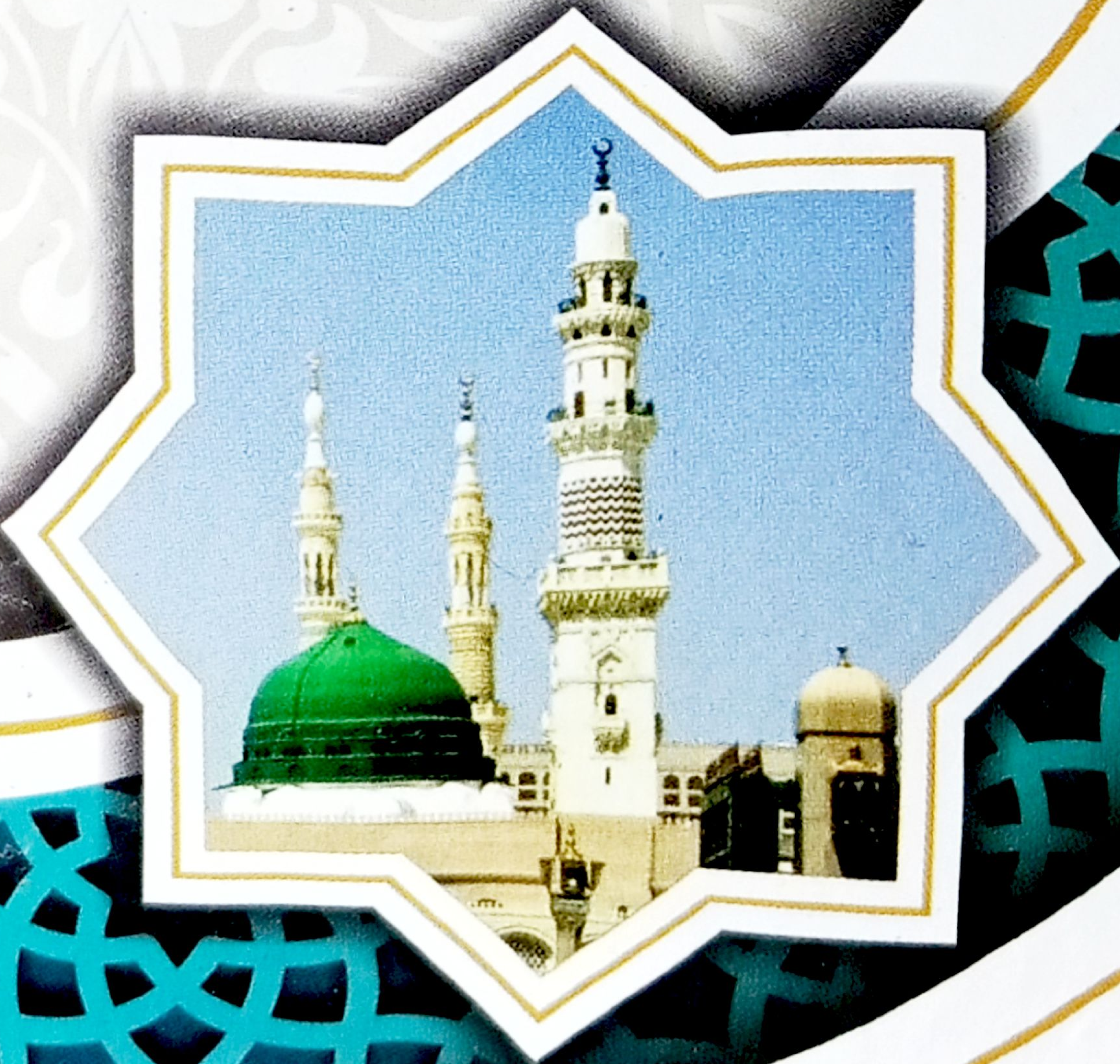
وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ
بَلْ أَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (القرآن)

اَلْأَنْبِيَاءُ أَحْيَآءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ (الحديث)

مجموعہ کُتب

حیات انبیاء علیہم السلام

۲



مکتبہ سراجیہ لنشر الکتب الاسلامیہ

حضوری باغ روڈ، ملتان فون : 061-4783486

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتٌ
بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (القرآن)

اَلْأَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّونَ (الحدیث)

مجموعۂ کتب

حیات الانبیاء علیہم السلام

۲

مکتبہ رحمانیہ لنشر الکتب الاسلامیہ

معصوم شاہ روڈ ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب : مجموعہ کتب حیات الانبیاء علیہم السلام (جلد دوم)

مصنفین : حضرت مولانا محمد عبداللہ بہلوی رحمہ اللہ
حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ
حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ
حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ
حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ
الشیخ محمد بن عبدالوہاب الحنبلی رحمہ اللہ (مجموعہ افادات حضرات خمسہ)
حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ

صفحات : ۶۴۰

مطبع : طیب شمشاد پرنٹنگ پریس لاہور

طبع اوّل : نومبر ۲۰۲۴ء

اسٹاکسٹ : ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
0322-6180738

ناشر : مکتبہ سراجیہ لنشر الکتب الاسلامیہ
حضوری باغ روڈ ملتان
0303-7396203 0301-7500173
0344-7121967 0301-7904257

اجمالی فہرست

وَلَا تَقُولُوْا لِمَنْ يُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ
بَلْ أَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (القرآن)

اَلْاَنْبِيَاءُ أَحْيَآءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ (الحدیث)

اَلْقَوْلُ النَّقِیُّ فِیْ حَیَاتِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مؤلف: مفسر قرآن، شیخ طریقت

حضرت مولانا محمد عبداللہ بہلوی رحمۃ اللہ علیہ

خانقاہ بہلویہ شجاع آباد ملتان

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون (رواہ ابو یعلی)

رسالہ مسمّٰی

القول النقی

فی

حیات النبی

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

مؤلفہ

مفسر القرآن شیخ طریقت حضرت مولانا مولوی محمد عبداللہ صاحب بہلوی

نوّر اللہ مرقدہٗ

زیر اہتمام

خادم خانقاہ بہلویہ و مہتمم مدرسہ

حضرت مولانا حاجی عزیز احمد صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفصیلی فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(حرفے چند)

حضرت مولانا محمد عبداللہ بہلوی رحمہ اللہ

پیدائش: ۱۵؍فروری ۱۸۹۶ء ...... وفات: ۲؍جنوری ۱۹۷۸ء

آپ بہلی مضافات شجاع آباد ضلع ملتان کے رہنے والے تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ سے کسب فیض کیا۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ، حضرت خواجہ مولانا محمد سراج الدین رحمہ اللہ دامانی موسیٰ زئی شریف سے تصوف میں اجازت یافتہ تھے۔ امام التفسیر تھے۔ اپنے زمانہ کے علماء کرام کے سرخیل تھے۔ پاکستان میں فتنہ انکار حیات النبی ﷺ نے سر اٹھایا تو آپ نے ''القول النقی فی حیات النبی ﷺ'' کے نام سے رسالہ تحریر فرمایا، جو ہم اس مجموعہ میں شامل اشاعت کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ الشکر والحمد للہ تعالیٰ! جو معارف بہلوی ج ۱ ص ۲۶۴ تا ۳۱۳ سے ماخوذ ہے۔ (ناشر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ کَفٰی وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

خُصُوْصًا عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ الْمُصْطَفٰی وَ الْمُرْتَضٰی خَیْرِ خَلْقِ اللّٰہِ تَعَالٰی اَلَّذِیْ حَیَاتُہٗ اَکْمَلُ وَ اَفْضَلُ مِنْ حَیَاۃِ الشُّہَدَآءِ وَ عَلٰی اٰلِہِ الْمُجْتَبٰی وَ اَصْحَابِہِ الَّذِیْنَ اہْتَدَوْا بِہُدَاہُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَ اَرْضَوْا عَنِ اللّٰہِ تَعَالٰی، اَمَّا بَعْدُ!

بندہ بصد عجز و نیاز، دست بستہ عارض ہے کہ اس سال (۱۹۵۷ء) مسئلہ حیات النبی ﷺ کے اختلاف کی ایسی آندھی چلی کہ عوام و خواص تک اس سے متاثر ہوئے، علمائے کرام معتوب و معیوب ہوئے، آفتابِ نصف النہار پر اَبرِ سیاہ آنے لگا اور عوام میں فریقین کے استدلال نے پریشانیاں، چہ میگوئیاں اور جنگ و جدال ڈال دیا۔ ''حیات الانبیاء'' کا مسئلہ ابتدائی سطح کے اعتبار سے اگرچہ کوئی اُصولی مسئلہ نہ تھا، مگر اپنے بعض نتائج کے اعتبار ولحاظ سے غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا۔ ہر طرف سے طنز برسنے لگے۔ احباب نے سوال و جواب سے سکوت اور دم بخود ہونا اختیار نہ کیا۔ آخر بندۂ گناہگار، شرمسار نے بذریعہ قلم اپنے احباب کے لئے اپنا مسلک ظاہر کرنا ضروری سمجھا۔ اس میں بعض احباب اور رفقاء نے بھی کچھ نقول بھیج دیں۔ ان نقول اور اکابر علمائے دیوبند کی تحقیقات سے بطور مشت نمونہ از خروارے پیشِ خدمت ہیں:

گر قبول افتد زہے عز و شرف

وما توفیقی الا باللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ

***

اس رسالے میں مختلف مباحث پر مشتمل چند فصول ہیں:

فصل اوّل

موت کس چیز کا نام ہے؟

یاد رکھنا چاہئے کہ موت، فنائے کامل اور عدمِ کامل کا نام نہیں ہے، فنائے کامل اور عدمِ کامل کا عقیدہ دراصل کفارِ مکہ اور منکرینِ حشر و نشر کا ہے کہ اس ظاہری موت پر انسان مرجاتا ہے اور گل سڑ جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ''وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ۔ بَلْ هُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ۔ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ'' (السجدۃ: ۱۰، ۱۱)

(ترجمہ) ''اور کہتے ہیں کہ جب ہم رل گئے زمین میں، کیا ہم کو نیا بننا ہے؟ کچھ نہیں، وہ اپنے رَبّ کی ملاقات کے منکر ہیں تو کہہ قبض کر لیتا ہے۔ تم کو فرشتہ موت کا جو تم پر مقرر ہے، پھر اپنے رَبّ کی طرف پھر جاؤ گے۔''

اس پر حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی تم اپنے آپ کو محض بدن اور دھڑ سمجھتے ہو کہ خاک میں رل مل کر برابر ہو گئے، ایسا نہیں، تم حقیقت میں جان ہو جسے فرشتہ لے جاتا ہے، بالکل فنا نہیں ہو جاتے۔'' (موضح القرآن)

پس قرآن مجید نے کفار کے اس عقیدے کا مدلل طریقے پر رَدّ فرمایا ہے اور اس ظاہری موت پر بھی حیات کو ثابت رکھا اور فرمادیا کہ موت فنائے کلی اور عدمِ تام نہیں، بلکہ: "اَلْاِنْتِقَالُ مِنْ دَارٍ اِلٰی دَارٍ" یعنی ایک مکان سے دُوسرے مکان کی طرف انتقال کرنے کا نام موت ہے۔

اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بارے میں یہ الفاظ ہیں کہ: "ایک لباس اُتار کر دُوسرا پہننے کا نام موت ہے۔"

امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "بشری الکئیب" میں اسی طور پر لکھا ہے کہ علماء نے فرمایا: "الموت لیس بعدم محض، ولا فناء صرف وانما هو انقطاع تعلق الروح بالبدن، ومفارقة وحيلولة بينهما، وتبدل حال، وانتقال من دار الٰى دار" (شرح الصدور، وبلیہ کتاب بشری الکئیب ص ۳۳۴)

(ترجمہ) "موت عدمِ محض اور فنائے صرف نہیں ہے، وہ تو بے شک رُوح کے تعلق (جو کہ بدن سے تھا) کے ٹوٹنے اور جدا ہونے، ایک حال سے تبدیل ہونے اور ایک مکان سے دُوسرے مکان کی طرف جانے کا نام ہے۔"

بلکہ قرآن مجید نے تو یہاں تک بتادیا کہ اس برزخی دور میں فنائیت کے بعد دارِ آخرت میں بھی یہی بدن پھر ترکیب کذائی اختیار کرے گا۔ جیسا کہ ارشاد ہے: "كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ" (الانبیاء: ۱۰۴)

(ترجمہ) "جیسا سرے سے بنایا تھا ہم نے پہلی بار، پھر اُس کو دُہرائیں گے وہ وعدہ ضرور ہو چکا ہے ہم پر، ہم کو پورا کرنا ہے۔"

لفظ اعادہ خود بتا رہا ہے کہ اسی بدن کو لوٹایا جائے گا۔ نیز موت کے بعد اجزائے بدنیہ کی کمی کو پورا کردیا جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ کمی ہمارے علم میں ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری ہے: "قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ وَعِندَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ" (ق: ۴)

(ترجمہ) "ہم کو معلوم ہے جتنا گھٹاتی ہے زمین ان میں سے (یعنی سب مٹی نہیں ہوجاتی، جان سلامت رہتی ہے) اور ہمارے پاس کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے۔"

یعنی جہاں کہیں اجزائے بدن تحلیل ہوکر منتشر ہوگئے ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ علاوہ ازیں وہ اپنے واقف کاروں کو پہچانیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ" (یونس: ۴۵)

(ایک دُوسرے کو پہچانیں گے)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے "الدرۃ الفاخرہ" کے ص ۱۶ میں حیاتِ انسانی کی تین قسمیں فرمائی ہیں:

۱...... پہلی زندگی: یعنی تخلیق سے قبل جب عالم ارواح میں عہد الست لیا گیا۔

چنانچہ فرمانِ الٰہی ہے: "ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ" (الاعراف: ۱۷۲)

یہ لفظ انفس اور ذُرّیت دونوں کسی موجود پر دلالت کرتے ہیں۔

۲...... دُوسری زندگی: جس کو قرآن مجید نے "الحیٰوۃ الدنیا" سے تعبیر فرمایا۔

۳...... تیسری زندگی: جو الفاظ قرآنی میں "اَبقٰی" ہے۔

مزید برآں اس جسدِ عنصری سے پہلے بھی انسان، انسان ہی ہوتے ہیں، مگر قابلِ ذکر نہیں ہوتے، قابلِ ذکر اس وقت ہوتے ہیں۔ جب کہ ان کو قوتِ عمل کے تمام آلات، سمع، بصر، فواد دے دیئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْـًٔا مَّذْكُوْرًا۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا'' (الدھر:۱،۲)

(ترجمہ) ''بے شک گزرا ہے انسان پر ایک وقت زمانے میں کہ نہ تھا وہ کوئی چیز جو زبان پر آتی۔ ہم نے بنایا آدمی کو ایک دورنگی بوند سے، ہم پلٹتے رہے اس کو، پھر کر دیا ہم نے اس کو سننے والا اور دیکھنے والا۔''

مگر وہ وجودِ پاک جو شروع سے ہی اطاعت سے سرشار اور معصیت کے عمل سے مستثنیٰ ہوتے ہیں، وہ اس آب وگل کے درمے سے پہلے بھی قابلِ ذکر ہوا کرتے ہیں، وہ اس وقت بھی آلاتِ ظاہرہ کے بغیر، ادراک وشعور سے مشرف ہوا کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ اور حضرت آدم علیہما السلام کا مکالمہ دربارۂ قضا وقدر صحیح حدیثوں بلکہ صحیح بخاری جلد دوم میں موجود ہے۔ کما فی الدرۃ الفاخرۃ ص ۱۶ اور حضور اکرم ﷺ کا ادراک وشعور، اس شعور سے بھی کامل تر ہے۔ (نسیم الریاض شرح شفاج ۱ ص ۲۵۱) میں ہے: ''كُنْتُ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ''

اور بعض روایات میں ہے کہ: ''كُنْتُ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ'' (میں نبی تھا جب کہ آدم علیہ السلام ابھی پانی اور مٹی میں تھے یا رُوح اور جسد میں تھے) مقصد یہ ہے کہ: ''ثَبَتَ لِیَ النُّبُوَّةُ'' یعنی میرے لئے اس وقت نبوّت ثابت ہوئی اور شہرت میں آئی، جب کہ ابھی حضرت آدم علیہ السلام کا وجودِ مبارک بھی نہ بنا تھا۔ کما فی شرح المصابیح! ظاہر ہے کہ جب نبوّت ثابت ہوئی تو آپ ﷺ کو علم وادراک بھی اس وقت سے حاصل ہوئے ہوں گے، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آپ ﷺ نبی تو تھے، مگر ادراک وشعور بعد میں ہوا، یہ بھی نبی کا ایک امتیازی وصف ہے۔ اسی ادراک وشعور کی دُنیا میں انبیاء علیہم السلام سے ایک خاص عہد لیا گیا اور مکلف قرار دیئے گئے۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

الف:...... ''وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ'' (آل عمران:۸۱)

(ترجمہ) ''جب کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے وعدہ لیا۔''

ب:...... ''وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ'' (الاحزاب:۷)

(ترجمہ) ''جب ہم نے نبیوں سے وعدہ لیا۔''

الغرض تمام علمائے ملتِ اسلامیہ اس اُمر میں متفق ہیں کہ موت فنائے کامل کا نام نہیں، بلکہ صرف زندگی کے ایک پلیٹ فارم سے اُتر کر دُوسرے پر جانے کا نام ہے۔ اس لئے ادراک وشعور اور سرور وغم اس ظاہری موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ اسی لئے شارع علیہ السلام کی جانب سے اہلِ قبور اور موتیٰ پر سلام وتلقین تجویز فرمائی گئی ہیں۔ علامہ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کتاب (الروح ص ۵ و ۱۰) میں فرماتے ہیں: ''والسلف مجمعون علی ھذا وقد تواترت الآثار عنھم بان المیت یعرف زیارۃ الحی ویستبشر بہ''

(ترجمہ) ''سلف اس بات پر متفق ہیں، اور ان سے متواتر آثار واخبار آچکے ہیں کہ میّت زیارت کرنے والے زندہ کو پہچانتی ہے اور خوش ہوتی ہے۔''

امام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ارشاد ہے: "ان الشھداء بل کل المؤمنین اذا زارھم المسلم وسلم علیھم عرفوا بہ وردوا علیہ السلام، فاذا کان ھذا فی احاد المؤمنین فکیف بسید المرسلین ﷺ"

(وفاء الوفاء ج ۴ ص ۱۳۵۱)

(ترجمہ) "شہداء اور تمام مؤمنوں کی جب کوئی مسلمان زیارت کرتا ہے اور ان پر سلام کہتا ہے تو وہ اس کو پہچانتے ہیں اور سلام کا جواب دیتے ہیں، جب عام مؤمنین کا یہ حال ہے تو سیّد المرسلین ﷺ (کی حیات) کا کیا عالم ہوگا؟"

فصل ثانی

انبیاء کرام علیہم السلام دنیوی وفات کے بعد بھی جسد عنصری کے ساتھ زندہ ہیں

جاننا چاہئے کہ تمام اہلِ سنت والجماعت حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، اہلِ حدیث اور مجددی وغیرہ اس بات پر متفق ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام دُنیوی وفات کے بعد اعلیٰ، افضل اور اکمل تر مقام، درجات اور قربِ کمال پر فائز المرام ہیں، مگر حضور پُرنور خاتم الانبیاء والمرسلین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین ﷺ سب سے بڑھ کر زیادہ مقرب اور "فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ" کے مقام پر سرفراز ہیں، مگر چونکہ "القلیل کالمعدوم" کے مصداق بعض لوگ انبیاء علیہم السلام کی اس طرح کی موت کے قائل تھے جیسے کہ دُوسرے انسانوں کی موت ہوتی ہے، تو اس پر امام بیہقی رحمہ اللہ اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ وغیرہ نے ان کی تردید میں حیات الانبیاء علیہم السلام کے موضوع پر رسائل تحریر فرمائے اور اُمتِ مرحومہ پر احسان فرمایا ہے، جزاھم اللہ تعالیٰ خیرًا!

فائدہ: اس وقت اس میں اختلاف نہیں ہے کہ حضور اکرم ﷺ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی موت کو عام انسانوں کی موت کی طرح سمجھا جاتا ہو، بلکہ اس میں اختلاف ہے کہ دُنیوی وفات کے بعد انبیاء کی حیاتِ برزخی رُوحانی ہے یا جسمانی برزخی ہے؟ ہمارے اکابرِ دیوبند وغیرہم رحمہم اللہ حضور پُرنور ﷺ کی حیاتِ برزخی جسمانی کے اس طور قائل ہیں کہ حضور اکرم ﷺ اسی وجودِ پاک کے ساتھ اپنے روضۂ مبارک میں اس طرح زندہ تشریف فرما ہیں جس طرح آپ ﷺ اِس دُنیا میں تشریف فرما تھے، جیسا کہ ماہنامہ "دارالعلوم دیوبند" نومبر ۱۹۵۷ء ص ۸، "آبِ حیات" مؤلفہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ میں اور "المہند علی المفند" (مطبوعہ کتاب خانہ اعزازیہ دیوبند) کے ص ۱۳ میں ہے:

"پانچواں سوال: کیا فرماتے ہیں جنابِ رسول اللہ ﷺ کی قبر میں حیات کے متعلق کہ کوئی خاص حیات آپ کو حاصل ہے؟ یا عام مسلمانوں کی طرح برزخی حیات؟

جواب: ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک حضرت ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور آپ کی حیات دُنیا کی سی ہے، بلا مکلف ہونے کے، اور یہ حیات مخصوص ہے آنحضرت (ﷺ) اور تمام انبیاء علیہم السلام اور شہداء کے ساتھ، برزخی نہیں ہے، جو حاصل ہے تمام مسلمانوں، بلکہ سب آدمیوں کو۔ چنانچہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ "انباء الاذکیاء بحیاۃ الانبیاء" میں بہ تصریح لکھا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ: علامہ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ: انبیاء و شہداء کی قبر میں حیات ایسی ہے جیسے دُنیا میں تھی اور موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبر میں نماز پڑھنا اس کی

دلیل ہے۔ کیونکہ نماز زندہ جسم کو چاہتی ہے......الخ۔ پس اس سے ثابت ہے کہ حضرت ﷺ کی حیات دُنیوی ہے، اوراس معنے پر برزخی بھی ہے کہ عالمِ برزخ میں حاصل ہے......الخ''

اور فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۲ ص ۵۸ مطبوعہ دارالاشاعت دیوبند ضلع سہارنپور میں ہے:

''سوال: انبیاء علیہم السلام احیاء اند؟ حیات چہ معنی دارد؟ اقسام حیات نیز تحریر فرمایند! چنانچہ حیات شہداء حیاتِ اولیاء وحیاتِ انبیاء وغیرہ۔

جواب: انبیاء علیہم السلام در قبورِ خود زندہ اند، وایں قدر از حدیث معتبر ثابت است کہ فرمود آنحضرت ﷺ کہ حرام کردہ است بدن ہائے انبیاء بر زمین وامثال آں، ایں قسم احادیث در شرح الصدور فی احوال الموتی والقبور سیوطی رحمہ اللہ باستیعاب آوردہ است فقط، واللہ تعالیٰ اعلم! (محمد شفیع غفرلہ)''

کتاب ''نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام'' میں آنحضرت ﷺ کے احوال اور عالم برزخ میں تشریف رکھنے سے متعلق تفصیلات ہیں۔ چنانچہ اس میں حیات النبی علیہ السلام کے متعلق چند دلائل بھی تحریر ہیں، من جملہ ان کے یہ ہیں:

پہلی روایت: ابن المبارک رحمہ اللہ نے حضرت سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے کہ: ''لیس من یوم الا وتعرض علی النبی ﷺ أعمال أمته غدوة وعشیًا'' (المواھب اللدنیة ج۵،ص ۳۴۷)

(ترجمہ) ''کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر آپ کی اُمت کے اعمال صبح وشام پیش نہ کئے جاتے ہوں۔''

دوسری روایت: مشکوٰۃ میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ان اللہ حرّم علی الأرض أن تأکل أجساد الأنبیاء، فنبیّ اللہ حیّ یرزق، رواہ ابن ماجة'' (مشکوٰۃ ص ۱۲۱)

(ترجمہ) ''اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کردیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسدِ مبارک کو کھاسکے۔ پس خدا تعالیٰ کے پیغمبر زندہ ہوتے ہیں اوران کورزق دیا جاتا ہے، روایت کیا اس کو ابن ماجہ نے۔''

فائدہ: پس ایک تو آپ ﷺ کا قبر میں زندہ ہونا ثابت ہوا، دوم یہ کہ قبر میں جو رزق دیا جاتا ہے وہ اُس عالم کے مناسب ہوتا ہے، گو شہداء کے لئے بھی حیات اور رزق دیا جانا وارد ہے، مگر انبیاء کی حیات اور مرزوقیت ان سے اکمل واقویٰ ہے۔

تیسری روایت: بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''الأنبیاء أحیاء فی قبورھم یصلون'' (المواھب اللدنیة ج ۵ ص ۳۳۲)

(ترجمہ) ''انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں، اور نماز پڑھتے ہیں۔''

فائدہ: مدارج النبوۃ جلد دوم میں اس کی اسناد کی توثیق کی ہے۔

فائدہ: یہ نماز تکلیفی نہیں، بلکہ تلذّذ کے لئے ہے۔ (کذا فی تنویر الحوالک فی رؤیۃ النبی والملک ص ۳۷)

اس حیات سے آپ ﷺ کو پکارنا ہر جگہ سے دُرست نہیں، کیونکہ مشکوٰۃ میں بیہقی سے بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ خود حضرت رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ: ''من صلّٰی علیّ عند قبری سمعته، ومن صلّٰی علیّ نائیا ابلغته، رواہ البیهقی فی شعب الایمان'' (مشکوٰۃ ص ۸۷)

(ترجمہ) ''جو شخص میری قبر کے پاس درود پڑھے، میں اس کو سنتا ہوں، اور جو دُور سے پڑھے وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے۔''

جیسا کہ مشکوٰۃ میں نسائی اور دارمی سے بروایت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ: ''ان اللہ ملٰئکۃ سیاحین فی الأرض یبلغون من امتی السلام۔ رواہ النسائی والدارمی'' (مشکوٰۃ ص ۸۶)

(ترجمہ) ''بے شک اللہ تعالیٰ کی جانب سے زمین میں ملائکہ مقرر ہیں جو میری اُمت کی طرف سے مجھ تک سلام پہنچاتے ہیں۔''

چوتھی روایت: میں ہے کہ: ''مررت علٰی موسٰی لیلۃ أسری بی عند الکثیب الأحمر وھو قائم یصلی فی قبرہ'' (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۶۸)

(ترجمہ) ''جس رات معراج ہوئی، میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ سرخ ٹیلے کے پاس اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں۔''

پانچویں روایت: میں ہے کہ: ''ان رسول اللہ ﷺ صلی بالمرسلین لیلۃ أسری بہ رکعتین، وانہ سلم علٰی ھارون فدعالہ بالرحمۃ ولأمتہ، وانہ سلم علٰی ادریس فدعالہ بالرحمۃ ولأمتہ''

(درۃ الفاخرۃ ص ۱۱۵، مجموعہ رسائل امام غزالی، دار الکتب العلمیۃ بیروت، لبنان)

(ترجمہ) ''حضور ﷺ نے معراج کی رات میں رسولوں کو دو رکعت نماز پڑھائی، اور آپ ﷺ نے حضرت ہارون علیہ السلام پر سلام کیا اور انہوں نے آپ کے لئے اور آپ کی اُمت کے لئے رحمت کی دُعا کی، اور حضرت ادریس علیہ السلام پر سلام کہا اور انہوں نے آپ کے لئے اور آپ کی اُمت کے لئے رحمت کی دُعا کی۔''

چھٹی روایت: میں ہے کہ: حضور ﷺ نے فرمایا: ''والذی نفسی بیدہ لینزلن عیسٰی بن مریم ثم لئن قام علٰی قبری وقال: یامحمد! لأجیبنہ'' (ترجمان السنۃ ج ۳، ص ۵۶۳، بحوالہ رُوح المعانی)

(ترجمہ) ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، عیسٰی بن مریم ضرور اُتر کر رہیں گے اور اگر وہ میری قبر پر آکر کھڑے ہوں گے اور مجھ کو یا محمد (ﷺ) کہہ کر آواز دیں گے تو میں ان کو ضرور جواب دوں گا۔''

ساتویں روایت: ''ما من أحد یسلم علیّ الا رد اللہ علیّ روحی حتّٰی ارد علیہ السلام، رواہ ابوداؤد والبیہقی فی الدعوات الکبیر'' (مشکوٰۃ ص ۸۶)

(ترجمہ) ''جو کوئی میرے پر سلام کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھ پر میری رُوح واپس کرتا ہے، اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔''

مندرجہ بالا روایات کا خلاصہ یہ نکلا کہ سب انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں، آنحضرت ﷺ بھی زندہ ہیں اور روضۂ اقدس میں تشریف فرما ہیں۔

حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے مکاتیب جلد اوّل ص ۱۵۳ میں ہے کہ: ''آپ (ﷺ) کی حیات نہ صرف رُوحانی ہے جو کہ عام مؤمنین وشہداء کو حاصل ہے، بلکہ جسمانی بھی ہے اور از قبیل حیاتِ دُنیوی، بلکہ بہت سی وجوہ سے اس سے قوی تر ہے۔''

''مدارج النبوۃ'' (ج ۲ ص ۵۷۵، مطبوعہ لکھنؤ) میں ہے: ''بدانکہ حیاتِ انبیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہم

جمعین متفق علیہ است میان علماء ملت و ہیچ کس را خلاف نیست دراں کا تر و تو تیر زوجود و حیات شہداء و مقاتلین فی سبیل اللہ کہ آن معنوی اُخروی است عند اللہ و حیات انبیاء حیات حسّی و دُنیاوی است۔"

(ترجمہ) "جاننا چاہئے کہ حیاتِ انبیاء علیہم السلام متفق علیہ ہے تمام علماء کے نزدیک، کسی کو اس میں اختلاف نہیں، شہداء مقاتلین فی سبیل اللہ کی حیات معنوی اُخروی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور انبیاء علیہم السلام کی حیات حسی دُنیاوی ہے۔"

"اشعۃ اللمعات" (ج ۱ ص ۶۱۳) میں ہے کہ: "وحیاتِ انبیاء متفق علیہ است" یعنی حیاتِ انبیاء علیہم السلام متفق علیہ ہے۔

"انباء الاذکیاء للسیوطی رحمہ اللہ" میں ہے کہ: "حیاۃ النبی ﷺ فی قبرہ وھو وسائر الأنبیاء معلومۃ عندنا علمًا قطعیًا لما قام عندنا من الأدلۃ فی ذٰلک وتواترت بہ الأخبار وقد ألّف البیھقی جزأ فی حیاۃ الأنبیاء فی قبورھم۔" (انباء الاذکیاء مندرجہ الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۱۴۷ طبع بیروت)

(ترجمہ) "حضور اکرم ﷺ اور تمام انبیاء علیہم السلام کی حیات علم قطعی سے ہمارے نزدیک ثابت ہے، اس لئے کہ دلائل اور متواتر اخبار اس پر قائم ہیں اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے حیاتِ انبیاء علیہم السلام پر ایک رسالہ لکھا ہے۔"

"بذل المجھود فی حل ابی داؤد" (ج ۲، ص ۱۱۷) میں ہے کہ: "ان نبی اللہ ﷺ حیّ فی قبرہ کما أن الأنبیاء علیہم السلام أحیاء فی قبورھم، ولا فرق بین أن یکون فوق الأرض أو تحت حجابھا کما لا فرق فی حضورہ وغیبتہ فی زمان حیاتہ ﷺ"

(ترجمہ) "نبی اکرم ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں، جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں، اس میں کوئی فرق نہیں کہ زمین کے اُوپر ہوں یا پردے کے نیچے۔ جیسا کہ حضور ﷺ اپنی حیاتِ مبارک کے وقت میں رُوبرو بھی ہوتے تھے اور آنکھ سے غائب بھی ہوتے تھے۔"

اسی طرح "فتح الباری" (ج ۳، ص ۴۱۴) میں فرماتے ہیں: "الأنبیاء أحیاء عند ربھم یرزقون، فلا مانع ان یحجوا فی ھٰذا الحال کما ثبت فی صحیح مسلم من حدیث أنس رضی اللہ عنہ انہ ﷺ رأی موسٰی قائمًا فی قبرہ یصلی"

(ترجمہ) "انبیاء علیہم السلام، اللہ تعالیٰ کے قرب میں زندہ ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ پس کوئی چیز مانع نہیں کہ اس حال میں حج کریں۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے دیکھا۔"

اور ابوداؤد باب زیارۃ القبور کے حاشیہ میں حیات النبی ﷺ کی کس قدر وضاحت فرمائی ہے: "وجاء فی الروایۃ انہ یعطی للمیت فی یوم الجمعۃ الادراک اکثر مما یعطی فی سائر الأیام" (ابوداؤد ج ۲، ص ۱۰۵)

(ترجمہ) "روایت میں وارد ہے کہ میّت کو جمعہ کے دن دُوسرے دنوں کی نسبت زیادہ ادراک دیا جاتا ہے۔"

اسی طرح نسائی باب (اکثار الصلوٰۃ یوم الجمعۃ ص ۱۵۵ حاشیہ) میں ہے: "والجواب بقولہ ﷺ (ان اللہ حرم ... الخ) کنایۃ عن کون الأنبیاء أحیاء فی قبورھم"

(ترجمہ) ''آنحضرت ﷺ کا قول: ''ان اللہ حرم......'' اس بات سے کنایہ ہے کہ حضراتِ انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔''

''باب صلوۃ نبی اللہ موسیٰ علیہ السلام'' ص ۱۸۵ کے حاشیہ: ۱۲ میں واضح فرمایا ہے کہ:

''(یصلی فی قبرہ) قال الشیخ بدر الدین الصاحب ھذا صریح فی اثبات الحیاۃ لموسی فی قبرہ فانہ وصفہ بالصلوۃ وانہ قائم ومثل ذٰلک لا یوصف بہ الروح وانما یوصف بہ الجسد وفی تخصیصہ بالقبر دلیل علی ھذا فانہ لو کان من اوصاف الروح لم یحتج لتخصیصہ''

(ترجمہ) شیخ بدرالدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: یہ یصلی فی قبرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات فی القبر کے بارے میں صریح دلیل ہے۔ پس آپ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نماز پڑھنے اور قبر میں کھڑے ہونے سے متصف فرمایا ہے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنا صرف رُوح کی صفت نہیں، بلکہ رُوح مع الجسد کی صفت ہوتا ہے، پھر قبر کی تخصیص کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے۔ پس اگر وہ رُوح کے اوصاف سے ہوتا تو اس سے حجت پکڑنا صحیح نہ ہوتا۔''

مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۵۷۶ میں اوس بن ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''......فأکثروا علیّ من الصلوۃ فیہ فان صلوتکم معروضۃ علیّ۔ قالوا: یا رسول اللہ! وکیف تعرض صلوتنا علیک وقد ارمت؟ قال: یقولون بلیت، قال: ان اللہ حرّم علی الأرض أجساد الأنبیاء'' (مشکوۃ ص ۱۲۰)

(ترجمہ) ''جمعہ کے روز مجھ پر دُرود شریف کثرت سے پڑھا کرو، تمہارا دُرود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیسے پیش کیا جائے گا، آپ تو قبر میں مٹی ہو جائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے جسم کو کھائے۔''

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: ''حیاتِ انبیاء متفق علیہ است ہیچ کس را در وے خلافی نیست، حیاتِ جسمانی دُنیاوی حقیقی نہ حیاتِ معنوی رُوحانی چنانکہ شہدا راست''

(اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۶۱۳)

(ترجمہ) ''حیاتِ انبیاء علیہم السلام متفق علیہ ہے، کسی کا اس میں اختلاف نہیں، حیاتِ انبیاء علیہم السلام حسی دُنیاوی ہے، محض ملاقاتِ ارواح نہیں، جیسا کہ شہداء کی (ارواح کو پرندوں کے پیٹ میں ڈالا جاتا) ہے۔''

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''الاعتقاد والہدایۃ الی سبیل الرشاد'' میں فرماتے ہیں کہ: ''ان اللہ ردّ علی الأنبیاء أرواحہم وھم أحیاء عند ربھم کالشھداء'' (کذا فی انباء الاذکیاء للسیوطی مندرجہ الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۱۴۸)

(ترجمہ) ''انبیاء علیہم السلام کی ارواح (قبض ہونے کے بعد) ان کی طرف واپس کی جاتی ہیں۔ پس وہ شہداء کی طرح اللہ کے قرب میں زندہ ہیں۔''

اور شرح تنویر الحلک فی رؤیۃ النبی والملک (ص ۵۸ مطبوعہ مصر) میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''علامہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''شرح ہمزیہ'' میں لکھتے ہیں کہ: ''حیاتِ انبیاء علیہم السلام کی حدیثیں بہت ہیں، جن کو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالے میں جمع کر دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حیات، شہداء کی حیات سے اعلیٰ واتم ہے، جس کی تصریح قرآن مجید میں: ''بَلْ اَحْیَآئٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ'' کی شکل میں موجود ہے''

فصل ثالث

مسئلہ حیات کتب اہلِ حدیث سے

نواب صدیق حسن خان صاحب اپنی کتاب (حج الکرامہ ص ۲۸۵) میں لکھتے ہیں: ''ابنِ جوزی رحمہ اللہ بہ سندِ متصل سعید بن المسیب رحمہ اللہ لایا ہے کہ سعید مذکور نے فرمایا کہ: واقعہ حرہ میں مسجدِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں بجز میرے اور کوئی نہ تھا۔ اہلِ شام جب مسجد میں آتے تو کہتے کہ: یہ بوڑھا دیوانہ اس جگہ کیا کرتا ہے؟ اور فرمایا کہ: کوئی نماز کا وقت نہ آتا تھا، مگر میں آواز اذان اور اقامت کی حجرۂ شریف سے سنتا تھا اور اسی اذان واقامت سے نماز ادا کرتا تھا اور بجز میرے کوئی نہ ہوتا تھا۔ اسی واقعہ کو ''الدرة الثمينه'' (ص ۱۲۳) میں اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ''انباء الاذکیاء'' و ''شرح الصدور'' میں، اور علامہ سخاوی رحمہ اللہ تلمیذ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''القول البدیع'' میں نقل کیا ہے، اور اس قسم کے اور بھی واقعات نقل کئے ہیں۔''

علامہ شوکانی یمنی آخری دور کے محقق اہلِ حدیث (متوفی ۱۲۵۰ھ) اپنی کتاب ''فتح القدیر للشوکانی'' آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''والمراد من الرزق المعروف فی العادات علی ماذهب اليه الجمهور كماسلف''

حاصلِ آیت: ''وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا'' (مریم: ۶۲) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جنتیوں کو رزق جو کہ عادت میں معلوم ہے، وہی مراد ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: شہداء کو جنت سے عالمِ برزخ میں صبح وشام رزق دیا جاتا ہے، قرآنِ کریم میں عام جنتیوں کے لئے بھی ہے کہ: ''وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا'' (مریم: ۶۲) یعنی جنتیوں کو بہشت میں صبح وشام رزق دیا جاتا ہے۔ ایک روایت میں لفظِ ''حوت'' اور لفظ ''ثور'' یعنی بیل بھی آیا ہے۔

اور اسی روایت میں ہے: ''فَيَجِدُوْنَ طَعْمَ كُلِّ شَيْءٍ فِي الْجَنَّةِ'' یعنی بہشت میں ہر شے کا مزہ پاتے ہیں۔ (بشری الکئیب مع شرح الصدور للسیوطی رحمہ اللہ ص ۳۵۸)

نیز روایات سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے وفات کے وقت اظہار فرمایا کہ مجھ کو جو زہر دیا گیا تھا، آج میں اس کی تکلیف محسوس کر رہا ہوں اور ظاہر ہے کہ زہر دے کر کسی کو مارا جائے تو اس کے شہید ہونے میں کسی کو شبہ نہیں اور قرآنی تصریحات سے شہداء کا زندہ ہونا ثابت ہے، اگر حضور ﷺ کے بارے میں اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو بھی آپ ﷺ کی حیات میں کوئی شبہ نہیں۔ جب شہداء کی حیات ثابت ہے تو انبیاء ورُسل تو شہداء سے کئی مراحل آگے ہیں۔ شہداء کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ. فَرِحِيْنَ بِمَا آتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ'' (آل عمران: ۱۶۹، ۱۷۰)

(ترجمہ) ''بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رَبّ کے پاس، کھاتے پیتے اور خوشی کرتے ہیں اس پر جو دیا ان کو اللہ نے اپنے فضل سے اور خوش ہوتے ہیں ان کی طرف سے جو ابھی تک نہیں پہنچے ان کے پاس، ان کے پیچھے سے۔''

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے شہداء کے لئے پانچ چیزیں فرمائیں:

۱...... تم ان کو مردہ مت سمجھو۔

۲...... وہ زندہ ہیں۔

۳...... ان کو رزق دیا جاتا ہے۔
۴...... وہ اپنی اس اُخروی زندگی پر خوش وخرم ہیں۔
۵...... پس ماندگان کو بشارت بھیجتے ہیں۔

کیا یہ صفات مُردوں کی ہیں؟ یا محض رُوحانی حیات کی ہیں؟ فافہم!

حالانکہ شہداء میں سے بعض وہ ہیں جن کی رُوح نکلنے کے ساتھ ساتھ ان کے بدن بھی ٹکڑے ٹکڑے کردیئے جاتے ہیں اور بعض کو جلا دیا جاتا ہے اور راکھ کو بھی ہوا میں اُڑا دیا جاتا ہے۔ دُنیا ان کے ساتھ یہ معاملات دیکھتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نہایت زوردار الفاظ سے کہتا ہے کہ ان کو مردہ مت کہو! اور مت سمجھو! وہ تو زندہ ہیں، خوش ہیں......الخ!

نیز ہمارا اور اکثر کا مشاہدہ ہے کہ بہت سے صلحاء وشہداء کی نعشیں صدیوں کے بعد اپنی قبروں سے تروتازہ نکلیں اور ان کے اجسام پر کسی قسم کا کوئی اثر نہ تھا، تنویر الحوالک فی رؤیة النبی والملک ص ۶۳ میں ابونعیم نے یوسف بن عطیہ سے روایت کیا ہے کہ: ''سمعت ثابتًا یقول لحمید الطویل: هل بلغک یا ابا عبید ان احدًا یصلی فی قبره الا الأنبیاء قال: لا، قال ثابت: اللّٰهم ان اذنت لأحد أن یصلی فی قبره فأذن لثابت ان یصلی فی قبره... والله الذی لا اله الا هو ادخلت ثابتًا البنانی لحده ومعی حمید الطویل قال: فلما سوینا علیه اللبن سقطت لبنةٌ فاذا انا رأینا به یصلی فی قبره'' (حلیۃ الاولیاء ج ۲، ص ۳۱۹)

(ترجمہ) ''میں نے ثابت سے سنا، وہ حمید طویل کو کہتا تھا کہ: کیا کوئی خبر بھی سنی کہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی دوسرا بھی قبر میں نماز پڑھتا ہو؟ فرمایا: نہیں سنا! ثابت نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ! (یعنی دُعا کہہ دی) اور جسیر ﷫ سے روایت ہے کہ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! میں نے ثابت ﷫ بنانی کو قبر میں داخل کیا، اس موقع پر حمید طویل بھی ساتھ تھا۔ جب ہم نے اس پر اینٹیں برابر کردیں تو اچانک ایک اینٹ گرگئی، تو ہم نے دیکھا کہ ثابت قبر میں نماز پڑھ رہا تھا۔ (اللہ تعالیٰ نے اس کی دُعا کو قبول فرمالیا)''

ترمذی ﷫، بیہقی ﷫ اور حاکم ﷫ نے ابن عباس ﷠ سے روایت کیا ہے کہ: ''ضرب بعض أصحاب النبی ﷺ خبائه علی قبر وهو لا یحسب انه قبر فاذا قبر فیه انسان یقرأ سورة الملک حتی ختمها فأتی النبی ﷺ فقال: یا رسول الله! ضربت خبائی علی قبر وأنا لا أحسب انه قبر فاذا فیه انسان یقرأ سورة الملک حتی ختمها، فقال النبی ﷺ: هی المانعة هی المنجیة تنجیه من عذاب القبر'' (ترمذی ج ۲ ص ۱۱۷)

(ترجمہ) ''بعض اصحابِ حضور رسولِ اکرم ﷺ نے قبر کے اُوپر خیمہ گاڑا اور اس کو خبر نہ تھی کہ یہ قبر ہے، اس میں سے سورۃ ''تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ'' سنی۔ حتیٰ کہ اس نے سورۃ کو تمام کیا۔ حضور پُرنور ﷺ کو آکر خبر دی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: یہ سورۃ عذابِ قبر کو روکنے والی اور عذابِ قبر سے نجات دینے والی ہے۔''

''قال أبو القاسم السعدی فی کتاب الروح: هذا التصدیق من النبی ﷺ بأن المیت یقرأ فی قبره، فان عبدالله أخبره بذلک، وصدقه رسول الله ﷺ'' (شرح الصدور ص ۱۸۹)

(ترجمہ) ''ابوالقاسم سعدی ﷫ نے کتاب رُوح میں فرمایا کہ: حضور ﷺ نے تصدیق کردی کہ میت بھی قبر میں پڑھتی ہے، کیونکہ حضرت ابن عباس ﷠ نے اس واقعہ کی خبر آپ ﷺ کو دی اور آپ ﷺ نے اس کی تصدیق فرمائی۔''

اور شیخ نجم الدین اصبہانی سے مروی ہے کہ: ''انه حضر رجلاً یدفن، فقعد الملقن یلقنه، فسمع المیت وهو یقول: الا تعجبون من حیث یلقن حیًا'' (شرح الصدور ص ۲۰۶)

(ترجمہ) ''ایک جوان کے دفن پر حاضر ہوا تو تلقین کرنے والا قبر پر اس کو تلقینِ شہادت کر رہا ہے اور دفن ہونے والے سے سنا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ: کیا تعجب نہیں کرتے ایسے مردے سے کہ زندہ کو تلقین کر رہا ہے۔''

اس کی مثل متعدد واقعات کتب یافعیؒ اور قشیری میں کثیر ہیں۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا کہ: فاطمہ بنتِ خزاعیہؓ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبر پر سلام کہا کہ: ''السلام علیک یاعمّ رسول اللہ!'' انہوں نے جواب دیا: ''علینا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' (شرح الصدور ص ۲۱۰)

اس کے علاوہ ایسے واقعات کثیر ہیں۔

''ازالۃ الخفاء'' میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: ''زمانۂ خلافتِ فاروقی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی اور نماز کے بعد فوراً کسی نے کھجوروں کی ایک پلیٹ خدمتِ اقدس میں پیش کی۔ آنحضرت ﷺ نے تقسیم فرماتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دو کھجوریں دیں، مگر ان کے جی میں آیا کہ اگر تیسری بھی مل جاتی تو بہتر تھا۔ آنکھ کھل گئی، مسجد تشریف لے گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی، فوراً کسی نے ایک پلیٹ کھجوروں کی پیش کی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں دو کھجوریں پیش کر دیں۔ آپ کو وہ رات والا واقعہ یاد آ گیا اور دِل میں اس خیال کی یاد تازہ ہوگئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر رسولِ اکرم ﷺ آپ کو تیسری کھجور عنایت فرماتے تو میں دے دیتا، مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے محض دو ہی دی تھیں، اس لئے میں بھی دو ہی دُوں گا۔''

بظاہر زیارت تو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہوئی تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی اس واقعے کا علم کرا دیا تھا۔

مقدمہ فیوض الحرمین میں اپنے مشاہدہ نہم میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''میں نے آنحضرت ﷺ کو اکثر اُمور میں اسی صورتِ مقدس میں جس میں آپ تھے، بار بار دیکھا۔ (حتیٰ کہ فرمایا کہ) انبیاء علیہم السلام حج کیا کرتے ہیں اور اپنی قبروں میں وہ زندہ ہیں۔'' (فیوض الحرمین ص ۳۲)

فائدۂ عجیبہ

سوال: آپ کا یہ فرمانا کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں۔ آیتِ شریفہ: ''اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ'' (الزمر: ۳۰) کے خلاف ہے، آیت میں صاف واضح ہے کہ آپ ﷺ پر موت وارد ہوئی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کو دفن کیا، جب آپ ﷺ کی موت ہوجانے یا نہ ہونے میں اختلاف ہوا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت سے استدلال کیا۔ پھر حیات کا کیا مطلب رہ جاتا ہے؟ نیز جب مشاہدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ قبرِ انور میں آرام فرما ہیں، تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہاں سے باہر حج وغیرہ کے لئے تشریف لے جائیں یا وہاں بھی زندہ ہوں؟

جواب: یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے جسدِ اطہر کو زمین نہیں کھاتی، نہ وہ بوسیدہ ہوتا ہے۔ اور تمام موتیٰ کے لئے رُوح کا واپس ہونا حدیثِ صحیح میں موجود ہے، جس سے سوال منکر نکیر ہوتا ہے، شہداء اور انبیاء تو ہزاروں درجے اُوپر ہیں۔ پھر اب یہ ہے کہ جسم میں رُوح آ کر واپس چلی جاتی ہے یا دائم و مستمر بھی رہ سکتی ہے؟ تو حق

تعالیٰ زوردار الفاظ میں فرماتا ہے کہ ان کو مردہ گمان بھی نہ کرو: ’’وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا، بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ... الخ‘‘ (آل عمران:۱۶۹) کھاتے پیتے ہیں، خوش ہوتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام تو ان سے ہزاروں درجے بالاتر ہیں۔ جب شہداء زندہ ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور بہشت میں آتے جاتے ہیں اور دُنیا میں بھی آتے جاتے ہیں، جیسا کہ حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ:

’’بینما النبی ﷺ جالس، وأسماء بنت عمیس قریبة منه اذ ردّ السلام، و قال: یا أسماء! هٰذا جعفر مع جبریل و میکائیل مروا فسلموا علینا‘‘ (شرح الصدور ص ۲۴۴)

(ترجمہ) ’’حضور ﷺ بیٹھے تھے اور اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے قریب تھیں، اور آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: اے اسماء! یہ جعفر ہے، جبریل اور میکائیل علیہما السلام کے ساتھ گزرے اور ہم پر سلام کہا۔‘‘

تو کیا بعید ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی جسدِ عنصری کے ساتھ زندہ ہوں اور نماز بھی پڑھیں اور حج بھی کریں اور آیت: ’’اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ‘‘ (الزمر:۳۰) اس کے مخالف نہیں۔ اس لئے کہ کون کہتا ہے کہ حضور ﷺ اور انبیاء علیہم السلام پر موت نہیں آئی؟ بلکہ اختلاف اس بات میں ہے کہ ظاہری موت کے بعد پھر قبر مبارک میں بہ جسدِ عنصری زندہ ہیں یا نہ؟

نیز رُوح تو ہر خاص و عام کی زندہ ہے، کیونکہ رُوح ان اشیاء میں سے ہے کہ اس پر فنا نہ آئے گی، جیسے حور و غلمان وغیرہ، کما عند الجمهور، پس: ’’اَلْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ‘‘ (رواه البیهقی عن انس رضی اللہ عنہ و وافقه الحافظ ابن حجر کما فی الجلد السادس فی فتح الباری کما مرّ) کا معنی یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبر مبارک میں عباداتِ طیبہ اور افعالِ مبارکہ سے معطل نہیں، بلکہ وہ قبر میں بھی اسی طرح عبادات، مثلاً: حج، نماز وغیرہ میں مشغول ہیں، جیسا کہ دُنیا میں تھے، اسی طرح ان کے تابعین کا حال علیٰ قدر المراتب ہے، بخلاف ان لوگوں کے جو دُنیا میں عبادات سے معطل تھے، وہ قبر میں بھی معطل ہیں۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے: ’’مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی‘‘ (بنی اسرائیل:۷۲) یعنی وہ شخص جو دُنیا میں نابینا ہے (یعنی اعمالِ صالحہ و اعتقادِ صحیحہ سے معطل ہے) وہ آخرت میں بھی معطل ہے۔

پس حیات کا معنی یہ ہے کہ حیات کے ہوتے ہوئے زندوں والے کام کرتے ہیں اور ممات کا مطلب یہ ہے کہ باوجود زندہ ہونے کے، رُوح زندوں کے نیک افعال سے معطل ہے۔ جیسا کہ محاورہ میں آوارہ اور نالائق کو مردہ اور نیک خصال کو زندہ کہتے ہیں اور حدیث میں ذاکر کو زندہ اور غافل کو مردہ فرمایا ہے۔ اسی طرح علم کو حیات اور جہل کو موت سے تعبیر کرتے ہیں، پس کافر میّت ہے، کیونکہ وہ قبر میں میّت ہے، یعنی تمام خیرات اور نیک کام کرنے سے معطل ہے، اس کو سوائے فریاد و فغاں کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔

میّت کے یہ معنی نہیں کہ اس کی رُوح فانی ہے، کیونکہ ارواحِ خبیثہ جو افعال کرتی ہیں، ان کو افعالِ حیات نہیں کہا جاتا۔ پس بیہقی کی حدیث میں حیات باعتبار افعال کے ہے، اس لئے جہاں کہیں بھی کسی کی حیات ذکر کی جاتی ہے، وہاں اس کے افعال کا ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ اس کی حیات پر دلیل ہو، اس تقریر سے اس حدیث: ’’مَا مِنْ اَحَدٍ یُسَلِّمُ عَلَیَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰہُ عَلَیَّ رُوْحِیْ‘‘ جو کوئی مجھ پر سلام کہتا ہے تو مجھ پر میری رُوح رد کی جاتی ہے کا مطلب یہ ہے، آپ ﷺ سلام کا جواب دیتے ہیں۔

سوال: اب یہ تو سمجھ میں آگیا کہ رُوح واپس کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ رُوح پہلے نہ تھی، سلام کے جواب دینے کے وقت واپس آتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس سے حیات ابدی کیسے ثابت ہوئی؟

جواب: فیض الباری علیٰ صحیح البخاری میں اعادۂ رُوح کا معنیٰ بتلاتے ہوئے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ: "لیس معناہ انہ یرد روحہ أی انہ یحیی فی قبرہ، بل توجہ من ذٰلک الجانب الیٰ ھٰذا الجانب فھو حیّ ﷺ فی کلتا الحالتین بمعنی انہ لم یطر أعلیہ التعطل قط" (فیض الباری علیٰ صحیح البخاری ج ۲ ص ۶۵)

(ترجمہ) "ردِّ رُوح کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ قبر میں پھر زندہ کئے جاتے ہیں، بلکہ یہ معنیٰ ہے کہ رُوح کی توجہ جو تجلیات واردہ میں تھی، دُرود کے وقت اس کی توجہ سلام کے جواب کی طرف کر دی جاتی ہے، تو حضور کریم ﷺ دونوں حالتوں میں زندہ ہیں، یعنی کسی وقت بھی ان کو تعطّل نہیں ہوا۔"

اور "فیض الباری" ج ۲ ص ۴۶، ۴۷ پر ہے کہ عالم دو قسم پر ہے، ایک وہ جو ہمارے لئے محسوس و مبصر ہے، اس کو ہم دیکھ رہے ہیں، اس کو عالم الشہادۃ کہتے ہیں، دوم وہ کہ جس کا اخبار شرع سے ہم کو علم ہوا، اس کا نام عالم الغیب ہے۔

شریعت کبھی ظاہر حس پر اَحکام مرتب کرتی ہے، گو واقع میں اس کے خلاف کا امکان ہو، جیسے فرمایا: "وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا" (یٰسٓ:۳۸) سورج کے آنے جانے کا کون انکار کرسکتا ہے؟ ظاہر حس میں جو تھا، فرمایا، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ آسمان چل رہا ہو، اس کے چلنے سے سورج چل رہا ہو، اسی ظاہر کو فرمایا کہ سورج چل رہا ہے، اور ممکن ہے کہ آسمان میں محض سورج چل رہا ہو، اور آسمان ساکت ہو۔

اور کبھی حقیقت پر آگاہی دی جاتی ہے، جیسے قبر کا عذاب جن و اِنس کے سواء سب سنتے ہیں، مگر حواسِ ظاہری اس کے سننے سے معطّل ہیں، جیسے نیند والے پر حالات عجیبہ غریبہ گزرتے ہیں، مگر جاگنے والا نہیں دیکھ سکتا۔

اسی طرح عالم غیب یعنی برزخ والے کے حالات کچھ اور ہیں اور عالَم ظاہر و دُنیا کے کچھ اور ہیں، عالم ظاہر کے اعتبار سے فرمادیا کہ: "اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی" مگر ممکن ہے کہ اسماع کی نفی ہو، یعنی جو سننے کے اسباب و آلات ہیں، وہ مرنے سے معطّل ہیں۔ لہٰذا آپ نہیں سنا سکتے۔

ہاں! البتہ عالم برزخ کے حالات دُوسرے ہیں، وہ اس باعث سے نہیں سن سکتے ہیں، جیسے فرمایا: "اِنَّ اللہَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ" (فاطر:۲۲) اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو سنا دے۔ پس ظاہر حس میں معطّل ہونا اس کے منافی نہیں کہ عالمِ غیب میں اس کے مناسب حالات، واردات، کیفیات، تجلیات، قرائتِ قرآن، صلوٰۃ، عبادات اور اذان وغیرہ سے متلذّذ ہوں، یا دُنیا میں عبادت سے تعطّل اور محروم ہونے کی وجہ سے وہاں قبر میں بھی خائب و خاسر ہوں۔ لہٰذا اس کے لئے شرح الصدور للسیوطی رحمہ اللہ کی طرف رُجوع کرنا بہتر ہے اور اہلِ کشف کے نزدیک اس کے علاوہ دُوسری نعمتیں بھی ثابت ہیں۔ لہٰذا ہم اس کا انکار نہیں کرسکتے جب تک کہ شریعت صراحتاً اس کا انکار نہ کرے۔ (ملخص مانی فیض الباری علیٰ صحیح البخاری ج ۲ ص ۴۶)

اسی کتاب کے اسی صفحے پر ہے کہ: جو شخص رات کو عبادت سے اور دن کو روزہ سے زندہ اور آباد رکھتا ہے، قبر میں اس کی آنکھیں عبادت سے ٹھنڈی کی جائیں گی اور معطّل و بےکار نہ چھوڑا جائے گا۔ پس بعض وہ ہوں گے جو قبر میں آرام کی نیند سوئیں گے، یہاں تک کہ جب صور پھونکا جائے گا تو آنکھیں مل کر اُٹھیں گے اور کہیں گے: "مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا" اور بعض وہ ہوں گے کہ صبح و شام آگ پر پیش کئے جائیں گے۔ معاذ اللہ!

"فتح الملھم شرح صحیح مسلم" (ج ۳ ص ۴۱۹) میں ہے کہ: "ان النبی ﷺ حیّ کما تقرر وانہ یصلی فی قبرہ بأذان و اقامۃ وان أعمالہ مضاعفۃ فیہ أکثر من مضاعفۃ عمل کل أحد"

(ترجمہ) ''حضور ﷺ زندہ ہیں، اور آپ ﷺ قبر میں اذان و اقامت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور آپ ﷺ کے اعمال ہر ایک کے عمل سے مضاعف در مضاعف ہیں۔''

امام سیوطی رحمہ اللہ نے حدیثِ رُوح کے پندرہ جواب دیئے ہیں۔ ان کا خلاصہ وہ ہے جس کو شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے (مکاتیب ج ۱ ص ۲۵۱) میں بیان فرمایا ہے کہ: ''یہ روایت دوامِ حیات پر دلالت کرتی ہے، اس لئے کہ دن رات میں کوئی گھڑی اور کوئی گھنٹہ، بلکہ کوئی منٹ اس سے خالی نہیں رہتا کہ آپ ﷺ پر اندرونِ نماز اور بیرونِ نماز دُرود نہ بھیجا جاتا ہو، اس لئے دوامِ حیات لازم آئے گا۔''

(مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱، ص ۲۵۱ مدنی کتب خانہ گوجرانوالہ)

اور یہ جواب بھی فرمایا کہ: اگر لفظ (''اِلَّا رَدَّ اللہُ عَلَیَّ رُوْحِیْ'' کے بجائے) ''اِلَیَّ رُوْحِیْ'' فرمایا گیا ہوتا تو شبہ وارِد ہوسکتا تھا، اس لئے کہ ''اِلَیَّ'' اور ''عَلَیَّ'' میں فرق ہے، ''علیٰ'' استعلاء کے لئے اور ''الیٰ'' نہایت غایت کے لئے ہے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ و سلام سے پہلے رُوح کا استعلاء نہ تھا، نہ یہ کہ وہ جسمِ اطہر سے بالکل خارج ہوگئی تھی اور اب اس کو جسمِ مقدس کی طرف لوٹایا گیا ہو۔

چونکہ آنحضرت ﷺ مدارجِ قرب و معرفت میں ہر وقت ترقی پذیر ہیں، اس لئے توجہ الی اللہ کا انہماک اور استغراق دُوسری جانب کی توجہ کو کمزور کردیتا ہے۔ چنانچہ اہلِ استغراق کی حالتیں روزانہ مشاہدہ ہوتی ہیں، مگر جب حضور رسول اللہ ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنایا گیا ہے۔ اس لئے بارگاہِ اُلوہیت سے دُرود بھیجنے والے پر رحمتیں نازل فرمانے کے لئے متعدّد مزایا میں ایک مزیت یہ بھی عطاء فرمائی گئی کہ خود سرورِ کائنات علیہ السلام کو اس استغراق سے منقطع کرکے دُرود والے کی طرف متوجہ کردیا جاتا ہے، اور آپ (ﷺ) اس کے لئے دُعا فرماتے ہیں۔''

(مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱، ص ۲۵۱ مدنی کتب خانہ گوجرانوالہ)

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''رُوح پُرفتوح نبوی ﷺ جب منبع اور اصل ارواحِ باقیہ، خصوصاً ارواحِ مؤمنینِ اُمت ٹھہری، تو جونسا اُمتی آپ پر سلام عرض کرے گا، اس کی طرف کا شعبہ لوٹے گا، ارتدادِ (لوٹنا) جملہ شعب لازم نہیں اور ظاہر ہے کہ اس شعبہ کا ارتداد (لوٹنا) باعث اطلاع سلام معلوم تو ہوگا، پر موجب زوالِ استغراق مطلق نہ ہوگا، آخر شعب غیر متناہیہ اور ہیں۔'' (آبِ حیات ص ۱۷۵، ۱۷۶، مطبوعہ: مطبع قدیمی دہلی)

یعنی جب آپ ﷺ منبع اور اصل، اَرواحِ باقیہ، خصوصاً اَرواحِ مؤمنینِ اُمت ہیں، تو جونسا اُمتی آپ ﷺ پر سلام کرے گا، اس کی طرف کا شعبہ از شعبہائے لوٹے گا اور تمام شعبوں کا لوٹنا لازم نہیں اور ظاہر ہے کہ اس شعبے کا لوٹنا باعث اطلاعِ سلام تو ہوجائے گا، مگر موجبِ زوالِ استغراق نہ ہوگا، آخر شعب کثیر اور بھی ہیں اور غیر متناہی ہیں۔

اس تقریر سے وہ اعتراض کہ جب تمام اقطارِ ارض سے سلام بھیجے جاتے ہیں اور کوئی ساعت بھی خالی نہیں رہتی، تو پھر حضرتِ الٰہی تعالیٰ کے شہود کے لئے کب فراغت ہوگی؟ خود بخود دفع ہوگیا، اس لئے کہ تمام شعبوں کو تو دُرود بھیجنے والے کی طرف نہیں لوٹایا جاتا، اس میں سے کوئی ایک شعبہ ہوتا ہے جس کو متوجہ کیا جاتا ہے، اس سے استغراق میں کمی نہیں آتی۔

نیز آخرت کے معاملات عقل سے مدرک نہیں ہوتے، اور احوالِ برزخ، احوالِ آخرت کے مشابہ ہیں، ان کو دُنیا کے معاملات پر قیاس کرنا غلط بات ہے۔ (القول البدیع للسخاوی ص ۱۲۷)

حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی ﷫ فرماتے ہیں کہ: بیہقی کی ایک روایت میں ہے: ''اِلَّا وَقَدْرَدَّ اللّٰہُ اِلَیَّ رُوْحِیْ '' (حیاۃ الانبیاء امام بیہقی ص ۹۹، مطبوعہ مکتبۃ العلوم والحکم مدینہ منورہ)

اب کوئی اِشکال نہیں رہتا، اس لئے کہ اس کا معنی یہ ہوگا کہ جو کوئی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اس پر سلام کا جواب دیتا ہوں، اس لئے کہ رُوح تو میری طرف پہلے سے واپس ہو چکی ہے۔

اس قدر اہلِ بصیرت کو کافی وشافی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم!

فصل رابع

علمائے نجد کا اعتقاد

کتاب ''الهدیة السنیة والتحفة الوهابیة النجدیة'' (مطبوعہ مصر) میں ہے کہ: ''ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کا رُتبہ تمام مخلوق کے مراتب سے اعلیٰ ہے، وہ اپنی قبر میں حیاتِ برزخیہ سے زندہ ہیں، ان کی حیات، حیاتِ شہداء سے...... جو کہ قرآن مجید میں مصرّح ومنصوص ہے...... افضل واکمل ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ شہداء سے بلا شک وشبہ افضل ہیں، اور سلام کہنے والے کا سلام سنتے ہیں۔''

اور شہداء کی حیات ''یُرْزَقُوْنَ'' اور ''فَرِحِیْنَ'' کے قرینے سے برزخی وجسمانی حیات ہے، جیسا کہ اس سے پہلے گزرا، اور پیغمبر تو اس سے بدرجہا بالاتر ہیں۔

کتبِ فقہ سے حوالہ جات

''نور الایضاح'' جو فقہ کی مستند، محقق اور معتبر کتاب ہے اور علامہ شرنبلالی ﷫ کی تصنیف ہے، علامہ موصوف ﷫ اپنی اسی کتاب کے باب زیارۃ المدینہ میں تحریر فرماتے ہیں: ''ومما هو مقرر عند المحققين انه ﷺ حیّ یرزق متمتع بجمیع الملاذ والعبادات غیر انه احجب عن ابصار القاصرين عن شريف المقامات'' (مراقی الفلاح شرح نور الایضاح ص ۴۰۵)

(ترجمہ) ''جیسا کہ محققین کے ہاں ثابت ہے کہ حضور ﷺ (اپنی قبر مبارک میں) زندہ ہیں، تمام عبادات وغیرہ سے نفع مند ہیں، مگر یہ کہ آپ ﷺ اعلیٰ مقامات پر پہنچنے کی وجہ سے ناقص وقاصروں کی آنکھوں سے اوجھل ہیں۔''

اسی طرح ''فتح القدیر'' (ج ۲ ص ۳۳۷ مطبوعہ مصطفیٰ محمد مصر) مقصد ثالث زیارت قبر نبی اکرم ﷺ کے مطالعہ سے صاف واضح ہے کہ حضرت ابن الهمام الحنفی (المتوفی ۸۶۱ھ) حضور اکرم ﷺ کی حیات بابرکات حسی، جسمانی، برزخی کے قائل ہیں، اس لئے کہ آپ فرماتے ہیں کہ: ''...... محاذیا لرأس النبی ﷺ ووجهه الکرام ملاحظا نظره السعید الیک'' (مراقی الفلاح شرح نور الایضاح ص ۴۰۶)

(ترجمہ) ''زیارت کرنے والا پائے مبارک کی جانب سے آئے تا کہ زیارت کرنے والا حضور پُرنور ﷺ کے منہ مبارک کی آنکھ سے آئے۔''

فصل خامس

کتب تصوف سے حوالہ جات

کتاب ''الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر'' للامام العارف الربانی سیدی عبدالوہاب الشعرانی رحمۃ اللہ علیہ (ج۱ ص۱۳۲) میں ہے: ''ان الأنبیاء علیہم الصلٰوۃ والسلام لا تبلی اجسادھم ولا تتغیر صورھم وھم فی قبورھم یصلون کما جائت بہ الأحادیث''

(ترجمہ) ''بے شک انبیاء علیہم السلام کے جسم قبر میں بوسیدہ نہیں ہوتے، ان کی صورتیں متغیر نہیں ہوتیں اور وہ اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں، جیسا کہ احادیث میں آگیا ہے۔''

اور اسی کتاب کی ج۱، ص۱۳۳ میں ہے: ''(فان قلت) فھل یصدق من ادعی رؤیۃ النبی ﷺ فی الیقظۃ الآن (فالجواب) نعم یصدق''

(ترجمہ) ''پس اگر تو کہے کہ جو شخص بیداری کی حالت میں آنحضرت ﷺ کی رُؤیت کا دعویٰ کرے، کیا اس کی تصدیق کی جائے گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ: جی ہاں! اس کے دعوے کی تصدیق کی جائے گی۔''

چونکہ انبیاء علیہم السلام کی بیداری میں رُؤیت ہوسکتی ہے، اسی میں امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب ''تنویر الحلک فی رُؤیۃ النبی والملک'' تصنیف فرمائی ہے اور اس میں صحابہ کرام، اولیاء اور علماء سے بہت نقول ارشاد کی ہیں جس میں کہ نبی کریم اور ملائکہ کے ساتھ بیداری میں مجتمع ہونا بیان کیا ہے۔

اب بندہ گناہگار خود کتاب ''تنویر الحوالک فی رُؤیۃ النبی والملک'' سے چند چیزیں پیش کرتا ہے، اس کتاب کے ص۱۱ میں ہے: ''امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ اربابِ قلوب اپنی بیداری میں ملائکہ اور ارواحِ انبیاء علیہم السلام کو دیکھتے ہیں اور ان کی آواز سنتے ہیں اور ان سے فائدے حاصل کرتے ہیں۔ پھر اس حال سے بھی جو کہ مشاہدہ صورتوں اور امثال کا ہے، ترقی کرجاتا ہے، جس کا بیان مشکل ہے۔''

امام ابنِ ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں اور حافظ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حلیہ میں حضرت ربعی بن حراش رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ: ''کنا اربع اخوۃ، وکان الربیع اخونا اکثرنا صلٰوۃ واکثرنا صیامًا فی الھواجر، وانہ توفی فبینا نحو حولہ، وقد بعثنا من یبتاع لنا کفنا، اذ کشف الثوب عن وجھہ فقال: السلام علیکم، فقال القوم: وعلیکم السلام یا اخا بنی عبس، أبعد الموت؟ قال: نعم! انی لقیت ربی عز وجل بعدکم فلقیت ربًا غیر غضبان واستقبلنی بروح وریحان واستبرق، الا وان أبا القاسم ﷺ ینتظر الصلٰوۃ علی فعجلونی ولا تؤخرونی... فنمی الحدیث الی عائشۃ رضی اللہ عنہا فقالت: اما انی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: یتکلم رجل من امتی بعد الموت... ھذا حدیث مشھور...'' (حلیۃ الاولیاء ج۴، ص۳۶۷، ۳۶۸)

(ترجمہ) ''ہم چار بھائی تھے اور ہمارا بھائی ربیع بہت نماز پڑھتا اور روزہ رکھتا تھا، وہ فوت ہوگیا، ہم اس کے اردگرد بیٹھے ہیں اور وہ کپڑے سے ڈھانپا ہوا ہے، ناگہاں اس نے اپنے منہ سے کپڑا اُتارا اور کہا: السلام علیکم! ہم نے کہا: وعلیکم السلام! کیا بعد موت کے؟ کہا: ہاں! اپنے رَبّ کو ملا تمہارے بعد، پس پایا میں نے رُوح وریحان اور رَبّ کو مہربان، اور پہنائے مجھ کو کپڑے سبز ریشم کے پتلے اور گاڑھے (اور پایا میں نے معاملے کو آسان اس سے

جو تم گمان کرتے تھے اور اس پر سہارا نہ کرو، اور میں نے اللہ تعالیٰ سے اجازت مانگی تا کہ تم کو خوشخبری دوں)، مجھے جلدی رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جاؤ، وہ انتظار کرتے ہیں نماز کی مجھ پر...... الخ!

یہ بات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تک پہنچی، انہوں نے کہا کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا، آپ نے فرمایا: میری اُمت سے ایک جوان مرنے کے بعد بات کرے گا...... ابونعیم رحمہ اللہ نے کہا کہ: یہ حدیث مشہور ہے۔"

اور امام بیہقی رحمہ اللہ دلائل میں اس حدیث کو لائے، اور کہا کہ: اس کی صحت میں کوئی شک نہیں۔

(دلائل النبوۃ ج ۶، ص ۴۵۴)

اسی طرح اس کتاب کے ص ۲۳ میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ میں سے موت کے بعد کلام کرنے والے کثیر ہیں، جو شمار میں نہیں آسکتے۔

عوارف المعارف میں شیخ سہروردی رحمہ اللہ، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ سے حکایت کرتے ہیں کہ: "وہ فرماتے تھے کہ میں نے کوئی نکاح اس وقت تک نہیں کیا جب تک کہ مجھے حضورِ اکرم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ: شادی کرلے!"

اور ص ۲۶ میں شیخ خلیفہ بن موسیٰ النہرملکی کے متعلق کہا کہ: "حضورِ اکرم ﷺ کے بہت سے دیکھنے والے ایسے تھے، جو جاگتے اور نیند میں بھی، آپ کی زیارت کرتے تھے اور اکثر اُمور آپ ﷺ سے حکم پا کر کرتے، تا آں کہ ایک رات میں ان کو سترہ بار زیارت ہوئی۔"

اور (ص ۴۳، ۸۴) میں لکھا ہے کہ: "حاصل مجموعہ نقول اور احادیث کا یہ ہے کہ حضور ﷺ اپنے جسمِ اطہر اور رُوح کے ساتھ زندہ ہیں...... اسی صورت (مقدس) کے ساتھ جو وفات سے پہلے تھی، اس سے کچھ تبدل نہیں ہوا، ہاں آنکھوں سے غائب ہیں، جیسا کہ فرشتے غائب ہیں اور زندہ ہیں اپنے جسم کے ساتھ۔ پس جب اللہ تعالیٰ کسی کو زیارت کرانے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کو اس شکل و صورت میں دِکھا دیتے ہیں جیسے کہ پہلے تھے، اس سے کوئی مانع نہیں اور نہ اس کے کہنے کی ضرورت ہے کہ مثال میں دِکھاتے ہیں۔" (انتہیٰ ملخصاً)

فائدہ: مضمونِ سابق سے معلوم ہوگیا کہ فرشتگان اور انبیاء علیہم السلام بیداری میں نظر میں آسکتے ہیں، چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام، دحیہ کلبیؓ کی شکل میں اور جنگِ بدر و اُحد میں دُوسرے فرشتے بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نظر آئے، کما هو مصرح فی الأحادیث، اور پیغمبر علیہم السلام بھی نظر آسکتے ہیں، کما نقل کثیرًا فی تنویر الحوالک فانظر ثمه!

پس بعض کا یہ کہنا کہ ہم کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ میں سے کسی سے نہیں پہنچا کہ وفات کے بعد بیداری میں حضورِ اکرم ﷺ نظر آئے ہوں، غلط ہے۔ وہ لوگ حدیث: "مَنْ رَآنِيْ فِي الْمَنَامِ فَسَيَرَانِيْ فِي الْيَقْظَةِ" کی تأویل کرتے ہیں، اس کا جواب تنویر مذکور ص ۱۵ میں یہ دیا گیا ہے کہ بعد از وفات، بیداری میں حضور ﷺ کی زیارت کا انکار کرنے والا دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ کراماتِ اولیاء کی تصدیق کرتا ہوگا یا انکار کرتا ہوگا، جو کراماتِ اولیاء کی تصدیق نہیں کرتا، اس کے ساتھ ہماری بحث نہیں۔ کیونکہ وہ شخص سنت اور دلائلِ واضحہ سے ثابت شدہ اُمور کا منکر ہے۔ البتہ جو شخص اس کی تصدیق کرتا ہے، اس پر مخفی نہیں کہ یہ بھی خرقِ عادت ہے اور اولیاء اللہ کو خرقِ عادت سے عالمِ علوی و سفلی کی چیزیں منکشف ہوجاتی ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ: "...... وقد کان یسلم علی حتی اکتویت فترکت ثم ترکت الکی فعاد" (صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۰۲)

حضرت عمران بن حصین صحابی رضی اللہ عنہ کو فرشتے سلام کرتے تھے اور وہ سنتے تھے، جب داغ دے دیا تو سلام ہونا بند ہو گیا۔ پھر داغ دینا چھوڑ دیا تو پھر سلام سننے لگے۔

"ومعنى الحديث: ان عمران بن الحصين رضی اللہ عنہ كانت به بواسير فكان يصبر على ألمها وكانت الملائكة تسلم عليه فاكتوى فانقطع سلامهم عليه ثم ترك الكي فعاد سلامهم عليه"

(ترجمہ) "اور حدیث کا معنی یہ ہے کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو بواسیر کا مرض تھا، وہ بواسیر کی تکلیف پر صبر کرتے تھے تو ملائکہ ان کو سلام کیا کرتے تھے، جب انہوں نے بواسیر کی تکلیف کے ازالے کے لئے داغ لگوایا تو ملائکہ کا سلام کرنا بند ہو گیا، انہوں نے داغ لگوانا چھوڑ دیا تو دوبارہ ملائکہ کا سلام شروع ہو گیا۔"

جاننا چاہئے کہ قبر کے اَحوال اُمورِ آخرت سے ہیں۔ پس ضروری ہے کہ دُنیا والوں سے وہ کامل ولی شخص اس کو پا سکتا ہے جس کو آخرت کے اَحوال منکشف ہوتے ہوں۔

حضور ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے دیکھا، نماز جسم مع رُوح سے ہوتی ہے نہ کہ محض رُوح سے۔

اشکال: بعض کا یہ فرمانا کہ اللہ تعالیٰ ان کی رُوح کی وہی مثال دِکھاتا ہے جو دُنیا میں نماز اور حج کیا کرتے تھے، یعنی جاگتے میں دِکھا دیتا ہے، گویا کہ ان کا سابق زمانہ متمثل ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

جواب: جب حضور ﷺ نے معراج کی رات میں بیت المقدس میں تمام انبیاء علیہم السلام کو نماز پڑھائی (کذا فی المشکوٰۃ ص ۵۴۰) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام حضورِ انور ﷺ کو تخفیفِ نماز کے لئے واپس لوٹاتے رہے۔ کیا یہ بھی رُوح وجسم سابق ممثل تھا؟ نہیں، نہیں! بلکہ وہی جسمِ اطہر موسوی مع رُوح کے (علیہ السلام) موجود تھا اور نماز میں بھی تمام انبیاء علیہم السلام جسم مع رُوح کے مقتدی ہوئے تھے، نہ کہ محض ارواحِ انبیاء آئی تھیں اور جسم اطہر قبروں میں تھے۔

اشکال: اسی طرح بعض کا یہ فرمانا کہ قبروں میں بھی ہیں اور حج بھی کرتے ہیں، کیا قبر خالی رہتی ہے؟ کیا زیارت کرنے والا خالی قبر کی مٹی کو دیکھ کر آتا ہے اور ایک وقت میں قبروں میں بھی ہوں؟ آسمانوں پر بھی ہوں؟ اور اطرافِ زمین میں بھی ہوں؟ لہٰذا صالحین کی یہ حکایات مثالی ہیں یا من گھڑت ہیں، جیسا کہ توثیق حری الایمان اور بہجۃ النفوس وروض الریاحین وغیرہ میں ایسی چیزیں ہیں۔

جواب: "تنویر الحوالک" ص ۸۸ میں ہے کہ: بعض حضرات نے بعض علماء سے سوال کیا کہ: اطرافِ بعید میں ہزاروں دیکھنے والے ایک ہی وجودِ مسعود کو ہر جگہ نیند یا جاگتے میں کیسے دیکھتے ہیں؟ تو جواب میں یہ شعر پڑھا:

كالشمس في كبد السماء وضوئها تغشى البلاد مشارقًا ومغاربًا

یعنی جیسے سورج آسمان میں ہے اور اس کی روشنی مشرق ومغرب کو ڈھانپ لیتی ہے۔

نیز برزخ دارِ آخرت سے ہے اور دارِ آخرت کے اَحکام دُنیا کے اَحکام سے جدا ہیں، وہاں کی وسعت کا علم علیحدہ ہے۔ چنانچہ دُنیا کے اجسام غذا، پانی اور اس کے متعلقات کے بغیر باقی نہیں رہ سکتے، مگر آخرت اور آسمان سے اُوپر کے اجسام کا معاملہ جدا ہے۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر ہیں اور دُنیوی غذا سے پاک ہیں، ایسے ہی رُوح علیین وسجین میں ہوتی ہے اور اس کا تعلق قبر سے بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اُمورِ آخرت کو دُنیا کے معاملات وحالات پر

قیاس کر کے اعتراض کرنا دُرست نہیں۔ اس لئے کہ شہید کو حساً وعقلاً مردہ دیکھتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اس کو زندہ، رزق کھاتا پاکر خوش ہونے والا ہے اور یہ بھی فرماتا ہے کہ شہید کو مردہ گمان بھی نہ کرو اور فرماتا ہے: "بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ" یعنی مؤمنین کو خطاب ہے کہ تم اس کی زندگی کو حس اور مشاہدہ سے نہیں جان سکتے۔ پس اس سے شہید دُوسرے مردگان سے متمیّز ہوتا ہے۔

فائدہ: شہداء اور انبیاء علیہم السلام کی حیات میں یہ فرق ہے کہ شہید اَحکامِ آخرت میں زندہ ہے اور دُنیا کے اَحکام میں مردہ ہے، تاآنکہ اس کا مال تقسیم ہوتا ہے، اس کی بیوی عدّت بیٹھتی ہے اور عدّت کے بعد دُوسرا نکاح کرتی ہے۔ (کذا فی سراج الوہاج والنہایۃ) جب کہ انبیاء علیہم السلام کی حیات دُنیوی اَحکام میں بھی ہے۔ چنانچہ ان کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن پر عدت نہیں، وہ نکاح نہیں کرسکتیں، ان کا مال تقسیم نہیں ہوتا اور ان کی جنازے کی نماز دوسروں جیسی نہیں پڑھی جاتی۔ وغیر ذالک!

فائدہ: حدیث: "مَرَرْتُ لَیْلَۃَ اُسْرِیَ بِیْ بِمُوْسٰی وَھُوَ قَائِمٌ یُصَلِّیْ فِیْ قَبْرِہٖ" یعنی میں معراج کی رات موسیٰ علیہ السلام پر گزرا تو وہ اپنی قبر میں نماز پڑھتے تھے۔

اشکال: ابنِ حبان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ: یہ حدیث ضعیف ہے، جب کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: اس حدیث کے شواہد ہیں، لہٰذا حدیث حسن ہے، کذا ذکرا المناوی۔

جواب: اگر یہ حدیث ضعیف ہے یا حسن ہے، تو وہ حدیث جو صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں مروی ہے: "قال رسول اللہ ﷺ: لقد رأیتنی فی الحجر وقریش تسألنی عن مسرای فسألتنی عن أشیاء من بیت المقدس لم أثبتها فکربت کربۃ ما کربت مثلہ قط قال فرفعہ اللہ أنظر الیہ ما یسألونی عن شیء الا أنبأتھم بہ وقد رأیتنی فی جماعۃ من الأنبیاء فاذا موسیٰ علیہ السلام قائم یصلی واذا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام قائم یصلی... واذا ابراھیم علیہ السلام قائم یصلی... فحانت الصلوٰۃ فأممتھم..." (صحیح مسلم ج۱ ص۹۶)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قریش معراج کے بعد بیت المقدس کے حالات اور چیزیں پوچھنے لگے، مگر وہ یاد نہ تھیں، تو سخت غم میں پڑا، اس پر اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو مجھ پر ظاہر کردیا۔ لہٰذا جو پوچھتے جاتے تھے، بتلاتا رہا اور میں نے اپنے آپ کو جماعتِ انبیاء علیہم السلام میں دیکھا، موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہے تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہے تھے اور ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہے تھے، پھر نماز کا وقت آگیا اور میں نے سب کی امامت کی۔ پس یہ حدیث تو ضعیف نہیں بلکہ صحیح ہے۔

اشکال: بعض علمائے کرام کو یہ وسوسہ ہوا ہے کہ فردِ واحد میں بیک وقت سب اُمور کا اجتماع انسانی حالت سے بعید ہے کہ ایک وقت میں بیت المقدس میں بھی ہوں، پھر آسمان میں بھی حضورِ اکرم ﷺ کو ملیں، قبر میں بھی ہوں اور علیین میں بھی رہیں، جہاں امر ہو چلے جائیں اور روضۂ مبارک میں بھی ہوں؟

جواب: اس کا جواب گزر چکا ہے کہ بزرخ کو، رُوح کو، پھر رُوحِ مبارک کو بہت وسعت ہوتی ہے، اس میں تزاحم کا وسوسہ کرنا غلط ہے۔

اشکال: جب رُوح کو اتنی وسعت ہے تو پھر دُور سے کسی حاجت روائی اور مشکل کشائی میں اُسے پکارنا اور اس سے مدد مانگنا جائز ہوگا؟

جواب: یاد رکھنا چاہئے کہ جواُمور دلیلِ صحیح سے ثابت نہیں، منفی ہیں یا مسکوت علیہا ہیں، ان کو ثابت ماننا یا جو چیز کہ کبھی کبھی ثابت ہے، ہر وقت نہیں۔ اس کو ثابت بالدوام ماننا جائز نہ ہوگا۔ دُور سے کسی زندہ بزرگ کو یا قبر والے بزرگ کو حاجت روائی کے لئے یا مشکل کشائی کے لئے پکارنا شرعاً ثابت نہیں۔ ''رُوح المعانی'' نے آیت: ''وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ'' کی تفسیر میں اس کو منع فرمایا ہے۔ کیونکہ اگر پکارنا دُرست تھا تو واقعہ کربلا وغیرہ میں کیوں نہ پکارا گیا؟ تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ حضور ﷺ کی جسمانی و رُوحانی حیات کا اعتقاد رکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ غیر ثابت شدہ چیز کو قیاساً ثابت کیا جائے۔

یاد رکھنا چاہئے! کہ اس جگہ دو چیزیں ہیں، ایک حضورِ اکرم ﷺ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی وفات حسرت آیات کے بعد کی زندگانی جسمانی و رُوحانی کا بطورِ کامل اکمل اعتقاد رکھنا یا بقول فریقِ ثانی زندگی رُوحانی کامل تر کا یقین کرنا، فریقِ ثانی اپنے دعویٰ پر دلائل دیتا ہے اور مدعا کو ثابت کرتا ہے۔ جب کہ بندہ نے قولِ اوّل یعنی بعد وفات، حیاتِ جسمانی رُوحانی کو حتی الوسع ثابت کیا ہے:

''گر قبول افتد زہے عزّو شرف!''

دوم اینکہ حیاتِ جسمانی و رُوحانی ماننے کے بعد ہم لوگ ان کو دُور سے پکاریں اور نفع و نقصان فوق الاسباب کا مالک مختار سمجھیں اور مدینہ منوّرہ حاضر ہوکر وہ چیزیں جو حضورِ اکرم ﷺ کی شریعت میں ممنوع ہیں یا شریعت سے منقول نہیں، نہ اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم سے صحیح طور مروی ہیں، نہ کسی قوی دلیل سے ثابت ہیں، نہ ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ نے استنباطاً جائز رکھی ہیں۔ ہم ان کو جسمانی رُوحانی حیات کے اعتقاد پر قیاساً و اجتہاداً ثابت کریں اور چودھویں صدی کے مجتہد و بزرگ بن کر معاملہ کریں اور فتویٰ دیں، یہ ہرگز ہرگز جائز نہیں! ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے بجائے، اللہ تعالیٰ کے غضب میں آجائیں اور حضور ﷺ کے غضب میں آجائیں۔ نعوذ باللہ من غضبہٖ و غضب رسولہٖ!

حضرت خواجہ غلام فرید صاحب رحمہ اللہ جب مدینہ منوّرہ حاضر ہوئے، جوشِ محبت میں آکر بوسہ دینے کے ارادے سے کسی قدر جھک کر پھر سیدھے کھڑے ہوئے۔ کسی نے عرض کیا: ایسا کیوں کیا؟ تو فرمایا: ہم آئے ہیں راضی کرنے کے لئے، ایسا نہ ہو کہ شریعت کے خلاف کرکے آپ ﷺ کو ناراض کردیں!

(کذا فی ملفوظ خواجہ صاحب رحمہ اللہ حصہ چہارم)

خلافِ شریعت کسے راہ گزید — کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

(ترجمہ) ''جس شخص نے شریعت کے خلاف راستہ اختیار کیا وہ ہرگز منزل پر نہیں پہنچے گا۔''

تنبیہ: ہمارے اکابر و اسلاف دیوبند، ہمارے مرشدینِ نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ رحمہم اللہ کا بھی یہی اعتقاد ہے کہ حضور ﷺ دُنیاوی وفات کے بعد قبرِ مبارک میں جسمانی رُوحانی حیات سے زندہ ہیں، جو اس زندگی سے بھی افضل و اکمل ہے جو دُنیا میں تھی۔ اس کے دلائل پیشِ خدمت کئے، بعض دلائل تمام طور پر مصرّح ہیں اور بعض دلائل رُوحانی حیات کے زیادہ مؤید ہیں، چونکہ ہمارے متقدمین و متاخرین کا مسلک ہر دو رُوحانی و جسمانی

حیات کا ہے، اس لئے وہ دلائل ہمارے خلاف نہیں، کیونکہ رُوحانی حیاتِ مبارک کے ہم بھی قائل ہیں، فافهم و لا تکن من القاصرین!

غرض ابتداء میں بھی یہی عرض کیا گیا ہے کہ یہ رسالہ اپنے احباب کی فہمائش کے لئے مختصر طور پر لکھا گیا ہے، کسی کی تردید، تشنیع یا تعریض کے لئے نہیں، اگر کسی کی فکر اس کے موافق نہیں ہے تو وہ اپنا مافی الضمیر اپنے احباب کے لئے شائع کردے۔

اخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین، والصلٰوۃ والسلام علٰی خیر خلقه محمد و اٰلہٖ و اصحابه و اتباعه اجمعین، من الصلٰوۃ والسلام افضلهما و اکملهما، سبحانک اللّٰهم و بحمدک اشهد ان لا اِلٰه الّا انت استغفرک و اتوب الیک، اللّٰهم تقبل منا انک انت السمیع العلیم!

۵/جمادی الثانیہ ۱۳۷۷ھ بمطابق ۲۸/دسمبر ۱۹۵۷ء

تصدیقات

حضرت مولانا خیر محمد جالندھری کی تصدیق

باسمہٖ سبحانہٗ و تعالٰی

حامدًا و مصلیًا، امابعد!

عالمِ برزخ میں جملہ انبیاء علیہم السلام کی حیات حقیقیہ دُنیویہ بجسد ہم العنصری کا مسئلہ اہلِ سنت والجماعت میں متفق علیہ مسئلہ ہے۔

۱...... حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حیات متفق علیہ است ہیچ کس رواداری خلافے نیست، حیاتِ جسمانی دُنیاوی حقیقی نہ حیاتِ معنوی رُوحانی۔ (اشعۃ اللمعات ج۱ص ۶۱۲)

۲...... نواب قطب الدین دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ مسئلہ متفق علیہ ہے، کسی کو اس میں خلاف نہیں کہ حیات ان کو وہاں حقیقی جسمانی دُنیا کی سی ہے، نہ حیاتِ معنوی رُوحانی، جیسا کہ شہداء کو ہے۔ (مظاہرِ حق ج۱ص ۴۴۵)

۳...... حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند جملہ اکابرِ دارالعلوم کا مسلک تحریر فرماتے ہیں: ''مسئلہ زیرِ بحث حیات النبی میں جہاں تک اپنے بزرگوں کی کتابوں، فتاوٰی، مقالات اور متوارث ذوق کا تعلق ہے، دیوبندیت تو یہی ہے کہ برزخ میں آنحضرت ﷺ کو حیاتِ دُنیوی کے ساتھ زندہ مانا جائے۔'' (منقول از رسالہ الصدیق ج۸، ص۵، ش۳ بابت ماہ مارچ ۱۹۵۷ء، ربیع الاوّل ۱۳۷۷ھ)

۴...... عالم ربانی حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب دام فیوضہم نے مسئلہ حیات النبی ﷺ میں رسالہ ''القول النقی'' تحریر فرما کر اہلِ سنت والجماعت پر احسان فرمایا۔ حق تعالٰی ان کو جزائے خیر عطاء فرمائے اور رسالے کو نافع اور مشعلِ صراطِ مستقیم بنائے، آمین!

احقر خیر محمد عفا اللہ عنہ
مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان

۱۵/جمادی الاخریٰ ۱۳۷۷ھ بمطابق ۷/جنوری ۱۹۵۸ء

***

حضرت مولانا مفتی محمود کی تقریظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً، امابعد!

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام پر موت کا طاری ہونا قطعی ہے، کسی کا اس میں اختلاف نہیں، "اِنَّکَ مَیِّتٌ وَاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ" الآیۃ اور قولِ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ: "قَدْ مَاتَ" اس کے شاہدِ صدق ہیں، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی موت سے حیات زائل ہو جاتی ہے یا صرف مستور ہو جاتی ہے۔ یعنی موت بمعنی رافع الحیاۃ ہے یا بمعنی ساتر الحیاۃ؟ بانیٔ دار العلوم دیوبند حضرت نانوتوی قدس سرہ العزیز نے اپنے رسالے "آبِ حیات" میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی موت سے صرف حیات مستور ہوئی ہے، زائل نہیں ہوئی۔ آپ ﷺ کی موت کو عامۃ المؤمنین کی موت سے ممتاز قرار دے کر وضاحت سے لکھا ہے، رسول اللہ ﷺ کی حیات دُنیوی علی الاتصال اب تک برابر مستمر ہے، اس میں انقطاع یا تبدل، تغیر جیسے حیاتِ دُنیوی کا حیاتِ برزخی ہو جانا واقع نہیں ہوا۔ انتہیٰ! لیکن اکثر محققین کے اقوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پر موت بمعنی رفع الحیاۃ طاری ہوئی۔ بہر حال حقیقت موت جو بھی ہو، علیٰ اختلاف القولین یہ اَمر مُسلّم ہے کہ آپ ﷺ پر موت طاری ہوئی، لیکن ساتھ ساتھ یہ اَمر بھی علمائے اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک مُسلّم اور مجمع علیہ ہے کہ بحالت موجود یعنی عالمِ برزخ میں آپ ﷺ جسمانی حیات سے زندہ ہیں، آپ ﷺ کی رُوحِ مبارک کا تعلق آپ ﷺ کے جسدِ عنصری کے ساتھ ایسا قائم کر دیا گیا ہے کہ اس دُنیاوی جسدِ اطہر کے ساتھ (جسے اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے) تمام افعال وحرکات مثل سمع، بصر و بطش و مشی و کلام وغیرہا پر قادر ہیں۔ یہ عقیدہ کہ آپ ﷺ کا جسدِ اطہر ساکن و صامت قبرِ مبارک میں صحیح وسلامت موجود ہے اور اس سے افعال وحرکات کا صدور نہیں ہوتا، عقیدۂ فاسدہ ہے اور تمام علمائے اہلِ سنت والجماعت کے عقیدے اور علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہے۔ حضرت العلامۃ العارف باللہ مولانا محمد عبداللہ صاحب مدظلہ العالی نے یہ رسالہ لکھ کر اہلِ حق کے اقوال کو اس ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا ہے کہ منصفین، طالبینِ حق کے لئے کافی و وافی ہے۔ میں نے رسالے کا مطالعہ کیا ہے، مجھے اس کے مندرجات سے اتفاق ہے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر عطاء فرمائے اور رسالۂ ہذا کو قبول فرما کر عامۃ المؤمنین کے لئے ذریعۂ ہدایت اور حضرتِ موصوف کے لئے ذریعۂ ترقیٔ درجات گردانے!

احقر الافقر

ابوالفضل محمود عفا اللہ عنہ

خادم الافتاء والتدریس بقاسم العلوم ملتان

۲۱ر جمادی الثانی ۱۳۷۷ھ بمطابق ۱۳ر جنوری ۱۹۵۸ء

***

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ
بَلْ أَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (القرآن)

اَلْاَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّونَ (الحدیث)

عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پر حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا

ارشادِ گرامی

فرمودہ: پیر طریقت حضرت اقدس

مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ

پیر طریقت حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر صاحب مدظلہ العالی رائپوری کا

ارشادِ گرامی

مولوی عنایت اللہ صاحب بخاری کا یہ عقیدہ بالکل غلط ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک بغیر روح کے قبر مبارک میں ہے۔ (تسلق)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(حرفے چند)

قطب الارشاد حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ

پیدائش: ۱۸۷۳ء ...... وفات: ۱۶؍ اگست ۱۹۶۲ء

قطب الارشاد حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سید انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ قطب دوراں حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پور سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین اور خلیفہ مجاز تھے۔ آپ کو ''مرشد العلماء'' کہا جاتا تھا۔ آپ سے بیک وقت جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار اسلام کل ہند، کانگریس اور مسلم لیگ کے راہنمایان بیعت تھے۔ علماء اور سیاستدان، چوٹی کی قیادت مختلف الخیال ہونے کے باوجود آپ کے در فیض پر جمع نظر آتے تھے۔ عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے محاذ پر آپ تکوینی طور پر مامور تھے۔ پاکستان میں جب ''فتنہ انکار حیات النبی ﷺ'' نے سر اٹھایا تو اس فتنہ کے بانی سید عنایت اللہ گجراتی ۲۷؍ ستمبر ۱۹۵۸ء کو آپ کے قیام لاہور کے دوران ملنے کے لئے آئے۔ اس کی پوری روئیداد حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے خادم نذیر احمد صاحب نے چار صفحاتی پمفلٹ میں شائع کر دی۔ اس مجموعہ میں ہم اسے شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ (ناشر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''مولوی عنایت اللہ صاحب بخاری کا یہ عقیدہ بالکل غلط ہے کہ نبی کریم ﷺ کا بدن مبارک بغیر (تعلق) روح کے قبر مبارک میں ہے۔''

میرا عقیدہ وہی ہے جو ہمارے حضرات دیو بند کا ہے اور یہی صحیح مسلک ہے

مولوی غلام اللہ خان اور مولوی عنایت اللہ صاحبان نے آج کل جو مشغلہ اختیار کر رکھا ہے، اس سلسلہ میں مولوی عنایت اللہ شاہ صاحب ۲۷ ستمبر ۱۹۵۸ء کی شام کو حضرت اقدس رائے پوری مدظلہ کی خدمت میں کوٹھی نمبر ۱۴، ایمپرس روڈ لاہور مع اپنے چند ساتھیوں کے آئے اور آتے ہی حیات انبیاء کا مسئلہ چھیڑ دیا اور اکابر دیو بند کے مسلک کی تردید شروع کر دی۔ کچھ حوالہ جات پیش کرتے رہے۔ حاضرین میں سے بعض علماء نے ان کی تردید کی، مولوی عنایت اللہ صاحب نے فیض الباری کی عبارت پیش کی۔ مولانا محمد صاحب لائل پوری (فیصل آبادی) نے اور دیگر علماء نے ٹوکا کہ آپ خلط مبحث کرتے ہیں۔ فیض الباری کی عبارت کا مطلب تو یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں ارواح انبیاء علیہم السلام اعمال طیبات میں مشغول رہتی ہیں، بعینہٖ اسی شان سے قبر میں بھی اعمال طیبات میں مشغول رہتی ہیں۔ نہ دنیا میں تعطل ہوا، نہ قبور میں اور یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں روح مع الجسد کام کرتی رہی، قبر میں بھی روح مع الجسد کام کرتی ہے۔

نیز حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''یہ جو حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب کوئی سلام عرض کرتا ہے تو روح مبارک لوٹا دی جاتی ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ روح کا جو استغراق اللہ تعالیٰ کے دربار کی طرف تھا، سلام کے وقت اس کو ہٹا کر سلام کا جواب دینے کی طرف روح کو متوجہ فرما دیا جاتا ہے۔ روح دونوں حالتوں میں بدن میں موجود رہتی ہے۔''

مولوی عنایت اللہ صاحب اس کا جواب نہ دے سکے۔

پھر مولانا محمد صاحب نے فرمایا کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (فتاویٰ رشیدیہ ج اوّل ص ۹۲) میں فرماتے ہیں کہ: انبیاء کرام علیہم السلام کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں، اسی لئے فقہاء نے قبر شریف پر سلام عرض کرتے وقت شفاعت کا سوال کرنے کو لکھا ہے۔ اگر مولوی عنایت اللہ صاحب کی طرح یہ مان لیا جائے کہ بدن کا روح سے کوئی تعلق نہیں، روح آسمان پر ہے اور بدن قبر میں بغیر (تعلق) روح کے رکھا ہے تو سلام اور سوال شفاعت بے معنی ہے۔ حضرت شاہ صاحب انوار المحمود میں فرماتے ہیں کہ جمعہ کے روز درود بلا واسطہ پہنچتا ہے اور عام حالات میں ملائکہ پہنچاتے ہیں۔ نیز یہ کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''حیات انبیاء جسمانی ہے۔''

اس کا جواب بھی مولوی عنایت اللہ صاحب نہ دے سکے۔ ہاں! یہ ضرور ہوا کہ وہ شور مچاتے تھے، جس سے تنگ آ کر حضرت مولانا احمد علی صاحب (لاہوری) اور مولانا خدا بخش صاحب ملتانی مجلس سے اٹھ کر چلے گئے اور دیگر علماء آداب مجلس کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔

مولوی عنایت اللہ صاحب ادھر ادھر کی غیر متعلقہ عبارات پڑھتے جاتے تھے جن کا اصل مسئلہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مثلاً: خواب میں حضور ﷺ کو دیکھنا کہ حضور ﷺ کا بدن مبارک حقیقت میں خواب دیکھنے والے کے پاس نہیں آتا۔

اس کے متعلق حضرت رائپوری نے فرمایا یہ تو ٹھیک ہے مگر نبی کریم ﷺ روضہ اقدس میں زندہ ہیں۔ لیکن مولوی عنایت اللہ صاحب، حضرت کی آواز لوگوں کو سننے ہی نہیں دیتے تھے۔ اپنی خوب سناتے تھے، جب ان کو کہا گیا: ''انک میت، وانھم میتون''

یہ آیت مکی ہے، تو کیا آپ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی موت کفار کے برابر ہوئی؟ (معاذ اللہ) تو ان کو اقرار کرنا پڑا کہ بھلا ایک رسول برحق کی موت کفار کی طرح کیسے ہوسکتی ہے؟ پھر وہ جلدی اٹھ کر چلے گئے۔ حالانکہ نماز مغرب کا وقت بالکل قریب تھا۔

۲۸ر ستمبر ۱۹۵۸ء بعد نماز فجر حضرت اقدس نے مولانا محمد صاحب لائل پوری کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور فرمایا کہ: کل شام جو کچھ وہ حضرات فرما رہے تھے، ہمیں تو سمجھ آیا نہیں۔ اب وقت کافی ہے، آپ تفصیل سے ہمارے حضرات اکابر کا مسلک واضح فرمائیں تو مولانا موصوف نے اپنے اکابر حضرات مثلاً حضرت مولانا گنگوہی، حضرت مولانا نانوتوی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا مدنی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبند، حضرت نواب قطب الدین دہلوی (رحمہم اللہ) و دیگر اکابر کی عبارات پڑھ کر مع تشریحات مجمع عام میں جو تقریباً دو سو سے زیادہ حضرات ہوں گے۔ حضرت اقدس کے سامنے عرض کیں۔

نیز حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ کی مرقات کی عبارات حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ و علامہ عبدالرؤف مناوی، شارح جامع صغیر سیوطی رحمہ اللہ کی عبارات و نیز نبراس شرح، شرح عقائد، نیز علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اور احیاء العلوم امام غزالی رحمہ اللہ و شفاء السقام حضرت محدث تقی الدین سبکی رحمہ اللہ کی عبارات پیش کیں کہ یہ سب حضرات حیات انبیاء کرام علیہم السلام جسمانی مانتے ہیں اور احادیث عرض صلوٰۃ بھی پڑھ کر سنائیں۔ پھر یہ عرض کیا کہ یہ حضرات (مولوی عنایت اللہ صاحب اور ان کے ہم نوا حضرات) یہ کہتے ہیں کہ فقط جسد اطہر بلا (تعلق) روح روضہ اقدس میں موجود ہے۔ اس کو یہ حضرات حیات برزخی سے تعبیر کرتے ہیں اور روحانی اس معنی کو مانتے ہیں کہ روح زندہ ہے۔

حضرت اقدس مدظلہ بڑی توجہ سے سنتے رہے، پھر فرمایا: ''یہ تو بالکل غلط ہے، جو یہ حضرات کہتے ہیں۔ بلکہ روح مع البدن روضہ اقدس میں زندہ ہے، ایسے ہی دیگر انبیاء کرام علیہم السلام''

عرض کیا کہ: ''الانبیاء احیاء فی قبورھم'' کا مطلب ہمارے اکابر بزرگان دیوبند و دیگر محققین یہ لیتے ہیں کہ جس طرح دنیا میں اعمال طیبات سے کسی وقت تعطل نہیں ہوا، بالکل اسی طرح قبر میں بھی اعمال طیبہ سے انبیاء کرام علیہم السلام کو تعطل نہیں ہے، دائماً ترقی ہوتی رہتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں روح مع الجسد ہی اعمال طیبہ کرتی رہی، بالکل یہی شان ....

حضرت اقدس مدظلہ نے فرمایا: ''یہی صحیح مسلک ہے جو ہمارے حضرات دیوبند کا ہے۔''

یہ عرض کیا گیا کہ: ''یہ حضرات (توحیدی) روضہ اقدس پر حاضری اور وہاں طلب شفاعت اور صلوٰۃ وسلام کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔''

حضرت مدظلہ نے فرمایا: ''توبہ توبہ! یہ تو مجدی بھی نہیں کہتے۔ مجدیوں کو بھی ہم نے دیکھا ہے کہ وہ: الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ مواجہہ شریف پر حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں۔''

الحمدللہ! سب سامعین کی پوری پوری تشفی ہو گئی اور حضرت نے پھر فرمایا: ''عقیدہ وہی صحیح ہے جو اکابر دیوبند فرماتے ہیں۔''

اور فرمایا: بھائی! ''ہم تو اپنے بزرگوں کے تابع ہیں۔''

اس وقت مجلس میں بہت سے علماء مثلاً: حضرت مولانا عبدالوحید صاحب (ڈھڈیاں) خواہرزادہ، حضرت رائے پوری مدظلہ، حضرت مولانا محمد صاحب لائل پوری، مولانا محمد سعید صاحب سرگودھا، مولانا حافظ اللہ داد صاحب، مولانا محمد ابراہیم صاحب ملتانی (میاں چنوں)، ڈاکٹر محمد امیر صاحب اوکاڑہ، حاجی محمد اسماعیل صاحب لائل پوری، مولوی عزیز الرحمن صاحب لائل پوری، مولانا عبداللہ صاحب دھرم کوٹی، مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پور گجراں (چک نمبر ۱۱ چیچہ وطنی)، پیر جی عبداللطیف صاحب (چیچہ وطنی)، حافظ ولی محمد صاحب (ہڑپہ) و دیگر متعدد حضرات موجود تھے۔

شائع کردہ: احقر نذیر احمد خادم حضرت رائے پوری ۲۹ ستمبر ۱۹۵۸ء

***

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ
بَلْ أَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُونَ (القرآن)

اَلْاَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّونَ (الحديث)

(منتخب حصہ)

معارفِ شیخ رحمۃ اللہ علیہ

تالیف: قطب الاقطاب، شیخ الحدیث

حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

معارفِ شیخؒ

جلد اوّل

حضرتِ اقدس قطبُ الاقطاب شیخ الحدیث
مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے
عِلمی افادات ومعارف کا بیش قیمت اور
وقیع مجموعہ

ترتیب وتقدیم
سید مولانا محمد شاھد صاحب سہارنپوری مدظلہٗ

ناشر مکتبۃ الشیخؒ ۳۶۷/۳ بہادر آباد۔ کراچی ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(حرفے چند)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

پیدائش: فروری ۱۸۹۸ء ...... وفات: ۲۵؍ مئی ۱۹۸۲ء

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی حجۃ اللہ علی الارض کا مصداق تھے۔ تحریر، تدریس، تبلیغ کے ذریعہ آپ کے کل دنیا پر وہ احسانات ہیں، جس کے باعث اسلامیان ان کے زیر بار ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں جب پاکستان میں "انکار حیات النبی ﷺ" کے فتنہ نے یہاں طوفان قائم کر رکھا تھا، پاکستان سے حضرت شیخ الحدیث کو خط لکھا گیا اور آپ سے فتویٰ طلب کیا گیا۔ اس خط کے جواب میں حضرت شیخ الحدیث نے ایک خط تحریر کیا۔ مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری (پیدائش: ۲۱؍ جنوری ۱۹۵۱ء...... وفات: ۶؍ اکتوبر ۲۰۲۳ء) ناظم عمومی مظاہر العلوم سہارنپور نے "معارف شیخ" کے نام پر کتاب لکھی۔ اس کی ج ۱ ص ۱۳۱ تا ۱۴۰ پر حیات النبی ﷺ کے سلسلہ میں خط اور حضرت شیخ کا جواب شائع ہوا جو ہم اس مجموعہ میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ (ناشر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۳۷۸ھ (۱۹۵۸ء) میں پاکستان کے بعض اہل علم حضرات کے یہاں ''حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' جیسے دقیق اور علمی مسئلہ پر بحث ومباحثہ نے شدت اختیار کی۔ طرفین سے اس موضوع پر کتابیں لکھی گئیں۔ اشتہارات شائع ہوئے۔ حضرات اکابر کے مسلمہ عقائد بھی متاثر ہونے لگے تھے۔ غرض کہ ایک عجیب حالت اور کیفیت پیدا ہو چلی تھی۔ بعض دردمند حضرات نے اس صورت حال کی اطلاع حضرت نور اللہ مرقدہ (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ) کو دے کر اس مسئلہ پر متوازن جامع اور معتدل تحریر لکھنے کی درخواست کی۔

آئندہ صفحات میں پڑھی جانے والی تحریر اسی موقعہ پر جمادی الثانی ۱۳۷۸ھ (جنوری ۱۹۵۹ء) میں لکھی گئی۔

المحترم شیخنا شیخ الحدیث مولانا ادام اللہ برکاتکم علینا وعلیٰ سائر المسلمین الیٰ یوم القیامۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

یہ عریضہ بصورت استفتاء حاضر خدمت ہے، انی اری الفتن کوقع المطر کا ارشاد آج اپنی آنکھوں نے اہل حق طبقہ میں پورا ہوتے دیکھا۔ تاہم ابھی سوراخ کو سوئی کے ذریعہ بند کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ اس ریلے میں نہ معلوم کتنے افراد عقائد اہل حق سے محروم رہ جائیں گے۔ کل تک جو حضرات یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ در حقیقت حنفیت اور ہدایت کا منبع موجودہ دور میں بانی دارالعلوم دیوبند، الامام الکبیر مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ اور دیگر حضرت حجۃ اللہ فی الارض مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ، شیخ الہند رحمہ اللہ اول وشیخ الہند رحمہ اللہ ثانی[1] ہیں، وہی حضرات بدقسمتی سے ہمارے یہاں مغربی پاکستان میں مولانا قاسم صاحب کے عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن وسنت اور اجماع صحابہ اور اجماع امت کے خلاف ثابت کر رہے ہیں، ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ قرآن مجید کی یہ آیات علی الاعلان موت پر دلیل ہیں، مثلاً انک میت وانهم میتون، کل نفس ذائقة الموت۔

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اپنے خطبہ میں یہ فرمان ''ان محمدا قدمات'' اور اجماع صحابہ بوقت خطبہ اور حیات النبی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس موقعہ پر رجوع حالانکہ اس وقت بظاہر وفات ہو چکی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال یہ تھا کہ روح ابھی جسم اطہر میں ہے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اعلان کر دیا کہ روح پرواز ہو کر رفیق اعلیٰ میں پہنچ گئی اور حضرت عائشہ کا یہ ارشاد: خرجت نفسه ومالت یده۔

یہ مذکورہ آیات قرآنیہ اور روایات صحیحہ وصریحہ اور پھر ان کے ساتھ اجماع امت کے بعد دوسرا قول غیر معتبر ہے خواہ وہ کہنے والے تاج الدین سبکی ہوں یا ابن تیمیہ، ملا علی قاری ہوں یا ابن حجر وغیرہم (رحمہم اللہ)۔

اب اس مسئلہ میں جانبین سے پوری تیاری ہو رہی ہے، ایک جماعت یہ ثابت کر رہی ہے کہ حضرت نانوتوی سے لے کر المهند علی المفند[2] کے فتوی تک تمام کا عقیدہ نص قرآنی اور احادیث صحیحہ متفقہ اور اجماع صحابہ کے خلاف

---

[1] یعنی حضرت اقدس مولانا محمود حسن صاحب وحضرت اقدس مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہما۔

[2] اس کتاب کا مشہور نام التصدیقات لدفع التلبیسات ہے، یہ کتاب علمائے مدینہ منورہ کے ان ستائیس سوالات کے جوابات میں ہے، جس میں انہوں نے اکابر دیوبند کے مسلک اور عقائد وغیرہ کے متعلق حضرت اقدس سہارنپوری سے خط وکتابت کی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ (علمائے مظاہر علوم اور ان کی علمی وتصنیفی خدمات، جلد دوم ص ۷۱)

ہے۔ دوسری جماعت یہ ثابت کر رہی ہے کہ سلف سے لے کر خلف تک تمام امت کا اس پر اتفاق ہے کہ جسد اطہر میں روح کے ذریعہ حیات موجود ہے اور اپنی اپنی قبور میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام برزخی حیات، جسمانی عنصری رکھتے ہیں۔ گو دنیاوی ظاہری حیات ختم ہو چکی۔ ملا علی قاری، ابن حجر، علامہ عینی، قرطبی صاحب، روح المعانی (علامہ آلوسی)، علامہ سیوطی، تاج الدین سبکی اور الصارم المنکی، علامہ ابن تیمیہ، ابن قیم اور حضرات دیوبند (رحمہم اللہ) کا بھی یہی عقیدہ ہے۔

دونوں جماعتوں کے کچھ لوگ آپ کے فیصلہ کو قبول کرنے پر متفق ہیں۔ لہٰذا برائے مہربانی واضح طور پر صاف صاف الفاظ میں اس عقیدہ کی وضاحت فرمائیں اور بتلائیں کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا عقیدہ جو آبِ حیات[1] میں ہے قابل اقتدا اور صحیح ہے یا نہیں؟

اس کے علاوہ درج ذیل سوالات کے جوابات بھی مرحمت فرمائیں:

۱...... اجساد انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے مدافن میں جسم عنصری کی حیات برزخی ہے یا قطعاً کوئی حیات جسمانی عنصری برزخی نہیں ہے؟

۲...... روح کی وجہ سے برزخی حیات حاصل ہے یا بغیر تعلق روح حیات ہے؟

۳...... اسی قسم کی حیات ہے جیسا کہ ہر ذرہ کائنات میں ارادہ الٰہیہ موجود ہے۔ ان منها لما يهبط من خشية الله والی حیات ہے یا روح جسم عنصری میں ہے یا روح الرفیق الاعلیٰ میں ہے اور اس کا تعلق جسم عنصری پر پڑتا ہے، اسی وجہ سے حیاتی ہے؟

۴...... کیا علمائے دیوبند کا یہ عقیدہ صحیح اور قابل اقتداء ہے کہ اجسام عنصریہ میں حیات حقیقی برزخی دنیاوی کی سی نہیں بلکہ اس سے بھی قوی بواسطہ روح ہے اور انہی مدافن میں زندہ ہیں۔ نماز حج وغیرہ کرتے ہیں؟

۵...... روضہ مطہرہ پر خود رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم درود وسلام سنتے ہیں، (حالانکہ منکرین حیات اس کے بھی منکر ہیں)

۶...... حضرت گنگوہی رحمہ اللہ اور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے مسلک میں اس بارے میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

۷...... یہاں یہ مشہور ہے کہ حضرت عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ کا عقیدہ یہ ہے کہ جسد اطہر میں حیات نہیں بلکہ صرف روح کو حیات ہے اور وہ بھی الرفیق الاعلیٰ میں کیا یہ صحیح ہے؟

۸...... منکرین کہتے ہیں کہ روضہ مطہرہ کے قریب درود سننے کی روایت صحیح نہیں ہے، کیا ان لوگوں کا یہ کہنا صحیح ہے؟ مہربانی فرما کر رہنمائی فرمائیں! فقط

مکرم محترم فیوضکم، بعد سلام مسنون!

نہایت طویل گرامی نامہ پہنچا، آپ نے ایسے شخص کو مخاطب بنایا جو نہ مفتی ہے، نہ مولوی۔ اس ناکارہ کی حقیقت ایک نقل نویس کی سی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں جو اکابر اور اسلاف کے کلام میں ملتا ہے، اس کو ادھر ادھر نقل کرتا رہتا ہوں۔ اسی کا نام شرح مؤطا ہے، یہی تبلیغی رسائل کی حقیقت ہے۔

آپ نے تحریر فرمایا کہ دونوں طرف کے کچھ لوگ تیری تحریری کو قبول کرنے کو آمادہ ہیں، یہ موجب تعجب ہے۔ جن حضرات کو اس ناکارہ کے جملہ اکابر حضرت گنگوہی قدس سرہ سے لے کر حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کی

[1] آب حیات، حضرت اقدس مولانا محمد قاسم حسن نانوتوی رحمہ اللہ کی تالیف ہے جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے اثبات پر ہے۔ ۱۲۸۲ھ میں یہ تالیف ہوئی۔ اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نور اللہ مرقدہ نے اس کو ملاحظہ فرما کر دعاؤں سے نوازا۔ متعدد ایڈیشن اس کے اب تک شائع ہو چکے۔ ہمارے سامنے ۱۳۵۴ھ کا مطبوعہ نسخہ ہے جو مطبع قدیمی دہلی سے شائع ہوا تھا۔

تحریرات قابل قبول نہیں ہیں، وہ اس نا کارہ کی تحریر کو کیا قبول کر سکتے ہیں۔ بہر حال یہ نا کارہ ان اکابر کا بالکل متبع ہے، ان کے اس صاف ارشادات، اور تحریرات کے بعد جس پر حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ، حضرت رائے پوری رحمہ اللہ، حضرت تھانوی قدس اللہ اسرارہم نے بلا کسی اجمال کے ''هذا معتقدنا و معتقد مشائخنا'' لکھا ہے کیا کوئی گنجائش ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہا جا سکے۔

جو نصوص آپ نے ممات کے متعلق لکھی ہیں ان سے کوئی پڑھا لکھا انکار کر سکتا ہے؟ بالخصوص جن حضرات کی راتیں ہمیشہ تلاوت قرآن اور دن ساری عمر تدریس بخاری شریف وغیرہ کتب حدیث میں گزرے، ان کو کبھی بھی پتہ نہ چلا کہ قرآن پاک کی آیات میں کیا وارد ہوا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں کیا فرمایا۔ ان میں حضرت اقدس رائے پوری[1] قدس سرہ کے علاوہ کون سا ایسا ہے جس کی عمر کا معتد بہ حصہ تدریس حدیث میں نہیں گزرا؟

حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہ کے معارف وعلوم کے سننے والے ابھی تک دنیا میں بکثرت موجود ہیں۔ مگر ان میں سے کسی کو بھی نہ تو قرآن پاک کی کسی آیت کا پتہ چلا نہ حدیث کی کوئی ممات والی روایت ان کی نظر سے گزری۔

یہ نا کارہ اپنے ان اکابر کے متعلق وہی عقیدہ رکھتا ہے جو حضرت اقدس عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے اکابر یعنی صحابہ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ: ''فانهم علیٰ علم وقفوا ببصر ناقد كفوا ولهم علیٰ كشف الامور كانوا اقویٰ وبفضل ما كانوا فيه اولی، فما دونهم من مقصر وما فوقهم من محسر وقد قصر قوم دونهم فجفوا و طمع عنهم اقوام فغلوا وانهم بين ذلک لعلیٰ هدیٰ مستقيم''

حقیقت یہ ہے کہ اس دور فساد میں آدمی اس وقت تک محقق نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ سلف صالحین کے خلاف کوئی نئی ایجاد نہ کرے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی پیش گوئی ''ان من ورائكم فتنا يكثر فيها المال ويفتح فيها القرآن حتى ياخذه المؤمن و المنافق والرجل ولمراة والكبير والصغير والعبد والحر فيوشک قائل ان يقول ماللناس لايتبعوني وقد قرأت القرآن ماهم بمتبعي حتى ابتدع لهم غيره فاياكم وما ابتدع''

لہٰذا یہ نا کارہ تو ''حذو النعل بالنعل'' ان حضرات کا جامد متبع ہے اور اس نا کارہ کی تحریر میں کوئی لفظ ان کی تحقیق کے خلاف ہے تو وہ لغو، نا قابل التفات اور مردود ہے۔

ان سب کے بعد...... گرامی نامہ کے مستفسرات کے متعلق اپنا خیال یہ ہے کہ جیسے حیات کے درجات متفاوت ہیں جس کا اعتراف یہ حضرات خود بھی کرتے ہیں، جیسا کہ آپ نے لکھا، اسی طرح ممات کے بھی درجات مختلف ہیں۔ نوم پر بھی احادیث صحیحہ صریحہ میں موت کا اطلاق کیا گیا ہے، سونے اور جاگنے کی دعاؤں میں کثرت سے الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا وارد ہوا ہے، قرآن پاک میں اللہ یتوفی الانفس حین موتها، الایة میں نوم پر وفات کا اطلاق کیا گیا ہے۔ لاتقولوا لمن يقتل فی سبيل الله اموات میں موت کی نفی کی گئی ہے، وغیرہ وغیرہ!

لہٰذا...... جن نصوص میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر موت کا اطلاق کیا گیا ہے، ان میں سے کوئی سی بھی حضرت نانوتوی قدس سرہ یا اکابر علمائے دیوبند یا المہند کے خلاف نہیں ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں بھی وہی موت مراد ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شایان شان ہے، خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تفصیلی اقوال جو اس سلسلہ میں نقل کئے گئے ہیں، اس کی واضح تائید کرتے ہیں۔ اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی نوع ممات کے بھی قائل نہ تھے۔ چنانچہ ان کا ارشاد ''ان رجالا من المنافقين يزعمون ان

[1] یعنی اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری متوفی ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ

رسول اللہ ﷺ توفی واللہ مامات ولکن ذھب الیٰ ربہ کماذھب موسیٰ بن عمران، واللہ لیرجعن رسول اللہ ﷺ کمارجع موسیٰ فلیقطعن ایدی رجال وارجلھم زعموا ان رسول اللہ ﷺ مات''

بیہقی کی روایت سے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے کہ وہ ''وکذلک جعلناکم امۃ وسطا، الایۃ'' کے متعلق فرماتے ہیں: ''واللہ ان کنت اظن انہ ﷺ سیبقی فی امتہ حتی یشھد علیہ باخر اعمالھا وانہ وھو الذی حملنی علی ان قلت ماقلت'' لہٰذا شیخین کے مکالمہ کو موجودہ مسئلہ متنازعہ سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ موت کا بالکلیہ انکار فرماتے تھے اور سمجھتے تھے کہ حضور اقدس ﷺ ابھی واپس تشریف لے آئیں گے، اس کے لحاظ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ردعمل بالکل واضح ہے کہ بنوع من الموت سے کسی کو بھی انکار نہیں بلکہ انکار صرف موت لجمیع الوجود سے ہے کہ نوع خاص من الحیاۃ فی الجسد باقی ہے۔

تعجب ہے کہ یہ حضرات اجساد انبیاء کے بقاء کے قائل ہیں۔ جیسا کہ آپ نے لکھا لیکن ان اجساد میں اگر کسی نوع کی حیات بھی نہ مانی جائے تو یہ حدیث پاک ہی بے معنی بن جائے گی، اس لئے کہ حضور پاک کا ارشاد اس حدیث پاک میں یہ ہے: اکثروا علی من الصلوٰۃ فیہ فان صلوٰتکم معروضۃ علیّ اس پر صحابہ کرام کو اشکال ہوتا ہے: قالوا یارسول کیف تعرض وقد بلیت؟ اس پر حضور اکرم ﷺ ارشاد فرمائے ہیں: ان اللہ حرم ...... الخ آپ ہی غور کریں کہ اگر ان پاک اجساد میں کوئی نوع حیاۃ کی نہیں ہے تو حضور ﷺ کا یہ پاک ارشاد صحابہ کے اشکال کیف تعرض کا جواب کیسے بن گیا۔ روایت بھی صحیح ابن حبان کی ہے۔ حاکم نے اس کو علیٰ شرط البخاری بتایا اور ذہبی نے اقرار کیا، ایک چیز یہ بھی قابل غور ہے کہ باجماع امت قبر اطہر کا وہ حصہ جو جسد اطہر سے متصل ہے کعبہ شریف بلکہ عرش معلّٰی سے بھی افضل ہے۔ کیا یہ فضیلت صرف اس جسد اطہر کی ہے جس کے ساتھ کبھی روح کا تعلق رہ چکا اور اب نہیں ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو پھر موئے مبارک جو بدن اطہر سے جدا ہو چکے ہیں ان کا بھی یہی حال ہوتا، بلکہ لباس مبارک جو کبھی جسد اطہر پر پڑ چکا ہے، اس کا بھی یہی حکم ہوتا۔ وغیرہ وغیرہ!

بہرحال یہ ناکارہ تو اکابر دیوبند قدس اللہ اسرارہم کا ہمہ تن متبع ہے اور ان سب حضرات کا متفقہ فیصلہ المہند میں بلا کسی اجمال کے تحریر ہے، اس سے آپ کے جملہ سوالات کا جواب واضح ہو گیا۔

گرامی نامہ کے آخر میں آپ نے جو سوالات لکھے نمبروار ان کے جوابات حسب ذیل ہیں:

۱...... اجساد انبیاء میں ایک خاص نوع کی حیات ہے۔

۲...... ظاہر ہے کہ حیاۃ تو روح ہی کے تعلق سے ہوتی ہے، بغیر تعلق روح کے حیاۃ کا کیا مطلب؟

۳...... اگر ایسی حیاۃ ہوتی جو ہر ذرہ کائنات میں ہوتی ہے تو پھر انبیاء کرام علیہم السلام کی تخصیص کیا رہی؟ علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''نحن نؤمن ونصدق بانہ ﷺ حی یرزق فی قبرہ''

۴...... ایک دیوبندی سے یہ سوال کہ علمائے دیوبند کا یہ قول قابل اقتداء ہے یا نہیں؟ بے محل ہے۔ علامہ سخاوی رحمہ اللہ امام بیہقی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں: ''وقال البیھقی وفی حدیث سعید ابن المسیب عن ابی ھریرۃ انہ یقیم ببیت المقدس وفی حدیث ابی ذر ومالک بن صعصعۃ فی قصۃ المعراج انہ یقیم فی جماعۃ من الانبیاء بالسمٰوٰت وکل منھم وکلموہ وکل ذلک صحیح لایخالف بعضھم بعضا فقد یری موسیٰ علیہ السلام قائما یصلی فی قبرہ ثم یسری بموسیٰ وغیرہ الی بیت المقدس کما

اسری بنبینا فیراھم فیھا کما اخبر قالوا وحلولھم فی اوقات مختلفۃ لمواضع مختلفات جائز فی العقل کما ورد فی خبر الصادق وفی کل ذلک دلالۃ علیٰ حیاتھم... الخ'' یہ مضمون تو بہت ہی صاف ہے، لیکن اگر یہ حضرات اپنی قبروں میں مع الجسد ہوں اور دوسرے مواضع میں روح متشکل ہو، جیسا کہ بعض نے کہا ہے تو اس میں بھی کوئی مانع نہیں۔

۵...... جو شخص حضور اقدس ﷺ کی قبر اطہر کے پاس کھڑا ہو کر درود پڑھے تو حضور اقدس ﷺ اس کو سنتے ہیں من صلّی عند قبری سمعتہ نص صریح ہے۔ علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے سندہ جید۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مستقل قاصد مدینہ پاک بھیجا کرتے تھے، تاکہ قبر اطہر پر سلام پہنچائے، اب اگر کوئی فرق نہیں تو ان کا یہ فعل عبث ہوگا؟

۶...... مجھے حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی قدس سرہما کے مسلک میں کوئی فرق معلوم نہیں۔ المہند میں حضرت سہارنپوری، حضرت شیخ الہند، حضرت رائے پوری وغیرہ اکابر کا یہ ارشاد ھذا معتقدنا و معتقد مشائخنا واضح ہے، ان تینوں حضرات کے ''شیخ'' حضرت گنگوہی رحمہ اللہ ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جناب مفتی عزیز الرحمن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم نور اللہ مرقدہ نے حضرت گنگوہی قدس سرہ سے انک میت، الایۃ کے اشکال کا جو جواب نقل کیا ہے وہ تو حضرت نانوتوی قدس سرہ کی تعبیر سے بھی اونچا ہے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ موت سب کو شامل ہے، مگر انبیاء کی ارواح مشاہدہ جلال و جمال حق تعالیٰ شانہ و تقابل آفتاب وجود باری تعالیٰ سے اس درجہ پر پہنچ جاتی ہیں کہ اجزاء بدن پر ان کا یہ اثر ہوتا ہے کہ تمام بدن روح پیدا کر لیتا ہے اور تمام جسم ان کا عین ادراک اور عین حیات ہو جاتا ہے اور یہ حیات دوسری قسم کی ہوتی ہے۔ اس تحقیق سے نکتہ ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء..... ظاہر ہوتا ہے، الخ! اب آپ غور کیجئے کہ ہم ناواقف ان واصلین کے علوم تک کہاں پہنچ سکتے ہیں۔

۷...... حضرت رائے پوری دام مجدہم بار بار زبانی اور تحریری ارشاد فرما چکے ہیں کہ میرا مسلک وہی ہے جو اکابر دیوبند کا ہے، اس وقت بھی یہی فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ یہ لوگ بے کار وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں تو اسی (۸۰) سال سے متجاوز ہو کر من یرد الیٰ ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئاً میں داخل ہو گیا ہوں اور بھی کسر نفسی کے الفاظ ارشاد فرمائے، جن کا نقل کرنا دشوار ہے کہ میں ان حضرات کے مقابلہ میں کیا ہوں؟

۸...... اگر روایت صحیح نہ کہنے والے حافظ ابن حجر سے اونچے ہوں تو ان کے قول پر غور کیا جا سکتا ہے۔

نوٹ: علامہ ذہبی رحمہ اللہ کا قول جرح و تعدیل میں معتبر ہے، لیکن ہر شخص کے قول کو دیگر اہل فن کے اقوال کے لحاظ سے دیکھا جائے گا۔ اگر علامہ ذہبی رحمہ اللہ کی جرح و تعدیل دوسرے اکابر کے خلاف ہوگی تو غور کیا جائے گا، ورنہ یقیناً معتبر ہے۔

آخر میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ یہ دقیق مسائل عوام کی عقول سے اونچے ہیں، ان کو اردو رسائل واشتہارات وغیرہ میں لانا ان میں بحثیں کرنا نہایت ناموزوں ہے۔ ہر دو فریق سے درخواست ہے کہ اس بحث کا سلسلہ جلد از جلد بند فرما دیا جائے۔

زکریا بقلم خود مظاہر علوم سہارنپور

۲۵ جمادی الثانیہ ۱۳۷۸ھ/ ۶ جنوری ۱۹۵۹ء

۸

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتٌ
بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (القرآن)

اَلْأَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّوْنَ (الحدیث)

انکار
حیات النبی ﷺ
(ایک پاکستانی فتنہ)

افادات:

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
شیخ المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ
شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ
الشیخ محمد بن عبد الوھاب الحنبلیؒ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم
مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّار

انکار حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ایک پاکستانی فتنہ

افادات

قطب الارشاد حضرۃ مولانا رشید احمد محدث گنگوہی، رحمۃ اللہ علیہ
شیخ المحدثین حضرۃ مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ
شیخ الاسلام حضرۃ مولانا سید حسین احمد مدنی ـــــ رحمۃ اللہ علیہ
شیخ الحدیث حضرۃ مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی ـ رحمۃ اللہ علیہ
شیخ محمد بن عبد الوہاب الحنبلی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر
المکتبۃ المدنیۃ
۱۷- اردو بازار، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفصیلی فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(حرفِ چند)

''انکار حیات النبی ﷺ ایک پاکستانی فتنہ'' کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا، جس میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ، حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ، حضرت مدنی رحمہ اللہ، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ کاندھلوی، محمد بن عبدالوہاب الحنبلی رحمہ اللہ کے پانچ مضامین شامل تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ کا مضمون اسی کتاب میں دوسری جگہ شامل ہے۔ اس رسالہ سے ہم نے اس کو حذف کر دیا ہے۔ باقی مضامین کو اس مجموعہ میں شریک اشاعت کیا ہے۔ (ناشر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیات النبی ﷺ قرآن وحدیث کی روشنی میں

آیات قرآنی

"ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات، بل احیاء ولٰکن لا تشعرون" (البقرہ:۱۵۴)

اور نہ کہو ان کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مردے ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم کو خبر نہیں۔

"ولا تحسبنّ الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا، بل احیاء عند ربھم یرزقون" (آل عمران:۱۶۹)

اور تو نہ سمجھ ان لوگوں کو جو مارے گئے اللہ کی راہ میں مردے، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس کھاتے پیتے۔

قاضی شوکانی ؒ لکھتے ہیں کہ: "ورد النص فی کتاب اللہ فی حق الشھداء انھم احیاء یرزقون وانّ الحیات فیھم متعلقہ بالجسد فکیف بالانبیاء المرسلین" (نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۱۱ مصری)

"قرآن مجید کی آیت جو شہداء کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ ثابت ہے کہ وہ زندہ ہیں، ان کو رزق دیا جاتا ہے اور ان کی یہ زندگی ان میں جسم کے ساتھ ہے، پس انبیاء علیہم السلام کی حیات کیسے ثابت نہیں ہے۔"

احادیث مبارکہ

حضرت ابو الدرداء ؓ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں: "عن ابی درداء ؓ قال، قال رسول اللہ ﷺ اکثروا من الصلاۃ علیٰ یوم الجمعۃ فانہ یوم مشھود تشھدہ الملائکۃ، وان احدا لن یصلی علیّ الّا عرضت علیّ صلاتہ حتی یفرغ منھا، قال قلت: بعد الموت؟ قال: ان اللہ حرّم علی الارض ان تأکل اجساد الانبیاء علیہم السلام، رواہ بن ماجہ باسناد جید وزاد السخاوی فی آخر الحدیث فنبی اللہ یرزق وبسط فی تخریجہ"

"میرے اوپر جمعہ کے دن کثرت سے درود بھیجا کرو، اس لئے کہ یہ ایسا مبارک دن ہے کہ ملائکہ اس میں حاضر ہوتے ہیں اور جب کوئی شخص مجھ پر درود بھیجتا ہے تو وہ درود اس کے فارغ ہوتے ہی مجھ پر پیش کیا جاتا ہے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کے انتقال کے بعد بھی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! انتقال کے بعد بھی۔ اللہ جل شانہ نے زمین پر یہ بات حرام کردی ہے کہ وہ انبیاء کے بدنوں کو کھائے، پس اللہ کا نبی زندہ ہوتا ہے، رزق دیا جاتا ہے۔"

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "لیھبطن عیسیٰ ابن مریم حکما اماما مقسطا ولیسلکن فجا حاجا او معتمرا ولیاتین قبری حتی یسلم علیّ ولاردن علیہ" (الجامع الصغیر ج ۲ ص ۱۴۰)

"البتہ ضرور عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نازل ہوں گے۔ منصف اور امام عادل ہوں گے اور وہ فج (جگہ کا نام) کے راستے پر حج یا عمرہ کے لئے آئیں گے اور یقیناً وہ میری قبر پر آئیں گے۔ یہاں تک کہ وہ مجھے سلام کریں گے اور میں ان کے سلام کا ضرور جواب دوں گا۔ وقال صحیح!"

مقدمہ ...... مع اضافہ جدیدہ

از قلم جامع شریعت و طریقت حضرت مولانا عبدالحفیظ صاحب مکی دامت برکاتہم
خلیفہ مجاز قطب عالم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدنی قدس سرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ وعلی الہ واصحابہ والتابعین لھم باحسان الی یوم الدین"

اما بعد! محترم و مکرم مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری (نواسہ و خلیفہ مجاز شیخ قدس سرہ) کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دیں کہ ہر کچھ مدت کے بعد قطب الاقطاب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے کنوز علم وعرفان میں سے مختلف انواع و اقسام کے ہیرے جواہرات لٹاتے رہتے ہیں اور خواص و عوام ان سے مستفیض و متمتع ہوتے ہیں۔ ابھی انہوں نے ماشاء اللہ ایک تازہ افادات علمیہ و تحقیقات نادرہ کا مجموعہ بنام "معارف شیخ" جلد اوّل نشر فرمایا ہے۔ جس میں پانچ مضمون ہیں۔ ان میں سے دوسرا مضمون "حیات النبی ﷺ" سے متعلق ہے، جو باوجود اپنے اختصار کے علمی تحقیقی لحاظ سے ان شاء اللہ حرف آخر ہے۔ اس وقت پتہ چلا ہے کہ پاکستان میں بعض ایسے اشخاص جو اپنے آپ کو مسلک اہل سنت والجماعت علماء دیوبند اہل حق کی طرف منسوب کرتے ہیں، انہوں نے پھر سے حیات النبی ﷺ کا مسئلہ اٹھایا ہے اور باوجودیکہ اس سے قبل یہ مسئلہ بہت زور وشور سے اٹھ کر الحمد للہ ختم ہو چکا تھا اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ کی حسب ذیل عبارت پر فریقین میں سے حضرت مولانا غلام اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دستخط کئے تھے اور دوسری طرف مولانا محمد علی جالندھری اور مولانا عبدالحنان ہزاروی مرحومین کے دستخط تھے۔ وہ عبارت یہ ہے: "وفات کے بعد نبی کریم ﷺ کے جسد اطہر کو برزخ قبر شریف میں بہ تعلق روح حیات حاصل ہے اور اس حیات کی وجہ سے روضہ اقدس پر حاضر ہونے والوں کا آپ صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں۔"

رئیس الموحدین قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کا فتوی

"مگر انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو خلاف نہیں، اسی وجہ سے ان کو مستثنیٰ کیا ہے اور دلیل جواز یہ ہے کہ فقہاء نے بعد سلام کے وقت زیارت قبر مبارک کے شفاعت مغفرت کا عرض کرنا لکھا ہے۔ پس یہ جواز کے واسطے کافی ہے۔" (فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۲۳، مطبوعہ کارخانہ اسلامی کراچی)

مگر نہایت افسوس کی بات ہے کہ اب چند ناعاقبت اندیش اس حد تک غلو کر رہے ہیں، کتابوں میں یہاں تک چھپوا دیا ہے کہ: (۱) بعد از موت سماع اور رؤیت انبیاء کا عقیدہ دراصل یہودیوں[۱] کی ایجاد ہے۔ نعوذ باللہ!

---

[۱] حالانکہ خود جمعیۃ اشاعت التوحید والسنۃ کے مرکزی ناظم عمومی حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر (جواہر القرآن ص ۹۰۲) پر تحریر فرماتے ہیں: "سماع موتی کا مسئلہ زمانہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مختلف فیہ چلا آرہا ہے۔ یہ مسئلہ اعتقادات ضروریہ میں سے نہیں، جن کی نفی یا اثبات پر کفر واسلام کا مدار ہے۔ .... ان دونوں جماعتوں کے پاس دلائل ہیں، جن پر انہوں نے اپنی اپنی رائے اور تحقیق کی بنیادیں استوار کی ہیں۔ جو سماع موتی کی نفی کرتے ہیں۔ ان کا استدلال ظواہر قرآن اور احادیث صحیحہ سے ہے جب کہ قائلین سماع موتی بھی صحیح حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ (ناشر)"

(۲) مرے ہوئے شخص کو چاہے پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، موت کے بعد اپنے اور وارد ہونے والے حالات کا علم نہیں ہوتا۔ نعوذ باللہ!

مذکورہ دونوں حوالے، اسی جماعت کے مولوی اللہ بخش صاحب کے رسالہ اربعین احادیث و اربعین آیات کے ہیں، جو کتاب (دعوت الانصاف فی حیات جامع الاوصاف ص ۲۳) سے ماخوذ ہیں۔ (دعوۃ الانصاف کے مؤلف حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب شجاع آبادی پہلے اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں ان گستاخیوں کی بناء پر علیحدہ ہو گئے۔ جیسے کہ انہوں نے کتاب جامع الاوصاف میں خود تصریح کی ہے)

اسی طرح جماعت کے احمد سعید[1] نامی شخص نے تو یہاں تک جسارت کی ہے کہ:

۱...... جو شخص حضور ﷺ کے سماع صلوٰۃ وسلام عندالقبر کا قائل ہے، خواہ کسی تاویل سے ہو، وہ قرآن و حدیث اور شریعت کی روح سے بلا تاویل کافر ہے، مرتد ہے۔ نعوذ باللہ!

۲...... جو شخص سماع عندالقبر کے قائل کو کافر نہ سمجھے وہ بھی بلا تاویل کافر ہے اور جو اس کو کافر نہ مانے وہ بھی کافر ہے۔ نیز جو شخص اس مسئلہ کو فروعی کہتا ہے، وہ بھی کافر ہے۔ نعوذ باللہ!

۳...... اگر نبی علیہ السلام کے سماع عندالقبر کا قائل ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہو، تو وہ بھی کافر ہیں، نعوذ باللہ!

(بحوالہ دعوۃ الانصاف ص ۲۵)

۴...... اساڈی جماعت جمعیت اشاعت التوحید والسنہ دا عقیدہ، بات صاف ہے محمد رسول اللہ دوسرے انبیاء اولیاء قطاب وفات دے بعد کوئی صلوٰۃ وسلام سند انئیں تے جیہڑا شخص اس اتے اصرار کرے اوہ پکا مشرک ہے۔ اوسے پیچھے نماز پڑھنی جائز نئیں تے جیہڑا انہاں صاحباں ٹھیکہ چایا ہویا ہے ناں، جان بجھ کے انہاں دے کفر وچ شک کرنے والا بھی کافر ہے۔

<u>ترجمہ اردو</u>: ہماری جماعت جمعیۃ اشاعت التوحید والسنہ کا عقیدہ بات صاف ہے کہ محمد رسول اللہ دوسرے انبیاء، اولیاء، اقطاب وفات کے بعد صلوٰۃ وسلام کوئی سنتا نہیں اور جو شخص اس پر اصرار کرے وہ پکا مشرک ہے۔ اس کے پیچھے نماز پڑھنی جائز نہیں اور جو ان صاحبوں نے ٹھیکہ اٹھایا ہے، جان بوجھ کر ان کے کفر میں شک کرنے والا بھی کافر ہے۔ نعوذ باللہ! (بحوالہ اشتہار "ایک جدید انکشاف" شائع کردہ بزم قاسمی سرگودھا)

---

[1] <u>خطرناک دھوکہ</u>: جمعیۃ اشاعت التوحید والسنہ کے بعض حضرات سے جب اس ظلم کی شکایت کی جاتی ہے تو وہ احمد سعید سے اپنی برأت ظاہر کرتے ہیں، حالانکہ اس مسئلہ پر مناظروں میں بعض ذمہ داران جماعت بلکہ امیر جماعت سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری ان کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں اور اس کو اپنا جانشین بتاتے ہیں اور اپنے جلسوں میں اس کو بلاتے ہیں اور اس کے جلسوں کو کامیاب بنانے کی سعی کرتے ہیں اور ایسے گستاخوں کے کتابچوں کی تائید بھی کرتے ہیں۔ تفصیل کے لئے کتاب "دعوۃ الانصاف فی حیاۃ جامع الاوصاف" ملاحظہ فرمائیں: نیز احمد سعید کی ایسی بہت سی باتیں ٹیپ شدہ موجود ہیں۔ ہماری اس بات کی تائید حضرت مولانا غلام اللہ صاحب رحمہ اللہ کے خط بنام مؤلف "دعوۃ الانصاف" سے بھی ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو: "محترم ومکرم مولانا صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ! محمد سعید (احمد سعید) منافقانہ دستخط کر دیے ہیں کہ سماع والے کافر نہیں ہیں اور شاہ صاحب (سید عنایت اللہ شاہ بخاری گجرات امیر جماعت) نے بالکل دستخط سے انکار کر دیا اور کہا میرا عقیدہ یہی کفر کا ہے اور محمد سعید کا یہی ہے، واللہ اعلم! کیا غضب الٰہی ہے تمام امت کو کافر کہہ دینا، لاشی غلام اللہ (بلفظہ) (دعوۃ الانصاف ص ۲۷ ناشر)"

اس تقریر کی کیسٹ ان کے پاس موجود ہے۔

ایک اور بدترین گستاخی بحوالہ مولانا غلام اللہ خان صاحب مرحوم

مولانا مرحوم نے دورہ تفسیر پڑھاتے وقت ایک سوال کے جواب میں فرمایا جس کو بلفظہ ٹیپ سے نقل کیا جاتا ہے، جو مندرجہ ذیل ہے:

قائلین سماع موتی کو کافر کہنے والا بڑا لعنتی اور بڑا بے ایمان ہے (مولانا غلام اللہ خان)

۱...... مولانا احمد سعید ملتانی نے سارے ملک میں گندگی پیدا کی ہے، خاص کر کے سرگودھا اور میانوالی کے ضلع میں جو منہ میں آیا، کہتا رہا اور بے تکی باتوں سے ہمیں بدنام کیا۔ مولانا غلام مصطفیٰ صاحب اور خود میں اور بہت سے علماء نے اس کی یہ ریکارڈ تقریر سنی اس ظالم کے منہ سے ایسے گندے کلے نکل جاتے ہیں۔

مولوی سعید کو ایسی توحید ملی ہے جو اکابر و اسلاف کو بھی نہیں ملی، چنانچہ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جو سماع کے قائل ہیں، ہم ان کو کافر نہیں کہتے۔ مولوی سعید نے بھی یہ لکھ کر دے دیا ہے کہ میں سماع والوں کو قطعاً کافر نہیں کہتا اور جو پہلے کافر کہا وہ میں نے غلطی کی ہے۔ لیکن چونکہ اس کی زبان گندی ہے، اس لئے اس کے لکھنے کے باوجود ہم اس پر اعتماد نہیں کریں گے، اور پورا ایک سال تک اس کو دیکھیں گے۔ اگر ٹھیک ہو گیا اور اس دوران زبان سے کوئی گندہ کلمہ نہ نکالا تو پھر ہم سوچیں گے، ورنہ نہ کوئی اس کو بلائے اور نہ اس کا وعظ سنے۔ خود ہم بھی اس کو اس وقت بلائیں گے، جب اس کی زبان قابو میں آ جائے گی۔

میں تمہارے سامنے سماع کے بارے میں اپنے دلائل پیش کروں گا اور دلائل پیش کرنے کے بعد بھی یہی کہوں گا کہ جو سماع والوں کو کافر کہتا ہے وہ بڑا لعنتی ہے، بہت بڑا بے ایمان ہے، خواہ کوئی بھی ہو۔

نوٹ: مولانا غلام اللہ خان مرحوم کی تقریر کی یہ کیسٹ ہمارے پاس موجود ہے۔

۲...... حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحب مرحوم اور حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب مرحوم کا فیصلہ

ہم (مولانا قاضی نور محمد صاحب اور مولانا غلام اللہ خان صاحب) اس کی پوری کوشش کریں گے یہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے بھی اس تحریر (مندرجہ بالا) پر دستخط کرائیں، جس پر ہم نے دستخط کئے ہیں، اگر ممدوح اس پر دستخط نہ کریں گے تو ہم مسئلہ حیات النبی ﷺ میں اس تحریر کی حد تک ان سے برأت کا اعلان کر دیں گے، نیز اپنے جلسوں میں ان سے مسئلہ حیات النبی ﷺ پر تقریر نہ کرائیں گے اور اس مسئلہ میں وہ کوئی مناظرہ وغیرہ کریں گے تو ہم اس بارے میں ان کو مدد نہ دیں گے۔ نور محمد خطیب قلعہ دیدار سنگھ

لاشئی غلام اللہ خان ۲۲ رجون ۱۹۶۲ء

۳...... احمد سعید ملتانی کی تقریر سننا گناہ ہے، اہل ایمان پر اس کی صحبت سے گریز لازم ہے۔

مفتی عبد الرشید صاحب مفتی دار العلوم تعلیم القرآن راولپنڈی کا فتویٰ

باسمہ تعالیٰ! بخدمت محترم حضرت شیخ القرآن صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ! معروض ہوں کہ ضلع سرگودہا میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب بمقام

گکڑ ہٹہ ضلع ملتان تقریریں کر رہا ہے اور وہ اپنے کو اشاعت التوحید والسنہ کا مرکزی مبلغ ظاہر کرتا ہے جس سے دیوبندی پارٹی میں بڑی نفرت اور کش مکش پیدا ہو رہی ہے۔ کئی لوگ کہتے ہیں مسلک ان کا ٹھیک ہے اور کئی لوگ کہتے ہیں کہ علماء جمہور اس عقیدہ کے خلاف ہیں۔ لہٰذا حضرت والا سے درخواست ہے کہ آپ کے فتویٰ پر ایک کمیٹی کی لڑائی جھگڑا ختم ہوتا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر مندرجہ ذیل سوالوں پر روشنی فرمائیں تاکہ ہماری پارٹی (کمیٹی) مضبوط رہے۔ ہم سارے دیوبندی ہیں اور جمعیت العلماء اسلام اور خدام اہل سنت سے تعلق رکھتے ہیں اور کئی آدمی اشاعت التوحید کی جماعت کے ہیں۔

سوال نمبر ۱: جو شخص کشف القبر سیکھے یا سکھائے یا خود کرے اور اسے جائز سمجھے، وہ بالکل کافر ہے، جیسے مرزائی کافر ہیں۔

سوال نمبر ۲: جو شخص نبی کریم ﷺ کو روضہ اطہر میں زندہ باشعور سمجھے یا یہ عقیدہ رکھے کہ نبی ﷺ کے روضہ اطہر پر حاضری کے وقت خود درود وسلام سنتے ہیں، اس عقیدہ والا بھی کافر ہے۔

سوال نمبر ۳: جو شخص درود وسلام پڑھے، بذریعہ فرشتے نہیں پہنچایا جاتا، لہٰذا حضرت والا سے درخواست ہے اور اخلاق کریمانہ سے امید کرتا ہوں کہ جواب دے کر مشکور فرمائیں گے، جوابی لفافہ پیش خدمت ہے۔

بقلم خود محمد یوسف سلیم چک نمبر ۱۱۷ شمالی فی الحال چک نمبر ۱۴ پٹھانوالی بھلوال

الجواب واللہ الموفق للصواب

۱...... سادات دیوبند کشف قبور[1] کے قائل ہیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت تھانوی اور دیگر علماء دیوبند کی تصریح ان کی کتابوں میں موجود ہے اور ہم بھی اس کے قائل ہیں۔ ہمارا اس کا انکار صحیح نہیں ہے اور قائل کو کافر کہنا تو بڑی جہالت ہے۔

۲...... روضہ اطہر پر حاضری کے وقت پیغمبر علیہ السلام خود سنتے ہیں، جمہور امت اس پر متفق ہے اور سادات دیوبند کا عقیدہ بھی یہی ہے، اس کا انکار بھی جہالت ہے اور قائل پر کفر کا فتویٰ جہلانہ جسارت رکھتا ہے۔

۳...... یہ بھی جہالت ہے، علماء دیوبند کا یہ مسلک نہیں ہے، ایسے شخص[2] کی تقریر سننا سخت گناہ، اہل ایمان پر لازم ہے کہ اپنا ایمان مضبوط رکھیں اور ایسی صحبت سے پرہیز کریں۔ ھذا واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب!

مہر مدرسہ

عبدالرشید

مفتی دارالعلوم تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی

۲۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۸ھ

---

[1] خود حضرت اقدس مولانا حسین علی صاحب قدس سرہ کا مکاشفہ عند القبر بھی ملاحظہ ہو، فرماتے پیشہ ہیں: ''اور میں امام ربانی مجدد الف ثانی کے مزار مبارک کے قریب بیٹھا تو آپ نے مجھے مکاشفہ میں فرمایا توحید کا مسئلہ بیان کرنا سلوک کے بلند ترین درجات میں سے ہے۔'' (مقدمہ بلغۃ الحیران، ص ۸: ناشر)

[2] اس شخص سے حضرت مفتی صاحب مراد احمد سعید ہے، کیونکہ سائل نے اس کا نام لکھ کر دریافت کیا ہے۔ (ناشر)

حضرت مولانا غلام اللہ خان مرحوم نے مولوی احمد سعید کو آخر وقت تک اپنی مسجد میں جلسہ کے لئے دعوت نہیں دی، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اس نفرت کرتے تھے۔ (بحوالہ اشتہار بزم حیات النبی ﷺ گوجرانوالہ)

"اناللہ وانا الیہ راجعون، اللھم انا نبرأ الیک ممایقول ھؤلاء"

ایسی گستاخی کرنے والے کیسے دیوبندی ہو سکتے ہیں اور ایسے بدبختوں کا اکابر علماء دیوبند سے کیسے تعلق ہو سکتا ہے؟

حقیقت واضح ہوگئی

اس رسالہ کی پہلی اشاعت میں حاشیہ میں ہم نے خطرناک دھوکہ کے عنوان سے یہ شکایت کی تھی کہ احمد سعید کے بارے میں جمعیۃ اشاعۃ التوحید والے دورخی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ مگر اب تو ماہنامہ تعلیم القرآن کے حوالہ ذیل سے پوری جماعت کے فیصلے سے حقیقت واضح ہوگئی۔ قارئین کرام خود ہی رسالہ ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی نومبر ۱۹۸۵ء کا ص ۱۳۹ اور ۱۴۰ ملاحظہ فرمالیں، مندرجہ ذیل ہے:

تعلیم القرآن راولپنڈی	ص ۳۹	نومبر ۱۹۸۵ء

۲ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ

ملتان کے اجلاس کا فیصلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ

اما بعد! ہمارے شیخ حضرت علامہ مولانا حسین علی رحمہ اللہ اور ان سے تعلق رکھنے والے جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنہ کے تمام علماء ومشائخ کا کتاب وسنت ارشاد سلف اور اقوال ائمہ متقدمین حنفیہ رحمہم اللہ کی روشنی میں اپنا مسلک تو یہ ہے کہ سماع صلوٰۃ و سلام عندالقبر النبی ﷺ ثابت نہیں لیکن جو لوگ قبر شریف کے پاس یعنی عندالقبر النبی ﷺ صرف صلوٰۃ وسلام کے سماع کے قائل ہیں۔ ہم ان کو کافر نہیں کہتے بلکہ ہم ان کو اہل سنت و جماعت سے خارج بھی نہیں قرار دیتے۔ جو شخص ایسا عقیدہ رکھنے والے کو کافر سمجھے ہماری جماعت جمعیت اشاعت التوحید والسنہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح جو لوگ سماع اموات عندالقبور کے قائل ہیں۔ ان کا بھی ہماری جماعت سے کوئی تعلق نہیں۔

عنایت اللہ	شمس الدین	عبدالغنی
احقر انورعلی سجاد بخاری	عبدالرزاق ابن حضرت مولانا حسین علی	حکیم نور احمد یزدانی
احسان الحق عفی عنہ	محمد حسین غفرلہ مدرس ضیاء العلوم سرگودھا	خلیل احمد
احمد سعید عفی عنہ	ضیاء اللہ شاہ جامع مسجد شاہ فیصل گیٹ گجرات	عبدالحکیم علی اللہ عنہ
احقر محمد حسین ہزاروی	قاضی محمد امیر میانوالی	عبدالستار عفی عنہ توحیدی راولپنڈی
محمد ضیاء القادری	مشتاق احمد عفی عنہ	خلیل الرحمٰن جامع مسجد ماڈل ٹاؤن لاہور
خلیل احمد خطیب جامع مہاجرین واں بھچراں	نور محمد عفی عنہ ملتان	

تعلیم القرآن راولپنڈی	ص ۴۰	۱/۶ اکتوبر ۱۹۸۵ء

۲۱ رمحرم الحرام ۱۴۰۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلوۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ، اما بعد!

مجلس مقننہ جماعت اشاعۃ التوحید والسنہ پاکستان کا فیصلہ

۱...... ملتان میں جماعت کی مجلس شوری منعقدہ ۲ ربیع الاوّل ۱۴۰۲ھ میں طے شدہ متفقہ فیصلہ کی توثیق کرتے ہوئے مندرجہ امور کی وضاحت کی گئی۔

۲...... الف: جماعت اشاعۃ التوحید والسنہ کا مسلک عدم سماع موتٰی ہے۔

ب: سماع موتی عند القبور کے قائلین کو ہم کافر نہیں کہتے۔

ج: سماع موتی عند القبور کے قائلین میں سے کوئی بھی ہماری جماعت کا رکن نہیں بن سکتا۔

د: سماع موتی عند القبور کے قائلین کو کافر کہنے والا بھی ہماری جماعت کا رکن نہیں رہ سکتا۔

استشفاع

ہماری جماعت کے نزدیک کسی پیغمبر یا ولی کے مزار پر جا کر یہ کہنا کہ میرے لئے دعا کریں بدعۃ قبیحہ مستحدثہ اور ذریعہ شرک ہے۔ ''مجلس مقننہ اشاعۃ التوحید والسنہ پاکستان کا متفقہ فیصلہ'' نام کے متعلق حضرت الامیر مولانا محمد طاہر صاحب کی تجویز پر فیصلہ کیا گیا کہ ہماری جماعت کا نام صرف ''اشاعۃ التوحید والسنہ پاکستان'' ہوگا۔

جس کے دو شعبے ہوں گے: ایک کا نام ''جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنہ'' ہوگا۔ دوسرے شعبہ کا نام ''جماعۃ اشاعۃ التوحید والسنہ'' ہوگا۔

عنایت اللہ، احقر محمد طاہر عفی عنہ، سجاد بخاری، عارف طاہری، احقر عبد اللہ غفرلہ، بدیع الزمان، فضل حق، میر سمیع الحق، احسان الحق عفی عنہ، ضیاء الحق، محمد حسین غفرلہ، عصمۃ اللہ (ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی)

ایک مزید وضاحت

نعوذ باللہ! جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنہ والوں نے استشفاع کے سلسلہ میں جس دریدہ دہنی کا ثبوت دیا ہے، یہ تو بہت ہی بڑی جسارت ہے۔ اس سے تو اکابرین اسلاف میں سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا، کیا ہی ظلم ہے کہ اپنے اکابر پر بدعت قبیحہ وغیرہ کا الزام لگا دیا، جب کہ پوری جماعت دیوبند کا عقیدہ ہے، جس کو حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ (جن سے حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ نے ظاہری و باطنی فیض پایا اور حضرت گنگوہی کے نام ہی سے ان کا تعارف کرایا جاتا ہے) نے اپنی حج کی کتاب ''زبدۃ المناسک'' میں روضہ اقدس پر بارگاہ رحمۃ للعالمین حضور ﷺ میں حاضری کے وقت ان الفاظ سے درخواست پیش کرنے کا طریقہ لکھا ہے۔

فرماتے ہیں: ''اور پھر حضرت رہا کے وسیلہ سے دعا کرے اور شفاعت چاہے کہے: ''یا رسول اللہ اسالك الشفاعة و اتوسل بک الی اللہ فی ان اموت مسلما علی ملتک و سنتک'' اور ان الفاظ میں جس قدر چاہے زیادہ کرے مگر ادب اور عجز کے کلمات ہوں، لیکن سلف یہاں الفاظ مختصر کہنے کو جہاں تک اختصار ہو مستحسن رکھتے ہیں اور بہت پکار کر نہ بولے، بلکہ آہستہ خضوع اور ادب سے بہ نرمی عرض کرے اور جس کا سلام کہنا ہو عرض کرے: ''السلام علیک یارسول اللہ من فلان بن فلان یستشفع بک الی ربک'' پھر بقدر ایک ہاتھ کے پیچھے کو ہٹ کر حضرت صدیق پر سلام کہے: ''السلام علیک یا خلیفۃ رسول اللہ و ثانیہ فی الغار رفیقہ فی الاسفار امینہ علی الاسرار ابا بکر ن الصدیق جزاك اللہ عن امۃ محمد خیرا'' پھر قدر ایک ہاتھ کے اور پیچھے کو ہٹ کر حضرت عمرہ پر سلام کہے: ''السلام علیک یا امیر المومنین عمر الفاروق الذی اعز اللہ بہ الاسلام امام المسلمین مرضیا حیاً و میتاً جزاك اللہ عن امۃ محمد خیرا'' اور یہاں بھی کمی زیادتی الفاظ میں اختیار ہے اور جس نے کہہ دیا ہو، اس کا سلام پہنچا دے، پھر ذرا آگے کو بڑھ کر کہے: ''السلام علیکما یا ضجیعی رسول اللہ و رفیقیہ و زیریہ جزاکما اللہ احسن الجزاء جئتنا کما نتوسل بکما الی رسول اللہ ﷺ لیشفعلنا و یدعو لنا ربنا ان یحیینا علی ملتہ و سنتہ و یحشر نافی زمرتہ و جمیع المسلمین'' پھر کو بڑھ کر مقابلہ مواجہہ شریف کے کھڑا ہو کر جو کچھ ہو سکے دعا کرے اپنے اور والدین اور مسلمانوں کے واسطے۔'' (زبدۃ المناسک)

ان وجوہ کی بنا پر ضروری سمجھا گیا کہ حضرت شیخ قدس سرہ کے اس تحقیقی و مبارک مضمون کو مستقل طور پر چھپوا کر حقیقت واضح کر دی جائے اور اس میں کوئی نہیں کہ اکابر علماء دیو بند کا حیات النبی ﷺ کے بارے میں وہی صاف ستھرا نکھرا ہوا عقیدہ حقہ ہے، جو کتاب و سنت سے مستنبط ہے اور یہی تمام علماء سلف و خلف اہل سنت و جماعت کا ہمیشہ عقیدہ رہا ہے۔

چونکہ اس مضمون میں مرسل کے خط میں بھی اور حضرت شیخ قدس سرہ کے گرامی نامہ میں بھی ''المہند علی المفند'' کا تذکرہ ہے، جو علماء دیو بند کے عقائد کے بارے میں مستند ترین ہے، اس لئے اتماماً للفائدہ المہند[1] کا اس مسئلہ سے متعلق نص بلفظہ نقل کیا جاتا ہے، جو یہ ہے:

(ترجمہ) ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک حضرت ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور آپ کی حیات دنیا کی سی ہے، بلا مکلف ہونے کے اور یہ حیات مخصوص ہے، آنحضرت اور تمام انبیاء علیہم السلام اور شہداء کے ساتھ برزخی نہیں ہے، جو حاصل ہے تمام مسلمانوں، بلکہ سب آدمیوں کو۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے اپنے رسالہ ''انباء الاذکیاء بحیاۃ الانبیاء'' میں بتصریح لکھا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ علامہ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام وشہداء کی قبر میں حیات ایسی ہے جیسی دنیا میں تھی اور موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبر میں نماز پڑھنا اس کی دلیل ہے۔ کیونکہ نماز زندہ جسم کو چاہتی ہے، الخ! پس اس سے ثابت ہوا کہ حضرت محمد ﷺ کی حیات دنیوی ہے اور اس معنی کو برزخی بھی ہے کہ عالم برزخ میں حاصل ہے اور ہمارے شیخ مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کا اس مبحث میں ایک مستقل رسالہ بھی ہے۔ نہایت دقیق اور انوکھے طرز کا بے مثل جو طبع ہو کر لوگوں میں شائع ہو چکا ہے، اس کا نام ''آب حیات'' ہے۔

---

[1] ہم حضرت شیخ قدس سرہ کے مضمون کے بعد عوام و خواص کی افادیت کے پیش نظر رسالہ ہذا کے آخر میں المہند سے متعلقہ سوال و جواب مع تصدیقات مشاہیر علماء عرب و عجم بھی بعینہ نقل کر رہے ہیں۔

اب بات اور بھی قابل لحاظ ہے کہ حضرت شیخ قدس سرہ کے گرامی نامہ سے اپنے اکابر کے ساتھ گہرا تعلق اور ان کے اتباع میں پختگی بہت واضح ملے گی، یہ فی الحقیقت کسی تعصب کی بنا پر نہیں ہے بلکہ جیسے کہ حضرت نے اسی گرامی نامہ میں عملاً واضح بھی فرمایا کہ ان کی ساری باتین مدلل ہیں۔ ویسے بھی حضرت قدس سرہ ہمیشہ اپنے اسباق میں اور مجالس میں ذکر فرمایا کرتے تھے ان اکابر کے تبحر علمی اور تعمق رسوخ فی العلم میں اتنا حضرت کو متاثر کیا ہوا تھا کہ حضرت شیخ ان حضرات کے خلاف کچھ برداشت ہی نہ فرماتے تھے اور ایسے مسائل جن پر ان اکابر کا اجماع ہو جائے تو اس کا پوچھنا ہی کیا۔ خود حضرت کا رسالہ ''اکابر کا تقوی'' (مرتبہ حضرت صوفی محمد اقبال صاحب مدنی) کے اپنے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں: ''حامداً و مصلیاً و مسلماً، اس ناکارہ کو بھی بچپن ہی سے اپنے اکابر کے ساتھ محبت، عشق کے درجہ میں ہے، بالخصوص جب سے حدیث پاک کا مشغلہ شروع ہوا، اس وقت سے اپنے اکابر کے حالات کو جامع الکمالات سید الکونین روحی فداہ ابی وامی عوام کے جامع الصفات میں کسی نہ کسی صفت کا پرتو اور صحابہ کرام کی مختلف شئون اور حالات میں سے کسی کی زندگی کا پرتو دیکھتا رہا اور جوں جوں حدیث پاک پر نظر بڑھتی گئی میرا یہ تجربہ بھی بڑھتا رہا اور اسی وجہ سے میری محبت بھی اپنے اکابر نور اللہ مرقدہم واعلی اللہ تعالی درجاتہم سے بڑھتی گئی۔''

اولئک آبائي فجئني بمثلهم　　　اذا جمعتنا یاجریر المجامع

اور جس شخص نے ان کی صفات میں یہ اشعار کہے ہیں بالکل درست ہیں۔

خدا یاد آئے جن کو دیکھ کر وہ نور کے پتلے　　　نبوت کے یہ وارث ہیں یہی ہیں ظل رحمانی
یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر　　　انہیں کے اتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی
انہیں کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے　　　انہیں کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی
رہیں دنیا میں اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہوں　　　پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی
اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزہ آئے　　　اور آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخن دانی

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اپنے فضل و کرم سے اس مضمون کی اشاعت کو قبول فرمادیں اور اسے ہدایت کا ذریعہ بنائیں اور سب کو اپنی مرضیات پر عمل کی توفیق فرما کر، نامرضیات سے حفاظت فرمادیں۔ اپنے ساتھ اور اپنے پیارے رسول ﷺ کے ساتھ سچا تعلق نصیب فرمادیں اور حضور اقدس ﷺ کی سنت مبارکہ کو زندہ کرنے کی توفیق عطاء فرمادیں۔ آمین!

''والحمدللہ رب العالمین وصلی اللہ علیٰ سیدنا و مولانا محمد و آلہ و صحبہ اجمعین و بارک وسلم تسلیماً''

عبدالحفیظ وارد حال لاہور

بروز پنج شنبہ ...... ۴ر جمادی الثانیہ ۱۴۰۴ھ

***

نوٹ: اس سے آگے مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری کی کتاب ''معارف شیخ'' سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ کا حیات النبی ﷺ پر مضمون یہاں نقل کیا گیا تھا، وہ مضمون اس کتاب میں علیحدہ مستقل رسالہ کے طور پر شامل ہے، اس لئے یہاں سے اسے حذف کردیا ہے۔ (مرتب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب گرامی

شیخ الاسلام حضرت الحاج مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب گرامی بنام مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ اس مضمون کی تائید میں ہے، اس لئے ذیل میں ہم اس کو نقل کرتے ہیں تاکہ قارئین مستفید ہوسکیں:

مدینہ منورہ حاضری کی محض جناب سرور کائنات ﷺ کی زیارت اور آپ کے توسل کی غرض سے ہونی چاہئے۔ آپ کی حیات نہ صرف روحانی ہے جو کہ عام مومنین وشہداء کو حاصل ہے، بلکہ جسمانی بھی ہے اور از قبیل حیات دنیوی بلکہ بہت سی وجوہ سے اس سے قوی تر ہے، آپ سے توسل نہ صرف وجود ظاہری کے زمانہ میں کیا جاتا تھا بلکہ اس برزخی وجود میں بھی کیا جانا چاہئے۔ محبوب حقیقی تک وصال اور اس کی رضا صرف آپ ہی کے ذریعہ سے اور وسیلہ سے ہوسکتی ہے۔ اسی وجہ سے میرے نزدیک یہی ہے کہ حج سے پہلے مدینہ منورہ جانا چاہئے اور آپ کے توسل سے نعمت قبولیت حج وعمرہ کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے۔ مسجد کی نیت خواہ تبعاً کرلی جائے، مگر اولیٰ یہی ہے کہ صرف جناب رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی نیت کی جائے تاکہ ''لاتعلمه الا زيارتی'' والی روایت پر عمل ہوجائے۔ (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ ص: ۱۲۹، ۱۳۰ مکتوب نمبر ۴۵: بنام مولانا عبدالماجد دریا آبادی)

***

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں علماء اہل سنت دیوبند کے متفقہ عقائد جن کو فتویٰ کی صورت میں فخر المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ''المهند علی المفند'' نامی رسالہ میں شائع فرمائے ہیں اور جس پر مشاہیر علماء عرب وعجم کے تائیدی دستخط مع مہر کے موجود ہیں، اختصار کے ساتھ نیچے درج کئے جارہے ہیں:

سوال: جناب رسالت مآب ﷺ کے روضہ اطہر کی زیارت کے لئے سفر کرنا آپ لوگوں کے نزدیک کیا درست نہیں ہے اور کیا سفر مدینہ کرتے وقت فقط مسجد نبوی میں نمازیں ادا کرنے کی نیت ہی کرنی چاہئے؟

جواب: ہم اور مشائخ (حنفی حضرات اور طریقت میں چشتی، نقشبندی، قادری، سہروردی مشائخ جن کے چاروں سلسلوں میں ہم بیعت ہیں) یہ فرماتے ہیں کہ روضہ اطہر کی زیارت ہی کی نیت کرنی افضل ہے، کیونکہ اسی میں جناب رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کا حق زیادہ ادا ہوتا ہے اور جب وہاں پہنچ جائے گا تو اسے زیارت مسجد اور اس میں نمازوں کی فضیلت خود حاصل ہوجائے گی۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے زبدۃ المناسک میں بالتفصیل یہ بیان فرمایا ہے۔

سوال: کیا آپ کے نزدیک دعاؤں میں جناب رسول اللہ ﷺ سے آپ کے وفات پا جانے کے بعد اب توسل جائز نہیں اور کیا آپ کے نزدیک انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور اولیاء کرام سے توسل جائز نہیں؟

جواب: ہمارے اور ہمارے مشائخ کرام کے نزدیک جناب رسول اللہ ﷺ اور دیگر انبیاء کرام اور اولیاء و صدیقین و شہداء سے دعاؤں میں توسل جائز ہے، ان کی زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی کہ اپنی دعا میں یہ کہے کہ خداوند کریم میں تجھ سے فلاں کے وسیلہ سے دعا کرتا ہوں کہ میری دعا قبول فرما اور میری حاجت پوری فرما دے، حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاویٰ میں صراحت سے یہ مسئلہ تحریر فرمایا ہے۔

سوال: جناب رسالت مآب ﷺ کی حیات جو آپ کو قبر شریف میں حاصل ہے، کیا وہ خاص قسم کی ہے یا تمام مسلمانوں کی طرح آپ کی حیات برزخی ہے۔

جواب: ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک حضرت محمد ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور آپ کی حیات دنیا کی سی ہے، بلا مکلف ہونے کے اور یہ حیات مخصوص ہے، آنحضرت ﷺ اور تمام انبیاء علیہم السلام اور شہداء کے ساتھ برزخی نہیں ہے، جو حاصل ہے تمام مسلمانوں بلکہ سب آدمیوں کو۔ چنانچہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "انباء الاذکیاء بحیاۃ الانبیاء" میں بتصریح لکھا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ علامہ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ انبیاء و شہداء کی قبر میں حیات ایسی ہے جیسی دنیا میں تھی اور موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبر میں نماز پڑھنا، اس کی دلیل ہے کیونکہ نماز زندہ جسم کو چاہتی ہے۔ الخ!

پس اس سے ثابت ہوا کہ حضرت محمد ﷺ کی حیات دینوی ہے اور اس معنی کو برزخی بھی ہے کہ عالم برزخ میں حاصل ہے اور ہمارے شیخ مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کا اس مبحث میں ایک مستقل رسالہ بھی ہے، نہایت دقیق اور انوکھے طرز کا بے مثل جو طبع ہو کر لوگوں میں شائع ہو چکا ہے، اس کا نام "آب حیات" ہے۔

سوال: جو شخص مسجد نبوی میں دعا مانگ رہا ہو، کیا سے جناب رسول کریم علیہ السلام کی قبر مبارک کی طرف رخ کر کے آپ کے توسل سے حق تعالیٰ سے دعا مانگنی درست ہے؟

جواب: ہمارے نزدیک طریقہ یہ ہے اور اسی پر ہمارا اور ہمارے مشائخ کا عمل چلا آ رہا ہے کہ زیارت کے وقت جناب رسول اللہ ﷺ کے چہرہ اقدس کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو، اور دعا بھی اسی طرح (کھڑے کھڑے) کرے، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے زبدۃ المناسک میں بصراحت تحریر فرمایا ہے اور جواز توسل نمبر ۳، ۴ میں لکھا جا چکا ہے کہ وہ جائز ہے۔

سوال: جناب رسول ﷺ پر بکثرت درود شریف پڑھنے اور دلائل الخیرات پڑھنے کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: جناب رسول ﷺ پر بکثرت درود شریف پڑھنا نہایت پر امید نیکی ہے، چاہے دلائل الخیرات پڑھ کر ہو یا کسی اور طرح اور افضل درود شریف وہ ہے جو خود جناب رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمایا ہے۔ دلائل الخیرات حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ خود بھی پڑھا کرتے تھے اور اس کے پڑھنے کی ان سے کوئی اجازت چاہتا تھا تو اجازت بھی دیا کرتے تھے۔

سوال: کیا ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تمام ہی اصول وفروع میں تقلید درست ہے یا نہیں۔ اگر درست ہے تو وہ مستحب ہے یا واجب؟

جواب: اس زمانہ میں ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید (اتباع) واجب اور ضروری ہے۔ ورنہ ہمارے تجربہ میں یہ بات آئی ہے کہ ترک تقلید کا نتیجہ الحاد اور زندقہ میں مبتلاء ہو جانا ہوتا ہے۔ اعاذنا اللہ اسی لئے ہمارے مشائخ اور ہم اصول اور فروع سب میں امام المسلمین ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد ہیں۔ ہمارے مشائخ کی تمام تصنیفات اس کی دلیل ہیں۔

سوال: کیا آپ کے نزدیک صوفیہ کرام کے اشغال (ان کے بتلائے ہوئے طریقوں سے ذکر واذکار کرنے) اور بزرگوں سے بیعت ہونا جائز ہے، اور کیا آپ اس بات کو مانتے ہیں کہ اکابر کے سینوں اور ان کی قبروں سے باطنی فیوض حاصل ہوتے ہیں؟ اور کیا اہل سلوک بڑے بڑے مشائخ کی روحانیت سے مستفید ہوتے ہیں؟

جواب: ہمارے نزدیک بیعت ہونا مستحب ہے اور بزرگوں کے طریقوں پر ذکر کرنا درست ہے، تاکہ مرتبہ احسان (جو حدیث میں تعلیم فرمایا گیا ہے) حاصل ہو اور اکابر کے سینوں اور قبروں سے باطنی فیوض کا پہنچنا بھی درست ہے، لیکن اس کے حاصل کرنے کا طریقہ اور اہلیت یہ عام لوگوں کو نہیں بلکہ خاص لوگوں کو معلوم ہوتا ہے۔

سوال: کیا آپ حضرات کائنات میں کسی کو جناب رسول اللہ ﷺ سے افضل سمجھتے ہیں؟

جواب: ہمارا اور ہمارے مشائخ کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔ فضیلت میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ جیسا کوئی نہیں بلکہ آپ کے درجہ کے قریب بھی کوئی نہیں جو آپ کے درجہ رفیعہ کو پہنچے۔ آنحضرت ﷺ تمام انبیاء اور تمام رسولوں کے سردار ہیں اور خاتم النبیین ہیں جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے اور یہی ہمارا عقیدہ ہے اور ہمارے مشائخ کرام نے متعدد تصانیف کے ساتھ یہ صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

سوال: کیا آپ لوگ جناب رسول ﷺ کے بعد کسی اور نبی کا وجود جائز قرار دیتے ہیں اور جو شخص یہ کہتا ہو کہ ایسا ہو سکتا ہے، اس کے بارے میں آپ حضرات کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہمارا اور ہمارے مشائخ کرام کا یہ عقیدہ ہے کہ سرور کائنات حضرت محمد ﷺ خاتم النبیین ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں "لانبی بعدی" اور حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "ولٰکن رسول اللہ و خاتم النبیین" لیکن محمد (ﷺ) اللہ کے سچے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور یہ مسئلہ بہت سی حدیثوں سے جو تواتر کی حد کو پہنچتی ہیں۔ ثابت ہے اور اس پر پوری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والتحیہ کا اجماع ہے۔ حاشا کہ ہم میں کوئی بھی اس کے خلاف کہتا ہو، کیونکہ جو آپ کی ختم نبوت کا انکار کرے تو وہ ہمارے نزدیک کافر ہے، کیونکہ وہ نص قطعی اور نص صریح کا منکر ہے[1]

[1] امام اہل سنت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ نے "تحذیر الناس" میں قرآن پاک حدیث شریف اور تواتر واجماع وغیرہ مختلف ومتعدد دلائل سے حضور خاتم النبیین ﷺ کی ختم نبوت زمانی کو ثابت فرما کر اس کے منکر کو کافر قرار دیا ہے۔
(ملاحظہ ہو تحذیر الناس ص ۱۸)
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سوال: کیا آپ حضرات یہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی فضیلت بس اتنی ہے، جیسے بڑے بھائی کی چھوٹے بھائی پر ہوتی ہے اور کیا آپ کے کسی شخص نے ایسا لکھا ہے؟

جواب: ہم میں یا ہمارے اسلاف کرام میں ہرگز کبھی اور کسی کا بھی عقیدہ نہ رہا ہے اور ایسی خرافات تو کوئی ضعیف سے ضعیف ایمان والا شخص بھی زبان پر نہیں لاسکتا اور جو شخص یہ کہے کہ اس پر جناب رسول اللہ ﷺ کی فضیلت اتنی ہی ہے، جتنی بڑے بھائی کی چھوٹے بھائی پر ہوتی ہے تو ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

سوال: کیا آپ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا علم فقط احکام شرعیہ کی حد تک ہی تھا یا آپ کو ذات وصفات باری تعالیٰ اور اسرار مخفیہ کے علوم اور حکمتیں وغیرہ بھی عطا ہوئی تھیں، جہاں تک مخلوقات میں کسی اور کی رسائی نہیں ہوئی، چاہے وہ مخلوق کوئی بھی ہو۔

جواب: ہم زبان سے بھی کہتے ہیں اور دل میں بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارے آقا جناب رسول اللہ ﷺ کو ہی تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ علم عطا ہوا تھا۔ حضور علیہ السلام کو ذات وصفات باری تعالیٰ شرعی احکام جو عملی ہوں اور نظری حکمتیں اور حقیقت ہائے حقہ اور اسرار مخفیہ وغیرہ تمام ہی علوم آپ کو اتنے عطاء ہوئے تھے جن تک مخلوقات میں سے کوئی بھی نہیں پہنچتا، نہ مقرب فرشتہ اور نہ نبی مرسل اور آپ کو اوّلین وآخرین کے علوم عطاء ہوئے تھے۔ ارشاد ربانی ہے: وکان فضل اللہ علیک عظیماً!

سوال: کیا آپ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ابلیس لعین حضور سید کائنات علیہ السلام سے زیادہ علم رکھتا ہے اور اس کا علم آنحضرت ﷺ سے علی الاطلاق زیادہ علم رکھتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسا عقیدہ رکھتا ہو تو اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: ابھی ہم لکھ چکے ہیں کہ جناب رسالت مآب ﷺ علی الاطلاق مخلوقات میں سب سے زیادہ علوم اور حکمتوں اور اسرار الٰہیہ کے جاننے والے ہیں آپ کو تمام آفاق ملکوت کا سب سے زیادہ علم ہے اور ہمارا یقین ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ فلاں جناب رسول اللہ ﷺ سے زیادہ بڑا عالم ہے وہ کافر ہے اور ہمارے حضرات نے اس شخص کے کافر ہونے کا فتویٰ دیا ہے، جو یہ کہے کہ ابلیس لعین جناب رسول اللہ ﷺ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔

سوال: کیا آپ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی ولادت کا ذکر شرعاً برا ہے، بدعت سیئہ ہے جو حرام ہے یا اور کچھ کہتے ہیں؟

جواب: یہ بات کوئی بھی مسلمان ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ چہ جائیکہ ہم یہ کہیں کہ بدعت اور حرام ہے، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ تمام احوال کہ جن کا جناب رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس سے ادنیٰ سا بھی تعلق ہو، اعلیٰ درجہ کا مستحب

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) نیز "مناظرہ عجیبہ" (در توضیح تحذیر الناس) میں بھی حضرت نانوتوی ارشاد فرماتے ہیں: "اپنا دین وایمان ہے بعد رسول اللہ ﷺ کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں، جو اس میں تامل کرے اس کو کافر سمجھتا ہوں ص ۱۴۴" آپ جانتے ہیں کہ سب سے پہلے قادیانیوں کے خلاف منظم جدوجہد کا آغاز کرنے والے امام اہل سنت والجماعت حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ پھر امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور پھر آخر میں مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ اور ان حضرات کی جماعت احرار اسلام اور اب ان ہی کی مجلس تحفظ ختم نبوت ہے۔

ومندوب ہے، خواہ وہ آپ کی ولادت شریفہ کا ذکر ہو یا آپ کے اٹھنے، بیٹھنے، سونے، جاگنے کا ہو (حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری رحمہ اللہ) جو حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی ثم المکی کے شاگرد ہیں نے مجلس میلاد کے متعلق فتوی تحریر فرمایا ہے کہ ولادت شریفہ کے متعلق روایات صحیحہ کا بیان مجلس میں منکرات سے بچتے ہوئے برطریقہ مشروعہ برائے مندوبات خلوص نیت کے ساتھ ہو تو یقیناً وہ اذکار حسنہ میں داخل ہے اور خیر و برکت کا موجب ہے۔

(رسالہ المہند علی المفند عقائد اہل سنت والجماعت، مجموعہ رسائل عقائد علماء دیوبند ۲۴۷)

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہ کے اس فتویٰ پر علماء عرب وعجم نے تصدیق کی مہریں ثبت کیں، جن کی فہرست حسب ذیل ہے:

تصدیقات علماء عرب وعجم

علماء مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ

- ☆... الشیخ محمد سعید بابصیل الشافعي رحمہ اللہ الشیخ العلماء بمکة المکرمة والامام والخطیب بالمسجد الحرام
- ☆... الشیخ احمد رشید الحنفي
- ☆... الشیخ محب الدین المهاجر المکي الحنفي
- ☆... الشیخ محمد صدیق الافغانی المکی
- ☆... الشیخ محمد عابد المکي مفتي المالکیه
- ☆... الشیخ محمد علی بن حسین المالکی مدرس الحرام
- ☆... السید احمد البرزنجی الشافعي المفتي المدینة المنوره
- ☆... الشیخ رسوحي عمر المدارس بمدرسة الشفاء
- ☆... الشیخ الملا محمد خان البخاری الحنفي المدرس في الحرم النبي الشریف
- ☆... الشیخ خلیل بن ابراهیم المدرس في الحرم النبي الشریف
- ☆... السید احمد الجزائري شیخ المالکیة بالحرم الشریف النبوی
- ☆... الشیخ محمد السوسي الخیاري المدرس بالمسجد الشریف النبوی
- ☆... الشیخ عمر بن حمدان المحرسی المدرس بالمسجد الشریف النبوی
- ☆... الشیخ موسی کاظم بن محمد المدرس في باب السلام المدنیة المنورة
- ☆... الشیخ معصوم احمد سید المدرس بالحرم الشریف النبوی
- ☆... الشیخ احمد بن محمد خیر الحاج الباسي المدرس المسجد الشریف
- ☆... الشیخ محمود عبد الجواد المدرس بالحرم الشریف النبوی
- ☆... الشیخ محمد حسن السندی المدرس بالحرم الشریف النبوی
- ☆... الشیخ محمد بن عمر الفلانی المدرس بالحرم الشریف النبوی

☆... الشیخ ابن نعمان محمد منصور المدرس بالمدینة المنورة

☆... الشیخ الملا باطی المدرس بالحرم الشویف النبوی

☆... الشیخ احمد باطی المدرس بالحرم الشریف النبوی

☆... الشیخ عبداللہ النابلسي الحنبي المدرس بالحرم النبوي

☆... الشیخ احمد بن احمد اسعد المدرس في الحرم الشریف النبوي

☆... الشیخ احمد بن محمد خیر الشنقیطي المالکي المدني

☆... حضرت الشیخ سلیم البشری شیخ العلماء بالجامع مع الأزهر الشریف (شیخ الازهر مصر)

☆... حضرت السید محمد ابو الخیر الشهیر بابن عابدین الحسیني النقشبندي الدمشقی (اولاد علامہ شامی صاحب فتاوی شامی)

☆... الشیخ مصطفی بن احمد الشطي الحنبلي دمشق (شام)

☆... الشیخ محمو در شید العطار (الشامی)

شام میں حما علمی مقام ہے، وہاں جامع سلطانہ درسگاہ تھی، جہاں آج کل حافظ الاسد شیعی باطنی کے خلاف بغاوت ہوئی تھی، وہاں کے علماء کی تصدیقات:

☆... الشیخ محمد بوشی الحموی

☆... الشیخ محمد سعید الحموي

☆... الشیخ علي بن محمد الدلال الحموي

☆... الشیخ محمد ادیب الحرراکی

☆... الشیخ عبدالقادر لبابیدي

☆... الشیخ محمد سعید الحنفی

☆... الشیخ فارس بن احمد اشفقه الحمري

☆... الشیخ مصطفی الحداد

مشاہیر علماء عرب

☆... الشیخ احمد ابن المامون البغلیش

☆... الشیخ محمد توفیق المدرس و خطیب جامع السروحی بدمشق

☆... الشیخ عبداللہ القادر بن محمد بن سوده العرسی ولیه

مشاہیر اکابر علماء دیوبند

☆...... اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

☆...... مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند وصدر مہتمم دارالعلوم دیوبند

☆...... مولانا حافظ محمد احمد صاحب (ابن مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) صدر مفتی حیدرآباد دکن
☆...... مولانا حبیب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند
☆...... مولانا محمد مسعود صاحب ابن مولانا رشید احمد صاحب تھانوی
☆...... حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
☆...... حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری
☆...... مولانا قدرت اللہ صاحب مرادآباد
☆...... مولانا محمد اسحاق صاحب نہٹوری
☆...... مولانا ریاض الدین صاحب مدرس مدرسہ عالیہ میرٹھ
☆...... حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی
☆...... مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی
☆...... مولانا سراج احمد صاحب سروحنہ میرٹھ
☆...... مولانا محمد اسحاق صاحب مدرس مدرسہ اسلامیہ میرٹھ
☆...... مولانا مصطفیٰ صاحب میرٹھ
☆...... مولانا محمد یحییٰ صاحب سہسرامی مدرس مدرسہ مظاہرالعلوم سہارنپور
☆...... مولانا کفایت اللہ صاحب گنگوہی مدرس مدرسہ مظاہرالعلوم سہارنپور

***

الشیخ محمد بن عبدالوہاب حنبلی کا حیاۃ النبی ﷺ کے بارے میں عقیدہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سعودی حکومت کے مسلمہ روحانی پیشواء الشیخ محمد بن عبدالوہاب النجدی الحنبلی جن کی توحید وسنت کے بارے میں سختی ضرب المثل ہے کہ اگر کوئی بھی شخص مسئلہ توحید میں سختی کرتا ہے تو اس سختی کی وجہ سے ان کی طرف نسبت کر کے اس کو وہابی کہا جاتا ہے، ان شیخ محمد بن عبدالوہاب کا عقیدہ بھی مسئلہ حیات النبی کے بارے میں وہی ہے جو تمام دنیا کے مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب اپنے رسالہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈا میں تحریر فرماتے ہیں کہ (والہدیۃ السنیۃ ص ۴۱) میں شیخ کے صاحبزادے عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: ''ہمارا عقیدہ اور ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا درجہ اور مرتبہ تمام مخلوقات میں سب سے اعلیٰ اور افضل ہے اور آپ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور آپ کی یہ حیات برزخی حیات ہے اور یہ شہداء کرام کی حیات سے زیادہ بلند درجے کی ہے، کیونکہ بلاشک وشبہ آپ ﷺ شہداء سے افضل ہیں اور آپ سلام عرض کرنے والے کا سلام سنتے ہیں۔''

اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نے خود اپنے رسالہ احکام تمنی الموت میں بہت سی احادیث اور واقعات نقل فرمائے ہیں جس سے اس قضیہ کے بارے میں ان موقف مزید واضح ہوجاتا ہے، یہ رسالہ سعودی عرب کی مشہور یونیورسٹی (جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ بالریاض) نے ''اسبوع الشیخ الامام محمد بن عبدالوہاب'' کے موقعہ پر جب شیخ کی تمام تصانیف کو یکجا چھپوا کر شائع کیا۔ جو اسی مجموعہ کے ساتھ چھپا ہوا ہے، وہیں سے ہم بعینہ چند احادیث مع ترجمہ اور چند واقعات کا ترجمہ نقل کرتے ہیں: ''اخرج مسلم عن انس ان النبی ﷺ لیلۃ اسری بہ مر بموسیٰ علیہ السلام وھو قائم یصلي في قبرہ''

ترجمہ: امام مسلم نے حضرت انس ہی کی روایت سے حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ میں شب معراج میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا وہ اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔

''ولابي نعیم عن جبیر قال: انا واللہ الذی لا الٰہ الا ھو ادخلت ثابتا البناني في لحدہ، ومعی حمید الطویل، فلما سوینا علیہ اللبن، سقطت لبنۃ، فاذا انا بہ یصلی في قبرہ''

ترجمہ: حضرت ابونعیم نے حضرت جبیر سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں اس اللہ کی قسم کہ جس کے سواء کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ میں نے ثابت بنانی کو قبر میں اتارا، اور میرے ساتھ حمید تھے۔ پس جب ہم نے...... ان پر اینٹیں درست کیں تو ایک اینٹ گرگئی۔ پس میں نے ان کو دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔

''ولہ ولابن جریر عن ابراھیم بن المھلبي قال: حدثني الذین کانو ایمرون بالجص بلاسحار، قالوا: کنا اذا مررنا بجبانۃ قبر ثابت البنانی سمعنا قراءۃ القرآن''

ترجمہ: ابن جریر نے حضرت ابراہیم بن المہلبی سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم حضرت ثابت بنانی رحمہ اللہ کی قبر پر گزرتے تھے تو قبر سے قرآن پاک پڑھنے کی آواز سنتے تھے۔

''وللترمذي وحسنہ عن ابن عباس قال: ضرب بعض اصحاب النبي ﷺ خباءہ علی قبر، وھو لا یحسب انہ قبر، فاذا فیہ انسان یقرأ سورۃ الملك حتی ختمھا، فأتی النبي ﷺ فاخبرہ فقال رسو ل اللہ ﷺ (ھی المانعۃ، ھی المنجیۃ، تنجیہ من عذاب القبر)''

ترجمہ: ترمذی میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے کہ بعض صحابہ نے ایک جگہ خیمہ لگایا، انہیں پتہ نہیں تھا کہ یہاں قبر ہے اچانک وہاں ایک آدمی کی آواز سنی کہ سورۃ تبارک الذی اس نے اخیر تک پڑھی، پس انہوں نے حضور اقدس ﷺ کو واقعہ کی اطلاع کی۔ پس آپ نے فرمایا کہ سورۃ تبارک الذی عذاب قبر سے بچانے والی ہے۔

''ولابن ابي شیبۃ عن ابن سیرین قال: کان یحب حسن الکفن، ویقول: انھم یتزاورون فی اکفانھم، ومعناہ فی مسند ابن ابی اسامۃ عن جابر مرفوعا، وفیہ: ویتباھون ویتزاورون فی قبورھم''

ترجمہ: ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن سیرین سے نقل کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ وہ اچھے کفن کو پسند کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ مردے کفنوں میں ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور اسی جیسی حدیث مسند ابن ابی اسامہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعا یہ نقل کی گئی ہے کہ وہ باہم فخر کرتے ہیں اور قبروں میں زیارت کرتے ہیں۔

"للترمذی و ابن ماجه و محمد بن یحییٰ الهمدانی فی صحیحه عن ابی قتادة مرفوعا: (اذا ولی احدکم اخاه فلیحسن کفنه، فانهم یتزاورون فی قبورهم"

ترمذی، ابن ماجہ اور محمد بن یحییٰ الہمدانی نے اپنی صحیح میں حضرت ابوقتادہ سے مرفوعا روایت کی ہے کہ اپنے بھائی کو اچھا کفن پہناؤ کہ وہ قبروں میں ملاقاتیں کرتے ہیں۔

"اخرج ابن عبد البر عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ (ما من احد یمر بقبر اخیه المؤمن، کان یعرفه فی الدنیا فیسلم علیه الا عرفه ورد علیه السلام) صححه عبد الحق، وفی الباب عن ابی هریرة وعائشه"

ترجمہ: ابن عبدالبر نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے: نہیں ہے کوئی بھی شخص جو کہ اپنے مومن بھائی کی قبر پر گزرتا ہے، جب کہ وہ اس کو دنیا میں پہچانتا تھا، مگر یہ کہ وہ (قبر والا) اس کو پہچان لیتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے، شیخ عبدالحق نے اس روایت کو صحیح کہا ہے اور اس باب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت ہے۔

"ولاحمد والحاکم عنها قالت: کنت ادخل البیت، فاضع ثوبی، واقول: انما هو ابی و زوجی فلما دفن عمر معهما ما دخلته الا وانا مشدودة علی ثیابی حیاء من عمر"

ترجمہ: احمد و حاکم میں حضرت عائشہ صدیقہ ام المؤمنین سے روایت ہے کہ میں گھر (یعنی روضہ اقدس) میں داخل ہوتی اور کپڑے رکھ لیتی تھی اور کہتی تھی وہ تو میرے باپ اور خاوند ہیں، پس جب حضرت عمر کو ان دونوں (جناب رسول اللہ ﷺ و صدیق اکبر) کے ساتھ دفنایا گیا تو پھر میں پردے کا اہتمام کرتی تھی، حضرت عمر سے حیا کی وجہ سے۔ (کہ وہ غیر محرم تھے)

"واخرج ابن سعد عن ابن المسیب، انه کان یلازم المسجد ایام الحرة، والناس یقتلون، قال: کنت اذا حانت الصلاة اسمع اذانا یخرج من قبل القبر النبوی"

ترجمہ: ابن سعد نے ابن المسیب سے روایت کیا ہے کہ واقعہ حرہ کے زمانہ میں وہ مسجد میں رہا کرتے تھے اور لوگ لڑائی میں مشغول تھے، وہ فرماتے ہیں کہ جب نماز کا وقت ہوتا تھا تو میں حضور نبی کریم ﷺ کی قبر شریف کے اندر سے اذان کی آواز سنتا تھا۔

اب ہم اس کتاب سے اختصار کے پیش نظر چند واقعات کا ترجمہ کر کے درج کرتے ہیں۔

ابن ابی الدنیا نے راشد بن سعد سے ایسی سند کے ساتھ جس میں کوئی حرج نہیں ہے) روایت کیا ہے کہ:

"ایک صحابی کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا، انہوں نے خواب میں عورتوں کو دیکھا لیکن ان کی بیوی ان میں شامل نہ تھی، ان صحابی نے عورتوں سے اپنی بیوی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ تم نے اپنی بیوی کے کفن میں کمی اور واقعہ ہی ہیں ایسے صاحب کے پاس گئے، جن کے انتقال کا وقت قریب تھا اور جا کر نہیں ساری بات جلائی۔ انصاری کہنے لگا: اگر کوئی شخص مردوں کو کوئی چیز پہنچا سکتا ہے تو میں ضرور پہنچادوں گا، جب انصاری کا انتقال ہو گیا تو یہ صحابی دو خوشبودار کر دی تھی، اس لئے اب ہمارے ساتھ نکلتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ صحابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور پورا واقعہ بتلایا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: دیکھو! کوئی قابل اعتماد آدمی جانے والا ہے؟ یہ صحابی انصار میں سے ایک زعفرانی رنگ کے کپڑے لائے اور ان انصاری کے کفن میں رکھ دیئے، اگلی رات آئی تو ان صحابی نے پھر عورتوں کو کر دیا کہ اب ان کے ساتھ ان کی بیوی بھی تھیں، وہ دونوں زعفرانی کپڑے ان کے زیب تن تھے۔"

ابن الجوزی نے محمد بن یوسف فریابی سے بھی اس قسم کا واقعہ نقل کیا ہے کہ: ایک عورت نے اپنی والدہ کو خواب میں دیکھا اور والدہ نے کفن کے ٹھیک نہ ہونے کی شکایت کی۔ لوگوں نے یہ خواب محمد فریابی سے بیان کیا اور بتلایا کہ خواب میں عورت کی والدہ نے فلاں عورت کے ساتھ کفن بھجوانے کی ہدایت کی ہے۔"

محمد فریابی کہتے ہیں کہ جب مجھے یہ واقعہ سنایا گیا تو مجھے فوراً وہ حدیث یاد آ گئی کہ: "مردے اپنے کفن میں ایک دوسرے کی ملاقات کو جاتے ہیں" میں نے ان سے کہا کہ اس کے لئے کفن خرید لو۔ اس دن اس عورت کا بھی انتقال ہو گیا، جس کے ساتھ والدہ نے کفن بھجوانے کی وصیت کی تھی، چنانچہ لوگوں نے والدہ کا کفن اس عورت کے کفن کے ساتھ رکھ دیا۔ (احکام تمنی الموت ص ۴۱، ۴۲، از شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب)

اللہ جل شانہ کی قدرت سے تو بعید نہیں، عمل شریعت مطہرہ کے مطابق ہی کرنا چاہیئے

ایک نوجوان بڑا عابد، زاہد تھا۔ مسجد میں اکثر رہا کرتا تھا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے گھر گیا، جہاں اس کا بوڑھا باپ تھا، راستہ میں ایک حسین کے ساتھ آنکھیں چار ہو گئیں۔ ایک عورت کو اس سے عشق ہو گیا۔ وہ عورت ہمیشہ راستہ میں کھڑی رہا کرتی، ایک دن عورت نے اس کو بہکایا، وہ بھی ساتھ ہو لیا اور دروازہ پر پہنچ کر جب عورت اندر چلی گئی یہ بھی جانے لگا تو اللہ تعالیٰ کی یاد نے نشہ توڑ دیا اور یہ آیت اس کی زبان پر جاری ہو گئی۔ "ان الذین اتقوا اذا مسھم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ھم مبصرون" تو وہ نوجوان غش کھا کر گر گیا۔ اس عورت نے اپنی مدد کے لئے اپنی باندی کو بلایا اور دونوں نے مل کر اٹھا کر اس کے دروازہ تک پہنچایا اور دروازہ کو کھٹکھٹایا، بوڑھا باپ نکل کر آیا تو دیکھا کہ لڑکا دروازہ پر بے ہوش پڑا ہے، اس نے اپنے گھر کے لوگوں کو بلایا اور اسے اٹھا کر اندر گھر میں لے گئے، رات کے بڑے حصہ کے بعد اس کو ہوش آیا، باپ کے پوچھنے پر سارا قصہ سنایا، باپ نے پوچھا کون سی آیت پڑھی تھی۔ لڑکے نے اوپر والی آیت پڑھی اور پھر بے ہوش ہو کر گیا۔ لوگوں نے حرکت دی تو وہ مر چکا تھا۔ اس کو رات ہی کو دفن کر دیا گیا۔ صبح کو یہ قصہ حضرت عمر تک پہنچا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باپ کے پاس جا کر اس کی تعزیت کی اور فرمایا کہ مجھے کیوں نہ خبر کی تو انہیں نے عرض کیا کہ امیر المومنین رات کو وقت تھا، حضرت عمر نے فرمایا کہ اس کی قبر پر مجھے لے چلو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ساتھیوں کے ساتھ قبر پر پہنچے اور اس کو مخاطب کر کے یہ آیت پڑھی: "ولمن خاف مقام ربہ جنتان" تو قبر میں سے دو دفعہ آواز آئی کہ: اے عمر! اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ دونوں جنتیں عطاء فرما دیں۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے ابی عثمان نہدی سے، انہوں نے ابن مینا سے نقل کیا ہے کہ: "وہ ایک قبر کے پاس پہنچے اور دو رکعت پڑھی اور قبر پر ٹیک لگالی، وہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم میرا قلب جاگ رہا تھا کہ اچانک میں نے قبر سے ایک آواز سنی کہ صاحب قبر نے کہا پرے کو ہٹو مجھے اذیت نہ دو تم زندہ لوگ عمل کرتے ہو، مگر اس کے بدلہ کو نہیں دیکھتے اور ہم لوگ ثواب کو دیکھتے ہیں، عمل نہیں کر سکتے، تم نے جو دو رکعتیں پڑھی ہیں، وہ میرے نزدیک اتنے اتنے ثواب یا بدلہ) سے زیادہ محبوب ہیں۔" (احکام تمنی الموت از شیخ محمد بن عبدالوہاب)

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ
بَلْ أَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (القرآن)

اَلْاَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ (الحدیث)

تَسْکِیْنُ الصُّدُوْر

فی تحقیق احوال الموتیٰ فی البرزخ والقبور

تالیف: شیخ الحدیث

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ

جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ الآية (قرآن کریم)

اَلْاَنْبِيَاءُ اَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ (حدیث شریف)

تَسْكِيْنُ الصُّدُوْرِ

فِيْ تَحْقِيْقِ اَحْوَالِ الْمَوْتٰى فِي الْبَرْزَخِ وَالْقُبُوْرِ

جس میں قرآن کریم صحیح احادیث اور حضرات سلف صالحین کی واضح عبارات سے قبر کا مفہوم اور راحت و عذاب قبر کے بارے میں اسلامی نظریہ بیان کیا گیا ہے اور بہ صحیح احادیث اور ٹھوس عبارات سے قبر میں اعادۂ روح پر نفیس اور مدلل بحث کی گئی ہے نیز حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبور میں حیات اور عند القبور ان کے سماع پر واضح دلائل اور براہین سے تحقیق کی گئی ہے اور عام سماعِ موتیٰ پر بھی مختصر مگر اصولی بحث کی گئی ہے اور مسئلہ توسّل پر بھی بحمد اللہ تعالیٰ سیر حاصل اور باحوالہ بحث کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں کئے گئے جملہ اعتراضات کے کتب تفسیر و عقائد شروح حدیث اور فقہ سے بفضلہ تعالیٰ مسکت جوابات عرض کئے گئے ہیں نیز اس طبع میں تسکین الصدور پر کئے گئے قابلِ توجہ اعتراضات کا بھی خوب جائزہ لیا گیا ہے۔ وَاللّٰہُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ط

مؤلفہ

ابو الزاہد محمد سرفراز خان صفدر خطیب جامع مسجد گکھڑ و صدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

ناشر

ادارۂ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم نزد گھنٹہ گھر، گوجرانوالہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تفصیلی فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(حرفے چند)

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ

پیدائش: ۱۹۱۴ء ...... وفات: ۵ر مئی ۲۰۰۹ء

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر ڈھکی چیتراں داخلی کٹرمنگ مانسہرہ کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ سے حاصل کی۔ دورۂ حدیث ۱۹۴۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے کیا۔ فراغت کے بعد ۱۹۴۳ء میں گکھڑ منڈی تشریف لائے۔ جامعہ نصرت العلوم گوجرانوالہ کے بانی مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی آپ کے برادر محترم تھے۔ ان کے ساتھ آپ شانہ بشانہ رہے۔ نصرت العلوم کے ''شیخ التفسیر'' مولانا عبدالحمید خان سواتی اور ''شیخ الحدیث'' مولانا محمد سرفراز خان تھے۔ آپ نے تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں سنت یوسفی کو زندہ کیا۔ آپ ہر دینی تحریک کے ہراول دستہ میں رہے۔ جمعیۃ علماء اسلام کے پلیٹ فارم سے نفاذ شریعت کے لئے سربکف رہے۔ آپ نے بدعت ورفض کے خلاف تحریر کے میدان میں امام اہل سنت کا کردار ادا کیا۔

پاکستان میں ''فتنہ انکار حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' نے سر اٹھایا۔ ۴ر اگست ۱۹۶۲ء کو جمعیۃ علماء اسلام نے اپنے مرکزی اجلاس میں بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ کیا اور ان مسائل کی ترتیب وتدوین اور ان کو باحوالہ مدلل ومبرہن کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی جو مواد جمع وترتیب کے بعد شائع کرے۔ اس کمیٹی کے سیکرٹری مولانا محمد سرفراز خان صفدر مقرر ہوئے۔ کمیٹی کے ممبران شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد یوسف بنوری، مفکر اسلام مولانا مفتی محمود، مولانا مفتی محمد شفیع سرگودھوی، شیخ الحدیث مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک مقرر ہوئے۔ آپ (مولانا صفدر) نے کتاب 'تسکین الصدور فی تحقیق احوال الموتی فی البرزخ والقبور'' مرتب فرمائی۔ کتاب کے مرتب ہونے کے بعد ۲۷، ۲۸ر نومبر ۱۹۶۷ء کو جامعہ خیر المدارس ملتان میں کتاب کا مسودہ سنانے کے لئے تاریخیں طے ہوئیں۔ مولانا سید محمد یوسف بنوری کو بروقت اجلاس کی اطلاع نہ ہوئی اور مولانا عبدالحق اپنی معروفیت کے باعث تشریف نہ لاسکے۔ البتہ طے شدہ تاریخ پر ملتان جامعہ خیر المدارس میں اجلاس منعقد ہوا۔ اوّل سے آخر تک مؤلف کتاب حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے کتاب کی خواندگی کی۔ مولانا خیر محمد جالندھری، مولانا مفتی محمود، مولانا مفتی محمد عبداللہ (ملتان)، مولانا محمد عبداللہ (ساہیوال)، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا قاضی مظہر حسین (چکوال)، مولانا محمد نذیر اللہ خان (گجرات) رحمہم اللہ کے سامنے یہ کتاب مکمل پڑھی گئی۔ اصلاح وترمیم پر بحث بھی ہوئی۔ اس کے بعد کتاب کا مسودہ منظور ہوا۔ ۳ر جون ۱۹۶۸ء میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ ہم نے اس مجموعہ میں اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۷۹ء کو شامل اشاعت کیا ہے۔ اس میں پہلے ایڈیشن کی نسبت اضافہ جات بھی ہیں۔ یوں یہ ایڈیشن اس لحاظ سے کامل ومکمل ہے کہ اس کتاب پر اگر فریق ثانی نے نقد قائم کیا تو اس کا جواب بھی آگیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب متفقہ دستاویز ہے کہ اس وقت کے اس خطہ کے نامور اکابر نے اس کتاب کو متفقہ طور پر دیوبند کا موقف قرار دیا۔ اس کتاب کی اشاعت پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ (ناشر)

تصدیقات علماء کرام

منبع العلوم ومخزن الفهوم، محی السنۃ الغرّاء، ماحی البدعۃ الظلماء، سند العلماء، رأس الاتقیاء، نمونہ سلف، صدر المدرسین

حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

صانہا اللہ تعالیٰ عن شر کل حاسد، محترم مولانا دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ! کتاب ''تسکین الصدور'' کا دو مرتبہ مطالعہ کیا پہلی مرتبہ سرسری طور پر اور دوسری مرتبہ کافی غور کے ساتھ مطالعہ میں کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بے مثل ہے اور واقعی اسم بامسمیٰ ''تسکین الصدور'' ہی ہے ہر مسئلہ نہایت واضح طریق پر دلائل سے آراستہ پیراستہ اور مخالفین کے دلائل کا صحیح ردّ جس سے دیکھنے والے کو حق معلوم کرنے میں زبردست امداد حاصل ہو سکے اور بشرط انصاف انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ پھر اس کے ساتھ مسلک کی پوری پوری رعایت یہ جملہ اُمور ایسے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ دل سے دُعا نکلتی ہے کہ خدایا اس کتاب کو اہل حق کے لئے مقبول بنا دے اور اس کے جامع کو دنیوی عزت کے ساتھ آخرت میں خادمانِ دین متین میں محشور فرمائے۔ آمین! میں نہایت عدیم الفرصت ہوں اسی بناء پر اس قدر تاخیر واقع ہوگئی جس سے آن محترم کو ضرور کلفت ہوئی ہوگی میں معافی کا خواستگار ہوں۔ والسلام

فخر الدین احمد غفرلہٗ ...... ۲رذی الحجہ ۱۳۸۹ھ

***

عروۃ الحبل المتین، رئیس الشیوخ الکرام، قطب فلک العلوم والعرفان، استاد العلماء رئیس المناظرین، صدر المفتیین

حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب مفتی اعظم دار العلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ

محترم مولانا محمد سرفراز خاں صاحب دامت فیوضہم

سلام مسنون عافیت مزاج کا طالب وداعی، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ کافی عرصہ کے بعد حاضر خدمت بذریعہ عریضہ ہو رہا ہوں جس کے لئے معذرت خواہ ہوں کتاب ''تسکین الصدور'' وصول ہوئی۔ شکر گزار ہوں وصول ہوتے ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ جناب والا نے کتاب کے ہر مبحث کو تشنہ نہیں چھوڑا مسائل کو دلائل صحیحہ اور نقول معتبرہ سے باحسن وجوہ ثابت کر دیا اور اہل سنت والجماعت کے عقیدے کو بطریق صحیح ثابت کرنے میں کسی قسم کا فتور واقع نہیں ہوا۔ اثبات عذاب قبر اور اثبات حیات انبیاء فی القبور کو جن دلائل حقہ سے ثابت کیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے طالب حق وہدایت کو کسی قسم کے چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔ متعنت اور معاند سے اُمید نہیں کہ وہ ہدایت قبول کرے۔ ان مسائل میں معاندین کے شبہات رکیکہ اور اعتراضات واہیہ میں ان کے جوابات دندان شکن دے دیئے ہیں اور ان شبہات کو زائل کر دیا ہے الحاصل کتاب تحقیقات سے مملو اور دلائل سے مشحون ہے۔ عوام وخواص دونوں طبقوں کے لئے بہت مفید ہے۔ پڑھنے کے بعد مجھ جیسے نااہل کے صدر کو تسکین اور دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر آپ کو عطاء فرمائے اور کتاب کو مقبول عام بنا دے اور گمراہوں کو ہدایت کے راستہ پر گامزن کرے۔ آمین! اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے مسائل کی تحقیق کے لئے موفق کیا ہے۔ فلہ

الحمد و الشکر ! اسی طرح آپ کی دوسری تصانیف بھی دلائل حقہ صحیحہ سے مزین ہیں کتاب مذکور میں جن مسائل پر آپ نے قلم فرسائی کی اور داد تحقیق دی ہے۔ میں اس کے ساتھ متفق ہوں کہ مسلک اہل سنت والجماعت کا ہے۔ واللہ اعلم ! دُعا گو و طالب دُعا سید مہدی حسن غفرلہٗ از شاہجہان پور محلہ جھنڈا کلاں مکان نمبر ۱۸، ۷، ۲۷/ اگست ۱۹۶۸ء

میں سترہ ماہ سے وطن میں ہوں صاحب فراش ہوں مفلوج ہوں نشست و برخاست دُشوار تر ہے، دارالعلوم سے رخصت لے رکھی ہے۔ ۸۸ سال کی عمر ہوگئی ہے ضعیف و کمزور ہوں کتاب دیو بند ہوتی ہوئی شاہ جہان پور پہنچ گئی۔ کل اعزاز نامہ بھی پہنچا چند سطور بمشکل لکھ کر حاضر خدمت ہوا ہوں۔ ودتم بالمعافیۃ والخیر!

***

شمس فلک الشریعۃ البیضاء، و بدر سماء الطریقۃ الغراء، فخر الاماثل، جامع الفضائل، رازیٔ وقت، غزالی دوراں

حضرت مولانا الحاج الحافظ القاری محمد طیّب صاحب دامت معالیہم مہتمم دارالعلوم دیو بند

الحمدللہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفی

رسالہ نافعہ تسکین الصدور مؤلفہ حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب صفدرؔ سے استفادہ نصیب ہوا۔ رسالہ کی وقعت وعظمت کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ مولانا سرفراز خاں صاحب کی تالیف ہے جو اپنی محققانہ اور معتدلانہ طرز تالیف میں معروف ہیں۔ تسکین الصدور حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع کے مسائل میں تسکین الصدور ہی ہے جس سے روحی اور قلبی تسکین ہو جاتی ہے۔ جن جن مسائل پر کلام کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ نہ صرف یہ کہ اہل السنت والجماعت کے مسلک اور مذہب منصور کے مطابق ہی نہیں بلکہ فی نفسہٖ اپنی تحقیقی رنگ کی وجہ سے پوری جامعیّت کے ساتھ منضبط ہو گئے ہیں اور ان سے دِلوں میں سُرور اور آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ مؤلف ممدوح کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطاء فرمائے اور ان کے علم و عرفان اور عمل و ایمان میں روز افزوں ترقیات عطا فرمائے۔ آمین !

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیو بند

۱۷/ ذیقعدہ ۱۳۸۹ھ

***

جامع العلوم العقلیہ والنقلیہ، المحدث الجلیل، ماہر اسماء الرجال، فقیہ زمان، حامی توحید و سنت و ماحیٔ شرک و بدعت، رئیس المحققین

حضرت مولانا محمد حبیب الرحمن الاعظمی دامت فیوضہم العالیہ

۱۰/ ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ ۵/ مارچ ۱۹۶۹ء

محب مکرم جناب ابوالزاہد مولانا محمد سرفراز خاں صاحب صفدرؔ سلمہ اللہ تعالیٰ و عافاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

ندامت ہے کہ آپ کے نامۂ لطف و کرم کا جواب بڑی تاخیر سے روانہ کر رہا ہوں ایک طرف سنن سعید بن منصور جلد سوم کا دوسرا حصہ چھپ رہا تھا۔ دوسری طرف المطالب العالیہ فی زوائد المسانید الثمانیہ کی تحقیق و تعلیق میں معروفیت تھی۔ اب اس کا ایک ربع پریس بھیج چکا ہوں تو ذرا دم لینے کی فرصت ملی ہے۔ اسی فرصت میں آپ کی کتاب تسکین الصدور کا اکثر حصہ بالاستیعاب پڑھا۔ باقی پر سرسری نظر ڈالی۔ ماشاء اللہ ! خوب لکھا ہے۔ ہر ہر گوشے پر سیر

حاصل بحث کی ہے اور ہر ہر دعویٰ کو مدلّل و مبرہن کیا ہے اور اصل مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ مجھے کتاب پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ حق تعالیٰ آپ کو تادیر زندہ وسلامت رکھے اور دین کی مزید خدمت کے لئے توفیق بخشے۔

(ص ۱۱۱) پر آپ نے لکھا ہے کہ: ''ممکن ہے بزار کی سند میں بھی الحسن بن قتیبۃ الخزاعی'' ہو۔ آپ کا یہ خیال صحیح ہے، بزار کی سند میں بھی وہ واقع ہے، مسند بزار میں سند کا ابتدائی حصہ یوں ہے: ''حدثنا محمد بن عبدالرحمٰن بن المفضل الحرانی ثناء الحسن بن قتیبة المدائنی'' میں نے یہ حدیث کشف الاستار فی زوائد مسند البزار للھیثمی میں دیکھی ہے۔ جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ مفتاح العلوم مئو ضلع اعظم گڑھ میں موجود ہے۔ خیر وعافیت سے مطلع فرمائیں۔

والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی

***

رئیس المناظرین، استاذ العلماء، عالم بے بدل، پیر طریقت، ماہر علوم عقلیہ ونقلیہ

حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علی آلہ و صحبہ اجمعین

کتاب تسکین الصدور فی تحقیق احوال الموتی فی البرزخ والقبور مؤلفہ حضرت مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صفدر صاحب اطال اللہ بقائہ وعم فیضہ کو میں نے اوّل سے آخر تک حرفاً حرفاً سنا اتباع سلف صالحین میں ہر مسئلہ میں مذہب جمہور کو قرآن وحدیث شریف صحیح وحسن وفقہ حنفی کے ذخیرہ کی روشنی میں مسائل کو اَدلّہ کثیرہ سے ایسا مبرہن کیا ہے کہ اس سے زائد کی گنجائش نہیں۔ ہر مسئلہ میں دلائل صحیحہ کا اس قدر انبار لگا دیا ہے کہ ہر منصف اس پر اعتبار واعتماد کرتے ہوئے اس کہنے پر مجبور ہے ؎

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

احقر: خیر محمد عفا اللہ عنہ از ملتان

***

سابق وزیر معارف شرعیہ ریاست ہائے متحدہ بلوچستان وشیخ التفسیر دار العلوم دیوبند وشیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل وحال صدر شعبۂ تفسیر اسلامی یونیورسٹی بہاول پور، جامع العلوم العقلیۃ والنقلیۃ

حضرت العلام مولانا محمد شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم السامیة

محترم المقام جناب مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خان صفدر دامت فیوضاتکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ! آپ کی کتاب تسکین الصدور فی تحقیق احوال الموتی فی البرزخ والقبور پہنچی۔ اس کے مندرجات مطالعہ سے گزرے۔ (۱) الم وراحت قبر اور انبیاء علیہم السلام کی۔ (۲) حیات فی القبور اور ان کے۔ (۳) سماع عند القبور اور عام سماع موتی اور توسل بمقبولین کے ابحاث کے تفسیری کلامی اور فقہی وحدیثی دلائل اور نقد الرواۃ کے مباحث بھی نظر سے گزرے۔ ان ابحاث پر آپ کی کتاب کا لُب لباب اہل السنۃ

والجماعۃ کے مسلک کے مطابق ہے اور منہج سلف صالحین کا آئینہ دار ہے۔ احقر ان سے متفق ہے اور دُعا کرتا ہے کہ اللہ جل مجدہ اس کتاب کو اہل زیغ کے لئے موجب ہدایت بنائے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس کتاب کی برکت سے متنازعین کا اختلاف ختم ہو جائے گا۔ بشرطیکہ توفیق الٰہی اور خشیۃ اللہ دستگیری فرمائے اور اتباع ہوئی کی آلائش سے قلب وضمیر کو پاکی نصیب ہو۔ احقر: شمس الحق افغانی عفا اللہ عنہ، بہاول پور

۸ جمادی الاُخریٰ ۱۳۸۸ھ

***

بحر العلوم، المحدث الکامل، الفقیہ الجلیل، المحقق النبیل

حضرت العلامہ مولانا السید محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰہ و کفٰی و سلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی خصوصا علٰی سیدنا محمد ن المصطفٰی و آلہ و صحبہ ما کفٰی و شفٰی۔ اما بعد!

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حیات بعد الممات کا مسئلہ صاف و متفقہ مسئلہ تھا۔ شہداء کی حیات بنص قرآن ثابت تھی اور دلالۃ النص سے انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات قرآن سے ثابت تھی اور احادیث نبویہ سے عبارت النص کے ذریعہ ثابت تھی۔ لیکن بُرا ہوا اختلافات اور فتنوں کا کہ ایک مسلمہ حقیقت زیر بحث آ کر مشتبہ ہوگئی۔ کتنے تاریخی بدیہات کو کج بحثیوں نے نظری بنا دیا اور کتنے حقائق شرعیہ کو کج فہمی نے مسخ کر کے رکھ دیا۔ یہ دنیا ہے اور دنیا کے مزاج میں داخل ہے کہ ہر دور میں کج فہم اور کج رو اور کج بحث موجود ہوتے ہیں۔ زبان بند کرنا تو اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے۔ ملاحدہ و زنادقہ کی زبان کب بند ہو سکی۔ کیا اس دور میں امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو افسانہ نہیں بنایا گیا اور کہا گیا کہ واقعہ ہے ہی نہیں اور کیا امام حسین رضی اللہ عنہ کو باغی واجب القتل اور یزید بن معاویہ کو امیر المؤمنین خلیفہ برحق ثابت نہیں کیا گیا۔ کسی صحیح حدیث کو ضعیف بنانے کے لئے کسی راوی کے بارے میں کتاب رجال میں جرح کا کوئی کلمہ دیکھا۔ بس کافی تھا کہ اس پر بنیاد قائم کی جائے اگر عقل سلیم سے کام نہ لیا جائے اور صرف کتاب میں جرح کو دیکھا جائے تو امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ تمام کے تمام ائمہ مجروح ہو کر دین کا سرمایہ ہی ختم ہو جائے گا۔

الغرض حیات انبیاء کرام علیہم السلام کا مسئلہ بھی تقریباً اسی قسم کے کج بحثوں میں اُلجھ کر اچھا خاصا فتنہ بن گیا عصمت تو انبیاء کرام علیہم السلام کا خاصہ ہے۔ علماء معصوم تو ہیں نہیں کچھ حضرات نے دانستہ یا نادانستہ حدیثی و کلامی بحثیں پیدا کر دیں اور سمجھا یہ گیا یا سمجھایا گیا کہ اس طرح توسل بالاموات اور استعانت بغیر اللہ وغیرہ وغیرہ بہت سے بدعات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ گویا علاج یہ تجویز کیا گیا کہ حیات انبیاء کرام علیہم السلام سے انکار کرنے ہی سے یہ مفاسد ختم ہو سکتے ہیں۔ اس کی مثال تو ایسی ہوئی کہ بارش سے بچنے کے لئے پرنالے کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ بہر حال ان تفصیلات میں جانے کی حاجت نہیں۔ اس خلفشار کو ختم کرنے کے لئے ارباب فکر و اخلاص نے چند حضرات کے نام تجویز کئے کہ اس اختلاف کو جس نے فتنہ کی شکل اختیار کر لی ہے، ختم کرنے کی کوشش کریں۔ راقم الحروف کا نام بھی ان میں شامل تھا۔ تجویز یہ ہوئی کہ اس موضوع پر ایک محققانہ کتاب مؤثر انداز میں لکھی جائے اور تشکیک پیدا کرنے والے حضرات کے

شبہات کے جواب بھی دیئے جائیں اور مسئلہ کے تمام گوشوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے۔ باتفاق رائے اس کام کے انجام دہی کے لئے جناب برادر گرامی مآثر مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز صاحب منتخب ہو گئے جن کے دماغ میں بحث و تمحیص کی صلاحیت بھی ہے قلم میں پختگی بھی علوم دینیہ اور حدیث و رجال سے اچھی قابل قدر مناسبت بلکہ عمدہ بصیرت بھی ہے، مختلف مکان سے غرر نقول جمع کرنے کی پوری قدرت بھی ہے اور حُسنِ ترتیب کی پوری اہلیت بھی۔ الحمد للہ! کہ برادر موصوف نے توقع سے زیادہ مواد جمع کر کے تمام گوشوں کو خوب واضح کر دیا ہے اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ میرے ناقص خیال میں اب یہ تالیف اس مسئلہ میں جامع ترین تصنیف ہے اور اس دور میں جتنی تصانیف اس مسئلہ پر لکھی گئی ہیں، ان سب میں جامع و واضح و عالمانہ بلکہ محققانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کی اس خدمت کو خلعتِ قبول سے نوازے اور مزید اس قسم کی خدمات کی توفیق عطاء فرمائے۔ عرصہ ہوا کہ میرے رفیق محترم جناب مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری جن کو حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ رحمہ اللہ کا نہ صرف شرف تلمذ حاصل ہے بلکہ فرزند نسبتی کا شرف بھی حاصل ہے، جن کے قلم سے صحیح بخاری کی محققانہ اُردو شرح انوار الباری وجود میں آ رہی ہے اور اب سے اِکتیس بتیس سال قبل مصر و استنبول کے علمی سفر میں رفیق طریق رہے، ان کے جواب میں ۱۳۷۹ھ قلم برداشتہ نہایت عجلت میں جو کچھ لکھا تھا نامناسب نہ ہوگا کہ اس خط کا کچھ اقتباس نقل کیا جائے۔ تاکہ میری ذاتی پرانی رائے بھی اس مسئلہ کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ اگرچہ وہ اشارات ہیں اور مخاطب ایک عالم تھے۔ تفصیل کی حاجت نہیں تھی۔ لیکن اس موضوع پر ایک جامع فیصلہ کی حیثیت سے ایک متن ہے۔ تشریح جتنی چاہئے کر لیجئے۔ واللہ المستعان!

محولہ بالا طویل مکتوب کے چند اقتباسات

۱...... شہداء کے لئے بنصِ قرآن "حیات" حاصل ہے اور مزید دفع تجوز (مجاز مراد نہ لیا جائے) کے لئے "یرزقون" کا ذکر بھی کیا گیا ہے، جیسے آج کل کا محاورہ بھی ہے: "فلان حیّ یرزق" عام اہل برزخ سے ان کی حیات ممتاز ہے۔

۲...... جب انبیاء کا درجہ عام شہداء سے اعلیٰ وارفع ہے تو بدلالۃ النص یا بالاولیٰ خود قرآنِ کریم سے ان کی حیات ثابت ہوئی (علیہم الصلوٰۃ والسلام) اور جب مرتبہ اعلیٰ وارفع ہے تو حیات بھی اقویٰ واکمل ہوگی۔

۳...... اسی حیات کی اکملیت کے بارے میں دو حدیثیں آئی ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاْکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ اور حدیث: اَلْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِهِمْ یُصَلُّوْنَ اور ان ہی احادیث کے شواہد کے طور پر دیگر احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ مثلاً: موسیٰ علیہ السلام کا تلبیۂ حج اور اس کے علاوہ روایات۔

۴...... رُوح کے تعلق اجساد سے پانچ قسم کے ہیں: (۱) فی حالۃ الجنین، (۲) بعد الولادۃ فی الدنیا (اور اس کی دو صورتیں ہیں)، (۳) حالت نوم میں اور حالت یقظہ میں، (۴) بعد الموت فی البرزخ، (۵) بعد البعث فی الحشر۔ ضعیف ترین اوّل ورابع ہے، قوی ترین خامس اور متوسط ثانیہ ہے، کما حققہ المتکلمون و ابن القیم فی کتاب الروح والقاری فی شرح الفقہ الاکبر۔

۵...... انبیاء کرام علیہم السلام کی نوم جیسے ممتاز ہے عام نوم سے۔ ان عینای تنامان ولا ینام قلبی۔ اسی طرح ان کی موت کی حالت بھی عام اموات جیسی نہیں۔ النوم اخو الموت اور عام موتی میں تحقیق موت کے لئے انقطاع الروح عن الجسد بالکلیہ ہوتا ہے اور یہاں بالکلیہ نہیں ہوتا اور پھر علو مرتبہ جتنا ہوتا ہے، اتنا ہی تعلق قوی ہوگا۔

۶...... مفارقت روح عن الجسد سے مفارقت تعلق الروح عن الجسد لازم نہیں آتا۔

۷...... اگر نبی کریم ﷺ کے جسد مبارک کو تروح کی کیفیت حاصل ہو جیسے معراج میں جسد پر رُوح کی کیفیت طاری ہوئی۔ تجسد اَرواح اور تروح اجساد دونوں کی نظیریں عالم شہادت میں ہیں۔ تو عالم ارواح میں کیوں استبعاد کیا جائے جب کہ اس کا تعلق عالمِ غیب سے ہے۔

۸...... دنیا میں صوفیہ کرام کے یہاں ابدانِ مثالیہ سے تعدّد وقت واحد میں متعدد امکنہ میں ظہور اور آثار کے ثبوت پر مشہور واقعات ہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی نقل وحرکت بالاجساد والمتروحہ اس کی نظیر ہوگی۔

۹...... الغرض انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے حیات، بقا، اجساد، نقل وحرکت، ادراک وعلم سب چیزیں حاصل ہیں۔

۱۰...... یہ حیات دنیوی حیات کے مماثل بلکہ اس سے اقویٰ ہے، دنیا میں ہمیشہ جسد کو رُوح کی خاصیت حاصل نہیں ہوتی اور برزخ میں ہوتی ہے۔ اب اگر اس کو ''حیات دنیوی'' سے بعض حضرات نے تعبیر کیا ہے تو اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کیا ہے۔ بہرحال وہ حیات دنیوی بھی ہے اور حیات برزخی بھی۔ صرف حیات برزخی نہیں جس میں عام شہداء یا اموات بھی شریک ہوں، بلکہ اقویٰ واکمل ہے۔ اس لئے حیات دنیوی کے مماثل، بلکہ اس سے بھی اقویٰ ہے۔ اختلاف تعبیرات میں نزاع لفظی ہے، اس دنیا سے رسمی تعلق منقطع ہونے کے بعد برزخی دور شروع ہوتا ہے۔ اب جو چاہے اطلاق کیا جائے۔

۱۱...... اگر احادیث ونصوص میں حیات کا ثبوت ہے اور پھر عدمِ نکاح بالازواج المطہرات اور عدم توریث وغیرہ کی علت اصل حیات کو کہا جائے تو درست ہے۔ بہرحال حکم شرعی کی کوئی علت ہی ہوتی ہے اور یہاں تو علت از قبیل العلل المعتبرۃ کے ہوگی، نہ کہ علل مرسلہ کی قسم سے اور اس علت کی تنقیح، اُصولی تنقیح الفاظ اور تحقیق المناط سے زیادہ قطعی ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب!

***

صاحب الفہم الباہر والرشد الزاہر، فقیہ النفس والبصیرۃ التامۃ، والملکۃ الراسخۃ

حضرت العلام المفتی جمیل احمد صاحب تھانوی دامت فیوضہم

مُبسلاً ومحمدلاً ومصلیاً ومسلماً

حضرت مولانا، علّامہ فاضل، فخر اماثل محمد سرفراز خان صفدر صاحب کی تازہ تالیف ''تسکین الصدور'' فی تحقیق احوال الموتیٰ فی البرزخ والقبور اوّل سے آخر تک حرفاً حرفاً پڑھی، یوں تو علّامہ موصوف کی ہر تالیف عمدہ سلیقہ کے ساتھ نہایت تحقیقات پر مشتمل ہر ایک بہت بہت معلومات افزا رُوح پرور اور دل نشین ہوتی ہے خصوصیت اور بے انتہا قابل قدر خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ بزرگانِ سلف سے ہی ہر بات ماخوذ ہوتی ہے خود رائی کو دین نہیں بنایا جاتا جو آج کل عام ہو رہا ہے۔ مجھے اس کتاب سے کچھ خاص دلچسپی ہوئی اور اس قدر کہ ہارٹ اٹیک اور بلڈ پریشر کی تشخیص پر ڈاکٹروں کی ممانعت کے باوجود شروع سے آخر تک دیکھ گیا۔

وجہ یہ تھی کہ تیس (۳۰) سال سے مجھے خود بھی ذاتی تجربہ یہ ہو رہا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جس مسئلہ میں جو نظریہ قائم کیا ہے واقع میں وہی راجح وحق ثابت ہوتا ہے جب خوب مکمل اور گہری تحقیقات کی جاتی ہے تو وہ اس سے سرِ مو تجاوز نہیں کر پاتی پوری تحقیقات کا نچوڑ آخر میں وہی دو لفظی مسئلہ نکلتا آنکھوں سے نظر آ جاتا ہے اس وقت

ان حضرات کے علم کا لدنی علم ہونا منکشف ہوتا ہے۔ اپنے اس ذاتی تجربہ اور ایسے ہی اور علماء کے اس تجربہ کا یہ نتیجہ دل و دماغ کی تہ میں جم جانا ضروری ہے کہ جو شخص کسی مسئلہ میں بھی ذرّہ برابر ان سے اختلاف رکھتا ہے وہ یقیناً کم نظری یا غلط فہمی یا کسی خارجی اثر میں مبتلاء ہے۔

ہم چند لوگوں کا ہی نہیں تمام اُمت کا کم و بیش یہی تجربہ ہے۔ چنانچہ دیوبندی عالم وہی نہیں کہلاتا جو دیوبند کا باشندہ یا تعلیم یافتہ ہو بلکہ ہر وہ عالم دین جو فقہ حنفی و عقائد کے راجح وقوی ترین مسائل پر عامل اور متقی ہو دیوبندی عالم کہلانے لگا۔ دہلی کے شاہ صاحبان، لکھنؤ کے مولانا عبدالحیؒ اور دوسرے اطراف کے اہل حق و تحقیق علماء جنہوں نے دیوبند کی شکل نہ دیکھی ہوگی علمائے دیوبند کہلائیں گے۔ حق و تحقیق و تقویٰ ان کی ایسی خصوصیت بن گیا کہ خود اسی کا نام دیوبندیت بن گیا۔

۸، ۱۰ ؍سال سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات کا انکار بعض ایسے عالموں کی طرف سے شائع ہونے لگا جو ہمارے اپنے شمار ہوتے تھے بہت جی چاہتا تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ اس مسئلہ کی پوری پوری تحقیق لکھ دے تو یقیناً ہر مسئلہ کی طرح یہاں بھی حق بات وہی ثابت ہوگی جو ان حضرات کی تحقیق کا دو لفظوں میں ثمرہ شائع ہو چکا ہے پھر ممکن ہے اشتباہ والے بزرگوں کو بھی صحیح راہ نظر آ سکے۔ خود تو کم صحت کم فرصت کم استعداد اس سے قاصر تھا بس دل میں یہ تمناء موجزن تھی۔

حضرت مولانا سرفراز خان صاحب نے بڑی محنت جانفشانی اور عرق ریزی سے یہ تحقیق مکمل کر دی ہے اللہ تعالیٰ نے میری وہ دلی تمنا مولانا کے ہاتھوں پوری فرما دی۔ اس لئے حرف حرف مزے لے لے کر پڑھتا چلا گیا۔ ہر ہر بحث پر دل باغ باغ ہوتا گیا اور دُعاؤں میں سرشار ہوتا رہا۔

للّٰہ الحمد برآں چیز کہ خاطر می خواست — آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

الحمد للہ! جیسا دل چاہتا تھا یہ کام انجام پا گیا احادیث کے اسناد کی صحت اور مفہومات کی تحقیقات شبہات کے جوابات ماشاء اللہ نور علیٰ نور ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مصنف کو بہترین جزاؤں سے دونوں جہان میں سرفراز فرمائیں اور مشتبہ آنکھوں کے لئے کتاب کو سرمۂ بصیرت بنائیں۔

جمیل احمد تھانوی ...... جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن لاہور

۱۹ ؍جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ

***

اُسوۃ الاصفیاء، ذروۃ سنام الدین، مجاہد جلیل، حافظ الحدیث امیر جمعیت علماء اسلام پاکستان

حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب درخواستی دامت برکاتہم

واجب الاحترام حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر دامت برکاتہم

سلام اللہ تعالیٰ علیکم و رحمۃ لدیکم! گرامی نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ تسکین الصدور کے اکثر حصے دیکھے اپنے موضوع میں مسلک اہل السنت والجماعت کے بیان میں کافی و شافی ہے اور پچھلی تصانیف سے مغنی ہے۔ دعا میں یاد فرمائیں۔

والسلام!

محمد عبداللہ مدرسہ عربیہ مخزن العلوم عیدگاہ خان پور...... ۷ نومبر ۱۹۶۷ء

***

قدوۃ العارفین، زبدۃ المحدثین، عمدۃ الفقہاء، واُسوۃ العلماء

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ہدیہ سنیہ ''تسکین الصدور'' موجب سرور وسکون ہوا۔ جستہ جستہ مقامات سے دیکھا، دل خوش ہوا۔ ماشاء اللہ! آپ نے حیات النبی ﷺ اور سماع موتی پر خوب کلام کیا ہے اور درمیان درمیان میں اُصولِ حدیث اور تنقید حدیث کا طریقہ بھی اچھا بیان کیا ہے۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء! فرصت ملی تو کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کروں گا۔ جعلنی اللہ وایاکم کمایحب ویرضی وجعل آخرتنا خیرًا من الاولی۔ والسلام!

ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو آلہ یار سندھ...... ۲۵/ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ

***

یادگارِ سلف، استاد العلماء، العالم النحریر، امام الفضلاء، شیخ الحدیث

حضرت مولانا محمد عبد الحق صاحب دامت معالیہم

مخدومی المحترم المکرم حضرت مولانا صاحب، شکر اللہ مساعیکم ودُمتم لاسلام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اُمید ہے مزاج گرامی بالخیر ہوں گے۔ کتاب ''تسکین الصدور'' سرور قلب، اور تبرید بصر کا موجب بنا۔ الحمد للہ کہ خداوند تعالیٰ نے اس عظیم اور اہم کام کی تکمیل اور اس کی اشاعت پذیر ہونے کا موقع میسر فرمایا۔ آنجناب جیسے فاضل بے بدل اور محقق کے نگارشات کے بارے میں کچھ کہنا گستاخی ہے۔ جن کی تحقیق کا سکہ سب مان چکے ہیں۔

بہرحال تعمیلِ اِرشاد میں اور استفادہ کی غرض سے کتاب کا مطالعہ کیا۔ بحمد اللہ کتاب میں جتنے مسائل کی تنقیح اور تشریح کی گئی ہے۔ سب کو اہل سنت والجماعۃ خصوصاً اکابر دیوبند کے مسلک کے موافق پایا۔ جس محنت اور عرق ریزی سے آپ نے ان مسائل کو تحقیقی دلائل اور اکابر ملت اور معتمد علماء کے اقوال سے مبرہن کیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو مسلمانوں کے اتحاد و اِتفاق اور ان مسائل میں مسلکِ حق کی پیروی اور تمسک بالکتاب والسنۃ کا ذریعہ بنا دے۔ مسئلہ حیات انبیاء میں طرفین کے دلائل کو جس تفصیل سے مشرح فرمایا ہے۔ خدا کرے اگلے ایڈیشن میں دیگر مسائل از قسم توسّل وغیرہ میں بھی فریق ثانی کے دلائل سے اس تفصیل سے تعرض فرمایا جائے۔

والسلام!

بندہ عبد الحق غفرلہٗ مہتمم دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک

***

سید العلماء، صفوۃ الصلحاء، سند الابرار، جامع الکمال، صادق الاحوال

حضرت العلّام مولانا محمد عبد الخالق صاحب رحمہ اللہ

میں کمترین عبد الخالق مظفر گڑھی تلمیذ وخلیفہ مجاز حضرت قبلہ مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ نے مولانا محمد

سرفراز خان صاحب کی تصنیف لطیف ''تسکین الصدور'' فی تحقیق احوال الموتی فی البرزخ والقبور کو بالاجمال اوّل سے آخر تک دیکھا ہے اور بعض مواقع تفصیلاً بھی دیکھے ہیں۔ اس میں مندرجہ مسائل کو نہایت محققانہ طور پر بیان کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں کئے گئے جملہ اعتراضات کے مسکت جواب دیئے گئے ہیں۔ (۱) قبر کے ثواب وعقاب کے مسئلہ کو چند آیات واحادیث صحیحہ سے ثابت کیا گیا ہے اور اہل السنۃ والجماعۃ کا اجماعی مسئلہ مانا گیا ہے۔ (۲) اور اعادۃ الروح الی الجسد کو صریح حدیثوں اور جمہور علماء اہل السنۃ والجماعۃ کے اقوال سے ثابت کیا گیا ہے۔ (۳) اور جس طرح ہر ذی رُوح کی موت قطعی ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی وفات کو قطعی مانا گیا ہے اور کتاب وسنت سے اس کا ثبوت پیش کیا گیا ہے اور اس کو اجماعی مسئلہ قرار دیا گیا ہے۔ (۴) حیٰوۃ الانبیاء فی القبور کو متواتر احادیث صحیحہ سے ثابت کیا گیا ہے اور اس کو بھی اجماعی مسئلہ قرار دیا گیا ہے۔ (۵) سماع الانبیاء عند القبور بلا واسطہ کو بھی احادیث سے اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تقریر سے اور جمہور علماء اہل السنۃ کے اقوال سے ثابت مانا گیا ہے۔ (۶) توسل فی الدعا کے مسئلہ کو بھی نہایت احسن طریق سے بیان کیا گیا ہے اور توسّل بصالح الاعمال کے جواز بلکہ استحباب کو متفق علیہ اور توسُّل بالذات کو متنازع فیہ بنزاع لفظی مانا گیا ہے۔ فَلِلّٰہِ در المؤلف بارک اللہ تعالٰی فی حیاتہٖ و فی حَسَنَاتِہٖ۔ مجھے ان کی تحقیقات سے کلّی اتفاق ہے۔

کتبہ عبدالخالق مظفر گڑھی

***

شیخ الاتقیاء، بقیۃ السلف، قدوۃ الخلف، وحید العصر

حضرت العلاّمہ مولانا خواجہ خان محمد صاحب

عمت مکارمہم خانقاہ سراجیہ کندیاں ضلع میانوالی

بَعد الحَمد والصَّلٰوۃَ وارسَال التسلیمات والتحیَات۔ فقیر ابوالخلیل خان محمد عفی عنہ، ''تسکین الصدور فی احوال الموتٰی فی البرزخ والقبور'' حامدًا ومصلیًا ومسلّماً!

اما بعد! فقیر نے تالیف منیف ''تسکین الصدور'' مؤلفہ حضرت مولانا العلاّم محمد سرفراز صاحب دامت برکاتہم کا مطالعہ بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا اور بحمدہ تعالیٰ احوالِ موتی کے بارے اس کو اسم بامسمی پایا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ ۴۴۵-۴۴۶ ہجری میں فرقہ کرامیہ علیہا ما علیہا نے نیشا پور میں امام اہل السنۃ ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ پر افترأت کا ایک طوفان بے پناہ اُٹھایا تھا جس کی وجہ جماعت حقہ اہل السنت والجماعۃ کو سخت مصائب سے دو چار ہونا پڑا، جن کی تفصیل ''تلبیس کذب المفتری'' اور ''طبقات الشافعیۃ الکبریٰ'' میں مذکور ہے کہ کرامیہ کے افترأت کا اصل منشاء یہ تھا کہ انہوں نے اپنی فساد طبع اور عناد اہل حق کی بناء پر اَوّلاً اہل السنۃ پر یہ الزام تراشا کہ: ''اہل السنۃ'' کا خیال وعقیدہ یہ ہے کہ موت کے بعد میّت علم وادراک سے بے نصیب ہو جاتا ہے۔ پھر اسی پر یہ شاخ وبرگ لگائے کہ اس سے یہ لازم کہ میّت سے ایمان بھی مسلوب ہو جائے۔ کیونکہ ایمان بھی علم ومعرفت کا ہی نام ہے۔ مزید برآں یہ بھی لازم آئے گا کہ نبی بھی ''بعد الموت نبوت'' سے معزول ہو جائے۔ کیونکہ نبوت کا ثمرہ بھی علم ومعرفت ہی ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ اور امام قشیری رحمہ اللہ نے اس دورِ پُرفتن کے مصائب برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ ان الزامات کی تردید میں رسائل تحریر فرمائے اور ثابت کیا۔ اہل السنۃ کے نزدیک تو میت کا صاحب ادراک واحساس وجود کے ساتھ قبر میں زندہ ہونا اَمرِ مسلم ہے۔ کیونکہ عذاب وثواب قبر جو متواترات شرعیہ میں سے ہے، اس کا ترتب بدون حیات متعذر ہے اور اَنبیاء علیہم السلام کی حیات فی القبر مع بقاء اجساد مطہرہ اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ مجمع علیہا ہے۔ جس پر بہت سے مسائل متفرع ہوئے۔ مثلاً: سفر بقصد الزیارت الی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم، عرض صلوٰۃ وسلام دربارگاہ رسالت متوجہا الی روضۃ الاطہر علی ساکنہا الصلوٰۃ والسلام ابد الدھر۔ عرض اعمال اُمۃ اور توسل بسید الانبیاء وصلحاءِ امتہ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام وغیرہ مسائل جن پر متعدد اور مستقل رسائل اہل حق علمائے تصنیف فرمائے ہیں خلاصہ یہ کہ حیٰوۃ الانبیاء فی القبور کا مسئلہ تو تقریباً ضروریات دین میں سے شمار ہو کر اُمت کا ایک اجماعی مسئلہ بن چکا ہے۔ حتیٰ کہ علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم رحمہما اللہ جو مداخل شرک کی تحقیق وتفتیش میں کافی توسع سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے سفر الی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم والتوسل بہ علیہ السلام وغیرہ مسائل کو معرکۃ الآراء بنا دیا گیا ہے مگر اصل مسئلہ کے بارے میں ان کی رائے بھی اُمت مرحومہ کے مسلمہ عقیدہ کے موافق رہی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ خود بعد ذکر دلائل تحریر فرماتے ہیں: ''یحصل من جملته القطع بان موت الانبیاء انما هو راجع الی ان غیبوا عنا بحیث لاندرکھم وان کانوا موجودین احیاء'' (کتاب الروح ص ۳۶)

مقام افسوس ہے کہ دور حاضر میں بعض قاصرین فی العلم طبائع نے اپنی متوحدانہ نظریات توحید میں اس قدر غلو اور تجاوز عن حد الاعتدال اختیار کر رکھا ہے کہ بعض مسنونات ومستحبات کو بھی حدود شرک میں کھینچ لانے کے من مانی تصرفات کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ انہی عناصر نے اپنی متوحدانہ رنگ کی توحید کے نشہ میں عقیدہ حیٰوۃ الانبیاء کو بھی منافی توحید خود ساختہ قرار دے کر ہنگامہ آرائی شروع کر دی اور صدیوں کے مُردہ کرامیہ کی یاد تازہ کر دی۔ اراھم اللہ تعالیٰ الحق حقا ورزقھم اتباعہ!

اہل حق نے جب اس شرذمہ قلیلہ کی ان ہنگامہ آرائیوں کو دیکھا تو حفظ دین اور عقیدہ اجماعیہ کے تحفظ کی حتیٰ الامکان سعی فرمائی۔ انفرادی مساعی کے علاوہ اجتماعی طور پر ان مسائل پر ایک مکمل دستور العمل مرتب کرنے کے لئے حضرت شیخ الحدیث مولانا العلاّم محمد سرفراز صاحب کو منتخب کیا۔ جنہوں نے رسالہ ''تسکین الصدور'' تالیف فرما کر اس مسئلہ میں پوری پوری داد تحقیق دی اور پوری جماعت پر عائد شدہ فریضہ کو دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ کے ساتھ انجام دے کر سب کو سبکدوش کر دیا۔ جزاھم اللہ تعالیٰ عنا وعن سائر المسلمین احسن الجزاء وتقبلھا اللہ تعالیٰ منھم قبولا حسنًا۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر استقامت کرامت فرمائے اور اس رسالہ متبرکہ نافعہ سے منتفع ہونے کی توفیق عطاء فرمائے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز!

و آخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی خیر خلقہ محمد و آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین ۔

و یرحم اللّٰہ عبدا قال آمینا

***

امام الفضلاء، سند الابرار، رئیس الحکماء، جامع الاصول والفروع، جامع المعقول والمنقول

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

عزیز محترم مولانا سرفراز صاحب زادکم اللہ تعالیٰ علماً وعملاً وانجح مساعیکم للدین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ! گرامی نامہ میں آپ نے رشتہ تلمذ کا ذکر کیا۔ ماشاء اللہ آپ کے علمی کمالات کے سامنے اس کا تصور بھی مجھے نہیں ہوسکتا اور ضعف سن اور غلبۂ نسیان کا خدا بھلا کرے اس نے اس سب کو بھلا بھی دیا ہے۔ بہرحال آپ کی سابقہ تصانیف کو اجمالاً دیکھا تھا اور مرسلہ کتب "تنقید متین" اور "تسکین الصدور" کو کسی قدر تفصیلاً دیکھنے کی نوبت آئی۔ جوں جوں دیکھتا جاتا تھا دل سے دُعائیں نکلتی تھیں کہ ماشاء اللہ تحقیق کا حق بھی پورا ادا کر دیا اور دوسروں پر تنقید کا طرز بھی بہت اچھا اور متین ہے۔ آج کل کے انشاء پردازوں یا واعظوں کی زبان اختیار نہیں کی جس میں الزام تراشی اور فقرے کسنے کا جذبہ اصلاح کے جذبہ کو دبا دیتا اور بے اثر بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم اور حُسنِ عمل اور اخلاص میں ترقیات لامتناہی عطاء فرمائیں ۔

ہم چنیں می رو کہ زیبا می روی

یہ ناکارہ تو پہلے بھی ناکارہ ہی تھا اور اب تو ضعف سن اور ہجوم افکار نے کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ اپنے چند رسائل جدیدہ بھیج رہا ہوں۔ دُعاؤں میں کبھی احقر کو بھی یاد فرمایا کریں تو عنایت ہو یہاں ایک ضروری بات یاد آئی کہ آج کل کے پیش آنے والے نئے مسائل جو مشینی دور نے پیدا کر دیئے ہیں۔ اس طرح کچھ اور مسائل جو عوامی اور عمومی ضرورت اختیار کر چکے ہیں، ان کے متعلق احقر کی پرانی تجویز دیوبند کے زمانے سے یہ تھی کہ ایسے مسائل میں انفرادی فتوؤں سے اجتناب کیا جائے۔ اجتماعی صورت سے کسی نتیجہ پر پہنچ کر جواب لکھے جائیں اگر باوجود بحث وتمحیص کے آپس میں اختلاف بھی رہے تو اس اختلاف کو بھی معتدل صورت سے اسی فتویٰ میں واضح کر دیا جائے۔ دیوبند میں تو اللہ کے فضل سے اپنے اساتذہ موجود تھے اور سب کے بزرگ حضرت تھانوی قدس سرہٗ موجود تھے۔ احقر نے کسی ایسے مسئلے میں ان حضرات سے استصواب کے بغیر قلم نہیں اُٹھایا۔ پاکستان میں یہ میدان بالکل خالی نظر آیا جس سے کمر ٹوٹ رہی ہے مگر تاہم ضروری کام چھوڑے نہیں جاسکتے، اس لئے بڑے پیمانے پر علماء کی رائیں جمع کرنے کی تو ہمت فرصت نہ نکل سکی۔ کراچی شہر میں علماء اہل فتویٰ کی ایک مجلس ہم نے مقرر کر لی ہیں جس میں مولانا محمد یوسف بنوری نیو ٹاؤن کراچی سے مولانا مفتی رشید احمد، مدرسہ اشرف المدارس سے اور ان کے دوسرے رفقاء اور اپنے دارالعلوم کے چند اہل علم ماہ بہ ماہ جمع ہوکر ایسے مسائل پر بحث وتمحیص کر کے کچھ لکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں اس وقت تک مسائل ذیل مستقل رسالوں کی صورت میں تیار ہو چکے ہیں۔ اب ان کی اشاعت اس مقصد کے لئے کرنے کا اِرادہ ہے کہ اپنے ملک اور بیرون ملک کے علماء کے پاس پہلے بھیجے جائیں۔ ان حضرات کی آراء حاصل ہو جائیں تو ان کو شامل کر کے مکرر اشاعت عام کی جائے۔ رسائل یہ ہیں: "تداوی باجزاء الانسان، بیمہ زندگی، پراویڈنٹ فنڈ، بلاسود کی بینکاری، مشینی ذبیحہ، مواقیت حج اور عمرہ۔"

ماشاء اللہ! آپ کی وسعتِ نظر اور ذوق تحقیق کے پیش نظر دل تو یہ چاہتا ہے کہ اس مجلس میں بھی آپ کی شرکت ہوتی تو بہتر تھا مگر بُعد بعید کی وجہ سے یہ نہ ہوسکا۔ اب یہ رسائل طبع ہوتے ہی میں آپ کے پاس بھیجوں گا۔

غور وفکر کے ساتھ دیکھ کر اپنی رائے ثبت فرمادیں۔ طباعت میں ظاہر ہے کہ کافی مدت لگے گی، اس لئے یہ بھی اِرادہ ہے کہ اگر اس درمیان کبھی لاہور وغیرہ کا سفر ہوا تو مسوّدات ساتھ لاؤں اور آپ کو دیکھنے کے لئے دوں۔ واللہ الموفق والمعین!

والسلام

محمد شفیع دارالافتاء دارالعلوم کراچی نمبر ا

***

مجاہد حق گو، فاضل عصر، کامل دھر، صادق الاحوال

حضرت مولانا سید گل بادشاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

۱۱رشعبان ۱۳۸۸ھ

بخدمت صاحب المجد والسعادۃ جناب مولانا سرفراز خان صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ!

محترم جناب مولانا عبدالعزیز صاحب زاداللہ فضلہ نے آپ کی لکھی ہوئی کتاب ''تسکین الصدور'' فی تحقیق احوال الموتی فی البرزخ والقبور ہدیۃ دی۔ میں خود بھی اس کتاب کے انتظار میں تھا۔ کتاب میں جو مسائل حقہ آپ نے جمع کی ہیں اور اہل سنت والجماعت کے صحیح ومسلک وعقیدہ کی جو آپ نے ترجمانی کی ہے۔ اس پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

جمعیت علماء اسلام کے مجلس شوریٰ نے آپ پر پورے اعتماد کے ساتھ مسائل مذکورہ کی ترتیب وجمع جو خدمت آپ کو سپرد کی تھی۔ یقیناً آپ اس اعتماد کے پورے اہل ہیں، پاکستان میں اہل سنت والجماعۃ حنفی مسلمانوں کا عظیم غلبہ اوراکثریت ہے پاکستان میں دُشمنانِ اسلام اعتزال وخارجیت کے فتنے پیدا کررہے ہیں تاکہ پاکستان میں اہل سنت والجماعت حنفی مسلمانوں کی جو عظیم وحدت ہے۔ اس کو توڑ دیا جائے اور آسانی سے مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈال دیا جائے۔ علمائے حق مسلمانوں کے ایمان کے محافظ ہیں۔ آپ نے اس حفاظت کا پورا فریضہ ادا کیا۔ ہمارا پختون علاقہ جو کل کے کل اہل سنت والجماعت حنفی مسلمان ہیں۔ آپ کی اس کتاب سے ان کو پوری تسکین ہوگی۔ اللہ آپ کو جزاء خیر دے اور خدمت دین کی مزید توفیق عطاء فرمائے۔

والسلام

سید گل بادشاہ امیر جمعیت علماء اسلام پشاور ڈویژن

اقامت گاہ سواریان طورو ضلع مردان

***

امام المناظرین، صاحب الرائے الصائب، ذوالفہم الثاقب

حضرت مولانا الحاج دوست محمد صاحب قریشی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا زید مجدہٗ!

سلام مسنون! جناب کی تصنیف شدہ تسکین الصدور بوساطت مولانا عبدالعزیز صاحب پہنچی۔ اس عاجز

نے اس سے پہلے اس کے اہم مقامات کا مطالعہ کر لیا تھا۔ جناب نے اس کتاب میں ہمارے اسلاف کی صحیح ترجمانی اور تشریح فرمائی ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطاء فرمائے اور مسلمانوں کے لئے اسے مشعل راہ بنائے ؂

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

فقیر دوست محمد قریشی......صدر تنظیم اہل سنت پاکستان

***

عالم نحریر، فاضل بے نظیر، جامع العلوم النقلیہ والفنون العقلیہ، ذوالمجد الفاخر والفہم الباہر

حضرت العلاّم مولانا المفتی احمد سعید صاحب عم فیضہم العمیم

هو الحی القیوم

ذوالمجد والکرم جناب مولانا صاحب مدظلہ! السلام علیکم و علی من لدیکم، مزاج شریف!

کتاب ''تسکین الصدور'' کے متعدد اور اکثر مقامات کا مطالعہ کیا۔ الحمد للہ! کتاب دفع وساوس کے لئے کافی اور اطمینانِ قلب کے لئے وافی ہے۔ منصف کے ہاتھ ایک مشعل ہدایت ہے اور متردّد کے لئے برہانِ ساطع بلاریب یہ کتاب اسم بامسمّٰی ہے۔ میں سفر پہ تھا اس لئے جواب میں تاخیر ہوگئی۔ والسلام خیر الختام

احمد سعید عفی عنہ......جامعہ عربیہ سراج العلوم سرگودھا

۲۲ رجنوری ۱۹۶۹ء

***

المجاہد الجلیل، مخزن محاسن الاخلاق، ناشر عقیدۃ الاکابر، ربیع ریاض الاسلام، مقتدائے انام، ابوالاعجاز

حضرت مولانا محمد نذیر اللہ خان صاحب کثر اللہ تعالیٰ امثالہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی۔ امابعد!

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز صفدر کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان کا علم وتقویٰ۔ علماء وصلحاء کے نزدیک مسلّم ہے۔ اجلّہ علماء نے موصوف کو اس مہتم بالشان اَمر کے لئے منتخب کیا۔ بحمد اللہ! تسکین الصدور اہل انابت کے لئے اسم بامسمّٰی ثابت ہوئی۔ معاندین کے لئے خاتم النبیین ﷺ کی ذات گرامی اور حجۃ اللہ فی الارض کتاب اللہ آخری کتاب بھی باعث ہدایت نہیں ہوتی جو شخص بھی خصوصاً اہل علم غائرانہ مطالعہ کرے گا تو تہہ دل سے یہی فیصلہ کرے گا کہ اہل علم اور طلباء کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ حوالجات کا ذخیرہ موجود ہے اور مستحکم دلائل اور واضح حجج سے مسئلہ حیاۃ انبیاء علیہم السلام کو مبرہن اور واضح فرمایا۔ اُصولِ حدیث میں مہارت رکھنے والے علماء حضرات موصوف کو ہمیشہ دادِ تحسین دیئے بغیر نہیں رہ سکتے اور طالبین حق کی گردن پر بہت بڑا احسان ہے۔ منصف اور منیب کے لئے وسیلۂ ہدایت اور معاند اور مخالف کے لئے: ''فزادھم اللہ مرضا۔ من یھد اللہ فھو المھتد و من یضللہ فلا ھادی لہ۔ یضل بہ کثیراً و یھدی بہ کثیراً و ما یضلّ بہ الا المعاندین۔ و ما ھو الا شفاء لما فی الصدور ھی شمس

الضحی او بدر الدجی فی حیاۃ الانبیاء'' کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔ متکلمین محدثین اور فقہاء کے اقوال و آراء سے مسائل کو مدلل فرمایا۔ خداوند کریم باقیات صالحات کو قبول فرما کر مایۂ ثواب آخرت فرمائے اور قیامت تک اس کتاب مستطاب سے علماء اور طلباء کو مستفیض ہونے کی توفیق عنایت فرمائے۔

وما التوفیق الّا باللہ العزیز الحکیم، وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

صلّی اللہ علیٰ من قال الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلّون وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین

راقم الحروف حفیظ الرحمن الشہیر بمحمد نذیر اللہ خان دیوبندی حنفی

خطیب جامع مسجد حیات النبی ﷺ گجرات۔

مسقطہ پنچوڑیاں من مضافات کاریان من ملحقات گجرات

۱۰ رمحرم الحرام ۱۳۸۹ھ

***

عُمدۃ الاقران والاماثل، ذوالمجد الفاخر والعلم الذاخر منطقۃ بروج الفضائل مطرح انظار السادۃ والافاضل

قائد جمعیۃ علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نفعنا اللہ تعالیٰ بعلمھم

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ ھداۃ خلق اللہ فی احوال الموتٰی فی البرزخ والقبور، امابعد!

زیر نظر کتاب ''تسکین الصدور'' مصنفہ مخدوم محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب مدظلہ العالی کا بغور مطالعہ کیا۔ مولانا موصوف نے جمعیت علماء اسلام مغربی پاکستان کے فیصلہ کے مطابق اس کتاب کی تالیف کی ابتداء فرمائی اور مسودہ کی تکمیل کے بعد ملتان کے مجلس علماء کے ایک اجتماع میں اس مسودہ کو پڑھ کر سنایا۔ میں خود اس مجلس میں شریک تھا۔ بعض مقامات میں انہیں ترامیم کے لئے مشورہ بھی دیا جو مولانا نے بخوشی قبول فرمایا۔ آخر منظوری کے بعد حضرت مولانا نے اُسے پھر سے مرتب کر کے کتابت وطباعت کی زینت سے آراستہ فرمایا: فجزاھم اللہ احسن الجزاء! حضرت مولانا نے بالکل مثبت علمی انداز میں اہل السنت والجماعت کے متفقہ عقائد کو بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کتاب وسنت اور اقوال فقہاء و متکلمین اُمت کے جامع استدلالات سے مسلمانوں کے سامنے پیش فرمایا کسی مخالف کی تشخیص وتعیین یا اس پر تنقید وتنقیص سے کامل احتراز کیا۔ عبارت سلیس۔ صاف اور عمدہ اختیار کی گئی ہے۔ جس کے پڑھنے سے مطالب خود بخود ذہن میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں، میں اس دینی عظیم خدمت پر مولانا موصوف کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کر کے دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ حضرت کی اس تالیف کو قبول فرما کر عامۃ المسلمین کے لئے مفید بنائے اور اسے زائغین کی ہدایت کا ذریعہ بنا کر حضرت مولانا موصوف کی فلاح دُنیوی ونجات اُخروی کا سبب بنا دے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز!

محمود عفاء اللہ عنہ خادم قاسم العلوم ''ملتان'' وناظم عمومی کل پاکستان جمعیۃ علماء اسلام

۲۶ رربیع الثانی ۱۳۸۹ھ

***

دیباچہ......طبع دوم

مبسملاً و محمدلاً و مصلیًا

تسکین الصدور لکھنے کی وجہ؟

اس کتاب کے معرضِ وجود میں آنے کی وجہ اجمالی طور پر طبع اوّل میں مذکور ہے مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قدرے تفصیل سے اس کی وجہ عوام کے سامنے عرض کر دی جائے تا کہ آنے والی نسلوں کو بھی اس کا علم ہو سکے اور بات کی تہ تک پہنچنا ان کے لئے آسان ہو۔

ا...... چند سال ہوئے ہیں کہ پاکستان کی زرخیز زمین میں بعض حضرات نے بزعم خود توحید کے نشہ سے سرشار ہو کر کچھ ایسے نظریات اپنا رکھے ہیں جو اہل السنت والجماعت کے مسلک کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ اکابر علماء دیوبند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم کی تصریحات کے بھی سراسر خلاف ہیں لیکن وہ حضرات محض سینہ زوری کے ساتھ اپنے ان نظریات کو علماء دیوبند کے نظریات بتانے اور باور کرنے کے در پے ہیں اور برملا وہ جلسوں میں ان کی خوب تشہیر کرتے ہیں اور اس طریق کو وہ بزعم خویش توحید کا ایک حصہ یا شرک کے رد کا بہترین ذریعہ قرار دیتے ہیں اور بقول ان کے ان نظریات کی نشر و اشاعت نہ کرنے سے قوم کے شرک میں مبتلاء ہو جانے کا شدید خطرہ ہے۔ لہٰذا اس میں مداہنت کسی طرح بھی روا نہیں ہے اور بالعموم وہ انہی نظریات کی تبلیغ و تشہیر کو اپنی مستعار اور فانی زندگی کا عظیم مقصد سمجھتے ہیں اور اسی کے لئے ہمہ وقت وہ کوشاں رہتے ہیں، ان کے بعض نظریات یہ ہیں۔

(۱) آنحضرت ﷺ کی رُوح مبارک کا آپ کے جسدِ اطہر کے ساتھ قبر شریف میں کوئی تعلق نہیں (معاذ اللہ تعالیٰ) ہاں! دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح آنحضرت ﷺ کا جسدِ اطہر قبر مبارک میں بالکل محفوظ ہے۔

(۲) آپ ﷺ عند القبر صلوٰۃ وسلام وغیرہ کا سماع نہیں فرماتے۔ ہاں! خرق عادت کے طور پر جیسے اللہ تعالیٰ پتھروں کو سنا سکتا ہے ویسے ہی آپ ﷺ کو بھی سنا دے تو جدا بات ہے۔ (معاذ اللہ تعالیٰ)

(۳) عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کی جتنی حدیثیں ہیں، وہ ان کے خیال میں موضوع اور جعلی اور کم از کم ضعیف ہیں جن کا کوئی اعتبار نہیں ہے (العیاذ باللہ تعالیٰ)

(۴) الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون کی حدیث ان کے نزدیک باطل نہایت ضعیف اور بے اصل ہے، ان کے نزدیک نہ تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ) ان کے نزدیک یہ ساری کارروائی ارواح کرتی ہیں اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجساد عنصریہ کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

(۵) قبر میں ثواب و عذاب کا تعلق صرف رُوح سے وابستہ ہے بدن عنصری کا اس سے کوئی واسطہ نہیں اور اگر بدن تسلیم بھی کیا جائے تو بدن مثالی ہے (جسے ان کے وکیل نفس ناطقہ اور نسمہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ندائے حق ص ۲۱۲) بدنِ خاکی و عنصری ہرگز نہیں۔

(۶) عند القبور عام مُردوں کے سماع کا نظریہ ان کے نزدیک مشرکانہ نظریہ اور خیال ہے اور ''سماع الموتی'' کا قائل ان کے خیال میں مشرک ہے اور اقل درجہ یہ ہے کہ یہ ذریعہ شرک ہے۔

(۷) آنحضرت ﷺ یا اُمّت میں سے کسی بزرگ شخصیت کے طفیل وسیلہ برکت اور حرمت وغیرہ سے دُعا کرنا ھٰؤلاءِ شفعاءُنا عند اللہ کا مصداق ہے جو حرام اور خالص شرک ہے اور انہی نظریات کی ''الاقوال المرضیہ۔ شفاء الصدور۔ ندائے حق'' اور ''اقامت البرہان'' وغیرہ میں تائید کی گئی ہے اور بخیال خویش ان کو مبرہن کیا گیا ہے مگر یہ نظریات اہل السنت والجماعت کے نظریات کے سراسر خلاف ہیں اب اگر انہوں نے کلاً یا بعضاً ان نظریات سے رجوع کرلیا ہو تو ہمیں علم نہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے لیکن پہلے ان کے یہی نظریات تھے۔

پاکستان میں مشہور دینی مدرسہ خیر المدارس کے سالانہ جلسہ پر ان میں سے بعض حضرات نے اپنے نظریات کی تبلیغ شروع کردی جس کا اسی موقع پر شدید ردعمل ہوا اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ نے اپنے اکابر کی تائید کرتے ہوئے علمی طور پر باحوالہ جلسۂ عام میں ایسے غلط نظریات کی تردید کردی جس سے ان نظریات کے بعض حاملین حضرات کو بہت ہی صدمہ ہوا اور یہ تردید اُنہیں سخت ناگوار گزری اور اس کارروائی کو انہوں نے اپنی ذاتی توہین سمجھ کر پھر اپنے نظریات کی برملا ہر جگہ تشہیر شروع کردی۔

۲...... اس راقم اثیم سے لے کر مرکزی اکابر تک بعض بزرگوں نے اس معاملہ کو سلجھانے اور عوام کو افتراق سے بچانے کے لئے حتی الوسع کوشش کی مگر صد افسوس ان حضرات پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور معاملہ بجائے سلجھنے کے مزید اُلجھ کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ فخر الاماثل رئیس المتکلمین الحاج الحافظ القاری محمد طیّب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دار العلوم دیوبند کی علمی اور مرکزی طور پر بین الاقوامی شخصیت کو درمیان لایا گیا اور حضرت نے راولپنڈی میں طرفین کے ذمہ دار حضرات سے ذیل کی تحریر پر دستخط لے کر صلح کرادی اور تشتت وافتراق سے بچنے کی یوں تلقین فرمائی کہ: ''عامۂ مسلمین کو فتنہ نزاع وجدال سے بچانے کے لئے مناسب ہوگا کہ مسئلۂ حیات النبی ﷺ کے سلسلہ کے ہر دو فریق کے ذمہ دار حضرات عبارت ذیل پر دستخط فرمائیں یہ مسئلہ قدر مشترک ہوگا ضرورت پڑنے پر اسے ہی عوام کے سامنے پیش کردیا جائے تفصیلات پر زور نہ دیا جائے۔'' عبارت مجوزہ حسب ذیل ہے:

وفات کے بعد نبی کریم ﷺ کے جسدِ اطہر کو برزخ (قبر شریف) میں بہ تعلق رُوح حیات حاصل ہے اور اس حیات کی وجہ سے روضۂ اقدس پر حاضر ہونے والوں کا آپ صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں۔

احقر محمد طیّب راولپنڈی ...... نور محمد قلعہ دیدار سنگھ

محمد علی جالندھری عفا اللہ عنہ ...... لاشیٔ غلام اللہ خان

۱۸ / محرم الحرام ۸۲ ۱۳ھ، ۲۲ / جون ۱۹۶۲ء

الغرض! مصالحت کی یہ دستاویز پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور معاملہ فریقین میں طے ہوگیا تو اس مسئلہ کو اُٹھانے والے بزرگ کو جب اس کا علم ہوا تو وہ آپے سے باہر ہوگئے اور اس معاہدہ کو منسوخ کرانے کے لئے اپنے بعض دوستوں کے ساتھ لاہور پہنچے جہاں حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب دامت برکاتہم ہندوستان جانے کے لئے تیار تھے چونکہ حضرت کو اپنے پروگرام کے مطابق دیوبند پہنچنا تھا اور مزید ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی اور ان میں سے

بعض حضرات کو اس تحریر کو منسوخ کرانے پر شدید اصرار تھا اس لئے بات طے نہ ہو سکی۔ البتہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم نے یہ فرمایا کہ میری سمجھ میں جو بات آسکتی تھی وہ میں کر چکا ہوں اگر مزید آپ کچھ کرنا اور کہنا چاہتے ہیں تو حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمہ اللہ کی طرف مراجعت کریں جو یہاں پاکستان ہی میں رہتے ہیں یہ فرما کر حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم دیوبند تشریف لے گئے۔

۳...... اس کے بعد پھر اس سلسلہ کا اجتماع ملتان میں ہوا اور وہاں کچھ ایسی ناگفتنی باتیں اور نامناسب کارروائیاں ہوئیں کہ شرم و حیا بھی سر پیٹ کر رہ جائے چونکہ معاملہ کو کھٹائی میں ڈالنا مقصود تھا، اس لئے کامیابی نہ ہوئی اور معاملہ جوں کا توں اُلجھاؤ میں رہا اور تخرب و افتراق کا یہ دروازہ بند نہ ہو سکا۔ فالی اللہ المشتکی۔

۴...... ارباب علم و بصیرت تو ان تمام مسائل کی شرعی اور فقہی حقیقت کو جانتے ہی تھے لیکن طلبہ کرام اور عوام شش و پنج میں مبتلاء تھے کہ دونوں طرف مولوی ہیں اور اپنے کو دیو بندی کہلاتے اور دیو بندی مسلک سے وابستہ بتاتے ہیں اور ان مسائل میں ان کے بیانات بالکل متضاد ہیں اب ہم کہاں جائیں؟ اور کس کو حق پر سمجھیں؟ اور کس نظریہ اور عقیدہ کو اپنائیں؟ اور کس نظریہ کو اکابر کے مسلک کے عین مطابق اور کس کو مخالف سمجھیں؟ اس مجبوری کے پیش نظر جمعیت علماء اسلام کا لاہور میں ایک عظیم اجتماع ہوا جس میں تمام صوبوں کے سینکڑوں حضرات علماء کرام موجود تھے۔ انہوں نے پانچ افراد کی ایک کمیٹی بنائی اور اس کا ناظم راقم اثیم کو بنایا (جس کی بقدر ضرورت تفصیل سخن ہائے گفتنی طبع اوّل میں موجود ہے) اور ان مذکورہ بالا مسائل پر باحوالہ دلائل کے ساتھ کتاب مرتب کرنے کا فریضہ اس کوتاہ علم و فہم کے سپرد کیا گیا۔ راقم اثیم نے انتہائی مصروفیت اور بے بضاعتی کے پیش نظر مسودہ تیار کیا اور پھر ملتان میں علماء کرام کی نمائندہ مجلس میں پیش ہوا جس کا نام ''تسکین الصدور'' تجویز ہوا اور بحث و مباحثہ کے بعد وہ اس مجلس میں متفقہ طور پر منظور ہوا اور پھر کتابی شکل میں معرض وجود میں آیا، جس کا طبع اوّل قارئین کرام اس سے قبل پڑھ چکے ہیں اور طبع دوم آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

۵...... ''تسکین الصدور'' کے منصۂ شہود پر آنے کے بعد دوسرے فریق کی طرف سے اس پر خاصی برہمی ہوئی اور اس کا اُبال ''تسکین القلوب''، ''ندائے حق'' اور ''اقامۃ البرہان'' کی شکل میں جوش مار کر نکلا مگر حق آخر حق ہوتا ہے اس کو تسلیم کئے بغیر بھی کسی باضمیر کے لئے چارہ نہیں بشرطیکہ کوئی ماننا چاہے۔ چنانچہ صاحب ''تسکین القلوب'' نے حق تسلیم کر لیا ہے جس کا بیان آگے آرہا ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ! مگر بقیہ حضرات کو حق ماننے کی ابھی توفیق نہیں ہوئی ہماری قلبی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو بھی حق قبول کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین!

۶...... علم غیب تو صرف پروردگار کو ہے لیکن قرائن و شواہد کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ ''تسکین الصدور'' کے جواب کے لئے دوسری جانب کے بزرگوں میں بحث و تمحیص کے بعد حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب دام مجدہم کو آمادہ کیا گیا کہ وہ پُرانے مدرس اور محقق عالم ہیں وہ علمی رنگ میں اس کا خوب رد کریں گے لیکن جب قاضی صاحب کی کتاب سامنے آئی تو نیلوی صاحب وغیرہ دوستوں کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی اور بالکل ان کی یہ حالت ہوگئی کہ ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' اور سب حیران ہو گئے کہ بن کیا گیا ہے نہ اُگلتے بنے اور نہ نگلتے۔ کیونکہ جناب قاضی صاحب نے اپنی کتاب ''تسکین القلوب'' میں اُصولی اور بنیادی طور پر وہ سب مسائل تسلیم کر لئے ہیں

جو ''تسکین الصدور'' میں درج تھے۔ جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ! مؤلف ''ندائے حق'' اور ان کے مُشیروں نے راقم کو سامنے رکھ کر اور بظاہر ''تسکین الصدور'' کو نشانہ بنا کر درحقیقت تردید محترم جناب قاضی صاحب کی ''تسکین القلوب'' کی کی ہے۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ غیر تو اپنے نہ بن سکے اور اپنے بھی ہاتھ سے نکل گئے تو اس کوفت کی وجہ سے ان کا پارہ چڑھ گیا اور یہی وجہ ہے کہ ''ندائے حق'' میں ان کا لہجہ خاصا تُرش ہے اور ندائے حق ص ۵۶ میں ''تسکین القلوب'' کا حوالہ دیا گیا ہے جو اس اَمر کا واضح قرینہ ہے کہ یہ ''ندائے حق'' سے پہلے کی تالیف ہے اور مصنف ''ندائے حق'' نے اس کو بخوبی دیکھا ہے۔

دیوبند کا فتویٰ

اُسی زمانہ میں ایک صاحب نے اپنی تسلی کے لئے مرکزِ علوم اسلامیہ دارالعلوم دیوبند ایک ''استفتاء'' بھیجا تھا جس کا باحوالہ جواب آیا اور اُس وقت کے دینی رسائل میں وہ طبع بھی ہوا جس پر پاکستان کے بعض جلیل القدر علماء کرام کے دستخط بھی ثبت ہیں وہ استفتاء مع جواب یہ ہے: استفتاء نمبر ۱۹۹۸۔ ''یہ عقیدہ رکھنا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی رُوحِ مبارک علیین میں ہے آپ کا اپنی قبر اور جسد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کی قبر پر درود وسلام پڑھا جائے تو پڑھنے والے کو ثواب ملتا ہے لیکن آپ سنتے نہیں کیا ایسا عقیدہ صحیح ہے کہ نہیں؟ اور غلط ہونے کی صورت میں بدعت سیئہ ہے یا نہیں؟ اور ایسے عقیدہ والے کی اِمامت کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا!

الجواب: آنحضرت ﷺ اپنے مزار مبارک میں بجسدہٖ موجود اور حیات ہیں آپ کے مزار پر پاس کھڑے ہو کر جو سلام کرتا ہے اور درود پڑھتا ہے آپ خود سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں، ہمارے کان نہیں کہ ہم سنیں آپ اپنے مزار میں حیات ہیں مزار مبارک کے ساتھ آپ کا خصوصی تعلق بجسدہٖ وروحہٖ ہے جو اس کے خلاف کہتا ہے۔ ''وہ غلط کہتا ہے وہ بدعتی ہے خراب عقیدے والا ہے اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔'' یہ عقیدہ صحیح نہیں ہے، حدیث میں آتا ہے: ''اِنَّ اللہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاْکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ (الحدیث وعن ابی هُریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ من صلی عَلَیَّ عند قبری سمعتہ و من صلی عَلَیَّ من بعید اعلمتہ رواہ ابو الشیخ و سندہ جید القول البدیع ص ۱۱۶۔ عن أنس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ الانبیاء (علیہم السلام) احیاء فی قبورھم یصلون رواہ ابن عدی رحمہ اللہ والبیہقی رحمہ اللہ وغیرھما (شفاء السقام ص ۱۳۴)''

دو تین حدیثیں نقل کر دی ہیں اس باب میں بکثرت احادیث وارد ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور جو اِنکار کرتا ہے ''بدعتی اور خارج اہل السنۃ والجماعت ہے۔'' غرض پڑھنے والے کو ثواب بھی پہنچتا ہے اور مزار مبارک کے قریب پڑھنے سے آپ سنتے بھی ہیں اور اپنے مزار مبارک میں بجسدہٖ موجود ہیں اور حیات ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب! کتبہ: السید مہدی حسن مفتی دارالعلوم دیوبند۔ ۱۳ر جمادی الاوّل ۱۳۷۶ھ، مہر دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح، جمیل احمد تھانوی جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور۔ ۲۱ر شوال ۱۳۷۶ھ

اجاب المجیب واجاد، محمد ضیاء الحق کان اللہ لہٗ، مدرسہ جامعہ اشرفیہ لاہور۔

الجواب صواب، محمد رسول خان عفا اللہ عنہ

راقم اثیم سے بھی اس فتویٰ پر جواب طلب کیا گیا تو راقم نے بھی اس پر ''الجواب صحیح'' لکھا غور فرمائیں کہ دارالعلوم دیوبند کے جناب صدر مفتی صاحب مرحوم ومغفور اور حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی اور اُستاد الکل حضرت مولانا محمد رسول خان صاحب ﷫ نے ایسا عقیدہ رکھنے والے کو اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج اور بدعتی قرار دیا ہے اور تصریح فرمائی ہے کہ ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ﷫ کے فتاویٰ سے چند حوالے بھی ملاحظہ فرمائیں:

(سوال:۱) بدعتی کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟

الجواب: بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمہ ہے۔ فقط (کذا فی الدر مختار باب الامامۃ) فتاویٰ رشیدیہ ج ۳، ص ۱۱۸، طبع جید برقی پریس دہلی۔

(سوال:۲) بدعتی کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب: مکروہ تحریمہ ہوتی ہے۔ (ج ۳ ص ۱۱۳)

(سوال:۳) اور بدعتی امام کے پیچھے نماز پڑھنا گناہ ہے جب کہ دوسری جگہ متبع سنت امام موجود ہے۔ (ج ۳ ص ۹۷)

الغرض جو نظریات اکابر سے ہٹ کر ان حضرات اور ''مؤلف ندائے حق'' وغیرہ نے اپنا رکھے ہیں وہ اہل بدعت کے عقائد ہیں، اہل السنت والجماعت کے ہرگز ہرگز نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بدعت کے عقائد ونظریات سے بچائے اور محفوظ رکھے۔ آمین ثم آمین ؎

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہئے!

تسکین الصدور سے متعلق آراء ونظریات

''تسکین الصدور'' کے طبع ہونے کے بعد ملک کے کونے کونے میں اس کے بارے میں مختلف خیالات اور آراء کا اظہار کیا گیا اور قدرتی وطبعی طور پر ایسا ہونا ناگزیر اَمر تھا جو حضرات صحیح طور پر مسلک دیوبند سے وابستہ ہیں ان تمام حضرات نے نہ صرف یہ کہ اس کی تائید ہی کی بلکہ اس کو بہت حد تک سراہا اور اس کو علمی وتحقیقی شاہکار کا درجہ دیا اور بے شمار خطوط اس تالیف کی داد تحسین اور مبارک باد کے موصول ہوئے جہاں اس کتاب سے ان حضرات کو قلبی تسکین اور علمی اطمینان حاصل ہوا۔ وہاں اس نظریہ کے مخالف حضرات کو اس کتاب کے معرض وجود میں آنے سے بے حد قلق اور صدمہ پہنچا اور بعض کے بارونق چہرے دفعۃً مرجھا گئے اور کچھ احباب توسیخ پا بھی ہو گئے اور ایسا ہونا ایک نفسیاتی امر تھا کیونکہ یہ کتاب ان کے غلط نظریات پر ضرب کاری ہے اور اس کتاب نے بعض حضرات کے اوسان بھی خطاء کر دیئے ہیں۔ جیسا کہ ان کی کتابوں سے یہ بالکل ظاہر ہے مگر یہ ایک فطری بات ہے کہ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔ اس وقت تک تحریری طور پر جو آراء ونظریات ''تسکین الصدور'' کے بارے میں ہمیں موصول ہوئے وہ تین قسم کے ہیں:

پہلا نظریہ

اس کتاب میں درج شدہ تمام مسائل ودلائل اسلام مذہب اہل السنت والجماعت فقہ حنفی اور مسلک علماء دیوبند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم کے عین مطابق ہیں اور اس میں کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں جو مذہب حق کے خلاف ہو اور

اس کتاب میں درج شدہ تمام حوالے ٹھوس۔ صحیح اور مطابق ہیں اور یہ کتاب ایمان وایقان کی عظیم دولت مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ (اللہ تعالیٰ اس کو ایسا ہی بنائے۔ آمین ثم آمین!)

یہ نظریہ اور رائے پاک وہند کے اکابر علماء دیوبند کی اُن واضح تحریرات اور زرّیں تقریظات میں چمک دار موتیوں کی طرح عیاں ہے جو اِسی کتاب میں باقاعدہ درج ہیں۔ قارئین کرام خود ان کو پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ عیاں راچہ بیاں، علماء کرام تو اپنے مقام پر رہے عام مسلمان بھی اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ اس دَور کے اندر پاک وہند میں اسلام مذہب اہل السنت والجماعت۔ فقہ حنفی اور مسلک علماء دیوبند کے صحیح ترجمان اور حقیقی جانشین یہی حضرات ہیں۔ کیونکہ قرآن وسنّت کے علاوہ علوم دینیہ میں جو بصیرت پختگی اور عمق ان کو حاصل ہے وہ اس وقت ان علاقوں میں اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا ان ہی حضرات کی رائے قابلِ اعتبار لائق اخذ اور صحیح ہے اور انہی حضرات کے دامن سے وابستہ رہنا ہی ذریعۂ نجات اور باعث فلاح وکامرانی ہے ۔

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی   ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی

یہ الگ بات ہے کہ مؤلف ''ندائے حق'' ان کو اور ان کے پیروکاروں کو دیو بندی سمجھنے اور کہنے پر آمادہ نہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''اگر زمانۂ حال کے بناسپتی دیو بندی علماء کہیں۔'' (ص ۱۵۶) نیز اسی صفحہ میں لکھتے ہیں: ''یہ نام نہاد بناسپتی دیو بندی دراصل تقیّہ کرنے والے بریلوی ہیں۔'' اور نیز لکھتے ہیں: ''اور یہ بناسپتی دیو بندی فرماتے ہیں۔'' (ص ۶۷) ہر صاحب فہم وبصیرت مسلمان اس کو بخوبی سمجھتا ہے کہ اگر اس دور میں یہ حضرات (جن کی تصدیقات اس کتاب میں شامل ہیں) صحیح مسلک علماء دیو بند پر گامزن نہیں تو اور کون ہو سکتا ہے؟ اور اگر یہ بناسپتی دیو بندی ہیں تو اُصلی دیو بندی کہاں ہیں اور کون ہیں؟ اور اگر یہ تقیّہ باز بریلوی ہیں تو جڑی اور حق گو دیو بندی کس دُنیا میں رہتے ہیں اور کیا ان میں ۔

خوش بیانی خوش کلامی یا خوش اُسلوبی نہیں   خوئے دلداری نہیں یا بوئے محبوبی نہیں

دوسرا نظریہ

استاذ العلماء سابق مدرّس دار العلوم دیو بند جمعیت اشاعت التوحید والسنۃ کے نائب امیر حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب دام مجدہم کا ہے جو ''تسکین القلوب'' میں درج ہے۔ موصوف نے اس کتاب میں ہماری کتاب ''تسکین الصدور'' کے بعض حوالوں اور بعض استدلالات پر بزعم خود مناظرانہ تنقید بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ بزرگانہ زجر وتوبیخ اور اپنی افتادِ طبع کے موافق تعلّی۔ غصہ اور شکوہ بھی اس کتاب کے اوراق میں جا بجا موجود ہے۔ سماع موتی کے مسئلہ کے علاوہ جو صدیوں سے اہلِ حق میں اختلافی چلا آرہا ہے۔ (جس کی مبسوط اور با حوالہ بحث ہم نے بفضلہٖ تعالیٰ سماع الموتی میں کر دی ہے) اُصولی طور پر تسکین الصدور میں درج شدہ باقی تمام مسائل حضرت قاضی صاحب دام مجدہم نے کچھ سیدھی زبان میں اور کچھ ہیر پھیر کی زبان میں تسلیم کر لئے ہیں۔ ہمیں آں محترم کی تعظیم وتوقیر کا بھی خیال ہے۔ پھر اہم مسائل تسلیم کر لینے کے بعد اُن سے اُلجھنا بھی مناسب نہیں۔ کیونکہ پھر تو نزاع صرف برائے نزاع ہی ہو سکتا ہے اور ہم اس میدان کے سوار نہیں ہیں اور نہ اس فضول اور غیر مقصود بحث میں اپنا قیمتی وقت صرف کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ان کی بعض مناظرانہ موشگافیوں کا ذکر عنقریب آرہا ہے۔ قارئین کرام! خود ان سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کاش کہ موصوف بجائے ''الاقوال الرضیہ۔ شفاء الصدور اور ''البصائر'' وغیرہ پر اعتماد کرنے کے

(جن میں قطع و برید کر کے عبارتیں پیش کی گئی ہیں) اصل کتابوں کی طرف مراجعت فرماتے تو وہ ریت کے ذرّات سے سونا الگ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان پر اصل حقیقت بالکل منکشف ہو جاتی مگر موصوف کو عموماً درسی کتابوں کے علاوہ دیگر کتابوں کا مطالعہ کرنے کی نہ تو عادت ہے اور نہ فرصت وشوق اس لئے وہ ایک حد تک معذور بھی ہیں۔

(۱) ''تسکین الصدور'' میں اُصولی طور پر ایک مسئلہ یہ بیان کیا گیا تھا کہ مرنے کے بعد قبر میں میّت کی طرف رد اور اعادہ رُوح حق ہے (جس سے نکیرین کے سوال کا فہم وشعور اور راحت وتکلیف کا احساس ہو سکے) اور رُوح کا بدن عنصری سے ایسا تعلق ہے جس پر سوال وجواب اور ثواب وعقاب مرتب ہو اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی قبور میں زندہ ہیں اور حضرت قاضی صاحب محترم اس کے بارے تحریر فرماتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

ہم اپنی پہلی بعض کتابوں میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ: ''الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون لا شک فیه'' اور یہ بھی عرض کر چکے ہیں کہ صوفیاء کرام رحمہم اللہ کے نزدیک یہ عذاب وثواب قبر اور تألم تلذّذ صرف رُوح سے تعلق رکھتا ہے۔ (صوفیاء کرام رحمہم اللہ میں ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ قبر میں ثواب وعقاب کا تعلق رُوح کے ساتھ بمشارکت بدن مثالی ہے اور یہ حضرات رُوح کا تعلق جسم عنصری اور جسم مثالی دونوں سے تسلیم کرتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ کے حوالے سے یہ بات اپنے مقام پر آرہی ہے۔ إن شاء اللہ تعالیٰ! صفدرؔ) اس جسم عنصریؔ سے اس کا تعلق نہیں اور فقہاء کرام اور متکلمین کے نزدیک یہ جسم خواہ ریزہ ریزہ ہو چکا ہو پھر بھی قبر کے عذاب وثواب اور تألم وتلذّذ میں وہ رُوح کا شریک ہے[1]۔

اور فتویٰ بھی فقہاء کرام رحمہم اللہ کے قول پر دینا چاہئے۔ ''اگر آپ کو ہماری اس گزارش پر اعتماد نہ ہو اور بدگمانی بدستور رکھیں تو اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔'' (بقدر الحاجۃ تسکین القلوب ص ۶۷) اور نیز وہ فرماتے ہیں کہ: ''علماء کرام کی ان عبارات کے اس اضطراب بلکہ ہجوم اضطراب سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عذاب القبر حق اور فتویٰ قول فقہاء ومتکلمین پر دیتے ہیں کہ عذاب وثواب تألم وتلذّذ میں بدن بھی فی اَیِّ حالٍ کا شریکِ رُوح ہے اور ان کے تعلق کی کیفیت اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب!'' (تسکین القلوب ص ۷۰) موصوف کی خودنوشت سے معلوم ہوا کہ حدیث: الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون صحیح ہے اور اپنے مفہوم اور مدلول کے لحاظ سے لا شک فیہ اور نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ قبر میں ثواب وعذاب کے سلسلہ میں روح کا جسم عنصری سے تعلق ہوتا ہے اگرچہ وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرات فقہاء کرام اور متکلمین رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے اور اسی پر محترم جناب قاضی صاحب فتویٰ دیتے ہیں جب موصوف نے صحیح بات تسلیم کر لی ہے تو ان سے اُلجھنا پسندیدہ بات نہیں ہے۔ البتہ نہایت ادب سے یہ گزارش ہے کہ ہم آپ پر کسی قسم کی بدگمانی نہیں کرتے اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ: ''اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ'' (الحجرات: ۱۲) لیکن خود موصوف نے پہلے اس کے خلاف تصریح فرمائی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''حق یہی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین رحمہم اللہ، خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم، ائمہ اربعہ، محدثین رحمہم اللہ، بخاری رحمہ اللہ، مسلم رحمہ اللہ، داؤد رحمہ اللہ تک حیات الشہداء والانبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) فی القبور کا یہی مفہوم سمجھا جاتا تھا جس میں تعلق روح بالجسم العنصری کا نام تک نہیں ملتا بلکہ روایات میں صراحۃً اس تعلق کی نفی ملتی ہے۔'' (مسالک العلماء ص ۳۷) اور (ص ۳۳) میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''تعلق بالجسد العنصری کا اشارہ تک بھی نہیں پایا جاتا۔'' اور (ص ۳۰) میں لکھتے ہیں کہ: ''تعلق روح بالجسد العنصری کا اِشارہ تک

[1] قاضی صاحب (التعلیق الفصیح علی المشکوۃ المصابیح ج ۱ ص ۳۹) میں بھی تصریح فرماتے ہیں: وقال الفقھاء رحمہم اللہ ھو للروح مع الجسد ویشارک الجسد فیه الروح''

بھی نہیں ملتا۔'' اگر ان تصریحات کے بعد بھی بدگمانی کی نسبت ہماری طرف ہو تو یہ بالکل ناانصافی ہے۔ بہرحال بہت ہی اچھا ہوا اور خوشی کی بات ہے کہ آپ نے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ اور حضرات متکلمین رحمہم اللہ کے قول پر فتویٰ دیا۔ اللہ تعالیٰ جمہور کے اس مفتی بہ قول پر آپ کو قائم رکھے جس کی وجہ سے آپ کے سینکڑوں شاگرد اور شاگرد در شاگرد بفضلہٖ تعالیٰ جمہور کے حق مسلک کی طرف رجوع کر لیں گے اور ید اللہ علی الجماعۃ کی نورانی چادر کے نیچے آ جائیں گے۔

لیکن محترم قاضی صاحب کی تحریر کے پیش نظر چند باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں:

(۱) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین رحمہم اللہ، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، ائمہ اربعہ، محدثین رحمہم اللہ، بخاری رحمہ اللہ، مسلم رحمہ اللہ اور ابوداؤد رحمہ اللہ، وغیرہ کی وہ کون سی صریح روایات اور عبارات ہیں جن میں عبارت النص کے طور پر یہ ثابت ہے کہ قبر میں ثواب وعذاب کا تعلق جسم عنصری سے نہیں؟ رُوح وجسم عنصری اور عدم تعلق کی تصریح ہونی چاہئے۔

(۲) وہ کون سی روایات ہیں جو صراحت سے رُوح کے جسم عنصری کے عدم تعلق کی تصریح کرتی ہیں؟

(۳) کیا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین رحمہم اللہ، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، ائمہ اربعہ، محدثین رحمہم اللہ، امام بخاری رحمہ اللہ، مسلم رحمہ اللہ اور ابوداؤد رحمہ اللہ، فقہاء کرام و متکلمین رحمہم اللہ کی مد میں شامل نہیں ہیں؟

(۴) یہ حضرات آپ کے سابق نظریہ کے مطابق کچھ فرمارہے ہیں اور آپ کے مفتی بہ اور مرجوع الیہ قول کے موافق ان کی رائے کچھ اور معلوم ہوتی ہے؟

(۵) حضرات فقہاء کرام و متکلمین رحمہم اللہ نے ان حضرات کی بلا وجہ اور بلا دلیل کیوں مخالفت کی ہے جب کہ ان کے نزدیک رُوح کے جسم عنصری کے ساتھ تعلق کا اِشارہ بھی نہیں پایا جاتا اور حضرات فقہاء کرام اور متکلمین رحمہم اللہ جسم عنصری کے ریزہ ریزہ سے تعلق تسلیم کرتے ہیں۔

(۶) محترم جناب قاضی صاحب نے ''تسکین القلوب'' (ص ۴۸) میں اس پر خاصا زور صرف کیا ہے کہ: ''حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا قبور میں نماز پڑھنا اور اسی طرح دیگر جملہ اُمور۔ ان کی ارواح متشکلہ بشکل اجسامھم یا داخلہ فی اجسام مثالیہ کرتی ہیں۔'' (ص ۴۸) بے حد حیرت اور انتہائی حیرانگی کی بات ہے کہ عام اموات کے اجسام عنصریہ کے ریزہ ریزہ سے ان کے اَرواح کا تعلق ہو اور ثواب وعذاب میں ان کے اجسام عنصریہ کا بھی تعلق ہو لیکن جب باری آئے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اپنی اپنی قبور میں نماز پڑھنے یا دیگر اُمور کی تو ان کے اجسام عنصریہ کا ان کے ارواح سے تعلق نہ ہو۔ حالانکہ ان کے اجسام مبارکہ بالکل صحیح وسالم اور محفوظ ہیں۔ چنانچہ خود قاضی صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اور ابدان انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ان قبور میں جیسے پہلے دن رکھے گئے تھے تر وتازہ اور اپنی حالت پر قائم ہیں اور زمین پر حرام ہیں ساتھ حُرمت تکوینی کے نہ ان کو زمین چھیڑتی ہے اور نہ متغیر کرتی ہے۔'' (مسالک العلماء ص ۱۶۸) جب ان کے اجسام عنصریہ اصلی حالت میں موجود ومحفوظ اور تروتازہ ہیں تو ان کے ارواح مبارکہ کا ''اجسام عنصریہ'' سے تعلق کیوں نہیں۔ جب کہ عام اموات کے ارواح کا ان کے اجسام عنصریہ کے ریزہ ریزہ سے تعلق ہے اور مفتی بہ قول بھی یہی ہے پھر ان کے لئے ''اجسام مثالیہ'' کی کیا ضرورت ہے؟

(۷) ''تسکین الصدور'' میں صحیح حدیث وتعاد الروح فی جسدہٖ کی مفصل تفصیل اور تشریح ہم نے کی ہے اور اعادۂ رُوح کے بارے میں خاصے حوالے ہم نے دیئے ہیں۔ محترم جناب قاضی صاحب نے اس کو بھی اُصولاً تسلیم کرلیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''رَدّ روح اور اعادۂ رُوح سے جو مراد ہے وہ حق ہے اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا۔ آگے اس کی

پوری کیفیت ہم نے بحکم خداوندی عدم شعور میں رکھ دی ہے۔'' (تسکین القلوب ص ۵۰) پوری کیفیت جاننے کا دعویٰ جمہور نے بھی نہیں کیا بلکہ وہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ ردّ رُوح اور اعادۂ رُوح الی الجسد وفی الجسد سے یہی مراد ہے کہ رُوح کے جسم عنصری سے ایک گونہ تعلق کے ساتھ ادراک اور فہم وشعور پیدا ہو جاتا ہے جس سے سوال نکیرین کو سمجھنا اور جواب دینا اور ثواب وعذاب کا احساس متحقق ہو جائے۔

محترم جناب قاضی صاحب نے (تسکین القلوب ص ۶۸) میں اعادۂ رُوح الی الجسد کی روایات کے بارے تعارض واضطراب کا دعویٰ بھی کیا ہے (اور مؤلف ندائے حق نے ص ۷۲۴ میں اسی لا حاصل بحث کو اپنی کتاب کی زینت بنایا ہے) کہ کسی روایت میں الی جسدہٖ کسی میں فی جسدہٖ اور کسی میں متصل بدنہٖ وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں مگر علمی طور پر اس شگوفہ کی بھی کوئی وقعت نہیں۔ کیونکہ نحاۃ کوفہ مطلقاً اس کے جواز کے حق میں ہیں کہ حروف جارہ ایک دوسرے کی جگہ آ سکتے ہیں۔ (ہامش بخاری ج ۱ ص ۵۰۴ وغیرہ) لہٰذا اس نحوی قاعدہ کے مطابق الی الجسد۔ فی الجسد اور بدنہٖ میں کوئی اضطراب نہیں اسی طرح رد اعادہ اور اتصال ببدن سے رُوح کا بدن سے تعلق مراد ہے مگر ایسا تعلق جس سے مُردہ میں ادراک وشعور پیدا ہو جائے۔

(۳) ''تسکین الصدور'' میں جمہور کے نظریہ کے مطابق باحوالہ یہ مسئلہ بھی عرض کیا گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ عندالقبر صلوٰۃ وسلام کا سماع فرماتے اور جواب دیتے ہیں محترم جناب قاضی صاحب نے اُصولی طور پر اس کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اور مولوی صاحب نے ''سماع عندالقبر'' کے عنوان سے بلوغ صلوٰۃ وسلام کا آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کا مسئلہ بھی ذکر فرمایا: ''مولوی صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً۔ تو ہر مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کو اُمت کی طرف سے فرستادہ صلوٰۃ وسلام پہنچتا ہے اگر نہ پہنچتا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا اُمر کیوں فرماتے؟ اور ایمان کے لئے اتنا کافی ہے کہ یقین محکم ہو کہ پہنچتا ہے آگے اس کی کیفیت کیا ہے؟ وہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اگر ہمارے فہم اس کیفیت کے پانے سے قاصر ہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ مواخذہ نہیں کرے گا۔'' (تسکین القلوب ص ۱۰۵)

اس عبارت سے واضح ہوا کہ عندالقبر آنحضرت ﷺ صلوٰۃ وسلام کا سماع فرماتے ہیں اور بلوغ صلوٰۃ وسلام صحیح ہے اور پھر آگے لکھتے ہیں کہ: ''اس بلوغ اور ردّ (سلام) کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔'' (ص ۱۰۵) اس سے خوب روشن ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ عندالقبر سلام کہنے والوں کو سلام کا جواب لوٹاتے اور ردِّ سلام فرماتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور جمہور نے بھی پوری کیفیت جاننے کا کب دعویٰ کیا ہے۔

(۴) ''تسکین الصدور'' میں مسئلہ توسّل پر بھی خاصی بحث ہے اور موصوف مسئلہ توسّل پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''اب ایک صورت رہ گئی بحرمت فلاں سے دُعا کرنا تو نہ اس میں شک ہے کہ سلف صالحین رحمہم اللہ قرون ثلاثہ میں اس کا رواج نہ تھا اور نہ اس میں شک ہے کہ متاخرین کافۃً (اِلاَّ ماشاء اللہ تعالیٰ) اس کے جواز کے قائل ہیں بلکہ یہ طریق ان کے ادعیہ میں بھی عام مذکور ہے اور نہ اس میں شک ہے کہ ہماری ساری جماعت بلا استثناء احد اور بلا استثناء سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری اس کے جواز کے قائل ہیں۔ مگر اس تاویل سے جو بزرگوں نے کی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور حاصل توسّل فی الدعاء کا یہ ہے کہ اے اللہ تعالیٰ فلاں بندہ آپ کا مورد رحمت کا ہے اور مورد رحمت سے محبت اور اعتقاد رکھنا (جو ہمارا ایک نیک عمل ہے) بھی موجب

جلب رحمت ہے اور ہم اس سے محبت اور اعتقاد رکھتے ہیں۔ پس (ہمارا یہ نیک عمل متقبول فرما اور اس نیک عمل کے وسیلہ سے) ہم پر بھی رحمت فرما۔ (تسکین الصدور ص ۲۳۴) اور یہ مطلب بالکل واضح ہے۔ پس و پیش کی گنجائش نہیں اور یہی تاویل بعینہٖ حضرت مرشدنا قدس سرہٗ العزیز نے فرمائی۔'' (تسکین القلوب ص ۱۰۰)

پھر آگے حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تحفۂ ابراہیمیہ کا حوالہ دیا ہے جس میں اس تاویل کا ذکر ہے اور پھر آگے لکھتے ہیں کہ: ''توسواتی برادران (یعنی راقم ابوالزاہد محمد سرفراز اور عزیزم صوفی عبدالحمید) نے یہاں دو خیانتوں کا ارتکاب کیا ایک یہ کہ ناظرین کو یہ تأثر دلایا کہ ہماری جماعت (یعنی جمعیۃ اشاعت التوحید والسنۃ) سرے سے بحرمت فلاں کے ساتھ دُعا کی قائل ہی نہیں اور یہ سراسر افتراء و بہتان ہے ہماری جماعت پر (آپ کی جماعت کے اس وقت وکیل اعظم مؤلف ندائے حق) لکھتے ہیں۔ آمدم برسرِ مطلب توسّل بذات المیّت یا بدعاء المیّت یا بذات النبی ﷺ بعد الوفات کو یا حرام کہنا پڑے گا یا سکوت اختیار کرنا پڑے گا بلا کھٹک کھلے طور پر کسی شرعی قاعدہ کی رُو سے جواز کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔'' (ص ۱۰۸) ''اور دوسرا یہ کہ اکابر کی عبارات تو نقل کر دیں مگر جس تاویل سے وہ حضرات بحرمت فلاں سے دُعا کرنے کے قائل ہیں اس کو نظر انداز کر گئے پھر اگر یہ نادانستہ کیا تو غباوت اور عدم فطانت ہے اور اگر دانستہ کیا تو خیانت ہے۔'' (تسکین القلوب ص ۱۰۱)

اس عبارت سے بالکل آشکارا ہو گیا کہ محترم جناب قاضی شمس الدین صاحب اور ان کی جماعت مسئلہ توسّل کو تسلیم کرتی ہے مگر اُسی تاویل سے جو بیان ہوئی اور لکھتے ہیں کہ: ''سواتی برادران ہم پر افتراء و بہتان باندھتے ہیں اور مجوزین حضرات کی تاویل کو نظر انداز کر کے غباوت یا خیانت کا ثبوت دے رہے ہیں۔''

سو گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی جماعت کو مسئلہ توسّل کے جواز پر قائم رکھے۔ آمین! مگر مؤدبانہ گزارش ہے کہ آپ اپنی جمعیت کے صدر جناب سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری سے بھی اس مسئلہ پر ذرا گفتگو فرما لیں۔ راقم کی تقریباً آج سے تیس برس پہلے گکھڑ میں نہ صرف گفتگو ہوئی تھی بلکہ جھڑپ بھی ہوئی تھی جب کہ انہوں نے اس مسئلہ کے لئے پیش کی گئی کتاب ''المهند علی المفند'' دکھانے والے محترم جناب ماسٹر محمد حسین صاحب او، ٹی، ٹیچر گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ گکھڑ کی جھولی میں زور سے پھینک دی تھی۔ الغرض مسئلہ توسّل کے انکار کی نسبت آپ کی پوری جماعت کی طرف تو ہرگز نہیں کی گئی۔ یہ نسبت ہم پر خالص بہتان اور نرا افتراء ہے اور ہماری عبارات میں جو بزرگ مراد ہیں وہ اُس وقت اس کے منکر اور سخت مخالف تھے۔ اب کا علم نہیں ہے اللہ تعالیٰ کرے کہ وہ آپ کے ہم نوا ہو گئے ہوں اور مؤلف ندائے حق کا حوالہ بھی آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ باقی دوسری بات بھی بڑی عجیب اور نری مضحکہ خیز ہے، وہ اس طرح کہ ہم نے ''تسکین الصدور'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے باقاعدہ اس تاویل کا تذکرہ کیا ہے اور لُطف کی بات یہ ہے کہ خود جناب قاضی صاحب بھی ہماری بیان کردہ تاویل کا ہماری کتاب کے حوالہ سے ذکر کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ ہم نے توسّل کے قائلین حضرات کی تاویل کو نظر انداز کر دیا ہے، انتہائی تعجب خیز بات ہے۔ موصوف نے تسکین القلوب میں اپنے بعض سابق نظریات کا اور خود اس کتاب میں بیان کردہ بعض نظریات کا بے شعوری میں بہترین رد کر دیا ہے۔ مگر جوش اور جذبات میں سمجھے نہیں بہرحال ''تسکین الصدور'' میں بیان کردہ اُصولی مسائل میں وہ ہم سے متفق ہیں۔ اس لئے ہم ان سے زیادہ اُلجھنا پسند بھی نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ ہمارے بزرگ ہیں بات صرف بعض مسائل کے حق پہلوؤں سے تھی سو بحمد اللہ تعالیٰ وہ ان کو صاف طور پر تسلیم کر چکے ہیں۔

محترم جناب قاضی شمس الدین صاحب دامت برکاتہم نے مناظرانہ انداز میں سواتی برادران (راقم اثیم اور عزیزم صوفی عبدالحمید) پر لفظی گرفت بھی کی ہے۔ مثلاً فیوضات حسینی اور ''ابدان عنصری'' میں صفت اور موصوف میں مطابقت نہ ہونے کا سوال کھڑا کیا ہے مگر اس کی چنداں وقعت نہیں ہے۔

اَوّلاً: اس لئے کہ بے شک عربی عبارت میں تو اس کا التزام ضروری ہے[1]۔

مگر اُردو وغیرہ میں اس کا التزام ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اخبارات میں وہ روزانہ مشرق وسطیٰ کا جملہ تو پڑھتے ہی ہوں گے۔ ہاں! مطابقت کا مستحسن ہونا اچھی بات ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ نے جمال قاسمی (ص ۸) میں ''ضروریات دینی'' کا اور حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ نے (مائۃ مسائل ص ۳۹) میں ''آیات قرآنی'' کا جملہ استعمال کیا ہے اور اُردو اور فارسی کی عبارات میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ اہل علم اور وسیع النظر علماء سے یہ بات مخفی نہیں۔

ثانیاً: حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ کی متعدد کتابوں کا نام تو ضرور حضرت قاضی صاحب نے سنا ہی ہوگا۔ مثلاً: ''اسرار قرآنی۔ لطائف قاسمی اور قصائد قاسمی'' وغیرہ! اور حضرات مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ نے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی زندگی کے مختصر حالات پر کتاب لکھی ہے جس کا نام سوانح عمری ہے۔ کیا ان تمام حضرات کی بھی ویسی ہی پھبتی محترم قاضی صاحب اڑائیں گے جیسے سواتی برادران کی اڑائی ہے۔

وثالثاً: ہمارے پیر ومرشد حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ہاتھ مبارک سے جو کتاب لکھی اور آپ کی زندگی میں وہ طبع ہوئی اس کا نام فیوضات حسینی ہی ہے۔ اس میں ناقل کا کیا قصور ہے؟ آپ کی اصل پھبتی کا مورد اور محل تو حضرت مولانا مرحوم ہیں جو خیر سے آپ کے بھی محترم اُستاد اور پیر ومُرشد ہیں۔

ورابعاً: محترم معاف رکھنا آپ کو صرف عربی کے زور سے یہ حق کہاں سے حاصل ہوا کہ آپ نے از خود ہی حضرت مرحوم کی کتاب کا نام بجائے ''فیوضات حسینی'' کے ''افادات حسینہ'' کر دیا ہے؟ کیا یہ علمی خیانت نہیں ہے؟ اسی طرح محترم جناب قاضی صاحب نے فیوضات حسینی کے آخر میں حضرات صوفیاء کرام رحمہم اللہ کے مختلف سلاسل کے بزرگوں کے نام جو ''بحرمت فلاں'' سے حضرت مرحوم کے زمانہ میں طبع ہوئے تھے بالکل حذف کر دیئے ہیں اور جو کتاب اب جناب قاضی صاحب نے طبع کرائی ہے، اس میں ان تمام سلاسل کا نام تک بھی نہیں آنے دیا اور شاید یہ اس لئے ہو کہ محترم جناب شاہ صاحب گجراتی کو جو توسل کے سختی سے منکر ہیں۔ حُرمت کے لفظ چبھتے ہیں۔

اسی طرح محترم جناب قاضی صاحب نے مشہور راوی ابوجعفر خطمی کے بارے بھی بہت سی عقلی موشگافیاں کی ہیں کہ راوی مطلق ابوجعفر ہے یا ابوجعفر مدنی یا مدائنی خطمی ہے یا خطمی وغیرہ وغیرہ (تسکین القلوب ص ۱۱۰) مگر کتب اسماء الرجال پر گہری اور وسیع نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ ثقہ روات کے ناموں میں ولدیت، کنیت اور نسبت وغیرہ کے بارے میں ایسے بے شمار اختلافات آتے ہیں مگر کوئی بھی اس وجہ سے ان کو ضعیف اور مجروح قرار نہیں دیتا۔ نقل کے لحاظ سے جو صحیح وجہ سامنے آتی ہے اس کو لے لیا جاتا ہے اور باقی چیزوں سے صرف نظر کر لی جاتی ہے۔ اگر محض

---

[1] یہ عجیب بات ہے کہ خود موصوف نے اپنے ایک مضمون میں بجائے حیات برزخیہ اور حیات دنیویہ کے حیات برزخی اور حیات دنیوی کے جملے استعمال کئے اور موصوف وصفت میں مطابقت ملحوظ نہیں رکھی۔ (ملاحظہ ہو ماہنامہ تعلیم القرآن، مئی ۱۹۵۹ء، ص ۱۶)

اختلاف روایات اور کتابت کی ایسی غلطیوں کو پلے باندھ لیا جائے تو پھر علم حدیث کا اثبات کوہ کندن اور کاہ دبرآوردن کا مصداق ہے۔ اگر جرح کا یہی طریقہ رہا تو خدا ہی حافظ ہے۔

تری بزم میں اور بھی گل کھلیں گے اگر رنگ یارانِ محفل یہی ہے

محترم جناب قاضی صاحب نے ''تسکین الصدور'' میں درج شدہ جو مسائل تسلیم کئے ہیں، اگر ان کے پاس ان مسائل کے اثبات کے لئے وہی دلائل اور حوالے ہیں جو ہم نے ''تسکین الصدور'' میں نقل اور پیش کئے ہیں تو ہوالمراد! اور اگر وہ ان پر مطمئن نہیں ہیں تو ان مسائل کے اثبات کے لئے جو دلائل اور حوالے ان کے پاس ہیں ضرور ان کو صفحہ قرطاس پر لانے کی زحمت فرمائیں، تاکہ ہمارے جیسے کم علم لوگ بھی ان سے مستفید ہو سکیں۔ اس کا تو بظاہر تصور بھی قدرے مشکل ہے کہ حضرت قاضی صاحب جیسے مدرّس اور محقق عالم بلا ثبوت اور بدون دلیل کے ان کو تسلیم کرتے ہوں۔ دلیل تو ضرور ہوگی مگر ضرورت اس اَمر کی ہے کہ وہ اس کو علمی تھیلے سے باہر نکالیں، تاکہ وہ صحیح اور غیر مجروح دلیل افادۂ عام کا ذریعہ بنے۔

دلوں میں دریچے کھلے آرزو کے نئے ولولے شوق کے جستجو کے

تیسرا تحریری نظریہ

''تسکین الصدور'' کے متعلق تیسرا تحریری نظریہ جناب مولانا سید محمد حسین صاحب نیلوی اور محترم مولانا محمد امیر صاحب بندیالوی (بامداد قوی از مشیران کرام) ندائے حق اور مقدمہ ''ندائے حق'' کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ مقدمہ ''ندائے حق'' کا خلاصہ درج ذیل ہے:

ندائے حق کے مقدمہ کا خلاصہ اور اس پر اجمالی تبصرہ

اس مقدمہ کا اجمالی خاکہ یا بالفاظ دیگر اس کا مختصر تانا بانا یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱...... ''اس میں تقریباً چودہ صفحات میں قرآن کریم کی متعدد آیات کریمات اور ساتھ ہی ان کا ترجمہ نقل کیا گیا ہے۔ اس سے ان کا مقصد بزعم خویش ''تسکین الصدور'' کے مسائل کو نصوص قرآنیہ کے خلاف بتانا ہے۔ لیکن یقین جانئے کہ ان میں سے ایک آیت کریمہ بھی ''تسکین الصدور'' میں پیش کردہ کسی مسئلہ کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں جمہور کے مسائل درج ہیں اور اگر یہ قرآن کے خلاف ہوں تو پھر جمہور اہل السنت والجماعت اور خصوصیت سے حضرات متکلمین عظام رحمہم اللہ اور فقہاء کرام رحمہم اللہ کا دینی اعتبار سے نہایت محتاط گروہ قرآن کریم کا مخالف ہوا؟ (معاذ اللہ تعالیٰ) کون مسلمان اس کا تصور کرسکتا ہے کہ واقعی یہ قرآن کریم کے مخالف تھے؟ اور پھر حضرات علماء دیوبند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم بھی اس باطل نظریہ کے تحت قرآن کریم کے مخالف ہوئے؟ (العیاذ باللہ تعالیٰ) ان آیات کریمات سے جو کچھ ثابت ہے: ''اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا'' ہمارا ان پر قطعی ایمان ہے اور ان میں سے کسی ایک کی مخالفت ہم نے نہیں کی ہم نے ان میں سے بیشتر آیات کی تشریح اپنی متعدد کتابوں مثلاً ''تبرید النواظر''، ازالۃ الریب، گلدستہ توحید'' اور ''دِل کا سرور'' اور ''سماع الموتی'' وغیرہ میں کردی ہے، وہاں ہی ملاحظہ کرلیں۔ الغرض ان آیات کریمات کا مؤلف ''ندائے حق اور مقدمہ باز بزرگ'' اور ان کی جماعت کے کسی دعویٰ سے ہرگز قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان غیر متعلق

آیات کریمات کے نقل کے بعد صاحب مقدمہ لکھتے ہیں۔ مقدمۃ الکتاب کی مذکورہ آیات میں صاحب تسکین کے مخترعات عقائد اور روایات ضعیفہ، اقوال مردودہ، خیالات باطلہ، رطب و یابس جمیع مستدلات من اوّلہ الیٰ آخرہ کا راز مضمر ہے۔ قطعیات و یقینیات کے ہوتے ہوئے کسی سلف یا خلف اکابر یا اصاغر جماہیر ہوں یا مشاہیر کا قول و فعل حجت نہیں بن سکتا۔'' (بلفظہٖ ص ۱۴) سُبْحَانَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ صاحب تسکین کا بحمد اللہ تعالیٰ ایک بھی عقیدہ قرآن کریم، احادیث صحیحہ اور جمہور سلف و خلف کے خلاف نہیں ہے۔ صاحب تسکین تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صراط مستقیم پر گامزن اور العروۃ الوثقیٰ سے متمسک اور حضرات اکابر کا مضبوط دامن تھامے ہوئے ہے اور اس کتاب میں جمہور کے عقائد حقہ، روایات صحیحہ، حسنہ اقوال مرضیہ اور مسائل قویہ اور ٹھوس عقلی و نقلی مستدلات جمع کئے گئے ہیں جن میں صاحب تسکین کو جمہور حضرات سلف و خلف اور مشاہیر اکابر کی پوری پوری تائید حاصل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مؤلف ندائے حق اور اس کے صاحب مقدمہ اپنی اور اپنے غلط کار مشیروں کی رائے کو صحیح قرار دے کر جمہور حضرات سلف و خلف رحمہم اللہ اور مشاہیر اکابر کے پختہ و راسخ علم و نظریہ میں ان کا ساتھ نہ دیں بلکہ اُلٹا ان کی پھبتی اُڑائیں۔ جیسا کہ ان کی عبارت سے ظاہر ہے لا شک فیہ۔

۲...... ندائے حق کے مقدمہ باز بزرگ نے پھر آگے (ص ۱۸ تا ۲۰) میں صاحب تسکین (یعنی راقم اثیم۔ صفدرؔ) کی اُنتیس (۲۹) غلطیاں بتائی ہیں اور یہ سب ندائے حق سے ماخوذ ہیں اور پھر (ص ۲۰) اور (ص ۲۱) میں سترہ (۱۷) عدد خیانتیں ذکر کی ہیں۔ بعض ضروری اُمور کا ذکر تو اِن شاءاللہ العزیز! ''تسکین الصدور'' میں آجائے گا اور بعض کا ذکر ''سماع الموتیٰ'' کے رسالہ میں ہم نے کر دیا ہے اور اس کے بعد مزید رد کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور بعض ایسی لچر پوچ باتیں ہیں جن کو ایک مبتدی طالب علم بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور ان کے جواب دینے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نمونہ کے طور پر ہم ان کی عبارت میں ایک غلطی اور ایک خیانت کا تذکرہ کر کے اس کا جواب عرض کر دیں۔

(۱) غلطی نمبر ۲۷۔ اُصولِ حدیث کا مسلّمہ قاعدہ کہ: ''جس راوی پر بعض علماء نے تنقید کی ہو اور بعض دوسروں نے اس کی توثیق کی ہو تو جرح کو توثیق پر ترجیح دی جائے گی لیکن صاحب تسکین نے اس کے خلاف لکھا۔''

(مقدمۂ ندائے حق ص ۲۰)

الجواب: جرح کے توثیق پر مقدم ہونے میں بحث ہے حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

''والجرح مقدم علی التعدیل و اطلق ذٰلک جماعۃ ولٰکن محلہ ان صدر مبینًا من عارف باسبابہ لانہ ان کان غیر مفسر لم یقدح فی من ثبتت عدالتہ و ان صدر من غیر عارف بالاسباب لم یعتبر بہ ایضاً''

(شرح نخبۃ الفکر ص ۱۱۱ طبع مجیدی کانپور)

''جرح تعدیل پر مقدم ہے اس کو ایک جماعت نے تو مطلق چھوڑا ہے لیکن اس کا مصداق یوں ہے کہ جب جرح کے اسباب جاننے والے کی طرف سے مفسر جرح ہو تو تعدیل پر مقدم ہوگی۔ کیونکہ جب جرح مفسر نہ ہو تو جس کی عدالت ثابت ہو چکی ہو، اس کے بارے میں جرح قادح نہیں ہو سکتی اور اسی طرح اگر جرح کے اسباب نہ جاننے والے کی طرف سے جرح ہو تو اس کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے؟''

اس سے معلوم ہوا کہ جرح مفسر ہو اور عارف باسباب الجرح سے صادر ہو تب وہ توثیق پر مقدم ہوگی ورنہ نہیں۔ اس تفصیل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے مطلقاً جرح کے توثیق پر مقدم ہونے کو اُصولِ حدیث کا مسلمہ قاعدہ بنا کر طعن کرنا قلت تدبر کا نتیجہ ہے اور تدریب الراوی میں اس مسئلہ کی تحقیق اور اختلاف بیان کرتے ہوئے لکھا:

''واختار شیخ الاسلام تفصیلاً حسنا فان کان من جرح مجملاً قد وثقه احد من ائمة هذا الشان لم یقبل الجرح فیه من احد کائنا من کان الا مفسرًا لانه قد ثبتت له رتبة الثقة یزحزح عنها الا بامر جلی فان ائمة هذا الشان لا یوثقون الا من اعتبر واحاله فی دینه ثم فی حدیثه و نقدوه کما ینبغی و هم ایقظ الناس فلا ینقض حکم احدهم الا بامر صریح'' (ص ۲۰۴ طبع مصر)

''اور شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اس میں ایک اچھی تفصیل کو اختیار کیا ہے، وہ یوں ہے کہ اگر جارح نے اجمالی طور پر جرح کی ہو اور اس فن کے اماموں میں سے کسی ایک نے اس کی توثیق کی ہو تو اس کی جرح قبول نہ ہوگی خواہ جرح کرنے والا کوئی بھی ہو۔ کیونکہ جس کو ثقاہت کا درجہ حاصل ہو اس سے بغیر کسی واضح بات کے عدول نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس فن کے امام صرف اسی شخص کی توثیق کرتے ہیں جس کے دین کا پھر حدیث میں اس کا حال بخوبی ان کو معلوم ہوتا ہے اور جس طرح اس کو پرکھنا مناسب ہے۔ وہ اس کو پرکھتے ہیں اور وہ اس فن میں سب لوگوں سے زیادہ بیدار واقع ہوئے ہیں تو ان میں سے کسی کا حکم کسی صریح بات کے بغیر نہیں توڑا جاسکتا۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اُصولِ حدیث کے جس قاعدہ کی مخالفت کا ہم پر الزام لگایا گیا ہے۔ موصوف خود اُصولِ حدیث میں اس قاعدہ کے بارے میں تفصیل سے ناواقف ہیں ؎

جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا ترى نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کئے

(۲) خیانت نمبر ۱۷۔ ''حدیث حسن کو مطلقاً حجت بنانا اُصولِ حدیث میں ایک مجرمانہ حرکت ہے جو اہلِ علم کے نزدیک معیوب ہے۔'' (ص ۲۱)

الجواب: اصل بات یہ ہے کہ یہ صاحب۔ اُصول حدیث ہی سے بے خبر ہیں اور محض اپنے باطل اور معتزلی نظریہ کے تحت جذبات کے رد میں بے بس ہو کر ایسی بے سرو پا باتیں کر کے اپنے دل کی تشفی حاصل کرتے اور اپنے ضدی حواریوں کو خوش کرتے ہیں۔ فن حدیث میں جب مطلق حسن کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے حسن لذاتہٖ مراد ہوتی ہے۔ کیونکہ فرد کامل ہی یہی ہے اور اس کے حجت ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''وهذا القسم من الحسن مشارک للصحیح فی الاحتجاج به وان کان دونه ومشابه له فی انقسامه الی مراتب بعضها فوق بعض و بکثرة طرقه یصحح'' (شرح نخبۃ الفکر ص ۳۳)

''حدیثِ حسن کی یہ قسم احتجاج میں صحیح کے ساتھ شریک ہے۔ اگرچہ (تعارض کے وقت) اس سے کم ہو اور حدیثِ حسن منقسم ہونے میں صحیح کے مُشابہ ہے کہ اس کی طرح اس کے مراتب کا بھی اعلیٰ وادنیٰ ہونے کا بھی فرق ہے اور کثرت اسانید کی وجہ سے حسن حدیث صحیح بن جاتی ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح حدیث صحیح قابل استدلال ہے۔ اسی طرح حدیث حسن بھی قابل احتجاج ہے۔ ہاں! معارضہ میں فرق ہونا الگ بات ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''وعلیه مدار اکثر الحدیث و یقبله اکثر العلماء واستعمله عامة الفقهاء'' (تقریب مع التدریب ص ۸۷ طبع مصر)

''اور اس پر اکثر احادیث کا مدار ہے اور حدیث حسن کو اکثر علماء قبول کرتے ہیں اور عام فقہاء اس کو معمول بہ بناتے ہیں۔''

اور اسی کے قریب الفاظ ہیں۔ علامہ جزائری رحمہ اللہ کے (ملاحظہ ہو توجیہ النظر ص ۱۴۵) اس سے معلوم ہوا کہ صحیح کی بہ نسبت حسن قسم کی حدیثیں زیادہ ہیں اور اکثر علماء محدثین اور فقہاء رحمہم اللہ نے حدیث حسن کو معمول بہ قرار دیا ہے۔

حدیث حسن سے استدلال کا انکار امام ابوحاتم رحمہ اللہ نے (ملاحظہ ہو تدریب الراوی ص ۸۷ و توجیہ النظر ص ۱۴۶) کیا ہے اور اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ اور ابن العربی رحمہ اللہ نے انکار کیا ہے۔ چنانچہ قاضی شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

''و هکذا یجوز الاحتجاج بما صرح احد الائمة المعتبرین بحسنه لان الحسن یجوز العمل به عند الجمهور و لم یخالف فی الجواز الا البخاری و ابن العربی و الحق ماقاله الجمهور و لان ادلة وجوب العمل بالاحاد و قبولها شاملة له'' (نیل الاوطار ج ۱ ص ۲۲، طبع مصر)

''اسی طرح جب ائمہ معتبرین میں سے کسی ایک نے حدیث کے حُسن ہونے کی تصریح کی ہو تو اس سے استدلال جائز ہے۔ کیونکہ جمہور کے نزدیک حدیث حسن پر عمل جائز ہے۔ اس جواز میں صرف امام بخاری رحمہ اللہ اور ابن العربی رحمہ اللہ نے اختلاف کیا ہے لیکن حق جمہور کے ساتھ ہے۔ کیونکہ خبر احاد پر عمل کرنے اور اس کو قبول کرنے کے واجب ہونے کے دلائل اس کو بھی شامل ہیں۔''

چونکہ صاحب مقدمہ ''ندائے حق'' اور ان کے حواریوں کو جمہور سے بیر اور چڑ ہے۔ اس لئے وہ قدم قدم اور جزئی جزئی میں جمہور کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا کوئی بھی باطل نظریہ جمہور کو ساتھ رکھ کر ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ جمہور کو بھی جلی کٹی سنانے سے باز نہیں آتے۔

ندائے حق کے بعض مضامین پر اجمالی تبصرہ

''ان کی بعض مغالطہ آفرین باتوں کا ذکر موقع بہ موقع آگے کتاب میں آئے گا۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ! مگر مُشتے نمونہ ازخروارے یہاں بھی اجمالاً بعض ملاحظہ کرلیں۔

جمہور زنبور

راقم پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جب عود روح کا مسئلہ آیا تو جمہور کا نام لیا اور ضعاف حدیثوں کا سہارا لیا، جب حیاتِ انبیاء کا مسئلہ آیا، جب بھی جمہور کا نام لیا اور ضعاف حدیثوں کا سہارا لیا، جن کے ضعف کا اقرار خود حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے کیا۔ جب قبر نبی پر سلام وصلوٰۃ کے سماع کا مسئلہ آیا، جب بھی جمہور کا نام لیا اور من گھڑت حدیث کا سہارا لیا، اب باری آئی توسل بالذات والاموات کی اس میں بھی جمہور کا نام لے کر اس من گھڑت حدیث کو اپنا مستدل بنایا۔ اگر جمہور کا یہ حال ہے تو ہم ایسے جمہور کی اتباع سے رہے۔ ہم جمہور سے علیحدہ ہی اچھے ہیں۔ ہم ایسے جمہور کے عاشق نہیں۔ ہمیں تو قرآن وسنت و اجماع مجتہدین کافی ہیں۔ یہ جمہور زنبور کشف خوابیں جنگلیوں کا مذہب آپ ہی کو نصیب ہو۔'' (ندائے حق ص ۳۰۳) جمہور کے بارے میں مؤلف مذکور کے ناپاک دل اور قلم کا اُبال ملاحظہ فرمائیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ عربی میں زنبور بھڑ کو کہتے ہیں جو زہریلا ڈنگ مارتی ہے۔

الحمد للہ تعالیٰ کہ راقم کو جمہور کا مذہب نصیب ہوا اور ہر مسئلہ پر راقم کی پیش کی ہوئی حدیثیں محدثین کرام رحمہم اللہ کے بتائے ہوئے اُصول کے مطابق بالکل صحیح ہیں اور جمہور محدثین کرام رحمہم اللہ نے ان کی تصحیح کی ہے۔ ہاں! البتہ چکڑالوی، پرویزی اور معتزلہ وغیرہ باطل فرقوں کے اُصول کے مطابق یہ حدیثیں صحیح نہ ہوں اور مؤلف ندائے حق اوران کے کچھ ہم نواء ان کو صحیح تسلیم نہیں کرتے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اوراگر اللہ تعالیٰ نے حق قبول کرنے والا دل اور حق گوزبان اور قلم آپ حضرات کو نہیں دیا تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ دینے والا تو صرف وہی ہے ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے — جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

مؤلف مذکور کا پرویزی ذہن

حضرات شہداء کرام رحمہم اللہ کی برزخی حیات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''مگر انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات جو اہم ترین اور اعلیٰ ترین اور حیات شہداء سے الگ اور مختلف بمراتب کثیرہ اس سے قرآن مجید کا ساکت ہونا یہ دلیل ہے۔ اس اَمر کی کہ یہ انبیاء کا زندہ درقبر ہونا یہ کوئی مسئلہ قابل اعتبار نہیں۔ السکوت فی معرض البیان بیان بیان کے موقع پر بیان نہ کرنا یہ بھی بیان ہے اس کا یہ نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو اس کا بیان ہوتا۔'' (ندائے حق ص ۲۵۳) اس عبارت میں قطع نظر دیگر کوتاہیوں کے صرف یہ بات ہی ملاحظہ فرمائیں کہ بقول مؤلف مذکور کے۔ چونکہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حیات کا ذکر قرآنِ مجید میں نہیں۔ اس لئے یہ کوئی مسئلہ قابل اعتبار نہیں اور یہی کچھ پرویز صاحب اوران کے حواری کہتے ہیں کہ جو کچھ قرآنِ مجید سے باہر ہے وہ ظنی ہے اور قابل اعتبار نہیں اور موصوف نے اپنی ساری کتاب ''ندائے حق'' میں اہل حق اور اہل السنت والجماعۃ کے دلائل پر کلام کرتے ہوئے معتزلہ اور پرویزیوں کا یہی ذہن استعمال کیا ہے اور اپنی نارسا عقل کو نُصوص اور اکابر کی صریح عبارات کے مقابلہ میں دخل دیا ہے۔ جیسا کہ پڑھنے والے اس بات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں اور باتوں کا تو ذکر ہی چھوڑ دیجئے۔ مولانا موصوف کو تو یہ اَمر بخوبی معلوم ہوگا کہ قرآن کریم میں نمازوں کی رکعات اور زکوٰۃ کا نصاب بیان نہیں کیا گیا۔ ان کے قاعدے کے مطابق ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر ان کا اعتبار ہوتا تو ضرور ان کا ذکر قرآنِ کریم میں ہوتا۔ کیونکہ السکوت فی معرض البیان بیان اوران کے اپنے باطل نظریہ کے مطابق جو روایات قرآنِ کریم سے متصادم ہوں، وہ سب ضعاف ہوتی ہیں اور وہ قابل اعتبار نہیں اور بقول ان کے جمہور زنبور پر کیا اعتبار ہوسکتا ہے؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ عادل نہیں معاذ اللہ!

سب اہل السنت والجماعت اس پر متفق ہیں کہ: ''تمام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل ہیں اوران کے نزدیک الصحابۃ کلھم عدول کا جملہ بہت مشہور ہے لیکن مؤلف ''ندائے حق'' حضرت امام بیہقی رحمہ اللہ پر جو جمہور کے وکیل ہیں، گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کو صرف ایک صحابی غیر معروف الفقۃ والعدالۃ یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی حدیث ملی۔'' (ص ۱۳۵) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے فقیہ اور غیر فقیہ ہونے کا اختلاف تو حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ سے منقول ہے لیکن ان کی اور اسی طرح دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت پر کلام بجز روافض وغیرہم کے اور کسی نے نہیں کیا۔ ہاں! مؤلف ''ندائے حق'' کو ضرور یہ جرأت حاصل ہے۔ وہ ان کو عادل بھی تسلیم نہیں کرتے اور یوں گوہر افشانی کر کے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ۵۳۷۴ روایات پر پانی پھیر رہے ہیں۔ نعوذ باللہ من

الشیطان الرجیم و من العناد و سوء الفھم۔ ندائے حق میں اگر کوئی علمی یا نیم علمی باتیں ہیں تو ہمارے خیال کے مطابق وہ ان کے ان پردہ نشین مُشیروں کی ہیں جو چلمن سے لگے بیٹھے ہیں۔ خیر ہماری بلا سے بہر حال ان میں شرعی طور پر کوئی جان اور عقلی لحاظ سے کوئی وزن نہیں اور نہ اکابر کی تصدیق و تائید ان کو حاصل ہے۔ ان کے سابق بالکل غلط نظریات کے علاوہ چند بے بنیاد دعاوی کا اجمالی خاکہ یہ ہے (اور آگے کتاب میں جن کا ذکر ہوگا وہ ان کے علاوہ ہیں)

جسد مثالی

سوال نکیرین اور راحت و عذاب قبر کے سلسلہ میں رُوح کے ساتھ جسم عنصری کی مشارکت کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''اعادۂ رُوح فی الجسد کی بابت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث اوّل تو صاحب تسکین کو مفید نہیں اور اہل حق کو مُضر نہیں۔ کیونکہ اس میں مطلق جسد ہے (لا بشرط شئ) صاحب تسکین اس کا مصداق جسد عنصری کہتے ہیں اور اہل حق (اہل السنت والجماعت) جسد یعطی لہ فی البرزخ (مثالی) مراد لیتے ہیں۔ علماء اہل سنت میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوا جس نے عنصری کا قول کیا ہو۔ کُتب اہل سنت میں کہیں عنصری کا نشان نہیں ملتا۔ یہ تقیید ی لفظ جناب (سرفراز) کی خانہ زاد ہے۔ یہ ان کی اور اُن کے ہم نواؤں کی فہم کی ایجاد ہے۔'' (ندائے حق ص ۲۱۳، ونحوہ فی ص ۴۴) سُبحان اللہ تعالیٰ مؤلف ندائے حق کی کیا ہی تحقیق انیق اور راست گوئی ہے کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت صاحب تسکین کو مفید نہیں اور اہل حق کو مضر نہیں۔ لا حول و لا قوۃ الا باللہ! مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ صحیح اور صریح روایت صاحب تسکین کے دعویٰ کے لئے نص صریح ہے اور سو فیصدی دعویٰ سے مطابق اور مفید ہے اور خوارج و روافض اور مؤلف ندائے حق وغیرہ کے لئے سم قاتل ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ! صاحب تسکین کو حضرات محدثین کرام، فقہاء عظام اور متکلمین رحمہم اللہ کی سو فیصدی تائید حاصل ہے اور حضرات جمہور کی معیّت نصیب ہے اور بقول حضرت قاضی شمس الدین صاحب فتویٰ بھی اسی پر ہونا چاہئے اور اہل حق اور اہل السنت والجماعت کی کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ عذاب و نعیم قبر کے سلسلہ میں رُوح کا جسم کے ریزہ ریزہ سے تعلق ہوتا ہے۔ اب مؤلف مذکور ہی از روئے انصاف یہ بتائیں (اگر انصاف نام کی کوئی چیز ان کے نزدیک ہے) کہ نفس ناطقہ نسمہ اور جسد مثالی ریزہ ریزہ ہوتا ہے یا جسد عنصری؟ اور کیا جب مطلق جسد کا لفظ بولا جاتا ہے تو انسان کے لئے جسد عنصری مراد نہیں ہوتی؟ اور پھر اہل السنت کے منصور نظریہ سے کٹ اور ہٹ کر خوارج و روافض وغیرہم باطل فرقوں کے ہم نوا ہو کر اپنے آپ کو اہلِ حق اور اہل السنت کس منہ سے کہتے ہیں؟ اور کیا حضرات محدثین کرام، فقہاء عظام اور متکلمین رحمہم اللہ آپ کے نزدیک اہلِ حق اور اہل السنت نہیں ہیں؟ کیا آپ نے ان کی واضح اور صریح عبارات نہیں دیکھیں جن میں رُوح کا جسم کے ذرّہ ذرّہ سے تعلق وہ تسلیم کرتے ہیں؟ اور کیا ان کی یہ کتابیں اہل السنت اور اہلِ حق کی کتابیں نہیں ہیں؟ اور کیا جسد خاکی اور عنصری کے ریزہ ریزہ سے تعلق تسلیم کرنا سرفراز اور اس کے ہم نواؤں کی خانہ زاد ایجاد ہے یا سرفراز ان تمام اکابر اور جمہور کی پیروی میں یہ کہتا ہے؟ اور کیا آپ کے نزدیک محترم جناب قاضی شمس الدین صاحب علماء حق اور اہل السنت میں سے نہیں ہیں؟ آپ کو معلوم ہے وہ کیا فرما گئے ہیں؟ اور کیا آپ حضرات محدثین عظام، فقہاء کرام اور متکلمین رحمہم اللہ کی عبارات میں مثالی کا لفظ بتا سکتے ہیں۔ آپ کو قیامت تک کی مہلت ہے ہمت کر کے دیکھیں۔ دیدہ باید!

بعض حضرات صوفیاء کرام کی عبارات میں جسم مثالی کا تذکرہ ضرور موجود ہے اور وہ بھی انہوں نے منکرین عذاب قبر کو جواب دینے کے لئے ایک مخلص ڈھونڈ نکالا ہے کہ جس کو جلا کر راکھ کر دیا ہو تو اس کے عذاب و راحت کا تعلق جسم مثالی سے ہے جس کا جسم خاکی موجود ہو اس کے لئے جسم مثالی کے وہ بھی قائل نہیں ہیں اور پھر میدان فتویٰ میں اعتبار صرف حضرات محدثین کرام، فقہاء عظام اور متکلمین رحمہم اللہ کا ہے۔

زاویۂ نگاہ کی خرابی

مؤلف ''ندائے حق'' (اور اس کے مقدمہ باز بزرگ) کو تسکین الصدور کی دلیلوں اور حوالوں میں خاصی خامیاں۔ کوتاہیاں بلکہ کیڑے نظر آئے ہیں اور اس کے انگور بہت ترش محسوس ہوئے ہیں اور بعض مقامات پر انہوں نے دور اَز کار اور غیر متعلق باتوں کو جوڑ جوڑ کر تنکوں کا ٹِل بھی بنایا ہے اور خاصی بھرتی کر کے کتاب کا عوام پر رُعب ڈالنے کے لئے حجم بھی بڑھایا ہے اور بعض مقامات پر انتہائی دیدہ دلیری سے عبارات میں قطع و برید کر کے علمی خیانتیں کی ہیں اور سینہ زوری کے ساتھ بعض علماء اور حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کو اپنے ٹانگے پر سوار کرنے کی بے جا سعی کی ہے۔ جس کی قدرے وضاحت ہم نے ''سماع الموتی'' میں کر دی ہے۔ الغرض بات بن سکی ہے یا نہیں بنی انہوں نے بزعم خویش کچھ نہ کچھ لکھ کر اپنے حقیقت ناشناس حواریوں کو اپنی حُسن کارکردگی کا احساس ضرور دلایا ہے لیکن پاک و ہند کے اکابر کے مقابلہ میں نہ تو ان صاحبوں کا علم وسیع ہے اور نہ تحقیق پختہ ہے اور نہ رائے صحیح ہے اور نہ فہم کامل ہے اور نہ ان اکابر کے تقویٰ وورع اور خدا خوفی اور بصیرت دینی کے مدمقابل ان کی کوئی نسبت ہے۔ ایسے حالات میں جو نتیجہ یہ خام خیال حضرات نکالیں گے وہ اظہر من الشمس ہے اور ''ندائے حق'' میں اوّل سے آخر تک انہوں نے یہی کچھ کیا ہے صفراوی بخار میں مبتلاء مریض کو شہد اور کھانڈ بھی کڑوی محسوس ہوتی ہے اور بھینگے آدمی کا زاویۂ نگاہ ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے کوئی چیز اپنی اصل حالت میں نظر نہیں آسکتی۔ یہی حال مؤلف ''ندائے حق'' وغیرہ کا ہے کہ ان کو ''تسکین الصدور'' کے مسائل اور دلائل سیدھے نظر نہیں آئے۔ اس کے برعکس پاک و ہند کے اکابر علماء دیوبند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم کو جن کو گہری دینی بصیرت۔ بے لوث علمی خدمت۔ غصب کی اصابت رائے اور بے لاگ حق گوئی کا قدرتی ملکہ حاصل ہے۔ اپنی درست نگاہوں سے ''تسکین الصدور'' میں تمام درج شدہ مسائل اور پیش کردہ دلائل اور حوالے حق اور صحیح نظر آئے ہیں اور اس میں درج شدہ تمام مسائل ان کو اسلام۔ اہل السنت والجماعۃ، احناف اور دیوبندی مسلک کے عین مطابق معلوم ہوئے ہیں۔ اگر مؤلف ''ندائے حق'' اور ان کے حقیقت ناشناس حواریوں کو ''تسکین الصدور'' کے مسائل و دلائل میں خرابی اور خامی نظر آتی ہے تو ان کو اکابر علماء دیوبند کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوئے تلمذ طے کر کے علم حاصل کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس دور میں صحیح علم علماء دیوبند کی وراثت ہے اور وراثت بیٹوں کو تو ملتی ہے مگر لے پالکوں کو نہیں ملا کرتی اور ان احباب پر لازم ہے کہ وہ اپنے سوءِ مزاج اور بھینگے پن کا معقول علاج کروائیں پھر ان کو ہر چیز اصلی صورت و شکل میں نظر آئے گی۔

اِن شاء اللہ تعالیٰ ہم نے ''ندائے حق'' میں پیش کردہ صرف اس بات کے جواب کو ملحوظ رکھا ہے جس سے کسی طالب حق کے مغالطہ میں مبتلاء ہونے کا خطرہ ہوگا۔ دیگر بعض باتوں کا جواب ہم نے ''سماع الموتی'' میں دے

دیا ہے۔ باقی باتوں کو ہم نے سرے سے درخور اعتناء اور قابل التفات ہی نہیں سمجھا اور نہ لایعنی اور نری مجذوبانہ باتوں کو نقل کر کے ان کے جوابات دے کر عوام کے اذہان کو مشوش کرنا مناسب سمجھا ہے اور جو زبان انہوں نے استعمال کی ہے۔ ہم نے علمی سطح سے گری ہوئی وہ زبان استعمال نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ کا جہان بڑا وسیع ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی صاحب ہمت انہیں کی بولی میں ان سے ہم کلام ہوں۔ ہم اس میدان کے شہسوار نہیں ہیں اور نہ ہمارے پاس ایسی مجذوبانہ باتوں کے رد کرنے کے لئے فالتو وقت ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ! ہمارے مسائل بالکل حق اور دلائل وحوالے بڑے مضبوط اور ٹھوس ہیں، جن کی اکابر علماء کرام نے اپنی وسیع دینی بصیرت کے ساتھ جاندار اور شاندار الفاظ میں بھرپور حمایت اور مکمل تائید کی ہے۔ جیسا کہ ان کی تصدیقات سے ظاہر ہے۔ وَالْحَقُّ مَعَهُمْ حَيْثُ كَانُوْا۔

فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم پر بہتان

حضرات فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے فقہی طور پر یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ جب ولی جنازہ پڑھ چکے تو اس کے بعد کسی کو نماز جنازہ پڑھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ جنازہ فرض کفایہ ہے اور وہ ایک دفعہ ادا کرنے سے ادا ہو جاتا ہے اور نفلی جنازہ مشروع نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے تمام لوگوں کو اوّل سے آخر تک دیکھا کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر جنازہ نہیں پڑھا۔ حالانکہ آپ کا وجود مبارک آج بھی اسی طرح صحیح وسالم ہے جس طرح قبر مبارک میں رکھا گیا تھا۔ کیونکہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وجود زمین پر حرام کر دیا گیا ہے کہ وہ اس کو کھائے۔''

(محصلہ ہدایہ ج۱ ص ۱۶۰، بدائع الصنائع ج۱ ص ۳۱۱)

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اُمت کا ترک جنازہ علی القبر اس بات کی دلیل ہے کہ عدم تکرار جنازہ پر اجماع ہے (محصلہ بدائع الصنائع) ان غیر متعلق عبارات اور خصوصاً علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت سے استدلال کرتے ہوئے مؤلف ندائے حق لکھتے ہیں کہ یہ عبارت غمازی کر رہی ہے کہ تمام اُمت کا جیسے اجماع ہے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ الجنازہ کے ترک پر بعد الدفن'' ایسے ہی تمام اُمت کا اجماع ہے اس اَمر پر کہ جسد اطہر میں اعادۂ رُوح نہیں ہوا۔'' (ندائے حق ص ۲۶۱) لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ ملاحظہ کیا آپ نے نیلوی صاحب کی دینی بصیرت اور عشق محمدی؟ (علیٰ صاحبہ الف الف تحیۃ والسلام) محترم! معاف رکھنا یہ عبارت ہرگز اس امر کی غمازی اور چغلی نہیں کر رہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک سے آپ کی رُوح مبارک کا کوئی تعلق نہیں اور یہ کہ جسد اطہر میں اعادۂ رُوح نہیں ہوا۔ یہ آپ کی سوءِ فہم کا نتیجہ اور حضرات فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم پر خالص افتراء نرا بہتان اور سفید جھوٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ ضد اور تعصب سے بچائے حضرات فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کے ساتھ رُوح مبارک کا باقاعدہ تعلق تسلیم کرتے اور عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع پر متفق ہیں۔ لَا رَيْبَ فِيْهِ! حضرات فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے اس اَمر کی دلیل بھی ساتھ ہی بیان کر دی ہے کہ نماز جنازہ فرض کفایہ ہے جب ایک دفعہ ادا ہوگئی تو پھر دوبارہ اس کی اجازت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نیلوی صاحب کو صحیح سمجھ اور احترام اکابر کی توفیق بخشے۔

راہ فرار

مؤلف ''ندائے حق'' نے اپنے پردہ نشیں مُشیروں کی بے پناہ انگیخت سے دعویٰ تو ایسا کیا کہ اہل حق اور

اہل السنت والجماعت میں سے ایک شخص بھی ان کا ساتھی نہیں ہے وہ یہ کہ قبر مبارک میں آنحضرت ﷺ کے جسدِ اطہر سے رُوح مقدس کا کوئی تعلق نہیں اور آپ عند القبر صلوٰۃ وسلام نہیں سنتے۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) لیکن اس بے بنیاد اور بادر ہوا دعویٰ پر وہ ایک بھی صریح اور صحیح حوالہ پیش نہیں کر سکے اور تا قیامت کر بھی نہیں سکتے۔ ہاں! وہ شیش محل میں رہ کر دوسروں کے ٹھوس اور مضبوط دلائل پر مجذوبانہ انداز میں الفاظ کے ہیر پھیر سے پتھراؤ کے خوگر ہیں اور بھینگے آدمی کی طرح ان کو کچھ کا کچھ نظر آتا ہے اور اپنے لئے جو محفوظ قلعہ تلاش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''لا دلیل علی النافی فی احکام الشرع وانما الدلیل علی المثبت'' احکام شرع میں نافی کے ذمہ دلیل نہیں۔ دلیل قائم کرنا تو مُثبت کے ذمہ ہے۔ (اُصول سرخسی ج ۲ ص ۱۱۷، ندائے حق ص ۱۳۴، ۱۴۳)

قارئین کرام! سمجھ گئے ہوں گے کہ حضرات جمہور کے حق اور مدلل مسائل کے مقابلہ میں دلیل اور برہان قائم کرنا خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں اور اس سے مؤلف مذکور اور ان کی پوری جماعت سراسر قاصر اور قطعاً عاجز ہے۔ اس لئے اپنے بچاؤ کے لئے اُصول سرخسی کا ہوائی قلعہ تلاش کیا ہے مگر خیر سے محفوظ اس میں بھی نہیں رہے۔ تعاقب کرنے والوں نے قلعہ پر بھی یلغار کر دی ہے اور اس قلعہ میں بھی ان کو چین سے نہیں رہنے دیا۔

اَوّلاً: اس لئے کہ مُثبت و مدعی اور نافی و مدعیٰ علیہ کا درجہ قائم کرنا علمی اور تحقیقی رنگ میں خاصا مشکل ہے کبھی کوئی چیز بظاہر سلبی ہوتی ہے مگر درحقیقت وہ اثباتی ہوتی ہے اور اس کو بھی دلائل سے ثابت کیا جاتا ہے اور اس پہلو کو اختیار کرنے والا مُثبت اور مدعی کہلاتا ہے اور اس کے مدمقابل والا نافی اور مدعیٰ علیہ قرار دیا جاتا ہے۔

وثانیاً: خود مؤلف مذکور نے (ص ۱۴۳) میں صاحب ہدایہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مدعی کی ایک تعریف یہ ہے کہ جو غیر ظاہر سے متمسک ہو اور مدعیٰ علیہ وہ ہے جو متمسک بالظاہر ہو۔ (ہدایہ ص ۲۰۰) اس لحاظ سے ہم صحیح احادیث اور اقوال حضرت محدثین کرام، فقہاء عظام اور متکلمین رحمہم اللہ کے ظاہر سے متمسک ہیں اور آپ اس کے خلاف ہیں۔ اس لئے آپ مدعی ہیں اور ہم مدعیٰ علیہ ہیں۔ لہٰذا آپ پر دلائل کا اثبات لازم ہے۔

وثالثاً: آپ کو یہ تو نظر یہ بظاہر معلوم ہی ہوگا کہ حضرات احناف کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم قرأۃ خلف الامام۔ رفع الیدین عند الرکوع وعند رفع الرأس من الرکوع، آمین بالجہر اور نماز میں سورۂ فاتحہ سے پہلے جہر کے ساتھ بسم اللہ پڑھنے کے قائل نہیں ہیں اور ایسے ہی دیگر بے شمار مسائل ہیں اور ان تمام مسائل میں نافی ہیں اور یہ سب کے سب احکام شرع ہیں۔ بایں ہمہ نہ تو حضرات احناف نے صرف اتنی بات پر اکتفاء کیا ہے کہ چونکہ ہم نافی ہیں، اس لئے ہمارے ذمہ دلائل نہیں ہیں اور نہ فریق ثانی ان کو دلائل قائم کئے بغیر چھوڑتا ہے۔ باوجود یہ کہ وہ ان تمام مسائل میں نافی ہیں۔ بایں ہمہ وہ اپنے مقام پر نقلی اور عقلی دلائل پیش کرتے ہیں اور اس پر وہ مجبور ہیں۔ چونکہ آپ کا دعویٰ غلط ہے۔ قطعاً باطل اور خلاف اجماع ہے اور عوام کی گمراہی کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ اس لئے آپ کو دلیل و برہان کا واضح ثبوت دینا ہوگا۔ محض معصومانہ یا مجذوبانہ انداز سے آپ ہرگز گلو خلاصی نہیں کرا سکتے۔

بچھڑ کر قافلے والوں سے جب تم رہ گئے تنہا ۔ تو پھر دوشِ ہوا پر دلربا بہنے سے کیا ہو گا

مؤلف مذکور اسی صفحہ میں لکھتے ہیں کہ اگر یہ اجماعی مسئلہ ہے تو مؤطا امام مالک اور صحاح ستہ اور مسند شافعی اور مسند امام اعظم رحمہ اللہ وغیرہ وغیرہ کتابوں میں اس کا ذکر کیوں نہیں ہے؟ اور کیوں یہ خاموش ہیں؟

الجواب: یہ بھی نرا طفلانہ سوال ہے۔ اوّلاً: اس لئے کہ ان کتابوں میں تمام اجماعی مسائل کے تذکرہ کا ہرگز التزام نہیں کیا گیا۔ بعض ایسے مسائل بھی ہیں جو اجماعی ہیں مگر ان کتابوں میں ان کا ذکر تک نہیں ہے۔ مؤلف مذکور نے (ص ۲۵۳ تا ۲۵۵) میں ایک عجیب بے مغز اور نری ہوائی تقریر کی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ: ''یہ ہے اجماع صحابہ تابعین خیر القرون اور ائمہ مجتہدین کا کہ قبر عرفی میں حضور کو زندہ نہیں مانتے۔'' (العیاذ باللہ تعالیٰ) مؤلف مذکور کا ان تمام حضرات پر یہ سراسر جھوٹ اور نرا افتراء ہے۔ یہ تمام حضرات آپ کو قبر مبارک میں زندہ تسلیم کرتے ہیں اور ان میں سے ایک بھی ان کا منکر نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس مفروض اجماع کا ذکر ان کتابوں میں کہاں ہے؟ آخر یہ کتابیں اس اجماع کے ذکر سے کیوں خاموش ہیں؟ ؎

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

وثانیاً: ابوداؤد وغیرہ صحاح ستہ ہی کی کتاب ہے اور اس میں اس کی تصریح موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ پر جو شخص سلام کہتا ہے، آپ اس کو سنتے اور اس کا جواب دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف رُوح مبارک لوٹائی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی پیش نظر کتاب میں اس کی بحث موجود ہے اور صحاح ستہ اور حدیث وغیرہ ہی کی کتابوں میں تصریح ہے کہ عام مؤمنین بھی قبور کے پاس سلام کہنے والوں کا سلام سنتے اور اس کا جواب دیتے ہیں۔ اس کی تحقیق راقم کی کتاب ''سماع الموتیٰ'' میں ملاحظہ فرمائیں اور یہ سب کچھ ان کی حیات فی القبور کی بیّن دلیل ہے۔

نرالی تحقیق

فتح القدیر۔ فتاویٰ عالمگیری، نور الایضاح۔ طحطاوی اور دیگر متعدد کتابوں کے حوالہ سے ہم نے ''تسکین الصدور'' میں لکھا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر آپ سے طلبِ مغفرت کی سفارش کرانا درست ہے۔ ان عبارات کا جواب مؤلف ندائے حق نے یہ دیا ہے۔ بس ہم اب آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ جتنی کتابوں میں یہ مسئلہ قبر پر حضور ﷺ سے دُعا، استغفار استشفاع کا جو معتبر کتب میں لکھا جا چکا ہے وہ باغیوں کا لکھا ہوا ہے اور بس۔'' (انتہی بلفظہٖ ندائے حق ص ۳۱۱) یہ ہے مؤلف مذکور کا حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کی عبارات کا معقول اور شافی جواب جو اس قابل ہے کہ رُوس کے عجائب گھر کے دروازہ پر آویزاں کیا جائے۔ لاحول ولاقوۃ الّا باللہ تعالیٰ! اسی طرح کے کئی اور باطل نظریات ان کے ہیں بعض کا ذکر آگے کتاب میں آئے گا۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ اور بعض کا ذکر ہم نے مسئلہ ''سماع الموتیٰ'' میں کر دیا ہے۔

بیکار بھرتی

صاحب ''ندائے حق'' نے غیر متعلق حوالے تو کافی پیش کر دیئے ہیں اور کشید کرنے کی بھی بے حد سعی کی ہے لیکن ایک حوالہ بھی اس پر نہیں پیش کر سکے اور نہ ہی بفضلہٖ تعالیٰ قیامت تک پیش کر سکتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی رُوح مبارک کا قبر شریف میں آپ کے جسد اطہر سے کوئی تعلق نہیں اور آپ عند القبر صلوٰۃ وسلام نہیں سنتے۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ اللہ اور حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ وغیرہ حضرات کی بالکل غیر متعلق عبارات سے (جن کا ذکر آرہا ہے، اِن شاء اللہ تعالیٰ) اس کا ہرگز ہرگز ثبوت نہیں ہوتا اور ابھی تک مؤلف ''ندائے حق'' وغیرہ اپنے اس باطل اور بے بنیاد نظریہ پر کوئی دلیل نہیں قائم کر سکے۔ اس سے قطعاً عاجز سراسر قاصر اور یقیناً بے بس رہے ہیں۔

فتنہ انگیز کارنامہ

پوری کتاب ''ندائے حق'' میں بجائے اس کے کہ وہ اپنے باطل اور بے بنیاد دعاوی ٹھوس عقلی ونقلی دلائل پیش کرتے انہوں نے جمہور کے دلائل پر بلاوجہ تنقید کرنے اور ان میں کیڑے نکالنے پر ہی سارا زور صرف کیا ہے لیکن یہ سب کچھ ان کے سوء استعداد اور سوء مزاج کی واضح دلیل ہے۔ محض تنقید کر دینے اور کچھ کہہ اور لکھ دینے سے دلائل حقہ کی تردید نہیں ہو جایا کرتی۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی محکم کتاب ہے۔ لیکن قدیماً وحدیثاً مشرکین کے مہمل اور بے سود اعتراضات بھی خود قرآن کریم اور کتب اسلامیہ پر موجود ہیں۔ آریا کے مشہور لیڈر ''سر دیانند سرسوتی'' نے اپنی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' کا چودھواں باب ہی بسم اللہ سے لے کر والناس تک قرآن پر تنقید کے لئے وقف کیا ہے۔ کیا معاذ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ایک پڑھا لکھا اور منطقی قسم کا آدمی اعتراض اور تنقید کر رہا ہے؟ لہٰذا اس سے ضرور قرآن کریم کی صداقت متاثر ہوگئی ہے یا مثلاً احادیث کے منکر موسلا دھار بارش کی طرح ان پر بلا وقفہ برستے رہتے ہیں؟ عبد اللہ چکڑالوی، تمنا عمادی، اسلم جیراجپوری اور مسٹر غلام احمد پرویز وغیرہ کے یہ بے باک کارنامے کس عالم اور غیور مسلمان سے اوجھل ہیں۔ پھر کیا یہ یقین کر لینا چاہئے کہ واقعی احادیث میں کمی کمزوری اور خامی ہے؟ کون مسلمان اس کے تصور کے لئے تیار ہے؟ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کرنے والوں نے کیا کمی چھوڑی ہے؟ جس کی ادبی رنگ میں کمی اب مودودی صاحب نے خلافت وملوکیت وغیرہ میں پوری کر دی ہے۔ کیا سچ مچ یہ مان لینا چاہئے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ برگزیدہ شخصیتیں جن پر کلام اور تنقید ہوئی ہے؟ حقیقت میں ایسے ہی ناقابل اعتبار اور گئے گزرے اخلاق کی مالک ہیں؟ اسی طرح ائمہ دین اور فقہاء کرام ومحدثین عظام رحمہم اللہ پر جو کڑی جرحیں کی گئی ہیں، کیا وہ قابل اعتماد ہیں؟ اوروں کا تو قصہ ہی جانے دیجئے امام الائمہ سراج الامت حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں۔ خصوصیات سے امام خطیب بغدادی الشافعی رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ بغداد میں امام صاحب پر انتہائی ناشائستہ اور نازیبا جرحی اور تنقیدی بحث جو تقریباً پچاس صفحات میں کی ہے، کیا وہ سب درست ہے؟ جس میں بعض حوالوں کی رُو سے امام صاحب رحمہ اللہ کو عربی اور نحو سے ہی نابلد قرار دیا گیا ہے۔ دُور نہ جایئے قریب کے زمانہ میں بعض غالی غیر مقلدوں نے فقہ حنفی پر جو کتابیں شائع کر کے لوگوں کے سامنے پیش کی ہیں جن میں ''حقیقۃ الفقہ'' خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ کیا ایسی کتابوں کے پیش نظر تمام کتب حقہ حنفی سے ہاتھ دھو دینا چاہئے اور فقہ کی تمام کتابوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ اگر اس میں درج شدہ مسائل ضروری اور اہم ہوتے تو ضرور ان کا ذکر قرآن وحدیث میں بصراحت ہوتا؟ ان حضرات کو ہوش میں آ جانا چاہئے۔ کیونکہ سوء مزاج میں مبتلاء بعض افراد کی گرفت اور دینی طور پر بے باک اور غلط کار لوگوں کی تنقید کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ حق جمہور کے ساتھ ہے اور بحمد اللہ تعالیٰ ''تسکین الصدور'' کی ذمہ دار حضرات نے تصدیق کر دی ہے۔

رُوح کے جسم عنصری کے ساتھ تعلق میں عقلاً کوئی استبعاد نہیں ہے

مسلمان کے ایقان واطمینان کا ذریعہ تو قرآن کریم حدیث شریف اور اجماع اُمت کے واضح دلائل ہیں وہ

ان کی موجودگی میں کسی اور چیز کا قطعاً محتاج نہیں ہوتا۔لیکن آج کی مادّہ پرست دنیا اور عقل نارسا کی پجاری نئی پود کے لئے آج کی سائنس میں ایسی واضح مثالیں اور نظیریں بھی موجود ہیں جن سے وہ اپنے ضمیر کو سائنس کی ایجادات سے بھی مطمئن کر سکتے ہیں۔قریب کے زمانہ میں امریکہ نے تین مرتبہ چاند پر کامیابی کے ساتھ اپنے آدمی اُتارے اور حیرت انگیز معلومات سے دنیا کو محو حیرت کر دیا۔پہلی مرتبہ ۱۶ر جولائی ۱۹۶۹ء کو امریکہ کے تین خلا باز ''نیل آرمسٹرانگ، ایڈون آلڈرن اور مائیکل کولنز'' تین ہزار ایک ٹن وزنی خلائی جہاز ''اپالو یازدہم'' کے ذریعہ زمین سے روانہ ہو کر ایک سو دو گھنٹے پینتالیس منٹ اور بیالیس سیکنڈ میں چاند کی سطح پر پہنچے۔اوّل الذکر دونوں قمری گاڑی کے ذریعہ ۲۱ر جولائی ۱۹۶۹ء پاکستانی وقت کے لحاظ سے ساڑھے سات بجے صبح قمری گاڑی سے چاند کی سطح پر اُترے اور دو گھنٹے پچپن منٹ تک کامیابی کے ساتھ تجربات کرتے اور مٹی کے نمونے جمع کرتے رہے اور چاند کی سطح پر انہوں نے لنچ بھی کھایا اور اس وقت قمری گاڑی زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل (سائنس دانوں نے جونئی پیمائش کی ہے۔اس کے مطابق چاندزمین سے دولاکھ چھبیس ہزار نوسوستر میل دُور ہے۔اخبار امروز ۶ر اگست ۱۹۶۹ء ص اوّل) کے فاصلہ پر بحر سکوت کی دھول پر جمی رہی۔آرمسٹرانگ اور آلڈرن چاند پر تجربات کے بعد گاڑی میں جا کر سو گئے تھے روانگی سے دو گھنٹے چوّن منٹ قبل انہیں بیدار کر دیا گیا اور اس طویل سفر میں خلائی جہاز اور قمری گاڑی اور خلا بازوں کے جسم کے ساتھ زمینی مرکز ''کیپ کینیڈی'' میں خلائی مرکز سے بدستور تعلق قائم رہا۔حتیٰ کہ ان کے دل کی رفتار تک سنائی دیتی رہی۔خلائی مرکز کے ڈاکٹر چارلس بیرنے بتایا کہ خلا باز جب چاند پر کام کر رہے تھے تو ان کے دل کی حرکت بالکل نارمل تھی۔حالانکہ چاند پر اُترائی کے وقت ان کے دل کی رفتار ستر پچھتر سے یکدم نوّے اور تھوڑی دیر بعد ایک سو پچپن تک ہوگئی۔زمین کے مدار سے نکلنے کے بعد جب خلائی جہاز نے چاند کی طرف پرواز شروع کی تو اس کی رفتار چوبیس ہزار میل فی گھنٹہ تھی۔خلائی جہاز کو صحیح سمت پر رکھنے کے لئے گراؤنڈ کنٹرولر سائنسی آلات سے کام لیتے رہے اور انہوں نے خلانوردوں کو بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ جی بھر کر سونے کی اجازت دی۔

ماخوذ از اخبار اِمروز لاہور، ۱۸ر جولائی ۱۹۶۹ء ص اوّل کالم ۴، ۲۲ر جولائی ۱۹۶۹ء ص ۲، کالم ۱ تا ۴، ملخصاً) اور اپالو پانز دہم (۱۵) جب ۲۶ر جولائی ۱۹۷۱ء کو روانہ ہوا تو اس میں تین مہ نورد تھے۔ڈیوٹ سکاٹ۔جیمز اردن اور ورڈن ان میں مؤخر الذکر تو کمان گاڑی میں چاند کے گرد چکر لگا تا رہا اور پہلے دونوں چاند پر اُترے، انہوں نے کئی مقامات پر مٹی اور پہاڑوں کے نمونے حاصل کئے اور ضروری تجربات کئے اس مہم کا مقرر وقت سات گھنٹے تھا۔لیکن زمینی کنٹرول نے آکسیجن میں تیزی سے کمی آجانے کے باعث اس میں نصف گھنٹے کی کمی کر دی۔زمینی کنٹرول نے کمانڈر سکاٹ کو انتباہ کیا کہ اس کے دل کی دھڑکن درست طور پر سنائی نہیں دیتی۔اس لئے وہ مقرر پروگرام سے زیادہ ہرگز کام نہ کریں۔(اخبار مشرق لاہور ۲ر اگست ۱۹۷۱ء ص ۱ کالم ۳) اس مہم کے سربراہ سکاٹ نے چاند کی سطح پر پہنچنے کے بعد پروگرام کے مطابق چاند گاڑی کا دروازہ کھولا اور کوئی نصف گھنٹے تک اپنا آدھا جسم باہر نکال کر چاند کی فضا اور مناظر دیکھتے رہے اور جیمز اردن اپنی نشست پر ہی بیٹھے رہے۔دریں اثناء ٹیلی ویژن پر ان کا ہر کام واضح اور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ (اخبار امروز لاہور یکم راگست ۱۹۷۱ء ص اوّل کالم ۷)

امریکہ نے ۲/ مارچ ۱۹۷۲ء کو ''کیپ کینیڈی'' سے اپنا خلائی جہاز ''پانیر ۱۰، نظام شمسی کے سب سے دور دراز سیارہ مشتری کی طرف روانہ کر دیا ہے جو تقریباً تیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا ہے۔ مُشتری زمین سے تقریباً ایک ارب کیلومیٹر دور ہے۔ جب کہ سورج کا فاصلہ زمین سے ۴۸۳۰۰۰۰۰۰ میل ہے گویا مُشتری کا سورج سے فاصلہ زمین سے سورج کے فاصلہ سے پانچ گنا زیادہ ہے اور اس کا قطر زمین سے گیارہ گنا زیادہ ہے زمین کا استوائی قطر ۸۸۷۰۰ میل ہے اور قطبی ۸۲۸۰۰ میل ہے۔ یہ خلائی جہاز اگر اس کے آلات ٹھیک طور پر کام کرتے رہے تو ۲۱/ ماہ کے بعد ۳/ دسمبر ۱۹۷۳ء مشتری کے مدار میں داخل ہوگا اور اس کے سائنسی آلات اتنے طاقتور ہیں کہ زمین سے دو اَرب چالیس کروڑ میل کے فاصلہ تک وہ زمین سے رابطہ قائم رکھے گا۔ (محصلہ)

(اخبار امروز لاہور۔ ۱۹/ محرم ۱۳۹۲ھ، ۱۶/ مارچ ۱۹۷۲ء، ص پس منظر، آخری ایڈیشن، ۳ ستارے)

امریکہ نے حال میں جو خلائی گاڑی ''وائی کنگ'' کامیابی سے مریخ پر اُتاری ہے (زمین سے مریخ کی مسافت اکیس کروڑ پچاس لاکھ میل ہے) اس کے کھدائی کرنے والے ایک بازو میں پن خراب ہونے کی وجہ سے کام میں تعطل پیدا ہوگیا تھا۔ زمین پر رہنے والے سائنسدانوں نے اس کی خرابی دُور کر دی اور وہ کام کر رہی ہے۔

چنانچہ اخبار نوائے وقت لاہور (۲۸/ رجب ۱۳۹۶ھ/ ۲۷/ جولائی ۱۹۷۶ء ص ۱، کالم ۵) میں یہ سُرخی قائم کی ہے۔ خلائی گاڑی کے مشینی بازو کو زمینی مرکز سے درست کر دیا گیا۔ آگے تفصیل یوں درج ہے: ''پساڈینا کیلئے فورنیا ۲۶/ جولائی (اف پ) مریخ پر اُترنے والی ''وائی کنگ'' کی خلائی گاڑی کا جو مشینی بازو خراب ہوگیا تھا اسے سائنسدانوں نے زمینی آلات کی مدد سے ٹھیک کر دیا ہے اور وہ مریخ پر زندگی کے امکانات معلوم کرنے کے لئے بدھ کے روز سے پھر کھدائی شروع کر دے گا۔ ''وائی کنگ'' کی کدال کا یہ بازو اسے وائی کنگ سے جوڑنے والے ایک پن کے خراب ہو جانے کی وجہ سے معطل ہوگیا تھا۔''

یہ تو اِنسانی سائنس اور انسانی کوشش اور کاوش کا ایک نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قادر مطلق ذات کو اس پر قدرت نہیں ہے کہ ارواح کو علّیین یا سجّین میں رکھنے کے باوجود (جیسا کہ روایات سے ثابت ہے) ان کا تعلق قبروں میں ان کے اجسام یا اجسام کے ذرّات سے وابستہ رکھے۔ اگر یہ اُمور وقوع پذیر ہو سکتے ہیں اور سورج کا تعلق زمین سے ایک واضح مشاہدہ کی حیثیت رکھتا ہے تو اَرواح کے اجسام کے ساتھ تعلق رکھنے میں بھی عقلی طور پر ہرگز کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مرنے کے بعد رُوح کے جسم عنصری کے ساتھ تعلق کو مستبعد سمجھنے والے حضرات میں اگر حق کی طلب وجستجو ہے تو اِن شاء اللہ تعالیٰ بالآخر یہ اپنی غلطی کا ضرور احساس کر کے جمہور اور اکابر کا دامن تھام لیں گے۔ کیونکہ حق کی راہ میں چلنے والے زیادہ دیر تک اَلگ نہیں رہ سکتے۔ حق ان کو جمع کر کے ہی رہتا ہے۔ کیونکہ حق کی فطرت ہی جمع وتالیف اور وحدت ویگانگت کی متقاضی ہے۔ تفرقہ اور تحزب صرف اسی صورت میں رُونما ہوتا ہے جب حق کے ساتھ کچھ نہ کچھ باطل اور نفسانیت کی آمیزش ہو یا اُوپر تو حق کی نمائش ہو اور اندر باطل مفاد پرستی انانیت اور ذاتیات کار فرما ہوں۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا ؂

کہ تو جس کو سمجھتا ہے بہاراں اوروں کی نگاہوں میں وہ موسم ہو خزاں

***

سخن ہائے گفتنی

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم، اَمَّا بَعْدُ!

(۱) قیامت کی نشانیاں تو بہت کچھ ہیں مگر اُن میں ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ہر آنے والا دن پہلے دن سے ہر لحاظ سے متفاوت ہے۔ گو اس دور میں مادّی ترقی کو بہت کچھ عروج حاصل ہو رہا ہے۔ لیکن افسوس کہ دین سے بے اعتنائی اور غفلت بھی برق رفتاری کے ساتھ ترقی پذیر ہے اور دین کے نام پر بہت سے فتنے پروان چڑھ رہے ہیں اور ہر پڑھا لکھا اور قادر علی الکلام آدمی اپنے کو مجدّد اور مجتہد سے کم نہیں سمجھتا اور اپنی رائے اور فہم کو حرف آخر اور قطعی تصور کئے بیٹھا ہے[۱]۔

و اعجاب کل ذی رائ برأیہ کا ارشاد پورا ہو رہا ہے۔ یعنی ہر آدمی اپنی رائے پر مغرور و نازاں ہوگا حالانکہ راہ نجات اور سلامتی کا طریقہ ہی وہی ہے جس پر حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ گامزن اور عمل پیرا تھے۔ اُن کے دامن سے وابستہ رہنا ہی فلاح و کامیابی کا ضامن اور اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہلاکت و بربادی اور گمراہی وضلالت کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ کے دامن سے وابستہ رکھے۔ آمین! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے تمہاری خطاء کا خطرہ نہیں۔ لیکن مجھے تمہارے جان بوجھ کر (غلط کاری) اختیار کرنے کا خطرہ ہے۔ (موارد الظمآن ص ۲۱۴ و لفظہ و ما اخشی علیکم الخطاء و لکنی اخشی علیکم العمد)

(۲) چند سال سے پاکستان میں بعض مسائل وجۂ نزاع بنے ہوئے ہیں جن میں علی الخصوص مسئلہ حیات الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عند القبر صلوٰۃ وسلام کا سماع، قبر اور برزخ کے عذاب کی نوعیّت اور توسّل وغیرہ ان میں قابل ذکر ہیں۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ قبور میں حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ارواح طیبات کا ان کے اجسام مبارکہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں! یوں اُن کے اجسام مبارکہ بالکل محفوظ ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عند القبر صلوٰۃ وسلام کا سماع نہیں فرماتے اور اسی طرح عذاب قبر ان میں سے بعض کے نزدیک صرف رُوح کو ہے اور بعض کے نزدیک صرف بے جان جسم کو اور دُعا میں توسّل بھی جائز نہیں۔ جب کہ جمہور علماء کرام ان نظریات کے بالکل مخالف ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ حیات حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جسم اور روح دونوں سے متعلق ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عند القبر صلوٰۃ وسلام کا بنفس نفیس خود سماع فرماتے اور جواب دیتے ہیں اور اسی طرح قبر میں نیکوں کو جو راحت و آرام اور گنہگاروں کو جو عذاب و سزا ہوتی ہے۔ وہ بدن مادّی اور رُوح دونوں سے متعلق ہے اور توسّل کا مسئلہ اپنی جائز صورتوں کے ساتھ جائز اور مشروع ہے۔ ملک کے طول وعرض میں جب یہ مسائل منظر عام پر آئے تو عامۃ المسلمین کا رجوع ملک میں حضرات علماء کرام کی ذمہ دار جماعت جمعیۃ علماء اسلام کی طرف ہوا جن میں محقق اور مدرّس عالم بھی ہیں اور مناظر و مقرر بھی تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی قابل اعتماد ہیں اور ملکی سیاست میں بھی ان کا بفضلہٖ تعالیٰ خاصا حصہ ہے۔ کافی غور وخوض کے بعد محض عوام کی راہنمائی کے لئے انہوں نے ان مسائل میں اپنے

[۱] یہ ایک حدیث کا جملہ ہے جو حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حتی اذا رأیت شحا مطاعا و ھو متبعا و اعجاب کل ذی رأی برأیہ نعلیک نفسک و دع امر العوام الحدیث (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۴۱، موارد الظمان) یعنی جب تو بُخل کو مُطاع اور خواہش نفسانی کو مقتداء اور ہر رائے والے کو اپنی رائے پر مغرور و نازاں دیکھے تو اس وقت تو اپنے نفس کی فکر کر اور عوام کا معاملہ چھوڑ دے۔

بزرگوں کی اور خود اپنی رائے کا اظہار ضروری سمجھا۔ اُن میں سے بعض مسائل پر حضرت مولانا علامہ خالد محمود صاحب ایم، اے سیالکوٹی نے ایک عمدہ، مدلّل اور بہترین کتاب ''مقام حیات'' لکھ کر اہلِ علم کی علمی تشنگی بجھائی ہے۔ اس کتاب کے بعض حوالوں اور دلائل اور ان سے طرز استدلال میں تو علمی اور تحقیقی طور پر اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مجموعی اعتبار سے یہ عمدہ اور ٹھوس کتاب ہے اور ہم نے بھی بعض حوالوں میں اس سے استفادہ کیا ہے مگر پھر بھی ان تمام مسائل پر مدلّل طریقہ سے کتاب کی ضرورت باقی تھی جس کی ضرورت علماء کرام نے محسوس کی۔

(۴) ۲ رربیع الاوّل ۱۳۸۲ھ مطابق ۴ راگست ۱۹۶۲ء میں جمعیت علماء اسلام کے مرکزی اجلاس میں جو لاہور میں منعقد ہوا اور جس میں ملک بھر کے سینکڑوں ذمہ دار علماء کرام تشریف فرما تھے۔ ان مسائل پر بھی خوب گرما گرم بحث ہوئی۔ بالآخر بالاتفاق یہ طے ہوا کہ ان مسائل کی ترتیب وتدوین اور ان کے باحوالہ مدلّل ومبرہن کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے اور وہ ان مسائل پر علمی مواد جمع کرے اور اس کے بعد ذمہ دار حضرات کی رائے سے ان کو شائع کیا جائے۔ چنانچہ اس کمیٹی کے لئے پانچ حضرات منتخب ہوئے۔

(۱) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری دامت برکاتہم، (۲) حضرت مولانا مفتی محمود صاحب، (۳) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سرگودھوی، (۴) حضرت مولانا عبدالحق صاحب دامت فیوضہم (اکوڑہ خٹک)، (۵) راقم اثیم اور اس کمیٹی کا ناظم راقم کو منتخب کیا۔ باوجود نااہلی عدیم الفرصتی اور علالت کے ناچار الامر فوق الادب کے قاعدہ کے تحت اکابر کا حکم اور فیصلہ تسلیم کرنا پڑا۔ آخر مشہور مقولہ ہے: ''حکم حاکم مرگ مفاجات'' ان جملہ اکابر کی ہدایت اور حکم کے مطابق راقم نے ان مسائل کو جمع کیا اور ان کو اطلاع دی کہ مجموعہ مرتب ہو چکا ہے۔ اس پر اظہار رائے کے لئے کوئی جگہ اور وقت متعین کریں۔ مگر مشکل یہ پیش آئی کہ کراچی وملتان واکوڑہ خٹک وسرگودھا اور گکھڑ ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دُور واقع ہیں اور مستزاد براں ان میں سے ہر بزرگ اپنے مقام پر انتہائی مصروف تھے اور راقم اثیم ان سب سے بڑھ کر مصروف تھا۔ اگر ایک صاحب کو فراغت نصیب ہوتی تو دوسرے کسی اُلجھن میں مبتلاء ہوتے اور اگر کسی دوسرے کو قدرے فرصت ملتی تو کوئی اور صاحب مصر وعرب وغیرہ کے دورہ پر ہوتے اور کچھ نہ ہوتا تو مرض وعلالت ہی دامن گیر ہو جاتی۔ الغرض رکاوٹ پر رکاوٹ اور تاخیر پر تاخیر پیش آتی رہی اور کتاب کی سماعت اور اس پر رائے زنی کا موقع میسر نہ آسکا۔ حتیٰ کہ اس کمیٹی کے ایک بزرگ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سرگودھوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۸۵ھ) اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے اور یہ معاملہ جوں کا توں معلق رہا۔ مگر کیا کیا جائے تقدیر میں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔

(۵) بالآخر ۲۴، ۲۵ رشعبان ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۷، ۲۸ رنومبر ۱۹۶۷ء کی تاریخیں منتخب ہوئیں اور ملتان خیر المدارس کی جگہ متعین ہوئی۔ مگر حضرت مولانا عبدالحق صاحب دام مجدہم خود تشریف نہ لا سکے اور ایک نوازش نامہ ارسال فرمایا جو بعینہٖ درج ذیل ہے۔ اسی طرح سوء اتفاق سے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب مدظلہٗ بھی شریک نہ ہو سکے۔ ان کا جو پیام آیا وہ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

(۱) حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد یوسف صاحب بنوری دامت برکاتہم کا گرامی نامہ

گرامی مأثر مولانا المحترم وفقکم اللہ لکل خیر وسعادۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ! میں رحیم آباد، رحیم یار خان اور چند گھنٹوں کے لئے ملتان گیا تھا۔ ۹ رنومبر سے

۲۶ر نومبر تک میں یہاں غیر موجود تھا۔ واپسی پر ڈاک میں مکتوب گرامی ملا اور آج ۲۸ر نومبر پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ بہت صدمہ ہوا۔ آج ۲۵ر شعبان ہے، شام کا وقت ہے۔ اگر مجھے اس کا علم ہو جاتا تو میں ملتان ٹھہر جاتا۔ اناللہ! بہرحال نہ خود حاضری کا امکان نہ نائب مقرر کرنے کا سوال۔ میری غیر موجودگی میں جو صاحب ڈاک کے منتظم تھے وہ بھی تعطیل میں رخصت ہو گئے تھے۔ ورنہ مجھے ٹیلی فون یا تار سے مطلع کرتے۔ بہرحال اب جو کچھ آپ حضرات نے فیصلہ کرلیا ہوگا، وہ بالکل درست ہوگا۔ مجھے اس سے اتفاق ہوگا۔ مجھے اس کا اطمینان ہے کہ وہ درست ہوگا اور صحیح ہوگا۔ اب زیادہ تأسف کیا ہوسکتا! والسلام

محمد یوسف بنوری عفاعنہ ...... ۲۵ر شعبان ۱۳۸۷ھ

***

(۲) حضرت مولانا محمد عبدالحق صاحب شیخ الحدیث مدرسہ حقانیہ دامت برکاتہم کا نوازش نامہ

حوالہ نمبر ۱۵۹۳ ۱۸ر رجب ۱۳۸۷ھ

بگرامی خدمت مخدومی المحترم المکرم جناب حضرت العلاّمہ مولانا صاحب زادکم اللہ مجداً وسعوداً

اَلسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ باعث عزت افزائی بنا۔ یادفرمائی کا تہِ دل سے مشکور ہوں۔ مسائل مذکورہ کے بارے میں مجھے آں محترم کے گراں مایہ تحقیقات سے کلی اتفاق ہے۔ پھر دیگر حضرات اکابر وافاضل کے غور وخوض سے جو فیصلہ ہوگا، اُس سے میرے اختلاف کی کیا مجال ہے؟ آپ حضرات نے جو بھی طے کیا، اس کی میں کاملاً تائید کرتا ہوں۔ میٹنگ میں بھی شمولیت سرمایۂ سعادت سمجھتا ہوں۔ مگر افسوس کہ ان دنوں بعض ایسے موانع اور اعذار درپیش ہیں۔ جس کی وجہ سے ملتان حاضر نہ ہوسکوں گا۔ ایسے قلیل وقت میں مجوزہ مشاغل کو ملتوی کرنا بھی مشکل ہے۔ حضرات اکابر نے جو بھی فیصلہ کیا۔ میرا اتفاق اس کے ساتھ لکھ لیں اور اگر مزید ضرورت ہو تو مسائل مذکورہ کے بارہ میں اُن حضرات کی رائے گرامی یہاں ارسال فرمادیں۔ میں بھی تائیدی دستخط ثبت کروں گا۔ اُمید ہے میری واقعی مجبوریوں کی وجہ سے نہ آسکنے پر کبیدہ خاطر نہ ہوں گے۔ آپ کا وجود علمی اور دینی دنیا کے مغتنمات میں سے ہے۔ خداوند تعالیٰ مساعی جمیلہ کو برکت اور قبولیت سے نوازدے۔ آمین، آمین والسلام! بندہ عبدالحق غفرلہ مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

ملتان کے اس اجلاس میں جن حضرات نے شرکت کی اور اوّل سے آخر تک راقم کتاب سناتا رہا اور یہ بزرگ سنتے رہے اور بعض بعض مقامات میں اصلاح بھی کرتے رہے اور آخر میں بعض مسائل پر بحث بھی ہوئی اور ان کی ہدایت پر عمل کیا گیا، وہ یہ ہیں: (۱) حضرت مولانا خیر محمد صاحب، (۲) حضرت مولانا مفتی محمود صاحب دام مجدھم، (۳) حضرت مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب دام مجدھم (ملتان)، (۴) حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب دام مجدھم جامعہ رشیدیہ ساہیوال، (۵) حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری، (۶) حضرت مولانا غلام غوث صاحب دامت برکاتہم، (۷) حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب دام مجدھم (چکوال)، (۸) حضرت مولانا محمد نذیر اللہ خان صاحب دام مجدھم (گجرات)، (۹) راقم اثیم، (۱۰) اور گاہے گاہے حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب کوہاٹی نائب مفتی خیر المدارس ملتان بھی اس میں حصہ لیتے رہے۔

(۶) یہ بات بھی اچھی طرح ملحوظِ خاطر رہے کہ قرآنِ کریم اور حدیث شریف کے معانی و مطالب جس طرح حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ نے سمجھے اور بیان کئے ہیں وہی صحیح اور درست ہیں۔ کیونکہ ان میں علم اور علم کا عمق خدا خوفی اور ورع جس طرح موجود تھا وہ بعد کے آنے والوں کو نصیب نہیں ہو سکا اور زمانۂ رسالت کے قُرب کی برکت اور خیر القرون کی سعادت سے جس انداز سے وہ بہرہ ور ہوئے، وہ انہی حضرات کا حصہ ہے۔ خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۱ھ) نے ایک موقع پر منکرین تقدیر کو نصیحت کرتے ہوئے ایسی بہترین باتیں اِرشاد فرمائی ہیں جو بلا مبالغہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ انہوں نے طویل مضمون میں ان لوگوں کے شبہات کا ازالہ فرمایا اور پوری ہمدردی اور دل سوزی سے ان کی خیرخواہی کی۔ ان لوگوں کا یہ شُبہ تھا کہ اگر تقدیر پر اِیمان لانا ضروری ہے اور یہ قرآن (وحدیث) سے ثابت ہے تو قرآن کریم میں ایسی آیات کیوں موجود ہیں جن سے تقدیر کی نفی ثابت اور معلوم ہوتی ہے۔ ان کے اِس پادر ہوا شبہ کو رد کرتے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے جو کچھ فرمایا وہ سارا مضمون پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اس کے چند جملے یہ ہیں: ''ولئن قلتم لم انزل اللہ آیۃ کذا و لِمَ قال کذا لقد قرؤا منہ ما قرأتم و علموا من تاویلہ ما جھلتم و قالوا بعد ذالک کلہ بکتاب و قدر و ما یقدر یکن و ماشاء اللہ کان و مالم یشالم یکن و لا نملک لانفسنا نفعًا و لا ضرا ثم رغبوا بعد ذٰلک و رھبوا'' (ابوداؤد ج۲ ص۲۷۸)

(ترجمہ) ''اور اگر تم یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں آیت کیوں نازل فرمائی ہے (جس سے تقدیر کا انکار ثابت ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے اس طرح کیوں فرمایا ہے؟ (تو اس کا جواب یہ ہے) کہ بلا شُبہ قرآن کریم کی یہ آیتیں اور مضمون حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ نے بھی پڑھا ہے، جیسا کہ تم پڑھتے ہو مگر وہ اس کا مطلب سمجھ گئے اور تم نہ سمجھ سکے اور باوجود اس کے انہوں نے (پہلے ہی سے اعمال کے) لکھنے کا اور تقدیر کا اقرار کیا سو جو چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں سے مقدر ہوتی ہے اور جس کو وہ چاہتا ہے وہ ہو کر رہتی ہے اور جس کو وہ نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتی اور ہم اپنے لئے نہ تو نفع کے مالک ہیں اور نہ ضرر کے اور پھر وہ راغب (الی اللہ) بھی ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے بھی رہے۔''

مراد واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی ان آیات سے اگر تمہیں تقدیر کا اِنکار معلوم ہوتا ہے تو یہی قرآنِ کریم اور اس کی آیات حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ کے سامنے بھی تو تھیں، پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو ان آیات سے نفی معلوم نہ ہوئی اور تمہیں معلوم ہوگئی۔ کیسے باور کیا جائے کہ تم ان آیات کی تہ تک رسائی حاصل کر گئے اور ان پر یہ راز منکشف نہ ہو سکا۔ اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اگر چہ تم قرآنِ کریم کی آیات پڑھتے ہو لیکن ان کا مطلب نہیں سمجھتے اور ٹھوکر کھا جاتے ہو اور حضرات سلف ان کی تہ تک پہنچ گئے تو انہی کے دامن سے وابستہ رہنا ضروری اور کامیابی کی چابی ہے اور ان سے اعراض نرا خطرہ کا آلارم ہے اور پھر جمہور اُمت اور اکثریت کا خطاء سے محفوظ رہنا نصوص سے ثابت ہے اکیلے دوکیلے کی غیر معصوم رائے ان کے مقابلہ میں کیا وقعت رکھتی ہے؟ علامہ اقبال مرحوم نے کیا اچھا فرمایا ہے کہ ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہاء کچھ نہیں

اِس لئے قرآنِ کریم کی ہر آیت اور ہر حدیث کا مطلب سمجھنے کے لئے حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ کا دامن تھامنا ضروری ہے اور یہی نجات کا راستہ ہے۔ اللّٰھم وفقنا لما تحب و ترضٰی۔

***

باب اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ ○ اَلَّذِیْ لَاشَرِیکَ لَہُ فِی الخَلقِ وَالاَمرِ بِیَدِہِ المَوتُ وَالحَیٰوۃُ وَھُوَ الَّذِیْ قَالَ کَیفَ تَکفُرُونَ بِاللّٰہِ وَکُنتُمْ اَموَاتًا فَاَحیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیتُکُمْ ثُمَّ یُحیِیکُمْ ثُمَّ اِلَیہِ تُرجَعُونَ وَھُوَ الَّذِیْ اَرسَلَ رَسُولَہُ بِالھُدٰی وَدِینِ الحَقِّ وَاَعلٰی دَرَجَتَہُ فِیْ اَعلٰی عِلِّیِّینَ وَحَرَّمَ عَلَی الاَرضِ جَسَدَہُ الشَّرِیفَ وَاَجسَادَ سَائِرِ الاَنبِیَاءِ علیہم الصلوٰۃ والسلام اَن تَاکُلَھَا وَمَن صَلّٰی عَلَیہِ عِندَ قَبرِہٖ سَمِعَہُ وَمَن صَلّٰی عَلَیہِ نَائِیًا بُلِّغَہُ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَاَزوَاجِہٖ وَجَمِیعِ مُتَّبِعِیہِ اِلٰی یَومِ الدِّینِ۔ اٰمِینَ ثُمَّ اٰمِینَ!

قبر کی راحت اور عذاب حق ہے اور اس کا انکار کفر ہے

جملہ اہل السنت والجماعت اس عقیدہ پر متفق ہیں کہ قبر اور برزخ میں اہلِ ایمان اور اصحاب طاعات کو لذت وسرور نصیب ہوتا ہے اور کفار ومنافقین اور گناہگاروں کو عذاب وتکلیف حاصل ہوتی ہے، اس میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن وسنت اور اجماع اُمت کے صریح دلائل کے پیش نظر یہ عقیدہ اتنا مضبوط ہے کہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کا ذمہ دار گروہ عذاب قبر کے منکر کو کافر کہتا ہے۔ حالانکہ وہ تکفیر کے مسئلہ میں بڑا ہی محتاط ہے اور ان کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر کسی ایک کلمہ میں مثلاً سو معانی کا احتمال بھی پیدا ہوسکتا ہو جن میں ۹۹ پہلو کفر کے نکلتے ہوں اور صرف ایک ہی پہلو اِسلام کا پیدا ہوتا ہو تو قائل کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ قائل کی مراد اسلام ہی کا پہلو ہو۔ ہاں! اگر وہ خود ہی کفر کا کوئی معنی اور پہلو متعین کردے تو پھر کفر کے فتویٰ سے اس کو کوئی تاویل نہیں بچا سکتی۔ مسئلہ کی وضاحت کے لئے ہم مسلم حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ سے چند بزرگوں کی شہادت نقل کرتے ہیں:

(۱) علامہ طاہر بن احمد۔ الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۵۴۲ھ) لکھتے ہیں کہ: ''ولا یجوز الصلٰوۃ خلف من ینکر شفاعۃ النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام وینکر کرام الکاتبین وعذاب القبر کذا من ینکر الرؤیۃ لانہ کافر''

''جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور کرامٌ کاتبین اور عذابِ قبر اور رؤیۃِ باری تعالیٰ کا منکر ہو، اس کے پیچھے نماز درست نہیں ہے، کیونکہ وہ کافر ہے۔'' (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۴۹)

یہ عبارت اپنے مفہوم ومدلول کے لحاظ سے بالکل روشن ہے، کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں۔

(۲) محقق علی الاطلاق حافظ ابن الھمام محمد بن عبدالواحد الحنفی (المتوفی ۸۶۱ھ) فرماتے ہیں کہ: ''ولا تجوز الصلٰوۃ خلف منکر الشفاعۃ والرؤیۃ وعذاب القبر والکرام الکاتبین لانہ کافر لتوارث ھذہ الامور عن الشارع علیہ السلام'' شفاعت اور اللہ تعالیٰ کے دیدار اور عذاب قبر اور کرام کاتبین کے انکار کرنے والے کی اقتداء میں نماز درست نہیں ہے کیونکہ وہ کافر ہے۔ اس لئے کہ یہ اُمور شارع علیہ السلام سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۲۴۷، طبع مصر)

یہ حوالہ بھی اپنے مدلول میں صریح ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری ج ۲ ص ۳۰۱ طبع مصر) میں بھی انکار عذاب قبر کو کفر لکھا ہے۔

(۳) امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن بکر الانصاری الخذری الاندلسی القرطبی رحمہ اللہ (المتوفی ۶۷۱ھ) ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''فاعلموا ایھا الاخوان ان عذاب القبر و نعیمہ حق کما صرحت بہ الاحادیث الصحیحۃ ولٰکن اللہ تعالیٰ یأخذ بابصار الخلائق و اسماعھم من الجن و الانس عن رؤیۃ عذاب القبر و نعیمہ لحکمۃ الٰھیۃ و من شک فی ذٰلک فھو ملحد'' (مختصر تذکرۃ القرطبی رحمہ اللہ، لعبدالوہاب الشعرانی رحمہ اللہ ص ۳۶ طبع مصر)

''اے بھائیو! تم بخوبی جان لو کہ قبر کا عذاب اور اس کی راحت برحق ہے۔ جیسا کہ صحیح احادیث صراحت سے اس پر دلالت کرتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنی (مکلّف) مخلوق میں سے جنوں اور انسانوں کی آنکھوں اور کانوں سے قبر کے عذاب اور راحت کو اوجھل رکھتا ہے۔ کیونکہ حکمت الٰہی کا تقاضا ہی یہی ہے اور جو شخص اس کا انکار کرے تو وہ ملحد ہے۔''

علّامہ ابوشکور السالمی رحمہ اللہ (المتوفی) فرماتے ہیں کہ: ''فاما عذاب القبر للمؤمنین من الجائزات وللکافرین من الواجبات واللہ تعالیٰ یقول اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا یعنی فرعون و قومہ دل انہ کان صحیحا فی ایّ موضع و علی ایّ حال و من انکر ھذا یصیر کافرا واللہ اعلم'' (تمہید ص ۱۲۵ طبع لاہور)

''عذاب قبر مؤمنوں کے لئے جائز اور کافروں کے لئے واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ فرعون اور اس کی قوم صبح و شام آگ پر پیش کی جاتی ہے۔ یہ ارشاد دلالت کرتا ہے کہ عذاب صحیح ہے جس جگہ میں ہو اور جس حالت میں ہو جو اس کا منکر ہو سو وہ کافر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!''

مولانا عبدالعلی بحرالعلوم الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۳۵ھ) لکھتے ہیں کہ: ''منکر الشفاعۃ لا اھل الکبائر والرؤیۃ و عذاب القبر و منکر الکرام الکاتبین کافر'' (رسائل بحرالعلوم ص ۹۹)

''اہل کبائر کے لئے شفاعت، رؤیت باری تعالیٰ، عذاب قبر اور کاتبین کا انکار کرنے والا شخص کافر ہے۔''

ذخیرۂ کُتبِ حدیث میں صحیح اور صریح احادیث میں جن کا احصاء و شمار بھی مشکل ہے۔ بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ قبر کی راحت اور عذاب کا ذکر ہے اور عذابِ قبر کا ذکر قرآنِ کریم میں بھی مذکور ہے مگر کچھ لوگ اپنی بدقسمتی سے قرآنِ کریم اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں دیکھنے کے بجائے محض اپنی نارسا عقل اور مادی طبیعت کے زور سے ان مسائل کو حل کرنے کی بے جا سعی کرتے ہیں اور اپنی رائے سے قرآن کریم کی تفسیر کرنے کے خوگر ہیں وہ دیگر مسائل کی طرح عذاب قبر کا بھی انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی ناقص سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مرنے کے بعد ثواب و عقاب اور راحت و عذاب بے جان جسم کو ہو؟ لیکن نصوص قطعیہ اس باطل نظریہ کی پُرزور تردید کرتی ہے اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ جسم کے ساتھ رُوح کا تعلق ہوتا ہے اور قطع نظر احادیث کے قرآن کریم میں عذاب برزخ کا ذکر ہے۔ اپنے دعویٰ کو مبرہن کرنے کے لئے چند آیات پیش کرتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ سرکشوں اور باغیوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ: ''وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَکُمْ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا کُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَکُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَکْبِرُوْنَ'' (الانعام: ۹۳)

''اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ ظالم موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے (اور کہیں گے) کہ نکالو اپنی جانیں آج کے دن تمہیں بدلہ ملے گا ذلت کے عذاب کا۔ اس سبب سے کہ تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹی باتیں کہتے تھے اور اس کی آیتوں سے تکبر کیا کرتے تھے۔''

خروج نفس اور روح کے بعد "اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْھُوْنِ" میں جس عذاب کا ذکر کیا گیا ہے یہی اصطلاح شریعت میں عذاب قبر اور عذاب برزخ کہلاتا ہے اور چونکہ یہ الفاظ استعمال کرنے والے معصوم فرشتے ہیں جن کے صادق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا اور جو بجز پروردگار کے بلائے بولنے کے مجاز نہیں۔ اس لئے اگر مرنے کے بعد جلد ہی عذاب نہ ہو تو (معاذ اللہ تعالیٰ) یہ کلام صادق نہ رہے گا اور جب یہ ارشاد حق ہے تو ثابت ہوا کہ مرنے کے بعد عذاب ہوتا ہے۔ (ماخوذ از کتاب الروح ص ۹۳)

(۲) دوسرے مقام پر نافرمانوں اور مجرموں کے تذکرہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ: "وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَاَدْبَارَھُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ" (الانفال:۵۰)

"اور اگر دیکھے تو جس وقت جان قبض کرتے ہیں فرشتے کافروں کی (اور) مارتے ہیں اُن کے منہ اور ان کی کمریں اور کہتے ہیں چکھو عذاب جلنے کا۔"

مرنے کے بعد جو عذاب الحریق کافروں کو چکھایا جائے گا وہی عذاب قبر اور عذاب برزخ ہے۔ اس آیت کریمہ سے بھی بلا کسی تاویل کے ثابت ہوا کہ موت کے وقت ہی سے کافروں کو عذاب کی وعیدیں سنادی جاتی ہیں اور لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہونے کے فوراً بعد عذاب شروع ہوجاتا ہے۔

(۳) ایک مقام پر فرعونیوں کا واقعہ نقل کرتے ہوئے رب العزت فرماتے ہیں کہ: "وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ○ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْھَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ"

"اور گھیر لیا فرعونیوں کو بُری طرح عذاب نے وہ آگ ہے کہ پیش کئے جاتے ہیں، اس پر صبح و شام اور جس دن قیامت قائم ہوگی۔ حکم ہوگا کہ داخل کرو فرعونیوں کو سخت سے سخت عذاب میں۔" (المؤمن:۴۵،۴۶)

اس ارشاد سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ صبح و شام یعنی دوام و استمرار کے ساتھ فرعونیوں کو آگ کے عذاب پر پیش کیا جاتا ہے اور وہی عذاب قبر اور عذاب برزخ کہلاتا ہے۔ کیونکہ قیامت کا عذاب تو "وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ" کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے جو "اَشَدَّ الْعَذَابِ" ہوگا اور جو حکم فرعونیوں کا ہے وہی حکم جملہ کفار اور مشرکین کا ہے۔ کیونکہ جو علت ان کے عذاب اور سزا کی ہے وہی دوسروں میں بھی پائی جاتی ہے۔

حافظ عماد الدین بن کثیر الشافعی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۷۴ھ) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: "وھذہ الآیة اصل کبیر فی استدلال اھل السنة علی عذاب البرزخ فی القبور" (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۸۱، طبع مصر)

"یہ آیت کریمہ قبر میں عذاب برزخ کے اثبات کے سلسلہ میں اہل سنت کے لئے ایک بڑا قاعدہ اور ضابطہ ہے۔"

(۴) حضرت نوح علیہ السلام کی نافرمان اور مجرم قوم کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ: "مِمَّا خَطِیْٓئٰتِھِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا فَلَمْ یَجِدُوْا لَھُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْصَارًا" (نوح:۲۵)

"بوجہ اپنے گناہوں کے وہ غرق کئے گئے، پس ڈالے گئے آگ میں۔ پھر نہ پایا انہوں نے اپنے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار۔"

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی مجرم قوم غرقاب ہوتے ہی فوراً عذاب میں مبتلاء ہوگئی۔

کیونکہ ''اُغْرِقُوْا'' ماضی کا صیغہ ہے اور اسی طرح ''فَاُدْخِلُوْا'' بھی ماضی ہے جس میں حرف فَا ہے جو تعقیب بلا مُہلہ کے لئے آتا ہے۔ (الخیالی ص ۱۱۸) اور مرنے کے بعد فوراً جو عذاب ہوتا ہے، اسی کا نام عذاب قبر اور عذاب برزخ ہے۔ ان آیات طیبات سے معلوم ہوا کہ اصل عذاب قبر کا ثبوت قرآن کریم میں موجود و مذکور ہے۔ ہاں! اس کی تفسیر وتشریح جناب رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے وحی پا کر اپنی زبان مبارک سے بیان کر دی ہے جو بالکل حق ہے۔ کیونکہ

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

عذاب قبر کی بعض احادیث

عذاب قبر کے بارے میں بکثرت احادیث وارد ہیں ہم اس مقام پر صرف چند احادیث باحوالہ عرض کرتے ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: ''مرّ النبی ﷺ بقبرین فقال انهما لیعذبان وما یعذبان فی کبیرا اما احدهما فکان لا یستتر من البول وفی روایة لمسلم لا یستنزه من البول واما الآخر فکان یمشی بالنمیمة ثم اخذ جریدة رطبةً فَشَقَّهَا بنصفین ثم غرز فی کل قبر واحدة قالوا یارسول اللہ لم صنعت هذا فقال لعله ان یخفف عنهما مالم ییبسا''

(متفق علیہ، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۴۲، بخاری ج ۱ ص ۳۵، مسلم ج ۱ ص ۱۴۱، موارد الظمأن ص ۱۹۹)

''آنحضرت ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے تو آپ نے فرمایا کہ ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے لیکن کسی بڑے گناہ میں عذاب نہیں ہو رہا۔ ایک کو تو اس سے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ پیشاب کی چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغلی کیا کرتا تھا۔ پھر آپ نے کھجور کی تر ٹہنی لی اور اس کے دو حصے کر دیئے ایک حصہ ایک قبر میں گاڑ دیا اور دُوسرا دُوسری قبر میں۔ پھر فرمایا شاید کہ ان سے عذاب ہلکا ہو جائے جب تک کہ یہ ٹہنیاں خشک نہ ہوں۔''

اس حدیث میں شرّاح حدیث نے جو روایتی اور درایتی ابحاث کی ہیں، اس وقت ان سے غرض نہیں ہے، یہ صحیح روایت عذاب قبر کے بارے میں نص ہے اور اس موقع پر یہی پہلو مقصود ہے۔

(۲) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: ''بینا رسول اللہ ﷺ فی حائط لبنی النجار علی بغلة له و نحن معه اذ حادت به فکادت تلقیه و اذا قبر سته او خمسة فقال من یعرف اصحاب هذه الاقبر قال رجل انا قال فمتی ماتوا قال فی الشرک فقال ان هذه الامة تبتلی فی قبورها فلولا ان لا تدا فنوا لدعوت اللہ ان یسمعکم من عذاب القبر الذی اسمع منه''

(الحدیث، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۵، مسلم ج ۲ ص ۳۸۶، موارد الظمأن ص ۲۰۰)

''آنحضرت ﷺ خچر پر سوار ہو کر بنو نجار کے ایک باغ میں جا رہے تھے اور ہم بھی آپ کے ساتھ تھے یکا یک خچر بدکا، قریب تھا کہ آپ کو گرا دیتا۔ معلوم ہوا کہ وہاں پانچ یا چھ قبریں تھیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان قبروں میں کون لوگ دفن ہیں؟ کوئی جانتا ہے؟ ایک شخص بولا: ہاں! حضرت میں جانتا ہوں یہ دَورِ شرک میں فوت ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس اُمت (یعنی مکلّف انسانوں) کا قبروں میں امتحان ہوتا ہے۔ اگر مجھے یہ ڈر نہ ہو کہ تم مُردوں کو دفن نہیں کرو گے تو میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کروں کہ جو عذاب قبر میں سنتا ہوں وہ تمہیں بھی سنا دے۔''

اس روایت سے بھی عذاب قبر کے اثبات پر صراحت سے روشنی پڑتی ہے:

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں یہ بھی آتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''ویضرب بمطارق من حدید ضربۃ فیصیح صیحۃ یسمعھا من یلیہ غیر الثقلین''

''منافق کو لوہے کے ہتھوڑوں سے سختی سے مارا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی آواز کو انسانوں اور جنوں کے علاوہ قریب والی ساری مخلوق سنتی ہے۔'' (متفق علیہ ولفظہ للبخاری ومسند احمد ج ۳ ص ۱۲۶، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۵)

اور ایک روایت میں آتا ہے: ''انھم لیعذبون فی قبورھم تسمعہ البھائم'' (موارد الظمآن ص ۲۰۰)

''بلاشبہ ان (مجرموں) کو قبروں میں سزا دی جاتی ہے جس سزا کی آواز چوپائے بھی سنتے ہیں۔''

چونکہ انسان اور جن مکلف مخلوق ہے، اس لئے اِن سے ایمان بالغیب مطلوب ہے اور ان کو قبر کا عذاب سنانا حکمت کے خلاف ہے۔ بخلاف چوپایوں اور باقی جانوروں کے کہ وہ مکلف نہیں۔ اس لئے وہ سُن سکتے ہیں۔

(۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں آتا ہے کہ منکر نکیر جب نیک و بد سے سوال کر چکتے ہیں تو منافق اور مجرم کے متعلق: ''فیقال للارض التئمی علیہ فتلتئم علیہ فتختلف اضلاعہ فلا یزال فیھا معذبا حتی یبعثہ اللہ من مضجعہ ذالک'' (رواہ الترمذی ج ۱ ص ۱۲۷، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۵)

''زمین کو حکم ہوتا ہے کہ اس پر سمٹ کر اکٹھی ہو جا سو زمین اُس پر سمٹ جاتی ہے اور اس کی پسلیاں آر پار ہو جاتی ہیں، یہ سزا اس کو اس وقت تک ہوتی رہتی ہے جب تک کہ قیامت کے دِن قبر سے کھڑا نہیں کر دیا جاتا۔''

ہم نے صرف چند حدیثیں عرض کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ راحتِ قبر اور عذابِ قبر کے بارے میں اس کثرت سے احادیث وارد ہیں جن کا احصاء و شمار آسانی سے نہیں ہو سکتا۔ حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ عذابِ قبر کی احادیث متواتر درجہ کی ہیں اور ان کا انکار کفر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اسلام کے سبھی طبقے عذاب قبر اور راحتِ قبر کے مسئلہ پر متفق ہیں مگر کچھ بدنصیب منکر ہیں۔

قبر کا حقیقی مفہوم

لفظ قبر اور اس کی جمع قبور اور اس کا مادّہ قرآن کریم میں آیا ہے: ''اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ'' (انفطار: ۳۰)

جس وقت قبریں اکھاڑی جائیں گی اور منافقوں کی تردید کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے: ''وَلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ'' اور تو ان میں سے کسی کی قبر پر کھڑا نہ ہو۔ (التوبۃ: ۸۴)

اور ایک اور مقام پر آیا ہے: ''فَاَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ'' (عبس: ۲۱)

''پس اس نے اس کو مارا یعنی اس کو قبر میں داخل کرنے کا حکم دیا۔'' (تفسیر عزیزی پارہ عم ص ۸۸، ترجمہ اُردو)

اور نیز ارشاد ہوتا ہے: ''اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ'' (العادیات: ۹)

''جس وقت قبروں کے مُردے نکالے جائیں گے۔''

''كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ'' (الممتحنۃ: ۱۳)

''جیسا کہ کافر اہل قبور (کی حیات سے) نا اُمید ہو چکے ہیں۔''

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یعنی منکروں کو توقع نہیں کہ قبر سے کوئی اُٹھے گا اور پھر دوسری زندگی میں ایک دوسرے سے ملیں گے یہ کافر بھی ویسے ہی نا اُمید ہیں۔'' (حاشیہ ص ۷۱۵)

اور احادیث میں اس کثرت سے یہ لفظ آیا ہے کہ اس کا آسانی سے شمار نہیں کیا جا سکتا اور لفظ قبر حقیقتاً اس گڑھے پر اطلاق کیا جاتا ہے جس میں میت کو دفن کیا جاتا ہے اور جس میں اس کا جسد عنصری رکھا جاتا ہے، سابق پیش کی ہوئی حدیثیں اس کا واضح ثبوت ہیں۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے جن دو قبروں پر کھجور کی ٹہنی دو حصے کر کے گاڑی دی تھی وہ حسی قبریں اور گڑھے ہی تھے۔ کیونکہ اس سے علیین اور سجین کا وہ برزخی مقام تو مراد نہیں جو مستقر ارواح ہے کیونکہ ٹہنی کے دو حصے وہاں نہیں گاڑے گئے تھے۔ اسی طرح بنو نجار کے جس باغ میں پانچ یا چھ قبریں تھیں اور جن کے پاس سے گزرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کا خچر بدکا تھا وہ حسی قبریں ہی تھیں۔ سجین کا وہ برزخی مقام نہ تھا جو ارواح کفار کا مستقر ہے، کیونکہ خچر وہاں نہیں گیا تھا بلکہ بنو نجار کے باغ میں جو قبریں تھیں ان کے پاس سے گزرا تھا اور انہیں قبروں کی نشان دہی ایک انصاری نے کی تھی اور اسی طرح میت کے عذاب کی آواز کا انسانوں اور جنوں کے بغیر جانوروں کا سننا بھی اس ظاہری اور حسی قبر ہی سے متعلق ہے۔ کیونکہ بہائم اور جانور سجین کے مقام پر تو نہیں پہنچتے بلکہ سطح ارضی پر ظاہری اور حسی قبروں کے آس پاس چلتے اور چرتے پھرتے رہتے ہیں اور اسی طرح ایک روایت میں آتا ہے: ''انَّ المیّت اذا وضع فی قبرہ وانہ یسمع خفق نعالھم حین یولّون مدبرین الحدیث''

''کہ میت جب قبر میں رکھی جاتی ہے اور دفن کرنے والے اس سے واپس ہوتے ہیں تو وہ ان کی جوتیوں کی کھنکھناہٹ کو سنتی ہے۔'' (موارد الظمآن ص ۱۹۷ واللفظ لہ، بخاری ج ۱ ص ۱۷۸، مسلم ج ۲ ص ۳۸۶)

میت جس قبر میں رکھی جاتی ہے اور دفن کرنے والے جس قبر سے واپس ہوتے ہیں تو وہ یہی حسّی قبر اور گڑھا ہوتا ہے کیونکہ دفن کرنے والوں کی رسائی علیین اور سجین تک نہیں ہوتی۔ حضرت بشیر بن خصاصیہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ مشرکوں کی قبروں کے پاس سے گزرے تو تین دفعہ فرمایا کہ یہ لوگ کتنی بڑی خیر سے محروم ہو کر دنیا سے چلے گئے ہیں اور جب مسلمانوں کی قبروں کے پاس سے گزرے تو تین ہی مرتبہ یہ ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ کیا ہی عمدہ خیر اور بھلائی کما کرُ دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ اتنے میں آپ نے توجہ فرمائی: ''فاذا ھو برجل یمشی بین القبور وعلیہ نعلان فناداہ یاصاحب السبتیتین الق سبتیتیک الحدیث''

''تو دیکھا کہ ایک شخص جوتی پہن کر قبروں کے درمیان چل رہا تھا آپ نے اس کو آواز دی اور فرمایا کہ اے جوتیاں پہننے والے اپنی جوتیاں اُتار۔'' (موارد الظمآن ص ۲۰۱، مستدرک ج اوّل ص ۳۷۳، قال الحاکم، والذہبی، صحیح)

ظاہر اَمر ہے کہ وہ شخص حسّی قبروں کے درمیان جوتیاں پہن کر چل پھر رہا تھا علیین اور سجین کے برزخی مقام میں تو نہ تھا۔ غزوۂ اُحد میں جب ستر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے تو آنحضرت ﷺ نے: ''کان یجمع الثلاثۃ والاثنین فی قبر واحد الحدیث''

''دو دو اور تین تین کو ایک قبر میں جمع کر کے دفن کیا۔'' (مستدرک ج ۱ ص ۳۶۵)

یہ قبریں بھی حسّی تھیں کیونکہ ظاہر طور پر شہداء اُحد کو انہی میں دفن کیا گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''اذا وضعتم موتاکم فی قبورھم فقولوا بسم اللّٰہ وعلٰی ملۃ رسول اللّٰہ الحدیث''

''جب تم اپنے مُردوں کو قبروں میں رکھنے لگو تو اس وقت ''بسم اللہ و علی ملة رسول اللہ'' کے الفاظ پڑھا کرو۔'' (مستدرک ج ۱ ص ۳۶۶، قال الحاکم رحمہ اللہ والذہبی رحمہ اللہ علیٰ شرطہما)

اس سے بھی حسّی قبریں مراد ہے کیونکہ دفن کرنے والے انہیں قبروں میں دفن کرتے ہیں۔

فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت اپنے بیٹے کو وصیّت کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ جب تم مجھے دفن کر چکو اور میری قبر پر مٹی ڈال چکو: ''ثم اقیموا احول قبری قدر ماینحر الجزور ویقسم لحمها حتی استأنس بکم و اعلم ماذا اراجع به رسل ربی'' (مسلم ج ۱ ص ۷۶ وابوعوانہ ج ۱ ص ۷۱، ومشکوۃ ج ۱ ص ۱۴۹)

''تو میری قبر کے اِردگرد اتنا وقت کھڑا ہونا جتنے میں اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جا سکتا ہوتا کہ میں تمہارے ساتھ مانوس ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے فرشتوں کو جواب دے سکوں۔''

اس حدیث سے بھی بخوبی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی وصیّت میں جس قبر کا ذکر ہے وہ یہی حسّی گڑھا ہے کیونکہ دفن کرنے والے اسی کے پاس کھڑے ہو سکتے تھے علیین پر جانا ان کے بس میں نہ تھا۔

اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے وصیّت کی تھی کہ جب میری وفات ہو جائے تو میری قبر پر کھجور کی دو ٹہنیاں گاڑ دینا۔ (بخاری ج ۱ ص ۱۸۱)

ان تمام صحیح روایات سے یہ ثابت ہوا کہ لفظ قبر اور قبور ان حسّی گڑھوں پر اطلاق ہوا ہے جن میں مُردوں کو دفن کیا جاتا ہے اور یہ سب الفاظ صحیح احادیث میں وارد ہیں جو صاحب شریعت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض رسان اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زبانوں سے نکلے ہیں۔ اس لحاظ سے جہاں بھی لفظ قبر یا قبور بولا جائے گا تو اس سے حقیقتاً شریعت میں یہی گڑھے مراد ہوں گے جن میں مُردے دفن کئے جاتے ہیں اور حشر تک انہی میں رہتے ہیں اگرچہ ان کے ذرّات ہی کیوں نہ ہو چکے ہوں ؎

اب تو اپنی منزلِ خواب گراں تک آگئے
حشر تک سوتے رہیں گے قبر میں آرام سے

قبر کا مجازی معنی

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میّت کا جسم محفوظ نہیں رہتا۔ مثلاً وہ آگ میں جل جاتا یا جلا دیا جاتا ہے یا دریا بُرد ہو جاتا ہے اور اس کو مچھلیاں وغیرہ جانور ہڑپ کر جاتے ہیں یا درندے اور پرندے اس کو کھا جاتے ہیں اور قبر میں دفن کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی اور ظاہر بات ہے کہ سوال قبر اور قبر کی راحت یا تکلیف و عذاب اس کے بارے میں بھی ہے ایسے لوگوں کے بارے میں حضرات متکلمین و فقہاء رحمہم اللہ اور شُراح حدیث کے سامنے باطل فرقوں کی طرف سے یہ اشکال پیش آیا کہ جب ان لوگوں کو قبروں میں دفن ہی نہیں کیا گیا تو ان کے متعلق قبر میں سوال اور راحت و عذاب قبر کا کیا مطلب؟ اس مُشکل سوال کے جواب میں علماء اسلام اور متکلمین نے جو کچھ فرمایا وہ بقدر ضرورت اپنے مقام پر باحوالہ عرض کیا جائے گا۔ اِن شاء اللہ العزیز! مگر اس مقام پر صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اس مشکل سوال سے جو مخلص ان حضرات نے تلاش کیا ہے وہ یہ ہے کہ قبر صرف اس حسّی گڑھے ہی کا نام نہیں ہے بلکہ برزخ علیّین اور سجّین کے اس مقام کا نام بھی ہے جو نیکوں اور بدوں کی ارواح کا مستقر ہے اور ان لوگوں کے لئے وہی مقام قبر ہے اور ان کی راحت و عذاب کا محل بھی وہی ہے۔ لہٰذا سوال قبر اور راحت و عذاب سب کے لئے ہے صرف انہی لوگوں کے لئے نہیں جو مٹی کے گڑھے میں دفن کئے جاتے ہیں۔

چنانچہ علامہ قرطبی ﷫ اسی اشکال کے پیش نظر لکھتے ہیں کہ: ''وقد اجمع اھل الکشف علٰی ان المیّت یحس بضغطۃ القبر و یحس باختلاف اضلاعہ ولو کان فی بطون السباع اور والطیور او کان قد حرق وذری فی الریح فتحسّ کل ذرّۃ بالالم ولو کانت متفرقۃ'' (مختصر تذکرہ قرطبی ﷫ ص ۳۶، طبع مصر)

''جملہ اہل کشف کا اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ میّت قبر کی تنگی اور پسلیوں کے آر پار ہونے کو محسوس کرتی ہے اگرچہ وہ درندوں اور پرندوں کے پیٹ میں ہو یا اس کو جلا کر ہوا میں بکھیر دیا جائے میّت کا ہر ذرّہ تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ اس کے ذرّات متفرق ہو چکے ہوں۔''

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قبر کی تنگی اور عذاب سے وہ لوگ بھی مستثنٰی نہیں جن کو درندے اور پرندے کھا گئے ہوں یا ان کو جلا کر ہوا میں بکھیر دیا گیا ہو، جہاں بھی ان کے ذرّات ہوتے ہیں وہی جگہ ان کے حق میں قبر ہوتی ہے۔

حافظ ابن القیم الحنبلی ﷫ (التوفی ۷۵۱ھ) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''ومما ینبغی ان یعلم ان عذاب القبر ھو عذاب البرزخ فکل من مات و ھو مستحق للعذاب نالہ نصیبہٗ منہ قُبر اولم یُقبر فلوا کلتہ السباع او احرق حتٰی صار رمادًا و نُسف فی الھواء او صُلب او غرق فی البحر وصل الٰی روحہ و بدنہ من العذاب مایصل الٰی المقبور'' (کتاب الروح ص ۷۱، طبع دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن)

''یہ جاننا مناسب ہے کہ عذاب قبر عذاب برزخ ہی کو کہتے ہیں۔ پس ہر ایسا شخص جو عذاب کا مستحق ہے جب مر جاتا ہے تو اس کو اس کے عذاب کا حصہ پہنچ ہی جاتا ہے قبر میں دفن کیا گیا ہو یا نہ سو اگر اس کو درندے کھا گئے ہوں یا جلا دیا گیا ہو۔ حتٰی کہ اس کی راکھ ہوا میں اُڑا دی گئی ہو یا سُولی پر لٹکا دیا گیا ہو یا دریا بُرد ہو چکا ہو، بہرکیف اس کی رُوح اور بدن دونوں کو وہ عذاب حاصل ہوگا جو قبر میں دفن شدہ کو حاصل ہوتا ہے۔''

امام جلال الدین سیوطی ﷫ (التوفی ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں کہ: ''قال القاضی ان من لم یدفن ممن بقی علٰی وجہ الارض یقع لھم السوال والعذاب و یحجب اللہ ابصار المکلّفین عن رؤیۃ ذٰلک کما حجبا عن رؤیۃ الملائکۃ والشیاطین قال بعضھم و تردالحیاۃ الٰی المصلوب و نحن لا نشعر بہ کما انا نحسب المعفی علیہ میتا و کذٰلک یضیق علیہ الجو کضمۃ القبر و لا یستنکر شیئًا من ذٰلک من خالط الایمان قلبہٗ و کذٰلک من خالط الایمان قلبہٗ و کذٰلک من تفرقت اجزئہٗ یخلق اللہ الحیاۃ فی بعضھا او کلھا و یوجہ السوال علیھا قالہ امام الحرمین قال بعضھم ولیس ھذا با بعد من الذر الذی اخرجہ اللہ من صلب آدم واشھدھم علٰی انفسھم الست بربکم قالوا بلٰی انتھٰی'' (شرح الصدور ص ۵۹، طبع مصر)

''رئیس المتکلمین امام اہل السنۃ (قاضی) محمد ابوبکر بن الطیب الباقلانی ﷫ (التوفی ۴۰۳ھ) فرماتے ہیں کہ جو شخص دفن نہ کیا گیا ہو اور وہ زمین کی سطح پر ہو تو اس سے بھی سوال ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ مکلف مخلوق کی نگاہوں کو اس کے دیکھنے سے روک دیتا ہے۔ جیسا کہ اُس نے فرشتوں اور شیاطین کے دیکھنے سے اس کی نگاہیں روک دی ہیں اور بعض فرماتے ہیں کہ جس کو سُولی پر لٹکایا جاتا ہے زندگی اس کی طرف بھی لوٹائی جاتی ہے۔ لیکن ہم اس کا شعور نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ ہم بے ہوشی والے کو مُردہ خیال کرتے ہیں (اور اس کی حیات کا شعور نہیں کر سکتے) اور قبر کی طرح اس پر جو اور فضا کو تنگ کیا جاتا ہے جس شخص کے دل میں ایمان داخل ہو چکا ہے وہ ان میں سے کسی چیز کو بھی اُوپر نہیں سمجھتا اور اسی طرح جس کے اجزاء متفرق ہو چکے ہوں۔ اللہ تعالیٰ بعض یا کل اجزاء میں حیات پیدا کر دیتا

ہے اور پھر اس پر سوال متوجہ ہوتا ہے۔ امام الحرمین (اُستاد امام غزالی رحمہ اللہ ابوالمعالی عبدالملک رحمہ اللہ المتوفی ۴۷۸ھ) نے ایسا ہی فرمایا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ کارروائی ان چیونٹیوں سے زیادہ مستبعد تو نہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا اور پھر ان کو ان کے نفوس پر یہ فرماتے ہوئے گواہ بنایا کیا میں تمہارا رب نہیں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں۔''

عذابِ قبر کے بارے میں مذاہب

قبر میں راحت و عذاب کے بارے میں جو مختلف اقوال، شروحِ حدیث کُتب کلام و فقہ اور تفاسیر و علم تصوف میں نظر سے گزرے ہیں۔ (جن میں بیشتر اقوال کا ذکر آگے متعدد عبارات میں آ رہا ہے۔ اِن شاء اللہ العزیز!) وہ یہ ہیں:

(۱) یہ کہ قبر میں راحت و عذاب اور سوال وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب میّت میں حیات ہی نہیں ہوتی تو پھر یہ اُمور جو حیات پر متفرع ہیں کیوں کر متحقق ہو سکتے ہیں؟ یہ مسلک ملاحدہ، خوارج، کچھ معتزلہ اور بعض مرجۂ وغیرہ کا ہے جن میں ضرار بن عمرو اور بشر المریسی وغیرہ کا نام آگے عبارات میں آئے گا اور علّامہ ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ معتزلہ کے ایک ''شیخ ضرار بن عمرو والغطفانی'' نے عذاب قبر کا انکار کیا ہے جن خوارج سے ہم ملے ہیں ان کا بھی یہی مذہب ہے، اہل سنت اور بشر بن المعتمر والجبائی اور بقیہ معتزلہ عذابِ قبر کے قائل ہیں، ہم بھی اسی کے قائل ہیں۔ اس لئے کہ اس کے متعلق جناب رسول اللہ ﷺ سے احادیث ثابت ہیں۔ (ملل ونحل ج ۲ ص ۱۵۷، ترجمہ اُردو) اور کُتبِ علم عقائد اور شروحِ حدیث میں ان کا ٹھوس رد موجود ہے یہ مسلک قرآن و حدیث کی نصوص قطعیہ اور صریحہ کے خلاف ہے اور جمہور اُمت کا اتفاق و اجماع اس پر مستزاد ہے بعض دلائل کا ذکر پہلے کر دیا گیا ہے اور بعض کا ذکر آئندہ اوراق میں ہوگا۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ اور ایک بیّن حقیقت کے اثبات کے لئے اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

(۲) یہ کہ عذابِ قبر اور راحت صرف بدن کو حاصل ہوتی ہے اور رُوح کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یہ نظریہ محمد بن جریر کرامی، عبداللہ بن کرام، ابوالحسین الصالحی (جو فرقۂ صالحیہ کا سربراہ تھا) اور ان کے دیگر ہم نوا لوگوں کا ہے لیکن رُوح کے اتصال اور تعلق کے بغیر محض بے جان جسم کے عذاب و راحت کا قول نری حماقت ہے۔ چنانچہ علّامہ شمس الدین احمد بن موسیٰ المشہور بہ الخیالی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۷۰ھ) اس گروہ کا رد کرتے ہوئے یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''جوّز بعضهم تعذيب غير الحي ولا شك انه سفسطة'' (الخیالی ص ۱۱۸، ونحوہ فی نبراس ص ۳۲۲)

''ان میں سے بعض نے بلا حیات بدن کے معذب ہونے کو جائز قرار دیا ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نری حماقت ہے۔''

(۳) یہ کہ قبر میں عذاب و راحت محض روح کو ہوتی ہے کیونکہ بیشتر ابدان ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں اور بعض کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے اور بعض کو درندے، پرندے اور مچھلیاں کھا جاتی ہیں اور ان کے اجسام ان حیوانات کا جزوِ بدن ہو جاتے ہیں تو پھر بدن کے معذب ہونے کا کیا مطلب؟ یہ مذہب علّامہ ابن حزم رحمہ اللہ اور ابن میسرہ رحمہ اللہ یا ابن ہبیرۃ وغیرہ کا ہے اور یہی غلط نظریہ مؤلف اقامۃ البرہان کا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: ''باقی انبیاء علیہم السلام شہداء کرام اور مؤمنین کو برزخ میں جو نعیم و راحت حاصل ہوتی ہے۔ وہ صرف ان کی رُوحوں کو ہے۔

ابدان عنصر یہ اس میں شریک نہیں۔'' (۱۹۸) العیاذ باللہ تعالیٰ! لیکن صحیح اور صریح حدیثیں اس مذہب کا پُرزور رد کرتی ہیں اور جمہور علمائے ملت اس کے خلاف ہیں اور یہ حضرات جمہور وزنی دلائل سے ان کی تردید کرتے ہیں، جیسا کہ عنقریب باحوالہ عبارتیں آرہی ہیں۔ ان شاء اللہ العزیز!

(۴) یہ کہ قبر اور برزخ میں راحت وکلفت روح اور بدن دونوں کو ہوتی ہے لیکن بدن اولی، عنصری اور مادّی کو نہیں بلکہ بدن مثالی کو جو ان کے نزدیک بدن عنصری کے اندر حلول کئے ہوئے ہوتا ہے جس کو بعض نفس ناطقہ اور بعض نَسَمہ بھی کہتے ہیں اور قبر میں رُوح کا تعلق اس بدن مثالی سے ہوتا ہے اور راحت وعذاب اس بدن کو ہوتا ہے اگرچہ بدن عنصری اور مادّی ریزہ ریزہ ہو کر فنا ہی کیوں نہ ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ دیکھنے والوں کو قبر میں کوئی راحت و تکلیف جو مُردہ پر وارد ہوتی ہے محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کی نگاہ تو بدن مادّی پر پڑتی ہے اور بدن مثالی محسوس نہیں تو اسی طرح اس کی راحت و تکلیف بھی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ مسلک بعض حضرات صوفیائے کرام رحمہم اللہ کا ہے اور اس مسلک کے اختیار اور قبول کرنے کا باعث بھی وہی مجبوری ہے جو دوسرے لوگوں کو پیش آئی کہ بسا اوقات بدن مادّی اور عنصری بالکل خاک ہو جاتا ہے یا اس کو جلا دیا جاتا ہے یا اس کو حیوانات ہڑپ کر جاتے ہیں تو پھر اس کو سزا کیونکر ہو سکتی ہے؟ اور چونکہ احادیث صحیحہ اور حضرت ائمہ دین رحمہم اللہ کی عبارات میں جسم اور بدن کا لفظ مذکور ہے اس لئے ان حضرات نے اس بدن سے بدن مثالی مراد لی ہے اور فرماتے ہیں کہ اربابِ کشف نے اپنے کشف کے ذریعہ اس بدن کا ادراک کیا ہے اور متعدد کُتب تفسیر اور تصوف میں بدن مثالی کا ذکر موجود ہے اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات لوگوں سے بدن مثالی ہی سے ہوتی ہے۔ (روح المعانی ج ۱۵ ص ۳۲۶)

اور زلیخا نے جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو ورغلانے کی کوشش کی تھی تو اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کی مثالی صورت ہی ان کے سامنے پیش ہوئی تھی۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۷۴ وصراط مستقیم ص ۱۴۸) اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں عالم مثال کے وجود پر ایک مستقل باب قائم کر کے اس حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔ بلاشک یہ سب باتیں اپنے مقام پر حق اور صحیح ہیں لیکن یہ بات بخوبی سمجھ لینی چاہئے کہ جو حضرات قبر اور برزخ میں حساب وسوال اور عذاب وراحت بدن مثالی کے لئے تسلیم کرتے ہیں وہ یہ نہیں فرماتے کہ بدن مادّی اور عنصری کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ بدن مثالی کے ساتھ بدن عنصری اور مادّی بھی اس کارروائی میں برابر شریک ہوتا ہے۔ چنانچہ صوفی کامل حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۶۲ھ) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے پہلے یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ قبر میں رُوح کا تعلق بدن مثالی سے قائم کیا جاتا ہے اور عذاب وراحت اس سے وابستہ ہوتا ہے۔

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ: ''البتہ بعض احادیث میں رد روح الی الارض وعود فی الجسد آیا ہے جس سے اسی بدن دنیوی[1] کے ساتھ تعلق اور بدن مثالی سے عدم تعلق متبادر ہوتا ہے۔ سو ممکن ہے کہ سوال کے وقت وہ روح

[1] حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بعد وفات کے بھی حیات برزخیہ ثابت ہے وہ حیات الشہداء کی حیات سے بھی بڑھ کر ہے اور اتنی قوی ہے کہ حیات ناسوتی کے قریب قریب ہے۔

(میلاد النبی ماخوذ از ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی ص ۶۰، ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۶۰ء)

بدن مثالی کے اندر ہو کر ارض کی طرف بھیجی جاتی ہو اور اس بدن عنصری کے ساتھ اس مجموعہ کو ایک گونہ تعلق کر کے سوال اسی روح اور بدن مثالی سے ہوتا ہو۔ مگر یہ تعلق عادتاً کسی حکمت سے اسی وقت شرط ہو جب کہ جسد عنصری باقی ہو اور اگر وہ متفرق و متلاشی ہو گیا ہو، سوال وغیرہ اسی مجموعہ روح و بدل مثالی سے ہو جاتا ہو۔ خواہ ارض میں یا غیر ارض میں۔ (التکشف ص ۵۵ طبع اشرفیہ دہلی وطبع لاہور ص ۱۰۸) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

غریق وسوختہ ومصلوب کو عذاب وثواب قبر کی صورت

ناممکن اور ممتنع نہیں ہے کہ مصلوب اور غریق کی روح پھیر دی جائے اور ہم معلوم نہ کر سکیں۔ کیونکہ وہ روح اور قسم کی ہے۔ بے ہوش اور سکتہ زدہ اور مبہوت زندہ ہوتے ہیں اور ان کی روحیں ان کے ساتھ ہی ہوتی ہیں اور بظاہر وہ مردہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی زندگی ہم کو معلوم ومحسوس نہیں ہو سکتی جس کے ٹکڑے ٹکڑے اور اجزاء الگ الگ ہو کر پراگندہ ہو جاویں۔ خدائے قادر مطلق پر نہ مشکل ہے اور نہ ممتنع ہے کہ ان اجزاء میں روح کو پیوست کر دے اور درد اور دکھ اور سکھ کا شعور ان اجزاء میں پیدا کر دے۔ (المصالح العقلیۃ حصہ سوم ص ۳۲۲ مکتبہ دینیہ دیوبند)

اور ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: ”اسی طرح بلا شبہ مرنے کے بعد اجزائے بدن سے بھی رُوح کا تعلق رہتا ہے، گو نیکوں کی روحیں علّیین میں ہوتی ہیں اور بدوں کی سجّین میں لیکن رُوحوں کا روحانی تعلق ابدان کے ذرّات کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ خواہ کسی کو قبر میں دفن کریں خواہ جلا دیں خواہ وہ ڈوب جائے ذرّے ذرّے کے ساتھ رُوح کا تعلق (بالاتر از فہم) رہتا ہے، اس کی نظیر ایک تار برقی کا ہے۔ تار برقی کا تعلق دیکھئے کہاں سے کہاں تک رہتا ہے، ایسا ہی رُوح کا تعلق باوجود علّیین وسجّین کے تعلق کے ”بدن کے ساتھ بھی ہے اور ضرور ہے“ مگر اس کو دنیا کی آنکھیں محسوس نہیں کر سکتیں، کیونکہ عالم غیب کے اسرار دنیادار کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور نہ دکھایا جانا ہی مناسب ہے۔ کیونکہ پھر ایمان بالغیب نہیں رہے گا۔“ (المصالح العقلیہ حصہ سوم ص ۳۲۷، ۳۲۸)

نیز حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ ارقام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تین مقام انسان کے لئے ٹھہرائے ہیں: (۱) دنیا، (۲) برزخ، (۳) دارِ قرار اور ہر ایک مقام کے لئے علیحدہ علیحدہ کچھ احکام ٹھہرائے ہیں جو اسی سے مخصوص ہیں اور انسان کو بدن اور نفس سے مرکب کیا اور دُنیا کے احکام بدنوں پر ٹھہرائے اور رُوحوں کو بدنوں کے تابع کیا۔ اس لئے شرعی احکام ان حرکات سے مرکب کئے ہیں جو زبان اور انداموں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگرچہ دل میں کچھ اور باتیں چھپی ہوئی ہوں اور خدا تعالیٰ نے برزخ کے احکام روحوں پر ٹھہرائے اور جسموں کو روح کے تابع کیا۔ پس جیسا کہ رُوح دنیا کے احکام میں بدنوں کے تابع ہو کر بدن کے دردناک ہونے سے دردناک ہوتی اور لذت پاتی ہے قبر یعنی عالم برزخ میں جسم دکھوں اور سکھوں میں رُوح کے تابع ہو جاتا ہے اور رُوح دُکھ اور سکھ کو سہتی ہے تو بدن بھی اس دُکھ سکھ کے تابع ہو جاتا ہے اور اس جگہ بدن ظاہر ہے اور رُوح پوشیدہ اور عالم قبر یعنی عالم برزخ میں رُوح غالب وظاہر ہو گی اور بدن پوشیدہ اور برزخ کے احکام ارواح پر جاری ہوں گے یعنی دُکھ اور سکھ رُوح کو جب پہنچے گا تو وہ صاحب رُوح کے جسم پر بھی سرایت کرے گا۔ جیسا کہ دنیا میں جسم کو کچھ راحت یا دُکھ پہنچے تو اس کا اثر رُوح پر بھی سرایت کر جاتا ہے جب یہ ہے تو ان واقعات کا ظاہری جسم پر ظاہر ہونا ضروری نہیں۔ وہ سب احکام رُوحانی ہیں جن کو رُوح مدرک کرتی ہے اور وہ سب واقعات بھی اس عالم کے ہیں۔ پس ان کا محسوس ہونا بھی ضروری نہیں بلکہ عادۃً ممکن بھی نہیں۔ الّا ماشاء اللہ تعالیٰ! خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت ولطف واحسان سے اس اَمر کا نمونہ دُنیا میں بھی

سونے والے کے حال سے ظاہر و باہر فرمایا ہے کیونکہ خواب میں جو دُکھ اور سکھ سونے والے کو پہنچتا ہے وہ اس کی رُوح پر جاری ہوتا ہے اور اس میں بدن اس کے تابع ہوتا ہے ایسا ہی عالم برزخ میں بھی جسم اور رُوح کے لئے دُکھ اور سکھ کا طریق جاری ہے بلکہ اس خواب سے بھی بڑھ کر ہوگا۔ کیونکہ اس عالم برزخ میں رُوح کا تجرد اور ظاہر ہونا بہت کامل ہوتا ہے اور رُوح کا تعلق بدن سے گو عام حالات میں ظاہر نہیں لیکن ایک غیر معلوم وجہ پر بھی یہ رہتا ہے، بدن سے اس کا بالکل انقطاع اور جدائی نہیں ہوتی۔ (المصالح العقلیہ حصہ سوم ص ۲۱۶، ۲۱۷)

اس عبارت میں جس جسم کا ذکر ہے وہ یقیناً جسم عنصری مادّی اور خاکی ہے۔ کیونکہ دنیا میں جس جسم کے ساتھ رُوح کا تعلق ہوتا ہے وہ یہی جسم عنصری ہے۔ یاد رہے کہ یہ پوری عبارت حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی (کتاب الروح ص ۷۷، ۷۸) کا بعینہٖ لفظی ترجمہ ہے۔ نیز ارشاد فرماتے ہیں: ''پس یہ اَمر کہ اَرواح کا قبور کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اس چشم سے لینا چاہئے جس کو کسی قدر کشفی آنکھ نے بھی بتلایا ہے کہ اس تودہ خاک سے ارواح کا ایک تعلق ہوتا ہے اور اسلام علیکم یا اہل القبور کہنے سے جواب ملتا ہے جو آدمی ان قویٰ سے کام لے جن سے کشف قبور ہوتا ہے تو وہ ان تعلقات کو دیکھ سکتا ہے۔'' (حصہ سوم ص ۳۲۶)

اور نیز فرماتے ہیں: ''غرض رُوح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ انسان میّت سے کلام کرسکتا ہے اَرواح کا تعلق آسمان سے بھی ہوتا ہے جہاں اس کے لئے ایک مقام ملتا ہے اور یہ ایک ایسی مسلّم بات ہے کہ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی اس کی گواہی موجود ہے۔ پس یہ مسئلہ عام طور پر مسلّمہ مسئلہ ہے، بجز اس گمراہ فرقے کے جو نفی بقائے رُوح کرتا ہے۔'' (ایضاً ص ۳۲۷)

مؤلف ندائے حق نے (ص ۷۰ سے ص ۷۶) تک قبر کے معنی کی بزعم خویش تحقیق کی ہے اور اس پر خاصا اصرار کیا ہے کہ قبر اس گڑھے کو نہیں کہتے جس میں مُردہ دفن کیا جاتا ہے بلکہ قبر سے برزخ مراد ہے اور اس کے لئے انہوں نے چند حوالے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے اور ایک نظم الفرائد کا اور ایک مولانا عبدالحق کا دیا ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(۱) ''قبر سے مراد حدیث میں عالم برزخ ہے نہ حفرہ (گڑھا)۔'' (مجالس الحکمۃ ص ۴۳)

(۲) ''غرض ایک جسم تو یہاں ہے اور ایک جسم عالم مثال میں ہے وہاں کی دوزخ بھی مثالی ہے۔ بس اس مثال ہی کا نام قبر ہے۔ کیوں وہ جو عالم مثال ہے وہیں اس کو عذاب قبر بھی ہوگا۔ اشکال تو تب ہوتا جب جسم قبر سے مراد یہ گڑھا ہوتا جس میں لاش دفن کی جاتی ہے۔ حالانکہ اصطلاحِ شریعت میں قبر گڑھے کو کہتے ہی نہیں بلکہ عالم مثال کو کہتے ہیں قبر اور وہاں پہنچنا کسی حال میں منتفی نہیں خواہ وہ مردہ دفن ہو یا نہ۔'' (اشرف الجواب ج ۲ ص ۲۴۶)

(۳) ''مرنے کے بعد مثالی قبر میں اُٹھایا جاتا ہے وہیں سوالات اور عذاب وثواب ہوتا ہے۔''

(اشرف الجواب ج ۳ ص ۴۳۷)

(۴) ''اس رُوح کو برزخ میں دوسرا جسد عطاء ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس جسد سے تعلق رکھتا ہے اور قبر کا سوال و جواب اس جسد مثالی سے ہوتا ہے جو وہاں عطاء ہوتا ہے اور جسد عنصری سے تعلق رہنے کا ایسا ہی درجہ ہے جیسے کوئی ایک رضائی اُتار کر رکھ دے اور دوسری اوڑھ لے۔ اب چلنا پھرنا تو دوسرے جسم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگرچہ ایک گونہ تعلق پہلے کے ساتھ بھی رہتا ہے تو رُوح گو وہاں جسد مثالی کے ساتھ ہوگی مگر ''تعلق اس جسد عنصری کے ساتھ بھی

ہوگا۔'' اب اس سے یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ اگر کسی میت کو شیر کھا جائے یا آگ میں جل جائے، تب بھی حساب ہوگا؟ سو یہ جواب سوال اسی جسد مثالی کے ساتھ ہوگا جو عالم برزخ میں عطاء ہوتا ہے۔'' (ملفوظات ج ۴ ص ۵۱۴، ۸۶۵)

مولانا محمد احسن صاحب سنبھلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''مراد قبر سے وہ گڑھا نہیں جس میں میت دفن کی جاتی ہے بلکہ اس سے مُراد موت کے بعد دوبارہ اُٹھ کھڑے ہونے تک سارا عالم برزخ ہے۔'' (نظم الفرائد حاشیہ شرح عقائد النسفیہ ص ۱۷۱، مترجماً)

(۶) مولانا عبدالحق حقانی مفسر و متکلم دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قبر کے وسیع اور تنگ ہونے سے ہماری یہ مُراد نہیں کہ یہ گڑھا کہ جسم کو جس میں چھپایا ہے وہ تنگ و وسیع ہوتا ہے بلکہ اس عالم میں روح پر تنگی اور کشادگی ہوتی ہے اور اصل قبر اس کی وہی ہے۔ ہاں! ''عرف عام میں اس جسم کے اعتبار اِس گڑھے کو بھی قبر کہتے ہیں۔'' (عقائد الاسلام ص ۱۶۰، ۱۶۱)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی عبارت میں تصریح ہے کہ رُوح کا قبر اور برزخ میں ''جسد عنصری کے ساتھ بھی تعلق ہوتا ہے۔'' اور یہ تعلق بارشاد ان کے اس تودۂ خاک سے ارواح کا ایک تعلق ہوتا ہے اور السلام علیکم یا اہل القبور کہنے سے جواب ملتا ہے۔ (کما مر) ظاہر اَمر ہے کہ سلام کہنے والے حِسّی اور عُرفی قبور کے پاس جایا کرتے ہیں عالم مثال میں نہیں جایا کرتے۔ باقی رضائی کی مثال صرف سمجھانے کی خاطر ہے کہ ایک جسم چھوڑا کہ اب رُوح اس میں تصرف و تدبیر نہیں کرتی کہ وہ تنمیہ اور غذا کا محتاج ہو۔ (کما سیاتی اِن شاء اللہ تعالیٰ) اور دوسرا اپنا لیا مگر پہلے سے تعلق ہے، ان تمام عبارات میں جیسا کہ خود حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی عبارت میں تصریح ہے، اس اشکال کا جواب دیا گیا ہے جو ملحدین کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جس کو شیر وغیرہ درندے کھا جائیں یا جلا دیا جائے یا پانی میں ڈوب جائے تو اس کا سوال و جواب کہاں ہوتا ہے؟ اور اس کی سزا اور راحت کہاں ہوتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جو یہ اِرشاد فرمایا ہے کہ اس گڑھے کو اصطلاح شریعت میں قبر نہیں کہتے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ حِسّی قبر اور گڑھا شرعاً قبر نہیں ہوتا بلکہ مراد یہ ہے کہ اسی کا نام قبر نہیں ہے، تاکہ وہ لوگ اس سے مستثنٰی قرار پائیں جن کو جلایا گیا یا جانور کھا گئے یا دریا وغیرہ میں غرق ہو گئے بلکہ قبر کا مفہوم اس سے وسیع ہے۔ ہاں! یہ مٹی کا گڑھا بھی قبر ہے۔ جیسا کہ خود حضرت تھانوی رحمہ اللہ ''ثم اماتہ فاقبرہ'' کے ترجمہ اور تفسیروں میں لکھتے ہیں۔ پھر (بعد عمر ختم ہونے کے) اس کو موت دی پھر اس کو قبر میں لے گیا۔ (کقولہ تعالیٰ فِیْهَا نُعِیْدُکُمْ، خواہ اوّل ہی خاک میں رکھ دیا جائے یا بعد چندے خاک میں مل جائے) (بیان القرآن ص ۷۷، ج ۱۲، طبع دہلی)

اس مقام میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ خاک کے اس گڑھے کو قبر کہتے ہیں جس میں مردہ رکھا جاتا ہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ شرعی طور پر میت کو دفن کرنے کے مسائل بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ''میت کی قبر کم از کم اس کے نصف قد کے برابر گہری کھودی جائے اور قد سے زیادہ نہ ہونی چاہئے۔ جب قبر تیار ہو چکے تو میت کو قبلے کی طرف سے قبر میں اُتار دیں۔ قبر میں اُتارنے والوں کا طاق یا جفت ہونا مسنون نہیں۔ قبر میں رکھتے وقت بسم اللہ و علیٰ ملۃ رسول اللہ کہنا مستحب ہے۔ میت کو قبر میں رکھ کر داہنے پہلو پر اس کو قبلہ رُو کر دینا مسنون ہے۔ قبر میں رکھنے کے بعد کفن کی وہ گرہ جو کفن کھل جانے کے خوف سے دی گئی تھی کھول دی جائے۔ مُردوں کے دفن کے وقت قبر پر پردہ نہ کرنا چاہئے۔''

''جب میت کو قبر میں رکھ چکیں تو جس قدر مٹی اس کی قبر سے نکلی ہو وہ سب اس پر ڈال دیں۔ اس سے زیادہ مٹی ڈالنا مکروہ ہے۔ قبر میں مٹی ڈالتے وقت مستحب ہے کہ سرہانے کی طرف سے ابتداء کی جائے اور ہر شخص اپنے دونوں ہاتھوں میں مٹی بھر کر قبر میں ڈال دے اور پہلی مرتبہ پڑھے مِنْهَا خَلَقْنٰکُمْ اور دوسری مرتبہ وَ فِیْهَا

نُعِیْدُ کُمْ اور تیسری مرتبہ وَ مِنْھَا نُخْرِ جُکُمْ تَارَۃً۔ بعد دفن کے تھوڑی دیر تک قبر پر ٹھہرنا اور میت کے لئے دُعائے مغفرت کرنا یا قرآن مجید پڑھ کر اس کا ثواب اس کو پہنچانا مستحب ہے۔ بعد مٹی ڈال چکنے کے قبر پر پانی چھڑک دینا مستحب ہے، قبر کا مربع (چورس) بنانا مکروہ ہے۔ قبر کا ایک بالشت سے بہت زیادہ بلند کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ قبر پر گچ کرنا یا اس پر مٹی لگانا مکروہ ہے۔ بعد دفن کر چکنے کے قبر کوئی عمارت مثل گنبد یا قبے وغیرہ کے بنانا بغرض زینت حرام ہے اور مضبوطی کی نیت سے مکروہ ہے۔" (بہشتی زیور حصہ ۱۱ ص ۹۷، ۹۸۔ محصلہ)

یہ بتانا تو مؤلف ندائے حق وغیرہ کا کام ہے کہ ان عبارات میں شرعی اور فقہی طور پر لفظ قبر گڑھے پر اطلاق ہوا ہے یا برزخ اور مثالی قبر پر؟

اس کے علاوہ بھی متعدد عبارتیں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی اس بارے میں موجود ہیں، ان تمام عبارات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قبر میں عذاب وراحت کے سلسلہ میں بدن مثالی سے تعلق ہوتے ہوئے بھی بدنِ مادّی اور عنصری کے ذرّے ذرّے سے رُوح کا تعلق ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ہماری عقل سے بالاتر ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے۔ اجزاء خواہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں یا جلا دیئے جائیں مگر رُوح کا تعلق ان سے ضرور ہے۔ اس حد تک بدن مادّی اور عنصری سے تعلق تسلیم کر چکنے کے بعد عذاب وراحت کا تعلق بدن مثالی سے بھی ہو تو اس سے کسی نص یا جمہور کے مسلک پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

(۵) یہ کہ بدن کے نصف اعلیٰ میں رُوح ڈال دی جاتی ہے اور بدن کا نچلا حصہ رُوح کے تعلق سے محروم ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے ایک قول اسی مضمون کا آگے آرہا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ! ان کے علاوہ یہ معلوم نہیں کہ اور کون حضرات اس کے قائل ہیں؟ چنانچہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۹۴ھ) فرماتے ہیں کہ: "اور بعض کہتے ہیں کہ رُوح کا حلول بدن کے نصف اعلیٰ میں ہوتا ہے۔ ظاہر احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میت کے تمام اجزاء میں رُوح کا اعادہ ہوتا ہے جس بدن سے رُوح نکالی گئی تھی۔ قبر میں پھر اسی بدن میں روح ڈالی جاتی ہے اور مُردہ قبر میں اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جس میت کے اجزاء متفرق ہو گئے ہیں، اس کے فقط دل یا دماغ میں یا اور کسی عضو میں حیات ڈالی جاتی ہے۔ اس تخصیص پر کوئی نقل نہیں دیکھی اور دلیل عقلی کافی نہیں۔ بلکہ یہ کہ اس طرح کہیں کہ جس میت کے اجزاء متفرق ہو گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ جتنے اجزاء کو چاہے اس کے جمع کر کے اس میں حیات پیدا فرما دیں اور پھر ان سے سوال فرما دیں اور مزید تحقیق کی نہ تو کوئی ضرورت ہے اور نہ کوئی امکان ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم اور جس شخص کو درندے یا پرندے کھا جائیں اس سے اس وقت سوال ہوتا ہے کہ جب وہ ان جانوروں کے پیٹ میں قرار پکڑ جائے اور یہ بات حقیقت ہے مجاز نہیں کہ جیسے بزازی رحمہ اللہ نے "فتاویٰ بزازیہ" میں اس کی تصریح کی ہے۔ بزازی رحمہ اللہ فقہاء حنفیہ میں سے ہے۔ فتاویٰ بزازیہ میں لکھتے ہیں: السوال فیما یستقر فیہ المیت حتی لو اکلہ السبع فالسوال فی بطنہ انتہی یعنی سوال اسی جگہ ہوتا ہے جہاں میت قرار پکڑے۔ حتیٰ کہ اگر کسی کو درندے نے کھا لیا ہو تو اس سے درندہ کے پیٹ میں سوال ہوگا۔"

(فتح الغفور ص ۳۰، لمولانا کاندھلوی رحمہ اللہ شرح منظومۃ القبور السیوطی رحمہ اللہ)

علامہ بزازی کی یہ عبارت امام سیوطی رحمہ اللہ نے بھی نقل کی ہے اور فی بطنہ سے آگے یہ عبارت بھی ہے:

"ان جعل فی التابوت ایاما لنقلہا الی مکان آخر لا یسأل مالم یدفن" (شرح الصدور ص ۶۱)

''اور اگر میت کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے تابوت میں رکھا گیا تو جب تک اس کو دفن نہیں کیا جائے گا اس سے سوال نہ ہوگا۔''

خط کشیدہ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تمام بدن میں روح نہیں لوٹائی جاتی بلکہ صرف بالائی حصہ میں اس کا اعادہ ہوتا ہے، لیکن حضرت مولانا نے ظاہر احادیث کے حوالہ سے اس مسلک کا جواب دے دیا ہے مزید رد کی ضرورت نہیں ہے۔

(۶) یہ کہ اگر جسم موجود و محفوظ ہو تو عذاب قبر یا آرام جسم اور رُوح دونوں کو ہوتا ہے اور بصورت دیگر علّیین یا سجّین میں جہاں اَرواح ہوتے ہیں عذاب یا آرام ان کو ہوتا ہے یا یوں سمجھئے کہ جب روح اور جسم دونوں کا تعلق ہوتا ہے تو ثواب وعقاب دونوں کو ہوتا ہے اور جب یہ تعلق باقی نہیں رہتا تو سزا اور راحت صرف رُوح کو ہوتی ہے۔ مشہور صوفی امام عبداللہ بن اسعد یمنی الشافعی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۵۵ھ جو صاحب خوارق وکرامات وتصانیف کثیرہ تھے) اپنی کتاب روضۃ الریاحین میں (جس کا ترجمہ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۶۳ھ) کے حکم سے حضرت مولانا جعفر علی صاحب نگینوی رحمہ اللہ نے کیا ہے جس کا نام ''نزہۃ البساتین'' رکھا ہے) لکھتے ہیں کہ:

''اور دلائل شرعیہ مثل احادیث صحیحہ اور آثار مشہورہ اس پر دال ہیں کہ قبر میں عذاب وثواب رُوح وجسم دونوں کو اور صرف رُوح کو ثواب وعذاب علّیین اور سجّین میں ہوتا ہے۔ بقدر اپنی سعادت وشقاوت کے اور یہ اَمر عقلاً بھی محال نہیں ہے اور نقلاً ثابت ہے جس کا بیان طویل ہے:''الی ان قال'' یہ جو کچھ بیان ہوا ہے کہ کبھی عذاب صرف رُوح کو ہوتا ہے اور کبھی جسم اور رُوح دونوں کو ہوتا ہے۔ یہ عالَم برزخ کا واقعہ ہے ورنہ بعد قیامت کے عذاب جسم کو رُوح کے ساتھ ہی ہوگا۔ اس پر جمیع اہل اسلام کا اجماع ہے اور کوئی مسلمان اِس کا منکر نہیں ہے۔'' (نزہۃ البساتین ص ۲۲۱)

قبر اور برزخ میں جسم اور رُوح دونوں کے معذب ہونے کا مسلک تو جمہور اہل السنت کا ہے لیکن صرف رُوح کے معذب ہونے کا قول علامہ ابن حزم رحمہ اللہ اور ابن میسرہ رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے اور جمہور اس کے قائل نہیں ہیں۔ جیسا کہ باحوالہ آگے اس کا بیان ہوگا۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ! اس کی الگ تردید کی حاجت نہیں ہے۔

(۷) یہ کہ قبر و برزخ میں جب منکر ونکیر کا سوال ہوتا ہے تو اس وقت روح کلیۃً لوٹادی جاتی ہے اور جب حساب وسوال ہو چکتا ہے تو اس وقت روح کو علّیین یا سجّین میں پہنچا دیا جاتا ہے اور بدن کے ساتھ عام لوگوں کی رُوحوں کا تعلق باقی نہیں رہتا۔ (ہاں! حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اس سے ان کے نزدیک بھی مستثنیٰ ہیں بحث اپنے مقام پر ذکر کی جائے گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ) یہ نظریہ ''فتح الباری عمدۃ القاری'' اور بعض دیگر کتابوں میں بعض حضرات کا منقول ہے لیکن رُوح کے جسم سے قبر میں الگ ہونے پر کوئی قطعی الدلالت اور صریح دلیل موجود نہیں ہے اور نہ جمہور اہل سنّت اس کے قائل ہیں۔ اس لئے اس نظریہ کی طرف بھی زیادہ توجہ مبذول کرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

(۸) یہ کہ قبر و برزخ میں ثواب وعذاب جسم اور رُوح دونوں کو ہوتا ہے اور قبر و برزخ میں رُوح کا جسم کی طرف اعادہ ہوتا ہے بعض کے نزدیک یہ اعادہ اس طریق سے ہوتا ہے جس طرح دنیا میں رُوح جسم کے اندر داخل تھی اور بدن میں تصرف اور تدبیر کرتی تھی اور اس طرح بدن کو حیات کاملہ اور مطلقہ حاصل ہو جاتی ہے اور جمہور واکثر اس کے قائل ہیں کہ رُوح بدن میں مکمل طور پر داخل نہیں ہوتی جس طرح کہ دنیا میں تھی بلکہ رُوح کا بدن سے اتصال اور تعلق قائم کر دیا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک رُوح کا جسم پر یا اس کے اجزاء پر پرتو پڑتا ہے

جس کو وہ اِشراق اور اِشراف سے تعبیر کرتے ہیں اور اس اتصال وتعلق سے ایک گونہ حیات (نوع من الحیواۃ) جو مُردہ کو حاصل ہوتی ہے اس سے وہ نکیرین کا جواب بھی دیتا ہے اور ثواب وعذاب بھی محسوس کرتا ہے۔ یہی مذہب جمہور اہل سنّت کا ہے اور یہی حق ومنصور ہے۔

علامہ شمس الدین القہستانی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۹۵۳ھ) لکھتے ہیں کہ: ''والمعذب فی القبر کحی بقدر مایتالم بہ وھو اقرب الی الحق'' (جامع الرموز ج ۲ ص ۲۹۲، نولکشور)

''جس کو قبر میں سزا دی جاتی ہے وہ اس انداز کا زندہ ہوتا ہے جس سے وہ اذیت محسوس کرے اور یہی بات حق کے قریب ہے۔''

اس مذہب کے دلائل وبراہین اپنے مقام پر آرہے ہیں۔ اِن شاء اللہ العزیز! اس مسلک پر سب سے بڑا اور وزنی اعتراض جو وارد ہوتا ہے (اور یہی باطل اور مرجوح فرقوں کو پریشان کئے ہوئے ہے) یہ ہے کہ جب میّت کو درندے اور پرندے کھا جاتے ہیں یا وہ جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے تو اس کا بدن کہاں رہا؟ جب بدن ہی نہ رہا تو رُوح کا اس سے تعلق اور اتصال اور پھر اس تعلق اور اتصال کی وجہ سے اس کی حیات کا کیا مطلب؟ لیکن یہ بات نرا مغالطہ اور شُبہ ہے۔ کیونکہ قبر اور برزخ کا معاملہ اس جہان سے ہے جو ہماری مادّی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے اور عادۃً اُس عالم کی چیزیں ہمیں اس جہان میں نظر بھی نہیں آسکتیں، ورنہ ایمان بالغیب نہ رہے گا۔ جب دلائل قوی ہوں تو ہر مؤمن کو ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ صحاح ستّہ کی مرکزی کتابوں میں حضرت ابوسعید ن الخُدری رضی اللہ عنہ (المتوفی ۷۴ھ) حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ (المتوفی ۳۵ھ) اور حضرت ابوہُریرہ رضی اللہ عنہ (المتوفی ۵۸ھ) وغیرہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف الفاظ کے ساتھ روایت مروی ہے۔

چنانچہ حضرت ابوہُریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کان رجل یُسرف علٰی نفسہٖ فلمّا حضرہ الموت قال لبنیہ اذا انامِتُّ فاحرقونی ثم اطحنونی ثم ذُرُّونی فی الریح فواللہ لئن قدر اللہ علیّ لیعذبنی عذابا ما عذّبہٗ احداً فلمّا مات فُعِل بہ ذٰلک فامر اللہ تعالیٰ الارض فقال اجمعی ما فیک منہ ففعلت فاذا ھو قائم قال ما حملک علٰی ما صنعت قال مخافتک یارب فغفر لہٗ''

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص نے گناہوں کی وجہ سے اپنے نفس پر بڑی زیادتی کی تھی جب اس کی موت کا وقت آیا تو اُس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو تم مجھے جلا کر میری راکھ کو خوب پیس کر ہوا میں اُڑا دینا بخدا اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر تنگی کی تو مجھے وہ ایسی سزا دے گا جو اور کسی کو اس نے نہیں دی جب اس کی وفات ہوئی تو اُس سے یہی کارروائی کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ اس کے تمام ذرّات کو جمع کر دے۔ سو اس نے ایسا ہی کیا جب وہ جمع کر دیا گیا تو وہ آدمی تھا جو کھڑا کر دیا گیا فرمایا کہ یہ کارروائی تو نے کیوں کی؟ اس نے کہا تیرے ڈر سے اے میرے پروردگار، سو اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔'' (بخاری ج ۱ ص ۴۹۵ واللفظ لہٗ ومسلم ج ۲ ص ۳۵۶)

اور ایک روایت میں آتا ہے کہ اس نے کہ میری راکھ کا آدھا حصہ خشکی میں اور آدھا دریا میں بکھیر دینا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ (بخاری ج ۲ ص ۱۱۱۷، مسلم ج ۲ ص ۳۵۶) حضرت ابوسعید الخُدری رضی اللہ عنہ کی روایت (مسند احمد ج ۳ ص ۷۷) میں بھی موجود ہے۔

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ پروردگار کو اس اَمر پر قدرت کاملہ ہے کہ وہ راکھ کے ذرّات کو بحر و بَر سے جمع کر کے اس سے بھلا چنگا آدمی اور انسان بنا دے اور پھر اس سے سوال کرے ہاں جو شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت کو تسلیم نہیں کرتا یا معاذ اللہ تعالیٰ اس کی قدرت کو محدود مانتا ہے تو اس کے لئے یہ بات تسلیم کرنی بڑی ہی مشکل ہے۔ اس کے نزدیک مُردہ کی راکھ کو بھلا کیوں کر جمع کیا جا سکتا ہے؟ آگے ہم حضرات جمہور کے مسلک کی تشریح کرتے ہیں کہ وہ قبر اور برزخ میں جسم کی طرف اعادۂ رُوح کے قائل ہیں اور اعادہ رُوح کے ساتھ جو حیات ہوتی ہے وہ برزخی بھی ہے باایں معنی کہ یہ کارروائی برزخ میں ہوئی اور جسمانی بھی ہے بایں تفسیر کہ قبر میں رُوح کا اتصال اور تعلق جس درجہ کا بھی ہے جسم مادّی عنصری سے ہے جو بدن دنیا میں حاصل تھا۔ اس لحاظ سے جن حضرات نے اس حیات کو برزخی کہا ہے وہ بھی ٹھیک ہے اور جنہوں نے جسمانی کہا وہ بھی ٹھیک ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نزاع صرف لفظی ہے، ہاں اَلَا نُسَلِّمْ کا کوئی علاج نہیں ہے، اس کی کچھ ضروری بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ! اب ہم جمہور اہل سنّت کے اس نظریہ کے اثبات پر صحیح حدیث اور اس کے شواہد اور اقوال حضرات ائمہ رحمہم اللہ اور عبارات علماء پیش کرتے ہیں کہ قبر میں میّت کے جسم کی طرف رُوح لوٹائی جاتی ہے۔ بایں طور کہ رُوح کا جسم سے اتصال و تعلق قائم کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کو ادراک و شعور ہو جاتا ہے اور اسی شعور سے راحت و کُلفت اس کو محسوس ہوتی ہے۔ باقی مذاہب کا رد آئندہ پیش ہونے والے دلائل میں خود بخود ہوتا رہے گا اور ان کا مستقل رد نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کی ضرورت ہے۔

اس سابق بیان سے معلوم ہوا کہ جو میّت جلا کر راکھ کر دی گئی ہو یا اس کو درندے کھا چکے ہوں تو اس کو جو سزا دی جاتی ہے وہ صرف رُوح اور بدن مثالی ہی سے متعلق نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ اس کے بدن عنصری کا تعلق بھی ہوتا ہے، اس کے بدن کا تعلق کیونکر ہوتا ہے؟ اس کا جواب اِن شاء اللہ تعالیٰ آئندہ اوراق میں ملے گا بشرطیکہ صحیح بات کو ماننے کے لئے کوئی آمادہ ہو۔ ورنہ اس کے حق میں دلائل کا انبار بھی بے سود ہے۔ سچ ہے کہ ؎

تہی دستانِ قسمت راچہ سُود از رہبر کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ مے آرد سکندر را

الحاصل لفظ قبر حقیقتاً اس گڑھے پر اطلاق کیا جاتا ہے جس میں میّت دفن ہوتی ہے اور مجازی طور پر اس برزخی مقام پر بھی بولا جاتا ہے جہاں میّت یا اس کے اجزاء اصلیہ ہوں عام اس سے کہ وہ درندوں اور پرندوں کا پیٹ ہو یا دریا کی گہرائی ہو۔ آتش کدہ ہو یا ہوا ہو لیکن یہ خیال رہے کہ اس موقع پر جمع بین الحقیقۃ والمجاز کا شُبہ نہ ہو جو اَربابِ اُصول کے نزدیک جائز نہیں ہے بلکہ یہ عموم مجاز کے طور پر ہے جس کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے ؎

خُذ ما صفا ودع ما کدر

قدرتِ خداوندی کی تو حد و بست نہیں اور نہ وہ مخلوق کے حیطۂ امکان میں ہے لیکن سنت اللہ یوں جاری ہے کہ حیاتِ جسم رُوح کے تعلق کے بغیر متحقق نہیں ہوتی اس لئے قبر کی حیات بھی رُوح کے تعلق سے ہی ہو سکتی ہے اور دلائلِ صریحہ سے ثابت ہے کہ موت کے وقت رُوح جسم سے نکالی جاتی ہے اور اس کے مستقر پر جو (جو علّیین اور سجّین ہے) پہنچا دی جاتی ہے مگر یہ بھی صحیح براہین سے ثابت ہے کہ قبر میں میّت کی طرف اس کی روح لوٹائی جاتی ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اعادۂ روح کے کچھ دلائل با حوالہ عرض کر دیں تاکہ ماننے والوں کے ایمان و ایقان میں اضافہ ہو اور نہ ماننے والوں کے لئے شاید کہ رُشد و ہدایت کا ذریعہ ثابت ہوں یا کم از کم اتمام حجت ہی ہو جائے۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ!

باب دوم

اعادۂ روح

اہل السنت والجماعت کا یہ مسلک ہے کہ میت جب قبر میں دفن کر دی جاتی ہے تو اس کی رُوح اس کے جسم کی طرف لوٹا دی جاتی ہے یہ اعادہ بالجملہ (پورا) ہو یا بایں طور کہ رُوح بکمالہ پورے جسم میں داخل ہو جائے جیسا کہ دُنیا میں داخل تھی یا فی الجملہ یعنی اس قدر رُوح کا جسم سے اتصال اور تعلق ہو کہ جس سے راحت و تکلیف کا احساس ہو سکے یہ اپنے مقام کی بحث ہے اور اس کے بارے میں کچھ ضروری بحث آگے بیان ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ! اس اعادہ کا ثبوت صحیح حدیث سے ہے جس کی سند یوں ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو معاویہ رحمہ اللہ[۱] نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اعمش رحمہ اللہ[۲] نے بیان کیا وہ منہال بن عمرو رحمہ اللہ[۳] سے اور وہ زاذان[۴] سے اور وہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک انصاری رحمہ اللہ کے جنازہ کے لئے نکلے اور قبرستان میں پہنچے۔ لیکن ابھی تک قبر تیار نہیں ہوئی تھی۔ آپ بھی وہاں جلوہ افروز ہوئے اور ہم بھی آپ کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ آپ نے (ایک طویل حدیث میں) مؤمن اور کافر کی وفات کا تذکرہ فرمایا۔ اس میں مؤمن کے بارے میں یہ ارشاد بھی مذکور ہے کہ:

---

۱ ان کا نام محمد بن حازم رحمہ اللہ تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: وہ احد مشائخ الحدیث الثقات المشہورین تھے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۳۵) علامہ ذہبی رحمہ اللہ ان کو احد الائمۃ الاعلام الثقات فرماتے ہیں۔ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۸۲) اور نیز لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ (میزان ج ۲ ص ۹۹) امام عجلی یعقوب بن سفیان رحمہ اللہ اور نسائی رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں، محدث ابن خراش رحمہ اللہ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور متقن تھے۔ ابن سعد رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۳۷) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تقریب ص ۳۱۸) علامہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ ج ۵ ص ۲۴۲ سے ص ۲۴۹ تک کئی صفحات میں علم حدیث میں ان کی ثقاہت اور اتقان پر متعدد حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ کے زرّیں اقوال نقل کئے ہیں اور امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابو معاویہ رحمہ اللہ، اعمش رحمہ اللہ سے روایت کرنے میں جریر رحمہ اللہ سے (جو ثقہ اور ثبت راوی ہیں) ثبت تھے اور نیز لکھا ہے کہ اعمش رحمہ اللہ سے روایت کرنے میں وہ اضطراب کا شکار کبھی نہیں ہوئے۔ (ج ۵ ص ۲۴۸)

۲ ان کا نام سلیمان بن مہران رحمہ اللہ تھا۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ وہ الحافظ الثقہ اور شیخ الاسلام تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۵) محدث ابن عمار رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ حضرات محدثین رحمہم اللہ کی پوری جماعت میں اعمش رحمہ اللہ سے زیادہ اثبت اور کوئی نہ تھا امام عجلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت فی الحدیث تھے۔ امام ابن معین رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور امام نسائی رحمہ اللہ ثقہ ثبت کہتے ہیں۔ ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات تابعین رحمہم اللہ میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۳، ۲۲۴ ملتقطاً)

۳ منہال بن عمرو رحمہ اللہ، امام ابن معین رحمہ اللہ، نسائی رحمہ اللہ اور عجلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، امام دارقطنی رحمہ اللہ ان کو صدوق کہتے ہیں اور ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ بعض حضرات نے ان پر یہ جرح کی ہے کہ ان کے گھر سے ساز کے ساتھ قرأت کی آواز آئی تھی۔ لہٰذا ان کی روایت نامعتبر ہے لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ساز کا افسانہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: "ولم یصح ذلک عنہ وجرحہ بھذا التعسف ظاہر وقد وثقہ ابن معین رحمہ اللہ والعجلی رحمہ اللہ وغیرھما" (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۲۰) (ترجمہ) "مگر یہ الزام ان پر ثابت نہیں ہو سکا اور اس کی وجہ سے ان پر جرح کرنا سراسر زیادتی ہے۔" (بقیہ حاشیہ آگے)

"حتّٰی یُنْتَھٰی بھا الٰی السماء السابعة فیقول اللہ اکتبوا کتاب عبدی فی علیین و اعیدوہ الٰی الارض فانی منھا خلقتھم و فیھا اعیدھم و منھا اخرجھم تارۃً اُخرٰی "فتعاد روحہ فی جسدہٖ فیأتیہ ملکان فیجلسانہٖ فیقولان لہ من ربک" (مسند احمد ج ۴ ص ۲۸۷، وتفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۳ وتحریرات حدیث ص ۲۰۸)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ) بلاشبہ وہ ثقہ تھے امام ابن معین رحمہ اللہ اور عجلی رحمہ اللہ وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے۔ امام شعبہ رحمہ اللہ نے ان سے روایت اس لئے ترک کردی تھی کہ ان کے گھر سے ساز کی آواز آئی تھی لیکن یہ حکایت ہی من گھڑت ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے صرف اتنا ہی فرمایا ہے کہ ابو بشر رحمہ اللہ ان سے زیادہ ثقہ ہے۔ غلابی رحمہ اللہ نے ابن معین رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ ان کی شان کو کچھ کم کرتے تھے جوزجانی رحمہ اللہ ان کو سیئ المذہب کہتے تھے اور ابن القطان رحمہ اللہ نے غمزہ۔ یعنی ان کو دبایا، یعنی مطعون کیا۔ یہ حوالے مؤلف ندائے حق نے ص ۲۱۴ میں نقل کئے ہیں لیکن ان سے ان پر جرح ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ساز کی نسبت ان کی طرف غلط ہے اور سیئ المذہب کوئی جرح نہیں۔ کیونکہ اسی ساز کی وجہ سے جو ثابت نہیں ان کا یہ مذہب سمجھا گیا ہے اور باقی تمام جرحیں مبہم ہیں۔ (تدریب الراوی ص ۲۰۴) میں ہے:"فان کان من جرّح مجملا قدر ثقۃ احد من ائمہ ھذا الشان لم یقبل الجرح فیہ من احد کائناً من کان الّا مفسرًا" (سوا گر جارح نے مجمل جرح کی ہو اور اس فن کے اماموں میں سے کسی ایک نے اس کی توثیق کی ہو تو جرح کسی کی بھی قبول نہ ہوگی خواہ جرح کرنے والا کوئی بھی ہو الّا یہ کہ جرح مفسر ہو۔"

؎ زاذان رحمہ اللہ کی ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے اور بعض نے ابوعمرو بیان کی ہے الکندی نسبت ہے۔ امام ابن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسے ثقہ تھے جن کی مثل کے بارے میں سوال ہی نہیں کیا جاسکتا۔ (ثقۃ لا یسئل عن مثلہ) ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب ان سے روایت کرنے والا ثقہ ہو تو ان کی احادیث لا بأس بھا ہیں۔ علامہ ابن سعد رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں: علامہ خطیب رحمہ اللہ اور عجلی رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ کثیر الخطاء تھے اور حاکم ابواحمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:"لیس بالمتین عندھم" اور حکم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وہ کثیر الکلام تھے۔ لیکن امام ابن حبان رحمہ اللہ کا ان کو کثیر الخطاء کہنا جمہور کے نزدیک مسلم نہیں۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ متشدد بھی تھے اور متساہل بھی تھے۔ کبھی کبھی بے سروپا باتیں کہہ جاتے تھے۔ چنانچہ ناقد فن رجال علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:"ابن حبان رحمہ اللہ لا یدری ما یخرج من رائہ" (الاجوبۃ الکاملۃ ص ۵۳، مولانا عبدالحئی رحمہ اللہ) "ابن حبان رحمہ اللہ نہیں جانتے کہ ان سے سر اور دماغ سے کیا نکلتا ہے۔" اگر جمہور کی جرح مفسّر نہ ہو تو لیس بالمتین سے عدالت ساقط نہیں ہوتی۔ (تدریب الراوی ص ۲۳۳) اور روایت میں عدالت ہی رکن اکبر ہے۔ (توجیہ النظر ص ۷۰۴ طبع مصر) اور کثیر الکلام ہونا فن حدیث کے لحاظ سے کوئی جرح نہیں ویسے کوئی صوفی قسم کا آدمی اس سے روایت لینے میں احتیاط کرتا ہے تو یہ اس کا اپنا ذاتی نظریہ ہے۔ (تدریب الراوی ص ۲۰۲) میں لکھا ہے کہ:"منہال بن عمرو رحمہ اللہ" کے گھر سے طنبور کی آواز سننے کی وجہ سے امام شعبہ رحمہ اللہ کا ان کی روایت کو نہ لینا اور حکم بن عتیبہ رحمہ اللہ کا کثیر الکلام ہونے کی وجہ سے زاذان رحمہ اللہ کی روایت کو نہ لینا مالیس بجرح (یعنی اُصول حدیث کے لحاظ سے کوئی جرح نہیں) (محصلہ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۰۳) حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:"و زاذان من الثقات روی عن اکابر الصحابۃ رضی اللہ عنہم کعمر رضی اللہ عنہ وغیرہ" (کتاب الروح ص ۵۹) "زاذان رحمہ اللہ ثقہ راویوں میں سے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اُس نے روایتیں کی ہیں۔" مؤلف ندائے حق نے ص ۲۰۹ میں بحوالہ تقریب مذکور "زاذان رحمہ اللہ" کے بارے میں لیّن الحدیث وفیہ شعیۃ کے الفاظ نقل کئے ہیں اور اسی طرح ص ۲۱۰ میں تفسیر بے نظیر کے حوالہ سے بھی یہ الفاظ نقل کئے ہیں لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ تقریب ص ۱۲۶ میں اس سند کے راوی زاذان ابوعمر کندی رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے صدوق یرسل وفیہ شیعۃ اور یہ روایت متصل ہے اور شیعہ ہونا بغیر داعیہ کے اُصول حدیث کے لحاظ سے کوئی جرح نہیں اور اعادۂ روح الی الجسد اہل السنت والجماعۃ کا مسلک ہے نہ کہ شیعہ کا وہ اگر اعادۂ روح مانتے ہیں تو نصف حصہ تک (بحوالہ ندائے حق ص ۲۱۱) اور تقریب ص ۱۲۶ میں زاذان ابویحیٰی القتات کے بارے میں لکھا ہے۔ لیّن الحدیث مگر وہ اس سند کا راوی نہیں ہے وہ اور ہے۔"

یہ روایت امام ابن المبارک رحمہ اللہ کی کتاب (الزہد والرقاق ص ۴۳۱ طبع علمی پریس مالیگاؤں) میں بھی ہے:

''مؤمن کی رُوح کو پھر ساتویں آسمان پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کا نام علیین میں درج کر دو اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو، کیونکہ میں نے ان کو زمین سے پیدا کیا ہے اور اسی میں ان کو لوٹاؤں گا اور اسی سے دوسری مرتبہ نکالوں گا۔ پس اس کی رُوح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اس کو بٹھلا کر ''من ربک'' سے سوال کرتے ہیں۔''

اور نیز مصنف ابن ابی شیبۃ (ج ۳ ص ۳۸۱ طبع حیدر آباد دکن) میں بھی ہے اور (تفسیر ابن جریر ج ۱۳ ص ۲۱۴) میں بھی یہ روایت موجود ہے۔

اور اسی حدیث میں کافر کے بارے میں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں کہ آسمانوں کے دروازے اس کے لئے نہیں کھلتے: ''فیقول اللہ اکتبوا کتابہ فی سجین فی الارض السفلٰی فتطرح روحہ طرحا ثم قرأ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ○ فتعاد روحہ فی جسدہ ویأتیہ ملکان فیجلسانہ ویقولان لہ من ربک''

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کی کارگزاری اور نام وغیرہ سجین میں لکھ دو جو ساتویں زمین میں ہے۔ پھر اس کی رُوح وہاں سے پھینکی جاتی ہے۔ پھر آپ نے یہ ارشاد خداوندی پڑھا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا ہے۔ پس گویا کہ وہ آسمان سے گرا اور اس کو پرندے اُچک کر لے گئے یا ہوا نے گہرے گڑھے میں ڈال دیا اور پھر اس کی رُوح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اس کو بٹھلا کر ''من ربک'' سے سوال کرتے ہیں۔

یہ روایت (ابوداؤد طیالسی ص ۱۰۲) میں بھی مذکور ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں: ''فیرد الی الارض وتعاد روحہ فی جسدہ۔ الحدیث'' کہ اس کو زمین کی طرف لوٹایا جاتا ہے اور اس کی رُوح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے اور یہ روایت (تفسیر ابن جریر ج ۱۳ ص ۲۱۸) میں بھی ہے اور یہ روایت صحاح ستہ کی مشہور کتاب (ابوداؤد ج ۳ ص ۲۹۸) میں بھی اختصاراً مروی ہے اور اس میں یہ جملہ بھی موجود ہے۔ وتعاد روحہ فی جسدہ اور (مشکوۃ ج ۱ ص ۱۴۲) میں بحوالہ مسند احمد مذکور ہے اور (مشکوۃ ج ۱ ص ۲۵) میں بھی اختصاراً یہ روایت موجود ہے اور اس میں بھی ''ویعاد روحہ فی جسدہ'' کے الفاظ موجود ہیں اور آخر میں لکھا ہے: رواہ احمد رحمہ اللہ وابو داؤد رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے یہ روایت (مستدرک ج ۱ ص ۳۷) میں نقل کی ہے اور اس میں مؤمن کے بارے یہ الفاظ موجود ہیں: فترد روحہ الی جسدہ اور کافر کے حق میں یہ الفاظ مروی ہیں: فیرمی بروحہ حتّٰی تقع فی جسدہ سو اس کی روح کو پھینک دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کے جسم میں جا پڑتی ہے۔

امام حاکم رحمہ اللہ نے محدثانہ انداز میں کئی طُرق اور متعدد اسانید کے ساتھ یہ روایت نقل کر کے آگے تحریر فرمایا ہے: ''ھذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین فقد احتجا بالمنھال بن عمرو رحمہ اللہ وزاذان رحمہ اللہ ابی عمر والکندی رحمہ اللہ وفی ھذا الحدیث فوائد کثیرۃ لاھل السنۃ وقمع للمبتدعۃ'' (مستدرک ج ۱ ص ۳۹)

''یہ حدیث بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ (کیونکہ ابو معاویہ اور اعمش تو بخاری اور مسلم کے مرکزی راوی ہیں اور) منہال بن عمرو رحمہ اللہ اور زاذان رحمہ اللہ ابو عمر والکندی رحمہ اللہ سے بھی بخاری اور مسلم نے احتجاج کیا ہے اور اس حدیث میں اہل سنت کے لئے کئی فوائد اور اہل بدعت کے عقائد کے قلع قمع کا خاصا ثبوت موجود ہے۔''

علامہ ذہبی رحمہ اللہ اس روایت کے بارے میں اپنا فیصلہ یوں ارقام فرماتے ہیں کہ: ''وھو علی شرطھما فقد احتجا بالمنھال رحمہ اللہ'' (تلخیص المستدرک ج ۱ ص ۳۸)

''یہ روایت بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ اور مسلم رحمہ اللہ دونوں نے منھال رحمہ اللہ سے احتجاج کیا ہے۔''

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے استاد حافظ نور الدین الہیثمی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۰۷ھ) اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: ''رواہ احمد ورجالہ رجال الصحیح'' (مجمع الزوائد ج ۳ ص ۴۹، ۵۰)

''اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور اس کے تمام راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔''

اور مولانا سید احمد حسن صاحب (المتوفی) حضرت امام بیہقی رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: ''وقال البیھقی ھذا حدیث صحیح الاسناد'' (تنقیح الرواۃ ج ۱ ص ۳۱۴)

''امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔''

علامہ منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ''وھذا حدیث صحیح الاسناد''

''یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔'' (الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۲۶۵)

اور خود اپنا فیصلہ یوں صادر فرمایا: ''والحدیث صحیح'' کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ (تنقیح الرواۃ ج ۱ ص ۳۱۷)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس حدیث کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ: ''وقد رواہ الامام احمد رحمہ اللہ وغیرہ وھو حدیث اجمع رواۃ الاثر علٰی شھرتہ و استفاضتہ وقال الحافظ ابو عبداللہ بن مندہ رحمہ اللہ ھذا الحدیث اسناد متصل مشھور رواہ جماعۃ عن البراء بن عازب رضی اللہ عنہ'' (شرح حدیث النزول ص ۷۴، طبع امرتسر)

اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور تمام محدثین کا اس کے مشہور اور مستفیض ہونے پر اجماع ہے اور حافظ ابو عبداللہ بن مندہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث متصل الاسناد اور مشہور ہے اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک جماعت نے اس کو روایت کیا ہے۔

اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وھو حدیث صحیح صححہ جماعۃ من الحفاظ''

(اجتماع جیوش الاسلامیۃ علیٰ غزو المعطلۃ والجھمیۃ ص ۳۵، طبع امرتسر)

''یہ حدیث صحیح ہے اور حفاظ حدیث کی ایک بڑی جماعت نے اس کو صحیح کہا ہے۔''

اور دوسرے مقام پر یوں لکھتے ہیں کہ: ''وقال ابو موسیٰ الاصبھانی ھذا حدیث حسن مشھور بالمنھال رحمہ اللہ عن زاذان رحمہ اللہ وصححہ ابو نعیم رحمہ اللہ، والحاکم رحمہ اللہ وغیرھما''

(تہذیب سنن ابی داؤد ج ۷ ص ۱۴۱، وکذا فی مختصر سنن ابی داؤد للمنذری ج ۷ ص ۱۴۴)

''امام ابو موسیٰ الاصبہانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور مشہور ہے جو منہال رحمہ اللہ نے زاذان رحمہ اللہ سے روایت کی ہے امام ابو نعیم رحمہ اللہ اور حاکم رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔''

اور ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''ھذا حدیث مشھور مستفیض صححہ جماعۃ من احفاظ ولا نعلم احدًا من ائمۃ الحدیث طعن فیہ بل رووہ فی کتبھم وتلقوہ بالقبول وجعلوہ اصلاً من أصول الدین فی

عذاب القبر و نعیمہ و مسئلۃ منکر و نکیر و قبض الارواح و صعودھا الی بین یدی اللہ ثم رجوعھا الی القبر ''
(کتاب الروح ص ۵۸، ۵۹)

''یہ حدیث ثابت مشہور اور مستفیض ہے اور حفاظ حدیث کی ایک بڑی جماعت نے اس کی تصحیح کی ہے اور ہمیں معلوم نہیں کہ ائمہ حدیث میں کسی نے اس میں طعن کیا ہو بلکہ انہوں نے اس کو اپنی کتابوں میں روایت کیا اور اس کو قبول کیا ہے اور قبر کے عذاب و راحت اور منکر و نکیر کے سوال اور اَرواح کے قبض کرنے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف لے جانے اور پھر ان کو قبر کی طرف لوٹانے کے سلسلہ میں اس روایت کو اُصولِ دین سے قرار دیا ہے۔''

اور ایک اور مقام میں محدثانہ رنگ میں اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''فالحدیث صحیح لا شک فیہ'' پس یہ حدیث صحیح ہے اس میں کوئی شک نہیں۔　(کتاب الروح ص ۵۶)

اور علامہ منذری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''وذکر ابو موسی الاصبھانی انہ حدیث حسن شھر بالمنھال ''
(مختصر ابی داود ج ۷ ص ۱۴۴، للمنذری رحمۃ اللہ علیہ)

''محدث ابوموسیٰ الاصبہانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے اور ''منھال رحمۃ اللہ علیہ'' کے طریق سے مشہور ہے۔''

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''رواہ ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ و احمد رحمۃ اللہ علیہ باسناد رواتہ محتج بھم فی الصحیح''　(الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۳۶۵)

''امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جس کے تمام راویوں سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے صحیح میں احتجاج کیا ہے۔''

اور علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''روی الامام احمد رحمۃ اللہ علیہ و ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ باسناد صحیح عن البراء رضی اللہ عنہ''　(مختصر تذکرہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ ص ۳۴)

''امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ یہ روایت حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔''

اور حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو ''الاحادیث الصحاح'' میں شمار کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفسیر مظہری ج ۱۰ ص ۲۲۴) اور علامہ علی بن عبد الکافی السبکی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۷۵۶ھ) اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں کہ (رجال اسنادہ کلھم ثقات (شفاء السقام ص ۱۵۰) اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں۔ حضرت مولانا عبد العزیز صاحب فرہاروی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''ان الاحادیث الصحیحۃ ناطقۃ بان الروح تعاد فی الجسد عند السوال'' (نبراس ص ۳۲۲) صحیح حدیثیں اس اَمر پر ناطق ہیں کہ سوال کے وقت روح جسم میں لوٹائی جاتی ہے۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس حدیث کو کماثبت فی الحدیث کہہ کر صحیح کہتے ہیں۔
(فتح الباری ج ۵ ص ۵۰۴)

اور علامہ داؤد بن سلیمان البغدادی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے مسند میں امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے سنن میں امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں امام ابن ابی شیبۃ رحمۃ اللہ علیہ نے مصنف میں۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب عذاب القبر میں امام طیالسی رحمۃ اللہ علیہ اور امام عبد بن حمید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اپنے مسند میں ھناد بن سری رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب الزہد''

میں اور اسی طرح امام ابن جریر رحمہ اللہ اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ وغیرہ نے صحیح اسانید اور طرق کے ساتھ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث روایت کی ہے) (المنحۃ الوھبیۃ فی رد الوھابیۃ ص ۱۱ طبع استنبول)

الحاصل! اس حدیث کا ایک ایک راوی ثقہ اور ثبت ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ اور مسلم رحمہ اللہ جیسے امام فن اور پختہ کار حضرات محدثین کرام رحمہ اللہ نے اس سند کے تمام راویوں سے احتجاج کیا ہے اور سو فیصدی حضرات محدثین کرام رحمہ اللہ اس حدیث کی تصحیح کرتے ہیں اور عذاب قبر و نعیم قبر وغیرہ اہم مسائل کے بارے میں اس حدیث کو اہل سنت والجماعت کا مستدل قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''رواہ ابو عوانۃ الاسفرائنی فی صحیحہ و ذھب الی القول بموجب ھذا الحدیث جمیع اھل السنۃ و الحدیث من سائر الطوائف'' (کتاب الروح ص ۵۱)

''امام ابو عوانہ الاسفرائنی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور اہل السنت اور اہل الحدیث کے تمام فرقے اس حدیث سے جو احکام ثابت ہیں ان کے قائل ہیں۔''

اور علی الخصوص قبر میں عود الروح الی البدن کے بارے میں اس حدیث کو نص قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اعادہ روح کے متعلق واشگاف الفاظ میں لکھتے ہیں کہ: ''النص الصحیح الصریح و ھو قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فتعاد الروح فی جسدہ'' (کتاب الروح ص ۵۲)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ (قبر میں رُوح کو جسم میں لوٹایا جاتا ہے نص صحیح اور صریح ہے)

اور علامہ علی بن عبد الکافی السبکی رحمہ اللہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: ''و فیہ التصریح بعود الروح الی الجسد'' اس حدیث میں عود الروح الی الجسد کی صراحت موجود ہے۔ (شفاء السقام ص ۱۴۸)

غرض یہ کہ روایت اُصول حدیث کے رُو سے بالکل صحیح ہے۔ اس کی صحت میں ذرّہ بھر کلام نہیں ہو سکتا۔ اہل السنت والجماعت کا یہ قوی مستدل ہے اور اہل بدعت کے باطل عقائد کے رَد کے لئے یہ برھان قاطع اور ان کے حق میں یہ خالص نشتر ہے اور اس حدیث سے جو اُمور ثابت ہیں ان پر علماء کا اجماع ہے۔ (المنحۃ الوھبیۃ ص ۱۱)

اس حدیث پر کلام اور اس کا جواب

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس صحیح حدیث کے سلسلہ میں جو اعتراضات کئے گئے ہیں، ان کو بھی نقل کر کے ان کے صحیح جوابات عرض کر دیئے جائیں تا کہ معاملہ بالکل بے غبار ہو جائے۔ لیکن اس سے قبل کہ اعتراضات اور ان کے جوابات نقل کئے جائیں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے لے کر تقریباً چوتھی صدی تک اہل السنت والجماعت کے ہر مسلک اور ہر مکتبہ وفکر کے حضرات فقہاء، متکلمین رحمہ اللہ اور علماء حق اس عقیدے پر تھے کہ وفات کے بعد قبر میں میّت کو جو راحت و کُلفت پہنچتی ہے۔ اس کا تعلق بدن مع الروح کے ساتھ ہوتا ہے اور میّت کو ایک گونہ حیات (نوع من الحیوۃ) حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کو فہم و شعور اور ادراکِ عذاب و نعمت ہوتا ہے۔ معتزلہ کرامیہ اور روافض وغیرہ (جس کا ذکر اپنے مقام پر ہوگا۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ) اگرچہ اس حق اور صحیح مسلک کے ساتھ اختلاف رکھتے تھے لیکن اہل السنت میں شمار کئے جانے والے فرقوں میں سے کوئی شخص اس کا

منکر نہ تھا۔ ہماری دانست میں سب سے پہلے جس شخص نے قبر میں اعادۂ رُوح کا انکار کیا ہے وہ امام ابو محمد علی بن احمد بن حزم الظاہری رحمہ اللہ (المتوفی ۴۵۶ھ) ہیں۔ جنہوں نے محلی الفصل والنحل اور دیگر متعدد معلومات افزاء کتابیں لکھ کر بہت بڑی دینی خدمت کی ہے جو رہتی دنیا تک یاد رہے گی، ان کا علم بڑا طویل اور عریض تو تھا۔ مگر صد افسوس ہے کہ ظاہریت کی وجہ سے عمیق نہ تھا اور بعض اُصولی اور فروعی مسائل میں اُنہوں نے ٹھوکریں کھائی ہیں اور علماء ربانی نے ان کا بعض مسائل میں خوب تعاقب کیا ہے اور بعض باتیں تو ان کے بے باک قلم سے ایسی بھی صادر ہوئی ہیں، جن پر انتہائی حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً صحاح ستہ کی مرکزی کتاب الجامع الترمذی کے مصنف حضرت امام ترمذی رحمہ اللہ کے بارے میں ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ وہ مجہول ہیں۔" (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۱۷ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۸)

اگر امام ترمذی رحمہ اللہ مجہول ہیں تو رواتِ حدیث میں معروف کون ہوگا؟ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ابن حزم رحمہ اللہ قوت حافظہ کے گھمنڈ پر جرح و تعدیل اور اسماء رجال کی تعیین میں فاحش غلطیاں کر جاتے اور بُری طرح وہم کا شکار ہو جاتے تھے۔ (لسان المیزان ج ۴ ص ۱۹۸)

علامہ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن السخاوی رحمہ اللہ (المتوفی ۹۰۲ھ) لکھتے ہیں کہ جن حضرات نے رواتِ حدیث پر بے تحاشا کلام اور جرح کی ہے، ان میں ایک ابن حزم رحمہ اللہ بھی ہیں۔ (الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ ص ۶۱، طبع مصر) اور بڑے بڑے ائمہ دین ان کی زبان سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ چنانچہ امام ابو العباس بن العریف الصالح الزاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "حجاج بن یوسف" کی تلوار اور "ابن حزم رحمہ اللہ" کی زبان (شقیقتین) دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۸، ولسان المیزان ج ۴ ص ۲۰۱)

• علامہ ذہبی رحمہ اللہ ائمہ دین کی شان میں ان کی گستاخی کی یوں شکایت کرتے ہیں کہ: "و قد امتحن هذا الرجل و شدد علیه و شرد عن وطنه و جرت علیه أمور لطول لسانه و استحقافه بالكبار و وقوعه فی ائمة الاجتهاد باقبح عبارة و افظ محاورة و امتع رد" (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۸)

"ابن حزم رحمہ اللہ بڑی آزمائش میں مبتلا ہوئے اور ان پر سختی بھی کی گئی اور جلا وطن بھی کئے گئے اور کئی مصائب کا شکار بھی ہوئے کیونکہ وہ بڑے بڑے ائمہ رحمہ اللہ کے حق میں زبان دراز کرتے اور ان کی توہین کا ارتکاب کرتے تھے اور حضرات ائمہ مجتہدین رحمہ اللہ کے بارے میں قبیح ترین عبارتیں اور گھناؤنے محاورات استعمال کرتے اور نا مناسب لہجہ میں تردید کرتے تھے۔"

اور دوسرے مقام پر یوں رقم طراز ہیں کہ: "و انا امیل الی محبة ابی محمد لمحبته بالحدیث الصحیح و معرفته به و ان کنت لا او افقه فی کثیر مما یقوله فی الرجال و العلل و المسائل البشعة فی الأصول و الفروع و اقطع بخطائه فی غیر مسألة و لکن لا اکفره و لا اضلله و ارجو له العفو و المسامحة و اخضع لفرط ذکائه و سعة علمه" (سیر النبلاء بحوالہ مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۹)

"میں ابن حزم رحمہ اللہ کے ساتھ محبت کرتا ہوں۔ کیونکہ وہ صحیح حدیث سے محبت کرتے اور اس کی معرفت رکھتے ہیں لیکن میں ان کے بہت سے نظریات میں مثلاً رواتِ وعللِ حدیث اور اُصول و فروع میں ناپسندیدہ طور پر مسائل میں کلام سے موافقت نہیں کرتا اور متعدد مسائل میں ان کو یقیناً خطا کار سمجھتا ہوں۔ لیکن میں ان کی تکفیر و تذلیل نہیں کرتا اور ان کے لئے عفو و درگزر کا اُمیدوار ہوں اور ان کی فرط ذکاء اور وسعت علمی کا معترف ہوں۔"

اور علامہ جزائری رحمہ اللہ نے بھی ان کی یہ شکایت کی ہے کہ وہ بڑے بڑے ائمہ کرام رحمہم اللہ کو خطا کار بتاتے اور ان پر زبان درازی کرتے تھے۔ (توجیہ النظر ص ۳۳۳)

ہمارا مقصد ان حوالوں سے حاشا وکلا حافظ ابن حزم رحمہ اللہ کی تحقیر وتوہین نہیں بلکہ بتانا صرف یہ ہے کہ بعض مقامات میں حدیث کے راویوں سے متعلق اور بعض احادیث کو معلول ٹھہرانے میں ان سے صریح کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں اور اُصول وفروع کے کئی مسائل میں ان سے لغزشیں ہوئی ہیں۔ لہٰذا ایسے مقامات میں بجائے علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کی پیروی کے صحیح حدیث کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اور جمہور سلف وخلف رحمہم اللہ کا ساتھ دینا ہی باعث نجات ہے اور کامیابی صرف اسی پہلو میں بند ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد ہم سہولت کے لئے اعتراضات کے نمبر قائم کر کے ان کو نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کے مختصر باحوالہ جوابات عرض کرتے ہیں۔ غور وفکر کرنا قارئین کرام کا کام ہے۔

اعتراض اَوّل

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کی مذکور حدیث پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ولم یرواحد ان فی عذاب القبر تردالروح الی الجسد الا المنهال بن عمرو ولیس بالقوی''

''کسی راوی نے عذاب قبر کے سلسلہ میں روح کے جسم کی طرف لوٹانے کا ذکر نہیں کیا مگر صرف منہال بن عمرو رحمہ اللہ نے اور وہ قوی نہیں۔'' (محلی ج۱ ص ۲۲ طبع مصر، الفصل فی الملل والاہواء والنحل ج ۴ ص ۶۸ طبع بیروت)

جواب: اس اعتراض کی اُصول حدیث کی رُو سے کوئی وقعت نہیں۔ کیونکہ ہم پہلے باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ منہال بن عمرو رحمہ اللہ ثقہ راوی ہیں اور ان کی روایت امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ کی شرط پر صحیح ہے اور باحوالہ حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ کے جم غفیر سے اس روایت کی تصحیح نقل کی جا چکی ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''واما المنهال فمن رجال البخاری وحدیث زاذان مما اتفق السلف والخلف علی روایته وتلقیها بالقبول'' (شرح حدیث النزول ص ۵۱)

''منہال بن عمرو رحمہ اللہ صحیح بخاری کے راوی ہیں اور زاذان رحمہ اللہ کی اس حدیث کے روایت کرنے اور اس کے قبول کرنے پر تمام حضرات سلف وخلف رحمہم اللہ کا اتفاق ہے۔''

اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کو جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: ''واما قوله ان الحدیث لا یصح لتفرد المنهال بن عمرو وحده ولیس بالقوی فهذا من مجازفته رحمه اللہ فالحدیث صحیح لا شک فیه'' (کتاب الروح ص ۵۶)

''ابن حزم رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ یہ حدیث صحیح نہیں۔ کیونکہ اس کے روایت کرنے میں منہال بن عمرو رحمہ اللہ متفرد ہیں تو یہ محض اٹکل پچو بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ابن حزم رحمہ اللہ پر رحم کرے یہ حدیث صحیح ہے اس میں کوئی شک نہیں۔''

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے منہال بن عمرو رحمہ اللہ کے تفرد کا جو دعویٰ کیا ہے، حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ: ''فالمنهال احد الثقات العدول قال ابن معین المنهال ثقة وقال العجلی ثقة

واعظم ما قیل فیہ انہ سمع من بیتہ صوت غناء وھذا لا یوجب القدح فی روایتہ واطراح حدیثہ وتضعیف ابن حزم لہ لا شیء فانہ لم یذکر موجبا لتضعیفہ غیر تفردہ بقولہ فتعاد الروح فی جسدہ وقد بینا انہ لم یتفرد بھا بل قد رواھا غیرہ قد روی ماھو ابلغ منھا او نظیرھا کقولہ فترد الیہ روحہ وقولہ فتصیر الی قبرہ فیستوی جالسا وقولہ فیجلسانہ وقولہ فیجلس فی قبرہ وکلھا احادیث صحاح لا مغمز فیھا'' (کتاب الروح ص ۵۹)

''منہال رحمہ اللہ ثقہ اور عادل راویوں میں تھے، ابن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ منہال رحمہ اللہ ثقہ ہے عجلی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کوفی اور ثقہ تھے بڑا الزام جو ان کی طرف نسبت کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے گھر سے گانے کی آواز آئی تھی لیکن یہ ان کی حدیث کے رد اور ترک کا موجب نہیں اور ابن حزم رحمہ اللہ کی اس تضعیف کا کوئی اعتبار نہیں۔ کیونکہ انہوں نے تفرد کے بغیر تضعیف کی کوئی اور وجہ بیان نہیں کی۔ مگر ''فتعاد الروح فی جسدہ'' کے قول میں منہال رحمہ اللہ متفرد بھی نہیں بلکہ ان کے علاوہ دیگر راویوں نے ان الفاظ کی مانند بلکہ اس سے زیادہ واضح الفاظ نقل کئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ میت کی رُوح اس کی طرف لوٹائی جاتی ہے اور یہ کہ رُوح قبر میں پہنچتی ہے سو میت اس وقت سیدھی بیٹھ جاتی ہے اور فرشتے اس کو بٹھلاتے ہیں اور اس کو قبر میں بٹھلایا جاتا ہے اور یہ سب صحیح حدیثیں ہیں، ان میں کسی قسم کا کوئی طعن نہیں ہے۔''

خود حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اس سے قبل اُن تمام روایات کو باحوالہ نقل کر کے اُن کی نشان دہی کی ہے جن میں یہ الفاظ آتے ہیں اور ان میں منہال بن عمرو رحمہ اللہ نہیں بلکہ دیگر راوی ہیں اور علامہ سبکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وقد تکلم فیہ ابن حزم من جھۃ المنھال بن عمرو وھذا الکلام لیس بشیء لان المنھال بن عمرو روی لہ البخاری ووثقہ غیر واحد منھم ابن معین'' (شفاء السقام ص ۱۵۰)

''اس حدیث میں ابن حزم رحمہ اللہ نے منہال بن عمرو رحمہ اللہ کی وجہ سے کلام کیا ہے لیکن اس کلام کا کوئی اعتبار نہیں۔ کیونکہ منہال رحمہ اللہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے احتجاج کیا ہے اور بے شمار حضرات محدثین کرام رحمہ اللہ نے ان کی توثیق کی ہے جن میں امام ابن معین رحمہ اللہ بھی ہیں۔''

مولانا سید احمد حسن صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ولما رأی ابن حزم حدیث المنھال رادا علی معتقدہ فی انکار عذاب الاجساد فی قبورھا طعن فیہ وطعنہ مردود والحدیث صحیح'' (تنقیح الرواۃ ج ۱ ص ۳۱۴)

''جب ابن حزم رحمہ اللہ نے دیکھا کہ منہال بن عمرو رحمہ اللہ کی حدیث ان کے اس عقیدہ کے خلاف ہے کہ قبور میں اجسام کو عذاب ہو تو اس حدیث پر جرح شروع کر دی۔ مگر ان کی جرح مردود ہے اور یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے پہلے یہ عقیدہ اختراع کیا کہ قبور میں مُردوں کے اجسام کو عذاب نہیں ہوتا۔ کیونکہ اعادہ رُوح کے بغیر نرے جماد کو سزا دینے کا کیا معنٰی؟ اور ان کے زعم فاسد میں اعادۂ رُوح کی کوئی روایت نہیں۔ اگر ہے تو منہال بن عمرو رحمہ اللہ کی روایت ہے اور اس روایت کو دیکھ کر وہ خاصے پریشان ہوئے ہیں جو ان کے باطل عقیدہ پر کاری ضرب لگاتی ہے اور اس مخترع عقیدہ کو بیخ و بن سے اُکھاڑ کر رکھ دیتی ہے لیکن ان کی ذہانت و طبع ان کے کام آ گئی اور یہ کہہ کر گلو خلاصی چاہی کہ منہال بن عمرو رحمہ اللہ ضعیف ہے اور متفرد بھی پھر بھلا اس کی روایت کا کیا اعتبار؟ جن کی زبان سے بڑے بڑے حضرات ائمہ دین، مجتہدین اور امام ترمذی رحمہ اللہ نہیں محفوظ رہ سکے۔ ان سے منہال بن عمرو رحمہ اللہ کیونکر بچ سکتے تھے؟ لیکن آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ حضرات محدثین کرام رحمہ اللہ میں

چوٹی کے بزرگ ہاتھ دھو کر ابن حزم رحمہ اللہ کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور منہال رحمہ اللہ کی تضعیف اور ان کے تفرد کا معقول جواب دے کر حدیث مذکور کی تصحیح کرتے ہیں اور زوردار الفاظ میں اہل حق کے منصور مسلک کی تائید کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر کسی مسئلہ کی تحقیق وتمحیص اور کیونکر ہو سکتی ہے۔ مگر نہ ماننے والے کو اس کے انکار اور ضد سے کون روک سکتا ہے جو ضد اور لا نسلّم کا ہی خوگر ہو چکا ہے کہ ؎

کون روکے گا اُسے پینے سے میخانے میں آج ہاتھ جس کے گردن وطلِ گراں تک آ گئے !

اعتراض دوم

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کا یہ اعتراض بھی ہے کہ: ’’ترکہ شعبۃ وغیرہ وقال فیہ المغیرۃ بن مقسم الضبی وھو احد الائمۃ ملجازت للمنھال بن عمر وقط شھادۃ فی الاسلام‘‘ (بحوالہ کتاب الروح ص ۵۲)

’’منھال بن عمرو رحمہ اللہ کو امام شعبہ رحمہ اللہ نے ترک کر دیا تھا اور مغیرہ بن مقسم الضبی رحمہ اللہ جیسے امام فرماتے ہیں کہ منہال بن عمرو رحمہ اللہ کی اسلام میں سرے سے شہادت ہی جائز نہیں ہے۔‘‘ (تو روایت کیونکر معتبر ہوگی؟)

جواب: امام شعبہ رحمہ اللہ کی منہال بن عمرو رحمہ اللہ کی روایت کو ترک کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ ثقہ نہ تھے بلکہ اس کی وجہ جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں، یہ تھی کہ امام شعبہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے منھال بن عمرو رحمہ اللہ کے گھر سے طنبور کی آواز سنی۔ اس لئے میں نے ان کی روایت ترک کر دی ہے، محدث وہب بن جریر رحمہ اللہ نے یہ قصہ سُن کر امام شعبہ رحمہ اللہ سے دریافت کیا۔ فھلا سالتہ عسٰی کان لا یعلم آپ نے ان سے دریافت کیوں نہ کر لیا۔ ممکن ہے یہ کارروائی ان کی لاعلمی میں ہوئی ہو۔ امام وہب بن جریر رحمہ اللہ نے بجا فرمایا ہے کسی کے گھر سے طنبور اور ساز کی آواز کا بلند ہونا، اس کی دلیل نہیں کہ صاحب خانہ اس کا مرتکب ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت گھر میں ہی موجود نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ آواز پڑوسی کے گھر سے بلند ہوئی ہو اور صاحب خانہ اس پر راضی نہ ہو، اس سے ان کی ثقاہت وعدالت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ سارا افسانہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ امام ابو الحسن بن القطان رحمہ اللہ نے یہ حکایت نقل کر کے لکھا ہے کہ: ’’ولم یصح ذٰلک عنہ وجرحہ بھذا اتعسف ظاھر وقد وثقہ ابن معین والعجلی وغیرھما‘‘ (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۲۰)

’’یہ کارروائی منھال بن عمرو رحمہ اللہ سے ثابت نہیں ہو سکی اور اس وجہ سے ان پر جرح کرنا کھلی زیادتی ہے۔ حالانکہ امام ابن معین رحمہ اللہ اور عجلی رحمہ اللہ وغیرہ نے منھال رحمہ اللہ کو ثقہ کہا ہے۔

اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس افسانہ کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ’’وقد یمکن ان لا یکون ذٰلک بحضورہ ولا اذنہ ولا علمہ وبالجملۃ فلا یرد حدیث الثقات بھذا وامثالہ‘‘ (تہذیب سنن ابی داؤد ج ۷ ص ۱۴۰)

’’ممکن ہے کہ یہ ساز وطرب والی کارروائی ان کی غیر حاضری میں ہوئی ہو اور ان کی اجازت اور علم کے بغیر صادر ہوئی ہو۔ الغرض ثقہ راویوں کی حدیث ایسی اور اس جیسی پا در ہوا باتوں سے رد نہیں کی جا سکتی۔‘‘

’’امام مغیرہ بن مقسم رحمہ اللہ سے اسی سے ملتی جلتی ایک رام کہانی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کی ہے اور پھر لکھا ہے کہ اس حکایت کا راوی محمد بن عمر خود قابل اعتماد نہیں۔ ’’فیہ نظر‘‘ اس میں کلام ہے۔ بھلا ایسے نا معتبر راویوں کی

داستانوں سے ثقہ راویوں کو کیونکر مجروح قرار دیا جا سکتا ہے؟ الحاصل اس اعتراض میں بھی کوئی جان نہیں ہے اور یہ نرا لایعنی اعتراض ہے۔ اگر ایسی بے بنیاد باتوں سے رُوات حدیث پر جرح قبول ہو تو حدیث کا خدا تعالیٰ ہی حافظ ہے۔ حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ ایسے کمزور اعتراضات کے سامنے کبھی سپر نہیں ڈالتے ۔

نہ ڈرائے ناخدا طوفاں میں بھی کچھ اہل ہمت کے　　　سفینے کھیلتے رہتے ہیں موجوں کی روانی میں

مؤلف ''ندائے حق'' (ص ۲۱۴) میں لکھتے ہیں کہ: ''منھال بن عمرو رحمہ اللہ کی جرح میں ابن حزم رحمہ اللہ متفرد نہیں۔ شعبہ، جوزجانی، یحییٰ القطان، احمد بن حنبل، حاکم، غلابی، مغیرہ الضبی رحمہم اللہ، سب آپ کو مجروح کہتے ہیں جوزجانی کہتے ہیں۔ منھال بن عمرو سئی المذہب ہے۔'' (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۲۰)

الجواب: ان تمام حضرات نے جس وجہ سے ان پر کلام کیا ہے اس میں مرکزی نقطہ یہ ہے کہ ان کے گھر سے ساز کی آواز آئی تھی۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا کہ امام شعبہ رحمہ اللہ نے ان کو ترک کر دیا تھا۔ امام عبدالرحمن بن ابی حاتم رحمہ اللہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ: ''لانہ سمع من دارہ صوت قرأۃ بالتطریب''

''اس لئے کہ ان کے گھر سے ساز کے ساتھ پڑھنے کی آواز سنائی دی تھی۔'' (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۱۹)

اور اس تمام افسانہ اور رام کہانی کو نقل کر کے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''لم یصح عنہ ذٰلک'' فرما کر (کہ ان سے یہ کارروائی ثابت ہی نہیں ہے) اس کا رد کر دیا ہے۔ ان حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ میں سے کسی نے ان کو حدیث میں ضعیف نہیں کہا اور نہ اس وجہ سے ان کی روایت رد کی ہے اور نہ ان کو اس لحاظ سے مجروح کہا ہے۔ یہ مؤلف ''ندائے حق'' کا بے جا تعصب اور ضد ہے کہ وہ معقول جواب اور جمہور کی توثیق کے بعد بھی اپنے باطل نظریہ پر قائم ہیں، بڑے شوق سے قائم رہیں۔ مرنے کے بعد اِن شاء اللہ تعالیٰ حقیقت سب منکشف ہو جائے گی۔

اعتراض سوم

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ، امام ابوحاتم رحمہ اللہ، بُستی رحمہ اللہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ یہ روایت زاذان رحمہ اللہ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے نہیں سنی۔ لہٰذا یہ روایت منقطع ہے۔ (تہذیب سنن ابی داؤد ج ۷ ص ۱۳۹)

جواب: یہ اعتراض بھی بے معنی ہے۔ اوّلاً: اس لئے کہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح ابوعوانہ میں بھی مذکور ہے اور اس کی سند آخر میں اس طرح ہے: ''عن زاذان سمعت البراء رضی اللہ عنہ'' زاذان فرماتے ہیں کہ میں نے خود یہ حدیث حضرت براء رضی اللہ عنہ سے سُنی ہے۔

(شرح حدیث النزول ص ۷۴، وتہذیب سنن ابی داؤد ج ۷ ص ۱۴۱ وکتاب الروح ص ۵۹)

اور (مستدرک ج ۱ ص ۳۷، ۳۸) میں بھی یہ روایت ہے۔ اس طرح ہے: ''زاذان قال سمعت البراء رضی اللہ عنہ'' اور (ابو داؤد ج ۲ ص ۲۹۸) میں بھی ''زاذان قال سمعت البراء رضی اللہ عنہ'' کے الفاظ ہیں۔ جب زاذان رحمہ اللہ جو ثقہ اور ثبت راوی ہیں، چلاّ چلاّ کر یہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ روایت حضرت براء رضی اللہ عنہ سے خود سُنی ہے تو پھر اس کے منقطع ہونے کا ناکام بہانہ کون سُنتا ہے؟ اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حوالے سے یہ بات پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ حافظ ابوعبداللہ بن مندہ رحمہ اللہ (جو الامام الحافظ الجوال محدث العصر ابو عبداللہ محمد بن

الشیخ ابی یعقوب رحمہ اللہ) تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۰) المتوفی ۳۹۵ھ اس حدیث کی سند کو متصل کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ: ''ھذا الحدیث اسناد متصل مشھور'' (شرح حدیث النزول ص ۴۷)

''اس حدیث کی سند متصل اور مشہور ہے۔''

اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے بھی یہ الفاظ حافظ ابن مندہ رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کئے ہیں۔ (کتاب الروح ص ۵۹)

وثانیاً: اس روایت کو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے تنہا زاذان رحمہ اللہ ہی روایت نہیں کرتے بلکہ راویوں کی اچھی خاصی جماعت اس کو روایت کرتی ہے۔

چنانچہ حافظ ابن مندہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''رواہ جماعۃ عن البراء رضی اللہ عنہ''

شرح حدیث النزول ص ۷۴ وکتاب الروح ص ۵۹)

حضرت براء رضی اللہ عنہ سے ایک جماعت اس کو روایت کرتی ہے۔

اور پھر اس جماعت میں سے بعض مشہور راویوں کی نشان دہی کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''قلت ھذا قد رواہ عن البراء بن عازب رضی اللہ عنہ غیر واحد غیر زاذان منھم عدی بن ثابت و محمد بن عُقبہ و مجاھد'' (شرح حدیث النزول ص ۴۹، واللفظ لہ وکتاب الروح ص ۵۶)

''میں کہتا ہوں کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے زاذان رحمہ اللہ کے علاوہ بھی متعدد راویوں نے یہ روایت کی ہے ان میں عدی بن ثابت رحمہ اللہ، محمد بن عقبہ رحمہ اللہ اور مجاہد رحمہ اللہ بھی ہیں۔''

اور پھر باقاعدہ اُنہوں نے ان راویوں کی روایت کی نشان دہی کی ہے۔ اس لئے یہ اعتراض بھی مردود ہے اور سرے سے قابل التفات ہی نہیں ہے۔

اعتراض چہارم

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ، امام ابو حاتم بُستی رحمہ اللہ کا یہ اعتراض نقل کرتے ہیں کہ بعض روایتوں میں ''الاعمش'' اور ''المنھال بن عمرو رحمہ اللہ'' کے درمیان الحسن بن عمارہ ایک راوی آتا ہے اور وہ ضعیف ہے اور اس لحاظ سے اعمش رحمہ اللہ کی منہال رحمہ اللہ سے روایت منقطع ہے۔ (محصلہ تہذیب سنن ابی داؤد ج ۷ ص ۱۳۹)

جواب: اس اعتراض میں بھی کوئی وزن نہیں۔ اوّلاً: اس لئے کہ حافظ ابن مندہ رحمہ اللہ، امام حاکم رحمہ اللہ، علامہ ذہبی رحمہ اللہ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ وغیرہ حضرات محدثین کرام رحمہ اللہ اس حدیث کو متصل اور صحیح کہتے ہیں اور صحت حدیث کے لئے سند کا متصل ہونا، اُصول حدیث کے رُو سے بنیادی اَمر ہے۔ لہٰذا الاعمش عن المنھال کی سند بالکل صحیح اور متصل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس سند میں الحسن بن عمارہ رحمہ اللہ کا واسطہ آیا ہے، اس کی سند صحیح ہے یا ضعیف؟ اگر صحیح ثابت ہو جائے تو اُصول حدیث کے لحاظ سے یہ المزید فی متصل الاسانید کی قسم سے ہوگی اور اس سے حدیث کی صحت میں مطلقاً کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی اور اگر وہ سند ضعیف ہے تو یہ کسی کمزور اور ضعیف راوی کا وہم ہوگا اور کسی کمزور اور وہمی راوی کی کارستانی سے صحیح حدیث اور متصل سند پر کیا زد پڑتی ہے؟ وثالثاً: منہال بن عمرو رحمہ اللہ سے علاوہ امام اعمش رحمہ اللہ کے رواۃ حدیث کی ایک خاصی جماعت اس کو روایت کرتی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''انہ قد رواہ عن المنھال جماعۃ کما قالہ ابن عدی''

(تہذیب سنن ابی داؤد ج ۷ ص ۱۴۰)

''یہ حدیث منہال رحمہ اللہ سے راویوں کی ایک خاصی جماعت نے روایت کی ہے، جیسا کہ محدث ابن عدی رحمہ اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔''

اگر راویوں کی اتنی بڑی جماعت میں ایک ''الحسن بن عمارہ رحمہ اللہ'' بھی کسی طریق میں آ گئے ہوں تو ان کی وجہ سے اس حدیث کی صحت اور سند کے اتصال پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ان راویوں میں یونس بن خباب رحمہ اللہ کا ذکر حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کیا ہے، (ملاحظہ ہو ص مذکور) اور امام حاکم رحمہ اللہ نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔ (مستدرک ج ۱ ص ۳۹)

نیز امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو خالد الدالانی رحمہ اللہ، عمرو بن قیس الملائی رحمہ اللہ اور الحسن بن عبید اللہ نخعی رحمہ اللہ بھی یہ روایت منہال بن عمرو رحمہ اللہ سے بیان کرتے ہیں۔ (ایضاً ص ۳۹)

الحاصل! اس صحیح روایت کے سلسلہ میں جتنے اعتراضات کئے گئے ہیں ان میں کسی ایک میں بھی کوئی وزن نہیں۔ محض اعتراض کرنے سے کیا نقص اور عیب لازم آتا ہے؟ کیا آخر اس گیتی پر رہنے والوں میں کم بخت اور حرماں نصیب لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے شریک اور اولاد تجویز نہیں کی؟ (معاذ اللہ تعالیٰ) اور کیا دریدہ دہن لوگوں نے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو (العیاذ باللہ تعالیٰ) ساحر، مجنون اور کذاب وغیرہ نہیں کہا؟ پھر ان کم بختوں کی واہی تباہی باتوں سے ان نفوس قدسیہ کی بلند اور ارفع ہستیوں میں کیا کمی آ گئی؟ غرض یہ کہ نرے اعتراضات سے کچھ نہیں بنتا۔ جب تک کہ اس میں جان نہ ہو۔ ارباب باطن اس کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ جہاں پھول ہوتے ہیں، وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں اور اسی سے دنیا کی رونق ہے ؎

حدِ تکمیل تک پہنچے گا دستورِ چمن بندی　　اگر کانٹے بھی شامل ہوں گلوں کے ہم نشینوں میں

اعتراض پنجم

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ کا یہ خیال ہے کہ قبر میں نکیرین کا سوال اور عذاب قبر تو حق ہے مگر یہ ساری کارروائی رُوح سے متعلق ہے، اس میں رُوح کا جسم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کیونکہ قیامت سے پہلے کسی کو حیات حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنا یہ نظریہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''و ان عذاب القبر حق و مسألۃ الارواح بعد الموت حق ولا یحیٰی احد بعد الموت الٰی یوم القیمۃ'' (محلی ج ۱ ص ۲۱)

''کہ عذاب قبر بھی حق ہے اور مرنے کے بعد ارواح سے فرشتوں کا سوال بھی حق ہے لیکن موت کے بعد قیامت تک کوئی شخص زندہ نہیں کیا جاتا۔''

اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ اگر حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث کے پیش نظر قبر میں حیات تسلیم کر لی جائے تو یہ قرآنِ کریم کی نصوص کے خلاف ہے۔ مثلاً ایک مقام پر اس طرح ارشاد ہوتا ہے کہ: ''قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ'' (المؤمن: ۱۱)

''وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب تو موت دے چکا ہم کو دوبارہ اور زندگی دے چکا ہم کو دوبارہ۔''

اور دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے کہ: ''كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ'' (البقرۃ: ۲۸)

''تم کیسے کفر کرتے ہو اللہ تعالیٰ کا حالانکہ تم بے جان تھے، پھر اُس نے تمہیں زندہ کیا۔ پھر وہ تمہیں مارے گا۔ پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ دو دفعہ کی حیات اور دو دفعہ کی موت ہی قرآنِ کریم سے ثابت ہے۔ اگر قبر میں بھی حیات تسلیم کی جائے تو بجائے دو دفعہ کی حیات کے تین دَفعہ کی حیات ثابت ہوگی اور چونکہ حضرت براء رضی اللہ عنہ کی روایت میں عود الروح الی البدن کے ساتھ قبر میں حیات ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ حدیث نص قرآنی کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل اخذ نہیں۔ (محصلہ کتاب الروح ص ۵۱، ۵۲، وتہذیب سنن ابی داؤد ج ۷ ص ۱۴۱) یہ بحث حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''ملل و نحل ج ۲ ص ۱۷۵ تا ۱۸۷، مترجم اُردو دائرۃ المعارف حیدر آباد دَکن'' میں اور ج ۴ ص ۸۹ عربی طبع مصر میں کی ہے)

جواب: حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نظریہ ان کی ظاہریت کا شاخسانہ اور قلتِ تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اَوّلاً: اس لئے کہ ''ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ'' کے جملہ سے قطعیت کے ساتھ بعث یوم القیمہ کی حیات ہی مراد لینا متعین نہیں ہے بلکہ بعض حضرات مفسّرین کرام رحمہم اللہ نے اس سے قبر میں نکیرین کے سوال کے وقت کی حیات بھی مراد لی ہے۔

چنانچہ علّامہ ابو السعود رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: ''ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ، بالنشور یوم ینفخ فی الصور اوللسوال فی القبور وایاما کان فھو متراخ من زمان الاماتۃ'' (تفسیر ابو السعود ج ۱ ص ۶۲)

''پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا کا مطلب یہ ہے کہ نفخۂ ثانیہ کے بعد قبروں سے تمہیں نکالے گا یا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ قبور میں سوال کے لئے تمہیں زندہ کرے گا، کچھ بھی ہو، یہ حیات زمانۂ اماتت کے بعد ہوگی۔''

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اور علّامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ (وغیرہ) نے بھی اس جملہ کی تفسیر میں اوللسوال فی القبور وغیرہ کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو بیضاوی ص ۵۶، تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۵۱، تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۶۷ اور روح المعانی ج ۲۴ ص ۵۲، ''وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ'' کی تفسیر میں یہ نقل کیا ہے) اور اس تفسیر کے لحاظ سے قیامت کے دن کی حیات ''ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ'' سے ثابت ہے غرض یہ کہ ''حیات فی القبر'' کی نفی پر ان آیات سے استدلال قطعی نہیں، بلکہ ان سے اثبات ''حیات فی القبر'' پر بھی استدلال کیا گیا ہے اور یہ استدلال علّامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف پڑتا ہے۔

امام ابوبکر الجصاص الرازی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۳۷۰ھ) شہداء کرام کی حیات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''وقال الجمھور ان اللہ تعالیٰ یحییھم بعد الموت فینسیلھم من النعیم بقدر استحقاقھم الی ان یفنیھم اللہ تعالیٰ عند فناء الخلق ثم یعیدھم فی الآخرۃ و یدخلھم الجنۃ لانہ اخبر انھم احیاء و ذٰلک یقتضی انھم احیاء فی ھذا الوقت ولان تاویل من تاوّلہ علی انھم احیاء فی الجنۃ یؤدی الی ابطال فائدتہ لان احدًا من المسلمین لایشک انھم سیکونون احیاء مع سائر اھل الجنۃ اذا الجنۃ لایکون فیھا میت'' (احکام القرآن ج ۲ ص ۱۵ طبع مصر)

''جمہور فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ موت کے بعد ان کو زندہ کرتا ہے سو ان کو ان کے استحقاق کے مطابق راحت پہنچتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے فناء کرتے وقت ان کو بھی فناء کردے۔ پھر ان کو آخرت میں لوٹائے گا اور ان کو جنت میں داخل کرے گا اور یہ بات اس کو چاہتی ہے کہ وہ اس وقت زندہ ہیں۔ لہٰذا جن

لوگوں نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ وہ جنت میں زندہ ہیں وہ اس ارشاد کے فائدہ کو باطل کرنے کے در پے ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں میں سے کسی ایک کو بھی اس میں شک نہیں کہ سب اہل جنت کی طرح حضرات شہداء بھی زندہ ہوں گے۔ کیونکہ جنت میں تو کوئی بھی مُردہ نہ ہوگا۔

اس عبارت سے ذیل کے فوائد حاصل ہوتے ہیں:

(۱) جمہور کا یہ مسلک ہے کہ اللہ تعالیٰ شہداء کو مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ (۲) اور زندہ کر کے ان کو جس نعمت کے وہ مستحق ہوتے ہیں اس سے نوازتا ہے۔ (۳) شہداء کی یہ حیات اس وقت تک برقرار رہے گی۔ جب تک اللہ تعالیٰ مخلوق کو فنا نہ کردے۔ (۴) اس فنا کے بعد آخرت میں اللہ تعالیٰ دوبارہ شہداء کو زندہ کر کے جنت میں داخل کرے گا۔ (۵) اگر شہداء کی اس حیات سے مرنے کے بعد فوری حیات مراد نہ لی جائے تو (معاذ اللہ تعالیٰ) اللہ تعالیٰ کی خبر سچی نہیں رہتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خبر تو یہ دی ہے کہ شہداء زندہ ہیں اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ فی الحال زندہ ہوں۔ (چونکہ روح پر موت نہیں آتی۔ اس لئے موت اور پھر حیات یہ اجسام ہی سے متعلق ہے۔ صفدرؒ) (٦) جن لوگوں نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ وہ قبر اور برزخ میں زندہ نہیں بلکہ جنت میں زندہ ہیں، تو اس کی اس تاویل سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا فائدہ ہی باطل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو اس پر یقین نہ رکھتا ہو کہ شہداء دیگر اہل جنت کی طرح زندہ ہوں گے۔ کیونکہ جنت میں سرے سے موت ہی نہیں ہے۔

وثانیاً: ان آیتوں میں دو دفعہ کی جس حیات کا ذکر ہے وہ حیات مطلقہ، حیات کاملہ اور پوری حیات ہے اور ایسی حیات یا تو دنیا میں ہوتی ہے اور یا قیامت کے دن ہوگی اور اس حیات کی علامت یہ ہے کہ اس میں رُوح تمام بدن میں سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے اور رُوح بدن کی تدبیر اور اس میں تصرف کرتی ہے اور ایسی مطلق اور کامل حیات میں بدن کو عادۃً خوراک، پانی اور لباس وغیرہ جملہ ضروریات کی حاجت پڑتی ہے اور بدن میں حس و حرکت ہوتی ہے اور وہ جنبش کرتا ہے جن کا بخوبی لوگ مشاہدہ کر سکتے ہیں اور اس کی حرکات محسوس ہو سکتی ہیں اور ایسی حیات صرف دو دفعہ ہوگی۔ دنیا میں اور آخرت میں رہی قبر اور برزخ کی حیات تو وہ مطلق اور کامل حیات نہیں بلکہ فی الجملہ اور ''نوع من الحیوۃ'' ہے۔ اس میں رُوح کا اتصال ربط اور تعلق بدن عنصری کے اہم اجزاء کے ساتھ ہوتا ہے جن سے فہم و شعور اور ادراک ہو سکے اور قبر کی راحت و کلفت کا ادراک ہو سکے اور اس حیات میں بدن عنصری نہ تو خوراک اور لباس وغیرہ کا محتاج ہوتا ہے اور نہ ظاہری طور پر حس و حرکت اور جنبش کرتا ہے جس کا مشاہدہ کیا جا سکے اور اس معنی کو نہ سمجھتے ہوئے معتزلہ وغیرہ باطل فرقوں کو عذاب قبر اور راحت قبر کے بارے میں بڑی اُلجھنیں پیدا ہوئی ہیں مگر حقیقت کو وہ نہیں پا سکے اور اہلِ حق سنت کی پیروی کی بدولت اس راز کو پا گئے ہیں اور ان کے لئے اس میں کوئی دقت باقی نہیں رہی۔

چنانچہ حافظ ابن القیم ؒ نے ابنِ حزم کا یہ اعتراض نقل کر کے یہ جواب دیا کہ: ''قلت ما ذکرہ ابو محمد فیہ حق و باطل اما قولہ من ظن ان المیّت یحیا فی قبرہ فخطأ فھذا فیہ اجمال ان اراد بہ الحیاۃ المعھودۃ فی الدنیا التی تقوم فیھا الروح بالبدنی وتدبرہ وتصرفہ ویحتاج معھا الی الطعام والشراب واللباس فھذا خطأ کما قال والحِسّ والعقل یکذّبہ کما یکذبہ النص و ان اراد بہ حیاۃ أخرٰی غیر ھذہ الحیوۃ بل تعاد الروح الیہ اعادۃ غیر اعادۃ المألوفۃ فی الدنیا یسئال و یمتحن فی قبرہ فھذا حق و نفیہ خطأ وقد دل علیہ النص الصحیح الصریح وھو قولہ ﷺ فتعاد الروح فی جسدہ'' (کتاب الروح ص ۵۲)

''میں کہتا ہوں کہ ابو محمد بن حزم رحمہ اللہ کے اس قول میں حق بھی ہے اور باطل بھی ان کا یہ کہنا کہ: ''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ میت قبر میں زندہ کی جاتی ہے غلط ہے۔ اس میں اجمال ہے۔ اگر ابن حزم رحمہ اللہ اس زندگی سے دنیا کی معمور زندگی مراد لیتے ہیں جس میں رُوح بدن میں قوام اور اس کی تدبیر اور تصرف کرتی ہے اور اس میں کھانے پینے اور لباس کی ضرورت پڑتی ہے تو ایسی حیات کا قول غلط ہے۔ جیسا کہ ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں اور حس و عقل اور نص اس کی تکذیب کرتی ہے اور اگر قبر کی حیات سے اس معہود حیات کے علاوہ کوئی اور حیات مراد ہو، جس میں روح بدن کی طرف لوٹائی جائے۔ لیکن یہ اعادہ دنیا کی معہود زندگی کے اعادہ کے علاوہ ہوتا کہ قبر میں اس سے سوال اور امتحان ہو سکے تو ایسی حیات حق ہے۔ اس کی نفی غلط ہے اور آنحضرت ﷺ کی صحیح اور صریح حدیث اس پر دال ہے کہ رُوح جسم میں لوٹائی جاتی ہے۔''

اور اس فی الجملہ اور نوع من الحیٰوۃ کی مثال خود حافظ ابن القیم رحمہ اللہ یوں بیان کرتے ہیں: ''و اذا کان النائم روحہ فی جسدہٖ و ھو حی و حیاتہ غیر حیاۃ المستیقظ فان النوم شقیق الموت فھکذا المیت اذا اعیدت روحہ الٰی جسدہٖ کانت لہ حال متوسطۃ بین الحی و بین المیت الذی لم ترد روحہ الٰی بدنہٖ کحال النائم المتوسطۃ بین الحی و المیت فتأمل ھذا یزیح عنک اشکالات کثیرۃ'' (کتاب الروح ص ۵۳)

''اور جب سونے والے آدمی کی رُوح اس کے جسم میں ہوتی ہے اور وہ زندہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کی زندگی بیدار آدمی کی زندگی سے متفاوت ہوتی ہے۔ کیونکہ نیند موت کی بہن ہے۔ سو اسی طرح جب مُردہ جسم کی طرف اس کی روح لوٹائی جائے گی تو اس کی حالت زندہ اور مُردہ کے درمیان درمیان ہوگی جس کی طرف اس کی رُوح نہیں لوٹائی گئی جیسے کہ خوابیدہ کی حالت زندہ اور مُردہ کے درمیان درمیان ہوتی ہے تو اگر اس مثال پر غور کرے گا تو (ان شاء اللہ تعالیٰ) تیرے بہت سے اشکالات اس سے دُور ہو جائیں گے۔''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کا مسلک

''اگرچہ سابق بیان کردہ حوالے ان کے مسلک کو بالکل واضح کرتے ہیں مگر چونکہ مؤلف ندائے حق (ص ۱۶۲) اور ان کے حواریوں کو حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کے مسلک کے سمجھنے میں بڑی غلطی ہوئی ہے اور اُلٹا وہ ہمیں کوستے ہیں کہ ہم نے ان کے مسلک کو نہیں سمجھا۔ اس لئے بہت ضروری ہے کہ ہم ان بزرگوں اور دوستوں کے نظریات بھی عرض کر دیں اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کا صحیح مسلک بھی خود انہی کی عبارات میں عرض کر دیں تا کہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جائے۔ ان بزرگوں اور دوستوں کے دعاوی یہ ہیں: (۱) حافظ ابن القیم رحمہ اللہ جسد عنصری کے ساتھ رُوح کے تعلق کے قائل نہیں ہیں۔ (حصلہ تسکین القلوب ص ۸۱) (۲) برزخ میں ارواح شہداء مثالی جسدوں میں نعیم جنت کا لطف اُٹھاتی رہیں گی اور قیامت کے دن ان کو عنصری جسموں میں داخل کیا جائے گا۔ (اقامۃ البرہان ص ۱۱۶) (۳) شہداء کے ارواح کو بعد از وفات اجساد عنصری کے عوض میں اس سے بہتر نورانی اجساد مثالیہ عطاء ہوں گے۔ (ندائے حق ص ۳۲۲) (۴) مؤلف نے (ندائے حق ص ۱۷۲، ۱۷۳) میں سو بزرگوں کے نام درج کئے ہیں جن میں ایک حافظ ابن القیم رحمہ اللہ بھی ہے۔ پھر آخر میں لکھتے ہیں کہ یہ سو فیصدی علماء اس اَمر پر متفق ہیں کہ بعد از مرگ اِس جسدِ عنصری کے ساتھ (سوائے تعلقِ محبت کے) رُوح کا کچھ تعلق نہیں۔ چہ جائیکہ داخل مانیں بلکہ ارواح کو مثالی جسد عطاء ہوتا ہے جس میں قیامِ قیامت تک رہ کر رُوح ثواب وعذاب پاتا رہتا ہے۔''

اور ان بزرگوں اور دوستوں کو کتاب الروح کی دو عبارتوں سے مغالطہ ہوا ہے۔

(۱) ایک یہ ہے کہ حضرات شہداء کرام رحمہم اللہ نے جب اپنی جانیں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں پیش کر دیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں نے ان کو تلف کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے عوض میں ان کو برزخ میں ان سے بہتر جانیں عطاء فرما دیں، جن میں قیامت تک رہیں گے اور ان ابدان کی وساطت سے ان کو جو نعمت حاصل ہوتی ہے وہ ارواح مجردہ کی نعمت سے زیادہ کامل ہے۔ (کتاب الروح ص ۱۲۲، ندائے حق مترجما ص ۱۶۲)

(۲) دوسری یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہداء کے اکرام و اعزاز کا تتمہ ہے کہ جو بدن انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ٹکڑے ٹکڑے کرائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بدلے ان کو ان سے بہتر بدن عطاء فرمائے جو ان کی رُوحوں کی سواری ہوں، تا کہ وہ پوری طرح جنت کی نعمتوں کا لطف اُٹھا سکیں۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو ان کی رُوحیں انہی بدنوں میں لوٹا دی جائیں گی جن میں وہ دارِ دنیا میں رہتی تھیں۔ (کتاب الروح ص ۱۴۱، اقامۃ البرہان ص ۱۱۶)

الجواب: ان بزرگوں اور دوستوں نے نفس مسئلہ پر بھی غور نہیں فرمایا اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی عبارات پر بھی غور نہیں فرمایا، ورنہ مسئلہ اور درحقیقت کی تہ تک پہنچنا ان کے لئے چنداں مشکل نہ تھا۔ بات یوں ہے کہ صحیح احادیث میں آتا ہے کہ حضرت شہداء کرام رحمہم اللہ کی ارواح (فی حواصل طیر خضر و فی روایۃ اجواف) سبز رنگ کے پرندوں کے پیٹوں میں جنت میں جہاں چاہیں سیر و سیاحت کر کے ان قندیلوں کی طرف لوٹ آتی ہیں جو عرش کے ساتھ لٹکی رہتی ہیں لیکن ان پرندوں سے اجساد مثالیہ مراد لینا قطعاً غلط ہے۔

(۱) اوّلاً: جو حضرات جسم مثالی کے قائل ہیں وہ اس جسم کو دنیا کے جسم کے مشابہ تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''برزخ میں انسان کو جسم مثالی عطاء ہوگا جو اسی جسم عنصری سے مشابہ ہے (یعنی مرد و عورت کالا اور گورا پتلا اور دُبلا وغیرہ ہونے میں۔ صفدرؔ) مگر اس سے زیادہ لطیف ہوتا ہے۔''

(اشرف الجواب ص ۱۲، ۳، بحوالہ ندائے حق ص ۱۶۲)

جنت کے پرندے کیسے ہی خوب صورت اور کتنے ہی خوش نما اور پیارے ہوں بہر حال انسان کی شکل وصورت کے تو نہیں ہوتے اور نہ انسان ان کے ہم شکل وہم صورت ہوتا ہے۔ پھر یہ کیونکر تسلیم کر لیا جائے کہ وہ پرندے انسانوں کے لئے اجسام مثالیہ ہیں؟

(۲) وثانیاً: یہ پرندے ارواح کے لئے سواری ہیں جیسے دنیا میں انسان، گدھے، گھوڑے اور خچر وغیرہ پر سوار ہوتا ہے۔ یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ گدھا اور گھوڑا وغیرہ انسان کا جسم مثالی ہے بلکہ وہ اس کے لئے سواری ہے اسی طرح وہ پرندے شہداء کرام رحمہم اللہ کے اعزاز و اکرام کے لئے سواری ہوتے ہیں جس طرح دنیا میں لوگ ہوائی جہاز کار اور بس وغیرہ کے اندر پیٹ میں بیٹھ کر مزے اور آرام سے سیر و سیاحت کرتا ہے۔ اسی طرح جنت کے ان پرندوں کے پیٹ میں بیٹھ کر ارواح جنت کی سیر کریں گے اور خود حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی دیگر عبارات میں بھی اور خود اس عبارت میں بھی اس کی تصریح موجود ہے کہ: ''فیکون مرکبا لا رواحھم'' (کتاب الروح ص ۱۴۱) تا کہ وہ پرندے شہیدوں کی ارواح کے لئے سواری ہوں اور ظاہر اَمر ہے کہ سواری کا جانور کسی طرح بھی سوار کا جسد مثالی نہیں ہوتا نہ شرعاً نہ عقلاً اور نہ عُرفاً صحیح اور مرفوع روایات سے یہی ثابت ہے کہ شہداء کرام رحمہم اللہ کی ارواح سبز (یا

بعض روایتوں میں سفید) رنگ کے پرندوں کے پیٹوں میں سوار ہو کر جنت میں سیر کرتی ہیں اور بعض موقوف آثار میں جو حضرت ابوالدرداء، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت قتادہ، حضرت عکرمہ (رضی اللہ عنہم)، حضرت ابن شہاب زہری رحمہ اللہ اور حضرت ابوالعالیہ رحمہ اللہ وغیرہ سے مروی ہیں۔ (دیکھئے علی الترتیب شرح الصدور ص ۹۹، ۱۰۲، تفسیر ابن جریر ج ۲ ص ۳۹، شرح الصدور ص ۹۶، الدر المنثور ج ۱ ص ۵۵ ملتقطاً من اقامۃ البرہان ص ۱۱۰ تا ۱۱۲) یہ آتا ہے کہ خود ارواح شہداء کرام رحمہم اللہ ان پرندوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں کسی اثر میں ھی طیر خضر آتا ہے اور کسی میں کطیر خضر اور کسی میں فی صور طیر الغرض صحیح اور مرفوع روایات کے پیشِ نظر یہ پرندے ارواح کے لئے سواری ہوں یا موقوف آثار کے مطابق یہ خود پرندوں کی شکل اختیار کر لیں، کسی صورت میں بھی یہ رُوح کے لئے اجسام مثالیہ نہیں بنتے کہ رُوح ان میں داخل ہو کر یا ان سے متصل ہو کر راحت (یا کفار و عصاۃ کے لئے عذاب و سزا) پائے اور یہ پرندے ابدان عنصریہ کے نائب اور خلیفہ بن کر راحت (یا سزا) پائیں حضرات صوفیاء کرام جس کو جسد مثالی کہتے ہیں وہ اور شئے ہے یہ پرندے ہرگز ہرگز نہیں ہیں۔ مؤلف ''ندائے حق'' نے (اور اسی طرح مؤلف اقامۃ البرہان وغیرہ نے) اسی مضمون کی روایات اور عبارات پیش کر کے سو بزرگوں کی گنتی پوری کر کے سو فیصدی کہہ کر محض اپنی کم فہمی یا کرامت سے ان تمام حضرات کو اجسام مثالیہ کا قائل بنا دیا ہے جو حقیقت سے بالکل دور ہے اور یہ سو فیصدی حضرات جس کے قائل ہیں بحمد اللہ تعالیٰ ہم بھی اس کے قائل ہیں اور سر مو بھی ان کے مخالف نہیں مگر ان حضرات کا ایک حوالہ بھی آپ حضرات کو بال برابر بھی مفید نہیں ہے دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھ عطا فرمائے۔

(۳) وثالثاً: سبز (یا سفید) رنگ کے پرندوں کے مضمون کی یہ جملہ روایات و آثار حضرات محدثین کرام، فقہاء عظام رحمہم اللہ اور متکلمین کے پیشِ نظر تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے ان روایات و آثار سے اجسام مثالیہ سمجھ کر باطل فرقوں کا جواب نہ دیا اور کیوں جسد عنصری کے ذرّات کے پیچھے پڑ گئے؟ کیا باطل فرقوں کے اس سوال کے کہ جب مُردہ جلا دیا جائے یا اس کو درندے اور مچھلیاں وغیرہ کھا جائیں تو اس سے سوال نکیرین اور اس کو راحت یا کلفت کیسے ہوتی ہے؟ جواب میں ان حضرات کو یہ کہنا سہل نہ تھا کہ بدن عنصری جل گیا ہے تو کیا مضائقہ ہے بدن مثالی بصورت سبز یا سفید پرندہ تو موجود ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ اس سہل ترین جواب کو چھوڑ کر مشکل میں پڑ گئے اور امکانِ بعید کو بھی نہ چھوڑا کہ خواہ بدن عنصری ریزہ ریزہ ہو جائے۔ رُوح کا کسی نہ کسی درجہ میں اس کے ساتھ تعلق ضرورت ہوتا ہے گو ہمیں اس کا شعور نہ ہو سکے۔ لہٰذا ان سو فیصدی کا مسلک بھی ان حضرات کو مفید نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ جو حضرات اجسام مثالیہ کے ساتھ رُوح کا تعلق مانتے ہیں وہ اجسام عنصریہ سے بھی رُوح کا تعلق تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ کا آگے آ رہا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

(۴) و رابعاً: یہ کہنا کہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ (اور ان کے استاد محترم حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ جیسا کہ مؤلف ''ندائے حق'' کا بے بنیاد دعویٰ ہے۔ (دیکھئے ص ۱۶۴) جسد سے جسد مثالی مراد لیتے ہیں، بالکل غلط اور ان پر سراسر بہتان ہے۔ ہم ان کی چند عبارات عرض کرتے ہیں غور سے ان کو دیکھیں کہ وہ حدیث میں وارد جسد سے کیا مراد لیتے ہیں:

(۱) حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت پر کہ جسم کی طرف رُوح لوٹائی جاتی ہے۔ (تعاد روحہ فی جسدہ) حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی صحیح اور مرفوع حدیث کے علاوہ دیگر مرفوع احادیث بھی پیش کرتے ہیں

جن میں سے ایک محدث کبیر الحافظ العالم عبدالرحمن بن مندہ رحمہ اللہ (المتوفی ۴۷۰ھ) کی سند سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی مرفوع طویل روایت نقل کرتے ہیں جس میں یہ بھی ہے کہ مرنے کے بعد جب رُوح کو جنت میں پہنچا دیا جاتا ہے اور وہاں وہ خوشیاں دیکھ لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ اس کو زمین کی طرف لے جاؤ کیونکہ میں نے اسی سے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور اسی میں لوٹاؤں گا اور اسی سے پھر دوبارہ نکالوں گا۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''فوالذی نفس محمد بیدہ لھی اشد کراهية للخروج منها حين كانت تخرج من الجسد و تقول اين تذهبون بي الى ذلك الجسد الذي كنت فيه؟ قال فيقولون انا مأمورون بهذا فلا بد لك منه فيهبطون به على قدر فراغهم من غسله و اكفانه فيه خلون ذلك الروح بين جسده و اكفانه فدل هذا الحديث ان الروح تعاد بين الجسد و الاكفان و هذا عود غير التعلق الذي كان لها في الدنيا بالبدن و هو نوع آخر و غير تعلقها به حال النوم و غير تعلقها به و هي في مقرها بل هو عود خالص للمسئلة'' (کتاب الروح ص۶۱ و ۲۲۸)

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے۔ البتہ وہ روح جنت سے نکلنے کو اس سے بھی زیادہ ناپسند کرتی ہے جس طرح کہ اس نے بدن سے نکلنے کو ناپسند کیا تھا اور وہ رُوح کہتی ہے مجھے تم کہاں لے جاتے ہو؟ کیا اُس جسم کی طرف جس میں میں تھی؟ آپ نے فرمایا تو فرشتے کہتے ہیں کہ ہاں! ہمیں اسی کا حکم ہے اور تیرے لئے بھی اس سے کوئی چارہ نہیں ہے، سو وہ اس کو اُتار لاتے ہیں۔ اتنے انداز کے بعد کہ لوگ میت کے غسل اور کفن سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ پس وہ اس رُوح کو اس جسم اور اس کے کفن کے درمیان داخل کر دیتے ہیں (اور جب اس کو قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق یہ رُوح اس کے جسم میں لوٹا دی جاتی ہے) پس یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ رُوح جسم اور اکفان کے درمیان لوٹائی جاتی ہے اور یہ لوٹانا اس تعلق کے علاوہ ہے جو رُوح کا دنیا میں (تصرف وتدبیر کے طور پر) جسم سے تھا یہ عود اور نوع کا ہے اور یہ ایسا تعلق بھی نہیں جو نیند کے حال میں تھا اور یہ ایسا تعلق بھی نہیں جو رُوح کا اپنے ٹھکانے میں تھا بلکہ یہ لوٹنا خاص طور پر سوال کے لئے ہے۔''

اس حدیث اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کے استدلال سے صاف ظاہر ہے کہ رُوح کا عود اس جسم کی طرف ہوتا ہے جس میں روح پہلے رہتی رہی اور وہ یقینی طور پر جسم عنصری و مادی ہے نہ کہ جسم مثالی۔

(۲) قبر کے عذاب کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''فكل من مات و هو مستحق للعذاب ناله نصيبه منه قبر او لم يقبر فلو اكلته السباع او احرق حتى صار رمادا او نسف في الهواء او صلب او غرق في البحر وصل الى روحه و بدنه من العذاب ما يصل الى القبور'' (کتاب الروح ص۷۱)

''ہر وہ شخص جس کی وفات ہو گئی اور وہ عذاب کا مستحق ہے تو اُس کو عذاب کا حصہ ضرور پہنچتا ہے۔ اس کو قبر میں دفن کیا جائے یا نہ دفن کیا جائے۔ پس اگر اس کو درندے کھا گئے یا وہ جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ راکھ ہوا میں اُڑا دی گئی یا سولی پر لٹکا دیا گیا یا دریا میں ڈوب گیا تو ان سب صورتوں میں اس کی روح اور اس کے بدن کو وہ عذاب پہنچے گا جو قبر میں دفن کئے ہوئے کو پہنچتا ہے۔''

مبتدی طالب علم بھی یہ جانتے ہیں کہ قبر میں جس بدن کو دفن کیا جاتا ہے اور اسی طرح درندے جس بدن کو کھاتے ہیں اور جس بدن کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے یا سولی پر لٹکایا جاتا ہے یا سمندر میں ڈوب جاتا ہے وہ صرف

عنصری اور مادّی بدن ہی ہوتا ہے، مثالی بدن ہرگز نہیں ہوتا۔ مگر حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اُس بدن کو بھی سزا بھگتے بغیر نہیں گوارا کرتے اور فرماتے ہیں کہ اس کو بھی باقاعدہ عذاب ہوتا ہے۔

(۳) احادیث کی روشنی میں ایک شخص کی وصیت کا کہ اس نے مرنے کے بعد اُسے جلا کر راکھ کر دینے کی تاکید تھی۔ تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''فلم یفت عذاب البرزخ و نعیمه لهذا الاجزاء التی صارت فی هذه الحال حتّٰی لو علق المیّت علٰی رؤس الاشجار فی مهاب الریاح لاصاب جسدهٗ من عذاب البرزخ حظّه و نصیبهٗ و لو دفن الرجل الصالح فی اتون من النار لاصاب جسدهٗ من نعیم البرزخ و روحه نصیبهٗ و حظه فیجعل اللّٰه النار علٰی هذا برداوّ سلٰمًا و الهواء علٰی ذٰلک نارًا و سمومًا'' (کتاب الروح ص ۹۰)

''عذاب برزخ اور اس کی راحت سے یہ اجزاء بھی نہیں چھوٹ سکے جو اس حالت میں (راکھ) ہو گئے یہاں تک کہ اگر کسی میت کو سخت ہوا کے جھونکوں میں درختوں کی چوٹیوں پر بھی لٹکا دیا جائے تو اس کے جسم کو بھی عذاب برزخ کا حصہ اور نصیبہ ضرور پہنچے گا اور اگر کسی نیک آدمی کو آتش کدہ میں دفن کیا جائے تو لامحالہ اس کے جسم اور رُوح کو بھی برزخ کی راحت کا حصہ اور نصیبہ پہنچے گا پس اللہ تعالیٰ اس پر آگ کو ٹھنڈک اور سلامتی والی بنا دیں گے اور اس کے لئے ہوا کو آگ اور گرم لو کر دیں گے۔''

یہ عبارت بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جسم سے مراد جسم عنصری اور مادّی ہے جس کو راکھ کیا جاتا ہے اور جس کو درختوں پر لٹکایا جاتا ہے اور جس کو لوہاروں کے بھٹہ اور آتش کدہ میں دفن کیا جاتا ہے مگر اس کے لئے بھی عذاب قبر اور راحت سے کوئی مخلص اور مفر نہیں ہے۔

(۴) ایک اور مقام پر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''انه غیر ممتنع ان ترد الروح الی المصلوب و الغریق و المحرق و نحن لا نشعر بها لان ذٰلک الرد نوع آخر غیر المعهود فهذا المغمٰی علیا و المسکوت و المبهوت احیاء و ارواحهم معهم و لا نشعر بحیاتهم و من تفرقت اجزاءهٗ لا یمتنع علٰی من هو علٰی کل شئ قدیر ان یجعل للروح اتصالًا بتلک الاجزء علٰی تباعد ما بینها و قربه و یکون فی تلک الاجزاء شعور بنوع من الالم و اللذة'' (کتاب الروح ص ۸۹)

''اس میں کوئی امتناع نہیں کہ سولی پر لٹکائے ہوئے اور غرق شدہ اور جلائے ہوئے کی طرف روح لوٹائی جائے لیکن ہم اس کا شعور نہیں کر سکتے اس لئے کہ رُوح کا لوٹایا جانا معہود طریقہ پر (جس کا ہمیں مشاہدہ اور شعور ہو) نہیں ہوتا بلکہ وہ اور نوع ہے۔ مثلاً دیکھو کہ بے ہوش آدمی اور سکتے والا اور مبہوت و حیران زندہ ہیں اور ان کی روحیں ان کے ساتھ ہوتی ہیں پر ہم ان کی حیات کو نہیں سمجھ سکتے اور اسی طرح جس کے اجزاء متفرق ہو چکے ہوں اس ذات پر جو ہر چیز پر قادر ہے ممتنع نہیں کہ روح کا اتصال ان اجزاء کے ساتھ قائم کر دیں جو دور ہوں یا نزدیک اور ان اجزاء میں دُکھ اور لذت کی نوع کا شعور پیدا ہو جائے۔''

یہ عبارت بھی اپنے مدلول و مفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح ہے کہ جس جسم کی بات ہو رہی ہے وہ جسم عنصری اور مادّی ہی ہے۔

(۵) رُوح کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''وان لھا شانا غیر شان البدن وانھا مع کونھا فی الجنۃ فھی فی السماء وتتصل بفناء القبر وبالبدن فیہ وھی اسرع شیئ حرکۃ وانتقالا وصعوداً وھبوطاً''

''روح کا معاملہ بدن کے معاملہ کے علاوہ ہے اور باوجود اس کے کہ رُوح جنت میں ہوتی ہے اس کے باوجود وہ آسمان میں بھی ہوتی ہے اور قبر کے کنارے سے بھی متصل ہوتی ہے اور اس بدن سے بھی متصل ہوتی ہے جو قبر میں ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ رُوح حرکت انتقال چڑھنے اور اُترنے میں سب چیزوں سے تیز تر ہے۔'' (کتاب الروح ص ۱۴۴)

اس سے معلوم ہوا کہ رُوح جنت اور آسمان میں ہوتے ہوئے بھی قبر میں بدن کے ساتھ بھی متصل ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ جنت اور آسمان میں ہوتے ہوئے قبر میں بدن کے ساتھ اس کا کوئی تعلق اور اتصال نہ ہو بلکہ اس کا تعلق بدستور رہتا ہے۔

(۶) فرماتے ہیں کہ رُوح کے بدن کے ساتھ تعلق کی پانچ قسمیں ہیں جن کے احکام جدا جدا ہیں۔

''الرابع تعلقھا بہ فی البرزخ فانھا وان فارقتہ وتجردت عنہ فانھا لم تفارق فراقا کلیا بحیث لایبقی لھا التفات الیہ البتۃ'' (کتاب الروح ص ۵۳)

''چوتھی قسم روح کا بدن سے برزخ میں تعلق ہے۔ رُوح اگرچہ بدن سے جدا اور الگ ہوجاتی ہے لیکن وہ کُلی طور پر جدا نہیں ہوتی۔ بایں طور کہ رُوح کا بدن کے ساتھ کوئی ربط اور التفات ہی نہ رہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ برزخ میں رُوح کا بدن سے تعلق جس درجہ کا بھی ہو۔ ہوتا ضرور ہے اور بالکلیہ انقطاع نہیں ہوتا۔

(۷) امام ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ نے اعادۂ رُوح کی نفی پر یوں استدلال کیا تھا کہ اگر اعادہ تسلیم کرلیا جائے تو اس سے قرآن کریم کے مضمون کی مخالفت لازم آتی ہے جس میں دو دفعہ کی حیات اور دو ہی دفعہ کی موت کا ذکر ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ''واما استدلالہ بقولہ تعالیٰ قَالُوْا رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فلا ینفی ثبوت ھذہ الاعادۃ العارضۃ للروح فی الجسد کما ان قتیل بنی اسرائیل الذی احیاہ اللہ بعد قتلہ ثم اماتہ لم تکن تلک الحیاۃ العارضۃ لہ للمسئلۃ معتدا بھا فانہ حی لحظۃ بحیث قال فلان قتلنی ثم خر میتا علی ان قولہ ثم تعاد روحہ فی جسدہ لا یدل علی حیاۃ مستقرۃ وانما یدل علی اعادۃ لھا الی البدن وتعلق بہ والروح لم تزل متعلقۃ ببدنھا وان بلی وتمزق'' (کتاب الروح ص ۵۲، ۵۳)

''بہرحال ان کا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کہ وہ کہیں گے: اے ہمارے رب تو نے ہمیں دو مرتبہ مارا اور دو دفعہ زندہ کیا تو یہ استدلال روح کے جسم کی طرف عارضی طور پر (سوال وغیرہ کے لئے) اعادہ کی نفی نہیں کرتا۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے مقتول (عامیل نامی شخص) اس کے قتل کے بعد اللہ تعالیٰ نے زندہ کیا اور پھر اس کو ماردیا تھا۔ یہ عارضی حیات جو محض سوال کے لئے تھی کوئی معتد بہ نہ تھی۔ کیونکہ وہ ایک لحظہ کے لئے زندہ ہوا اور اس نے یہ کہا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے پھر مردہ ہوکر گر پڑا۔ (اسی طرح سوال نکیرین کے وقت حیاۃ لوٹائی جاتی ہے پھر یہ کیفیت نہیں رہتی) علاوہ اس کے آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ پھر اس کی رُوح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے دائمی اور مستقر حیات پر دلالت نہیں کرتا۔ یہ تو صرف اس پر دلالت کرتا ہے کہ رُوح بدن کی طرف لوٹائی جاتی ہے اور اس سے متعلق ہوتی ہے اور رُوح ہمیشہ بدن سے متعلق رہتی ہے۔ اگرچہ وہ بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہوجائے۔''

یہ عبارت بھی بالکل واضح ہے کہ رُوح کا اس بدن سے تعلق رہتا ہے جو عنصری ہے۔ کیونکہ بوسیدہ اور ریزہ ریزہ وہی ہوتا ہے اور یہ تعلق بدستور ہمیشہ رہتا ہے۔ اگرچہ جسم عنصری ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ ہو جائے اور ان کی اس عبارت میں پہلے جواب سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ سوالِ نکیرین کے وقت گو عارضی سہی مگر رُوح کے جسم کی طرف اعادہ کی وجہ سے حیات کاملہ اور مطلقہ حاصل ہو جاتی ہے جیسے مقتول بنی اسرائیل کو حاصل ہوئی تھی اور دوسرے جواب کے الفاظ بھی اس کے مؤید ہیں۔ جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں اور ساتھ ہی تصریح موجود ہے کہ رُوح کے بدن کی طرف لوٹنے اور روح کے ریزہ ریزہ سے تعلق میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے اور یہ صرف قیاسی بات ہی نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ثم تعاد روحه فی جسده اس پر دال ہے۔

(۷) زنادقہ اور ملاحدہ کے شبہات کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''واما عصرة القبر حتى تختلف بعض اجزاء الموتى فلا يرده حِسّ ولا عقل ولا فطرة ولو قدر ان احدًا نبش عن ميّت فوجد اضلاعه كما هى لم تختلف لم يمنع ان تكون قد عادت الى حالها بعد العصرة فليس مع الزنادقة والملاحدة الا مجرد تكذيب الرسول'' (کتاب الروح ص ۸۱)

''بہرحال قبر کی تنگی بایں طور کہ مُردوں کے بعض اجزاء (مثلاً پسلیاں) آر پار ہو جاتے ہیں تو اس کو نہ تو حِس اور عقل کو رَد کرتی ہے اور نہ فطرت اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ کسی نے میّت کی قبر اُکھاڑی اور اس کو مُردہ کی پسلیاں ویسے ہی نظر آئیں جیسے تھیں جو آر پار نہیں ہوئیں تو اس میں کوئی مانع نہیں کہ وہ قبر کی تنگی کے بعد اسی حالت پر لوٹ گئی ہوں، جیسے پہلے تھیں۔ الغرض زندیقوں اور ملحدوں کے پاس اس کے سواء اور کچھ نہیں کہ وہ جناب رسول خدا (ﷺ) کی تکذیب کرتے ہیں۔

پوچھئے حافظ ابن القیم رحمہ اللہ (رئیس المؤحدین) سے کہ حضرت آپ کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ آپ زنادقہ اور ملاحدہ کے ساتھ جسم عنصری کے اعضاء کے آر پار ہونے اور حِسّی قبر اور گڑھے کے بارے میں اُلجھ رہے ہیں، ان کو قبر اکھاڑنے کے بغیر یوں کیوں نہیں فرما دیتے کہ بھیا زندیق! قبر تو اس گڑھے کا نام ہی نہیں ہے اور نہ پسلیاں جسم عنصری کی آر پار ہوتی ہیں۔ یہ معاملہ تو غیر محسوس برزخ اور جسد مثالی کا ہے۔ اے بھیا ملحد! تم نے وہ کب دیکھا ہے جس کے بارے میں خواہ مخواہ ہم سے اُلجھ رہے ہو۔

(۸) حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے برزخ کے بارے میں شاذ اقوال اور ان کے قائلین کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے: ''وان البدن لا ينعم ولا يعذب فجميع هؤلاء الطوائف ضلال فى امر البرزخ''

''(ان کا یہ بھی خیال ہے) کہ بدن کو نہ راحت ملتی ہے اور نہ سزا مگر یہ تمام فرقے برزخ کے معاملہ میں گمراہ ہیں۔'' (کتاب الروح ص ۶۳)

(۹) حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نعیم قبر اور عذاب قبر کے بارے بعض فرقوں کا مسلک بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''هل النعيم والعذاب يقع على اجزاء الجسد او جزء منه اما عجب او غيره فيخلق الله فيه الالم واللذة اما بواسطة رد الحيوة اليه كما قاله بعض ارباب هذا القول او بدون رد الحيوة كما قاله الآخرون منهم فهؤلاء عندهم لا عذاب فى البرزخ الا على الاجساد و مقابلهم من يقول ان الروح لا تعاد الى الجسد بوجه ولا

تتصل بہ و العذاب و النعیم علی الروح فقط و السنۃ الصریحۃ المتواترۃ ترد قول ھؤلاء و ھؤلآء و تبیّن ان العذاب علی الروح و الجسد مجتمعین و منفردین'' (کتاب الروح ص ۱۴۲)

''کیا راحت و عذاب تمام اجزاء جسم پر واقع ہوتے ہیں یا اس کی جزو پر؟ دُم گزہ پر یا اس کے علاوہ؟ بایں طور کہ اللہ تعالیٰ اس میں الم اور لذت پیدا کر دیتا ہے یا تو زندگی لوٹا کر جیسا کہ اس نظریہ کے بعض ارباب کا قول ہے یا بغیر ردِ حیات کے جیسا کہ ان میں سے بعض کا قول ہے۔ سو ان کے نزدیک برزخ میں عذاب صرف اجسام پر ہوتا ہے اور ان کے مقابل کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ روح جسم کی طرف کسی طرح بھی نہیں لوٹائی جاتی اور نہ اس کے ساتھ اتصال ہوتا ہے اور تکلیف و راحت صرف رُوح کو ہوتی ہے اور سنت صریحہ متواترہ ان کا قول بھی رد کرتی ہے اور ان کا بھی اور واضح کرتی ہے کہ عذاب روح اور جسم دونوں پر ہوتا ہے، اجتماعاً بھی اور انفراداً بھی۔''

موصوف کی باقی عبارت تو بالکل واضح ہے مگر آخر کا جملہ مجتمعین و منفردین قابل تشریح ہے، حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اور ان کے شیخ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبر اور برزخ میں راحت و تکلیف رُوح اور بدن دونوں کے لئے تسلیم کرتے اور اس پر اپنے معلومات کی بناء پر زبردست دلائل پیش کرتے ہیں جن میں سے بعض قارئین کرام نے ملاحظہ کر لئے ہیں لیکن ان کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر احیاناً رُوح بدن سے الگ بھی ہو جائے تو اُس حال میں انفرادی طور پر رُوح کو عذاب ہوتا ہے۔ (اور غالباً ایسی ہی عبارات سے بعض حضرات کو ان کے اقوال سے شبہ ہوا ہے)

چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''بل العذاب و النعیم علی النفس و البدن جمیعًا باتفاق اھل السنۃ و الجماعۃ تنعم النفس و العذاب علیھما تعذب منفردۃ من البدن و تنعم و تعذب متصلۃ بالبدن و البدن متصل بھا فیکون النعیم و العذاب علیھما فی ھذہ الحال مجتمعین کما تکون علی الروح منفردۃ عن البدن'' (کتاب الروح ص ۶۲)

''بلکہ عذاب و راحت اہل السنۃ والجماعۃ کے اتفاق سے روح اور بدن دونوں پر وارد ہے رُوح کو بدن سے الگ بھی سزا اور راحت ہوتی ہے اور بدن کے ساتھ متصل ہو کر بھی اور بدن رُوح کے ساتھ متصل ہوتا ہے تو اس حال میں راحت و عذاب دونوں پر اجتماعی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ کارروائی رُوح پر بدن سے الگ ہونے کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔''

اور خود حافظ ابن القیم رحمہ اللہ باطل اقوال نقل کرنے اور ان کے رد کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: ''فلتعلم ان مذھب سلف الامۃ و ائمتھا ان المیّت اذا مات یکون فی نعیم او عذاب و ان ذٰلک یحصل لروحہ و بدنہ و ان الروح تبقٰی بعد مفارقۃ البدن منعمۃ او معذبۃ و انھا تتصل بالبدن احیانًا و یحصل لہ معھا النعیم و العذاب''

''تو جان لے کہ سلف اُمت اور اس اُمت کے اماموں کا مذہب یہ ہے کہ میّت کو راحت اور سزا ہوتی ہے اور یہ اس کے رُوح اور بدن دونوں کو حاصل ہوتی ہے اور رُوح کو بدن سے جدا ہونے کے بعد بھی راحت و سزا ہوتی ہے اور رُوح بدن کے ساتھ بھی احیاناً متصل ہوتی ہے اور اس حالت میں بدن اور رُوح دونوں کو راحت و سزا ہوتی ہے۔''

(کتاب الروح ص ۶۳، ۶۴)

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ علمی طور پر بڑی شخصیتیں ہیں اور ہم ان کا احترام کرتے ہیں لیکن باوجود کمال جستجو اور تفحص کے ہمیں کوئی ایسی صحیح اور صریح روایت یا کوئی ایسی قابلِ قبول عقلی دلیل نہیں مل سکتی جس سے یہ ثابت ہو کہ قبر میں راحت و تکلیف شروع ہونے کے بعد رُوح کی بدن یا بدن کے (ریزہ ریزہ) اجزاء سے جدائی اور علیحدگی بھی ہوتی ہے۔ اگر ان حضرات کے نزدیک کسی وقت رُوح کی بدن سے کلیۃً جدائی کی کوئی دلیل ہے جس کی بناء پر وہ افتراق کے قائل ہیں تو ان کے نزدیک صرف اس حالت میں روح کو بدن سے الگ تسلیم کر کے بھی سزا اور راحت ہو سکے گی۔ ورنہ یہ دونوں بزرگ اہل السنت والجماعت کا اجماع اور ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم کا اتفاقی نظریہ یہ بتاتے ہیں کہ عذاب و راحت کے سلسلہ میں بدن اور رُوح دونوں شریک ہیں اور اس پر وہ احادیث صریحہ اور متواترہ کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس میں کوئی شک نہیں۔

(۱۰) یہی حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ عذاب و نعیم اور سوال قبر پر طویل بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

''ومعلوم ان ھذا کلہ للجسد بواسطۃ الروح'' (کتاب الروح ص ۷۰)

''یہ ایک معلوم بات ہے کہ یہ ساری کارروائی جسم کے لئے ہے مگر بواسطۂ رُوح۔''

یہ عبارت بھی اپنے مفہوم و مدلول کے لحاظ سے بالکل واضح اور روشن ہے۔

یہ سب عبارات حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور اور معتبر کتاب ''کتاب الروح'' کی ہیں جو بالفاظہا ہم نے عرض کر دی ہیں ان کی موجودگی میں یہ دعویٰ کرنا کہ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ قبر میں بدن سے رُوح کے اتصال اور تعلق کے قائل نہیں یا یہ کہ وہ بدن اور جسد سے بدن مثالی مراد لیتے ہیں یا یہ کہ شہداء کرام رحمۃ اللہ علیہم کو سواری کے طور پر جو پرندے مرحمت ہوتے ہیں، ان کے نزدیک وہ ابدان مثالیہ ہیں یا یہ کہ وہ عودالروح الی البدن کے قائل نہیں یا یہ کہ وہ حِسّی قبر اور گڑھے کو قبر کہتے ہی نہیں یا یہ کہ وہ عودالروح الی البدن کی وجہ سے علم و شعور اور اَلم و راحت کے ادراک کے درجہ میں بھی فی الجملہ حیات کے قائل نہیں یا یہ کہ وہ جسم عنصری کے ذرّات اور ریزوں سے رُوح کے تعلق کے قائل نہیں یا یہ کہ وہ بدن سے رُوح کے کلیۃً انقطاع کے قائل ہیں یا یہ کہ وہ اَرواح کو علیین جنت اور آسمانوں یا سجین ہی میں تسلیم کرتے اور ان کا تعلق ابدان یا ان کے ذرّات سے تسلیم نہیں کرتے یا یہ کہ وہ عذاب و راحت ہمہ وقت صرف رُوح کے لئے تسلیم کرتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کی تمام وہ غلط باتیں جو ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں ان واضح اور صریح عبارات کے پیش نظر سراسر باطل ہیں مشہور ہے ۔

''شنیدہ کے بود مانند دیدہ''

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ علامہ ابن حزم وغیرہ کے اس نظریہ کی پُرزور تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الاحادیث الصحیحۃ المتواترۃ تدل علی عوْد الروح الی البدن وقت السوال والسوال للبدن بلا روح قول طائفۃ من الناس و انکرہ الجمہور و قابلہم آخرون فقالوا السوال للروح بلا بدن و ھذا قالہ ابن میسرۃ و ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ و کلاھما غلط والاحادیث الصحیحۃ تردہ و لو کان ذٰلک علی الروح فقط لم یکن للقبر بالروح اختصاص'' (شرح حدیث النزول ص ۱۵۱، کتاب الروح ص ۶۲)

''صحیح اور متواتر حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ سوال کے وقت روح بدن کی طرف لوٹائی جاتی ہے اور روح کے بغیر بدن سے سوال کا لوگوں میں صرف ایک طائفہ قائل ہے لیکن جمہور اس کے منکر ہیں اور ان کے

مقابلہ میں کچھ اور لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ سوال صرف رُوح سے ہوتا ہے اور بدن کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یہ ابن میسرہ رحمہ اللہ اور ابن حزم رحمہ اللہ کا قول ہے مگر یہ دونوں قول باطل ہیں اور صحیح حدیثیں ان کو رد کرتی ہیں اور اگر یہ کارروائی صرف رُوح ہی کو پیش آتی تو رُوح کے قبر کے ساتھ اختصاص کا کوئی معنی نہ ہوتا۔

نواب صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ اسی عبارت کے پیش نظر لکھتے ہیں کہ: ''احادیث متواترہ اندبر آں کہ عود می کند روح بسوئے بدن وقت سوال و ایں تعلق ھمیشہ می ماند اگر چہ جسد جاں دریدہ و متفرق و منقسم گردد و سوال بدن بلا روح قول طائفہ است و جمھور انکارش کردہ اند و دیگر در برابر ایشاں گویند کہ سوال روح را بلا بدن است و ایں غلط فاحش است ورنہ قبر را بداں اختصاص نہ باشد''

(التنکیت فی شرح الباب التثبیت ص ۲۳، طبع ۱۲۹۲ھ)

اور عذاب اور نعیم قبر پر بحث کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''بل العذاب والنعیم علی النفس والبدن جمیعًا باتفاق اهل السّنة والجماعة'' (شرح حدیث النزول ص ۱۵ وکذا فی کتاب الروح ص ۶۲)

''بلکہ عذاب اور راحت و آرام روح اور بدن دونوں کو حاصل ہوتا ہے اور تمام اہل السنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے۔''

اور عذاب قبر کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''ولهذا صار بعض الناس الی ان عذاب القبر انما هو علی الروح فقط کما یقوله ابن مسرة وابن حزم وهذا قول منکر عند عامة اهل السّنة والجماعة وصار آخرون یحتجون بالقدرة وبخبر الصادق ولا ینظرون الی ما یعلم بالحِسّ والمشاهدة وقدرة الله حق وخبر الصادق حق لکن الشأن فی فهمه واذا عرف ان النائم یکون نائمًا وتقعد روحه وتقوم وتمشی وتذهب وتتکلم وتفعل افعالاً واموراً باطن بدنه مع روحه ویحصل لبدنه وروحه بها نعیم وعذاب مع انّ جسدهٗ مضطجع وعینیه مغمضة وفمه مطبق واعضائه ساکنة وقد یتحرک بدنه لقوة الحرکة الداخلة وقد یقوم ویمشی ویتکلم ویصیح لقوة الامر فی باطنه وکان هذا مما یعتبر به امر المیّت فی قبره فان روحه تقعد وتجلس وتسأل وتنعم وتعذب وتصحیح وذلک متصل ببدنه مع کونه مضطجعًا فی قبره''

''اور بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ عذاب قبر صرف رُوح کو ہوتا ہے جیسا کہ ابن میسرۃ اور ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں اور یہ قول اکثر اہل سنت والجماعت کے نزدیک مردود ہے اور دوسرے حضرات اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مُخبر صادق کی خبر سے احتجاج کرتے ہیں اور حِس اور مشاہدہ کی طرف وہ نہیں دیکھتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی حق ہے اور صادق کی خبر بھی حق ہے لیکن معاملہ اس کے سمجھنے کا ہے اور جب یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ سونے والا خوابیدہ ہوتا ہے اور اس کی روح بیٹھتی اور اُٹھتی چلتی اور پھرتی، بولتی اور کئی قسم کے افعال اور معاملات بدن کے اندر ہی کرتی ہے اور اس کے بدن اور رُوح کو راحت وکلفت حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ اس کا جسم پڑا رہتا ہے اور اس کی آنکھیں اور منہ بند ہوتا ہے اور اس کے اعضاء ساکن ہوتے ہیں اور کبھی داخلی حرکت کی قوت کی وجہ سے بدن بھی حرکت کرتا ہے اور کبھی اُٹھتا اور چلتا ہے اور کبھی بولتا اور آواز کرتا ہے۔ کیونکہ اندر خاصی قوت ہوتی ہے اس سے قبر میں میت کا معاملہ بھی بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کی رُوح اُٹھائی اور بٹھائی جاتی ہے اور اس سے سوال کیا جاتا ہے اور اس کو راحت و تکلیف حاصل ہوتی ہے اور وہ آواز کرتی ہے اور رُوح بدن سے متصل ہوتی ہے۔

حالانکہ بدن قبر میں پڑا رہتا ہے۔'' (شرح حدیث النزول ص ۸۸)

اور نیز حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اختلاف اضلاع کی حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: ''فقد صرح الحدیث باعادۃ الروح الی الجسد وباختلاف اضلاعہ وھذا بین فی ان العذاب علی الروح والبدن مجتمعین'' (فتاوی ج ۴ ص ۲۸۹ ومثلہ فی کتاب الروح ص ۶۶)

''بلاشبہ اس حدیث میں روح کے جسم کی طرف اعادہ اور پسلیاں آر پار ہونے کی تصریح ہے اور اس میں بالکل روشن دلیل ہے کہ عذاب روح اور بدن دونوں پر ہوتا ہے۔''

ان صریح اقتباسات سے یہ معاملہ واضح ہو جاتا ہے کہ قبر میں رُوح کا جسم کے ساتھ اتصال ربط اور تعلق تو ہوتا ہے لیکن اکثر اوقات جسم بالکل ساکن اور ساکت رہتا ہے اور بایں ہمہ عذاب وآرام بدن اور روح دونوں کو حاصل ہے جیسے سونے والے کا معاملہ ہے کہ بظاہر اس کا جسم اور اعضاء تو ساکن رہتے ہیں لیکن خواب میں اس کی رُوح جو خوشی اور غمی دیکھتی ہے، اس سے بدن کو بھی راحت وتکلیف حاصل ہوتی ہے۔ ہاں! زیادہ خوشی اور غمی کی وجہ سے اس کا بدن حسّی طور پر بھی رُوح کی طرح اس خوشی اور غمی کے آثار سے جسا متاثر ہوتا ہے۔ احتلام کی صورت میں لذت اور خوف وہراس اور مار پٹائی کی وجہ سے بدن پر تکلیف ظاہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ اور حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ وغیرہ کی عبارات سے اس کی مزید تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

امام سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وقال ابن تیمیۃ الاحادیث متواترۃ علی عود الروح الی البدن وقت السوال وسوال البدن بلا روح قول طائفۃ منھم ابن الزاغونی وحکی عن ابن جریر وانکرہ الجمھور وقابلھم آخرون فقالوا السوال للروح بلا بدن قالہ ابن حزم وآخرون منھم ابن عقیل وابن الجوزی وھو غلط والا لم یکن للقبر بذلک اختصاص'' (شرح الصدور ص ۶۰، طبع مصر)

''ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سوال کے وقت روح کے بدن کی طرف لوٹنے کی حدیثیں متواتر ہیں رُوح کے بغیر بدن سے سوال ایک طائفہ کا قول ہے جن میں ابن زاغونی بھی ہیں اور ابن جریر (الکرّامی) سے بھی اس کی حکایت کی گئی ہے مگر جمہور نے اس کا انکار کیا ہے اور ان کے مقابلہ میں کچھ اور لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ سوال بدن کے بغیر صرف روح سے ہوتا ہے۔ ابن حزم رحمہ اللہ، ابن عقیل رحمہ اللہ اور ابن الجوزی رحمہ اللہ وغیرہ کچھ اور لوگوں نے ایسا ہی کہا ہے لیکن ان کا یہ خیال غلط ہے اگر معاملہ صرف رُوح کا ہی ہوتا تو پھر قبر سے اس کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔''

مؤلف ندائے حق نے (ص ۱۶۰) ابن حزم رحمہ اللہ، ابن الجوزی رحمہ اللہ اور ابن عقیل رحمہ اللہ کا یہ حوالہ تو دیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ''وھو غلط'' کے الفاظ سے آخر تک بالکل ہضم کر گئے ہیں۔ ابن الزاغونی کا نام علی بن عبید اللہ کنیت ابو الحسن اور فقہی نسبت الفقیہ الحنبلی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ولہ تصانیف فیھا اشیاء من بحوث المعتزلۃ بدعوہ بھا لکونہ نصرھا وماھذا من خصائصہ ھل قلَّ من امعن النظر فی علم الکلام الا واداہ اجتھادہ الی القول بما یخالف محض السنۃ ولھذا ذم علماء السلف النظر فی علم الاوائل فان علم الکلام مولد من علم الحکماء الدھریۃ''

''ان کی کئی تصانیف ہیں جن میں معتزلہ کی ابحاث سے کئی چیزیں درج ہیں جن کی وجہ سے علماء نے ان کو

بدعتی قرار دیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے ان ابحاث میں معتزلہ کی تائید کی ہے اور یہ صرف انہی کی خصوصیات میں سے نہیں بلکہ ایسے لوگ بہت کم ہیں جنہوں نے علم کلام کی گہرائیوں میں نگاہ دوڑائی ہو اور ان کے اجتہاد نے انہیں خالص سنت کی مخالفت تک نہ پہنچایا ہو۔ اسی لئے علماء سلف نے پہلے لوگوں کے علم میں نظر کرنے کی مذمت کی ہے۔ کیونکہ ان کا علم کلام حکماء دھریہ کے علم سے پیدا ہوا ہے۔'' (لسان المیزان ج ۴ ص ۲۴۲)

اسی ابن زاغونی کا سہارا مؤلف ندائے حق اور اقامۃ البرہان نے (ملاحظہ ہو ص ۲۶۰) لیا ہے۔ فوا اسفا!

علامہ داؤد بن سلیمان البغدادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وان عذاب القبر حق وانه علی الروح والجسم الذی فیه الحد'' (المنحۃ الوھبیۃ ص ۳، طبع استنبول)

''بلاشبہ قبر کا عذاب حق ہے اور یہ عذاب روح اور اس جسم پر ہوتا ہے جس جسم کو لحد اور قبر میں دفن کیا جاتا ہے۔ (یعنی جسد عنصری)

اور قاضی محمد بن علی الشوکانی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۵۰ھ) حیات فی القبور کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وقد وردت بذلک احادیث کثیرة بلغت حد التواتر'' (نیل الاوطار ج ۴ ص ۹۷)

''کہ اس کے بارے میں بکثرت حدیثیں وارد ہوئی ہیں جو تواتر کے درجہ کو پہنچتی ہے۔''

ایک طرف ان حضرات کی یہ صریح عبارات بھی ملاحظہ فرمائیں اور دوسری مؤلف اقامۃ البرہان کا یہ باطل نظریہ بھی دیکھتے جائیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''باقی انبیاء علیہم السلام شہداء کرام اور مؤمنین کو برزخ میں جو نعیم و راحت حاصل ہوتی ہے، وہ صرف ان کی رُوحوں کو ہے۔ ابدان عنصریہ اس میں شریک نہیں ہیں۔ (اقامۃ البرہان ص ۱۹۸)

لا حول ولا قوة الّا باللہ!

امام قاسم بن قطلو بغا الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۷۹ھ) لکھتے ہیں کہ: ''قال الامام القونوی رحمہ اللہ اختلفوا فی انه یخلق فیه حیوة مطلقة کحیاته قبل الموت او حیوة بقدر ما یحسّ الالم والصحیح هذا''

''امام قونوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بات میں اختلاف ہے کہ کیا مُردہ میں حیات مُطلقہ پیدا کی جاتی ہے جس سے دُکھ (وغیرہ) کا احساس کر سکے؟ صحیح بات دوسری ہے۔'' (شرح المسایرۃ للقطلو بغا ج ۲ ص ۱۱۶، طبع مصر)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ قبر میں مُردہ کو مطلق اور کامل حیات حاصل نہیں ہوتی جیسی حیات موت سے پہلے اس کو دنیا میں حاصل تھی بلکہ اس انداز کی حیات اس کو حاصل ہوتی ہے جس سے عذاب وکلفت کا احساس ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نہ تو اس حیات کا احساس کر سکتے ہیں اور نہ اس کی پوری حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں۔

علامہ سیّد محمود آلوسی مفتی بغداد الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۷۰ھ) اپنی بے نظیر تفسیر میں شہداء کی حیات پر بحث کرتے ہوئے یہ بھی ارقام فرماتے ہیں کہ: ''واختلف فی هذه الحیوة فذهب کثیر من السلف الی انها حقیقة بالروح والجسد ولکنا لاندر کها فی هذه النشأة'' (روح المعانی ج ۲ ص ۱۷)

''اور اس حیات کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے اور بلاشبہ بہت سے سلف صالحین رحمہم اللہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ حقیقۃً حیات ہے جو رُوح اور جسم دونوں کے ساتھ ہوتی ہے لیکن ہم اس دور اور حالت میں اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔''

مطلب واضح ہے کہ قبر کی زندگی اگر مطلق اور کامل زندگی ہوتی جس طرح دنیا میں ہوتی ہے تو اس کا ادراک تو ہر شخص کرسکتا ہے مگر چونکہ وہ حیات اس معمور حیات سے متفاوت ہے اور ایک گونہ اور نوع من الحیوۃ ہے۔ اس لئے ہمارے ادراک سے وہ بالاتر ہے۔ ہاں احیاناً کسی کو اس کا ادراک کرادیا جائے تو اس کا کون منکر ہے؟ جس طرح قبر کی حیات اہل دنیا کے احساس وادراک سے بالاتر ہے۔ اسی طرح ان کی راحت وکلفت بھی اہل دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے وہ اگر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بھی دیکھیں کہ تو ان کو اس کا مشاہدہ نہیں ہوسکتا۔

علامہ سید محمود آلوسی الحنفی رحمہ اللہ مفتی بغداد نے پہلے یہ لکھا تھا: ''وعندی ان الحیاۃ فی البرزخ ثابتۃ لکل من یموت من شھید وغیرہ وان الارواح وان کانت جواھر قائمۃ بانفسھا مغایرۃ لما یحس بہ من البدن لکن لا مانع من تعلقھا ببدن برزخی مغایر لھذا البدن الکثیف الیٰ ان قال واما القول نیاۃ ھذا الجسد الرمیم مع ھدم بنیتہ وتفرق اجزائہ و ذاب ھیئتہ وان لم یکن ذٰلک بعیدًا عن قدرۃ من یبدأ الخلق ثم یعیدہ لکن لیس الیہ کثیر حاجۃ ولا فیہ مزید فضل ولا عظیم منۃ بل لیس فیہ سوی ایقاع ضعفۃ المؤمنین بامشکوک والاوھام وتکلیفھم من غیر حاجۃ بالایمان بما یعدون قائلہ من سفھہ الاحلام'' (شرح روح المعانی ج ۲ ص ۲۱)

''اور میرے نزدیک حیات فی البرزخ ثابت ہے ہر مرنے والے کے لئے شہید ہو یا غیر شہید اور ارواح اگرچہ جواہر قائم بنفسہا ہیں، اس محسوس بدن کے علاوہ اور مغایر، لیکن ان کے ایک بدن برزخی سے تعلق ہونے سے کوئی مانع نہیں۔ (پھر آگے فرمایا) اور لیکن قول کرنا ساتھ حیات اس جسم رمیم کے باوجود اس کی بنیاد ٹوٹ پھوٹ جانے کے اور اس کے اجزاء کے بکھر جانے کے اور اس کی ہیئت (کذا ئیہ) کے چلے جانے کے اگرچہ اس اللہ کی قدرت سے بعید نہیں جو پہلی پیدائش کررہا ہے اور پھر (روز محشر میں) اسی کو لوٹائے گا اور انہیں بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرے گا لیکن نہ تو اس قول کی طرف کوئی بڑی حاجت ہے اور نہ اس قول میں کوئی بڑی فضیلت ہے اور نہ (شہداء پر) بڑا احسان بلکہ اس قول میں اس کے سواء اور کچھ نہیں کہ کمزور ایمان والوں کو شکوک اور اوھام میں ڈال دیں اور بلاضرورت ان کو تکلیف دیں ایسی چیز کے ماننے کی جس کے قائل کو وہ بے وقوف قرار دیتے ہیں۔''

اس عبارت کا یہ ترجمہ بلفظہٖ ہم نے ''تسکین القلوب'' (ص ۶۵،۶۶) سے نقل کیا ہے اور رُوح المعانی کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد مؤلف تسکین القلوب نے راقم کو بلا وجہ خوب کوسا ہے اور لکھتے ہیں کہ: ''مولوی صاحب ناظرین کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے اس عبارت کو ہضم کرگئے اور یہ مغالطہ دیا کہ صاحب روح بھی مولوی صاحب کا ہم نوا ہے۔'' (تسکین القلوب ص ۶۷)

بے شک علامہ آلوسی رحمہ اللہ کا پہلے یہی نظریہ تھا کہ لیکن تحقیق کے بعد اس کو ترک کرکے انہوں نے بعد کو جمہور کا ساتھ دیا ہے اور حضرات صوفیہ اور جمہور کے قول میں تطبیق دی ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: ''و تحقیقۃ فی شرح الشمائل للعلامۃ ابن حجر رحمہ اللہ ثم اعلم ان اتصال الروح بالبدن لا یختص بجزء دون جزئٍ بل ھی متصلۃ مشرقۃ علٰی سائر اجزائہ و ان تفرقت و کان جزء بالمشرق و جزء بالمغرب و لعل ھذا الاشراق علی الاجزاء الاصلیۃ لانھا التی یقوم بھا الانسان من قبرہٖ یوم القیمۃ علٰی ما اختارہ جمع و اعلم ایضاً ان الروح علٰی القول بتجردھا لا مستقر لھا بل لا یقال انھا داخل العالم او خارجہ کما سمعت و انما المستقر حینئذٍ البدن الذی تتعلق بہ و قد نص بعض الصوفیۃ علی انہ

لامانع من ان تتعلق نفس ببدنین فاکثر بل ھو واقع عندھم و ذکر بعضھم ان احدالبدنین ھو البدن الاصلی والآخر مثالی یظھر للعیان علی وجہ خرق العادۃ'' (روح المعانی ج ۱۵ ص ۱۶۳)

''اس کی تحقیق علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کی شرح شمائل میں ہے پھر تو جان لے کہ رُوح کا بدن کے ساتھ اتصال یوں مختص نہیں کہ کسی ایک جزو کے ساتھ ہو اور دوسری سے نہ ہو بلکہ یہ بدن کے تمام اجزاء کے ساتھ متصل ہے اور اس کا تمام اجزاء پر پَرتو پڑتا ہے۔ اگر چہ وہ اجزاء متفرق ہو چکے ہوں اور ایک جزو مشرق میں اور دوسری مغرب میں ہو اور شاید کہ رُوح کا یہ پرتو اصل اجزاء پر، کیونکہ یہی وہ اجزاء ہیں جن کے ساتھ انسان قیامت کے دن قبر سے اُٹھے گا۔ جیسا کہ ایک بڑی جماعت نے اس کو اختیار کیا ہے۔ (مولوی عبدالحق حقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''انسان کے اجزاء اصلیہ وہی ذرّات ہیں کہ جو حضرت آدم علیہ السلام بھی پشت سے عہد لینے کے لئے نکالے گئے تھے...... پس روح کا تعلق بعداز مرگ انہی اجزاء اصلیہ وذرّات کے ساتھ ہے۔'' (عقائد اسلام بحوالہ ندائے حق ص ۱۶۲) اور نیز تو جان لے کہ اس قول کی بناء پر کہ روح مجرّد ہے اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں بلکہ یوں نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عالم میں داخل ہے یا اس سے خارج ہے جیسا کہ تو نے سنا اور پختہ بات ہے کہ رُوح کا مستقر اس وقت وہ بدن ہے جس سے اس کا تعلق ہے اور بعض حضرات صوفیاء کرام رحمہم اللہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ کوئی مانع نہیں کہ رُوح دو بدنوں (بدن عنصری و بدن مثالی) اور ان سے زیادہ متعلق ہو بلکہ ان کے نزدیک یہ واقع اور ثابت ہے اور ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ دو بدنوں میں سے ایک بدن اصلی (عنصری و مادّی) ہے اور دوسرا مثالی ہے جو خرقِ عادت کے طور پر مشاہدہ کے لئے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔''

علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے صراحت سے معلوم ہوا کہ بدن اصلی وعنصری کے ساتھ رُوح کا باقاعدہ تعلق رہتا ہے۔ اگر چہ وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور ایک جزو مشرق میں اور دوسری مغرب میں چلی جائے۔ لہٰذا ان کی پہلی عبارت سے ان کا مختار مذہب یہ ثابت کرنا (جیسا مؤلف تسکین القلوب نے ص ۶۷ میں کیا ہے) کہ وہ روح کے بدن مثالی ہی سے تعلق کے قائل ہیں اور بدن عنصری وخاکی سے تعلق کے قائل نہیں ہیں بالکل غلط ہے۔ اگر ان کا پہلا نظریہ یہی تھا تو اس عبارت سے ان کا رجوع الی قول الجمھور ثابت ہے۔ جیسا کہ پوشیدہ نہیں ہے۔ پھر آگے اپنی تحقیق یہ لکھی ہے کہ رُوح اور نفس ایک ہی شئے ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''البحث الثالث اختلف الناس فی الروح والنفس ھل ھما شیٔ ولاحدام شیئان؟ فحکی ابن زید عن اکثر العلماء انھما شیٔ واحد فقہ صح فی الاخبار اطلاق کل منھما علی الآخر وما اخرجہ البزار بسند صحیح عن ابی ھریرۃ رفعہ ان المؤمن ینزل بہ الموت ویعاین مایعین یرد لو خرجت نفسہ واللہ تعالیٰ یجب لقاءہ وان المؤمن تصعدہ روحہ الی السماء فتاتیہ ارواح المؤمنین فیستخبرونہ عن معارفہ من اھل الدنیا الحدیث ظاھر فی ذٰلک'' (روح المعانی ص ۱۵۷)

''تیسری بحث لوگوں نے اس اَمر میں اختلاف کیا ہے کہ کیا رُوح اور نفس دونوں ایک شئے ہے یا دو ہیں؟ ابن زید رحمہ اللہ نے اکثر علماء سے نقل کیا ہے کہ وہ دونوں ایک شئے ہے بلاشبہ حدیثوں میں ایک کا دوسرے پر اطلاق صحیح اور ثابت ہے محدث بزار رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کی تخریج کی ہے کہ مؤمن پر جب موت آتی ہے اور معائنہ کرتا ہے ان چیزوں کا جن کا بھی معائنہ کرتا ہے تو وہ اس کو پسند کرتا ہے کہ اس کا نفس نکلے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور مؤمن کی روح جب آسمان کی طرف جاتی ہے تو اس کے

پاس مومنوں کی ارواح آتی ہیں اور وہ دنیا میں اپنے پہچاننے والوں کے بارے میں اس سے سوال کرتی ہیں۔ الحدیث! اس سے بالکل ظاہر ہے کہ نفس اور رُوح ایک شئی ہے۔''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جمہور کا یہی قول ہے کہ: ''نفس اور رُوح دونوں ایک ہی شئے ہے۔''
(کتاب الروح ص ۲۶۴)

الغرض قبر اور برزخ میں راحت اور تکلیف رُوح اور بدن دونوں کو حاصل ہوتی ہے لیکن دُنیا والے اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۱۷۶ھ) اپنی بلند پایہ کتاب حجۃ اللہ البالغہ باب ''اختلاف احوال الناس فی البرزخ'' میں لکھتے ہیں کہ: ''و یؤمروا بالتعذیب او التنعیم فیراهم المتبلی عیانا و ان کان اهل الدنیا لا یرونهم عیانا'' (حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۳۶، طبع مصر)

''فرشتوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان کو عذاب یا راحت پہنچائیں۔ مبتلیٰ بہ تو آنکھوں سے ان فرشتوں کو دیکھتا ہے لیکن اہل دنیا ان کو مشاہدۃً نہیں دیکھ سکتے۔''

حیات فی القبور اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ

قبر کی زندگی کے بارے میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کا مسلک بعض حضرات نے غلط سمجھا ہے اور بے جا مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے اور ان کی ایک مجمل عبارت: ''و در قبر اصلاً تعلق روح به بدن نیست'' سے غلط مطلب اخذ کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تسکین القلوب ص ۹۳، وندائے حق ص ۲۳۶)

اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ ہی کی ہے چند عبارات عرض کر دیں تا کہ حقیقت بالکل کھل کر سامنے آجائے اور علمی و تحقیقی طور پر کسی قسم کی کوئی اُلجھن باقی نہ رہے۔ غور وفکر کرنا آپ کا کام ہے۔

(۱) روافض نے دیگر منکرین کی طرح عذاب قبر کے بارے میں ایک اعتراض کیا ہے جس کا جواب حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں سوال وجواب دونوں ان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

''و نیز گویند که مامی بینیم شخصی را که مُرده بر زمین افتاده است یا مصلوب بر جذع مدتے بر آں جذع مانده تا آں که اجزاء او همه متلاشی شده و هرگز دروے حیاتے و قیامے و قعودے و تحرکے و کلامے و سوالے و جوابے و بچیزے از آثار ایں اُمور دریافته نشده بلکه بر سینه او چند دانه خردل پاشیده ایم و آں دانه ها را بحال خود یافته ایم و نیز کافر را بعد از موت تجسس کردیم دوست رسانیدیم اصلاً اثر احراق دروے نمی بینیم جواب ایں شبه از تقریر سابق معلوم شد که الله تعالیٰ روح آں میّت را بقدر یکه ادراک و تالّم و تلذذ از و حاصل شود ببدنے از ابدان عنصریه موجوده یا مثالیه مخترعه متعلق میسازد و ایں کار سر انجام میفرماید و محسوس نبودن ایں حرکات دلالت بر عدمِ وقوع آنها نمیکند زیرا که ذوات و اشخاص ملائکه و جن را بحواس ادراک نمیکنیم چه جائے حرکات و معهذا واقع است بلا شُبه عند المِلیین و نیز نائم در خواب خود می بیند که با زنے خوش شکل جماع میکند و معانقه و بوس و کنار همه بعمل مے آرد حتّٰی که انزال و احتلام هم میشود و تلذذهم برمیدارد و اثر ایں اُمور دیگراں بر بدن او

ادراک نمیکنند و نیز حکماء و فلاسفہ باعانت روحانیات کواکب و حرکات آنہا قائل اند و ہیچکس را محسوس نمی شود چنانچہ از ثابت بن قرہ در باب ثانی نقل آں گذشت و خدائے تعالیٰ قادر است بر آں کہ و انہائے خردل را بر ہیئت خودش باقی دارد و روح آں میّت را باوصفِ تعلقے کہ ببدن خود پیدا کردہ منعم و معذّب کردہ اللہ نہایت کار استبعاد است ''وَهُوَ لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ''

''اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم ایک شخص کو زمین پر مُردہ پڑا ہوا دیکھتے ہیں یا کسی کو کافی مدت تک سولی پر لٹکا یا ہوا دیکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے تمام اجزاء بکھر جاتے ہیں اور اس میں زندگی۔ کھڑے ہونے، بیٹھنے، حرکت کرنے اور کلام اور سوال کرنے و جواب دینے وغیرہ اُمور میں سے کسی کا ہرگز کوئی نشان نہیں پایا جاتا بلکہ ہم نے اس کے سینے پر رائی کے چند دانے بکھیرے لیکن ان دانوں کو اسی حالت میں ہم نے پایا اور نیز کافر کی موت کے بعد ہم نے اس کے جسم کو ٹٹولا اور ہاتھ اس کے بدن تک پہنچایا لیکن اس میں جلانے کا ہرگز کوئی اثر ہم نے نہیں دیکھا۔ (اندریں حالات عذاب قبر کا کیا مطلب) اس شُبہ کا جواب پہلے بیان سے معلوم ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میت کی رُوح کو اس انداز سے کہ ادراک اور تکلیف اور لذت اس سے حاصل ہو اور ابدان عنصریہ میں سے موجودہ بدن کے ساتھ یا مثالی مخترع بدن کے ساتھ متعلق کر دیتا ہے اور اس کام کو سرانجام دیتا ہے اور ان حرکات کا محسوس و مشاہدہ نہ ہونا اس پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ واقع نہ ہوں۔ کیونکہ فرشتوں اور جنّات کی شخصیتوں کا احساس ہم نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ ان کی حرکات کا احساس ہو لیکن بایں ہمہ تمام ملتوں میں بلا شُبہ ان کا وجود مسلّم ہے اور نیز خواب دیکھنے والا نیند کی حالت میں دیکھتا ہے کہ وہ کسی خوب صورت عورت سے جماع کرتا ہے اور اس کو گلے لگاتا ہے اور بوس و کنار وغیرہ سب کام کرتا ہے۔ حتیٰ کہ انزال و احتلام بھی ہوتا ہے اور وہ لذت بھی اُٹھاتا ہے لیکن دوسرے اس کے بدن پر ان اُمور کا اثر و ادراک نہیں کرتے اور نیز حکماء اور فلاسفہ ستاروں کی روحانیات کی اعانت اور ان کی حرکات کے قائل ہیں لیکن کسی کو وہ محسوس نہیں ہوتیں۔ جیسا کہ باب دوم میں قرہ بن ثابت سے اس کی نقل گزر چکی ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ رائی کے دانوں کو اپنی حالت پر باقی رکھے اور اس میت کی روح کا اس کے اپنے بدن کے ساتھ اس انداز سے تعلق پیدا کر دے کہ اس کو راحت و عذاب ہو زیادہ سے زیادہ یہ کارروائی ایک بعید سی معلوم ہو گی لیکن یہ استبعاد نہ تو بعید سمجھنے والے کو موٹا کرتا ہے اور نہ علمی بھوک دُور کرتا ہے۔'' (تحفۂ اثناء عشریہ ص ۳۸۴، ۳۸۵، طبع لکھنؤ)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ راحت و عذاب قبر کے سلسلہ میں جو شبہ پیش کیا گیا ہے اس کے جواب میں ایک شق یہ بھی ہے کہ میت کی رُوح کا اس کے بدن عنصری کے ساتھ تعلق قائم کیا جاتا ہے اور اس تعلق کی بناء پر اس کو قبر کی راحت و تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور دوسروں کو اس کا احساس نہ ہونا اس کے عدم وقوع کی دلیل نہیں اور اس بات کو پھر موصوف نے خواب اور احتلام کی کثیر الوقوع صورت کے ساتھ سمجھانے کی سعی فرمائی ہے۔ ان کی اس صریح عبارت کی موجودگی میں یہ دعویٰ کرنا کہ ان کے نزدیک رُوح کا بدن کے ساتھ بالکل کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایک غیر ذمہ دارانہ حرکت اور خالص مغالطہ ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

(۲) ''ومقام علیین بالائے ہفت آسمان است و پائین آں متصل سدرۃ المنتہیٰ است و بالائے آں متصل بپایۂ راست عرش مجید و ارواح نیکاں بعد از قبض دراں جا میرسند و مقربان یعنی انبیاء و اولیاء دراں مستقر می مانند و عوام و صلحاء را بعد از نویسانیدن و رسیدن نامہائے اعمال برحسب مراتب در آسمان دُنیا یا درمیان آسمان و زمین یا در چاہ

زمزم قرار می دہند و'' تعلقے بہ قبر نیز ایں ارواح را میباشد کہ بحضور زیارت کنندگان و اقارب و دیگر دوستاں بر قبر مطلع ومُستانس'' میگردند زیرا کہ روح را قُرب و بُعد مکانی مانع ایں دریافت نمیشود و مثال آن در وجود انسانی رُوح بصری است کہ ستارہ ہائے ہفت آسمان را در ون چاہ میتو انددید۔'' (تفسیر عزیزی پارۂ عم بتساءلون ص ۱۲۵، طبع حیدری، بمبئی)

''اور علیین کا مقام سات آسمانوں کے اُوپر ہے اور اس کا زیریں حصہ سدرۃ المنتھٰی سے متصل ہے اور اس کا بالائی حصہ عرش مجید کے دائیں پائے کے ساتھ متصل ہے اور نیک لوگوں کی ارواح کو قبض کرنے کے بعد وہاں پہنچایا جاتا ہے اور مقربین یعنی حضرات انبیاء و کرام و اولیاء عظام ﷺ کی ارواح کا مستقر بھی وہی ہے اور عام صلحاء کو وہاں پہنچانے اور ان کے نامۂ اعمال لکھنے کے بعد حسب مراتب آسمان دنیا میں یا آسمان و زمین کے درمیان یا زمزم کے کنوئیں میں لگاتے ہیں اور ان ارواح کا قبر کے ساتھ بھی تعلق ہوتا ہے کہ جو لوگ ان کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور جو ان کے اقارب اور دوسرے دوست حاضر ہوتے ہیں اُن کی آمد سے وہ مطلع اور ان سے مانوس ہوتے ہیں۔ کیونکہ رُوح کے لئے قُرب اور بُعد مکانی اس دریافت سے مانع نہیں ہے اور اس کی مثال وجود انسانی میں رُوح بصری ہے کہ (رصدگاہ کے) کنویں میں ساتوں آسمانوں کے ستارے دیکھے جاسکتے ہیں۔''

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ ارواح کا ٹھکانا کہیں بھی ہو مگر ان کا قبور کے ساتھ بھی تعلق ہوتا ہے اور رُوح کے قُرب بُعد سے اس پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

(۳) مردوں کو قبر میں دفن کرنے کی تائید اور جلانے کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ''و نیز در سوختن بآتش تفریق اجزائے بدن است کہ بسبب آں علاقۂ روح از بدن انقطاع کلی مے پذیرد و آثار ایں عالم ہاں روح کمتر میرسد و کیفیات آں روح بایں عالم کمتر سرایت میکند و در دفن کردن چوں اجزائے بدن بتمامہ یکجا میباشد ''علاقہ روح با بدن از راہ نظر و عنایت بحال میماند'' و توجہ روح بزائرین و مستانسین و مستفیدین بسہولت میشود کہ بسبب تعین مکانِ بدن گویا مکان روح ہم متعین است و آثار ایں عالم از صدقات و فاتحہ ہا و تلاوت قرآنِ مجید چوں دراں بُقعہ کہ مدفن بدن اوست واقع شود بسہولت نافع میشود پس سوختن گویا رُوح را بے مکان کردن است و دفن کردن گویا مسکنے برائے روح ساختن۔'' (تفسیر پارہ عم ص ۶۱، ۶۲، طبع مذکور)

''اور نیز آگ میں جلانے سے بدن کے اجزاء متفرق ہو جاتے ہیں اور اس وجہ سے روح کا تعلق بدن سے کلی طور پر منقطع ہو جاتا ہے اور اس جہان کے آثار اُس روح تک بہت کم پہنچتے ہیں اور اس روح کی کیفیات اس جہان تک کم سرایت کرتی ہیں اور دفن کرنے میں چونکہ بدن کے اجزاء بتمامہا یکجا ہوتے ہیں اس لئے روح کا بدن کے ساتھ تعلق از راہ نظر و عنایت اپنے حال پر رہتا اور رُوح کی توجہ زیارت کرنے والوں اور اُنس حاصل کرنے والوں اور استفادہ کرنے والوں کی طرف آسانی سے ہوتی ہے کہ چونکہ دن بدن کا مکان متعین ہے اس لئے گویا روح کا مکان بھی متعین ہے اور اس جہان کے آثار مثلاً صدقات اور دعائیں اور تلاوت قرآنِ کریم جب اُس خطہ میں ہوگی، جہاں بدن مدفون تو سہولت سے نافع ہوگی۔ پس جلانے میں گویا روح کو بے مکان کرنا ہے اور دفن کرنے میں گویا رُوح کے لئے جگہ اور مسکن بنانا ہے۔''

اس سے بھی یہ بات آشکارا ہوگئی کہ جب تک بدن باقی رہتا ہے روح کا بدن عنصری کے ساتھ تعلق اور ربط بھی باقی رہتا ہے اور جلانے کی صورت میں چونکہ بدن کے اجزاء بالکل متفرق ہو جاتے ہیں۔ اس لئے رُوح کا تعلق بھی اس بدن سے کلیۃً منقطع ہو جاتا ہے اور اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روح کا اصل ٹھکانہ جہاں بھی ہو

مگر قبر میں بدن بھی اس کے لئے ایک مکان کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا روح اپنے اس تعلق کی وجہ سے مکین ہے اور بدن اس کے لئے مکان ہے اور مُردہ کو جلانے کی صورت میں گویا روح کو بے مکان کرنا ہے اور چونکہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ابدان مبارکہ کا اصلی صورت میں موجود ہونا نصِ حدیث سے ثابت ہے اور بعض شہداء اور اولیاء کرام رحمہم اللہ کے اجسام کا موجود ہونا مشاہدہ سے ثابت ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ان کی ارواح مبارکہ کا تعلق ان کے اجسام عنصریہ سے نہ ہو کیونکہ:

عبرت کا ہے محل کہ مکاں ہو مکیں نہ ہو ۔۔۔ دل ہو اور اس میں دردِ محبت کہیں نہ ہو

(۴) ایک مقام پر طویل بحث کے ضمن میں یہ بھی ارقام فرماتے ہیں کہ: ''زیرا کہ ارواح را تعلق بہ بدن خود کہ در قبر مدفون است البتہ میباشد زیرا کہ مدت دراز دریں بدن بودہ اند۔''

''اس لئے کہ ارواح کا اپنے ابدان کے ساتھ جو قبر میں مدفون ہیں، یقیناً تعلق ہوتا ہے۔ کیونکہ مدت دراز تک وہ ارواح ان ابدان میں رہ چکی ہیں۔'' (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۴۳، طبع مجتبائی دہلی)

یہ عبارت بھی اپنے مدلول کے لحاظ سے واضح ہے کہ ابدان کے ساتھ قبور میں ان کی ارواح کا تعلق ایک یقینی اَمر ہے اور ظاہر اَمر ہے کہ موت سے پہلے جن اجسام کے ساتھ ارواح کا تعلق تھا وہ تو اجسام عنصریہ ہی تھے نہ کہ مثالیہ اور اختراعیہ اور انہی اجسام کو قبور میں دفن کیا جاتا ہے اور انہی کے ساتھ ارواح کا تعلق بھی البتہ یقینی بات ہے۔

(۵) توسّل اور شفاعت باہل القبور کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ: ''وبالجملہ بعد ازاں کہ ثابت شد کہ روح باقی است واورا تعلق خاص باجزاء بدن بعد مفارقت از وی وتغیر کیفیت ری نیز باقیست کہ بداں علم وشعور برائرانِ قبر واحوال ایشاں دارد وارواح کمل کہ در حین حیات ایشاں بسبب قرب مکانت ومنزلت از رب العزت کرامات وتصرفات وامداد داشتند بعد از ممات چوں ہماں قُرب باقی اند نیز تصرفات دارند چنانچہ در حین تعلق کلی بجسد داشتند یا بیشتر ازاں انکار استمداد را وجہ صحیح نمی نماید مگر آنکہ از اوّل منکر شوند ای تعلق روح را بہ بدن بالکلیہ وجمیع وجوہ بعد مفارقت وزوال علاقہ حیاتے وآں خلاف منصوص است وبرایں تقدیر زیارت ورفتن بقبور ہمہ لغو وبے معنی گردد وآں امرے دیگر است کہ عامۂ اخبار وآثار دال برخلاف آنست ونیست صورت استمداد مگر ہمیں کہ محتاج طلب کند حاجت خود از جناب عزت الٰہی بتوسل روحانیہ بندہ کہ مقرب ومکرم درگاہ والا است وگوید خداوندا ببرکت ایں بندہ کہ تو رحمت واکرام کردۂ واورا آبرا آوردہ گرداں حاجت مرا یاندا کند آں بندۂ مقرب ومکرم را کہ اے بندۂ خدا دولی وے شفاعت کن مراو بجواہ از خدائے تعالیٰ مطلوب مرا تا قضا کند حاجت مرا پس نیست بندہ درمیان مگر وسیلہ وقادر ومعطی ومسئول پروردگار است تعالیٰ شانہٗ ودروے ہیچ شائبۂ شرک نیست چنانچہ منکر وہم کردہ وآں چنان است کہ توسّل وطلب دعا از صالحان ودوستانِ خدا در حالت حیات کنند وآں جائز است باتفاق۔ پس آں چرا ناجائز باشد فرقے نیست درارواح کاملان در حین حیات وبعد از ممات مگر بترقی کمال۔'' (فتاویٰ عزیزی ج ۲ ص ۱۰۸، طبع مجتبائی دہلی)

''اور خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ روح باقی ہے اور اس کا ایک خاص تعلق اجزاء بدن کے ساتھ اس سے مفارقت اور تغیر کیفیت کے بعد بھی باقی ہے کہ اس تعلق کی وجہ سے اس میں علم وشعور پیدا ہوتا ہے جس سے قبر کی زیارت کرنے والوں اور ان کے احوال سے آگاہی ہوتی ہے اور کامل لوگوں کی اَرواح جن کو اللہ تعالیٰ کے ہاں زندگی میں تقرب ومنزلت حاصل تھی اور کرامات وتصرفات وامداد کرتے تھے، ان کو بعد از وفات

بھی یہ تقرب حاصل ہوتا ہے اور تصرفات کرتے ہیں جس طرح کہ وہ اس وقت کرتے تھے جب کہ ان کے ابدان کے ساتھ ارواح کا کلی تعلق تھا یا اس سے بھی بڑھ کر امداد حاصل کرنے کا انکار کرنے کی کوئی صحیح وجہ معلوم نہیں ہوتی مگر یہ کہ پہلی بات سے انکار کر دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ روح کا تعلق بدن سے بالکلیہ نہیں اور بدن سے مفارقت کے بعد تمام وجوہ سے زندگی کا تعلق زائل ہو چکا ہے اور یہ منصوص کے خلاف ہے اور اس تقدیر پر قبور کی زیارت اور وہاں جانا سب لغو و بے معنی ہو جائے گا اور یہ ایک دوسری بات ہے کہ عام اخبار اور آثار اس کے خلاف ہیں اور مدد طلب کرنے کی صورت اس کے سواء کچھ نہیں کہ محتاج اپنی حاجت اللہ تعالیٰ سے طلب کرے اُس روحانی توسل کے ذریعہ کہ مقبول بندہ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں حاصل ہے اور یوں کہے کہ اے پروردگار اس بندہ کی برکت سے جس پر تو نے رحمت و نوازش فرمائی ہے۔ میری حاجت پوری کر یا یوں کہے کہ اے بندہ خدا اور اللہ تعالیٰ کے ولی میرے حق میں سفارش کر اور اللہ تعالیٰ سے میرے لئے دُعا کر کہ وہ میری حاجت کو پورا کر دے۔ پس بندہ اس صورت میں صرف وسیلہ ہے اور قادر اور دینے والا اور جس سے سوال کیا گیا ہے صرف پروردگار ہے۔ جل شانہٗ اور اس صورت میں شرک کا کوئی شائبہ موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ منکر کو وہم ہوا ہے اور اس قسم کا توسل اور طلب دُعا صالحین اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں سے زندگی میں بالاتفاق جائز ہے۔ پس بعد از وفات کیوں جائز نہیں؟ کیونکہ کامل لوگوں کی ارواح میں زندگی اور بعد از وفات بجز اس کے اور کوئی فرق نہیں کہ مرنے کے بعد ارواح کو ترقی ہوتی ہے۔''

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ روح کا وہ کُلّی تعلق جو جسم کے ساتھ دُنیا میں تھا (یا قیامت کے دن ہوگا) اگرچہ موت کے بعد وہ تو باقی نہیں رہا۔ مگر رُوح کا بدن سے بلکہ بدن کے اجزاء سے ایک ایسا تعلق بدستور باقی رہتا ہے جس سے علم و شعور وغیرہ حاصل ہوتا ہے اور برعکس اس کے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ رُوح کا بدن کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا تو یہ دعویٰ خلافِ منصوص ہے اور ایک اور مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ: ''بالجملہ انکار شعور وادراک اموات اگر کفر نباشد در الحاد بودن او شبہ نیست'' حاصل کلام یہ ہے کہ اگر اموات کے ادراک و شعور کفر نہ ہو تو اس کے الحاد ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔ (فتاویٰ عزیزی ج۱ ص ۸۸)

تصویر کا دوسرا رخ

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کی کتابوں میں ایسے الفاظ اور عبارتیں بھی ملتی ہیں جن سے نظر بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وفات کے بعد روح کا بدن سے تعلق نہیں رہتا اور عذاب و راحت روح کو حاصل ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''مغرب روح است نہ بدن تا بقائے بدن شرط تعذیب باشد۔'' سزا رُوح کو دی جاتی ہے نہ کہ بدن کو تا کہ بدن کا باقی رہنا، سزا دینے کے لئے شرط ہو۔ (تفسیر عزیزی پارہ تبارک ص ۱۳۴ طبع لاہور)

اور ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''ارواح را بعد موت فنا نیست بلکہ انقطاع تعلق بہ بدن است'' اور اَرواح کے لئے موت کے بعد فنا نہیں بلکہ بدن سے انقطاع تعلق ہوتا ہے۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۲ ص ۱۰۵)

اور ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''بلکہ تحقیق آنست کہ معنی حیات تعلق روح بہ بدن است و در قبر اصلاً تعلق روح بہ بدن نیست بلکہ بقائے شعور و ادراک روح را بعد از مفارقت از بدن تعبیر بحیات فرمودہ اند پس حمل حیات قبر بر مجاز متعین است لاغیر۔'' (تفسیر عزیزی ص ۱۷۶، بر حاشیہ قرآن کریم و تسکین القلوب ص ۹۳)

''بلکہ تحقیق یہ ہے کہ حیات کا معنی روح کا بدن سے تعلق ہے اور قبر میں اصلاً روح کا بدن سے یہ تعلق نہیں بلکہ شعور وادراک بدن سے مفارقت کے بعد بھی روح میں باقی رہتا ہے اور اسی کو حیات سے تعبیر کرتے ہیں۔ پس قبر کی حیات کو مجاز پر حمل کرنا متعین ہے اس کے سواء کچھ نہیں۔''

الجواب: زیادہ قرین قیاس یہی بات ہے کہ ہم ان عبارات کو خود موصوف رحمہ اللہ کی اپنی عبارات کی روشنی میں حل کریں نہ یہ کہ ان میں رنگ ومعنی اپنی طرف سے بھریں یہ بات تو ان کی سابق واضح عبارت میں گزر چکی ہے کہ آپ کا اَرواح کا تعلق اجسام عنصریہ سے مانتے ہیں بلکہ اجزاء بدن کے بکھر جانے اور متفرق ہونے کے بعد بھی وہ روح کا جسم سے تعلق مانتے ہیں اور اسی ایک گونہ تعلق کی وجہ سے وہ عند القبور سفارش کے بھی قائل ہیں؛ اور یہ سارا قصہ اس بدن کا تسلیم کرتے ہیں جس بدن میں دنیا کے اندر روح رہ چکی ہے اور جو بدن قبر میں دفن کیا جاتا ہے اور اس بدن سے تعلق کے نہ ماننے کو خلاف منصوص فرماتے ہیں۔ اس پوری بحث کو ملحوظ رکھنے کے بعد ان کی ان بالا (اور اسی مضمون کی دیگر) عبارات کے دو جواب ہیں۔ اوّل: یہ کہ رُوح کا بدن کے ساتھ تعلق تین قسم کا ہے۔ (۱) نباتی۔ (۲) نفسانی اور (۳) حیوانی۔ نباتی کا یہ مطلب ہے کہ بدن اس تعلق سے بڑھتا رہے (أَنْبَتَهَا نَبَاتًا قرآن کریم کے الفاظ ہیں) اور اس تعلق کی وجہ سے بدن محتاجِ خوراک ہو اور حس وحرکت اس میں محسوس ہو اور یہ تعلق دنیا کی حقیقی حیات میں ہوتا ہے (یا قیامت کو ہوگا)

بایں طور کہ روح بدن میں علیٰ وجہ الکمال والتمام داخل ہو کر بدن میں تصرف کرے کہ اس کا حرکات حس ومشاہدہ میں آسکیں اور بدن کو تدبیر کرے جس سے بدن جسمانی خوراک کا محتاج ہو اور اس خوراک کے بعد بدن میں نشو ونما ہو جیسا کہ دنیا میں ہوتا تھا قبر میں اس قسم کا تعلق روح کا جسم سے نہیں ہوتا بلکہ وہاں تو فی الجملہ تعلق ہوتا ہے جس سے ادراک وشعور پیدا ہو اور جس سے راحت واَلم محسوس ہو سکے اور اس تعلق کے لئے بدن کا صحیح وسلامت رہنا بھی کوئی شرط نہیں۔ ہاں! اگر کوئی بدن محفوظ ہو تو اس کا انکار بھی جہالت ہے۔ بلکہ بدن کے اجزاء پریشان اور ذرّات سے بھی یہ تعلق قائم ہوتا ہے۔ ہاں! مگر روح کا بدن سے دنیوی خوراک حاصل کرنے اور نشو ونما کے سلسلہ میں اصلاً اور بالکل کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ باقی ادراک وشعور والا تعلق بدستور ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ منکرین عذاب قبر کو جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''جوابش آنکہ در قبر احیاء واماتت حقیقیہ نیست بسبب انعکاس اشعہ روح بر بدن تعلقے پیدا میشود کہ تغذیہ وتنمیہ بدن ہمراہ آں نمی باشد تا معنی حیات متحقق باشد بلکہ آں تعلق شبیہ است بہ تعلق عاشق بہ معشوق یا مالک بمملوک یا صاحب خانہ بہ خانہ کہ آلہ تعذیب وتنعیم میتواند شد۔'' (تحفۂ اثناء عشریہ ص ۳۸۲)

''اس کا جواب یہ ہے کہ قبر میں زندہ کرنا اور مارنا حقیقی نہیں (بلکہ) بدن پر روح کی شعاعوں کے عکس اور پرتو پڑنے کے سبب سے روح کا بدن کے ساتھ ایک تعلق پیدا ہو جاتا ہے کہ حاجت خوراک اور بدن کی نشو ونما اس کے ساتھ نہیں ہوتی تا کہ (حقیقی) حیات کا معنی متحقق ہو بلکہ یہ تعلق اس تعلق کے مشابہ ہے جو تعلق عاشق کو معشوق سے یا مالک کو غلام سے یا صاحب خانہ کو گھر سے ہوتا ہے کہ یہ چیزیں عذاب وراحت پہنچانے کا آلہ ہیں۔

مطلب واضح ہے کہ قبر میں جو حیات حاصل ہوتی ہے وہ حقیقی اور کامل حیات نہیں جس میں رُوح کا بدن کے ساتھ ایسا تعلق ہو کہ خوراک (حِسّی) کی ضرورت ہو اور بدن میں نشو ونما پیدا ہو بلکہ یہ تعلق صرف اس رنگ کا ہے کہ جس میں بدن روح کے لئے راحت وتکلیف کا آلہ بنے جیسے معشوق کی تکلیف سے عاشق کو اور مملوک کی اذیت سے مالک کو یا مثلاً گھر کے جل جانے کی وجہ سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہی حال روح وبدن کا ہے کہ اصل راحت وکلفت جو کچھ بھی ہے اور جتنی کچھ بھی ہے وہ تو روح کو ہے لیکن اس میں اس کا آلہ بدن ہے اور پھر آگے اسی بحث میں لکھتے ہیں: ''واما عقلی پس گویند کہ سوال وجواب وتکلم ولذت والم وادراک ہمہ موقوف بر حیات است وحیات با فساد وبنیہ وبطلان مزاج ممکن نیست۔ پس ایں اُمور میّت را ممکن نیست جوابش آنست کہ میّت بایں معنٰی بدن است نہ روح وفساد بنیہ وبطلان مزاج بر بدن واقع شدہ است نہ برروح'' آرے روح را برائے تالّم وتلذذ جسمانی واعمال حواس تعلقے ببدن خودش یا بہدن دیگر مثالی وراء تعلق تدبیر وتصرف وتغذیہ وتنمیہ خواہند داد وحاصل آں چوں روح از بدن جدا شد قوائے نباتی از وجدا میشود نہ قوائے نفسانی وحیوانی'' واگر وجود قُوٰی نفسانی وحیوانی فیضاناً یا بقاءً مشروط باشد باوجود قوای نباتی ومزاج لازم آید کہ ملائکہ را شعور وادراک حِسّی وحرکت وغضب ودفع منافر نباشد۔ پس حالِ اَرواح درعالم قبر مثل حال ملائکہ است کہ بتوسط شکلے وبدنے کار میکنند ومصدر افعال حیوانی ونفسانی میگردند بے آنکہ نفس نباتی ہمراہ داشتہ باشند۔'' (تحفہ اثنا عشریہ ص ۳۸۴)

''اور بہرحال عقلی طور پر وہ یوں اعتراض کرتے ہیں کہ سوال وجواب اور بولنا اور لذت اور دُکھ اور ادراک وغیرہ تمام اُمور حیات پر موقوف ہیں اور حیات بدن کے فاسد ہوجانے اور مزاج کے باطل ہوجانے کے بعد ممکن نہیں ہے۔ پس یہ اُمور میّت کے لئے کیسے ممکن ہو سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میّت اس معنٰی میں بدن ہے نہ کہ روح اور بدن کا فساد اور مزاج کا بطلان سب کچھ بدن پر واقع ہوتا ہے نہ کہ روح پر ہاں'' روح کا جسمانی دُکھ اور لذت اُٹھانے اور حواس کے اعمال کے لئے اپنے بدن کے ساتھ یا بدن مثالی کے ساتھ ایک تعلق ہوتا ہے لیکن یہ تعلق اس تعلق کے علاوہ ہے جس سے بدن کی تدبیر اور تصرف اور خوراک رسانی اور نشو ونما ہو اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب بدن سے رُوح الگ ہوجاتی ہے تو نباتی (بڑھنے اور نشو ونما والی) قوتیں اس سے جدا ہوجاتی ہیں۔'' نفسانی اور زندگی کی قوتیں اس سے جدا نہیں ہوتیں اور اگر نباتی قوتیں فیضان وبقاء میں نفسانی اور حیوانی قوتوں کے لئے شرط ہوں تو لازم آئے گا کہ فرشتوں کو شعور وادراک حس وحرکت اور غصہ اور نفرتوں کو دُور کرنے کا شعور نہ ہو۔ سو روح کا عالم قبر میں وہی حال ہے جو فرشتوں کا ہے کہ کسی شکل اور بدن کے واسطہ سے کام کرتے ہیں اور ان حیوانی اور نفسانی افعال کے لئے صادر ہونے کی جگہ ہیں بغیر اس کے نباتی نفس اپنے ساتھ رکھتے ہوں۔''

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ جسم سے روح کے جس تعلق کی نفی فرمارہے ہیں وہ تعلق نباتی ہے، نفسانی اور حیوانی کی نفی نہیں فرمارہے۔

دوم: حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ جب تک بدن مادّی اور عنصری موجود ہو تو اس وقت تک روح کا تعلق اسی سے قائم رہتا ہے لیکن جب بدن عنصری ہی قائم نہ رہے۔ (مثلاً یہ کہ اس کو جلا کر راکھ کر دیا گیا ہو) تو اس صورت میں سزا وراحت روح کو ہوتی ہے اور اس خاص صورت میں روح کا بدن مثالی سے تعلق قائم کردیا جاتا ہے اور اس صورت میں چونکہ مادّی اور عنصری بدن ہی باقی نہیں رہا۔ اس لئے روح کا اس سے سرے سے کوئی

تعلق نہیں رہتا اور غالباً یہ ان اقوام کے بارے میں ہوسکتا ہے جن کو درندے وغیرہ کھالیں یا جن کو جلا کر راکھ کر دیا جائے۔ (گو اس راکھ کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے انسان بنا کر اس کے ساتھ روح کا تعلق قائم کرسکتا ہے۔ جیسا کہ بخاری و مسلم کی روایت میں تصریح ہے اور وہ اس کتاب میں مذکور ہے) بخلاف ان اقوام کے جو مردوں کو دفن کرتی ہیں، وہاں اور نہ سہی تو آدمی کی ریڑھ کی ہڈی کا نچلا حصہ جس کو حدیث میں عجب الذنب (دُم گزہ) سے تعبیر کیا گیا ہے وہ تو بہرحال قائم ہی رہتا ہے اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ بدن کے اجزاء کے تفرق کے بعد بھی رُوح کا تعلق ان سے مانتے ہیں۔ کما مر!

چنانچہ وہ تصریح فرماتے ہیں کہ: ''وایں ہم درصورتے است کہ آں بدن قائم باشد و مدفون و الّا عذاب و نعمت روح را است کہ نفس مجرد است و بدن حقیقی او روح ہوائی است و روح را تعلیق میکنند بہ بدنے دیگر از عالم مثال یا مرکب از اجزاء جمادات۔ بہیئتے و شکلے کہ بینندہ را امتیاز درمیان آں بدن و بدن دُنیاوی حاصل نہ شود و ایں از باب تناسخ نیست زیرا کہ حقیقت تناسخ انتقال روح است از تدبیر بدنے بتدبیر بدنے دیگر بطریق تغذیہ و تنمیہ و ایں تعلیق محض است بنا برایلام و تلذیز۔'' (تحفۂ اثناء عشریہ ص ۲۸۳)

''اور یہ (تعلق روح کا بدن سے) بھی اس صورت میں ہے کہ بدن قائم ہو اور مدفون اور اگر ایسا نہیں تو عذاب و نعمت روح ہی کو ہے۔ کیونکہ وہ نفس مجرد ہے اور اس کا حقیقی بدن ہوائی روح ہے اور روح کا عالم مثال کے ایک اور بدن سے تعلق قائم کر دیا جاتا ہے جو اجزاء جمادات سے اس صورت و شکل سے مرکب ہے کہ دیکھنے والے کو اس بدن اور اس دنیوی بدن میں امتیاز حاصل نہیں ہوتا اور یہ تناسخ کی قسم سے نہیں ہے۔ کیونکہ تناسخ کی حقیقت یہ ہے کہ رُوح ایک بدن کی تدبیر سے دوسرے بدن کی تدبیر کی طرف انتقال کرے لیکن بطور خوراک دینے اور نشوونما کے اور یہ تعلق تو محض تکلیف اور لذت پہنچانے کے لئے ہے۔ (نہ کہ تدبیر کے لئے تو تناسخ کیسے؟)

اس عبارت کے پیشِ نظر مطلب یہ ہوگا کہ جب تک مادّی و عنصری بدن قائم ہے روح کا تعلق اس سے وابستہ رہتا ہے لیکن صرف نفسانی اور حیوانی درجہ میں نہ کہ نباتی حیثیت سے اور جب یہ بدن قائم نہ رہے تو پھر یہ تعلق بدن مثالی کے ساتھ قائم کر دیا جاتا ہے تو جہاں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ روح کا بدن سے سرے سے اصلاً کوئی تعلق نہیں اور روح کا تعلق بدن مثالی سے قائم کر دیا جاتا ہے تو یہ اس صورت سے مختص ہے جس میں بدن اصلی اور عنصری باقی نہ رہے۔

حضرت شیخ عبدالحق الدہلوی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۵۲ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ حضرات علماء نے:
''واختلاف کردہ اند کہ عذاب در قبر بزندہ گردانیدن میت است یا در مقابلہ داشتن روح باوے یا بنوعی دیگر کہ پروردگار تعالیٰ خواہد و ما را بدریافت کنہ حقیقت آں راہ نباشد و حق آں ست کہ باحیاء است چنانکہ ظاہر احادیث دال است براں۔'' (اشعۃ اللمعات باب اثبات عذاب القبر ج ۱ ص ۱۰۷، طبع نولکشور لکھنؤ)

''اس میں اختلاف کیا ہے کہ عذاب قبر مُردہ کو زندہ کر کے دیا جاتا ہے یا رُوح کو اس کے مقابل رکھ کر (اس کی شعاعوں سے) اس میں حیات پیدا کر کے یا کسی اور نوع سے جس کو پروردگار ہی جانتا ہے؟ اور ہمارے لئے اس کی حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں ہے اور حق یہ ہے کہ زندہ کر کے اسے عذاب دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ احادیث کا ظاہر اس پر دال ہے۔''

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ سے سوال ہوا: ''وسئل عن الروح ھل تلبس حینئذٍ الجثۃ کما کانت فاجاب نعم لٰکن ظاھر الخبر انھا تحل فی نصفہ الاعلیٰ'' (شرح الصدور ص ۶۰، طبع مصر)

''کہ (عذاب وراحت کے وقت) روح کا جسم سے کوئی تعلق ہوتا ہے جیسا کہ (زندگی میں) تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں! تعلق ہوتا ہے لیکن ظاہر حدیث اس کو چاہتی ہے کہ رُوح نصف اعلیٰ میں داخل ہوتی ہے۔ (کیونکہ دِل اور دماغ وغیرہ جو محل علم وشعور اور فہم خطاب ہیں، اسی نصف اعلیٰ میں ہوتے ہیں۔ اس پر حضرت ملا علی القاری رحمہ اللہ کی گرفت بھی اسی کتاب میں مذکور ہے۔''

الغرض حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی مذکور حدیث میں عود الروح الی البدن کے ساتھ قبر میں جو حیات ثابت ہے وہ حق اور صحیح ہے۔ لیکن دنیوی زندگی کی طرح مطلق حیات نہیں بلکہ نوع من الحیواۃ ہے اور ایسی حیات کے تسلیم کرنے سے قرآنِ کریم کی کسی نص کی مخالفت لازم نہیں آتی اور نہ یہ حیات کسی دیگر عقلی اور نقلی دلیل کے خلاف ہے۔ یہ علامہ ابن حزم اور ابن میسرہ رحمہ اللہ وغیرہ کی کوتاہ فہمی کا نتیجہ ہے کہ وہ اس کو نصوص قرآنیہ کے خلاف سمجھتے ہیں اور یہ مخالفت محض ان کے اذہان تک محدود ہے خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں ؎

یہ اپنی حد نظر ہے کسی کی دید کہاں

ہاں! بعض حضرات کا یہ نظریہ بھی ہے کہ نکیرین کے سوال کے وقت روح بدن میں لوٹائی جاتی ہے پھر بلا تکلیف نکال لی جاتی ہے۔ لیکن مع ہذا میت میں ایسا ادراک وشعور باقی رہتا ہے کہ جب بھی کوئی اس کی زیارت کو آتا ہے تو وہ اس کو (اس کے سلام وکلام کے لب ولہجہ سے) پہچان لیتی ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: ''المنکر والنکیر یأتیان المیّت فیرسل فی ذٰلک المیّت الروح ثم یقعد فاذا أسئل رُسلت روحہ بلا الم و نؤمن بان المیّت یعرف من یزورہ اذا اتاہ واکدہ یوم الجمعۃ بعد طلوع الفجر قبل طلوع الشمس'' (تحریرات حدیث ص ۲۵۷)

''منکر ونکیر میت کے پاس آتے ہیں تو اس میت میں روح ڈال دی جاتی ہے۔ پھر اس کو بٹھایا جاتا ہے۔ جب اس سے سوال ہو چکتا ہے تو اس کی رُوح بلا تکلیف کے نکال لی جاتی ہے اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ جب میت کے پاس کوئی شخص زیارت کرنے کو آتا ہے تو وہ اس کو پہچان لیتی ہے۔ خصوصاً جمعہ کے دن طلوع فجر کے بعد اور طلوع آفتاب سے پہلے۔''

قارئین کرام! آپ اس مفصل اور مدلل باحوالہ بحث سے بخوبی یہ معلوم کر چکے ہیں کہ قبر میں نکیرین کے سوال کے وقت اور اسی طرح قبر کی راحت وعذاب کے سلسلہ میں روح کا بدنِ مادّی اور عنصری سے باقاعدہ تعلق، اتصال اور ربط ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے اجزاء ریزہ ریزہ اور ذرّہ ذرّہ ہو کر بکھر جائیں اور بقول علامہ آلوسی رحمہ اللہ ایک جزء مشرق میں اور دوسری مغرب میں چلی جائے اور رُوح کا بدن سے یہ اتصال علم۔ ادراک اور شعور تک ہی محدود رہتا ہے جسم میں تدبیر اور جسم کے نشو ونما سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جیسا کہ دنیا میں ہوتا تھا اور سابق پیش کردہ حوالے اس کا واضح اور بیّن ثبوت ہے۔ بشرطیکہ کوئی حکم ربانی کی اتباع کرنا چاہے ؎

بقائے دائمی کا لطف ہوتا ہے اُسے حاصل ضروری جس نے سمجھا اتباع حکم ربانی

باب سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت کے تمام راوی ثقہ اور ثبت ہیں اور یہ روایت امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ کی شرط پر صحیح ہے اور سو فیصدی حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ اس کو صحیح کہتے ہیں اور عذاب قبر اور راحت قبر اور نکیرین کے سوال کے سلسلہ میں اس روایت کو اہل السنت والجماعت کے استدلال کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور مبتدعین کے خانہ ساز عقائد کے قلع قمع کے لئے اس کو حجت قاطعہ سمجھتے ہیں۔ ضرورت تو نہیں کہ اس حدیث کے بعد کسی اور حدیث کا تذکرہ کیا جائے مگر ہم محض تکمیلِ بحث کے لئے اس حدیث کے تین شاہد عرض کرتے ہیں جن کو امام قرطبی رحمہ اللہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ وغیرہ نے حضرت براء رضی اللہ عنہ کی مذکور حدیث کی تائید وتقویت کے لئے پیش کیا ہے:

شاہد اوّل

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ، امام ابو عبداللہ عبدالرحمن بن مندہ رحمہ اللہ (المتوفی ۴۷۰ھ) جو المحدث الحافظ اور العالم تھے، کے حوالہ سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں۔ جس کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے کہ: ”ثم قول لهذه النفس الطيبة ادخلوها الجنة واروها مقعدها من الجنة واعرضوا عليها ما اعددت لها من الكرامة والنعيم ثم اذهبوا بها الى الارض فانى قضيت انى منها خلقتهم وفيها اعيدهم و منها اخرجهم تارةً أخرى فوالذى نفس محمد بيده لهى اشد كراهيه للخروج منها حسين كانت تخرج من الجسد و تقول اين تذهبون بى الى ذالك الجسد الذى كنت فيه؟ قال فيقولون انا مأمورون بهذا فلا بدلك منه فيهبطون به على قدر فراغهم من غسله واكفانه فيدخلون ذٰلك الروح بين جسده واكفانه۔ فدل هذا الحديث ان الروح تعاد بين الجسد والاكفان وهذا عود غير التعلق الذى كان لها فى الدنيا بالبدن وهو نوع آخر۔“ (کتاب الروح ص۶۱، ۶۲)

”پھر اللہ تعالیٰ اس پاکیزہ روح کے بارے میں فرماتا ہے کہ اس کو جنت میں داخل کردو اور اس کا وہ ٹھکانا جو جنت میں ہے اس کو دکھا دو اور اس پر عزت اور خوشی کی وہ چیزیں پیش کرو جو میں نے اس کے لئے تیار کی ہیں پھر اس کو زمین کی طرف لے جاؤ۔ کیونکہ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں نے جس طرح ان کو زمین سے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح ان کو زمین کی طرف لوٹاؤں گا اور اس سے ان کو نکالوں گا۔ سو اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے۔ البتہ وہ روح وہاں سے نکلنے کو اتنا ہی ناپسند کرتی ہے، جتنا اس نے جسم سے نکلنے کو ناپسند کیا تھا اور وہ روح کہتی ہے کہ مجھے کہاں لے جاتے ہو؟“ کیا اس جسم کی طرف لے جاتے ہو جس میں میں تھی؟ آپ نے فرمایا کہ وہ فرشتے کہتے ہیں ہمیں یہی حکم ملا ہے اور تیرے لئے اس سے کوئی چارہ نہیں۔ پس اس کو نیچے اُتار لاتے ہیں۔ اس اثناء میں لوگ میت کے غسل اور کفن سے فارغ ہو چکتے ہیں۔ پس وہ فرشتے اس کی روح کو اس کے جسم اور کفن میں داخل کر دیتے ہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ روح جسم اور کفن کے اندر لوٹا دی جاتی ہے لیکن یہ لوٹانا اس تعلق کے علاوہ ہے جو رُوح کا جسم سے دنیا میں تھا بلکہ یہ ایک اور نوع کا تعلق ہے۔“

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بھی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ روح جسم میں لوٹائی جاتی ہے لیکن بقول حافظ ابن القیم رحمہ اللہ یہ اعادہ اور تعلق اس طرح کا نہیں جس طرح کہ دنیا میں تھا بلکہ اس کی نوعیت جدا ہے اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جسد سے جسد مثالی مراد نہیں بلکہ وہ جسد مراد ہے جس میں دُنیا میں روح تھی اور وہ یقیناً جسم عنصری اور مادّی ہے مثالی ہرگز نہیں۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میّت کے غسل اور کفن پہنانے کے وقت تک روح اس کے کفن اور جسم کے درمیان تک لوٹادی جاتی ہے اور حضرت براء رضی اللہ عنہ کی سابق حدیث کے مطابق جب مُردہ کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو اس کی روح اس کے بدن کی طرف لوٹائی جاتی ہے جس سے اس کو سوال نکیرین کے وقت فہم وشعور حاصل ہو جاتا ہے۔ گویا تدریجاً تدریجاً باذن خداوندی روح یہ مراحل طے کرتی ہے۔

شاہد دوم

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ مسند احمد وغیرہ کے حوالے سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمن اور کافر کی رُوح کے اخراج کے بارے میں تفصیل بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ مؤمن کی رُوح کے لئے آسمانوں کے لئے دروازے کھل جاتے ہیں اور اس کو تقرب خداوندی حاصل ہوتا ہے اور کافر کی روح کے لئے آسمانوں کے دروازے نہیں کھلتے۔

آخر میں فرمایا کہ: ''فترسل بین السماء والارض فتصیر الی قبرہ فیجلس الرجل الصالح فی قبرہ غیر فزع (الحدیث)''　(شرح حدیث النزول ص ۵۰، وکتاب الروح ص ۶۰)

''سو اس کو رُوح آسمان و زمین کے درمیان ارسال کی جاتی ہے۔ پس وہ قبر میں پہنچ جاتی ہے تو نیک آدمی اپنی قبر میں بلا کسی خوف و گھبراہٹ کے بیٹھ جاتا ہے۔''

ان حضرات نے یہ حدیث ان الفاظ سے نقل کی ہے۔ لیکن (مسند احمد ج ۶ ص ۱۴۰) میں یہ حدیث ان الفاظ سے مروی ہے: ''فترسل من السماء ثم تصیر الی القبر فیجلس الرجل الصالح (الحدیث)'' یعنی اس کی روح آسمان سے نیچے چھوڑ دی جاتی ہے تو پھر وہ قبر کی طرف رجوع اور میلان کرتی ہے۔ پس نیک آدمی کو بٹھایا جاتا ہے۔

اس روایت کے متعلق حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ ابن القیم رحمہ اللہ دونوں لکھتے ہیں کہ: ''وقال الحافظ ابو نعیم الاصفهانی هذا حدیث متفق علی عدالة ناقلیه''　(شرح حدیث النزول ص ۵۰، وکتاب الروح ص ۶۰)

''حافظ ابو نعیم الاصفہانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے تمام روات کی عدالت حضرت محدثین کرام رحمہم اللہ کے نزدیک ایک اتفاقی اَمر ہے۔''

اِس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ رُوح کا تعلق بدن کے ساتھ قبر میں قائم کر دیا جاتا ہے اور اس تعلق کی وجہ سے سوالِ قبر اور باقی اُمور انجام پذیر ہوتے ہیں۔''

شاہد سوم

امام قرطبی رحمہ اللہ، حافظ ابو نعیم رحمہ اللہ کے حوالہ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمن اور کافر کی موت کا اور ان کی اَرواح کے اخراج کا تذکرہ فرمایا اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

''حتی یدخل حضرته و ترد الروح الی جسده (الحدیث)''　(مختصر تذکرۂ قرطبی رحمہ اللہ ص ۳۳، طبع مصر)

''یہاں تک کہ مُردہ کو اس کی قبر میں داخل کیا جاتا ہے اور اس کی روح اس کے جسم کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوہریرہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم کی یہ مرفوع روایتیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پاک سے صادر ہوئی ہیں۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی سابق حدیث کی مؤید ہیں۔ ان تمام روایات میں اس کی تصریح موجود ہے کہ قبر میں مُردہ کی طرف اس کی روح لوٹائی جاتی ہے اور نکیرین کے سوال اور عذاب قبر اور راحتِ قبر میں جسم کی روح سے مشارکت ہوتی ہے۔ یہ جملہ اُمور نہ تو صرف بدن سے متعلق ہوتے ہیں اور نہ محض روح سے بلکہ دونوں سے وابستہ ہوتے ہیں اور جمہور اہل السنت والجماعت کا یہی مسلک ہے اور یہی حق اور صحیح ہے جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ کے حوالوں سے آپ معلوم کر چکے ہیں۔ یہ کہنا کہ اعادۂ رُوح الی الجسد کا کوئی ثبوت نہیں یا اس کے ثبوت پر کوئی روایت موجود نہیں۔ سراسر باطل اور محض خود فریبی ہے اور دلائل صحیحہ اس بے بنیاد نظریہ کے خلاف ہیں اور براہین واضح کی رہنمائی سے یہ باطل نظریہ یکسر محروم ہے اور ؎

جو قافلہ بے خضر سرِ راہِ گزر ہے
ہر گام پہ وہ ٹھوکریں کھاتا ہی رہے گا

اس لئے ضروری ہے کہ صحیح حدیث اور حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ کے ذکر کردہ زرّیں اقوال کو اپنا مشعلِ راہ بنایا جائے اور انہی کے دامنِ تحقیق سے وابستہ رہ کر حق کا ساتھ دیا جائے اور اسی میں اپنی دنیوی اور اُخروی کامیابی کا راز سمجھا جائے۔ بھلا غور فرمایئے کہ حدیث اور حضرات سلف رحمہم اللہ کی تحقیق سے اعراض واغماض کر کے حق کہاں مل سکتا ہے؟ اور نجات کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو حق کا دلدادہ بنائے اور حق ہی اس کا اوڑھنا اور بچھونا ہو۔ آمین ثم آمین! حق پر قائم رہنا ہی مؤمن کے امتحان وآزمائش کا معیار ہے ؎

کراتا ہے وہ جن سے دینِ قیم کی نگہبانی
خدا دے کر مصائب بس انہی کو آزماتا ہے

باب چہارم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس باب میں بعض حضرات ائمہ دین رحمہم اللہ، محدثین رحمہم اللہ، متکلمین اور فقہاء کرام رحمہم اللہ کی بعض عبارتیں عرض کی جاتی ہیں جن سے قبر میں اعادۂ روح کے بارے میں حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے اور اہل السنت کا منصور مسلک واضح سے واضح تر ہو جاتا ہے جس میں کسی منصف مزاج کو شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ امام الائمہ حضرت ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ (المتوفی ۱۵۰ھ) ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''واعادۃ الروح الی العبد فی قبرہ حق'' قبر میں روح کا بندے کی طرف لوٹایا جانا حق ہے۔ (فقہ الاکبر مع الشرح لعلی القاری رحمہ اللہ ص ۱۲۰، طبع کانپور)

اس کی شرح میں حضرت مُلّا علی القاری الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۱۴ھ) ارقام فرماتے ہیں کہ: ''واعادۃ الروح ای ردّھا او تعلقھا الی العبد ای جسدہ بجمیع اجزائہ او ببعضھا مجتمعۃ او متفرقۃ فی قبرہ حق''

''اور رُوح کا لوٹانا یعنی اس کا مکمل طور پر رد کرنا یا اس کا تعلق بندے کی طرف یعنی اس کے جسم کی طرف تمام اجزاء بدن میں بعض میں عام اس سے کہ اس کے اجزاء مجتمع ہوں یا متفرق اس کی قبر میں حق ہے۔'' (ص ۱۲۰)

اور پھر آگے لکھتے ہیں: ''واعلم ان اهل الحق اتفقوا علٰی ان الله یخلق فی المیّت نوع حیوٰة فی القبر قدر مایتألم ویتلذذ ولکن اختلفوا فی انه هل یعاد الروح الیه؟ والمنقول عن ابی حنیفة التوقف الّا ان کلامه ههنا یدل علٰی اعادة الروح از جواب الملکین فعل اختیاری فلا یتصور بدون الروح'' (شرح فقہ اکبر ص ۱۲۱)

''تو جان لے کہ اہل حق اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ قبر میں میّت کے اندر ایک گونہ زندگی پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ تکلیف اور لذّت محسوس کرتا ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ کیا روح اس کی طرف لوٹائی جاتی ہے؟ امام صاحب رحمہ اللہ سے اس سلسلہ میں توقف نقل کیا گیا ہے لیکن ان کا کلام اس جگہ اعادہ روح پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ فرشتوں کو جواب دینا ایک اختیاری فعل ہے اور بدوں روح کے ان کا تصور نہیں ہوسکتا۔''

اعادۂ روح کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ روح کا تعلق بکمالہٖ جسم سے ہو جیسا کہ دُنیا میں تھا یا آخرت ہوگا۔ اس میں اختلاف ہے۔ اگر حضرت امام صاحب رحمہ اللہ سے توقف کا قول کسی معتبر طریقہ سے ثابت ہے تو اس سے یہی پہلی صورت مراد ہوگی اور پہلے امام قونوی رحمہ اللہ کے حوالہ سے عرض کیا جاچکا ہے کہ حق یہ ہے کہ قبر میں اعادہ، روح کی یہ صورت نہیں ہوتی اور دوسری صورت یہ ہے کہ اعادۂ روح سے فی الجملہ تعلق مراد ہو۔ جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی صریح عبارات کے حوالہ سے یہ بات پہلے نقل کی جاچکی ہے اور یہ اعادہ صحیح اور صریح احادیث سے ثابت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اور حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے خود اپنی کتاب ''فقہ الاکبر'' میں اس اعادۂ رُوح کی تصریح کردی ہے۔ لہٰذا اس نقد کے ہوتے ہوئے توقف کے بعد اُدھار کو کون مانتا ہے؟ علاوہ ازیں بہت ممکن ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کا توقف روح کے اعادہ اور عدم اعادہ سے متعلق نہ ہو بلکہ یہ تقوف کل بدن یا بعض بدن کے متعلق ہو۔

چنانچہ مُلّا علی القاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ولعل توقف الامام فی ان الاعادة متعلق بجزء البدن او کله'' (مرقات ج ۱ ص ۱۹۸)

''اور شاید کہ امام صاحب رحمہ اللہ کا توقف اس بات میں ہو کہ اعادہ جزو بدن سے متعلق ہے یا کل بدن سے؟''

رہا یہ شبہ کہ فقہ اکبر تو امام صاحب رحمہ اللہ کی تصنیف ہی نہیں۔ جیسا کہ بعض حضرات کو یہ مغالطہ ہوا ہے تو یہ نرا شبہ ہے۔ کیونکہ تاریخ کی واضح شہادتیں اس پر قائم ہیں اور علماء اسلام کا جم غفیر اس بات کو تسلیم کرچکا ہے کہ فقہ اکبر حضرت امام صاحب رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ اس لئے یہ شبہ بھی کوئی معنٰی اور وزن نہیں رکھتا۔ مقدمہ البیان الازہر میں ہم نے اس پر بقدر ضرورت بحث کردی ہے۔ یہ معتزلہ کے مخترعات میں سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ الفقہ الاکبر امام صاحب رحمہ اللہ کی نہیں بلکہ ابو حنیفہ البخاری رحمہ اللہ کی ہے۔ (مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۲۹)

غرض یہ کہ قبر میں اعادہ روح کے بارے میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہ حوالہ صحیح اور نص صریح ہے۔ لاشک فیہ!

امام اہل سنت حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (المتوفی ۲۴۱ھ) اپنی کتاب الصلوٰۃ میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''والایمان بالحوض والشفاعة والایمان بمنکر ونکیر وعذاب القبر والایمان بملک الموت بقبض الارواح ثم ترد فی الاجساد فی القبور فیسألون عن الایمان والتوحید'' (کتاب الصلوٰۃ ص ۴۵، طبع قاہرہ)

''حوضِ کوثر، شفاعت، منکر ونکیر، عذاب قبر، ملک الموت کے ارواح کو قبض کرنے پھر اَرواح کے قبروں میں جسموں کی طرف لوٹائے جانے پر ایمان لانا ضروری ہے اور اس پر بھی ایمان لانا لازم ہے کہ قبر میں ایمان وتوحید کے بارے میں سوال ہوتا ہے۔''

ان صریح عبارات سے معلوم ہوا کہ قبر میں عود الروح الی الجسد کا عقیدہ صرف بعد کے مقلدین حضرات ہی کا اختیار کردہ نہیں بلکہ حضرات ائمہ اربعہ رحمہم اللہ میں سے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی صاف لفظوں میں اس کا اقرار کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک بزرگ اس کو حق اور دوسرے ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔ قطع نظر صحیح احادیث کے علماء احناف کے لئے تو حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ارشاد بھی کافی تھا، حالانکہ یہ مسئلہ نرے اجتہاد پر مبنی نہیں بلکہ اس کی بناء صحیح اور صریح احادیث پر ہے۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اگرچہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کی اس بارے میں صراحت نظر سے نہیں گزری۔ لیکن صحیح اور صریح حدیث کے خلاف کب وہ نظریہ قائم کر سکتے تھے۔ لہٰذا ان کی تحقیق بھی یہی سمجھنی چاہئے کہ اعادہ روح حق ہے۔

حضرت امام محی الدّین یحییٰ بن شرف بن حسن رحمہ اللہ، النووی الشافعی رحمہ اللہ (المتوفی ٦٧٦ھ) لکھتے ہیں کہ:

''اعلم ان مذهب اهل السنة اثبات عذاب القبر و قد تظاهرت عليه دلائل الكتاب و السنة قال الله تعالىٰ النار يعرضون عليها غدوا و عشيا الآية وتظاهرت به الاحاديث الصحيحة عن النبی ﷺ من رواية جماعة من الصحابة رضی اللہ عنہم فی مواطن كثيرة و لا يمتنع فی العقل ان يعيد الله تعالىٰ الحيوة فی جزء من الجسد ويعذبه و اذا لم يمنعه العقل وورد الشرع به وجب قبوله و اعتقاده الٰی ان قال ثم المعذب عند اهل السنة الجسد بعينه او بعضه بعد اعادة الروح اليه او الٰی جزء منه و خالف فيه محمد بن جرير و عبد الله بن كرام و لطائفة فقالوا لا يشترط اعادة الروح قال اصحابنا هذا فاسد لان الالم و الاحساس انما يكون فی الحی قال اصحابنا و لا يمنع من ذٰلک كون الميّت قد تفرقت اجزاء ما كما نشاهده فی العادة او اكلته السباع او حيتان البحر او نحو ذٰلک فكما ان الله تعالىٰ يعيده للحشر و هو سبحانه و تعالىٰ قادر علٰی ذٰلک فكذا يعيد الحيوة الٰی جزء منه و ان اكلة السباع و الحيتان'' (شرح مسلم ج ۲ ص ۳۸۵، ۳۸۶)

''تو جان لے کہ اہل السنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ قبر کا عذاب حق ہے اور اس پر کتاب وسنت کے روشن دلائل ثابت ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ آل فرعون صبح وشام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں اور بہت سے مقامات پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خاصی جماعت نے آنحضرت ﷺ سے اس پر صحیح احادیث بھی روایت کی ہیں اور عقل بھی اس کو ممتنع نہیں سمجھتی کہ اللہ تعالیٰ جسم کی کسی جزو میں زندگی لوٹا دے اور اس کو سزا دے اور جب عقل بھی اس کو ممتنع نہیں سمجھتی اور شرع میں بھی اس کا ثبوت ہے تو اس کو قبول کرنا اور اس پر اعتقاد کرنا واجب ہے۔ پھر آگے فرمایا کہ پھر اہل السنت کے نزدیک بعینہٖ جسد عنصری یا اس کی جزء کو سزا دی جاتی ہے اور اس میں محمد بن جریر اور عبد اللہ بن کرام اور ایک گروہ مخالف ہے وہ کہتے ہیں کہ عذاب کے لئے اعادۂ روح شرط نہیں ہے لیکن ہمارے اکابر کہتے ہیں کہ یہ بالکل باطل ہے۔ کیونکہ درد اور اس کا احساس زندہ ہی کو ہوسکتا ہے اور ہمارے بزرگ ہی فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی ممانعت نہیں کہ میّت کے اجزاء بکھر جائیں۔ جیسا کہ عادۃً ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں یا اس کو درندے کھا جائیں یا مچھلیاں ہڑپ کر جائیں یا اسی طرح کی کوئی اور صورت پیش آجائے تو جیسے کہ اللہ تعالیٰ میدان

محشر میں جسم کو لوٹانے پر قادر ہے۔ اسی طرح جسم کی کسی جزء میں زندگی لوٹانے پر بھی قادر ہے۔ اگرچہ اس کو درندے اور مچھلیاں کھا جائیں۔

تنبیہ: محمد بن جریر سے اس مقام پر وہ محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ مراد نہیں جو مشہور مفسر، محدث اور مؤرخ تھے، جن کی وفات (۳۱۰ھ) میں ہوئی بلکہ یہ محمد بن جریر طبری کرّامی ہے جو کہ کرّامیہ فرقہ کا روح رواں تھا۔

(عبدالحکیم علی الخیالی ص ۱۱۸)

محمد بن جریر الطبری رحمہ اللہ کے بارے میں مؤلف (ندائے حق ص ۲۱۶) میں مستقل عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں کہ ابن جریر دو ہیں۔ ایک سُنّی، دوسرا شیعہ۔ یہ تیسرا کرّامی کہاں سے نکل آیا؟ یہ آپ کی تحریر سے معلوم ہوا پھر اس کی وفات کی تعیین کیوں نہیں؟ جناب یہ محمد بن جریر سُنّی ہیں۔ (نبراس ص ۳۲۲) میں ہے: ''واجاب الصالحی من المعتزلة و بعض الكرّامية والامام ابن جرير الطبری من اهل السنة بان الميّت يعذب بعذاب بلا حياة و قال المحققون هذه سفسطة'' اور (نظم الفرائد حاشیہ شرح عقائد نسفیہ ص ۱۷۴) میں مرقوم ہے: ''وذهب الصالحی من المعتزلة و ابن جرير و طائفة من الكرامية الى انه بلا احياء الميّت'' اور خیالی میں وابن جریر الطبری کے بعد طائفۃ کا لفظ کاتب سے رہ گیا ہے اور خیالی پڑھنے والے پر مخفی نہیں کہ کئی جگہ متن اور حاشیہ میں غلطیاں ہیں جو کاتب کی بے پرواہی سے ہوگئی ہیں اور ہر کتاب میں ہوتی ہیں کوئی کتاب غلطیوں سے خالی نہیں۔ (محصلہ)

الجواب: ابن جریر کرّامی کا ذکر راقم نے از خود نہیں کیا بلکہ فاضل اجل۔ نکتہ رس، محقق عالم حضرت مولانا محمد عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۷۰ھ) کے حوالہ سے کیا ہے جن کو علماء کرام اور خصوصاً مدرسین حضرات بخوبی جانتے ہیں، بلاشبہ کاتب بھی انسان ہوتے ہیں اور ان سے کتابت میں غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں اور عبارات بھی چھوٹ جاتی ہیں۔ جیسا کہ ابن کثیر کے ایک نسخہ میں ایک عبارت چھوٹ گئی ہے اور باقی نسخوں میں موجود ہے۔ کمامرَّ لیکن غلطی کی نشاندہی کے لئے بھی دلیل درکار ہوتی ہے محض دعویٰ سے کچھ نہیں بنتا۔ ہاں! صاحب نبراس نے امام ابن جریر الطبری کو اس مقام پر ''من اهل السنة'' لکھا ہے اور صاحب نبراس حضرت مولانا عبدالعزیز فرہاروی رحمہ اللہ بڑے ذہین وسیع النظر اور مصنف عالم تھے۔ مگر ''مَنْ ذَا سَلِمَ مِنَ الْوَهْم'' وھم سے کون بچا ہے؟ یہ ان کا وہم ہے محمد بن جریر سے اس مقام پر جریر سُنّی مراد نہیں بلکہ یہ کرّامی ہی ہے اور اس میں حضرت مولانا سیالکوٹی کی رائے درست ہے۔ راقم کے پیش نظیر ''الخیالی'' کے دو نسخے ہیں اور دونوں میں الکرامی کا لفظ موجود ہے۔ آپ نے تمام دنیا کے ابن جریر نامی راویوں کا تھوڑا ہی احاطہ کر لیا ہے کہ یہ الکرامی آپ کے لئے کوئی نرالی بات ہو علم بڑا وسیع ہے۔ یہ نہیں کہ جس چیز کا علم مجھے اور آپ کو نہ ہو تو وہ ہوتی ہی نہیں۔ یقین جانئے یہ ابن جریر سُنّی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ محمد بن جریر الطبری سُنّی اپنی مشہور تفسیر ابن جریر میں ''يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ'' (ابراہیم: ۲۷) کی تفسیر میں پُرزور دلائل سے قبر میں مُردہ کے لئے ''اعادة الروح الى الجسد'' کے طور پر حیات ثابت کرتے ہیں۔

اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت سند کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے: ''وذکر قبض روح المؤمن فتعاد روحه فى جسده و يأتيه الملكان فيجلسانه فى قبره فيقولان من ربک'' مؤمن کی روح کے قبض کرنے کا ذکر فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ پھر اس کی روح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اس کو قبر میں بٹھاتے ہیں۔ سو وہ کہتے ہیں: تیرا رَب کون ہے؟ (تفسیر ابن جریر ج ۱۳ ص ۲۱۴)

پھر اس کی چار سندیں اور بیان کی ہیں۔ پھر (ج ۱۳ ص ۲۱۷) میں الگ سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے اور پھر (ج ۱۳ ص ۲۱۸) میں الگ سند کے ساتھ روایت نقل کی ہے جس میں آتا ہے: ''قال رسول اللہ ﷺ و ذکر الکافر حین تقبض روحہ قال فتعاد روحہ فی جسدہٖ (الحدیث)''

''آنحضرت ﷺ نے کافر کی رُوح کے قبض کرنے کے سلسلہ میں فرمایا۔ پس ان کی روح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے۔

اور ان روایات کو نقل کر کے وہ قبر میں حیات ثابت کرتے ہیں اور حیات بھی بایں طور کہ روح کا جسم کی طرف اعادہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک حوالہ بھی انہوں نے ایسا نقل نہیں کیا جس سے یہ ثابت ہو کر قبر میں روح کا جسم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جیسا کہ کرّامیہ کا مذہب ہے۔ پھر کیسے اِس سُنّی مفسّر کو محض اپنے ہوائے نفسانی کے تحت بیک جنبش قلم کرّامی سمجھ لیا جائے اور کرامی کو سُنّی بنا دیا جائے۔ یہ بات بھی طلبہ کرام سے مخفی نہیں کہ ''وطائفة'' کا لفظ واو عطف کے ساتھ لفظ ابن جریر پر عطف بھی ہو۔ مع ہذا! اس کے جھوٹ جانے سے بھی ابن جریر کا سُنّی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی الشافعی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں کہ: ''وقد اخذ ابن جریر و جماعة من الکرّامیه من هذه القصة ان السوال فی القبر یقع علی البدن فقط و ان الله تعالٰی یخلق فیه ادراکاً بحیث یسمع و یعلم و یلذّ و یألم و ذهب ابن حزم و ابن هبیرةؑ''

الٰی ان السوال یقع علی الروح فقط من غیر عود الٰی الجسد و خالفهم الجمهور فقالوا تعاد الروح الٰی الجسد او بعضه کما ثبت فی الحدیث و لو کان علٰی الروح فقط لم یکن للبدن بذٰلک اختصاص و لا یمنع من ذلک کون المیّت قد تتفرق اجزائه لان الله تعالٰی قادر علٰی ان یعید الحیوة الٰی جزء من الجسد و یقع علیه السوال کما هو قادر علٰی ان یجمع اجزائهٗ و الحامل للقائلین بان السوال یقع علی الروح فقط ان المیّت قد یشاهد فی قبرهٖ حال المسئلة لا اثر فیه اقعاد و لا غیره و لا ضیق فی قبرهٖ و لا سعة و کذٰلک غیر المقبور کالمصلوب و جوابهم ان ذٰلک غیر ممتنع فی القدرة بل له نظیر فی العادة و هو النائم فانه یجد لذةً و المًا لا یدرکه جلیسه بل الیقظان قد یدرک المًا و لذةً لما یسمعهٗ او یفکر فیه و لا یدرک ذٰالک جلیسه و انما اتی الغلط من قیاس الغائب علٰی الشاهد و احوال ما بعد الموت علٰی ما قبلهٗ و الظاهر ان الله تعالٰی صرف ابصار العباد و اسماهم عن مشاهدة ذٰلک و سترهٗ عنهم ابقاءً علیهم لئلا یتدافنوا الیست للجوارح الدنیویة قدرة علٰی ادراک امور الملکوت الا من شاء الله تعالٰی و قد ثبتت الاحادیث بما ذهب الیه الجمهور کقوله انه یسمع خفق نعالهم و قوله تختلف اضلاعهٗ لضمة القبر و قوله یسمع صوتهٗ اذا ضربه بالمطراق و قوله یضرب بین اذنیه و قوله فیقعدانه و کل ذالک من صفات الاجساد و ذهب ابو الهذیل و من

ؑ دیگر متعدد کتابوں میں ابن میسرہ رحمہ اللہ آیا ہے۔ فتح الباری میں ابن ہبیرہ ہے۔ اغلب ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے اور صحیح ابن میسرہ ہی ہے واللہ اعلم!

تبعہ الی ان المیت لا یشعر بالتعذیب ولا بغیرہ الی ان المیت لا یشعر بالتعذیب ولا بغیرہ الا بین النفختین قالوا وحالہ کحال النائم والمغشی علیہ یحس بالضرب ولا بغیرہ الّا بعد الافاقۃ والاحادیث الثابتۃ فی السوال حالۃ تولی اصحاب المیت عنہ ترد علیھم'' (فتح الباری ج ۳ ص ۴۷۷، طبع مصر)

''بے شک اس واقعہ سے ابن جریر اور کرامیہ کی ایک جماعت نے یہ اخذ کیا ہے کہ قبر میں سوال صرف بدن سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس بدن میں ایسا ادراک پیدا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ سنتا اور جانتا اور لذت اور درد محسوس کرتا ہے اور ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ہبیرہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ سوال صرف روح سے ہوتا ہے اور رُوح جسم کی طرف نہیں لوٹائی جاتی۔ لیکن جمہور ان کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روح کو پورے جسم یا بعض حصہ کی طرف لوٹایا جاتا ہے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے اور اگر یہ کارروائی محض روح سے وابستہ ہوتی تو بدن کی اس میں خصوصیت نہ ہوتی۔ (حالانکہ بدن اس میں ملحوظ ہے) اور اس میں کوئی امتناع نہیں کہ کبھی میت کے اجزاء بالکل بکھر جاتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ بدن کے ایک حصہ کی طرف روح لوٹا دے اور اس سے سوال ہو جیسا کہ وہ تمام اجزاء کے جمع کرنے پر قادر ہے جو لوگ سوال قبر صرف روح کے لئے مانتے ہیں۔ اس کا باعث ان کے نزدیک یہ ہے کہ میت کو کبھی مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ اس میں اُٹھانے وغیرہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ اس کی قبر میں تنگی اور فراخی نظر آتی ہے اور اسی طرح بعض مُردوں کو بجائے دفن کرنے کے سُولی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ ان کے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ بعید نہیں بلکہ اس کی ایک نظیر موجود ہے جو عادتاً وقوع میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ خوابیدہ شخص لذت اور دُکھ محسوس کرتا ہے اور اس کے پہلو میں دوسرا شخص اس کو محسوس نہیں کر سکتا بلکہ بیدار آدمی بھی کبھی تکلیف اور لذت محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے کوئی بات سُنی ہوتی ہے یا محوِ فکر ہوتا ہے اور دوسرے اس کو محسوس نہیں کر سکتے یہ ساری غلطی اس لئے سرزد ہوئی ہے کہ غائب (یعنی اُمور برزخ) کو حاضر پر قیاس کر لیا گیا ہے اور مابعد الموت کے حالات کو زندگی کے حالات پر قیاس کر لیا گیا ہے اور ظاہر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کی نگاہوں اور ان کے کانوں کو اس کے مشاہدہ سے روک دیا ہے اور ان پر شفقت کرتے ہوئے یہ اُمور ان سے پوشیدہ رکھے ہیں تاکہ وہ مُردوں کو دفن کئے بغیر ہی نہ چھوڑ دیں اور دنیا کے اعضاء کو یہ قدرت ہی نہیں کہ اس جہان کے اُمور کا ادراک کر سکیں مگر جن کے متعلق اللہ تعالیٰ چاہے اور بے شبہ احادیث اُسی مسلک کے ثبوت پر موجود ہیں جو جمہور نے اختیار کیا ہے۔ مثلاً آپ علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ میت قبر سے لوٹنے والوں کی جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ سنتی ہے اور آپ کا یہ ارشاد کہ قبر کی تنگی کی وجہ سے اس کی پسلیاں آر پار ہو جاتی ہیں اور آپ کا یہ ارشاد کہ جب اس کو ہتھوڑا اور گرز ماری جاتی ہے تو (ثقلین کے بغیر دوسری مخلوق کو) اس کی آواز سنائی دیتی ہے اور آپ کا یہ ارشاد کہ اس کے دو کانوں کے درمیان ضرب لگائی جاتی ہے اور آپ کا یہ ارشاد کہ فرشتے اس کو بٹھاتے ہیں اور یہ سب کے سب اُمور اجسام کی صفات ہیں (نہ کہ ارواح کی) اور ابو الہذیل اور اس کے پیرو اس طرف گئے ہیں کہ نفخۂ اُولیٰ اور نفخۂ ثانیہ کے درمیان میت کو عذاب وغیرہ کسی چیز کا شعور نہیں ہوتا یہ لوگ کہتے ہیں کہ میت کا حال اس شخص کے حال کے مناسب ہے جو سویا ہو یا اس پر غشی طاری ہو وہ افاقہ سے پہلے مار وغیرہ کسی چیز کا احساس نہیں کرتا لیکن وہ حدیثیں جو دفن میت کے وقت لوگوں کی واپسی کے وقت میت سے سوال کے بارے میں آئی ہیں ان کے خلاف ہیں اور ان کا رد کرتی ہیں۔''

نوٹ ہم نے فتح الباری کی اس مقام پر پوری عبارت نقل کردی ہے۔ مؤلف کا (ندائے حق ص ۲۲۹، ۳۰۰) میں یہ شکوہ کرنا کہ ہم نے جو عبارت خلاف مطلب تھی وہ چھوڑ دی ہے، نرا بہتان ہے۔ یہاں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نام کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور اس کو صحیح سمجھتے ہیں، اس کی تردید نہیں کرتے۔

اور علامہ بدرالدین العینی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۵۵ھ) لکھتے ہیں: ''ولا بُعد فی رد الحیوۃ الی بعض اجزاء البدن فیختص بالاحیاء والمسئالۃ والعذاب وان لم یکن ذٰلک مشاھدًا لنا''

''اور اس میں کوئی بُعد نہیں کہ بدن کے بعض اجزاء کی طرف زندگی لوٹائی جائے اور وہی بعض اجزاء حیات اور قبر کے سوال اور عذاب سے مختص ہوں۔ اگرچہ ہمیں اس کا مشاہدہ نہ ہوسکے۔'' (عمدۃ القاری ج ۸ ص ۱۴۷)

اس سے معلوم ہوا کہ علامہ عینی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی فی الجملہ اعادۂ روح الی البدن میں کوئی بعد نہیں۔ اگرچہ اس کا مشاہدہ ہمیں نہ ہوسکے بلکہ وہ اُسی کو اکثر ''اہل السنۃ'' کا قول بتاتے ہیں۔

چنانچہ وہ سماع موتی کی بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''واجیب عن الآیۃ بانالذی یسمعھم ھو اللہ تعالٰی والمعنی انہ ﷺ لا یسمعھم ولکن اللہ تعالٰی احیاھم حتّٰی سمعوا کما قال قتادۃ وقال السھیلی رحمہ اللہ، عائشہ رضی اللہ عنہا لم تَحضُر وغیرھا ممن حضر احفظ للفظہ وقد قالوا لہ اتخاطب قومًا قد جیفوا فقال ما انتم باسمع لما اقول منھم واذا جز ان یکونوا فی تلک الحالۃ عالمینا جاز ان یکونوا سامعین اما باذان رؤسھم اذا قلنا ان الارواح تعاد الی اجساد عند المسائلۃ وھو قول الاکثر من اھل السنۃ واما باذان القلب والروح علٰی مذھب من یقول یتوجہ السوال الی الروح من غیر رجوع منہ الی الجسد او الی بعضہ''

''اس آیت کریمہ کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو سُناتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو نہیں سُنایا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا حتیٰ کہ انہوں نے سُن لیا۔ جیسا کہ قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: امام سہیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (بدر کے موقع پر) حاضر نہ تھیں اور ان حضرات نے جو وہاں موجود تھے۔ آنحضرت ﷺ کے الفاظ کو خوب یاد رکھا ہے اور انہوں نے آپ سے کہا بھی کہ حضرت! آپ ایسے لوگوں سے خطاب کر رہے ہیں جو مردار اور بدبودار ہوچکے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ تم سے بھی زیادہ سنتے ہیں اور جب یہ جائز ہے کہ وہ اس حالت میں جاننے والے ہیں تو یہ بھی جائز ہے کہ وہ سننے والے بھی ہوں یا تو سر کے کانوں سے جب ہم یہ کہیں کہ قبر میں سوال کے وقت ارواح کو اجسام کی طرف لوٹایا جاتا ہے جیسا کہ اکثر اہل السنۃ والجماعۃ کا قول ہے اور یا وہ دل اور رُوح کے کانوں سے سنتے جیسا کہ اِن لوگوں کا مذہب ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ قبر میں سوال رُوح سے ہوتا ہے بغیر اس کے کہ اس کو جسم یا اس کے بعض حصہ کی طرف لوٹایا جائے۔'' (عمدۃ القاری ج ۱۷ ص ۹۳)

علامہ عبدالرؤف المناوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۰۳ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ: ''زاد فی حدیث البراء رضی اللہ عنہ فتعاد روحہ فی جسدہ ظاھر فی جمیع الجسد لکن سئل الحافظ عن ذٰلک فاجاب بان ظاھر الخبر انھا تحل فی النصف الاعلٰی۔۔۔ قلت ویمکن ان یقال قوۃ حلولھا فی النصف الاعلٰی بوسع اللحد حتّٰی یجلس فیہ زاد فی روایۃ فتعاد روحہ فی جسدہ وظاھرہ فی کلہ ونقلہ المصنف فی ارجرزتہ عن الجمھور ولکن قال ابن حجر ظاھر الخبر فی النصف الاعلٰی وجمع بان مقرھا فی النصف الاعلٰی ولھا اتصال بباقیہ وقیل وجزم بہ القاضی'' (فیض القدیر ج ۲ ص ۳۷۲، ۳۷۳ طبع مصر)

''حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ''فتعاد روحہ فی جسدہ'' کی زیادت بھی ہے۔اس کا ظاہر اس کو چاہتا ہے کہ روح کا اعادہ سب جسم میں ہوتا ہے لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ظاہر خبر اس کو چاہتا ہے کہ رُوح کا حلول نصف اعلیٰ میں ہوتا ہے۔ان کی بات ختم ہوئی۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ نصف اعلیٰ میں روح کے حلول کی قوت ہوتی ہے جس سے لحد میں وسعت ہوتی ہے اور مُردہ قبر میں بیٹھ جاتا ہے۔اس میں فتعاد روحہ فی جسدہ کا ظاہر اسی کو چاہتا ہے کہ سب بدن میں روح کا اعادہ ہوتا ہے۔مصنف نے اپنے رجزوں میں اس کو جمہور سے نقل کیا ہے لیکن ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ظاہر خبر نصف اعلیٰ کو چاہتی ہے اور تطبیق یوں دی گئی ہے کہ روح کا مقر نصف اعلیٰ ہے لیکن اس کا باقی بدن سے بھی اتصال ہوتا ہے اور کہا گیا ہے کہ قاضی (ابوبکر الباقلانی رحمۃ اللہ علیہ) نے اسی پر جزم کیا ہے۔''

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اگر چہ یہ دعویٰ کیا ہے (جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے) کہ روح بدن کے نصف اعلیٰ میں لوٹائی جاتی ہے اور علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی جمع و تطبیق کی صورت میں پیدا کر دی ہے لیکن حضرت ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی تردید کرتے ہیں۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:''فتعاد روحہ فی جسدہ ظاہر الحدیث ان عود الروح الی جمیع اجزاء بدنہ فلا التفات الی قول البعض بان العود انما یکون الی البعض ولا الی قول ابن حجر الی نصفہ فانہ لا یصح ان یقال من قبل العقل بل یحتاج الی صحۃ النقل'' (مرقات ج ۴ ص ۲۵، طبع ملتان)

''فتعاد روحہ فی جسدہ کی حدیث کا ظاہر اسی کو چاہتا ہے کہ روح کا اعادہ تمام بدن کی طرف ہوتا ہے۔لہٰذا ان بعض لوگوں کے قول کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاسکتی۔ جو یہ کہتے ہیں کہ عود روح بعض بدن کی طرف ہوتا ہے اور نہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی طرف التفات کیا جاسکتا ہے جس میں نصف بدن کی طرف عود کا ذکر ہے۔کیونکہ یہ محض عقلاً کہنا درست نہیں بلکہ اس میں صحتِ نقل کی ضرورت ہے (جو مفقود ہے)

نیز حضرت ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:''قال العسقلانی فی فتاوٰہ ارواح المؤمنین فی علیین وارواح الکفار فی سجین و لکل روح بجسدھا اتصال معنوی لا یشبہ الاتصال فی الحیٰوۃ الدنیا بل اشبہ شئ بہ حال النائم و ان کان ھو اشد من حال النائم اتصالا و بھذا یجمع بین ما ورد ان مقرھا فی علیین او سجین و بین ما نقلہ ابن عبدالبر عن الجمھور انھا عند افنیۃ قبورھا قال ومع ذٰلک فی مادون لھا فی التصرف و تأوی الی محلھا من علیین او سجین قال و اذا نقل المیت من قبر الی قبر فالاتصال المذکور مستمر و کذا لو تفرقت الاجزاء'' (مرقات ج ۴ ص ۲۵، طبع ملتان)

''(ابن حجر) عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاویٰ میں کہا ہے کہ مؤمنوں کی ارواح علیّین میں اور کافروں کی سجین میں رہتی ہیں۔ بایں ہمہ ہر ایک روح کا تعلق معنوی اپنے جسم سے بھی ہے۔لیکن وہ دنیوی زندگی کے اتصال کے مشابہ نہیں۔ یہ سونے والے کے حال کے زیادہ مشابہ ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اتصال ہے اور اس سے تطبیق ہو جائے گی اس میں کہ ارواح کا مقر علیین یا سجین ہے اور اس میں جو ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ ارواح قبروں کے کناروں پر ہوتی ہیں۔مع ہذا! ان کو آنے جانے کی اجازت ہوتی ہے اور وہ اپنے محل علیین یا سجین میں بھی پہنچ

جاتی ہیں۔ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب میت کو ایک قبر سے دوسری قبر تک منتقل کیا جاتا ہے اور اسی طرح جب اس کے اجزاء متفرق ہو جاتے ہیں تو روح کا یہ اتصال بدستور باقی رہتا ہے۔''

یہ اتصال محض معنوی بیرونی اور اشراقی اتصال ہی نہیں بلکہ یہ اتصال حیات کا ہے۔جیسا کہ خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ قرع نعال کی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:''فیہ ان المیت یحیا فی قبرہ للمسألۃ خلافا لمن ردّہ واحتج بقولہ تعالٰی قَالُوْا رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتنا اثْنَتَیْنِ الآیۃ قال فلو کان یُحیٰ فی قبرہ للزم ان یُحیٰ ثلاث مرات و یموت ثلاثا و ھو خلاف النص والجواب بان المراد بالحیوۃ فی القبر للمسألۃ لیست الحیاۃ المستقرۃ المعھودۃ فی الدنیا التی تقوم فیھا الروح بالبدن و تدبرہ و تصرفہ و تحتاج الٰی ما یحتاج الیہ الاحیاء بل ھی مجرد اعادۃ لفائدۃ الامتحان الذی وردت بہ الاحادیث الصحیحۃ فھی اعادۃ عارضۃ کما حی خلق لکثیر من الانبیآء لمسألتھم لھم عن اشیاء ثم عادوا موتٰی'' (فتح الباری ج ۳ ص ۴۸۴)

''اس میں دلیل یہ ہے کہ میت کو قبر میں سوال کے لئے زندہ کیا جاتا ہے۔برخلاف اس کے جس نے اس کو رد کیا ہے،اس نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے کہ وہ (کافر قیامت کے دن) کہیں گے:اے ہمارے رب!تو نے دو مرتبہ ہمیں مارا اور دو مرتبہ زندہ کیا۔اگر قبر میں بھی زندگی ہو تو لازم آتا ہے کہ وہ تین مرتبہ زندہ کیا جائے اور تین مرتبہ مرے اور یہ نص کے خلاف ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ قبر میں سوال کے لئے جو حیات ہوتی ہے وہ دنیا کی مستقر اور موعود حیات کی طرح نہیں ہے جس میں رُوح بدن کی مُقوم اور اس میں تدبیر اور تصرف کرتی ہے اور اس کو اس چیز کی حاجت نہیں ہوتی جس کے زندہ (خوراک وغیرہ کے) محتاج ہوتے ہیں بلکہ یہ محض اعادہ ہے جس کا فائدہ وہ امتحان ہے۔جس کے بارے میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں اور یہ اعادہ عارضی ہوتا ہے جیسا کہ بہت سے لوگ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے زندہ کئے گئے تاکہ ان سے کچھ اشیاء کے بارے سوال ہو سکے۔اس کے بعد وہ پھر مر گئے۔''

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قبر کی زندگی دنیا کی معہود زندگی کی طرح نہیں جس میں روح بدن کے لئے مُقوم اور اس کی مدبر اور اس میں متصرف ہو اور بدن اس حیات کے ساتھ ان محسوس اشیاء کا محتاج ہو جن کا دنیا میں محتاج تھا بلکہ یہ اعادہ عارضی اور امتحان کے لئے ہے۔جیسا کہ صحیح احادیث اس پر دال ہیں اور یہ حیات دنیا اور آخرت کی معہود اور کامل حیات نہیں جس سے آیت کریمہ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ کی مخالفت لازم آئے۔چونکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ قبر میں ثواب و عذاب کا جسم اور رُوح دونوں پر مترتب ہونا تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ پہلے ان کی عبارت عرض کی جا چکی ہے،اس لئے ان کے نزدیک یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ سوال کے بعد پھر اس کو بالکل بے روح اور بے جان بنا دیا جاتا ہے۔کیونکہ بغیر فی الجملہ حیات کے ثواب و عذاب اور راحت و الم کس پر؟ بلکہ اس کا مطلب یہ لینا چاہئے کہ ان کے نزدیک سوال کے وقت تو بالجملہ اور کامل حیات ہوتی ہے۔پھر یہ کامل اور عارضی حیات ختم ہو جاتی ہے اور فی الجملہ اور ایک گونہ حیات باقی رہ جاتی ہے۔ان کی عبارت کے آخری حصہ کما حی خلق سے مغالطہ نہیں ہونا چاہئے۔اس میں تشبیہ صرف حیات عارضہ ہے اور ثم عادوا موتٰی دنیا میں بطور معجزہ عارضی طور پر زندہ ہونے والوں سے متعلق ہے نہ کہ اہل قبور سے جیسا کہ کسی بھی اہل فہم سے یہ بات مخفی نہیں ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ان مذھب سلف الامۃ و ائمتنا ان المیّت اذا مات یکون فی نعیم او عذاب و ان ذٰلک یحصل لروحہ و بدنہ'' (کتاب الروح ص ۶۳)

''بلاشبہ اُمت کے اسلاف اور ہمارے ائمہ کا یہ مذہب ہے کہ جب کسی شخص کی وفات ہو جاتی ہے تو وہ راحت اور عذاب میں مبتلاء ہوتا ہے اور یہ راحت و تکلیف اس کی روح اور بدن دونوں کو حاصل ہوتی ہے۔''

یہ عبارات بھی اس اَمر پر نص صریح ہیں کہ عذاب و راحت کے سلسلہ میں بدن کا رُوح سے تعلق ہوتا ہے

حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''و مذھب اھل السنۃ اثبات عذاب القبر خلافا للخوارج والمعتزلۃ و بعض المرجئۃ فانھم نفوا ذٰلک و احادیث الباب متردعلیھم ثم المعذب عند اھل السنۃ الجسد بعینہ بعد اعادۃ الروح الیہ و ماقیل ان السوال فی القبر یقع علی البدن فقط و قال بعضھم یقع علی الروح فقط فیرد علیھم قولہ ﷺ تعاد روحہ فی بعض الروایات'' (تنقیح الرواۃ ج ۱ ص ۳۱، ۳۲)

''اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ وہ عذاب قبر کو تسلیم کرتے ہیں بخلاف خوارج مُعتزلہ اور بعض مَرجئہ کے کہ وہ اس کی نفی کرتے ہیں لیکن عذاب قبر کے باب کی حدیثیں ان کے خلاف پڑتی ہیں۔ پھر اہل سنت کے نزدیک عذاب جسد عنصری کو ہوتا ہے مگر اعادہ روح کے بعد باقی جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ قبر میں سوال صرف بدن سے ہوتا ہے تو حضور ﷺ کا یہ ارشاد جو بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اس کی روح اس کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ ان اقوال کو رد کرتا ہے۔''

علم عقائد کے مسلّم امام علامہ صدر الدین علی بن محمد الاذری الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۴۷ء) لکھتے ہیں کہ: ''و کذلک عذاب القبر یکون لِلنفس و البدن جمیعا باتفاق اھل السنۃ والجماعۃ'' اسی طرح اہل سنت کے اتفاق سے عذاب قبر روح و بدن دونوں کو ہوتا ہے۔ (شرح عقیدۃ الطحاوی ص ۳۴۰، طبع مکہ مکرمہ)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ عذاب قبر روح اور بدن دونوں کو ہوتا ہے اور اس پر تمام اہل سنت والجماعت متفق ہیں۔ اس میں ان کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

علامہ آلوسی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''والجمھور علی عود الروح الی الجسد اوبعضہ وقت السوال علی وجہ لا یُحِسُّ بہ اھل الدنیا الا من شاء اللہ تعالٰی منھم و رواء ذٰلک مذاھب فمذھب ابن جریر و جماعۃ من الکرّامیہ ان السوال فی القبر علی البدن فقط و ان اللہ تعالٰی یخلق فیہ ادراکاً بحیث یسمع و یعلم و یلذ و یألم و علی ھذا المذھب یمکن ان یقال ما قیل علی الاوّل و مذھب ابن ھزم و ابن میسرۃ انہ علی الروح فقط و مذھب ابی الھذیل و اتباعہ ان المیّت لا یشعر بشئ اصلاً الا بین النفختین والحق ان الموتٰی یسمعون فی الجملۃ'' (روح المعانی ج ۲۲ ص ۵۷)

''جمہور (اہل السنت) اس کے قائل ہیں کہ روح کو پورے جسم یا بعض جسم کی طرف سوال کے وقت ایسے انداز سے لوٹایا جاتا ہے جس کو اہل دنیا محسوس نہیں کر سکتے۔ ہاں! مگر جس کو اللہ تعالٰی چاہے (تو محسوس کرا دے اور اس کے علاوہ اس مسئلہ میں کچھ اور مذاہب بھی ہیں۔ سو ابن جریر (کرّامی) اور کرّامیہ کی ایک جماعت کا یہ مذہب ہے کہ قبر میں سوال صرف بدن سے ہوتا ہے۔ بایں طور کہ اللہ تعالٰی اس میں ایک گونہ ادراک پیدا کر دیتا ہے

جس سے وہ سُننا اور جاننا اور لذّت و تکلیف محسوس کرتا ہے لیکن اس مذہب پر بھی ویسے ہی اعتراض ہے جیسا کہ پہلے پر تھا (کہ مثلاً بلا روح بدن کی حیات کا کوئی معنی نہیں) اور ایک مذہب ابن حزم رحمہ اللہ اور ابن میسرہ رحمہ اللہ کا ہے، وہ یہ کہ یہ ساری کارروائی صرف رُوح سے متعلق ہوتی ہے اور ایک مذہب ابو الہذیل اور اس کے اتباع کا ہے کہ میّت کو سرے سے کوئی شعور نہیں ہوتا۔ مگر محقّقین اولیٰ اور ثانیہ کے درمیان اور حق بات یہ ہے کہ مُردے فی الجملہ سُنتے ہیں۔

علّامہ بدر الدین ابو عبداللہ محمد بن علی البعلی الحنبلی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۷۷ھ) لکھتے ہیں کہ:

''وفی الصحاح انھا ترد الیہ بعد الموت ویسئال وترد فتکون متصلۃ بالبدن بلا ریب واللہ اعلم''

''صحیح حدیثوں میں آتا ہے کہ روح موت کے بعد بدن کی طرف لوٹائی جاتی ہے اور اس سے سوال ہوتا ہے اور پھر لوٹادی جاتی ہے مگر بلا شبہ وہ بدن سے متصل رہتی ہے۔'' (مختصر الفتاویٰ ص ۱۹۰، المصریۃ)

''امام ابو بکر الجصاص الرازی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۳۷۰ھ) لکھتے ہیں کہ: ''واذا جاز ان یکون المؤمنون قد احیوا فی قبورھم قبل یوم القیمۃ وھم منعمون فیھا جاز ان یحیی الکفار فی قبورھم فیعذبوا''

''اور جب یہ جائز ہے کہ مؤمنوں کو قیامت کے دن سے پہلے قبروں میں زندہ کیا جاتا ہے اور وہ قبور میں راحت پاتے ہیں تو جائز ہے کہ کفار کو بھی قبروں میں زندہ کیا جائے اور عذاب دیا جائے۔'' (احکام القرآن ج ۱ ص ۱۰۸)

امام تقی الدین علی بن عبدالکافی۔ السبکی الشافعی (المتوفی ۷۵٦ھ) لکھتے ہیں کہ: ''وقد اجمع اھل السنت علیٰ اثبات الحیوۃ فی القبور وقال امام الحرمین فی الشامل وقد اتفق سلف الامۃ علیٰ اثبات عذاب القبر واحیاء الموتیٰ فی قبورھم ورد الارواح فی اجسادھم وقال الفقیہ ابو بکر بن العربی فی الامد الاقصیٰ فی تفسیر اسماء الحُسنیٰ ان احیاء المکلفین فی القبر وسوالھم جمیعًا لا خلاف فیہ بین اھل السنۃ قال سیف الدین الآمدی فی کتاب ابکار الافکار اتفق سلف الامۃ قبل ظھور المخالف واکثرھم بعد ظھورہ علیٰ اثبات احیاء الموتیٰ فی قبورھم ومسئلۃ الملکین لھم واثبات عذاب للمجرمین والکٰفرین''

''قبور میں اثبات حیات پر اہل سنت کا اجماع ہے۔ امام الحرمین رحمہ اللہ اپنی کتاب شامل میں فرماتے ہیں کہ اُمت کے اسلاف اثبات عذاب قبر اور مُردوں کو قبروں میں زندہ کرنے اور ان کی اَرواح کو ان کے جسموں کی طرف لوٹانے پر متفق ہیں۔ فقیہ ابوبکر بن العربی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''امد الاقصیٰ فی تفسیر اسماء الحسنیٰ'' میں لکھتے ہیں کہ جملہ مکلّفین کے قبروں میں زندہ کرنے اور ان سے سوال کرنے میں اہل سُنّت کا کوئی اختلاف نہیں ہے امام سیف الدین آمدی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''ابکار الافکار'' میں لکھتے ہیں کہ مخالف کے ظاہر ہونے سے پہلے اُمت کے تمام اسلاف اور ظہور مخالف کے بعد اکثریت اس بات پر متفق رہی ہے کہ مُردوں کا قبروں میں زندہ کرنا اور ان سے نکیرین کا سوال اور مجرموں اور کافروں کے لئے اثبات عذاب بالکل حق ہے۔''

(شفاء السقام ص ۱۵۱، طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن)

اور پھر آگے لکھتے ہیں کہ: ''ان حیاۃ جمیع الموتیٰ بارواحھم واجسامھم فی قبورھم لا شک فیھا''

''بلا شبہ تمام مُردوں کا اپنی قبروں میں اپنی ارواح اور اجسام کے ساتھ زندہ ہونا شک سے بالاتر ہے۔''

(شفاء السقام ص ۱۵۳)

اِس عبارت سے معلوم ہوا کہ متقدمین میں اس مسئلہ کے اندر کوئی اختلاف نہ تھا کہ مُردوں کو قبروں میں زندہ کیا جاتا ہے اور ان کی ارواح کو ان کے اجساد میں لوٹایا جاتا ہے اور منکر ونکیر کا سوال ہوتا ہے۔ہاں! بدقسمتی سے بعد کو اس میں اختلاف پیدا ہوا لیکن اس اختلاف کے بعد بھی اُمت کی اکثریت متقدمین اور سلف صالحین کی ہم نوا ہی رہی ہے اور حق انہیں کے ساتھ ہے۔

مشہور مصنف اور مسلّم امام عقائد عضد الدین عبدالرحمن بن احمد الایجی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۷۵۶ھ) لکھتے ہیں کہ:''احیاء الموتٰی فی قبورھم و مسئلة منکر و نکیر و عذاب القبر للکافر و الفاسق کلھا حق عندنا و اتفق علیه سلف الامة قبل ظھور الخلاف و اتفق علیه الاکثرون بعدهٗ'' (مواقف مع الشرح ص۷۱۵ طبع نولکشور)

''مُردوں کا قبروں میں زندہ کرنا اور منکر ونکیر کا سوال اور کافر و فاسق کے لئے عذاب قبر سب مسئلے ہمارے نزدیک حق ہیں اور اختلاف سے پہلے سلف اُمت کے تمام حضرات اور اختلاف رونما ہونے کے بعد اُمت کی اکثریت ان اُمور کے حق ہونے پر متفق رہی ہے۔''

یہ عبارت بھی اس اَمر کی واضح دلیل ہے کہ قبروں میں مُردوں کے زندہ کرنے کے بارے میں اسلام کے ابتدائی اَدوار میں کوئی اختلاف نہ تھا اور اُس وقت سبھی حضرات بلا قیل وقال اس کو تسلیم کرتے تھے۔جب اختلاف پیدا ہوا تو اس کے بعد بھی اُمت مسلمہ کی اکثریت ''احیاء الموتٰی فی القبور'' اور اسی طرح دیگر بیان کردہ مسائل کے حق ہونے کی قائل رہی ہے اور حق ہمیشہ جماعت کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح فرمان اور ارشاد سے یہ ثابت ہے۔قاضی صاحب موصوف نے احیاء موتٰی کے بارے میں منکرین حیات کے اس اعتراض کو بسط سے نقل کیا ہے کہ بعض مُردوں کو درندے اور پرندے کھا جاتے ہیں اور ان کے اجزاء ان کے پیٹوں میں متفرق ہو جاتے ہیں اور بعض کو جلا کر راکھ بنا کر ہوا میں اُڑا دیا جاتا ہے اور بعض سُولی پر لٹکا دیئے جاتے ہیں۔ان میں بھلا حیات کہاں سے اور کیسے آجاتی ہے؟ اور مشاہدہ بھی اس کے خلاف ہے۔کیونکہ کسی کو ان میں حیات نظر نہیں آتی اور مشاہدہ کے خلاف قول کرنا ایک قسم کی حماقت ہے۔ (محصلہ مواقف مع الشرح ص ۷۱۷)

اس اعتراض کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے موصوف یہ لکھتے ہیں کہ:''وقد تحیر الاصحاب فی التفصی عن ھذا فقالوا ای القاضی و اتباعهٗ فی صورة المصلوب لا بُعد فی الاحیاء و المسألة مع عدم المشاھدة کما فی صاحب السکتة فانه ھی مع انا لا نشاھد حیاتهٗ و کما فی رؤیة النبی جبرائیل علیہ السلام و ھو بین اظھر اصحابه مع سترہ عنھم و قال بعضھم لا بُعد فی رد الحیوة الٰی بعض اجزاء البدن فیختص بالاحیاء و المسالة و العذاب و ان لم یکن ذٰلک مشاھدًا النا و اما الصورة الأخرٰی یعنی بھا ما یشمل الثانیة و الثالثة اذھما من وادٍ واحدٍ فان ذالک ای التمسک بھا مبنی علٰی اشتراط البنیة فی الحیوة و ھو ممنوع عندنا کما مرَّ فلا بُعد ان تعاد الحیوة الٰی الاجزاء المتضرقة او بعضھا و ان کان خلاف العادة فان خوارق العادة غیر ممتنعة فی مقدور اللہ تعالٰی کما سلف تعزیرہ۔واللہ اعلم بالصواب! (مواقف مع الشرح ص ۷۱۷)

''بلا شبہ (اہل السنت والجماعت کے) اصحاب اس مشکل سے جان چھڑانے میں حیران ہوئے ہیں۔سو قاضی (ابو بکر باقلانی رحمۃ اللہ علیہ) اور ان کے اتباع نے مصلوب کے بارے میں کہا ہے کہ اس کے زندہ کرنے اور اس

سے سوال کرنے میں، میں کوئی استبعاد نہیں۔ اگرچہ اس کا مشاہدہ نہیں ہوتا جس طرح صاحب سکتہ کہ وہ زندہ ہوتا ہے۔ حالانکہ ہم اس کی زندگی کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اور جیسے کہ آنحضرت ﷺ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں دیکھتے تھے۔ حالانکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اُن سے اوٹ میں ہوتے تھے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس میں کوئی بُعد نہیں کہ بدن کے بعض اجزاء کی طرف زندگی لوٹائی جائے۔ سو وہ بعض حصہ زندہ ہونے اور سوال اور عذاب سے مختص ہو۔ اگرچہ ہمیں اس کا مشاہدہ نہ ہو سکے اور بہرحال دوسری صورت، اس سے مراد دوسری اور تیسری دونوں صورتیں ہیں۔ کیونکہ وہ دونوں ایک ہی میدان (واُسلوب) سے ہیں۔ سو بے شک ان لوگوں کی دلیل اس بات پر مبنی ہے کہ حیات کے لئے جسم کا ڈھانچہ باقی رہنا ضروری ہے اور ہم اس کو نہیں مانتے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، سواس میں کوئی بُعد نہیں کہ اجزاء متفرقہ یا ان میں سے بعض کی طرف حیات لوٹائی جائے۔ اگرچہ یہ عادت کے خلاف ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت میں خوارق عادات بھی داخل ہیں اور وہ ممتنع نہیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے اس کا بیان ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

منکرین حیات فی القبور کا سب سے بڑا وزنی اور مرکزی اعتراض ہی یہی تھا کہ جب ڈھانچہ باقی نہیں رہتا تو حیات کہاں سے آجاتی ہے؟ اسی اشکال کو حل کرنے کے لئے اکابر اہل سنت نے یہ کہا کہ حیات کے لئے ڈھانچہ شرط نہیں ہے بلکہ اجزاء متفرقہ میں بھی حیات کا تحقق قدرت خداوندی میں داخل ہے اور بعض اجزاء کی طرف حیات کا اعادہ بھی داخل تحت القدرت ہے۔ گو عادت کے خلاف ہی سہی لیکن قدرت باری تعالیٰ مخلوق کی عادت کی پابند نہیں ہے اور اسی کو ہم نے پہلے حیات فی الجملہ سے تعبیر کیا ہے اگر جسم کے اجزاء کا نکیرین کے سوال کے سلسلہ میں دخل نہ ہوتا یا عذاب قبر کے سلسلہ میں اجزاء بدن کا واسطہ نہ ہوتا تو ان اکابر کو یہ کہہ دینے میں ہرگز کوئی تامل نہ ہوتا کہ سوال یا عذاب تو محض روح کو حاصل ہے۔ بدن اور اس کے اجزاء رہیں یا نہ رہیں لیکن یہ حضرات کسی موقع پر بھی اجزاء بدن کو فراموش نہیں ہونے دیتے۔ اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ قبر کی حیات میں بدن کا تعلق ایک طے شدہ حقیقت اور ناگزیر اُمر ہے۔ متقدمین بلا اختلاف اور متاخرین کی اکثریت قبر میں روح کے بدن کے ساتھ تعلق کی قائل ہے۔

مواقف کے شارح علامہ علی بن محمد الجرجانی المعروف بہ سید شریف رحمہ اللہ (المتوفی ۸۱۶ھ) لکھتے ہیں کہ:

”واذا ثبت التعذیب ثبت الاحیاء والمسئلة لان کل من قال بعذاب القبر قال بهما“

”اور جب میت کا مُعذّب ہونا ثابت ہوا تو اس کا زندہ کرنا اور اس سے سوال بھی ثابت ہو گیا۔ کیونکہ جو شخص عذاب قبر کا قائل ہے وہ زندہ کرنے اور سوال کا بھی قائل ہے۔“ (شرح مواقف ص ۷۱۶، طبع نولکشور)

مطلب واضح ہے کہ قبر میں عذاب اور سوال جبھی متحقق ہو سکتا ہے کہ اس میں زندگی اور حیات ہو اور جب عذاب قبر ثابت ہے تو لامحالہ میت کا قبر میں زندہ کرنا اور سوال بھی ثابت ہے۔

محقق حیث اطلق حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ”ولذا کان الحق ان المیّت المعذب فی قبرہ توضع فیه الحیوة بقدر ما یحِسُّ بالالم والبنیة لیست بشرط عند اهل السنة حتّٰی لو کان متفرق الاجزاء بحیث لا تتمیز الاجزاء بل هی مختلطة بالتراب فعذب بجعلت الحیوٰة فی تلک الاجزاء التی لا یاخذها البصر وان الله تعالٰی علٰی ذٰلک لقدیر“ (فتح القدیر ج ۲ ص ۹۹، طبع مصر)

''اور اسی لئے حق بات یہی ہے کہ جس میت کو قبر میں عذاب ہوتا ہے، اس میں اس انداز کی حیات رکھی جاتی ہے جس سے وہ تکلیف محسوس کرتا ہے اور ڈھانچے کا محفوظ رہنا اہل سنت کے نزدیک شرط نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اگر میت کے اجزاء بکھر جائیں اور خاک میں رَل مِل جائیں اور اس کو سزا دی جائے تو ان باریک اجزاء میں بھی حیات رکھی جاتی ہے جن کو نگاہ نہیں دیکھ سکتی اور اللہ تعالیٰ کو اس پر قدرت ہے۔ (اس کی شان سے یہ بعید نہیں ہے)

اور یہی حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد رشید کمال الدین محمد بن محمد المقدسی رحمہ اللہ (ایک حنفی اور دوسرے شافعی ہیں اور دونوں عقائد کے مسلّم عالم ہیں۔ (المتوفی ۹۰۵ھ) اپنی علم کلام کی مایۂ ناز کتاب المسامرہ میں منکرین کے شبہات کو نقل کر کے آگے جواب دیتے ہیں: ''و ما استحیل به ما ذکر من السوال و عذاب القبر و نعیمه من جهة ان اللذة و الالم و التکلم کل منها فرع الحیواة و العلم و القدرة و لا حیواة بلا بِنيَةٍ اذا البنية قد فسدت و بطل المزاج و من جهة کون المیّت ساکتا لا یسمع سوالنا اذا سألناه و منهم ای من الموتٰی من یحرق فیصیر رمادًا و تذروه الریاح فلا یعقل حیاة و سؤاله و اشار الٰی دفعها بقول فمجرد استبعاد لخلاف المعتاد و هو لا ینفی الامکان فان ذٰلک الامه الذی یتکلم فیه من سوال الملکین و عذاب القبر و نعیمه ممکن اولا یشترط فی الحیوة البنیة کما قدمناه و لو سلم اشتراطها جاز ان یحفظ الله تعالٰی من الاجزاء مایتأتی به الادراک بان یصلح بنیته و ان کان المیّت فی بطون السباع و قعور البحار و غایة ما فی الباب ان یکون بطن البسع و نحوه قبرًا له و لا یمتنع ان لا یشاهد الناظر منه ما یدل علٰی ذٰلک فان النائم ساکن بظاهره و هو مع ذٰلک یدرک من الاٰلام و اللذات مایحسُّ تاثیره عند یقظتِهٖ من منامه و خروج منی من جماع رأه فی منامه'' (المسامرہ مع المسایرہ ج ۲ ص ۱۱۷، ۱۱۸، طبع مصر)

''سوال قبر اور عذاب و راحت کو جو بایں وجہ محال سمجھا گیا ہے کہ لذت اور دُکھ اور گفتگو یہ حیات و علم اور قدرت کی فرع ہے اور ڈھانچے کے بغیر زندگی کہاں سے؟ کیونکہ اجزاء تو باطل ہو گئے اور ڈھانچہ ختم ہو گیا اور بایں وجہ بھی کہ میت خاموش رہتی ہے۔ جب ہم اس سے سوال کرتے ہیں تو وہ جواب نہیں دیتی اور بعض مُردے جلا کر راکھ کر دیئے جاتے ہیں اور ان کی راکھ کو ہوا اُڑا دیتی ہے تو اندریں حالات میت کی حیات اور اس سے سوال عقل کے بالکل خلاف ہے۔ مصنف رحمہ اللہ نے ان اعتراضات کو دفع کرنے کے لئے یہ جواب دیا کہ اس کو محض خلاف عادت ہونے کی وجہ سے بعید سمجھا گیا ہے اور یہ امکان کی نفی نہیں کرتا۔ کیونکہ نکیرین کا سوال اور عذاب قبر اور راحت جس کی گفتگو ہو رہی ہے بالکل ممکن ہے۔ کیونکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حیات کے لئے ڈھانچہ شرط نہیں ہے اور اگر وہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ڈھانچے سے اُن اجزاء کو درست کر دے جن سے عذاب کا ادراک ہو سکے۔ اگرچہ میت درندوں کے پیٹوں اور دریاؤں کی گہرائیوں میں ہو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ درندے وغیرہ کا پیٹ اس کے لئے قبر ہوگا اور اس سے بھی کوئی محال لازم نہیں آتا کہ دیکھنے والا میت سے عذاب وغیرہ کا کچھ اثر نہیں دیکھتا۔ کیونکہ خوابیدہ شخص بظاہر ساکن ہوتا ہے لیکن مع ہذا وہ تکالیف اور لذات کا احساس کرتا ہے اور بسا اوقات ان کا اثر بیداری کے بعد بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ مار جو اس کو بحالت نیند پڑی اس کا درد اور منی کا خروج کہ بحالت نیند اس نے جماع کیا بیداری کے بعد بھی ظاہر ہوتا ہے۔''

ماتن اور شارح کی اس طویل عبارت میں بھی یہی اَمر اُجاگر کیا گیا ہے کہ جس حیات کا قبر میں سوالِ نکیرین اور راحت اور عذاب کے لئے اثبات کیا جاتا ہے اس کے لئے ڈھانچے کا برقرار رہنا شرط اور ضروری نہیں ہے بلکہ یہ حیات اس کے بغیر بھی ثابت ہے اور اگر شرط بھی ہو تب بھی اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے کہ اس کے اجزاء میں سے وہ ضروری اجزاء جمع کر دے جن میں ادراک و شعور رکھ دیا جائے۔ اگرچہ مُردے درندوں کے پیٹ میں ہوں یا سمندر کی تہہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کیا بعید ہے؟ رہا یہ سوال کہ دیکھنے والوں کو میّت کا اُٹھنا بیٹھنا حس و حرکات چیخ و پکار کچھ نظر نہیں آتا تو یہ بجا ہے لیکن اس سے ان واردات کا جو میّت پر گزرتی ہیں انکار کرنا اور ان کا امتناع ثابت کرنا بالکل بے کار اور بے جا ہے۔ کیونکہ کوئی عقلمند اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ بسا اوقات ایک خوابیدہ شخص کو خواب میں دشمن کی مار پڑتی ہے لیکن وہ بالکل ساکن رہتا ہے اور اس کو درد اور کرب باقاعدہ محسوس ہوتا ہے اور جاگنے کے بعد وہ بعض اوقات درد کا احساس اور شکایت بھی کرتا ہے اور اکثر اوقات بحالت نیند احتلام ہو جاتا ہے اور سونے والا مجامعت کرتا اور اس کی لذت محسوس کرتا ہے اور بظاہر وہ کوئی حرکت نہیں کرتا بلکہ بالکل ساکت اور ساکن نظر آتا ہے اور جب بیدار ہوتا ہے تو منی سے اس کا پاجامہ اور تہبند وغیرہ آلودہ اور پلید ہو چکے ہوتے ہیں اور اس پر غسل لازم ہو چکتا ہے تو کیا کوئی احمق یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم اس کے پہلو میں بیدار تھے۔ اس کو کب دشمن نے پیٹا یا مجامعت کے لئے اس نے کب حرکت کی اس لئے نہ تو اس پر غسل واجب ہے اور نہ اس کا بیان درست ہے؟ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کارروائی رُوح اور جسم دونوں کے تعلق سے ہوتی ہے، نہ صرف روح سے اور نہ تنہا جسم سے۔ بس اس ادنیٰ سی نظیر اور مثال سے قبر کا سوال اور عذاب و راحت بھی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ پھر آگے یہی ماتن و شارح معتزلہ وغیرہ کا استدلال نقل کر کے اس کا رد کرتے ہیں۔

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''وقد تمسک المنکرون للسوال و عذاب القبر و نعیمہ و ھم ضرار بن عمرو وبشر المریسی واکثر متاخری المعتزلۃ بان ذٰلک یقتضی اعادۃ الحیواۃ الی البدن لفھم الخطاب ورد الجواب وادراک اللذۃ والالم و ذٰلک منتفٍ بالمشاھدۃ وذکر المصنف الجواب عن ذٰلک و توضیحہ انا نمنع اقتضاء ذٰلک عود الحیواۃ الکاملۃ الی جمیع البدن و غایۃ ما یقتضی اعادۃ الحیواۃ الی الجزء الذی بہ فھم الخطاب و رد الجواب والانسان قبل موتہ لم یکن یفھم بجمیع بدنہ بل یجزء من باطن قلبہ و احیاء جزء یفھم الخطاب و یجیب ممکن مقدور علیہ و أمور البرزخ لا تقاس بامور الدنیا'' (المسامرۃ مع المسایرۃ ج ۲ ص ۱۱۶)

''ضرار بن عمرو، بشر المریسی اور اکثر متاخرین معتزلہ نے جو قبر میں سوال عذاب اور راحت کے منکر ہیں۔ یہ دلیل پیش کی ہے کہ اگر یہ اُمور ثابت ہیں تو لازم آئے گا کہ بدن میں حیات لوٹائی جائے تاکہ میّت خطاب سمجھے اور جواب دے سکے اور لذّت و تکلیف کا ادراک کر سکے اور یہ چیز مشاہدہ سے منتفی ہے۔ مصنف نے اس کا جو جواب دیا اس کی توضیح یہ ہے کہ ہم یہ نہیں تسلیم کرتے کہ حیات کاملہ تمام بدن کی طرف لوٹ آتی ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوگا کہ ایسی جزء کی طرف حیات لوٹائی جاتی ہے جس سے فہم خطاب اور ردِ جواب محقق ہو اور انسان مرنے سے پہلے سارے بدن سے تھوڑا ہی سمجھتا تھا بلکہ اس کے دل کے اندر ایک جزء تھی جس سے وہ سمجھتا تھا اور اس جزء کا زندہ کرنا جس سے فہم خطاب اور جواب دینا ممکن ہو۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت ہے اور برزخ کے معاملات کو دُنیا کے اُمور پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔''

اس عبارت میں منکرین کے انکار کا اصل منشاء بیان کیا گیا ہے کہ وہ قبر برزخ اور آخرت کے اُمور کو اپنی نارسا عقل کی ترازو سے تولنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ قبر اور برزخ کا معاملہ دُنیا کے معاملات سے الگ تھلگ اور جداگانہ ہے، اس کا صحیح ادراک وشعور مرنے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ اس جہان میں تو صرف اس قدر ضروری ہے کہ اس کو تسلیم کیا جائے اور شک وشبہ کو قریب نہ آنے دیا جائے۔

علّامہ ابو المظفر طاهر بن محمد الاسفرائنی (المتوفی ۴۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ: ''واخبر انهم يحيون في القبور وقد ورد في معنى احياء الموتى في القبور مالا يحصى من آلاى والاخبار والآثار''

''آنحضرت ﷺ نے خبر دی ہے کہ مُردے قبروں میں زندہ کئے جاتے ہیں اور مُردوں کے زندہ کرنے کے بارے میں اس قدر آیات احادیث اور آثار وارد ہوئے ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔'' (التبصیر ص ۱۵۸)

امام ابو الیسر محمد بن محمد بن عبدالکریم البزدوی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۹۳ھ) رقمطراز ہیں: ''مسألة۔ سوال منكر ونكير في القبر حق عند اهل السنة والجماعة وهما ملكان يسألان من مات بعد ما حيي مَن ربك وما دينك ومن نبيك فيقدر المؤمن على الاجواب ولا يقدر الكافر وفيه احاديث كثيرة عن النبي ﷺ في هذا الباب ان الملكين يجيئان في القبر الى الميّت ويحيي الله الميّت فليسالان عما ذكرنا وقد انكرت المعتزلة وعامة المبتدعة هذا'' (اُصول الدین ص ۱۶۵، طبع القاہرۃ)

(ترجمہ) مسئلہ قبر میں منکر نکیر کا سوال اہل سنت والجماعت کے نزدیک حق اور وہ دو فرشتے ہیں جو مردہ سے اس کے زندہ کئے جانے کے سوال کرتے ہیں۔ تیرا رب کون ہے؟ اور تیرا دین کیا ہے؟ اور تیرا نبی کون ہے؟ مومن تو جواب پر قادر ہوتا ہے لیکن کافر جواب پر قادر نہیں ہوتا اور اس باب میں آنحضرت ﷺ کی بکثرت احادیث موجود ہیں کہ دو فرشتے قبر میں میت کے پاس آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ میت کو زندہ کر دیتا ہے۔ پس وہ فرشتے ان امور مذکورہ کے بارے میں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، سوال کرتے ہیں اور معتزلہ اور عام متبدعین نے اس کا انکار کیا ہے۔

امام موصوف کی اس عبارت سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ معتزلہ اور اکثر بدعتی قبر میں میت کی حیات اور سوال کے منکر ہیں اور اہل السنت والجماعت حیات فی القبر اور سوال کے قائل ہیں۔

نیز موصوف لکھتے ہیں کہ: ''فان قالوا تعذيب الميّت مستحيل فان الالم الّا يحصل الا بالحياة فانه لا الم الّا بالعلم ولا علم الّا بالحيواة فنقول عند اهل السنة والجماعة يحييهم الله تعالى فيعذبهم وهم احياء فان قالوا الخلاف في تعذيب الميّت وبه ورد الاخبار وعلى زعمكم فانه روى يعذب الميّت ببكاء اهله فنقول اوريد به يميت في حقنا فان في حقنا هو ميت وكذا في حق احكام الله تعالى'' (ص ۱۶۴)

''اگر وہ یہ کہیں کہ مُردہ کو عذاب دینا محال ہے۔ کیونکہ درد والم تو حیات سے ہوتا ہے، اس لئے کہ علم کے بغیر کوئی اَلم نہیں ہوتا اور حیات کے بغیر علم نہیں ہوتا تو ہم کہتے ہیں کہ اہل السنت والجماعت کے نزدیک اللہ تعالیٰ ان کو زندہ کرتا ہے اور زندہ کرنے کے بعد ان کو سزا دیتا ہے اور اگر وہ کہیں کہ اختلاف تو میّت کے سزا دینے میں ہے اور تمہارے زعم کے مطابق حدیثیں بھی اسی سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ کیونکہ وارد ہوا ہے کہ میّت کو اس کے اہل وعیال

کے رونے سے سزا ہوتی ہے تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمارے حق میں وہ میّت ہے کیونکہ وہ ہمارے حق اور اللہ تعالیٰ کے احکام (تکلیفی) کے حق میں میّت ہے۔

یعنی چونکہ ہمارے اس جہان کے اعتبار سے اس کی زندگی محسوس نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے احکام نماز روزہ وغیرہ تکلیفی احکام کے لحاظ سے بھی وہ میّت ہے۔ اس لئے اس کو میّت کہا جاتا ہے اور قبر و برزخ کے معاملہ میں وہ زندہ ہوتا ہے، اس لئے اس کو عذاب و راحت کا ادراک و شعور باقاعدہ ہوتا ہے۔

فخر المناطقة والفلاسفه امام المتكلمين حضرت ابو حامد محمد بن محمد الغزالی الشافعی رحمہ اللہ (المتوفی ۵۰۵ھ) اپنی مدلل اور مشہور علم کلام کی کتاب میں عذاب قبر وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ”واما عذاب القبر فقد دلت عليه قواطع الشرع اذ تواتر عن النبی ﷺ و عن الصحابة رضی اللہ عنہم بالاستعاذة منه فی الادعية واشتهر قوله عند المرور بقبرين انهما ليعذبان ودل عليه قوله تعالٰی وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْءُ الْعَذَابِ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا الآية و هو ممكن فيجب التصديق به و وجه امكانه ظاهر و انما تُنكره المعتزلة من حيث يقولون انا نرى شخص الميّت مُشاهدة و هو غير معذب و ان الميّت وبما تفترسه السباع و تأكله و هذا هوس اما مشاهدة الشخص فهو مشاهدة لظاهر الجسم والمدرك للعقاب جزء من القلب او من الباطن كيف كان وليس من ضرورة العذاب ظهور حركة فی ظاهر البدن بل الناظر الٰی ظاهر النائم لا يشاهد ما يدركه النائم من اللذة عند الاحتلام و من الالم عند تخيل الضرب و غيره و لو انتبه النائم واخبر عن مشاهداته و آلامه و لذاته من لم يجز له عهد بالنوم لبادر الٰی انكار اغترارًا بسكون ظاهر جسمه كمشاهدة انكار المعتزلة لعذاب القبر و اما الذی تأكله السباع فغاية ما فی الباب ان يكون بطن السبع قبرًا فاعادة الحيواة الٰی جزءٍ يدرك العذاب ممكن فما كل متألم يدرك الالم من جميع بدنه و اما سوال منكر و نكير فحق والتصديق به واجب لورود الشرع به و امكانه فان ذٰلك لا تستدعی منهما الا تفهيما بصوت او بغير صوتٍ و لا يستدعی منه الا فهما و لا يستدعی الفهم الا حياة والانسان لا يُفهم بجميع بدنه بل بجزء من باطن قلبه و احياء جزء يفهم السوال و يجيب ممكن مقدور عليه“

(الاقتصاد فی الاعتقاد ص ۹۷، طبع قاہرہ)

”بہرحال عذاب قبر کے اثبات پر شریعت حقّہ کی قطعی دلیلیں قائم ہیں۔ آنحضرت ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تواتر سے ثابت ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں عذاب قبر سے پناہ مانگتے تھے اور آپ کی یہ حدیث بھی مشہور ہے کہ جب آپ دو قبروں کے پاس سے گزرے تو فرمایا کہ ان کو عذاب ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اس کی دلیل ہے کہ فرعونیوں کو سخت عذاب نے گھیر لیا وہ آگ ہے جس پر صبح و شام ان کو پیش کیا جاتا ہے اور عذاب قبر ممکن بھی ہے۔ لہٰذا اس کی تصدیق واجب ہے اور امکان کی وجہ ظاہر ہے۔ معتزلہ نے اس کا اس لئے انکار کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم میّت کو عیاناً دیکھتے ہیں اور اس کو کوئی عذاب نہیں ہوتا اور بعض اوقات میّت کو درندے چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں لیکن یہ ان کا مَن بھاتا اور غلط نظریہ ہے۔ کیونکہ مشاہدہ تو ظاہری جسم کا ہوتا ہے اور عذاب کا ادراک کرنے

والی جزء دل یا باطن میں ہوتی ہے کچھ بھی ہو عذاب سے یہ لازم نہیں آتا کہ ظاہری بدن پر بھی حرکت ہو بلکہ سونے والے شخص کے ظاہری جسم کو دیکھنے والا شخص اس لذت کا مشاہدہ نہیں کرسکتا جس کا احساس خوابیدہ کو احتلام کے وقت ہوتا ہے اور اس دَرد کا ادراک بھی بیدار شخص نہیں کرسکتا جس کا سونے والا مار پٹائی کے تخیل سے احساس کرتا ہے۔ اگر سونے والا شخص بیدار ہونے کے بعد اپنی تکالیف اور لذات کے وہ مشاہدات جو اس پر گزرے ہیں کسی ایسے شخص کو بتلائے جو نیند کے اس ماجرا سے نا آشنا ہے تو وہ یقیناً اس کا فٹ انکار کردے گا۔ کیونکہ وہ تو بظاہر اس کے سکون جسم سے دھوکہ کھائے گا جیسا کہ معتزلہ نے اپنے مشاہدہ کی بناء پر عذاب قبر کا انکار کردیا ہے۔ رہا وہ شخص جس کو درندے کھا گئے ہوں تو اس باب میں جو آخری بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ درندے کا پیٹ اس کے لئے قبر ہو جائے گا۔ سو ایسی جزء کی طرف اعادہ حیواۃ جس سے ادراک عذاب ہو سکے بالکل ممکن ہے۔ کیونکہ دَرد میں مبتلاء ہر شخص تمام بدن سے درد کا ادراک نہیں کیا کرتا، اسی طرح منکر ونکیر کا سوال بھی حق ہے اور اس کی تصدیق واجب ہے۔ کیونکہ نکیرین کا سوال صرف اس بات کو چاہتا ہے کہ وہ آواز سے یا بغیر آواز کے اس کو مفہوم سمجھادیں اور وہ اس کو سمجھ لے اور یہ فہم وعلم صرف حیات کو چاہتا ہے اور انسان تمام بدن سے نہیں سمجھتا بلکہ دل کے اندر ایک جزء سے سمجھا کرتا ہے اور ایسی جزء کا زندہ کردینا جس سے وہ سوال سمجھے اور جواب دے سکے ممکن اور داخل تحت القدرت ہے۔''

یہ عبارت بھی اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل روشن اور بے غبار ہے۔ مزید تشریح کی حاجت نہیں۔

علامہ مسعود بن عمر۔ سعد الدین تفتازانی الشافعی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ: ''ویجوز ان یخلق اللہ تعالٰی فی جمیع الاجزاء او فی بعضھا نوعا من الحیواۃ قدر ما یدرک الم العذاب ولذۃ التنعیم وھذا لا یستلزم اعادۃ الروح الٰی بدنہ ولا ان یتحرک ویضطرب'' (شرح عقائد ص ۷۷)

''اور جائز ہے کہ اللہ تعالٰی میت کے تمام اجزاء میں یا بعض میں ایک گونہ حیات پیدا کردے جس سے وہ عذاب کا درد اور خوشی کی لذت کا ادراک کرسکے اور اس کو مستلزم نہیں کہ (مکمل طور پر) روح اس کے بدن کی طرف لوٹائی جائے اور نہ اس کو مستلزم ہے کہ وہ حرکت واضطراب اور جنبش بھی کرلئے۔''

اس عبارت میں علامہ موصوف نے اُصولی طور پر دو اَمر ذکر کئے ہیں:

(۱) اَوّل: یہ کہ قبر میں میت کے تمام یا بعض اجزاء میں ایک گونہ حیات پیدا کی جاتی ہے جس سے وہ قبر میں عذاب کا دُکھ اور خوشی وراحت کا سکھ ادراک کرسکتی ہے اور سوال قبر اور عذاب وراحت کے لئے اتنی ہی حیات کافی ہے اور ایسی حیات جائز اور ممکن ہے۔ اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ میت میں کامل اور پوری حیات ہو جس طرح دُنیا میں تھی یا قیامت کو ہوگی؟ اور جس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اُٹھتا بیٹھتا۔ نقل وحرکت اور جنبش کرتا اور اختیاری افعال کرتا نظر آتا ہو۔ علامہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی کامل اور مطلق حیات قبر میں نہیں ہوتی اور معتزلہ وغیرہ کا شبہ بھی یہی تھا کہ اگر اس میں حیات ہے تو پھر اس کے آثار کیوں نظر نہیں آتے؟ اسی شبہ کا ازالہ علامہ موصوف نے کردیا کہ یہ حیات قبر میں نہیں تاکہ تمہیں اس کے آثار اور اعلام نظر آسکیں۔ علاوہ ازیں اگرچہ علامہ موصوف کا معتزلہ کے جواب میں یہ ارشاد

ایک حد تک کافی ہے، جس میں انہوں نے جسم کے تعلق سے ایک گونہ حیات تسلیم کی ہے۔ لیکن علامہ عبدالعزیز فرہاروی رحمہ اللہ اس پر بھی مطمئن نہیں ہیں۔

چنانچہ وہ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ کے اس قول وارشاد ''وھذا الا یستلزم اعادة الروح فی البدن'' پر گرفت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: ''وعندی فی ھذا الجواب بحث وھو ان الاحادیث الصحیحة ناطقة بان الروح یعاد فی الجسد عند السوال فالجواب بانکار الاعادة غیر موجّہ'' (نبراس ص ۳۲۳)

''میرے نزدیک اس جواب میں کلام ہے وہ یہ کہ صحیح حدیثیں صراحت سے دلالت کرتی ہیں کہ سوال کے وقت رُوح جسم میں لوٹائی جاتی ہے تو پھر رُوح کے لَوٹائے جانے کا انکار کر کے جواب کیونکر درست ہوسکتا ہے؟

مطلب صاف ہے کہ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ کا اعادہ روح فی البدن کا انکار کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ صحیح احادیث کے خلاف ہے۔

پھر اسی پر بحث کرتے ہوئے علامہ فرہاروی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وحاصل الجواب ان الحیواة للمیت لیست کحیواة غیرہ باعادة الروح فی الجسد اعادة کاملة'' (ص ۳۲۳)

''اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ میت کی زندگی دوسروں کی زندگی کی طرح نہیں ہوتی کہ اس کے بدن میں روح پوری طرح لوٹائی جائے۔''

یعنی بایں طور کہ روح بدن میں تدبیر وتصرف کرے اور حسّی طور پر بدن خوراک، پانی اور لباس وغیرہ کا محتاج جیسا کہ دنیا میں تھا روح کا بدن کی طرف اس طور پر اعادہ نہیں ہوتا اور پہلے حافظ ابن القیم رحمہ اللہ وغیرہ کی عبارتوں میں اس کی مزید تشریح گزر چکی ہے۔

علامہ شمس الدین الخیالی رحمہ اللہ معتزلہ وغیرہ کے اس سوال کا کہ میت کو جب درندے کھا چکے ہوں اور اس کے اجزاء ہی متفرق ہو چکے ہوں تو عذاب کیسے ہوسکتا ہے؟

جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''واما تعذیب المأکول بخلق نوع من الحیواة فی بطن آلا کل فواضح الامکان کدودة فی الجوف وفی خلال البدن فانھا تتألم وتتلذذ بلا شعور منا'' (الخیالی ص ۱۱۸)

''بہر حال جس میت کو کوئی جانور کھا گیا ہو اس کو بایں طور سزا دینا کہ کھانے والے کے پیٹ میں ایک گونہ حیات اس میں پیدا کردی جائے، اس کا روشن امکان ہے جس طرح کہ ہمارے پیٹ اور بدن کے (زخم کے) درمیان کوئی کیڑا ہوتا ہے۔ اس کو تکلیف بھی ہوتی ہے اور لذت بھی مگر ہمیں بالکل شعور نہیں ہوتا۔''

اگر عذاب صرف بدن کو ہوتا تو اس میں بخلق نوع من الحیواة ایک گونہ حیات تسلیم کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اسی طرح اگر محض روح کو عذاب ہوتا جیسے کہ ابن حزم رحمہ اللہ اور ابن میسرة رحمہ اللہ وغیرہ کا خیال ہے تو میت کو کھا جانے والے کے پیٹ میں کھائے ہوئے اجزاء میں ایک گونہ حیات ثابت کرنے کی حاجت بھی باقی نہ رہتی اور اگر صرف بدن مثالی کو عذاب ہوتا ہے تو وہ کھانے والے کے پیٹ میں نہیں جاتا۔ اس کے پیٹ میں جس بدن کے اجزاء جاتے ہیں وہ تو جسد عنصری کے اجزاء ہیں عقلمند اور منصف مزاج آدمی کے لئے یہ بات بالکل کافی ہوگی کہ یہ اکابر اجزاء بدن کی حیات اور ان کے معذّب ہونے کے لئے امکانِ بعید کو بھی نہیں چھوڑتے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اگر

سزا اور خوشی صرف بدن مثالی کو ہوتی ہے تو اس کا ذکر کیوں نہیں کرتے؟ کتب عقائد و فقہ کی تمام کتابوں کو چھان ڈالئے ایک حوالہ بھی جمہور اہل سنت کے طریق سے ایسا نہیں ملے گا جس سے یہ ثابت ہو کہ قبر میں سوال یا عذاب وآرام صرف بدن مثالی کو ہوتا ہے۔ اگر یہ بات ان کے نزدیک کچھ بھی وزن رکھتی تو کم از کم احتمال کے ہی درجہ میں وہ اس کا ذکر کر دیتے۔ یہ یاد رہے کہ علامہ خیالی رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ کو ذہن نشین کرنے کے لئے یہ ایک مثال دی ہے۔ ملا احمد جند رحمۃ اللہ علیہ کا اس کو قیاس بنا کر یہ ارشاد فرمانا کہ یہ قیاس مع الفارق ہے۔ اس لئے کہ کیڑا جزو بدن نہیں ہوتا بلکہ اس سے ملابس ہوتا ہے۔ (حاشیہ شرح عقائد مصری ص ۱۱۵، بحوالہ ندائے حق ص ۲۲۹)

صحیح نہیں ہے کیونکہ علماء عقائد نے تصریح کی ہے کہ بدن کے جو اَجزاء کھانے والے کے پیٹ میں جاتے ہیں اور پھر وہ اجزاء بدن بنتے ہیں۔ وہ زائد اور فالتو اجزاء ہوتے ہیں، اجزاء اصلیہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''والاجزاء الماکولة فضلة فی الاکل لا اصلية'' (شرح عقائد ص ۷۹)

یعنی جو اجزاء کھائے جاتے ہیں اور کھانے والے کے پیٹ میں پہنچتے ہیں، وہ زائد اور فالتو اجزاء ہیں۔ (مثلاً گوشت اور چربی وغیرہ) اصلی اجزاء نہیں ہوتے اور جن اجزاء کا قیامت کے دن اعادہ ہوگا یا جن اجزاء کے ساتھ قبر اور برزخ میں روح کا تعلق قائم کیا جاتا ہے وہ اجزاء اصلیہ ہیں، گو وہ ذرہ ذرہ ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ علاوہ ازیں جو پروردگار راکھ کے ذرّات کو جمع کر کے ان سے انسان بنا کر اس سے سوال کر سکتا ہے وہ اپنی قدرت کاملہ سے کھائے ہوئے تمام اجزاء کو جمع کر کے ان سے انسان بنا سکتا ہے۔ صرف مضبوط ایمان اور پختہ عقیدہ کی ضرورت ہے۔ معتزلہ کے شکوک سے ہی آدمی لیس نہ ہو۔ چنانچہ مؤلف (ندائے حق ص ۱۶۲) میں مولانا عبدالحق صاحب حقانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب عقائد الاسلام کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: ''انسان کے اجزائے اصلیہ وہی ذرّات ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے عہد لینے کے لئے نکالے گئے تھے۔ پس روح کا تعلق بعد از مرگ انہی اجزاء اصلیہ اور ان ذرّات کے ساتھ ہے۔'' لیکن یہ اجزاء نفس ناطقہ نسمہ نہیں کہلاتے۔ جیسا کہ مؤلف کا (ندائے حق ص ۲۱۲) میں یہ وہم ہے نسمہ کے معنی روح کے ہیں جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''اَلنَّسَمَةُ''

نفحات الروح (المسوی ج ۲ ص ۵۱۰) خیالی کے مشہور محشی علامہ ایوبی اس مسئلہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''واعلم ان المذاهب فی هذا المقام ثلاثة الاوّل المیّت حی فی قبره فیعذب و هذا هو مذهب اهل السنة والحق والثانی انه جماد لا یعذب ولا یدرک العذاب و هذا هو مذهب جمهور المعتزلة والروافض والثالث انه جماد یعذب و هذا مذهب الصالحیة من المعتزلة و مذهب ابن جریر'' (ص ۱۱۸)

''تو جان کہ مذاہب اس مقام میں تین ہیں: (۱) پہلا مذہب اہل سنت اور اہل حق کا ہے وہ یہ کہ میّت کو قبر میں حیات حاصل ہوتی ہے جس سے اس کو عذاب ہوتا ہے۔ (۲) دوسرا جمہور معتزلہ اور روافض کا مذہب ہے وہ یہ کہ میّت بالکل جماد ہوتی ہے نہ تو اس کو عذاب ہوتا ہے اور نہ ادراکِ عذاب اور تیسرا مذہب معتزلہ کے صالحیہ فرقہ اور ابن جریر (کرامی) کا ہے وہ یہ کہ میّت میں رُوح بالکل نہیں ہوتی اور مع ہذا اس کو عذاب ہوتا ہے۔''

یہ عبارت بھی بالکل صاف اور بے غبار ہے علمی طور پر اس میں بھی کوئی اشکال نہیں ہے۔ مولانا عبدالحکیم بن شمس الدین سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۰۶۷ھ) جو اپنے وقت کے متبحر محقق اور نکتہ رس عالم تھے، قبر میں حیات کی تحقیق

کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ: ''لا یخفی علیک ان لیس المراد بالحی ھھنا ما یعاد فیہ الروح و یصدر عنہ الافعال الاختیاریۃ بل ما یدرک الالم واللذۃ فاذا خلق اللہ فیھا ادراکا یکون سببًا لادراک الالم واللذۃ یکون حیًا لا جمادًا'' (عبدالحکیم علی الخیالی ص ۱۱۸)

''یہ بات تجھ پر مخفی نہ رہے کہ زندہ سے مراد اس مقام پر وہ زندہ نہیں جس میں (بکمالہ) روح داخل ہو اور اس سے اختیاری طور پر افعال سرزد ہوں بلکہ ایسا زندہ مراد ہے جو دُکھ اور لذّت کا ادراک کر سکے۔ جب اللہ تعالیٰ اس میں ایسا ادراک پیدا کردے جو دُکھ اور لذّت کے احساس کرنے کا سبب بن جائے تو وہ زندہ ہوگا نہ کہ جماد۔''

مولانا سیالکوٹی رحمہ اللہ نے بھی وہی کچھ ارشاد فرمایا جو دیگر علماء وعقائد اور متکلمین کہتے ہیں کہ عذاب اور آرام کا تعلق بدن مادّی اور عنصری کے ساتھ ہے اور وہ بھی حیات کے بعد نہ بایں طور پر کہ وہ جماد کا جماد رہے اور اس میں سرے سے حیات ہی نہ ہو۔ ہاں! یہ بات جدا ہے کہ زندہ سے اس مقام پر وہ زندہ مراد نہیں جس میں سو فیصدی روح داخل ہو اور اس سے اختیاری طور پر افعال صادر ہوں کہ دوسرے لوگ بھی ان کا احساس کر سکیں۔ جیسا کہ دنیا میں تھا یا قیامت کو ہوگا بلکہ زندہ سے اس مقام پر وہ زندہ مراد ہے جس میں ایسا ادراک وشعور پیدا کردیا جائے جس سے اس کو عذاب وآرام اور الم ولذت کا ادراک اور احساس ہو سکے۔ جب یہ کیفیت اس میں متحقق ہو جائے تو وہ زندہ کہلائے گا نہ کہ جماد۔

مولانا عبدالعزیز فرہاروی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''یکون حینئذ حیا لا جمادًا محضًا و لیس الحیواۃ منحصرۃ فیمن یفعل الافعال الاختیاریۃ'' (نبراس ص ۳۲۱)

''کہ اس وقت (روح کے تعلق سے) وہ زندہ ہوگا نہ کہ جمادِ محض اور حیات اسی میں منحصر نہیں ہے کہ اس سے افعال اختیاریہ صادر ہوں۔''

یعنی حیات فی القبر کے لئے افعال اختیاریہ کا سرزد ہونا ضروری نہیں ہے جیسا کہ اس جہان کی زندگی میں وہ اس سے صادر ہوتے تھے۔

علم کلام کے مشہور محقق عالم علامہ ابوشکور السالمی رحمہ اللہ (محمد بن عبدالسعید بن شعیب الکبشی رحمہ اللہ) عذاب قبر کی تحقیق کرتے ہوئے باطل فرقوں کو جواب دیتے ہوئے اثنائے کلام میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ: ''فاذا کان الروح متصلا بالشخص سواء کان عظماً او لحمًا او ترابا فانہ یتألم''

(ترجمہ) جب روح کا بدن سے تعلق ثابت ہے تو بدن کو الم دکھ پہنچے گا۔ عام اس سے کہ بدن ہڈی یا گوشت یا مٹی ہو جائے۔ (تمہید ص ۱۲۵، طبع لاہور)

اس عبارت میں بھی بدن مادّی اور عنصری کو نظر انداز نہیں کیا گیا بلکہ اس کو مدار کلام بنایا ہے۔

عالم ربانی محقق جلال الدین الدوانی رحمہ اللہ (المتوفی ۹۲۸ھ) عذاب قبر کی بحث میں لکھتے ہیں کہ: ''واختلف الناس فی عذاب ثم اختلف ھؤلاء فمنھم من اثبت التعذیب و انکر الاحیاء و ھو خلاف العقل و بعضھم لم یثبت التعذیب بالفعل بل قال تجمع آلا لام فی جسدہ فاذا حشر احس بھا دفعۃ و ھذا انکار لعذاب القبر بالحقیقۃ و منھم من قال باحیائہ لکن من غیر اعادۃ الروح و منھم من قال بالاحیاء و اعادۃ

الروح معًا ولا یلزم ان یری اثر الحیواۃ فیہ حتی ان الماکول فی بطن الحیوانات یحیی ویسئل وینعم ویعذب ولا ینبغی ان ینکر لان من اخفی النار فی الشجر الاخضر قادر علی اخفاء العذاب والنعیم''

(الدوانی علی العقائد العضدیۃ ص ۹۳ طبع علیمی دہلی)

''عذاب قبر کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے ایک قوم نے عذاب قبر کا کلیۃً انکار کیا ہے۔ (یہ لوگ ملحد ہیں۔ عبدالحکیم علی الدوانی ص ۹۳) اور دوسرے عذاب قبر کو تسلیم کرتے ہیں، پھر ان میں بھی اختلاف ہے۔ ان میں ایک فرقہ کہتا ہے کہ عذاب تو ثابت ہے لیکن مردہ کو زندہ نہیں کیا جاتا۔ لیکن یہ قول خلاف عقل ہے اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ فی الحال مُردہ کو عذاب نہیں ہوتا بلکہ تمام تکالیف کو اس کے جسم میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ جب قیامت کے دن اس کو اُٹھایا جائے گا تو اس وقت تمام تکالیف کا اس کو احساس ہوگا۔ درحقیقت اس قول میں بھی عذاب قبر کا انکار ہے اور تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس کو زندہ کیا جاتا ہے، مگر (بکمالہ) روح اس میں نہیں لوٹائی جاتی اور چوتھا گروہ کہتا ہے کہ اس کو زندہ کیا جاتا ہے اور روح اس کی طرف لوٹائی جاتی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زندگی کا اثر اس میں دیکھا جا سکے۔ یہاں تک کہ جس مردہ کو حیوان کھا جائیں تو اس کو ان حیوانوں کے پیٹ میں زندہ کیا جاتا ہے اور اس سے سوال ہوتا ہے اور اس کو راحت و تکلیف دی جاتی ہے اور اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں جو ذات سبز درخت میں آگ کو مخفی رکھ سکتی ہے، اس کو عذاب و راحت کو (مخلوق سے) چھپانے پر بھی قدرت ہے۔''

محقق دوانی رحمہ اللہ نے اس عبارت میں عذاب قبر تسلیم کرنے والوں کے چار فرقے اور گروہ ذکر فرماتے ہیں۔ ایک کو تو خلاف عقل کہہ کر رَد کر دیا ہے اور دوسرے گروہ کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا کہ یہ گروہ عذاب قبر کو تسلیم کرنے کے دعویٰ کے باوجود درحقیقت عذاب قبر کا منکر ہے اور تیسرے اور چوتھے گروہ کے مسلک کو نقل کر کے ان پر کوئی گرفت نہیں کی بلکہ چوتھے گروہ کی طرف سے دلیل بھی پیش کر دی ہے اور بظاہر محقق دوانی رحمہ اللہ اسی مسلک کے قائل معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ اہل علم اُسلوب کلام سے بخوبی یہ سمجھ سکتے ہیں۔ رہا تیسرا گروہ تو اس کو بھی وہ حق پر سمجھتے ہیں۔ اس گروہ کا مسلک یہ ہے کہ مُردہ کو قبر میں زندہ تو کیا جاتا ہے، مگر رُوح کا بکمالہ اعادہ اس کی طرف نہیں ہوتا بلکہ اسی حد تک ہوتا ہے جس سے اس کو الم و عذاب اور لذت و سرور اور جواب و سوال کا ادراک شعور اور احساس ہو سکے۔

چنانچہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی رحمہ اللہ اس کو شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''قولہ من غیرہ اعادۃ الروح بل قدر مایدرک الالم واللذۃ والجواب والسوال'' (عبدالحکیم ص ۹۳، علی الدوانی)

یعنی ان کے قول ''من غیر اعادہ الروح'' کا یہ مطلب ہے کہ اس قدر روح کا تعلق اس سے قائم کیا جاتا ہے جس سے وہ الم ولذّت اور جواب و سوال کا ادراک کر سکے۔''

حضرت امام غزالی رحمہ اللہ اپنی مشہور متداول اور مفید کتاب ''احیاء العلوم'' میں موت کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''ولا یبعد ان تعاد الروح الی الجسد فی القبر ولا یبعد ان تؤخر الی یوم البعث واللہ اعلم بما حکم بہ علی کل عبدٍ من عبادہٖ و انما تعطل الجسد بالموت یضاھی تعطل اعضاء الزمن لفساد مزاج یقع فیہ و بسدۃ تقع فی الاعصاب تمنع نفوذ الروح فیھا فتکون الروح العالمۃ العاقلۃ المدرکۃ باقیۃ مستعملۃ لبعض الاعضاء وقد استعصی علیھا بعضھا'' (احیاء العلوم ج ۴ ص ۴۰۹، طبع مصر)

''اور اس میں کوئی بُعد نہیں کہ قبر میں جسم کی طرف (فی الجملہ) روح لوٹائی جائے اور اس میں بھی کوئی بعد نہیں کہ (بکمالہ) جسم کی طرف روح کے لوٹانے کو قیامت تک مؤخر کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر کوئی حکم نافذ کرتا ہے تو اس کہ وہ بخوبی جانتا ہے موت کی وجہ سے جسم کے معطل ہونے کی ایسی مثال ہے، جیسے فساد مزاج یا اعصاب میں سُدہ آجانے کی وجہ سے اعضاء مفلوج اور شل ہو جاتے ہیں اور دوران خون اور نفوذ روح میں رکاوٹ آجاتی ہے۔ حالانکہ روح جو علم و عقل اور ادراک سے متصف ہوتی ہے، وہ باقی رہتی ہے۔ بعض اعضاء اس کے تصرف میں ہوتے ہیں اور بعض شل ہونے کی وجہ سے اس کا اثر قبول نہیں کرتے۔''

یعنی جس طرح مفلوج اور شل اعضاء بظاہر دوسرے اعضاء کی بہ نسبت بے حس و حرکت معلوم ہوتے ہیں اور سوکھے اور پتلے نظر آتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ کلیۃً روح کا تعلق ہی ان سے منقطع ہو جاتا ہے۔ ہاں! یہ بھی درست ہے کہ جس طرح روح کا تعلق دیگر اعضاء صحیحہ سے ہوتا ہے وہ فالج زدہ اور شل اعضاء سے نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ روح باوجود مکمل کوشش کے مفلوج اعضاء میں پورا اثر نہیں کر سکتی۔ بس اسی طرح موت کے بعد جسم کی مثال ہے کہ روح کا جسم سے ایک گونہ تعلق ہوتا ہے لیکن یہ تعلق دنیوی تعلق سے الگ اور حس سے بالاتر ہے۔

اور حافظ بدر الدین العینی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''ومن یعذب فی القبر توضع فی الحیوۃ علی الصحیح وان اختلفوا فی کیفیتھا'' (عینی شرح کنز ص ۱۶۳)

''اور جس شخص کو قبر میں عذاب دیا جاتا ہے صحیح مذہب کے رُو سے اس میں زندگی رکھی جاتی ہے۔ اگرچہ اس زندگی کی کیفیت میں علماء کا اختلاف ہے۔''

علامہ نیشاپوری رحمہ اللہ شہداء کی حیات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''ثم ان اکثر المفسرین علی انھم احیاء فی الحال فمن الجائز ان یجمع اللہ تعالٰی من اجزاء الشھید جملۃ فیحییھا ویوصل الیھا التنعیم وان کانت فی حجم الذرۃ فیری معظم جسد الشھید میتا فلا یختش بحیاتہ''

''اکثر مفسرین کرام رحمہم اللہ اس کے قائل ہیں کہ شہداء فی الحال زندہ ہیں تو یہ اَمر بالکل ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ شہید کے جسم کے اجزاء کا ایک حصہ جمع کر کے اس میں حیات ڈال دے اور اس کو راحت پہنچائے۔ اگرچہ وہ حصہ ذرّہ برابر ہو اور شہید کا باقی تمام جسم مُردہ نظر آئے اور اس کی حیات کا احساس نہ ہو سکے۔''

(تفسیر نیشاپوری برحاشیہ طبری ج ۲ ص ۴۴، طبع مصر)

''اس عبارت میں بھی یہ حقیقت واشگاف کی گئی ہے کہ قبر و برزخ میں حیات کا یہ مطلب نہیں کہ دیکھنے والوں کو اس حیات کا احساس ہو اور نہ یہ مطلب ہے کہ بقدرِ ضرورت حیات کے لئے جسم مادی سے قطع نظر درست ہے۔ اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے کہ شہید کے مادّی اور عنصری جسم کے اعضاء سے ایک ایسا حصہ جمع کر دے جس میں ایک گونہ حیات پیدا کر دے۔ چاہے وہ حصہ ذرّہ بھر ہی کیوں نہ ہو اور راحت و نعمت کا تعلق اس سے وابستہ کر دیا جائے۔

اور امام ابو البرکات عبد اللہ بن احمد النسفی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۰۱ھ) اپنی فقہ کی مشہور کتاب ''الکافی شرح الوافی'' میں عذاب قبر کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''فانہ ثابت عند اھل السنۃ وان اختلفوا فیما بینھم فقال بعضھم نؤمن باصل العذاب و نسکت عن الکیفیۃ لان الواجب علینا تصدیق

ماورد به السنة المستفيضة وهو التعذيب بعد الموت فنؤمن به ولا نشتغل بكيفيته وعند العامة توضع فيه الحيواة بقدر ما يتألم لا الحيواة المطلقة وقيل توضع فيه الحيواة من كل الوجه" (بحوالہ مائۃ مسائل ص ۴۷)

"عذاب قبر اہل سنت کے نزدیک ثابت ہے۔ اگرچہ (اس کی کیفیت کے بارے میں ان کا) آپس میں اختلاف ہے۔ بعض یوں کہتے ہیں کہ ہم نفس عذاب کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کی کیفیت سے خاموشی اختیار کرتے ہیں کیونکہ ہم پر واجب ہے کہ ہم سنت مشہورہ سے جو چیز ثابت ہے، اس کی تصدیق کریں اور وہ مرنے کے بعد عذاب ہے۔ سو ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی کیفیت کے درپے نہیں ہوتے اور اکثر کے نزدیک میت میں اس انداز کی حیات ڈالی جاتی ہے جس سے اس کو سزا کا ادراک ہو سکے۔ کامل حیوٰۃ اس میں نہیں ہوتی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں من کل الوجہ زندگی ڈالی جاتی ہے۔

مشہور حنفی فقیہ علامہ محمد بن عابدین الشامی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۵۲ھ) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "ولا يرد تعذيب الميّت في قبره لانه توضع فيه الحيواة عند العامة بقدر ما يحس بالالم والبنية ليست بشرط عند اهل السّنة بل تجعل الحيواة في تلك الاجزاء المتفرقة لا يدركها البصر"

"اور یہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا کہ میت اور بے جان کو قبر میں سزا کیسے دی جاتی ہے۔ کیونکہ اکثر علماء کے نزدیک اس میں اس قدر حیات ڈالی جاتی ہے جس سے وہ تکلیف کا احساس کر سکتی ہے اور ڈھانچے کا باقی رہنا اہل سنت کے نزدیک شرط نہیں ہے بلکہ یہ حیات ایسے اجزاء متفرقہ میں پیدا کی جاتی ہے جن کو نگاہ محسوس نہیں کر سکتی۔"

(شامی ج ۳ ص ۲۰۱، طبع مصر)

یعنی حیات کا تعلق ان اجزاء سے قائم کیا جاتا ہے جو مادّی اور عنصری جسم سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ اجزاء پریشان ہی کیوں نہ ہوں اور نگاہ بھی ان پر نہ پڑ سکے۔

بیہقیٔ وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۲۵ھ) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "فان قيل بعض الاحاديث الصحاح تدل على ان ارواح المؤمنين حتى الانبياء وارواح الكفار كلها في القبور كما ورد في حديث البراء رضی اللہ عنہ الطويل يقول الله تعالى في حق المؤمن اكتبوا كتاب عبدي في عليين واعيدوه الى الارض فانى منها خلقتهم وفيها اعيدهم ومنها اخرجهم تارة أخرى فيعاد روحه في جسده وكذا قال في الكافر فيعاد روحه في قبره قال ابن عبد البر رحمہ اللہ هذا اصح ما قيل وقد رأى النبي صلی اللہ علیہ وسلم موسىٰ علیہ السلام في قبره يصلي ليلة اسرى به وانه صلی اللہ علیہ وسلم قال من صلّى علىّ عند قبري سمعتهٗ ومن صلّى علىّ غائباً بلغتهٗ فكيف التطبيق قلنا وجه التطبيق ان مقر ارواح المؤمنين في عليين او في السماء السابعة ونحو ذٰلك كما مرّ ومقر ارواح الكفار في سجين ومع ذٰلك لكل روح منها اتصال بجسده في قبره لا يدرك كُنهٗ الا الله تعالىٰ وبذلك الاتصال يصح ان يعرض على الانسان المجموع المركب من الجسد والروح مقعده من الجنة او النار ويحسّ الالذة او الالم يسمع سلام الزائر ويجيب المنكر والنكير ونحو ذٰلك مما ثبت بالكتاب والسنة كما ان جبرائيل علیہ السلام مع كون مستقره من السمٰوٰت كان يدنو من النبي صلی اللہ علیہ وسلم حتى يضع يديه على فخذيه قال الشعبي في بحر الكلام هي متصلة باجسادها فتعذب الارواح ويتألم الاجساد منها كالشمس في السماء ونورها في الارض والله تعالىٰ اعلم" (تفسیر مظہری ج ۱۰ ص ۱۲۴، ۱۲۵)

''پس اگر یہ کہا جائے کہ بعض صحیح حدیثیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مؤمنوں کی روحیں بلکہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی اور کفار کی جملہ روحیں قبور میں ہوتی ہیں۔ جیسا کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤمن کے حق میں فرماتے ہیں کہ میرے بندے کا نامہ عمل علیین میں لکھ دو اور اُسے زمین کی طرف لوٹا دو، کیونکہ میں نے ان کو زمین ہی سے پیدا کیا ہے اور اسی میں ان کو لوٹاؤں گا اور اسی سے ان کو دوبارہ نکالوں گا۔ پس روح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی۔ ہے اور اسی طرح کافر کے بارے میں فرمایا کہ اس کی روح قبر میں لوٹائی جاتی ہے۔ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سب سے زیادہ صحیح بات ہے جو کی گئی ہے اور معراج کی رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قبر میں نماز پڑھتے دیکھا اور آپ نے فرمایا کہ جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھتا ہے تو میں اس کو خود سنتا ہوں اور جو مجھ پر غائبانہ درود پڑھتا ہے تو وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے تو ان مختلف احادیث میں تطبیق کیسے ہوگی؟ ہم کہتے ہیں کہ اس طور پر ہے کہ مؤمنوں کی ارواح کا مستقر علیین یا ساتواں آسمان اور اس کی مانند کوئی اور جگہ ہے جیسا کہ گزر چکا ہے اور کفار کی ارواح کا ٹھکانہ سجین ہے لیکن بایں ہمہ ہر روح کا جسم کے ساتھ قبر میں تعلق ہے جس کی حقیقت بجز پروردگار کے کوئی نہیں جانتا اور اس اتصال کی وجہ سے صحیح ہے کہ انسان پر جو جسم اور روح دونوں کے مجموعہ اور مرکب کا نام ہے اس کا ٹھکانہ جنت یا دوزخ کا پیش کیا جائے اور وہ لذت یا دکھ محسوس کرے! اور زیارت کرنے والے کا سلام سُنے اور منکر ونکیر کو جواب دے اور اسی کی مانند اور اُمور جن کا کتاب وسنت سے ثبوت ہو چکا ہے جس طرح کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا مستقر آسمانوں میں ہے اور مع ہذا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے قریب ہو جاتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے دونوں ہاتھ آپ کی رانوں پر رکھتے تھے۔ امام شعبی رحمہ اللہ (اپنی کتاب) بحر الکلام میں فرماتے ہیں کہ ارواح اجسام کے ساتھ متصل ہوتی ہیں۔ سو ان کو عذاب دیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے اجسام بھی درد محسوس کرتے ہیں جس طرح کہ سورج آسمان پر ہے اور اس کی روشنی زمین پر پڑتی ہے۔ واللہ اعلم!

حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ کی یہ عبارت بڑی واضح اور ہر لحاظ سے معنی خیز ہے۔ اس کی مزید تشریح وتفسیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اس عبارت سے ان مختلف احادیث کی آپس میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ جن میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے اور غیر بالغ نظریں ان کے جمع کرنے میں ٹھوکریں کھاتی ہیں۔ مثلاً ایک آپ نے اسی پیش نظر کتاب میں باحوالہ محدثین کرام رحمہم اللہ کی تصحیح کے ساتھ پڑھی ہے کہ قبر میں جسم کی طرف روح لوٹائی جاتی ہے۔ (فتعاد الروح فی جسدہ) اور دوسری طرف یہ حدیثیں بھی صحیح ہیں کہ شہیدوں اور مؤمنوں کی روحیں جنت میں ہوتی ہیں۔

مثلاً ایک حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (المتوفی ۳۲ ہجری) سے یوں آتی ہے کہ کچھ لوگوں نے ان سے ''وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا'' (آل عمران: ۱۶۹) کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ: ''انا قد سالنا عن ذٰلک فقال ارواحھم فی جوف طیر خضر لھا قنادیل معلقة بالعرش تسرح من الجنة حیث شاءت'' (مسلم ج ۲ ص ۱۳۵)

''ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ شہداء کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے پیٹ میں چلی جاتی ہیں اور ان کے لئے عرش پر قندیلیں لٹکتی رہتی ہیں اور وہ جنت میں جہاں چاہیں چلتی پھرتی ہیں۔''

سبز رنگ کے پرندوں کے پیٹ ان کے لئے سواری اور مرکب ہوتے ہیں جیسے دنیا میں لوگ ہوائی جہاز

اور کار وغیرہ کے اندر داخل ہو کر سفر کرتے ہیں۔ تناسخ پر اس سے استدلال کرنا جیسا کہ بعض زائغین نے کیا ہے، قطعاً باطل ہے اور اسی طرح ان سواریوں کو ابدان مثالیہ قرار دینا جیسا کہ مؤلف نے (اقامۃ البرہان ص۹۹) میں کیا ہے باطل ہے اور اس کے بطلان کے لئے علماء متکلمین اور حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے وہ صریح حوالے کافی ہیں جن سے جسد عنصری کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

اور ایک حدیث حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ (المتوفی ۵۰ ہجری) کی ہے: ''ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال نسمة المؤمن طیر یعلق فی شجرة الجنة حتٰی یرجعه اللّٰه الٰی جسده یوم یبعثهٗ''

(مسند احمد ج ۳ ص ۴۵۵ وسنن ابن ماجہ ص ۳۱۶، موطا امام مالک ص ۸۴ واللفظ لہ وموارد الظمآن ص ۱۸۷)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کی روح پرندوں کی طرح اُڑتے ہوئے جنت کے درختوں سے کھاتی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے جسم کی طرف اس کو لوٹائے۔''

لفظ نسمہ جسم اور روح دونوں پر اسی طرح روح دونوں پر اور اسی طرح روح ہوائی پر اور صرف تنہاء روح پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ (مجمع البحار ص ۱۶۵) میں ہے: وعلی الروح المفردة (ندائے حق ص ۳۸) اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی نسمہ کے معنی روح کے کئے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں دوسری جگہ ان کا حوالہ مذکور ہے اور خود مؤلف (ندائے حق ص ۳۷) میں لکھتے ہیں کہ: ''عموماً نسمہ کے معنی روح کے کئے جاتے ہیں۔'' چونکہ اس حدیث میں جسد کا لفظ مستقل طور پر موجود ہے۔ اس تقابل کے لحاظ سے یہاں نَسمہ کے معنی روح ہی زیادہ مناسب ہیں۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ وغیرہ نے نسمہ کے جو اور معنی بیان کئے ہیں اپنے مقام پر وہ بھی درست ہیں لیکن یہاں نَسمہ سے روح ہی مراد ہے۔

ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء اور عام مؤمنوں کی روحیں جنت میں ہوتی ہیں تو بظاہر ان متعارض روایات کو پیش نظر رکھ کر قاضی ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ نے محدثانہ اور فقیہانہ انداز میں یہ جواب دیا کہ مؤمنوں کی ارواح کا مستقر جنت ہو یا علیین یا ساتواں آسمان کچھ بھی ہو مگر ان ارواح کا فی الجملہ تعلق اور اتصال قبروں میں اجساد کے ساتھ ہوتا ہے جس کی پوری کیفیت پروردگار ہی جانتا ہے اور اسی تعلق کی وجہ سے لذّت اور کُلفت کا احساس اور ادراک ان کو ہوتا ہے اور اسی ادراک وشعور کے ساتھ وہ منکر ونکیر کے سوال کا جواب دیتے ہیں اور اسی اتصال کے سبب عند القبر سلام کہنے والے کا سلام سنتے (اور جواب دیتے) ہیں۔ ہاں! ان ارواح کا اجسام کی طرف مکمل طور پر لوٹایا جانا اور بکمالہ اعادہ قیامت کے دِن ہی ہوگا اور مؤطا امام مالک رحمہ اللہ کی روایت کے آخر میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ (حتٰی یرجعه اللّٰه الٰی جسده یوم یبعثک)

حضرت ملّا علی القاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''حتٰی یرجعه اللّٰه فی جسده ای یرده الیه کاملًا فی بدنه''

''حتٰی یرجعه اللّٰه فی بدنه کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کامل طور پر اس کی روح اس کے بدن میں (قیامت کے دن) لوٹائے گا۔'' (مرقات ج ۴ ص ۱۳۰، طبع ملتان)

مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ اس حدیث کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ: ''یعنی بجمیع جسده یوم یبعثهٗ وهو یوم القیٰمة'' (تحریرات حدیث ص ۲۰۹)

''یعنی تمام جسد کے ساتھ روح کا تعلق اس دن ہوگا جس دن اللہ تعالیٰ اس کو کھڑا کرے گا اور وہ قیامت کا دن ہے۔''

علامہ شیخ سلیمان بن سحمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''وقد تقرر ان الاموات لا یساوون الاحیاء فی وجه من الوجوه اذا الموت غیر الحیوة المعهودة و ما ثبت لهم من الحیواة فهی برزخیة غیر الحیواة المعهودة فی الدنیا فمن اراد بها الحیواة المعهودة فی الدنیا التی تقوم فیها الروح بالبدن و تدبره و تصرفه او یحتاج معها الی الطعام و الشراب و اللباس فهذا خطاء ظاهر و الحِسّ و العقل یکذبه کما یکذبه النص و اما من اراد حیواة أخری غیر هذه الحیواة بل تعاد الروح الیه اعادة غیر الاعادة المألوفة فی الدنیا لِیسئل و یمتحن فی قبره و یرّد السلام علی المسلمین فهذا حق و نفیه خطأ و قد دل علیه النص الصحیح الصریح و هذه الحیواة متفاوتة فحیواة الانبیاء اکمل من حیواة الشهداء و حیواة الشهداء اکمل من حیواة غیرهم و هذه الحیواة حیواة برزخیة لا یعلم کنهها الا الله'' (البیان المُبدی لشناعة القول المجدی ص ۱۰۲، طبع امرتسر)

''بلاشبہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مُردے کسی وجہ سے بھی زندوں کے مساوی نہیں ہیں کیونکہ موت معہود حیات کے غیر ہے اور جو زندگی اموات کے لئے ثابت ہے وہ برزخی حیات ہے جو معہود دنیوی زندگی کے غیر ہے۔ سو جس شخص نے مُردوں کی زندگی سے دُنیا کی معہود زندگی مراد لی، بایں طور کہ رُوح بدن کا قوام اس کی تدبیر اور اس میں تصرف کرے اور اس کی وجہ سے بدن خوراک پانی اور لباس کا محتاج ہو تو یہ نظریہ بالکل خطاء ہے۔ نص کی طرح حِس وعقل بھی اس کی تکذیب کرتے ہیں اور اگر اس زندگی کے علاوہ اور زندگی مراد لے کہ بدن کی طرف روح تو لوٹائی جائے لیکن دنیا کی معہود زندگی کی طرح اعادہ نہ ہو بلکہ محض اس لئے ہو کہ تا کہ اس سے قبر میں سوال و امتحان ہو سکے اور وہ سلام کرنے والوں کے سلام کا جواب دے سکے تو یہ حق ہے اور اس کی نفی غلط ہے اور اس پر نص صحیح اور صریح دلالت کرتی ہے اور یہ زندگی درجہ بہ درجہ ہے۔ سب سے اکمل حیات انبیاء علیہم السلام کی پھر شہداء کی اور پھر دوسروں کی ہے اور یہ زندگی برزخی ہے جس کی حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

امام عبدالوہاب الشعرانی لکھتے ہیں کہ: ''و قول الجلال المحلی السابق فترد روح المعذب الی جسده کله او ما بقی منه اشارة للخلاف فی ذلک فان الحلیمی یقول ترد الروح الی جسده کله و ابن جریر الطبری و امام الحرمین یقولون ترد الروح الی ما بقی منه'' (الیواقیت والجواہر ج ۲ ص ۱۲۹، طبع مصر)

''جلال الدین محلی رحمہ اللہ کے سابق قول میں جس میں انہوں نے کہا ہے کہ جس شخص کو سزا دی جاتی ہے، اس کے سب بدن میں یا باقی حصہ کی طرف روح لوٹائی جاتی ہے، اشارہ ہے۔ اس امر کی طرف کہ اس میں اختلاف ہے کیونکہ علامہ حلیمی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ روح پورے بدن کی طرف لوٹائی جاتی ہے اور امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ اور امام الحرمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ روح بدن کے اس حصہ کی طرف لوٹائی جاتی ہے جو باقی رہتا ہے۔ (اس سے معلوم ہوا کہ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ فی الجملہ رد الروح الی البدن کے قائل ہیں)

رئیس المحدثین ابن حجر ثانی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب (المتوفی ۱۳۵۲ھ) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''ثم لاهل السنة قولان قیل ان العذاب للروح فقط و قیل للروح و الجسد

والمشهور الثاني اختاره اكثر شارحي الهداية وهو المختار وان صار البدن ذرة ذرة فان الشعور لكل شئ عند جمهور الامة وتفرد ابن حزم الاندلسي وقال لا شعور الا للثقلين وقال الصوفية العذاب للبدن المثالي" (العرف الشذی ص ۳۵۵)

"پھر اہل سنت کے دو قول ہیں ایک یہ کہ عذاب صرف روح کو ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ روح اور جسم دونوں کو ہوتا ہے مشہور یہی قول ہے اور ہدایہ کے اکثر شارحین نے اسی کو اختیار کیا ہے اور (میرے نزدیک بھی) یہی مختار ہے۔ اگرچہ بدن ذرّہ ذرّہ ہی کیوں نہ ہو جائے کیونکہ جمہور اُمت کے نزدیک شعور ہر چیز کو ہے۔ ابن حزم اندلسی اس میں متفرد ہیں وہ کہتے ہیں کہ انسانوں اور جنوں کے علاوہ کسی چیز میں شعور نہیں ہے۔ وہ صوفیاء اس کے قائل ہیں کہ عذاب بدن مثالی کو ہوتا ہے۔

اس عبارت میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اہل سنت کا ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ قبر میں عذاب صرف روح کو ہوتا ہے۔ آپ پہلے با حوالہ پڑھ چکے ہیں کہ کشتی اہل سنت پر سوار ہونے والوں میں علامہ ابن حزم اُندلسی رحمہ اللہ اور ابن میسرہ رحمہ اللہ (یا ابن ہبیرہ رحمہ اللہ) ہی اس کے قائل ہیں اور باقی سب اہل سنّت ان کا پرزور رَد کرتے ہیں۔ جیسا کہ امام ابن تیمیہ علامہ ابن القیم اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ کے حوالہ سے یہ عرض کیا گیا ہے اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اس عبارت میں اکثر شراح ہدایہ کا حوالہ یہ دیتے ہیں کہ وہ روح اور جسم دونوں کے معذّب ہونے کے قائل ہیں اور اسی کو انہوں نے اختیار کیا ہے اور یہی قول مشہور ہے اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ خود بھی اسی قول کو پسند کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: "وهو المختار" اور (فیض الباری ج ۲ ص ۴۹۲) میں اسی ثانی کے متعلق فرماتے ہیں: "والاقرب عند الثاني" یعنی میرے نزدیک اقرب الی الحق یہی ثانی قول ہے۔

اور حضرت انور شاہ صاحب رحمہ اللہ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ: "ثم السوال عندي يكون بالجسد مع الروح كما اشار اليه صاحب الهداية في الايمان" (فیض الباری ج ۱ ص ۱۸۵)

"پھر سوال میرے نزدیک جسم سے ہوتا ہے جو روح سے متعلق ہو جیسا کہ صاحب ہدایہ نے "کتاب الایمان" میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔"

رہا حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا یہ ارشاد: تحقیق آنست کہ معنی حیات تعلق روح بہ بدن است و در قبر اصلاً تعلق روح بہ بدن نیست بلکہ بقائے شعور و ادراک روح را بعد از مفارقت از بدن تعبیر بحیات فرمودند۔

یہ حوالہ (ندائے حق ص ۲۳۵) میں دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ روح کا بدن سے ایسا تعلق جو بدن کی تدبیر اس کی نشو و نما اور اس میں تصرف کرے جس پر حیات کاملہ مرتب ہوتی ہے۔ قبر میں وہ تعلق روح کا بدن سے اصلاً نہیں رہتا۔ باقی قبر میں سوال ادراک و شعور، عذاب و راحت کی حد تک روح کے جسم عنصری کے ساتھ تعلق کو وہ اقرب اور مختار فرماتے ہیں اور ہمارے خیال میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے یہ الفاظ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کے الفاظ کی نقل ہے جس کی بحث باحوالہ گزر چکی ہے۔ (حل مشکلات قرآن ص ۱۳)

نیز حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "حكاية۔ سمعت ببلدتي كشمير وانا اذ ذاك ابن اربع سنين ان رجلين تكلما في ان العذاب هل يكون للجسد او الروح؟ فاستقر رأيهما على ان

العذاب لهما ثم ضرب الله مثلاً فقال ان مثل الجسد مع الروح کمثل اعمٰی و اعرج ذهبا الٰی حدیقة لیجنوا من ثمارها فعجز الاعمٰی ان یراها و عجز الاعرج ان یحجنیها فتشاورا فی امرهما فرکب الاعرج علی الاعمٰی فجعل الاعمٰی یذهب به الٰی الاشجار و الاعرج یری الثمار و یجنیها فهذا هو حال البدن مع الروح فان البدن بدون الروح جماد لاحراک له و الروح بدون البدن معطلة عن الافعال فاحتاج احدهما الٰی الآخر فلما اشترکا فی الکسب اشترکا فی الاجر او الوزر ایضاً و بعد مرور خمس و ثلاثین سنة رأیت فی القرطبی عن ابن عباس رضی اللہ عنہ عین ما قالاه من فطرتهما فانظر هل یمکن مثله من نحو ارسطو؟ کلا ثم کلا''

''حکایت۔ میں چار سال کا تھا کہ میں نے اپنے علاقہ کشمیر میں دو آدمیوں کو عذاب کے بارے کلام کرتے سنا کہ کیا عذاب جسم کو ہوتا ہے یا روح کو؟ ان دونوں کی رائے اس پر ٹھہری کہ عذاب دونوں کو ہوتا ہے۔ پھر دونوں نے اس کی مثال بیان کی وہ اس طرح کہ جسم اور روح کی ایسی ہی مثال ہے جیسے اندھا اور لنگڑا جو دونوں ایک باغ میں گئے تاکہ وہاں سے پھل چنیں۔ لیکن اندھا دیکھنے سے عاجز تھا اور لنگڑا (کھڑا ہو کر) پھل چننے سے قاصر تھا۔ دونوں نے آپس میں اس بارے مشورہ کیا اور لنگڑا اندھے (کے کندھے) پر سوار ہو گیا۔ اندھا اس کو درختوں کی طرف لے جاتا اور لنگڑا پھل دیکھ کر چُن لیتا۔ یہی حال ہے بدن کا روح کے ساتھ۔ کیونکہ بدن روح کے بغیر جماد ہے۔ اس میں کوئی حرکت نہیں اور روح بغیر بدن کے افعال سے معطل ہے۔ اس لئے ایک کو دوسرے کی حاجت ہے۔ جب بدن اور روح کسب میں دونوں شریک ہیں تو اَجر یا گناہ میں بھی شریک ہیں۔ پینتیس (۳۵) برس گزرنے کے بعد میں نے یہی بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے تفسیر قرطبی میں دیکھی جوان دو آدمیوں نے اپنی فطری ذوق سے کہی تھی تو دیکھ لے، کیا ایسی چیز ارسطا طالیس وغیرہ (یونانی حکماء) سے ممکن ہے؟ ہرگز نہیں پھر ہرگز نہیں۔'' (فیض الباری ج ۴ ص ۱۱۵)

اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کو غضب کی ذہانت اور حافظہ عطاء فرمایا تھا۔ گو یہ واقعہ انہوں نے چار سال کی عمر میں سنا لیکن بخاری شریف پڑھاتے وقت وہ علم کے ناپیدا کنار سمندر میں غوطہ زن تھے۔ لہٰذا اس مبنی برحقیقت واقعہ سے پہلو تہی کرنا عقلاء کی شان کے خلاف ہے۔ یہ واقعہ (تفسیر قرطبی کے علاوہ تفسیر (درمنثور ج ۵ ص ۳۲۸ اور کتاب الروح ص ۲۲۷) میں بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

مفتی اعظم دیوبند کا فتویٰ

حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۴۶ھ) سے اسی سلسلہ کے چند سوالات ہوئے جن کے انہوں نے جوابات دیئے۔ ذیل میں بعض سوال و جواب درج ہیں:

سوال نمبر ۳۱۲۲: زید کہتا ہے کہ مرنے کے بعد قیامت تک انسان کی روح قبر ہی میں رہتی ہے۔ یہ درست ہے یا نہیں؟

سوال نمبر ۳۱۲۳: مرنے کے بعد عذاب روح کو ہوتا ہے یا جسم کو یا دونوں کو؟

الجواب: (۱) قبر میں بھی روح کا تعلق رہتا ہے اور مستقر اصل اس کا علیین یا سجین ہے۔ (۲) عذاب روح پر مع جسم کے ہوتا ہے۔ جیسا کہ ظاہر احادیث سے ثابت ہے۔ فقط!

(فتاویٰ دار العلوم مدلل ومکمل ج پنجم ص ۴۲۶، ۴۲۷، طبع دیوبند)

سوال نمبر ۱۹۴۳: مرنے کے بعد جو سوال وغیرہ ہوتے ہیں تو روح مرنے کے بعد آسمان پر چلی جاتی ہے۔ پھر قبر میں لائی جاتی ہے یا جسم میں بند کر دی جاتی ہے؟

الجواب: جسم سے روح کو تعلق رہتا ہے۔ فقط!　(فتاویٰ دار العلوم ج ۵ ص ۴۶۲)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اور پھر مفتی اعظم رحمہ اللہ کی عبارات سے جس جسم کا ثبوت ملتا ہے وہ جسم عنصری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ جیسا کہ کسی بھی صاحب فہم وبصیرت سے یہ مخفی نہیں ہے۔ مؤلف کا (ندائے حق ص ۲۲۳ تا ۲۳۶) متعدد عبارات (جن میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ اور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی بھی ایک عبارت ہے) نقل کر کے جو اصل مسئلہ سے غیر متعلق ہیں، یہ باور کرانا یا مبتدی طالب علموں کو ورغلانا کہ قبر میں حیات جسم عنصری سے متعلق نہیں یا روح کا اس جسم سے تعلق نہیں، صرف دفع الوقتی ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے صاحب ہدایہ کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے وہ یوں ہے کہ: ''ومن یعذب فی القبر یوضع فیہ الحیوۃ فی قول العامۃ''　(ہدایہ ج ۲ ص ۴۸۴)

''جس شخص کو قبر میں عذاب دیا جاتا ہے تو عام علماء کے قول کے مطابق اس میں حیات ڈالی جاتی ہے۔''

فقہاء کرام رحمہم اللہ کے طبقہ میں صاحب ہدایہ (الامام الفقیہ الزاھد علی بن ابی بکر رحمہ اللہ، المتوفی ۵۹۳ھ) کا مقام اور پایا بہت بلند ہے۔ ان کے بعد آنے والے فقہاء ان کے علم وتحقیق اور دیانت وامانت اور زہد وتقویٰ پر کلی اعتماد کرتے ہیں۔ صاحب ہدایہ کا یہ ارشاد دراصل مشہور اعتراض کا جواب ہے۔

چنانچہ علامہ اکمل الدین محمد بن محمود البابرتی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ص ۷۸۶ھ) اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ''قولہ ومن یعذب جواب عما یقال قولکم الایلام لا یتحقق فی المیت یشکل بعذاب المیت فی القبر وقید بقول العامۃ احترازاً عن قول ابی الحسین الصالحی فان المیت عندہٗ یعذب من غیر حیوۃ ولا یشترط الحیوۃ لتعذیب المیت''　(عنایہ برہامش فتح القدیر ج ۴ ص ۹۹، طبع مصر)

''صاحب ہدایہ کا یہ قول کہ جس کو قبر میں عذاب دیا جاتا ہے۔'' اس اعتراض کا جواب ہے کہ جب درد والم میت میں متحقق نہیں ہو سکتا تو قبر میں میت کو عذاب کس طرح ہوگا؟ (تو اس کا جواب یہ دیا ہے کہ قبر میں میت میں حیات ڈالی جاتی ہے۔ اکثر کا یہی قول ہے) اور اکثر کی قید اس لئے لگائی کہ ابوالحسین الصالحی (صالحیہ فرقہ کا سربراہ) کے قول سے احتراز کرنا مقصود ہے کیونکہ اس کے نزدیک میت کو بلاشرط حیات سزا دی جاتی ہے۔''

حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ اس سوال کو بھی نظر انداز نہیں کرتے کہ جسم جب ریزہ ریزہ ہو جائے تو اس کو عذاب دینے کا کیا مطلب ہوگا؟

جواب یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''ولا بُعد فی تعذیب الجسد بعد تمزقہ فانہ یبتنی علی عدم الشعور فی الجمادات وھو فی حَیّزِ الحقاء''　(فیض الباری ج ۱ ص ۱۸۶)

''اور اس میں بھی کوئی بُعد نہیں کہ جسم ریزہ ریزہ ہو جائے اور بایں ہمہ اس کو عذاب دیا جائے۔ اس کے خلاف نظریہ اس بات پر مبنی ہے کہ جمادات میں شعور نہیں اور یہ خیال محلِ نظر ہے۔''

الغرض حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ قبر میں سوال اور عذاب و راحت میں روح کے ساتھ جسم بھی شریک رہتا ہے اور یہی بات حق اور مختار ہے۔ عرف شذی کی عبارت کے آخر میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے صوفیاء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عذاب قبر جسم مثالی کو ہوتا ہے۔ (جو جسد ماڈی اور عنصری کے اندر داخل ہوتا ہے) اگر جسد عنصری اور ماڈی ریزہ ریزہ بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ جسم مثالی تو موجود ہے۔ گویا صوفیائے کرام رحمہم اللہ نے جسم مثالی کو لے کر ان لوگوں کو جواب دینے کی سعی کی ہے جو جسد ماڈی اور عنصری کے ریزہ ریزہ ہو چکنے کے بعد عذاب کو اس کے لئے مستبعد سمجھتے ہیں، اس مشکل سے صوفیائے کرام رحمہم اللہ نے بزعم خود جان چھڑانے کا یہ سہل طریقہ اختیار کیا ہے لیکن صحیح حدیث مع شواہد، علماء عقائد، شراح حدیث اور فقہاء عظام کی صریح عبارات باحوالہ عرض کی جا چکی ہیں کہ قبر میں سوال نکیرین اور عذاب و راحت کے سلسلہ میں رُوح کے ساتھ جو بدن اور بدن کے اجزاء شریک ہوتے ہیں وہ بدن ماڈی اور بدن عنصری ہے۔ بالتبع اور ضمنی طور پر بدن مثالی بھی شریک ہو تو ہو مگر جب دلائل اور براہین سے بدن ماڈی اور عنصری ثابت ہے، جس کے بارے میں متعدد صریح حوالے پہلے عرض کئے جا چکے ہیں تو صوفیاء کرام رحمہم اللہ کے نرے بدن مثالی کو قبر میں عذاب و راحت کے لئے ثابت کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہاں! اگر ان سابق دلائل میں بدن ماڈی کا ذکر نہ ہوتا یا علماء عقائد میں سے کسی ایک نے بھی صرف بدن مثالی کا تذکرہ کیا ہوتا تو پھر اس پر غور کیا جا سکتا تھا مگر ان دلائل کی موجودگی میں اس نظریہ کی طرف توجہ مبذول کرنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ صوفیاء کرام رحمہم اللہ کے اس مسلک کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''ثم لا حاجة فی اثبات عذاب القبر الٰی ما قاله الصوفية ان العذاب علی البدن المثالی دون المادی وحينئذٍ لا بعد ان لم نشاهد احداً يعذب فی قبره فان الاسهل ان يقال انه من عالم الغيب واقامة الدلائل العقلية عليه جهل و من يطيق ذٰلک؟'' (فیض الباری ج ۲ ص ۴۷۶)

''پھر اثبات عذاب قبر کے لئے اس بات کی کوئی حاجت نہیں جس کو صوفیاء کرام رحمہم اللہ بیان کرتے ہیں کہ عذاب بدن مثالی کو ہوتا ہے نہ کہ بدن مادی کو۔ لہٰذا اگر قبر میں ہم کسی کے عذاب کا مشاہدہ نہیں کر سکتے تو کیا حرج ہے؟ (کیونکہ ہم تو بدن ماڈی کو دیکھتے ہیں اور عذاب بدن مثالی کو ہوتا ہے) عذاب قبر کے بارے میں آسان بات یہ ہے کہ عذاب اُس عالم میں دیا جاتا ہے جو ہماری نگاہوں سے غائب ہے اور اس پر دلائل عقلیہ کا قائم کرنا نرا جہل ہے اور پھر یہ کس کے بس کا روگ ہے؟''

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تو صوفیاء کرام رحمہم اللہ کے اس بے دلیل قول کو صرف رد ہی کیا ہے۔ لیکن امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد صاحب سرہندی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) بعض صوفیاء کرام رحمہم اللہ کے عذاب و ثواب قبر کے بارے میں اس بدن مثالی کے رد میں فاروقی جوش بھی دکھاتے ہیں۔ چنانچہ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''نزد فقیر قول بنقل روح از قول بتناسخ ساقط تر است زیرا کہ تناسخ را از برائے تکمیل نفوس اعتبار کردہ اند اگر چہ ایں اعتبار باطل است و نقل روح را بعد از حصول کمال گمان بردہ اند اگر چہ ہیچ کمال

نیست هر گاه تبدّل ابدان از برائے تحصیل کمالات قرار داده باشند بعد از حصول کمال نقل ببدن ثانی برائے چه بود؟" اهل کمال تماشائی نیستند همت ایشاں بعد از حصول کمال تجرد از ابدان است نه تعلق بابدان زیرا که آنچه مقصود از تعلق بوده است بحصول پیوسته" و ایضاً در نقل روح اماتت بدن اَول است و احیاء بدن ثانی است پس بدن اَول را از حصول احکام برزخ چاره نبود و از عذاب و ثواب قبر گذر نه بدن ثانی را چوں حیات ثانی اثبات می نمایند حشر در حق او در دُنیا ثابت گشت (و آں خلاف مقررات عقائد اهلسنت است) انگارم که معتقدانِ نقلِ روح معلوم نیست که بعذاب و ثواب قبر قائل باشند ذ بحشر و نشر معتقد بوند افسوس هزار افسوس ایں قسم بطّالان خود را بمسند شیخی گرفته اند و مقتدائے اهل اسلام گشته اند ضلّوا فاضلّوا" (مکتوبات دفتر دوم حصہ ہفتم مکتوب نمبر ۵۸ ص ۲۶، طبع امرتسر)

"فقیر کے نزدیک روح کے بسوئے بدن ثانی حصولِ کمال کے لئے انتقال کا قل تناسخ کے قول سے بھی ساقط تر ہے۔ کیونکہ انہوں نے تناسخ کو نفوس کی تکمیل کے لئے اعتبار کیا ہے۔ اگر چہ یہ اعتبار باطل ہے اور روح کے انتقال کا گمان حصولِ کمال کے بعد کیا ہے۔ اگر چہ یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ جب انہوں نے ابدان کا تبدّل کمالات کی تحصیل کے لئے قرار دیا ہے تو کمال کے حصول کے بعد دوسرے بدن کی طرف نقل کس لئے؟ اہل کمال کوئی تماشا تو نہیں (کہ بدن پر بدن کا سین بدلتے رہیں) ان کی ہمت تو حصولِ کمال کے بعد ابدان سے تجرد ہے نہ کہ ابدان سے تعلق۔ کیونکہ تعلق سے جو مقصود تھا وہ حاصل ہو گیا ہے اور نیز روح کے انتقال سے پہلے بدن (یعنی مادّی وعنصری) کی اماتت اور دوسرے کی احیاء ہوتی ہے۔ سو پہلے بدن (عنصری) کو احکام برزخ کے حصول سے تو کوئی چارہ نہیں اور عذاب وثواب سے کوئی مخلص نہیں اور دوسرے بدن کے لئے جب وہ دوسری حیات ثابت کرتے ہیں تو اس کے حق میں دنیا ہی میں حشر ثابت ہو گیا۔ (اور یہ اہل السنت کے ثابت شدہ عقائد کے خلاف ہے) بہر حال معلوم نہیں کہ نقل روح کے معتقد کیا قبر کے عذاب وثواب کے قائل ہیں؟ اور حشر نشر کے معتقد ہیں۔ افسوس ہزار افسوس کہ اس قسم کے مسخرے اپنے آپ کو بزرگی کے مسند پر براجمان سمجھتے ہیں اور اہل اسلام کے مقتداء بنے ہوئے ہیں۔ سو وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور انہوں نے لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قبر میں جو عذاب وثواب ہوتا ہے اس میں بدن اَوّل یعنی بدن عنصری کی پوری مشارکت ہوتی ہے اور اس بدن کو اس سے کوئی چارہ نہیں اور یہ بدنِ اَوّل روح کا آلہ بن کر قبر کے عذاب وثواب میں برابر کا شریک ہے اور احکام برزخ وقبر میں اس بدنِ اَوّل کا برابر داخل ہے اور اس سے اس کے لئے کوئی مخلص نہیں ہے اور اہل کمال کو جب بدنِ اَوّل کی وجہ سے کمال حاصل ہو گیا تو اُن کو کسی اور بدن کی ضرورت نہیں۔

(نوٹ) مؤلف نے (تسکین القلوب ص ۹۳) میں آنحضرت ﷺ کے بدن مبارک کے ساتھ روح اطہر کے عدم تعلق پر حضرت مجددؒ الف ثانی رحمہ اللہ کی اس عبارت میں خط کشید عبارت کو درمیان اور کمر سے پکڑ کر استدلال کیا ہے۔ حالانکہ یہ عبارت تو عوام الناس کے بدنِ اَوّل یعنی بدن عنصری کی روح کے ساتھ عذاب وثواب میں مشارکت جتلا رہی ہے۔ جب عوام کے حق میں ایسا ہے تو آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کا بدن اطہر سے تعلق کیوں نہ ہوگا؟ اور معاذ اللہ تعالیٰ! وہاں لاتعلقی کیسے ثابت ہو گئی؟

اور حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ دوسرے مقام پر عالم مثال کی بحث کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ:

''عذاب قبر ازیں قبیل نیست کہ حقیقت عقوبت است نہ صورت وشبہ عقوبت۔'' (مکتوبات دفتر سوم ص ۵۸)

''عذاب قبر عالم مثال کے قبیل سے نہیں ہے۔ کیونکہ عذاب قبر خود ایک حقیقت ہے نہ کہ عذاب کی صورت اور اس کی مثال اور شبیہ۔''

اور ایک اور مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ: ''و آنچہ او علیہ علی آلہ الصلوات و التسلیمات از احوال آخرت خبر دادہ است ہمہ حق است از عذاب گور و ضغطۂ آن و سوال منکر و نکیر در اں و فنائے عالم و انشقاق سمٰوٰت و انتشار کواکب و برداشتن زمین و کوہہا و پارہ پارہ شدن اینہا و حشر و نشر و اعادۂ روح بجسد و زلزلہ ساعت دھول قیامت و محاسبۂ اعمال و شہادت جوارح باعمال مکتبہ''

''اور آنحضرت ﷺ نے (آپ پر اور آپ کی اہل پر صلوات و تسلیمات ہوں) احوال آخرت کی جو خبر دی ہے وہ سب حق ہے۔ مثلاً عذاب قبر، قبر کی تنگی، قبر میں منکر و نکیر کا سوال، جہاں کا فنا ہونا، آسمانوں کا پھٹ جانا، ستاروں کا بکھر جانا، زمین اور پہاڑوں کا اپنی جگہ سے اُٹھ سے جانا، اُن کا ریزہ ریزہ ہو جانا، حشر و نشر، اعادۂ روح بجسدہ قیامت کا زلزلہ، قیامت کا ہولناک منظر، اعمال کا محاسبہ اور اعضاء کا اپنے کئے ہوئے اعمال کے بارے میں گواہی دینا۔ (وغیرہ وغیرہ) (مکتوبات دفتر دوم حصہ ہفتم مکتوب نمبر ۶۷ ص ۴۵)

اس عبارت میں حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے حرف واؤ کے ساتھ جس میں ترتیب ملحوظ نہیں ہوتی بلکہ صرف جمع کے لئے آتا ہے۔ مرنے کے بعد اُن متعدد اُمور کا تذکرہ فرمایا ہے جن کی خبر آنحضرت ﷺ نے دی ہے۔ جن میں عذاب قبر، قبر کی تنگی، سوال منکر و نکیر اور اسی طرح دیگر متعدد اُمور کے علاوہ ''اعادۂ روح بجسد'' کا خصوصیت سے ذکر فرمایا ہے اور اس جملہ میں حدیث کے اُن الفاظ کو ادا کیا گیا ہے جو ''فتعاد روحہ فی جسدہ'' کے ساتھ وارد ہوئے ہیں اور یہ ارشاد قبر کے عذاب و ثواب کے بارے میں عام مُردوں کے متعلق ہے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق وہ صاف لفظوں میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''الانبیاء یصلون فی قبورھم'' جیسا کہ اِن شاء اللہ تعالیٰ اپنے مقام پر یہ حوالہ آئے گا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی ایسی اور اتنی واضح تصریحات کے باوجود بھی اگر کوئی شخص یہ بے بنیاد دعویٰ کرے کہ حضرت مجدد صاحب عام لوگ تو درکنار آنحضرت ﷺ کی رُوح مبارک کا جسد اطہر سے تعلق نہیں تسلیم کرتے۔ ان پر ایک افتراء اور علم و انصاف کا خون کرنا ہے جو انصاف اور علم کی دُنیا میں سرے سے قابلِ سماعت ہی نہیں ہے۔

فائدہ: ہم نے ''تسکین الصدور'' میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ کسی اسلامی کتاب میں اس کا ثبوت نہیں مل سکتا کہ آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کا آپ کے جسد اطہر سے قبر شریف میں کوئی تعلق اور اتصال نہیں اور یہ کہ آپ عند القبر صلوٰۃ وسلام کا سماع نہیں فرماتے۔ (محصلہ) اس کا جواب نہ تو مؤلف ندائے حق دے سکے ہیں اور نہ کوئی اور مؤلف نے (تسکین القلوب ص ۹۳، ۹۴) میں پہلے یہ لکھا ہے کہ مناسب تو یہ تھا کہ ایک لمبی بحث لکھ کر مولوی صاحب کو یہ تنبیہ کر دی جاتی کہ زندگی بھر آئندہ ایسا دعویٰ نہ کریں۔ (ص ۹۳) اور اس کے بعد اپنے اس بے بنیاد دعویٰ پر تین عبارتیں بطور دلیل کے پیش کی ہیں: (۱) حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی عبارت ''و در قبر اصلاً

تعلق روح بہ بدن نیست'' جس کی پوری تشریح ہم نے خود ان کی اپنی عبارات کی روشنی میں عرض کر دی ہے۔ (۲) حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی وہ خط کشیدہ عبارت جو اُوپر بیان ہوئی جس سے ان کے دعویٰ کا رد ثابت ہوتا ہے۔ (۳) حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے (مکتوبات ج ۳ ص ۱۷۷) کی وہ عبارت جس کا ان کے دعویٰ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس عبارت میں انہوں نے تصوف کے رنگ میں ولایت ''محمدی'' اور ''ولایت احمدی'' کا ذکر کیا ہے، اس میں قبر شریف میں آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کے جسد اطہر سے عدم تعلق کا قطعاً اور یقیناً کوئی ثبوت نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مؤلف تسکین القلوب نے اس عبارت کے ترجمہ میں جگہ جگہ بین القوسین اپنی ذہنی تشریح کو داخل کر کے بزور اپنا مطلب کشید کرنے کی ناکام کوشش اور کاوش کی ہے اور آخر میں بات ٹالنے اور جان چھڑانے کے لئے یوں ارشاد فرمایا ہے: ''ولشرحہ مقام آخر'' گویا ان کے نزدیک جہاں بیان اور شرح کی انتہائی ضرورت ہے وہ بیان کا مقام ہی نہیں۔ لیکن اگر بالفرض اس عبارت سے مؤلف تسکین القلوب کی مراد ہی لی جائے تو مندرجہ ذیل اُمور کا جواب ان کے ذمہ لازم ہے۔ (۱) اس عبارت کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''لیکن اثر اس تعیین (تعلق بالبدن) کا کچھ باقی تھا ہزار سال چاہئے کہ وہ اثر زائل ہو۔'' (ص ۹۴) اس سے معلوم ہوا کہ ہزار سال تو آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کا تعلق بدن مبارک سے رہا، اگر زائل ہوا تو بعد کو ہوا۔ تو ان کو لازم ہے کہ دعویٰ یوں کریں کہ ہزار سال کے بعد تعلق منقطع ہوا۔ (۲) وہ عام اموات کے اَرواح کے ان کے ابدان عنصریہ کے ساتھ تعلق قائم رہنے کے بارے میں حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ اور متکلمین کے مطابق فتویٰ دے چکے ہیں۔ کیا آنحضرت ﷺ کا معاملہ اس فتویٰ سے الگ ہے؟ (۳) خود مؤلف ''تسکین القلوب'' نے آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کا جسد اطہر سے مجہول الکنہ تعلق تسلیم کیا ہے۔ کیا انہوں نے حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ کی اس عبارت کی خلاف ورزی نہیں کی؟ یا یہ راقم کے لئے وقف ہے کہ (ص ۱۱۲) میں لکھا کہ اس نے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی رائے گرامی ٹھکرا دی۔ (محصلہ) للہ کچھ تو فرمائیے کہ بات کیا ہے؟ ''تسکین الصدور'' کا چیلنج ابھی تک برقرار ہے اور اِن شاء اللہ العزیز! قیامت تک رہے گا۔ اس کا ابھی تک کوئی جواب نہیں ملا۔

الغرض! عذاب اور راحت قبر کے بارے میں بدن مثالی کا قول جن حضرات نے اختراع کیا ہے، وہ محض معتزلہ وغیرہ باطل فرقوں کے قوی اشکال سے ایک تخلص ہے اور بلا ضرورت ہے عذاب وثواب جو کچھ ہے وہ بدن مادّی اور عنصری سے وابستہ ہے اور جمہور محدثین ومتکلمین اور فقہاء اسی کے قائل ہیں۔ جیسا کہ باحوالہ یہ بات عرض کی جا چکی ہے اور حدیث سے بھی یہی کچھ ثابت ہے۔

رأس الموحدین حامیٔ سنت ماحیٔ بدعت حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۶۳ھ) عذاب اور راحت قبر پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''فیجوز ان یقع المسئلة والعذاب والنعیم ببعض جسد المؤمن والکافر دون بقیة اجزائہ وقیل ان اللہ یجمع تلک الاجزاء المتفرقة المضغطة وللمسئلہ کما یفعل ذٰلک للحشر'' (تحریرات حدیث ص ۲۵۷)

''سو جائز ہے کہ قبر میں سوال وعذاب اور راحت مؤمن اور کافر کے بعض جسم سے وابستہ اور متعلق ہو نہ کہ سب اجزاء سے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قبر کی تنگی اور سوال کے لئے ان متفرق اجزاء کو جمع کر دیتا ہے۔ جیسا کہ وہ حشر کے دن ایسا کرے گا۔''

''علم کلام کی مشہور اور متداول کتابوں کے حوالہ سے یہ بات پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ قبر میں روح کا جسم سے اس قدر تعلق کافی ہے جس سے فہم خطاب اور جواب متحقق ہوا اور اَلم و راحت کا ادراک و شعور ہو سکے اور اس کے لئے تمام جسم کی حیات ضروری نہیں بلکہ اگر روح کا تعلق باطن قلب یا بدنِ مادّی کے اجزاء سے پروردگار کو منظور ہو قائم کر دے تو مطلب پورا ہو جاتا ہے۔ انہی عبارات کے پیش نظر حضرت مرحوم بعض جسد المؤمن والکافر کی قید لگاتے ہیں اور یہ نہیں فرماتے کہ عذاب و آرام صرف روح کو ہوتا ہے یا محض بدن مثالی کو جب مطلق لفظ جسد بولا جاتا ہے تو شرعاً و عقلاً و عرفاً اس سے بدن مادی اور عنصری ہی مراد ہوتی ہے۔ اگر بدن مثالی کی مشارکت بھی ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کَمَا مَرَّ مگر ہاں! یہ زندگی دنیا کی حسی حیات سے جدا ہے۔

چنانچہ علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:''وفی الجملة رد الروح علی المیت فی البرزخ ورد السلام علی من یسلم علیه لا یستلزم الحیاة التی یظنها بعض الغالطین وان کان نوع حیاة برزخیة وقول من زعم انها نظیر الحیوة المعهودة مخالف للمنقول والمعقول'' (الصارم المنکی ص ۱۸۷)

''اور خلاصہ یہ ہے کہ برزخ میں میت کی طرح روح کا لوٹنا اور اس کا سلام کرنے والوں کو جواب دینا اس حیات کو مستلزم نہیں جس کو بعض مغالطہ کا شکار ہونے والوں نے سمجھا ہے۔ اگرچہ یہ برزخ کی حیات کی ایک قسم ہے اور جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ وہ (دنیا کی) معہود زندگی کی طرح ہے۔ ان کا قول نقل و عقل کے مخالف ہے۔''

کیونکہ نہ تو اس میں میت کی حیات محسوس ہوتی ہے اور نہ وہ جنبش و حرکت کرتی ہے اور ایسی زندگی جس کو کامل اور مطلق حیات کہتے ہیں، وہ قبر اور برزخ میں نہیں ہوتی۔ ایسی زندگی دنیا میں ہوتی ہے اور پھر آخرت کو ہوگی۔

قارئین کرام! ہم نے اس باب میں آپ کا خاصا وقت لیا ہے۔ حوالے اگرچہ ابھی اور بھی کافی موجود ہیں، مگر ہمارا مقصد تمام حوالوں کا استیعاب نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ صریح اور صحیح حدیث کی روشنی میں آئمہ دین، متکلمین، فقہاء رحمہم اللہ اور شراح حدیث نے جو کچھ سمجھا، وہ یہ ہے کہ قبر میں نکیرین کا سوال اور عذاب و راحت بدن مادّی و عنصری اور اس کے اجزاء اور رُوح دونوں سے وابستہ ہے اور صرف روح یا صرف بدن کی سزا کے جمہور اہل اسلام ہرگز قائل نہیں ہیں۔ صرف رُوح کے عذاب کے علامہ ابن حزم رحمہ اللہ اور ابن میسرہ رحمہ اللہ یا ابن ہبیرہ رحمہ اللہ قائل ہیں اور جمہور ان کے خلاف ہیں اور بدن من غیر روح کے معذب ہونے کے محمد بن جریر کرامی اور ان کے اتباع قائل ہیں۔ اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ جس عذاب و ثواب کا ذکر نصوص یا احادیث و آثار میں آتا ہے۔ دراصل اس کا محل روح ہی ہے یا یہ کہے کہ وہ ہمارا عقیدہ ہے کہ مردہ کا بدن خواہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ تب بھی عذاب قبر بغیر روح کے ہے تو قطعاً یہ قول مردود ہوگا اور یہ دونوں قول جمہور اہل سنّت کے ہرگز نہیں ہیں اور یہ دلائل کے رُو سے غلط ہیں اور حق جمہور کے ساتھ ہے۔

غیر مقلدین حضرات

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس مقام پر بعض غیر مقلدین حضرات کے اقوال بھی عرض کر دیں کہ قبر و برزخ میں حیات کا تعلق جسم سے متعلق ہوتا ہے اور یہ حیات صرف روح ہی کی نہیں ہوتی:

(۱) محمد بن علی بن محمد المعروف بہ القاضی الشوکانی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۵۵ھ) لکھتے ہیں کہ:''وورد النص فی کتاب اللہ تعالٰی فی حق الشهداء وانهم احیاء یرزقون وان الحیوة فیهم متعلقة بالجسد فکیف بالانبیاء والمرسلین'' (نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۶۴، طبع مصر)

"اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں صراحت ہے شہداء کے بارے میں آیا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور ان کو رزق ملتا ہے اور بلاشبہ یہ حیات ان کے جسم سے متعلق ہے تو حضرات انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی حیات بطریق اولیٰ اجسام سے متعلق ہوگی۔"

قاضی صاحب رحمہ اللہ نے اس عبارت میں تصریح کر دی ہے کہ حضرات شہداء رحمہم اللہ کی حیات محض روحانی ہی نہیں بلکہ حیات ان کے اجساد و اجسام سے متعلق ہے اور یہی کچھ قاضی صاحب رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"معنی الآیة عند الجمهور انهم احياء حيوة محققة ثم اختلفوا فمنهم من يقول انها ترد اليهم ارواحهم فی قبورهم فيتنعمون وقال مجاهد يرزقون من ثمر الجنة ای يجدون ريحها وليسوا فيها و ذهب من عدا الجمهور الی انها حيوة مجازية والمعنى انهم فی حكم الله مستحقون للتنعم فی الجنة والصحيح هو الاوّل ولا موجب للمصير الی المجاز" (تفسیر فتح القدیر ج ۱ ص ۳۶۵، طبع مصر)

"اِس آیت کا معنی جمہور کے نزدیک یہ ہے کہ شہداء کو حقیقی حیات حاصل ہے۔ پھر اس کی تعبیر میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ قبروں میں ان کی روحیں ان کی طرف لوٹا دی جاتی ہیں اور ان کو راحت پہنچائی جاتی ہے اور مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کو جنت کا رزق ملنے کا یہ معنی ہے کہ وہ جنت کے پھلوں کی خوشبو محسوس کرتے ہیں نہ یہ کہ ان کو حاصل ہوتے ہیں اور جمہور کے علاوہ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ اُن کی حیات مجازی ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جنت کے عیش کے مستحق ہوتے ہیں۔ لیکن صحیح بات پہلی ہی ہے اور مجازی معنی لینے کی کوئی مجبوری نہیں ہے۔"

اور پھر آگے یُرْزَقُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "والمراد بالرزق ههنا هو الرزق المعروف فی العادات علی ما ذهب اليه الجمهور كما سلف" (فتح القدیر ج ۱ ص ۳۶۵)

"اس مقام پر رزق سے وہ رزق مراد ہے جو عادۃً لوگوں کے ہاں رزق معروف ہے اور اسی کے جمہور قائل ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔"

اِن عبارات میں قاضی صاحب موصوف رحمہ اللہ نے شہداء کے لئے حقیقی حیات اور اس کے لوازمات تسلیم کئے ہیں لیکن اس کا تعلق چونکہ درحقیقت اس عالم سے ہے جو ہماری مادی نگاہوں سے اُوجھل ہے۔ اس لئے اگر کسی شہید کی قبر میں ہمیں حقیقی حیات اور اس کے آثار اور رزق اور اس سے ان کا انتفاع محسوس نہیں ہوتا تو یہ کوئی انکار کی بات نہیں۔ آخر اس جہان میں جنات بھی ہیں اور فرشتے بھی۔ لیکن باوجود موجود ہونے کے وہ ہمیں نظر نہیں آتے تو کیا معاذ اللہ! ان کا انکار کر دینا چاہئے؟ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ایک ہی لحاف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آرام فرما ہوتی تھیں، حضرت جبرائیل علیہ السلام آ کر آپ کو وحی سنا جاتے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آپ کے بتلائے بغیر اطلاع تک نہ ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ انہی کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے سلام کی خبر بھی نہ ہوئی اور وہ کہنے پر مجبور ہوئیں کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو میرا سلام ارشاد فرمائیں۔ کیونکہ آپ کو وہ نظر آتے ہیں اور میں نہیں دیکھ سکتی۔ اگر کسی وقت اللہ تعالیٰ خرق عادت کے طور پر شہداء کی حیات کے کچھ آثار مادّی نگاہوں کو بھی دکھا دے تو باعث تعجب تو ہو سکتا ہے، مگر محل انکار نہیں۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ (المتوفی ۱۷۹ھ) اپنی کتاب مؤطا میں (جو کتب حدیث کے طبقہ اولیٰ میں شمار ہوتی ہے) یہ واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ قبیلہ بنو سلمہ کے دو بزرگ انصاری حضرت عمرو بن

الجموح اور حضرت عبداللہ بن عمرو جب غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے تو ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد پہاڑی نالہ نے اپنا رُخ ان کی قبر کی طرف موڑ دیا اور ان کی قبر کا ایک حصہ بہ گیا۔ بامر مجبوری!

''فحفر عنهما ليغير امن مكانهما فوجدا لم يتغير ا كانهما ماتا بالامس و كان احدهما قد جرح فوضع يدهٔ على جرحه فدفن وهو كذلك فاميطت يدهٔ عن جرحه ثم ارسلت فرجعت كما كانت و كان بين أحد و بين يوم حفر عنهما ست واربعون سنة'' (مؤطا امام مالک ص ۱۷۷)

''ان کی قبر کو کھودا گیا تا کہ ان کو وہاں سے منتقل کر دیا جائے جب قبر کھودی گئی تو وہ بالکل صحیح وسالم تھے گویا کہ کل ان کی وفات ہوئی ہے اور ان میں سے ایک زخمی ہوا تھا۔ سو اس نے اپنا ہاتھ اپنے زخم پر رکھ دیا تھا اور اسی حالت میں ان کو دفن کر دیا گیا تھا۔ قبر سے نکالنے کے بعد ان کا ہاتھ زخم سے ہٹا دیا گیا اور کھلا چھوڑ دیا گیا۔ مگر وہ ہاتھ پھر بدستور زخم پر جا لگا، غزوۂ اُحد اور ان کی قبر کھودنے کے درمیان چھیالیس (۴۶) سال کا عرصہ گزرا تھا۔''

''جسم عنصری کے ساتھ حیات شہداء کی یہ ایک بیّن مثال اور واضح دلیل ہے۔ مگر یہ ضروری اور قاعدہ نہیں کہ ہر وقت ہر شہید سے ہر ایک کو ایسی حالت نظر آئے۔ ہاں! قدرت خداوندی سے ایسے واقعات بعید نہیں ہیں کہ کسی وقت وہ لوگوں کے ایمان وایقان بڑھانے کے لئے ایسا دکھلا دے۔

(۲) نواب صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۰۷ھ) احوال برزخ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''و جملہ اموات از مؤمنین و کفار از حصول علم و شعور و ادراک و سماع و عریض اعمال و رد جواب برزائر برابر اند تخصیص با نبیاء و صلحاء نیست۔'' (دلیل الطالب ص ۸۸۶)

''اور تمام مُردے عام اس سے کہ وہ مؤمن ہوں یا کافر علم، شعور، ادراک، سُننے اعمال کے پیش ہونے اور زیارت کنندہ کے سلام کا جواب دینے میں برابر اور یکساں ہیں اس میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور صلحاء کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔''

ظاہر بات یہ ہے کہ زیارت کنندہ اور مُردوں پر سلام کہنے والا جنت اور دوزخ یا علیین اور سجین میں اَرواح کے پاس زیارت کرنے اور سلام کہنے نہیں جایا کرتا۔ وہ اگر زیارت کرتا ہے تو حسّی قبر کی کرتا ہے اور اگر سلام کہتا ہے تو اس قبر کے پاس جس میں میت کا جسم مادّی اور بدنِ عنصری مدفون ہوتا ہے اور بقول نواب صاحب رحمہ اللہ میت کو زائر کے سلام وغیرہ کا ادراک وشعور ہو جاتا ہے اور اس صفت میں مؤمن و کافر سب برابر ہیں۔ کسی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اگر روح کا جسم سے کوئی تعلق نہ ہو تو بے جان ڈھانچے کو ادراک وشعور کیسے ہو جاتا ہے اور وہ سلام کیسے سنتا ہے اور جواب کیونکر دیتا ہے؟ اس تحقیق کے ہوتے ہوئے ایک غیر ذمہ دار غیر مقلد بھائی کا یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ روح کے جسم سے انفصال (خروج) یا علیحدہ ہونے کے بعد جسم انسانی زندگی کی تمام صلاحیتوں یعنی حس وحرکت نطق وسماع اور بینائی وغیرہ سے یکسر محروم و بالکل قاصر یا محض ایک مجسمہ اور ڈھانچہ ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی کتاب وسنّت کا متفقہ فیصلہ اور اہل السنّت والجماعت کا مسلّمہ مسئلہ ہے کہ روح اور جسم کا جو انفصال یا علیحدگی بصورت موت واقع ہوئی ہے یہ تا قیامت باقی رہے گی۔

آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ کتاب وسنت اور اہل سنت والجماعت کے اکابر کا فیصلہ قطعاً اس کے خلاف ہے جو گزشتہ اوراق میں باحوالہ گزر چکا ہے اور غیر مقلد صاحب کا یہ کہنا سراسر غلط ہے۔

باب پنجم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وفات حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام قطعی اَمر ہے[1]

اور اللہ تعالیٰ نے اپنی جاندار مخلوق کے لئے جو محکم اور اٹل فیصلہ صادر فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ: ''کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ'' (آل عمران: ۱۸۵)

---

[1] حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی دامت برکاتہم کا ارشاد گرامی قدر جو ملتان میں علماء کرام کے سامنے انہوں نے لکھا:

موت الانبیاء علیہم السلام: اللہ تعالیٰ نے موت وحیات کو پیدا فرمایا۔ اس دنیا میں کسی کو دوام نہیں۔ آیت کریمہ: ''کل من علیہا فان (الرحمن: ۲۶)'' کے مطابق ہر ایک کو یہاں سے جانا ہے، ہر آدمی کو مرنا ہے۔ اس سنت اللہ سے کوئی ولی اور کوئی نبی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے سید الانبیاء والمرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بھی ارشاد فرمایا: ''اِنَّکَ مَیِّتٌ وَ اِنَّھُمْ مَّیِّتُوْن (الزمر: ۳۰)'' (اے پیغمبر بلاشبہ آپ کو بھی موت آنی ہے اور ان کو بھی موت آنی ہے) چنانچہ اس ارشاد کے مطابق حضور ﷺ کا بھی وصال ہوا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی تجہیز وتکفین کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آپ کا خلیفہ منتخب فرمایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودی سازش سے بچا کر اللہ تعالیٰ نے دوسرے آسمان پر اُٹھا لیا جو اَب تک زندہ ہیں اور قُربِ قیامت میں تشریف لا کر دجّال کو قتل کر کے چالیس سال زندہ رہیں گے اور آخر کار وفات پا کر مدینہ منورہ میں روضۂ اطہر میں دفن ہوں گے۔ بہرحال ''کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ'' کے قاعدہ کلیہ سے کوئی آدمی، جن، ولی اور نبی مستثنیٰ نہیں ہے، نہ اس میں کسی کو اختلاف ہے، نہ بحث، البتہ دو باتوں میں بحث ہے۔ ایک یہ کہ مرنے کا معنیٰ کیا ہے، اس کا طریقہ کیا ہے؟ اور کیا سب کی موت ایک ہی طریقہ سے ہوتی ہے یا کچھ فرق بھی ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ مرنے کے بعد قبر میں پھر زندگی ہوتی ہے یا نہیں، وہاں رُوح کا کوئی تعلق جسم کے ساتھ رہتا ہے یا نہ۔

پہلی بات، موت کا پہلا مفہوم: عرف عام میں موت جان نکل جانے کا نام ہے، یعنی جب روح جسم سے نکل جاتی ہے تو اس کو موت کہتے ہیں۔ علماء نے موت کا معنیٰ کیا ہے کہ روح کا تعلق جسم سے منقطع ہو جائے۔ قرآن وحدیث کے نصوص واشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت روح نکالی جاتی ہے۔ آسمانوں کی طرف لے جائی جاتی ہے پھر اپنی مقرر جگہ پر رکھی جاتی ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ قبر کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ مگر جب تک ہم روح کی حقیقت نہ جان لیں اور یہ نہ سمجھ جائیں کہ جسم میں روح کے داخل ہونے یا تعلق رکھنے کی کیفیت کیا ہے؟ ہم اس کے نکل جانے اور تعلق منقطع ہونے کا مطلب بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے اور جب ہمیں روح کی حقیقت معلوم نہیں ہے تو اس کی صفات وافعال کا ادراک عقل سے کیسے کیا جا سکتا ہے؟ موت طاری ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے اور یہ ماننا بھی لازم ہے کہ موت سے رُوح کا تعلق جسم سے منقطع ہو جاتا ہے اور وہ اس جسم میں تصرفات نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ انقطاع تعلق کیسے ہوتا ہے۔ عام لوگوں میں کہا جاتا ہے کہ انقطاع تعلق یوں ہوتا ہے کہ روح جسم سے نکل جاتی ہے۔ عام خیال یہی ہے۔

موت کا دوسرا مفہوم: مگر اَنبیاء علیہم السلام کی موت کے بارے میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ بانی دارالعلوم دیو بند ارشاد فرماتے ہیں کہ حیات انبیاء علیہم السلام کی ذاتی صفت ہے۔ (یعنی اولاً و بالذات حیات دنیا میں حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوتی ہے اور دوسروں کو بالعرض اور آگے حضرت مولانا کے بیان میں آرہا ہے کہ یہ حیات اللہ تعالیٰ کی عطاء ہوتی ہے) اور اوروں کی عارضی۔ اس لئے پیغمبروں سے حیات کا انقطاع نہیں ہوتا اور نہ روح نکلتی ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"ہر نفس موت چکھنے والا ہے"

اور اس ضابطہ سے کوئی مستثنیٰ نہیں نہ پیغمبر اور نہ شہید اور نہ کوئی اور جلد ہو یا بدیر ہر ایک پر موت وارد ہو کر رہے گی اور تمام حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پر یہ گھڑی آ کر رہی۔ بجز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہ وہ ابھی تک آسمان دوم پر زندہ ہیں اور قیامت کے قریب دمشق کی جامع مسجد کے مشرقی سفید مینار پر صبح کے وقت نازل ہوں گے اور دجّال لعین کو قتل کریں گے۔ پھر چالیس (۴۰) سال تک زمین پر حکومت کریں گے۔ اس کے بعد مدینہ طیبہ میں ان کی وفات ہوگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک میں دفن کئے جائیں گے۔

(علی الترتیب ملاحظہ ہو، مسلم ج ۲ ص ۴۰۱، ومسند طیالسی ص ۳۳۵ ووفاء الوفاء ج ۱ ص ۳۹۷)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) بلکہ جسم سے سمٹ کر دل میں مرکوز ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس کا تعلق جسم سے منقطع ہو جاتا ہے اور وہ جسم میں عام دنیوی زندگی کی طرح تصرفات نہیں کرتی نہ دنیوی اُمور میں مشغول اور نہ مکلف ہوتی ہے روح کے سمٹ جانے سے جسمانی حواس معطل ہو جاتے ہیں۔ یہی انبیاء علیہم السلام کی موت ہے جس کے بعد وہ اوروں کی طرح دُنیا سے منقطع ہو کر اوروں کی طرح قبروں میں دفن کر دیئے جاتے ہیں۔ جہاں اسی روح سے ان کے مبارک اجسام میں ادراک واحساس موجود ہوتا ہے۔ حضرت مولانا اپنی اس تحقیق کو اوروں پر ٹھونسنا نہیں چاہتے فرماتے ہیں کہ موت کا اقرار تو ضروری ہے جیسے کہ آیات میں موت واقع ہو جانے کی خبر قبل از وقت دی گئی تھی۔ مگر انبیاء کی موت کا وقوع اس طرح پر ہوا کرتا ہے۔ قطب زمان حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ نے حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ کی تحقیق کی داد دی ہے ان کو اللہ تعالیٰ نے خاص فہم وذکا عطا فرمایا تھا جب ہم قرآن پاک کی اس آیت کریمہ پر نظر کرتے ہیں (تو) مولانا نانوتوی رحمہ اللہ کی تائید (ہوتی ہے) "اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرٰى" (زمر: ۴۲) "اللہ روحوں کو موت کے وقت قبض کرتے ہیں اور جن کو موت نہیں ہوتی، ان کو (بھی) سوتے وقت قبض کر لیتے ہیں۔ پھر جس کی موت کا فیصلہ کیا ہو اس کو روک لیتے ہیں اور دوسری (قسم کی روح) کو چھوڑ دیتے ہیں۔" اس آیت کریمہ نے تصریح فرما دی ہے کہ روح جیسے موت کے وقت قبض ہوتی ہے، اسی طرح نیند کی حالت میں بھی قبض ہوتی ہے۔ پھر موت والی روک دی جاتی ہے اور نیند والی چھوڑ دی جاتی ہے۔ گویا روح نیند میں بھی قبض ہوتی ہے۔ مگر باوجود اس کے سونے والا سانس لیتا ہے۔ زندہ سمجھا جاتا ہے اور روح اس کے اندر موجود سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن کا ظاہر یہ ہے کہ پہلے رُوح قبض کی جاتی ہے بعد میں چھوڑ دی جاتی ہے۔ روح کا تعلق واتصال سب اُمور متشابہات میں سے ہیں ان کی صحیح کیفیت کے بارے میں کوئی جزم سے نہیں کہا جا سکتا۔ پھر اگر حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ کے ارشاد کے مطابق اگر روح سمٹ کر جسم کے اندر تصرفات سے علیحدہ ہو جائے جس سے سارے حواس معطل ہو جائیں اور اسی کو انقطاع تعلق یا قبض روح سمجھا جائے اس میں کون سا اشکال لازم آتا ہے۔ سکتہ کی بیماری میں بسا اوقات سانس تک نہیں چلتا نہ نبض چلتی ہے نہ دل کی حرکت محسوس ہوتی ہے، پھر بھی بیمار زندہ ہوتا ہے اور روح اس کے اندر سمجھی جاتی ہے۔ بہرحال قرآن پاک نے موت کی خبر دی ہے اس کے وقوع میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ البتہ موت تعطل حواس اور انقطاع تعلق کی صورت کیا ہوتی ہے؟ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ روح نکل جائے۔ ایک یہ ہے کہ سمٹ جائے جیسے ایک کمرے میں چراغ جل رہا ہے، اس پر برتن اوندھا کر کے رکھ دیا۔ اس کو صندوق میں بند کر دیا۔ بس اس کا تعلق کمرے سے منقطع ہو جاتا ہے۔

دوسری بات، قبر کی زندگی: عام اہل اسلام کا ارشاد ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں بعضوں کو عذاب بعضوں کو راحت ہوتی ہے اس عذاب قبر وغیرہ کا ماننا تواتر کی وجہ سے ضروری ہے۔ اسی لئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آنحضرت ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ'' (الزمر: ۳۰)

ترجمہ: ''بے شک تجھے بھی مرنا ہے اور وہ بھی مر جائیں گے۔''

اور دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے کہ: ''اَفَائِنْ مِّتَّ فَھُمُ الْخٰلِدُوْنَ'' (الانبیاء: ۳۴)

ترجمہ: ''پھر کیا اگر تو وفات پا جائے تو وہ رہ جائیں گے؟''

اور ایک اور مقام پر ارشادِ خداوندی اس طرح ہے کہ: ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ'' (آل عمران: ۱۴۴)

ترجمہ: ''اور نہیں محمد (ﷺ) مگر رسول بے شک ہو چکے، اُن سے پہلے بہت رسول پھر کیا اگر وہ وفات پا جائے یا شہید کر دیا جائے تو تم پھر جاؤ گے اُلٹے پاؤں۔''

ان تمام آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی وفات بھی ایک قطعی اور حتمی اُمر ہے جس کی ان آیات میں قبل از وقت خبر دی گئی اور کتب احادیث میں متعدد صحیح اور صریح روایات اس پر دال ہیں کہ: ''قُبِضَ النبی ﷺ اور ''تُوُفِّیَ رسول اللہ ﷺ'' اور حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے ''باب وفات النبی ﷺ'' قائم کر کے اس حقیقت کو الم نشرح کر دیا ہے۔ (ج ۲ ص ۶۴۱) اور اسی وفات کے نتیجے میں آنحضرت ﷺ کی تجہیز و تکفین اور دفن و قبر وغیرہ کا انتظام ہوا اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے ہاتھوں سے لحد مبارک میں آپ کو اُتار کر دفن کیا اور اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفۃ المسلمین منتخب کیا گیا اور وہی نماز اور خطبہ پڑھاتے اور فصلِ خصومات کرتے رہے اور اہم معاملات میں لوگ انہی کی طرف رجوع کرتے رہے اور اسی طرح ان کے بعد دیگر خلفاء کے وقت بھی ایسا ہی ہوتا رہا۔ یہ تمام اُمور اپنے مقام پر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جو قرآن و حدیث اور اُمتِ مسلمہ کے اتفاق و اجماع سے ثابت ہے جس کا کوئی شخص منکر نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) قبر میں میت کو راحت و تکلیف کا احساس و ادراک ہوتا ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کے بارہ میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ قبروں میں زندہ ہیں نمازیں پڑھا کرتے ہیں۔ قریب سے درود و سلام سنتے اور اس کا جواب بھی دیا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی جارہی ہے۔

بعض اصحاب کی کم علمی: یہاں سے ان حضرات کی کم علمی واضح ہو جاتی جو مسئلہ حیات النبی ﷺ کو شرک قرار دیتے ہیں۔ شرک تو تب ہوتا کہ کسی کو ایسا زندہ مان لیا جاتا جس کی حیات اللہ تعالیٰ کی عطاء نہ ہو اس کے گھر کی ہو پھر اس پر کبھی موت طاری نہ ہو مگر یہ تو کسی مسلمان کا عقیدہ نہیں ہے کیا جو پیغمبر دنیا میں زندہ تھے وہ شرک تھا، کیا قیامت میں ہم سب زندہ ہوں گے اور زندہ بھی ایسے کہ پھر کبھی نہ مریں گے کیا وہ شرک ہوگا۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ کسی کو درمیان میں، قبر میں بھی پوری یا اُدھوری زندگی عطاء فرما دیں، وہ کیسے شرک ہو گیا؟ جب کہ علماء دیوبند نہ تو آنحضرت ﷺ کی وفات ہو جانے کا انکار کرتے ہیں نہ پیغمبروں کی حیات کو اللہ تعالیٰ کی عطاء کردہ ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ صرف آپ کے ارشاد کے مطابق قبروں میں انبیاء علیہم السلام کی حیات اور نماز پڑھنے اور سلام و درود سننے کا اقرار کرتے ہیں۔ جیسے کہ تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔ تو کیا آنحضرت ﷺ کے ارشاد کو ماننا شرک ہے؟ اللہ تعالیٰ ایسی جہالت اور ضد سے بچائے۔'' (ارشادِ گرامی مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ)

علامہ عبدالکافی السبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''والقرآن العزیز ناطق بموتہ ﷺ قال تعالیٰ اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ وَقَالَ ﷺ الی مقبوض وقال الصدیق رضی اللہ عنہ فان محمدًا قدمات واجمع المسلمون علی اطلاق ذٰلک فالوجہ اذا ثبت القول المذکور ان یقال ان ذٰلک موت غیر مستمر واللہ احییٰ بعد الموت''

قرآن عزیز صراحت سے بتاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات ہوئی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''بے شک تو بھی وفات پانے والا ہے اور بلا شبہ وہ بھی وفات پانے والے ہیں اور خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں وفات پانے والا ہوں اور حضرات صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تحقیق سے حضرت محمد ﷺ کی وفات ہوگئی ہے اور سب مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ کی وفات ہوئی ہے جب یہ بات ثابت ہے تو حیات کی وجہ یہ ہوگی کہ آپ کی موت مستمر نہ تھی بلکہ آپ کو وفات کے بعد پھر زندہ کیا گیا۔'' (شفاء السقام ص ۱۴۲)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ تمام مسلمان اس نظریہ کے حامل ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی وفات ہوئی ہے اور وفات کا لفظ آپ کے حق میں بولنا بالکل درست اور صحیح ہے لیکن وفات کے بعد آپ کو پھر حیات مرحمت ہوئی ہے۔ پہلے ٹھوس حوالوں کے ساتھ یہ بات ثابت کر دی گئی ہے کہ قبر اور برزخ میں صحیح احادیث ائمہ دین، متکلمین، شراح حدیث اور فقہاء کرام رحمہم اللہ کے بیان کے مطابق جسد عنصری کے ساتھ روح کے تعلق اور اتصال سے حیات ہوتی ہے۔ اس صفت میں عام مؤمنوں سے حضرات شہداء بڑھے ہوئے ہیں اور ان سے بڑھ کر یہ خوبی اور صفت حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو حاصل ہے۔ جمہور علماء اسلام موت کا معنیٰ انفکاک الروح عن البدن ہی کرتے ہیں اور بعض علماء ملت جن میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ بانی دارالعلوم دیوبند بھی ہیں۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی وفات کا معنی یہ کرتے ہیں کہ ارواح انبیاء کرام علیہم السلام کا اخراج نہیں ہوتا۔ فقط مثل نور چراغ اطراف و جوانب سے قبض کر لیتے ہیں اور سواء ان کے اوروں کو خارج کر دیتے ہیں۔ (جمال قاسمی ص ۱۵)

اور دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ: ''بالجملہ موت انبیاء علیہم السلام اور موت عوام میں زمین و آسمان کا فرق ہے، وہاں استتار حیات زیر پردہ موت ہے اور یہاں انقطاع حیات بوجہ عروض موت ہے۔'' (آب حیات ص ۱۶۸)

اور صاف الفاظ میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ: ''ہاں اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ گو عقیدہ[1] تو یہی ہے اور میں جانتا ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ! ایسا ہی رہے گا مگر اس عقیدہ کو عقائد ضروریہ میں سے نہیں سمجھتا نہ تعلیم ایسی باتوں کی کرتا ہوں، نہ منکروں سے دست و گریبان ہوتا ہوں۔ (لطائف قاسمیہ ص ۵)

مطلب یہ ہوا کہ روح مبارک کو جسد اطہر کے تمام اطراف و جوانب سے سمیٹ کر مثلاً دل پر اکٹھا کر دیا گیا اور اعضاء پر موت طاری ہوئی اور وہ بے حس و حرکت ہو گئے لیکن دِل مبارک کی بھی بظاہر حرکت باقی نہ رہی جس طرح کہ بعض اوقات سکتہ کے مرض میں ہوتی ہے اور دیکھنے والوں کو بظاہر آپ کا وجود مسعود بالکل بے حس و لاشعور نظر آیا لیکن بایں ہمہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ اس عقیدہ کو غیر ضروری اور آپ کی وفات کے عقیدہ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

[1] اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا موت کی تفسیر اور تشریح میں اپنی رائے کو ذوقی اور وجدانی فرماتے ہوئے کسی کو اس معنی پر مجبور نہیں فرماتے۔ بعض لوگ عوام کو مغالطہ دینے کی خاطر یہ کہتے ہیں کہ حضرت مولانا حیات کے مسئلہ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ لکھتے ہیں: "بر حسب ہدایت كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ اور اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَيِّتُوْنَ تمام انبیاء کرام علیہم السلام خاص کر حضرت سرور انام ﷺ کو نسبت موت کا اعتقاد بھی ضرور ہے۔ (لطائف قاسمی ص ۴)

الغرض حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے کیسی صاف گوئی سے یہ واضح کر دیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کا عقیدہ ضروری ہے اور علمی یا ذوقی طور پر بعض دیگر علماء کرام کی طرح موت کا جو معنی انہوں نے بیان فرمایا ہے اس کو وہ نہ تو وہ عقائد ضروریہ سے سمجھتے ہیں اور نہ عام لوگوں کو اس کی تعلیم و تبلیغ کرتے ہیں اور نہ علماء کرام سے اس پر ہاتھا پائی کے لئے تیار ہیں۔ الحاصل حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی وفات ایک حتمی اور قطعی اَمر ہے اور اس کا اعتقاد ضروری ہے، کیونکہ یہ نصوص قطعیہ اور صریحہ سے ثابت ہے۔ ہاں! اس وفات کے بعد قبر اور برزخ میں جو حیات حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے ثابت ہے وہ حق اور صحیح ہے اس میں رتی بھر شک نہیں ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ حیات کسی نص قطعی کے مخالف نہیں جس نے اس کو مخالف سمجھا ہے وہ کوتاہ فہمی کا شکار ہے۔

باب ششم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قبور میں حیات انبیاء کرام علیہم السلام

تمام اہل سنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام قبر اور برزخ میں زندہ ہیں اور ان کی زندگی حضرات شہداء رحمہم اللہ کی زندگی سے بھی اعلیٰ اور ارفع ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے بعض دلائل بیان کریں اور پھر ان پر جو اعتراضات وارد کئے گئے ہیں ان کے جوابات اور اس کے بعد بعض علماء اسلام کی عبارات اور اقوال عرض کر دیں تاکہ صحیح حقیقت سامنے آجائے۔

پہلی دلیل

امام ابو یعلیٰ[1] رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الجہم الازرق بن علی[2] رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے

---

[1] امام ابو یعلی الموصلی کا نام احمد بن علی رحمہ اللہ تھا جو الحافظ الثقۃ اور محدث الجزیرہ تھے ان کی وفات ۳۰۷ھ میں ہوئی ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۴۸)

[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "ذکرہ ابن حبان فی الثقات وقال یغرب" (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۰۰) ابن حبان رحمہ اللہ نے ان کو ثقات میں لکھا ہے اور فرمایا کہ وہ غریب حدیث لاتے ہیں اور خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صدوق یغرب (تقریب ص ۳۱) کہ وہ سچے راوی ہیں اور غریب حدیث لاتے ہیں۔ فن روایت میں راوی کے لئے سب سے بڑھ کر جس صفت کی ضرورت ہے وہ اس کی صداقت ہوتی ہے (مع دیگر شروط کے) اور یہ صاحب اس صفت سے متصف تھے اور اپنے مقام پر یہ بات آئے گی کہ غرابت صحت کے منافی نہیں۔

یحییٰ بن ابی بکیر[۱] رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے مستلم بن سعید[۲] رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ حجاج[۳] رحمہ اللہ سے اور وہ ثابت بنانی[۴] رحمہ اللہ سے اور وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون'' حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ (شفاء السقام ص ۱۳۴، حیات الانبیاء ص ۱، للبیہقی رحمہ اللہ)

علامہ سبکی رحمہ اللہ اس حدیث کی سند کو نقل کر کے اس کے رُوات کی توثیق کرتے ہیں اور اس کو صحیح قرار دیتے ہوئے اس سے استدلال کرتے ہیں۔ یہ روایت بدوں سند (خصائص الکبری ج ۲ ص ۲۸۱) میں اور پہلے راوی کے علاوہ بقیہ روات کے ساتھ (فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۲، فتح الملہم ج ۱ ص ۳۲۹) میں بھی مذکور ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وصححہ البیہقی رحمہ اللہ'' (فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۲) کہ اس حدیث کی امام بیہقی رحمہ اللہ نے تصحیح کی ہے اور مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''ووافقہ الحافظ فی المجلد السادس'' (فیض الباری ج ۲ ص ۶۴) کہ امام بیہقی رحمہ اللہ کی اس تصحیح پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اتفاق کیا ہے اور علامہ عثمانی رحمہ اللہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ (فتح الملہم ج ۱ ص ۳۲۹) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''رجال ابی یعلی ثقات'' (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۱۱) ابو یعلی کی سند کے سب راوی ثقہ ہیں۔ علامہ عزیزی لکھتے ہیں: ''وھو حدیث صحیح'' (السراج المنیر ج ۲ ص ۱۳۴) کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ حضرت ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ: ''صح خبر الانبیاء احیاء فی قبورھم'' (مرقات ج ۲ ص ۲۱۲) الانبیاء احیاء فی قبورھم کی حدیث صحیح ہے۔

---

[۱] ابو بکیر کا نام نسر رحمہ اللہ تھا، یحییٰ بن ابی بکیر رحمہ اللہ کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ دانا محدث تھے، امام ابن معین رحمہ اللہ اور عجلی رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں، امام ابو حاتم رحمہ اللہ ان کو صدوق کہتے ہیں، محدث ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں، امام ابن المدینی رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۹۰) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص ۵۴۶) علامہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ اپنی تاریخ (ج ۱۴ ص ۱۵۶، ۱۵۷) میں ان کا طویل ترجمہ بیان کرتے ہوئے محدثین کرام رحمہم اللہ کے یہ مذکورہ بالا اقوال ان کے بارے میں نقل کرتے ہیں۔

[۲] امام احمد ان کو شیخ ثقہ اور امام ابن معین رحمہ اللہ صویلح کہتے ہوئے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ امام نسائی ان کو لا باس بہ کہتے ہیں اور ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۰۴) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ (تقریب ص ۴۸۸)

[۳] حجاج رحمہ اللہ اس سند میں الاسود ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۲) امام احمد رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور رجل صالح کہتے ہیں امام ابن معین رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں، امام ابو حاتم رحمہ اللہ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں اور محدث ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (لسان المیزان ج ۲ ص ۱۷۵)

[۴] ثابت بنانی رحمہ اللہ جلیل القدر تابعی اور صحاح ستہ کے مرکزی راوی ہیں۔ امام نسائی رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں امام عجلی رحمہ اللہ بھی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ علامہ ابن سعد رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ محدث ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں، امام احمد رحمہ اللہ ان کو مثبت فی الحدیث کہتے ہیں۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے میں سب سے اثبت امام زہری رحمہ اللہ، ان کے بعد ثابت بنانی رحمہ اللہ اور ان کے بعد قتادہ ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳)

غرض یہ کہ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ اور ثبت ہیں اور سند بالکل صحیح ہے۔

علامہ عبدالرؤف مناوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۰۳ھ) فرماتے ہیں: "هذا حديث صحيح" (فیض القدیر ج ۳ ص ۱۸۴) کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "ابو یعلی بنقل ثقات از روایت انس رضی اللہ عنہ بن مالک آوردہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون" (مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۴۴۷، جذب القلوب ص ۱۸۰)

"امام ابو یعلی رحمہ اللہ ثقہ راویوں کی نقل سے حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام زندہ ہیں اور اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔"

قاضی شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "انه صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ وروحه لا تفارقه، لما صح ان الانبياء احياء فی قبورهم" (تحفۃ الذاکرین شرح حصن حصین ص ۲۸، طبع مصر)

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ ہیں اور آپ کی رُوح آپ کے جسم مبارک سے جدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔"

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ: "و قد ثبت فی الحديث ان الانبياء احياء فی قبورهم رواه المنذری و صححه البيهقی" (نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۶۴)

"بلاشبہ حدیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔
علامہ منذری رحمہ اللہ نے یہ روایت بیان کی ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔"

علامہ سید سمہودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "ورواه ابو يعلی برجالٍ ثقات ورواه البيهقی وصححه" (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۰۵)

"ابو یعلی رحمہ اللہ نے ثقہ راویوں سے یہ روایت کی ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح سند سے روایت کیا ہے۔"

اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری لکھتے ہیں کہ اور یہ حدیث کہ انبیاء اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں صحیح ہے۔ (فضائل درود ص ۳۷)

آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ امام ابو یعلی رحمہ اللہ کے طریق سے جو روایت ہے اس کے تمام راوی ثقہ اور ثبت ہیں اور جمہور محدثین کرام رحمہم اللہ اس کی تصحیح کرتے ہیں۔ کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لئے اُصولِ حدیث میں اس سے زیادہ قوی دلائل موجود نہیں ہیں کہ اس کے راوی سب ثقہ ہوں اور جمہور محدثین کرام رحمہم اللہ اس کی تصحیح پر متفق ہوں۔

اعتراض: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند میں حسن بن قتیبہ خزاعی ہے جس کے متعلق ذہبی رحمہ اللہ نے "میزان الاعتدال" میں ابن عدی رحمہ اللہ کا قول لا بأس به ذکر کر کے اپنی اور دوسرے ائمہ کی رائے ذکر فرمائی ہے: "قلت بل هو هالک قال الدار قطنی فی رواية البرقانی متروک الحديث قال ابو حاتم ضعيف قال الازدی واهی الحديث قال العقيلی كثير الوهم" (ج ۱ ص ۲۴۱) یعنی ائمہ جرح وتعدیل کی نظر میں یہ ہالک متروک الحدیث ضعیف واہی الحدیث اور کثیر الوہم ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے (لسان المیزان ج ۲ ص ۲۴۶) میں ذہبی رحمہ اللہ کی پوری عبارت نقل فرما کر اس جرح کی تصدیق فرما دی ہے۔ حافظ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے بھی اسے واہی الحدیث اور متروک الحدیث فرمایا ہے۔ (تاریخ بغداد ج ۷ ص ۴۰۵)

باقی رہا شوکانی رحمہ اللہ کا تحفۃ الذاکرین میں حدیث ردّ اللہ علیّ روحی کی تشریح میں یہ لکھنا لانہ ﷺ حی فی قبرہ وروحہ لاتفارقہ، لما صح ان الانبیاء احیاء فی قبورھم (ص ۲۸) تو سابق مفصل جرح کے موجود ہوتے صحیح سے مصطلح صحت مراد لینا تو مشکل ہے، یہ صحیح بمعنی ثبت ہی ہوسکتا ہے۔ جب تک حدیث پر وضع کا حکم یقینی نہ ہو محدثین کے نزدیک ثبت سے اس کی تعبیر ہوسکتی ہے۔ "نیل الاوطار" میں حافظ شوکانی رحمہ اللہ نے یہی لفظ اختیار کیا ہے۔ "وقد ثبت فی الحدیث ان الانبیاء احیاء فی قبورھم" (ج ۳ ص ۳۰۵)

ایسی احادیث کا تذکرہ مواعظ اور فضائل کی مجالس میں تو کیا جاسکتا ہے لیکن عقیدہ کی بنیاد اس پر نہیں رکھی جاسکتی۔ اہل حدیث اور ائمہ فن کے نزدیک اعتقاد کے لئے خبر واحد صحیح ہونی چاہئے۔

الجواب: یہ جو کچھ کہا گیا ہے قطعاً باطل اور سراسر مردود ہے۔ اوّلاً: اس لئے کہ جن محدثین کرام رحمہم اللہ نے یہ حدیث سند کے ساتھ نقل کی ہے ہمارے علم میں وہ تین ہیں: الاوّل: امام ابو یعلیٰ الموصلی رحمہ اللہ ان کی سند امام بیہقی رحمہ اللہ اور علامہ سبکی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح نقل کی ہے جس طرح ہم نے پہلے بیان کی ہے اور ایک ایک راوی کی توثیق اور محدثین کرام رحمہم اللہ کی تصحیح بھی نقل کردی گئی ہے نہ تو اس سند میں حسن بن قتیبہ خزاعی ہے اور نہ کوئی اور مجروح راوی ہے اور محدثین کرام رحمہم اللہ اسی ابو یعلیٰ رحمہ اللہ کی سند کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ صحیح ہے اور اس کے رجال ثقات ہیں اور قاضی شوکانی رحمہ اللہ کے پیش نظر بھی یہی روایت ہے اور اس حدیث کے رواۃ پر کوئی معقول جرح مذکور اور موجود نہیں ہے۔ سینہ زوری کا البتہ کوئی علاج نہیں۔ الثانی: امام ابن عدی رحمہ اللہ نے اس کو اپنی سند کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس کا حوالہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے (حیات الانبیاء ص ۱) میں اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے (میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۴۱) میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے (لسان المیزان ج ۲ ص ۲۴۶) میں دیا ہے اور اس کی سند یوں ہے: ابن عدی حدثنا قسطنطین ثنا الحسن بن عرفۃ ثنا الحسن بن قتیبۃ" اس سند میں الحسن بن قتیبہ الخزاعی ہے۔

اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی جرح صرف اس سند پر ہے۔

الثالث: امام البزار رحمہ اللہ (ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق الحافظ العلامۃ صاحب المسند المتوفی ۲۹۲ھ، تذکرۃ ج ۲ ص ۲۰۴) نے یہ روایت سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے مسند میں باسند احادیث ہی روایت کرتے ہیں۔

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۱۱) میں بزار رحمہ اللہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مسند بزار کی سند ہمارے پیش نظر نہیں ہے[1]

ممکن ہے بزار رحمہ اللہ کی سند میں بھی الحسن بن قتیبہ الخزاعی ہو لیکن علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے خصوصیت سے یہ فرمایا ہے کہ رجال ابن یعلیٰ ثقات تو دارومدار ابو یعلیٰ رحمہ اللہ کی سند پر ہے اور وہ بالکل صحیح ہے اور محدثین کرام رحمہم اللہ اسی کی تصحیح کرتے ہیں اور حیات انبیاء کرام علیہم السلام کی بنیاد اس صحیح حدیث پر رکھتے ہیں۔ معترضین حضرات بلاوجہ یہ جرح نقل کرکے اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے اور عوام کے صاف اذہان کو اُلجھانے کی بے کار سعی کر رہے ہیں۔ وثانیاً: قاضی شوکانی رحمہ اللہ نے صحیح اور ثبت کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ اُصول حدیث اور فن روایت کے مطابق استعمال کئے ہیں اور یہ دونوں لفظ مقبول حدیث پر بولے جاتے ہیں۔ معترض نے جو یہ کہا ہے کہ صحیح بمعنی ثبت کے ہے اور محدثین

---

[1] حضرت العلام مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی فرماتے ہیں کہ مسند بزار کی سند میں الحسن بن قتیبہ موجود ہے۔ جیسا کہ ان کی تقریظ میں یہ بات گزر چکی ہے اور (طبقات سبکی ج ۲ ص ۲۸۱) کی سند میں بھی یہی الحسن بن قتیبہ ہے۔

جو حدیث قطعی طور پر جعلی ثابت نہ ہو، اس پر بھی ثبت کا لفظ اطلاق کرتے ہیں۔ (محصلہ) تو یہ خالص سینہ زاد اختراع اور ایجاد بندہ ہے اور محدثین کرام رحمہم اللہ اس سے بالکل ناواقف ہیں اور قاضی شوکانی رحمہ اللہ کے وہم میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ ایک ہمارے محسن کرم فرما اور وکیل ان پر کیا کیا عنایات فرمائیں گے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (المتوفی ۹۱۱ھ) محدثین کرام کا ضابطہ بیان کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ: ''من الالفاظ المستعملة عند اهل الحديث فی المقبول الجيد والقوی۔ والصالح والمعروف والمحفوظ والمجود والثابت'' (تہذیب الراوی ص ۱۰۴، طبع مصر)

''محدثین کرام رحمہم اللہ کے نزدیک حدیث مقبول پر جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں جید۔ قوی، صالح، معروف، محفوظ مجود اور ثابت۔''

اس سے معلوم ہوا کہ محدثین کرام رحمہم اللہ کے نزدیک جید، قوی اور ثابت وغیرہ الفاظ ایک ہی درجہ کے ہیں اور یہ الفاظ حدیث مقبول میں استعمال کئے جاتے ہیں نہ کہ اس حدیث پر جو اگرچہ قطعی طور پر موضوع ثابت نہ ہو سکے مگر صحیح اور مقبول بھی نہ ہو۔

اور پھر آگے امام سیوطی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''والموجود والثابت يشملان۔ ايضاً الصحيح''

''لفظ موجود اور ثابت صحیح کو شامل ہیں۔'' (تدریب الراوی ص ۱۰۵)

اِس سے بصراحت یہ بات واضح ہوگئی کہ صحیح اور ثابت یا بالفاظ دیگر صَحَّ اور ثَبَتَ ایک ہی معنی پر اطلاق ہوتے ہیں، ان میں استعمال کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا معترض صاحب کی یہ سینہ زاد توجیہ مردود اور توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ کا مصداق ہے۔ وثالثاً: معترض کا یہ ارشاد کہ اہل حدیث اور ائمہ فن کے نزدیک اعتقاد کے لئے خبر واحد صحیح ہونی چاہئے۔ اس میں بھی خاصا کلام ہے۔ اگر لفظ اہل حدیث اور ائمہ فن سے ان کی اپنی اصطلاح مراد ہے تو وہ اس کو خوب جانتے ہیں۔ کیونکہ صاحب البیت ادری بما فیہ اور اگر اس سے جمہور محدثین کرام رحمہم اللہ اور متکلمین وغیرہم مراد ہیں تو ان کے نزدیک قطعی عقیدہ میں خبر واحد صحیح بھی ناکافی ہے۔ (شرح عقائد ص ۱۰۱) وغیرہ میں اس کی بحث موجود ہے۔ ہاں! اگر خبر واحد اجماع اور تلقی اُمت بالقبول سے مؤید ہو جائے۔ جیسے یہ مذکور حدیث ہے تو بات جُدا ہے۔ ہمیں اس موقع پر یہ بحث مقصود نہیں۔ جب سنداً یہ روایت صحیح ہے اور محدثین کرام رحمہم اللہ کی تصحیح اس پر مستزاد ہے تو مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہونا چاہئے کہ (الانبیاء احیاء فی قبورھم) حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔ معترض صاحب اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر اس حق مسلک کو کیوں کمزور کرنے کے درپے ہیں؟

علامہ ذہبی رحمہ اللہ کا وہم

اس صحیح حدیث کے سلسلہ میں قدرے معقول نما اعتراض جو سامنے آیا ہے، وہ علامہ شمس الدین ابوعبداللہ الذہبی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۴۸ھ) کا ہے وہ لکھتے ہیں کہ: ''حجاج بن الاسود عن ثابت البنانی نكرة ماروى عنه فيما اعلم سوى مستلم بن سعيد فاتی بخبر منكر عنه عن انس رضی اللہ عنہ فی ان الانبياء احياء فی قبورهم يصلّون رواه البيهقی'' (میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۰۴، طبع مصر)

''حجاج بن الاسود رحمۃ اللہ علیہ ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں مگر وہ مجہول ہیں ہماری دانست کے مطابق مستلم بن سعید کے بغیر ان سے کسی نے روایت نہیں کی اور اس نے حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے ایک منکر روایت بیان کی ہے وہ یہ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت نقل کی ہے۔''

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے اس اعتراض کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے: (۱) یہ کہ حجاج بن الاسود مجہول ہے نکرۃ۔ (۲) یہ کہ مستلم بن سعید کے علاوہ اس سے کسی اور نے روایت نہیں کی۔ (۳) یہ کہ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کے طریق سے جو روایت اُنہوں نے نقل کی ہے وہ منکر ہے جس کا مضمون یہ ہے: ''الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون'' لہٰذا یہ روایت مخدوش ہے۔

الجواب: آپ ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

(۱) علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول کہ حجاج بن الاسود (نکرۃ) مجہول ہے، صحیح نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اعتراض نقل کر کے آگے لکھا ہے: ''قال احمد رحمۃ اللہ علیہ ثقۃ ورجل صالح وقال ابن معین ثقۃ وقال ابو حاتم صالح الحدیث وذکرہ ابن حبان فی الثقات''

''کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ان کو ثقہ اور مرد صالح کہتے ہیں اور امام ابن معین رحمۃ اللہ علیہ ان کو ثقہ کہتے ہیں ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔'' (لسان المیزان ج ۲ ص ۱۷۵)

جب ائمہ جرح وتعدیل اور چوٹی کے محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہ ان کو ثقہ کہتے ہیں تو پھر وہ نکرۃ اور مجہول کیسے رہے؟

(۲) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ: ''وعنہ جریر بن حازم وحماد بن سلمۃ وروح بن عبادۃ واخرون''

''حجاج بن الاسود رحمۃ اللہ علیہ سے جریر بن حازم رحمۃ اللہ علیہ حماد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ رُوح بن عبادہ رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات روایت کرتے ہیں۔''

اور اخرون میں آگے عیسیٰ بن یونس رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی لیا ہے۔ (دیکھئے لسان ج ۲، ص ۱۷۵) جب ان سے روایت کرنے والے مستلم بن سعید رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ اور بھی موجود ہیں تو علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اعتراض بھی ختم ہو گیا کہ اس سے ہماری دانست میں صرف مستلم بن سعید رحمۃ اللہ علیہ ہی نے روایت کی ہے۔ غرض یہ کہ اُصولِ حدیث کی رُو سے نہ تو یہ راوی مجہول الحال ہے اور نہ مجہول العین اس لئے علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے اس اعتراض کی کوئی وقعت نہیں۔

(۳) یہ شق پہلی دو شقوں کا نتیجہ ہے جب وہ دونوں باطل ہیں تو یہ خود بہ خود باطل ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں خبر منکر وہ ہوتی ہے جس کو کوئی ضعیف راوی ثقہ راویوں کے خلاف روایت کرتا ہو یا بعض کے نزدیک کوئی ثقہ راوی اپنے سے ثقہ تر راوی کے خلاف روایت کرتا ہو جس کو بعض شاذ سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ (علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بعض محدثین شاذ اور منکر کو ایک ہی سمجھتے ہیں اور بعض فرماتے ہیں کہ شاذ وہ روایت ہوتی ہے جس میں ثقہ یا صدوق راوی دیگر ثقات کی مخالفت کرے اور منکر وہ روایت ہے جس میں ضعیف راوی ثقات کی مخالفت کرے۔ (تدریب الراوی ص ۱۵۲) مگر اس روایت کی حیثیت ہرگز یہ نہیں ہے۔ کیونکہ حجاج بن الاسود رحمۃ اللہ علیہ ثقہ ہے، ضعیف نہیں

اور پھر اس نے کسی ثقہ یا ثقہ تر اور اوثق کی مخالفت بھی نہیں کی تو ان کی روایت اُصول حدیث کے اعتبار سے کیونکر منکر ہوگئی ہے؟ نظر بہ ظاہر علامہ ذہبی کو یہ وہم ہوا ہے کہ انہوں نے اس سابق حدیث کو حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت کے آئینہ میں دیکھا ہے۔ حالانکہ وہ الگ اور مستقل روایت ہے اور یہ الگ حدیث ہے اور پھر یہ مذکور روایت اس کے مخالف بھی نہیں بلکہ اس کی مؤید ہے۔

وہ دوسری روایت یوں آتی ہے: ''حماد بن سلمة عن ثابت البناني و سليمان التيمي عن انس بن مالک ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال اتيت و في رواية مررت علی موسى ليلة أسرى بی عند الكثيب الاحمر و هو قائم يصلي في قبره'' (مسلم ج ۲ ص ۲۶۸، ومسند احمد ج ۳ ص ۱۴۸)

''حماد بن سلمہ رحمہ اللہ، ثابت بنانی رحمہ اللہ اور سلیمان تیمی رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں معراج کی رات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا جو سُرخ رنگ کے ٹیلے کے پاس اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔''

اس صحیح روایت سے ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے اور حجاج بن الاسود رحمہ اللہ کی سابق روایت اس حدیث کے کسی طرح مخالف اور منافی نہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ باقی حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اپنی قبروں میں نماز پڑھنے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اپنی قبر میں نماز پڑھنے سے کوئی مخالفت اور منافات لازم ہیں آتی اور نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اپنی قبر میں نماز پڑھنے سے باقی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اپنی قبروں میں نماز پڑھنے کی مخالفت پیدا ہوتی ہے۔ اگر مسلم کی اس صحیح روایت کے پیش نظر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبر میں نماز پڑھنا ثابت ہے اور اس سے اسلام کے کسی عقیدہ پر زد نہیں پڑتی تو یقین کامل ہے کہ دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اپنی قبروں میں نماز پڑھنے سے بھی کسی عقلی اور نقلی دلیل کی مخالفت لازم نہیں آتی۔ یہ دونوں روایتیں ایک دوسرے کے مخالف اور منافی تو ہرگز نہیں۔ ہاں! ایک دوسرے کی مؤید ضرور ہیں اور حجاج بن الاسود رحمہ اللہ کی روایت میں متن کی زیادت ہے۔ (اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نماز کے علاوہ دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی نماز کا بھی ذکر ہے) اور محدثین کرام رحمہم اللہ کا قاعدہ ہے کہ جب ثقہ راویوں سے سند اور متن میں زیادت مروی ہو تو وہ قابل قبول ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو مستدرک ج ۱ ص ۳ وغیرہ)

علامہ سخاوی رحمہ اللہ اپنے اُستاد محترم حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: ''و شاهد الحديث الاوّل مااثبت في صحيح مسلم من رواية حماد بن سلمة'' (القول البدیع ص ۱۲۶)

''اس سابق حدیث کا شاہد اور مؤیدہ وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں حماد بن سلمہ رحمہ اللہ کے طریق سے مروی ہے۔''

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی (فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۲) میں اس کا ذکر کیا ہے اور حضرت مولانا عثمانی رحمہ اللہ نقل فرماتے ہیں کہ: ''و شاهد هذا الحديث ما اثبت في صحيح مسلم من رواية حماد بن سلمة عن ثابت عن انس رضی اللہ عنہ رفعه'' (فتح الملہم ج ۱ ص ۳۲۹)

''اس حدیث کا شاہد وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں حماد بن سلمہ رحمہ اللہ کے طریق سے ثابت بنانی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت کی ہے۔''

الغرض حجاج بن الاسود رحمہ اللہ اور حماد بن سلمہ رحمہ اللہ کی دونوں روایتیں ایک دوسرے کی مؤید، باعث تقویت اور شاہد ہیں نہ کہ ایک دوسرے کی مخالف اور منافی اس لئے علامہ ذہبی رحمہ اللہ کا اعتراض بے جا ہے۔

منکر اور شاذ کی تعریف

اس مقام پر یہ بحث بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگی کہ منکر اور شاذ کی تعریف عرض کر دی جائے تا کہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ کا اس روایت کو منکر کہنے کا پس منظر اور پیش منظر سامنے آ جائے اور امام مسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''وعلامة المنكر في حديث المحدث اذا ما عرضت روايته، للحديث علٰى رواية غيره من اهل الحفظ والرضٰى خالفت روايته روايتهم اولم تكد توافقها فاذا كان الاغلب من حديثه كذلك كان مهجور الحديث غير مقبوله ولا مستعمله'' (مسلم ج ۱ ص ۵)

''حدیث بیان کرنے والے کی حدیث کے منکر ہونے کی علامت یہ ہے کہ جب اس کی حدیث دوسرے اہل حفظ اور پسندیدہ راویوں کی حدیث پر پیش کی جائے تو اس کی روایت ان کی روایت کے مخالف ہو یا ممکن ہی نہ ہو کہ اس کی روایت اُن کی روایت کے موافق ہو سکے۔ جب اس کی حدیث پر یہ اغلب ہو تو اس کی حدیث متروک اور غیر مقبول ہوگی۔''

اس تعریف کے پیش نظر ''حجاج بن الاسود رحمہ اللہ'' کی روایت کسی طرح منکر نہیں۔ کیونکہ یہ حماد بن سلمہ رحمہ اللہ کی روایت کے موافق مؤید اور اس کی شاہد ہے اور اس کے مخالف کسی طرح نہیں ہے۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''قال الشافعي رحمہ اللہ ليس الشاذ من الحديث ان يروى الثقة مالا يرويه غيره هذا ليس بشاذ وانما الشاذ ان يروى الثقة حديثا يخالف فيه الناس هذا الشاذ من الحديث''

''شاذ وہ روایت نہیں ہے جس کو ایک ثقہ راوی بیان کرتا ہو اور دوسرے بیان نہ کرتے ہوں بلکہ شاذ وہ روایت ہے جس کو ثقہ راوی بیان کرے مگر اس کی روایت دوسرے راویوں کی روایت کے مخالف ہو، ایسی حدیث شاذ ہوتی ہے۔'' (معرفت علوم الحدیث ص ۱۱۹ طبع قاہرہ)

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''لان الزيادة اما ان تكون لاتنافي بينها وبين رواية من لم يذكر فهذه تقبل مطلقا لانها في حكم الحديث المستقل الذي يتفرد به الثقة ولا يرويه عن شيخه غيره و اما ان تكون منافية بحيث يلزم من قبولها رد الرواية الأخرٰى فهذه هي التي يقع الترجيح بينها وبين معارضها فيقبل الراجح ويرد المرجوح'' (شرح نخبۃ الفکر ص ۳۷)

''زیادت یا تو ایسی ہوگی کہ جن رواۃ نے یہ بیان نہیں کی۔ یہ ان کی حدیث کے مخالف نہیں تو وہ مطلقاً قابل قبول ہے۔ کیونکہ وہ ایک مستقل حدیث کے حکم میں ہے جس کے بیان کرنے میں ثقہ راوی متفرد ہے اور اس کے شیخ سے کوئی دوسرا اس کو بیان نہیں کرتا اور یا یہ روایت منافی ہوگی۔ بایں طور کہ اس کے قبول کر لینے سے دوسری روایت کا رَد لازم آتا ہو تو ایسی زیادت اور اس کے معارض حدیث میں ترجیح کا سوال پیدا ہوگا راجح کو قبول کر لیا جائے گا اور مرجوح کو رد کر دیا جائے گا۔''

اور امام سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "ثم یفسرون الشذوذ بمخالفة الثقة من ھو اوثق منه والمنقول عن ائمة الحدیث المتقدمین کابن مھدی و یحیی القطان و احمد و ابن معین و ابن المدینی والبخاری و ابی زرعة و ابی حاتم والنسائی والدار قطنی و غیرھم اعتبار الترجیح فیما یتعلق بالزیادة المنافیة بحیث یلزم من قبولها رد الروایة الاخری" (تدریب الراوی ص ۱۵۷، طبع مصر)

"پھر محدثین کرام رحمہ اللہ شذوذ کی یہ تفسیر کرتے ہیں کہ ثقہ راوی اوثق کی مخالفت کرتا ہو اور حضرت متقدمین ائمہ حدیث مثلاً امام ابن مہدی رحمہ اللہ، یحییٰ القطان رحمہ اللہ، ابن معین ابن المدینی رحمہ اللہ، بخاری رحمہ اللہ، ابو زرعہ رحمہ اللہ، ابو حاتم رحمہ اللہ، نسائی رحمہ اللہ اور دار قطنی رحمہ اللہ وغیرہ یہ فرماتے ہیں کہ ترجیح کا اعتبار اور سوال اس منافی روایت سے متعلق ہے اور منافات بھی اس حیثیت کی کہ اس زیادت کے قبول کر لینے سے دوسری روایت کا رد لازم آتا ہو۔"

اور علامہ جزائری رحمہ اللہ نے بھی اس کی اسی نہج پر بحث اور تحقیق کی ہے۔ (ملاحظہ ہو توجیہ النظر ص ۲۱۹، طبع مصر) ان روشن اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاذ کی تعریف میں مخالفت اور منافات بنیادی شرط ہے۔ بایں طور کہ اس شاذ کے قبول کر لینے سے دیگر ثقات کی روایت کا رَد اور مخالفت لازم آتی ہو لیکن حجاج بن الاسود رحمہ اللہ کی روایت سے نہ تو حماد بن سلمہ رحمہ اللہ کی روایت کی مخالفت اور منافات ہے اور نہ دیگر ثقہ راویوں کی روایت سے اس کا تضاد ہے۔ اس لئے اس کو منکر یا شاذ کہہ اور سمجھ کر اس سے گریز اور پہلو تہی کرنا تحقیق کے میدان سے کوسوں دُور ہے۔

علماء اسلام اور مسئلہ حیات

اس صحیح حدیث اور دیگر شرعی دلائل سے علماء ملت نے جو کچھ سمجھا ہے اس مقام پر اس کا ذکر کرنا بھی ایک حد تک ضروری ہے تاکہ اس حدیث کی صحت کے علاوہ اس کی مراد اور مطلب بھی واضح ہو جائے اور اس حدیث کے بارے میں انصاف و دیانت کی دُنیا میں کوئی شبہ باقی نہ رہے باقی جو حضرات ذاتی رائے کو چھوڑنا نہ چاہتے ہوں اُن کے لئے دفتروں کے دفتر بھی بیکار ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: "ان حیاته ﷺ فی القبر لا یعقبھا موت بل یستمر حیًا والانبیاء احیاء فی قبورھم" (فتح الباری ج ۷ ص ۲۲، طبع مصر)

"آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک میں زندگی ایسی ہے جس پر پھر موت وارد نہیں ہوگی بلکہ آپ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس عبارت میں آنحضرت ﷺ اور دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبروں میں زندگی صریح الفاظ میں بیان فرمائی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا ہے کہ قبر میں آپ کی زندگی مستمر اور دائمی ہے جس پر پھر موت طاری اور وارد نہیں ہوتی جس طرح کہ بعض حضرات کے نزدیک نکیرین کے سوال کے وقت عام مُردوں کو زندہ کیا جاتا ہے۔ پھر اُن پر وفات طاری کر دی جاتی ہے۔ گو جمہور اس کے بھی خلاف ہیں۔

نوٹ ضروری: چونکہ آنحضرت ﷺ پر قطعی اور صریح دلائل کی روشنی میں وفات آچکی ہے اور یہ بات سب کے نزدیک مسلّم ہے اور نفسِ موت میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ہاں! اس کے بعد قبر اور برزخ میں دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حیات اور زندگی حاصل ہے اور یہ برزخی حیات دائمی اور ہمیشہ کے لئے ہے۔ لہٰذا ایسی حیات کے تسلیم کرنے سے ہرگز کوئی شرک لازم نہیں آتا۔ جیسا کہ بعض کوتاہ فہم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پر وفات آچکی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آئے گی اور کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کا اٹل فیصلہ ان کے حق میں بھی پورا ہوگا اور جب ان کو حَیُّ الْقَیُّوم سے اس حیاتِ دائمہ کی صفت میں کوئی مماثلت ہی حاصل نہیں تو پھر شرک کیسا؟ ہاں! اگر کوئی شخص ان کی کسی قسم کی وفات کا قائل نہ ہو تو پھر یہ فتویٰ اس کی طرف رُخ پھیر سکتا ہے۔

حضرت امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''ان اللّٰہ جل ثناءہٗ رد الی الانبیاء ارواحھم فھم احیاء عند ربھم کالشھداء'' (حیات الانبیاء ص ۵۱۴، وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۰۶، زرقانی شرح مواہب ج ۵ ص ۳۳۲)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کے ارواح اُن کی طرف لوٹا دیئے ہیں۔ سو وہ اپنے رب کے ہاں شہیدوں کی طرح زندہ ہیں۔''

پہلے باحوالہ یہ بحث گزر چکی ہے کہ قبر اور برزخ میں مؤمنین اور کفار سب کی طرف ارواح لوٹائے جاتے ہیں تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا مقام تو بہت اُونچا ہے، اس لئے قبور میں ان کی حیات ردِّ اَرواح کے طور پر ہی ہوگی اور حضرت امام بیہقی رحمہ اللہ کی اس عبارت کا یہی مطلب ہے۔

حضرت مُلّا علی القاری رحمہ اللہ ارقام فرماتے ہیں کہ: ''المعتقد المعتمد انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہٖ کسائر الانبیاء فی قبورھم وھم احیاء عند ربھم وان لارواحھم تعلقا بالعالم العلوی والسفلی کما کانوا فی الحال الدنیوی فھم بحسب القلب عرشیون وباعتبار القالب فرشیون'' (شرح شفاء ج ۲ ص ۱۴۲، طبع مصر)

''قابل اعتماد عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ ہیں جس طرح دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں اور اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں اور ان کے اَرواح کا عالم علوی اور سفلی دونوں سے تعلق ہوتا ہے۔ جیسا کہ دنیا میں تھا سو وہ قلب کے لحاظ سے عرشی اور جسم کے اعتبار سے فرشی ہیں۔''

اس عبارت میں حیات انبیاء علیہم السلام کو قابلِ اعتماد عقیدہ قرار دیا ہے اور یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ ان کے ارواح طیبہ کا تعلق جنت ملاءِ اعلیٰ، رفیقِ اعلیٰ اور علّیین سے بھی قائم رہتا ہے اور عالم سفلی یعنی قبور میں ان کے اجسامِ مبارکہ سے بھی جس طرح کہ دُنیا میں تھا کہ وہ قلب کے اعتبار سے عرشی اور قالب کے لحاظ سے فرشی تھے۔

علّامہ سمہودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''لا شک فی حیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد وفاتہٖ وکذا سائر الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام احیاء فی قبورھم حیاۃ اکمل من حیوۃ الشھداء التی اخبر اللّٰہ بھا فی کتابہ العزیز'' (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۰۵)

''وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں کوئی شک نہیں اور اسی طرح باقی تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور ان کی یہ حیات شہداء کی اُس حیات سے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کیا ہے بڑھ کر ہے۔''

اس عبارت میں وفات کے بعد حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات کا ذکر ہے اور یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ ان کی حیات شہداء کی حیات سے جس کا ذکر قرآنِ پاک میں آیا ہے، زیادہ کامل اور اعلیٰ درجہ پر ہے۔

یعنی جس طرح کہ ان کا درجہ بلند ہے، اسی طرح قبر میں ان کی زندگی بھی شہداء کی زندگی سے عمدہ اور ارفع ہے اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''و اما ادلة حياة الانبياء فمقتضاها حياة الابدان كحالة الدنيا مع الاستغناء عن الغذاء'' (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۰۷)

''بہرکیف حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات کے دلائل اس کے متقضی ہیں کہ یہ حیات ابدان کے ساتھ ہو جیسا کہ دنیا میں تھی مگر خوراک سے وہ مستغنی ہیں۔''

یعنی ان کی حیات محض برزخی اور روحانی ہی نہیں بلکہ جسمانی بھی ہے مگر جس طرح دنیا میں اجسام عادۃً خوراک کے محتاج ہوتے ہیں۔ قبر میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام طیبہ کو حسّی اور دنیوی خوراک کی حاجت نہیں بلکہ وہ اس سے مستغنی ہیں۔

امام علی بن عبدالکافی السبکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''و اما حيوة الانبياء اعلٰى و اكمل و اتم من الجميع لانها للروح و الجسد على الدوام على ما كان فى الدنيا'' (شفاء السقام ص ۱۵۴)

''بہرحال حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات تو تمام سے اعلیٰ اکمل اور اتم ہے۔ کیونکہ ان کی حیات جسم اور رُوح دونوں کو دوامی طور پر حاصل ہے جس طرح کہ دنیا میں تھی۔''

اور دوسرے مقام پر ارقام فرماتے ہیں کہ: ''فان الصلٰوة يستدعى جسدًا حيا و كذٰلك الصفات المذكورة فى الانبياء ليلة الاسراء كلها صفات الاجسام و لا يلزم من كونها حياة حقيقيةً ان يكون الابدان معها كما كانت فى الدنيا من الاحتياج الى الطعام و الشراب و الامتناع عن النفوذ فى الحجاب الكثيف و غير ذٰلك من صفات الاجسام التى نشاهدها بل قد يكون لها حكم اٰخر فليس فى العقل ما يمنع من اثبات الحيوة الحقيقة لهم و اما الادراكات كالعلم و السماع فلا شك ان ذلك ثابت و سند كر ثبوته لسائر الموتٰى فكيف بالانبياء انتهٰى'' (شفاء السقام ص ۱۴۳)

''نماز زندہ جسم کو چاہتی ہے اور اسی طرح معراج کی رات حضرات انبیاء علیہم السلام کے بارے میں جتنی صفات کا ذکر ہے وہ تمام اجسام کی صفات ہیں اور اس حیات کے حقیقی حیات ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس حیات کے ساتھ ابدان کو کھانے پینے کی ویسی ہی حاجت ہو، جیسے دُنیا میں تھی یا یہ کہ وہ کثیف پردہ میں نفوذ نہ کر سکیں اور اسی طرح اجسام کی دیگر صفات جن کا ہم دُنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اُن ابدان کا حکم دنیوی ابدان سے جُدا اور اَلگ ہو۔ عقلاً اس میں کوئی امتناع نہیں کہ ان کے لئے حقیقی حیات ثابت ہو رہے۔ ادراکات مثلاً علم اور سماع وغیرہ تو ان کے ثبوت میں کوئی شک و شبہ ہی نہیں۔ یہ تو تمام مُردوں کے لئے ثابت ہیں۔ پھر بھلا حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے کیوں ثابت نہ ہوں گے؟''

اس عبارت سے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حقیقی اور جسمانی حیات پر خاصی روشنی پڑتی ہے اور اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حیات جسمانی کے جملہ لوازمات قبر میں ثابت نہیں ہیں۔ مثلاً کھانے اور پینے کی جس طرح حاجت دُنیا میں ہوتی ہے۔ اس طرح قبر میں نہیں ہوتی اور اسی طرح دیگر کئی احکام میں بڑا فرق اور تفاوت ہے۔ ہاں! دُنیوی حیات کی طرح ان کو ادراک علم اور شعور حاصل ہے اور انہی اہم اُمور کی وجہ سے اس کو دنیوی اور جسمانی حیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ان کے فرزند ارجمند علامہ تاج الدین السبکی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۷۱ھ) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکور حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''عن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون فاذا ثبت ان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم حی فالحی لابد من ان یکون اما عالما او جاھلا ولا یجوز ان یکون النبی صلی اللہ علیہ وسلم جاھلا''

(طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۶ ص ۲۸۱، طبع مصر)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو زندہ کے لئے لازم ہے کہ یا تو وہ عالم ہو اور یا جاہل اور یہ بات تو ہرگز جائز نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جاہل ہوں (معاذ اللہ) تو لامحالہ آپ عالم ہوں گے۔''

اس عبارت میں علامہ سبکی رحمہ اللہ نے ایک تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث صحیح اور قابل احتجاج ہے اور پھر واضح الفاظ میں یہ بات آشکارا کر دی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبر میں زندہ اور صفت علم سے متصف ہیں۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''لان عندنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یحس ویعلم وتعرض علیہ اعمال الامۃ ویبلغ الصلوٰۃ والسلام علی ما بینا'' (ج ۶ ص ۲۸۲)

''ہمارے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں حس وعلم سے موصوف ہیں اور آپ پر اُمت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں اور آپ کو صلوٰۃ وسلام پہنچائے جاتے ہیں جس طرح کہ ہم بیان کر آئے ہیں۔''

قبر میں حیات کے جو نتائج مرتب ہیں امام موصوف رحمہ اللہ نے ان کو اس عبارت میں بالکل نمایاں کر کے پیش کر دیا ہے کہ حس وعلم اور عرض[1] اعمال وتبلیغ صلوٰۃ وسلام بالکل محقق ہیں کچھ غلط کار یا کم فہم لوگوں نے امام اہل سنت ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ (المتوفی ۳۳۰ھ) کی طرف یہ عقیدہ منسوب کیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی نبوت کے قائل نہیں۔ (معاذ اللہ) ان کم فہموں کو شبہ یہ ہوا ہوگا کہ چونکہ وفات کے ساتھ تکلیفی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے نبوت اور رسالت کے فرائض بھی شاید وفات کے ساتھ ختم ہو چکے ہیں۔ اشاعرہ نے اس غلط نظریہ کی اپنے امام سے جو پرزور مدافعت کی ہے، وہ متعدد کتابوں میں مذکور ہے۔

---

[1] عرض اعمال کے بارے میں نہایت مختصر تحقیق یہ ہے کہ صحیح روایت سے اجمالی طور پر عرض اعمال ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حیاتی خیر لکم تحدثون ویحدث لکم ووفاتی خیر لکم تعرض علی اعمالکم فما رأیت من خیر حمدت اللہ علیہ وما رأیت من شر استغفرت اللہ لکم رواہ البزار ورجالہ رجال الصحیح'' (مجمع الزوائد ج ۹ ص ۲۴، وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۰۶، ذکرہ السبکی رحمہ اللہ فی شفاء السقام ص ۳۴ والعلامۃ داؤد بن سلیمان البغدادی رحمہ اللہ فی المنحۃ الوہبیۃ فی رد الوہابیۃ ص ۱۵، طبع استنبول والزرقانی فی شرح المواہب، ج ۵ ص ۳۳۷) ''کہ میری زندگی تمہارے لئے بہتر ہے کہ تم (مشکل مسئلے) بیان کرو گے اور (میری طرف سے) ان کی حقیقت بیان کر دی جائے گی اور میری موت بھی تمہارے لئے بہتر ہوگی۔ تمہارے اعمال مجھ پر پیش ہوں گے سو جو اچھے ہوں گے میں ان پر اللہ تعالیٰ کی تعریف کروں گا اور جو برے ہوں گے میں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگوں گا۔ اس کو بزار رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور اس کے سب راوی بخاری کے راوی ہیں۔'' امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت بسند صحیح ہے (خصائص الکبریٰ ج ۲ ص ۲۸۱) علامہ زرقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند جید ہے (زرقانی شرح مواہب ج ۵ ص ۳۳۷) اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند جید ہے (فہرست عقیدۃ الاسلام ص ۱۱) اور مولانا عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند جید ہے۔ (فتح الملہم ج ۱ ص ۴۱۳) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

چنانچہ علامہ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ومن عقائدنا أن الانبیاء علیہم السلام احیاء فی قبورهم فاین الموت الی ان قال وصنف البیهقی رحمہ اللہ جزؤا سمعناه فی حیوة الانبیاء علیہم السلام فی قبورهم و اشتد نکیر الاشاعرة علی من نسب هذا القول الی الشیخ'' (طبقات ج ۶ ص ۲۶۶)

''ہمارے عقیدہ میں یہ بات داخل ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں تو پھر ان پر موت کہاں؟ (پھر آگے فرمایا) کہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کی قبروں میں حیات پر ایک رسالہ تصنیف فرمایا ہے جو خود ہم نے سنا ہے اور جن لوگوں نے امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کی طرف یہ غلط بات منسوب کی ہے، اشاعرہ نے سختی سے اس کا رد کیا ہے۔''

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ نے بھی اس روایت سے استدلال کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتاویٰ عزیزی ج ۲ ص ۶۹، فارسی ومترجم اُردو ج ۲ ص ۱۳۶) اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے کہ اُمت کے اعمال ہر روز حضور ﷺ کے روبرو پیش کئے جاتے ہیں آپ اعمال خیر کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور بداعمالیوں پر مطلع ہو کر نالائقوں کے لئے استغفار فرماتے ہیں۔ (النحل، تفسیر ص ۲۵۸) اور اسی مضمون کی روایت مشہور ثقہ اور مامون تابعی حضرت بکر بن عبداللہ رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۹۴، والجامع الصغیر ج ۱ ص ۱۵۰، والسراج المنیر ج ۲ ص ۲۳۳، و خصائص الکبریٰ ج ۲ ص ۲۸۱) اور اس سند کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وهذا اسناد صحیح الی بکر المزنی رحمہ اللہ'' (الصارم المنکی ص ۱۶۸) اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن المبارک رحمہ اللہ نے حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ سے روایت کی ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ نبی ﷺ پر آپ کی اُمت کے اعمال صبح وشام پیش نہ کئے جاتے ہوں۔ (کذا فی المواہب نشر الطیب ص ۲۱۰، ۲۲۹) میں تصریح فرمائی ہے کہ یہ عرض اجمالی ہے تفصیلی نہیں۔ (محصلہ) اور مولانا سہارنپوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اور جو یہ عقیدہ نہیں بلکہ یہ عقیدہ ہے کہ جب حق تعالیٰ چاہے جس شئے کو چاہے آپ پر منکشف کر دیوے اور ملائکہ درود وسلام پہنچاتے ہیں اور اعمال اُمت کے بھی آپ پر پیش ہوتے ہیں تو درست ہے۔ (البراہین القاطعہ ص ۲۱۶، ۲۱۷، طبع امدادیہ دیوبند)

نیز حضرت فرماتے ہیں اس بات کو خوب یاد کر لینا ضروری ہے کہ عقیدہ سب کا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبر میں زندہ ہیں اور عالم غیب میں اور جنت میں جہاں چاہیں باذنہ تعالیٰ چلتے پھرتے ہیں اور اس عالم میں بھی حکم ہو تو آسکتے ہیں اور صلوٰۃ وسلام ملائکہ پہنچاتے ہیں اور اعمال اُمت آپ پر پیش ہوتے ہیں اور جس وقت حق تعالیٰ چاہے دنیا کے احوال کشف ہو جاتے ہیں اس میں کوئی مخالف نہیں مگر یہ کہ ہر جگہ محفل مولود میں اور دیگر مجالس ذکر میں ہر روز آتے ہوں یا ہر صورت ونداء اور عرض وحالات دُنیا کے ہر روز معلوم ہوتے ہوں بدون اعلام حق تعالیٰ کے اس کو تسلیم نہیں کرتے اور یہ کہ سب اشیاء کا علم حق تعالیٰ نے اُن کو دیا ہے اس کو بھی قبول نہیں کرتے بلکہ جس قدر دیا جاتا ہے اس قدر جانتے ہیں اور بس۔ (البراہین القاطعہ ص ۱۹۹، ۲۰۰) الغرض! یہ حدیث بالکل صحیح ہے لیکن یہ یاد ہے کہ عرض اعمال سے اُمت کے تمام اعمال کا عرض مراد نہیں ہے جیسا کہ شیعہ شنیعہ کا مسلک ہے یا جس طرح غالی قسم کے اہل بدعت کا باطل نظریہ ہے بلکہ یہ عرض صرف اجمالی ہے جس میں درود وغیرہ بعض اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''انہ عرض کعرض الاسماء علی الملائکۃ لاعلم محیطا الی ان قال فعلیہ انک لا تدری ما احدثوا بعدک مع عرض الاعمال علیہ ﷺ'' (فہرست عقیدۃ الاسلام ص ۱۱)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ متکلمین اشاعرہ ﷭ حضرات انبیاء ﷩ کی قبروں میں حیات کو تسلیم کرتے ہیں اور اپنے امام ابوالحسن الاشعری ﷫ کا بھی یہی مسلک بیان کرتے ہیں اور اس کے خلاف جو بات ان کی طرف نسبت کی گئی ہے، سختی سے وہ اس کی تردید کرتے ہیں اور دلائل کی مد میں امام بیہقی ﷫ کی کتاب کا سہارا لیتے ہیں۔

امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری ﷫ (المتوفی ۴۶۵ھ) لکھتے ہیں کہ: ''فاما ما حکی عنه وعن اصحابه انهم یقولون ان محمدا ﷺ لیس نبی فی قبره ولا رسول بعد موته فبهتان عظیم و کذب محض لم ینطق به منهم احد ولا سمع فی مجلس مناظرة ذلک عنهم ولا وجد فی کتاب لهم و کیف یصح ذلک وعندهم محمد صلوات الله علیه حی فی قبره قال الله تعالٰی وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ فاخبر سبحانه ان الشهداء احیاء عند ربهم فالانبیاء اولٰی بذلک لتقاصر رتبة الکافة عن درجة النبوة'' (الرسائل القشیریہ ص ۱۰، طبع کراچی)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ''یہ عرض (صرف اجمالی ہے) جس طرح کہ چیزوں کے نام فرشتوں پر پیش کیے گئے تھے اس سے علم محیط مراد نہیں ہے۔ (پھر آگے فرمایا) سو اس کی دلیل یہ ہے کہ قیامت کے دن آپ سے فرمایا جائے گا کہ تو نہیں جانتا کہ تیرے بعد ان بدعتیوں نے کیا کیا بدعات گھڑی ہیں۔ حالانکہ آپ پر اعمال پیش ہوتے رہے۔'' یعنی اگر اس عرضِ اعمال سے تفصیلی عرض مراد ہو جو اُمت کے تمام اعمال اور جزئیات کو شامل ہو تو انک لا تدری ما احدثوا بعدک کہنا صحیح نہیں ہو سکتا اور یہ صحیح صریح اور مشہور روایت ہے تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ شقی القلب اور بدبخت بدعتیوں نے جو بدعات آپ کے بعد ایجاد کی ہیں، ان کا آپ کو علم نہیں۔ حالانکہ ان کے اعمال بھی آپ پر پیش ہوتے ہیں تو یہ سوائے عرضِ اجمالی کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ مولف نے (تسکین القلوب ص ۱۰۲، ۱۰۳) میں حضرت شاہ صاحب ﷫ کا نام لئے بغیر بلا دلیل راقم پر غصہ کیا ہے کہ مولوی صاحب تطبیق میں فرماتے ہیں کہ: ''یہ عرضِ اعمال چونکہ اجمالی ہوتا ہے تفصیلی نہیں۔'' اور آگے اس اجمال کی نفی کی جولا حاصل بحث کی ہے اس سے حضرت شاہ صاحب ﷫ کے علمی جواب کا بالکل رد نہیں ہوتا ان کا جواب و تطبیق اپنی جگہ قائم ہے۔ ہاں! مگر انصاف شرط ہے۔

امام تاج الدین ابونصر عبدالوہاب السبکی الشافعی ﷫ (المتوفی ۷۷۱ھ) لکھتے ہیں: ''لان عندنا رسول الله ﷺ حی یحس ویعلم وتعرض علیه اعمال الامة ویبلغ الصلوٰة والسلام علی ما بینا'' (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۲۸۲)

''کیونکہ ہمارے نزدیک آنحضرت ﷺ زندہ ہیں حس رکھتے ہیں اور جانتے ہیں اور آپ پر اُمت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں اور صلوٰۃ وسلام آپ کو پہنچایا جاتا ہے اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔'' چونکہ آنحضرت ﷺ قبر مبارک میں زندہ ہیں اور زندگی کے آثار میں سے احساس اور علم بھی ہے اس لئے آپ ﷺ قبر مبارک میں حس وعلم کی صفت سے بھی متصف ہیں اور آپ پر اعمال اُمت اور صلوٰۃ وسلام پیش کیا جاتا ہے۔

علامہ السید نور الدین علی بن احمد السمہودی الشافعی ﷫ (المتوفی ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں: ''انا لا نسلم انه لا یستغفر بعد الموت لما سبق من حیاته و من استغفار امته بعد الموت عند عرض اعمالهم علیه'' (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۱۱) ''بے شک ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ آپ ﷺ وفات کے بعد استغفار نہیں کرتے کیونکہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ زندہ ہیں اور جب اُمت کے اعمال آپ ﷺ پر پیش کئے جاتے ہیں تو آپ ﷺ ان کے لئے استغفار کرتے ہیں۔'' اس عبارت میں بھی آپ ﷺ پر عرضِ اعمال کی اور اُمت کے لئے آپ ﷺ کے استغفار کی تصریح ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

''جو بات امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب سے حکایت کی گئی ہے کہ حضرت محمد ﷺ قبر میں نبی نہیں اور نہ وفات کے بعد رسول ہیں۔(معاذ اللہ) تو یہ بہتانِ عظیم اور خالص جھوٹ ہے اور ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ بات نہیں کہی اور نہ کسی مجلسِ مناظرہ میں ان سے سُنی گئی ہے اور نہ ان کی کسی کتاب میں اس کا ثبوت ہے اور یہ بات ان سے بھلا کیسے ثابت ہو سکتی ہے۔ جب کہ ان کے نزدیک آنحضرت ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اور ہرگز ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتل کئے گئے۔ یہ خیال نہ کرنا کہ وہ مُردہ ہیں بلکہ وہ اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں۔ اس ارشاد میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ شہداء زندہ ہیں۔ جب شہداء زندہ ہیں تو حضرات انبیاء علیہم السلام بطریق اولیٰ زندہ ہیں۔ کیونکہ سب کا رُتبہ نبوت کے رُتبہ سے قاصر ہے۔''

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) قاضی شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وقد ذھب جماعۃ من المحققین الی ان رسول اللہ ﷺ حی بعد وفاتہ و انہ یسر بطاعات امتہ'' (نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۶۴)

''محققین کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ وفات کے بعد زندہ کئے گئے ہیں اور آپ اُمّت کی طاعات سے خوش ہوتے ہیں۔''

عام موتیٰ پر عرضِ اعمال: اجمالی طور پر بعض اعمال کا آنحضرت ﷺ (اور اسی طرح دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام) پر عرض اہل السنت والجماعت کے ہاں ایک مسلّم حقیقت ہے۔ جیسا کہ اس کتاب میں درج شدہ حوالوں سے آپ کو یہ اَمر بخوبی معلوم ہو گیا ہے۔ اہلِ حق کے نزدیک جملہ اموات پر بھی بعض اعمال پیش کئے جاتے ہیں اچھے ہوں تو ان پر وہ خوش ہوتے ہیں بُرے ہوں تو اُن کو ان سے رنج ہوتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ کے حوالے سے ہم نے (سماع الموتیٰ ص ۱۶) میں اور بعض مرفوع احادیث اور چند حوالے (سماع الموتیٰ ص ۳۰۵) میں درج کر دیئے ہیں، وہاں ہی ملاحظہ فرمائیں طلبہ علم کے افادہ کے لئے ہم یہاں چند اور حوالے عرض کرتے ہیں وہ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) امام محمد بن محمد الغزالی رحمہ اللہ (المتوفی ۵۰۵ھ) نقل کرتے ہیں کہ: ''وقال النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سمعت رسول اللہ ﷺ علی المنبر یقول الا انہ لم یبق من الدنیا الا مثل الذباب یمور فی جوھا فاللہ اللہ فی اخوانکم من اھل القبور فان اعمالکم تعرض علیھم وقال ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ قال النبی ﷺ لا تفضحوا موتاکم بسیئات اعمالکم فانھا تعرض علی اولیاء کم من اھل القبور'' (احیاء العلوم ج ۴ ص ۴۱۲)

''حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے منبر پر آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے سنا آپ نے فرمایا کہ خبردار دُنیا اتنی ہی باقی ہے، جتنی (تھوڑی دیر) مکھی جو میں حرکت کرتی ہے۔ سوتم قبر میں دفن ہونے والے اپنے بھائیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ کیونکہ تمہارے اعمال ان پر پیش کئے جاتے ہیں اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنے بُرے اعمال سے اپنے مُردوں کو مت رُسوا کرو تمہارے اعمال تمہارے رشتہ داروں پر قبروں میں پیش کئے جاتے ہیں۔''

یہ روایت اپنے مدلول کے لحاظ سے بالکل واضح ہے اور اس سے صراحۃً یہ ثابت ہوتا ہے کہ زندوں کے بُرے اعمال سے ان کے اعزہ و اقارب اور رشتہ دار مُردوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اہل السنت والجماعت کے امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ کی طرف ان کے دشمنوں نے جو یہ بات منسوب کی ہے کہ وہ وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے قائل نہیں ہیں۔ یہ خالص بہتان اور محض افتراء ہے۔ خود ان کی اور ان کے اتباع کی کتابوں میں اس کے خلاف مصرح ہے۔

پھر آگے لکھتے ہیں کہ: ''لان الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام احیاء فی قبورھم و قد اقام النکیر علی الافتراء ذلک ابو القاسم القشیری رحمہ اللہ'' (شامی ج ۳ ص ۳۶۶، باب المغنم)

''اس لئے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور امام ابوالقاسم القشیری رحمہ اللہ نے اس افتراء کی سختی سے تردید کی ہے۔''

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) (۲) شیخ الطائفہ شہاب الدین ابوحفص عمر بن محمد السہر وردی رحمہ اللہ (المتوفی ۶۳۲ھ) لکھتے ہیں کہ: ''وقد ورد فی الخبر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم تعرض الاعمال یوم الاثنین والخمیس علی اللہ و تعرض علی الانبیاء والاباء والامھات یوم الجمعۃ فیفرحون بحسناتھم و تزداد وجوھھم بیاضا و اشراقا فاتقوا اللہ ولا تؤذوا موتاکم و فی خبر اخو ان اعمالکم تعرض علی عشائرکم و اقاربکم من الموتی فان کان حسنا استبشروا و ان کان غیر ذلک قالوا اللّٰھم لا تمتھم حتی تھدیھم کما ھدیتنا'' (عوارف المعارف علی ہامش الاحیاء ج ۴ ص ۱۵۳)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث وارد ہوتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوموار اور جمعرات کو اعمال اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اور جمعہ کے دن حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور باپ دادوں اور ماؤں پر پیش کئے جاتے ہیں وہ نیکیوں سے خوش ہوتے ہیں اور ان کے چہرے سفید اور چمکیلے ہو جاتے ہیں۔ سو تم اللہ سے ڈرو اور اپنے مُردوں کو اذیت مت دو۔

اور دوسری حدیث میں آتا ہے کہ تمہارے اعمال تمہارے مُردہ رشتہ داروں اور اقارب پر پیش کئے جاتے ہیں اگر وہ اعمال اچھے ہوتے ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں اور اگر اعمال بُرے ہوتے ہیں تو دُعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ان کو اس وقت تک موت نہ دے جب تک تو ان کو ہماری طرح ہدایت نہ دے دے۔

یہ روایت قدرے اختلاف الفاظ کے ساتھ (الجامع الصغیر ج ۱ ص ۱۳۱، والسراج المنیر ج ۲ ص ۱۶۵، وزرقانی شرح المواہب ج ۵ ص ۳۳۷) میں حکیم ترمذی کے حوالہ سے اور (شرح الصدور ص ۱۱۰، مائۃ مسائل ص ۳۸) میں بحوالہ (مسند احمد ج ۳ ص ۱۶۵، مجمع الزوائد ج ۲ ص ۳۲۸) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اور (ابوداؤد والطیالسی ص ۲۴۸) میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے۔ الغرض عرض اعمال علی الاقارب کی حدیثیں بھی موجود ہیں اور علماء اُمت نے ان سے استدلال و احتجاج کیا ہے جیسا کہ ان کی عبارات سے یہ واضح وظاہر ہے۔

حدیث عرض اعمال پر گرفت: اکابر سے کٹ اور ہٹ کر اپنی نئی تحقیق اور رائے کو حرف آخر سمجھنے والے بعض دوستوں نے جو کچھ کہا اس کا اجمالی خاکہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ مؤلف (ندائے حق ص ۲۴۳) میں لکھتے ہیں کہ شیعہ کہتے ہیں ہمارے اعمال ائمہ اطہار کے پیش ہوتے ہیں۔ سُنّی گو بدعتیوں نے کہا ہمارے اعمال حضور کے حضور پیش ہوتے ہیں۔

الجواب: قارئین کرام نے عرض اعمال کے بارے اکابر علماء ملت کے کچھ حوالے پہلے پڑھ لئے ہیں اور مؤلف ''ندائے حق'' کے اس حوالہ کے پیش نظر وہ تمام اکابر سُنّی گو بدعتی ہیں۔ ہاں اگر اصلی سُنّی ہیں تو وہ مؤلف مذکور یا ان کے بعض ہمنوا ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ'' اور مؤلف مذکور نے (ندائے حق ص ۱۳۹) میں عرض اعمال کا عنوان قائم کر کے جو باتیں کہیں وہ یہ ہیں: (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور علامہ ابن داؤد بن سلیمان البغدادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''والحاصل ان حیاۃ الانبیاء ثابتۃ بالاجماع'' حاصل یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات بالاجماع ثابت ہے۔ (المنحۃ الوھبیۃ ص۶)

امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قبرہ ھو سائر الانبیاء و معلومۃ عندنا علماً قطعیاً لما قام عندنا من الادلۃ فی ذلک و تواترت بہ الاخبار الدالۃ علی ذلک''

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی قبر مبارک میں اسی طرح دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات ہمارے نزدیک قطعی طور پر ثابت ہے۔ کیونکہ اس پر ہمارے نزدیک دلائل قائم ہیں اور تواتر کے ساتھ اخبار موجود ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔'' (انباہ الاذکیاء ص ۲، طبع حیدرآباد دکن، وفتاوی امام سیوطی رحمہ اللہ ج ۲ ص ۱۴۷، طبع مصر)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) (۱) روایت کی تصحیح اور تحسین کی بابت سیوطی رحمہ اللہ کا تساہل مشہور ہے اور زرقانی رحمہ اللہ کا حال بھی کسی عالم سے مخفی نہیں اور سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ اور مولانا عثمانی رحمہ اللہ نے انہیں کو دیکھ کر سند جید کہہ دیا ہے۔ (۲) حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عرض اعمال شیعہ کا مذہب ہے۔ چنانچہ سند کے ساتھ امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر صبح و شام تمام نیک و بد بندوں کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ سو تم بداعمال سے بچو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''اعملوا فسیری اللہ عملکم و رسولہ والمؤمنون قال واللہ ھو علی ابن ابی طالب'' عرض اعمال شیعہ کا مذہب ہے کسی حدیث میں نہیں۔ (۳) ابوداؤد کنس المساجد میں عرضت عَلَیَّ اعمال امتی منقطع ہے قابل اعتبار نہیں اور پھر اس کا معنی یہ ہے کہ احوال عملوں کا دکھایا گیا نہ یہ معنی کہ فلاں شخص نے یوں کیا۔ (۴) خود صاحب تسکین الصدور نے اپنی کتاب (تبرید النواظر ص ۱۱۹) میں لکھا ہے کہ: ''فسیری اللہ عملکم'' سے شیعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر ائمہ پر اعمال پیش کرنے پر استدلال کیا ہے۔ (اُصول کافی جزو سوم ص ۱۳۹، مع الصافی) اور لکھا ہے در حقیقت عرض جملہ اعمال شیعہ شنیعہ کا مسلک ہے۔ (۵) رجالہ رجال الصحیح کا لفظ نہ تو صحت حدیث پر دال ہے اور نہ سند کے منقطع ہونے کے منافی ہے۔ (محصلہ)

الجواب: مؤلف مذکور نے یہ جو کچھ کہا ہے بالکل بے سود ہے۔ علی الترتیب جوابات ملاحظہ فرمائیں۔ (۱) بلا شبہ امام سیوطی رحمہ اللہ متساہل تھے لیکن علامہ نور الدین الہیثمی رحمہ اللہ اور علامہ زرقانی رحمہ اللہ کا تساہل ثابت نہیں اور بلا حوالہ اور بدون دلیل کے ان حضرات کا تساہل غیر مسلم ہے۔ اسی طرح مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ اور مولانا عثمانی رحمہ اللہ دور حاضر کے محقق علماء میں تھے، نرے لکیر کے فقیر نہ تھے۔ خود مؤلف مذکور (ندائے حق ص ۳۷) میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کو رئیس المحدثین اور ابن حجر ثانی کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ مگر صد افسوس ہے کہ یہی رئیس المحدثین اور ابن حجر ثانی کوئی ایسا بیان کرتے ہیں جو مؤلف مذکور کے نظریہ کے خلاف ہوتا ہے۔ (جیسے یہاں) تو وہ صرف سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ رہ جاتے ہیں اس لئے ان پر کی گئی بے اعتمادی کا بھی اہل حق کے ہاں قطعاً کوئی اعتبار نہیں ہے۔

(۲) شیعہ کے ساتھ بعض مسائل میں اشتراک وتوارد اس کا مقتضی تو نہیں کہ ان مسائل ہی کا سرے سے انکار کر دیا جائے۔ اگر شیعہ نماز و روزہ اور حج وغیرہ احکام کے قائل ہیں تو کیا ہم اہل السنت والجماعت ان احکام کا انکار کر دیں؟ (معاذ اللہ تعالیٰ) علاوہ ازیں اہل حق اجمالی عرض کے قائل ہیں۔ جیسا کہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ وغیرہ حضرات کے حوالہ عرض کر دیئے گئے ہیں اور شیعہ عرض تفصیلی کے قائل ہیں۔ چنانچہ خود مؤلف نے (ندائے حق ص ۱۳۹) میں حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ کی املائی تفسیر (بلغۃ الحیران ص ۲۳۲) کا یہ حوالہ نقل کیا ہے۔ ''اے برادر یہ عقیدہ کہ کوئی سب کچھ جانتا ہے اور صبح و شام کسی پر اعمال کل عباد کے پیش ہوتے ہیں یہ عقائد شیعہ کے ہیں۔'' الغرض دونوں کے نظریات میں بڑا فرق ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

چونکہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں رہا اور اس پر حدیث سے بھی صحیح ثبوت موجود ہے اور اُمت کے تمام طبقات میں اس کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لئے امام سیوطی رحمہ اللہ نے تواتر کا دعویٰ کیا ہے اور ایک اور مقام میں تواتر کا دعویٰ کر کے یوں لکھتے ہیں کہ: ''ان من جملۃ ما تواتر عن النبی ﷺ حیاۃ الانبیاء فی قبورھم'' یعنی جو چیزیں آنحضرت ﷺ سے تواتر کے ساتھ مروی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔ (النظم المتناثر من الحدیث المتواتر کذا فی شرح البوستوی رحمہ اللہ ص ۴، طبع مصر)

علامہ داؤد بن سلیمان البغدادی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کے متواتر کہنے میں امام سیوطی رحمہ اللہ کی تائید کی ہے۔ (المنحۃ الوھبیۃ ص ۱۱، طبع استنبول)

اہل علم جانتے ہیں کہ تواتر کے کئی اقسام ہیں۔ تواتر لفظی، تواتر معنوی۔ تواتر طبقہ اور تواتر توارث وغیرہ گو اس حدیث کے الفاظ اور اسناد متواتر نہیں لیکن تواتر طبقہ اور تواتر توارث کا شرف اس کو حاصل ہے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) (۳) ابوداؤد کی روایت کا اس موقع پر پیش کرنا بے محل ہے اور یہ حضرت مرحوم کا وہم ہے کیونکہ وہ عرض جیسا کچھ بھی تھا آنحضرت ﷺ پر زندگی میں ہوا تھا اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو عرض ہے وہ بعد از وفات قبر مبارک میں ہے جب دونوں حدیثوں کا محل جدا جدا ہے تو ایک کو دوسری کی تفسیر میں یا اس کے معارضہ میں پیش کرنا بے سُود ہے وہ صحیح ہو یا منقطع ہو اُس کی وجہ سے اس صحیح حدیث پر ہرگز کوئی زد نہیں پڑتی۔

(۴) تجرید النواظر میں شیعہ شنیعہ کا جو مسلک نقل کیا گیا ہے اس میں یہ الفاظ موجود ہیں عرض جملہ اعمال (حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ اپنی مختصر بے نظیر (التبیان فی ربط القرآن ص ۴۷، طبع تعمیر پرنٹنگ پریس راولپنڈی) میں لکھتے ہیں: ''ہر روز سب عمل بندوں کے رسول اللہ ﷺ پر پہنچتے ہیں یہ شیعہ مذاہب والے کہتے ہیں۔'' آگے اُصول کافی (ص ۱۳۳) کا حوالہ دیا ہے) خدا کرے کہ مؤلف مذکور کو جملہ کا معنیٰ سمجھ آجائے کیونکہ بات سب سمجھ ہی کی ہے الحاصل اہل حق جس طرح کے عرضِ اعمال کے قائل ہیں وہ روایۃً ودرایۃً بالکل صحیح ہے اور اس پر کوئی قابلِ التفات عقلی یا نقلی اعتراض وارد نہیں ہوا۔ ہاں! اگر کوئی صرف میں نہ مانوں کی رٹ لگا تا رہے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

مؤلف اقامۃ البرہان: مؤلف مذکور نے (ص ۲۴۲ تا ۲۴۵) میں ازالۃ الریب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کثرت تفحص کے بعد بھی حضرت امام سیوطی رحمہ اللہ کے زمانہ تک کسی اور محدث سے اس حدیث کی تصحیح یا تحسین نہیں مل سکی اور امام سیوطی رحمہ اللہ تصحیح حدیث میں بہت متساہل ہیں وہ تو جعلی من گھڑت اور موضوع حدیثوں کا سہارا بھی اپنے استدلال میں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ دیکھئے (مسالک الحنفاء وغیرہ) جب تک اس روایت کی پوری سند اور اس کے روات کی توثیق اور سند کا اتصال ثابت نہ کیا جائے اور کسی معتبر محدّث سے اس کی تصحیح اور تحسین ثابت نہ ہو تو اس پر علم غیب وغیرہ قطعی عقیدہ میں کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ بقول امام سیوطی رحمہ اللہ یہی کہا جائے گا کہ: ''یا تو اس کی مناسب تاویل کی جائے گی یا خود یہ حدیث باطل ٹھہرے گی (کما یاتی) خصوصاً جب کہ یہ روایت مسند بزار کی ہے جو نہ تو کتب حدیث کے طبقہ اولیٰ میں ہے اور نہ ثانیہ میں۔'' اس کے بعد انہوں نے ''تسکین الصدور'' کی عرضِ اعمال کی حدیث کے صحیح ہونے کا حوالہ پیش کر کے جواب لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ معتبر محدّث نہیں کسی معتبر محدّث سے اس کی تصحیح و تحسین ثابت نہیں راویوں کی توثیق اور سند کا اتصال ثابت نہیں۔ اب کیا امام سیوطی رحمہ اللہ معتبر ہو گئے ہیں؟ یا مسند بزار طبقہ اولیٰ اور ثانیہ میں شامل ہو گئی ہے یا طبقہ ثالثہ ورابعہ کی حدیثیں قابل احتجاج ہو گئی ہیں۔ علامہ نورالدین ہیثمی رحمہ اللہ اگرچہ امام سیوطی رحمہ اللہ پر اقدم ہیں لیکن وہ بھی امام سیوطی رحمہ اللہ کی طرح ناقل وجامع ہیں اور ان کے رجالہ رجال الصحیح کہنے سے حدیث کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔ (محصلہ) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۹۷۳ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ: ''قد صحت الاحادیث انه صلی الله علیه وسلم حی فی قبره یصلی باذان و اقامة'' بلا شبہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ ہیں اور اذان و اقامت سے نماز پڑھتے ہیں۔ (منح المنة ص ۹۲، طبع مصر)

پہلے صحیح روایت عرض کی جا چکی ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں اور منفرد کی کامل نماز تو وہی ہوتی ہے جو اذان و اقامت سے ہو۔ لہٰذا اذان و اقامت خود نماز میں شامل ہیں اور کتب فقہ میں منفرد کے لئے بھی اذان و اقامت کا ثبوت موجود ہے۔ (بلا جماعت اس منفرد کی نماز ''نور الانوار'' ص ۳۶ وغیرہ کے حوالہ کے مطابق اداء قاصر کی مد میں شامل ہوتی ہے۔ جہاں جماعت مسنونہ مل سکتی ہو اور تغافل وکوتاہی کر کے آدمی اس کو حاصل نہ کر سکے اور پھر تکلیفی زندگی ہو، قبر کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ لہٰذا (ندائے حق ص ۹۱) پر اس پر بحث لا حاصل ہے)

حضرت مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: ''ان النبی صلی الله علیه وسلم حیٌ کما تقرر و انه یصلی فی قبره باذان واقامة'' (فتح الملہم ج ۳ ص ۴۱۹)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں جیسا کہ اپنی جگہ یہ ثابت ہے اور آپ اپنی قبر میں اذان و اقامت سے نماز پڑھتے ہیں۔''

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''ان کثیراً من الاعمال قد ثبتت فی القبور کالاذان والاقامة عند الدارمی و قرأة القرآن عند الترمذی'' (فیض الباری ج ۱ ص ۱۸۳)

''قبروں میں بہت سے اعمال کا ثبوت ملتا ہے جیسے اذان و اقامت کا ثبوت دارمی کی روایت میں اور قرأۃ قرآن کا ترمذی کی روایت ہیں۔''

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) الجواب: جس وقت ہم نے ''ازالۃ الریب'' لکھی تھی اس وقت ہمارے سامنے صرف امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی خصائص الکبریٰ کا حوالہ ہی تھا اور ہم صرف امام السیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی تصحیح پر ان کے تساہل ہونے کی وجہ سے مطمئن نہ تھے لیکن سرسری طور پر اس کے دیگر مظان سے دیکھا تو کسی اور کی تصحیح و تحسین نہ مل سکی لیکن جب بعد کو ''مجمع الزوائد'' زرقانی رحمۃ اللہ علیہ، رئیس المحدثین ابن حجر ثانی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے حوالے مل گئے تو ہم مطمئن ہو گئے اور ہم نے اسی اطمینان سے یہ بحث ''تسکین الصدور'' میں باحوالہ درج کر دی اور اس سلسلہ میں اصل، اعتماد امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ دوسروں پر ہے۔ جب اس روایت کے راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں تو ان کے ثقہ ہونے میں کیا شبہ ہے؟ اور جب ذمہ داری سے علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اس کو صحیح اور جید کہتے ہیں تو اصول حدیث کے رُو سے صحت کے لئے اتصال سند بھی ضروری امر ہے۔ لہٰذا اتصال سند بھی ثابت ہے۔ علامہ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ اسی کتاب میں اپنے مقام پر آ رہا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ! اور علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نرے ناقل اور جامع ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو صحیح اور ضعیف حدیثوں کے پرکھنے کا قوی ملکہ عطاء فرمایا ہے اور بعد میں آنے والے جملہ محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم اس سلسلہ میں ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ جب یہ ذمہ دار حضرات اس کی تصحیح کرتے ہیں تو یہ روایت مسند بزار میں رہ کر بھی صحیح ہو سکتی ہے نہ طبقہ بدلنے کی حاجت ہے اور نہ اس صحیح روایت پر بے اعتمادی کی کوئی وجہ ہے۔

علامہ بدر الدین محمود بن احمد العینی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۵۵ھ) اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ کی تفسیر کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ: ''اراد بالموتتین الموت فی الدنیا والموت فی القبر وھما موتتان المعروفتان المشھورتان فلذلک ذکرھما بالتعریف وھما موتتان لکل احد غیر الانبیاء علیہم السلام فانھم لایموتون فی قبورھم بل ھم احیاء واما سائر الخلف فھم یموتون فی القبور لم یحیون یوم القیمة''

''دو موتوں سے ایک وہ موت مراد ہے جو دُنیا میں آتی ہے اور دوسری وہ ہے جو قبر میں آتی ہے یہی دو معروف و مشہور موتیں ہیں۔ اس لئے ان کو (الف ولام حرف تعریف سے ذکر کیا ہے۔ ہاں! حضرات انبیاء علیہم السلام اس سے مستثنیٰ ہیں وہ اپنی قبروں میں نہیں مرتے بلکہ وہ زندہ ہی رہتے ہیں۔ بخلاف دیگر مخلوق کے کہ (حساب وکتاب کے بعد) وہ قبروں میں وفات پا جاتے ہیں اور پھر قیامت کے دن وہ زندہ ہوں گے۔'' (عمدۃ القاری ج ۷ ص ۲۰۰)

یہ تحقیق اس مسلک پر مبنی ہے کہ قبر میں نکیرین کے سوال کے وقت مُردوں کو زندہ کیا جاتا ہے پھر ان کو وفات دی جاتی ہے۔ مگر جمہور اس کے خلاف ہیں (پہلے اس کی بحث گزر چکی ہے) لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام پر قبور میں وفات نہیں آتی بلکہ وہ مستمر طور پر زندہ رہتے ہیں اور اس بات میں وہ حضرات بھی متفق ہیں جو عام مُردوں کے لئے قبر میں سوال کے بعد موت تسلیم کرتے ہیں۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے یہ منقول ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضر ہونے والے کے لئے لفظ زیارت کو پسند نہ فرماتے تھے۔ علامہ ابن رشد رحمہ اللہ (المتوفی ۵۹۵ھ) نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ لفظ زیارت عموماً مُردوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو قبر مبارک میں زندہ ہیں۔ پھر لفظ زیارت کیوں استعمال کیا جائے۔

چنانچہ حضرت مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۸۵ھ) نقل کرتے ہیں کہ: ''نقل عن الامام مالک رحمہ اللہ انه کان یکرہ ان یقول رجل زرت قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ابن رُشد رحمہ اللہ من اتباعه ان الکراھة لغلبة الزیارۃ فی الموتی وھو صلی اللہ علیہ وسلم احیاہ اللہ تعالٰی بعد موته حیاۃ تامة واستمرت تلک الحیوۃ وھی مستمرۃ فی المستقبل ولیس ھذا خاصة به صلی اللہ علیہ وسلم بل یشارکه الانبیاء علیہم السلام فھو حیّ بالحیوۃ الکاملة مع الاستغناء عن الغذاء الحسی الدنیوی'' (نور الایمان بزیارۃ آثار حبیب الرحمن ص ۱۴، ونحوہ فی وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۱۳، طبع مصر)

''امام مالک رحمہ اللہ سے یہ منقول ہے کہ وہ اس کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت کی علامہ ابن رشد مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کراہت کی وجہ یہ ہے کہ زیارت کا لفظ بالعموم مُردوں کے لئے بولا جاتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وفات کے بعد مکمل حیات بخشی ہے اور یہ مستقبل میں دائمی ہے اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے مختص نہیں بلکہ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام بھی اس میں آپ کے ساتھ شریک ہیں۔ پس آپ کو حیات کاملہ حاصل ہے لیکن دنیوی اور حسی خوراک کی حاجت نہیں پڑتی۔''

اس عبارت میں بھی یہ اَمر واضح کر دیا گیا ہے کہ گو یہ حیات کامل ہے مگر تمام لوازمات دنیوی اس پر مرتب نہیں ہوتے کہ اس میں دُنیوی اور حسی خوراک کی حاجت بھی باقی رہے۔

اس مقام میں مؤلف نے (ندائے حق ص ۳۰۵ تا ۳۰۷) میں ایک غیر ضروری اور بے فائدہ بحث چھیڑ دی ہے جس کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ:

(۱) ابن رُشد رحمہ اللہ کا قول لغت میں معتبر نہیں۔

الجواب: ہم نے کب ابن رُشد رحمہ اللہ کا قول لغوی اعتبار سے پیش کیا ہے ان کا حوالہ صرف اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ فقہی طور پر انہوں نے امام مالک رحمہ اللہ کے قول کی ایک توجیہ پیش کی ہے اور علامہ ابن رُشد رحمہ اللہ کا مقام فقہاء مالکیہ میں بہت بلند ہے۔

(۲) زیارت کا لفظ زندوں پر ہوتا ہے اور اس کے ثبوت میں کئی حوالے پیش کئے ہیں۔

الجواب: بجا ہے اس کا کون انکار کرتا ہے؟ لیکن یہ لفظ اسی میں منحصر نہیں ہے اور مقامات پر بھی بولا جاتا ہے۔

(۳) اہل عرف جب زیارتِ میت کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد (بحذف مضاف) قبر ہوتی ہے۔

الجواب: بجا ہے قرآن کریم، احادیث اور فقہاء کرام رحمہم اللہ کی عبارات میں زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ اور زیارۃ القبور وغیرہ کے الفاظ موجود ہیں۔ اگر ایسا ہی مضاف آپ ابن رُشد رحمہ اللہ کے کلام میں مراد لے لیں تو کیا نقصان لازم آتا ہے؟ علاوہ ازیں ہمارے فقہاء احناف رحمہم اللہ نے لفظ زیارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بولا ہے۔

چنانچہ علامہ شُرنبلالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”ینبغی لمن قصد زیارۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یکثر من الصلوٰۃ علیہ“ ”جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا قصد کرے تو اس کے لئے مناسب ہے کہ وہ بکثرت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھے۔“ (نور الایضاح ص ۱۸۸)

اور علامہ عبد العلی بحر العلوم رحمہ اللہ روضۂ اقدس پر حاضر ہونے سے پہلے کی ایک دُعا بتاتے ہیں جس میں یہ الفاظ بھی ہیں: ”وارزقنی من زیارۃ رسولک صلی اللہ علیہ وسلم“ (رسائل الارکان ص ۲۸۰)

الغرض! زندہ کی زیارت، قوم کی زیارت، قبر کی زیارت اور زیارۃ النبی اور زیارۃ الرسول کے تمام الفاظ اپنے اپنے معنی اور اپنے موقع اور محل کے لحاظ سے درست ہیں نہ تو اس میں راقم کی لغوی غلطی ہے اور نہ علامہ ابن رُشد رحمہ اللہ کی۔

علامہ ابو الوفاء علی بن محمد ابن عقیل الحنبلی رحمہ اللہ (المتوفی ۵۱۳ھ) کا ارشاد ہے کہ: ”قال ابن عقیل رحمہ اللہ من الحنابلۃ وھو صلی اللہ علیہ وسلم حیٌ فی قبرہ یصلی“ (الروضۃ البہیۃ ص ۱۴)

”علامہ ابن عقیل الحنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔“

امام بدر الدین البعلی الحنبلی رحمہ اللہ جنہوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے فتاویٰ کا اختصار کیا ہے، لکھتے ہیں کہ: ”والانبیاء احیاء فی قبورھم وقد یصلون“ (مختصر فتاویٰ مصریہ ص ۱۷۰)

”حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور بسا اوقات نماز بھی پڑھتے ہیں۔“

یعنی چونکہ تکلیفی زندگی تو رہی نہیں اور وہ حضرات نماز حلاً ذ کے طور پر پڑھتے ہیں۔ اس لئے پابندی لازم نہیں اور قد یصلون کہہ کر اسی حقیقت کو آشکارا کر دیا ہے۔ کیونکہ حرف قد مضارع پر داخل ہو کر اکثر تقلیل کا فائدہ دیتا ہے اور حرف قد مضارع پر کبھی تحقیق کے لئے بھی آتا ہے۔ (رضی ج ۲ ص ۳۸۸، ومتن متین ص ۲۸۱)

فقیہ وقت علامہ حسن بن عمار بن علی شرنبلالی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۰۶۹ھ) لکھتے ہیں کہ: ''ولما ھو مقرر عند المحققین انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یرزق متمتع بجمیع الملاذ والعبادات غیر انہ احجب عن ابصار القاصرین عن شریف المقامات'' محققین کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔ آپ کو رزق دیا جاتا ہے اور آپ تمام لذتوں اور عبادتوں سے متمتع ہیں مگر ان نگاہوں سے اوجھل ہیں جو ان ارفع مقامات تک رسائی سے قاصر ہیں۔ (نورالایضاح ص ۱۷۷)

اس عبارت میں محققین کا مسلک یہ بتایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور رزق اور عبادات سے متمتع ہیں لیکن یہ رزق دنیوی اور حسی نہیں بلکہ عالم غیب اور دوسرے جہاں کا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

علامہ ابن عابدین الشامی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ ایک خاص مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ: ''ان الانبیاء واحیاء فی قبورھم کما ورد فی الحدیث'' (رسائل ابن عابدین ج ۲ ص ۲۰۳، طبع مصر)

''حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔''

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عبارت میں حیات حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو حدیث پر بنیاد رکھتے ہوئے تسلیم کیا ہے جس سے حدیث کی صحت بھی ان کے نزدیک مسلّم ہے۔

الامام الاستاذ ابو منصور طاہر الشافعی البغدادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۴۲۹ھ) فرماتے ہیں کہ: ''قال المتکلمون المحققون من اصحابنا ان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم حیّ بعد وفاتہ یسر بطاعات امتہ''

''ہمارے اصحاب کے محقق متکلمین یہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے بعد زندہ ہیں اور آپ اپنی اُمت کی طاعات سے خوش ہوتے ہیں۔'' (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۰۶، واعلاء السنن ج ۱۰ ص ۳۳۰)

اصحابنا سے متکلمین کی جماعت مراد ہو یا شوافع کی بہرصورت ان میں محققین کا مسلک اور تحقیق یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں۔

امام شمس الدین محمد بن عبدالرحمن السخاوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۹۰۲ھ لکھتے ہیں کہ: ''نحن نؤمن و نصدق بانہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یرزق فی قبرہ وان جسدہ الشریف لا تأکلہ الارض والاجماع علی ھذا''

''ہم اس بات پر ایمان لاتے اور اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ ہیں اور آپ کو رزق ملتا ہے اور آپ کے جسدِ اطہر کو زمین نہیں کھا سکتی اور اسی پر اجماع منعقد ہے۔'' (القول البدیع ص ۱۲۵)

اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبر مبارک میں زندہ ہونا اور آپ کو رزق ملنا اور جسد اطہر کا محفوظ رہنا اجماع اُمت سے ثابت ہے۔ اگر بالفرض حدیث سے اس کا کوئی ثبوت نہ بھی ہوتا تب بھی اُمت مسلمہ کا اجماع شرعی دلائل میں سے ایک وزنی دلیل ہے۔

علامہ محمد عابد السندی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی (۱۲۵۷ھ) لکھتے ہیں کہ: ''اماھم فحیاتھم لا شک فیھا ولا خلاف لاحد من العلماء فی ذٰلک الی ان قال فھو صلی اللہ علیہ وسلم حی علی الدوام'' (رسالہ مدینہ ص ۲۱)

''بہر حال حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات میں کوئی شک نہیں اور علماء میں سے کسی کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (پھر آگے فرمایا) پس آنحضرت ﷺ دوامی طور پر زندہ ہیں۔''

یعنی وفات کے بعد قبر میں جو حیات آپ ﷺ کو حاصل ہے وہ مستمر اور دوامی ہے وہ سلب نہیں ہوئی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ آنحضرت ﷺ کی حیات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''حیات متفق علیہ است ہیچ کس را دروے خلافے نیست۔'' (اشعاء اللمعات ج۱ ص ۶۱۳)

''حیات متفق علیہ ہے کسی کا اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔''

شیخ محدث دہلوی رحمہ اللہ باوجود وسیع النظر ہونے کے کس وضاحت سے یہ بیان کرتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کسی ایک فرد کا اختلاف بھی اس میں ہوتا تو ضرور اس کا اظہار فرماتے۔

نواب قطب الدین خان صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۷۹ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ: ''زندہ ہیں انبیاء علیہم السلام قبروں میں یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کسی کو اس میں خلاف نہیں کہ حیات ان کو وہاں حقیقی جسمانی دُنیا کی سی ہے۔

(مظاہر حق ج۱ ص ۴۴۵)

نواب صاحب رحمہ اللہ دُنیا کی سی کا جملہ بول کر یہ حقیقت بتلانا چاہتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی یہ حیات مِنْ کُلِّ الْوُجُوْہ دنیوی نہیں ہے کہ حسّی کھانے پینے کی حاجت ہو بلکہ بعض وجوہ سے دُنیوی ہے۔ مثلاً ادراک علم اور شعور وغیرہ۔

مشہور محقق، محدث اور نکتہ رس عالم علامہ شہاب الدین فضل اللہ بن حسین تور بشتی الحنفی[1] (المتوفی فی حدود ۶۶۰ھ) آنحضرت ﷺ کے خصوصیات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ: ''وازاں جملہ آں ست کہ بدانند کہ کالبد وے راز مین نخورد و بوسیدہ نشود و چوں زمین از وے شگافتہ شود کالبد وے بحال خود باشد و حشر وے و جملہ انبیاء چنیں باشد و حدیث درست الست کہ: ''اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَآءِ الٰی ان قال ھم احیاء فی قبورھم یصلّون'' واوّل ہمہ پیغمبر ما برخیز داز گورا (کتاب المعتمد فی المعتقد باب ۲ فصل ۴، للتور بشتی رحمہ اللہ)

''ان خصوصیات میں سے ایک یہ بھی جاننی چاہئے کہ آپ کے جسم مبارک کو زمین نہیں کھاتی اور نہ وہ ریزہ ریزہ ہوگا اور (قیامت کو) جب زمین شق ہوگی تو آپ کا جسم مبارک اپنی حالت میں محفوظ ہوگا اور اسی وجود مبارک کے ساتھ آپ اور دیگر جملہ انبیاء علیہم السلام کا حشر ہوگا اور صحیح حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے اجسام حرام کردیئے ہیں۔ (پھر آگے فرمایا کہ) انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور سب سے پہلے قبر مبارک سے ہمارے پیغمبر ﷺ اُٹھیں گے۔''

موصوف رحمہ اللہ نے یہ لکھ کر آخر میں فرمایا ہے کہ دانستن ایں ہمہ کہ یاد کردیم فہم است یعنی یہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس کا جاننا نہایت ضروری اور اہم ہے۔ غور فرمایئے کہ کس خیر خواہی، دلسوزی اور ہمدردی سے ضروری اور فہم اُمور کو ذہن نشین کرنے کی سعی کی جارہی ہے اور مستند، صحیح اور معروف حدیثوں کا حوالہ دے کر اُن اُمور کو مبرہن اور مدلل کیا جارہا ہے، تاکہ کسی منکر کے لئے انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔

---

[1] ملاں کاتب چلپی رحمہ اللہ نے ان کو الحنفی لکھا ہے، ملاحظہ ہوں کشف الظنون ج ۲، ص ۴۴۲، وھو الحق اور علامہ سبکی رحمہ اللہ نے ان کا تذکرہ طبقات شافعیہ ج ۵، ص ۱۴۶ میں کیا ہے۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ الحنفی (المتوفی ۱۲۹۷ھ) نقل کرتے ہیں کہ: ''والاحسن ان یقال ان حیاته ﷺ لا یتعقبها موت بل یستمر حیا والانبیاء احیاء فی قبورھم'' (حاشیہ بخاری ج ۱ ص ۵۱۷)

''بہتر بات یہ ہے کہ کہا جائے کہ آنحضرت ﷺ کی حیات ایسی ہے کہ اس کے بعد موت وارد نہیں ہوتی بلکہ دوامی حیات آپ کو حاصل ہے اور باقی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام بھی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

قبر میں حیات کے منکروں نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے اس قول: ''والذی نفسی بیدہ لا یذیقک اللہ الموتتین ابدًا''

''کہ بخدا آپ کو اللہ تعالیٰ کبھی دو مرتبہ موت نہیں چکھائے گا'' سے استدلال کیا تھا اور اہل سنت کی طرف سے اس کا ایک جواب یہ ہے جو مولانا سہارنپوری رحمہ اللہ نے فتح الباری کے حوالہ سے نقل کر کے اس کی تائید کی ہے۔

مولانا ابوالعتیق عبدالہادی محمد صدیق نجیب آبادی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ھ) لکھتے ہیں کہ: ''انھم اتفقوا علٰی حیوته ﷺ بل حیوة الانبیاء علیہم السلام متفق علیھا لا خلاف لاحد فیه'' (انوار المحمود شرح ابی داؤد ج ۱ ص ۶۱۰)

''محدثین کرام رحمہم اللہ اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت ﷺ زندہ ہیں بلکہ تمام حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات متفق علیہا ہے، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔''

یہ عبارت بھی اپنے مدلول ومفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ اور اسی طرح باقی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات اتفاقی اُمر ہے اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

حضرت مولانا عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ودلت النصوص الصحیحة علٰی حیوة الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کما سیأتی ان شاء اللہ تعالٰی فی موضع یلیق به'' (فتح الملہم ج ۱ ص ۳۲۵)

''نصوص صحیحہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام زندہ ہیں جیسا کہ مناسب موقع پر اس کا ذکر ہوگا۔ اِن شاء اللہ!''

مولانا رحمہ اللہ نے متعدد مقامات پر حیات انبیاء علیہم السلام کو بیان فرمایا ہے ان کی بعض ضروری عبارتیں باحوالہ اپنے مقام پر آ رہی ہیں۔ اِن شاء اللہ!

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۴۶ھ) لکھتے ہیں کہ: ''ان النبی ﷺ حی فی قبرہ کما ان الانبیاء علیہم السلام احیاء فی قبورھم'' (بذل المجھود ج ۲ ص ۱۱۷)

''آنحضرت ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں جس طرح کہ دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔''

یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ اگر اس حیات سے محض روح کی حیات مُراد ہے اور قبر میں جسم اطہر کا اس سے کوئی تعلق نہیں تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں قبور کا لفظ معاذ اللہ بیکار جاتا ہے اور اسی طرح اکابر کی عبارات میں بھی لفظ قبر کا کوئی مطلب خیز معنی حاصل نہیں ہوتا۔ چونکہ ان کے اجساد مبارکہ قبروں میں بالکل محفوظ ہیں تو قبر میں حیات کا مطلب اور مفہوم اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ رُوح مبارک کا جسم اطہر سے تعلق ہے اور اس کی بدولت حیات حاصل ہے۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "وقد یتخایل ان رد الروح ینافی الحیوۃ وھو یقررھا فان الرَّدَّ انما یکون الی الحیی لا الی الجماد کما وقع فی حدیث لیلۃ التعریس یرید بقولہ الانبیاء مجموع الاشخاص لا الارواح" (تحیۃ الاسلام ص ۳۵،۳۶)

"کبھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ رُوح کا لوٹانا حیات کے منافی ہے۔ حالانکہ رَدِّ رُوح حیات کو ثابت کرتا ہے کیونکہ روح زندہ کی طرف لوٹائی جاتی ہے نہ کہ جماد کی طرف۔ جیسا کہ لیلۃ التعریس کی حدیث میں ہے۔ (جب سب حضرات سو گئے تھے اور سورج چڑھنے کے بعد بیدار ہوئے اور اس میں رَدِّ رُوح کا ذکر ہے۔ (بخاری ج۱ ص ۸۳) اور انبیاء احیاء سے حضرات انبیاء کے مجموع اشخاص مراد ہیں نہ کہ فقط ارواح (یعنی وہ اپنے اجسام کے ساتھ زندہ ہیں)

حضرت موصوف رحمہ اللہ نے اس عبارت میں تصریح کر دی ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی زندگی سے فقط روح کی زندگی مراد نہیں بلکہ بدن اور رُوح دونوں کی زندگی مراد ہے۔ (مجموع الاشخاص)

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ارقام فرماتے ہیں کہ: "بیہقی وغیرہ نے حدیث اَنس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں کذا فی المواھب اور یہ نماز تکلیفی نہیں بلکہ تلذذ کے لئے ہے اور اس حیات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ آپ کو ہر جگہ پکارنا جائز ہے۔" (نشر الطیب ص ۲۱۱، طبع جید برقی پریس دہلی)

اور ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ: "آپ بنص حدیث قبر میں زندہ ہیں۔" (التکشف ص ۴۴۶)

حضرت مجدّد اَلف ثانی رحمہ اللہ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"برزخ صغریٰ چوں از یک وجہ از مواطن دنیوی است گنجائش ترقی دارد و احوال ایں مواطن نظر باشخاص متفاوتہ تفاوت فاحش دارد الانبیاء یصلون فی قبورھم شنیدہ باشند۔" (مکتوبات دفتر دوم ص ۹۲، طبع لکھنؤ)

"چھوٹا برزخ (یعنی قبر) جب ایک وجہ سے دنیوی جگہوں میں سے ہے تو یہ ترقی کی گنجائش رکھتا ہے اور مختلف اشخاص کے اعتبار سے اس جگہ کے حالات خاصے متفاوت ہیں۔ آپ نے یہ تو سنا ہی ہوگا کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ حیات انبیاء علیہم السلام پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: "واذا ثبت انھم احیاء من حیث النقل فانہ یقوّیہ من حیث النظر کون الشھداء احیاء بنص القرأن والانبیاء افضل من الشھداء"

اور جب نقل کے لحاظ سے ان کا زندہ ہونا ثابت ہے تو دلیل عقلی اور قیاس بھی اس کی تائید کرتا ہے وہ یہ کہ شہداء نص قرآن کے رُو سے زندہ ہیں اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تو شہداء سے اعلیٰ اور افضل ہیں۔ (تو بطریق اولیٰ ان کو حیات حاصل ہوگی) (فتح الباری ج۶ ص ۳۷۹)

تمام اہل اسلام اس اَمر پر متفق ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی قبر اور برزخ میں حیات حضرات شہداء کی حیات سے اعلیٰ اور ارفع ہے اور جب شہداء کی زندگی نص قرآنی سے ثابت ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث انس رضی اللہ عنہ کی رُو سے تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات ثابت ہی ہے عقلی اور نظری طور پر دلالۃ النص سے بھی ان کی حیات ثابت ہے اس لئے کہ وہ شہداء سے افضل ہیں تو لامحالہ ان کی حیات بھی شہداء سے افضل اور برتر ہوگی۔ لہٰذا نقل وعقل سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات ثابت ہے۔

آنحضرت ﷺ شہید تھے

حافظ ابن حجر وغیرہ نے تو قیاس کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام قبر و برزخ میں زندہ ہیں لیکن قطع نظر اس قیاس کے آنحضرت ﷺ شہید بھی ہیں۔ لہٰذا جو حیات شہداء کی منصوص ہے وہ نصِ قرآنی سے بھی آپ کے لئے ثابت اور محقق ہے۔

قصہ یوں ہے کہ ۷ ہجری میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معیت میں خیبر فتح کرلیا تو یہود خیبر اس پر بہت ہی زیادہ برافروختہ ہوئے اور آنحضرت ﷺ کو شہید کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ چنانچہ مشہور یہودی سلام بن مشکم کی بیوی زینب بنت الحارث نے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا اور آنحضرت ﷺ کی بمعہ چند دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دعوت تیار کی اور بکری کے گوشت میں زہر ہلاہل ڈال کر آپ ﷺ کو شہید کرنا چاہا۔ چنانچہ آپ کے ساتھیوں نے بھی وہ کھانا ایک ایک دو دو لقمے کھایا اور آپ ﷺ نے بھی ایک لقمہ منہ مبارک میں ڈالا اور اس کا لعاب حلق مبارک سے نیچے پیٹ میں چلا گیا، گوشت کی بوٹی نے بول کر کہا حضرت مت کھایئے کیونکہ میں زہر آلود ہوں، آپ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فوراً منع کیا، مگر ایک صحابی حضرت بشر بن براء بن معرور رضی اللہ عنہ اس سے شہید ہو گئے اور آپ کو اس زہر سے کافی تکلیف ہوئی۔

چنانچہ آپ ﷺ نے وفات سے چند لمحات پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ: ''یا عائشۃ رضی اللہ عنہا ما ازال اجد الم الطعام الذی اکلت بخیبر فھذا اوان وجدت انقطاع ابھری من ذٰلک السم''

''اے عائشہ رضی اللہ عنہا میں برابر اس کھانے کی زہر کا اثر پا رہا ہوں جو خیبر میں مَیں نے کھایا تھا سو اس وقت میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ میری رگ جان کٹ رہی ہے۔'' (بخاری ج ۲ ص ۶۳۷، ومستدرک ج ۳ ص ۵۸)

آپ کی وفات کے وقت اس زہر کا خاصا اثر تھا اور عالم اَسباب میں آپ کی وفات کا سبب وہ زہر ہلاہل ہے، اس لئے آپ شہید بھی ہوئے۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''لان احلف تسعا ان رسول اللہ ﷺ قتل قتلا احب الیّ من احلف واحدۃ انہ لم یقتل و ذٰلک ان اللہ اتخذہٗ نبیا و اتخذہ شہیدا''

(مستدرک ج ۳ ص ۵۸، قال الحاکم رحمہ اللہ والذہبی رحمہ اللہ، صحیح علی شرطہما و مسند احمد ج ۱ ص ۳۸۱)

''یہ کہ میں نو دفعہ قسم اُٹھاؤں کہ آنحضرت ﷺ شہید ہوئے مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ایک دفعہ یہ قسم اُٹھاؤں کہ آپ قتل نہیں کئے گئے اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی بھی بنایا اور شہید بھی۔''

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو شہادت کا رُتبہ بھی عنایت فرمایا ہے۔

علامہ محمد بن عبدالباقی بن یوسف الزرقانی المالکی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۱۲۲ھ) اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''اخرجہ احمد و ابو یعلی والطبرانی والحاکم والبیھقی عن ابن مسعود''

''اس روایت کو امام احمد رحمہ اللہ، ابو یعلی رحمہ اللہ، طبرانی رحمہ اللہ، حاکم رحمہ اللہ اور بیہقی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔'' (زرقانی شرح مواہب ج ۵ ص ۳۳۲)

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے شہادت کا بلند مقام بھی مرحمت فرمایا ہے اور قرآن کریم میں شہداء کی جو زندگی اور حیات منصوص ہے وہ آنحضرت ﷺ کے لئے بھی ہے۔نصِ قرآنی اور صحیح حدیث کو ملانے کے بعد حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کی مذکور حدیث کے علاوہ یہ ایک الگ اور جدا دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ قبر مبارک میں زندہ ہیں اور یہ محض قیاسی فقہی اور نظری دلیل ہی نہیں۔جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے حوالہ سے پہلے عرض کیا گیا ہے بلکہ اس روایت کی رُو سے آپ کی شہادت بھی منصوص ہے اور نصِ قرآنی سے شہداء کی حیات بھی منصوص ہے۔

اکابر علماء دیوبند کی دینی خدمات

اس دور میں مذہب وقوم کی جو خدمت علماء دیوبند نے کی ہے وہ کسی دانشمند اور منصف مزاج آدمی سے مخفی نہیں ہے علمی اور تحقیقی، تقریری اور تحریری تدریسی اور سیاسی رنگ میں ان کی خدمات رہتی دُنیا تک نہ صرف یہ کہ یادگار ہی رہیں گی بلکہ اِن شاء اللہ مشعلِ راہ بھی بنیں گی اور ان کے درس وتدریس اور وعظ و پند سے تشنگانِ علم وہدایت ذوق وشوق کے پیالے بھر بھر کر سیراب ہوتے رہیں گے۔ایک وقت تھا کہ ان کی خداداد قابلیت اور بےلوث خدمت اور قبولیت عامہ نے برطانیہ کی حکومت کو خاصا ہراساں کر دیا تھا جس نے ان کو طرح طرح کی اذیتیں اور دُکھ پہنچائے اور اُن کو بدنام کرنے کا کوئی مذموم سے مذموم حربہ اور پہلو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا، اسی دورِ برطانیہ میں ایک خاص مصلحت کے پیش نظر مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی (المتوفی ۱۳۴۰ھ) نے اکابر علماء دیوبند کی خالص علمی اور دقیق عبارتوں میں قطع وبرید کر کے اسلامی ممالک کے علماء اور علی الخصوص علماء حرمین شریفین کے سامنے پیش کر کے ان سے کفر کا فتویٰ حاصل کیا۔لیکن جب علماء حرمین کو اصل حقیقت معلوم ہوئی اور خان صاحب کی مجرمانہ کارروائی کا پتہ چلا تو انہوں نے چھبیس (۲۶) سوالات مرتب کر کے حضرات علماء دیوبند کو بھیجے کہ آپ حضرات کا ان مسائل کے بارے میں کیا خیال ہے ان کو صاف لکھئے تاکہ حق وباطل واضح ہو جائے تو اس وقت فخر العلماء رأس المحققین حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ اللہ صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور نے ان کے جوابات لکھے اور ۱۸ رشوال ۱۳۲۵ھ میں ان کو مکمل کر کے اپنی جماعت کے تیئس بزرگوں (جن میں خصوصیت سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ صدر مدرس دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا میر احمد حسن صاحب امروہی رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمہ اللہ، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ، حضرت مولانا غلام رسول صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں) کی تصدیقات لکھوا کر علماء حرمین اور دیگر ممالک اسلامیہ کو بھیجیں وہ حضرات ان کے تسلی بخش جوابات دیکھ کر مطمئن ہو گئے اور خان صاحب کے الزامات پر محو حیرت ہو کر انگشت بدندان رہ گئے ان جوابات پر مشتمل رسالہ ''المہند علی المفند'' کے نام سے سالہا سال سے طبع ہو چکا ہے۔ہمارے سامنے ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء کا وہ نسخہ ہے جو مطبع قاسمی دیوبند میں طبع ہوا ہے۔گویا یہ رسالہ ان معتقدات پر مشتمل ہے جو علماء دیوبند کے اتفاقی اور اجماعی عقیدے کہلاتے ہیں۔اگرچہ ہم نے بعض اکابر علماء دیوبند کی عبارات پہلے بھی با حوالہ عرض کر دی ہیں اور آئندہ بھی اِن

شاء اللہ تعالیٰ اپنے مقام پر عرض ہوں گی اور اُن کے علاوہ بھی ان کی مسئلہ کے بارے میں بہت سی عبارات ہیں لیکن اس اجماعی اور مرکزی رسالہ کے بعد مزید کچھ کہنے اور لکھنے کی مطلقاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

''المھند'' کی اس عبارت کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔

''السوال الخامس: ماقولکم فی حیوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قبرہ الشریف ھل ذٰلک امر مخصوص بہ امر مثل سائر المؤمنین رحمۃ اللہ علیہم حیوۃ برزخیۃ''

''پانچواں سوال: کیا فرماتے ہو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر میں حیات کے متعلق کہ کوئی خاص حیات آپ کو حاصل ہے یا عام مسلمانوں کی طرح برزخی حیات ہے۔''

الجواب: عندنا و عند مشائخنا حیاۃ حضرت الرسالۃ صلی اللہ علیہ وسلم دنیویۃ من غیر تکلیف و ھی مختصۃ بہ صلی اللہ علیہ وسلم بجمیع الانبیاء صلوٰت اللہ علیھم و الشھداء لا برزخیۃ کما ھی لسائر المؤمنین بل لجمیع الناس کما نص علیہ العلّامۃ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ فی رسالۃ انباہ الاذکیاء بحیوۃ الانبیاء حیث قال قال الشیخ تقی الدین السبکی حیوۃ الانبیاء و الشھداء فی القبر کحیواتھم فی الدنیا و یشھد لہ صلٰوۃ موسیٰ علیہ السلام فی قبرہ فان الصلٰوۃ تستدعی جسدًا حیا الٰی اٰخر ما قال فثبت بھذا ان حیوتہ دنیویۃ برزخیۃ لکونھا فی عالم البرزخ ولشیخنا شمس الاسلام و الدین محمد قاسم العلوم علی المستفیدین قدس اللہ سرہ العزیز فی ھذا المبحث رسالۃ مستقلۃ دقیقۃ المأخذ بدیعۃ المسلک لم یُر مثلھا قد طبعت و شاعت فی الناس و اسمھا آب حیات ای ماء الحیات'' (المھند علی المفند ص ۱۳، ۱۴)

جواب: ہمارے اور ہمارے مشائخ کے نزدیک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور آپ کی حیات دُنیا کی سی ہے۔ بلا مکلف ہونے کے اور یہ حیات مخصوص ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام اور شہداء کے ساتھ برزخی نہیں ہے جو حاصل ہے تمام مسلمانوں بلکہ سب آدمیوں کو۔ چنانچہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''انباہ الاذکیا حیواۃ الانبیاء'' میں بتصریح لکھا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ علامہ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ: ''انبیاء علیہم السلام و شہداء کی قبر میں حیات ایسی ہے جیسا دنیا میں تھی اور موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبر میں نماز پڑھنا اس کی دلیل ہے۔ کیونکہ نماز زندہ جسم کو چاہتی ہے۔'' پس اس سے ثابت ہوا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات دنیوی ہے اور اس معنیٰ کو برزخی بھی کہ عالم برزخ میں حاصل ہے اور ہمارے شیخ مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کا اس مبحث میں ایک مستقل رسالہ بھی ہے نہایت دقیق اور انوکھے طرز کا بے مثل جو طبع ہو کر لوگوں میں شائع ہو چکا ہے، اُس کا نام آبِ حیات ہے۔

اس عبارت میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی قبر میں زندگی اور حیات کو دنیوی حیات سے تعبیر کیا ہے اور اس کو برزخی بھی کہا ہے کہ وہ عالم برزخ میں ہے اور اس حیات دُنیوی پر دلیل علامہ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت پیش کی ہے اور ان کی عبارت کا ابتدائی حصہ پیش کر کے آخر میں لکھا ہے کہ: ''الٰی آخر ما قال'' یعنی علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کا یہی ٹکڑا مدار دلیل نہیں بلکہ ان کی عبارت آخر تک اس دلیل میں ملحوظ رکھنی چاہئے اور آخر تک ان کی عبارت میں جو تشریح اور تفصیل ہے اُس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے اور ہم باحوالہ پہلے علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ کی معہود

عبارت نقل کر چکے ہیں جس میں اس کا بھی ذکر ہے کہ اگر چہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی قبر میں زندگی دنیوی ہے لیکن دنیوی زندگی کے تمام لوازمات اس کے لئے ضروری نہیں ہیں کہ وہ دنیوی کھانے پینے اور ایسے ہی دیگر حاجات کو مستلزم ہو بلکہ اُن اُمور میں وہ الگ اور جدا حکم رکھتی ہے۔ ہاں ادراک و شعور اور علم وغیرہ میں وہ دنیوی زندگی کی طرح ہے۔ بالفاظ دیگر ان کے ارواح طیبہ کا تعلق ان کے ابدان دنیویہ سے ہے اور دنیا کی زندگی کی طرح ادراک و شعور اور علم ان کو حاصل ہے لیکن اگر کوئی دوسرا شخص اس زندگی کو دیکھنا چاہئے تو اس کے لئے وہ بالکل محسوس نہیں ہو سکتی اور اس کو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام مبارکہ ساکن اور ساکت ہی نظر آئیں گے۔ کیونکہ دوسروں کے حق میں وہ غیر محسوس ہے اور اس لحاظ سے وہ دنیوی نہیں اور نہ دنیوی زندگی سے مشابہ ہے بلکہ اس معنی میں وہ برزخی اور اُخروی ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''لانه بعد موته وان کان حیا فهی حیاة أخرویة لا تشبه حیوة الدنیا'' کیونکہ آپ وفات کے بعد اگر چہ زندہ ہیں لیکن یہ دوسری قسم کی حیات ہے وہ دنیا کی حیات کی طرح نہیں ہے۔'' (فتح الباری ج ۴ ص ۳۶)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''وهذه الحیوة لیست دنیویة انما هی اخرویة''

''اور یہ زندگی دنیوی نہیں بلکہ اُخروی ہے۔'' (فتح الباری ج ۲ ص ۲۱۳)

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''تمام اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام وفات کے بعد اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز و عبادات میں مشغول ہیں اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی یہ برزخی حیات اگر چہ ہم کو محسوس نہیں ہوتی لیکن بلاشبہ یہ حیات حسّی اور جسمانی ہے اس لئے کہ رُوحانی اور معنوی حیات تو عامہ مؤمنین بلکہ ارواح کفار کو بھی حاصل ہے۔'' (حیات نبوی ص ۲)

اور آگے لکھتے ہیں کہ: ''غرض یہ کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات جسمانی ہے محض روحانی نہیں اس لئے کہ مرنے کے بعد روحانی حیات اور سمع اور ادراک حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ احادیث صحیحہ سے تمام افراد اور احاد بشر کے لئے ثابت ہے۔'' (ص ۵)

اور پھر آگے چند دلائل کا ذکر کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ: ''یہ تمام اُمور اس اَمر کی قطعی دلیل ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات جسمانی ہے اور اَرواح طیّبہ کا اجسام مبارکہ سے تعلق ہے۔'' (ص ۱۱)

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب (المتوفی ۱۳۴۶ھ) لکھتے ہیں اور اَنبیاء کرام علیہم السلام کی حیات خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات شہداء کی حیات سے افضل واعلیٰ ہے اور بحث اس کی طویل ہے۔ فقط!

(فتاویٰ دار العلوم مدلل و مکمل ج ۵ ص ۱۷۴، طبع دیوبند)

ایک اور سوال یوں ہوا کہ مرنے کے بعد جو سوال وغیرہ ہوتے ہیں تو رُوح مرنے کے بعد آسمان پر چلی جاتی ہے، پھر قبر میں لائی جاتی ہے یا جسم میں بند کر دی جاتی ہے، جس کا جواب یہ ارشاد فرمایا:

الجواب: جسم سے رُوح کو تعلق رہتا ہے۔ فقط! (فتاویٰ دار العلوم مدلل و مکمل ج ۵ ص ۴۶۲، طبع دیوبند)

جب عام مُردوں کے جسم سے رُوح کا تعلق رہتا ہے تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام مبارکہ سے ارواح طیبہ کا تعلق کیوں نہ ہوگا؟

علامہ سید محمود آلوسی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''والمراد بتلک الحیوۃ نوع من الحیوۃ غیر معقول لنا وھی فوق حیوۃ الشھداء بکثیر و حیوۃ نبینا ﷺ اکمل واتم من حیوۃ سائرھم علیہم السلام الی ان قال ان تلک الحیوۃ فی القبر و ان کانت یترتب علیھا بعض ما یترتب علی الحیوۃ فی الدنیا المعروفۃ لنا من الصلٰوۃ والاذان والاقامۃ ورد السّلام المسموع ونحو ذٰلک الا انھا لا یترتب علیھا کل ما یمکن ان یترتب علٰی تلک الحیوۃ المعروفۃ'' (روح المعانی ج ۲۲ ص ۳۶)

''اس حیات سے حیات کی ایک ایسی نوع مراد ہے جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اور یہ حیات شہداء کی حیات سے بہت اُونچی ہے اور آنحضرت ﷺ کی حیات تو تمام اَنبیاء علیہم السلام سے اکمل اور اتم ہے۔ (پھر آگے فرمایا کہ) اس قبر کی زندگی پر اگرچہ بعض وہ اُمور مترتب ہوتے ہیں جو ہماری دُنیا کی معروف زندگی پر مترتب ہیں۔ مثلاً نماز، اذان، اقامت اور سُنے ہوئے سلام کا جواب لوٹانا اور اسی طرح کے کئی اور اُمور، مگر اس پر وہ سب اُمور مترتب نہیں جو دُنیا کی معروف زندگی پر مترتب ہوتے ہیں۔''

علامہ سبکی رحمہ اللہ وغیرہ کے حوالہ سے یہ گزر چکا ہے کہ جس طرح دنیوی زندگی میں حسّی قسم کا کھانا اور پانی درکار ہوتا ہے اور اس کے بغیر عادۃً لمبی زندگی برقرار نہیں رہتی۔ اس طرح کے حسّی کھانے اور پانی کی ضرورت قبر اور برزخ میں پیش نہیں آتی۔ وہاں کا طعام وشراب اسی ماحول کے مناسب مرحمت ہوتا ہے۔ ہاں! عبادات اور صلوٰۃ وسلام کا سماع وہاں بھی متحقق ہے اور اس معنی کے لحاظ سے وہ دُنیوی حیات ہے۔

اور پھر آگے لکھتے ہیں کہ: ''فلو فرض انکشاف قبر نبی من الانبیاء علیہم السلام لا یری الناس الا کما یرون سائر الاموات الذین لم تاکل الارض اجسادھم'' (روح المعانی ج ۲۲ ص ۳۸)

''پس اگر فرض کیا جائے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی کی قبر مبارک کھل گئی ہے تو لوگ ان کو اسی طرح (بے حس وحرکت) دیکھیں گے جس طرح کہ عام دوسرے مُردوں کو دیکھتے ہیں جن کو زمین نہیں کھاتی۔''

یعنی باوجود اجسام مبارکہ کے صحیح وسالم ہونے اور باوجود قبر میں ان کی حیات کے لوگ اس حیات کو محسوس نہیں کر سکتے اور نہ ظاہری طور پر اُن کو اس کے کچھ آثار نظر آ سکتے ہیں اور امام سیوطی رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ وہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے قبروں سے باہر نکل کر دنیا میں پھرنے اور تصرف کرنے کے قائل ہیں۔ (اگرچہ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اجسام کے ساتھ چلنے پھرنے کا ذکر نہیں کیا ممکن ہے کہ ان کے نزدیک مثالی اجسام یا ارواح کے ساتھ یہ سیر ہوتی ہو بشرطیکہ کسی معقول اور قطعی دلیل سے یہ ثابت ہو جائے لیکن اس سے ہر جگہ حاضر وناظر ہونے کا شبہ نہ کیا جائے کیونکہ اگر کسی ایک جگہ رُوح یا جسم مثالی حاضر ہو تو دیگر مقامات میں تو وہ نہیں ہوگا اور کسی ایک جگہ میں حاضر ہونے سے ہر جگہ حاضر ہونا لازم نہیں آتا)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ اس کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''وما تقدم من ان الانبیاء علیہم السلام یخرجون من قبورھم ای باجسامھم وارواحھم کما ھو الظاھر ویتصرفون فی الملکوت العلوی والسفلی فمما لا اقول بہ'' (روح المعانی ج ۲۲ ص ۳۵)

''اور جو پہلے گزر چکا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں سے اجسام وارواح کے ساتھ نکلتے ہیں جیسا عبارت سے یہی متبادر ہوتا ہے اور عالم علوی اور سفلی میں تصرف کرتے ہیں تو میں اس نظریہ کا قائل نہیں ہوں۔''

اور پھر آگے لکھتے ہیں کہ: ''والحیوة فی القبر لا تستلزم الخروج و انا اقول بها فی حق الانبیاء علیہم السلام'' (روح المعانی ج ۲۲ ص ۳۶)

''قبر میں زندگی اس بات کو مستلزم نہیں کہ صاحب قبر باہر بھی نکلے۔ ہاں! میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات فی القبر کا قائل ہوں۔''

غور فرمایئے کہ علامہ آلوسی الحنفی رحمہ اللہ ''حیات فی القبر'' تو تمام حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے تسلیم کرتے ہیں لیکن اس نظریہ کے قائل نہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنے اجسام اور ارواح کے مجموعہ کے ساتھ قبروں سے نکل کر دنیا میں پھرتے اور تصرف کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی سے کسی وقت ان کی خواب یا بیداری[1] میں ملاقات ہوتی ہے تو محض ابدانِ مثالی سے ہوتی ہے نہ کہ اجسام عنصریہ اور اجسام وارواح دونوں کے مجموعہ سے، لیکن قبر میں اُن کی حیات ابدان عنصری کے ساتھ ہے۔

حیات انبیاء علیہم السلام اور غیر مقلدین حضرات

اس سے قبل جتنے حوالے نقل کئے گئے ہیں وہ ان حضرات کے ہیں جو فروعی مسائل میں کسی نہ کسی امام کے مقلد تھے، کوئی حنفی تھا اور کوئی مالکی کوئی شافعی تھا اور کوئی حنبلی (بجز قاضی شوکانی رحمہ اللہ اور نواب صاحب رحمہ اللہ کے کہ وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس مقام پر غیر مقلدین حضرات کے کچھ حوالے بھی نقل کردیں تاکہ حیات انبیاء کرام علیہم السلام کی حقیقت بالکل روشن ہو جائے۔

قاضی شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''و قد ذهب جماعة من المحققين الى ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم حیّ بعد وفاته و انه يسر بطاعات امته و ان الانبياء لا يبلون مع ان مطلق الادراک کالعلم والسماع ثابت لسائر الموتی۔ الی ان قال وورد النص فی کتاب الله فی حق الشهداء انهم احياء يرزقون و ان الحيوة فيهم متعلقة بالجسد فكيف بالانبياء والمرسلين و قد ثبت فی الحديث ان الانبياء احياء فی قبورهم رواه المنذری و صححه البیهقی و فی صحيح مسلم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال مررت بموسیٰ ليلة اسری بی عند الكثيب الاحمر و هو قائم يصلی فی قبره'' (نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۶۴ طبع مصر)

''بے شک محققین کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے بعد زندہ ہیں اور آپ اپنی اُمت کی طاعات سے خوش ہوتے ہیں اور یہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام بوسیدہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ مطلق ادراک جیسے علم اور سماع وغیرہ تو یہ سب مردوں کے لئے ثابت ہے۔ (پھر آگے کہا) اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں شہداء کے بارے میں نص وارد ہوئی ہے کہ وہ زندہ ہیں اور ان کو رزق ملتا ہے اور ان کی حیات جسم سے متعلق ہے تو حضرات انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کی حیات جسم سے کیوں متعلق نہ ہوگی؟ اور حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام

[1] اس کی تحقیق (فیض الباری ج ۱ ص ۲۰۴) میں ملاحظہ کریں۔ علاوہ ازیں اسنی المطالب کا حوالہ بھی اس زیر نظر کتاب میں موجود ہے۔

اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ امام منذری رحمہ اللہ نے اس کو روایت کیا ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کی تصحیح کی ہے اور صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں نے معراج کی رات سُرخ رنگ کے ٹیلے کے پاس موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں کھڑے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

قاضی شوکانی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ وہ شہداء کی حیات جسمانی کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی زندگی بطریق اولیٰ جسمانی ہے۔ کیونکہ ان کے اجسام طیبہ اپنی حالت پر رہتے ہیں، ان میں کسی قسم کا کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا اور یہ بھی تصریح فرماتے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی وفات تو ہوتی ہے لیکن وہ اس کے بعد اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ: ”انه ﷺ حيّ في قبره بعد موته كما في حديث الانبياء احياء في قبورهم وقد صححه البيهقي والف في ذلك جزء قال الاستاذ ابو مصنور البغدادي قال المتكلمون المحققون من اصحابنا ان نبينا ﷺ حي بعد وفاته انتهى ويؤيد ذلك ماثبت ان الشهدآء احياء يرزقون في قبورهم والنبي ﷺ منهم“ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۰۱، طبع مصر)

آنحضرت ﷺ وفات کے بعد اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور بیہقی رحمہ اللہ نے اس کی تصحیح کی ہے اور اس مسئلہ میں انہوں نے ایک رسالہ بھی لکھا ہے استاذ ابو منصور البغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اصحاب میں محقق متکلمین کا ارشاد ہے کہ آنحضرت ﷺ وفات کے بعد زندہ ہیں۔ ان کا بیان ختم ہوا اور اس کی تائید یہ بات بھی کرتی ہے کہ شہداء زندہ ہیں اور قبروں میں ان کو رزق دیا جاتا ہے اور آنحضرت ﷺ بھی شہید ہیں۔“

پہلے صحیح روایت کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ شہید تھے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے نظر اور دلالۃ النص کی دلیل سے بھی یہ ثابت ہو چکا ہے اور قرآن کریم کی نص سے شہداء کی زندگی ثابت ہے۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ کی حیات بھی ثابت ہے کہ آپ قبر مبارک میں زندہ ہیں۔

عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ”والذی نعتقدان رتبة نبيّنا ﷺ اعلٰى مراتب المخلوقين على الاطلاق وانه حي في قبره حيوة مستقرة ابلغ من حيات الشهداء المنصوص عليها في التنزيل اذهو افضل منهم بلاريب وانه يسمع من يسلّم عليه“ (اتحاف النبلاء ص ۴۱۵، طبع کانپور)

”جس چیز کا ہم اعتقاد کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا درجہ مطلقاً ساری مخلوق سے بڑھ کر ہے اور آپ اپنی قبر مبارک میں حیات دائمی سے متصف ہیں جو شہداء کی حیات سے اعلیٰ وارفع ہے جس کا ثبوت قرآن کریم سے ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ بلاشبہ شہداء سے افضل ہیں اور جو شخص آپ ﷺ پر (عند القبر) سلام کہتا ہے، آپ اس کو سنتے ہیں۔“

اس سے بھی آفتاب نیمروز کی طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ اپنے وقت میں علماء نجد کے وکیل اعظم اپنی جماعت کا یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اپنی قبر مبارک میں دوامی طور پر زندہ ہیں اور آپ کی یہ حیات شہداء کی منصوص حیات سے اعلیٰ وارفع ہے نواب صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے کہ وہ جملہ

اموات کے لئے ادراک وشعور اور سماع وغیرہ ثابت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ اوصاف سب کے لئے ثابت ہیں اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور صلحاء کی اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔

غیر مقلدین[1] حضرات کے شیخ الکل مولانا سید میاں نذیر حسین صاحب دہلوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) لکھتے ہیں کہ: ''اور حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں۔ خصوصاً آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ جو کوئی عند القبر درود بھیجتا ہے میں سنتا ہوں اور دُور سے پہنچایا جاتا ہوں۔'' (فتاویٰ نذیریہ ج ۲ ص ۵۵ ضمیمہ) اہل علم جانتے ہیں کہ حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ کی وجہ سے ہندوستان میں غیر مقلدین حضرات کو اپنے مقام پر کتنی تقویت اور تائید حاصل ہوئی بلکہ انہی کی بدولت ان میں اہل علم، صاحب قلم مدرس اور مصنف قسم کے علماء پیدا ہوئے ہیں اور جن کی کتاب ''معیار الحق'' غیر مقلدین حضرات کے ہاں بڑی مقبول اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ نے اس عبارت میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی اپنی اپنی قبر میں حیات کے علاوہ یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ آنحضرت ﷺ عند القبر سلام کہنے والوں کا سلام بنفسِ نفیس سنتے ہیں اور دُور سے درود شریف آپ کو پہنچایا جاتا ہے۔

مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ان الانبیاء فی قبورھم احیاء''

''حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔'' (عون المعبود ج ۱ ص ۴۰۶)

اور مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف لکھتے ہیں کہ: ''انھم احیاء فی قبورھم یصلون و قال النبی ﷺ من صلی علّی عند قبری سمعتہ و من صلّی علیّ نائیا ابلغتہ'' (التعلیقات السلفیۃ علی سنن النسائی ج ۱ ص ۲۳۷)

''حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھتا ہے تو میں خود اس کو سنتا ہوں اور جو دُور سے پڑھتا ہے تو وہ مجھے (بذریعہ ملائکہ) پہنچایا جاتا ہے۔''

علماء نجد جو لوگوں میں وہابی کے نام سے مشہور ہیں اپنا عقیدہ یوں بیان کرتے ہیں کہ: ''و اما الکلام علی حیوۃ النبی ﷺ فاعتقادنا فی ذٰلک اعتقاد سلف الامۃ وامتنا و الاسوۃ و ھی انہ ﷺ قبض و دفن و زالت عند الحیوۃ الدنیا الٰی قولہٖ و اما حیوۃ البرزخ فھو حی الحیوۃ البرزخیۃ و کذا الشھداء فلو کان حیا حیوۃ دنیویۃ لرفعوا الیہ الامر فیما جری بینھم'' (الدرر السنیۃ فی الاجوبۃ النجدیۃ ج ۱ ص ۲۶۰، طبع مصر)

---

[1] غیر مقلد عالم مولانا فضل الرحمن صاحب ہری پوری لکھتے ہیں کہ کل پیغمبروں کے جسم صحیح و سالم ہیں اور قبر شریف میں زندہ ہیں اور جو کوئی قبر کے پاس درود بھیجے یا سلام کرے تو آپ خود سُن لیتے ہیں اگر دُور سے درود بھیجے تو فرشتہ آپ تک پہنچاتے ہیں اہلحدیث کا یہی اعتقاد ہے۔ (رسالہ درود الشریف ص ۱۶) محدث مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ محققین کی جماعت کا یہی مذہب ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے مرقد میں زندہ ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ اُمت کی اطاعت کی خبر پاکر خوش ہوئے ہیں۔ (اسلام کی چودھویں کتاب ص ۴۵)

[2] مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سلفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔ اہل السنت کے دونوں مکاتب فکر اصحاب الرائے واہل حدیث کا اس اَمر پر اتفاق ہے کہ شہداء اور انبیاء زندہ ہیں برزخ میں وہ عبادات تسبیح وتہلیل فرماتے ہیں: الی قولہ انبیاء کی زندگی کے متعلق سنت میں شواہد ملتے ہیں صحیح احادیث میں انبیاء علیہم السلام کے متعلق عبادات وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ (حیات النبی ﷺ ص ۲۷)

''بہر حال آنحضرت ﷺ کی حیات کے بارے میں ہمارا وہی اعتقاد ہے جو سلفِ اُمت اور ہمارے آئمہ کا اعتقاد ہے اور وہی اس میں ہمارے مقتدا ہیں وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کی وفات ہوئی ہے اور آپ کو دفن کیا گیا اور آپ کی دنیوی زندگی ختم ہو گئی ہے۔ (پھر آگے کہا) اور بہر حال برزخی زندگی تو آنحضرت ﷺ کے لئے ثابت ہے اور آپ حیات برزخیہ کے ساتھ زندہ ہیں اور ایسے ہی شہداء بھی زندہ ہیں۔ اگر آپ کی زندگی دنیا کی زندگی ہوتی تو اختلافی اُمور میں سلف آپ کی طرف مراجعت کرتے۔''

یعنی دنیوی تکلیفی اور حِسی زندگی آپ کی ختم ہو چکی ہے لیکن برزخی زندگی آپ کی ثابت ہے۔ نیز علماء نجد نے کہا کہ ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ رُتبہ حضور انور ﷺ کا تمام مخلوق کے مراتب سے اعلیٰ ہے وہ اپنی قبر میں حیاتِ برزخیہ سے زندہ ہیں جو کہ حیاتِ شہداء سے افضل واکمل ہے اور سلام کہنے والے کا آپ سلام سنتے ہیں۔

(الهدایة السنیه والتحفة الوهابیة النجدیه ص ۴۷، طبع مصر)

محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ اور اُن کے پیروکار مسلکاً حنبلی ہیں جو مقلدین ہی کا ایک فرقہ ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی تحقیق پر اعتماد کرتے اور ان کو اپنا پیشواء تسلیم کرتے ہوئے ان کی کتابوں کی خوب نشر واشاعت کرتے ہیں محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ باوجود مقلد اور حنبلی ہونے کے سطحی ذہن کے آدمی تھے اور توحید وسنت کے خوب داعی تھے ان سے وقتی مصلحت کے پیش نظر کچھ عوامی غلطیاں سرزد ہو چکی تھیں جن کی وجہ سے وہ عوام میں خاصے بدنام ہو گئے اور علامہ شامی رحمہ اللہ اور حضرت مدنی رحمہ اللہ جیسے بزرگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے لیکن ان کے بارے میں صحیح نظریہ وہی ہے جو علامہ آلوسی رحمہ اللہ اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا ہے۔ وللتفصیل مقام آخر انگریز نے اپنی سیاسی بقاء کے لئے ان کو بہت بدنام کیا اور ہندوستان کے اہل بدعت نے ان کے بدنام کرنے میں خوب خوب حصہ لیا اور جنگ آزادی میں شریک مجاہدینِ اسلام کو وہابیت کے بے خطاء ہتھیار سے ان ظالموں نے گھائل کیا۔

علامہ ابن عابدین الشامی رحمہ اللہ کے تلمیذ اور علماء نجد کے مسلک کے روح رواح الشیخ محمد بن السید درویش رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۷۶ھ) لکھتے ہیں۔

فائدہ: حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات برزخی ہے (حِسی ہونے میں) حیات دنیوی کے مشابہ نہیں ہے اور نہ وہ نیند کے مشابہ ہے اور نہ وہ باقی مخلوقات کی حیات کی طرح ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے اجسام مبارکہ کو بوسیدہ ہونے اور فنا ہونے سے محفوظ رکھتا ہے اور ان پر ان کے ارواح کی روشنی بعض اوقات مخفی طریقہ سے لوٹاتا ہے کسی مقصد کے لئے اور بہت سی احادیث وارد ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً ایک یہ ہے کہ اُمت کی طرف سے صلوٰۃ وسلام آپ پر پیش کیا جاتا ہے اور مثلاً بعض احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر آپ کی رُوح مبارک لوٹاتا ہے تاکہ آپ سلام کہنے والے کے سلام کا جواب دیں اور مثلاً بعض میں آتا ہے جس نے دُور سے سلام کہا اس کو فرشتے پہنچاتے ہیں اور جس نے قریب سے سلام کہا تو اس کو آپ خود سنتے ہیں اور مثلاً بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ آپ پر کیسے صلوٰۃ وسلام عرض کیا جائے گا۔ جب کہ آپ ﷺ (مرنے کے بعد) بوسیدہ ہو جائیں گے۔ (معاذ اللہ) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام کو کھائے تو یہ سب احادیث آپ ﷺ کی اور دیگر تمام حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات پر دلالت کرتی ہیں لیکن اُسی طرح جس طرح بیان ہوا نہ جیسا کہ ہماری (حِسی اور تکلیفی) زندگی ہے۔

کیونکہ جب آپ ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ ﷺ دیگر اموات کی طرح تھے کہ روح مبارک جسم اطہر میں نہ تھی اور جسم سے خارج ہوگئی اگر آپ ﷺ کی زندگی ہماری (محسوس اور تکلیفی) زندگی کی طرح ہوتی تو جب حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خلافت کے مسئلہ پر اختلاف کیا تھا آپ ﷺ اُن سے اس سلسلہ میں خطاب فرماتے۔

(اسنی المطالب ص ۲۹۸، فی احادیث مختلفۃ المراتب طبع مصر)

''تسکین الصدور'' میں ہی بقدر ضرورت اس کی بحث موجود ہے کہ جو حضرات اس حیات کو جسمانی اور دنیوی کہتے ہیں اُن کی مراد یہ ہے کہ رُوح مبارک کا اسی جسم اطہر سے تعلق ہوتا ہے جو دنیا میں تھا اور جو حضرات اس کو برزخی کہتے ہیں ان کی مراد یہ ہے کہ وہ حیات اہل دنیا کے لئے محسوس نہیں ہے اور اسی کو علماء عقائد نوع من الحیٰوۃ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اس پر دونوں فریق متفق ہیں کہ دُور سے آپ ﷺ پر صلوٰۃ وسلام پیش کیا جاتا ہے اور نزدیک سے آپ خود بنفسِ نفیس سنتے اور جواب دیتے ہیں اس میں حیات جسمانی یا حیات برزخی سے تعبیر کرنے والوں میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ رہا موصوف رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ اگر آپ ﷺ کی حیات ہماری زندگی کی طرح ہوتی تو آپ ﷺ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں خلافت کے مسئلہ کا اختلاف رفع فرما دیتے اور ان سے خطاب فرماتے تو اس میں کلام ہے۔

(۱) اَوّلاً اس لئے کہ مسئلہ خلافت میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف آپ ﷺ کے پاس نہ ہوا تھا وہ اختلاف سقیفہ بنوساعدہ میں ہوا تھا۔

(۲) ثانیاً جمہور علماء کی تحقیق کی رُو سے رُوح کا اعادہ قبر میں ہوتا ہے پہلے نہیں ہوتا اور بات بھی حیات فی القبر کی ہو رہی ہے۔

(۳) ثالثاً اُمت کے جملہ اختلافات ونزاعات کا فیصلہ آپ اپنی تکلیفی زندگی میں کرتے رہے جب آپ ﷺ کی وفات ہوگئی تو ان اختلافات کا رفع کرنا زندہ اور مکلف اُمت کے کندھے پر ڈال دیا گیا آپ پر اُن کا رفع کرنا باقی نہ رہا۔

موصوف رحمہ اللہ باوجود مجدی ذہن رکھنے کے یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ: ''ثم ان کثیراً من الصالحین یقول انہ یری النبی ﷺ یقظۃً ولا ینکر ھذا منھم وانما ھی رؤیۃ روحانیۃ لا جسمانیۃ ولذالک یراہ البعض دون البعض فی المکان الواحد ولو کان بجسمہ لرأہ کل احد لان رؤیۃ الجسم لا تتوقف علی صلاح و تقوی بل رأہ الکفار فی حیاتہ ﷺ وشرار الخلق وخیارھم'' (ص ۲۹۹)

''پھر بہت سے نیک لوگ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو بیداری میں دیکھا ہے اور ان سے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ روحانی رویت ہے جسمانی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایک ہی جگہ میں بعض آپ ﷺ کو دیکھتے ہیں اور بعض نہیں دیکھتے۔ اگر یہ رویت جسمانی ہوتی تو ہر ایک آپ ﷺ کو دیکھتا کیونکہ جسم کو دیکھنا صلاح اور تقویٰ پر موقوف نہیں جب آپ ﷺ زندہ تھے تو آپ ﷺ کو کافر بد اور نیک بھی دیکھتے تھے۔

موصوف رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ یہ رؤیت روحانی ہے جسمانی نہیں اس میں بھی کلام ہے کیونکہ یہ رویت روحانی بھی نہیں ہوتی، صرف مثالی ہوتی ہے۔ (اور یہیں سے آپ ﷺ کو حاظر وناظر سمجھنے والے اور آپ سے مرادیں مانگنے والے مغالطہ میں پڑے ہیں جس کا حقیقت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے جس بزرگ کی مثال ہوتی ہے اس کو علم

تک نہیں ہوتا کہ ہماری مثال کہاں گئی؟ کیا کر آئی؟ اور کیا کہہ آئی؟ اس کی بقدرِ ضرورت با حوالہ بحث ہم نے بحمد اللہ تعالیٰ تفریح الخواطر میں کر دی ہے)

چنانچہ علامہ احمد بن محمد القسطلانی رحمہ اللہ (المتوفی ۹۲۳ھ) لکھتے ہیں کہ: "فمارأه من الشكل ليس هو روح المصطفى ولا شخصه بل هو مثال له على التحقيق" (المواهب اللدنيه مع الشرح للزرقانی رحمہ اللہ ج ۵ ص ۲۹۳)

"دیکھنے والا جو شکل مبارک دیکھتا ہے تو وہ نہ تو آنحضرت ﷺ کی روح مبارک ہوتی ہے اور نہ جسم اطہر بلکہ تحقیق کے رُو سے وہ آپ ﷺ کی مثال ہوتی ہے۔"

اور خود موصوف رحمہ اللہ کی ایک واضح عبارت اس پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: "ومن ذلك ماوقع لسيدنا الرفاعی رضی اللہ عنہ حين زار النبی ﷺ وانشد عند الحجرة الشريفه البيتين المشهورين وهما"

في حالة البعد روحي كنت ارسلها تقبل الارض عني وهي نائبتي
وهذه دولة الاشباح قد حضرت فامدد يمينك كيْ تحظى بها شفتي

فمثلت له اليد الشريفة وقبلها والخبر المذكور مشهور من قبل الامام المذكور

(اسنی المطالب ص ۲۹۹، ۳۰۰)

اور اسی سلسلہ کی ایک کڑی وہ ہے جو ہمارے سردار سید (احمد) الرفاعی رضی اللہ عنہ کے لئے واقع ہوئی جب کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی زیارت کی اور حجرہ شریف کے پاس یہ دو مشہور شعر پڑھے۔

ترجمہ: دُوری کی حالت میں اپنی روح کو بھیجا کرتا تھا۔ زمین مجھ سے قبول کرتی اور وہ میری نائب تھی اور یہ (امثال) اشباع کی دولت ہے جو بلاشبہ حاضر ہے۔ پس اپنا دایاں ہاتھ بڑھائیں تاکہ میرے ہونٹ لطف اندوز ہوں۔

اس پر آنحضرت ﷺ کا ہاتھ مبارک مثالی طور پر ان کے سامنے ظاہر ہوا اور انہوں نے اس کو بوسہ دیا اور یہ خبر امام سید احمد رفاعی رحمہ اللہ کی طرف سے مشہور ہے۔

پہلے تو معجزہ اور کرامت خرقِ عادت فعل کا نام ہے اور پھر ہو بھی مثالی طور پر تو اس کے ماننے میں ہرگز کوئی تامّل نہیں ہونا چاہئے۔ ہاں! اگر کوئی شخص مشہور اُمور کو بھی تسلیم نہ کرے اور صرف اپنی عقل پر اعتماد کرتا رہے تو اس کا معاملہ ہی الگ ہے۔

مشہور غیر مقلد عالم محمد بن اسماعیل الامیر الصنعانی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۱۸۲ھ) اپنے مناسک الحج میں لکھتے ہیں کہ

وسلّم عليه والوزيرين عندهٗ و زره كما زرنا لِتَحصِد عُقباهُ
و بَلِّغه عنّا لا عدمت سلامنا فانت رسول للرّسل بعثناه
و من كان مِنّا مُبلغًا لِسلامنا فانا بِمبلاغ السلام سبقناه

(مناسک الحج والعمرۃ ص ۸۷، طبع مصر)

"اور آپ ﷺ کو اور آپ کے دو وزیروں (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کو سلام کہہ اور آپ ﷺ کی زیارت کر جیسا کہ ہم نے کی تاکہ ہم عقبیٰ کی کھیتی کو کاٹ سکیں۔"

"اور آپ کو ہمارا سلام پہنچا دے تجھے اللہ تعالیٰ سلامت رکھے...... سو تُو جناب رسول اللہ ﷺ کی طرف ہمارا قاصد ہے جس کو ہم نے بھیجا ہے۔"

''اور جو شخص ہمارا سلام پہنچائے گا...... پس بے شک ہم سلام پہنچانے میں اس پر سبقت لے گئے ہیں۔''

قاضی عیاض، علامہ سبکی، حافظ ابن القیم، مورخ سمہودی اور امام سخاوی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

واللفظ الاوّل: ''وعن سلیمان بن سحیم رأیت النبی ﷺ فی النوم فقلت یا رسول اللہ ھؤلآء الذین یأتونک فیسلمون علیک اتفقہ سلامھم قال نعم وارد''

(الشفاء ج ۲ ص ۶۴، وشفاء السقام ص ۸۳ وکتاب الروح ص ۱۳، ووفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۰۵، والقول البدیع ص ۱۲۰)

''سلیمان بن سحیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں آنحضرت ﷺ کو دیکھا میں نے آپ ﷺ سے سوال کیا، یا رسول اللہ! یہ لوگ جو آپ ﷺ کے پاس آتے ہیں اور آپ کو سلام کہتے ہیں۔ کیا آپ ﷺ ان کے سلام کو سمجھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اور میں اُن کو جواب بھی دیتا ہوں۔''

مؤلف (شفاء الصدور ص ۸۶) میں اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ خواب ہے اور خواب شرعاً حجت نہیں پھر اس کی سند میں عبدالرحمن بن ابی الرجال ہے۔ (تقریب ص ۲۲۸) میں ہے۔ صدوق ربما اخطأ و لینہ ابو حاتم رحمہ اللہ (محصلہ)

الجواب: بلاشبہ بڑے خواب پر دین کے بارے اعتماد نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ خواب اُن صحیح احادیث کے عین مطابق ہے جو آنحضرت ﷺ سے ثابت ہیں اور عبدالرحمن بن ابی الرجال کو امام احمد رحمہ اللہ، ابن معین رحمہ اللہ، مفضل غلابی رحمہ اللہ اور دارقطنی رحمہ اللہ ثقہ کہتے ہیں اور ابوداؤد ان کو لیس بہ بأس کہتے ہیں اور ابو زرعہ رحمہ اللہ ان کو اشبہ (یعنی ثقہ راویوں کے مشابہ کہتے ہیں اور ابو حاتم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ کی طرح ہیں اور ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ''کتاب الثقات'' میں لکھتے ہیں اور کہتے ہیں: ربما اخطأ (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۶۹) جمہور کی توثیق کے بعد صرف ربما اخطأ کے جملہ سے ان کو ضعیف قرار دینا کوئی معنی نہیں رکھتا ویسے کون راوی ایسا ہے جس سے کبھی بھی خطاء اور وہم نہ ہوا ہو، الا من شاء اللہ تعالٰی والعصمت بیدہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ علماء نجد کے نزدیک آنحضرت ﷺ کی رُوح مبارک کا جسدِ اطہر سے ایسا تعلق اور اتصال ہے جس کے سبب عند القبر سلام کہنے والے کا سلام آپ خود سُن لیتے ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علماء نجد بھی آپ کی حیات برزخی کے قائل ہیں اور دُور دَراز سے قاصد کے ذریعہ آپ ﷺ تک اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہم تک سلام پہنچانے کے بھی قائل ہیں۔

مولانا عبدالغفور صاحب غزنوی امرتسری رحمہ اللہ (المتوفی) مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ تو معلوم ہوا کہ کل پیغمبروں کے جسم زمین کے اندر صحیح و سالم ہیں اور رُوح تو سب کی سلامت رہتی ہے۔ پس آنحضرت ﷺ مع جسم صحیح و سالم ہیں اور قبر شریف میں زندہ ہیں اور جو کوئی قبر کے پاس درود یا سلام بھیجے تو آپ خود سُن لیتے ہیں اگر دُور سے درود بھیجے تو فرشتے آپ تک پہنچا دیتے ہیں، اہل حدیث کا یہی اعتقاد ہے۔ اگرچہ یہ زندگی دُنیا کی سی نہیں جس میں کھانے پینے کا احتیاج ہو اور شوکانی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کو نیل الاوطار میں بہت عمدہ لکھا ہے۔

(ترجمہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۴۰۱، باب الجمعہ)

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ علماء کرام جہاں دنیا کی زندگی کی نفی کرتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ دنیوی کھانے اور پینے کی حاجت وہاں نہیں ہوتی، نہ یہ کہ روح کا جسم سے تعلق اور اتصال اور اس کی وجہ سے ادراک وشعور اور قوت سماع نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ اُمور تو بہرحال ثابت ہیں اور ان کا انکار بڑا مکابرہ اور سینہ زوری ہے۔

الغرض ذمہ دار غیر مقلدین حضرات بھی جملہ مقلدین حضرات کے ساتھ اس اُمر پر متفق ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام وفات کے بعد اپنی قبور اور برزخ میں زندہ ہیں اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس مسئلہ پر صرف باب ہی قائم نہیں کیا بلکہ مستقل رسالہ اور کتاب لکھ کر اس کو اجاگر کیا ہے اور اسی طرح دیگر کتب حدیث، شروح حدیث اور کتب فقہ وسیر وغیرہ میں اس مسئلہ پر خاصا مواد اور دلائل موجود ہیں جن سے انصاف ودیانت کی دنیا میں علمی طور پر اغماض اور اعراض نہیں کیا جا سکتا۔''

اور امام عبدالقادر البغدادی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۲۹ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ: ''واجمعوا علی ان الحیوٰة شرط فی العلم والقدرة والارادة والرؤیة والسمع وان من لیس بحیٍ لا یصح ان یکون عالماً قادراً مریداً سامعا مبصراً و ھذا اخلاف قول الصالحی واتباعہ من القدریة فی دعواھم جواز وجود العلم والقدرة والرؤیة والارادة'' (الفرق بین الفرق ص ۳۳۷، طبع مصر)

''اہل السنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ علم قدرت ارادہ دیکھنے اور سننے کے لئے حیات شرط ہے اور اس امر پر بھی اہل السنت کا اجماع ہے کہ جو ذات حیات سے متصف نہ ہو وہ عالم قادر، مرید اور سننے دیکھنے والی نہیں ہو سکتی۔ منکرین تقدیر میں صالحی اور اس کے پیروکاروں کا قول اس کے خلاف ہے۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ علم وقدرت دیکھنا اور ارادہ کرنا حیات کے بغیر بھی جائز ہو سکتا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ سماع وغیرہ کے لئے حیات اہل السنت کے نزدیک شرط ہے اور اس پر ان کا اجماع ہے۔ ہاں! اس میں اگر اختلاف ہے تو وہ صالحی وغیرہ گمراہ فرقوں کے سربراہوں کا ہے جو بغیر حیات کے میت کے لئے علم وقدرت ثابت کرتے ہیں اور اب تو اس ایٹمی دور میں بعض لوگ یہاں تک آگے نکل چکے ہیں کہ وہ برملا یہ کہتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے نہ حیات ثابت ہے نہ سماع۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ!

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اوّل بطور مقدمہ کے جانئے کہ حضور ﷺ کی قبر مبارک کے لئے بہت کچھ شرف حاصل ہے۔ کیونکہ جسدِ اطہر اس کے اندر موجود ہے بلکہ حضور ﷺ خود یعنی جسد مع تلبس الروح اس کے اندر تشریف رکھتے ہیں۔ کیونکہ آپ قبر میں زندہ ہیں۔ قریب قریب تمام اہلِ حق اس بات پر متفق ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی اعتقاد ہے حدیث میں بھی نص ہے۔

''اِنَّ نَبِیَّ اللّٰہِ حَیٌّ یُرْزَقُ (اوکما قال)'' کہ آپ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور آپ کو رزق بھی پہنچتا ہے۔''

''مگر یہ یاد رہے کہ اس حیات سے مراد ناسوتی نہیں ہے وہ دوسری قسم کی حیات ہے جس کو حیات برزخیہ کہتے ہیں۔'' (الحبور ص ۱۴۹، مطبع انوار احمدی الہ آباد ورأس الاربعین ص ۵۰۸، طبع ملتان)

اور دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ: ''اگر نظر کو اور وسیع کیا جاوے تو حضور کے لئے بعد وفات کے بھی حیات برزخی ثابت ہے اور وہ حیات شہداء کی حیات برزخی سے بھی بڑھ کر ہے اور اتنی قوی ہے کہ حیات ناسوتی (عنصری اور جسمانی) کے قریب قریب ہے۔ چنانچہ بہت سے احکام ناسوت کے اس پر متفرع ہیں۔ دیکھئے زندہ مرد کی بیوی سے نکاح جائز نہیں اور حضور کی اَزواج مطہرات سے بھی نکاح جائز نہیں اور زندہ کی میراث تقسیم نہیں ہوتی حضور ﷺ کی میراث بھی تقسیم نہیں ہوئی اور حدیثوں میں صلوٰۃ وسلام کا سماع وارد ہے۔'' (الظہور ص ۵۸)

یہ یاد رہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات اور سماع عند القبور اتفاقی اور اجماعی اَمر ہے۔ اس کی مخالفت اجماعی مسئلہ کی مخالفت ہوگی، جو موجب گناہ ہے۔

چنانچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب: یہ کرامات اولیاء اللہ سے ہوتی ہیں اور حق ہے کہ کرامت خرق عادت کا نام ہے اس میں تردّد کی کوئی بات نہیں اس کا انکار گناہ ہے کہ انکار کرامت کرتا ہے اور کرامت کا حق ہونا اجماعی مسئلہ اہل سنت کا ہے فقط واللہ اعلم کتبہ الاحقر رشید احمد گنگوہی عفی عنہ۔ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۲۲ طبع جید برقی پریس دہلی)

کیفیت حیات میں اختلاف ہے

یہاں تک جتنے حوالے پیش کیے گئے ہیں اور جتنی بحث بھی ہوئی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ قبور میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات اور زندگی ایک طے شدہ حقیقت ہے اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کافی تلاش اور خاصی کاوش کے باوجود سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کے بعد بھی اہل السنت والجماعت میں ایک شخص بھی ایسا نہیں مل سکا جو یہ کہتا ہو کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور علی الخصوص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ نہیں اور آپ کی روح مبارک کا جسد اطہر سے کوئی اتصال در بط اور تعلق نہیں۔ باتونی قسم کے لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں مگر کتب اہل السنت میں ایک حوالہ بھی وہ تا قیامت نہیں بتا سکیں گے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ارواح طیبہ کا اجسام مبارکہ سے قبور مطہرہ میں کوئی تعلق اور علاقہ نہیں ہوتا۔ اگر بلا ایچ پیچ کوئی ایسا حوالہ ہو تو چشم ما روشن دل ما شاد (دیدہ باید) اُصولی طور پر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی بعد از وفات قبور مطہرہ میں حیات کو تسلیم کرتے ہوئے کتب اہل سنت والجماعت میں اس حیات کی نوعیت اور کیفیت میں اختلاف ہے کہ آیا یہ حیات محض برزخی ہے یا جسمانی اور حسّی ہے؟

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ان کی حیات دنیوی اور حسّی ہے، حضرت ملّا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ، علامہ سمہودی رحمۃ اللہ علیہ، امام تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ، حافظ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور نواب قطب الدین خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عبارات میں دنیوی اور کحال الدنیا حسّی وغیرہ کے الفاظ گزر چکے ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: ”بدانکہ حیات انبیاء صلوات اللہ علیہم متفق علیہ است میاں علماء ملّت و ہیچ کس را خلاف نیست دراں کہ آں کامل تر و قوی تر از وجود حیات شہداء و مقاتلین فی سبیل اللہ است کہ آں معنوی و اُخروی است عند اللہ و حیات انبیاء حیات حسّی دنیاوی است و احادیث و آثار دراں واقع شدہ چناں کہ مذکور گردد یکے ازاں حدیث کہ ابو یعلیٰ بنقل ثقات از روایت انس بن مالک رضی اللہ عنہ آوردہ ”قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلّون و دیگر ایں حدیث صحیح است ما من مسلم یسلم علیّ الا ردّ اللہ علیّ روحی حتّٰی ارد علیہ السلام“ (مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۴۴۷)

”جاننا چاہئے کہ جملہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات علماء ملّت کے ہاں متفق علیہ ہے اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آپ کی حیات شہداء اور فی سبیل اللہ مقتولوں کی حیات سے کامل تر اور قوی تر ہے۔ کیونکہ شہداء کی زندگی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں معنوی اور اُخروی ہے اور اَنبیاء علیہم السلام کی حیات حسی اور دُنیاوی ہے اور احادیث

اور آثار اس میں موجود ہیں۔ چنانچہ ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ ایک حدیث ان میں امام ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ نے ثقہ راویوں سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے اور نماز پڑھتے ہیں اور دوسری صحیح حدیث یہ ہے کہ مجھ پر جو شخص سلام کہتا ہے، اللہ تعالیٰ میری طرف میری روح کو لوٹا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔''

اور علامہ نورالحق بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی (المتوفی ۱۰۷۳ھ) لکھتے ہیں کہ:'' قول مختار: مقرر جمہور ہمیں است کہ انبیاء علیہم السلام بعد از ذائقہ موت زندہ اند بحیات دنیوی۔'' (تیسیر القاری شرح بخاری ج ۳ ص ۲۶۲)

'' جمہور کے نزدیک طے شدہ حقیقت اور مختار قول یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام موت کا ذائقہ چکھنے کے بعد دُنیوی زندگی کے ساتھ متصف ہیں۔'' لیکن یہ حیات دنیوی ظاہری نہیں کہ ہر ایک کو محسوس ہو سکے۔

چنانچہ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۵ ص ۳۹۷) میں ہے:

سوال نمبر ۳۰۴۶: آنحضرت ﷺ کا حیات ہونا مسلمات اہل سنت و جماعت سے ہے۔ پھر قبض روح وتجہیز و تکفین وتدفین وغیرہ اُمور منافی حیات معلوم ہوتے ہیں۔ اگر حیات انبیاء مثل حیات شہداء عند اللہ ہونا کہا جاوے تو مابین کیا فرق ہوگا؟

الجواب: انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات شہداء کی حیات سے بھی اقویٰ واتم ہے اور مراد اس حیات سے حیات دنیاوی ظاہری نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّکَ مَیِّتٌ فَاِنَّھُمْ مَیِّتُوْنَ۔ لہٰذا احکام اموات ظاہر یہ سب پر جاری ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ کی پوری تحقیق آب حیات مصنفہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ میں مذکور ہے اس کو دیکھ لیں۔

ان عبارات میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ لفظ دنیوی اور حسّی کی بقدر ضرورت بحث ابھی آ رہی ہے۔

اِن شاء اللہ تعالیٰ اور حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۷۷ھ) لکھتے ہیں کہ:

'' آپ ﷺ کی حیات نہ صرف روحانی ہے جو کہ عام شہداء کو حاصل ہے بلکہ جسمانی بھی اور از قبیل حیات دنیوی بلکہ بہت وجوہ سے اس سے قوی تر۔'' (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ ص ۱۳۰)

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی مراد بظاہر حیات جسمانی اور دنیوی سے یہ ہے کہ کتاب کی روح مبارک کا تعلق جسد مثالی سے قائم نہیں ہوتا جیسا کہ بعض صوفیاء کرام کا نظریہ پہلے عرض ہو چکا ہے کہ وہ عذاب وثواب کے سلسلے میں قبر میں روح کا تعلق جسد مثالی سے مانتے ہیں اور اسی طرح جنت کے عارضی ابدان سے بھی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ بعض صحیح روایات سے شہداء کے متعلق ثابت ہے کہ ان کی ارواح کا تعلق جنت کے سبز رنگ کے پرندوں سے قائم کر دیا جاتا ہے۔ (فی جوف طیر خضر) کما مرّ! بلکہ روح کا تعلق دنیوی جسم سے قائم ہوتا ہے اور بایں معنی یہ حیات جسمانی اور دنیوی ہے۔ چنانچہ حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ وہابی فرقہ اور علماء دیوبند کے عقائد کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:'' وہ (وہابی) وفات ظاہری کے بعد انبیاء علیہم السلام کی حیات جسمانی اور بقائے علاقہ بین الروح والجسم کے منکر ہیں اور یہ (علماء دیوبند) حضرات صرف اس کے قائل ہی نہیں بلکہ مُثبت بھی ہیں اور بڑے زور وشور سے اس پر دلائل قائم کرتے ہوئے متعدد رسائل اس بارے میں تصنیف فرما کر شائع کر چکے ہیں۔'' (نقش حیات ج ۱ ص ۱۰۳)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ موصوف رحمہ اللہ روح اور جسم کے علاقہ اور تعلق کی وجہ سے جسمانی اور دنیوی حیات کا لفظ اس پر اطلاق فرما رہے ہیں اور اس کی مزید تشریح حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کے بیان سے ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''انبیاء علیہم السلام کو ابدانِ دنیا کے حساب سے زندہ سمجھیں گے۔'' (لطائف قاسمیہ ص ۴)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''انبیاء کرام علیہم السلام کو انہیں اجسام دنیاوی کے تعلق کے اعتبار سے زندہ سمجھتا ہوں۔ یہ نہیں کہ مثل شہداء ان ابدان کو چھوڑ کر اور ان ابدان سے تعلق ہو جاتا۔'' (لطائف قاسمی ص ۳)

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے اس عبارت میں صراحت سے یہ بیان فرما دیا ہے کہ جیسے شہداء کو دوسرے عارضی اجسام مرحمت ہوتے ہیں اور ان کی ارواح کا ان سے تعلق قائم کر دیا جاتا ہے۔ (باوجود اس تعلق کے جو فی الجملہ ان کے ارواح کو ان کے اجسام عنصری سے بھی ہوتا ہے۔ کما مرّ مفصلا) حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات کا یہ طریق نہیں ہے بلکہ ان کے ارواح کا تعلق ان کے ابدان دنیا سے ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس حیات کو دنیوی اور جسمانی حیات کہتے ہیں۔

اَرواح کا ابدانِ عنصریہ سے فی الجملہ تعلق اور حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ

مؤلف ندائے حق راقم اثیم کے اس جملہ سے ''باوجود اس تعلق کے جو فی الجملہ ان کے اَرواح کو اُن کے اجسام عنصری سے بھی ہوتا ہے کما مرّ مفصلاً'' خاصے سیخ پا ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: ''بتایئے کہ خط کشیدہ الفاظ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی کون سی عبارت سے معلوم ہو رہے ہیں؟ کیا حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی عبارت اور صاحب ''تسکین الصدور'' کی تشریح میں باہم تناقض نہیں؟ بایں طور کہ حضرت کی عبارت میں سالبہ کلیہ ہے اور صاحب تسکین کی عبارت میں موجبہ جزئیہ فافھم بلفظہٖ (ص ۲۹۳، ۲۹۲) میں عنوان یہ قائم کیا ہے۔'' حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی عبارت میں ناجائز اضافہ''

مگر یہ اعتراض مؤلف مذکور کی کم فہمی اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے ارواح کے اجسام عنصریہ کے ساتھ تعلق کی جس نوع کا (کہ دنیوی اموال اور ازواج سے تعلق اور استفادہ کے سلسلہ میں قبض وتصرف کے طور پر اجسام عنصریہ کے ساتھ ارواح کا تعلق بالکل نہیں رہتا) حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ عام مؤمنین اور حضرات شہداء کے لئے کلیۃً انکار کیا ہے۔ راقم اثیم بھی اس کا منقر ہے اور ادراک وشعور فہم خطاب اور سماع سلام وغیرہ کی حد تک ارواح کے اجسام عنصریہ کے ساتھ فی الجملہ (گو ضعیف ہی سہی) تعلق کی جس نوع کے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ قائل ہیں۔ ان کی اور حضرات جمہور کی پیروی میں راقم اثیم بھی قائل ہے۔ جب نفی اور اثبات کا محل جدا ہے تو پھر تناقض کیسے؟ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ہی کی چند عبارات پیش کر دیں جن سے بصراحت یہ بات واضح سے واضح تر ہو جاتی ہے کہ وہ کس قسم کے تعلق کے منکر اور کس قسم کے تعلق کے مقر ہیں۔

(۱) مسئلہ سماع موتی کی بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: الغرض اِدھر تو روح کو جسم سے وہ تعلق ضعیف ہو گیا جو سرمایۂ ابصار واسماع تھا۔ ادھر واسطۂ ایصال بعد دفن آپ خاک ہے جس میں خفیف سی لچک اور قلیل سا سیلان ہے۔ اس لئے خواہ مخواہ یہی کہنا پڑے گا کہ حد قوت اِسماع متکلم سے قوت سامعہ اموات جو بالکل فقط روح

کے ساتھ قائم ہے۔''اور جسم سے چنداں تعلق نہیں بَری ہے، پر بایں ہمہ تعلق بھی موجود ہے، گوضعیف ہے اور واسطہ وصول آواز میں سیلان اور لپک بھی موجود ہے، گوخفیف ہے۔ اس لئے اگر اُدھر سے بوجہ توجہ و اقتراب و جو محبت مذکورہ کو لازم ہے۔ تلقی آواز یعنی استماع ہو تو بعید نہیں۔ اس لئے مناسب یوں ہے کہ قبرستان میں گزرے تو سلام سے دریغ نہ کرے اور بن پڑے تو ہدیہ مناسب وقت بھی پیش کرے۔ ورنہ سخت بے مروّتی ہے جو یوں آنکھیں چرائے چلا جاوے۔'' (جمال قاسمی ص ۱۰)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ رُوح کا جسم سے تعلق اگر چہ ضعیف ہے، مگر ہے ضرور اور اس تعلق کی وجہ سے جب مردہ کی طرف سے توجہ ہو اور سلام کہنے والا قریب سے سلام کہے تو وہ سنتا ہے۔

(۲) یا یوں کہیے کہ رسول اللہ ﷺ کے مال میں میراث جاری نہ ہوئی اور آپ کی ازواج کے نکاح کی حُرمت کی علت اور اُن کے ساتھ آپ کی حیات جسمانی ہے جو آپ کی موت عرضی کے تلے دیگر افاضہ حس و حرکت سے اس طرح معذور ہو گئی ہے، جیسے چراغ روشن کسی ہنڈیا میں بند ہو کر مکان میں افاضۂ نور سے معطل ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ جیسے ہماری تمہاری حیات جسمانی جس سے جسم پر روح کا قبض و تصرف تھا موت آنے سے اسی طرح زائل ہو جاتی ہے۔ جیسے سایہ کے آنے سے دھوپ۔ آپ کی حیات بھی موت آنے سے زائل ہو جاتی ہے۔ باقی ''جو یہ السلام علیکم یا اَھل القبور سے ایک نوع کے تعلق روح و جسد کا پتہ لگتا ہے جس سے اشتباہِ حیات (کاملہ و مطلقہ صفدرؔ) پیدا ہوتا ہے۔'' تو اس کو اَوّلاً تو ایسا سمجھئے جیسا بوسیلۂ تار برقی بمبئی یا کلکتہ یا لندن کی خبر میرٹھ یا بنارس میں آجائے، ایسے ہی یہاں بھی سمجھئے (کہ سلام کہنے والا گو قبر سے باہر اور مردہ قبر میں ہوتا ہے مگر اس کے سلام کی آواز اور خبر اس کو ہو جاتی ہے۔ صفدرؔ) دوسرے اگر کچھ تعلق ایسا رہا بھی جیسا کسی جلاوطن کو اپنے اصلی وطن کے ساتھ تو گو اتنا تعلق موجب اطلاع بعض احوال متعلقہ جسد اسی طرح ہو جاوے جیسا تعلق خاطر مرد آوارہ بسا اوقات بہ نسبت اور بلاد کے احوال متعلقہ وطن متروک کے زیادہ اطلاع کا باعث ہو جایا کرتا ہے پر اتنی بات سے ''قبض و تصرف نہیں نکلتا جو اشتباہِ حیات'' (مطلقہ و کاملہ۔ صفدرؔ) ہو۔'' (تصفیۃ العقائد ص ۱۳، طبع خواجہ برقی پریس دہلی)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے نزدیک روح کا جسم کے ساتھ ادراک و شعور کی حد تک تعلق رہتا ہے جس سے مُردہ سلام کہنے والوں کا سلام سنتا ہے۔ ہاں! روح کا بدن پر قبض و تصرف نہیں جیسا کہ دنیا میں تھا یا قیامت کے دن ہوگا جس سے حیات کاملہ حاصل ہوتی ہے۔

(۳) لیکن ہر چہ بادا باد بعد موت نہ ارواح شہداء کو ان کے ابدان کے ساتھ تعلق باقی رہتا ہے نہ ارواح اور مؤمنین کو اتنا فرق ہے کہ بمجرد انقطاع علاقہ جسد اوّل یا بعد چندے شہداء کی اَرواح کو تو اور اَبدان کے ساتھ تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور اس حساب سے اُن کو حیات روحانی و جسمانی دونوں حاصل ہو جاتی ہیں اور باقی مؤمنین اُمت کے لئے اس نقصان کی کچھ مکافات نہیں کی جاتی۔ بہر حال ابدان دُنیا سے دونوں کو کچھ تعلق نہیں رہتا۔ پھر اشیاء متعلقہ ابدان دنیوی سے تو تعلق کہاں جو اُن کے اموال و ازواج کو جُوں کے تُوں اُنہیں کے ازواج و اَموال کو سمجھے جائیں اور کسی اور کو نکاح کی اجازت اور وارثوں کو تقسیم و تصرف نہ کرنے دیں۔ کیونکہ اموال و ازواج دنیوی دونوں کو انہیں ابدان کی ضرورت رفع کرنے کے لئے بنایا ہے۔ ازواج سے قضاء حاجت فرج اگر ہوتی ہے تو انہیں ابدان کی حاجت ہے۔ (آب حیات ص ۱۶۸، طبع دہلی)

اس عبارت میں حضرت نے ارواح کے ابدان کے ساتھ ایسے تعلق کا انکار کیا ہے جس سے ابدان کو ایسی

قوت حاصل ہو جس کی وجہ سے وہ دنیوی ازواج واَموال کے محتاج ہوں لیکن حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا معاملہ اس سے الگ مانتے ہیں اور کتاب ''آبِ حیات'' کا موضوع ہی صرف یہ مسئلہ ہے اور دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

''اور اَرواح انبیاء کو بدن کے ساتھ علاقہ بدستور رہتا ہے پَر اطراف وجوانب سے سمٹ آتی ہے اور اس لئے حیات جسمانی کو بہ نسبت سابق اسی طرح قوت ہو جاتی ہے۔ جیسے ظرف مذکور کے رکھ دینے کے بعد چراغ کے شعلہ میں نورانیت بڑھ جاتی ہے۔'' (جمال قاسمی ص ۱۱)

اور عام مؤمنین کے لئے بھی حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ تعلق روح بالجسد مانتے ہیں۔ ہاں! اس طرح کا نہیں جس طرح دنیا کی زندگی میں تھا۔

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: ''اور اس وجہ سے حدیث: لَا نُوْرَثُ کو معارض آیت: یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ اور آیت: لَا تَنْكِحُوْا اَزْوَاجَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ اَبَدًا کو معارض آیت وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا نہیں کہہ سکتے کیونکہ آیت یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ اور آیت وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ کے مصداق وہ ہیں، (یعنی غیر انبیاء۔ صفدرؔ) جن کی ارواح کو ان کے ابدان کے ساتھ'' وہ تعلق نہ رہا جو حالت حیات میں تھا۔'' (جمال قاسمی ص ۱۲)

اور پھر آگے لکھتے ہیں: ''اس لئے یہی کہنا پڑھتا ہے کہ روح کو ایسے لوگوں کی اپنے جسم سے وہ علاقہ نہیں رہتا جو وقتِ حیات تھا۔'' (ایضاً)

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی ان عبارات سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابدان سے ارواح کا فی الجملہ تعلق ہے اور اسی تعلق کی بناء پر مُردے ادراک وشعور رکھتے ہوئے زندوں کا سلام قریب سے سنتے ہیں۔ ہاں! ایسا تعلق ہرگز نہیں ہوتا جیسا کہ زندگی میں تھا جس سے ابدان کو دنیوی ازواج واموال کی حاجت پڑتی تھی۔ بحمد اللہ تعالیٰ خط کشیدہ الفاظ کا مفہوم خود حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی عبارات سے نکل آیا اور مؤلف مذکور کا اعتراض کافور ہو گیا۔ اگر مؤلف مذکور نے تدبر سے کام لیا ہوتا تو ان کو خواہ مخواہ چند ورق سیاہ کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی اور اسی وجہ سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں اور کھاتے رہیں گے ؎

تیری بزم میں اور بھی گل کھلیں گے

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''اور اَرواح انبیاء کو بدن کے ساتھ علاقہ بدستور رہتا ہے مگر اطراف وجوانب سے سمٹ آتی ہیں۔ اس لئے حیات جسمانی کو نسبت سابق سے اسی طرح قوت ہو جاتی ہے جیسے ظرف مذکور کے رکھ دینے کے بعد چراغ کے شعلہ میں نورانیت بڑھ جاتی ہے اور سکتہ میں ایسا ہو جاتا ہے جیسے فرض کرو کہ چراغ ٹمٹمانے لگے اور گل ہونے کو ہو۔ بہرحال اَرواح انبیاء کرام کو بدستور اپنے ابدان کے ساتھ تعلق رہتا ہے، بلکہ کیفیت حیات میں بوجہ اجتماع اور بھی قوت آ جاتی ہے اور مثل چراغ وظلمت ظرف محیط حیات وموت دونوں مجتمع ہو جاتے ہیں۔''

الغرض بقائے حیات انبیاء ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج کو نکاح ثانی کی اجازت نہیں اور اسی وجہ سے ان کے اموال میں میراث کا جاری ہونا مقرر نہیں ہوا اور نیز اس حکم میں عظمتِ انبیاء بھی منظور ہے اور لفظ ترک گو ایک حدیث میں منسوب الی الانبیاء بھی ہے۔ مگر دلائل حیات کے قرینہ سے وہ مشاکلۃً ومجازاً ہے۔ (المصالح العقلیہ حصہ دوم ص ۲۱۲)

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی اس تصریح کے پیش نظر حضرات علماء دیوبند جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات جسمانی اور حیاتِ دنیوی کا لفظ بولیں گے تو اس سے یہی مراد ہوگی کہ آپ کی رُوح کا بدن[1] دنیا سے تعلق ہے نہ یہ کہ تمام احکام میں یہ حیات دنیوی ہے اور اسی طرح علامہ سمہودی رحمہ اللہ اور امام سبکی رحمہ اللہ وغیرہ کی عبارات میں حیات دنیوی اور جسمانی سے بھی یہی مراد ہے اور علامہ سبکی رحمہ اللہ کی عبارت میں یہ بھی گزر چکا ہے کہ کھانے اور پینے وغیرہ تمام اُمور میں وہ حیات دنیوی نہیں بلکہ علم وشعور اور ادراک وسماع میں وہ دنیوی ہے۔ کما مرّ!

اعتراض: قبر میں عودِ روح کی وجہ سے حیات نص قرآنی کے خلاف ہے جو قابل سماعت نہیں اور نص قطعی کے مقابلہ میں ظنی دلیل (حدیث شریف) کا کیا اعتبار ہے؟

علامہ ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''و کذلک قوله تعالیٰ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى افصح بنص القرأن ان ارواح سائر من ذكرنا لا ترجع الى جسده الا الى الاجل المسمى و هو يوم القيمة''

''اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ قبض کر لیتا ہے جانوں کو ان کی نیند کے وقت اور اُن جانوں کو قبض کرتا ہے جو نہیں مرتیں ان کی نیند میں سو روک لیتا ہے ان جانوں کو جن پر وہ موت کا فیصلہ کر چکتا ہے اور دوسری جانوں کو مقررہ وقت تک چھوڑ دیتا ہے تو اس نص قرآنی سے ثابت ہوا ہے کہ وہ تمام اَرواح جن کا ذکر ہم نے کیا ہے قیامت سے پہلے جسم کی طرف نہیں لوٹتے۔'' (الفصل فی الملل والاھواء والنحل ج ۴ ص ۶۷ وکتاب الروح ص ۵۱ وللفظہ لہٗ)

مؤلف نے (ندائے حق ص ۲۲۱) میں نمبر اوّل پر اس آیت کریمہ کو نقل کیا ہے اور پھر حسب عادت بے سوچے سمجھے چند تفسیروں کے حوالے بھی نقل کئے ہیں اور اس کے بعد چار اور غیر متعلق آیتیں اور ان کی تفاسیر نقل کرنے کے بعد آخر میں نتیجہ نکالتے ہیں۔ ''بہر حال قرآنی آیات جمہور صحابہ وتابعین وکثیر من المحققین اسی طرف ہیں کہ اس جسد عنصری کی طرف دوبارہ قیامتِ کُبریٰ سے پہلے رُوح نہیں لوٹتی اور وہ حیات روحانی اور جزائی ہے نہ ابتدائی اور نہ اعادی۔'' (بلفظہٖ ندائے حق ص ۲۲۶)

اور ندائے حق کے مقدمہ باز بزرگ نے بھی آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۳۲)

الجواب: علامہ ابن حزم رحمہ اللہ اور مؤلف مذکور وغیرہ کا اس آیت کریمہ سے حیات فی القبر اور اعادۂ روح کی نفی پر استدلال اور ثانی الذکر کا اس مسلک کو جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہ اللہ اور کثیر من المحققین کی طرف منسوب کرنا قطعاً اور یقیناً باطل اور مردود ہے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین اور جمہور محققین میں سے کوئی ایک شخص بھی حیات فی القبر کا منکر نہیں اور نہ قبر میں اعادۂ روح کا منکر ہے۔ یہ کارروائی ان حضرات کے غلط نظریہ اور سوءِ فہم کا نتیجہ ہے۔

---

[1] حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی حیات دنیویہ کا مطلب بیان کرتے ہیں۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ وہ حیات دُنیا کسی ہے یعنی مع الجسد ہے صرف برزخی روحانی نہیں جو تمام مؤمنین کو بھی حاصل ہے جن کے اجسام مٹی ہو چکے ہیں۔
(حاشیہ ماہنامہ تعلیم القرآن نومبر ودسمبر ۱۹۵۹ء، ص ۳۹)

اَوّلاً: اس لئے کہ اگر اس آیت کریمہ سے حیات فی القبر کی نفی ہوتی تو آنحضرت ﷺ جن پر قرآن کریم نازل ہوا تھا اور جو اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق سے قرآن کریم کے معانی و مطالب زیادہ جانتے تھے یہ ہرگز نہ فرماتے کہ تعاد الروح فی جسدہٖ یعنی قبر میں میت کی طرف روح لوٹائی جاتی ہے اور اس حدیث کی مفصل بحث پہلے گزر چکی ہے۔

ثانیاً: اس لئے کہ اگر اس آیت کریمہ سے حیات فی القبر کی نفی ہوتی تو حضرات محدثین کرام، فقہا عظام متکلمین رحمہم اللہ نیک انجام اور مفسرین ذوالاحترام وغیرہم بزرگان دین کبھی "حیات فی القبر" کے اور اعادۂ روح فی القبر الیٰ جسدہٖ کے قائل نہ ہوتے۔ حالانکہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جیسی بزرگ شخصیتیں بھی اس کی قائل ہیں۔ کما مرّ مفصلاً!

ثالثاً: حافظ ابن القیم رحمہ اللہ جو ابن حزم رحمہ اللہ کے اس استدلال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ: "فامسا کہ سبحانہٗ التی قضی علیھا الموت لاینافی ردھا الٰی جسدھا المیّت فی وقت ما رداعارضًا لا یوجب لہٗ الحیوۃ المعھودۃ فی الدنیا واذا کان النائم روحہ فی جسدہٖ وھو حی وحیاتہٗ غیر حیاۃ المستیقظ فان النوم شقیق الموت فھکذا المیّت اذا اعیدت روحہ الٰی جسدہٖ کانت لہٗ حال متوسطۃ بین الحی و بین المیّت الذی لم ترد روحہ الٰی بدنہٖ کحال النائم المتوسطۃ بین الحی والمیّت فتامل ھذا یزیح عنک اشکالات کثیرۃ" (کتاب الروح ص ۵۳)

"اللہ تعالیٰ کا ان جانوں کو روکنا جن پر وہ موت کا فیصلہ کر چکا ہوتا ہے اس کے منافی نہیں کہ ارواح کو بے جان جسم کی طرف کسی وقت عارضی طور پر ایسے طریقہ پر لوٹا دے جس سے دُنیا کی معہود زندگی ثابت نہ ہو۔ جیسا کہ سونے والا شخص کہ اس کی روح اس کے جسم میں ہوتی ہے اور وہ زندہ ہوتا ہے مگر اس کی حیات بیدار آدمی کی حیات کے غیر ہوتی ہے۔ کیونکہ نیند موت کی بہن ہے۔ اسی طرح مُردہ کا معاملہ ہے کہ جب روح اس کے جسم کی طرف لوٹائی جاتی ہے تو اس کا حال زندہ اور ایسے مُردہ کے حال کے درمیان ہوتا ہے جس کی طرف روح نہ لوٹائی گئی ہو جیسا کہ سونے والے کا حال زندہ اور مُردہ کے درمیان ہوتا ہے۔ اس مثال میں خوب غور کرو اس سے تمہارے بہت سے اشکالات رفع ہو جائیں گے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی مفصل عبارات پہلے عرض کر دی گئی ہیں جن میں "حیات فی القبر" پر تصریح موجود ہے اور اس عبارت میں بھی وہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کو جواب دیتے ہوئے تصریح فرماتے ہیں کہ روحوں کو اجساد میں اس انداز سے لوٹانے سے روک دیا جاتا ہے کہ جس سے وہ بدن میں تدبیر و تصرف کریں اور ایسی معہود زندگی حاصل ہو جیسا کہ دُنیا میں تھی رہا۔ ایسے طریقہ سے روح کا بدن کی طرف عارضی طور پر لوٹانا جس سے دُنیا کی معہود زندگی ثابت نہ ہو۔ قرآنِ کریم کی اس آیت کریمہ کے ہرگز منافی نہیں ہے۔

ورابعاً: دیگر مفسرین کرام رحمہم اللہ بھی تصریح فرماتے ہیں کہ ارواح کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ ارواح ابدان میں تدبیر و تصرف نہیں کرتے۔ مثلاً یہ کہ بدن میں خون کا دورہ ہو سانس چلے۔ کھانا ہضم ہو نبضیں اچھلیں، بدن کا نشو و نما ہو۔ مثلاً بال بڑھیں، ناخن بڑھیں۔ وغیرہ وغیرہ! جیسا کہ دنیا میں یہ کارروائی ہوتی تھی۔

چنانچہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "ای یقبضھا عن الابدان بان یقطع تعلقھا تعلق التصرف فیھا عنا" (روح المعانی ج ۲۴ ص ۷)

''یعنی اللہ تعالیٰ ارواح کو ابدان سے قبض کرتا ہے بایں طور کہ ابدان میں ارواح کے تصرف کا تعلق باقی نہیں رہتا۔''

اس عبارت میں تعلق ''التصرف فیھا عنھا'' کے الفاظ صاف طور پر اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ ارواح کا ابدان میں تصرف نہیں ہوتا اور یہ کارروائی تا قیامت باقی رہتی ہے۔ رہا روح کا جسم سے قبر میں ایسا تعلق جس سے عند القبر سماع ہو اور قبر کی راحت و تکلیف وغیرہ کا ادراک ہو، اس کا علامہ آلوسی رحمہ اللہ واشگاف الفاظ میں اثبات کرتے ہیں۔ کما مرّ! اور حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اور ایک جان جس سے دم چلتا ہے اور نبضیں اُچھلتی ہیں اور کھانا ہضم ہوتا ہے۔ وہ دوسری ہے وہ موت سے پہلے نہیں کھنچتی۔'' (موضح القرآن) اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: پھر اس معطل کرنے کے بعد ''ان جانوں کو تو'' تصرف فی الابدان کی طرف عود کرنے سے روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم فرما چکا ہے اور باقی جانوں کو جو کہ نوم میں معطل ہوگئیں تھیں اور ابھی ان کی موت کا وقت نہیں آیا۔'' ایک میعاد معیّن یعنی مدت عمر تک کے لئے رہا کر دیتا ہے کہ جاگ کر پھر بدستور اَبدان میں تصرف کرنے لگتی ہیں۔'' (بیان القرآن ج ۱۰ ص ۲۳، طبع دہلی)

الغرض اس آیت کریمہ سے حیات فی القبر کی اُس نوع کا رد اور اعادۃ الروح الی الجسد کے اس مفہوم کا ابطال جس کے جمہور مثبت ہیں کسی طرح بھی نہیں ہوتا۔ وہ مفہوم اپنی جگہ پر ایک حقیقت ثابتہ ہے جس میں کوئی شک نہیں۔

وخامساً: زمانہ حال میں جو بزرگ مسئلہ حیات میں بڑی شدت اور غلو سے کام لے رہے ہیں۔ ان کو بھی یہ بات مسلّم ہے کہ آنحضرت ﷺ کو برزخ میں حیات عطاء فرمائی گئی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ روح پر تو موت وارد ہی نہیں ہوتی تا کہ یہ کہا جائے کہ اس کو برزخ میں حیات عطاء فرمائی گئی ہے بلکہ یہ حیات بدن ہی کی ہوگی جو روح کی مشارکت سے ہوگی۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ یہ حیات برزخیہ ہے نہ کہ دنیویہ لیکن اس کو حیات دنیویہ کہنے والا بھی ان کے نزدیک اہل السنت والجماعت سے خارج نہیں ہے۔ ماہنامہ ''تعلیم القرآن'' میں حیات دنیوی اور حیات برزخی کے ایک سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل فتویٰ ملاحظہ ہو۔ ''الجواب واللہ الملھم بالصواب! حضرت نبی کریم خاتم النبیین ﷺ پر وعدۂ الٰہی اِنَّکَ مَیِّتٌ وَاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ کے مطابق حقیقۃً موت واقع ہوئی۔ آپ کی روح اقدس جسد اطہر سے منقطع ہو کر جنت الفردوس میں رفیق اعلیٰ کے ساتھ شامل ہوگئی اور حضرات صحابہ کبار رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے جسدِ اطہر کو واقعی میّت سمجھ کر قبر مبارک میں دفن کیا۔''

''اور اس عالم دنیا سے انتقال کے بعد آنحضرت ﷺ کو عالم برزخ میں مثل شہداء بلکہ شہداء سے بھی اعلیٰ وارفع حیات برزخیہ عطاء فرمائی گئی۔'' وہ حیات دنیویہ نہیں بلکہ اس سے بدرجہا اعلیٰ وارفع اجمل وافضل حیات برزخیہ ہے نہ کہ حیات دنیویہ'' لیکن اگر کوئی اس حیات کو دنیوی کے نام سے تعبیر کرے اور آپ کی حیات برزخیہ سے بھی انکار نہ کرے تو اس کو جماعت اہل السنت سے خارج نہیں کرنا چاہئے۔'' حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور خصوصاً سید الانبیاء ﷺ کو ''بعد الموت سب سے اعلیٰ وارفع اجمل وافضل حیات برزخیہ عطاء فرمائی گئی ہے۔'' یہ جمہور اہل السنت والجماعت کا مسلک ہے۔ اس پر کتاب اللہ احادیث صحیحہ اور ارشادات صحابہ رضی اللہ عنہم شاہد ہیں۔

عنایت اللہ بخاری عفی عنہ مسجد جامع گجرات

اس جواب اور فتویٰ پر پچاس حضرات کے دستخط ہیں اور تصدیق کا عنوان یہ ہے جواب صحیح ہے۔
ان میں سے بعض حضرات کے نام یہ ہیں: (۱) مولانا نصیر الدین صاحب غورغشتوی رحمہ اللہ۔ (۲) مولانا عبدالرحمن صاحب بہبودی رحمہ اللہ۔ (۳) مولانا ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ (انہی، ضلع گجرات) (۴) مولانا غلام اللہ خان صاحب۔ (۵) مولانا محمد طاہر صاحب (پنج پیر) (۶) مولانا قاضی شمس الدین صاحب۔ (۷) مولانا فیض علی شاہ صاحب۔ (۸) مولانا قاضی غلام مصطفیٰ صاحب مرجانوی رحمہ اللہ۔ (۹) مولانا قاضی نور محمد صاحب رحمہ اللہ۔ (۱۰) مولانا محمد امیر صاحب (سرگودھا بلاک نمبر ۱۸) (۱۱) مولانا احمد حسین صاحب سجاد بخاری۔ (۱۲) اور مولانا قاضی عصمت اللہ صاحب وغیرہم۔ (تعلیم القرآن ماہ جنوری ۱۹۶۰ء ص ۳۲)

فتویٰ سے ایک بات تو صراحۃً یہ ثابت ہوئی کہ موت کے بعد برزخ میں حیات کا عطاء ہونا اہل السنت والجماعت کا مسلک ہے اور کتاب اللہ احادیث صحیحہ اور ارشادات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر شاہد ہیں معلوم ہوا کہ ایسی حیات کا برزخ میں عطاء ہونا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ کے ہرگز خلاف نہیں ہے۔ ورنہ یہ حضرات ہرگز اس کو تسلیم نہ کرتے اور دوسری یہ بات ثابت ہوئی کہ برزخ میں اس عطاء شدہ زندگی کو حیات دنیوی سے تعبیر کرنے والا اہل السنت والجماعت سے خارج نہیں ہے۔ کیونکہ اس قائل کی مراد یہ ہوگی کہ روح مبارک کا دنیوی جسم سے تعلق ہے نہ کہ جسم مثالی سے اور ادراک وفہم وشعور میں وہ دنیوی زندگی کی طرح ہے نہ کہ رُوح کے بدن میں تصرف وتدبیر کرنے اور حس وحرکت کے لحاظ سے دنیوی ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی عبارات میں حیات دنیوی سے یہی ثانی شق مراد ہے نہ کہ اوّل۔

چنانچہ ان کی عبارات علی الترتیب یہ ہیں: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قسم کی حیات برزخی حاصل ہے جس کی کیفیت خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے لیکن حیات دنیوی کہنا خلاف اہل السنت والجماعت ہے۔''

''حیاتِ دنیوی ظاہری'' کا تو دنیا میں کوئی بھی قائل نہیں۔ قرآن کریم کی اتنی صریح مخالفت کون مسلمان کرسکتا ہے؟ جو بھی قائل ہیں حیات برزخی کے قائل ہیں۔ (تعلیم القرآن ص ۳۲، ماہ جنوری ۱۹۶۰ء)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے فتویٰ میں تو حیات دنیوی کے ساتھ ظاہری کی قید موجود ہے اور یہی قید حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کے فتویٰ میں بھی ملحوظ رکھنی چاہئے۔

چنانچہ مولانا احمد حسین صاحب سجاد بخاری حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے فتویٰ میں حیات دنیوی کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ شاید یہ حیات دنیوی ظاہری کی طرف اشارہ ہو۔ سجادؔ! (ایضاً حاشیہ)

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیوی ظاہری کہنا اہل السنت کے قول کے خلاف ہے کیونکہ قبر اور برزخ کی زندگی اگر مستمر طور پر دنیوی ظاہری ہو تو پھر موت اور روح کے جسم سے منقطع ہونے کا کیا مطلب ہے اور پھر ایسی دنیوی ظاہری زندگی والے کو دفن کرنے کا اور اس کی وراثت کے تقسیم ہونے کا اور عدت گزر چکنے کے بعد اس کی بیوہ کا کسی سے نکاح جائز ہونے کا کیا مقصد ہے؟ اور یہ کیسے اور کیونکر جائز ہوگیا ہے؟ اور اگر موت کے بعد ایسی ہی دنیوی ظاہری زندگی دوبارہ عطاء ہو تو وہ دوسروں کو محسوس ہونی چاہئے اور دنیوی ظاہری زندگی کے دیگر آثار بھی اس میں ظاہر ہونے چاہئیں۔ حالانکہ عادۃً یہ مشاہدہ کے خلاف ہے۔

حیاتِ حِسّی دُنیوی سے مُراد؟

حیات جسمانی اور دُنیوی کا نظریہ تو بالکل صاف اور بے غبار ہے۔ جیسا کہ آپ نے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ وغیرہ کی عبارت میں ملاحظہ کرلیا ہے۔ البتہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کی عبارت میں حِسّی کا لفظ بھی مذکور ہے۔ یہ لفظ غور طلب ہے، اگر اس سے مراد یہ ہو (اور ہمارے نزدیک یہی مراد متعین ہے) کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو قبر میں جو حیات حاصل ہے وہ خود ان کے حق میں حسّی ہے۔ بایں طور کہ وہ اپنے جسم مبارک کے تمام اعضاء شریفہ میں حیات کے آثار محسوس کرتے ہیں جس طرح کہ دنیا میں ایک تندرست انسان روح کا اثر تمام اعضاء میں محسوس کرتا ہے۔ بخلاف مفلوج اور مشلول کے کہ فالج کی وجہ سے اس کے جو اعضاء ماؤف اور شل ہو جاتے ہیں ان میں وہ حس نہیں پاتا۔

الغرض جس طرح حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو دنیا میں اپنے تمام اعضاء مبارکہ میں حیات کے آثار محسوس ہوتے تھے، اسی طرح قبر میں جو حیات ان کو حاصل ہے، وہ ان کے حق میں حسّی ہے اور اس کے آثار وہ خود محسوس کرتے ہیں۔ گو اہلِ دنیا کو اس کا احساس و شعور نہ ہو سکے اور حِسّی کے اس معنی میں نقلاً و عقلاً کوئی خرابی معلوم نہیں ہوتی۔ جب وہ زندہ ہیں تو لامحالہ زندگی کے آثار ان کو محسوس ہوں گے۔ بخلاف عام مردوں کے کہ ان میں حیات کا اثر صرف اُس جزو سے وابستہ ہوتا ہے جس سے فہم خطاب اور الم و راحت کا ادراک ہو سکے اور یہ مطلب اس لحاظ سے بھی قوی اور صحیح ہے کہ قبر اور برزخ کا معاملہ عالم غیب اور دوسرے جہان سے متعلق ہے۔ اس کا مشاہدہ اور احساس اس جہان والے نہیں کر سکتے۔ لہٰذا حسّی کا یہ معنی نہیں ہوگا کہ اس جہان والے اس حیات اور اس کے آثار کو محسوس کر سکتے ہیں اور اگر اس حیاتِ حِسّی سے مراد یہ ہو کہ اہل دنیا اس کو محسوس کر سکیں تو خرقِ عادت کے طور پر اگر کسی ثقہ سے یہ ثابت ہو تو اس میں بھی شرعاً کوئی استبعاد نہیں۔ کیونکہ خوارقِ عادات کے لئے کوئی ضابطہ نہیں ہوتا اور عام حالات سے وہ ماوراء ہی ہوتے ہیں۔ علامہ آلوسی الحنفی رحمہ اللہ کا حوالہ پہلے عرض کر دیا گیا ہے کہ وہ اہلِ دنیا کے لئے اس کو حِسّی تسلیم نہیں کرتے اور اس تحقیق میں ہم بھی علامہ آلوسی رحمہ اللہ کے ساتھ ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ شیخ عبدالحق رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (اور اسی طرح دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام) کی رُوح مبارک آپ کے جسم اطہر سے ہی قبر شریف میں متعلق ہے اور ملاء اعلیٰ، علیین اور جنت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ روح مبارک کا باوجود جسم اطہر کے ساتھ اعلیٰ اور ارفع تعلق ہونے کے جنت اور علّیین سے بھی بدستور تعلق رہتا ہے جو آپ کی شانِ اقدس کے لائق ہے۔ باقی اس کی کیفیت پروردگار ہی جانتا ہے ہم اس کے مکلف نہیں ہیں۔

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی (اور اسی طرح دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام) کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوح پُرفتوح تو ملاء اعلیٰ علّیین اور جنت میں اس جگہ میں ہے جو آپ کی شایان شان ہے اور آپ کا جسدِ اطہر صحیح و سالم قبر مبارک میں محفوظ و مصئون ہے۔ لیکن بایں ہمہ آپ کی روح مبارک کا آپ کے جسدِ اطہر سے اتصال، تعلق اور علاقہ ہے جس تعلق کی بناء پر آپ کو حیات اور اس کے لوازمات علم وادراک و شعور و اشتغال بالعبادات حاصل ہیں کہ عند القبر اگر کوئی صلوٰۃ و سلام عرض کرے تو آپ بنفسِ نفیس خود سنتے ہیں اور اس کا جواب دیتے ہیں۔ (اس کی بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ ان شاء اللہ!) روح مبارک کا یہ تعلق جسدِ اطہر سے دخولاً ہو جیسے

بعض حضرات کا نظریہ ہے یا اشراقاً و اشرافاً ہو جس طرح کہ بعض دیگر حضرات قائل ہیں (کہ روح مبارک جسم اطہر میں داخل تو نہ ہو لیکن اس کا پَرتو اور عکس جسم اطہر پر اس انداز سے پڑتا ہو کہ آپ کو حیات حاصل ہو) اور اس تعلق کی وجہ سے آپ قبر مبارک کے پاس سلام کہنے والے کا سلام سُن لیتے ہوں اور پھر جواب دیتے ہوں، ایسا نہیں کہ رُوح مبارک کا جسم اطہر سے کوئی تعلق نہ ہو اور عند القبر صلوٰۃ وسلام کا سماع آپ نہ کرتے ہوں۔ باقی اس تعلق کی کیفیت ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہم کیا اور اس کا ادراک وشعور کیا؟ سچ کہا گیا ہے ؎

کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربا

گویا ان حضرات کے نزدیک آپ کی روح مبارک کا تعلق اور علاقہ اُسی بدن سے ہے جو بدن اور جسم دُنیا میں تھا۔ گو دنیوی زندگی کے اکثر لوازمات اور آثار اس پر مرتب نہ ہوں مگر ادراک وشعور اور علم وسماع۔ بہر حال اس میں متحقق ہے۔ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ (جن کی مفصل عبارت گزر چکی ہے) حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ کی عبارات سے یہ مسلک واضح ہوتا ہے کہ آپ کی روح مبارک تو جنت اور اعلیٰ علیین میں ہے اور اسی طرح دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ارواح بھی۔ لیکن مع ہذا ان کا تعلق قبور میں اپنے ابدان سے بھی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وبعد وفاته استقرت فی الرفیق الاعلٰی مع ارواح الانبیاء ومع هذا فلها اشراف علی البدن واشراق وتعلق به بحیث یرد السّلام علی من سلم علیه وبهذا التعلق رأی موسٰی قائما یصلی فی قبره الٰی ان قال کما انه ﷺ فی ارفع مکان فی الرفیق الاعلٰی مستقرا هناک وبدنه فی ضریحه غیر مفقود واذا سلم علیه المسلم رد الله علیه روحه حتّٰی یرد علیه السلام ولم یفارق الملاء الاعلٰی'' (زاد المعاد ج ۲ ص ۴۹)

''اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی رُوح مبارک دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی ارواح کے ساتھ رفیق اعلیٰ میں مستقر ہے لیکن مع ہذا بدن مبارک پر اس کا پرتو اور روشنی پڑتی ہے اور اس کا بدن سے تعلق ہے۔ اس انداز سے کہ آپ سلام کہنے والے کے سلام کا جواب دیتے ہیں اور اسی تعلق کی وجہ سے آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں بحالت قیام نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ (پھر آگے فرمایا کہ) جس طرح کہ آنحضرت ﷺ رفیق اعلیٰ میں بلند مقام پر فائز ہیں اور آپ کا بدن مبارک قبر شریف میں موجود رہتا ہے جب بھی کوئی سلام کہنے والا آپ سے سلام عرض کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کی روح مبارک کو آپ پر لوٹا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ آپ سلام کا جواب دیتے ہیں لیکن آپ کی روح مبارک رفیق الاعلیٰ سے جدا نہیں ہوتی۔''

اور دوسرے مقام پر یوں لکھتے ہیں کہ: ''هذا مع القطع بان روحه الکریمة فی الرفیق الاعلٰی فی اعلٰی علیین مع ارواح الانبیاء وقد صح عنه انه رأی موسٰی قائما یصلی فی قبره لیلة الاسراء ورأه فی السماء السادسة او السابعة فالروح کانت هناک ولها اتصال بالبدن فی القبر واشراف علیه وتعلق به بحیث یصلی فی قبره ویرد سلام من سلّم علیه وهی فی الرفیق الاعلٰی ولا تنافی بین الامرین فان شأن الارواح غیر شأن الابدان'' (کتاب الروح ص ۵۴)

''یعنی یہ بات قطعی ہے کہ آپ کی روح مبارک اعلیٰ علیین کے اندر رفیق اعلیٰ میں دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام

کے ارواح کے ساتھ ہے اور آپ کی یہ حدیث صحیح ہے کہ آپ نے موسیٰ علیہ السلام کو معراج کی رات ان کی قبر میں بحالت قیام نماز پڑھتے دیکھا اور ان کو چھٹے یا ساتویں آسمان پر بھی دیکھا۔ پس روح مبارک تو وہیں ہے لیکن اس کا قبر شریف میں بدن مبارک سے اتصال ہے اور اس پر روح کا پرتو پڑتا ہے اور اس سے تعلق ہے اس انداز سے کہ وہ قبر میں نماز پڑھتے ہیں اور سلام کہنے والے کے سلام کا جواب دیتے ہیں اور رُوح مبارک کا مستقر رفیق اعلیٰ ہی ہے اور ان دونوں باتوں میں کوئی منافات نہیں۔ اس لئے کہ ارواح کا معاملہ ابدان کے معاملہ سے الگ ہے۔''

ان عبارات میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ارواح کا مستقر رفیق اعلیٰ بتلایا گیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ واضح طور پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ان ارواح طیبہ کا قبور میں ابدان مبارکہ سے اتصال اور تعلق قائم ہوتا ہے جس کی وجہ سے قبور مبارکہ پر سلام کہنے والوں کا سلام عن کر جواب دینا ثابت ہے۔

حضرت عثمانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: ''و اما بعد وفاته فروحه المقدسة ﷺ قد استقرت فی الرفیق الاعلیٰ مع ارواح الانبیاء علیہم السلام ولا یتوهم من هذا انکار حیاته فی قبره الشریف فان لروحه ﷺ اشرافاً علی البدن المبارک المطیب و اشرافًا و تعلقا به وبدنه فی ضریحه غیر مفقود و اذا سَلّم علیه المُسلِمُ رد الله علیه روحه حتّٰی یرد علیه السلام کما ورد فی الحدیث و لم یفارق الملاء الاعلیٰ و من کثف ادراکه و غلظت طباعه عن هذا الادراک فلینظر الی الشمس فی علو محلها و تعلقها و تأثیرها فی الارض و حیات البنات والحیوان بها'' (فتح الملہم ج ۳ ص ۴۲۱)

''وفات کے بعد آپ کی روح مبارک دیگر انبیاء علیہم السلام کے ارواح کے ساتھ رفیق اعلیٰ میں مستقر ہے اور اس سے یہ وہم نہ کیا جائے کہ قبر شریف میں آپ کی حیات کا اس سے انکار لازم آتا ہے۔ کیونکہ آپ کی رُوح مبارک کا بدن مبارک پر عکس پرتو اور روشنی پڑتی ہے اور اس کے ساتھ تعلق ہے اور آپ کا بدن مبارک قبر شریف میں موجود رہتا ہے اور جب بھی کوئی سلام کہنے والا آپ سے سلام عرض کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کی روح مبارک کو آپ پر لوٹا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ آپ سلام کا جواب دیتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اور روح مبارک ملاء اعلیٰ سے جدا بھی نہیں ہوتی اور جس شخص کا ادراک کثیف اور اس کی طبیعت اس کے سمجھنے سے منقبض ہو تو اسے سورج کی طرف دیکھنا چاہئے کہ وہ کتنے بلند مقام پر ہے۔ لیکن مع ہذا اس کا تعلق اور تاثیر زمین پر ظاہر ہے اور نباتات وحیوانات کی حیات اور نشوونما اس سے وابستہ ہے۔''

حضرت مولانا عثمانی رحمہ اللہ نے اس عبارت میں سورج کی مثال دے کر یہ اشکال کہ جب روح مبارک علیین میں ہے تو پھر قبر مبارک میں اس کے ساتھ حیات کے کیا معنیٰ؟ رفع کیا ہے کہ سورج باوجود بہت بلند ہونے کے زمین اور اس کے اجزاء پر اثر انداز ہے اور عالم اسباب میں حیوانات ونباتات کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔ اگر زمین پر اس کی حرارت اور روشنی اثر انداز ہو سکتی ہے تو روح مبارک بھی قبر شریف میں جسم اطہر پر اثر انداز ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی بُعد نہیں ہے۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ (اور اسی طرح دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام) کی روح مبارک کا مستقر تو اعلیٰ علیین میں ہے لیکن باوجود اس استقرار کے اس کا تعلق ربط اور اتصال قبر مبارک میں جسد اطہر سے بھی ہے جس سے ایسی حیات آپ کو حاصل ہے کہ آپ ''عند القبر'' سلام کہنے والے کا سلام بنفس نفیس خود سنتے اور

اس کا جواب دیتے ہیں۔ انصاف کی دنیا میں نہ تو اس اتصال اور تعلق کا انکار ہو سکتا ہے اور نہ اس سے بڑھ کر اس کا کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے؟ ثلج صدر کے لئے یہ دلائل بالکل کافی ہیں ۔

حریم دل کا کیا کہنا یہاں جلوے ہی جلوے ہیں بحمد اللہ یہیں وہ ہیں یہیں خلوت نشین میں ہوں

عدم تعلق کا کوئی بھی قائل نہیں رہا

بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تقریباً ۱۳۷۴ھ تک اہل السنت والجماعت کا کوئی فرد کسی بھی فقہی مسلک سے وابستہ دنیا کے کسی خطہ میں اس کا قائل نہیں رہا کہ آنحضرت ﷺ (اور اسی طرح دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام) کی روح مبارک کا جسم اطہر سے قبر شریف میں کوئی تعلق اور اتصال نہیں اور آپ عند القبر صلوٰۃ وسلام کا سماع نہیں فرماتے۔ کسی اسلامی کتاب میں عام اس سے کہ وہ کتاب حدیث وتفسیر کی ہو یا شرح حدیث اور فقہ کی علم کلام کی ہو یا علم تصوف وسلوک کی سیرت کی ہو یا تاریخ کی کہیں صراحت کے ساتھ اس کا ذکر نہیں کہ آپ کی روح مبارک کا جسم اطہر سے کوئی تعلق اور اتصال نہیں اور یہ کہ آپ ''عند القبر'' صلوٰۃ وسلام کا سماع نہیں فرماتے: ''من ادعٰی خلافہ فعلیہ البیان ولا یمکنہ إن شاء اللہ تعالٰی الٰی یوم البعث والجزاء والمیزان'' خدا کرے کہ جو حضرات اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں ان کو محل نزاع اور اپنا مدعا سمجھ آسکے ۔

خدا یا اس مرض کی ہے دوا کیا کہ ہم کیا ہیں ہمارا مدعا کیا!

مؤلف ندائے حق وصاحب تسکین القلوب واقامۃ البرہان ہمارے اس دعویٰ سے خاصے برہم اور سیخ پا ہوئے ہیں۔ (ندائے حق ص ۱۳۳ تا ۱۳۸، وتسکین ص ۹۳ واقامۃ ص ۱۹۲) مگر یقین جانئے کہ باوجود مناظرانہ موشگافیوں کے ایک حوالہ بھی صراحت کے ساتھ اس پر پیش نہیں کر سکے کہ مثلاً آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کا جسد اطہر سے کوئی تعلق نہیں اور یہ کہ آپ عند القبر صلوٰۃ وسلام نہیں سنتے اور مؤلف اقامۃ البرہان نے روح کے بدن پر اشراق سے اور فی الجملہ روح کا تعلق جسم سے تسلیم کر کے ایک گونہ حیات تسلیم کر کے زائر کا صلوٰۃ وسلام سُننا اور اس کا جواب دینا بھی صاف تسلیم کر لیا ہے۔ (ملاحظہ ہو اقامۃ ص ۱۷۹، ۱۹۰، ۱۹۲) اور مؤلف تسکین القلوب کا اس سلسلہ میں حوالہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ صلوٰۃ وسلام کے عند القبر سماع کے قائل ہیں۔

عاجزانہ واویلا

مؤلف ندائے اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔ سبحان اللہ! یہ انوکھا اجماع آپ سے پہلے کسی نے نہیں بتایا اور نہ ہم نے عنا اس غلط اور موضوع حدیث (لعنۃ اللہ علی الکاذبین صفدرؔ) کے بل بوتے پر اتنا ناچ رہے ہیں کہ اجماع بنا دکھایا۔ کیوں جناب! اجماع کا منکر تو کافر ہوتا ہے کیا سماع عند القبر شریف کا منکر بھی کافر ہے۔ اس سے تو ہمیں اس خبر کی تصدیق ہو رہی ہے جو ہم نے سُنی ہے کہ آپ کے حواری منکر سماع کو صاف کافر کہتے ہیں۔ جناب من! آپ کیوں جھجک کر منکرین کے پیچھے نماز پڑھنے کو مکروہ تحریمی فرماتے ہیں۔ صاف کہہ دیجئے کہ کفار ہیں ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ کراہت کا سوال پیدا ہو۔ اگر آپ یوں فتویٰ دیں گے تو ہم بھی کہہ دیں گے جو غیر اللہ کو حاجات میں غائبانہ پکارے دُور سے پکارے یا قبر کے پاس سے پکارے وہ پکا مشرک ہے۔ اس کی ذبیحہ مُردار ہے۔ اس کو اپنی بہن بیٹی کا نکاح نہیں دے سکتے۔ وغیرہ! تو عدمِ سماع کا صریح حوالہ مانگتے ہیں مگر

کیا آپ نے اپنے دعویٰ اجماع کا حوالہ دیا ہے ہم نہیں پوچھ سکتے کہ آپ بسند صحیح یہ دکھاؤ جس میں صحابہ یامن بعدھم نے کہا ہو: ''اجمعنا علی سماع النبی ﷺ عند قبرہ الشریف الذی فیہ جسدہ الطیب المطھر'' یا یہ دکھاؤ کہ صحابی یامن بعدھم نے مجمع عام میں دعویٰ ''سماع النبی ﷺ عند قبرہ الشریف'' کیا ہو تو سارا مجمع خاموش رہا ہو تردید کسی نے نہ کی ہو مثل مشہور ہے اُلٹے بانس بریلی کو لا دلیل علی النافی فی احکام الشرع وانما الدلیل علی المثبت (اصول سرخسی ج ۲ ص ۱۱۷) چلو علیٰ سبیل التنزیل کسی صحابی۔ تابعی۔ تبع تابعین کا قول یا عمل ایسا دکھاؤ جو دال پر سماع ہوا اور جو من گھڑت حدیث آپ کو اُچھال رہی ہے۔ اس پر مکمل بحث ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے مقام پر آ رہی ہے اور موضوع حدیث پر عمل کرنے کا تمغہ من خَدَمِ الشَّیطَان بھی حاصل ہو جائے گا۔ (ندائے حق ص ۱۳۳، ۱۳۴)

الجواب: نیلوی صاحب غصہ تھوک دیجئے اور سراسر لا جواب عاجز اور قاصر ہو کر بلا وجہ پارہ چڑھ جانا بھی کوئی دلیل نہیں اور نہ اس سے کسی بھی صورت کوئی مطمئن ہو سکتا ہے۔ یہ حدیث بالکل صحیح ہے اور اُمت مسلمہ کا اس پر عمل ہے جو بقول آپ کے اس پر عمل کر کے من خدم الشیطان کا تمغہ حاصل کر چکی ہے۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) ہم نے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی باحوالہ عبارات ''تسکین الصدور'' میں درج کی ہیں کہ عند القبور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے سماع میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے (محصلہ) جناب اسی کا نام اجماع ہے۔ آپ کو آپے سے باہر نہیں ہونا چاہئے تھا بلکہ آپ دو چار ٹھوس اور صریح حوالے بتا کر علمی اور تحقیقی خدمت بجالاتے کہ فلاں صحابی یا تابعی یا امام یا محدث یا فقیہ یا متکلم یا بزرگ یوں فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ عند القبر سلام کا سماع نہیں فرماتے یہ آپ کا علمی فریضہ تھا اور اب بھی آپ پر قرض ہے، مرنے سے پہلے آپ اس کو پورا کر جائیں۔ ہمارے حواریوں میں سے اگر آپ جیسے مغلوب الغضب نے تکفیر کی ہو تو ہمیں اس کا علم نہیں ہے اور بفضلہ تعالیٰ ہم مسئلہ تکفیر میں اتنے غیر محتاط بھی نہیں ہیں مگر آپ کی توجہ کی خاطر ہم اپنے ایک پُرانے حواری حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی رحمہ اللہ سے ایک سوال اور اس کے جواب کا کچھ حصہ عرض کئے دیتے ہیں۔

سوال: انسان را بعد موت ادراک وشعور باقی میماند وزائران خود را مے شنود یا نے؟

سوال: کیا انسان کا مرنے کے بعد ادراک وشعور باقی رہتا ہے اور وہ اپنے زیارت کرنے والوں کو پہچانتا اور ان کے سلام وکلام کو سنتا ہے یا نہیں۔

جواب: انسان را بعد موت ادراک باقی میماند برایں معنی شرع شریف وقواعد فلسفی اجماع دارند الی ان قال بالجملہ انکار شعور وادراک اموات اگر کفر نہ باشد در الحاد بودن او شبہ نیست۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۸۸)

جواب: انسان کا مرنے کے بعد ادراک باقی رہتا ہے اس مقصد پر شرع شریف اور قواعد فلسفہ کا اجماع ہے۔ (پھر آگے فرمایا) خلاصہ کلام یہ ہے کہ مُردوں کے شعور وادراک کا انکار اگر کفر نہ ہو تو اس کے الحاد ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔

نیلوی صاحب فرمایئے کہ ہمارے حواری حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے کیا فرمایا ہے؟ ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتے اور فرض کیجئے کہ بعض اجماعی مسائل کا انکار کفر نہ ہو تو ان کا انکار ثواب بھی تو نہیں ہے بلکہ گناہ ہے۔ آپ کیوں اس گناہ پر مصر اور کمر بستہ ہیں؟ اور کیوں مخلوق خدا کو گمراہ کر کے ان کی راہ مارتے ہیں؟ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کا یہ فتویٰ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔

الجواب: یہ کرامات اولیاء اللہ سے ہوتی ہے اور حق ہے کہ کرامت خرق عادات کا نام ہے۔ اس میں تردد کی کوئی بات نہیں اس کا انکار گناہ ہے کہ انکار کرامت کرتا ہے اور کرامت کا حق ہونا مسئلہ اجماعی اہل سنت کا ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم! کتبہ الاحقر رشید احمد گنگوہی عفی عنہ۔ (فتاویٰ رشیدیہ ج ا ص ۲۲)

کچھ سمجھ آئی آپ کو؟ باقی آپ جیسے عقیدہ رکھنے والوں کے پیچھے نماز کے مکروہ ہونے کا فتویٰ دارالعلوم دیوبند اور دیگر بعض جید علماء کرام کا ہے جیسا کہ پہلے باحوالہ یہ بات عرض کی جا چکی ہے اس میں راقم پر دانت پیسنے کا کیا مطلب؟ آپ کا یہ کہنا کہ یا قبر کے پاس سے پکارے، وہ پکا مشرک ہے۔ اس کی ذبیحہ مردار ہے۔ پکارنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اگر پکارنے سے یہ مراد ہے کہ صاحب قبر سے کہے کہ تم میرا کام کر دو تو یہ شرک ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ ج ا ص ۹۹)

اور اگر یہ مراد ہے کہ قبر کے پاس جا کر کہے اے فلاں تم میرے واسطے دُعا کرو کہ حق تعالیٰ میرا کام کر دیوے اس میں اختلاف علماء کا ہے مجوز سماع موتی اس کے جواز کے مقر ہیں اور مانعین سماع منع کرتے ہیں۔ (فتاویٰ رشیدیہ ج ا ص ۹۹)

فرمایئے کہ کیا آپ کے نزدیک سماع موتی کے جملہ قائلین پکے مشرک ہیں؟ اور ان کا ذبیحہ حرام اور مردار ہے؟ اور ان کے نکاح میں جو بیبیاں تھیں اُن سے ان کا نکاح جائز نہیں تھا اور معاذ اللہ تعالیٰ وہ ساری زندگی زنا کرتے رہے۔ نیلوی صاحب ہوش میں آ کر بات کیجئے عاجز اور لاجواب ہو کر یوں جلی کٹی سنانے پر نہ آ جایئے بفضلہ تعالیٰ ہم نے اپنے دعویٰ کا ثبوت دے دیا ہے اور بغیر جناب سید عنایت اللہ صاحب بخاری (جو اس اجماع کے پہلے منکر ہیں) اور ان کے چند حواریوں کے اور کسی نے اس اجماع کے خلاف لب کشائی نہیں کی اور سب اس اجماع پر خاموش رہے اور کسی نے اس کی تردید نہیں کی۔ آپ اور آپ کے چند حواری اس اجماع کا انکار کر کے اور اس کے جواب سے بالکل لاجواب ہو کر اُلٹا ہمیں کوستے ہیں؟ اس کو کہتے ہیں اُلٹا بانس بریلی کو، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ فقہی طور پر مدعی اور مدعا علیہ مثبت اور نافی کا مقام متعین کرنا خاصا نزاعی مسئلہ ہے اور یہ ایک اضافی چیز ہے آپ بھی اس بات کے مدعی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی رُوح مبارک کا جسم مبارک سے قبر اطہر میں کوئی تعلق نہیں اور آپ ﷺ عند القبر صلوٰۃ وسلام وغیرہ نہیں سنتے۔ (العیاذ باللہ) اور آپ پر بھی اس کا واضح اور صریح دلائل سے ثبوت لازم ہے جس سے آپ یقیناً قاصر ہیں اور تا قیامت قاصر رہیں گے۔ ''لا دلیل علی النافی'' کو اپنا سپر بنا کر دلیل قائم کرنے سے راہ فرار اختیار کرنا بالکل بے سود ہے معاف رکھنا! تمام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ اور تبع تابعین، آنحضرت ﷺ کے عند القبر سماع پر متفق تھے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اگر آپ میں ہمت اور جرأت ہے تو ایک حوالہ ہی صریح ثابت کر دیں۔ ''ولا یمکن ذٰلک ان شاء اللہ تعالیٰ'' آپ ضد اور تعصب وتحزب میں آ کر بلا وجہ صحیح حدیث کو جس پر اُمت کا تعامل ہے، من گھڑت قرار دیتے اور اس پر عمل کرنے والوں کو مِنْ خَدَمِ الشَّیْطَان کا جو تمغہ دیتے ہیں۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ! اس کا مزہ آپ مرنے کے بعد چکھیں گے کہ کیا ہے؟

ممکن ہے اہل علم حضرات نفی حیات سے دنیوی حسی حیات ہی مراد لیتے ہوں جس پر ان کے خیال میں کئی مفاسد مرتب ہو سکتے ہیں مگر عوام تو بڑے سطحی ہوتے ہیں، وہ ان حدود وقیود کو کیا سمجھیں؟ ہو سکتا ہے کہ وہ اس اجماعی مسلک کا انکار کر کے اپنی عاقبت ہی برباد کر لیں۔ اس لئے حیات کا انکار خطرہ سے خالی نہیں ہے۔

حضرت سلطان باہو رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''اور جو جاہل کہ بدعت اور گمراہی میں پڑ جاتا ہے اس کی مثال بالکل ابوجہل جیسی ہے کہ اُسے رسول اللہ ﷺ نے کتنا ہی سمجھایا مگر وہ اپنی جہالت سے باز نہ آیا اور یاد رہے کہ جو شخص انبیاء علیہم السلام کو مُردہ جانے اس پر ایمان سلب ہو جانے کا خوف ہے۔''

(کتاب عین الفقر از سلطان باہو رحمہ اللہ ص ۸۲، ناشر اللہ والے کی قومی دوکان کشمیری بازار لاہور)

دوسری دلیل

امام ابوداؤد[۱] رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن عوف[۲] رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے مقری[۳] رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حیوۃ[۴] رحمہ اللہ نے بیان کیا۔ وہ ابوصخر حمید بن زیاد[۵] رحمہ اللہ سے اور وہ یزید بن عبداللہ بن قسیط[۶] رحمہ اللہ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''مامن احد یسلّم علیّ الا ردّ اللّٰہ علیّ روحی حتّٰی ارد علیہ السّلام''

(ابوداؤد ج ۱ ص ۲۷۹، واللفظ لہ ومسند احمد ج ۲ ص ۵۲۷)

---

۱ امام ابوداؤد رحمہ اللہ (المتوفی ۲۷۵ھ) کا نام سلیمان بن الاشعث تھا جو الامام الثبت اور سید الحفاظ تھے۔
(تذکرہ ج ۲ ص ۲۵۲)

۲ امام ابوحاتم رحمہ اللہ ان کو صدوق اور نسائی رحمہ اللہ ثقہ کہتے ہیں امام ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ صاحب حدیث اور اہل حفظ تھے۔ امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ اہل شام کی صحیح اور ضعیف سب حدیثوں کے عالم تھے محدث مسلمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے امام خلال رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ میں امام حافظ اور علم ومعرفت میں مشہور تھے۔
(تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۳، ۳۸۴)

۳ ان کا نام عبداللہ بن یزید رحمہ اللہ تھا، امام ابوحاتم رحمہ اللہ ان کو صدوق اور امام نسائی رحمہ اللہ اور خلیلی رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں علامہ ابن سعد رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور محدث ابن قانع رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۸۴)

۴ حیوہ بن شریح رحمہ اللہ بڑے صاحب کرامات بزرگ اور صحاح ستہ کے مرکزی راوی ہیں۔ امام ابن معین رحمہ اللہ اور یعقوب بن شیبہ رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ محدث ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۷۱)
علامہ ذہبی رحمہ اللہ ان کو الامام القدوۃ اور شیخ الدیار المصریۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۴)

۵ امام بغوی رحمہ اللہ ان کو صالح الحدیث اور امام دارقطنی رحمہ اللہ ثقہ کہتے ہیں۔ محدث ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ امام ابن معین رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ان کو لا باس بہ کہتے ہیں۔ محدث ابن عدی رحمہ اللہ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں۔
(محصلہ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۴۱، ۴۲)

۶ امام ابن معین رحمہ اللہ ان کو لیس بہ باس اور امام نسائی رحمہ اللہ ثقہ کہتے ہیں اور امام ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں امام ابن عدی رحمہ اللہ ان کو مشہور اور صالح الروایات کہتے ہیں۔ محدث ابراہیم بن سعد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ فقیہ اور ثقہ تھے علامہ ابن سعد رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ امام ابن معین رحمہ اللہ ان کو صالح کہتے ہیں۔ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ ان کو ثقہ من الثقات کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۴۲، ۳۴۳)

''کوئی شخص ایسا نہیں جو مجھ پر سلام کہتا ہو، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کا جواب دیتا ہوں۔''

امام سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس روایت پر اعتماد کیا ہے۔ (شفاء السقام ص ۱۰۵) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: رواتہ ثقات، (فتح الباری پ ۳ ص ۳۷۹) کہ اس کے راوی ثقہ ہیں اور علامہ عزیزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اسنادہٗ حسن (السراج المنیر ج ۳ ص ۲۷۹) کہ اس کی سند حسن ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صححه النووی فی الاذکار (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۱۴) کہ امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی اپنی کتاب الاذکار میں تصحیح کرتے ہیں اور امام نووی رحمہ اللہ (کتاب الاذکار ص ۱۰۶) طبع مصر میں لکھتے ہیں: بالاسناد الصحیح کہ یہ حدیث صحیح اسناد سے مروی ہے۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''واتفق الائمة علی انه یسلّم عند زیارته و علی صاحبیه لما فی السنن عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه قال مامن رجل یسلم علیّ الّا رد الله تعالٰی علیّ روحی حتّٰی ارد علیه السّلام وهو حدیث جیّد'' (فتاویٰ ج ۴ ص ۳۶۱)

''حضرات آئمہ کرام رحمہم اللہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی (قبور کی) زیارت کے وقت سلام کہنا چاہئے۔ کیونکہ سنن ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر کوئی شخص بھی سلام نہیں کہتا۔ مگر اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح (توجہ) لوٹا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔''

اور علامہ زرقانی رحمہ اللہ اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''باسناد صحیح''

(زرقانی شرح المواہب ج ۸ ص ۳۰۸)

اور نواب صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''قال النووی فی الاذکار اسناده صحیح و قال ابن حجر رواته ثقات'' (دلیل الطالب ص ۸۴۳)

''امام نووی رحمہ اللہ ''کتاب الاذکار'' میں لکھتے ہیں کہ اس کی اسناد صحیح ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔''

علامہ سمہودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''روی ابو داؤد بسند صحیح'' (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۰۳)

''کہ امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے۔''

مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ اور علامہ عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''رواته ثقات''

(عقیدۃ الاسلام ص ۵۲، وفتح الملہم ج ۱ ص ۳۳۰)

امام سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''رواه احمد و ابو داؤد والطبرانی و البیهقی باسناد حسن بل صححه النووی فی کتاب الاذکار وغیره وفیه نظر وقال شیخنا رواته ثقات'' (القول البدیع ص ۱۱۷)

''اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ، ابوداؤد رحمہ اللہ، طبرانی اور بیہقی رحمہ اللہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے بلکہ امام نووی رحمہ اللہ نے کتاب الاذکار وغیرہ میں اس کی تصحیح کی ہے اور اس میں کلام ہے اور ہمارے اُستاد (حافظ ابن حجر رحمہ اللہ) فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے جملہ راوی ثقہ ہیں۔''

علامہ محمد بن محمد الحانجی البوسنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''قال النووی فی الاذکار و ریاض الصالحین اسنادہ صحیح و صححہ ایضاً ابن القیم'' (ہامش حیات الانبیاء بیہقی رحمہ اللہ ص ۶ قلمی)

''امام نووی رحمہ اللہ نے ''کتاب الاذکار'' اور (ریاض الصالحین ص ۴۹۲، طبع مصر) میں فرمایا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔''

اُصول حدیث کی رُو سے یہ روایت بالکل حسن اور صحیح ہے اور اس کے جملہ راوی ثقہ ہیں۔ جیسا کہ آپ باحوالہ پڑھ چکے ہیں اور محدثین کرام رحمہ اللہ کی خاصی جماعت اس کی تصحیح و تحسین کرتی ہے۔

اعتراض: امام سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں و فیہ نظر کہ اس میں کلام ہے اور اس کی تشریح یوں کی ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یزید بن عبداللہ بن قسیط رحمہ اللہ لیس بذاک اور تقی الدین ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''کانہ لم یدرک اباھریرۃ رضی اللہ عنہ وھو ضعیف وفی سماعہ منہ نظر''

''گویا کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں کی اور وہ ضعیف ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان کے سماع میں کلام ہے۔''

انہی قرائن کی وجہ سے وہ فرماتے ہیں کہ: ''وھو یمنع من الجزم بصحتہ'' (القول البدیع ص ۱۱۷ ملخصاً)

''اور یہ چیز اس حدیث کے جزم بالصحۃ سے منع کرتی ہے۔''

الجواب: یزید بن عبداللہ بن قسیط رحمہ اللہ بخاری و مسلم اور دیگر صحاح ستہ کے راوی ہیں اور جمہور محدثین ان کی توثیق کرتے ہیں۔ امام ابوحاتم رحمہ اللہ نے ان کو اس لئے لیس بالقوی کہا تھا کہ امام مالک رحمہ اللہ ان پر راضی نہ تھے لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے ابوحاتم رحمہ اللہ کا رد کیا ہے۔

اور پھر آخر میں لکھتے ہیں کہ: ''و یزید قد احتج بہ مالک فی مواضع من المؤطا و ھو ثقۃ من الثقات'' (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۴۳)

امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں کئی مقامات پر ان سے احتجاج کیا ہے اور وہ ثقہ راویوں میں سے ایک تھے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''روی عن ابن عمر رضی اللہ عنہ و ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ'' کہ انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ علامہ ابن سعد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کی وفات ۱۲۲ھ میں ہوئی اور ابن حسان الزیادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ۹۰ سال کی عمر پائی تھی۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۳۴۲) اس لحاظ سے ان کی ولادت ۳۲ھ میں قرار پاتی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۵۸ھ کو ہوئی تھی۔ درمیان میں چھبیس (۲۶) سال کا طویل زمانہ ہے اور جمہور محدثین کرام رحمہ اللہ کے اُصول کے مطابق امکانِ لقاء کا کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔ الغرض اعتراض کی ایک ایک شق باطل ہے اور یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ امام سخاوی رحمہ اللہ فیہ نظر سے جو کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس حدیث کو جزماً صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا جو اختلاف ہے وہ محدثانہ نقطۂ نظر سے لفظ صحت کے اطلاق میں ہے۔ اس کے حسن ہونے میں تو ان کو بھی کوئی اختلاف نہیں ہے اور جمہور محدثین استدلال و احتجاج کے لئے حدیث میں صحت ہی کی قید کو ملحوظ نہیں رکھتے بلکہ ان کے نزدیک حدیث حسن بھی قابلِ استدلال ہوتی ہے۔ چنانچہ قاضی شوکانی رحمہ اللہ اور نواب صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ (وغیرہ) نے اس کی تصریح کی ہے۔ (نیل الاوطار ج ۱ ص ۲۲، ومسک الختام ج ۱ ص ۱۴)

مطلب حدیث

اس صحیح اور حسن حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ سلام کہنے والے کا جواب دینے کے لئے آنحضرت ﷺ کے جسدِ اطہر کی طرف روح مبارک لوٹائی جاتی ہے اور اس رَدِّ سلام میں آپ کی روح مبارک کا جسم اطہر سے اتصال اور تعلق ہوتا ہے۔ اگر سلام بھیجنے والا دُور سے بھیجے تو بواسطۂ ملائکہ یہ آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔ جیسا کہ إن شاء اللہ تعالیٰ عنقریب بیان ہوگا اور اگر سلام کہنے والا عند القبر سلام کہے تو آپ بلا واسطہ خود بنفسِ نفیس سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔ بحث اپنے مقام پر آرہی ہے۔ إن شاء اللہ! امام موفق الدین ابن قدامہ الحنبلی رحمہ اللہ (المتوفی ۶۲۰ھ) نے اسی روایت میں یسلّم کے جملہ کے بعد عند قبری کے الفاظ بھی نقل کئے ہیں۔ (مغنی ج ۳ ص ۵۸۸)

اور علامہ ابن عبد الہادی رحمہ اللہ نے بھی امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کے حوالہ سے امام احمد رحمہ اللہ کی روایت میں عند قبری کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ (الصارم المنکی ص ۱۵۶) اور جس روایت میں عندی قبری کے الفاظ موجود نہیں ہیں، ان سے مراد بھی عند قبری ہے۔ (الصارم ص ۹۵)

اس صحیح حدیث سے بھی آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک میں حیات ثابت ہے اور حیات بھی ایسی کہ روح مبارک جسد اطہر کی طرف لوٹائی جاتی ہے اور روح مبارک کا جسد اطہر سے اتصال تعلق اور رابطہ قائم ہوتا ہے۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''اس حیات میں شبہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ مراد یہ ہے کہ میری رُوح جو ملکوت و جبروت میں مستغرق تھی جس طرح کہ دُنیا میں نزولِ وحی کے وقت کیفیت ہوتی تھی۔ اس سے افاقہ ہو کر سلام کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ اس کو رَدِّ رُوح سے تعبیر فرمایا: کذا فی اللمعات'' (نشر الطیب ص ۲۱۱، ۲۱۲)

غرض یہ کہ یہ روایت اور اسی طرح کئی دیگر احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی رُوح مبارک آپ کی طرف لوٹائی گئی (اور لوٹائی) جاتی ہے۔

چنانچہ علامہ زین الدین ابوبکر المراغی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۱۶ھ) لکھتے ہیں کہ: ''اعلم ان کتب السنة متضمنة الاحادیث الدالة علی ان روح النبی ﷺ ترد علیه وانه یسمع ویرد علیهم'' (تحقیق النصرۃ ص ۱۱۶، طبع مصر)

''کتب حدیث ایسی روایات پر مشتمل ہیں جو اس اَمر پر دلالت کرتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ پر آپ کی روح مبارک لوٹائی جاتی ہے اور آپ خود سلام سنتے اور سلام کہنے والوں کے سلام کا جواب دیتے ہیں۔''

حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ اس حدیث شریف کی طویل بحث کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں: ''اس صورت میں حاصل معنی حدیث شریف کے یہ ہوں گے کہ جب کوئی رسول اللہ ﷺ پر سلام بھیجتا ہے تو خداوندِ کریم آپ کی رُوح پُرفتوح کو اس حالت استغراق فی ذات اللہ تعالیٰ وتجلیات اللہ سے جو بوجہ محبوبیّت و محبیت تامہ آپ کو حاصل رہتی ہے، اپنے ہوش عطاء فرما دیتا ہے۔ یعنی مبدأ انکشاف نبوی ﷺ کو جو انبساط الی اللہ حاصل تھا، مُبدل بانقباض ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے ارتداد علی النفس حاصل ہوتا ہے اور اپنی ذات وصفات اور کیفیات اور واقعات متعلقہ ذات وصفات سے اطلاع حاصل ہو جاتی ہے۔ سو چونکہ سلام اُمتیاں بھی منجملہ وقائع متعلقہ ذات خود ہیں۔ اس لئے اُس سے مطلع ہو کر بوجہ حسن اخلاق ذاتی جواب سے مشرف فرماتے ہیں۔'' (آب حیات ص ۱۷۵)

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ اسی حدیث کی تفسیر کرتے ہوئے ایک معترض کا جواب

دیتے ہوئے طویل بحث میں یہ بھی لکھتے ہیں: ''اگر لفظ اِلَیَّ روحی فرمایا گیا ہوتا تو آپ کا شبہ وارد ہو سکتا ہے۔ الی اور علی کے فرق سے آپ نے ذہول فرمایا علیٰ استعلاء کے لئے ہے اور الیٰ نہایت طرف کے لئے ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ وسلام سے پہلے روح کا استعلاء نہ تھا نہ یہ کہ وہ جسمِ اطہر سے بالکل خارج ہو گئی تھی اور اب اس کو جسمِ اطہر کی طرف لوٹایا گیا ہے۔'' (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ ص ۲۲۷، ۲۲۸)

اور نیز تحریر فرماتے ہیں کہ حاضری روضہ مبارک کے وقت میں آنحضرت ﷺ کی روح پر فتوح کو وہاں جلوہ افروز سننے والی جاننے والی غایت جمال وجلال کے ساتھ تصور کرتے ہوئے شہنشاہ عالم کے دربار کی حاضری خیال کی جاوے اور جملہ طرق ادب کا لحاظ رکھا جائے۔ (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ ص ۳۱۲)

اور نیز فرماتے ہیں کہ: ''آپ کی حیات نہ صرف روحانی ہے جو کہ عام مؤمنین وشہداء کو حاصل ہے بلکہ جسمانی بھی ہے اور از قبیل حیات دنیوی بلکہ بہت سی وجوہ سے اس سے قوی تر ہے۔ آپ سے توسّل نہ صرف وجود ظاہری کے زمانہ میں کیا جاتا تھا بلکہ اس برزخی وجود میں بھی کیا جانا چاہئے۔ محبوب حقیقی تک وصال اور اس کی رضاء صرف آپ ہی کے ذریعہ اور وسیلہ سے ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے میرے نزدیک یہی ہے کہ حج کے پہلے مدینہ منورہ جانا چاہئے اور آپ کے توسّل سے نعمت قبولیت حج وعمرہ کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے۔'' (مکتوبات ج ۱ ص ۱۲۰)

اور حضرت مولانا منظور صاحب نعمانی۔ حدیث مامن احد یسلّم علیَ الا ردّ اللہ علیَ روحی (الحدیث) کی تشریح کرتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں۔ ''علاوہ ازیں انبیاء علیہم السلام کا اپنی قبور میں زندہ ہونا ایک مسلّم حقیقت ہے۔ اگرچہ اس حیات کی نوعیت کے بارے میں علماء اُمت کی رائیں مختلف ہیں۔ لیکن اتنی سی بات سب کے نزدیک مسلّم اور دلائل شرعیہ سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور خاص کر سید الانبیاء ﷺ کو اپنی قبور میں حیات حاصل ہے۔ اس لئے حدیث کا یہ مطلب کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ آپ کا جسدِ اطہر روح سے خالی رہتا ہے اور جب کوئی سلام عرض کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ جواب دلوانے کے لئے اس میں روح ڈال دیتا ہے۔ اس بناء پر اکثر شارحین نے ردّ ِروح کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قبر مبارک میں آپ کی روحِ پاک کی تمام تر توجہ دوسرے عالم کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی جمالی وجلالی تجلّیات کے مشاہدہ میں مصروف رہتی ہے اور یہ بات بالکل قرین قیاس ہے۔ پھر جب کوئی اُمتی سلام عرض کرتا ہے اور وہ فرشتہ کے ذریعہ یا براہِ راست آپ تک پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے آپ کی روح اس طرف بھی متوجہ ہوتی ہے اور آپ سلام کا جواب دیتے ہیں۔ بس اس روحانی توجہ والتفات کو ردِّ روح سے تعبیر فرمایا گیا۔'' (معارف الحدیث ج ۵ ص ۳۷۸)

اشکال: ہر سلام کرنے والے کے سلام کے موقع پر عود روح کے سلسلہ میں علمی طور پر خاصا اشکال وارد ہوتا ہے کہ بار بار نزع روح اور عود روح تو اچھا بھلا سوہانِ روح ہے جو سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس لئے ایسی حدیث سے حیات کا مسئلہ کیونکر حل ہو سکتا ہے؟

چنانچہ یہ اشکال اور اس کا جواب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یوں لکھتے ہیں کہ: ''وجہ الاشکال فیہ ان ظاهرہ ان عود الروح الی الجسد یقتضی انفصالها عنه وهو الموت وقد اجاب العلماء عن ذٰلک باجوبة احدها ان المراد بقوله ردّ اللہ علیَ روحی انّ ردّ روحه کانت سابقة عقب دفنه لا انها تعاد ثم تنزع ثم تعاد الثانی سلّمنا لٰکن لیس هو نزع موت بل لا مشقة فیه الثالث ان المراد بالروح الملک المؤکل بذٰلک الرابع المراد بالروح النطق فتجوّز فیه من جهة خطابنا بما نفهم الخامس انه یستغرق فی أمور الملأ الاعلیٰ فاذا اسلم علیه

رجع الیه فهمه لیجیب من سلّم علیه و قد اشکل ذٰلک من جهة أخرىٰ و هو انه یستلزم استغراق الزمان کله فی ذٰلک لا تصال الصلوٰة و السلام علیه فی اقطار الارض ممّن لا یحصی کثرة و أجیب بانّ أمور الاخرة لاتدرک بالعقل و احوال البرزخ اشبهه باحوال الأخرة واللّٰه اعلم" (فتح الباری ج۶ ص ۳۵۲ طبع مصر)

"اس میں اشکال کی وجہ یہ ہے کہ رُوح کا جسم کی طرف عود اس کو چاہتا ہے کہ پہلے روح جسم سے الگ ہو اور یہی موت ہے۔ (حالانکہ آپ قبر مبارک میں مستمر طور پر زندہ ہیں۔ کما مرّ!) اور علماء نے اس کے کئی جوابات دیئے ہیں:

۱...... ایک یہ کہ آپ کے دفن کے بعد ہی آپ کی رُوح مبارک آپ کی طرف اللہ تعالیٰ نے لوٹا دی ہے۔ یہ نہیں کہ لوٹائی جاتی ہے پھر نکالی جاتی ہے اور پھر لوٹائی جاتی ہے۔

۲...... دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ ایسا ہی ہے لیکن یہ نزع موت کا سا نہیں بلکہ اس میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

۳...... تیسرا جواب یہ ہے کہ رُوح سے مراد وہ فرشتہ ہے جس کے سپرد یہ (درود شریف پہنچانے کا) کام ہوتا ہے۔

۴...... چوتھا جواب یہ ہے کہ رُوح سے مراد مجازی طور پر نُطق ہے، اس کو اس طریقہ پر اس لئے تعبیر کیا تاکہ ہم سمجھ سکیں۔

۵...... پانچواں جواب یہ ہے کہ آپ ملاء اعلیٰ کے معاملات میں مستغرق رہتے ہیں۔ سو جب بھی کوئی شخص سلام کہتا ہے آپ کی توجہ اور فہم آپ کی طرف لوٹ آتا ہے تاکہ آپ سلام کہنے والے کے سلام کا جواب دے سکیں۔

اور اس حدیث میں ایک اور وجہ سے بھی اشکال وارد ہوا ہے وہ یہ کہ اس سے لازم آتا ہے کہ آپ کا سارا وقت ہی سلام کے جواب لوٹانے میں صرف ہو جائے۔ کیونکہ زمین کے بیشتر اطراف سے صلوٰة وسلام اس کثرت سے پہنچتا ہے جو احصاء وشمار سے باہر ہے اور اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ آخرت کے معاملات عقل سے نہیں پہچانے جاسکتے اور برزخ کے معاملات احوال آخرت سے مشابہ ہیں۔ واللہ اعلم!

حضرت مولانا عثمانی رحمہ اللہ نے فتح الباری کی یہ مکمل عبارت (فتح الملہم ج۱ ص ۳۳۰) میں نقل کی ہے۔

اور علّامہ السخاوی رحمہ اللہ نے متعدد جوابات نقل کئے ہیں۔ ایک یہ ہے: "و اجاب البیهقی رحمہ اللہ بما حاصله ان المعنے الا و قد رد اللّٰه علیّ روحی یعنی ان النبی ﷺ عقب ما دفن رد اللّٰه علیه روحه لاجل سلام من یسلّم علیه استمرت فی جسده ﷺ لا انها تعاد ثم تنزع ثم تعاد"

"اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے جو جواب دیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر دفن کے بعد آپ کی رُوح مبارک آپ کی طرف لوٹا دی ہے تاکہ آپ سلام کہنے والوں کے سلام کا جواب دیں اور پھر وہ روح آپ کے جسدِ اطہر میں مستمر ہے نہ یہ کہ لوٹائی جاتی ہے، پھر نکالی جاتی ہے اور پھر لوٹائی جاتی ہے۔"

اور دوسرا جواب یہ نقل کیا ہے: "قال الفاکهانی رحمہ اللہ وغیره ان نقول المراد بالروح النطق مجازاً فکانه ﷺ قال الا رد اللّٰه الیّ فطقی و هو ﷺ حی علی الدوام لٰکن لا یلزم من حیاته النطق فاللّٰه سبحانه و تعالیٰ یرد علیه النطق عند سلام کل مسلّم علیه"

"امام فاکہانی رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ روح سے مجازاً نطق مراد ہے۔ پس گویا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری طرف میرا نطق لوٹا دیتا ہے اور آنحضرت ﷺ اگرچہ دوامی طور پر زندہ ہیں لیکن حیات سے نطق لازم نہیں آتا۔ سو اللہ تعالیٰ ہر سلام کہنے والے کے سلام کے وقت نطق کی طاقت آپ کو عطاء کر دیتا ہے۔"

اور ایک جواب یہ نقل کیا ہے: ”واجاب السبکی الکبیر بجواب اخر حسن جدًا فقال یحتمل ان یکون ردا معنویا و ان تکون روحه الشریفة مشتغلة بشهود الحضرة الالٰهیة و الملاء الاعلٰی عن هذا العالم فاذا سلّم علیه اقبلت روحه الشریفة علٰی هذا العالم لیدرک سلام من یسلم علیه و یرد علیه“

”اور علامہ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ نے ایک اور جواب دیا ہے جو بہت عمدہ ہے وہ یہ کہ انہوں نے فرمایا کہ روح کے رد سے رد معنوی مراد ہے۔ بایں طور کہ آنحضرت ﷺ کی روح مبارک اس جہان سے بے نیاز ہو کر درگاہِ الٰہی اور ملاء اعلیٰ میں مشغول ہوتی ہے۔ سو جب بھی کوئی شخص آپ پر سلام کہتا ہے تو آپ کی رُوح مبارک اس جہان کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے تاکہ سلام کہنے والے کے سلام کا ادراک کر کے اس کا جواب دے سکے۔“ (القول البدیع ص ۱۲۷)

علامہ سبکی رحمہ اللہ نے (شفاء السقام ص ۳۸) میں یہ بات بیان کی ہے اور حافظ ابن الملقن رحمہ اللہ (المتوفی ۸۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ: ”المراد برد الروح النطق لانه ﷺ حی فی قبره و روحه لا تفارقه لما صح ان الانبیاء احیاء فی قبورهم“ (تحفۃ الذاکرین ص ۲۸، للشوکانی رحمہ اللہ و دلیل الطالب ص ۸۴۳، لنواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ)

”ردِّ روح سے مراد نطق ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور آپ کی رُوح مبارک آپ سے جدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ صحیح روایت میں آتا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔“

اور علامہ عزیزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ”الا رَدَّ الله علیَّ روحی ای رد علیَّ نطقی لانه حی دائما و روحه لا تفارقه لان الانبیاء و احیاء فی قبورهم“ (السراج المنیر ج ۳ ص ۲۷۸)

”رَدِّ رُوح سے مراد نطق ہے کیونکہ آپ دوامی طور پر زندہ ہیں۔ آپ کی رُوح مبارک آپ سے الگ نہیں ہوتی، کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔“

حضرت امام سیوطی رحمہ اللہ نے ”الا رد الله علیَّ روحی“ کے اشکال مذکور کے پندرہ (۱۵) جوابات دیئے ہیں جو اُن کی کتاب ”انباء الاذکیاء“ میں موجود ہیں ایک جواب یہ ہے: ”ان قوله رد الله جملة حالیة و قاعدة العربیة ان جملة الحال اذا وقعت فعلا ماضیا قدرت فیها قد کقوله تعالٰی جاؤکم حصرت صدورهم ای قد حصرت و کذا هنا تقدر و الجملة ماضیة سابقة علی السلام الواقع من کل احد و حتّٰی لیست لتعلیل بل مجرد حرف عطف بمعنی الواؤ فصار تقدیر الحدیث ما من احد یسلّم علیَّ الا قد رد الله علیَّ روحی قبل ذٰلک وارد علیه“ (انباء الاذکیاء ص ۱۰)

”کہ رد اللہ کا جملہ حال ہے اور عربی کا قاعدہ یہ ہے کہ حال جب فعل ماضی ہو تو اس میں حرف قد مقدر ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول: ”جَاؤُکُمْ حَصِرَتْ صدورهم“ میں حرف قد مقدر ہے اور گویا عبارت یوں ہے: ”قد حصرت“ اور اسی طرح اس مقام پر بھی حرف قد مقدر ہے اور یہ جملہ ہر سلام کہنے والے کے سلام سے بہر حال پہلے اور ماضی میں ہے اور حرف حتیٰ تعلیل کے لئے نہیں بلکہ محض حرف عطف ہے جو بمعنی واؤ کے ہے اور معنی حدیث یوں ہے کہ کوئی شخص مجھ پر سلام نہیں کہتا۔ مگر اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر میری روح اس سے پہلے ہی لوٹا دی ہوتی ہے اور میں اس کے سلام کا جواب لوٹاتا ہوں۔“

علامہ احمد بن محمد الخفاجی المصری الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۶۹ھ) اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

''وفیه دلیل علی انه ﷺ حی حیاة مستمرة لان الکون لا یخلو من مسَلِم یسلّم علیه فی کل لحظة وقد ثبت بالاحادیث الصحیحة انه ﷺ و سائر الانبیاء احیاء حیاة حقیقةً کالشهداء و ان کان حال البرزخ لا یقاس علی حال الدنیا'' (نسیم الریاض ج ۳ ص ۴۹۹، طبع مصر)

''اس حدیث میں اس اَمر کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ دوامی طور پر زندہ ہیں۔ کیونکہ کوئی علاقہ آنحضرت ﷺ پر ہر لحظہ سلام کہنے والوں سے خالی نہیں اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ اور اسی طرح باقی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام شہداء کی طرح حقیقی طور پر زندہ ہیں۔ اگرچہ برزخ کی حالت کو دُنیا کی حالت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔''

یعنی اگر کسی شخص کو یہ زندگی سمجھ نہیں آسکتی اور وہ اس کو محسوس نہیں کرسکتا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ زندگی ہی ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ برزخ کا معاملہ دُنیا کے معاملہ سے الگ ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ ''مامن احد یسلم علیّ'' کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''فظاهر عقد الباب یدل علی ان المراد بالسّلام علیه السّلام عند القبر وقت حضوره للزیارة ''اِلا رد اللّٰه علیّ روحی'' قال ابن حجر ای نُطقی ''حتی ارد علیه السّلام'' ای اقول و علیک السّلام قال القاضی لعل معناه ان روحه المقدسة فی شان ما فی الحضرة الالٰهیة فاذا بلغه سلام احد من الامة رد اللّٰه تعالٰی روحه المطهرة من تلک الحالة الٰی رد من سلم علیه'' (بذل المجهود ج ۳ ص ۲۰۷)

''بظاہر باب کا یوں قائم کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے زیارت کے وقت قبر کے پاس سلام کہنا مراد ہے الّا رد اللّٰه علیّ روحی کا معنی حافظ ابن حجر یہ رحمہ اللہ کرتے ہیں کہ مجھے قوت گویائی دی جاتی ہے اور حتّٰی ارد علیه السّلام کا معنی یہ ہے کہ میں کہوں گا: ''وعلیک السلام'' قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شاید اس کا معنٰی یہ ہو کہ آپ کی روح مقدس اللہ تعالیٰ کے جلال اور مشاہدہ کے نظارہ میں مشغول ہوتی ہے۔ پس جب آپ کو اُمت میں سے کسی کا سلام پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کی روح مبارک کو اس طرف سے سلام کہنے والے کے سلام کے جواب دینے کی طرف لوٹا دیتا ہے۔''

ایک شبہ: ممکن ہے کسی صاحب کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی قبر میں حیات سے مُراد روحانی حیات ہو۔ یعنی روح کی حیات اور اسی طرح ردّ سلام بھی صرف روح کی وساطت سے ہو، اس لئے الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلون کی حدیث اور من صلّی علیّ عند قبری جسمانی حیات پر دال نہیں ہیں اور محل نزاع تو یہ حیات ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''ولعل المراد بحدیث الانبیاء احیاً في قبورهم یصلون انهم ابقوا علی هذا الحالة ولم تسلب عنهم فلا یرد ان الروح بنفسه یستطیع الصلوة ورد السلام فکیف وجه في الحدیث بقاء الحیوة بفعل الصلوٰة و کذا رد السلام برد الروح واللّٰه اعلم بهذه الحقائق'' (تحیۃ الاسلام ص ۳۶)

''اور شاید یہ کہ: ''الانبیاء احیاء في قبورهم یصلون'' کی حدیث سے مراد یہ ہو کہ وہ اسی (دنیوی) حالت پر باقی رکھے گئے ہیں اور یہ حالت ان سے سلب نہیں کی گئی۔ پس یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ روح خود بھی تو

نماز پڑھنے اور سلام کا جواب دینے پر قادر ہے۔ سو حدیث میں نماز کی ادائیگی اور اسی طرح ردسلام کے لئے زندگی کو رد روح کے ساتھ کیوں وابستہ کیا گیا ہے؟ اور ان حقائق کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ نماز کا پڑھنا اور سلام کا سننا اور جواب دینا عقلی طور پر روح سے بھی متحقق ہو سکتا ہے۔ مگر الانبیاء احیاء في قبورهم يصلون اور ردسلام کی حدیثوں سے روح کی نماز اور روح کا ردسلام مراد نہیں بلکہ وہ حیات مراد ہے جو دنیا میں تھی جس میں جسم و روح دونوں کا تعلق تھا اور یہی حالت قبر میں بھی ہے۔

اور پھر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ: ''والاحاديث ارادت افعال الحياة واعمالها لابقاء الروح وهو قوله فنبي الله حي يرزق وحياء في قبورهم يصلون تسرد في ذكر الحياة افعالها لا اصلها او اراد مع الاجساد فان اجسادهم حرمت على الارض'' (تحیۃ الاسلام ص ۳۶)

اور یہ احادیث بتلاتی ہیں کہ حیات سے ایسی حیات مراد ہے جس سے زندگی کے افعال و اعمال صادر ہوں صرف بقاء روح ہی مراد نہیں ہے اور اسی سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''نبي الله حي يرزق'' اور یہ ارشاد بھی کہ: ''الانبياء احياء في قبورهم يصلون'' یہ حدیثیں حیات کے افعال کے ذکر میں بیان کی گئی ہیں۔ نفس حیات کے بیان کے لئے نہیں ذکر کی گئی یا یہ مراد ہو کہ حیات اجسام کے ساتھ ہے۔ کیونکہ ان کے اجسام زمین پر حرام کر دیئے گئے ہیں۔ یعنی حیات سے مراد بقاء روح کی حیات نہیں بلکہ اعمال و افعال والی اور اجسام والی حیات مراد ہے۔

تیسری دلیل

امام ابوداود فرماتے ہیں کہ ہم سے ہارون[1] بن عبداللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہم سے حسین[2] بن علی نے بیان کیا وہ عبدالرحمن[3] بن یزید بن جابر سے اور وہ ابوالاشعث[4] الصعانی سے اور وہ حضرت اوس بن اوس سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ:

''ان من أفضل ايامكم يوم الجمعة فيه خلق آدم وفيه قبض وفيه النفخة وفيه الصعقة فاكثروا علىّ من الصلوٰة فيه فان صلواتكم معروضة علىّ قال قالوا يارسول الله وكيف تعرض صلواتنا عليك وقد ارمت قال يقولون بليت فقال ان الله عزّ وجل حرّم على الارض اجساد الانبياء'' (ابوداود ج ۱ ص ۱۵۰، واللفظ لہ والدارمی ص ۱۹۵ والنسائی ج ۱ ص ۱۵۴، والمستدرک ج ۱ ص ۲۷۸، وج ۴ ص ۵۶۰، وموارد الظمآن ص ۱۴۶، وابن ماجہ ص ۷۷ وسنن الکبریٰ ج ۳ ص ۲۴۹ وابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۵۱۶، طبع مجلس علمی)

---

[1] ان کی کنیت ابوموسیٰ تھی۔ الحال کے لقب سے معروف تھے۔ حافظ ابن حجران کو الحافظ لکھتے ہیں: ''امام مروزی نے امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ میں ان سے روایت لکھوں؟ فرمایا: ہاں! بخدا ابوحاتم اور ابراہیم الحربی فرماتے ہیں کہ وہ صدوق تھے۔ حربی نے یہ بھی فرمایا کہ اگر جھوٹ حلال بھی ہوتا، تب بھی وہ اس سے گریز کرتے۔ امام نسائی ان کو ثقہ کہتے ہیں: ''ابن حبان ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۹،۸)

[2] حسین بن علی الجعفی صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے افضل کوئی نہیں دیکھا۔ ابن معین ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ عجلی ان کو ثقہ اور صالح کہتے ہیں۔ ابن حبان اور ابن شاہین ان کو ثقات میں لکھتے ہیں: ''عثمان بن ابی شیبہ ان کو ثقہ اور صدوق کہتے ہیں۔'' (تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۵۸، ۳۵۹) (بقیہ حاشیہ نمبر ۳، ۴ اگلے صفحہ پر)

" بے شک تمہارے افضل ترین دنوں میں سے ایک جمعہ ہے، اسی میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے اور اسی میں ان کی وفات ہوئی اور اسی میں نفخہ اولٰی ہوگا اور اسی میں نفخۂ ثانیہ ہوگا۔ سوتم جمعہ کے دن مجھ پر بکثرت درود پڑھا کرو۔ کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کس طرح ہمارا درود آپ پر پیش کیا جائے گا جب کہ آپ ریزہ ریزہ ہو چکے ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجساد حرام کر دیے ہیں۔" (یعنی زمین ان کو نہیں کھاتی)

محدث ابن حبان رحمہ اللہ کی سند یوں ہے: "اخبرنا محمد بن اسحاق بن خزیمة حدثنا ابو کدیب حدثنا حسین بن علی حدثنا عبدالرحمن بن یزید بن جابر عن ابی الاشعث الصنعانی عن اوس بن اوس رضی اللہ عنہ" (موارد الظمآن ص ۱۴۰)

"اور امام ابو نعیم اصبہانی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۳۰ھ) کی سند میں بھی عبدالرحمن بن یزید بن جابر عن ابی الاشعث ہے۔" (دلائل النبوۃ ص ۴۹۶)

امام حاکم رحمہ اللہ اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ دونوں اس حدیث کو بخاری کی شرط پر صحیح کہتے ہیں اور یہ حدیث امام حاکم رحمہ اللہ نے (مستدرک ج ۴ ص ۵۶۰) میں بھی اسی سند سے روایت کی ہے اور وہاں امام حاکم رحمہ اللہ اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ دونوں اس کو بخاری اور مسلم دونوں کی شرط پر صحیح کہتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ، ابن حبان رحمہ اللہ، دارقطنی رحمہ اللہ اور نووی رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۱۴) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "و صححه ابن خزیمة رحمہ اللہ وغیرہ" (فتح الباری پ ۱۳ ص ۲۷۹) اس کی ابن خزیمہ رحمہ اللہ وغیرہ نے تصحیح کی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے بالاسانید الصحیحہ حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کی ہے۔" (کتاب الاذکار ص ۱۰۶، طبع مصر)

علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "یہ حدیث صحیح ہے اس لئے کہ اس کے سب راوی صدق و امانت اور ثقاہت وعدالت میں مشہور ہیں اور اسی واسطے حفاظ حدیث کی ایک بڑی جماعت نے اس کی تصحیح کی ہے۔ مثلاً امام ابن حبان رحمہ اللہ، حافظ عبدالغنی المقدسی رحمہ اللہ اور ابن دحیہ رحمہ اللہ وغیرہ اور کوئی شخص ایسا نہیں جس نے اس حدیث پر حجت اور دلیل سے کلام کیا ہو۔" (الصارم المنکی ص ۱۸۴، طبع مصر)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کو حدیث صحیح کہتے ہیں۔ (فتح الباری پ ۲۶ ص ۵۸)

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "و من تامّل فی هذا الاسناد لم یشک فی صحته لثقة رواته وشهرتهم وقبول الائمة حدیثهم" (جلاء الافہام ص ۴۴)

۳؎ امام احمد فرماتے ہیں: "لیس بہ باس امام ابن معین عجلی ابن سعد، امام نسائی وغیرہ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوب بن سفیان ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو داؤد ان کو من ثقات الناس اور ابو بکر بن ابی داؤد ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ موسیٰ بن ہارون ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابو حاتم ان کو صدوق لا باس بہ اور ثقہ کہتے ہیں۔ (تقریب التہذیب ج ۶ ص ۲۹۸)

۴؎ ان کا نام شراحیل بن آدہ تھا۔ امام بخاری اور مسلم وغیرہ نے ان سے احتجاج کیا ہے۔ عجلی ان کو تابعی اور ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب ج ۴ ص ۳۱۹)

"جو شخص بھی اس کی اسناد میں تامل کرے گا تو اس کو اس کی صحت میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے تمام راوی ثقہ اور مشہور ہیں اور آئمہ کرام رحمہم اللہ نے ان کی حدیثیں قبول کی ہیں۔"

"اور یہی الفاظ اس مقام پر علامہ ابن عبد الہادی رحمہ اللہ کے ہیں۔" (الصارم المنکی ص ۴۵)

اور علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "صح عنہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الارض لا تاکل اجساد الانبیاء علیہم السلام"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ زمین حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجساد کو نہیں کھاتی۔ (عمدۃ القاری ج ۶ ص ۲۹)

اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ: "قد صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الارض لا تاکل اجساد الانبیاء" (کتاب الروح)

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کے ساتھ یہ ثابت ہو چکا ہے، آپ نے فرمایا کہ زمین حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجساد کو نہیں کھاتی۔"

علامہ منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ انہ حسن (القول البدیع ص ۱۱۹)

علامہ عبد الغنی النابلسی رحمہ اللہ اس کو حسن صحیح سے تعبیر کرتے ہیں۔ (ترجمان السنۃ ج ۳ ص ۲۹۷، والقول البدیع ص ۱۱۹)

اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "در حدیث صحیح آمدہ است کہ بسیار گوئید در روز جمعہ درود بر من زیرا کہ صلوٰۃ شما معروض مے گردد بر من ایں جا معلوم می شود کہ حیات انبیاء حیات جسمی دنیاوی است نہ بمجرد بقائے ارواح۔" (مدارج النبوت ج ۲ ص ۹۲۰)

حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "فانہ صح عنہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ان اللہ عزّ و جلّ حرّم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء" (رواہ ابوداؤد، خزائن الاسرار ص ۱۹)

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کے ساتھ ثابت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے جسموں کو کھائے۔"

مولانا عثمانی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ: "وھو حی فی قبرہ الشریف ولحول الانبیاء حرام علی الارض کما ورد بہ الاثراء" (فتح الملہم ج ۲ ص ۴۹۸)

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے جسم زمین پر حرام ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔"

اُصولِ حدیث کے رُو سے یہ روایت بھی بالکل صحیح ہے اور اس میں کوئی شک اور شبہ نہیں۔

<u>اعتراض</u>: بعض حضرات لکھتے ہیں کہ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا راوی عبد الرحمن بن یزید بن جابر رحمہ اللہ نہیں (جو ثقہ ہے) بلکہ یہ عبد الرحمن بن یزید بن تمیم رحمہ اللہ ہے جو منکر الحدیث ہے۔ (التاریخ الکبیر ج ۳ قسم اوّل ص ۳۶۵) اور (التاریخ الصغیر ص ۱۷۹، محصلہ) اور امام ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبد الرحمن بن یزید بن تمیم رحمہ اللہ ضعیف ہے۔ لہٰذا یہ روایت منکر ہے۔ (علل الحدیث لابن ابی حاتم ج ۱ ص ۱۹۷)

اور علامہ منذری رحمہ اللہ نے بھی اس علت دقیقہ کا ذکر کیا ہے۔ (الترغیب والترہیب ج ۱ ص ۲۹۱ ومختصر سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۴) اور علامہ سبکی رحمہ اللہ اور امام سخاوی رحمہ اللہ نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (شفاء السقام ص ۳۵ والقول البدیع ص ۱۱۹) اور اسی بناء پر قاضی ابو بکر بن العربی المالکی رحمہ اللہ (المتوفی ۵۴۳ھ) فرماتے ہیں: ان الحدیث لا یثبت (بحوالہ نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۶۳) کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔

الجواب: عقل مندوں کا یہ مشہور مقولہ ہے کہ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج تا ثریا میرود دیوار کج

کہ عمارت کی جب پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی ہو تو اس پر جو عمارت بھی اُستوار کی جائے گی وہ تا ثریا کج ہی چلی جائے گی اور یہ شعر اور محاورہ اس اعتراض پر پورا صادق آتا ہے، اس حدیث کا جو راوی ہے وہ عبدالرحمن بن یزید بن جابر رحمہ اللہ ہے نہ کہ عبدالرحمن بن یزید بن تمیم رحمہ اللہ۔

اوّلاً: اس لئے کہ جن کتابوں کے ہم نے پہلے حوالے درج کئے ہیں، ان تمام میں ابن جابر رحمہ اللہ کی تصریح ہے۔

وثانیاً: امام حاکم رحمہ اللہ اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ اس سند کو ایک مقام پر امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط پر اور دوسرے مقام پر امام بخاری رحمہ اللہ اور مسلم رحمہ اللہ دونوں کی شرط پر صحیح کہتے ہیں اور عبدالرحمن بن یزید بن جابر رحمہ اللہ تو بخاری رحمہ اللہ اور مسلم کے راوی ہیں لیکن ابن تمیم نہیں اور متعدد محدثین نے ابو حاتم رحمہ اللہ وغیرہ کا رد کیا ہے۔

چنانچہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ان حسین بن علی الجعفی قد صرّح بسماعہ لہ من عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر قال ابن حبان فی صحیحہ ثنا ابن خزیمۃ ثنا ابو کریب ثنا حسین بن علی ثنا عبدالرحمن بن یزید بن جابر فصرح بالسماع منہ وقولھم انہ ظن انہ ابن جابر وانما ھو ابن تمیم فغلط فی اسم جدہ بعید فانہ لم یکن یشتبہ علی حسین ھذا بھذا مع نقدہ وعلمہ بھما وسماعہ منھما''

''حسین بن علی الجعفی رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ یہ روایت انہوں نے عبدالرحمن بن یزید بن جابر رحمہ اللہ سے کی ہے۔ چنانچہ ابن حبان رحمہ اللہ اپنے صحیح میں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو کریب رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حسین بن علی رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبدالرحمن بن یزید بن جابر رحمہ اللہ نے بیان کیا تو اس سند میں انہوں نے ان سے سماع کی تصریح کی ہے۔ رہا معترضین کا یہ قول کہ عبدالرحمن کے دادا ابن جابر رحمہ اللہ میں حسین رحمہ اللہ سے غلطی واقع ہوگئی ہے کہ ابن تمیم رحمہ اللہ کا انہوں نے ابن جابر بنا دیا ہے تو یہ بہت بعید سی بات ہے۔ حسین بن علی رحمہ اللہ پر اس میں کوئی اشتباہ نہ تھا۔ وہ تنقید کی اہلیت بھی رکھتے تھے اور دونوں کو بخوبی جانتے بھی تھے اور دونوں سے سماعت بھی کی ہے۔'' (الصارم المنکی ص ۴۵، طبع مصر)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اس اعتراض کا خوب رد کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری پ ۲۶ ص ۵۸)

اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے بھی اس کا رد کیا ہے۔ (جلاء الافہام ص ۳۶، سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۱۵۴، طبع مصر)

حضرت مُلّا علی القاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''قال ابن دحیۃ انہ صحیح بنقل العدل عن العدل ومن قال انہ منکر او غریب بعلۃ خفیۃ فقد استروح لان الدار قطنی ردھا'' (مرقات ج ۲ ص ۲۱۰، طبع مصر)

''محدث ابن دحیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے کیونکہ عادل راویوں نے عادل راویوں سے یہ نقل کی ہے جس نے یہ کہا ہے کہ یہ حدیث علت خفیہ کی وجہ سے منکر یا غریب ہے تو اس نے بالکل فضول بات کی ہے۔امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اس کا خوب رد کیا ہے۔''

اور امام سخاوی رحمہ اللہ اس علت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:''لکن قد رد ھذہ العلة الدار قطنی وقال ان سماع حسین من ابن جابر ثابت والی ھذا جنح الخطیب'' (القول البدیع ص ۱۱۹)

''لیکن اس علت کو امام دارقطنی رحمہ اللہ نے رد کیا ہے اور فرمایا ہے کہ حسین رحمہ اللہ کا ابن جابر رحمہ اللہ سے سماع ثابت ہے اور اسی تحقیق کی طرف علامہ خطیب رحمہ اللہ مائل ہوئے ہیں۔''

خامسا: مولانا سید احمد حسن صاحب لکھتے ہیں:''وللحدیث طرق جمعھا المنذری فی جزئٍ فتعدد الطرق یشد بعضھا بعضا'' (تنقیح الرواۃ ج ۱ ص ۲۵۵)

''اس حدیث کے کئی طرق ہیں جن کو امام منذری رحمہ اللہ نے ایک جز میں جمع کر دیا ہے سو تعدد طرق ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں۔''

اور امام منذری رحمہ اللہ نے الترغیب والترھیب اور مختصر سنن ابی داؤد میں اس کا ذکر کیا ہے کہ میں نے اس جزء میں اس حدیث کے طرق جمع کر دیئے ہیں۔

الغرض امام ابو داؤد رحمہ اللہ، نسائی رحمہ اللہ، ابن حبان رحمہ اللہ، بیہقی رحمہ اللہ، حاکم رحمہ اللہ، ذہبی رحمہ اللہ، ابن خزیمہ رحمہ اللہ، امام نووی رحمہ اللہ، ابن القیم رحمہ اللہ، دارقطنی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ سبھی اس راوی کو عبد الرحمن بن یزید بن جابر رحمہ اللہ ہی نقل کرتے ہیں اور اس روایت کو صحیح سمجھتے ہیں۔اندریں حالات اس روایت کی صحت پر کلام کرنا بالکل غلط ہے۔

اس روایتی تحقیق کے بعد اس حدیث کا درایتی پہلو بھی ملاحظہ کیجئے جو اُمور اس صحیح حدیث سے بلا کسی ضم ضمیمہ کے حاصل ہوتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر زندگی میں درود شریف پیش ہوتا رہا۔ چنانچہ آپ کے یہ الفاظ صراحت کے ساتھ اس پر دال ہیں کہ جمعہ کے دن:''فاکثروا علیّ من الصلوٰة فان صلواتکم معروضة علیّ''

''تم مجھ پر بکثرت درود پڑھو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔''

درود شریف کا یہ عرض جسم اطہر اور روح مبارک دونوں سے وابستہ ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:''اور اس حدیث پاک میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ درود روح مبارک اور بدن مبارک پر پیش ہوتا ہے۔'' (فضائل درود ص ۳۷)

اور اس عرض میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کوئی اشکال پیش نہیں آیا۔ رہی اس عرض کی کیفیت تو اس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے تھے، ہم اس کے مکلف نہیں ہیں۔

(۲) حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ اشکال پیش آیا کہ زندگی میں تو روح اور جسد دونوں کا تعلق ہے اور اس دور میں درود کے پیش ہونے پر تو کوئی اشکال نہیں لیکن جب آپ کی وفات ہو چکے گی تو اس کے بعد درود کیونکر پیش کیا جائے گا؟ آیا صرف روح مبارک پر پیش ہوگا؟ یا صرف جسد اطہر پر؟ یا دونوں پر؟ عقلی طور پر اس کی کئی

صورتیں سامنے آسکتی ہیں مگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو محض روح مبارک پر درود شریف پیش ہونے کا کوئی شبہ نہ تھا اور نہ وہ تنہا روح مبارک پر درود شریف پیش ہونے کے حق میں تھے جبھی تو وہ یہ سوال کر رہے ہیں کہ: ''قالوا یا رسول اللہ و کیف تعرض صلوٰتنا علیک و قد ارمت قال یقولون بلیت''

''یارسول اللہ ہمارا درود آپ پر کس طرح پیش کیا جائے گا۔ حالانکہ آپ تو (معاذ اللہ) خاک ہو چکے ہوں گے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک آپ پر صلوٰۃ وسلام پیش ہونے میں آپ کے جسدِ اطہر کو اوّلین درجہ حاصل ہے اور اس کے (العیاذ باللہ) بوسیدہ ہونے سے اس عرض کے سلسلہ میں ان کے اذہان و قلوب میں اشکال پیدا ہوا۔ اگر درود شریف کا تعلق آپ کے جسدِ اطہر کے ساتھ نہ ہوتا تو آپ ﷺ پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس نظریہ کی تردید فرماتے کہ جسد کا کیا سوال ہے؟ درود شریف تو روح پر پیش کیا جاتا ہے، مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس نظریہ کی پوری تائید فرمائی ہے کہ درود شریف کا تعلق آپ کے جسدِ اطہر کے ساتھ بھی باقاعدہ وابستہ ہے اور یہ تائید صرف دلالۃً ہی نہیں بلکہ صراحۃً ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''ان اللہ عزّ و جلّ حرّم علی الارض اجساد الانبیاء''

''اللہ تعالیٰ نے زمین پر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام حرام کر دیئے ہیں۔''

''اس سے صاف معلوم ہوا کہ درود شریف کے پیش ہونے میں جسد اطہر کا پورا پورا دخل ہے۔ کیونکہ آپ کا یہ ارشاد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس سوال کے بعد وارد ہوا ہے کہ ہمارا درود آپ پر جب کہ آپ معاذ اللہ خاک ہو چکے ہوں گے، کیونکر پیش کیا جائے گا؟ اور اس میں محض بے حس اور لاشعور جسم کا سوال نہیں بلکہ ایسے جسم اطہر کا سوال ہے جس پر درود شریف پیش ہو سکے اور روح کے بغیر یہ ہرگز ممکن نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر حیات جسمانی کی اور کون سی دلیل ہو سکتی ہے؟ لیکن چونکہ یہ حیات فی القبر برزخی بھی ہے۔ لہٰذا اس جہان کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کو اس کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا اور نہ ان کو حس و حرکت محسوس ہو سکتی ہے اور پہلے گزر چکا ہے کہ حیات دنیوی کا یہ مطلب ہے کہ رُوح مبارک کا تعلق دنیوی بدن سے ہے نہ کہ شہداء کی طرح اُخروی بدن سے۔ لہٰذا بعض حضرات کا یہ فرمانا کہ برتقدیر تسلیم یہ احادیث صحیح بھی ہوں تو ان سے دنیوی زندگی ثابت نہیں ہوتی۔'' غفلت پر مبنی ہے۔

(۳) اگر درود شریف کا یہ عرض جسد عنصری پر نہ ہوتا بلکہ جسدِ مثالی پر ہوتا تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کبھی اشکال پیش نہ آتا۔ کیونکہ جسدِ مثالی کے خاک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خاک ہونے اور بوسیدہ ہونے کا احتمال بلکہ یقین تو جسدِ عنصری اور جسم خاکی ہی سے وابستہ ہو سکتا ہے۔ یہ اس اَمر کی واضح دلیل ہے کہ قبر مبارک میں عرض صلوٰۃ وسلام کا آپ کے جسدِ عنصری کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے اور پھر وہ حدیثیں جن میں آپ سلام کہنے والوں کو جواب دیتے ہیں اور عند القبر صلوٰۃ وسلام کا بلا واسطہ سماع فرماتے ہیں جس کی تحقیق ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی اس پر مستزاد ہیں۔ غرض یہ کہ اس صحیح حدیث کے اندرونی اور بیرونی قرائن واضح طور پر اس اَمر کو ثابت کر رہے ہیں کہ آپ کی روح مبارک کا جسدِ اطہر کے ساتھ تعلق ہے اور اس تعلق کی وجہ سے آپ پر درود شریف پیش ہوتا ہے اور اسی تعلق سے آپ جواب دیتے ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ومعلوم بالضرورۃ ان جسدہ ﷺ فی الارض طری مطرا

وقد سأله الصحابة رضی اللہ عنہم کیف تعرض صلوتنا علیک وقد ارمت فقال ان اللہ حرّم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء ولو لم یکن جسدہ فی ضریحه لما اجاب بهذا الجواب'' (کتاب الروح ص ۵۴)

''اور بداہۃً معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ کا جسم مبارک بالکل تروتازہ زمین میں موجود ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے پوچھا کہ ہمارا درود آپ ﷺ پر کیسے پیش کیا جائے گا جب کہ آپ ریزہ ریزہ ہو چکے ہوں گے۔ (معاذ اللہ) تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ پیغمبروں کے اجسام کو کھائے اگر آپ کا جسم مبارک قبر میں نہ ہوتا تو آپ یہ جواب ہرگز نہ دیتے۔''

یعنی اگر عرض صلوٰۃ میں آپ کے جسم مبارک کا دخل نہ ہوتا تو آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ جواب نہ دیتے۔

حضرت مولانا شیخ الہند محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۳۹ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ: ''ان الصحابه رضی اللہ عنہم سألوا بیان کیفیة العرض بعد اعتقادهم بانه کائن لا محالة لقول الصادق رفعا للاشتباه ان العرض هل هو علی الروح المجرد او علی المتصل بالجسد حسبوا ان جسد النبی ﷺ کجسد کل احد فکفی فی الجواب ماقاله علی وجه الصواب'' (ہامش ابوداؤد ج ۱ ص ۱۵۷)

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس یقین کے بعد کہ لامحالہ آپ پر درود تو پیش کیا جاتا ہے۔ کیونکہ صادق کا فرمان ہے: محض اپنے شک کو دُور کرنے کے لئے اس عرضِ صلوٰۃ کی کیفیت دریافت کی کہ آیا وہ صرف رُوح مبارک پر پیش کیا جاتا ہے یا روح پر جو جسم سے متصل ہو؟ اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ عام لوگوں کی طرح آپ کے جسد اطہر کو بھی مٹی کھا جائے گی۔ اس سوال کا جو جواب آپ نے دیا وہ معقول اور درست طریقہ سے ان کے شبہ کے ازالہ کے لئے کافی تھا۔''

اس عبارت کا مطلب بھی روشن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عرض صلوٰۃ کے سلسلہ میں جسدِ اطہر سے صرفِ نظر نہیں فرمائی بلکہ درود شریف کے سلسلہ میں جسم مبارک اور روح اطہر دونوں کو ملحوظ رکھا ہے۔

حضرت مُلّا علی القاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''قال ای رسول اللہ ﷺ ان اللہ حرّم علی الارض ای منعها فیه مبالغة لطیفة اجسام الانبیاء ای ان تاکلها فان الانبیاء احیاء فمحصل الجواب ان الانبیاء احیاء فی قبورهم فیمکن لهم سماع من سلم علیهم'' (مرقات ج ۲ ص ۲۰۹)

''آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے یعنی اس کو روک دیا ہے۔ (اور اس میں لطیف مبالغہ ہے) کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے جسموں کو وہ کھائے کیونکہ وہ زندہ ہیں۔ پس جواب کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں تو ان کے لئے ممکن ہے کہ جو شخص بھی سلام عرض کرے وہ اس کو سُنیں۔''

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ: ''ان اللہ تعالیٰ حرّم علی الارض ان تاکل لحوم الانبیاء فاخبر انه یسمع الصلوٰة والسلام من القریب و انه یبلغ ذلک من البعید'' (مناسک الحج ص ۸۴، طبع دہلی)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ پیغمبروں کا گوشت کھائے۔ پس آپ نے خبر دی ہے کہ آپ قریب سے صلوٰۃ وسلام خود سُنتے ہیں اور دُور سے آپ کو پہنچایا جاتا ہے۔''

حضرت مولانا ابو تحقیق عبد الہادی صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ظاهره یدل علی ان روحه ﷺ لیس فی

جسد الاطهر بل اذا سلّم عليه احد عند القبر وقت حضوره للزيادة رد الله روحه فيه و هو ينافي حياته ﷺ مع انهم اتفقوا على حياته ﷺ بل حياة الانبياء علیہم السلام متفق عليها لا خلاف لاحد فيه فقال الحافظ معناه رد الله علىّ نطقي " (انوار المحمود ج ۱ ص ۶۱۰)

" یہ حدیث بظاہر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی روح مبارک جسد اطہر میں نہیں ہوتی بلکہ جب بھی کوئی شخص آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہو کر قبر مبارک کے پاس سلام کہتا ہے تو اس وقت آپ کی رُوح مبارک آپ کی طرف لوٹائی جاتی ہے اور یہ مطلب تو آپ کی حیات کے منافی ہے۔ حالانکہ سب کا اتفاق ہے کہ آنحضرت ﷺ زندہ ہیں بلکہ تمام حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات ایک اتفاقی اَمر ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس اشکال کے جواب میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رَدِّ روح سے مراد رَدِّ نُطق ہے۔"

ان تمام اقتباسات سے معلوم ہوا کہ محدثین کرام رحمہم اللہ نے اس صحیح حدیث پر وارد ہونے والے اشکال کے کئی جوابات دیئے ہیں، ان میں سے جو جواب بھی کسی کو پسند آئے قبول کر لے اور اس صحیح حدیث کے پیش نظر بھی آنحضرت ﷺ کی حیات ثابت ہے اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

چوتھی دلیل

امام ابن ماجہ[۱] رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عمرو بن سواد المصری[۲] نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہ بن وہب[۳] نے بیان کیا وہ عمرو بن الحارث[۴] سے اور وہ سعید بن ابی ہلال[۵] سے اور وہ زید بن ایمن[۶] سے اور وہ عبادۃ بن نُسی[۷] اور وہ حضرت ابوالدرداء[۸] رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: " اكثروا الصلٰوة علىّ يوم الجمعة فانه مشهود تشهده الملٰئكة و ان احدًا لن يصلي علىّ الا عرضت علىّ صلٰوته حتّٰى يفرغ منها قال قلت و بعد الموت قال و بعد الموت ان الله حرّم على الارض ان تأكل اجساد الانبياء فنبيّ الله حيّ يرزق " (ابن ماجہ ص ۱۱۹)

---

[۱] ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ رحمہ اللہ (المتوفی ۲۷۳ھ) جو الحافظ الکبیر اور المفسر تھے۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۱۸۹)

[۲] ابوحاتم رحمہ اللہ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن حبان رحمہ اللہ ثقات میں لکھتے ہیں۔ خطیب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ ابن یونس رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور صدوق کہتے ہیں۔ نسائی رحمہ اللہ ان کو لا باس بہ کہتے ہیں۔ مسلمہ رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ حاکم رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶)

[۳] یہ صحاح ستہ کے مرکزی راوی ہیں۔ ایک لاکھ حدیث انہوں نے بیان کی ہے۔ ابن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ ابوحاتم رحمہ اللہ ان کو صالح الحدیث اور صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعد رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور کثیر العلم کہتے ہیں۔ عجلی رحمہ اللہ ان کو ثقہ صاحب سنۃ اور رجل صالح کہتے ہیں۔ ابن عدی رحمہ اللہ ان کو من اجلة الناس و ثقاتهم کہتے ہیں۔ نسائی رحمہ اللہ ان کو لا بأس به اور ثقہ کہتے ہیں۔ ساجی رحمہ اللہ ان کو صدوق اور ثقہ کہتے ہیں۔ خلیلی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور متفق علیہ تھے۔ (تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۷۲ تا ۷۴)

[۴] ان کی کنیت ابوامیہ تھی۔ الانصاری اور المدنی نسبت ہے۔ امام ابن معین رحمہ اللہ ابوزرعہ رحمہ اللہ، نسائی رحمہ اللہ، عجلی رحمہ اللہ، ابن سعد رحمہ اللہ اور دیگر بے شمار محدثین (غیر واحد) ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ خطیب رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں من الحفاظ المتقنين لکھتے ہیں۔ ساجی رحمہ اللہ ان کو صدوق اور ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۶) (بقیہ حاشیہ نمبر ۵، ۶، ۷، ۸ اگلے صفحہ پر)

''جمعہ کے دن مجھ پر بکثرت درود پڑھا کرو۔ کیونکہ وہ دن حاضری کا ہے۔ اس میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ مجھ پر کوئی شخص درود نہیں پڑھتا، مگر اس کا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس سے فارغ ہو میں نے کہا وفات کے بعد بھی پیش کیا جائے گا؟ فرمایا کہ ہاں اوفات کے بعد بھی پیش کیا جائے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم کے اجسام طیبہ کو کھائے۔ سو اللہ تعالیٰ کا نبی زندہ ہے اس کو رزق ملتا ہے۔''

حافظ منذری ؒ فرماتے ہیں: ''اسنادہ جید'' (ترجمان السنۃ ج ۳ ص ۲۹۷) کہ اس کی سند جید اور کھری ہے۔ علامہ عزیزی ؒ لکھتے ہیں: ''ورجالہ ثقات'' (السراج المنیر ج ۱ ص ۲۹۰) کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ علامہ مناوی ؒ فرماتے ہیں: ''قال الدمیری رجالہ ثقات'' (فیض القدیر ج ۲ ص ۸۷) کہ دمیری ؒ فرماتے ہیں اس کے راوی ثقہ ہیں اور علامہ زرقانی ؒ فرماتے ہیں: ''رواہ ابن ماجہ برجال ثقات''

(زرقانی شرح مواہب ج ۵ ص ۳۳۶)

حافظ ابن حجر ؒ لکھتے ہیں کہ: ''قلت رجالہ ثقات'' (تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۸۹)

''میں کہتا ہوں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔''

اور علامہ سمہودی ؒ فرماتے ہیں کہ: ''رواہ ابن ماجۃ باسنادہ جید'' (خلاصۃ الوفاء ص ۴۸)

''امام ابن ماجہ ؒ نے اس کو جید سند سے روایت کیا ہے۔''

اور حضرت مُلّا علی القاری ؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''باسناد جید نقلہ میرک عن المنذری ؒ ولہ طرق کثیرۃ'' (مرقات ج ۲ ص ۱۱۲)

''اس کی سند جید ہے، محدث میرک ؒ نے امام منذری ؒ سے اس کو نقل کیا ہے اور اس کے طرق بہت ہیں۔''

(بقیہ حاشیہ جات گزشتہ صفحہ) ۵ ابوالعلاء کنیت اور اللیثی المصری نسبت تھی۔ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ ابن سعد ؒ، عجلی ؒ، ابن خزیمہ ؒ، دارقطنی ؒ، بیہقی ؒ، خطیب ؒ اور ابن عبدالبر ؒ وغیرہ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابوحاتم ؒ لا بأس بہ اور ساجی ؒ صدوق کہتے ہیں اور ابن حبان ؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۹۵)

ابن حزم ؒ نے ان کو لیس بالقوی کہا ہے لیکن یہ جرح مبہم ہے جس کا اعتبار نہیں۔ امام احمد ؒ نے ان کو مختلط کہا ہے مگر صحاح ستہ کے مصنفین نے ان کی روایت لی ہے اور ان پر اختلاط کے الزام کو درخور اعتناء نہیں سمجھا۔

۶ ابن حبان ؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور حافظ ابن حجر ؒ اس روایت کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں: رواتہ ثقات (تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۸)

امام ابن حبان ؒ اور حافظ ابن حجر ؒ کا ان کو ثقہ کہنے کے بعد علامہ ابن الہادی ؒ کا (الصارم المنکی ص ۱۷۷) میں ان کو مجہول الحال کہنا کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ کیونکہ محدثین ؒ کا قاعدہ یہ ہے: من عرف حجۃ علی من لم یعرف

۷ ابن سعد ؒ، امام احمد ابن معین ؒ، عجلی ؒ اور نسائی ؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابوحاتم ؒ اور ابن خراش کہتے لا بأس بہ ہیں۔ ابن حبان ؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن نمیر ؒ ان کی توثیق کرتے ہیں۔ (تہذیب ج ۵ ص ۱۱۴)

۸ حضرت ابوالدرداء ؓ کا نام عویمر بن زید ؓ تھا، جلیل القدر صحابی تھے۔ علامہ ذہبی ؒ ان کو الامام الربانی کہتے ہیں اور ان کو حکیم الامت بھی کہتے تھے۔ اہل الشام اور دمشق کے عالم، فقیہ، قاری، مفتی اور قاضی تھے۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۲۳، ۲۴)

قاضی شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "وقد اخرج ابن ماجة باسناد جید" (نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۶۴)

"امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے جیّد سند کے ساتھ اس کی تخریج کی ہے۔"

مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "باسناد جید" (عون المعبود ج ۱ ص ۴۰۵)

"اس کی سند جیّد اور کھری ہے۔"

ان تمام حوالوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اس روایت کے سب راوی ثقہ ہیں اور اس کی سند جیّد اور کھری ہے اور محدّثین کرام رحمہ اللہ کا جم غفیر جیّد کہہ کر اس حدیث کی تصحیح کرتا ہے۔

اعتراض: امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زید بن ایمن رحمہ اللہ کی عبادہ بن نسی رحمہ اللہ سے روایت مرسل ہے۔ (تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۸)

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ بات اپنی کتاب (التاریخ الکبیر ج ۲ ص ۵۴ ۳، قسم اوّل طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد) میں فرمائی ہے اور امام سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ورجاله ثقات لكنه منقطع" (القول البدیع ص ۱۱۹)

"کہ اس کے راوی ثقہ ہیں مگر سند منقطع ہے۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ زید بن ایمن رحمہ اللہ کی عبادہ بن نسی رحمہ اللہ سے روایت مرسل ہے۔ (تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۸)

علامہ عراقی رحمہ اللہ شرح ترمذی میں فرماتے ہیں کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں مگر اس میں انقطاع ہے۔ (نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۶۳)

اور بعض حضرات نے اس پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ فنبی الله حي يرزق کا جملہ راوی کا مدرج ہے۔ یہ مرفوع روایت کا حصہ نہیں ہے، لہٰذا یہ روایت مخدوش ہے۔

الجواب: یہ اعتراض چنداں وقعت نہیں رکھتا۔

اوّلاً: اس لئے کہ عنقریب ان شاء اللہ تعالیٰ باحوالہ یہ بحث آرہی ہے کہ اُصولِ حدیث کے رُو سے صحیح اور جیّد کا ایک ہی درجہ ہے اور حدیث کے صحیح ہونے کے لئے اس کا اتصال بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جن حضرات نے اس کو جیّد کہا ہے، گویا ان کے نزدیک اس کا اتصال بھی ثابت ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ زید بن ایمن رحمہ اللہ، عبادۃ بن نسی رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے سعید بن ابی ہلال رحمہ اللہ راوی ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۸)

(حاشیہ علامہ سندھی برابن ماجہ ج ۲ ص ۵۰۲) میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ عبادہ بن نُسَیّ رحمہ اللہ کی ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت مرسل ہے لیکن یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے (تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۱۱۳) میں تصریح فرمائی ہے کہ: "عبادۃ بن نُسَیّ رحمہ اللہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے براہِ راست روایت کرتے ہیں۔" خلاصہ یہ ہے کہ ان حضرات نے اس حدیث کے مرسل اور منقطع تسلیم کرنے میں حضرت امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ کا ساتھ نہیں دیا اور حق جمہور ہی کے ساتھ ہے۔

نوٹ: علامہ عراقی نے اس روایت کے بارے میں لا یصح نہیں فرمایا جیسا کہ "نیل الاوطار" کے حوالہ سے مؤلف نے (ندائے حق ص ۸۹) میں دھوکا کھایا ہے۔ اسی طرح قاضی ابوبکر بن العربی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کے بارے ان الحدیث لا یثبت نہیں فرمایا۔ جیسا کہ "نیل" کے حوالہ سے اسی ص میں مؤلف مذکور نے مغالطہ دیا ہے۔ قاضی ابن العربی رحمہ اللہ کا یہ ارشاد حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ کی روایت کے بارے میں ہے جس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

ثانیاً: اگر یہ روایت مرسل بھی ہو، (بعض محدثین کرام رحمہم اللہ نے مرسل اور منقطع میں فرق کیا ہے، لیکن امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "صحیح بات جس کی طرف فقہاء کرام رحمہم اللہ علامہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ امام ابن عبد البر رحمہ اللہ اور دیگر محدثین کرام گئے ہیں۔ یہ ہے کہ مرسل اور منقطع ایک ہی ہے۔" (تدریب الراوی ص ۱۲۶، ۱۲۷)

تب بھی مرسل روایت سے اُصول حدیث کے رُو سے ترجیح اور تفسیر درست ہے۔

چنانچہ امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "والترجیح بالمرسل جائز" (تدریب الراوی ص ۱۲۱)

"مرسل سے ترجیح جائز ہے۔"

اور مولانا عثمانی رحمہ اللہ "تدریب الراوی" کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: "قال شیخ الاسلام والمرسل یفسر المتصل" (مقدمہ فتح الملہم ص ۲۵)

"شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مرسل روایت سے متصل روایت کی تفسیر کی جا سکتی ہے۔"

اور حدیث فنبی اللہ حی یرزق ان روایات کی تفسیر ہے جن میں رزق دیئے جانے کے بغیر حیات کا ذکر آتا ہے۔ چنانچہ دلیل نمبر ۳ میں حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ کی جو روایت نقل کی جا چکی ہے، اس میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجساد طیبہ کی حفاظت کا ذکر اور درود شریف کے سلسلہ میں روح مبارک کے جسد اطہر سے تعلق کا تذکرہ تھا۔ لیکن اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے۔ (گو کمزور ہی سہی) کہ یہ داخلی تعلق نہ ہو بلکہ خارجی تعلق ہو کہ وہاں ایسی حیات ہی نہ ہوں جس میں کسی قسم کے رزق کی ضرورت پیش آئے اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی یہ مرسل روایت اس کی تفسیر اور حیات کے اس معنی کو ترجیح دینے کے لئے کافی ہے کہ یہ تعلق حیات کا ہے اور اس میں باقاعدہ شایانِ شان رزق بھی ملتا ہے۔ فنبی اللہ حی یرزق لہٰذا اُصولِ حدیث کے رُو سے یہ روایت مرجح اور مفسر ہے۔

وثالثاً: جو حضرات مرسل سے احتجاج کے قائل نہیں وہ بھی اس کے قائل ہیں کہ مرسل معتضد حجت ہے۔ (ملاحظہ ہو: تدریب الراوی ص ۱۲۰ اور مقدمہ نووی ص ۱۷ وغیرہ) اور اس حدیث کی تقویت اور اعتضاد کے لئے علاوہ سابق پیش کردہ اور آئندہ عرض کی جانے والی احادیث کے اجماع اُمت مؤید ہے۔ اس لئے یہ روایت قابل استدلال ہے۔ علاوہ ازیں یہ روایت دوسری روایتوں کے لئے شاہد ہے۔

چنانچہ علامہ ابن الہادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "وھذا الحدیث وان کان فی اسنادہ شیء فھو شاھد لغیرہ وعاضد واللہ اعلم" (الصارم ص ۱۷۸)

"اور اس حدیث کی سند میں اگرچہ کچھ تھوڑا سا ضعف ہے مگر یہ دوسری روایات کے لئے شاہد اور باعث تقویت ہے۔ واللہ اعلم!"

ورابعاً: محدثین کرام رحمہم اللہ کا یہ ضابطہ ہے کہ جو جملہ حدیث کے ساتھ ہو وہ متصل ہی مانا جائے گا اور محض احتمال سے ادراج ثابت نہیں ہو سکتا۔ (فتح الباری ج ۱۱ ص ۴۲۵)

اور ادراج کے اثبات کے لئے محدثین کرام رحمہم اللہ نے جو قواعد بیان فرمائے ہیں وہ یہ ہیں: ''ویدرک ذلک بورودہ منفصلاً فی روایۃ اخری او بالتنصیص علیٰ ذالک من الروای او بعض الائمۃ المطلعین او باستحالۃ کونہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ذلک'' (تدریب الراوی ص ۱۷۳)

''اور اس ادراج کا علم اس طرح ہوتا ہے کہ مدرج حصہ کسی دوسری روایت میں الگ آیا ہو یا راوی صراحت سے بیان کرے کہ یہ مدرج ہے یا اطلاع پانے والے اماموں میں سے کوئی اس کی تصریح کرے یا اس قول کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہونا محال ہو۔''

لیکن ان میں سے ایک بات بھی اس کے مدرج ہونے پر ثابت نہیں بلکہ آخری بات اس کے مدرج نہ ہونے کی روشن دلیل ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ''الانبیاء احیاء'' فرما کر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات ثابت فرمادی ہے تو پھر ''فنبی اللہ حیّ یرزق'' کا ارشاد آپ سے محال کیوں ہوگا؟

خامساً: اگر اس کو مدرج بھی تسلیم کر لیا جائے کہ راویوں میں سے کسی نے حدیث کے سابق حصہ کا مطلب اور مراد سمجھ کر اس کو اپنی طرف سے بطور تفسیر کے بڑھا دیا ہے، تب بھی یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کی دلیل ہے۔ کیونکہ اُصول حدیث کا یہ قاعدہ ہے کہ حدیث کا راوی اپنی مروی حدیث کا مطلب بہ نسبت دوسروں کے زیادہ بہتر جانتا ہے۔

چنانچہ امیر یمانی محمد بن اسمٰعیل الصنعانی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۱۸۲ھ) لکھتے ہیں کہ: ''و راوی الحدیث اعرف بالمراد بہ من غیرہ'' (سبل السلام ج ۱ ص ۱۴۶، طبع مصر)

''کہ حدیث کا راوی حدیث کی مراد کو دوسروں سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔''

اور مولانا عبدالرحمن صاحب مبارک پوری رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۵۳ھ) لکھتے ہیں کہ: ''وقد تقرر ان راوی الحدیث ادرای بمراد الحدیث من غیرہ'' (تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۲۵۷)

''اور بلاشبہ یہ بات طے شدہ ہے کہ حدیث کا راوی اپنی حدیث کی مراد کو دوسروں سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔''

لہٰذا اگر یہ حصہ مدرّج بھی ہو، تب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات بابرکات پر اس سے استدلال درست اور صحیح ہے۔ کیونکہ راویٔ حدیث نے اس سے یہی مطلب سمجھا ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''آپ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں۔ ونبی اللہ حیّ یرزق'' (ہدایۃ الشیعہ ص ۳۶)

اور حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: ''پس آپ کا زندہ رہنا بھی قبر شریف میں ثابت ہوا اور یہ رزق اُس عالم کے مناسب ہوتا ہے اور گو شہداء کے لئے بھی حیات اور مرزوقیت وارد ہے، مگر انبیاء علیہم السلام میں اُن سے اکمل واقویٰ ہے۔'' (نشر الطیب ص ۲۱۰)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ اکابر بھی اس جملہ کو حدیث کا حصہ اور صحیح تسلیم کرتے ہوئے اس سے استدلال واحتجاج کرتے ہیں۔

پانچویں دلیل

امام نسائی[1] رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبدالوہاب بن عبدالحکیم الوراق[2] رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے معاذ بن معاذ[3] رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ سفیان بن سعید (ثوری[4] رحمہ اللہ) سے اور وہ عبداللہ بن سائب[5] رحمہ اللہ سے اور وہ زاذان[6] رحمہ اللہ سے اور وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''ان اللہ ملئکۃ سیاحین فی الارض یبلّغونی من امتی السّلام'' (نسائی ج۱ ص ۱۴۳، مسند احمد ص ۴۴۱، ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۵۱۷ طبع مجلس علمی، دارمی ص ۳۷۲، موارد الظمآن ص ۵۹۴، مشکوۃ ص ۸۶ اور البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۵۴، الجامع الصغیر ج ۱ ص ۹۳، وخصائص الکبری ج ۲ ص ۲۸۰ وتجریبات حدیث ص ۲۱۱)

''بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسے فرشتے مقرر ہیں جو زمین میں گھومتے ہیں اور میری اُمّت کا سلام مجھے پہنچاتے ہیں۔''

علامہ سمہودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام نسائی رحمہ اللہ اور اسماعیل القاضی رحمہ اللہ نے صحیح سند سے یہ روایت نقل کی ہے۔ (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۰۴)

اور علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ امام نسائی رحمہ اللہ اور اسماعیل القاضی رحمہ اللہ وغیرہ نے مختلف طرق سے صحیح اسانید کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے۔ (الصارم المنکی ص ۱۶۸)

علامہ عزیزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حدیث صحیح (السراج المنیر ج ۱ ص ۵۱۸) کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رواہ البزار و رجالہ رجال الصحیح (مجمع الزوائد ج ۹ ص ۲۴) کہ محدّث بزار رحمہ اللہ نے اس کو روایت کیا ہے اور اس کے جملہ راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں اور یہ روایت (مستدرک ج ۲ ص ۴۲۱) میں بھی مروی ہے: ''قال الحاکم والذھبی صحیح'' امام حاکم رحمہ اللہ اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ صحیح ہے۔

امام سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''رواہ احمد والنسائی والدارمی و ابو نعیم والبیھقی والخلعی وابن حبان والحاکم فی صحیحھما وقال صحیح الاسناد'' (القول البدیع ص ۱۱۵)

''امام احمد رحمہ اللہ، نسائی رحمہ اللہ، دارمی رحمہ اللہ، ابونعیم رحمہ اللہ، بیہقی رحمہ اللہ، خلعی رحمہ اللہ، ابن حبان رحمہ اللہ اور حاکم رحمہ اللہ نے اس کو روایت کیا ہے اور حاکم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔

---

[1] امام نسائی رحمہ اللہ کی سفیان ثوری رحمہ اللہ تک سند ڈبل ہے۔ دوسرا طریق یوں ہے: ''اخبرنا محمود بن غیلان قال حدثنا وکیع وعبدالرزاق عن سفیان'' اور یہ جملہ حضرات ثقہ اور ثبت اور علم حدیث کے مسلم امام ہیں، تاہم پہلی سند کے روات کی توثیق ملاحظہ ہو۔

[2] عبدالوہاب ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۲۴۹)

[3] معاذ بن معاذ ثقہ اور متقن تھے۔ (ترقیب ص ۳۵۷)

[4] ثقہ حافظ فقیہ عابد اور حجت تھے۔ (تقریب ص ۱۵۱)

[5] ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۲۰۰)

[6] زاذان رحمہ اللہ کا ترجمہ ص ۸۴ میں گزر چکا ہے۔

اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ: ”نزد احمد رحمہ اللہ ونسائی رحمہ اللہ ہر آئینہ خدائے را فرشتگا نند سیر کنندگان در زمین میرسانند مرا از اُمت من سلام را و بتواتر رسیدہ ایں معنی“ (فتاویٰ عزیزی ج ۲ ص ۶۹)

”امام احمد رحمہ اللہ اور نسائی رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے فرشتے زمین پر سیر کرتے ہیں اور مجھے میری اُمت کا سلام پہنچاتے ہیں اور یہ مضمون متواتر طور پر ثابت ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو اُمت کا سلام پہنچنا تواتر سے ثابت ہے اور امام سخاوی رحمہ اللہ امام دار قطنی رحمہ اللہ کے حوالہ سے یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ: ”قال رسول اللّٰہ ﷺ ان للّٰہ ملٰئکۃ یسیحون فی الارض یبلغونی صلوٰۃ من صلّی علیّ من اُمتی اخرجہ الدار قطنی“

”آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے زمین پر پھرتے ہیں۔ میری اُمت میں سے جو شخص مجھ پر صلوٰۃ پڑھتا ہے وہ مجھے پہنچاتے ہیں۔“

(القول البدیع ص ۱۱۵) اور یہ (شفاء السقام ص ۳۴) میں بھی مذکور ہے۔

ان دونوں روایتوں کو ملانے سے معلوم ہوا کہ فرشتے صلوٰۃ وسلام دونوں پہنچاتے ہیں۔

علامہ شہاب الدین محمد بن احمد الابشیہی رحمہ اللہ المتوفی (۸۵۰ھ) یہ روایت اس طرح نقل کرتے ہیں: ”ان للّٰہ ملٰئکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی الصلوٰۃ علیّ من امتی فاستغفر لھم“

”بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ فرشتے زمین میں پھرتے ہیں میری اُمت کی طرف سے وہ مجھے درود پہنچاتے ہیں، پس میں ان کے لئے استغفار کرتا ہوں۔“ (المستطرف فی کل فن مستظرف ج ۲ ص ۳۱۷، طبع مصر)

اور علامہ عزیزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس طرح سلام آپ پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح صلوٰۃ اور درود بھی پیش کیا جاتا ہے۔ (السراج المنیر ج ۱ ص ۵۱۸)

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے یہ تصریح فرمادی ہے کہ یبلغونی فرشتے مجھے صلوٰۃ وسلام پہنچاتے ہیں اور کلمہ نی جو واحد متکلم کی ضمیر ہے، ذات پر دلالت کرتا ہے۔ (علم نحو کا قاعدہ ہے کہ ضمیر ذات پر دلالت کرتی ہے) اور آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی نہ تو صرف جسد اطہر کا نام ہے اور نہ محض روح مبارک کا بلکہ دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اگر صرف روح مبارک پر صلوٰۃ وسلام پیش کیا جاتا تو آپ فرمادیتے کہ میری رُوح پر اس کا عرض ہوتا ہے اور اگر محض بدنِ اطہر پر یہ عرض ہوتا۔ تب صرف بدن اطہر کا ذکر فرمادیتے مگر آپ نے تو اپنی ذات اقدس کا تذکرہ فرمایا ہے جو رُوح وجسم دونوں کے مرکب کا نام ہے۔ لہٰذا یہ روایت بھی آپ کی حیات کی دلیل ہے۔ اس روایت سے بھی یہ ثابت ہوگیا کہ دُور و دَراز سے جو لوگ درود وسلام پڑھتے ہیں وہ آپ تک بتوسط ملائکہ پہنچایا جاتا ہے۔ آپ خود اس کی سماعت نہیں فرماتے۔ جیسا کہ بعض جاہلوں کا خیال ہے۔ اس حدیث کی تشریح میں حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ”اس حدیث سے یہ تفصیل معلوم ہوگئی کہ فرشتوں کے ذریعہ آپ کو صرف وہی درود وسلام پہنچتا ہے جو کوئی دُور سے بھیجے لیکن اللہ تعالیٰ جن کو قبر مبارک کے پاس پہنچاوے اور وہ وہاں حاضر ہو کر صلوٰۃ وسلام عرض کریں تو آپ اس کو بنفس نفیس سنتے ہیں اور جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے ہر ایک کو جواب بھی عنایت فرماتے ہیں۔“ (معارف الحدیث ج ۵، ص ۸۰)

چھٹی دلیل

حافظ ابوالشیخ اصبہانی[۱] رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبدالرحمن بن احمد الاعرج[۲] رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے الحسن بن الصباح[۳] رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو معاویہ[۴] رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اعمش[۵] رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ ابو صالح[۶] رحمہ اللہ سے اور وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''من صلّی عند قبری سمعته و من صلی علیَّ من بعید أعلمته'' (جلاء الافہام لحافظ ابن القیم رحمہ اللہ ص ۱۹ و قال غریب جدًا)

---

۱ علامہ ذہبی رحمہ اللہ ان کو حافظ اصبہان، مسند زمان، الامام اور صاحب المصنفات السائرہ لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کثرت علم اور وافر حافظہ کے ساتھ نیک اور دیندار بھی تھے اور محدث ابن مردویہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور مامون تھے۔ علامہ خطیب ان کو حافظ ثبت اور متقن کہتے ہیں۔ حافظ ابو نعیم رحمہ اللہ ان کو احد الاعلام اور ثقہ کہتے ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۷، ۱۴۸) حافظ ابن القیم رحمہ اللہ ان کو الحافظ لکھتے ہیں۔ (اجتماع جیوش الاسلامیہ علیٰ غزو المعطلۃ و الجہمیۃ ص ۹۵، طبع امرتسر) اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ان کو الحافظ اور ثقہ لکھتے ہیں۔ (لسان المیزان ج ۶ ص ۳۹۵)

۲ ان کا مکمل نام عبدالرحمن بن احمد بن یزید الزہری رحمہ اللہ ہے۔ کنیت ابوصالح اور لقب الاعرج ہے۔ ۳۰۰ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ امام ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۳۰ھ) نے (تاریخ اصبہان ج ۲ ص ۱۱۳، طبع لندن) میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ان سے علاوہ امام ابوالشیخ اصبہانی رحمہ اللہ کے القاضی ابواحمد رحمہ اللہ محمد بن احمد بن ابراہیم رحمہ اللہ بھی روایت کرتے ہیں (ملاحظہ ہو تاریخ اصبہان ج ۲ ص ۱۱۳) اور مشہور محدث امام دارقطنی رحمہ اللہ (المتوفی ۳۸۵ھ) لکھتے ہیں کہ: ''وارتفاع اسم الجہالۃ ان یروی عنہ رجلان فصاعدا فاذا کان ہذہ صفتہ ارتفع عنہ اسم الجہالۃ و صار حینئذ معروفا'' (الدارقطنی ج ۲ ص ۳۶۱) ''یعنی جب دو یا دو سے زیادہ راوی کسی سے روایت کریں تو وہ جہالت کے دائرہ سے نکل جاتا ہے اور جب یہ صفت اس میں پائی جائے تو وہ مجہول نہیں رہتا بلکہ معروف ہو جاتا ہے۔'' امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اس ضابطہ کے مطابق عبدالرحمن بن احمد بن الاعرج رحمہ اللہ مجہول نہیں بلکہ معروف ہے اور عنقریب ذکر ہوگا۔ ان شاء اللہ کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور امام سخاوی رحمہ اللہ وغیرہ محدثین اس حدیث کی سند کو جید کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ عبدالرحمن بن احمد الاعرج رحمہ اللہ نہ تو مجہول العین ہیں اور نہ مجہول العدالت بلکہ ثقہ ہے۔ لہٰذا ان کو مجہول قرار دے کر ان کی حدیث سے اعراض کرنا علم و انصاف سے کوسوں دور ہے۔ نیز عبدالرحمن بن احمد الاعرج رحمہ اللہ کو بزور ابو عبدالرحمن محمد بن مروان السدی (المتوفی ۱۲۷ھ) قرار دے کر اس پر کی گئی جرح کو اس پر چسپاں کرنا فن اسماء الرجال سے بے خبری کا نتیجہ یا پری سینہ زوری کا مظاہرہ ہے۔ امام ابن عبدالہادی رحمہ اللہ نے (الصارم المنکی ص ۱۷۹، طبع مصر) میں جس راوی پر جرح کی ہے وہ ابو عبدالرحمن محمد بن مروان السدی ہے اور وہ بیہقی رحمہ اللہ کی روایت کی سند میں ہے اور ابوالشیخ اصبہانی رحمہ اللہ کی سند میں عبدالرحمن بن احمد الاعرج ہے اور یہ سند علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ کے پیش نظر نہیں ہے اور نہ وہ اس راوی اور اس سند کی تضعیف کرتے ہیں اور ان دونوں راویوں کا طبقہ بھی ایک نہیں ہے جیسا کہ ان کے سن وفات سے ظاہر ہے۔

۳ علامہ ذہبی رحمہ اللہ ان کو الحافظ الامام اور علم السنۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۵۵) اور بخاری میں ان کی متعدد روایتیں ہیں۔ (مثلاً ج ۱ ص ۳۹۰، ۴۶۷، ۵۰۳، ج ۲ ص ۷۹۲ وغیرہ ہیں) جن لوگوں نے اس راوی کو مختلف فیہ قرار دے کر اس سند کو کمزور کرنے کی لاحاصل سعی کی ہے، وہ اسماء الرجال سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔

۴ ابو معاویہ کا نام محمد بن خازم رحمہ اللہ ہے جو صحاح ستہ کے مرکزی راوی ہیں۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ ان کو الحافظ الثبت اور محدث الکوفہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۲۷۱) امام ابن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام اعمش رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں، اثبت ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۳۸) علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''ویضطرب فی غیر حدیث الاعمش'' (تذکرہ ج ۱ ص ۲۷۱) ''اعمش رحمہ اللہ کے علاوہ دوسروں سے روایت کرنے میں گڑبڑی کر جاتے ہیں۔'' اور یہ روایت اعمش رحمہ اللہ کے طریق سے ہے مگر صد حیرت ہے کہ اب تو ایسے ثقہ اور ثبت راوی کو بھی مختلف فیہ بنایا جا رہا ہے۔ فالی اللہ المشتکی (بقیہ حاشیہ نمبر ۵، ۶ اگلے صفحہ پر)

"جس نے میری قبر کے پاس درود پڑھا تو میں اُسے خود سنتا ہوں اور جس نے مجھ پر دُور سے درود شریف پڑھا تو وہ مجھے (بواسطہ فرشتوں کے) بتلایا جاتا ہے۔"

اس حدیث کے جملہ راوی ثقہ اور معروف ہیں اور محدثین کی خاصی جماعت اس حدیث کو صحیح مانتی اور کہتی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ابوالشیخ کی مذکورہ سند کے بارے میں فرماتے ہیں۔ سند جید! (فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۲)

علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "و سندہ جید" (القول البدیع ص ۱۱۶) حضرت ملّا علی القاری رحمہ اللہ بھی اس کو بسند جید فرماتے ہیں۔ (مرقات ج ۲ ص ۱۰) نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں: "اسنادہ جید" (دلیل الطالب ص ۸۴۴) مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ بھی اس کو بسند جید فرماتے ہیں۔ (فتح الملہم ج ۱ ص ۳۳۰)

ان اکابر محدثین کے (جن میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جن کی "تقریب" اور "تہذیب التہذیب" پر آج رواۃ کی توثیق و تضعیف کا مدار ہے) بیان سے واضح ہو گیا کہ یہ روایت جید اور صحیح ہے۔ ان دونوں لفظوں میں کوئی خاص اُصولی فرق نہیں ہے۔

چنانچہ امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "ان ابن الصلاح یری التسویۃ بین الجید و الصحیح و لذا قال بلقینی بعد ان نقل ذٰلک من ذٰلک یعلم ان الجودۃ یعبر بھا عن الصحۃ و فی جامع الترمذی فی الطلب ھذا حدیث جید حسن و کذا قال غیرہ لا مغایرۃ بین جید و صحیح عندھم الا ان الجھبذ منھم لا یعدل عن صحیح الی جید الا لنکتۃ کان یرتقی الحدیث عندہ عن الحسن لذاتہ و یتردد فی بلوغہ الصحیح فالوصف بہ انزل رتبۃ من الوصف بصحیح و کذا القوی" (تدریب الراوی ص ۱۰۴، طبع مصر)

(بقیہ حاشیہ جات گزشتہ صفحہ) ⑤ علامہ ذہبی رحمہ اللہ ان کو الحافظ الثقہ اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۴۵) "ان میں تشیع تھا مگر کیا یہ اسی حدیث پر اثر انداز ہے یا صحاح ستہ کی تمام روایات پر بھی جن کو اُمتِ مسلمہ صحیح سمجھتی ہے، ان کا نام سلیمان بن مہران رحمہ اللہ تھا۔" جلیل القدر محدث اور صحاح ستہ کے مرکزی راوی ہیں۔ مؤلف اقامۃ البرہان نے اس پر خاصہ زور صرف کیا ہے کہ: "یہ مدلس ہیں اور بغیر تصریح سماع کے ان کی حدیث قابل احتجاج نہیں۔" (فیصلہ ص ۲۴۱) اور یہی اعتراض (ندائے حق ص ۱۹۳) میں ہے: "مگر ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ امام اعمش رحمہ اللہ ان مدلسین میں شامل ہیں جن کی تدلیس مطلقاً معتبر نہیں ہے۔" (توجیہ النظر ص ۲۵۱)

⑥ ابوصالح کا نام ذکوان اور لقب السمان الزیات ہے۔ صحاح ستہ کے مرکزی راوی ہیں۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ ان کو حفاظ محدثین میں لکھتے ہیں اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: "ثقۃ ثقۃ من اجل الناس و اوثقھم" (تذکرہ ج ۱ ص ۸۳) یعنی وہ ذبل ثقہ اور جلیل القدر اور ثقہ تر لوگوں میں سے تھے۔ امام ابن معین رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور ابوحاتم رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور صالح الحدیث کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان کی حدیث سے احتجاج کیا جاتا ہے۔ امام ابوزرعہ رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور مستقیم الحدیث کہتے ہیں۔ علامہ ابن سعد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ امام ساجی رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور صدوق کہتے ہیں۔ امام حربی رحمہ اللہ اور ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور امام عجلی رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۱۹، ۲۲۰)

نوٹ ضروری: یہ راوی نہ تو ابوصالح مولی التوامہ ہے جس کا نام نبہان ہے اور نہ یہ ابوصالح مولی ام ہانی ہے جس کا نام باذام یا باذان ہے جن پر کچھ کلام بھی ہے اور امام اعمش رحمہ اللہ کی ان سے روایت منقطع بھی ہے۔ یہ راوی بلا شک اور بلا شبہ ابوصالح ذکوان السمان ہے۔ البتہ خواہ مخواہ کی سینہ زوری کا کوئی علاج نہیں ہے اور ابومعاویۃ عن الاعمش عن ابی صالح عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ بخاری کی سند ہے۔ (مثلاً ملاحظہ ہو ج ۲ ص ۷۳۵ وغیرہ) امام بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ نے جس ابوصالح پر کلام کیا ہے وہ یہ ہرگز نہیں ہے۔ اس کی کڑی اس سے ملا کر اس روایت کو ضعیف قرار دینا اسماء الرجال کا خون کرنا ہے۔

"امام ابن الصلاح رحمہ اللہ جیّد اور صحیح کو ایک ہی قرار دیتے ہیں اور اس لئے بلقینی رحمہ اللہ نے یہ نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ صحت کی تعبیر جودت سے کی جاسکتی ہے اور ترمذی رحمہ اللہ نے "ابواب الطب" میں ایک جگہ کہا ہے کہ یہ حدیث جیّد اور حسن ہے اور اسی طرح دوسروں نے بھی کہا ہے۔ محدّثین کے نزدیک جیّد اور صحیح میں کوئی فرق نہیں ہے مگر ان میں سے جب بھی کوئی ماہر بجائے صحیح کے جیّد کہے گا تو اس میں کوئی نکتہ ہوگا۔ مثلاً اس کے نزدیک وہ روایت حسن لذاتہٖ سے تو اُوپر ہوگی مگر اس کے صحیح کہنے میں تردّد ہوگا۔ اس لئے وہ بجائے صحیح اور قوی کے جیّد کا لفظ اس پر اطلاق کرے گا۔"

الغرض جیّد اور صحیح ایک ہوں یا جیّد صحیح سے نیچے اور حسن لذاتہٖ سے اُوپر ہو جمہور محدثین کے نزدیک اس کے حجت ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ امام ابن الصلاح رحمہ اللہ (المتوفی ۶۴۳ھ) کے نزدیک جیّد اور صحیح میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے نزدیک یہ دونوں ایک ہیں اور اس نظریہ میں دیگر محدثین کرام رحمہم اللہ بھی ان کے ہم نوا ہیں۔ جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے اور خود امام ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "ومتی قالوا هذا حدیث صحیح فمعناه انه اتصل سنده مع سائر الاوصاف المذكورة" (مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۰، طبع مدینہ منورہ)

"جب محدّثین یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی سند متصل ہے۔ مع مذکور اوصاف کے جو صحت کے لئے ضروری ہیں۔"

اور جو حضرات صحیح اور جیّد میں فرق ملحوظ رکھتے ہیں اور اس کے لئے نکتہ بیان کرتے ہیں تو وہ بھی جیّد کو حسن لذاتہٖ سے اُونچا مقام دیتے ہیں اور جمہور محدثین کرام رحمہم اللہ کے نزدیک حدیث حسن بھی حجت اور قابلِ استدلال ہے۔ اگر بالفرض اس میں کچھ معمولی سا ضعف اور کمی بھی ہو تو اُمتِ مسلمہ کے اجماع اور اس پر تعامل سے وہ ضعف بھی رفع ہو جاتا ہے اور اس حدیث کے قابلِ احتجاج ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

علامہ طاہر بن صالح الجزائری رحمہ اللہ حافظ ابن حزم الظاہری رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: "اذا ورد حدیث مرسل او فی احدنا قله ضعف فوجدنا ذلک الحدیث مجمعها علی اخذه والقول به علمنا یقینا انه حدیث صحیح لاشک فیه" (توجیہ النظر ص ۵۰، الی اصول الاثر، طبع مصر)

"اور جب کوئی مرسل حدیث ہو یا کوئی ایسی حدیث ہو جس کے کسی راوی میں ضعف ہو اور ہم یہ دیکھیں کہ سب لوگوں کا اس پر اجماع ہے اور سب اس کے قائل ہیں تو یقیناً ہم یہ جان لیں گے کہ وہ حدیث صحیح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔"

اور اس پیش کردہ حدیث کا مقام بھی یہی ہے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک کوئی شخص اہل سنت والجماعت میں ایسا نہیں گزرا، جو یہ کہتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عند القبر صلوٰۃ وسلام کا سماع نہیں فرماتے۔ تمام اہل سنت والجماعت کا آپ کے سماع عند القبر پر اتفاق ہے۔ کوئی اس کا مخالف نہیں گزرا اور کتب اہل اسلام میں اس کے خلاف ایک بھی صریح حوالہ موجود نہیں ہے۔ من ادعی خلافه فعلیه البیان!

اعتراض: ممکن ہے کوئی صاحب یہ کہہ دیں کہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اس روایت کو غریب جداً کہا ہے

تو پھر اس سے احتجاج واستدلال کیسا؟ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''غریب حدیثیں مت لکھا کرو، کیونکہ وہ منکر ہوتی ہیں اور اکثر ضعیف راویوں سے مروی ہوتی ہیں اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''شر العلم الغریب'' کہ برا علم غریب حدیثوں کا ہوتا ہے۔'' اور امام عبدالرزاق فرماتے ہیں کہ: ''ہم غریب الحدیث کو بہتر سمجھتے تھے مگر وہ بدتر نکلی اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص غریب الحدیث طلب کرتا ہے تو وہ جھوٹ کا مرتکب ہے۔'' (محصلہ تدریب الراوی ص ۳۷۶، طبع مصر)

الجواب: یہاں دو باتیں ہیں: ایک غریب الحدیث اور دوسری کسی حدیث کا غریب ہونا اور محدثین کرام رحمہم اللہ کے نزدیک ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے کہ ایک متن حدیث سے متعلق ہے اور دوسری بالعموم سند سے، امام ابن الصلاح بتیسویں نوع میں بحث غریب الحدیث کا بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''وھو عبارت عما وقع فی متون الاحادیث من الالفاظ الغامضة البعیدة من الفھم لقلة استعمالھا ھذا فن مھم یقبح جھلة باھل الحدیث خاصة خاصة ثم باھل العلم عامة الخوض فیہ لیس بالھین'' (مقدمہ ابن الصلاح ص ۲۴۵)

غریب الحدیث وہ فن ہے جس میں متون احادیث میں ایسے الفاظ سے بحث کی جاتی ہے جو نہایت مشکل اور فہم سے بعید ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ قلیل الاستعمال ہوتے ہیں اور یہ اہم فن ہے۔ محدثین کا اس سے جاہل رہنا خصوصاً اور دیگر اہل علم کا عموماً قبیح ترین فعل ہے، مگر اس میں دخل دینا بھی آسان کام نہیں ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''غریب الحدیث ھو ما وقع فی متن الحدیث من لفظة غامضة بعیدة من الفھم لقلة استعمالھا وھو فن مھم والخوض فیہ صعب فلیتحر خائضہ الخ''

غریب الحدیث اس کو کہتے ہیں کہ متن حدیث میں کوئی مشکل اور بعید از فہم لفظ واقع ہو کیونکہ اس کا استعمال کم ہوا ہے اور یہ اہم فن ہے اور اس میں خوض اور دخل دینا بہت مشکل ہے۔ سو اس میں خوض کرنے والے کو محنت اور کوشش کرنی چاہیے۔ (تقریب النووی مع تدریب الراوی ص ۳۷۸، طبع مصر)

چونکہ یہ فن بڑا مشکل ہے اور ہر کہ ومہ کی اس تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام عبدالرزاق اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اس میں دخل دینے سے منع کیا ہے۔ تاکہ نا اہل لوگ اس میں دخل دینے پر جری نہ ہو جائیں اور ایسے غریب اور مشکل الفاظ صحیح حدیثوں میں بھی اکثر آ جاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس حدیث پر لفظ غریب بولا گیا وہ صحت کے معیار ہی سے گر گئی اور ضعیف ہو گئی۔ جیسا کہ نہایت ہی سطحی قسم کے لوگوں نے سوء فہم سے یہ سمجھ رکھا ہے، اور من صلّی عند قبری الحدیث اس معنی میں غریب نہیں ہے، کیونکہ اس کے متن میں کوئی ایسا لفظ واقع نہیں جو بعید از فہم اور مشکل ہو۔ پھر اس حدیث کو غریب الحدیث کی مد میں لے جانا اور پھر اس کو ضعیف قرار دینا اہل علم کی شان سے بالکل بعید ہے اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہاں! البتہ حضرت امام احمد بن حنبل نے جن غرائب کا ذکر کیا ہے وہ ایسی غریب حدیثیں ہیں جن کی سند میں کوئی راوی متفرد ہو اور ایسی احادیث کے لکھنے سے انہوں نے منع فرمایا ہے اور وجہ یہ بیان کی کہ وہ اکثر ضعیف راویوں سے مروی ہوتی ہیں اور منکر ہوتی ہیں۔ اکثر غرائب بڑے شوق سے مناکیر اور ضعفاء سے مروی ہوں، یہ دعویٰ ہم نے کب کیا ہے کہ ہر غریب

حدیث صحیح ہوتی ہے اور امام احمد بن حنبل نے بھی یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ تمام غرائب منکر اور ضعیف ہوتی ہیں، ان کا دعویٰ بھی تو یہی ہے کہ ان میں اکثر ضعیف ہوتی ہیں۔ ہاں! ان میں صحیح بھی ہیں اور لفظ عامتہا اس کا واضح قرینہ ہے۔

امام ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ: ''ثم ان الغریب ینقسم الیٰ صحیح کالافراد المخرجۃ فی الصحیح والیٰ غیر صحیح وذلک ھو الغالب علی الغرائب'' (مقدمہ ۲۴۴)

پھر غریب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک صحیح جیسے ان متفرد راویوں کی حدیثیں جن کی صحیح میں تخریج کی گئی ہے اور دوسری غیر صحیح اور غرائب پر یہی غالب ہے۔''

اس عبارت سے بھی واضح ہوا کہ تمام غرائب غیر صحیح نہیں ہیں بلکہ ان میں صحیح بھی ہیں اور امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وینقسم الی صحیح وغیرہ وھو الغالب'' (تقریب النواوی ص ۳۷۶)

''کہ غریب کی دو قسمیں ہیں ایک صحیح اور دوسری غیر صحیح اور غالب یہی ہے۔''

اس سے بھی معلوم ہوا کہ غریب حدیثیں صحیح بھی ہوتی ہیں اور امام ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بخاری کی پہلی حدیث ''انما الاعمال بالنیات'' غریب ہے۔ فان اسنادہ متصف بالغرابۃ' (مقدمہ ابن الصلاح ص ۲۴۵) اس کی سند غرابت سے متصف ہے۔

تو کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ ضعیف ہے؟ اور بخاری اور مسلم میں متعدد روایتیں اس لحاظ سے غریب ہیں کہ اُن میں کہیں راوی متفرد ہوتا ہے مگر ہیں وہ صحیح اور ترمذی شریف میں متعدد مقامات پر آتا ہے۔ ھذا حدیث حسن غریب صحیح غریب (مزید تشریح شرح نخبۃ الفکر ص ۳۵) اور (توجیہ النظر ص ۱۶۱) وغیرہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ اگر غرابت صحت کے منافی ہوتی تو یہ حسن اور صحیح کے ساتھ کیسے جمع ہوگئی؟ محض غریب غریب کہہ کر پوری اُمت مسلمہ کی مخالفت کر کے اس جید اور صحیح حدیث کو ضعیف قرار دینا کوئی دینی اور علمی خدمت نہیں ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ان الغرابۃ لاتنافی الصحۃ ویجوز ان یکون الحدیث صحیحا غریبا'' (مقدمہ مشکوٰۃ ص ۶، طبع اصح المطابع دہلی)

''بلاشک غرابت صحت کے منافی نہیں ہے اور جائز ہے کہ حدیث صحیح غریب ہو۔''

اور مؤلف (ندائے حق ص ۱۸۴) میں لکھتے ہیں کہ اور بری وحدت راوی معتبر نہیں اور نہ یہ جرح ہے۔ وحدۃ الراوی لیس بجرح عندنا'' (فواتح الرحموت ج ۱ ص ۴۳۵)

الغرض! اس روایت پر اُصولِ حدیث کے رُو سے کوئی ایسا اعتراض وارد نہیں ہوا جو اس کی صحت اور اس کے قابلِ احتجاج ہونے پر اثر انداز ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ساری اُمت اس کے مفہوم پر متفق ہے۔

نوٹ ضروری: اسی مضمون کی روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے امام بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ نے روایت کی ہے لیکن اس کی سند میں محمد بن مروان السدی الصغیر ہے جو ضعیف لیس بشیٔ غیر ثقہ، کذاب ذاھب الحدیث، متروک الحدیث اور وضاع ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۳۶ وغیرہ)

اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ففی اسنادہ نظر تفرد بہ محمد بن مروان السدی الصغیر وھو متروک'' اس کی سند میں کلام ہے۔ کیونکہ اس میں محمد بن مروان السدی الصغیر متفرد ہے اور وہ متروک ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۱۵)

لیکن جمہور اہل السنت والجماعت کا استدلال ابوالشیخ[1] رحمہ اللہ کی سند سے ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے اور جس کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور امام السخاوی رحمہ اللہ وغیرہ محدثین بسند جید فرماتے ہیں جمہور کا مستدل سُدی والی روایت سے نہیں ہے۔ اس لئے اہل علم اور دیانت دار آدمی کا ہرگز یہ کام نہیں کہ خلط مبحث کرے اور ایسے صریح فرق کو نظر انداز کر دے۔

فنّی کوتاہ فہمی

بسا اوقات محدّثین کرام رحمہم اللہ فنّی طور پر بعض اسانید پر کلام کرتے ہیں لیکن ان کے متون سے جو مسائل اور احکام ثابت ہوتے ہیں وہ کثرت شواہد اور تعامل اُمت اور اس کی تلقی بالقبول کی وجہ سے ان کو معمول بہ قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح حدیث من صلّی عَلَیَّ عند قبری (کی اس سند پر جس میں محمد بن مروان السدّی ہے۔ مگر ہمارا استدلال اس سے نہیں ہے ہمارا مستدل تو ابوالشیخ رحمہ اللہ کی سند ہے) پر فنّی اور روایتی لحاظ سے بعض اکابر علماء نے کلام کیا ہے لیکن بایں ہمہ دیگر احادیث کی تائید اور اُمت کے تعامل سے وہ اس سے ثابت حکم کو معمول بہ قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وقد روی ابن ابی شیبة والدار قطنی عنه من صلّی عَلَیَّ عند قبری سمعته و من صلّی عَلَیَّ نَائیا ابلغته و فی اسناده لین لکن له شواهد ثابتة فان ابلاغ الصلٰوة و السلام علیه من البعد قد رواه اهل السنن من غیر وجه'' (فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ج ۴ ص ۳۱۶ و طبع جدید ج ۲۷ ص ۱۱۶)

''ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ اور دارقطنی رحمہ اللہ نے آنحضرت ﷺ سے روایت کی ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے مجھ پر میری قبر کے پاس (صلوٰۃ و) سلام کہا تو میں خود سُنتا ہوں اور جس نے دُور سے پڑھا تو وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے اس کی سند کمزور ہے لیکن اس کے کئی شواہد ثابت ہیں۔ کیونکہ دُور سے آپ ﷺ کو صلوٰۃ و سلام پہنچانے کی روایت متعدد طرق سے اہل السنن نے بیان کی ہے۔''

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ علمی طور پر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سند کے لحاظ سے اگرچہ یہ روایت کمزور ہے لیکن اپنے شواہد کی تائید سے یہ روایت قابلِ اعتبار و عمل ہے۔

اور علّامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''فاما ذٰلک الحدیث و ان کان معناه صحیحاً فاسناده لا یحتج به و انما یثبت معناه باحادیث أخر فانه لا یعرف اِلّا من حدیث محمد بن مروان السدی الصغیر عن الاعمش کما ظنّه البیهقی رحمہ اللہ و ما ظنه فی هذا هو متفق علیه عند اهل المعرفة و هو عندهم موضوع علی الاعمش'' بہرحال یہ حدیث اگرچہ اس کا معنیٰ صحیح ہے لیکن اس کی سند قابلِ احتجاج نہیں ہے۔ البتہ اس کا معنیٰ دوسری احادیث کی روشنی میں ثابت ہے۔ یہ روایت اعمش رحمہ اللہ سے محمد بن مروان السدی الصغیر کے طریق ہی سے معروف ہے، جیسا کہ بیہقی رحمہ اللہ نے خیال کیا ہے اور ان کا خیال اس فن کی معرفت رکھنے والوں کے ہاں اتفاقی اَمر ہے اور یہ ان کے نزدیک (بطریق محمد بن مروان) اعمش رحمہ اللہ پر موضوع ہے۔ (الصارم المنکی ص ۱۳۱)

---

[1] (ماہنامہ تعلیم القرآن ص ۴۸) اکتوبر ۱۹۶۷ء میں ہے: اُس حدیث کی جو سند سدی صغیر پر مشتمل ہے اس کو بوجہ راوی مذکور کے کمزور کہا جائے گا اور جس سند میں یہ راوی نہیں ہے وہ کمزور نہیں ہے اور حدیث ہذا کی دوسری سند بھی ہے جس کے صحیح ہونے کی تصریح کرتے ہیں۔ چنانچہ ملا علی القاری الحنفی رحمہ اللہ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں: ''قال میرک نقلاً عن الشیخ و رواه ابو الشیخ و ابن حبان فی کتاب ثواب الاعمال بسند جید''

اور نیز لکھتے ہیں کہ یہ حدیث آنحضرت ﷺ پر موضوع ہے نہ تو یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کی اور نہ ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ اور اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے اور محمد بن مروان السدی متہم بالکذب والوضع ہے اور نیز فرماتے ہیں کہ بعض نے یہ روایت ابو معاویہ رحمۃ اللہ علیہ عن الاعمش رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے بیان کی ہے اور یہ کھلی غلطی ہے۔ اس حدیث میں محمد بن مروان ہی متفرد ہے اور وہ متروک الحدیث اور متہم بالکذب ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ علامہ ابن عبد الہادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو سند کے لحاظ سے گرانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی اور ''محمد بن مروان عن الاعمش'' کے طریق کو موضوع تک کہتے ہیں۔ (اور اسی اُدھوری بات کو مؤلف ''ندائے حق'' نے پلّے باندھ رکھا ہے) لیکن دوسری احادیث کی روشنی میں وہ اس کے معنی اور مدلول کو صحیح کہتے ہیں اور اس کا معنی صحیح تسلیم کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں کہ:

''وھو ﷺ یسمع السلام من القبر و تبلغہ الملٰئکۃ الصلوۃ و السلام من البعد'' (الصارم المنکی ص ۲۸۲)

''آنحضرت ﷺ قبر کے پاس سے سلام خود سُنتے ہیں اور دُور سے فرشتے آپ کو صلوٰۃ وسلام پہنچاتے ہیں۔''

اور تصریح فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ صرف عند القبر صلوٰۃ وسلام سُنتے ہی نہیں بلکہ جواب بھی دیتے ہیں۔

چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''و اما من صلّی علیہ عند قبرہ فانہ یرد علیہ'' (الصارم المنکی ص ۱۶۵)

''جو شخص عند القبر آپ کو سلام کہتا ہے آپ اس کے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں۔''

اور نیز لکھتے ہیں کہ: ''و اما من سلّم علیہ عند قبرہ فانہ یرد علیہ و ذٰلک کالسلام علی سائر المؤمنین لیس ھو من خصائصہ'' (الصارم المنکی ص ۱۳۱)

''بہر حال جس نے آپ ﷺ پر عند القبر سلام کہا تو آپ اس کا جواب دیتے ہیں اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سب مؤمن سلام کا جواب دیتے ہیں یہ صرف آپ ﷺ ہی کی خصوصیت نہیں ہے۔''

ان تمام عبارات سے معلوم ہوا کہ موصوف رحمۃ اللہ علیہ فنی طور پر اس حدیث کی سند پر کلام کرنے کے باوجود اصل مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کرتے اور عند القبر آپ ﷺ کے صلوٰۃ وسلام سُننے اور جواب دینے کے وہ اسی طرح قائل ہیں۔

جیسے دیگر علماء مِلّت قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ: ''ثم حکم ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ مع ذٰلک بصحتہ لتلقی العلماء لہ بالقبول فردہ من حیث الاسناد و قبلہ من حیث المعنٰی'' (نیل الاوطار ج ۱ ص ۲۴)

''پھر باوجود اس کے ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کیونکہ علماء نے اس کو قبول کیا ہے۔ سو ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو سند کے لحاظ سے رد کیا ہے اور معنی کے لحاظ سے قبول کیا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جب کسی ضعیف حدیث کے شواہد موجود ہوں یا علماء اُمت نے اس کو قبول کر کے اس پر تعامل کیا ہو تو وہ حدیث باوجود کمزور ہونے کے قابلِ عمل ہوتی ہے۔ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس سلسلہ میں بعض عبارتیں ہم نے ''سماع الموتیٰ'' میں عرض کر دی ہیں ان کو وہیں ملاحظہ فرمالیں۔ اس بحث کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد مؤلف کا (ندائے حق ص ۱۳۷) میں یہ لکھنا کہ: ''پھر اجلّہ محدّثین کا اس حدیث کی سند پر جرح کرنا ہی دلیل ہے۔ اس حدیث کے غیر معمول بہ ہونے کے۔'' سراسر مردود ہے اور بالکل قابلِ التفات ہی نہیں ہے۔

فائدہ: علامہ ابن عبد الہادی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق میں یہ روایت صرف محمد بن مروان عن الاعمش کی سند ہی سے معروف ہے اور بقول ان کے یہ سند موضوع بھی ہے لیکن بایں ہمہ وہ اس کے معنی کو صحیح کہتے ہیں جیسا کہ آپ نے خود انہی کی عبارات سے یہ حقیقت ملاحظہ کر لی ہے برخلاف اس کے ہمارا اور جمہور کا مستدل ہرگز یہ سند نہیں ہے بلکہ ہمارا

استدلال ابوالشیخ رحمہ اللہ کی سند سے ہے۔ مؤلف نے (ندائے حق ص ۱۸۴ تا ۱۹۰) تک بلا وجہ محض تک بندی سے اور پٹواریوں کی طرح نقشہ نویشی سے اس کو ناقابلِ اعتبار بنانے کی بے جا سعی کی ہے۔ مگر اس سے کیا حاصل؟ ابوالشیخ رحمہ اللہ کی سند اُصول حدیث کے رُو سے جید ہے اور اُمت مرحومہ کے تعامل کی وجہ سے معمول بہ ہے: ''لا ریب فیہ'' اگر علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ کو اس سند کا علم نہیں تو کیا مضائقہ ہے۔ انہی کے اُستاد بھائی، وسیع النظر، محقق عالم حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اور حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اور امام سخاوی رحمہ اللہ وغیرہ کو (جو علم حدیث میں مسلم شخصیتیں ہیں) اس کا علم ہے اور اُصول حدیث کا مسئلہ ہے۔ (من عرف حجة علی من لم یعرف)

الغرض! علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ کے محمد بن مروان عن الاعمش کے طریق پر کلام کرنے بلکہ اسے موضوع کہنے سے ابوالشیخ رحمہ اللہ کی سند پر قطعاً کوئی زد نہیں پڑتی، جیسا کہ اہل علم اور ارباب انصاف پر یہ ظاہر ہے۔

خود علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''والعلماء المتنازعون کل منهم یحتج بدلیل شرعی و یکون عند بعضهم من العلم ما لیس عند الأخر فان العلماء ورثة الانبیاء قال الله تعالٰی وداؤدَ و سلَیمَانَ اِذْ یَحْکُمَانِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَ کُنَّا لِحُکْمِهِمْ شَاهِدِیْنَ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمَانَ وَ کُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّ عِلْمًا'' اور علماء جو آپس میں اختلاف کرتے ہیں، ان میں سے ہر ایک شرعی دلیل سے احتجاج کرتا ہے۔ کیونکہ بعض کے پاس وہ علم ہوتا ہے جو دوسرے کے پاس نہیں ہوتا۔ بلا شبہ علماء حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''داؤد اور سلیمان نے کھیتی کے بارے جس وقت فیصلہ کیا جب رات کے وقت اس میں قوم کی بکریاں جا پڑیں اور ہم ان کے فیصلہ پر گواہ تھے اور ہم نے فیصلہ کی بات سلیمان کو سمجھادی اور ہر ایک کو ہم حکم اور علم دیا۔ (ص ۲۷۹)

علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک چیز کا علم تھا اور حضرت داؤد علیہ السلام کو نہ تھا اور علماء حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں اور ان کے علم کا بھی یہی حال ہے۔

ساتویں دلیل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''لیهبطن عیسٰی ابن مریم حکمًا واماما مقسطا ویسلکن فجاحاجا او معتمرا ولیأتین قبری حتّٰی یسلم علیّ ولا ردن علیه''

''البتہ ضرور حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نازل ہوں گے منصف اور امام عادل ہوں گے اور البتہ ضرور وہ فج (جگہ کا نام ہے) کے راستے پر حج یا عمرہ کے لئے چلیں گے اور بلاشبہ وہ میری قبر پر آئیں گے۔ حتیٰ کہ وہ مجھے سلام کہیں گے اور بلا شک میں ان کے سلام کا جواب دوں گا۔'' (الجامع الصغیر ج ۲ ص ۱۴۰، وقال صحیح)

یہ روایت (مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۰، مستدرک ج ۲ ص ۵۹۵) میں بھی ہے اور امام حاکم رحمہ اللہ اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ دونوں اس کو صحیح کہتے ہیں اور ایک روایت میں یوں آتا ہے: ''ثم لئن قام علی قبری فقال یا محمد لأجیبنَّه۔ رواه ابو یعلی ورجاله رجال الصحیح'' (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۱۱)

''پھر اگر وہ میری قبر پر کھڑے ہو کر فرمائیں گے یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو میں ضرور ان کو جواب دوں گا۔ اس کو امام ابو یعلی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی بخاری کے راوی ہیں۔''

آنحضرت ﷺ کی حالت قبر مبارک میں جو اَب ہے وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت بھی ہوگی۔ بالفاظِ دیگر اُس وقت آپ کی قبر مبارک میں آپ پر کوئی نئی حالت طاری نہیں ہوگی جو مثلاً اَب نہیں ہے اور اس تفریق پر کوئی شرعی دلیل بھی قائم نہیں ہے۔ سوا گر اُس وقت آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سلام سُنیں گے اور اس کا جواب دیں گے تو اس وقت بھی یہ ممکن بلکہ واقع ہے اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ عرضِ سلام اور اس کا جواب آپ کی ذات گرامی سے وابستہ ہے جو جسم مع الروح کا نام ہے، نہ صرف جسم سے اور نہ تنہا روح سے۔ اس صحیح روایت سے بھی معلوم ہوا کہ ''عند القبر'' آنحضرت ﷺ کا صلوٰۃ وسلام کا سماع محقق ہے اور آپ کا جواب دینا بھی ثابت ہے اور اس کا انکار صحیح حدیث کا انکار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول متواتر احادیث سے ثابت ہے

تمام اہلِ اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان کی طرف اُٹھایا گیا ہے اور قربِ قیامت وہ آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے، دجّال لعین کو قتل کریں گے اور یہود و دیگر کفار سے جہاد کریں گے اور زمین پر قرآن و حدیث کی حکومت جاری فرمائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ: ''جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھالیں تو وہ اپنے صحابہ کی طرف نکلے۔'' (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۷۴) اور اس کی سند صحیح ہے (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۷۵) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری کیسی (اچھی) حالت ہوگی جب کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام تم میں آسمان سے نازل ہوں گے۔ (کتاب الاسماء والصفات ص ۳۰۱، للبیہقی رحمہ اللہ، طبع الٰہ آباد) اور ''من السّماء'' کے الفاظ (مجمع الزوائد ج ۷ ص ۳۴۹) اور (کنز العمال ج ۷ ص ۲۶۸ اور منتخب کنز بر حاشیہ مسند احمد ج ۶ ص ۵۶) میں بھی موجود ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہونے کے بعد زمین میں چالیس سال رہیں گے۔ (ابوداؤد طیالسی ص ۳۳۱، مستدرک ج ۲ ص ۵۹۵)

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اُمت مسلمہ کا اس امر پر اجماع ہے جس کی بنیاد متواتر احادیث پر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور آخر زمانہ میں نازل ہوں گے۔ (تفسیر بحر محیط ج ۲ ص ۴۷۳)

امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اُمت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھایا ہے۔ (کتاب الابانہ عن اُصول الدیانہ ص ۴۶، طبع حیدر آباد دکن)

امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور ان کی نبوت کی نفی کفر ہے۔ (الحاوی للفتاوٰی ج ۲ ص ۱۶۶) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''آنحضرت ﷺ کی متواتر احادیث (تقریباً نو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایتوں کا حوالہ بھی دیا ہے) سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ وہ شام میں دمشق کے اندر سفید مشرقی مینار پر صبح کی نماز کے وقت نازل ہوں گے۔'' (محصلہ تفسیر ج ۱ ص ۵۸۲)

نواب صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آخر زمانہ میں نازل ہونا متواتر احادیث سے ثابت ہے۔'' (فتح البیان ج ۲ ص ۳۴۴)

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''جو شخص آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر کسی اور نبی کے آنے کا قائل ہو تو اس کے کفر میں دو آدمیوں نے بھی شک نہیں کیا۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک اُمر میں سب پر حجت قائم ہو چکی ہے۔'' (الملل والنحل ج ۳ ص ۱۳۹)

الغرض! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع اور پھر نزول تواتر اور قطعیت سے ثابت ہے جو اس کا انکار یا تاویل کرے وہ کافر ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا فیصلہ

مسلمانوں کے جملہ فرقے خواہ وہ کسی بھی مکتبِ فکر سے متعلق ہیں، اس بات پر متفق ہیں اور ان کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور قیامت سے قبل ضرور نازل ہوں گے اور اس بات کو مرزا قادیانی بھی ماننے پر مجبور ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ: ''یہ اَمر پوشیدہ نہیں کہ مسیح بن مریم کے آنے کی پیش گوئی ایک اَوّل درجہ کی پیش گوئی ہے جس کو سب نے باتفاق قبول کرلیا ہے۔ تواتر کا اَوّل درجہ اس کو حاصل ہے۔''

(ازالہ اوہام ص ۵۵۷، خزائن ج ۳ ص ۴۰۰) اور نیز لکھا ہے کہ: ''مثلاً صحیح مسلم کی حدیث میں یہ لفظ موجود ہے کہ حضرت مسیح جب آسمان سے اُتریں گے تو ان کا لباس زرد رنگ کا ہوگا۔'' (ازالہ اوہام ص ۸۱، خزائن ج ۳ ص ۱۴۲)

الحاصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد اور آسمان سے نزول کا اقرار قادیانی دجّال کو بھی ہے۔

باب ہفتم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عند القبر سماع کے بارے میں علماءِ اسلام کا نظریہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عند القبر صلوٰۃ و سلام کے سماع کے بارے میں متعدد حوالے پہلے عرض کر دیئے گئے ہیں۔ ان کے اعادہ کی حاجت نہیں ہے جو حوالے پہلے مذکور نہیں ہیں ان میں سے بعض کا بیان سُن لیجئے۔

علّامہ مناوی رحمہ اللہ حدیث من صَلّی علیَّ کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''من صلی علیَّ عند قبری سمعتہٗ و من صلّی علیَّ ''نائیا'' ای بعید ''ابلغتہٗ'' ای اخبرت بہ من احد من الملٰئکۃ و ذلک لان لروحہ تعلقا بمقر بدنہ الشریف و حرام علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء'' (فیض القدیر ج ۶ ص ۱۷۰، طبع مصر)

''جس نے میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھا تو میں خود سُنتا ہوں اور جس نے دُور سے پڑھا تو میرے پاس وہ پہنچایا جاتا ہے۔ یعنی کسی فرشتہ کے ذریعہ مجھے اس کی خبر دی جاتی ہے اور یہ اس لئے کہ آپ کی روح مبارک کا آپ کے بدن شریف سے تعلق ہے اور زمین پر پیغمبروں کے جسم حرام کر دیئے گئے ہیں۔''

اور کم و بیش یہی عبارت اس مقام پر علامہ عزیزی رحمہ اللہ کی ہے۔ (السراج المنیر ج ۳ ص ۳۷۰)

علّامہ مناوی رحمہ اللہ کو اس مقام پر ایک صریح مغالطہ ہوا ہے وہ یہ کہ ان کو ابوالشیخ رحمہ اللہ کی سند کا علم نہیں ہے اور ''سدی'' کی سند کے پیشِ نظر انہوں نے اس پر کلام کیا ہے۔ ''سدی'' واقعی نامعتبر ہے لیکن مدار ابوالشیخ کی سند پر ہے۔

کما مرّ مفصلاً اور حضرت مُلّا علی القاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''من صلی علیَّ عند قبری سمعتہٗ ای سماعا حقیقیا بلا واسطۃ'' (مرقات ج ۲ ص ۱۰، ونحوہ فی شرح الشفاء ج ۳ ص ۵۰۰)

''جس شخص نے مجھ پر میری قبر کے پاس درود پڑھا تو میں خود اس کو سنتا ہوں یعنی حقیقی طور پر فرشتوں کے توسط کے بغیر میں خود سنتا ہوں۔''

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ سماع صلوٰۃ وسلام کا مسئلہ کوئی کنایہ یا رمز نہیں بلکہ حقیقی سماع پر محمول ہے۔
حضرت مولانا نصیر الدین صاحب غورغشتوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۸۶ھ) اپنے حاشیہ مشکوٰۃ ص ۹۳ میں سمعتہ کی شرح میں لکھتے ہیں: سمعا حقیقیا بلا واسطۃ اور لفظ نائیا کی شرح میں لکھتے ہیں ای بعیدًا۔
علامہ السیّد احمد طحطاوی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۳۳ھ) لکھتے ہیں کہ: ''فانہ یسمعھا ای اذا کانت بالقرب منہ ﷺ و تبلغ الیہ ای یبلغھا الملک الیہ اذا کان المصلی بعیدًا'' (طحطاوی ص ۴۰۵، طبع مصر)
''بے شک آنحضرت ﷺ درود شریف سنتے ہیں جب کہ آپ کے قریب پڑھا جائے اور فرشتہ آپ کو پہنچاتا ہے جب کہ درود پڑھنے والا دور سے پڑھتا ہو۔''
یہ عبارت بھی اپنے مدلول پر صراحت سے دلالت کرتی ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس صلوٰۃ وسلام پڑھا جائے تو آپ بنفسِ نفیس خود سُنتے ہیں اور دُور سے پہنچایا جاتا ہے۔
علامہ شہاب الدین احمد الخفاجی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۹۹ھ) دعاء کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ: ''لانہ ﷺ حی فی قبرہ یسمع دعاء زائرہ'' (نسیم الریاض ج ۳ ص ۳۸۹)
''کیونکہ آنحضرت ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں اور اپنے زیارت کرنے والے کی دُعا سُنتے ہیں۔''
بظاہر دعا کے عام لفظ سے صلوٰۃ وسلام کے علاوہ دعا متبادر ہے۔
قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) لکھتے ہیں کہ: استعانت کے تین معنی ہیں۔
(۱) یہ کہ حق تعالیٰ سے دُعا کرے کہ بحرمت فلاں میرا کام کردے یہ باتفاق جائز ہے۔ خواہ عند القبر ہو، خواہ دوسری جگہ اس میں کسی کو کلام نہیں۔
(۲) دوسرے یہ کہ صاحب قبر سے کہے کہ تم میرا کام کردو، یہ شرک ہے خواہ قبر کے پاس کہے خواہ قبر سے دُور کہے اور بعض روایات میں جو آیا ہے اَعِینُونِی عِبَادَ اللہ تو وہ فی الواقع کسی میّت سے استعانت نہیں بلکہ عباد اللہ جو صحراء میں موجود ہوتے ہیں، ان سے طلبِ اعانت ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو اسی کام کے واسطے وہاں مقرر کیا ہے تو وہ اس باب سے نہیں ہے۔ اس سے حجتِ جواز پر لانا جہل ہے معنی حدیث سے۔
(۳) تیسرے یہ کہ قبر کے پاس جا کر کہے کہ اے فلاں تم میرے واسطے دُعا کرو کہ حق تعالیٰ میرا کام کردیوے، اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ مجوز سماع موتیٰ اس کے جواز کے مقر ہیں اور مانعین سماع منع کرتے ہیں۔ سو اس کا فیصلہ اب کرنا محال ہے مگر انبیاء کرام علیہم السلام کے سماع میں کسی کو خلاف نہیں۔ اسی وجہ سے ان کو مستثنیٰ کیا ہے اور دلیل جواز یہ ہے کہ فقہاء نے بعد سلام کے وقت زیارت قبر مبارک کے شفاعت مغفرت کا عرض کرنا لکھا ہے۔ پس یہ جواز کے واسطے کافی دلیل ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۹۹، ۱۰۰، طبع جید برقی پریس دہلی)
اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''اور تفصیل یہ ہے کہ استمداد تین قسم ہے ایک یہ کہ اہل قبور سے مدد چاہے اس کو سب فقہاء نے ناجائز لکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ کہے اے فلاں خدا تعالیٰ سے دُعا کرو کہ فلاں کام میرا پورا ہو جائے، یہ مبنی اُوپر مسئلہ سماع کے ہے جو سماع موتیٰ کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک درست، دوسروں کے نزدیک ناجائز اسی کو شیخ (عبد الحق محدّث دہلوی رحمہ اللہ) نے لکھا ہے کہ: ''و ان الاستمداد باھل القبور الی قولہ فقد انکرہ کثیر من

الفقھاء'' انبیاء علیہم السلام کو اسی وجہ سے مستثنیٰ کیا کہ اُن کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں۔ تیسرے یہ کہ دُعا مانگے الٰہی بحرمت فلاں میرا کام پورا کردے یہ بالاتفاق جائز ہے اور تمام شجروں میں موجود ہے۔'' (فتاویٰ ج ۲ ص ۸)

قطب الارشاد حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے سماع میں کوئی اختلاف نہیں بڑی وزنی بات کی ہے۔

علامہ ابن عبدالہادی رحمۃ اللہ علیہ اس پر خاصی بحث کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''قبر شریف کے قریب سے تو آپ صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں اور اس کا جواب بھی دیتے ہیں لیکن قبر مبارک سے دور باقی مسجد نبوی میں جو سلام پڑھا جاتا ہے وہ آپ خود نہیں سُنتے وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی نماز میں یا مسجد میں داخل یا اس سے خارج وقت پڑھے۔''

(الصارم المنکی ص ۹۵)

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ: ''وہ فرمایا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں۔ لہٰذا پست آواز سے سلام عرض کرنا چاہئے۔ مسجد نبوی کی حد میں کتنی ہی پست آواز سے سلام عرض کیا جائے، اس کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود سنتے ہیں۔'' (تذکرۃ الخلیل ص ۳۶)

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''بروایت حضرت اَنس رضی اللہ عنہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ جو شخص میری قبر کے پاس درود پڑھتا ہے اس کو میں خود سُن لیتا ہوں اور جو شخص دُور سے درود بھیجتا ہے وہ مجھ کو پہنچایا جاتا ہے یعنی بذریعہ فرشتوں کے۔'' (نشر الطیب ص ۲۱۱)

اور پھر آگے لکھتے ہیں کہ: ''سلام کا سننا نزدیک سے خود اور دُور سے بذریعہ ملائکہ (اور) سلام کا جواب دینا یہ تو دائماً ثابت ہیں۔'' (ایضاً ص ۲۱۲)

ان تمام اقتباسات سے یہ اَمر روشن ہوگیا ہے کہ اگر کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس صلوٰۃ وسلام پڑھے تو اس کو آپ خود بنفسِ نفیس سنتے ہیں اور دُور سے فرشتے پہنچاتے ہیں اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت سے یہ بات بھی واضح ہوگئی ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے سماع میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ جو شخص اس کا منکر ہو وہ اجماع کا منکر ہے اور منکر اجماع کے لئے جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں وہ سب بلا شُبہ اس شخص پر چسپاں ہیں۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں چار مسئلوں کا خصوصیت سے ذکر ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں بھی کچھ تحقیق سپرد قلم کردی جائے۔ ایک تو یہ کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس شفاعتِ مغفرت کا عرض کرنا لکھا ہے اور دوسرا مسئلہ توسّل اور حُرمت کا ہے اور تیسرا حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ عام موتی کے عند القبر سماع یا عدم سماع کا مسئلہ ہے اور چوتھا استمداد باھل القبور کا ہے۔

قیامت کے دن شفاعت

شفاعت کا مسئلہ قرآن وحدیث اور کتب عقائد میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اس کی کئی اقسام ہیں۔ ایک شفاعت کبریٰ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن تمام اُمتوں کے لئے تعجیل حساب کے سلسلہ میں کریں گے۔ اس کے علاوہ دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور ملائکہ کی شفاعتِ عمومی بھی حق ہے اور اسی طرح شہداء حفاظ قرآن اولیاء عظام رحمہم اللہ اور جو بچے نابالغ فوت ہو چکے ہوں۔ بشرطیکہ ماں باپ نے ان پر نوحہ نہ کیا ہو،

ان کی شفاعت بھی حق ہے اور اہل اسلام کا کوئی قابل قدر فرقہ ایسا نہیں جو اس کا انکار کرتا ہو۔ یہ مسئلہ چونکہ دلائل قطعیہ صریحہ سے ثابت ہے اس لئے اس کے لئے دلائل پیش کرنا غیر ضروری ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے جس شفاعت کا ذکر کیا ہے وہ آگے آرہی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک پر شفاعت کی درخواست جائز ہے

چونکہ آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کا علم تواتر سے ثابت ہے، اس لئے آپ کی قبر شریف کے پاس حاضر ہو کر یہ کہنا کہ حضرت آپ میری مغفرت کی شفاعت فرمائیں، جائز اور درست ہے اور یہ صرف حضرات متاخرین ہی کی ایجاد نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض خام خیال لوگوں کا بے بنیاد وہم ہے بلکہ اس کا ثبوت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اور ان کے ایک گونہ اجماع اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تائید اور تصویب سے ہے۔

چنانچہ علامہ سمہودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''وقد یکون التوسل بہ ﷺ بعد الوفاۃ بمعنی طلب ان یدعوا کما کان فی حیاتہ و ذلک فیما روی البیھقی رحمہ اللہ من طریق الاعمش عن ابی صالح عن مالک الدار رضی اللہ عنہ قال اصاب الناس قحط فی زمان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فجاء رجل الی قبر النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ استسق اللہ تعالٰی لامتک فانھم قد ھلکوا فاتاہ رسول اللہ ﷺ فی المنام فقال ائت عمر رضی اللہ عنہ فاقرأہ السلام واخبرہ انھم مسقون و قل لہ علیک الکیس الکیس فاتی الرجل عمر رضی اللہ عنہ فاخبرہ فبکی عمر رضی اللہ عنہ ثم قال یا رب ما آلو الا ما عجزت عنہ وروی سیف فی الفتوح ان الذی رأی المنام المذکور بلال بن الحارث المزنی احد الصحابۃ رضی اللہ عنہ و محل الاستشھاد طلب الاستسقاء منہ ﷺ و ھو فی البرزخ و دعائہ لربہ فی ھذہ الحالۃ غیر ممتنع و علمہ بسوال من یسالہ قد ورد فلا مانع من سوال الاستسقاء و غیرہ منہ کما کان فی الدنیا''

''اور آنحضرت ﷺ سے وفات کے بعد توسل کبھی اس معنیٰ میں ہوتا ہے کہ آپ سے دعا طلب کرے جیسا کہ آپ ﷺ ں حیات میں تھا اور یہ جیسا کہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے بطریق اعمش عن ابی صالح عن مالک الدار روایت نقل کی ہے اور ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے اس کو صحیح سند کے ساتھ مالک الدار رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں لوگ قحط میں مبتلاء ہوئے۔ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی قبر کے پاس گیا اور اس نے کہا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے اپنے اُمتیوں کے لئے بارش طلب فرمائیں کیونکہ وہ ہلاک ہو چلے ہیں، تو خواب میں اس شخص سے آنحضرت ﷺ نے ملاقات کی اور فرمایا کہ تو عمر (رضی اللہ عنہ) کے پاس جا اور اس کو سلام کہہ اور اس کو خبر دے کہ اُن پر بارش نازل کی جائے گی اور عمر (رضی اللہ عنہ) سے کہہ دے کہ دانائی پر قائم رہے دانائی پر قائم رہے۔ تو وہ شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور انہیں خبر دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ پھر فرمایا اے میرے رَب میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی مگر جس اَمر سے میں عاجز ہو گیا۔ علامہ سیف رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''فتوح'' میں ذکر کیا ہے کہ جس شخص نے خواب دیکھا تھا وہ حضرت بلال بن الحارث المزنی رضی اللہ عنہ صحابی تھے اور اس سے استدلال یوں ہے کہ آپ ﷺ برزخ (اور قبر) میں تھے کہ آپ ﷺ سے بارش طلب کرنے کی دُعا کی التجاء ہوئی اور اس حالت میں آپ ﷺ کا رب تعالیٰ سے دُعا کرنا کوئی ممتنع اَمر نہیں ہے اور سوال کرنے والے کے سوال کے علم کے بارے میں دلیل وارد ہوئی ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ سے بارش وغیرہ کے طلب کرنے کے سوال میں کوئی مانع نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ سے دُنیا میں ایسا سوال کیا جاتا تھا'' (وفاء الوفا ج ۲ ص ۱۲۴۰، طبع مصر)

یہ واقعہ علامہ علی بن عبد الکافی السبکی رحمہ اللہ نے امام بیہقی رحمہ اللہ کی کتاب دلائل النبوۃ سے پوری سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو شفاء السقام ص ۱۳۰) اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی یہ واقعہ امام بیہقی رحمہ اللہ کی پوری سند کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔

اور آخر میں لکھتے ہیں: ''وھذا اسناد صحیح'' (البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۹۲)

اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''رواہ ابن ابی شیبۃ باسناد صحیح من روایۃ ابی صالح السمان'' (فتح الباری ج ۳ ص ۱۴۸)

''اس کو ابن ابی شیبۃ رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ ابو صالح السمان سے روایت کیا ہے۔''

ابن ابی شیبۃ رحمہ اللہ کی سند کی روات یہ ہیں:

(۱) امام ابوبکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبۃ رحمہ اللہ، المتوفی ۲۳۵ھ الحافظ عدیم النظیر الثبت النحریر جو ثقہ اور حافظ اور متقن تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۸، ۱۹، ملخصہ)

(۲) ابو معاویہ محمد بن خازم رحمہ اللہ، المتوفی ۱۹۵ھ، الحافظ الثبت اور محدث الکوفہ تھے۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۲۷۱) ان پر بعض محدثین نے اضطراب کا الزام لگایا ہے لیکن علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''ویضطرب فی غیر حدیث الاعمش'' (تذکرۃ ج ۱ ص ۲۷۱) کہ امام اعمش رحمہ اللہ کے علاوہ اور حضرات سے روایت کرنے میں یہ اضطراب کرتے ہیں اور یہ روایت حضرت اعمش رحمہ اللہ سے ہے۔

(۳) اعمش رحمہ اللہ (المتوفی ۱۴۸ھ) الحافظ الثقہ اور شیخ الاسلام تھے۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۴۵)

(۴) ابو صالح ذکوان السمان الزیات (المتوفی ۱۰۱ھ) حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ من اجلّ الناس واوثقھم (یعنی جلیل القدر اور ثقہ تر لوگوں میں شمار تھے۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۸۳)

(۵) حضرت مالک الدار رضی اللہ عنہ کو علامہ ذہبی رحمہ اللہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شمار کرتے ہیں۔ (تجرید اسماء الصحابۃ رضی اللہ عنہم ج ۲ ص ۴۷) اور علامہ ابن سعد رحمہ اللہ (المتوفی ۲۳۰ھ) ان کو تابعین رحمہ اللہ میں شمار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام (مولیٰ عمر رضی اللہ عنہ) تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے انہوں نے روایت کی ہے: ''وکان معروفا'' (طبقات ابن سعد رحمہ اللہ ج ۵ ص ۱۲) اور وہ معروف ومشہور تھے۔ غرض یہ کہ اس روایت کے سب راوی ثقہ ہیں اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور علامہ سمہودی رحمہ اللہ وغیرہ اس روایت کی سند کو صحیح کہتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ۱۷ھ کے آخر اور ۱۸ھ کی ابتداء کا ہے۔ (تاریخ طبری ج ۴ ص ۹۸، والبدایۃ والنہایہ ج ۷ ص ۹۱) اور مؤرخ عبد الرحمن بن محمد بن خلدون رحمہ اللہ (المتوفی ۸۰۸ھ) فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ۱۸ھ کا ہے۔ (ابن خلدون ج ۲ ص ۹۶۹)

امام طبری رحمہ اللہ اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس واقعہ کے سلسلہ میں یہ بھی نقل کرتے ہیں: ''حتّٰی اقبل بلال رضی اللہ عنہ بن الحارث المزنی فاستأذن علی عمر رضی اللہ عنہ فقال انا رسولُ رسولِ اللّٰہ الیک یقول لک رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم لقد عھدتک کیسا ومازلتَ علی ذٰلک فما شأنک؟ قال متٰی رأیت ھذا قال البارحۃ فخرج فنادٰی فی الناس الصلٰوۃ جامعۃ'' (تاریخ طبری ج ۴ ص ۹۸، والبدایۃ والنہایہ ج ۷ ص ۱۷، واللفظ لہا)

یہاں تک کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بن الحارث المزنی آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اجازت طلب کی اور فرمایا کہ میں تمہاری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر (رضی اللہ عنہ) میں تو تجھے دانا ہی سمجھتا رہا اور تم اسی پر قائم رہے مگر اب تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ (کہ تم نے دعا اور صلوٰۃ استسقاء ادا نہیں کی) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ خواب تم نے کب دیکھا؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ گزشتہ شب حضرت عمر رضی اللہ عنہ (نماز استسقاء کے لئے) نکلے اور لوگوں میں بھی نماز کے لئے جمع ہونے کا اعلان کیا۔''

اور اختصاراً اس واقعہ کا ذکر علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ (المتوفی ۶۳۰ھ) نے بھی کیا ہے۔ (الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۵۵۶)

اور یہ واقعہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیان کیا اور فرمایا: ''فان بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ یزعم ذیۃ و ذیعۃ فقالوا اصدق بلال رضی اللہ عنہ'' (تاریخ طبری ج ۴ ص ۹۹، والبدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۹۱)

''کہ بلاشبہ بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ ایسا اور ایسا خیال کرتا ہے تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ سچ کہتا ہے۔''

اس واقعہ سے ذیل کے بڑے واضح فوائد حاصل ہوتے ہیں:

(۱) یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات سے تقریباً سات آٹھ سال بعد پیش آیا۔ اس وقت بکثرت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے۔

(۲) خواب دیکھنے والے کوئی مجہول شخص نہیں تھے۔ (جیسا کہ مؤلف اقامۃ البرہان لکھتے ہیں: ''یہ ایک ایسے اعرابی کا عمل ہے جو سراپا جہالت ہے نہ اس کا نام معلوم ہے نہ اس کا حال اس لئے ایسے مجہول العین اور مجہول الوصف انسان کے عمل سے احکام شریعت پر استدلال دین سے تمسخر اور تلعب کی بدترین مثال ہے۔'' (ص ۲۸۸)

سبحان اللہ اور مؤلف (شفاء الصدور ص ۱۰۲) میں اس کو مجہول کہتے ہیں اور (ندائے حق ص ۳۰۳) میں اس واقعہ کا یوں تمسخر اُڑاتے ہیں: ''یہ جمہور زنبور کشف خوابیں جنگلیوں کا مذہب آپ ہی کو نصیب ہو۔'' اللّٰھم اھدنا الصراط المستقیم (۱) ضعیف حدیث، (۲) عمل ایک جنگلی صحابی کا جب صحابی کا عمل حجت نہیں تو جنگلی کے عمل کا کیا مقام ہے، (۳) واقعہ خواب کا غیر نبی کا خواب کوئی حجت نہیں۔ جب تک کہ مؤید بالاجماع نہ ہو۔ (ندائے حق ص ۳۰۳، ۳۰۴)

اور پھر آگے لکھتے ہیں کہ: ''ہم خیر القرون کا اُونچا دور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عہد بتاتے ہیں جس میں اعرابی (جنگلی) حضور کی قبر پر پہنچ کر بارش کی دُعا کرواتا ہے۔ سب علماء نے اسے بدعت میں شمار کیا ہے۔ اگر یہ آپ کی بات حق ہے تو ان علماء کی تغلیط فرمایئے اور فتویٰ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کا رد فرمایئے اور شاہ اسمٰعیل شہید کو بدعت کی تعریف سمجھایئے۔'' (چھوٹا منہ اور بڑی بات) (ندائے حق ص ۳۰۴)

اور نیز لکھتے ہیں کہ: ''مگر یہ شرط ہے کہ کسی جنگلی کا عمل نہ ہو کیونکہ وہ حجت نہیں۔'' (ندائے حق ص ۱۳۶)

ملاحظہ فرمایئے کہ کس طرح ایک جلیل القدر صحابی کو بار بار جنگلی کے لفظ سے تعبیر کر کے ان کا تمسخر اُڑاتے ہیں اور پھر اس جائز کارروائی کو بدعت کہتے ہیں اور پھر کس طرح سب علماء کی طرف اس کے بدعت قرار دینے کی نسبت کرتے ہیں اور کس بے باکی سے صحیح حدیث کو ضعیف کہتے ہیں اور کس دیدہ دلیری سے حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ اور حضرت شاہ شہید رحمہ اللہ کا نامکمل حوالہ دے کر عوام کو مغالطہ دیتے ہیں۔ اس کی بحث ہم نے ''سماع الموتیٰ'' میں کر دی ہے، وہاں ہی ملاحظہ فرمائیں۔

''یہ واقعہ کسی جنگلی کا نہیں بلکہ جلیل القدر صحابی حضرت بلال بن الحارث المزنی رضی اللہ عنہ (المتوفی ۶۰ھ) کا ہے۔
(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر طلب دُعا اور سوال شفاعت شرک نہیں، ورنہ یہ جلیل القدر صحابی یہ کارروائی ہرگز نہ کرتے۔

(۴) یہ معاملہ نرے خواب کا نہیں ہے بلکہ اس سچے خواب کو خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تائید و تصویب حاصل ہے اور اس کارروائی کا حکم پہلے تو ''علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین الحدیث'' کے تحت سُنّیت کا ہوگا، ورنہ استحباب اور اقل درجہ جواز سے کیا کم ہوگا۔

(۵) یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیان فرمایا تو انہوں نے صَدَقَ بَلَالٌ فرما کر اس کی پُرزور تائید و تصدیق کی۔ لہٰذا اس واقعہ کو نِرا خواب یا اعرابی اور جنگلی کا قصہ تصور کر کے گلو خلاصی چاہنا یا جلیل القدر اور معروف و مشہور صحابی کو مجہول العین والحال کہنا دین سے خالص تمسخر اور تلعّب ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلنا بمضمون حدیث ما انا علیہ و اصحابی باعث نجات اور رشد و فلاح ہے اور خود مؤلف ''اقامۃ البرہان'' نے لکھا ہے کہ: ''محمد بن حرب ہلالی رحمہ اللہ کا اتباع ہم پر لازم نہیں۔ لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار کی پیروی کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے اور ان کے دائرہ عمل سے باہر قدم رکھنا کھلی گمراہی ہے۔'' (ص ۲۹۰)

علاوہ ازیں اس واقعہ کی حقیقت اور صداقت علماء اسلام کے محتاط طبقہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے اس فتویٰ سے بھی اُجاگر ہوتی ہے جسے اُنہوں نے بڑی عقیدت اور محبت کے الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر طلب مغفرت اور سوال شفاعت کی مخلصانہ دُعا سے اپنی معتبر اور مستند کتابوں میں واضح تر الفاظ سے بیان اور نقل کیا ہے اور ہر مسلک اور ہر مکتب فکر کے علماء مناسک حج میں اس کو بلا نکیر نقل کرتے چلے آرہے ہیں اور لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں نے اس پر عمل کیا اور اس وقت بھی اس پر عمل پیرا ہیں اور سچ ہے کہ ؎

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

اتمامِ حجت

اگر استشفاع عند القبر کے منکرین حضرات کو ان صحیح اور ٹھوس حوالوں سے تسکین نہیں ہوتی۔ تو لیجئے ہم اپنے اور اُن کے پیر و مرشد المحقق رئیس الموحدین حضرت مولانا حسین علی صاحب کا حوالہ عرض کئے دیتے ہیں۔ (جن سے وابستگی کا زبانی دعویٰ یہ حضرات بھی کرتے ہیں اور حضرت یہ بات محض اپنے قیاس و اجتہاد سے نہیں فرما رہے جس میں غلطی کا امکان اغلب ہوتا ہے بلکہ باحوالہ تحریر فرماتے ہیں) ان کا ارشاد یوں ہے: ''وروی البیھقی رحمہ اللہ و ابن ابی شیبة رحمہ اللہ ان بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ جاء الی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقال یا رسول اللہ استسق لامتک فانهم هلکوا فاتاه رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المنام واخبره انهم یسقون'' (تحریرات حدیث ص ۲۵۵)

''امام بیہقی رحمہ اللہ اور ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے روایت کی ہے کہ حضرت بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر آئے اور فرمایا یا رسول اللہ! اپنی اُمت کے لئے بارش طلب فرمائیں، کیونکہ وہ ہلاک ہو چلی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو خواب میں ملے اور ان کو خبر دی کہ بارش برسے گی۔ (ان شاء اللہ)

اس سے مؤلف ''ندائے حق'' کا یہ مطالبہ بھی پورا ہو گیا جو انہوں نے راقم الحروف کو خطاب کر کے لکھا تھا کہ: ''آپ اپنے مطالعہ کے زور سے ذخیرۂ احادیث میں ایک حدیث ایسی دکھا دیں، جس میں یہ ہو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بعد وفات النبی آپ سے استشفاع و استغفار کراتے تھے۔'' (بلفظہ ص ۱۳۶)

اور قارئین کرام پہلے پڑھ چکے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے استشفاع عند القبر کے سلسلہ میں حضرت بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ کے اس فعل کی تائید کی ہے وہ حضرات اور کیا کرتے؟

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ علامہ ابن عبد الہادی رحمہ اللہ اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ وغیرہ اس مسئلہ میں جمہور کے خلاف رائے رکھتے ہیں، ان حضرات کی بعض عبارات پر اور حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ اور حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ کی اُدھوری عبارات پر (جن کی بقدر ضرورت بحث سماع الموتی میں ہم نے کر دی ہے) بنیاد رکھتے ہوئے مؤلف اقامۃ البرہان نے یہ فیصلہ دیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک سے استشفاع اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اور تعامل سلف اور تعاملِ جمہور اہل سنت کے سراسر خلاف اور بدعت سیئہ ہے: ''فماذا بعد الحق الا الضلال'' (بلفظہ ص ۳۱۲)

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا استشفاع عند القبر کے بدعت سیئہ ہونے پر اجماع تو در کنار کسی ایک صحابی سے صریح الفاظ میں اس کی نفی ثابت نہیں ہے اور سابق واقعہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کارروائی کے جواز پر کافی و شافی دلیل ہے اور علماء کرام جو حضرات فقہاء کرام کی کتابوں پر عبور رکھتے ہیں (جن کے کچھ حوالے ہم نے اسی کتاب میں درج کر دیئے ہیں) اور مناسک الحج کی کتابیں پڑھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ حضرات سلف کا اور جمہور اہل سنت کا تعامل کیا ہے۔ محض لفظوں کے کرتب سے حقیقت ثابتہ کا انکار علماء کو قطعاً زیب نہیں دیتا۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ جو عند القبر استشفاع کو جائز قرار دیتے ہیں اور بڑے ادب و تعظیم کے ساتھ اس کا شرعی اور فقہی طریقہ بتاتے ہیں کیا یہ سب اہل سنت کے مسلک کے خلاف تھے؟ اور کیا یہ بدعت سیئہ کے مرتکب اور اس کے مروّج تھے؟ اور کیا یہ سب حضرات الا الضلال کا مصداق ہو کر گمراہ قرار پائے؟ لا حول و لا قوۃ الا باللہ اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ دور ہی اعجاب کل ذی رأی برأیہ کا ہے جس کا جو جی چاہتا ہے کرتا پھرتا ہے۔

منع کی دلیل

ترکِ استشفاع اور ترک الدعاء عند القبر کی سب سے بڑی وزنی دلیل امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اور علامہ ابن عبد الہادی رحمہ اللہ وغیرہ نے یہ پیش کی ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آئمہ دین اور سلف صالحین رحمہم اللہ سے ایسی کارروائی ثابت نہیں۔ اگر یہ جائز ہوتی تو وہ ضرور ایسا کرتے۔ علاوہ ازیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ جب سفر پر جاتے یا سفر سے واپس تشریف لاتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر بڑی عقیدت سے یہ فرماتے: ''السّلام علیک یا رسول اللہ۔ السّلام علیک یا ابابکر رضی اللہ عنہ۔ السّلام علیک یا ابتاہ'' (یہ الفاظ مصنف عبد الرزاق ج ۳ ص ۵۷۶) اور (ابن ابی شیبہ ج ۴ ص ۳۸۱، طبع ملتان اور وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۰۹) میں عبد الرزاق کے حوالہ سے بسندِ صحیح اور (الصارم المنکی ص ۱۱۶ اور المسلک المتقسط ص ۳۴۱) وغیرہ میں مذکور ہیں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طلب

دُعا جائز ہوتی تو حضرت ابن عمرؓ بھی اس پر عمل کرتے۔

(مصلہ فتاویٰ مختصر الفتاویٰ المصریہ ص ۱۹۰، قاعدہ جلیلہ ص ۶۵، ۷، ۱۳، واغاثۃ اللھفان ج ا ص ۲۰۴، الصارم المنکی ص ۱۱۱، ۱۱۳ وغیرہ)

الجواب: یہ ان حضرات کا ایک علمی مغالطہ ہے کیونکہ قبر کے پاس حاضر ہو کر سفارش کرانا اور طلب دُعا نہ تو فرض وواجب ہے اور نہ سُنت مؤکدہ تاکہ یہ حضرات اس پر خواہ مخواہ ضرور عمل کر کے دکھاتے اور اس کارروائی کے نہ کرنے پر وہ ملامت کئے جاتے۔ اس کارروائی کے مُجوّز اس کو صرف جائز ہی کہتے ہیں اور جواز کے اثبات کے لئے حضرت بلال بن الحارثؓ کا یہ فعل جس کی حضرت عمرؓ اور دیگر حضرات صحابہ کرامؓ نے تائید کی ہے کیا کم ہے؟ اگر حضرت ابن عمرؓ صحابی ہیں جنہوں نے ایسا نہیں کیا تو یقین جانئے کہ حضرت بلال بن الحارثؓ اور ان کی اس کارروائی کے مصدقین بھی صحابہؓ ہی ہیں۔ تصویر کا صرف ایک رُخ ہی نہیں دیکھنا چاہئے۔ دُوسرا رُخ بھی دیکھنا چاہئے۔ اگرچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنی زبان سے حضرات سلف رحمہ اللہ سے یہ کارروائی تسلیم نہیں کرتے بلکہ سختی سے اس کے منکر ہیں لیکن اس کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کارروائی بعض متاخرین سے ثابت ہے۔ (مصلہ قاعدہ جلیلہ ص ۷۱، بحوالہ ندائے حق ص ۱۲۰) اور مشہور غیر مقلد عالم سہسوانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سلف سے یہ ثابت نہیں اور انہی کی پیروی اولیٰ ہے۔ ہاں! بعد کو آنے والے اہل فضل اور اہل الدین سے یہ کارروائی ثابت ہے۔ (بحوالہ ندائے حق ص ۱۲۰)

الغرض! نفسِ جواز کے لئے یہ ثبوت کافی ہے۔ علاوہ ازیں جب حضرات صحابہ کرامؓ سے یہ کارروائی ثابت ہے تو منکرین حضرات کا یہ دعویٰ کہ سلف سے یہ ثابت نہیں۔ نِری سینہ زوری ہے جو بالکل قابل سماعت نہیں ہے۔

قبر مبارک پر صلوٰۃ وسلام عرض کرنے کا طریقہ

قبر مبارک پر صلوٰۃ وسلام کا عرض کرنا جیّد حدیث کی روشنی میں اُمت کے تعامل سے اور قبر مبارک پر دعا اور شفاعت کی التجاء کرنا حضرات فقہاء کرام رحمہ اللہ کے فتویٰ سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہے جس کا انکار بغیر کسی ضدی اور بڑے متعصب کے اور کوئی نہیں کرتا اور نہ کرسکتا ہے۔ البتہ اس میں حضرات فقہاء احناف رحمہ اللہ کا آپس میں اختلاف ہے کہ صلوٰۃ وسلام وغیرہ عرض کرنے والا اپنا رُخ اور چہرہ قبلہ کی طرف پھیر کر سلام وغیرہ عرض کرے یا قبلہ کی طرف پیٹھ پھیر کر آپ ﷺ کی قبر مبارک اور مواجہ شریفہ کو ملحوظ رکھ کر یہ کارروائی کرے اکثر عبارات دوسرے قول کی مؤید ہیں۔ جیسا کہ بعض عبارات اسی کتاب میں آپ نے ملاحظہ کرلی ہیں اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اس سلسلہ میں دو قول منقول ہیں اور راجح دوسرا ہے۔

چنانچہ حضرت مُلّا علی القاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''ثم اعلم انه ذكر بعض مشائخنا كابي الليث و من تبعه كالكرماني والسروجي انه يقف الزائر مستقبل القبلة كذا رواه الحسن عن ابي حنيفة رحمہ اللہ وقال ابن الهمام رحمہ اللہ وما عن ابي الليث من ان الزائر يقف مستقبل القبلة مردود بما روى ابو حنيفة رحمہ اللہ عن ابن عمرؓ انه قال من السنته ان تأتي قبر رسول الله ﷺ فتستقبل القبر بوجهك ثم نقول السلام عليك ايها النبي ورحمة الله وبركاته'' (المسلک المتقسط فی المنسک المتوسط ص ۳۴۱)

''تو جان کہ ہمارے بعض مشائخ رحمہ اللہ نے جیسے ابو اللیث رحمہ اللہ اور اُن کی پیروی میں کرمانی رحمہ اللہ اور سروجی رحمہ اللہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ زیارت کنندہ قبلہ کی طرف رُخ کر کے کھڑا ہو اور اسی طرح حسن رحمہ اللہ نے امام

ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اور ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابواللیث رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ زیارت کنندہ قبلہ رخ ہو کر کھڑا ہو، مردود ہے۔ اس حدیث کے رُو سے جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے انہوں نے فرمایا کہ سُنّت یہ ہے کہ تم آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس آؤ اور اپنا رُخ قبر کی طرف کرو اور پھر کہو: ''السلام علیک ایھا النبیؐ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''

یہ عبارت (فتح القدیر ج ا ص ۵۹۰ طبع ہند) میں موجود ہے اور علامہ سمہودی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حوالہ (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۲۴) میں بھی محقق الحنفیہ کمال بن الھمام رحمۃ اللہ علیہ کے عنوان سے نقل کیا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت مسند الامام الاعظم کے حوالہ سے بالسند نقل کی ہے اور آخر میں لکھا ہے: ''وقد تقرر ان قول الصحابی من السنۃ کذا محمول علی سنتہ ﷺ فلہ حکم الرفع'' (وفاء الوفاج ۲ ص ۴۱۰)

''اور یہ بات (اُصول حدیث میں) طے شدہ ہے کہ جب صحابی (مطلقاً) من السنۃ کا لفظ کہے تو وہ آنحضرت ﷺ کی سنت پر محمول ہوتی ہے اور وہ مرفوع کے حکم میں آیا ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور استشفاع عند القبر

مشہور محدث قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ (جو القاضی العلاّمہ عالم المغرب) اور الحافظ تھے۔ محدّث ابن الشکوال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ اھل العلم والیقین والذکاء والفھم میں تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۶) قاضی ابن خلکان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے وقت میں امام الحدیث تھے۔ (ایضاً ص ۹۷) قاضی القضاۃ امام برہان الدین ابراہیم بن فرحون رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے وقت میں حدیث اور اس کے علوم کے امام تھے۔

اور نیز لکھتے ہیں کہ: ''وہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے حافظ تھے۔'' (الدیباج المذہب ص ۱۶۸، ۱۶۹) (ان کی وفات ۵۴۴ھ میں ہوئی تھی) اپنی سند کے ساتھ یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ابن حمید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امیر المؤمنین ابو جعفر کا حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مسجد نبوی میں مناظرہ ہوا۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: ''اے امیر المؤمنین اس مسجد میں اپنی آواز بلند نہ کریں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کو یہ اَدب سکھلایا کہ تم اپنی آوازوں کو آنحضرت ﷺ کی آواز پر بلند نہ کرو۔ الآیۃ'' اور ایک قوم کی تعریف کی ہے کہ: ''بلاشبہ جو لوگ جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنی آوازیں پست کرتے ہیں۔ الآیۃ'' اور ایک قوم کی مذمت کی ہے سو فرمایا ہے کہ: ''جو لوگ تجھے حجروں کے سامنے سے پکارتے ہیں۔ الآیۃ'' اور بے شک وفات کے بعد بھی آپ ﷺ کی عزت وحُرمت ایسی ہے، جیسا کہ زندگی میں تھی۔ اس پر ابو جعفر نے عاجزی کرتے ہوئے آواز پست کر لی اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ اے ابو عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کیا میں قبلہ رُخ ہو کر دُعا کروں یا آنحضرت ﷺ کی طرف رُخ کروں۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تو کیوں اپنا رُخ آپ ﷺ سے پھیرتا ہے۔ حالانکہ آپ ﷺ ہی (شفاعت کبریٰ کے ذریعے) تیرے اور تیرے باپ حضرت آدم علیہ السلام کے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں وسیلہ ہوں گے۔

اور آگے فرمایا: ''بل استقبلہ واستشفع بہ فیشفعہ اللہ قال اللہ تعالٰی وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ''

''بلکہ آپ ﷺ کی طرف متوجہ ہو اور آپ کو سفارشی بنا۔ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی سفارش قبول فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اور اگر بے شک جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا۔'' (الشفاء ج ۲ ص ۳۲، ۳۳، طبع مصر)

علامہ عبدالکافی السبکی رحمہ اللہ قاضی عیاض رحمہ اللہ کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''وھو اسناد جید'' (شفاء السقام ص ۱۱۵)

اور پھر ایک ایک راوی کا حال انہوں نے بیان کیا ہے اور ان کی توثیق کی ہے اور پھر آگے لکھتے ہیں کہ:

''فانظر الی ھذہ الحکایۃ وثقۃ رواتھا وموافقتھا لمارواہ ابن وھب عن مالک رحمہ اللہ'' (ص ۱۱۷)

''تو اس حکایت کو اور اس کے ثقہ راویوں کو دیکھ اور اس کو بھی دیکھ کہ یہ اس روایت کے موافق ہے جو ابن وہب رحمہ اللہ نے مالک رحمہ اللہ سے بیان کی ہے۔''

اس واقعہ کو علامہ سمہودی رحمہ اللہ نے بھی (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۲۲) میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند جید ہے۔ ثقہ راویوں کی یہ جید روایت صاف طور پر یہ بتاتی ہے کہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ استشفاع عند القبر کے قائل تھے اور ان کے نزدیک بعد از وفات بھی ''وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ'' سے آنحضرت ﷺ سے مغفرت کی دُعا طلب کرنا ثابت ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا یہ استدلال بالکل واضح صحیح اور حق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

ضربِ کاری

چونکہ یہ روایت حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مسلک اور ان کے دعویٰ پر ضرب کاری ہے اور اس میں عند القبر استشفاع حضرت امام مالک رحمہ اللہ جیسی شخصیت سے ثابت ہے، اس سے خاصے پریشان اور برہم ہو کر اُصولی طور پر تین جواب انہوں نے دیئے ہیں:

(۱) کہ یہ حکایت منقطع ہے کیونکہ اس میں محمد بن حمید الرازی نے امام مالک رحمہ اللہ کو نہیں پایا۔

(۲) محمد بن حمید اہل حدیث کے نزدیک ضعیف ہے۔ (قاعدہ جلیلہ ص ۷۱، ۷۲)

(۳) قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فقہ مالکی کی کتاب ''مبسوط'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں اس کو درست نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس کھڑا ہو کر دُعا مانگے۔ بس سلام کرے اور چلا جائے۔ (قاعدہ جلیلہ ص ۷۳)

اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی پیروی میں علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ نے (الصارم المنکی ص ۲۱۸ تا ۲۲۱) اس پر طویل بحث کی ہے اور اعتراض کے لئے یہی اُصول استعمال کئے ہیں جو اُوپر بیان ہوئے اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ان ہی اُصولی اعتراضات کو مؤلف نے (اقامۃ البرہان ص ۲۹۱ تا ۲۹۳) میں خوب پھیلا کر لکھا ہے اور ''اسماء الرجال'' کی کتابوں سے محمد بن حمید الرازی کے کذاب اور جھوٹے ہونے کے حوالے بھی نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ابن حمید الرازی کے علاوہ اس سند میں کئی مجاہیل ہیں۔ اس لئے امام مالک رحمہ اللہ سے یہ روایت ثابت نہیں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک حکایت بھی بیان کی ہے جو امام مالک رحمہ اللہ پر افتراء کی گئی ہے۔ (قاعدہ جلیلہ ص ۲۰، ۱ اقامہ ص ۲۹۳)

الجواب: یہ ساری کاوش بلا وجہ ہے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ بلاشبہ علمی طور پر بڑی شخصیت کے مالک ہیں مگر ان کی طبیعت میں شدت اور حدت بھی بے پناہ تھی۔ جب وہ اپنی شدت پر اُتر آتے ہیں تو انہیں بخاری و مسلم کی صحیح روایت: ''حُسِبَتْ عَلَيَّ بتطليقة'' بھی نظر نہیں آتی اور وہ حالت حیض میں دی گئی طلاق سے بھی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ (تفصیل کے لئے عمدۃ الاثاث اور سماع الموتی ملاحظہ کریں)

اصل بات یہ ہے کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ کی سند میں راوی ابن حمید ہے جس کو حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے محمد بن حمید الرازی سمجھ لیا ہے اور یہی ان کا کھلم کھلا وہم اور صریح غلطی ہے۔

اَوّلاً: اس لئے قاضی عیاض رحمہ اللہ اپنے وقت میں علم حدیث اور اس کے فنون کے امام تھے۔ اگر یہ راوی محمد بن حمید الرازی ہوتا جو کذاب ہے تو اس سے وہ ہرگز احتجاج و استدلال نہ کرتے۔

ثانیاً: اور خود امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ تصریح فرماتے ہیں کہ: ''لم يدرک مالکاً'' اس کی ملاقات امام مالک رحمہ اللہ سے نہیں ہوئی تو بلا دلیل اور بلا وجہ ایسا راوی کیوں سمجھ لیا گیا جس کی امام مالک رحمہ اللہ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔

وثالثاً: یہ راوی محمد بن حمید الیشکری المعمر ی ہے۔ چنانچہ علامہ السبکی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ میری رائے میں یہ ابو سفیان محمد بن حمید المعمر ی ہے۔ خطیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا شمار ان لوگوں میں ہے جنہوں نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کی ہے اور وہ خود فرماتے ہیں کہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے جب ''مؤطا'' لکھا تو مجھے دکھلایا۔ (شفاء السقام ص۱۱۷)

امام عقیلی رحمہ اللہ نے ان کو ضعفاء میں لکھا ہے اور کہا ہے: ''في حديثه نظر'' لیکن ان کے علاوہ باقی تمام ائمہ جرح و تعدیل ان کی توثیق کرتے ہیں۔ چنانچہ ابن معین رحمہ اللہ ایک روایت میں ان کو ثقہ اور ایک میں صدوق کہتے ہیں۔ ابو حاتم رحمہ اللہ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں۔ ابوداؤد ان کو ثقہ کہتے ہیں اور نسائی رحمہ اللہ ان کو لیس بہ بأس کہتے ہیں اور ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور امام ابوخیثمہ رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور ابن شاہین رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج۹ ص۱۳۲) ان کی وفات ۱۸۲ھ میں ہوئی ہے۔ (ایضاً)

اور حضرت امام مالک رحمہ اللہ کی ۱۷۹ھ میں اور ان کی عدم لقاء کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جب کہ امام خطیب رحمہ اللہ کی تصریح موجود ہے کہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کرنے والوں میں ان کا نام بھی ہے۔

کمامرَ! اَلبتہ ایک بات علامہ عبدالہادی رحمہ اللہ نے کہی ہے کہ اس سند کے راوی یعقوب ابن اسحاق بن ابی اسرائیل رحمہ اللہ کی لقاء معمری رحمہ اللہ سے نہیں ہوئی۔ معمری رحمہ اللہ کی وفات ۱۸۲ھ میں ہوئی ہے اور یعقوب بن اسحاق رحمہ اللہ کی ولادت سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ درمیان کی کڑی غائب ہے۔ ''بينهما مفازة بعيدة'' (الصارم المنکی ص۲۱۸) لیکن یہ محض تک بندی ہے تاریخ اور دلیل کے لحاظ سے وہ یہ دعویٰ بالکل ثابت نہیں کر سکے ان کا فریضہ تھا کہ وہ تاریخی طور پر یعقوب بن اسحاق رحمہ اللہ کی سنِ ولادت بتاتے تاکہ معاملہ صاف ہو جاتا۔

علامہ عبدالکافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کی اپنے والد اسحاق بن ابراہیم رحمہ اللہ بن کامجرا رحمہ اللہ سے (جن کی ولادت ۱۵۰ھ یا ۱۵۱ھ میں اور وفات ۲۴۰ھ میں ہوئی) (تہذیب التہذیب ج۱ ص۲۲۴) اور عمر بن شبہ رحمہ اللہ سے بھی روایت ہے (جن کی وفات ۳۰۲ھ میں ہوئی۔ ایضاً ص۴۱۶) جن کی عمر تو ے (۹۰) سال سے متجاوز تھی)

جب ان سے روایت ہو سکتی ہے تو تاریخی لحاظ سے معمری رحمہ اللہ سے روایت میں کیا اشکال ہو سکتا ہے؟ الغرض اس حکایت کو جھٹلانے اور منقطع اور ساقط الاعتبار قرار دینے کی کوئی ٹھوس اور قابلِ اعتماد دلیل موجود نہیں ہے۔ اس کو جب قاضی عیاض جیسے محدث نقل کرتے ہیں اور عبدالکافی السبکی رحمہ اللہ اور سمہودی رحمہ اللہ جیسے وسیع النظر عالم باسناد جید کہتے ہیں تو اس کے تسلیم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

علامہ شہاب الدین احمد الخفاجی رحمہ اللہ الشفاء کے اس منقولہ واقعہ کی شرح کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''وفی هذا رد علی ما قاله ابن تیمیه رحمہ اللہ من ان استقبال القبر الشریف فی الدعاء عند الزیارة امر منکر لم یقبل به احد و لم یرو اِلّا فی حکایة مفتراة علی الامام مالک یعنی هذه القصة التی اوردها المصنف رحمہ اللہ هنا ولله دره حیث اوردها بسند صحیح و ذکر انه تلقاها عن عدة من ثقات مشائخه فقوله انها کذب محض مجازفة من ترهاته و قوله لم ینقل ولم یرو باطل فان مذهب مالک و احمد و الشافعی رحمہ اللہ تعالٰی عنهم استحباب استقبال القبر الشریف فی السلام والدعاء و هو مستطر فی کتبهم'' (نسیم الریاض ج ۳ ص ۳۹۸)

''اس میں ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے قول کا رد ہے کہ زیارت کے وقت قبر شریف کی طرف دُعا کرتے وقت رُخ پھیرنا بُری بات ہے۔ اس کا کوئی بھی قائل نہیں اور نہ کسی سے مروی ہے مگر اس حکایت میں جو امام مالک رحمہ اللہ پر گھڑی گئی ہے۔ یعنی یہی واقعہ جس کو قاضی عیاض رحمہ اللہ نے یہاں نقل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مصنف کے اصیل ہونے کی خوبی ہے کہ اس نے صحیح سند کے ساتھ یہ حکایت اپنے متعدد ثقہ مشائخ سے نقل کی ہے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ یہ نرا جھوٹ ہے۔ الکل پچو بات ہے جو ان کی بے باکانہ جسارت ہے۔ رہا ان کا یہ قول کہ یہ کسی سے منقول نہیں اور نہ کسی سے روایت ہے۔ یہ قول بھی باطل ہے کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اور امام الشافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ سلام اور دُعا کرتے وقت قبر شریف کی طرف رُخ کرنا مستحب ہے۔ جیسا کہ ان کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔''

اور خود حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو بھی ان حضرات کے اس مسلک کا اقرار ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''فقال الاکثرون کمالک و احمد و غیرهما یسلم علیه مستقبل القبر و هو الذی ذکره اصحاب الشافعی و اظنه منقولا عنه'' (فتاویٰ ج ۲۷ ص ۱۱۷، طبع جدید)

''اکثر حضرات جیسے امام مالک رحمہ اللہ اور امام اُحمد رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ آپ پر سلام قبر مبارک کی طرف رُخ کر کے کرنا چاہئے اور اسی کو حضرت شوافع رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے اور میرے خیال میں امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے۔''

درایت: رہی حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی یہ بات کہ امام مالک رحمہ اللہ سے مبسوط میں روایت ہے کہ زیارت کنندہ آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس کھڑا ہو کر دُعا نہ کرے بلکہ سلام کہہ کر چلا جائے تو اس میں بھی کلام ہے۔

اَوّلاً: اس لئے کہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے اس کے خلاف بھی روایت موجود ہے۔

چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''رؤس المسائل'' میں حافظ ابو موسیٰ الاصبہانی رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: ''روی عن مالک ابن انس الامام رحمہ اللہ تعالٰی انه قال اذا اراد الرجل ان یأتی قبر النبی ﷺ فیستدبر القبلة ویستقبل النبی ﷺ ویصلی علیه ویدعوا'' (شفاء السقام ص ۱۱۹)

''حضرت مالک ابن انس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ جب آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس آئے تو قبلہ کی طرف پیٹھ کرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رُخ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ بھی پڑھے اور دُعا بھی کرے۔''

اس میں و یصلی علیہ کے بعد حرف عطف کے ساتھ و یدعوا کے الفاظ صراحت سے مذکور ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قبر کے پاس دُعا بھی ان کے نزدیک درست ہے۔

وثانیاً: اس لئے کہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ باہر سے آنے والوں یا سفر پر جانے والوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس وقوف اور سلام و دُعا کو درست فرماتے ہیں۔ ہاں! اہل مدینہ کے لئے اس کو درست نہیں کہتے۔ چنانچہ خود حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فقہ مالکی کی کتاب ''مبسوط'' کے حوالہ سے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اہل مدینہ پر یہ لازم نہیں کہ وہ جب مسجد میں داخل ہوں یا اس سے نکلیں تو قبر مبارک کے پاس ٹھہریں۔ یہ تو باہر سے آنے والوں کے لئے ہے اور نیز فرمایا کوئی حرج نہیں۔ اس شخص کے لئے جو سفر سے آئے یا سفر کے لئے نکلے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس ٹھہرے اور وہاں صلوٰۃ پڑھے اور آپ کے لئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے دُعا کرے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے کہا گیا کہ اہل مدینہ کے کچھ لوگ نہ تو سفر سے آئے ہوتے ہیں اور نہ سفر کا اِرادہ کرتے ہیں وہ روزانہ ایک دفعہ یا زیادہ یہ کارروائی کرتے ہیں اور بسا اوقات وہ جمعہ کو یا اور ایام میں ایک دو دفعہ یا زیادہ قبر کے پاس ٹھہرتے ہیں اور سلام کہتے ہیں اور ایک گھڑی دُعا کرتے ہیں تو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھے یہ بات مدینہ طیبہ میں کسی اہل فقہ سے نہیں پہنچی اور اس کے ترک کر دینے میں گنجائش ہے اور اس اُمت کے آخری لوگوں کی اصلاح بھی صرف اسی طریقہ سے ہوگی جس سے پہلے لوگوں کی اصلاح ہوئی تھی اور مجھے اس اُمت کے پہلے لوگوں اور اس کی بہترین شخصیتوں سے یہ خبر نہیں پہنچی کہ وہ ایسا کرتے تھے۔

''ویکرہ الا لمن جاء من سفر او ارادہ'' (فتاوٰی ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ج ۲۷ ص ۱۱۷، طبع جدید و شفاء السقام ص ۲۵)

''اور ایسا مکروہ ہے۔ ہاں! مگر جو سفر سے آئے یا سفر کرنے کا اِرادہ کرتا ہو۔''

اس تفصیلی حوالہ سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس کھڑے ہو کر سلام اور دعا کرنا ان لوگوں کے لئے مکروہ ہے جو مدینہ طیبہ ہی میں ہمہ وقت مقیم ہوں لیکن ان میں سے اگر کوئی شخص سفر کا اِرادہ رکھتا ہو یا سفر سے واپس آیا ہو اور اسی طرح دیگر مسافروں کے لئے ایسا کرنا مکروہ نہیں ہے اور اس کی وجہ بھی خود حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''لان ذٰلک تحیۃ لہ و المحیا لا یقصد بیتہ کل وقت بخلاف القادمین من السفر''

''کیونکہ یہ آپ کو سلام کہنا ہے اور جس کو سلام کہا جاتا ہے ہر وقت اس کے گھر کا قصد نہیں کیا جاتا۔ بخلاف اُن کے جو سفر سے آئیں۔'' (ج ۲۷ ص ۱۱۸)

اس سے اہل مدینہ کے ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر برائے سلام و دُعا نہ حاضر ہونے کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ علاوہ ازیں متعدد کتابوں میں آپ کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر طلب دُعا کا تذکرہ ہے۔

چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وقد ذکر جماعة منهم الشيخ ابو منصور الصباغ في كتابه الشامل الحكاية المشهورة عن العتبى قال كنت جالسا عند قبر النبى ﷺ فجاء اعرابى فقال السلام عليك يا رسول الله سمعت الله يقول وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَاؤُكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ○ وَقَدْ جِئْتُكَ مُسْتَغْفِرًا الذَّنْبِيْ مُسْتَشْفِعًا بِكَ اِلٰى رَبِّيْ''

''ایک جماعت نے عتبی رحمہ اللہ سے یہ مشہور حکایت نقل کی ہے جس جماعت میں شیخ ابو منصور الصباغ رحمہ اللہ بھی ہیں۔ یہ واقعہ انہوں نے اپنی کتاب الشامل میں بیان کیا ہے۔ عتبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور اس نے کہا: ''السلام علیک یا رسول اللہ'' میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا ہے اور اگر بے شک وہ لوگ جب کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، تیرے پاس آتے۔ پس وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے اور ان کے لئے رسول بھی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا تو وہ ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے۔ اس لئے میں اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کے لئے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی پیش کرنے آیا ہوں۔'' (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۲۰)

اس کے بعد اس نے درد دل سے چند اشعار پڑھے اور اظہار عقیدت اور جذبۂ محبت کے پھول نچھاور کر کے چلا گیا اور اسی واقعہ کے آخر میں مذکور ہے کہ خواب میں اس کو کامیابی کی بشارت بھی مل گئی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے عتبی رحمہ اللہ جا کر اس اعرابی سے کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی ہے۔

یہ واقعہ امام نووی رحمہ اللہ نے (کتاب الاذکار ص ۱۸۵، طبع مصر) میں اور علامہ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد النسفی رحمہ اللہ الحنفی (المتوفی ۷۱۰ھ) نے اپنی تفسیر (المدارک ج ۱ ص ۳۹۹) میں اور علامہ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ نے (شفاء السقام ص ۴۶) میں اور شیخ عبد الحق رحمہ اللہ نے (جذب القلوب ص ۱۹۵) میں اور علامہ بحر العلوم عبد العلی رحمہ اللہ نے (رسائل الارکان ص ۲۸۰ طبع لکھنؤ) میں نقل کیا ہے۔

اور علامہ علی بن عبد الکافی السبکی رحمہ اللہ اور علامہ سمہودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وحكاية العتبى فى ذلك مشهورة وقد حكاها المصنفون فى المناسك من جميع المذاهب والمؤرخون وكلهم استحسنوها''

''عتبی رحمہ اللہ کی حکایت اس میں مشہور ہے اور تمام مذاہب کے مصنفین نے مناسک کی کتابوں میں اور مؤرخین نے اس کو ذکر کیا ہے اور سب نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے۔'' (شفاء السقام ص ۶۱، ووفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۱۱)

اور خطیب قسطلانی رحمہ اللہ اور علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے بھی اس الحکایۃ المشہورۃ کا باقاعدہ حوالہ دیا ہے۔ (المواہب مع الزرقانی ج ۸ ص ۳۰۶)

اور اسی طرح شیخ محمد بخیت الحنفی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''تطهير الفواد من دنس الاعتقاد'' (ص ۵۱، ۵۲ طبع مصر) میں تذکرہ کیا ہے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ اس واقعہ سے استدلال اس رنگ میں نہیں کہ عتبی رحمہ اللہ کوئی بڑے پارسا بزرگ اور ثقہ راوی تھے جن کی اس کارروائی کی پیروی کی جا رہی ہے۔ فرض کیجئے کہ وہ بادۂ مست میں بھی ہوں جیسا کہ بعض کتابوں میں اس کا ذکر بھی ہے اور بعض معاصرین نے اس کو پلے باندھ لیا ہے

بلکہ استدلال اس انداز سے ہے کہ اس کی اس کارروائی کو ہر مکتب فکر کے علماء کرام کی اکثریت نے مستحسن سمجھ کر اس پر عمل کیا ہے اور تلقی اُمت اور تعامل علماء وفقہاء سے یہ کارروائی جواز کا درجہ رکھتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو دیکھا کہ یہود عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ اس دن تم کیوں روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کو نجات دی تھی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شکریہ کے طور پر روزہ رکھا تھا، اس لئے ہم بھی روزہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہمارا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تمہاری نسبت زیادہ ہے۔ آپ ﷺ نے خود بھی عاشورہ کا روزہ رکھا اور اُمت کو بھی حکم دیا۔ (او کما قال مشکوۃ ج ۱ ص ۱۸۰، وقال متفق علیہ) اس کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں کہ یہودی یہودیت پر قائم رہ کر ثقہ اور عادل راوی ہو گئے اور اُن کی بات اس لحاظ سے حجت ہوگئی بلکہ ان کا یہ فعل ایک اچھا فعل تھا، اس لئے آپ ﷺ نے اس پر خود بھی عمل کیا اور اُمت کو بھی حکم دیا۔ اسی طرح اس واقعہ کو سمجھئے اور اسی طرح دیگر متعدد علماء کرام نے قدیماً وحدیثاً اس کو نقل کیا ہے اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مواہب میں بسند امام ابومنصور صباغ اور ابن النجار اور ابنِ عساکر اور ابن الجوزی رحمہ اللہ محمد بن حرب ہلالی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ میں قبر مبارک کی زیارت کر کے سامنے بیٹھا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور زیارت کر کے عرض کیا کہ یا خیر الرسل اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایک سچی کتاب نازل فرمائی جس میں ارشاد فرمایا ہے: ''وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا'' اور میں آپ کے پاس اپنے گناہوں سے استغفار کرتا ہوا اور اپنے رب کے حضور میں آپ کے وسیلہ سے شفاعت چاہتا ہوا آیا ہوں پھر دو شعر پڑھے۔'' اور اس محمد بن حرب کی وفات ۲۲۸ھ میں ہوئی ہے اور عرض زمانۂ خیر القرون کا تھا اور کسی سے اُس وقت نکیر منقول نہیں۔ پس حجت ہوگیا۔ (نشر الطیب ص ۲۵۴)

اور حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ یہ آیت کریمہ لکھ کر تحریر فرماتے ہیں کہ: ''کیونکہ اس میں کسی کی تخصیص نہیں۔ آپ کے ہم عصر ہوں یا بعد کے اُمتی ہوں اور تخصیص ہو تو کیونکر ہو آپ کا وجود تربیت تمام اُمت کے لئے یکساں رحمت ہے کہ پچھلے اُمتیوں کا آپ کی خدمت میں آنا اور استغفار کرنا اور کرانا جب ہی متصور ہے کہ قبر میں زندہ ہوں۔'' (آب حیات ص ۴۰)

اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ یہ سابق واقعہ ذکر کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ: ''فثبت ان احکم الاٰیة باقٍ بعد وفاته ﷺ'' (اعلاء السنن ج ۱۰ ص ۳۳۰)

''پس ثابت ہوا کہ اس آیت کریمہ کا حکم آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی باقی ہے۔''

ان اکابر کے بیان سے معلوم ہوا کہ قبر مبارک پر حاضر ہو کر شفاعتِ مغفرت کی درخواست کرنا قرآن کریم کی آیت کے عموم سے ثابت ہے، بلکہ امام سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس معنی میں صریح ہے۔ ''صریح فی ذٰلک'' (شفاء السقام ص ۱۲۸) اور خیر القرون میں یہ کارروائی ہوئی مگر کسی نے انکار نہیں کیا جو اس کے صحیح ہونے کی واضح دلیل ہے۔

علامہ سمہودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''والعلماء فهموا من الاٰية العموم بحالتی الموت والحيوة واستحبوا لمن اتی القبر ان يتلوها ويستغفر الله تعالی وحکاية الاعرابی فی ذلک نقلها جماعة من الائمة عن العتبی'' (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۱۱)

''علماء نے اس آیت کریمہ سے آپ کی زندگی اور موت دونوں حالتوں کا عموم سمجھا ہے اور انہوں نے اس کو مستحب قرار دیا ہے کہ جو شخص آپ ﷺ کی قبر مبارک پر جائے وہ اس کو پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور اعرابی کی حکایت اس سلسلہ میں آئمہ کرام رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے عتبی رحمہ اللہ سے نقل کی ہے۔''

اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ علماء اُمت نے اس آیت کریمہ سے آنحضرت ﷺ کی زندگی اور بعد از وفات دونوں حالتوں میں عموم سمجھ کر آپ کی قبر مبارک پر اس کو پڑھنا مستحب قرار دیا ہے اور یہ صرف آپ کی زندگی ہی سے مخصوص نہیں ہے۔

امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحنبلی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''المستوعب'' میں آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے آداب میں لکھتے ہیں کہ پھر آپ کی قبر مبارک کی دیوار کے پاس پہنچے اور کنارہ پر قبر مبارک کی طرف رُخ کر کے قبلہ کی طرف پیٹھ پھیر کر اور منبر کو بائیں طرف کر کے کھڑا ہو اور یہ دُعا پڑھے: ''اللّٰهم انک قلت فی کتابک لنبیّک علیہ السلام وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ۔ (الاٰية) وانی قد اتيت نبيّک و مستغفراً فاسئلک ان توجب الی المغفرة کما اوجبتها لمن اتاه فی حياته اللّٰهم انی اتوجه اليک بنبيّک ﷺ و ذکر دعاءً طويلا'' (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۲۳)

''اے اللہ تعالیٰ تو نے اپنی کتاب میں اپنے نبی ﷺ سے فرمایا ہے اور اگر وہ جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا تیرے پاس آتے۔'' اور بے شک میں تیرے نبی ﷺ کے پاس معافی مانگنے آیا ہوں اور میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو میرے لئے مغفرت لازم کر دے جیسا کہ تو نے اُس شخص کے لئے لازم کی جو آپ کی زندگی میں آپ ﷺ کے پاس آیا ہے۔ میرے رب میں تیرے ہاں تیرے نبی ﷺ کو سفارشی پیش کرتا ہوں اور پھر لمبی دُعا ذکر کی۔''

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۱ رشوال ۱۴۰۶ھ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند و مفتی اعظم پاکستان) اپنی معتبر اور مستند علمی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری جیسے آپ ﷺ کی دنیوی حیات کے زمانہ میں ہو سکتی تھی، اُسی طرح آج بھی روضۂ اقدس پر حاضری اس حکم میں ہے۔ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے فرمایا کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کو دفن کر کے فارغ ہوئے تو اس کے تین روز بعد ایک گاؤں والا آیا اور قبر شریف کے پاس آ کر گر گیا اور زار زار روتے ہوئے آیت مذکورہ کا حوالہ دے کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ اگر گنہگار، رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور رسول ﷺ اس کے لئے دُعائے مغفرت کر دیں تو اس کی مغفرت ہو جائے گی۔ اس لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ میرے لئے مغفرت کی دُعا کریں۔ اُس وقت جو لوگ حاضر تھے ان کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں روضۂ اقدس کے اندر سے آواز آئی قَدْ غُفِرَ لَکَ (بحر محیط) یعنی مغفرت کر دی گئی۔'' (معارف القرآن ج دوم ص ۴۵۸، ۴۵۹)

فائدہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت کے بارے میں علامہ ابن عبدالهادی رحمہ اللہ نے (الصارم المنکی ص ۲۷۶) میں کڑی جرح کی ہے کہ اس کی سند میں ہیثم بن عدی کذاب راوی ہے اور یہ خبر منکر اور موضوع ہے اور

انہی کی پیروی میں (اقامۃ البرہان ص ۲۸۴ تا ۲۸۷) میں اس پر کتب ''اسماء الرجال'' سے مفصل بحث کی ہے لیکن علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ کا اس کو قطعی طور پر موضوع کہنا صرف ہوائی فیر ہے۔ اس لئے کہ اس روایت کی سند میں جس راوی پر سخت جرح ہوئی ہے وہ ہیثم ہے۔

اور ابن عبدالہادی لکھتے ہیں کہ: ''واظنّہ ابن عدی الطائی فان یکن ہو فہو متروک کذاب والا فہو مجہول'' (الصارم المنکی ص ۲۷۶)

''میرا خیال ہے کہ یہ راوی ہیثم بن عدی الطائی ہے۔ پس اگر یہ وہی ہے تو متروک اور کذاب ہے اور اگر وہ نہیں تو وہ مجہول ہے۔''

سوال یہ ہے کہ جب خود علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ اس راوی کی تعیین ہی میں متردّد ہیں تو ان کو اس کا حق کیسے اور کہاں سے حاصل ہے کہ وہ قطعیّت کے ساتھ اس حدیث کو موضوع قرار دیں؟ ہاں! اگر علی التعیین یہ راوی ہیثم بن عدی طائی ہی ہوتا تو کتب ''اسماء الرجال'' سے جتنی جرحیں اس پر نقل کی گئی ہیں کہ وہ کذاب اور متروک ہے وہ بجا ہیں مگر ایسا نہیں زیادہ سے سے زیادہ یہی ہوگا کہ یہ روایت ضعیف ہوگی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر شفاعت کی التجاء کرنا ذمہ دار حضرات فقہاء کرام محدثین عظام اور تعامل علماء سے ثابت ہے۔ اس لئے جواز کے مسئلہ کے لئے یہ روایت قابل برداشت ہوگی۔ کیونکہ محدثین کرام رحمہم اللہ کے ہاں یہ طے شدہ بات ہے کہ عقیدہ کے باب میں خبر واحد صحیح بھی معتبر نہیں اور حلال وحرام اور طلاق ونکاح وغیرہ کے سلسلہ میں صحیح یا حسن خبر ہی قابل احتجاج ہوسکتی ہے۔ باقی جواز اور استحباب کے لئے ضعیف حدیث بھی قابل قبول ہے۔

چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وقال العلماء من المحدثین والفقہاء و غیرہم یجوز ویستحب العمل فی الفضائل والترغیب والترہیب بالحدیث الضعیف مالم یکن موضوعا''

''علماء محدثین اور فقہاء رحمہم اللہ وغیرہم یہ فرماتے ہیں کہ فضائل اور ترغیب وترہیب میں ضعیف حدیث کے ساتھ عمل جائز اور مستحب ہے بشرطیکہ موضوع نہ ہو۔'' (کتاب الاذکار ص ۷، طبع مصر)

غیر مقلدین حضرات کے شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) لکھتے ہیں کہ ضعیف حدیث جو موضوع نہ ہو، اس سے استحباب اور جواز ثابت ہوسکتا ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ ج ۱ ص ۲۶۵)

اور نواب صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''فضائل اعمال میں ضعیف حدیث کے حجت ہونے پر علماء کا اتفاق ہے۔'' (دلیل الطالب ص ۸۸۹)

اور حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے استشفاع عند القبر کو جائز ہی کہا ہے جیسا کہ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کی عبارت میں مذکور ہے یا بعض نے مستحب کہا ہے جیسا کہ علامہ سمہودی رحمہ اللہ کی عبارت میں مذکور ہے۔

تعامل کس طبقہ کا معتبر ہے؟

اہل علم کی عبارات میں جب یہ آتا ہے کہ علماء نے اس کی تلقّی بالقبول کی ہے یا اس پر اُمت کا تعامل ہے تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہر عالم کہلانے والے کی تلقّی بالقبول یا تعامل مراد ہے۔ ورنہ ہر بدعت پسند طبقہ جو حظوظ

نفس کے لئے اپنی بدعات کو حرزِ جان قرار دیتا اور اس پر شدت سے کاربند اور مصر ہے۔ اس کا عمل بھی تلقی بالقبول کی مد میں ہوگا۔ حاشا و کلّا! عالم اور اُمتی ہے وہ عالم اور اُمتی مراد ہے جو قرآن کریم اور سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ کو جاننے والا اور دِل وجان سے ان پر عامل اور حضرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین تبع تابعین رحمہم اللہ اور سلف وخلف رحمہم اللہ کے عمل کو صحیح اور ٹھوس حوالوں کے پیش نظر اپنے لئے راہ نجات سمجھے، اس لئے ان الفاظ سے نہ دھوکہ دینا چاہئے اور نہ کھانا چاہئے اللہ تعالیٰ ہر ایک کو صحیح سمجھ نصیب فرمائے۔ (آمین)

محقق علی الاطلاق حافظ ابن الھمام الحنفی رحمہ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس حاضری کے آداب بتلاتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ: ''ثم یسئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم الشفاعة فیقول یارسول اللہ اسألک الشفاعة یارسول اللہ اسئلک الشفاعة واتوسّل بک الی اللہ فی ان اموت مسلمًا علی ملتک و سنتک ویذکر کل ما کان من قبیل الاستعطاف والرفق'' (فتح القدیر ج ۲ ص ۳۳۸، طبع مصر)

''پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت کا سوال کرے۔ پس کہے اے اللہ تعالیٰ کے رسول میں آپ سے شفاعت کا سوال کرتا ہوں یارسول اللہ میں آپ سے شفاعت کی درخواست کرتا ہوں اور آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں بطور وسیلہ پیش کرتا ہوں۔ آرزو یہ ہے کہ میں بحالت اسلام آپ کی مِلّت وسنّت پر مروں اور ہر ایسی چیز کا ذکر کرے جو تشفق وترحم کے قبیل سے ہو۔''

قبر مبارک کے پاس شفاعت کی درخواست اس بات پر مبنی ہے کہ قبر شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں اور آپ کے جسدِ اطہر سے روح مبارک کا اتصال، علاقہ اور تعلق ہو اور شفاعت کی درخواست کرنے والے کی التجاء بنفسِ نفیس خود سماعت فرماتے ہوں۔ اگر یہ محض توسّل کی صورت ہوتی تو قبر کے پاس حاضری کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں یہ تو ہر جگہ ہوسکتی ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں (جس کو سلطان اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ (المتوفی ۱۱۱۸ھ) کے حکم سے تقریباً پانچ سو علماء کرام کی مستند جماعت نے مرتب کیا ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضری اور اپنے معروضات پیش کرنے کے بعد اس کی بھی تصریح کی ہے۔ ''و یبلغه سلام من اوصافه فیقول السلام علیک یا رسول اللہ من فلان بن فلان یستشفع بک الی ربک فاشفع له ولجمیع المسلمین'' (عالمگیری ج ۱ ص ۲۸۲، طبع مصر)

''جس شخص نے آپ کی خدمت میں سلام کہنے کی تاکید کی ہو، آپ کو اس کا سلام بھی عرض کرے۔ پس یوں کہے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں بن فلاں نے آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے اور وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی بناتا ہے۔ سو آپ اس کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے شفاعت کریں۔''

اس عبارت میں بھی آپ کی خدمت اقدس میں سلام عرض کرنے اور شفاعت کی درخواست کرنے کا صراحت ووضاحت سے ذکر ہے۔

اور علّامہ بحرالعلوم عبدالعلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ثم یسال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الشفاعة فیقول یارسول اللہ اسئلک الشفاعة یا رسول اللہ اسئلک الشفاعة واتوسل بک الی اللہ فی ان اموت مسلما علی ملّتک وسنّتک'' (رسائل الارکان ص ۲۸۱، طبع لکھنؤ)

''پھر آنحضرت ﷺ سے شفاعت طلب کرے اور کہے یا رسول اللہ میں آپ کی شفاعت کا سوال کرتا ہوں یا رسول اللہ! میں آپ کی شفاعت کا سوال کرتا ہوں اور آپ کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کرتا ہوں کہ میں آپ ملّت اور آپ کی سنّت پر مروں۔''

اور پھر آگے لکھا ہے کہ جس شخص نے آپ کے روضۂ اقدس پر سلام عرض کرنے کی وصیت کی ہو، اس کا سلام بھی پہنچائے اور یہ کہے کہ یا رسول اللہ فُلاں بن فُلاں کی طرف سے آپ کو سلام قبول ہو یا یوں کہے فلاں بن فلاں آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔ (رسائل الارکان ص ۲۸۲) اور نیز فرماتے ہیں کہ اس کے بعد حضرات شیخین ﷠ کو سلام کہے اور پھر لوٹے۔ (ایضاً)

علّامہ سمہودی ﷫ لکھتے ہیں: ''وقال ابو منصور الکرمانی من الحنفیة ان کان احد او صاک بتبلیغ التسلیم تقول السلام علیک یا رسول اللہ من فلان بن فلان یستشفع بک الی ربک بالرحمة و المغفرة فاشفع'' (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۲۳)

''امام ابو منصور الکرمانی الحنفی ﷫ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے تمہیں سلام پہنچانے کی وصیت کی ہو تو تم وہاں کہو یا رسول اللہ فلاں بن فلاں کی طرف سے آپ پر سلام ہو وہ آپ کو آپ کے رب کے سامنے رحمت اور مغفرت کے سلسلہ میں سفارشی بناتا ہے۔ پس آپ اس کے لئے سفارش کریں۔''

حضرت مولانا قاری سعید احمد صاحب ﷫ سابق مفتی مظاہر العلوم سہارنپور نے بھی اپنی مشہور اور مستند کتاب (معلم الحجاج ص ۳۲۵) میں آپ ﷺ کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر شفاعت کی درخواست کرنے کا اور (ص ۳۲۶) میں دوسروں کا سلام آپ ﷺ تک پہنچانے کا فقہی طریقہ صراحت سے ذکر کیا ہے۔

اور علّامہ حسن بن عمار بن علی شرنبلالی الحنفی ﷫ آنحضرت ﷺ کے روضۂ اقدس کی زیارت کے وقت بڑے والہانہ اور عقیدت مندانہ انداز میں عرض پیش کرنے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''یا رسول اللہ نحن وفدک و زُوّار حرمک تشرفنا بالحلول بین یدیک و قد جئنٰک من بلاد شاسعة و امکنة بعیدة نقطع السهل و الوعر بقصد زیارتک لنفوز بشفاعتک و النظر الی ماثرک و معاهدک و القیام بقضاء بعض حقک و الاستشفاع بک الی ربنا فان الخطایا قد قصمت ظهورنا الی ان قال الشفاعة الشفاعة یا رسول اللہ یقولها ثلاثاً'' (نور الایضاح ص ۱۹۱)

''یا رسول اللہ (ﷺ) ہم آپ کے پاس وفد کے طور پر آپ کے حرم کی زیارت کی غرض سے آئے ہیں اور ہمیں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے اور ہم دور دراز شہروں اور بعید جگہوں سے آسان اور دُشوار گزار راستے طے کر کے آپ کی زیارت کی غرض سے آئے ہیں تاکہ آپ کی شفاعت سے کامیابی حاصل کریں اور مبارک نشانات اور مقامات کو دیکھیں اور آپ کے حق کا کچھ حصہ ادا کریں اور آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی پیش کریں۔ کیونکہ گناہوں نے ہماری کمر توڑ دی ہے۔ (پھر آگے فرمایا کہ) شفاعت، شفاعت، شفاعت یا رسول اللہ تین مرتبہ کہے۔''

غور فرمایئے کہ کس طرح اس عبارت کے لفظ لفظ میں جناب رسول اللہ ﷺ فداہ ابی و امی کی تعظیم وعقیدت محبت ومودّت اور اُلفت ورأفت کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے اور کس نیازمندانہ اور عاجزانہ انداز میں آپ

سے شفاعت کی التجاء کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام اہل اسلام کو سمیت اس حقیر پرتقصیر کے بار بار روضۂ اقدس پر حاضری کا شرف مرحمت فرمائے۔ اے خالق بے نیاز کیا زندگی میں آئندہ بھی وہ دن آئے گا کہ ؂

وہ دن خدا کرے کہ مدینہ کو جائیں ہم خاک در رسول کو سُرمہ بنائیں ہم

اور علامہ شرنبلالی رحمہ اللہ نے پھر آگے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی قبور کے پاس حاضری دینے کا مستحب طریقہ بتلاتے ہوئے نہایت والہانہ انداز میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ: ''جئنا کما نتوسل بکما الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یشفع لنا ویسئال اللہ ربنا ان یتقبل سعینا ویحینا علی ملتہ ویمیتنا علیھا ویحشر نافی زمرتہ'' (نور الایضاح ص ۱۹۱)

''ہم تم دونوں کے پاس آئے ہیں تمہیں بطور وسیلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کرتے ہیں تا کہ آپ ہمارے لئے شفاعت کریں اور اللہ تعالیٰ سے جو ہمارا رب ہے سوال کریں کہ وہ ہماری سعی کو قبول فرمائے اور ہمیں آپ کی مِلّت پر زندہ رکھے اور اسی پر وفات دے اور آپ کے گروہ میں ہمارا حشر کرے۔ (آمین ثم آمین)

علامہ السید احمد طحطاوی رحمہ اللہ ''الشفاعۃ'' کے جملہ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''ای نطلب منک الشفاعۃ'' یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ سے شفاعت کرنے کی التجاء کرتے ہیں۔ (طحطاوی ص ۴۰۶)

مشہور فقیہ عبد الرحمن بن الشیخ محمد بن سلیمان الحنفی المعروف بداماد آفندی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۸۸ھ) لکھتے ہیں کہ: ''ویقول السّلام علیک یارسول اللہ اسئلک الشفاعۃ الکبرٰی واتوسّل بک الی اللہ تعالیٰ فی ان اموت مسلمًا علی ملّتک وسنّتک'' (مجمع الانہر ج ۱ ص ۳۱۳، فی شرح ملتقی الابحر)

''اور کہے سلام ہو آپ پر اے اللہ تعالیٰ کے رسول میں آپ سے بڑی شفاعت مانگتا ہوں اور آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں بطور وسیلہ پیش کرتا ہوں کہ میں آپ کی مِلّت وسُنّت پر مسلمان ہوتے ہوئے مروں۔''

مؤلفۃ العلّامۃ ابراھیم محمد الحلبی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۹۵۶ھ) اور اس سے قبل (ج ۱ ص ۳۱۲) میں یہ حدیث نقل کرتے ہیں: ''من صلّی علی قبری سمعتہٗ ومن صلّی علیَّ نائیًا بلغتہٗ''

حضرت امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''فاذا صلّی تحیۃ المسجد اتی القبر الکریم فاستقبلہٗ واستدبر القبلۃ علی نحو اربع اذرع من جدار القبر وسلّم مقتصدًا لا یرفع صوتہ السّلام علیک یارسول اللہ، السّلام علیک یاخیرۃ اللہ من خلقہ السّلام علیک یا حبیب اللہ ''الٰی ان قال'' فیتوسل بہ فیحق نفسہ ویتشفع بہ الٰی ربہ سبحانہٗ وتعالیٰ ویدعو النفسہ والوالدیہ واصحابہ واحبابہ ومن احسن الیہ وسائر المسلمین''

''جب وہ تحیۃ المسجد ادا کرلے تو قبر مبارک کے پاس جائے اور اس کے سامنے کھڑا ہو اور قبلہ کی طرف پیٹھ پھیر دے اور قبر مبارک کی دیوار سے تقریبًا چار ہاتھ دُور کھڑا ہو اور میانہ روی اختیار کرے اور آواز (بہت زیادہ) بلند نہ کرے اور کہے: ''السّلام علیک یا رسول اللہ السّلام علیک یا حبیب اللہ'' اور سلام ہو تجھ پر اے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے چنے ہوئے۔ (پھر آگے فرمایا) سواپنے نفس کے حق میں آپ کا توسّل کرے اور پروردگار کے سامنے آپ کو سفارشی بنائے اور اپنے والدین اور دوستوں اور جس نے بھی اس سے حُسنِ سلوک کیا ہے، اس کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے دُعا کرے۔'' (کتاب الاذکار ص ۱۸۴، طبع مصر)

نیز حضرت امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ویتوسل به فی حق نفسه ویتشفع به الٰی ربه سبحانه وتعالٰی ومن احسن ما یقول ما حکاه اصحابنا عن العتبی مستحسنین له قال کنت جالسا عند قبر النبی ﷺ فجاء اعرابی فقال السّلام علیک یارسول اللّٰه'' (الایضاح فی مناسک الحج ص ۴۹۸، طبع مصر)

''آنحضرت ﷺ کو اپنے نفس کے بارے میں وسیلہ بنائے اور آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی بنائے اور اچھی بات وہ ہے جو ہمارے شوافع حضرات نے عتبی رحمہ اللہ سے حکایت کی اور اس کو انہوں نے اچھا سمجھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کی قبر مبارک کے پاس تھا، ایک اعرابی آیا اور اس نے کہا: ''السلام علیک یارسول اللہ''

علامہ رحمۃ اللہ السندھی اور حضرت ملا علی القاری فرماتے ہیں کہ: ''ثم ای فی تلک الساعة یطلب الشفاعة ای فی الدنیا بتوفیق الطاعة وفی الأخرة بغفران المعصیة فیقول یا رسول اللّٰه اسئالک الشفاعة ثلاثا لانه اقل مراتب الالحاح لتحصیل المنال فی مقام الدعاو السوال ولا یعبد ان یکون اشارة الٰی طلبها فی المقامات الثلاثة من الدنیا والبرزخ والأخرة والمراتب المرتبة من الشریعة والطریقة والحقیقة''

(لباب المناسک مع شرح المسلک المتقسط فی المنسک المتوسط ص ۳۳۹، طبع مصر)

''پھر اس گھڑی شفاعت طلب کرے دُنیا میں اطاعت کی توفیق کی اور آخرت میں گناہ کی بخشش کی اور تین مرتبہ کہے یارسول اللہ! میں آپ سے شفاعت طلب کرتا ہوں۔ کیونکہ دُعا اور سوال کے مقام پر مقصد حاصل کرنے کے لئے یہ عاجزی کے اقل مراتب ہیں اور بعید نہیں کہ دُنیا، برزخ اور آخرت کے تین مقامات میں طلب شفاعت کی طرف اشارہ ہو اور اُن تین بالترتیب مراتب کی طرف بھی اشارہ ہو جو شریعت طریقت اور حقیقت سے تعبیر کئے جاتے ہیں۔''

احناف کے ان دو بزرگ علماء نے قبر مبارک پر طلب شفاعت کا مستحسن ہونا اور اس کا طریقہ بتایا ہے اور نیز یہ دونوں بزرگ لکھتے ہیں۔ (ہم صرفی بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے معنیٰ کرتے ہیں)

''وحسن ای بصیغة الوصف او المضی ای ویستحسن ان یقول ای کما قال اعرابی مقبول ''اللّٰهم انک قلت وانت اصدق القائلین وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُم جَآءُوْکَ'' ای تائبین ''فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ'' ای عن ظلمة المعصیة ''وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ'' ای بالشفاعة لردهم الی الطاعة ''لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا'' ای قابلا لتوبتهم رَحِیْمًا بعصمتهم جنناک ای فقد اتینک ''ظٰلمین لانفسنا مستغفرین من ذنوبنا'' ای ومستشفعین بک الٰی ربنا ''فاشفع لنا'' ای الٰی ربک ''واسئاله ان یمن علینا بسائر طلباتنا'' بکسر فسکون ای مطلوباتنا ومسئولاتنا'' (لباب المناسک مع المسلک المتقسط ص ۳۴۰)

''اور مستحسن ہے کہ زیارت کنندہ کہے۔ جیسا کہ ایک مقبول (بارگاہِ الٰہی) اعرابی نے کہا تھا۔ اے اللہ تعالیٰ! تُو نے فرمایا اور تُو سب کہنے والوں میں زیادہ سچا ہے اور اگر وہ جب کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا تیرے پاس توبہ کرتے ہوئے آتے اور اپنے گناہ کی تاریکی سے وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے اور ان کے لئے جناب رسول اللہ ﷺ بھی ان کے اطاعت کی طرف لَوٹنے کی شفاعت کر کے استغفار کرتے تو اللہ تعالیٰ کو وہ توبہ قبول کرنے والا اور ان کے بچاؤ پر مہربان پاتے۔ سو بے شک ہم اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہوئے اور اپنے گناہوں سے معافی چاہتے ہوئے آئے

ہیں۔ہم آپ کو اپنے رب کے ہاں سفارشی بناتے ہیں۔سو آپ ﷺ اپنے رب کے ہاں ہماری سفارش فرمائیں اور آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے سوال کریں کہ وہ ہمارے مطلوبات اور سوالات پورے فرما کر ہم پر احسان فرمائے۔''

''اور پھر آگے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ) پر سلام کہنے کا طریقہ اور تعلیم وعقیدت کا سبق دیتے ہوئے۔علامہ رحمت اللہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: (اور حضرت مُلّا علی القاری رحمہ اللہ اس کی تشریح کرتے ہوئے ان کی مکمل تائید کرتے ہیں) ''جئنا یا صاحبی رسول اللہ ﷺ زائرین لنبینا و صدیقنا وفاروقنا و نحن نتوسل بکما الی رسول اللہ ﷺ یشفع لنا الی ربنا ای فی مغفرۃ ذنوبنا'' (ایضاً ص ۳۴۰)

''اے آنحضرت ﷺ کے دو ساتھیو ہم آنحضرت ﷺ اور صدیق رضی اللہ عنہ اور فاروق رضی اللہ عنہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں اور ہم تم دونوں کو آپ ﷺ کے ہاں وسیلہ بناتے ہیں تاکہ آپ ﷺ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لئے سفارش کریں۔''

علامہ داؤد بن سلیمان البغدادی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی) لکھتے ہیں کہ:''وقد اطبق الائمۃ الحنفیۃ علی سنیۃ زیارۃ النبی ﷺ و زیارۃ صاحبیہ رضی اللہ عنہما والسلام علیھم و طلب الشفاعۃ منھم فلو کانوا قائلین بعدم سماع النبی و الصاحبین لکان کلامھم متناقضًا'' (المنحۃ الوھبیۃ ص ۱۲)

''آنحضرت ﷺ اور آپ کے دونوں ساتھیوں کی زیارت کے سنّت ہونے اور ان پر سلام کہنے اور ان سے شفاعت طلب کرنے پر علماء احناف کا اتفاق ہے۔اگر یہ حضرات آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صاحبین رضی اللہ عنہما کے عدم سماع کے قائل ہوتے۔(جیسا کہ وہم کیا گیا ہے) تو ان کا کلام متناقض ہوتا۔''

یہ عبارت بڑی واضح اور روشن ہے جس سے حضرات فقہاء احناف کا مسلک واضح ہوتا ہے۔

علامہ سمہودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:''وقال الکرمانی من الحنفیۃ اذا اختار الرجوع یستحب لہ ان یأتی القبر الشریف ویقول بعد السلام والدعاء و دعناک یا رسول اللہ غیر مودع ولا سامحین بفرقتک نسئلک ان تسأل اللہ تعالٰی ان لا یقطع اثارنا من زیارتِ حرمک و ان یعید ناسالمین غانمین الی اوطاننا و ان یبارک لنا فیما وھب لنا و ان یرزقنا الشکر علی ذلک'' (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۵۲)

''احناف کے فقیہ کرمانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب زیارت کنندہ واپس لوٹنے کا قصد کرے تو اس کے لئے مستحب ہے کہ قبر شریف پر جائے اور سلام و دُعا کے بعد کہے یا رسول اللہ ہم آپ سے رخصت ہو رہے ہیں لیکن رخصت ہونے کو جی نہیں چاہتا اور نہ آپ کی جدائی کو خوشی سے گوارا کرتے ہیں۔ہم آپ سے سوال کرتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ سے سوال کریں کہ وہ آپ کے حرم شریف کی زیارت سے ہمارے آثار نہ مٹائے اور ہمیں سلامت اور غنیمت کے ساتھ ہمارے اوطان کی طرف لوٹائے اور جو کچھ اس نے دیا ہے، اس میں برکت دے اور ہمیں اس پر شکر کی توفیق مرحمت فرمائے۔(آمین)

علامہ ابن عابدین الشامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:''یستحب لہ اذا عزم علی الرجوع الی اھلہ ان یودع

المسجد بصلوٰة و یدعوا بعدھا بما احب و ان یأتی القبر الکریم فیسلم و یدعوا و یسأل اللہ تعالٰی ان یوصلہ الی اھلہ سالمًا و یقول غیر مودع یارسول اللہ و یجتھد فی خروج الدموع فانہ من امارات القبول"

"جب زیارت کنندہ اپنے گھر کو لوٹنے کا ارادہ کرے تو اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ مسجد (نبوی) میں نماز پڑھ کر رخصت ہو اور اس کے بعد جو پسند ہو دُعا کرے اور قبر مبارک کے پاس آئے اور سلام کہے اور دعا کرے اور اللہ تعالیٰ سے سوال کرے کہ وہ اسے سلامتی سے اس کے گھر لوٹائے اور کہے یارسول اللہ آپ سے رخصت ہونے پر دل آمادہ نہیں اور کوشش کرے کہ آنسو نکلیں کیونکہ یہ قبولیت کی نشانیوں میں سے ہے۔" (شامی ج ۲ ص ۲۵۴، طبع مصر)

چونکہ علامہ شامی رحمہ اللہ عند القبر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سماع کے قائل ہیں۔ سماع الموتی میں ہم نے ان کا حوالہ عرض کر دیا ہے۔ اس عبارت میں وہ آپ سے خطاب کرتے ہوئے آپ کے فراق اور جدائی کا والہانہ اظہار فرماتے ہیں اور اس کا طریقہ بتاتے ہیں۔

ہمارے پیر و مرشد حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ، علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کی الجواہر المنظوم کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: "روی عن علی رضی اللہ عنہ انہ بعد دفنہ صلی اللہ علیہ وسلم جاء اعرابی فقال یارسول اللہ جئتک لتستغفر لی الی ربی فنودی من القبر الشریف قد غفر لک و اتت صفیۃ عمۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد وفاتہ (فقالت) اَلا یا رسول اللہ انت رجائیا۔ و کنت بنابرًا و لم تک جافیا۔ و سمع الصحابۃ رضی اللہ عنہم و لم ینکرھا احد" (تحریرات حدیث ص ۲۵۶)

"حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن کئے جانے کے بعد ایک اعرابی آیا۔ سو اس نے کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ میرے لئے میرے رب سے مغفرت طلب فرمائیں۔ پس قبر مبارک سے آواز آئی کہ بے شک تیری مغفرت ہو چکی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ کی وفات کے بعد آئی اور اس نے یہ شعر پڑھا۔ خبردار! اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ میری اُمید ہیں اور آپ ہم پر مہربان تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سخت مزاج نہ تھے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ سنا اور کسی ایک نے بھی اس کا انکار نہ کیا۔"

سند اور تاریخ کے لحاظ سے یہ واقعہ صحیح ہے یا غیر صحیح؟ یہ اپنے مقام کی بحث ہے۔ مگر حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ صاحب نے اس واقعہ کو مقام استدلال میں پیش کیا ہے اور اس کی یہاں تردید نہیں فرمائی اور تعامل اُمت کی وجہ سے گویا انہوں نے اس کو صحیح سمجھا ہے اور ہمارا استدلال بھی اسی پہلو سے حضرت مرحوم نے (تفسیر بے نظیر ص ۵۲) میں علامہ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ کے نظریہ کی پیروی کرتے ہوئے اس روایت کے راوی ہیثم بن عدی الطائی پر کڑی جرح نقل کی ہے لیکن پہلے یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ خود علامہ موصوف رحمہ اللہ اس راوی کی تعیین میں متردد ہیں تو وثوق کے ساتھ اس روایت کو موضوع اور ساقط الاعتبار قرار دینا بے جا ہے۔

ان تمام ذمہ دار فقہاء احناف رحمہم اللہ کی روشن عبارات سے یہ بات واضح سے واضح تر ہو گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر شفاعت کی التجاء کرنا جائز صحیح اور درست ہے۔ حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے فقہاء کرام رحمہم اللہ کی انہی عبارات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ: "اور دلیل جواز یہ ہے کہ فقہاء

نے بعد سلام کے وقت زیارت قبر مبارک کے شفاعت مغفرت کا عرض کرنا لکھا ہے۔ پس یہ جواز کے واسطے کافی دلیل ہے۔ الغرض آنحضرت ﷺ سے استشفاع تو حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

بلکہ حضرت ملا علی القاری حاجی کو ہدایت کرتے ہوئے شہدائے اُحد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''ولا تترک اتیان زیارتھم واستدعاء شفاعتھم'' (شرح شفاء ج ۳ ص ۵۲۰ طبع مصر)

''اور تم شہداء (اُحد) کی زیارت کو مت ترک کرنا اور نہ ان سے شفاعت کی التجاء سے گریز کرنا۔''

اور حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''پھر آنحضرت ﷺ کے وسیلہ سے دعا کرے، اپنی شفاعت چاہے اور کہے: ''یا رسول اللہ اسئلک الشفاعة واتوسل بک الی اللہ فی ان اموت مسلمًا علی ملّتک وسنتک'' ان الفاظ میں اور جتنا چاہے زیادہ کرسکتا ہے۔ مگر وہ سب کلمات ادب اور عاجزی کے ہوں لیکن سلف رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اس موقع پر الفاظ جتنے کم ہوں مستحسن ہے اور بہت تیز آواز سے نہ بولے بلکہ آہستہ خضوع اور ادب کے ساتھ عرض کرے اور جس طرف سے سلام کہا ہو اس طرح عرض کرے۔ السّلام علیک یا رسول اللہ من فلان بن فلان یستشفع بک الی ربک'' (زبدة المناسک ص ۱۴۰، ۱۴۱، طبع کراچی)

اور پھر (ص ۱۴۲، ۱۴۳) میں حضرات شیخین رضی اللہ عنہما سے سلام عرض کرنے کا طریقہ اور اُن کے توسّل سے دُعا کرنے اور ان کو آنحضرت ﷺ کے ہاں سفارشی بنانے کا صراحت سے تذکرہ فرمایا ہے۔

حضرات فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کی ان عبارات کے جوابات

آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر شفاعت کی درخواست کرنا اور اس کا جواز و استحباب تو قارئین کرام کو مذکورہ بالا حوالوں سے بخوبی معلوم ہو گیا ہے۔ اسی طرح حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی قبور پر حاضر ہو کر سلام کہنا اور ان سے توسّل کرنا اور ان کو آنحضرت ﷺ کے ہاں سفارشی بنانا بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔ ان عبارات سے گلو خلاصی کے لئے ہمارے معاصرین کرم فرماؤں نے جو چور دروازے اپنے لئے تلاش کئے ہیں جن سے وہ خود بھی نکل کر بھاگنا چاہتے ہیں اور اپنے ان حواریوں کو بھی گزارنا چاہتے ہیں جو اکابر کے دامن سے وابستہ رہنے کو ایک گونہ عار سمجھتے ہیں اور ان سے کٹ اور ہٹ کر الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ یہ جوابات ہم انہیں کی عبارات میں عرض کر رہے ہیں۔

چنانچہ مؤلف ندائے حق استشفاع عند القبر کی تردید کرتے ہوئے اور تسکین الصدور میں عالمگیری وغیرہ سے پیش کردہ حوالوں کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱) ''خلاصہ یہ نکلا کہ شیخین (ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ) سے درخواست کہ تم حضور ﷺ کو کہو کہ اللہ سے کہیں کہ وہ ہماری مغفرت کرے۔ یعنی واسطہ در واسطہ بریلویوں سے ایک قدم آگے۔ وہ تو کہتے ہیں اے فقیر! میری تیرے آگے اور تیری اللہ کے آگے (دُعا و التجاء) ہے اور یہ بناسپتی دیوبندی فرماتے ہیں۔ ہماری ابوبکر و عمر کے آگے اور ان کی حضور ﷺ کے آگے اور پھر حضور ﷺ کی اللہ کے آگے۔ واہ ری دیوبندیت جدیدہ ترمیم شدہ!

ناظرین اب انصاف سے بتائیں کہ مشرکین مکہ کو جو کوسا جاتا ہے، ان کا کیا قصور تھا؟ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام و دیگر انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے: ''وَیَقُوْلُوْنَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ'' (ندائے حق ص ۶۷، بقدر الحاجۃ)

الجواب: اگر حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ مصنفین عالمگیری (اپنے وقت کے پانچ سو جید اور محقق علماء احناف رحمہم اللہ نے اس کو سلطان عالمگیر رحمہ اللہ کے حکم سے مرتب کیا تھا) علامہ شرنبلالی رحمہ اللہ السید احمد طحطاوی رحمہ اللہ، علامہ رحمۃ اللہ سندھی رحمہ اللہ، ملا علی القاری رحمہ اللہ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ وغیرہ وغیرہ حضرات بقول مؤلف ندائے حق اس کارروائی میں مشرکین مکہ کے پیروکار ہیں یا یہ سب حضرات بناسپتی دیوبندی ہیں یا یہ جملہ حضرات ترمیم شدہ دیوبندیت کی راہ پر گامزن ہیں تو صاف لفظوں میں سن لیجئے کہ ہم سواتی برادران بھی انہیں حضرات کے دامن سے وابستہ ہیں اور بفضلہ تعالیٰ ہمیں اس پر فخر ہے اور ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں انہیں حضرات کے مسلک پر رکھے اور قیامت کے دن انہیں حضرات کے ساتھ ہمارا حشر ہو۔ آپ اپنے لئے جو راستہ چاہیں اختیار کر لیں ۔

اولٰئک اٰبائی فجئنی بمثلہم اذا جمعتنا یا جریر المجامع

غور فرمایئے کہ مؤلف ندائے حق نے کس جرأت اور بے باکی سے ان اکابر علماء ملت کی کڑی مشرکین مکہ سے جا ملائی ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ!

نجدیوں سے بھی دو قدم آگے

موجودہ دور کے نجدی علماء جو توسّل وغیرہ کے مسائل میں خاصے متشدد اور اپنی سطحیت اور ظاہریت میں بہت مشہور ہیں، وہ بھی اس مسئلہ میں کفر و شرک کا فتویٰ لگانے سے گریز کرتے ہیں۔ اس کو صرف بدعت شنیعہ کہتے ہیں۔

چنانچہ وہ یہ عنوان قائم کرتے ہیں: ''کلام الناس فی مسئلة سوال اللّٰہِ بالمخلوق''

''اللہ تعالیٰ سے مخلوق کے واسطہ سے سوال کرنے کے بارے میں لوگوں کا کلام۔''

اور آگے لکھتے ہیں: ''بان الذی نعتقدہ انا لا نکفر بھا احدًا بل نقول ھی بدعة شنیعه نھی عنھا السلف'' (الدرر السنیہ فی الاجوبۃ النجدیۃ ج ۱ ص ۱۱۴)

''جس چیز کا ہم اعتقاد کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم اس کی وجہ سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ یہ ایک بری بدعت ہے جس سے سلف رحمہم اللہ نے منع کیا ہے۔''

حضرت بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ کا واقعہ جس کی تائید و تصدیق خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کی آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ آپ اس کی روشنی میں بخوبی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا حضرات سلف رحمہم اللہ نے اس سے منع کیا ہے یا اس کی اجازت دی ہے؟ نیز آپ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کی صریح عبارات پڑھ چکے ہیں جن سے اس کارروائی کا جواز اور استحباب ثابت ہے اور بدعت شنیعہ جائز اور مستحب نہیں ہوتی۔ قطع نظر اس سے نجدیوں کا فتویٰ بھی دیکھئے کہ وہ اس مسئلہ میں تکفیر نہیں کرتے۔ لیکن مؤلف ندائے حق ہیں جو ان اکابر فقہاء امت کی

کوئی مشرکین مکہ سے ملانے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ''فای اللہ المشتکی'' باقی مؤلف ندائے حق کا آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک (اور اسی طرح حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی قبور) کے پاس سفارش کی التجاء اور شفاعت کی درخواست کو ''هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ'' کا مصداق قرار دینا خالص تحریف ہے۔ کیونکہ اگر عند القبر شفاعت کی التجاء اس کا مصداق ہوتی تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ بن الحارث حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور فقہاء اُمت پر یہ بات واضح ہوتی اور وہ اس کی ہرگز اجازت نہ دیتے۔ کیونکہ یقینی بات ہے کہ وہ حضرات قرآن کریم اور اس کی تفسیر اور اس کے معانی و مطالب کو مؤلف ندائے حق اور اُن کے مشیروں سے زیادہ جانتے تھے۔ الغرض اس مسئلہ سے یہ آیت کریمہ بالکل غیر متعلق ہے۔ اس سے غائبانہ شفاعت مراد ہے جس سے علم الغیب اور حاضر و ناظر کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے جو خالص شرک ہے۔ بقدر ضرورت اس کی بحث ہم نے ''سماع الموتی'' میں کر دی ہے۔

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ استمداد عند القبر کے جواز اور عدم جواز میں خاصا اختلاف نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو (مائۃ مسائل ص ۳۶، ۳۷) اور مسائل (اربعین مسئلہ ص ۴۰) میں جو یہ لکھتے ہیں: ''وحق آنست کہ انکار فقہاء عام است از آں کہ استمداد از قبور انبیاء کنند یا از قبور غیر ایشاں ہمہ جائز نیست۔''

تو بظاہر اس سے اہل قبور سے مرادیں مانگنا مراد ہے۔ ورنہ ''استشفاع عند القبر'' تو اکثر اور عام فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ کما مر! مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس مقام پر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے دو فتوے عرض کر دیں، تاکہ بات کی تہہ تک پہنچنا آسان ہو جائے۔

سوال: انبیاء علیہم السلام اولیاء کرام و شہداء و صلحائے عالی مقام سے بعد وفات کے اس طور سے استمداد درست ہے یا نہیں کہ اے فلاں بزرگ حق تعالیٰ سے میری حاجت روائی کے لئے آپ عرض کریں اور میری سفارش کریں اور میرے لئے دُعا کریں؟

جواب: ''استمداد اموات سے بلا شُبہ بدعت ہے۔ خواہ قبر کے پاس استمداد کی جاوے یا غائبانہ ہووے، صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کے زمانے میں یہ اُمر نہ تھا لیکن اس بارے میں اختلاف ہے کہ استمداد کرنا بدعت حسنہ ہے یا بدعت سیئہ ہے اور طریقہ استمداد کے مختلف ہونے سے استمداد کے بارہ میں کیا حکم بھی مختلف ہوتا ہے؟ تو اگر استمداد اس طریقے سے کیا جاوے جو سوال میں مذکور ہے تو ظاہراً جائز ہے۔ اس واسطے کہ اس صورت میں شرک لازم نہیں آتا۔ جیسا کہ بزرگوں سے بحالت حیات استمداد کرنا اس طور سے جائز ہے کہ اُن سے عرض کیا جاوے کہ درگاہ الٰہی میں میری حاجت روائی کے لئے آپ دُعا و التجاء کریں اور اگر اموات سے استمداد کسی دوسرے طریقے سے ہو، اس طریقے کے موافق حکم ہوگا۔'' (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۱۸۷، مترجم اُردو اصل فارسی، ج ۱ ص ۸۹، طبع مجتبائی دہلی)

اس کے بعد انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف کی اس روایت کا ذکر کیا ہے جو ترمذی اور مشکوٰۃ وغیرہ کے حوالہ سے آگے آرہی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ! اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک یہ کارروائی شرک اور ناجائز نہیں بلکہ جائز ہے۔ ہاں! البتہ وہ اس پر بدعت حسنہ کا اطلاق کر رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے زمانے میں نہ تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلال بن الحارث اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کارروائی ان کے پیش نظر نہیں ہے، ورنہ وہ ایسا نہ فرماتے۔ بہرحال کچھ بھی ہو وہ اس کارروائی کو جائز قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ شرک نہیں ہے۔ وھوالمطلوب!

حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ کی (ایضاح الحق الصریح ص ۷، ۸) کی عبارت کا جواب ہم نے سماع الموتی میں عرض کر دیا ہے، اس کو وہیں ملاحظہ کرلیں۔ (ان کی عبارت سے مؤلف نے (ندائے حق ص ۱۱۹) میں استدلال کیا تھا)

نیز حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''واما استمداد باہل قبور در غیر نبی ﷺ یا غیر انبیاء علیہم السلام منکر شدہ اند آنرا بسیارے از فقہاء ے گویند کہ نیست زیارت مگر برائے رسانیدن نفع باموات بدعاء واستغفار و قائل گشتہ اند بآں بعضے از ایشاں و ظاہر است کہ از فقہاء آنانکہ قائل بسمع وادراک اند قائل بجواز اند وآنانکہ منکر اند آں را نیز انکار کنند وآں امریست ثابت ومقرر نزد مشائخ صوفیہ اہل کشف وکمال تا آں کہ گویند اکثرے رافیوض وفتوح از ارواح رسیدہ امام شافعی رحمہ اللہ گفتہ کہ قبر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام تریاق مجرب است مراجابت دعا۔'' (فتاویٰ عزیزی ج ۲ ص ۱۰۷، طبع مجتبائی دہلی)

''بہر حال آنحضرت ﷺ اور دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ (کیونکہ ان کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ (فتاویٰ رشیدیہ) باقی اہل القبور سے مدد طلب کرنے کے بہت سارے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ منکر ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ زیارت کا یہی مطلب ہے کہ مُردوں کو دُعا و استغفار سے نفع پہنچایا جاوے اور بعض فقہاء کرام رحمہم اللہ اس کے جواز کے قائل ہیں اور ظاہر ہے کہ فقہاء میں سے جو میت کے سماع اور ادراک کے قائل ہیں، وہ اس کے بھی قائل ہیں اور جو اُس کے منکر ہیں، وہ اِس کے بھی منکر ہیں اور یہ اَمر مشائخ صوفیاء میں سے اہلِ کشف وکمال کے ہاں ثابت اور محقق ہے۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ اکثر کو فیوض اور اشکالات کا حل ارواح سے ہوا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت امام موسیٰ کاظم رحمہ اللہ کی قبر اجابت دعا کے لئے تریاق مجرب ہے۔''

اور پھر اس کی مزید بحث کرنے کے بعد آخر میں تحریر فرماتے ہیں: ''ونیست صورت استمداد مگر ہمیں کہ محتاج طلب کند حاجت خود را از جناب عزت الٰہی بتوسل روحانیہ بندہ کہ مقرب ومکرم درگاہ والا است وگوید خداوندا! ببرکت ایں بندہ کہ تو رحمت واکرام کردہ اور اُبرآوردہ گرداں حاجت مرا یا ندا کند آن بندۂ مقرب ومکرم را کہ اے بندۂ خدا وولی وے شفاعت کن مرا وبخواہ از خدائے تعالیٰ مطلوب مرا تا قضا کند حاجت مرا پس نیست بندہ درمیان مگر وسیلہ وقادر ومعطی ومسئول پروردگار است تعالیٰ شانہٗ ودروے ہیچ شائبۂ شرک نیست چنانکہ منکر وہم کردہ وآں چناں است کہ توسل وطلب دعا از صالحاں ودوستان خدا در حالت حیات کنند وآں جائز است باتفاق پس آں چرا جائز شد و فرقے نیست در ارواح کاملاں درحین حیات وبعد از ممات مگر در ترقی کمال۔'' (فتاویٰ عزیزی ج ۲ ص ۱۰۸)

''استمداد کی صورت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ محتاج اپنی حاجت اللہ سے طلب کرتا ہے۔ مگر بتوسل اس بندہ کے جو اللہ تعالیٰ کے دربار میں مقرب ومکرم ہے اور کہتا ہے کہ اے پروردگار! اس بندہ کی برکت سے جس کو تو نے اپنی رحمت اور اکرام سے نوازا ہے، میری حاجت پوری کر دے اور یا اس بندہ مقرب ومکرم کو ندا کرتا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے ولی! آپ میرے لئے سفارش کریں اور اللہ تعالیٰ سے میرے مطلوب کی التجاء کریں کہ وہ میری حاجت پوری کر دے۔ سو اس صورت میں بندہ درمیان میں صرف وسیلہ ہے۔ قادر اور دینے والا اور جس سے سوال کیا گیا ہے وہ صرف پروردگار ہے اور اس صورت میں شرک کا شائبہ تک بھی موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ منکر نے وہم کیا ہے اور یہ صورت ویسی ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اور ولیوں سے ان کی

زندگی میں اُن سے توسّل اور طلب دُعا کی جاتی ہے اور وہ بالاتفاق جائز ہے تو یہ صورت کیوں جائز نہیں ہے؟ اور کاملین کے ارواح میں زندگی اور بعد از وفات میں کوئی فرق نہیں۔ ہاں اگر (بعد از وفات) ترقی کمال میں (جو پہلے سے بعد از وفات زیادہ ہوتی ہے)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اس مفصل عبارت سے معلوم ہوا کہ قبر کے پاس شفاعت طلب کرنے اور توسّل کا مذکورہ بالا طریقہ جائز ہے، اس میں شرک کا شائبہ تک نہیں ہے۔

الغرض حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے عند القبر جس توسّل اور استشفاع کا ذکر کیا ہے، یہ صورت جائز ہے اور وہ ''هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ'' کی مد اور زد میں کسی طرح بھی نہیں آتی۔ محض کوئی تحکم اور سینہ زوری کا مظاہرہ کرنا چاہے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

مغالطہ: عند القبر سوال کی ایک اور صورت بھی ہے جو خالص کفر و شرک ہے اور سطحی قسم کے لوگ پہلی صورت اور اس میں فرق نہ کرنے یا نہ سمجھنے کی وجہ سے اُلجھن میں پڑ جاتے ہیں اور اس صورت کا حکم پہلی صورت پر چسپاں کر دیتے ہیں جس سے خود مغالطہ کھاتے اور دوسروں کو مغالطہ میں ڈالتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ ایک اور مقام میں اہل قبور سے مدد مانگنے کی طویل بحث کرتے ہوئے اور اس کی قسمیں بتاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ''دوم آں کہ چیز یکہ خصوصیت بجناب الٰہی دارد مثل دادن فرزند یا بارش باران یا دفع امراض یا طول عمر و مانند ایں چیز ہا بے آں کہ دعا و سوال از جناب الٰہی در نیت منظور باشد از مخلوقے درخواست نماید ایں نوع حرام مطلق بلکہ کفر است و اگر از مسلماناں کسے از اولیائے مذہب خود خواہ زندہ باشد یا مردہ ایں نوع مدد خواہد از دائرہ مسلماناں خارج مے شود'' (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۳۳، ۳۴)

''دوم یہ کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، مثلاً اولاد دینا یا بارش نازل کرنا یا بیماریاں دور کرنا یا عمر لمبی کرنا اور اسی طرح کی اور اشیاء اگر دُعا اور سوال کے وقت اللہ تعالیٰ سے مانگنا نیت میں ملحوظ نہ ہو اور مخلوق سے اس کی درخواست کرے تو یہ قسم مطلق حرام بلکہ کفر ہے اور اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص اپنے مذہب کے اولیاء رحمہم اللہ سے خواہ وہ زندہ ہوں یا وفات پا چکے ہوں۔ اس طرح کی مدد چاہے تو وہ مسلمانوں کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں سے یوں مرادیں مانگنا کہ ''تو میرا کام کر دے'' خالص کفر اور شرک ہے اور جُہلاء میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو قبروں پر حاضر ہو کر بزرگوں سے یہ سودا بازی کرتے ہیں کہ۔

ککڑ لے تے پُتر دے

اور یہی وہ صورت ہے جس کے بارے میں حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ پانی پتی فرماتے ہیں: ''و دُعا از آنہا خواستن حرام است'' یعنی اہل قبور سے مرادیں مانگنا حرام ہے۔ (مالابد منہ ص ۸۱)

اور یہی وہ استعانت ہے جس کے بارے حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں: ''دوسرے یہ کہ صاحب قبر سے کہے کہ تم میرا کام کر دو یہ شرک ہے۔ خواہ قبر کے پاس کہے خواہ قبر سے دُور کہے۔''

(فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۹۹ طبع جید برقی پریس دہلی)

اور اسی صورت کے بارے حضرت تھانوی ؒ لکھتے ہیں کہ: ''توسّل بالمخلوق کی تین تفسیریں ہیں۔ ایک یہ کہ مخلوق سے دُعا کرنا اور اس سے التجاء کرنا، جیسا مشرکین کا طریقہ ہے اور یہ بالاجماع حرام ہے۔'' (بوادر النوادر ص ۷۵۹)

اور یہی وہ صورت ہے جس کو ہمارے پیر و مرشد حضرت مولانا حسین علی صاحب ؒ نے (تفسیر بے نظیر ص ۴۸) میں بحوالہ حافظ ابن تیمیہ ؒ نقل کیا ہے: ''وہ لوگ جو انبیاء اور صالحین کو بعد موت کے نزدیک سے پکارتے ہیں، وہ بھی مشرک ہیں۔''

الغرض استعانت باہل القبور کی یہ صورت کفر شرک اور بالاجماع حرام ہے، بخلاف پہلی صورت کے کہ اس میں مراد تو اللہ تعالیٰ سے مانگی جاتی ہے۔ بزرگوں کو اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف سفارشی بنایا جاتا ہے اور یہ طریقہ جیسا کہ زندگی میں درست ہے۔ بقول حضرت شاہ عبدالعزیز ؒ بعد از وفات بھی درست ہے۔ اس میں شرک کا شائبہ تک بھی موجود نہیں ہے۔

(۲) مؤلف ''ندائے حق'' نے حضرات فقہاء کرام ؒ اور علماء ملّت کی عبارات سے گلوخلاصی کا ایک طریق تو وہ اختیار کیا جو آپ ''نمبر ا'' میں پڑھ چکے ہیں۔ دوسرا طریق انہوں نے یہ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''سو جیسے بریلویہ کی تعمیم بلا دلیل وخلاف قاعدہ ہے، اسی طرح آپ کی تعمیم بھی بلا دلیل اور خلاف قاعدہ ہے۔ (اس سے قبل اسی صفحہ میں لکھتے ہیں۔ پھر زمانہ حال میں بریلویوں کو کیوں بُرا کہتے ہو، تم نے صلوٰۃ وسلام پر سماع کا حصر اُڑایا۔ یعنی شفاعت کو بھی جائز رکھا۔ صفدرؔ) اور پھر نبی کے سماع کے حصر کو بھی اڑایا (یعنی حضرات شیخین کو بھی شامل کرلیا۔ صفدر) جیسے وہ لوگ اپنے مسلک کی تائید میں کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کا قول کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالتے ہیں، اگرچہ کتاب وسنت کے خلاف ہو۔ ایسے ہی تم نے بھی اپنی تائید میں کتابوں کے حوالے پیش کئے۔ دلائل اربعہ (کتاب وسنّت اجماع وقیاس مجتہد) میں سے نہ اُن کا دعویٰ ثابت اور نہ تمہارا۔ یہود ونصاریٰ بھی توریت وانجیل کو چھوڑ کر اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی پوتھیاں ہی پیش کرتے تھے۔'' (بلفظہٖ ص ۶۷، ۶۸)

الجواب: مؤلف مذکور کی بے باکی ملاحظہ کیجئے کہ وہ حضرات فقہاء کرام ؒ کے اس محتاط طبقہ کو جس کے احتیاط سے بڑھ کر احتیاط کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ایرے غیرے اور نتھو خیرے سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کی مستند اور معتبر کتابوں کو جو علوم اسلامیہ کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ پوتھیوں سے تعبیر کرکے اپنے دل ماؤف کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ! اگر یہ حضرات ایرے غیرے نتھو خیرے ہیں تو نہ معلوم دینی اور فقہی خدمات کرنے والے کون حضرات ہوں گے؟ اور اگر ان حضرات کی کتابیں پوتھیاں ہیں تو علوم شرعیہ کا ذخیرہ کن کتابوں میں ملے گا؟ اور مؤلف مذکور خود خیر سے کتاب وسنّت اور اجماع وقیاس مجتہد سے ایک حوالہ بھی نہیں پیش کرسکے کہ آنحضرت ﷺ کی رُوح مبارک کا آپ کے جسد اطہر سے قبر مبارک میں کوئی تعلق نہیں اور یہ کہ آپ عند القبر صلوٰۃ وسلام کا سماع نہیں فرماتے اور یہ کہ آپ ﷺ سے یا حضرات شیخین ؒ سے مذکورہ بالا طریقہ سے توسّل ناجائز ہے اور ان شاء اللہ العزیز! قیامت تک پیش نہیں کرسکیں گے۔ غیروں کی طرف سے یا اپنی طرف سے غیر متعلق حوالے اور عبارات پیش کرنے سے کچھ نہیں بنتا جیسا کہ کسی بھی اہل علم سے یہ مخفی نہیں ہے۔

(۴) مؤلف ندائے حق نے اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز اور تاسف انگیز بات یہ لکھی ہے کہ: ''بس ہم اب آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ جتنی کتابوں میں یہ مسئلہ قبر پر حضور (ﷺ) سے دُعا و استغفار و استشفاع کا جو معتبر کتب میں لکھا جا چکا ہے وہ باغیوں کا لکھا ہوا ہے اور بس۔'' (ص ۳۱۱)

الجواب: ان ٹھوس عبارات اور صریح حوالوں سے چھٹکارے کے لئے اس سے بہتر جواب اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ ایسا جواب ہے جس سے مؤلف ندائے حق کی مرضی کے خلاف تمام اُن اُمور کا قلع قمع ہو جاتا ہے جن کو وہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ لیکن ہم لکیر کے فقیر کیا کریں؟ اگر ان مشہور و متداول اور بقول مؤلف مذکور معتبر کتابوں میں بھی باغی گھس گئے ہیں تو پھر اسلامی کتابوں کا اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا حشر ہوگا؟ اور ان باغیوں نے ان میں داخل ہو کر کیا کچھ نہ کیا ہوگا؟ بعض بزرگوں نے قطعیات کے خلاف بعض غیر معروف کتابوں کے بارے میں یہ بات تو کہی تھی، لیکن حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کی معتبر مستند متداول مشہور اور بے شمار کتابوں کے بارے میں یہ تیر بہدف نسخہ اور اکسیر اعظم صرف مؤلف مذکور ہی کو سوجھی ہے۔

اقامۃ البرہان

یہ جواب تو تھا مؤلف ندائے حق کا۔ اب آپ مؤلف اقامۃ البرہان کا جواب بھی ملاحظہ کیجئے جس سے انہوں نے حضرات فقہاء کرام اور حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کے فتاویٰ رشیدیہ سے گلوخلاصی چاہی ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''اگر فتاویٰ رشیدیہ کے مرتب سے یہاں سہو نہیں ہوا اور یہ الفاظ واقعی حضرت گنگوہی رحمہ اللہ ہی کے ہیں تو اس کے بارے میں باادب گزارش ہے کہ اُصولی طور پر اس دلیل سے اتفاق مشکل ہے۔ اس لئے کہ جس حدیث پر سماع انبیاء علیہم السلام کا مدار ہے بشرط صحت اس سے صرف صلوٰۃ وسلام کا سماع ثابت ہوتا ہے اور یہ حکم یعنی سماع عند القبر چونکہ خلاف قیاس ہے اس لئے اپنے مورد پر بند رہے گا۔ لہٰذا سماع صلوٰۃ وسلام پر قیاس کر کے استشفاع عند القبر کو جائز کہنا صحیح نہیں اور مطابق فتویٰ شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ انبیاء علیہم السلام کی قبور کا استثناء جائز نہیں۔ باقی رہا فقہا کا لکھ دینا تو یہ جواز کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ یہ قول متاخرین کا ہے اور ان کو مذہب میں ایک نیا قول ایجاد کرنے کی اجازت نہیں۔ قبر مبارک تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور صاحبین کے زمانہ میں بھی موجود تھی مگر انہوں نے قبر مبارک پر شفاعت مغفرت عرض کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے ان متاخرین کا قول حجت نہیں۔ چنانچہ فتاویٰ غیاثیہ میں شیخ الاسلام شہید رحمہ اللہ سے نقل ہے کہ: ''لا نأخذ باستحسان مشائخ البلخ داغا نأخذ بقول اصحابنا المتقدمين'' (ص ۲۹۴، ۲۹۵)

مؤلف ندائے حق نے بھی حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے (مکتوبات ج ۲ ص ۱۰۳) کے حوالہ سے شیخ الاسلام شہید رحمہ اللہ کی یہ بالا عبارت پیش کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ تعامل استحسان کی دلیل نہیں۔ پھر آگے مؤلف مذکور جوش میں آ کر لکھتے ہیں: ''اب فرمایئے کہ آپ کن دلائل کے زور پر متاخرین کے اس نازیبا عمل کو مستحسن قرار دیتے ہیں جب کہ آئمہ اربعہ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں، پھر متاخرین کی کون سنتا ہے۔ (ندائے حق ص ۱۲۱، ۱۲۲)

الجواب: جمہور کے دلائل عرض کر دیئے گئے ہیں۔ اگر آپ حضرات کا حضرت گنگوہی رحمہ اللہ سے اتفاق

مشکل ہے یا آپ کے نزدیک متاخرین کا قول حجت نہیں یا وہ نازیا عمل ہے تو یقین جانئے کہ ہمیں ان سے اتفاق کرنے اور ان کے قول کو حجت سمجھنے اور ان کے قول کو جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قول وعمل سے مؤید ہے۔ زیبا سمجھنے کا فخر حاصل ہے اور ہمارے لئے اتفاق آسان ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔ باقی آئمہ کرام رحمہم اللہ سے نصاً کچھ بھی ثابت نہیں اور حضرات متاخرین رحمہم اللہ کا قول محض استحسان نہیں بلکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے عمل پر مبنی ہے، جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تائید حاصل تھی۔ لہٰذا حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا حوالہ بالکل غیر متعلق حوالہ ہے اور یہ ناقلین کو ہرگز مفید نہیں ہے۔ کما لا یخفیٰ!

اعتراض: دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا عموماً اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصاً عند القبر سماع ثابت نہیں بلکہ قرآن وحدیث کے دلائل اس کے خلاف ہیں۔

اَوّلاً: اس لئے کہ حضرت عزیر علیہ السلام سو سال تک مُردہ رہے اور جب اس کے بعد زندہ ہوئے تو انہوں نے اس طویل زندگی کو یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ سے تعبیر کیا۔ اگر سماع ثابت ہوتا تو ایسا نہ ہوتا بلکہ ان کو معلوم ہوتا کہ کتنا عرصہ گزر چکا ہے۔

وثانیاً: قرآن کریم میں ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی '' اور اس مضمون کی جتنی بھی آیتیں آتی ہیں وہ سماع کی نفی کرتی ہیں۔ عام اس سے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا سماع ہو یا عام موتی کا۔

وثالثاً: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حجرہ اور مسجد کے باہر لوگ باتیں کیا کرتے تھے اور ایک موقع پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے دروازہ کے باہر حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے باتیں کیں اور مسئلہ دریافت کیا، مگر آپ نہ سُن سکے تو قبر میں اتنی مٹی کے نیچے کیسے سُن سکتے ہیں؟ (محصلہ)

الجواب: اس کی پوری تحقیق تو ''سماع الموتی'' کے رسالہ میں ہوگی جو إن شاء اللہ الگ شائع ہوگا۔ (اور اب بفضلہ تعالیٰ شائع ہو چکا ہے) یہاں نہایت اختصار سے یہ عرض ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عند القبر سماع کی نفی ان دلائل سے باطل ہے۔ پہلی شق کا جواب یہ ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قبر اور برزخ کی زندگی کا احساس عموماً نہیں ہو سکتا کہ کم گزری یا زیادہ؟ وہاں مؤمنوں کی راحت وخوشی اور بدکاروں کی تکلیف وتعذیب اس انداز سے ہوتی ہے کہ زمانہ کا صحیح ادراک ہی نہیں ہو سکتا اور آخر اس جہاں میں بھی آرام وخوشی کے موقع پر اکثر ایسا ہو جاتا ہے کہ وقت کا پتہ نہیں چلتا کہ تھوڑا گزرا ہے یا زیادہ؟ اور تکلیف کے وقت تھوڑا عرصہ بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تنگی میں بھی وقت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ صاحب تسکین القلوب نے بجا فرمایا ہے کہ: ''حقیقت یہ ہے کہ خوشی کے وقت مرورِ زمانہ کا احساس نہیں رہتا اور تکلیف دُکھ اور غم فراق کے وقت یہ احساس بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔'' (ص ۵۵) گویا تنگی میں وقت اور زمانہ کی تعیین وتحدید میں افراط ہو جاتا ہے اور خوشی میں تفریط کچھ بھی صحیح اندازہ تو نہ رہا۔ وھو المطلوب!

چنانچہ علامہ اقبال مرحوم فرماتے ہیں ؎

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

الغرض ! حضرت عزیر علیہ السلام کے اس واقعہ کو عدم سماع سے کوئی تعلق نہیں۔ آخر یہی مضمون حضرات سلف رحمہم اللہ وخلف رحمہم اللہ کے سامنے بھی تھا۔ مگر وہ سبھی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے سماع کے قائل تھے اور کسی نے اس مضمون سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے عند القبر عدم سماع پر استدلال نہیں کیا۔ علامہ ابن الہادی رحمہ اللہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''ولا یجوز احداث تأویل فی اٰیۃ وسنۃ لم یکن علی عھد السلف ولا عرفوہ ولا بینوہ للامۃ فان ھذا یتضمن انھم جھلوا الحق فی ھذا وضلوا عنہ واھتدی الیہ ھذا المعترض المستاخر فکیف اذا کان التأویل یخالف تأویلھم ویناقضہ وبطلان ھذا التأویل اظھر من ان یطنب فی ردہ'' (الصارم المنکی ص ۲۷۴)

''جائز نہیں کہ کسی آیت یا حدیث کا کوئی ایسا معنی اور تاویل کی جائے جو حضرات سلف رحمہم اللہ کے زمانہ میں نہ کی گئی ہو اور نہ انہوں نے وہ تاویل سمجھی ہو اور نہ اُمت کے سامنے بیان کی ہو۔ کیونکہ یہ اس بات کو متضمن ہے کہ سلف رحمہم اللہ اس میں حق سے جاہل رہے اور اس سے بہک گئے اور یہ پیچھے آنے والا معترض اس کی تہہ کو پہنچ گیا اور خصوصاً جب کہ متاخر کی تاویل سلف کی تاویل کے خلاف اس کے برعکس ہو، پھر کیونکر وہ قبول کی جا سکتی ہے؟ اور اس تاویل کا بطلان ایسا ظاہر ہے کہ اس کے رد کے لئے کسی بسط کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کریمہ یا حدیث شریف کا مطلب اور معنی حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ نے نہ سمجھا ہو اور نہ کیا ہو اور متاخرین رحمہم اللہ میں سے کسی نے سمجھا اور کیا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں اور وہ معنی یقیناً مردود ہے اور حضرت عزیر علیہ السلام سے متعلق اس مضمون سے حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ میں سے کسی نے عدم سماع موتی اور خصوصاً عدم سماع انبیاء کرام علیہم السلام پر استدلال نہیں کیا۔ لہٰذا اس سے یہ استدلال باطل اور مردود ہے۔ دلائل کی مد میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ خواہ اس کے کہنے والی شخصیت متاخرین میں کتنی ہی بڑی ہو۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''سعادت آثارا آنچہ بر ما وشما لازم است تصحیح عقائد بمقتضائے کتاب وسنت بر نہجیکہ علماء اہل حق شکر اللہ سعیہم از کتاب وسنت آں عقائد را فہمیدہ اند واز آنجا اخذ کردہ چہ فہمیدن ما وشما از حیز اعتبار ساقط است اگر موافق افہام ایں بزرگواراں نباشد۔ زیرا کہ ہر مبتدع وضال احکام باطلہ خود را از کتاب وسنت می فہمد واز آں جا اخذ می نماید والحال انہ لا یغنی من الحق شیئا۔

(مکتوبات دفتر اوّل حصہ سوم ص ۳۳، مکتوب نمبر ۱۵۷، طبع امرتسر)

''اے نیک بخت جو چیز ہم پر اور تم پر لازم ہے وہ کتاب وسنت کے مطابق عقائد کی اصلاح کرنا ہے۔ مگر اُس طریقہ پر کہ علمائے اہل حق نے (اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو بارآور کرے) کتاب وسنت سے ان کو سمجھا ہے اور ان سے اخذ کیا ہے۔ کیونکہ ہمارا اور تمہارا سمجھنا اگر ان بزرگوں کے فہم کے مطابق نہ ہو اعتبار کے مقام سے ساقط ہے۔ کیونکہ ہر بدعتی اور گمراہ اپنے باطل احکام کو کتاب وسنت ہی سے سمجھتا ہے اور وہاں ہی سے اخذ کرتا ہے۔ حالانکہ اس کا یہ سمجھنا حق کی کسی چیز سے مستغنی نہیں کرتا۔''

اس سے بھی وضاحت کے ساتھ ثابت ہوا کہ قرآن وحدیث کے مطلب اور معنی کے سمجھنے میں حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ کے فہم پر اعتماد کرنا پڑے گا اور اس کے بغیر چارہ نہیں ورنہ سخت ٹھوکر لگے گی۔

اور دوسری شق کا جواب یہ ہے کہ: ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' اور اسی طرح اس مضمون کی جتنی بھی دیگر آیات ہیں ان سے سماع موتی کی نفی پر استدلال اگرچہ بعض سلف رحمہم اللہ نے کیا ہے جن میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پیش پیش ہیں۔ مگر جمہور نے ان کا ساتھ نہیں دیا بلکہ جمہور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ہیں جو ''سماع موتی'' کی روایت کے راوی اور اس کے مقر ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''والصحیح عند العلماء روایة عبدالله بن عمر رضی اللہ عنہما لما لھا من الشواھد علی صحتھا من وجوہ کثیرة'' (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۴۳۸)

''اور صحیح بات علماء کرام کے نزدیک حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہی ہے کیونکہ اس کی صحت پر گوناگوں شواہد دلالت کرتے ہیں۔''

اور اس پر بحث کرتے ہوئے آگے ''سماع موتی'' کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: ''والسلف مجمعون علی ھذا وقد تواترت الاٰثار عنھم بان المیّت یعرف بزیارة الحی لہ ویستبشر بہ'' (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۴۳۸)

''اور سلف صالحین رحمہم اللہ کا اس بات پر اجماع ہے اور بلا شبہ تواتر کے ساتھ ان سے مروی ہے کہ مُردہ اس زندہ کو جو اس کی زیارت کرتا ہے، پہچانتا اور اس سے خوش ہوتا ہے۔''

اور اس آیت کا مطلب حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ یہ بیان فرماتے ہیں: ''ای لا تسمعھم شیئًا ینفعھم فکذٰلک ھؤلاء علی قلوبھم غشاوة وفی اذانھم وقر الکفر'' (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۸۴)

''یعنی تو ان کو کوئی چیز نہیں سنا سکتا جو ان کو نفع دے۔ پس اسی طرح ان کفار کے دِلوں پر پردے ہیں اور ان کے کانوں میں کفر کے بوجھ ہیں۔''

یعنی آیت کا یہ مطلب نہیں کہ مُردے سنتے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے حق میں سماع مفید اور نافع نہیں کیونکہ جب تکلیفی زندگی ختم ہو چکی ہو تو پھر ایمان لانے اور توبہ کرنے کا کیا معنیٰ؟ پس یہی حال زندہ کافروں کا ہے کہ وہ سنتے تو ہیں مگر ان کو سماع مفید اور نافع نہیں۔ کیونکہ وہ ایمان نہیں لاتے اور حق کو قبول نہیں کرتے آخر خود قرآن کریم میں اس کی تصریح موجود ہے کہ: ''اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَھُمْ مُّسْلِمُوْنَ'' (النمل: ٦)

ترجمہ: ''تو نہیں سنا سکتا مگر ان کو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں پس وہ مسلمان ہوتے ہیں۔''

اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ دُنیا میں جو کافر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اور مسلمان نہیں ہوئے وہ سنتے ہی نہ تھے۔ اگر اُن سے قوت سماع ہی سلب کر لی گئی تھی تو وہ مکلّف کس اَمر کے تھے؟ مطلب صاف ہے کہ وہ اس انداز سے نہیں سنتے تھے کہ وہ حق کو قبول کر لیں اور اس کو مان لیں اور سماع ان کے حق میں مفید اور نافع ہو اور دوسرے مقام پر ارشادِ خداوندی یوں ہے: ''فَاَعْرَضَ اَکْثَرُھُمْ فَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ'' (حم السجدہ: ۴)

''پس ان میں سے اکثر نے اعراض کیا، سو وہ نہیں سنتے۔''

اس کا مطلب بھی بجز اس کے اور کیا ہے کہ کافر اس انداز سے نہیں سنتے جو ان کے حق میں نافع اور مفید ہو، یہ مراد تو قطعاً اور یقیناً نہیں کہ کافر دُنیا میں سنتے ہی نہ تھے اور نہ اب سُنتے ہیں، اور چونکہ کافروں کے اسماع کو مُردوں کے اسماع سے تشبیہ دی گئی ہے تو اُصول کی رُو سے مشبہ اور مشبہ بہ میں مشابہت درکار ہے اور وہ یہی ہے کہ نہ کافروں کے حق میں سماع مفید اور نافع ہے اور نہ مُردوں کے حق میں ہاں نفسِ سماع دونوں کے لئے ثابت اور متحقق ہے۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ چونکہ بعض احادیث میں مُردوں کا سننا قریب جگہ نہ کہ بعید جگہ سے وارد ہے، اس لئے بعض علماء نے آیت (کے معنی) میں کہا ہے کہ مُراد سماع منفی سے سماع نافع ہے۔ (بیان القرآن ج۱ ص ۸۴) اور بھی متعدد مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس آیت کریمہ کے معنی میں یہی فرمایا ہے کہ اس سے مُردوں کے مطلق سماع کی نفی نہیں بلکہ سماع نافع اور مفید کی نفی ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: ''قلت اذا صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الموتی تسمع کلام الحی فمعنی قوله تعالٰی: اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی باختیارک و قدرتک کما انت تسمع الحی علٰی ما جری به عادة اللّٰه تعالٰی لٰکن اللّٰه تعالٰی یسمع الموتی کلام الاحیاء اذ شاء او انک لاتسمع الموتی سماعا تترتب علیه الفائدة'' (تفسیر مظہری ج ۷ ص ۲۵۳)

''میں کہتا ہوں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مُردے زندہ کا کلام سنتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا کہ ''تو مُردوں کو نہیں سنا سکتا'' یہ معنی ہوگا کہ تو اپنے اختیار اور قدرت سے نہیں سنا سکتا جس طرح کہ تو زندہ کو سنا سکتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت جاری ہے لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے تو مُردوں کو زندوں کا کلام سنا دیتا ہے یا ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' کا یہ مطلب ہے کہ تو ان کو اس انداز سے نہیں سنا سکتا جس پر فائدہ مرتب ہو۔''

مطلب یہ ہے کہ یہ سنانا تیری قدرت، اختیار اور بس میں نہیں ہے۔ کیونکہ جس عالم میں یہ سماع ہے، وہ قبر اور برزخ کا عالَم ہے اور اِس جہان میں جیسے سماع عادۃ اللہ کے مطابق ہے۔ اُس جہان کا سماع اس سے متفاوت اور جُدا ہے، اس کو آپ ایسا ہی سمجھیں۔

جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: ''اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ'' (القصص: ۵۶)

''کہ بے شک تو ہدایت نہیں دے سکتا (یعنی تجھے ہدایت دینے کا اختیار اور قدرت نہیں ہے) جس سے تو محبت کرتا ہے اور لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت فرماتا ہے۔''

اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے تو کسی کو ہدایت حاصل ہی نہیں ہوتی اور قاضی صاحب رحمہ اللہ نے دوسرا مطلب اس آیت کریمہ کا یہ بیان فرمایا ہے کہ نفی اس سماع کی ہے جس پر کوئی نتیجہ ثمرہ اور فائدہ مُرتب ہو اور وہ ہی سماع ہو سکتا ہے جو نافع اور مفید ہو اور مرنے کے بعد سماع کا کیا فائدہ؟ کہ نہ ایمان قبول اور نہ توبہ۔ بہر کیف یہ آیت کریمہ مطلقاً نفی سماع موتی کی دلیل نہیں ہے اور پھر قطعی اور یقینی طور پر دلیل نہ ہونا تو واضح اَمر ہے اور بعض حضرات نے اسماع (سنانے) اور سماع (سننے) میں فرق کیا ہے وہ یہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں اسماع کی نفی ہے، سماع کی نہیں۔ لہٰذا اس آیت کریمہ کو سماع موتی کی نفی پر دلیل بنانا درست نہیں ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''اپنے خیالِ نارسا کے موافق سمع اموات حد اسماع سے تو پَرے ہے پر استماع اموات ممکن ہے۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ خدا نے تو ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود اس کے سلام اہل القبور مسنون کر دیا۔ اگر استماع ممکن نہیں تو یہ بیہودہ حرکت یعنی سلام اہل القبور مُلحدوں کی زَبان دَرازی کے لئے کافی ہے۔'' (جمال قاسمی ص ۹، طبع مجتبائی دہلی)

اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''اقول والاحادیث فی سمع الاموات قد بلغت مبلغ التواتر'' (فیض الباری ج ۲ ص ۴۶۷)

''میں کہتا ہوں کہ مُردوں کے سماع کی حدیثیں تواتر کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہیں۔''

اور دوسرے مقام پر منکرین سماع موتی کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:'' وان ذخیرة الحدیث تدل علی سمع الموتی '' حدیث کا ذخیرہ تو سماع موتی پر دلالت کرتا ہے۔ (العرف الشذی ص ۳۵۳)

تو ان تمام دلائل کو پیش نظر رکھ کر موصوف رحمہ اللہ آیت کریمہ کا ایک مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ:''فقیل بالفرق بین السماع والاسماع والمنفی هو الثانی دون الاوّل '' (فیض الباری ج ۲ ص ۴۶۷)

''یہ فرق بھی بیان کیا گیا ہے کہ سماع اور ہے اور اسماع اور ہے اور آیت میں نفی اسماع کی ہے نہ کہ سماع کی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ سماع اور اسماع کا فرق بڑے بڑے اکابر نے ملحوظ رکھا ہے۔ حضرت مولانا عثمانی رحمہ اللہ مسئلہ سماع موتی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:''قال العبد الضعیف عفا اللہ عنه والذی تحصل لنا من مجموع النصوص واللہ اعلم ان سماع الموتی ثابت فی الجملة بالاحادیث الکثیرة الصحیحة''

''بندہ ضعیف اللہ تعالیٰ اس کی لغزشوں سے درگزر فرمائے کہتا ہے کہ جو چیز ہمیں مجموعۂ احادیث سے حاصل ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے یہ ہے کہ سماع موتی فی الجملہ احادیث کثیرہ صحیحہ سے ثابت ہے۔''

(فتح الملہم ج ۲ ص ۴۷۹)

اور اپنی مختصر مگر مستند تفسیر میں اس پر خاصی بحث کرتے ہیں اور آخر میں فرماتے ہیں کہ:''بہرحال آیت میں اسماع کی نفی سے مطلقاً سماع کی نفی نہیں ہوتی۔'' واللہ اعلم! (الروم ۵ ص ۵۳۱)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ الحنفی اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے خاصی بحث کرتے ہیں اور اس میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ:''والحق ان الموتی یسمعون فی الجملة'' (روح المعانی ج ۲۱ ص ۵۷)

''حق بات یہ ہے کہ مُردے فی الجملہ سنتے ہیں۔''

الحاصل اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی سے سماع مفید اور نافع کی نفی مراد ہو یا یہ مطلب ہو کہ آنحضرت ﷺ کے اختیار سے یہ خارج ہے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور یا مطلب ہو کہ نفی اسماع کی ہے، سماع کی نفی نہیں۔ کوئی بھی تفسیر اور مطلب لیا جائے موتی کے مطلق سماع کی نفی اس سے ثابت نہیں ہوتی۔ جب عام موتی کے مطلق سماع کی نفی پر یہ دال نہیں تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے عند القبر جس کی بحث چل رہی ہے۔ نفی سماع پر یہ کیونکر دلیل بن سکتی ہے؟ اور اگر بالفرض یہ عام موتی کے سماع کی نفی پر دال بھی ہو تو پھر بھی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا سماع اس سے خارج ہے۔ آخر اس مضمون کی آیات تمام حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ کے سامنے بھی تھیں ان کا ورع اور تقویٰ بھی زیادہ تھا، خدا خوفی بھی بڑی تھی اور قرآن کریم کی تفسیر اور مطالب پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی مگر کسی نے اس مضمون کی آیات سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے (عند القبور) سماع کی نفی پر استدلال واحتجاج نہیں کیا بلکہ ان کا اجماع اس کے خلاف منعقد ہوا ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے سماع میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جیسا کہ قطب الارشاد حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ وغیرہ کی صریح عبارات سے باحوالہ یہ بات پہلے عرض کی جا چکی ہے۔ ہاں! اگر کوئی شخص حضرات سلف صالحین کے مقابلہ میں اپنی ہی رائے پر مصر رہے اور اسی کو حرف آخر سمجھے تو اس جہان میں اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟ عام سماع موتی کا مسئلہ اگرچہ اختلافی ہے مگر سارے مالکی، شافعی، حنبلی اور احناف کی

اکثریت اور اکابر علماء دیوبند کثر اللہ تعالیٰ جماعتھم کی اکثریت سماع موتی کی قائل ہے۔ اگر سماع موتی کے مسئلہ سے شرک پیدا ہوتا یا یہ منجر الی الشرک ہوتا تو یہ اکابر علماء اسلام کبھی سماع کا اقرار نہ کرتے اور اگر "إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى" اور اس مضمون کی دیگر آیات سے سماع موتی کی نفی ثابت ہوتی تو یہ اکابر قرآنِ کریم کے خلاف ہرگز یہ نظر یہ نہ رکھتے اور اگر اپنے مقام پر سماع موتی کے دلائل و براہین ثابت اور متحقق نہ ہوتے تو یہ اکابر سماع موتی کا کیوں اقرار کرتے؟ ان میں سے ایک ایک بات صراحت سے اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ حق جمہور کے ساتھ ہے اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا سماع تو اجماعی مسئلہ ہے، اس کے حق ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ ابن القیم رحمہ اللہ وغیرہ وہ بزرگ ہیں کہ اگر کسی بات سے شرک کا ادنیٰ ترین وہم بھی پیدا ہوتا ہو تو وہ اس کا سدِّ باب کرتے ہیں اور اس کے خلاف محاذ قائم کر دیتے ہیں مگر سماع موتی کا مسئلہ اتنا صاف اور ایسا بے غبار ہے کہ یہ بزرگ اس کے پُرزور حامی ہیں۔

چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: "و سماع المیت للاصوات من السلام والقرأة حق" مردہ کا سلام و قرأت کی آوازوں کو سننا حق ہے۔ (اقتضاء الصراط المستقیم ص ۱۸۱، طبع مصر)

اس سے معلوم ہوا کہ موتی کا سماع حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک صرف سلام تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کے نزدیک وہ قرآنِ کریم کی قرأت بھی بدستور سنتے ہیں۔ اگر اس سماع میں شرعاً کوئی خرابی ہوتی یا یہ نصوص کے خلاف ہوتا تو موصوف رحمہ اللہ اس کو حَقٌّ سے کبھی تعبیر نہ کرتے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت آتی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب بھی کوئی شخص اپنے مؤمن بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جس کو وہ دُنیا میں پہچانتا تھا تو جب وہ اس کی قبر پر سلام کہتا ہے۔ صاحبِ قبر اس کو (اس کی آواز سے) پہچانتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔
(محصلہ الجامع الصغیر ج ۲ ص ۱۵۱)

اس روایت کو امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ، علامہ عبدالحق اشبیلی رحمہ اللہ، ابن عبدالہادی رحمہ اللہ، قاضی شوکانی رحمہ اللہ اور مولانا عثمانی رحمہ اللہ وغیرہ سب صحیح کہتے ہیں۔ (تفصیل سماع الموتی کے رسالہ میں ہے)

اس حدیث کو حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: "فهذا نص فی انه یعرفه بعینه و یرد علیه السلام" یہ حدیث اس بات میں نص ہے کہ مُردہ سلام کہنے والے کو بخصوصہ پہچانتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ (کتاب الروح ص ۴)

اور اپنے مشہور قصیدہ نونیہ میں اس مسئلہ کو خوب پھیلا کر انہوں نے بیان کیا ہے اور مزے لے لے کر اشعار فرماتے ہیں۔ ان کے چند اشعار یہ ہیں ؎

و هذا ورد نبیّنا تسلیم من یأتی بتسلیم مع الاحسان

"اور یہ اَمر صحیح ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمدہ طریقہ سے اس شخص کے سلام کا جواب دیتے ہیں۔ جو آپ کو سلام کہتا ہے۔"

ما ذاک مختصابہ ایضاً کما قد قالہ المبعوث بالقرآن

''یہ بھی آپ کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ جیسا کہ خود اُس ذات گرامی نے فرمایا جس کو قرآن دے کر بھیجا گیا ہے۔''

من زار قبر اخ لہ فاتی بتسلیم علیہ وھو ذو ایمان

جس شخص نے اپنے کسی مؤمن بھائی کی قبر کی زیارت کی اور اس نے سلام کہا!

رد الالٰہ علہ حقا روحہ حتّٰی یرد علیہ ردّ بیان

تو پروردگار یقینی طور سے اس پر اس کی رُوح کو لوٹا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کا جواب واضح بیان سے لوٹا تا ہے۔ (النونیہ ص ۱۴۵)

بعض لوگوں نے ''لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَ کُمْ (فاطر: ۱۴) اور وَھُمْ عَنْ دُعَآئِھِمْ غٰفِلُوْنَ (احقاف: ۵)'' وغیرہ مضامین کی آیات سے بھی یہ استدلال کرنے کی ناکام سعی کی ہے کہ عند القبر سماع نہیں نبی ہو یا ولی وغیرہ لیکن ان کا یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ ان آیات کا سماع موتی اور علی الخصوص حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے عدم سماع سے کوئی تعلق نہیں۔ تفصیل بفضلہٖ تعالیٰ اپنی جگہ پر کردی گئی ہے اور اسی طرح بعض لوگوں نے اصحاب کہف کے قصہ سے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات اور دیمک کے ان کی لاٹھی کو کھا جانے کے واقعہ سے بھی عدم سماع موتی اور عدم سماع انبیاء کرام علیہم السلام پر استدلال کیا ہے۔ مگر اس مسئلہ سے ان واقعات کا کوئی تعلق نہیں اور نہ دور کا واسطہ ہے۔ حضرات سلف رحمہم اللہ میں سے کسی نے ان سے یہ استدلال نہیں کیا۔

الغرض! محض کشید اور بُرے شبہات کا نام دلیل اور برہان نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فہم عطاء فرمائے اور حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ اور جمہور اکابر کے دامن سے وابستہ رکھے۔ آمین ثم آمین!

تیسری شق کا جواب

جملہ علماء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ نص کے مقابلہ میں قیاس قابلِ قبول نہیں بلکہ مردود ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح اور صریح حدیثیں (جن کا باحوالہ ذکر ہو چکا ہے) اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ آپ کا عند القبر سماع ثابت ہے اور آپ سلام کہنے والوں کا جواب بھی دیتے ہیں تو اس کے مقابلہ میں یہ بُرے عقلی ڈھکوسلے کیا وقعت رکھتے ہیں کہ جب آپ دروازہ کے باہر لوگوں کی آوازیں دنیا میں نہیں سنتے تھے اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی آواز نہ سُنی تو وفات کے بعد مٹی کے ڈھیر کے نیچے کیونکر سنتے ہیں اور پھر وہ عالم بھی الگ ہے اور عند قبری میں لفظ ''عند'' کتنی مسافت پر بولا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ! یہ سب قیاس فاسد اور مُردود ہے اور حضرات سلف رحمہم اللہ اور اکابر سے کٹ جانے کے بعد یہ محض اپنے ذہن کی ایجاد اور اختراع ہے۔ اس کو بھلا کون سنتا اور مانتا ہے؟ اس باطل قیاس کے تمام مقدمات حضرات سلف رحمہم اللہ اور اکابر کے سامنے بھی تھے مگر کسی نے ''عند القبر'' سماع کا انکار نہیں کیا بلکہ سو فیصدی حضرات نے اس کی تائید کی ہے اور یہی پہلو حق ہے اور یہی نظریہ درست ہے اور یہی مسلک صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی پر قائم ودائم رکھے۔ (امین ثم امین)

باب ہشتم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسئلۂ توسّل

دُعا کا مسنون طریقہ جو متعدد احادیث سے ثابت ہے یہ ہے کہ دُعا کنندہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرے اور اس کے بعد درود شریف پڑھے اور اس کے بعد نہایت اخلاص، بے حد عاجزی اور بہت ہی تضرّع کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت طلب کرے دل میں جتنی رقت ہوگی اور جتنا سوز وگداز ہوگا اتنی ہی دُعا زود اثر ہوگی اور جس قدر غفلت اور بے پرواہی سے دُعا کی جائے گی اتنی ہی وہ غیر مؤثر رہے گی اور آخر میں پھر درود شریف پڑھ کر ہاتھ منہ پر پھیرے اس بات میں اہلِ اسلام کا کوئی نزاع نہیں ہے۔ ہاں! البتہ اس اَمر میں اختلاف ہے کہ دُعا میں یہ کہا جاسکتا ہے یا نہیں کہ مثلاً اے پروردگار تو بوسیلۂ آنحضرت ﷺ یا بطفیل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یا بہ برکت حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یا بحرمت حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ یا بجاہ حضرت مجدّد اَلف ثانی رحمہ اللہ میرا کام کر دے؟ یا اس قسم کا کوئی مفہوم ہو جس کو اپنی زبان، لغت اور عرف کے اعتبار سے ادا کرے تو آیا یہ درست ہے یا نہیں؟

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے اتباع اس کا انکار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ایسا کہنا درست نہیں ہے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر ایک مستقل کتاب ''القاعدة الجلية في التوسل والوسيلة'' تصنیف فرمائی ہے اس میں انہوں نے اپنے دلائل پیش کئے ہیں اور دوسرے حضرات کو جواب دینے کی سعی بھی فرمائی ہے اور اس کے علاوہ بھی اپنی دیگر کئی کتابوں مثلاً فتاویٰ منہاج السنۃ اور زیارۃ القبور وغیرہ میں اجمالاً وتفصیلاً اس پر بحث کی ہے۔

علّامہ سبکی رحمہ اللہ اس مسئلہ میں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''وحسبک ان انکار ابن تيمية رحمہ اللہ للاستغاثة والتوسل قول لم يقله عالم قبله وصار به بين اهل الاسلام مثلة'' (شفاء السقام ص ۱۲۰)

''تیرے (تعجب کے) لئے یہ بات کافی ہے کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا طفیل اور توسّل سے انکار کا قول ایسا ہے کہ اُن سے پہلے یہ بات کسی عالم نے نہیں کہی اور اسی وجہ سے وہ اہلِ اسلام میں بدنام ہو گئے ہیں۔''

اس سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوگئی کہ توسّل کا انکار حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے قبل کسی عالم نے نہیں کیا اور اس مسئلہ کے پہلے منکر یہی حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ہیں۔

علّامہ ابن عابدین الشامی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''وقال السبكي رحمہ اللہ يحسن التوسل بالنبي ﷺ الى ربه ولم ينكره احد من السلف والخلف رحمہ اللہ الا ابن تيمية رحمہ اللہ فابتدع مالم يقله عالم قبله ونازع العلّامة ابن امير حاج في دعوى الخصوصية واطال الكلام على ذلك في الفصل الثالث عشر أخر شرحه على المنية فراجعه'' (شامی ج ۵ ص ۳۵۰)

''امام سبکی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں آنحضرت ﷺ کا توسّل مستحسن ہے۔ اس کا بغیر ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے سلف وخلف رحمہ اللہ میں اور کسی نے انکار نہیں کیا اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ ایک ایسی بدعت گھڑی ہے کہ اُن سے پہلے کسی عالم نے یہ بات نہیں کہی اور علّامہ ابن امیر حاج رحمہ اللہ نے مُنیہ کی شرح میں تیرھویں فصل کے آخر میں اس

پر طویل کلام کیا ہے اور توسّل کے (آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ) مخصوص ہونے کے دعویٰ میں اختلاف کیا ہے۔"

آگے ذکر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کہ علامہ عزالدین رحمہ اللہ نے توسّل کو آنحضرت ﷺ کی ذات سے مخصوص کیا ہے۔ لیکن علامہ ابن امیر حاج رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ توسّل آپ ﷺ کی ذات سے ہی مخصوص نہیں بلکہ دیگر صلحاء سے بھی درست ہے۔

اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "و قد شنّع التاج السبکی رحمہ اللہ کما ھو عادتہٗ علی المجد فقال ویحسن التوسل و الاستغاثۃ بالنبی ﷺ الی ربہٖ و لم ینکر ذالک احد من السلف و الخلف حتّٰی جاء ابن تیمیۃ رحمہ اللہ فانکر ذٰلک و عدل عن الصراط المستقیم و ابتدع مالم یقلہ عالم و صار بین الانام مثلۃ"

علامہ سبکی رحمہ اللہ نے اپنی عادت کے مطابق ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی شناعت اور بُرائی بیان کی ہے اور کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے توسّل اور طفیل سے دُعا اللہ تعالیٰ کے ہاں مستحسن اَمر ہے اور سلف و خلف رحمہ اللہ میں اس کا کسی نے انکار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ آئے، انہوں نے اس کا انکار کیا اور سیدھی راہ سے تجاوز کیا اور بدعت کی ایسی بات ایجاد کی جو کسی عالم نے نہ کہی اور لوگوں میں وہ بدنام ہو گئے۔ (روح المعانی ج ۶ ص ۱۲۶)

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جب آنحضرت ﷺ کی زیارت کے لئے سفر اور توسّل کا رد کیا تو ان کی تردید میں علامہ عبدالکافی السبکی رحمہ اللہ نے "شفاء السقام" کے نام سے کتاب تالیف فرمائی۔ مولانا محمد بن علی النیموی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۲۴ھ) جن کی مدح و تعریف میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے عربی میں ایک بہترین قصیدہ لکھا ہے اور ان کی تالیف کے بارے میں فرماتے ہیں: "لم یصنف مثلہ قبلہٗ قط" کہ اس سے پہلے ایسی کتاب کبھی تصنیف نہیں ہوئی) اپنی بہترین تالیف "آثار السنن" میں لکھتے ہیں کہ: "شفاء السقام" کا رد حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے شاگرد حافظ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ نے اپنی تالیف "الصارم المنکی" سے کیا پھر اس کے رد میں علامہ ابن علان رحمہ اللہ نے "المبرد المکی" تصنیف فرمائی اور "الصارم المنکی" کا رَد مولانا عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب "السعی المشکور" میں کیا ہے۔ (تعلیق التعلیق علی تعلیق الحسن علی آثار السنن ص ۲۷۹ طبع ملتان)

فائدہ: بعض لوگوں نے جن میں مؤلف اتحاف النبلاء بھی ہیں، امام سبکی رحمہ اللہ کی کتاب "شفاء السقام" کو تعصب کا نتیجہ قرار دیا ہے لیکن ان کی رائے بالکل غلط ہے۔

چنانچہ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "و لیس ردّہٗ تعصبا بل ھو مصیب فیما رد بہ شھد بہ الاجلۃ" (التعلیقات السنیۃ ص ۱۹۶)

"سبکی رحمہ اللہ کا رد کرنا تعصب پر محمول نہیں ہے بلکہ وہ اس رد میں درست رائے کے حامل ہیں۔ جلیل القدر علماء نے اس کی شہادت دی ہے۔"

الغرض! توسّل جمہور سلف و خلف رحمہ اللہ کے نزدیک درست ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان کے تلامذہ اور اُس لڑی کے بیشتر حضرات اور زمانہ حال کے اکثر غیر مقلدین حضرات اس کے منکر ہیں۔ بعض ان میں سے اس کے جواز کے قائل بھی ہیں جن کے حوالے عنقریب آ رہے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور ہمارے اکابر علماء دیو بند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم تقریباً سبھی مشروع توسّل کے جواز کے قائل ہیں۔

یہ یاد رہے کہ توسّل کا مسئلہ صرف جواز کا درجہ رکھتا ہے نہ ضروری ہے نہ ناجائز اور گمراہی ہے۔ جیسا کہ وہم کیا گیا ہے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ مسئلۂ توسّل پر مبسوط بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''و ھذا الذی ذکرته انما ھو لدفع الحرج عن الناس والضرار من دعوٰی تضلیلھم کما یزعمه البعض فی التوسل بجاہ عریض الجاہ صلی اللہ علیہ وسلم لا للمیل الی ان الدعاء کذٰلک افضل من استعمال الادعیة المأثورة التی جاء بھا الکتاب وصدحت بھا السنة'' (روح المعانی ج ۶ ص ۱۲۸)

''یہ چیز جو میں نے جوازِ توسّل کی ذکر کی ہے محض لوگوں سے دفع حرج کے لئے اور ان کو گمراہ قرار دینے کے دعوٰی سے جیسا کہ بعض نے کہا ہے بچانے کے لئے ہے۔ کیونکہ ان کے خیال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند ہستی کا توسّل گمراہی ہے۔ میرا یہ میلان نہیں کہ توسّل سے دُعا کرنا اُن ادعیۂ ماثورہ سے بہتر ہے جو کتاب اللہ میں آئی ہیں اور جن کو حدیث میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔''

علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی یہ عبارت جوازِ توسّل پر صراحت سے دال ہے اور ان کی اس سے بھی واضح عبارت آگے آرہی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ!

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ایک مقام میں لکھتے ہیں کہ: ''القسم الثالث وھو ان یقول اللّٰھم بجاہ فلان عندک او ببرکة فلان او بحرمة فلان عندک افعل بی کذا فھذا یفعله کثیر من الناس لٰکن لم ینقل من احد من الصحابة رضی اللہ عنہم والتابعین رحمہم اللہ وسلف الأمة انھم کانوا یدعون بمثل ھذا الدعاء و لم یبلغنی عن احد من العلماء فی ذٰلک ما احکیه الا ما رأیت فی فتاوٰی الفقیه ابی محمد عبد السلام فانه افتی انه لا یجوز لاحد ان یفعل ذٰلک الا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ان صح الحدیث فی النبی صلی اللہ علیہ وسلم''

''تیسری قسم یہ ہے کہ کہے اے اللہ فلاں کے مرتبہ سے جو تیرے ہاں اس کا ہے یا فلاں کی برکت سے یا فلاں کی حرمت سے جو تیرے نزدیک اس کی ہے، میرا یہ کام کردے تو ایسا توسّل بہت سے لوگوں سے ثابت ہے۔ لیکن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ اور سلف اُمت سے یہ منقول نہیں کہ انہوں نے ایسی دُعا کی اور مجھے کسی عالم سے ایسی کوئی بات نہیں پہنچی جس کو میں بیان کروں۔ ہاں! البتہ فقیہ ابو محمد عبد السلام کے فتاوٰی میں یہ بات میں نے دیکھی ہے کہ انہوں نے یہ فتوٰی دیا ہے کہ کوئی شخص ایسا توسّل بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی سے نہیں کرسکتا وہ بھی اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حدیث ثابت ہو۔'' (زیارۃ القبور والاستنجاد بالقبور ص ۱۱۲، طبع مصر)

اِن شاء اللہ تعالیٰ یہ بات قاضی شوکانی رحمہ اللہ وغیرہ کے حوالہ سے عنقریب آئے گی کہ امام ابو محمد عبد السلام رحمہ اللہ (المتوفی ۶۶۰ھ) کا اس توسّل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے مخصوص کرنا درست نہیں ہے اور جس حدیث کا حوالہ اس عبارت میں مذکور ہے وہ بھی اپنی جگہ پر صحیح اور قابل احتجاج ہے۔ باحوالہ اس کا بیان بھی آرہا ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ! اور اس کا تذکرہ بھی ہوگا کہ ایسا توسّل حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے یہ سب کچھ کہہ اور کر چکنے کے باوجود بھی حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نفسِ توسّل اور توسّل کی بعض صورتوں کا انکار نہیں کرسکے اور وہ ان کو درست سمجھتے ہیں۔

مثلاً وہ ایک مقام پر توسّل کا معنٰی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''اسئلک بنبیک محمد ای اسئالک بایمانی بہ و محبتہ'' (القاعدۃ الجلیلۃ ص ۳۸)

''میں تجھ سے تیرے نبی حضرت محمد ﷺ کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں کا معنٰی یہ ہے کہ چونکہ میرا آپ پر ایمان اور آپ سے محبت ہے۔ اس لئے اس کی وجہ سے میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔''

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''فالتوسل الی اللہ بالنبیین ھو التوسل بالایمان بھم وبطاعتھم کالصلٰوۃ والسّلام علیھم ومحبتھم وموالاتھم او بدعائھم و شفاعتھم و اما نفس ذواتھم فلیس فیھا ما یقتضی حصول مطلوب العبد وان کان لھم عند اللہ تعالٰی الجاہ العظیم'' (فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ج ۲۷ ص ۳۳ طبع جدید)

''اللہ تعالٰی کے ہاں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی وساطت سے توسّل کا یہ مطلب ہے کہ ان پر ایمان لانے اور ان کی اطاعت کرنے کی وجہ سے توسّل ہے جیسے ان پر صلٰوۃ وسلام کہنے اور ان سے محبت کرنے یا ان کی دُعا اور ان کی شفاعت کی وجہ سے توسّل ہے۔ باقی رہیں ان کی ذوات تو ان میں کوئی چیز نہیں جو بندے کے مطلوب کے حصول کو چاہے۔ اگرچہ اللہ تعالٰی کے ہاں ان کا بہت بڑا درجہ ہے۔''

گویا ان کے نزدیک یہ توسّل بصالح الاعمال کی مد میں شمار ہوتا ہے اور اس کے ثبوت کے لئے (بخاری ج ۲ ص ۸۸۳، مسلم ج ۲ ص ۳۵۳) کی وہ روایت ہے: ''جس میں تین آدمی ایک غار میں چلے گئے اور بارش کی وجہ سے ایک چٹان نے غار کا منہ بند کر دیا تو انہوں نے اپنے نیک اعمال کے توسّل سے اللہ تعالٰی کے ہاں دُعا کی جو قبول ہوگئی۔ چٹان غار کے منہ سے ہٹ گئی اور وہ صحیح وسالم باہر نکل آئے۔'' حضرت امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ: ''استدل اصحابنا بھذا علٰی انہ یستحب للانسان ان یدعوا فی حال کربہ و فی دعاء الاستسقاء وغیرہ بصالح عملہ ویتوسل الی اللہ تعالٰی بہ لان ھؤلاء فعلوہ فاستجیب لھم و ذکرہ النبی ﷺ فی معرض الثناء علیھم وجمیل فضائلھم'' (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۳۵۳)

''اِس حدیث سے ہمارے اصحاب نے یہ استدلال کیا ہے کہ آدمی کے لئے مستحب ہے کہ وہ پریشانی کے وقت اور استسقاء وغیرہ کی دُعاء میں اپنے نیک عمل کی برکت اور اس کے توسّل سے اللہ تعالٰی سے دُعا کرے۔ کیونکہ ان تینوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ سو ان کی دُعا قبول ہوگئی اور آنحضرت ﷺ نے اس کا ذکر ان کی تعریف اور ان کے اچھے فضائل کے سلسلہ میں کیا ہے۔''

ہمارے نزدیک توسّل بالذات اور توسّل بصالح الاعمال میں صرف نزاع لفظی ہے۔ کیونکہ جو حضرات توسّل بالذات کے قائل ہیں اور ان کی مراد یہ ہرگز نہیں کہ مثلاً جناب رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو (العیاذ باللہ تعالٰی) وصفِ نبوّت اور رسالت اور ان دینی خدمات سے جو آپ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں سرانجام دی ہیں، الگ کر کے توسّل کیا جائے یا معاذ اللہ تعالٰی! آپ پر ایمان لانے اور آپ سے محبت کرنے کی شرط سے صرف نظر کر لی جائے۔ یہ کسی کے وہم میں نہیں اور اسی طرح اللہ تعالٰی کے دیگر مقبول بندوں کو ان کی مذہبی سرگرمیوں اور خلقِ خدا کی ہدایت کی کوششوں سے جدا کر کے محض ان کی ذات ہی کو ملحوظ رکھا جائے۔ ایسا بھی نہیں بلکہ جہاں بھی ان حضرات سے توسّل ہوگا وہاں ان کی تمام خوبیوں اور کمالات کو پیش نظر رکھا جائے گا اور ان نیک کاموں کی وجہ سے ان پر اللہ تعالٰی کی جو خصوصی رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اُن کو کسی صورت میں فراموش نہیں کیا جائے گا۔ ذکر اگرچہ ذات کا ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ

موصوف ہے۔ لیکن اس کے اعمال، کمالات اور صفات کو بھی اس میں دخل ہے اور اسی وجہ سے توسّل کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ محبت بھی ان کی ان عظیم قربانیوں کی وجہ سے ہے جو حسب ارشاد جناب رسول اللہ ﷺ ''اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَلْحَبُّ فِی اللّٰہِ وَ الْبُغْضُ فِی اللّٰہِ'' (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۷۶) ہر دُعا کنندہ کا اپنا نیک اور صالح عمل ہے اور اسی طرح صالح اعمال آخر کسی ذات ہی سے صادر ہوں گے۔ از خود تو ان کا صدور نہیں ہوسکتا تو توسّل بصالح الاعمال ذات کے واسطہ کے بغیر سمجھ سے باہر ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک توسّل بالذات اور توسّل بصالح الاعمال کا مال بالآخر ایک ہی ہے۔ صرف اس کی تعبیر اور تشریح کا فرق ہے اور نزاع صرف لفظی ہے۔ جب حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ توسّل بصالح الاعمال کے قائل ہیں تو توسّل بالذات کا بھی ان کو اقرار کر لینا چاہئے۔ ان کے ذہن میں جو یہ وہم ہے کہ ذات کے توسّل سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ تعالیٰ) اس ذات کا رُتبہ شان اور درجہ اللہ تعالیٰ سے بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے یا اس کا اس پر کوئی جبر اور زور ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ) تو یہ کسی مسلمان کے وہم میں بھی نہیں آتا۔

ان کے الفاظ یہ ہیں: ''لان فیھما ایھام ان المتجوہ بہ والمستغاث بہ اعلٰی من المتجوہ علیہ والمستغاث علیہ'' (شفاء السقام ص ۱۲۹)

''ان الفاظ سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ جس کے جاہ اور وسیلہ سے سوال کیا گیا ہے اس کا درجہ اس سے اعلیٰ ہے جس کے ہاں التجاء کی گئی ہے۔''

چنانچہ امام تقی الدین سبکی رحمہ اللہ نے ان کے اس وہم اور نظریہ کا اس طرح رد کیا ہے کہ: ''فالتوسل والتشفع والتجوہ والاستغاثۃ بالنبی ﷺ وسائر الانبیاء والصالحین لیس لھا معنی فی قلوب المسلمین غیر ذٰلک ولا یقصد بھا احد منھم سواہ فمن لم ینشرح صدرہ لذٰلک فلیبک علٰی نفسہ'' (شفاء السقام ص ۱۲۹)

''آنحضرت ﷺ اور اسی طرح دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اور نیک لوگوں کے وسیلہ، سفارش، جاہ اور طفیل وغیرہ سے دُعا کرنے کا معنی مسلمانوں کے دلوں میں اس کے سواء اور کچھ نہیں (کہ ان پر ایمان لانا اور ان سے محبت کرنا نیکی ہے) اور کوئی مسلمان اس معنی کے علاوہ اور کچھ اِرادہ اس توسّل سے نہیں کیا کرتا مگر جس کا سینہ اس کے فہم کے لئے نہ کھلے تو اس کو اپنے نفس پر رونا چاہئے۔''

اس عبارت میں علامہ سبکی رحمہ اللہ نے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اس وہم اور نظریہ کی تردید کی ہے اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کا نظریہ توسّل کے متعلق واضح کیا ہے کہ ہر مسلمان کا یہی نظریہ ہوتا ہے کہ جن حضرات کے توسّل سے دُعا مانگی جاتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے نیک اور مقبول بندے ہیں اور ان کی محبت اور ان سے لگاؤ نزول رحمت الٰہی کا ذریعہ ہے اور یہ جائز ہے۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ توسل کی حقیقت یہ ہے کہ اے اللہ! فلاں شخص میرے نزدیک آپ کا مقبول ہے اور مقبولین سے محبت رکھنے پر آپ کا وعدہ محبت ہے: ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ'' پس میں آپ سے اس رحمت کو مانگتا ہوں۔ پس توسّل میں یہ شخص اپنی محبت کو اولیاء اللہ کے ساتھ ظاہر کر کے اس محبت پر رحمت وثواب مانگتا ہے اور محبت اولیاء کا موجب رحمت وثواب ہونا نصوص سے ثابت ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۴۱)

ایک حدیث قُدسی میں اس طرح آتا ہے کہ رب العزت نے فرمایا کہ: ''حقت محبتی للمتحابین فِیَّ'' (مستدرک ج ۴ ص ۱۶۹، قال الحاکم والذھبی علٰی شرطھما)

''میری محبت ان لوگوں کے لئے لازم ہے جو میری رضا کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔''

الغرض! نہ تو اس توسّل میں یہ بات وہم میں آتی ہے کہ معاذ اللہ تعالیٰ اولیاء رحمہم اللہ کا درجہ اور شان اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر ہے اور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے جبراً اس کو منوا سکتے ہیں، کہاں خالق اور کہاں مخلوق؟ کجا آقا اور کجا عاجز بندے، اس کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں مگر ؎

گُہر جو دِل میں نہاں ہیں خدا ہی دے تو ملیں اُسی کے پاس ہے مفتاح اس خزانے کی

توسّل کی بعض اور صورتیں بھی حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک درست ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''وقول القائل ببرکت الشیخ قد یعنی بھا دعاءہ واسرع الدعاء اجابۃً دعاء غائب لغائب وقد یعنی بھا برکت ماامرہ بہ وعلّمہ الخیر وقد یعنی بھا برکت معاونتہ علی الحق وموالاتہ فی الدین ونحو ذلک وھذہ کلھا معہ ان صحیحۃ'' (زیارۃ القبور والاستنجاد بالقبور ص ۱۱۸)

''قائل کا یہ کہنا کہ شیخ کی برکت سے (میرا یہ کام ہو جائے) کبھی تو اس سے شیخ کی دُعا مراد ہوتی ہے اور سب سے جلدی وہ دُعا قبول ہوتی ہے جو غائب کی غائب کے لئے ہو اور کبھی اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ شیخ نے جو حکم اس کو دیا ہے اور تعلیم خیر اس کو دی ہے اس کی برکت سے سوال کرتا ہوں اور کبھی اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ جب حق پر وہ اس کا تعاون اور دین میں اس سے دوستی کرتا ہے تو اس کی برکت سے دُعا کرتا ہے اور یہ سب معانی اپنی جگہ درست اور صحیح ہیں۔

جب یہ معانی درست اور صحیح ہیں تو صحیح العقیدہ مسلمان کے توسّل کو ان میں سے کسی ایک معنی کے لحاظ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مشرک کا معاملہ ہی جُدا ہے وہ توسّل میں غیر اللہ کو حاضر و ناظر اور عالم الغیب اور متصرف فی الامور سمجھ کر توسّل کیا کرتا ہے اور ان میں سے ایک ایک بات اپنے مقام پر کُفر ہے۔ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس بات کی تصریح کی ہے لیکن مسلمان کے ذہن میں ان کفریہ اُمور میں سے کوئی ایک اَمر بھی نہیں ہوتا۔ امام بدرالدین بعلی الحنبلی رحمہ اللہ (جنھوں نے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے فتاویٰ کا ملخص لکھا ہے) اسی سابق عبارت کے قریب قریب عبارت لکھ کر آگے فرماتے ہیں کہ: ''وقد یعنی بہ معنی باطلاً مثل دعائہ المیّت والغائب واستقلال الشیخ بذلک تاثیراً وفعلہ لما لا یقدر علیہ الا اللہ او متابعتہ او مطاوعۃ علی البدع والمنکرات ونحو ھذہ المعانی الباطلۃ'' (مختصر الفتاوی المصریۃ ص ۱۹۷)

''اور کبھی برکت شیخ کے لفظ سے باطل معنیٰ مراد لی جاتی ہے، مثلاً مُردہ اور غائب سے مُراد مانگنا اور شیخ کی اس میں مستقل تاثیر تسلیم کرنا یا ایسے فعل کی اس سے توقع رکھنا جس پر اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی قادر نہیں یا اس کی بدعات اور منکرات پر متابعت اور فرمانبرداری کرنا اور اس قسم کے باطل معانی مُراد رکھنا۔''

اسی قسم کا توسّل یقیناً باطل اور مردود ہے مگر یقین جانئے کہ کسی مؤمن اور مسلمان کے تصور میں بھی ان میں سے کوئی معنیٰ نہیں ہوتا۔ مسلمان انہی معانی کو پیش نظر رکھتا ہے جن کے خود حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ قائل ہیں۔ الغرض کلیۃً توسّل کے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی منکر نہیں ہیں۔ ہاں! صرف بعض صورتوں کے منکر ہیں اور جن صورتوں کو وہ ناجائز سمجھتے ہیں، ان کو دیگر اہل السنت والجماعت بھی درست نہیں سمجھتے۔ رہا توسّل بالذات اور توسّل بصالح الاعمال کا نزاع تو یہ صرف لفظی ہے ؎

یہ اپنی حدِ نظر ہے کسی کی دید کہاں

جمہور علماء کرام اور مسئلۂ توسّل

جمہور اہل السنت والجماعت توسّل کے جواز کے قائل ہیں لیکن اس میں تفصیل سے کام لیتے ہیں۔ توسّل کی بعض صورتوں کو حرام بعض کو بلا دلیل اور بعض کو جائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ توسّل کے مسئلہ کی تفصیل کرتے ہوئے اور اس کی قسمیں بیان کرتے ہوئے آخر میں رقمطراز ہیں:

''والثالث دعاء اللہ ببرکت ھذا المخلوق المقبول وھذا قد جوّزہ الجمہور'' (بوادر النوادر ص ۷۶۱)

''اور توسّل کی تیسری صورت یہ ہے کہ کسی مقبول مخلوق کی برکت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مانگے اور اسے جمہور نے جائز قرار دیا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ توسّل کی یہ صورت جمہور علماء کرام کے نزدیک جائز ہے۔ بزرگانِ دین اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کا توسّل اسی صورت میں ہوتا رہا ہے جس کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے۔

علامہ سیّد سمہودی رحمۃ اللہ علیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے توسّل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''قلت فکیف لا یستشفع ولا یتوسل بمن لہ ھذا المقام والجاہ عند مولاہ بل یجوز التوسل بسائر الصالحین کما قالہ السبکی''

(وفاء الوفاج ۲ ص ۴۲۲)

''میں کہتا ہوں کہ اس ذات گرامی کو شفیع اور وسیلہ بنانا کیونکر درست نہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے ہاں جاہ اور مرتبہ حاصل ہے۔ جب کہ تمام صالحین رحمہم اللہ کو وسیلہ بنانا درست اور جائز ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ اور طفیل تو صحیح اور درست ہے ہی، جملہ صالحین رحمہم اللہ کا توسّل بھی درست ہے۔ اس عبارت میں علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ کے جس حوالہ کا ذکر ہے وہ پہلے عرض کر دیا گیا ہے۔

اور علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: ''ان التوسّل بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم جائز فی کل حال قبل خلقہ وبعد خلقہ فی مدۃ حیاتہ فی الدنیا وبعد موتہ فی مدۃ البرزخ، وبعد البعث فی عرصات القیمۃ والجنۃ''

(شفاء السقام ص ۱۲۰)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا توسّل ہر حالت میں درست ہے آپ کی پیدائش سے پہلے اور دنیا میں آپ کی زندگی کی مدت میں اور وفات کے بعد برزخ میں اور قیامت کے دن میدان محشر اور جنت میں ہر مقام پر درست ہے۔''

یعنی جس وجہ سے توسّل کیا جاتا ہے وہ ان تمام مقامات اور حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں علیٰ وجہ الاتم پائی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر مقام میں آپ پر ایمان لانا اور محبت کرنا ضروری ہے۔ جب توسّل کی وجہ سب مقامات میں یکساں ہے تو توسّل بھی جائز ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے جتنے بھی مکاتب فکر ہیں، فن حدیث میں ان کا رشتہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدّث دہلوی سے جا ملتا ہے اور موصوف بھی توسّل کے قائل ہیں۔ چنانچہ اپنی مشہور ومتداول کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ: ''ومن ادب الدعاء تقدیم الثناء علی اللہ والتوسل بنبی اللہ لیستجاب'' (حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ ص ۶، طبع مصر)

''اور دُعاء کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ کو مقدم کیا جائے تاکہ دُعاء کو قبولیت کا شرف حاصل ہو۔''

اس عبارت سے بصراحت یہ معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دُعا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے توسّل کو مستحب اور قبولیتِ دُعا کا بہترین ذریعہ قرار دیتے ہیں اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اپنے دور میں علماء ہند کی سند کی کڑی حضرت شاہ محمد اسحق محدّث دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ) سے جا ملتی ہے، وہ اس مسئلہ کے بارے میں یوں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''دعا بایں طور کہ الٰہی بحرمت نبی وولی حاجت مرا روا کن جائز است۔ چنانچہ از شرح فقہ اکبر ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ مفہوم میشود'' (مائۃ مسائل نمبر ۳۵)

''اس طریقہ سے دُعا کرنا کہ اے میرے پروردگار نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ولی کی حرمت سے میری حاجت پوری کردے جائز ہے۔ چنانچہ حضرت ملا علی القاری کی شرح فقہ اکبر سے معلوم ہوتا ہے۔''

قطع نظر دیگر دلائل کے جو حضرات علم حدیث میں حضرت شاہ محمد اسحاق کی شاگردی اور اُن کے سلسلہ سے خوشہ چینی کا دَم بھرتے ہیں، ان کے لئے تو اس سے فرار بھلا معلوم نہیں ہوتا اور حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی شہادۃً ۱۲۴۶ھ) ابوداؤد شریف کی ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ[1]: ''اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ جو لوگوں میں ایک ختم مشہور ہے اس میں یوں پڑھتے ہیں یا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ شیئاً للہ یعنی اے شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کچھ دو تم اللہ کے واسطے یہ لفظ نہ کہنا چاہئے۔ ہاں! اگر یوں کہے کہ یا اللہ کچھ دے شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے تو بجا ہے۔'' (تقویۃ الایمان ص ۹۵)

بزرگانِ دین کے مشہور سلاسل اربعہ (قادری، چشتی، نقشبندی اور سہروردی) کے شجروں میں بکثرت واسطے وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے اور قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے جوازِ توسّل پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ (العرف الشذی ص ۴۳۹)

اس رسالہ کا نام ''درنضید'' ہے۔ (بوادر النوادر ص ۷۶۳) اس میں وہ لکھتے ہیں کہ: ''اور دوسرا مطلب حدیث توسّل بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاجات میں وسیلہ بنانا صرف زندگی کی حالت سے مخصوص نہ تھا بلکہ جس طرح زندگی میں آپ کو وسیلہ بنایا جاتا تھا۔ اسی طرح انتقال کے بعد بھی آپ کو وسیلہ بنانا جائز ہے اور جس طرح آپ کی موجودگی میں آپ سے توسّل جائز تھا۔ اسی طرح عدم موجودگی میں بھی جائز تھا۔ یہ بالکل واضح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی زندگی میں وسیلہ بنانا اور آپ کے بعد دوسرے بزرگوں کو وسیلہ بنانا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سکوتی سے ثابت ہے۔ کیونکہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنایا تو کسی صحابی نے اس کا خلاف نہیں کیا۔ میرے خیال میں جوازِ توسّل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخصوص کردینا، جیسا کہ عزالدین (ابو محمد عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ) کو وہم ہوا ہے، اس کی کوئی وجہ نہیں۔'' (بحوالہ بوادر النوادر ص ۷۶۳)

جناب قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ فرمایا ہے، دلائل اور اکثر اُمت کے تعامل سے یہی قوی اور صحیح ہے اور ایسے مسائل کے لئے اس سے زیادہ قطعی دلائل کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔

---

[1] ''اب ولی محمد اینڈ سنز تاجران اُردو بازار پاکستان چوک کراچی نے جو نسخہ طبع کرایا ہے، اس میں یہ عبارت ہی بدل دی ہے۔ اللہ تعالیٰ خائنین سے بچائے۔ ان کو اس کا تو حق تھا کہ وہ اس عبارت کو برقرار رکھ کر حاشیہ پر دلائل سے اس کی تردید کرتے جو ایک علمی خدمت سمجھی جاتی۔ لیکن عبارت ہی کو اُڑا دینا پرلے درجہ کی علمی خیانت ہے۔''

علامہ آلوسی رحمہ اللہ مسئلۂ توسّل پر خاصی طویل بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: ''وبعد هذا كله انا لا ارى بأسا في التوسل الى الله تعالى بجاه النبي ﷺ عند الله تعالى حيًا وَمَيّتًا ويراد من الجاه معنى يرجع الى صفته من صفاته مثل ان يراد به المحبة التامة المستدعية عدم رده و قبول شفاعته فيكون معنى قول القائل الهي اتوسل بجاه نبيك ﷺ ان تقضي لي حاجتي الهي اجعل محبتك له وسيلة في قضاء حاجتي ولا فرق بين هذا وبين قولك الهي اتوسل برحمتك ان تفعل كذا اذ معناه ايضا الهي اجعل رحمتك وسيلة في كذا'' (روح المعانی ج ٦ ص ١٢٨)

''اس ساری بحث کے بعد میں اللہ تعالیٰ کے ہاں آنحضرت ﷺ کی جاہ سے آپ ﷺ کی زندگی میں اور بعد از وفات توسّل میں کوئی حرج نہیں سمجھتا اور آپ کی جاہ وتوسّل سے مراد کوئی ایسا معنٰی لیا جائے گا جو آپ کی صفات میں سے کسی صفت کی طرف راجع ہو۔ مثلاً آپ کی محبت تامہ جو عدم رد اور قبول شفاعت کو چاہتی ہے۔ لہٰذا قائل کے اس طرح کہنے کا کہ اے الٰہ میں تیرے نبی کے جاہ سے توسّل کرتا ہوں کہ تو میری حاجت پوری کردے یہ معنٰی ہوگا کہ اے میرے الٰہ تیری جو محبت آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہے اس کو میری حاجت پورا کرنے کا وسیلہ بنا دے اور اس میں اور تیرے اس قول میں کوئی فرق نہیں کہ اے میرے الٰہ میں تیری رحمت سے توسّل کرتا ہوں کہ تو ایسا کردے کیونکہ اس کا بھی یہی معنی ہے کہ اے الٰہ تو اپنی رحمت کو اس میں وسیلہ بنا دے۔''

اس عبارت سے بوضاحت یہ بات ثابت ہوگئی کہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ آنحضرت ﷺ کی زندگی اور بعد از وفات دونوں حالتوں میں آپ کی جاہ وعظمت سے توسّل کو جائز قرار دیتے ہیں اور اس میں وہ کوئی حرج ومضائقہ نہیں سمجھتے۔

اور پھر آگے لکھتے ہیں: ''ان التوسل بجاه غير النبي ﷺ لا بأس به ايضاً ان كان المتوسل بجاهه مما علم ان له جاها عند الله تعالى كالمقطوع بصلاحه و ولايته'' (روح المعانی ج ٦ ص ١٢٨)

''کہ آنحضرت ﷺ کے علاوہ اوروں کی جاہ وبرکت سے توسّل میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ جب کہ یہ معلوم ہو کہ جس کی جاہ سے توسّل کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی جاہ ہے، جیسے وہ شخصیت کہ یقینی طور پر اس کی صلاح وولایت معلوم ہو۔''

اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی سے آپ کی زندگی میں بھی اور بعد از وفات بھی توسّل درست ہے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کے علاوہ اوروں سے بھی توسّل جائز ہے۔ جب کہ ان کی نیکی وتقویٰ اور ولایت یقینی طور پر معلوم ہو اور یہ بات دلائل سے ثابت ہے کہ تواتر بھی قطعیت اور یقین کا فائدہ دیتا ہے تو معلوم ہوا کہ جس بزرگ کی صلاحیت اور نیکی اور ولایت تواتر سے ثابت ہو، اس کا توسّل بھی درست ہے۔ لیکن یہ بات ذہن سے ہرگز اوجھل نہ ہو کہ توسّل کا یہ معنٰی نہیں کہ اس بزرگ سے مرادیں مانگی جائیں یا اس کو حاجت روا اور مشکل کشا تصور کیا جائے۔ جیسا کہ بعض جاہل عوام کا خیال ہے۔

چنانچہ خود علامہ آلوسی رحمہ اللہ واشگاف الفاظ میں فی مثل یا سیدی اغثنی کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں: ''ولا ارى احدًا ممن يقول ذلك الا و هو يعتقد ان المدعو الحي الغائب او الميت المغيب يعلم الغيب او يسمع النداء ويقدر بالذات او بالغير على جلب الخير و دفع الاذى و الا لما دعاه'' (روح المعانی ج ٦ ص ١٢٨)

''کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ اے میرے سردار میری مدد کر دہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جس زندہ غائب یا مردہ

غائب کو پکارا جاتا ہے، وہ غیب جانتا ہے یا پکار سنتا ہے اور بالذات یا بالغیر جلب نفع اور دفع مضرت پر قادر ہے۔ ورنہ وہ کیوں اس کو پکارتا۔"

الغرض! اس طرز و انداز سے غیر اللہ سے مدد مانگنا عین شرک ہے اور فتاویٰ رشیدیہ وغیرہ کی عبارات سے اس کا شرک ہونا پہلے با حوالہ نقل کیا جا چکا ہے اور یہی کچھ اس عبارت میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرما رہے ہیں۔ غرض یہ کہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی خود اپنی عبارات اور تصریحات جواز توسّل پر بالکل واضح ہیں۔ غیر متعلق عبارات سے استدلال کرنا اہل علم کی شان کے خلاف ہے۔

حضرت مولانا محمد عبدالحئی صاحب لکھنوی سے کسی نے سوال کیا کہ: "اذا تحیرتم فی الامور فاستعینوا باصحاب القبور" (یعنی جب تم اپنے کاموں میں حیران ہو جاؤ تو اہل قبور سے استعانت کرو) حدیث ہے یا نہیں؟ اور اس کا معنیٰ کیا ہے؟ تو اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث نہیں ہے کسی کا مقولہ ہے اور اس کا یہ معنیٰ ہے کہ جب کسی چیز کے حلال و حرام ہونے میں تمہیں تردّد ہو اور دلائل متعارض ہوں تو خود قیاس نہ کرو۔ (غلطی کھا جاؤ گے) بلکہ اُن حضرات کی تقلید اور پیروی کرو، جو اب قبروں میں آرام فرما ہیں اور جو کچھ انہوں نے کہا اس کو تسلیم کرو اور یہ معنیٰ بھی ہو سکتے ہیں کہ جب تم اُمورِ دُنیویہ میں تنگ دل ہو جاؤ تو اصحاب قبور کو دیکھو اور ان سے عبرت حاصل کرو کہ آخر انہوں نے بھی دُنیا ترک کر دی ہے اور آخرت کو چلے گئے ہیں تو تم یہ سمجھو کہ آخر ہم بھی دُنیا سے جانے ہی والے ہیں۔

اور آگے لکھتے ہیں: "ونیز بر استمداد ہم محمول میتوان شد یعنی وقتیکہ متحیّر شوید در اُمور و کار بر آری شما نشود پس دعائے انجاح مرام بوسیلہ اصحاب قبور سازید وایشاں را وسیلہ گردانیدہ از جناب باری تعالیٰ دعا سازید تا برکت ایشاں بدرجۂ قبول رسد نہ ایں کہ ایشاں را حلاّل مشکلات استقلالاً یا شریک کارخانہ تدبیر عالم دانید کہ ایں عین شرک است۔" (مجموعۂ فتاویٰ عبدالحئی رحمہ اللہ ج ۳ ص ۲۳)

"اور اس عبارت کو توسّل پر بھی حمل کیا جا سکتا ہے یعنی جس وقت تم اُمور میں حیران ہو جاؤ اور تمہارا مطلب پورا نہ ہو سکے تو تم حاجت میں کامیابی کے لئے اصحاب قبور کے وسیلہ سے دُعا کرو اور ان کو وسیلہ قرار دیتے ہوئے جناب باری تعالیٰ سے دُعا کرو تا کہ ان کی برکت سے دُعا درجہ قبولیت کو پہنچ جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو استقلالاً مشکل کشا یا کارخانہ عالم کی تدبیر میں شریک سمجھا جائے۔ کیونکہ یہ عین شرک ہے۔"

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ جس معنیٰ میں جواز توسّل کے دیگر حضرات قائل ہیں، حضرت مولانا عبدالحئی صاحب رحمہ اللہ بھی ایسے توسّل کے جواز کے قائل ہیں جن کو تاہ فہم حضرات نے ان کی بعض مجمل عبارات سے اس کے خلاف سمجھا ہے، وہ اپنی اصلاح خود کر لیں۔ بشرطیکہ ان کو اصلاح مقصود بھی ہو، ورنہ کون کسی پر جبر کر سکتا ہے۔ استقلال اور عدم استقلال کی بقدر ضرورت با حوالہ بحث ہم نے "راہ ہدایت" میں کر دی ہے وہاں ہی ملاحظہ کر لیں۔

اکابرین علماء دیوبند اور مسئلہ توسّل

علماء دیوبند کثر اللہ جماعتہم کی اس سلسلہ میں عبارتیں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے نقل اور پیش کرنے کے لئے چند اوراق تو کیا خاصی ضخیم کتاب بھی ناکافی ہوگی۔ اس لئے یہاں ہم صرف "المھند" کی عبارت پر اکتفاء کرتے ہیں جو علماء دیوبند کے نزدیک ایک اجماعی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

تیسرا اور چوتھا سوال

کیا وفات کے بعد جناب رسول اللہ ﷺ کا توسّل لینا دُعاؤں میں جائز ہے یا نہیں؟ تمہارے نزدیک سلف صالحین یعنی انبیاء (علیہم السلام) وصدیقین اور شہداء واولیاء اللہ کا توسّل بھی جائز ہے یا ناجائز؟

جواب: ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک دُعاؤں میں اَنبیاء واولیاء وصدیقین کا توسّل جائز ہے، ان کی حیات میں یا بعد وفات بایں طور کہے کہ یا اللہ میں بوسیلہ فلاں بزرگ کے تجھ سے دُعاء کی قبولیت اور حاجت برائی چاہتا ہوں، اسی جیسے اور کلمات کہے۔ چنانچہ اس کی تصریح فرمائی ہے۔ ہمارے شیخ مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی ثم المکی رحمہ اللہ نے پھر مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ نے بھی اپنے فتاویٰ میں اس کو بیان فرمایا ہے جو چھپا ہوا آج کل لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہے اور یہ مسئلہ اس کی پہلی جلد کے (ص ۹۳) پر مذکور ہے جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ (المہند ص ۱۲، ۱۳)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ کے شاگرد رشید جلیل القدر عالم حامئ توحید وسنت اور ماحئ شرک وبدعت حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ جو سینکڑوں علماء کے اُستاد ومرشد تھے اپنی املائی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: ''وحل مشکلے از حق تعالیٰ طلب نمودن بتوجہ بزرگان بجا است وعین رضا است الیٰ ان قال بداں اے برادر گفتن یارسول اللہ بطریق تعشق وتوسّل خارج از مبحث است الیٰ ان قال نواب صدیق حسن خان گفتہ ؎

''شیخ سنت مددی قاضئ شوکاں مدد بمعنے دعا باشد چنانچہ در ہندی گویند شالا مدد ہووے پیر جیلانی۔''

(بلغۃ الحیران ص ۳۵۴)

''کسی مشکل کا حل اللہ تعالیٰ سے بزرگوں کے توسّل سے طلب کرنا بجا اور عین رضا ہے۔ (پھر آگے فرمایا کہ) اے بھائی تو جان لے کہ یارسول اللہ بطور محبت اور توسّل کے کہنا اختلافی بحث سے خارج ہے۔ (کیونکہ وہ جائز ہے) پھر آگے فرمایا کہ اسی توسّل اور محبت کے طور پر ہے جو نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ؎

اے سنت کے شیخ مدد کر اور اے قاضی شوکاں مدد کر

جو محض (بطور توسّل) دعا ہے چنانچہ پنجابی میں لوگ کہتے ہیں شالا مدد ہووے پیر جیلانی رحمہ اللہ۔

یعنی سمجھ دار قسم کا کوئی مسلمان اس سے یہ مراد نہیں لیتا کہ ان الفاظ سے شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ سے مدد طلب کی جارہی ہے بلکہ یہی سمجھے گا کہ ان کے وسیلہ اور طفیل سے دُعا کی جاتی ہے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس! اس قسم کے دیگر الفاظ سے بھی یہی کچھ سمجھنا چاہئے۔ اِلّا یہ کہ کوئی غالی ان سے استمداد کر کے شرک کا ارتکاب کرے تو اس کا معاملہ الگ ہے اور دوسرے مقام پر اولیاء کرام رحمہم اللہ سے مدد مانگنے والوں کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''اور کہتے ہیں کہ حضرت عبد القادر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مصیبت کے وقت مجھے پکارو یہ اس طرح نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ اَوّل تو ثبوت اس اَمر کا نہیں 'بھجۃ الاسرار'' والے کے حق میں شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مشائخ بھجۃ الاسرار والے کو معتبر نہیں سمجھتے۔ مع ہٰذا! اس نے جو سند لکھی ہے رواۃ کا پتہ نہیں کہ کیسے ہیں؟ اور اصل عبارت یوں لکھتے ہیں: ''اذکرنی'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ بتوسّل میرے دُعا مانگو۔ واللہ اعلم بالصواب'' (بلغۃ الحیران ص ۳۴۷)

اور حضرت مرحوم نے اپنے ہاتھ مبارک سے علم تصوف وسلوک پر ایک نہایت مفید اور بہترین رسالہ لکھا ہے جس کا نام ''تحفۂ ابراہیمیہ'' اور ''فیوضاتِ حسینی'' ہے، اس کے آخر میں سلاسل اربعہ (قادری، نقشبندی، چشتی اور سہروردی) کے شجرے بتائے ہیں اور ان میں الٰہی بحرمت فلاں کے صریح الفاظ موجود ہیں جو زمین پر چمکدار موتیوں کی مانند اور آسمان میں درخشندہ ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ مگر صد افسوس کہ اب مؤلف تسکین القلوب نے یہ سارے شجرے حذف کر دیئے ہیں۔ (فوا اَسفاو یاعَجبا) اور خود کتاب میں بھی توسّل کا صریح الفاظ میں ذکر موجود ہے ''المهند'' کی واضح اور اجماعی عبارت کے بعد ضرورت تو نہیں مگر صرف طلبہ علم کے افادہ کے لئے چند حوالے اور بھی عرض کئے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیو بندی رحمہ اللہ کا فتویٰ

سوال نمبر ۳۱۲۷: قبور فقراء واولیاء وصلحاء پر فاتحہ خوانی کے بعد جو لوگ دُعا مانگتے ہیں، یہ اگر درست ہے۔ تو کس طریقہ سے؟

الجواب: اس طرح دُعا مانگنا درست ہے کہ یا اللہ ببرکت اپنے نیک بندوں کے میری حاجت پوری فرما۔ (فتاویٰ دار العلوم ج ۵ ص ۴۳۱، طبع دیو بند)

سوال نمبر ۳۱۱۳: استمداد من اہل القبور کے جواب کی حنفیہ کے یہاں کوئی صورت ہے یا نہیں؟

الجواب: استمداد من اہل القبور اگر اس عقیدہ کے ساتھ ہے کہ وہ متصرف فی الامور ہیں۔ جیسا کہ عوام کا عقیدہ ہے تو یہ درست نہیں ہے بلکہ اس میں خوف کفر ہے۔ (شامی ج ۲ ص ۱۷۵، طبع مصر) میں ہے: ''ومنها انه ان ظن ان المیّت یتصرف فی الامور دون اللہ تعالٰی واعتقاده ذٰلک کفر'' اور اگر مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ان کے ذریعہ سے دُعا کی جاوے کہ یا اللہ میرا فلاں کام فلاں بزرگ کی برکت سے پورا فرما دے تو یہ جائز ہے۔
(فتاویٰ دار العلوم ج ۵ ص ۴۲۳، ۴۲۴)

اور نیز ارشاد فرماتے ہیں: ''ان بزرگوں سے یہ نہ کہے تم دُعا کرو سماع موتیٰ خود مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ حنفیہ سماع موتیٰ کا انکار کرتے ہیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہی مذہب ہے اور آیات قرآنیہ اس پر دال ہیں۔ لہٰذا اس طرح ان سے خطاب کر کے نہ کہے کہ تم دُعا کرو بلکہ خود اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے دُعائے مغفرت اور رفع درجات کی دُعا کرے اور اگر ان کے ذریعہ سے اپنی حاجات کے پورا ہونے کے لئے بھی دُعا کرے تو مضائقہ نہیں۔ (حصن حصین ص ۱۸، ولفظہ: ''وان یتوسّل الی اللہ تعالٰی بانبیائه والصالحین من عباده'') میں مذکور ہے کہ صالحین کے وسیلہ سے دُعا کرنا مستحب ہے کہ حق تعالیٰ ان کی برکت سے دُعا قبول فرماوے۔'' (فتاویٰ دار العلوم ج ۵ ص ۴۴۱، ۴۴۲)

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ

سوال: اکثر آدمی شجرہ خاندان کا ہر صبح وشام پڑھتے ہیں۔ یہ کیسا ہے؟

الجواب: شجرہ پڑھنا درست ہے کیونکہ اس میں بتوسل اولیاء کے حق تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں، اس کا کوئی حرج نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم کتبہ الاحقر رشید احمد گنگوہی عفی عنہ ۱۳۱۰ھ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۷۸)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

سابق مفتی دارالعلوم دیو بند وحال مفتیٔ اعظم پاکستان مسئلہ استعانت اور توسّل کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اسی طرح غیر مادّی اسباب کے ذریعہ کسی نبی یا ولی سے دُعا کرنے کی مدد مانگنا یا ان کا وسیلہ دے کر براہ راست اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنا روایات حدیث اور اشارات قرآن سے اس کا بھی جواز ثابت ہے وہ بھی اُس استعانت میں داخل نہیں جو صرف اللہ کے لئے مخصوص اور غیر اللہ کے لئے حرام وشرک ہے۔''

(معارف القرآن ج۱ ص ۴۲)

اور پھر آگے اس کی مزید تشریح کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

وسیلہ: استعانت اور استمداد کے مسئلے میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے۔ اُمید ہے کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء واولیاء کو وسیلہ بنانا نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اُوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو مختار مطلق سمجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک وحرام ہے اور محض واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے۔ اس میں عام طور پر لوگوں میں افراط وتفریط کا عمل نظر آتا ہے۔

(معارف القرآن ج۱ ص ۴۴)

مسلک دیو بند سے وابستہ اور تعلق رکھنے والے حضرات کے لئے علماء دیو بند کے ان جلیل القدر مفتیان عظام کے یہ فتوے مشعل راہ کا کام دیں گے اور نہ ماننے والوں کا ان سے بھی شاید اتفاق مشکل ہو مگر ؎

یہی یورش رہی آزادیٔ و تقلید بے جا کی تو غائب قوم کی تمکین ہے دو چار ہلّوں کی

(اکبر الٰہ آبادی)

الغرض! علماء دیو بند کے جملہ اکابر جواز توسّل کے قائل ہیں اور ان کے ہاں اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہاں! بقول شخصے ؎ تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

توسّل کے کچھ دلائل

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر جواز توسّل کے بعض دلائل کا تذکرہ بھی کر دیا جائے تاکہ مجوزین حضرات کے اذعان وایقان میں مزید اضافہ ہو اور مانعین حضرات کے حق میں ممکن ہے کہ وہ راہنمائی کا ذریعہ اور سبب قرار پائیں۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ!

بعض حضرات نے ''قرآن کریم'' کی بعض آیات سے بھی مسئلہ توسّل پر استدلال کیا ہے۔ مثلاً:

''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ'' (المائدہ:۳۵)

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔''

اور بعض حضرات نے ''وَکَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' (البقرہ:۸۹)

''وہ یہود پہلے فتح مانگتے تھے کافروں پر'' سے بھی استدلال کیا ہے۔

چنانچہ علامہ سید محمود آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ”نزلت فی قریظة والنضیر کانوا یستفتحون علی الاوس والخزرج برسول اللہ ﷺ قبل مبعثہ قالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما وقتادۃ“ یہ آیت کریمہ بنو قریظہ اور بنو نضیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ اوس وخزرج کے خلاف آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے فرمایا ہے۔

اور وہ ان الفاظ سے دُعا کرتے تھے: ”اَللّٰھُمَّ انا نسئلک بحق نبیک الذی وعدتنا ان تبعثہ فی اخر الزمان ان تنصرنا الیوم علی عدونا فینصرون“ (روح المعانی ج ۱ ص ۳۲۰)

”اے اللہ! ہم تجھ سے تیرے اُس رسول کے حق اور وسیلہ سے جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ اس کو تو آخری زمانہ میں بھیجے گا۔ سوال کرتے ہیں کہ آج کے دن تو ہمیں ہمارے دشمن پر غلبہ عطاء فرما۔ پس ان کی مدد کی جاتی۔“

اس مضمون کی ایک روایت بھی مستدرک وغیرہ میں آتی ہے لیکن بعض محدثین کرام رحمہم اللہ نے اس پر سخت کلام کیا ہے۔ اس لئے اُس سے قطع نظر کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا ارشاد ہی ملحوظ رکھنا چاہئے اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ: ”قرآن کے اُترنے سے پہلے جب یہودی کافروں سے مغلوب ہوتے تو اللہ سے دعا مانگتے کہ ہم کو نبی آخر الزمان (ﷺ) اور جو کتاب ان پر نازل ہوگی۔ اُن کے طفیل سے کافروں پر غلبہ عطاء فرما۔ جب حضور پیدا ہوئے اور سب نشانیاں بھی دیکھ چکے تو منکر ہو گئے اور ملعون ہوئے۔ (انتہٰی ص ۱۷) اُصول فقہ میں یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور جناب رسول کریم ﷺ اگر پہلے لوگوں کی شریعتوں کو بلا اِنکار کے بیان کریں تو وہ ہم پر بھی لازم ہیں۔ (نور الانوار ص ۲۱۶) اس ضابطہ کو مؤلف نے (تسکین القلوب ص ۷۶) میں باحوالہ بیان اور تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح مؤلف نے بھی (ندائے حق ص ۱۰۱) میں یہ تسلیم کیا ہے اور اس پر نور الانوار ہی کا حوالہ دیا ہے۔ پھر دونوں نے راقم پر گرفت کرتے ہوئے بے سود لفظوں کا چکر بھی دیا ہے، جو لا حاصل ہے۔ مؤلف (ندائے حق ص ۱۰۲) میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا نام لئے بغیر یہ لکھتے ہیں کہ: ”اور صاحب تسکین جس بعض کی تفسیر کو اپنی تائید میں پیش فرما رہے ہیں۔ اسی تفسیر پر بریلویہ بڑے نازاں ہیں۔ پھر آگے مولوی نعیم الدین صاحب کی (اطیب البیان بتردید تقویۃ الایمان ص ۲۸) کے حوالہ سے وہی تفسیر نقل کی ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے بیان فرمائی ہے۔ آخر میں مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ اب ناظرین بتائیں کہ صاحب تسکین اور نعیم الدین ایک ہی شاہراہ پر گامزن ہیں یا نہ؟ جواب یہ ہے کہ صاحب تسکین الصدور تو حضرت شیخ الہند کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ اگر اس مسئلہ میں مولوی نعیم الدین بھی ساتھ ہو گئے ہیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ خود مؤلف مذکور ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اور کسی سُنّی کا کسی ایک مسئلہ میں کسی غیر سُنّی کے ساتھ متفق ہونا اس کو سُنّی ہونے سے نہیں نکال سکتا۔ (ندائے حق ص ۲۱۶)

(تسکین القلوب ص ۷۶) میں ہے اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی عبارت کا محمل یہ (یعنی نبی آخر الزمان کو مبعوث فرما کہ ہم ان کے زیر علم ہو کر فتح پائیں) بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہی مطلب ہو جو بحوالہ روح المعانی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا گیا ہے، یعنی قبل البعثۃ بطفیل دعا کرنا تو وہ بھی ہو سکتا ہے اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ وغیرہ بزرگوں سے منقول ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اسی آیت کریمہ کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ: ''ان الیھود کانوا یحاربون جیرانھم من العرب فی الجاھلیة و یستنصرون علیھم بالنبی ﷺ قبل ظھورہ فیفتح لھم وینصرون علیھم فلما ظھر النبی ﷺ کفروا و جحدوا انبوتہ'' (بدائع الفوائد ج ۴ ص ۱۴۵)

''بے شک یہود جاہلیت میں اپنے عربی پڑوسیوں سے لڑتے تھے اور آنحضرت ﷺ کی آمد سے پہلے وہ آپ کے طفیل سے دشمن کے خلاف مدد طلب کرتے تھے تو ان کو فتح ونصرت حاصل ہوتی تھی۔ پھر جب آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے کفر اختیار کیا اور آپ کی نبوت کا اِنکار کر دیا۔''

اور علامہ داؤد بن سلیمان البغدادی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''اتفق المفسرون و اھل الحدیث علی انھا نزلت فی یھود خیبر کانوا اقبل وجودہ ﷺ یحاربون اسدًا و غطفان من مشرکی العرب و کانوا یقولون اللّٰھم بحق النبی الذی تبعثہ أخر الزمان الّا نصرتنا علیھم فلیصرون فلما جاءھم الرسول و رأوہ کفروا بہ عنادًا و حسدًا'' (المنحتہ الوھبیة ص ۳۱)

''مفسرین رحمہم اللہ اور محدثین رحمہم اللہ اس پر متفق ہیں کہ یہ آیت کریمہ یہود خیبر کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو آنحضرت ﷺ کی آمد سے پہلے مشرکین عرب کے قبیلوں اسد اور غطفان سے لڑتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ اے اللہ تو اُس نبی کے حق سے ہمیں اُن پر نُصرت اور غلبہ عطاء فرما جس کو تو آخر زمانہ میں بھیجے گا۔ سو ان کی مدد کی جاتی۔ پس جب آپ ان کے پاس آئے اور انہوں نے آپ کو دیکھا تو عناداً و حسداً آپ کا انکار کر گئے۔''

اس سے صراحۃً معلوم ہوا کہ یہ تفسیر صرف بریلویوں کی اختیار کردہ ہی نہیں بلکہ بقول علامہ بغدادی رحمہ اللہ حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ اور محدثین عظام رحمہم اللہ کا اس پر اتفاق ہے اور اسی لئے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ جیسی علمی شخصیت نے اس کو اختیار کیا ہے۔

بعض مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس آیت کریمہ کی تفسیر یوں کی ہے کہ آپ کی بعثت سے پہلے وہ آپ کے اوصاف حمیدہ کافروں کے سامنے بیان کیا کرتے تھے۔ مگر آپ کی آمد کے بعد وہ منکر ہو گئے منکرین کے سامنے آنحضرت ﷺ کے اوصاف حمیدہ بیان کرنے اور ساتھ ہی آپ کے طفیل سے دُعا مانگنے میں کوئی تعارض نہیں ہے تا کہ اس تفسیر کو سابق تفسیر کے خلاف سمجھا۔ کما لا یخفٰی!

فائدہ: دیگر فقہائے کرام رحمہم اللہ نے عموماً اور فقہاء احناف رحمہم اللہ نے خصوصاً یہ بیان کیا ہے کہ توسّل کے موقع پر بحق فلاں کا لفظ استعمال کرنا مکروہ ہے اور اس کی وجہ بھی صرف یہ ہے کہ معتزلہ وغیرہ کے نزدیک نیکیوں پر بندوں کو ثواب دینا اور بدیوں پر عذاب دینا پروردگار پر ضروری اور حق ہے۔

چنانچہ مُلّا علی القاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''لا یجب علی اللہ شئ خلافاً للمعتزلة'' (مرقات ج ۱ ص ۹۸)

''کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں بخلاف معتزلہ کے کہ وہ وجوب کے قائل ہیں۔''

ان کے نزدیک اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو معاذ اللہ تعالیٰ اس کا عدل باقی نہیں رہے گا اور اس کا بخل وجہل وغیرہ لازم آئے گا۔ لیکن اہل السنت والجماعت اس اَمر پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ فاعل مختار ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے، اس پر کسی کا کوئی حق عائد نہیں ہوتا۔ ہاں! محض اپنے اِرادہ سے جس حق کا وعدہ کیا ہے وہ بجا ہے اور اس میں نہ تو کلام ہے اور نہ اس سے کسی قسم کا کوئی جبر لازم آتا ہے۔

اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''حَقًّا عَلَيْنَا نُنجِ الْمُؤْمِنِينَ'' (یونس: ۱۰۳)

''حق ہے ہم پر ہم مؤمنوں کو نجات دیں گے۔''

اور یہ حق بھی بحسب وعدہ ہے، اس معنی میں کوئی قباحت نہیں۔ ہاں! یہ سمجھ کر کہنا کہ اللہ تعالیٰ پر کسی کا حق لازم ہے مکروہ ہے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ: ''ویکرہ ان یقول فی دعائہ بحق فلان او بحق انبیائک او رسلک لانہ لا حق للمخلوق علی الخالق انتھی'' (ہدایہ ج ۴ ص ۲۱۱)

''اور یہ مکروہ ہے کہ کوئی شخص اپنی دُعاء میں یوں کہے کہ میں بحق فلاں یا بحق انبیاء یا بالحق رُسل تجھ سے دُعا کرتا ہوں۔ کیونکہ مخلوق کا خالق پر (بطور وجوب کے) کوئی حق نہیں ہے۔''

اور امام سراج الدین الاودی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی فی حدود ۷۰۰ھ) لکھتے ہیں کہ: ''یکرہ ان یقول فی دعائہ بحق فلان او بحق رسلک و انبیائک'' (فتاویٰ سراجیہ ص ۲۷، طبع نولکشور)

''یعنی مکروہ ہے کہ دعا میں یہ کہے کہ میں بحق فلاں یا بحق رُسل یا بحق انبیاء تجھ سے سوال کرتا ہوں۔''

اور حضرت ملا علی القاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''قال ابو حنیفۃ رحمہ اللہ و صاحباہ رحمہما اللہ یکرہ ان یقول الرجل اسئلک بحق فلان او بحق انبیائک و رسلک و بحق البیت الحرام و المشعر الحرام و نحو ذٰلک اذ لیس لاحد علی اللہ حق الی ان قال قلت قدور د ایضاً اللّٰھم انی اسئلک بحق السائلین علیک و بحق ممشای الیک فالمراد بالحق الحرمۃ او الحق الذی وعدہ لمقتضی الرحمۃ'' (شرح فقہ اکبر ص ۱۶۰، ۱۶۱، طبع کانپور)

''امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے صاحبین (امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ) نے فرمایا کہ یہ مکروہ ہے کہ کوئی شخص اپنی دُعا میں یہ کہے کہ اے پروردگار میں تجھ سے فلاں کے حق یا تیرے انبیاء کرام اور تیرے رسولوں (علیہم الصلوٰۃ والسلام) اور بیت الحرام اور مزدلفہ کے حق سے سوال کرتا ہوں یا اسی طرح کے اور الفاظ استعمال کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی حق (واجب) نہیں۔ پھر آگے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ اے پروردگار میں تجھ سے ان لوگوں کے حق کی بدولت سوال کرتا ہوں جو تجھ سے سوال کرتے ہیں اور تیری طرف اپنے چلنے کے حق کی بدولت سوال کرتا ہوں تو اس حق سے حرمت مراد ہے یا وہ حق جو بحسب رحمت اس نے وعدہ کے طور پر اپنے ذمہ لیا ہے۔''

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ چونکہ کچھ بد باطن فرقے اس کا معنیٰ غلط لیتے ہیں، اس لئے یہ لفظ مکروہ ہے۔ ہاں! اگر کسی کا عقیدہ صحیح ہو اور حق سے وہ حق مراد ہو جو بحسب وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اسی معنی میں حضرت مصلح الدین سعدی رحمہ اللہ (المتوفی ۶۹۱ھ) نے یہ لفظ استعمال کیا ہے ؎

الٰہی بحق بنی فاطمہ کہ برحال ایماں کنی خاتمہ

علامہ ابو محمد بن عبد اللہ بن ابی حمزہ الاندلسی (المتوفی ۶۹۹ھ) ما حق العباد علی اللہ کی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ: ''وفیہ دلیل علی ان الحق یطلق علی ما کان من طریق الوجوب و علی ما کان من طریق التفضل اذا علم المخاطب ذٰلک و لا یجوز ان یطلق لمن لا یعلمہ''

(بھجۃ النفوس المسمی بجمع النھایہ فی بدء الخیر والغایۃ ج ۱ ص ۱۲۰، طبع مصر)

"اور اس میں دلیل ہے کہ حق اس پر بھی بولا جاتا ہے جو بطریق وجوب ہو اور اس پر بھی جو تفضل اور مہربانی کے طور پر ہو جب کہ مخاطب اس کو جانتا ہو اور جس شخص کو اس معنی کا علم نہ ہو تو اس کے لئے یہ لفظ بولنا درست نہیں ہے۔"

حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ سے کسی نے سوال کیا تو اس کا جواب یوں ارشاد فرمایا کہ:

سوال: دعاء میں بحق رسول اللہ وولی اللہ کہنا ثابت ہے یا نہیں؟ بعض فقہاء ومحدثین منع کرتے ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے؟

الجواب: بحق فلاں کہنا درست ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو تو نے اپنے احسان سے وعدہ فرمالیا ہے۔ اس کے ذریعہ سے مانگتا ہوں مگر معتزلہ اور شیعہ کے نزدیک حق تعالیٰ پر حق لازم ہے اور وہ بحق فلاں کے یہی معنیٰ مراد رکھتے ہیں۔ سو اس واسطے معنی موہم اور مشابہ معتزلہ ہو گئے تھے۔ لہٰذا فقہاء نے اس لفظ کا بولنا منع کر دیا ہے تو بہتر ہے کہ ایسا لفظ نہ کہے جو رافضیوں کے ساتھ مشابہ ہو جاوے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم!" (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۶۳ طبع جید برقی پریس دہلی)

توسل بالدعاء اور استشفاع

یعنی کسی بزرگ اور زندہ ہستی کو اللہ تعالیٰ کے ہاں بطور وسیلہ پیش کیا جائے۔ بایں طور کہ اس سے دُعاء کی التجاء کی جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دست بہ دُعا ہو اور حاضرین مجلس بھی اس کے ساتھ اپنے ہاتھ اُٹھا کر خالقِ کائنات کے ہاں عاجزی اور زاری کریں اور دل کی تہ سے یہ فریاد کریں کہ ؎

کیوں مانگتا پھرے تیرا سائل جگہ جگہ ! دیتا ہے اپنے ہاتھ سے اے بے نیاز دے!

علامہ آلوسی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "الاستشفاع و هو ان یطلب من الشخص الدعاء والشفاعة ویطلب من اللہ تعالٰی ان یقبل دعائه ویؤید ذٰلک ان العباس رضی اللہ عنہ کان یدعوا وهم یؤمنون لدعائه حتّٰی سقوا"

"الاستشفاع کا یہ مطلب ہے کہ کسی شخص سے دُعا اور سفارش کرائی جائے اور اللہ تعالیٰ سے یہ طلب کرے کہ وہ اس کی دُعا کو قبول فرمائے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ دُعا کرتے تھے اور لوگ ان کی دُعا پر آمین کہتے تھے حتیٰ کہ ان پر بارش برسائی گئی۔" (روح المعانی ج ۶ ص ۱۲۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک دفعہ خشک سالی ہوئی اور کافی عرصہ تک بارش نہ ہوئی جس کی وجہ سے لوگ خاصے پریشان ہوئے۔ اسی اثناء میں: "اتی اعرابی من اهل البدو الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم الجمعة فقال یا رسول اللہ هلکت الماشیة هلک العیال هلک الناس فرفع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدیه یدعوا ورفع الناس ایدیهم مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدعون" (الحدیث بخاری ج ۱ ص ۱۴۰)

"ایک دیہاتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جمعہ کے دن حاضر ہوا تو اس نے کہا کہ یا رسول اللہ مویشی ہلاک ہو گئے۔ اہل وعیال تباہ ہو گئے۔ لوگ خستہ حال ہو گئے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک اُٹھائے اور دُعا کی اور لوگوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے ہاتھ اُٹھائے اور دُعا کی۔"

اس آنے والے دیہاتی کا مقصد بھی یہی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر اور مقبول الدعا ہیں دُعا فرمائیں تاکہ بارش ہو اسی روایت میں آتا ہے کہ دُعا کا نتیجہ فوراً ظاہر ہوا اور خوب بارش ہوئی اور (طحاوی ج ۱

ص ۱۹۰) کی روایت میں یہ لفظ بھی ہیں کہ اس آنے والے نے کہا: "فادع اللہ یغیثنا فرفع رسول اللہ ﷺ یدیہ"
"وفی روایۃ فادع اللہ یسقینا" پس آپ دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر بارش برسائے سو آپ ﷺ نے ہاتھ اُٹھائے۔

اور تقریباً یہی الفاظ دلائل النبوۃ اصبہانی رحمہ اللہ (ص ۳۸۳، ۳۸۴) میں ہیں اور ایسے ہی موقع پر آپ نے جب بلا ہاتھ اُٹھائے دُعا مانگنا شروع کی تو آنے والوں اور دُعا کی درخواست کرنے والوں نے کہا: "فقالوا یارسول اللہ ارفع یدیک" یارسول اللہ ہاتھ اُٹھا کر دُعا کریں۔

اسی روایت میں آتا ہے کہ پہلے آپ نے تبسّم فرمایا پھر ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی۔ (دلائل النبوۃ اصبہانی رحمہ اللہ ص ۳۸۵)

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ "انا کنا نتوسل" کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ: "وذلک ان التوسل بہ فی حیاتہ ھو انھم کانوا یتوسلون بہ ای یسألونہ ان یدعو اللہ فیدعوا لھم ویدعون فیتوسلون بشفاعتہ ودعائہ"

"یہ توسّل آپ کی زندگی میں یوں تھا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں دُعاء کی التجا کرتے اور وہ حضرات بھی دُعا کرتے تو اس طریقہ سے وہ آپ کی شفاعت اور دُعا کا وسیلہ چاہتے تھے۔"
(مختصر الفتاویٰ المصریہ ص ۱۹۶)

خلیفہ راشد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (المتوفی ۲۴ھ) کے دَور میں بھی ایسی ہی خشک سالی کی تکلیف پیش آئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو توسّل کے طور پر پیش کیا اور یوں ارشاد فرمایا کہ: "اللّٰھم انا کنا نتوسل الیک بنبینا ﷺ فتسقینا وانا نتوسل الیک بعم نبینا فاسقنا قال فیسقون" (بخاری ج ۱ ص ۱۳۷)

"اے اللہ! بے شک ہم تیرے سامنے اپنے نبی ﷺ کو بطور توسّل پیش کیا کرتے تھے سو تو ہم پر بارش نازل کیا کرتا تھا اور اب ہم تیرے سامنے اپنے نبی کریم ﷺ کے چچا کو بطور وسیلہ پیش کرتے ہیں سو تو ہم پر بارش نازل فرما تو ان پر بارش برسائی جاتی۔"

اور ایسے مواقع پر جس قدر اہل خیر اور صلاح کو آگے کیا جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے چچا تھے اور اس کے ساتھ ایمان اور آپ کی صحبت کے فیض سے بھی مالا مال تھے۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو دُعا کے لئے آگے کیا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، علامہ عینی رحمہ اللہ اور قاضی شوکانی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ویستفاد من قصۃ العباس رضی اللہ عنہ استحباب الاستشفاع باھل الخیر والصلاح واھل بیت النبوۃ"

(فتح الباری ج ۳ ص ۱۵۱، واللفظ لہ وعمدۃ القاری ج ۷ ص ۳۳، ونیل الاوطار ج ۴ ص ۸، ونحوہ فی مختصر الفتاویٰ المصریہ ص ۱۹۶)

"حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اہل خیر و صلاح اور خاندان نبوت سے تعلق رکھنے والے حضرات کو بطور توسّل پیش کرنا مستحب ہے۔"

اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی یہ دُعا درحقیقت آنحضرت ﷺ کی برکت اور آپ کے تعلق کی وجہ سے ہی قبول ہوئی۔ چنانچہ علامہ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "فھذہ دعوۃ مستجابۃ ببرکۃ نبینا محمد ﷺ"
(طبقات السبکی ج ۲ ص ۶۹، طبع مصر)

''پس یہ دعا ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی برکت ہی سے قبول ہوئی اور ان کی دُعا کے الفاظ بھی علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کر دیئے ہیں۔'' (ایضاً)

توسّل فعلی

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا پہلا بیان وہ فرماتے ہیں کہ اس روایت سے متاخرین حضرات کا توسّل مراد نہیں کہ دُعا کرنے والا کسی بزرگ کا نام بطور توسّل پیش کر کے دُعا مانگے۔ مثلاً یہ کہ اے پروردگار! تو بوسیلۂ فلاں میرا کام کر دے۔ (بلکہ اس سے مراد توسّل فعلی ہے یعنی کسی زندہ کو آگے کر دینا تاکہ وہ دُعا کرتا رہے اور قوم دُعا میں اس کا ساتھ دے)

چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ: ''قوله اللّٰهم انا كنا نتوسل اليك نبينا ﷺ ليس فيه التوسّل المعهود الذى يكون بالغائب حتّٰى قد لا يكون به شعور اصلاً بل فيه توسّل السلف و هو ان يقدم رجلًا ذا وجاهة عند الله تعالٰى و يأمره ان يدعو لهم ثم يحيل عليه فى دعائه كما فُعِل بعباس رضی اللہ عنہ عم النبى ﷺ و لو كان فيه توسّل المتأخرين لما احتاجوا اباذهاب عباس رضی اللہ عنہ معهم و لكفى لهم التوسل بنبيّهم بعد و فاته ايضاً او بالعباس رضی اللہ عنہ عند عدم شهوده معهم'' (فیض الباری ج ۲ ص ۳۷۹)

''اللّٰھمّ اِنَّا'' کے اس قول سے وہ معہود توسّل مراد نہیں جو غائب سے کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اس کا بالکل شعور بھی نہ ہو بلکہ اس حدیث میں سلف کے توسّل کا ذکر ہے وہ یہ کہ کسی ایسے شخص کو آگے کیا جائے جس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں درجہ ہو، اور اس سے التجاء کی جائے کہ وہ ان کے لئے دُعا کرے، پھر دُعا اسی کے سپرد کی جائے۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کیا گیا اور اگر اسی سے متاخرین کا توسّل مراد ہوتی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے جانے کی ان کو حاجت ہی نہ پڑتی اور اُن کے لئے کافی تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد آپ کا توسّل کرتے یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ان کی غیر حاضری میں توسّل کر لیتے۔

حضرات متقدمین رحمہم اللہ کے اس توسّل میں دعا کرنے والا بمنزلہ امام ہوتا ہے اور اس کی دُعا پر آمین کہنے والے بمنزلہ مقتدی۔

چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: ''وقد روى عبدالرزاق من حديث ابن عباس رضی اللہ عنہ ان عمر رضی اللہ عنہ، استقى بالمصلّى فقال للعباس رضی اللہ عنہ قم فاستسق فقام العباس رضی اللہ عنہ فذكر الحديث فتبيّن بهذا ان فى القصة المذكورة ان العباس رضی اللہ عنہ كان مسئولاً وانه ينزل منزلة الامام اذا امره الامام بذلك''

''محدث عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عیدگاہ میں بارش طلب کی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ کھڑے ہوں اور بارش کی دُعا کریں تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، پھر آگے حدیث بیان کی۔ اس سے واضح ہوا کہ قصہ مذکورہ میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ مسئول تھے اور وہ بمنزلہ امام تھے۔ کیونکہ امام (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) نے ان کو اس کا حکم دیا تھا۔'' (فتح الباری ج ۳ ص ۱۴۸، طبع مصر)

اس حدیث میں تصریح ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس دُعا میں امام تھے اور حاضرین بمنزلہ مقتدی تھے۔

علامہ عینی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''و بعدہ استسقی عمر رضی اللہ عنہ بمن معہ بالعباس رضی اللہ عنہ عم النبی صلی اللہ علیہ وسلم فجعلوہ کالامام یسأل فیہ لانہ کان اَمَسّ بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم واقربھم الیہ رحمًا'' (عمدۃ القاری ج ۷ ص ۳۲ طبع مصر)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سمیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے توسّل سے بارش طلب کی۔ سوان کو امام کی مانند قرار دیا۔ کیونکہ قرابت کے لحاظ سے وہ باقی تمام حضرات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ پیوستہ اورزیادہ قریب تھے۔''

اور یہ واقعہ امام ابوعمر بن عبدالبر رحمہ اللہ نے بھی ان الفاظ سے نقل کیا ہے: ''ثم قال عمر رضی اللہ عنہ یا ابا الفضل قم فادع فقال العباس رضی اللہ عنہ'' (الاستیعاب علی الاصابۃ ج ۳ ص ۹۸)

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے ابوالفضل (یہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی کنیت تھی) کھڑے ہو کر دُعا کریں، سو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

اس ساری کارروائی سے توسّل فعلی کا ثبوت ملتا ہے جو بقول حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ حتقدمین کا توسّل تھا اور ایسا ہی واقعہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ (المتوفی ۶۰ھ) کے زمانہ میں پیش آیا۔

چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اور علامہ بدرالدین بعلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''و کذلک استسقی معاویۃ رضی اللہ عنہ ابی سفیان رضی اللہ عنہ بیزید بن الاسود الجرشی و قال اللّٰھم انا نستشفع الیک بخیارنا یا یزید ارفع یدیک الی اللہ عز و جل فرفع یدیہ و دعا و دعوا فسقوا فلذلک قال العلماء یستحب ان یستسقی باھل الصلاح و الخیر'' (زیارۃ القبور والاستنجاد بالقبور ص ۱۱۳، واللفظ لہ والبدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۳۲۴، ومختصر الفتاوی المصریۃ ص ۱۹۶)

''اور اسی طرح حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے یزید بن الاسود الجرشی رحمہ اللہ کے توسّل سے بارش طلب کی اور فرمایا کہ اے میرے اللہ ہم اپنے میں سے بہتر شخص کو تیرے سامنے سفارشی پیش کرتے ہیں۔ (پھر فرمایا کہ) اے یزید رحمہ اللہ اپنے ہاتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اُٹھا تو انہوں نے اپنے ہاتھ اُٹھائے اور دُعا کی اور لوگوں نے بھی دُعا کی تو ان پر بارش برسائی گئی۔ اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ اہل خیر و صلاح کے وسیلہ سے استسقاء مستحب ہے۔''

اور علامہ الشیخ سلیمان بن سحمان رحمہ اللہ توسّل کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''فان التوسل بالنبی فی عرف الصحابۃ ھو التوسل بہ عائہ و کذلک ولما توسل عمر رضی اللہ عنہ بالعباس رضی اللہ عنہ انما ھو بدعائہ لقولہ قم یاعباس رضی اللہ عنہ فادع اللہ و کقول معاویۃ رضی اللہ عنہ لیزید بن الاسود الجرشی قُمْ یا یزید فادع اللہ و لیس ھذا توسلاً بالذوات لان التوسل بالذوات لم یرد الا بلفظ غیر ثابت لا یصح والتوسل بالاعمال قد ثبت بالکتاب والسنۃ الصحیحۃ'' (البیان المبدی ص ۱۱۳)

''حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عرف میں توسّل بالنبی (صلی اللہ علیہ وسلم) توسّل بالدعا ہی تھا۔ (یعنی آپ سے دُعا کرانا) اور اسی طرح جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے توسّل کیا تو اُن سے دُعا کروائی اور فرمایا کہ اے عباس رضی اللہ عنہ آپ کھڑے ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں اور اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید بن الاسود الجرشی رحمہ اللہ سے فرمایا تھا کہ اے یزید رحمہ اللہ کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں اور یہ توسّل بالذوات نہیں۔ کیونکہ توسّل بالذوات کے بارے میں کوئی صحیح لفظ ثابت نہیں اور توسّل بالاعمال کا ثبوت کتاب اللہ اور سنّت صحیحہ سے ثابت ہے۔''

باقی مضمون تو بالکل صاف اور واضح ہے، البتہ ان کا یہ ارشاد کہ توسّل بالذوات کے بارے میں کوئی صحیح ثبوت نہیں محل نظر ہے۔

اَوّلاً: اس لئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف کی روایت بالکل صحیح ہے جس میں آنحضرت ﷺ کی زندگی میں اور اسی طرح بعد از وفات توسّل ہوا ہے۔

وثانیاً: ہمارے نزدیک توسّل بالذوات اور توسّل بالاعمال کا اختلاف صرف نزاع لفظی پر مبنی ہے جیسا کہ اسی کتاب میں اس کی تصریح ہے۔

توسّل قولی

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب پہلے متاخرین کے توسل میں متردد تھے۔ مؤلف (تسکین القلوب ص ۲۹) میں فیض الباری کا سابق حوالہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''اس عبارت سے آپ یعنی مولانا سید محمد انور شاہ صاحب) توسل مروجہ کا رد کرتے ہیں۔'' اور مؤلف (ندائے حق ص ۹۹) میں لکھتے ہیں کہ: ''آپ اس کی تردید فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ اس حدیث سے ثابت نہیں۔'' اور (ص ۳۰۰) میں حافظ ابن تیمیہ کا مسئلہ توسل سے انکار اور حضرت شاہ صاحب کا تردد لکھتے ہیں۔ اس سابق عبارت کے پیش نظر ان حضرات کا یہ کہنا اور لکھنا بالکل بجا ہے لیکن حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کا آخری فیصلہ بھی علماء کو پیش نظر رکھنا چاہئے اور عملی طور پر اس سے اغماض جائز نہیں ہے اور جمہور امت کا اسی پر عمل ہے کہ آخری قول ہی کا اعتبار ہوتا ہے۔ انما یوخذ بالاخر فالأخر!

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب حدیث: ''وانا نتوسل الیك بعم نبینا'' کی شرح میں فرماتے ہیں: ''قلت و ھذا توسّل فعلی لانه کان یقول لهٗ بعد ذٰلک قم یا عباس رضی اللہ عنہ فاستسق فکان یستسقی لھم فلم یثبت منه التوسّل القولی ای الا استسقاء باسماء الصالحین فقط بدون شرکتھم اقول و عند الترمذی ان النبیّ ﷺ علّم اعرابیا ھٰذه الکلمات و کان اعمٰی اللّٰھم انّی اتوجه الیک بنبیّک محمد نبی الرحمة الٰی قوله فَشَفِّعْهُ فِیَّ فثبت منه التوسّل القولی ایضاً و حینئذٍ انکار الحافظ ابن تیمیة رحمہ اللہ تطاول''

''میں کہتا ہوں کہ یہ توسّل فعلی ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کھڑے ہوں اور بارش طلب کریں تو انہوں نے لوگوں کے لئے بارش طلب کی تو اس سے توسّل قولی ثابت نہیں ہوتا۔ یعنی نیک لوگوں کی شرکت کے بغیر محض ان کے ناموں کی برکت سے بارش طلب کرنا۔ میں کہتا ہوں کہ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک اعرابی کو جو اندھا تھا، ان کلمات سے تعلیم دی۔ اے اللہ میں تیرے سامنے تیرے نبی محمد ﷺ کے وسیلہ سے جو نبیٔ رحمت ہیں التجاء کرتا ہوں۔'' (فیض الباری ج ۴ ص ۶۸)

پھر آگے فرمایا: ''اے اللہ! تو ان کی سفارش میرے حق میں قبول فرما تو اس سے توسّل قولی بھی ثابت ہو گیا۔ لہٰذا حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا اس سے انکار زیادتی ہے۔''

اس عبارت میں نہ صرف یہ کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے توسّل قولی کا اقرار و اثبات ہی کیا ہے بلکہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا رد بھی کیا ہے اور استدلال میں وہی روایت پیش کی ہے جو راقم اثیم نے ''تسکین الصدور'' میں

نقل کی تھی جس پر بلا وجہ مؤلف نے (تسکین القلوب ص ۴۲، ۴۳، ۱۱۰) میں اور مؤلف نے (ندائے حق ص ۱۹۷ تا ۲۰۲) میں حلمی اور عظمی مدنی اور مدینی وغیرہ کے الفاظ لکھ کر اس سند کے راوی ابوجعفر رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مبتدی طالبعلموں کو مغالطہ دینے کی ناکام سعی کی ہے۔ نیز یاد رہے کہ ترمذی شریف کی اسی روایت سے توسّل کے جواز پر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی استدلال کیا ہے۔ (فتاوی عزیزی ج ۱ ص ۸۹)

کسی کے وسیلہ سے دُعا مانگنا

یعنی کسی مقبول بزرگ اور فاضل ہستی کی ذاتِ گرامی کو (بمع ان صفات جمیلہ کے جو اس میں پائی جاتی ہیں) دُعا کرنے والا اپنی دُعا میں بطور توسّل پیش کرے اور اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے اس طرح دُعا کرے کہ اے قادرِ مطلق تو فلاں بزرگ کے طفیل اور اس کے وسیلہ سے (یا اسی طرح کے اور الفاظ ہوں) میری دُعا قبول فرما۔ جمہور اہل اسلام کے نزدیک یہ جائز اور صحیح ہے جیسا کہ پہلے باحوالہ یہ عرض کر دیا گیا ہے اور اس کے لئے ایک دلیل حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ (المتوفی) کی روایت ہے جو حدیث کی متعدد کتابوں میں موجود ہے۔

چنانچہ امام ترمذی[۱] رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمود بن غیلان[۲] رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عثمان بن عمر[۳] رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے شعبہ[۴] رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا اور وہ ابوجعفر[۵] رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ عمارۃ بن خزیمۃ[۶] رضی اللہ عنہ بن ثابت سے اور وہ حضرت عثمان بن حُنیف رضی اللہ عنہ سے وہ فرماتے ہیں کہ: ''ان رجلاً ضریر البصر اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ادع اللہ ان یعافینی قال ان شئت صبرت فھو خیر لک قال فادعہ قال فامرہ ان یتوضا فیحسن وضوءہ و یدعوا بھذا الدعاء اللّٰھم انی اسئلک واتوجہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ انی توجھت بک الٰی ربی فی حاجتی ھٰذہ لتقضی لی اللّٰھم فشفعہ فِیَّ'' (ترمذی ج ۲ ص ۱۹۷ واللفظ لہ وقال حسن صحیح غریب ومسند احمد ج ۴ ص ۱۳۸، ابن ماجہ ص ۱۰۰، مستدرک ج ۱ ص ۳۱۳، الترغیب والترھیب ج ۱ ص ۲۴۱، قال رواہ النسائی وابن خزیمۃ فی صحیحہ ومشکوۃ ج ۱ ص ۲۱۹، البدایۃ والنھایۃ ج ۶ ص ۱۶۱، عن احمد رحمۃ اللہ علیہ وکتاب الاذکار ص ۱۶۷)

---

[۱] امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا نام مع ولدیت محمد بن عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ بن سورہ اور کنیت ابوعیسیٰ تھی۔ الامام اور الحافظ تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۸۷) صحاح ستہ میں مرکزی کتاب الجامع الترمذی کے مصنف تھے۔ ۲۷۹ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔

[۲] امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو خدمتِ حدیث میں معروف اور صاحبِ سنت دیکھا ہے۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ اور مسلمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ محدث ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۶۵) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ۲۳۹ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

[۳] امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابن معین رحمۃ اللہ علیہ اور ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے امام عجلی رحمۃ اللہ علیہ ان کو ثقہ اور ثبت فی الحدیث کہتے ہیں امام ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ ان کو صدوق کہتے ہیں محدث ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور امام ابن قانع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ صالح تھے۔ (تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۴۳) ۲۰۹ھ میں ان کی رحلت ہوئی ہے۔

[۴] علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ ان کو الحجۃ الحافظ اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۸۱) المتوفی ۱۶۰ھ (بقیہ حاشیہ ۵، ۶ اگلے صفحہ پر)

''ایک نابینا شخص آنحضرت ﷺ کے پاس آیا تو اُس نے کہا کہ حضرت! آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں کہ وہ مجھے صحت یاب (اور بینا) کرے آپ نے فرمایا کہ (اگر تو چاہے تو میں دعا کروں اور) اگر تو چاہے تو صبر کر اور صبر ہی تیرے لئے بہتر ہے۔ اُس نے کہا کہ حضرت! آپ دُعا فرمائیں! آپ نے حکم دیا کہ وہ اچھی طرح وضو کرے اور یہ دُعا پڑھے: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف تیرے نبی حضرت محمد ﷺ جو نبی الرحمۃ ہیں کے وسیلہ سے توجہ کرتا ہوں، حضرت! میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں وسیلہ پیش کرتا ہوں تا کہ میری یہ حاجت پوری ہو جائے۔ اے اللہ! تو ان کی شفاعت میرے بارے میں قبول فرما۔''

امام حاکم رحمہ اللہ اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ اس روایت کو ایک مقام پر بخاری اور مسلم دونوں کی شرط پر صحیح فرماتے ہیں۔ (مستدرک ج ۱ ص ۳۱۳، مع التلخیص)

اور دوسرے مقام پر بخاری کی شرط پر صحیح کہتے ہیں۔ (مستدرک ج ۱ ص ۵۲۶)

---

۵ ان کا نام مع ولدیت اور نسبت یوں ہے۔ عمیر بن یزید الانصاری رحمہ اللہ، ابوجعفر الخطمی المدنی رحمہ اللہ، امام ابن معین رحمہ اللہ اور امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں محدث ابن نمیر عجلی رحمہ اللہ اور طبرانی رحمہ اللہ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام عبدالرحمن بن مہدی رحمہ اللہ ان کو صاحب صدق کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۱۵۱، ملتقطاً) اصل میں وہ مدینہ طیبہ کے باشندہ تھے، بعد کو بصرہ میں چلے گئے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ ھو مدنی قدم بصرۃ (تہذیب ج ۸ ص ۱۵۱) وہ مدنی تھے، بصرہ میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ حدیث کی بعض کتابوں میں ان کو المدنی اور بعض میں المدینی سے یاد کیا گیا ہے اہل علم جانتے ہیں کہ پہلے مدینہ طیبہ کی طرف نسبت کرتے وقت المدنی اور المدینی دونوں تعبیریں درست تھیں۔ لیکن جب خلیفہ ابوجعفر منصور بن المہدی رحمہ اللہ (المتوفی ۲۳۶ھ) نے بغداد کا نام بدل کر (کیونکہ ''بغ'' ایک بت کا نام تھا اور داد کے معنی فارسی زبان میں ''اُس نے دیا'' کے ہوتے ہیں تو اس میں دینے کی نسبت بت کی طرف ہوتی ہے۔ اس لئے فقہاء کرام رحمہ اللہ نے اس نام کو پسند نہیں کیا۔ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۵۸) مدینۃ السلام رکھا تو اس کے بعد علماء عربیت نے مدینہ طیبہ اور مدینۃ السلام (یعنی بغداد) کی طرف نسبت میں فرق کیا۔ چنانچہ مشہور لغوی علامہ ابوالفضل محمد بن عمر القرشی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''اذا نسبت الی مدینۃ الرسول قلت مدنی والی مدینۃ المنصور مدینی والی مدائن کسری مدائنی'' (صراح ص ۵۲۰) ''جب تم مدینہ طیبہ کی طرف نسبت کرو گے تو مدنی کہو گے اور مدینہ منصور کی طرف نسبت میں مدینی اور مدائن کسریٰ کی طرف نسبت میں مدائنی کہو گے۔''

اور امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدنی اور مدینی مدینۃ النبی ﷺ کی طرف نسبت ہے قیاس تو یہ ہے کہ نسبت کے وقت اس میں یاء حذف کی جائے اور جو لوگ یاء کو حذف نہیں کرتے وہ اس لفظ کو اصل پر رکھتے ہیں۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۱۷) یعنی یہ لفظ حرف یاء کو برقرار رکھ کر بھی پڑھا گیا ہے۔ مدینی یہ حوالہ (ندائے حق ص ۳۵) میں بھی موجود ہے لیکن اس کے باوجود راقم کی بلا وجہ صرفی غلطی نکالنے کے لئے شافیہ کا حوالہ ڈھونڈ نکالا ہے کہ نسبت میں یا حذف کی جاتی ہے۔ (شافیہ ص ۴۱) بجا ہے راقم نے موافق قیاس کی بحث ہی نہیں چھیڑی اصل نسبت میں بحذف یاء ہی سہی لیکن یاء کے ساتھ بھی نسبت وارد ہوئی ہے جیسے علامہ قرشی رحمہ اللہ اور نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔

اور خطمہ انصار میں سے ایک شخص کا نام تھا (صراح ص ۴۶۱) میں ہے: خطمہ نام مردے از انصار۔ اس لحاظ سے ابوجعفر الخطمی المدنی اور (بعض روایات میں) المدینی ایک ہی ہے اور یہ ثقہ راوی ہے۔

۶ عمارہ رحمہ اللہ بن خزیمہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ محدث ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ علامہ ابن سعد رحمہ اللہ ان کو ثقہ اور قلیل الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۴۱۶)

اور تیسرے مقام پر صحیح کہتے ہیں۔ (ج ا ص ۵۱۹)

علامہ خفاجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وھذا الحدیث مسند صحیح" (نسیم الریاض ج ۳ ص ۱۰۶، طبع مصر)

علامہ سمہودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "صححہ البیھقی رحمہ اللہ" (وفاء الوفا ج ۲ ص ۴۲۰)

اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "رواہ اھل السنن و صححہ الترمذی رحمہ اللہ" (فتاویٰ ج ۴ ص ۱۷۴)

"اہل سنن نے یہ حدیث روایت کی ہے اور ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔"

الغرض! یہ روایت اُصول حدیث کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے اور ہم نے اس کی اِس لئے قدرے تشریح کردی ہے کہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے الفاظ جو پہلے نقل کئے جا چکے ہیں۔ ان سے اس کی عدم صحت کا شُبہ پڑتا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کو اس مقام پر شُبہ ہوا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس سند میں ابوجعفر الخطمی نہیں۔ (وھو غیر الخطمی) ان کے اس وہم کی بناء پر بعض دیگر حضرات کو بھی یہ مغالطہ ہوا کہ یہ اگر الخطمی نہیں تو ابوجعفر الرازی ہوگا یا ابوجعفر المدائنی ہوگا اور یہ دونوں سخت ضعیف ہیں۔ لہٰذا ان کی روایت کا کیا اعتبار؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ راوی ابوجعفر الخطمی ہی ہے۔ چنانچہ امام ابوبکر احمد بن محمد المعروف بابن السنی الدینوری رحمہ اللہ۔ (المتوفی ۳۶۴ھ) اپنی کتاب (عمل الیوم واللیلۃ ص ۲۰۲، طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن)" میں المدنی وھو الخطمی ہی نقل کرتے ہیں اور اسی طرح (مسند احمد ج ۴ ص ۱۳۸) میں بھی ابوجعفر الخطمی ہے اور امام حاکم رحمہ اللہ اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ المدنی الخطمی نقل کرتے ہیں۔ امام طبرانی رحمہ اللہ بھی ابوجعفر الخطمی ہی نقل کرتے ہیں۔ (معجم صغیر طبرانی رحمہ اللہ ص ۱۰۴)

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابوجعفر الخطمی المدنی (تقریب ص ۲۹۱، وتھذیب التھذیب ج ۸ ص ۱۵۱) ابوجعفر خطمی بھی ہے اور مدنی بھی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ اس حدیث کو حسن صحیح الآخر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر یہ الرازی یا المدائنی ہوتے تو وہ تو بڑے کمزور اور پرلے درجہ کے ضعیف بلکہ وضاع راوی تھے۔ ان کی حدیث کو یہ مقام وہ ہرگز نہ دیتے۔ معلوم ہوا کہ اس سند میں ابوجعفر امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی ثقہ ہے۔ گو ان کے وہم کے لحاظ سے وہ الخطمی نہ ہو مگر درحقیقت وہ الخطمی ہی ہے جیسا کہ ہم نے باحوالہ یہ بات ثابت کردی ہے اور (ترمذی ج ۲ ص ۲۷۷ طبع مصر) میں وھو الخطمی کے لفظ ہیں جس سے معلوم ہوا کہ ہندی طبع میں غالباً کتابت کی غلطی سے لفظ غیر زائد ہوگیا ہے۔ وھو الحق، وللہ الحمد! مؤلف ندائے حق لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ترمذی میں گو یہی ہے۔ وھو غیر الخطمی مگر باقی علماء خطمی کہتے ہیں پھر خطمی ہی کی تصویب فرمائی۔ وسائر العلماء قالوا ھو ابو جعفر الخطمی وھو الصواب" (قاعدہ جلیلہ ص ۸۸، ندائے حق ص ۱۹۹)

یہی وہ روایت ہے جس کے بارے میں امام عزالدین بن عبدالسلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں توسّل کی تخصیص کی ہے اور قاضی شوکانی رحمہ اللہ نے اس کا رد لکھا ہے۔ جیسا کہ ان کے حوالہ سے پہلے یہ بات نقل کی جاچکی ہے، اس لئے اب اعادہ کی حاجت نہیں۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ اس حدیث کا ترجمہ کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔ اس سے توسّل صراحۃً ثابت ہوا اور چونکہ آپ کا اس کے لئے دُعا فرمانا کہیں منقول نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح توسّل کسی کی دُعا کا جائز ہے۔ اسی طرح توسّل دعاء میں کسی کی ذات کا بھی جائز ہے اور حاصل توسّل فی الدعا کا یہ ہے کہ اے اللہ! فلاں بندہ آپ کا موردِ رحمت کا ہے اور موردِ رحمت سے محبت اور اعتقاد رکھنا بھی موجب جلب رحمت ہے اور ہم اس

سے محبت اور اعتقاد رکھتے ہیں۔ پس ہم پر بھی رحمت فرما اور توسل بالاعمال میں بھی تھوڑے تغیر سے یہی تقریر ہے کہ یہ اعمال آپ کے نزدیک موجب رحمت ہیں اور ان کا فاعل بھی مرحوم ہوتا ہے اور ہم نے یہ اعمال کئے تھے۔ پس ہم پر رحم فرما'' (نشر الطیب ص ۲۵۲، جید برقی پریس دہلی)

اور ایک اور مقام پر ایک حدیث کے فائدہ میں لکھتے ہیں کہ: ''عادۃً توسل اہل طریق میں مقبولان الٰہی کے توسل سے دعا کرنا بکثرت شائع ہے، حدیث سے اس کا اثبات ہوتا ہے اور شجرہ پڑھنا جو اہلِ سلسلہ کے یہاں معمول ہے، اس کی یہی حقیقت اور غرض ہے۔'' (التکشف ص ۴۴۶)

ان عبارات سے توسل کا صحیح مفہوم اور مراد واضح ہو جاتی ہے اور اس طرح کے توسل میں نہ تو شرک لازم آتا ہے اور نہ کراہت جن حضرات نے اس توسل کو نصوص کے خلاف سمجھا اور بتایا ہے وہ خود جہل مرکب کا شکار ہیں اور بالکل غیر متعلق نصوص سے اس کا رد کرتے ہیں۔

چنانچہ قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ مسئلہ توسل کے جواز کی طویل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اب معلوم ہو گیا کہ جو دلائل منکرین توسل پیش کرتے ہیں۔ مثلاً: ''مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر: ۳) اور فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (الجن: ۱۸) اور لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ (الرعد: ۱۴)'' ہمارے دعویٰ جوازِ توسل بالنبی والصالحین کے لئے مضر نہیں بلکہ اگر ان آیات کو امتناع توسل کے لئے پیش کیا جائے گا تو یوں کہا جائے گا کہ محل نزاع اور امتناع توسل سے یہ دلائل بالکل اجنبی ہیں اھ (درنضید مؤلفہ قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ ماخوذ از بوادر النوادر ص ۷۶۴) قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ طویل مضمون حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب سہالوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۳۵۹ھ سابق خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ نے اپنے علمی اور تحقیقی رسالہ ''العدل'' ۲۹ رجون ۱۹۲۷ء میں بھی شائع کیا تھا)

چونکہ (ابن ماجہ ص ۱۰۰) وغیرہ کی اسی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: ''یامحمد انی قد توجهت بک الٰی ربی'' تو اس سے مانعینِ توسل کو حاضر و ناظر اور علم غیب کا شبہ ہوا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

چنانچہ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اقول اس قصہ میں تو خود فخر عالم زندہ اس عالم میں تھے اور آپ ہی کے حکم سے یہ عمل ہوا تھا۔ آپ اُن کی خدمت میں حاضر تھے تو اس وقت میں تو کوئی ضرورت جواب و توجیہ کی نہیں اور بعد آپ کے معمول ہے تو اسی طرح سمجھ کر ہے کہ آپ کی خدمت میں تبلیغ ہوتی ہے ملائکہ پہنچاتے ہیں۔ علم استقلالی (یعنی بغیر فرشتوں کے پہنچانے کے۔ صفدرؔ) نہ اس میں ہے اور نہ اس عقیدہ سے پڑھنا اس کا درست ہے تو ایسی حالت میں یہ بھی شرک ہو جائے گا۔'' (البراہین القاطعہ ص ۲۱۹)

ایک شبہ: بہت ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ ہو (جیسا کہ امام عزالدین عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ہو چکا ہے) کہ اس حدیث سے جو ثابت ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا توسل حیات میں تھا اور اکثریت سے توسل بالاموات ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث اس مسئلہ سے غیر متعلق ہے۔

اور اس کا ازالہ: اگرچہ سطحی طور پر اس حدیث سے یہ شبہ پڑتا ہے مگر تحقیق کے میدان میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں یہی دُعاء ایک شخص کو بتلائی تھی اور اس نے دُعا کی تھی اور ان کا کام بن گیا تھا اور اُصولِ حدیث کا

قاعدہ ہے کہ حدیث کا راوی اپنی مروی حدیث کا مطلب اور مراد دوسروں سے بہتر جانتا ہے اور کسی نے ان پر نکیر بھی نہیں کی۔ لہٰذا اس سے توسل بعد الوفات بھی ثابت ہے۔ چنانچہ امام طبرانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم سے طاہر بن عیسیٰ بن قبرس المصری المقری رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اصبغ بن الفرج رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہ بن وہب رحمہ اللہ نے بیان کیا وہ ابوسعید (شبیب بن سعید رحمہ اللہ) المکی رحمہ اللہ سے اور وہ رُوح بن القاسم رحمہ اللہ سے اور وہ ابوجعفر الخطمی المدنی رحمہ اللہ سے اور وہ ابوامامہ بن سہل بن حنیف رحمہ اللہ سے اور وہ اپنے چچا حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: ''ان رجلا کان یختلف الی عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فی حاجۃ لہ فکان عثمان لا یلتفت الیہ و لا ینظر فی حاجتہ فلقی ابن حنیف فشکیٰ ذٰلک الیہ فقال لہ عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ ایت المیضاۃ فتوضاء ثم ایت المسجد فصل فیہ رکعتین ثم قل اللّٰھم انی اسئلک و اتوجہ الیک بنبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی الرحمۃ'' (معجم صغیر ص ۱۰۴ و شفاء السقام ص ۱۲۴، ۱۲۵، وفاء الوفاج ۲ ص ۴۲۰، ۴۲۱)

''ایک شخص حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس ایک ضروری کام کے سلسلہ میں آیا جایا کرتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (غالباً بوجہ مصروفیت) نہ تو اس کی طرف توجہ فرماتے اور نہ اس کی حاجت براری کرتے وہ شخص حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے ملا اور اس کی شکایت کی تو انہوں نے فرمایا کہ وضو کی جگہ جا اور وضوء کر پھر مسجد میں جا کر دو رکعت نماز پڑھ، پھر کہہ اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور بوسیلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں جو نبی الرحمۃ ہیں۔''

اسی روایت کے آخر میں اس کی تصریح ہے کہ اس شخص نے ایسا ہی کیا اور اس دُعا کی برکت سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس کی تعظیم و تکریم بھی کی اور اس کا کام بھی پورا کر دیا۔ امام طبرانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ والحدیث صحیح کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ (معجم صغیر ص ۱۰۴)

اور علامہ منذری رحمہ اللہ بھی اس روایت کو نقل کر کے امام طبرانی رحمہ اللہ کے اس قول ''والحدیث صحیح'' کی تائید کرتے ہیں۔ (الترغیب والترہیب ج ۱ ص ۲۴۲)

اور امام سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی یہ روایت دو سندوں سے روایت کی ہے، پھر آگے سند بیان کی ہے۔ (شفاء السقام ص ۱۲۵)

امام سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس روایت سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی آپ کا توسل درست ہے۔ (شفاء السقام ص ۱۲۴)

اور ایسا ہی علامہ سمہودی رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔ (وفاء الوفاج ۲ ص ۴۲۰)

(نشر الطیب ص ۲۵۳) میں حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فائدہ: ''اس سے توسل بعد الوفات بھی ثابت ہوا اور علاوہ ثبوت بالروایہ کے درایۃً بھی ثابت ہے کیونکہ روایت اوّل کے ذیل میں جو توسل کا حاصل بیان کیا گیا ہے وہ دونوں حالتوں میں مشترک ہے۔''

اور (بریقہ محمودیہ ج ۱ ص ۲۷۰) میں ہے: ''و یجوز التوسل الی اللہ تعالٰی و الاستغاثۃ بالانبیاء و الصالحین بعد موتھم'' حضرات انبیاء کرام اور صالحین علیہم السلام کی وفات کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا توسل جائز ہے۔

الغرض! جمہور جس توسّل کے قائل ہیں وہ دلائل کی رُو سے بزرگوں کی زندگی میں بھی اور بعد از وفات بھی جائز اور صحیح ہے۔ لَاشَکَّ فیہ!

آنحضرت ﷺ کے علاوہ اور صالحین رحمہم اللہ کا توسّل بھی درست ہے۔

جس طرح آنحضرت ﷺ کا توسّل درست ہے، اسی طرح اور صالحین رحمہم اللہ کا توسّل بھی درست ہے اور اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔

چنانچہ امام ابوعبداللہ محمد بن محمد بن محمد العبدری الفاسی المالکی الشہیر بابن الحاج رحمہ اللہ (المتوفی ۷۳۷ھ) لکھتے ہیں کہ: ’’بل یبدأ بالتوسل الی اللہ تعالٰی بالنبی ﷺ اذ ھو العمدۃ فی التوسل والاصل فی ھذہ کلہ والمشرع لہ فیتوسل بہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم وبمن اتبعہ باحسان الی یوم الدین‘‘ (المدخل ج۱ ص۲۵۵، طبع مصر)

’’بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں آنحضرت ﷺ کے توسّل سے دعا شروع کی جائے۔ کیونکہ آپ ہی توسّل میں عمدہ اور اس میں اصل ہیں اور آپ ہی نے اس کو مشروع قرار دیا ہے۔ پس آپ سے اور قیامت تک آنے والے آپ کی عمدہ اتباع کرنے والوں سے توسّل کیا جائے۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت تک نیک لوگوں کے توسّل سے دعا کرنا درست اور صحیح ہے۔

علامہ ابن حجر مکی رحمہ اللہ سابق نقل کردہ حدیث توسل پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: ’’وصححہ البیھقی رحمہ اللہ وزاد فقام وروی الطبرانی بسند جید انہ علیہ السلام ذکر فی دعائہ بحق نبیک والانبیاء الذین من قبلی ولا فرق بین ذکر التوسل والاستغاثۃ والتشفع والتوجہ بہ ﷺ او بغیرہ من الانبیاء وکذا الاولیاء‘‘

’’اس حدیث کی امام بیہقی رحمہ اللہ نے تصحیح کی ہے اور اس میں یہ جملہ زائد نقل کیا ہے کہ وہ (تندرست ہو کر) اُٹھ کھڑا ہوا اور طبرانی رحمہ اللہ نے جید سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی دُعاء میں اس کا بھی ذکر فرمایا کہ (اے اللہ) اپنے نبی کے حق سے اور اُن انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے حق سے جو مجھ سے پہلے گزر چکے ہیں، (دُعا قبول فرما) اور توسّل۔ استغاثہ۔ تشفع اور توجہ (وغیرہ) میں جو آنحضرت ﷺ یا آپ کے بغیر اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور حضرات اولیاء کرام سے کیا جائے کوئی فرق نہیں ہے۔‘‘

(حاشیہ ابن حجر المکی رحمہ اللہ، علی الایضاح فی مناسک الحج للنووی رحمہ اللہ ص۵۰۰، طبع مصر)

جس طرح یہ الفاظ تقریباً ہم معنی ہیں، اسی طرح لفظ طفیل برکت۔ جاہ اور حرمت وغیرہ الفاظ بھی ہیں۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ ’’یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُل‘‘ کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ پھر جب نبی کریم ﷺ کے طفیل میں سب کی طرف خدا کی نظر لطف و رحمت ہوگی، تب کچھ عرض کرنے کی جرأت کریں گے۔ (ص۱۶۲) اور ’’قُلْ لَوْ اَنْتُمْ تَمْلِکُوْنَ‘‘ کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ محمد ﷺ کے طفیل میں جو خزائن آپ کے اتباع کو ملنے والے ہیں، مل کر رہیں گے۔ (ص۳۷۸) اور ’’سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ‘‘ کی تفسیر کے آخر میں لکھتے ہیں: ’’اَللّٰھُمَّ ارزقنا ھذہ النعمۃ العظمٰی بحرمت نبیک ﷺ‘‘ (ص۵۷۶) اور پہلے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ سبکی رحمہ اللہ کے حوالہ سے برکت اور جاہ کے الفاظ بھی نقل کئے جا چکے ہیں اور ان سب الفاظ کے استعمال کی علماء اسلام اجازت دیتے ہیں، لیکن اُسی معنیٰ کے لحاظ سے جس کی بقدر ضرورت بحث پہلے گزر چکی ہے نہ اُس مفہوم کے لحاظ سے جو مشرکین کی مراد ہوتی ہے۔

مسئلہ توسّل اور غیر مقلدین حضرات

غیر مقلدین حضرات چوں بالعموم اکثر مسائل میں حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کے پیرو ہیں، اس لئے بعض حضرات نے مسئلہ توسّل کا انکار کیا ہے اور بعض مقر ہیں شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''وہابیہ توسّل بالانبیاء والاولیاء علیہم السلام کو بعد الوفات ممنوع اور حرام قرار دیتے ہیں۔ یہ حضرات (دیوبند) اس کو نہ صرف جائز بلکہ ارجی للاجابۃ (یعنی اس توسّل کے بعد اس دُعا کے قبول ہونے کی زیادہ توقع ہوتی ہے اور مفید قرار دیتے ہیں۔ شجرات حضرات چشت رحمۃ اللہ علیہم واداب زیارت وادعیہ مدینہ منورہ اس پر شاہد عدل ہیں جو کہ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کی متعدد تصانیف میں شائع ہو چکے ہیں۔'' (نقش حیات ج ۱ ص ۱۰۴)

غیر مقلدین کے مشہور مصنف عالم مولانا عبد الرحمن صاحب مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۵۳ھ) لکھتے ہیں کہ: ''والتوسل بہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد مماتہ و کذا التوسل بغیرہ من اھل الخیر والصلاح بعد مماتھم فلا یجوز واختارہ الامام ابن تیمیۃ رحمۃ اللہ علیہ فی رسالتہ ''التوسل والوسیلۃ'' (تحفۃ الاحوذی ج ۴ ص ۲۸۳)

''بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح دیگر اہلِ خیر اور صلاح کا ان کی وفات کے بعد توسّل جائز نہیں ہے اور اسی کو امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''التوسل والوسیلہ'' میں اختیار کیا ہے۔''

غیر مقلدین حضرات زبانی طور پر تسلیم کریں یا نہ کریں مگر یہ ایک خالص حقیقت ہے کہ جناب قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ اس دَور میں غیر مقلّدین حضرات کے پیشواء ہیں، انہوں نے نہ صرف یہ کہ مسئلہ توسّل کو جائز ہی کہا ہے بلکہ اس کے اثبات پر ''درنضید'' رسالہ بھی لکھا ہے جس کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے اور غیر مقلّدین حضرات کے شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) اپنی معروف علمی کتاب ''معیار الحق'' کے آخر میں لکھتے ہیں: ''هٰذَا اٰخِرُ مَا اَلْهَمَ اللهُ خَالِقُ الثَّقَلَيْنِ عَبْدَهُ الْعَاجِزَ محمد نذیر حسین عَافَاهُ اللهُ فِی الدَّارَیْنِ بِجَاهِ سَیِّدِ الثَّقَلَیْنِ'' (معیار الحق ص ۴۱۹، مکتبہ نذیریہ قصور)

اس عبارت میں جاہ کے لفظ سے توسّل صراحۃً مذکور ہے اور مشہور غیر مقلد عالم مولانا وحید الزمان خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ''تیسر الباری'' ترجمہ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۳۸۵ حاشیہ) میں لکھتے ہیں۔ (مسلم ج ۲ ص ۲۸۲) کی روایت میں یوں ہے: ''یا اللہ! میں اس (یعنی امام حسن رضی اللہ عنہ) سے محبت رکھتا ہوں تو بھی اس سے محبت رکھ۔ ہم گنہگاروں کے پاس کوئی نیکی نہیں ہے، بجز اس کے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتے ہیں۔ یا اللہ! اپنے حبیب کی دُعا پوری کر اور ہم کو آخرت کے عذاب سے امام حسن رضی اللہ عنہ کے طفیل ہمیں بچا دے۔ آمین یا رب العلمین'' اور اسی طرح وہ اپنی کتاب (لغات الحدیث ج ۲ ص ۴۵) میں بھی توسّل کو جائز قرار دیتے ہیں اور نیز وہ ترجمہ (بخاری پ ۴ ص ۷۷ حاشیہ) میں حدیث: ''وانا نتوسل الیک بعم نبینا'' کی شرح میں لکھتے ہیں۔ اس حدیث سے نیک بندوں کا وسیلہ لینا ثابت ہوا۔ بنی اسرائیل بھی قحط میں اپنے پیغمبر کے اہلِ بیت کا توسّل کرتے۔ اللہ تعالیٰ پانی برساتا۔ اس سے یہ نہیں نکلتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا توسّل آپ کی وفات کے بعد منع تھا۔ کیونکہ آپ تو اپنی قبر میں زندہ ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو دُعا سکھائی اس میں یوں ہے: ''یا محمد انی اتوسل بک الی ربی'' اور اس

صحابی نے آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد یہ دُعا دوسروں کو سکھائی مگر ہمارے اصحاب میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن القیم رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ اموات وقبور کا توسّل جائز نہیں نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اور نہ کسی اور صحابی نے آپ کی قبر کا توسّل کیا اور خلاف کیا ان کا۔ بہت سے اکابر محدثین اور علماء نے اور یہ کہا کہ ایک اُمر کا منقول نہ ہونا اس کے عدم جواز پر دلالت نہیں کرتا، جب اصل وسیلہ کا جواز شرع سے ثابت ہے۔

ہم نے حضرت بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ کا واقعہ صحیح سند سے پہلے عرض کر دیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ان کو تائید حاصل تھی، پھر نہ منقول ہونے کا کیا مطلب؟ الغرض! غیر مقلدین کے اہل علم اور ذمہ دار حضرات بھی مسئلہ توسّل کا جواز ثابت کرتے ہیں اور اس میں وہ بھی جمہور کا ساتھ دیتے ہیں: ''والحق ما قاله الجمهور'' کیونکہ حدیث شریف میں ہے: ''يدالله على الجماعة''

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو جمہور کے مسلک اور دامن سے وابستہ رکھے، اسی پر ان کی حیات ہو اور اسی پر ان کی وفات ہو۔ آمین ثم آمین!

''وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَجَمِيْعِ مُتَّبِعِيْهِ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ''

احقر الناس

ابوالزاہد محمد سرفراز خطیب جامع مسجد گکھڑ

صدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

۸ر محرم الحرام ۱۳۹۹ھ، ۹ر دسمبر ۱۹۷۸ء

***

ضمیمہ

اس کتاب کے موضوع کے مناسب چند اکابر علماء دیوبند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم کا ایک تازہ استفتاء اور اس کا جواب افادۂ عوام کے لئے شامل کیا جا رہا ہے جو درج ذیل ہے:

فتویٰ اکابر دیوبند

بخدمت اکابرین دیوبند رحمہم اللہ کے جانشینان کرام متعنا اللہ تعالیٰ بطول بقائکم بالخیر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض یہ ہے کہ آج کل بعض حضرات (۱) انبیاء کرام علیہم السلام کے وصال کے بعد حیات برزخی جسمانی کا انکار کرتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے جسدِ اطہر میں بھی کسی حس وحرکت کے قائل نہیں ہیں اور نہ ہی روضہ پاک پر سلام عرض کرنے والے کے سلام سننے کے قائل ہیں اور ساتھ ہی اس خیال کو اکابر دیوبند کا مسلک بتاتے ہیں۔ (۲) عالم برزخ میں ثواب وعذاب کا تعلق صرف روح سے مانتے ہیں، جسم عنصری پر عذاب وعتاب کے قائل نہیں ہیں اور اسے دیوبندی مسلک قرار دیتے ہیں۔ (۳) ذوات انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کے ساتھ وسیلہ پکڑنے کو صحیح نہیں سمجھتے اور اسے بزرگان دیوبند کا مسلک سمجھتے ہیں۔ (۴) سماع موتیٰ کے قائل ہونے کو شرک کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور اپنے آپ کو دیو

بندی کہلواتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ آپ حضرات جو مسلک دیو بند کے ترجمان ہیں اور بزرگانِ دیو بند کے سابقین اَوّلین سے براہِ راست مستفیض اور مستفید ہونے والے ہیں۔یہ وضاحت فرمادیں کہ مندرجہ بالا خیالات رکھنے والے صاحبان مسلک دیو بند سے منسوب و منسلک ہو سکتے ہیں یا نہیں اور کیا اکابرین دیو بند کا یہی مسلک تھا یا یہ ان کی ذاتی آراء ہیں اور بزرگان دیو بند کے مسلک سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔بینوا توجروا السّائلون!

حضرت مولانا (خان محمد) صاحب	مولانا (محمد رمضان) صاحب	حافظ (سراج الدین) صاحب
خانقاہ سراجیہ نزد کندیاں ضلع میانوالی	مہتمم مدرسہ تبلیغ الاسلام میانوالی	کلورکوٹ

الجواب وباللہ التوفیق

مسائل مستفسرہ میں بزرگان دیو بند کا مسلک صاف اور واضح ہے اور اس سے قبل بھی بار بار اس کی اشاعت ہو چکی ہے۔نیز علماء دیو بند کے مختلف اور متعدد تصانیف میں مکرر سہ کرر اسے بیان فرمایا گیا ہے اور وہ کتابیں علم و خاص میں معروف و مشہور ہیں۔مثلاً: (۱) آب حیات۔(۲) جمال قاسمی۔(۳) نشر الطیب۔(۴) الشہاب الثاقب۔(۵) المصالح العقلیہ۔(۶) فیض الباری۔(۷) المہند علی المفند۔(۸) اور متفقہ اعلان وغیر ذٰلک۔(۹) حیٰوۃ النبی ﷺ۔

(الف) چنانچہ ''المهند علی المفند'' میں بجواب سوال خامس صاف طور پر بیان کیا گیا ہے کہ:
''ہمارے اور ہمارے مشائخ کے نزدیک آنحضرت ﷺ قبر شریف میں زندہ ہیں اور آپ کی یہ حیٰوۃ عام مؤمنین یا عام لوگوں کی طرح برزخی ہی نہیں ہے بلکہ عالم برزخ میں دنیوی (جسمانی) ہے۔مگر مکلف بالاعمال نہیں ہیں اور یہ حیات حضور اکرم ﷺ اور جمیع انبیاء علیہم السلام کے خصوصیات میں سے ہے۔''

واضح رہے کہ اس مضمون پر علماء دیو بند کے طبقہ اولیٰ وعلیا کے تقریباً تمام اکابرین کے دستخط موجود ہیں۔مثلاً شیخ الہند، حضرت تھانوی رحمہ اللہ، مفتی عزیز الرحمن، حضرت شاہ عبد الرحیم رحمہ اللہ اور حضرت مولانا خلیل سہارنپوری رحمہ اللہ نے تو یہ مضمون خود ہی تحریر فرمایا ہے۔

(ب) اسی طرح تقسیم ہند کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جب اس مسئلہ حیٰوۃ النبی ﷺ سے متعلق بعض صاحبان کی تقریروں اور تحریروں سے بزرگانِ دیو بند کا مسلک مشتبہ ہونے لگا تو اس وقت کے اکابر علماء نے بھی متفقہ اعلان کے نام سے اپنے دستخطوں سے ایک تحریر شائع کر کے مسلک دیو بند کی وضاحت فرمائی۔چنانچہ اس وقت بھی وہ مقام حیات از مولانا خالد محمود اور دوسرے رسائل میں مطبوع ہے۔اس میں یہ صفائی سے لکھا گیا ہے کہ:''حضرت اقدس نبی کریم ﷺ اور سب انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں علماء دیو بند کا مسلک یہ ہے کہ وفات کے بعد وہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور ان کے ابدانِ مقدسہ بعینہٖ محفوظ ہیں اور جسدِ عنصری کے ساتھ برزخ میں ان کو حیات حاصل ہے اور حیات دنیوی کے مماثل ہے۔صرف یہ کہ احکام شرعیہ کے وہ مکلف نہیں ہیں۔لیکن وہ نماز بھی پڑھتے ہیں اور روضۂ اقدس پر جو درود شریف پڑھے وہ بلا واسطے سنتے ہیں اور یہی جمہور محدثین اور متکلمین اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک ہے۔اب جو اس مسلک کے خلاف کرے اتنی بات یقینی ہے کہ ان کا اکابر دیو بند کے مسلک سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

اس متفقہ اعلان پر مرحومین حضرات میں سے حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمہ اللہ خلیفہ اجل حضرت

تھانوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا رسول خان صاحب سابق اعلیٰ مدرس دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ مؤلف ''اعلاء السنن'' و''رحمۃ القدوس'' وغیرہ کے دستخط بھی ثبت ہیں۔

عذاب قبر: ہمارے اور ہمارے مشائخ کے نزدیک قبر میں ثواب وعتاب کا تعلق روح اور جسم دونوں کے ساتھ رہتا ہے اور جسم سے جسم عنصری مراد ہے نہ کہ جسم مثالی جو کہ حقیقی جسم نہیں ہے۔ بلکہ عالم مثال کے آئینہ میں جسم کا ایک عکس ہے: ''کما صرح به المجدد الالف الثانی رحمہ اللہ'' اور جیسا کہ کتب فقہ وعقائد میں مذکور ہے کہ ''ان المیت اذا مات یکون فی نعیم او عذاب وان ذٰلک یحصل لروحه وبدنه'' (کتاب الروح)

یہی اکابرین دیوبند کا مسلک ہے۔

توسل بالانبیاء والصلحاء علیہم السلام

توسّل بالانبیاء علیہم السلام بھی بزرگانِ دیوبند کے نزدیک جائز ہے۔ (المهند علی المفند ص ۲۸ مطبوعہ جہلم)

نشر الطیب للعلامۃ التھانوی رحمہ اللہ اور الشہاب الثاقب شیخ المدنی رحمہ اللہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے آیت کریمہ: ''وابتغوا الیه الوسیله'' کے تحت توسّل بالمقبولین کو جائز قرار دیا ہے اور تصریح کی ہے کہ اس کا مآل بھی توسّل بالصفات ہی ہے۔ کانه یقول برحمتک وفضلک علی فلان ادعومنک هذا!

سماع موتیٰ

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''کتاب الروح'' میں فرمایا ہے: ''وهذا السلام (ای السلام عند زیارة القبور) والخطاب والنداء الموجود یسمع ویعقل ویردون السلام وان لم یسمع المسلم الرد والسلف مجمعون علی هذا وقد تواترت الاثار عنهم بان المیت یعرف الحنی ویستبشر به''

ہمارے مشائخ بھی فی الجملہ سماع موتیٰ کے قائل ہیں۔ جیسا کہ: ''فیض الباری للعلامۃ الکشمیری رحمہ اللہ وغیرہ میں ہے اور اسے ہرگز شرک کی بنیاد قرار نہیں دیتے جو لوگ ان مسائل میں کچھ اور رائے رکھتے ہوں وہ کچھ بھی ہوں۔ بہرحال مسلک دیوبند سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ انہیں بزرگان دیوبند کی طرف غلط نسبت نہیں کرنی چاہئے۔ واضح رہے کہ بزرگان دیوبند کے یہ نظریات بحمد اللہ قرآن وسنت اور سلف صالحین کی تصریحات کے عین مطابق ہیں۔ سائلین کو چونکہ صرف مسلک دیوبند کا تعین اور تشخص مقصود تھا، اس لئے صرف مسائل کے بیان پر اکتفاء کیا گیا، دلائل سے تعرض نہیں کیا گیا۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل!

کاتب الحروف عبدالکریم عفی عنہ بحکم سیدی حضرت افغانی مدظلہ

دستخط مہر	دستخط مہر	دستخط مہر	دستخط مہر
مولانا شمس الحق افغانی عفا اللہ عنہ	مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ	احمد الرحمٰن غفرلہ	ولی حسن عفا اللہ

از احقر جمیل احمد تھانوی جامعہ اشرفیہ لاہور

مولانا افغانی زید معالیہم کا املائی جواب حق وصواب ہے۔ چاروں مسئلوں میں علمائے دیوبند کا یہی مسلک ہے بلکہ:

۱...... کل اہل السنت والجماعت کا اجماعی یہ مسئلہ ہے۔ عدم حیات کا قول تو صرف بعض معتزلہ اور رافضیہ کا ہے۔ اہل حق میں سے کسی کا نہیں۔ البتہ اہل السنت والجماعۃ میں تین قول ہیں۔ (۱) حیات من وجہ کا مسلسل رہنا۔ (۲) منقطع ہو کر عود کرنا، پھر منقطع ہو کر عود کرنا۔ (۳) منقطع ہو کر عود کرنا اور تا قیامت رہنا۔ مگر یہ اختلاف ترجیحی ہے، حق و باطل کا نہیں ہے اور معتزلہ سے حق و باطل کا اختلاف ہے۔ چونکہ عذاب قبر تواتر سے ثابت ہے اور بغیر حیات کے ثواب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے حیات قبری ہر انسان کے لئے اس قدر یقینی و متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ جس سے عذاب و ثواب کا ادراک ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''انکار شعور و ادراک اموات اگر کفر نہ باشد در الحاد بودن اوشبہ نیست'' (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۹۳)

بحذف دلائل تفصیلی دلائل وہاں ہیں۔

۲...... جمہور اُمت کے نزدیک برقول اصح جسم اور روح دونوں کو عذاب ہوتا ہے اور عذاب قبر اس کی متواتر ثبوت کی دلیل ہے۔ کیونکہ عذاب قبر اسی کو ہوتا ہے جو قبر میں ہو۔ اگر قبر میں فقط جسم ہو تو نہ عذاب عذاب ہے اور نہ ثواب ثواب کہ وہ ادراکات سے خالی ہے اور صرف روح قبر میں ہو جسم نہ ہو یہ ظاہر ہے کہ باطل ہے۔ لہٰذا دونوں پر عذاب ہوگا۔ عذاب قبر سے صرف عذاب برزخ مراد لینا، عذاب قبر کا انکار بنے گا۔ قبر خاص ہے۔ برزخ (جو موت سے قیامت تک کا زمانہ ہے) عام ہر قبر تو برزخ ہے مگر برزخ ہر ایک قبر نہیں جو عام خاص کا خاصہ ہے۔ اگر عذاب قبر ہو تو عذاب برزخ ہے۔ عذاب برزخ عذاب قبر نہیں۔ اگر صرف روح کو عذاب مانا گیا تو وہ قبر میں نہیں ہوگی تو عذاب قبر نہ ہوا۔ گو عذاب برزخ ہوگا یہ انکار متواتر کا ہے۔

۳...... وسیلہ اس کی ذات سے ہو تو بے اصل ہوگا لیکن حق تعالیٰ کی ایسی صفت سے ہو جس کا تعلق اس سے ہے۔ مثلاً محبت و نسبت وغیرہ پھر تو وسیلہ صورۃً گو ان سے کیا جا سکے۔ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی صفت سے ہے، اس کو ناجائز کون کہہ سکتا ہے۔ فقط حدیث شریف میں انبیاء سے توسّل آیا ہوا ہے: ''بعیسی روحک و موسی نجیک او کما قال'' لمبی حدیث ہے۔

۴...... میں ہمارے بزرگوں نے احتیاط کی ہے کہ صحابہ میں اختلاف رہا ہے۔ ایسا نہ ہو دوسروں کی بے تعظیمی ہو جائے، مگر مدار اس کا حیات پر ہے۔ اگر حیات بقدر ادراک عذاب و ثواب ثابت ہو تو سماع بھی ثابت ہے اور تمام اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک حیات بقدر ادراک نعم و قم ثابت ہے۔ حیات کے لئے سماع لازم ہے۔ یہی بات علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سوال و جواب کر کے نظم بھی کیا ہے جس میں یہ شعر بھی ہے۔ (الحاوی ج ۲ ص ۱۷۴)

سماع موتی کلام الخلق معتقد جاءت به عندنا الآثار فی الکتب

یعنی جمہور اُمت کا عقیدہ ہے۔ احادیث قریب بتواتر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً احادیث سلام احادیث معرفت غاسل وغیرہ احادیث تلقین جو بکثرت وارد ہیں اور مجموعہ متواتر بن جاتا ہے۔ اس لئے حضرت شاہ صاحب سرخیل علماء ہند کا یہی فتویٰ راجح و قوی صحیح ترین معلوم ہوتا ہے اور علماء دیوبند وہی اعتقاد رکھتے ہیں جو ان اسلاف کا تھا اور چودہ سو سالہ اسلاف کا ہے۔

مہر و دستخط

جمیل احمد تھانوی مفتی جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ لاہور

۱۳ ر رمضان ۱۳۹۶ھ

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ اَمْوَاتٌ
بَلْ أَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (القرآن)

اَلْاَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّونَ (الحدیث)

سِماعِ مَوتیٰ

المُلقب

باثبات السماع والشعور لجملة اهل القبور

تالیف: شیخ الحدیث

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ

جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

إِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَشَاءُ وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ (قرآن کریم)

مَا مِنْ رَجُلٍ يَمُرُّ بِقَبْرِ أَخِيهِ الْمُؤْمِنِ كَانَ يَعْرِفُهُ فَيُسَلِّمُ عَلَيْهِ إِلَّا عَرَفَهُ وَرَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ (حدیث شریف)

بالجملہ انکار شعور و ادراکِ اموات اگر کفر نباشد در الحاد بودن او شبہ نیست (فتاویٰ عزیزی ص۱۰۹ ج۱)

سماع الموتیٰ

الملقب

باثبات السماع والشعور لجملۃ اھل القبور

بحمد اللہ تعالیٰ وحسن توفیقہ جس میں بے حد کوشش اور خاصی کاوش کے ساتھ قرآن کریم صحیح احادیث، کتب تفسیر، کتب فقہ اور فتاویٰ سے مسئلہ سماع موتیٰ کا مثبت اور منفی پہلو واضح سے واضح تر کیا گیا ہے اور اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جمہور امت عند القبور سماع الموتیٰ کی قائل ہے اور حضرات فقہاء احناف کا معتد بہ طبقہ اور اکابر علماء دیوبند کی اکثریت سماع الموتیٰ کی قائل ہے اور عدم سماع الموتیٰ کے قائلین حضرات کے دلائل بھی نقل کر کے کتاب و سنت اور فقہ کی روشنی میں ان کے واضح جوابات عرض کر دیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ حضرات ائمہ اربعہؒ میں سے کوئی امام اور خصوصاً امام اعظم ابو حنیفہؒ سماع الموتیٰ کے منکر نہیں، بلکہ مقر ہیں اور اُن کی طرف عدم سماع الموتیٰ کی جو روایتیں منسوب کی جاتی ہیں وہ سب شاذ اور غیر معتبر ہیں۔ الغرض ٹھوس حوالوں کے ساتھ اردو زبان میں بفضلہ تعالیٰ یہ جامع کتاب ہے۔

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ

ابو الزاہد محمد سرفراز خان صفدر خطیب جامع مسجد گکھڑ
و صدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفصیلی فہرست

***

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(حرفے چند)

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ

پیدائش: ۱۹۱۴ء ...... وفات: ۵/ مئی ۲۰۰۹ء

مصنف محقق دوران اور نامور عالم دین تھے۔ دنیا نے انہیں ''امام اہلسنت'' کے نام سے بھی یاد کیا۔ آپ جہاں استاذ العلماء اور درس وتدریس کے ماہر تھے، وہاں حق تعالیٰ نے آپ کو تحریر کا بھی کامل ملکہ نصیب کیا۔ آپ جس مسئلہ پر قلم اٹھاتے آپ کی تحریر حرف آخر قرار پاتی۔ آپ نے جون ۱۹۶۸ء میں ''تسکین الصدور فی تحقیق احوال الموتی فی البرزخ والقبور'' تحریر فرمائی۔ مدرسہ ضیاء العلوم سرگودھا کے صدر مدرس مولانا محمد حسین نیلوی نے اس کا جواب لکھا، جس کا نام ''الکتاب المسطور فی جواب تسکین الصدور المعروف بہ ندائے حق'' تجویز فرمایا۔ یہ کتاب اگست ۱۹۶۹ء میں تحریر کی گئی۔

اس کے بعد ملک محمد فیروز اسلامک مشن جھنگ نے ''وفات النبی ﷺ'' کے نام پر اور کراچی کے ڈاکٹر کیپٹن مسعود عثمانی جماعت مسلمین نے ۱۹۷۲ء میں ''یہ قبریں یہ آستانے'' تحریر کیں۔ اس سے پہلے ''شفاء الصدور'' نامی کتاب مولانا محمد حسین نیلوی کی بھی منظر عام پر آچکی تھی، جس کا ترجمہ مولانا محمد امیر بندیالوی نے کیا تھا۔

''شفاء الصدور''، ''ندائے حق''، ''وفات النبی ﷺ''، ''یہ قبریں یہ آستانے'' یہ تمام کتب ورسائل ''عند القبور سماع موتی'' کے انکار پر مشتمل تھیں۔ ان حالات میں شیخ الحدیث مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خان صفدر نے ۱۹۷۶ء میں ''سماع موتی'' نامی کتاب تحریر فرمائی جس کا پورا نام ''سماع موتی الملقب باثبات السماع والشعور لجملة اهل القبور'' ہے۔ اس کتاب میں مسئلہ سماع موتی کو مبرہن کیا لیکن متذکرہ تمام رسائل بالخصوص ''ندائے حق'' کا پورا جواب بھی ہو گیا۔ اس مجموعہ میں یہ کتاب بھی شامل ہے۔ (ناشر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تصدیقات علماء کرام

(۱) فخر الاماثل، عمدۃ المحققین، رئیس المحدثین مصنف انوار الباری شرح البخاری (داماد زبدۃ المحدثین رأس الاتقیاء حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ) حضرت مولانا سید احمد رضا شاہ صاحب بجنوری دامت فیوضہم العالیۃ۔

باسمہٖ سبحانہٗ جل ذکرہٗ

مکرم ومحترم جناب مستطاب مولانا محمد سرفراز خاں صاحب دام فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ

اُمید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا کل ایک عریضہ اَرسالِ خدمت کر چکا ہوں آج ''سماع الموتیٰ'' کا مطالعہ کیا، دل خوش ہوا، خوب خوب دادِ تحقیق دی ہے۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء!

آپ بڑا کام کر رہے ہیں درازیٔ عمر اور صحت کے لئے دل سے دُعا ہے (اس کے بعد حضرت موصوف نے ایک غلطی کی نشاندہی فرمائی ہے جس کی اصلاح کر لی گئی ہے۔ صفدرؔ) جلد ملاقات کا مشتاق ہوں دُعاؤں میں یاد کریں، آپ کے ساتھ (اجلاس صد سالہ دیوبند کے موقع پر) جو مدرسہ نصرۃ العلوم کے مہتمم (مولانا صوفی عبدالحمید) صاحب تھے ان کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے۔ والسلام خیر ختام

احمد رضا عفا اللہ عنہ از بجنور (انڈیا) ۸/اپریل ۱۹۸۰ء

(۲) عالم جلیل، فقیہ کامل، رئیس المحدثین، محقق العصر، نمونہ سلف، اُستاد العلماء والفضلاء الحاج حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ سابق شیخ الحدیث المدرسۃ العربیہ الاسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی وسابق امیر مرکزیہ مجلس تحفظ ختم نبوت (پاکستان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گرامی مآثر مولانا ابو الزاہد صفدر صاحب زادکم اللہ الخیر توفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

جدید تالیف ''سماع الموتیٰ'' موصول ہو کر باعث شکر گزاری ہوئی۔ جزاکم اللہ تعالیٰ! ماشاء اللہ ''تسکین الصدور'' کے بعد اس موضوع پر یہ تصنیف مزید سکون صدور کا ذریعہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرما کر اور نافع ومثمر بنا کر مزید توفیق نصیب فرمائے۔ جستہ جستہ دیکھی، ماشاء اللہ! عمدۃ ہے۔ (اس کے بعد دو غلطیوں کی اصلاح کی تلقین فرمائی جو بحمد اللہ تعالیٰ اب درست کر دی گئی ہے۔ صفدرؔ) کتابت کے اغلاط کافی ہیں۔ (جن کی کافی حد تک اب درستی کر دی گئی ہے۔ صفدرؔ) اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام!

محمد یوسف بنوری، ۴/جمادی الاخریٰ ۱۳۹۷ھ

(۴) عالم باعمل حضرت مولانا حفیظ الرحمن محمد نذیر اللہ خان صاحب رحمہ اللہ (فاضل دیوبند)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ الَّذِیْ اَرْسَلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہِ الَّذِیْنَ ھُمْ مِنْ خَیْرِ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ وَجَعَلَھُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِیَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْھِمْ وَھُمْ اَھْلُ السُّنَّۃِ وَجَمَاعَۃُ الرَّسُوْلِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ مَنِ اتَّبَعَھُمْ فَقَدِ اھْتَدٰی وَمَنْ عَصَاھُمْ فَقَدْ ضَلَّ وَغَوٰی لِاَنَّھُمْ عَلَی الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْمِ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا۔ اَمَّا بَعْدُ ’’ما انا علیه و اصحابی‘‘

کہ نشانِ ہدایت ونجات ہے سنت رسول و جماعت رسول، راہِ ہدایت ہے ان کی اتباع ہدیٰ ورنہ اتباع مبتدعین کا دعویٰ زبان سے یہ ہوتا ہے کہ ہم قرآن وسنت کے متبع ہیں مگر انہوں نے قرآن وسنت کو اپنی آراء واہواء کا تختۂ مشق بنالیا ہوتا ہے۔ حالانکہ ’’تمسک بالقرآن والسنۃ‘‘ کا مطلب وہی معتبر ہے جو اسلاف اُمت نے بیان کیا ہے اور متوارث طور پر جہابذہ علم وفضل سے دیانۃً وامانۃً محفوظ چلا آتا ہے اور اعجاب کل ذی رائی برأیہ اور عدم اعتاد علی الاسلاف کی وباء سے آج بھی ایسے حضرات کا ظہور ہوا ہے جو قرآن پاک کی آیات اور احادیث کی روایات کو اپنی اہواء کے مطابق تقریر وتحریر سے نداء حق اور دعوۃ الحق وشفاء الصدور کا اعلان کر رہے ہیں۔ اُمت مسلمہ اور اسلافِ اُمت کے جم غفیر حضرات کو نشانہ طعن وتشنیع کرتے ہوئے سماع موتی کے قائلین کو مشرک کہتے ہیں اور طلب شفاعت للمغفرۃ عند قبر سید المرسلین ﷺ کے قائلین کو بھی شرک میں مبتلاء ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ سماع فی الجملہ حق ہے اور خوارج کی طرح وہ آیات ’’نداء لغیر اللہ‘‘ (من البعید) کو سماع موتی کی نفی کے لئے بے محل وبے موقع استعمال کرتے ہیں۔ اسی اثناء میں طلب شفاعت للمغفرۃ بعد الموت کو وہ نداء غیر اللہ کے ماتحت داخل کرتے ہیں۔ (جو قطعاً غلط ہے اور حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے اقوال اس کے رَد کے لئے کافی ہیں۔ صفدر) ضرورت تھی کہ کوئی جلیل القدر شخصیت جس کا علم وعمل دیانت وتقویٰ علماء کرام میں مسلّم ہو، اور اس کی سعی بلیغ سے اس فتنہ کی سرکوبی یا مدافعت کے لئے کوئی کتاب مستطاب لاجواب تحریر ہو جائے۔

چنانچہ مولانا الحاج محمد سرفراز صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث نے نہایت دیانت وامانت سے ’’سماع الموتی‘‘ (فی الجملہ) تحریر کی جو نہایت مبرہن ومدلّل ہے۔ حوالہ جات اور ادلّہ کاملہ کے ذخائر سے بھرپور ہے طلبہ وعلماء کے لئے ایک بہترین علمی تحفہ ہے۔ تفاسیر اور احادیث وآیات کا بیان اہل السنت والجماعت کی معتبرات سے منقول ہے۔ بقول حضرت مجدد (اَلف ثانی رحمہ اللہ) قرآن واحادیث کا مطلب وہی معتبر ہے جو علماءِ اہل السنت کرام سے منقول ہے۔ اس کتاب میں اسلاف اُمت کی تحریرات ومعتبرات کو مدِ نظر رکھ کر مسائل کی وضاحت کی گئی ہے اور گمراہ فرقوں کو مُسکت (خاموش) کرنے کے لئے تو پیغمبر کی تعلیم بھی مجت نہیں ہوتی مگر صاحب انابت کے لئے وہ راہِ ہدایت ہے۔ خداوند کریم مولانا موصوف کے لئے یہ تحریر مایۂ ثواب آخرت بنانے اور ہمیں بھی صراطِ مستقیم اور راہِ ہدایت پر قائم رہنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین ثم آمین!

ناکارۂ خلائق حفیظ الرحمن محمد نذیر اللہ خان (فاضل دیوبند)
خطیب جامع مسجد مدرسہ حیات النبی گجرات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ بِیَدِہٖ الْحَیٰوۃُ وَالْمَوْتُ وَالنُّشُوْرُ وَالَّذِیْ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ شَرَعَ السَّلَامَ عَلَی الْاَحْیَاءِ وَعَلٰی مَنْ دُفِنَ فِی الْقُبُوْرِ وَعَلٰی مَنْ تَبِعَہٗ مِنَ الصَّحَابَۃِ وَالتَّابِعِیْنَ وَمَنْ م بَعْدَھُمْ اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ وَالنُّشُوْرِ اَمَّا بَعْدُ!

سبب تالیف

اس پرفتن اور پرآشوب دور میں جس میں مادّی قوتوں نے لوگوں کے اذہان وافکار کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی ہے اور ہر آدمی مادّی ترقی ہی کا خواہاں اور دلدادہ ہے، ایک مسلمان کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ بنیادی عقائد اور اُصولِ دین پر سختی سے کار بند ہو اور ان پر عمل پیرا ہو کر اپنی قبر اور آخرت کو سنوار سکے۔ اس نازک دور میں باریک اور دقیق علمی و تحقیقی موشگافیوں اور فروعی مسائل کو چھیڑنا کسی بھی طرح مستحسن نہیں ہے مگر بعض مجبوریاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ اگر فروعی مسائل میں بھی راجح اور حق پہلو کو عوام کے سامنے نہ پیش کیا جائے تو وہ غلط ڈگر پر چل نکلتے ہیں اور راجح و حق پہلو پر عمل کرنے والوں۔ کیا حضراتِ سلف اور خلف رحمہم اللہ سب کو بنظرِ حقارت دیکھنے لگتے ہیں اور ایسے غلط کار لوگ اپنی غیر معصوم رائے کو حرفِ آخر سمجھ لیتے ہیں اور اس کی نشر و اشاعت کچھ ایسے انداز سے کرتے ہیں کہ عوام حضرات سلف و خلف رحمہم اللہ سے بدظن اور بے زار ہو جاتے ہیں اور ان غلط کار لوگوں کی رائے کو (جس کو یہ لوگ عوام پر اپنی لسانی قوت اور قلم کے زور سے بزور ٹھونسنے کی ناکام سعی اور لاحاصل کوشش کرتے ہیں) اسلامی مسائل کی تحقیق کا خلاصہ اور بزعمِ خویش توحید کا نچوڑ سمجھنے لگتے ہیں۔ چونکہ عوام اصل حقیقت سے واقف نہیں ہوتے وہ اکثر نقل کو اصل اور پوست کو مغز سمجھ لیتے ہیں اور اسی پر دِل میں گرہ لگا کر مخالفین کو کوستے ہیں بلکہ لٹھ لئے ان کے پیچھے پھرتے ہیں۔ ناچار حضرات سلف و خلف رحمہم اللہ اور اکابر کا دامن تھامنے والوں کو بھی کچھ کہنا ہی پڑتا ہے اور دفاع کے بغیر عالمِ اسباب میں اور چارہ ہی کیا ہے؟ مشہور تو یہی ہے کہ تنگ آمد بجنگ آمد۔

کچھ سالوں سے چند مسائل میں سے عدمِ سماعِ موتی۔ قبر میں جسم کی طرف عدم اعادۂ رُوح آنحضرت ﷺ کا عند القبر صلوٰۃ وسلام کا عدم سماع، عدمِ عرضِ اعمال اور توسّل کا شرک ہونا وغیرہ مسائل جمہور اہل اسلام اور اکابر سے کٹ اور ہٹ جانے والے حضرات کے نزدیک سر فہرست ہیں اور ان پر بحث و مباحثہ کا بازار گرام رہتا ہے اور تقریراً و تحریراً ان مسائل کی ترویج و اشاعت کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور مستقل کتابیں اور رسالے ان مسائل پر طلک کے طول وعرض میں الگ شائع کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ کے ایک مہربان (ملک محمد فیروز فاروقی ایم ایس سی) نے حیاتُ النبی ﷺ، عرض اعمال اور عدمِ سماعِ موتی کے مسئلہ کو اپنی تحقیق انیق کا تختۂ مشق بنایا ہے اور سستی شہرت حاصل کرنے کی خاطر وفات النبی ﷺ کے عنوان سے ایک کتابچہ بھی لکھا ہے جس کو اسلامک ریسرچ مشن جھنگ (پاکستان) نے شائع کیا ہے۔ اس کتابچہ میں حوالوں کے نقل کرنے میں جو خیانت اور قطع و برید کی گئی ہے۔ راقم اثیم نے اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں ایسے مختصر کتابچہ میں اس کی مثال اور کہیں نہیں دیکھی اور اس میں سراور دُم برید حوالوں سے جو اپنی پسند کے معانی اور مطالب کشید کئے گئے ہیں، وہ اہل علم کے دیکھنے کے قابل ہیں۔ اس کتابچہ میں عدمِ سماعِ موتی کے دعوٰی کے اثبات میں بعض نامکمل اور ادھورے مگر مفید مطلب حوالے نقل کر کے مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ:

یہی مسلک امام مسلم، بیہقی، سفارینی، قاضی ابو یعلیٰ موصلی، فخر الدین رازی، بدر الدین عینی، ابن الہمام، طحاوی، ولی اللہ محدث دہلوی، قاضی خان، شاہ عبد العزیز، شاہ عبد القادر محدث دہلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی، بشیر الدین قنوجی اور خرم علی وغیرہم (رحمہم اللہ) سے منقول ہے۔ (ملخصہ وفات النبی ص ۴۹)

ان حضرات میں سے ایک دو بزرگوں کی اپنی کتابیں تو میسر نہیں ہو سکیں، لہٰذا ہم قطعیت کے ساتھ ان کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ''سماع موتیٰ'' کے بارے میں ان کا صحیح مسلک اور موقف کیا ہے؟ لیکن بقیہ حضرات کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ وہ ''عدمِ سماعِ موتیٰ'' کے قائل تھے اور ان کا یہی مسلک تھا، سفید جھوٹ، صریح بہتان اور خالص افتراء سے ہے۔ آپ اسی پیشِ نظر کتاب میں بخوبی ملاحظہ فرمالیں گے کہ ان حضرات کا مسلک کیا تھا؟ اور کیا ہے؟ پہلے تو صرف سنا ہی کرتے تھے مگر اَب تو مشاہدۃً دیکھ بھی لیا کہ ؂

چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد

پھر ان اکابر علماء کی عظمت اور قدر اور ان کی آراء اور اقوال کی وُقعت بھی خود اس مؤلف کے قلم سے ملاحظہ کر لیجئے۔ وہ لفظ ''منقول ہے'' کے حاشیہ میں اسی صفحہ میں لکھتے ہیں کہ ان علماء کے نام صرف اس لئے درج کئے گئے ہیں کہ انہوں نے قرآنی مسلک (نہیں بلکہ بزعم مؤلف ان کے اپنے مسلک۔ صفدرؔ) کی تائید وحمایت کی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی ہر بات تسلیم کرنا ہوگی۔ اگر یہ لوگ قرآنی فیصلہ (بالفاظِ دیگر مؤلف کے مسلک۔ صفدرؔ) کے خلاف لکھتے تو ان کے اقوال کو رَدّی کی ٹوکری میں ڈال دیا جاتا۔ (حاشیہ ص ۴۹)

غور فرمائیں کہ ان لوگوں کے نزدیک حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ اور علماء ربانیین کے اقوال کی کیا قدر باقی رہ جاتی ہے؟ ان لوگوں کے نزدیک تو بس یہ طے شدہ بات ہے کہ اکابر علماءِ اُمت اور فقہاءِ ملت کی جو بات ان کی ناقص سمجھ میں نہ آئے یا نفسِ اَمّارہ اس کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو تو فوراً اس کو ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ!

یہی مؤلف عرضِ اعمال کے مسئلہ کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''عرضِ اعمال کا عقیدہ اہلِ تشیع کے ہاں پایا جاتا ہے۔ صوفیوں اور باطنی اماموں کی نوازش ہے کہ اہل سنت کی کتب میں بھی اسے درج کر دیا اور جعلی حدیثیں بناڈالیں۔ حتیٰ کہ اہلِ سنت اسے اپنا عقیدہ تسلیم کرنے لگے۔'' (حاشیہ ص ۸۵)

صد افسوس ہے کہ اسلامی مسائل کا بے دردی سے پوسٹ مارٹم کرنے والوں کو اتنا صاف فرق اور واضح تمیز بھی معلوم نہیں کہ اہل سنت کا عرضِ اعمال کے بارے میں مسلک اور ہے اور اہل تشیع کا عقیدہ اور ہے۔ اہل سنت صرف اجمالی طور پر بعض بعض اعمال کے عرض کے قائل ہیں اور اہلِ تشیع تفصیلی طور پر تمام اعمال کے عرض ہونے کے معتقد ہیں۔ گویا اسلامی مسائل پر ریسرچ کرنے والے ان لوگوں کے نزدیک کل اور بعض اور اجمال وتفصیل کا کوئی فرق ہی نہیں ہے اور پھر حد کر دی کہ صوفیوں اور باطنی اماموں کو دیمک کے کیڑے بنا کر اور قلم و دوات ہاتھ میں پکڑا کر خفیہ طریقہ سے نظر بچا کر اہل سنت کی کتابوں میں گھسیڑ دیا اور وہ برق رفتاری سے عرضِ اعمال کا عقیدہ اہل سنت کی کتابوں میں ملتے جُلتے خط سے داخل کر آئے اور غضب یہ ہے کہ ان کی اس چابک دستی سے نہ تو مسند احمدؒ، مسند بزار

ل امام احمد رحمہ اللہ (المتوفی ۲۴۱ھ)، امام طیالسی رحمہ اللہ (المتوفی ۲۰۴ھ)، امام بزار رحمہ اللہ (المتوفی ۲۹۲ھ) یہ سب حضرات چوتھی صدی سے قبل کے ہیں۔

اور ابوداوُد طیالسی وغیرہ حدیث کی مستند کتابیں بچ سکیں اور نہ دیگر وہ متداول اور معتبر کتابیں جن میں اہل سنت کے مسلک کے مطابق عرض اعمال کا عقیدہ درج ہے اور یہ صوفی اور باطنی امام ان کتابوں میں ایسے گھسے کہ جعلی روایتیں بنا کر ان میں گھسیڑ آئے اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی اور حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ جو تحقیق اور نقد وجرح کے میدان میں بال کی کھال اُتارنے کے عادی ہیں۔ نیند غفلت میں کچھ ایسے مدہوش ہوئے کہ ان کو کروٹ اور پہلو بدلنے کی سرے سے توفیق ہی نہ ہوئی کہ وہ ان صوفیوں اور باطنی اماموں کو اس دسیسہ کاری اور جعل سازی سے روکتے اور حیرت ہے کہ ان صوفیوں اور باطنی اماموں نے اہل سنت پر کچھ ایسا جادُو کیا اور افسُوں پھونکا کہ وہ بلا چون و چرا عرض اعمال کو اپنا عقیدہ بنا بیٹھے۔ سُبْحَانَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ!

اس کتابچہ کا تعارف کرانے والے بزرگ (جناب قاری عبدالحمید فاروقی اے ای ای) نے اپنے مقدمہ میں یہ لکھ کر اس کتابچہ کو مزید چار چاند لگائے کہ: ’’تحقیق یہ ہے (سبحان اللہ تعالیٰ۔ صفدرؔ) کہ چوتھی صدی ہجری میں صوفیاء اور روایات وضع کرنے والے احبار و رہبان عجمی و سبائی عناصر نے شریعت اسلامی میں بگاڑ پیدا کرنے کی غرض سے اس قسم کی روایات بیان کیں جن میں کہا گیا کہ قبر میں رُوح واپس بھیجی جاتی ہے اور مُردہ اس قبر میں لوگوں کے سلام سنتا اور جواب بھی دیتا ہے۔ خوابوں، مکاشفوں اور تصوف و باطنیت کی حکایتوں کے ذریعہ اس مسلک کو مدلل کیا گیا۔‘‘ (بلفظہٖ ص ۱۰)

جمہور اہل اسلام کا مسلک یہ ہے کہ قبر میں دفن ہو چکنے کے بعد میت کی طرف رُوح لوٹائی جاتی ہے لیکن اس مسلک کی بنیاد خوابوں، مکاشفوں اور تصوف و باطنیت کی حکایتوں پر نہیں بلکہ صحیح، مشہور اور مستفیض حدیث پر ہے جس کی بقدر ضرورت بحث بحمد اللہ تعالیٰ ہم نے اپنی کتاب ’’تسکین الصدور‘‘ میں کر دی ہے اور قبر میں مُردے کا سلام سننا اور اس کا جواب دینا، اسی پیش نظر کتاب میں صحیح روایات کے ساتھ ان شاء اللہ تعالیٰ بیان کر دیا گیا ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ جس طرح ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے یا جس طرح بھینگے آدمی کو زاویہ نگاہ ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے کوئی چیز اپنی اصلی شکل پر نظر نہیں آتی، اسی طرح ان رُوحانی بھینگوں کا حال ہے کہ ان کو صحیح احادیث عجمی اور سبائی عناصر کی سازش نظر آتی ہے اور جمہور علماء ملت اور فقہائے اسلام (جن کی برگزیدہ ہستیوں پر ہمیشہ سے اہل اسلام اعتماد اور فخر کرتے چلے آئے ہیں) کے اقوال ان کی رَدّی کی ٹوکری میں ڈالنے کے قابل نظر آتے ہیں اور یہ لوگ حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ کے اقوال کو کرید کرید کر اعلانیہ ان پر بے اعتمادی کا اظہار کرتے ہیں اور بعض بزرگان دین رحمہم اللہ کے اقوال کو تو خصوصاً اقوال بزرگان کی پوسٹ مارٹم کرنے والوں نے ہدف تنقید بنایا ہے۔ جیسا کہ اسی کتاب سے بعض ایسی چیزیں ان شاء اللہ تعالیٰ! بالکل عیاں ہوں گی اور جمہور کے اقوال پر برسنے کے لئے ان لوگوں نے ایک ایسا محاذ بنا رکھا ہے جس کی حقیقت بقول علامہ اقبال رحمہ اللہ صرف یہ ہے کہ ؎

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دُزدے چند　　بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند!

ان نظریات کے حامل جملہ حضرات کے طرز استدلال میں قارئین کرام کو یہ بات بخوبی نظر آئے گی کہ یہ حضرات مجمل اور مُبہم عبارات کو تو لے لیتے ہیں لیکن ان کتابوں میں مصرح اور واضح عبارات کا نام تک نہیں لیتے یعنی عمداً لوگوں کو دھوکا دینے اور مغالطہ میں ڈالنے کے درپے ہیں۔ فواأسفا!

(۲) کراچی سے چند اُوراق کا ایک اور کتابچہ طبع ہوا ہے جس کا نام ''یہ قبریں، یہ آستانے'' ہے جس کا اندازِ بیان، دلائل کی ترتیب اور مفید مطلب حوالے اور پھر ان سے نتیجہ اخذ کرنا ''شفاء الصدور'' اور ''ندائے حق'' (جن کا ذکر خیر آگے آرہا ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ) وغیرہ سے چنداں متفاوت نہیں اور ایسا لگتا ہے کہ یہی کتابیں سامنے رکھ کر سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے اس کو مرتب کیا گیا ہے۔ یہ کتابچہ جناب کیپٹن ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی ایم بی بی ایس (اور بقولِ خود) فاضل علوم دینیہ اور امیر حزب اللہ نے تالیف فرما کر اُمتِ مرحومہ ومظلومہ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ یہ کتابچہ ۱۹۷۲ء میں مکہ مکرمہ میں ''المسجد الحرام'' کے اندر بھی مفت تقسیم ہوتا رہا ہے۔ اس میں بھی عدم سماعِ موتی، عرضِ اعمال اور آنحضرت ﷺ پر صلوٰۃ وسلام کے نہ پیش ہونے پر خاصا زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ (ص ۲۱) میں لکھا ہے کہ: ''سماعِ موتی کا عقیدہ تو شرک کی جڑ ہے۔'' (بلفظہٖ) اور پھر آگے (ص ۱۳) میں ''لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' اور مضمون کی بعض دیگر آیات سے اپنے رنگ میں استدلال کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ: ''پس ثابت ہوا کہ قبر کے باسی دُنیاوی زندگی سے بالکل عاری ہیں۔ وہ نہ تو دنیا والوں کی پکار سنتے ہیں کہ جواب دیں اور نہ ان میں یہی طاقت ہے کہ دُعائیں کر اللہ تک پہنچانے کا وسیلہ بنیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ کا متفقہ فیصلہ یہی ہے۔ اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔'' (بلفظہٖ) افسوس حیرت اور صدمہ ہوتا ہے ان لوگوں کی اس جسارت اور بے باکی پر کہ وہ ایک اختلافی مسئلہ کا تذکرہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ ایک سیدھا سادھا مسلمان ان کی ایسی مغالطہ آفریں عبارات سے دھوکا کھا سکتا ہے اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوسکتا ہے کہ شاید شرعی حکم ہی یہی ہے۔ حالانکہ اس کو حقیقت سے دُور تک کا واسطہ نہیں اور یہ غلط نظریہ ان لوگوں کا نرا تعصب اور خالص غلو ہے۔ (حضرات ائمہ کرام رحمہم اللہ میں سے کسی کا یہ فیصلہ نہیں۔ چہ جائیکہ اُن کا متفقہ فیصلہ ہی یہ ہو) یہ ایک خالص بے بنیاد دعویٰ ہے۔

(۳) راقم اثیم نے ابھی کتاب ''تسکین الصّدور'' نہیں لکھی تھی کہ سرگودھا سے ایک دوست نے ایک کتاب تحفۃً راقم کو بھیجی جس کا نام ''شفاء الصدور'' ہے اس میں موضوعِ بحث عدمِ سماعِ موتی ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے اور انہی کے رفیق اور ہم ذہن ومہتمم مدرسہ نے (جواَب دُنیا سے رخصت ہو چکے ہیں) ساتھ ساتھ مفید مطلب اور آزاد ترجمہ بھی اُردو میں اپنی سمجھ کے مطابق کر دیا ہے اور اس مسئلہ کے سلسلہ میں دونوں دوستوں کا ذہن ایک سا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سب کا لُبِّ لباب صرف یہ ہے کہ مُردے نہیں سنتے اور اس دعویٰ کے اثبات پر انہوں نے بہت سی بالکل غیر متعلق آیات اور احادیث سے استدلال بھی کیا ہے جن سے ان کا یہ مدعا ہرگز کسی صورت میں ثابت نہیں ہوتا اور کسی اہلِ علم بلکہ کسی بھی عقلمند کو ان سے ذرّہ بھر شبہ نہیں ہوسکتا۔ چہ جائیکہ وہ عدمِ سماعِ موتی پر ان کو قطعی حجت سمجھے۔ ہاں! البتہ ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی (الآیۃ) اور وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ (الآیۃ)'' وغیرہا آیات سے نیز بعض اکابر کی کچھ عبارات سے ضرور کچھ شبہ ہوسکتا ہے اور انہی کی وضاحت ہم نے اس کتاب میں کر دی ہے اور ''تسکین الصدور'' میں اس کا وعدہ بھی ہم نے کیا تھا۔ سرِ دست ہم انہی دلائل اور اسی ترتیب پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اگر کسی صاحب نے قلم اُٹھایا اور ضرورت ہوئی تو ان شاء اللہ تعالیٰ طبع دوم میں مزید وضاحت کر دی جائے گی۔ مؤلف مذکور نے غیر متعلق عبارات سے اس مسئلہ کو ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ پھر غضب کی بات یہ ہے کہ جو حضرات اس مسئلہ میں ان کے ہم نوا نہیں بلکہ بالکل ان کے برخلاف ہیں اپنے

ناخواندہ حواریوں کو وہ بزرگ بھی انہوں نے اپنے گرد کھائے اور بلاخوف تردید بڑی بے باکی سے ان کے نام بھی منکرینِ سماعِ موتی میں درج کر دیئے ہیں جو حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ جیسا کہ اسی پیشِ نظر کتاب سے ان شاء اللہ تعالیٰ! یہ بات بالکل عیاں ہو جائے گی اور یہی طریقہ ان کا ''ندائے حق'' میں ہے جو انہوں نے بزعمِ خویش راقم کی کتاب ''تسکین الصدور'' کے جواب میں لکھی ہے۔ لیکن بحمد اللہ تعالیٰ و منہ! وہ ''تسکین الصدور'' کے وزنی اور ٹھوس دلائل کا جواب دینے سے قطعاً قاصر اور یقیناً عاجز رہے ہیں۔ ہاں! غیر متعلق باتوں کا تذکرہ کر کے کتاب کا حجم بڑھا کر اپنے ناخواندہ حواریوں کو ضرور یہ باور کرایا ہے کہ یہ اس کا جواب ہے۔ اس میں جو جو باتیں اپنی دانست کے مطابق ہم نے شبہ پیدا کرنے والی سمجھی ہیں، ان میں سے بعض کا جواب اسی پیشِ نظر کتاب اور بعض کا ''تسکین الصدور'' طبع دوم میں دے دیا ہے۔ باقی ہرواہی اور لچر بات کا جواب دینا ہم علمی اور تحقیقی سطح سے بہت فروتر سمجھتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس میدان میں بھی ان کا حریف کوئی شہسوار کبھی نکل آئے۔ کیونکہ لِكُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ اور ہم بلا تامّل یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی بھی علم دوست اور سمجھدار آدمی جمہور کے خلاف پیش کردہ ان کے وساوس واوہام یا محض قیاسات اور منطقیانہ ومغویانہ مغالطات سے ہرگز دھوکا نہیں کھائے گا۔ ضد اور تعصب کا معاملہ ہی الگ ہے۔ اس کا اس دُنیا میں کسی کے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ انتہائی حیرت ہے کہ ایک اختلافی مسئلہ کے سلسلہ میں جو لب ولہجہ اور طرزِ گفتگو اُنہوں نے اختیار کی ہے بلکہ توسّل عند القبر اور آنحضرت ﷺ کی قبرِ مبارک کے پاس حاضر ہو کر آپ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں طلبِ مغفرت کی سفارش کے جواز کے قائلین اور سماعِ موتی کے مقرین کو جس انداز سے انہوں نے مخاطب کیا اور کوسا ہے اور جس طرح جمہور کا مذاق اُڑایا ہے اور جس طرح بلند پایہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کو کھلے لفظوں میں کوسا اور ان پر بے اعتمادی کا اظہار کیا ہے اور جس طرح مشہور اور متداول کُتبِ فقہ اور فتاویٰ کو ہدفِ تنقید بنایا ہے، وہ صرف انہی کا حصہ ہو سکتا ہے اور یہ سب کچھ ان کا اور اس سلسلہ میں ان کے رہبر جناب مولانا سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری گجراتی کا اندازِ گفتگو اور سبق ہے۔ زیادہ تفصیل میں جانا تو ہم مناسب نہیں سمجھتے۔ چند عبارات انہی کے الفاظ میں ہدیۂ قارئین کرام کیے دیتے ہیں تاکہ آپ بھی نمونہ از خروارے ملاحظہ کر لیں۔

حافظ ابن الہمام الحنفی رحمہ اللہ پر بے اعتمادی

حافظ ابن الہمام الحنفی رحمہ اللہ نے فی الجملہ سماعِ موتی کا اقرار کیا ہے کہ مُردے قرعِ نعال اور سلام سنتے ہیں (حوالہ اپنے مقام پر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ) مگر ان کی تحقیق سے برہم ہو کر مؤلف ''شفاء الصدور'' لکھتے ہیں: ''اگر کہا جائے کہ امام ابن الہمام رحمہ اللہ کا قول فتح القدیر میں ایسا ہے جس سے سماعِ موتی سمجھ آتا ہے صاحب بحر الرائق نے لکھا ہے کہ محقق ابن ہمام رحمہ اللہ صاحبِ ترجیح ہیں۔ (یعنی فقہ کے متعارض اقوال کو ایک دُوسرے پر ترجیح دینے کے اہل ہیں جو اَربابِ فقہ میں ایک بلند مقام ہے۔ صفدرؔ) دراصل بات یہ ہے کہ ان کے قول کی اتباع تب تک ہے جب تک مذہب کے خلاف نہ ہو۔ خلافِ مذہب ہونے کی صورت میں ان کا قول معتبر نہ ہوگا۔ خود ان کے تلمیذ قاسم رحمہ اللہ نے یہ بات کہی ہے۔ مسئلہ مذکورہ میں چونکہ مذہب کے خلاف لکھا ہے، لہٰذا یہ قول معتبر نہ سمجھا جائے گا۔'' (بلفظہٖ ص ۶۸)

نہ معلوم مؤلف مذکور کی مذہب سے کیا مُراد ہے؟ اگر حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یا حضرات جمہور کا مذہب مراد ہے تو ظاہر اَمر ہے کہ امام ابن الہمام رحمہ اللہ نے نہ تو ان کی مخالفت کی ہے اور نہ عدم سماع ان کا مذہب ومسلک ہے۔ اس کی تفصیل اسی کتاب میں آگے آرہی ہے۔ ان شاء اللہ العزیز!

اور اگر مذہب سے مؤلف مذکور ان کے ہمنواء چند بزرگوں کا اپنا مذہب مراد ہے تو بلا شبہ امام ابن الہمام رحمہ اللہ اس کے مخالف ہیں مگر جمہور کے نزدیک ان کا قول اس معاملہ میں صرف معتبر ہی نہیں بلکہ حجت بھی ہے۔ کیونکہ یہ ایک محقق کا قول ہے اور پھر یہ احادیث صحیحہ کے بالکل مطابق اور حضرات جمہور رحمہم اللہ کے نظریہ کے عین موافق ہے۔ باقی جو بات علامہ قاسم بن قطلوبغا الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۷۹ھ) نے فرمائی ہے تو وہ مؤلف مذکور نے سمجھی ہی نہیں۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ میرے اُستاد محترم کے تفردات مقبول نہیں ہیں۔ (تفردات شیخی غیر مقبولۃ هدیۃ المجتنیٰ ص ۲۴) اور یہ سماع موتی کا مسئلہ ان کے تفردات میں شامل نہیں ہے بلکہ اس میں علاوہ صحیح احادیث کے اُمت کی اکثریت اور حضرات فقہاء کرام کا جم غفیر ان کے ساتھ اور ان کا ہم نواہ ہے۔ لہٰذا حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ جیسے صاحب ترجیح کی بات کو بلا وجہ ترک نہیں کیا جاسکتا اور نہ اُن کے مبنی بر دلائل قول کو غیر معتبر قرار دے کر رَد کیا جاسکتا ہے۔ ہاں! اگر کسی نے مؤلف مذکور کی طرح سبق ہی یہ پڑھا ہو کہ مَیں نہ مانوں تو اس کا معاملہ ہی جدا ہے۔

(۲) مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ: ''یہ سننے اور کلام کرنے کی بات اکثر سبکی، سیوطی، زرقانی، یافعی، محب الدین طبری، نووی، قاضی عیاض رحمہم اللہ وغیرہ کی ہیں جن میں سے کوئی بھی حنفی مسلک کا نہیں۔'' (بلفظہٖ شفاء الصدور ص ۹۶)

اس عبارت سے یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت احناف رحمہم اللہ میں سے کوئی اس کا قائل ہوتا تو مؤلف مذکور ضرور اس کو تسلیم کر لیتے۔ کیونکہ وہ بزعم خویش حنفی مسلک کے مدعی ہیں، مگر ان کی شومئ قسمت کہ یہ کہنے والے بھی بزرگ شافعی اور مالکی ہیں۔ اس لئے ان کا مسلک اختیار کرنے سے معذوری ہے۔ لیکن ان شاء اللہ تعالیٰ بحث آگے آرہی ہے کہ حضرات احناف رحمہم اللہ کا جم غفیر بھی سماع موتی کا قائل ہے۔ حضرات مالکیہ اور شافعیہ ہی اس کے قائل نہیں ہیں۔ پھر تأسف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے حضرات احناف رحمہم اللہ کی بات بھی تو تسلیم نہیں کی۔ (۱) اَوّلاً: ابھی اُوپر حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ کا رَد ان کی تحریر سے گزر چکا ہے۔ وثانیاً: ''شفاء الصدور'' کے اسی صفحہ میں حضرت مُلّا علی القاری رحمہ اللہ اور علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ کا حوالہ دے کر اور نام لے کر انہوں نے ایک فقہی مسئلہ بیان کیا ہے کہ زائر قبر مبارک کے پاؤں کی طرف سے آئے اور سر کی طرف سے نہ آئے تاکہ دیکھنے والے کو دقت نہ ہو۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''تو یہ اَقوال حجت نہیں ہیں اور نہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ سے اس پر کوئی دلیل ہے۔''

''فقد دَسّہ الخصوم فی کتبھم الاتری انھم صَرّحوا بعدم سماع الاموات'' (شفاء الصدور ص ۹۶)

ترجمہ: ''بلا شبہ یہ بات ان کی کتابوں میں ان کے مخالفوں نے گھسیڑ دی ہے کیا تُو نہیں دیکھتا کہ انہوں نے عدم سماع موتی کی تصریح کی ہے۔''

اس کا نام ہے تحقیق وتدقیق کہ جو بات ان کے ذہن مبارک میں نہ آسکے یا ان کی ایجاد یا اختیار کردہ رائے کے موافق نہ ہو تو اس کو فوراً دشمن اور مخالف معتبر اور متداول کتابوں میں کمال ہوشیاری اور چالاکی سے گھسیڑ آتے ہیں۔ محترم! یہ دونوں بزرگ حنفی ہیں۔ ان کی بات تو مان لی ہوتی یا ان کی بیان کردہ بات کا کوئی فقہی اور علمی

محمل یا کوئی مناسب توجیہ و تاویل بیان کی ہوتی۔ یہ یاد رہے کہ یہ دونوں بزرگ عدم سماع کے نہیں بلکہ شد و مد کے ساتھ سماع موتی کے قائل ہیں۔ اسی کتاب میں ان کے حوالے آرہے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ! محترم جب آپ نے کسی کی بات ہی تسلیم نہیں کرنی تو حنفی اور غیر حنفی کا سوال پیدا کرنے کا کیا مطلب؟

لطیفہ

بقول مؤلف مذکور یہ "الخصوم" اور مخالف بڑے ہی ہوشیار اور چابکدست ثابت ہوئے ہیں۔ حضرات احناف رحمہم اللہ کی کتابیں تو ان کی دست برد سے کیا محفوظ رہتیں، یہ تو حنبلیوں کی کتابوں میں بھی دسیسہ کاری سے باز نہیں آتے۔ یہی بات انہوں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ، الحنبلی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۲۸ھ) کے مشہور فتاویٰ اور شیخ بدرالدین البعلی الحنبلی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۷۷ھ) کے مختصر الفتاویٰ المصریہ میں بھی گھسیڑ دی ہے۔ پھر ان سے کوئی بچے تو کیونکر؟ اور اپنی کتابوں کو ان سے محفوظ رکھے تو کیسے؟ رہے نام اللہ تعالیٰ کا۔ یہ الخصوم تو سی، آئی، اے سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ کیونکہ یہ محفوظ الماریوں کے اندر بند کتابوں میں خوش نویسوں کے قلم لے کر داخل ہو جاتے ہیں اور اَصل کتاب جیسی خوش خط عبارتیں زیب قرطاس کر آتے ہیں اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی اَور وہ ایسے شاطر ہیں کہ حک و اضافہ کا وہم اور نشان بھی کتابوں میں نہیں رہنے دیتے کہ کسی کو حذف و اضافہ ہی کا شُبہ پڑے۔

چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "واستفاضت الآثار بمعرفة الميت اهله و باحوال اهله واصحابه في الدنيا و ان ذلك يعرض عليه وجاءت الآثار بانه يرى ايضا و بانه يدرى بما يفعل عنده فَيُسَرُّ بما كان حسنا و يتألم بمان كانا قبيحا" (فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ج ۴ ص ۲۴۶، ۷ ۴۴)

ترجمہ: "مشہور اور مستفیض احادیث سے یہ ثابت ہے کہ مُردہ اپنے اہل و عیال اور دوستوں کے احوال کو جانتا ہے جو ان کو دنیا میں پیش آتے ہیں اور یہ حالات اس پر پیش کئے جاتے ہیں اور احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ دیکھتا بھی ہے اور جو کچھ اس کے پاس کیا جاتا ہے، اس کو جانتا بھی ہے۔ اگر وہ کارروائی اچھی ہو تو اس سے وہ خوش ہوتا ہے اور اگر وہ بُری ہو تو اس کو اس سے رنج پہنچتا ہے۔"

اور شیخ بدر الدین بعلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "وقد استفاضت الاخبار بمعرفة الميت بحال اهله واصحابه في الدنيا و ان ذلك يعرض عليه و انه يز و يدرى بما يفعل عندهٗ و يَسُرُّ بما كان حسنا و يتألم بما كان قبيحا و روى ان عائشة رضی اللہ عنہا بعد ان دفن عمر رضی اللہ عنہ كانت تستر و تقول كان ابى و زوجى فاما عمر فاجنبى تعنى انه يزها" (مختصر الفتاویٰ المصریہ ص ۱۹۰)

ترجمہ: "اپنے اہل و عیال اور دوستوں کے حالات کو جانتا ہے۔ کیونکہ ان کے اعمال اس پر پیش کئے جاتے ہیں اور جو کارروائی اس کے پاس کی جاتی ہے، مُردہ اس کو دیکھتا اور جانتا ہے۔ اچھی کارروائی سے اس کو خوشی اور بُری کارروائی سے اسے تکلیف ہوتی ہے۔ روایت کی گئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دفن کئے جانے کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پردہ کر کے اندر جاتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ پہلے تو میرے والد اور خاوند تھے اور بہرحال حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو اَجنبی ہیں۔ ان کی مُراد یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو دیکھتے ہیں۔

حنفیوں کی کتابوں میں تو یہ "الخصوم" صرف یہی داخل کر سکے کہ میت دیکھتی ہے مگر تعجب ہے کہ حنبلیوں کے ان معتبر فتاووں میں انہوں نے اس کے ثبوت میں حضرت عائشہ صدیقہ ﷞ کی روایت بھی داخل کر دی ہے۔ اب کوئی کرے تو کیا کرے؟ اور ان دسیسہ کاروں سے بھاگ کر جائے تو کہاں جائے؟ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

علماءِ نجد

موجودہ زمانے کے نجدی علماء جو اکثر رسومات بدعیہ پر بھی بلا جھجک شرک کا اطلاق کرنے سے نہیں چوکتے۔ اس بات کو وہ بھی صاف طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ: "و معرفة المیت زائرہ لیس مختصا بہ ﷺ"

(الدرر السنیہ فی الاجوبۃ النجدیۃ ج ۱ ص ۱۶۶)

ترجمہ: "میت کا اپنے زیارت کنندہ کو پہچاننا صرف آنحضرت ﷺ ہی سے مختص نہیں ہے، (بلکہ ہر میت اپنے زائر کو پہچانتی ہے)

حضرت عائشہ ﷞ کی جس روایت کی طرف اس عبارت میں اشارہ کیا گیا ہے، وہ یوں ہے: "عن عائشة ﷞ قالت کنت ادخل بیتی الذی فیہ رسول اللہ ﷺ و انی واضع ثیابی و اقول انما ھو زوجی و ابی فلما دفن عمر ﷜ معھم فو اللہ ما دخلتہ إلّا و انا مشدودة علیّ ثیابی حیاءً من عمر ﷜" (رواہ احمد فی مسندہ ج ۶ ص ۲۰۲، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۵۴، وقال الھیثمی ﷫ رواہ احمد ﷫ و رجالہ رجال الصحیح، مجمع الزوائد ج ۹ ص ۳۷)

ترجمہ: "حضرت عائشہ ﷞ فرماتی ہیں کہ میرے جس گھر میں آنحضرت ﷺ اور میرے والد مدفون تھے، میں کپڑوں کا خاص اہتمام کئے بغیر ہی اس میں داخل ہو جاتی تھی کہ میرے والد اور خاوند ہیں اور جب ان کے ساتھ حضرت عمر ﷜ بھی دفن کئے گئے تو بخدا میں حضرت عمر ﷜ سے حیا کرتے ہوئے کپڑے اوڑھ کر (اور خوب اہتمام کر کے) وہاں جاتی تھی۔ امام احمد ﷫ نے مسند میں یہ روایت درج کی ہے اور امام ہیثمی ﷫ فرماتے ہیں کہ اس کے سب راوی بخاری کے راوی ہیں۔"

مؤلف مذکور جو تفسیر اور توجیہ اس صحیح روایت کی کرتے یا کر سکتے ہیں، وہی توجیہ حضرات فقہاء احناف ﷭ وغیرہم کی ایسی عبارات کی کر دیں۔ ہمارا اس پر صاد ہے مگر خدارا حضرات فقہاء احناف ﷭ کی گراں مایہ بلند پایہ کتابوں کو الخصوم اور دشمنوں سے تو بچائیں۔ اگر ہماری توجیہ پسند آئے تو اس کو قبول کر لیں۔ وہ یہ کہ ان عبارات میں رؤیت سے رؤیت بصری مراد نہیں ہے بلکہ رؤیت قلبی مراد ہے جس کو علم بھی کہتے ہیں۔

(صراح ص ۵۵۱) میں ہے: "رؤیة دیدن بچشم متعدالی مفعول و دانستن متعد الی مفعولین" یعنی لفظ رؤیت آنکھ کے ساتھ دیکھنے پر بھی بولا جاتا ہے اور جاننے پر بھی بولا جاتا ہے۔ یہ پہلی صورت میں ایک مفعول اور دوسری صورت میں دو مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ (تفسیر خازن ج ۱ ص ۲۱۰، معالم التنزیل ج ۱ ص ۲۱۱) میں "اَلَمْ تَرَ" کے معنی "اَلَمْ تَعْلَمْ" کے کئے ہیں اور امام ابوبکر بن خالویہ ﷫ فرماتے ہیں: "کل ما فی القرآن من الم تر فمعناہ الم تُخبَرْ الم تعلم لیس من رؤیة العین" (اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن ص ۷۵)

اور حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کی ان عبارات میں رؤیت سے جاننا مراد ہے کہ جب کوئی زندہ شخص قبر کے پاس آکر سلام وکلام کرتا ہے تو مُردے اس کو آواز اور لب ولہجہ سے پہچان لیتے ہیں۔ جیسا کہ نابینا حضرات لوگوں کو آواز سے پہچانتے ہیں مگر نابینا سے بھی اگر کلام کرنا ہوتا ہے تو عادۃً لوگ اس کے پیچھے نہیں کھڑے ہوتے بلکہ سامنے ہی کھڑے ہوتے ہیں۔ گو اس کو نظر کچھ بھی نہیں آتا لیکن عادت یوں ہی ہے اور متکلم کی مُراد یہ ہوتی ہے کہ اگر یہ بینا ہوتا تو میں اس کے سامنے ہی سے آتا۔ اب بھی ایسا ہی کروں۔ یہی حال اموات کے ساتھ کرنا چاہئے کہ اگر وہ قبر کے مضبوط پردہ کے نیچے سے اپنی حِسّی آنکھوں سے دیکھتے ہوتے تو ان کے پاس آنے والے سامنے سے ہی آتے۔ اس لئے اب قبر پر سامنے ہی کی طرف سے آئیں نہ کہ پیچھے کی طرف سے اور ان کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھ کر یوں خیال اور تصور کریں کہ گویا وہ دیکھتے ہیں۔ اس کو ایسا ہی سمجھئے جیسا کوئی متادب شاگرد اپنے اُستاد کے مصلے یا ان کی خاص نشست گاہ پر استاد کی غیر حاضری میں بھی کھڑا ہونے اور بیٹھنے کی ہمت اور جرأت نہیں کرتا۔ اس خیال سے کہ یہ میرے اُستاد کا مقام ہے کہ اگر اُستاد محترم موجود ہوتے تو ان کی موجودگی میں یہ جرأت نہ کرتا۔ اب بھی ان کا ادب واحترام ملحوظ رکھتا ہوں۔ ٹھیک اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بوقت زیارت کیا کرتی تھیں۔ پہلے چونکہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی وہاں مدفون تھے، وہ تستّر کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتی تھیں، جیسا کہ ان کی زندگی میں نہیں کرتی تھیں۔ بخلاف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہ چونکہ وہ شرعاً غیر محرم تھے، اس لئے جس طرح ان کی زندگی میں وہ ان کے سامنے پردے کا اہتمام کرتی تھیں، بعد از وفات بھی اس کو ملحوظ رکھا۔

راقم اثیم کے نزدیک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ صحیح روایت اور اسی مضمون کی اور بعض دیگر روایات اور آثار حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کی عبارات کا ماخذ ہیں اور ایسی ہی روایات پر نگاہ رکھتے ہوئے انہوں نے یہ لکھا ہے اور یہ بات صرف حضرت ملّا علی القاری رحمہ اللہ اور علّامہ شامی رحمہ اللہ ہی نے نہیں کہی جن کو مؤلف مذکور نے بے اعتمادی کا نشتر چبھویا ہے بلکہ دیگر متعدد حضرات فقہاء احناف رحمہم اللہ نے بھی یہ بات لکھی ہے اور دُوسرے حضرات نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ چنانچہ علّامہ حسن بن عمار الشرنبلالی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۶۹ھ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر صلوٰۃ وسلام عرض کرنے کا طریقہ یہ بتلاتے ہیں کہ سلام کرنے والا آپ کے سرِ مبارک اور چہرۂ انور کے سامنے اَدب کے ساتھ کھڑا ہو اور پھر اسے تلقین کرتے ہیں کہ: ''ملاحظاً نظره السعيد اليک و سماعه کلامک ورده عليک سلامک وتأمينه على دعائک'' (نور الایضاح ص ۱۸۹)

ترجمہ: ''تو یہ خیال اور لحاظ رکھ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ مبارک تیری طرف متوجہ ہے اور آپ خود تیرا کلام سنتے اور تیرے سلام کا جواب دیتے اور تیری دُعا پر آمین کہتے ہیں۔''

اس کی شرح میں علامہ سید احمد طحطاوی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۳۳ھ) لکھتے ہیں: ''اى تلاحظ انه ناظر اليک'' (طحطاوی ص ۴۰۶)

ترجمہ: ''یعنی تو یہ خیال اور تصور کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیری طرف دیکھتے ہیں۔''

اور علامہ رحمۃ اللہ السندھی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی) اپنی مستند کتاب ''لباب المناسک'' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضر ہونے کے آداب میں یہ بھی فرماتے اور بتاتے ہیں کہ: ''متمثلا صورته الكريمة فى خيالک مستشعرا بانه صلى الله عليه وسلم عالم بحضورک وقيامک وسلامک''

"تم اپنے ذہن اور خیال میں آنحضرت ﷺ کی مبارک صورت کا تصور باندھو یہ خیال اور تصور کرتے ہوئے کہ آپ تیرے حاضر ہونے، کھڑے ہونے اور تیرے کلام کہنے کو جانتے ہیں۔"

اس کی شرح میں لفظ "مستشعرا" کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مُلّا علی القاری الحنفی ﷫ (المتوفی ۱۰۱۴ھ) فرماتے ہیں کہ صرف اتنا ہی تصور نہ کرنا کہ آپ ﷺ تیرے حضور، کلام اور سلام ہی کو جانتے ہیں۔

"ای بل بجمیع افعالک و احوالک وارتحالک و مقامک وَ کَاَنَّہٗ حاضر جالس بازائک"

(المسلک المتقسط فی المنسک المتوسط ص ۳۳۸)

ترجمہ: "بلکہ یوں تصور کرنا کہ آپ ﷺ تیرے تمام افعال اور احوال اور سفر کر کے آنے اور کھڑے ہونے کو جانتے ہیں اور یہ تصور کرنا کہ گویا آپ ﷺ تمہارے سامنے حاضر اور تشریف فرما ہیں۔"

ان عبارات میں صراحت کر دی گئی ہے کہ روضۂ اقدس پر حاضر ہونے والا آپ کو صلوٰۃ وسلام عرض کرتے وقت دِل میں یہ تصور اور خیال رکھے کہ گویا آپ حاضر ہیں اور سامنے تشریف فرما ہیں اور "وَ کَاَنَّہٗ حَاضِرٌ۔ جَالِسٌ بَازَائِکَ" کا جملہ اس کی واضح دلیل ہے۔ اہل علم اس کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

علامہ السید نور الدین علی بن احمد السمہودی الشافعی ﷫ (المتوفی ۹۱۱ھ) حضرت امام محمد بن محمد الغزالی ﷫ (المتوفی ۵۰۵ھ) کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: "وقال فی الاحیاء واعلم انہ ﷺ عالم بحضورک وقیامک وزیارتک وانہ یبلغہ سلامک وصلوتک فَمَثِّلْ صورتہ الکریمۃ فی خیالک واخطر عظیم رتبتہ فی قلبک" (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۲۷)

ترجمہ: "امام غزالی ﷫ نے "احیاء العلوم" میں فرمایا کہ (اے زیارت کنندہ) تو جان لے کہ آنحضرت ﷺ تیرے حاضر ہونے، کھڑے ہونے اور تیرے زیارت کرنے کو جانتے ہیں اور آپ کو تیرا سلام اور درود پہنچتا ہے۔ سو اپنے خیال اور ذہن میں آپ کی صورتِ مبارکہ کا تصور باندھ اور اپنے دِل میں آپ کے عظیم رُتبہ کا خیال ملحوظ رکھ۔"

اور علامہ سمہودی ﷫ خود اپنا فیصلہ یہ صادر فرماتے ہیں کہ: "والادب معہ ﷺ بعد وفاتہ مثلہ فی حیاتہ فما کنت صانعہ فی حیاتہ فاصنعہ بعد وفاتہ من احترامہ والاطراق بین یدیہ" (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۴۷)

ترجمہ: "آنحضرت ﷺ کے ساتھ آپ کی وفات کے بعد بھی اسی طرح ادب سے پیش آ جس طرح آپ ﷺ کی زندگی میں تھا۔ سو جس طرح تو آپ ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کا اُدب کرتا اور آپ ﷺ کے سامنے سر نیچا کرتا تھا آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی تو ایسا ہی کر۔"

یہ تمام عبارات ذمہ دار علماءِ ملّت کی ہیں اور اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل روشن ہیں۔ مؤلف "شفاء الصدور" کس کس کا انکار کریں گے؟

علامہ احمد بن محمد القسطلانی ﷫ (المتوفی ۹۲۳) "مواھب اللدنیہ" میں اور اس کے شارح علامہ محمد بن عبدالباقی بن یوسف الزرقانی ﷫ (المتوفی ۱۱۲۲ھ) لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضر ہونے والا۔

''ویلازم الادب والخشوع والتواضع غاض البصر فی مقام الهیبة کما کان یفعل بین یدیه فی حیاته اذ هو حی ویستحضر علمه بوقوفه بین یدیه وسماعه لسلامه کما هو فی حال حیاته اذ لا فرق بین موته و حیاته فی مشاهدته لامته و معرفته باحوالهم و نیاتهم و عزائمهم و خواطرهم و ذلک عنده جلی ظاهر لا خفاء به باطلاع الله تعالٰی له علٰی ذٰلک'' (المواهب اللدنیه مع شرحه للزرقانی رحمۃ اللہ علیہ ج ۸ ص ۳۰۵)

''ادب، خشوع اور تواضع کو لازم پکڑے اور ہیبت کے مقام پر اپنی نگاہ کو نیچی رکھے جیسا کہ آپ ﷺ کے سامنے آپ ﷺ کی زندگی میں کرتا تھا کیونکہ آپ ﷺ زندہ ہیں اور اس بات کو ذہن میں حاضر رکھے کہ آپ ﷺ آنے والے کے اپنے سامنے کھڑا ہونے اور اس کے سلام کو سنتے ہیں جیسا کہ آپ ﷺ کی زندگی کی حالت میں تھا اس لئے کہ آپ ﷺ کی موت و حیات میں اپنی اُمت کے مشاہدہ اور ان کے احوال و نیات و عزائم اور خیالات کو پہچاننے میں کوئی فرق نہیں اور یہ بات آپ ﷺ کے ہاں بالکل روشن (اور) ظاہر ہے۔ اس میں کوئی خفاء نہیں ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالٰی آپ ﷺ کو اس پر اطلاع دیتا ہے۔''

اس عبارت سے اہلِ بدعت نے آنحضرت ﷺ کے لئے دِلوں کے راز تک کا علم غیب ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے مگر وہ بے چارے یستحضر کا مفہوم ہی نہیں سمجھے۔ استحضار کا یہ معنی ہوتا ہے کہ اپنے ذہن اور خیال میں ایک بات کو حاضر کرے اور ذہن میں پیش نظر رکھے اور اگر خارج اور نفس الامر میں بھی اللہ تعالٰی کسی کی خلوص نیت اور حالت کی آپ ﷺ کو کوئی خبر دے دے جیسا کہ علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ باطلاع اللہ تعالٰی ''له علٰی ذٰلک'' سے اس بات کو سمجھانا چاہتے ہیں تو شرعاً اس میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی اور نہ اس کا علم غیب سے کوئی تعلق ہے جو اللہ تعالٰی کی مخصوص صفت ہے۔

مؤلف ندائے حق کی باطل تاویل

مؤلف مذکور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکور حدیث کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اور اگر اس حدیث کو صحیح مان لیں، پھر بھی ہمارا کچھ نہیں بگڑتا اور آپ کا مقصود اس سے ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ دفن عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے تو حجرۂ شریفہ مخصوص تھا۔ بغیر اجازت کے کوئی اندر نہیں جا سکتا تھا۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دفن ہوئے تو عمر رضی اللہ عنہ کے اقارب اگر السلام علیکم کرنے آئیں تو انہیں کون منع کرے۔ اس لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو اچھی طرح کپڑے لپیٹ لیتی تھیں، تو اقارب عمر رضی اللہ عنہ سے پردہ کرنے کے لئے، نہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات مدفونہ سے پردہ کرنے کے لئے۔ ’رواۃ کے اختصار فی الحدیث سے یار لوگوں نے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اموات کے لئے حواس جسد عنصری والے ثابت کرنا شروع کر دیئے۔ الحاصل حدیث مذکور اس بات پر دال نہیں کہ نبی ﷺ کا سماع و بصر ثابت ہو۔ جسد عنصری کے کانوں، آنکھوں سے اہلِ دنیا کی اصوات وذوات کے بارے۔'' (بلفظہٖ ندائے حق ص ۱۴۱)

الجواب: مؤلف مذکور نے اس صحیح حدیث کا جس رنگ اور جس طرز سے انکار کیا ہے منکرین حدیث بھی کبھی ایسا نہ کر سکیں۔ بات صرف یہاں ختم ہوتی ہے کہ: ''مَیں نہ مانوں'' باقی سب بہانے ہیں اور مؤلف مذکور نے اس پر مطلقاً غور نہ کیا اور نہ اس کا باحوالہ ثبوت دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دفن سے پہلے حجرہ شریفہ یوں مخصوص تھا کہ بغیر اجازت کے اندر کوئی نہیں جا سکتا تھا؟ اس کا کیا ثبوت اور حوالہ ہے؟ کون اجازت مانگتا تھا اور کس سے مانگتا تھا؟ یہ

صحیح روایت تو خود صاف بتاتی ہے کہ جب آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مدفون ہو چکے تھے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس حجرہ شریفہ میں نہیں رہتی تھیں بلکہ وہ فرماتی ہیں: ''کنت ادخل بیتی الذی فیہ رسول اللہ ﷺ'' کہ میں اپنے اس کمرے میں داخل ہوتی تھی جہاں آپ ﷺ مدفون تھے اور پھر وہ تصریح فرماتی ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدفون ہو چکے تو وہ پردے کا اہتمام کر کے جاتی تھیں اور یہ کارروائی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اقارب سے نہیں بلکہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حیاء کی بناء پر تھی اور ''حیاءً من عمر رضی اللہ عنہ'' کے الفاظ اس میں صراحت سے موجود ہیں۔ پھر مؤلف مذکور کو یہ ہمت بھی نہ ہو سکی کہ وہ حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ کے حوالہ سے یہ بتاتے کہ اصل روایت یہ تھی اور رُواۃ کے اختصار سے اس کا نقشہ یہ بن گیا ہے اور اُلٹا وہ یار لوگوں کو بلا وجہ کوستے ہیں کہ انہوں نے اس حدیث سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔۔۔۔ یار لوگوں نے تو اس سے ناجائز فائدہ نہیں اُٹھایا، البتہ مؤلف مذکور نے اس کی بالکل ناروا اور باطل تاویل کر کے اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیا ہے اور الحاصل کے بعد جس طرح انہوں نے غلط نتیجہ نکالا ہے، وہ ان کی کم فہمی کا رونا رو رہا ہے۔ جب آنحضرت ﷺ کا جسدِ عنصری محفوظ ہے اور رُوحِ مبارک کا اس سے قوی تعلق ہے تو آپ ﷺ قریب سے کانوں سے اہلِ دُنیا کے اصوات کیوں نہیں سُن سکتے اور جسدِ عنصری کی آنکھوں سے قبر اور برزخ کی چیزوں کو کیوں نہیں دیکھ سکتے؟

(۴) یہی مؤلف لکھتے ہیں کہ: ''اگر تو یہ کہے کہ اگرچہ ہم اس بات کی سمعی دلیل تو نہیں جانتے لیکن ہم ان جلیل القدر فقہاء کرام رحمہم اللہ پر اعتماد کرتے ہیں کیونکہ وہ جھوٹ تو نہیں کہتے۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ دلائل کی بناء پر کہا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ہم نے یہ تسلیم کیا کہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ جھوٹ نہیں بولتے لیکن خطاء اور نسیان تو ممکن ہے۔ مولانا محمد عبدالحئی لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات مصنف فی نفسہٖ معتبر ہوتا ہے مگر اس کی کتاب نامعتبر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں تنقید و تنقیح کا التزام نہیں کیا ہوتا اور اس میں وہ تدقیق و توضیح کے بغیر ہر رطب و یابس جمع کیا ہوتا ہے۔ (مقدمہ عمدۃ الرعایہ ص ۱۲، شفاء الصدور ص ۷۹ مسلہ مترجماً)

مؤلف مذکور کی اس عبارت کا ایک ظاہری مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ اور حضرت مُلّا علی القاری رحمہ اللہ وغیرہ کی کتابیں ہی سرے سے نامعتبر ہیں کیونکہ وہ تنقید و تنقیح سے خالی ہیں۔ اگرچہ ان کے مصنف فی نفسہٖ معتبر ہیں اور دوسرا مطلب جو بظاہر مؤلف مذکور کی مراد ہے، یہ ہے کہ ان کتابوں میں یہ مسائل اور جزئیات نامعتبر ہیں، اس لئے کہ وہ تدقیق و توضیح سے عاری ہیں۔ بہر حال کچھ بھی ہو مؤلف مذکور کے نزدیک ان حضرات کی ان عبارات سے اتفاق مشکل ہے۔ مگر ایک بات فہم سے بالاتر ہے وہ یہ کہ کسی مصنف کا اپنی کتاب میں تنقید و تنقیح کا التزام نہ کرنا خطا اور نسیان کیسے ہو گیا؟ اور ان دونوں باتوں میں جوڑ اور تلازم کیا ہے؟ علاوہ ازیں پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلامی کتابوں کا وہ تمام ذخیرہ جس میں صحیح کے پہلو میں ضعیف اور قوی کے ساتھ کمزور اور راجح قول کے ساتھ مرجوح اور ناسخ کے ساتھ منسوخ وغیرہ درج ہوتا ہے، وہ سبھی کتابیں نامعتبر ہیں اور اس لحاظ سے کتاب اللہ تعالیٰ کے بعد صحیحین کے سوا یا معدودے چند اور کتابوں کے علاوہ باقی تمام اسلامی کتابیں عام اس سے کہ وہ حدیث و تفسیر کی ہوں یا فقہ و تاریخ وغیرہ کی، سبھی ہی نامعتبر ہوں؟ پھر یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ کیا سبھی حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ جو مختلف علاقوں اور زمانوں میں گزرے ہیں خطاء اور نسیان پر کمربستہ ہو گئے اور تالیف کے اثناء میں سامنے کتابوں کا انبار ہوتے ہوئے بھی ان کا نسیان نہ گیا اور نہ خطا کے چکر سے نکل سکے۔ یہ

ذہن اور نظریہ انتہائی خطرناک اور سخت مضر ہے اور یہ نظریہ صرف مؤلف ''شفاء الصدور'' ہی کا نہیں بلکہ مؤلف ''اقامۃ البرہان'' کا نظریہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔

چنانچہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں: ''نشر الطیب مولانا تھانوی رحمہ اللہ کے ابتدائی دَور کی تصنیف ہے جو ہر قسم کے رطب و یابس روایتوں سے پُر ہے اس لئے وہ درجۂ استناد سے ساقط ہے۔'' (ملخصاً اقامۃ البرہان ص ۲۹۰)

یہ صحیح ہے کہ ''نشر الطیب'' میں کمزور ضعیف روایات بھی ہیں لیکن اس میں قرآنِ کریم کی آیات اور صحیح احادیث اور مستند اقوال بھی تو موجود ہیں۔ یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ مؤلف مذکور نے ساری کتاب ہی کو درجۂ استناد سے ساقط کر دکھایا ہے۔ سُبْحَانَکَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ!

(۴) مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ: ''مُلّا علی القاری رحمہ اللہ اپنی کتابوں میں بہت غلطیاں کر جاتے ہیں۔ اطمینان کے لئے مقدمہ تنسیق النظام اور شرح نخبۃ الفکر پر حواشی عبداللہ ٹونکی کو دیکھ لو۔ محمد حسن سنبھلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مُلّا علی القاری حنفی رحمہ اللہ کی بہت عجیب حالت ہے۔ موافق مخالف رطب و یابس صحیح ضعیف سب نقل کر دیتا ہے۔ حدیثوں کی تنقیح اور ان کا امتیاز نہیں کرتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اکثر تصانیف عجلت سے لکھی گئی ہیں۔ پھر قاری صاحب کی ہر بات پر اعتماد کرنا درست نہ ہوا۔ خصوصاً جب کہ وہ سبکی رحمہ اللہ اور سیوطی رحمہ اللہ کی تقلید میں کوئی بات لکھ جائیں۔ اسی طرح ابن عابدین نے محمد بن عبدالوہاب کے بارہ میں سُنی سنائی بات لکھ دی۔'' (ترجمہ شفاء الصدور ص ۱۰۰، ۱۰۱)

مؤلف مذکور کی مراد واضح ہے کہ حضرت مُلّا علی القاری رحمہ اللہ اور علامہ ابن عابدین الشامی رحمہ اللہ کی ہر بات قابلِ اعتماد نہیں ہے اور اس ہر بات سے مؤلف مذکور کی مُراد یہاں پر وہ مسئلہ اور جزئیہ ہے جس میں ان دونوں بزرگوں نے روایات پر اعتبار کرتے ہوئے جمہور اور اکثریت کا ساتھ دیا ہے اور ان کے نامعتبر اور غیر قابلِ اعتماد ہونے کی وجہ بھی مؤلف مذکور کے ہاں صرف یہی ہے۔

(۵) چلئے سبکی، سیوطی، نووی، قاضی عیاض، زرقانی، شافعی اور مالکی رحمہم اللہ ہیں، ان کی بات نہ سہی جن اکابر فقہاء احناف نے سماعِ موتیٰ کا اقرار کیا ہے، مثلاً: ابن الہمام، علامہ عینی، مُلّا علی القاری، علامہ آلوسی، بحر العلوم، مولانا نانوتوی وغیرہ (رحمہم اللہ) حضرات، تو یہ جملہ حضرات حنفی ہیں اور یہ سب سماعِ موتیٰ کے قائل ہیں۔ ان کی بات ہی تسلیم کر لیتے یا ان کی بات بھی محال است و جنوں کا مصداق ہے؟ اگر حضرات علماء اسلام پر بے اعتمادی کا یہی عالم رہا تو پھر منکرین حدیث اور باطل فرقوں کے نظریات بلا روک ٹوک مسلمانوں میں سرایت کریں گے اور معاذ اللہ تعالیٰ اسلامی مسائل کا حلیہ بگڑ جائے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ غیر معروف الفقہ والعدالۃ ہیں (معاذ اللہ تعالیٰ)

ان حضرات کو اپنی قائم کردہ غیر معصوم رائے پر اتنا اصرار ہے کہ اجماع اور جمہور اور مسلم حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کو کوسنے سے گریز کرنا تو درکنار انہوں نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی ہاتھ صاف کیا ہے (معاذ اللہ تعالیٰ) کسی کی بات کو اعرابی اور جنگلی کہہ کر ٹال گئے ہیں اور کسی کی بات کو یہ کہہ کر صحابی کی بات حجت نہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی تو عدالت ہی کا انکار کر دیا ہے۔

چنانچہ مؤلف ندائے حق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''پھر بیہقی کو بھی صرف تمام لاکھ سے زائد صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے، جن میں معروف بالاجتہاد والفقہ بھی تھے، ایسی اہم اور ضروری حدیث جس کا انکار موجب فسق وضلال ہے۔ صرف ایک صحابی غیر معروف الفقہ والعدالۃ یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ملی۔ جس کی روایت عموم قرآنی اور عام قاعدہ کے خلاف ہو تو مسترد کر دی جاتی ہے جیسے ان کی مصرّاۃ والی روایت کو احناف رحمہم اللہ نے فرمادیا کہ خلاف قرآن ہے۔'' (ندائے حق ص ۱۲۵)

حضرت امام بیہقی رحمہ اللہ کا تو کمال ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سماع عند القبر کے بارے میں ایک صحابی کی روایت کی نشان دہی تو کر دی ہے مگر مؤلف ندائے حق اور ان کی پوری جماعت اس سے یقیناً قاصر رہی ہے اور تا قیامت قاصر رہے گی کہ وہ کسی ایک ہی صحابی سے یا کسی ایک ہی تابعی سے یا کسی ایک معتبر محدث اور فقیہ سے صاف اور صریح الفاظ میں یہ ثابت کر دے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عند القبر صلوٰۃ وسلام کا سماع نہیں فرماتے۔ اگرچہ بعض حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے یہ تو لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مجتہد اور فقیہ نہ تھے لیکن خود محققین احناف نے اس کی سختی سے تردید کی ہے۔ (العرف الشذی ص ۴۹۴ وغیرہ) مگر یہ کس فقیہ نے لکھا ہے کہ وہ معروف العدالۃ بھی نہ تھے اگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی عدالت ثابت نہیں ہے جو ثقاہت راوی کے لئے ایک بنیادی شرط ہے تو ان کی تمام حدیثیں قابل رَد ہیں اور اس باطل نظریہ کے قائل شاید جناب غلام احمد صاحب پرویز بھی نہ ہوں۔ آخر وہ بھی تو مفید مطلب روایات کو تاریخ کی حیثیت دے کر تسلیم کر لیتے ہیں۔

حضرات فقہاء احناف رحمہم اللہ ایرے غیرے نتھو خیرے ہیں اور ان کی کتابیں پوتھیاں ہیں (معاذ اللہ تعالیٰ)

امام ابن الہمام، حضرت ملا علی القاری، علامہ بحر العلوم، علامہ رحمۃ اللہ السندی الحنفی، علامہ شرنبلالی اور حضرت مولانا گنگوہی وغیرہ احناف (رحمہم اللہ) نے اپنی اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب زائر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام عرض کرنے اور طلب دُعا کی التجاء سے فارغ ہو جائے تو پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سلام عرض کرے اور یوں کہے کہ آپ میرے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میری مغفرت کی دُعا کی سفارش کریں۔ (محصلہ) ان میں سے بعض کے حوالے راقم نے تسکین الصدور طبع اوّل میں عرض کئے تھے اور کچھ طبع ثانی میں موجود ہیں۔ اس پر گرفت کرتے ہوئے مؤلف ''ندائے حق'' لکھتے ہیں کہ: ''خلاصہ یہ نکلا کہ شیخین (ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) سے درخواست کہ تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہو کہ خدا سے کہیں کہ وہ ہماری مغفرت کرے۔ یعنی واسطہ در واسطہ، بریلویوں سے ایک قدم آگے۔ وہ تو کہتے ہیں، اے فقیر میری تیرے آگے اور تیری اللہ کے آگے (دُعا والتجاء) ہے اور یہ بناسپتی دیوبندی فرماتے ہیں ہماری ابوبکر وعمر کے آگے اور اُن کی حضور کے آگے اور پھر حضور کی اللہ کے آگے۔ واہ ری دیوبندیت جدیدہ ترمیم شدہ الیٰ ان قال۔ جیسے وہ (بریلوی) لوگ اپنے مسلک کی تائید میں کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کا قول کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالتے ہیں اگرچہ کتاب وسنّت کے خلاف ہو، ایسے ہی تم نے بھی اپنی تائید میں کتابوں کے حوالے پیش کئے۔ دلائل اربعہ (کتاب وسنت اجماع وقیاس مجتہد) میں سے نہ ان کا دعویٰ ثابت اور نہ تمہارا۔ یہود ونصاریٰ بھی توریت وانجیل کو چھوڑ کر اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی پوتھیاں پیش کرتے ہیں۔'' (ملخصاً ندائے حق ص ۶۷، ۶۸)

مطلب واضح ہے کہ یہ جلیل القدر حضرات فقہاء احناف رحمۃ اللہ علیہم ایرے غیرے نتھو خیرے ہیں اور ان کی یہ کتابیں پوتھیاں ہیں اور تم ان کی بات ڈھونڈ نکالنے والے بناسپتی دیوبندی ہو، واہ ری دیوبندیت جدیدہ ترمیم شدہ۔ مگر افسوس ہے کہ مؤلف مذکور بقول خود اصلی دیوبندیت کے کسی حامی بزرگ سے کتاب وسنت اور اجماع وقیاس مجتہد سے ایک حوالہ بھی اس کے عدم جواز پر صراحت سے پیش نہیں کر سکے اور نہ تا قیامت پیش کر سکتے ہیں اور خیر سے وہ بایں ہمہ اصلی دیوبندی بنے ہوئے ہیں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ!

مؤلف مذکور بلا وجہ محض اپنے عوام کو خوش کرنے کے لئے ہمیں بزور بریلی ہونے کا ناروا طعن دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اکابر علماء دیوبند سماع موتی میں رُوح کے ساتھ جسد عنصری کی مشارکت کے بھی (گو بعض کے نزدیک جسم مثالی سے تلبس بھی ہو) قائل ہیں اور مولوی احمد رضا خان صاحب صرف رُوح کے سماع کے قائل ہیں اور جسم مثالی سے یہ تعلق تسلیم کرتے ہیں اور یہی نظریہ مؤلف ندائے حق اور ان کے ہم نوا دوستوں کا ہے۔

چنانچہ احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں:

عرض: اُمّ المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا کا انکار سماع موتی سے رجوع ثابت ہے یا نہیں؟

ارشاد: ''وہ جو فرما رہی ہیں، حق فرما رہی ہیں، وہ مُردوں کے سننے کا انکار فرماتی ہیں۔ مُردے کون ہیں؟ جسم رُوح مُردہ نہیں اور بے شک جسم نہیں سُنتا، رُوح سنتی ہے۔''

پھر آگے لکھتے ہیں: ''سماع کے عُرفی معنٰی ان آلات کے ذریعے سننا اور یہ یقیناً بعد مرنے کے رُوح کے لئے نہیں۔ رُوح کو جسم مثالی دیا جاتا ہے، اس کے جسم کے کانوں سے سنتی ہے۔'' (ملفوظات حصہ سوم ص ۳۳)

غور کیجئے اور انصاف سے فرمائیے کہ اس مسئلہ میں خان صاحب بریلوی کا ہم نوا کون ہے؟ مگر دُنیا میں ایسا ہوتا رہا کہ چھاننی لوٹے کو دو (۲) سوراخ ہونے کا طعن دیتی ہے۔

جمہور کی توہین

(۷) مسئلہ استشفاع عند القبر اور سماع موتی کی چونکہ جمہور اُمت قائل ہے اور حضرات فقہاء احناف رحمۃ اللہ علیہم اور ہمارے اکابر علماء دیوبند کثر اللہ تعالٰی جماعتہم کی اکثریت اس کی قائل ہے اور مؤلف ندائے حق چونکہ جمہور کے قائل نہیں ہیں، اس لئے ایک مقام پر جمہور سے برہم ہو کر علمی ہوش کو بالائے طاق رکھ کر خالص جوش میں آ کر لکھتے ہیں: ''اگر جمہور کا یہ حال ہے تو ہم ایسے جمہور کی اتباع سے رہے۔ ہم جمہور سے علیحدہ ہی اچھے ہیں (ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالٰی آپ کو جمہور کی معیت نصیب فرمائے۔ آمین۔ صفدرؔ) ہم ایسے جمہور کے عاشق نہیں۔ ہمیں تو قرآن وسنت واجماع مجتہدین کافی ہیں۔ (معاف رکھنا یہ سب جمہور کے ساتھ ہیں بلکہ جمہور ان پر عامل ہیں اور آپ کے پاس صرف لفظوں کی شعبدہ بازی ہے اور بس۔ صفدرؔ) یہ جمہور، زُنبور، کشف، خوابیں، جنگیوں کا مذہب آپ ہی کو نصیب ہو۔'' (بلفظہٖ ندائے حق ص ۳۰۳)

قارئین کرام! آپ مؤلف مذکور کا انداز گفتگو ملاحظہ کریں کہ اُنہوں نے جمہور کو کیا کہا؟ اور کن الفاظ سے یاد کیا ہے۔ عربی زبان میں زُنبور بھڑ کو کہتے ہیں جو چھوٹی سُرخ رنگ کی ہوتی ہے اور بڑی بھڑ کو ''کابلی بھڑ'' کہتے ہیں

جو مختلف رنگ کی ہوتی ہے اور زہریلا ڈنگ مارتی ہے۔ مگر سخت افسوس ہے کہ مؤلف مذکور نے جمہور کو بھی زُنبور بنا ڈالا ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ! جب ان کے نزدیک جمہور کا یہ ادب واحترام ہے تو ماوشما کی ان کے نزدیک کیا وقعت باقی رہ جاتی ہے اور غور کیجئے کہ ایک جلیل القدر دیہاتی صحابی کے خواب کو (جس کی بحث آگے آرہی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ) جس کی تائید خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں کی اور جس کی تصدیق حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کی۔ مؤلف مذکور نے کس بے باکی اور جسارت سے اس کو کشف خوابیں اور جنگلیوں کا مذہب کہہ کر اس کا تمسخر اُڑایا ہے اور کس طرح وہ حدیث: ''وَلَعَنَ اٰخِرُ ھٰذہٖ الامۃ اَوَّلَھَا'' (ترمذی ج ۲ ص ۴۴، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۷۰) کا مصداق بن رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے۔ آمین!

(۸) ''اور علماء سوء بھی ان کو تعلیم دیتے ہیں کہ اگرچہ دُور سے نہیں تو قبر کے اُوپر جا کر اگر پکارا جائے اور سفارشیں کروائی جائیں اور درخواستیں بھیجی جائیں تو مُردے سنتے جانتے ہیں۔ معاذ اللہ، معاذ اللہ ثم معاذ اللہ تعالیٰ! ایسے غلط عقائد اور شرکیہ خیالات اور بدعیہ حرکات وسکنات سے بچائے۔ اگر اس قسم کے شرع میں جائز ہوتے تو سب سے پہلے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی مزار مبارک پر جا کر کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب سید الانبیاء علیہ السلام کی قبر مبارک کو ایسے کرتوتوں سے بچا کر رکھا ہے۔'' (بلفظہٖ شفاء الصدور ص ۱۰۶)

بحمد اللہ تعالیٰ وحسن توفیقہٖ ہم نے استشفاع عند القبر کی کچھ بحث اس پیش نظر کتاب میں اور کچھ تسکین الصدور طبع دوم میں کردی ہے کہ کیا حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟ لیکن مؤلف مذکور کی دیدہ دلیری دیکھئے کہ انہوں نے بیک جنبشِ قلم استشفاع عند القبر کے جواز کے قائلین کو علماء سوء کے زُمرہ میں شامل کردیا ہے اور آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ کون کون علماء اس مد میں آتے ہیں یا بالفاظِ دیگر کون اس شاہی فتویٰ کی زد سے بچ سکتا ہے؟ اور ملاحظہ کیجئے کہ کس سینہ زوری سے انہوں نے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے ایک جائز فتویٰ کو غلط عقائد، شرکیہ خیالات اور بدعیہ حرکات وسکنات میں جا داخل کیا ہے۔

(۹) مؤلف مذکور عنوان یوں قائم کرتے ہیں: ''باب پنجم: ملحدین ومبتدعین سماع موتی'' (شفاء الصدور ص ۱۰۷)

اس عنوان کے تحت انہوں نے بزعم خویش بعض فرقوں کی کچھ عبارات بھی نقل کی ہیں لیکن ان عبارات کا سماع موتی کے اس پہلو سے ہرگز کوئی تعلق نہیں جو حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے درمیان نزاعی ہے، یہ سب کچھ مؤلف مذکور کے اپنے سوء فہم کا نتیجہ اور ان کی اپنی ذاتی کشید ہے مگر ان کا مقصد ان تمام غیر متعلق عبارات سے صرف یہ ہے کہ سماع موتی کا قائل ملحد اور مبتدع ہے جیسا کہ ان کے عنوان سے ظاہر ہے۔ مؤلف مذکور کے اس باطل نظریہ کے تحت آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ کون کون حضرات ملحد اور مبتدع قرار پاتے ہیں۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

فضول بھرتی اور اس کا رَد

مؤلف ندائے حق نے اپنی کتاب میں ص ۱۴۵ سے ص ۱۵۰ تک لفظ جمہور کا عنوان قائم کر کے خاصی بحث کی ہے جس میں انہوں نے ایک بات تو یہ کہی ہے کہ ادلۃ الشرع تو چار ہیں مگر صاحب ''تسکین الصدور'' پانچویں بھی مانتے ہیں جو جمہور ہے اور پھر لکھتے ہیں کہ کثرت کا کچھ اعتبار نہیں۔ اعتبار قوۃ کا ہے۔ ہمارے اُستاد مولانا خدا

بخش صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے، سو سنار کی ایک لوہار کی اُصولی قاعدہ مسلمہ ہے۔ "العبرة للقوة لا للكثرة" اور اللہ کا فرمان ہے: "فمنهم مهتد و كثير منهم فاسقون لا يستوى الخبيث والطيب ولو اعجبك كثرة الخبيث وقال ولكن اكثر الناس لا يشكرون وقليل من عبادى الشكور"

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

الحق حق و ان قلّ ناصروه والباطل باطل و ان كثر فقلوه (تحفه اثنائے عشریه ص ۵۴) وقال ابراهيم الخواص يس العلم بكثرة الرواية وانما العالم من اتبع العلم واستعمله واقتدى بالسنن و ان كان قليل العلم (الاعتصام ج ۱ ص ۹۷)

ان العلماء (اهل العلم والاجتهاد) هم السواد الاعظم و ان قلوا والعوام المفارقون للجماعة ان خالفوا فان وافقوا فهو الواجب عليهم (ج ۲ ص ۲۶۶) كان سفيان الثورى يقول المراد بالسواد الاعظم هم من كان من اهل السنة والجماعة ولو واحدًا كذا فى الميزان الشعرانى رحمہ اللہ (میانۃ ص ۳۰۸) قال الملّا سعد الرومى فى مجالس الابرار فلا بدّ ان تكون شديد التوقى من محدثات الامور و ان اتفق عليها الجمهور فلا يغرنّك اتفاقهم على ما احدث بعد الصحابة بل ينبغى ان تكون حريصا على التفتيش عن احوالهم واعمالهم فان اعلم الناس واقربهم الى الله اشبههم بهم واعرفهم بطريقهم اذ منهم أخذ الدين وهم أصول فى نقل الشريعة عن صاحب الشرع وقد جاء فى الحديث اذا اختلف الناس فعليكم بالسواد الاعظم والمراد به لزوم الحق واتباعه و ان كان المتمسك به قليلاً والمخالف كثيرًا (میانۃ ص ۳۰۸) عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ رفعه يس الجماعة بكثرة الناس من كان معه الحق فهو الجماعة و ان كان واحدًا (میانۃ ص ۳۱۰) عن ابى الدرداء رضی اللہ عنہ و واثلة رضی اللہ عنہ بن الاسقع وانس رضی اللہ عنہ بن مالك قالوا يا رسول الله ما السواد الاعظم قال من كان على ما انا عليه واصحابى (ص ۳۱۱) قال نعيم بن حماد اذا افسدت الجماعة فعليك ما كانت عليه الجماعة قبل ان تفسدوا ان كنت واحدك فانك انت الجماعة حينئذٍ (ص ۳۱۰) قال فضيل بن عياض الزمُ طوق الهُدى ولا يضرّك قلة السالكين اياك و طرق الضلالة ولا تغتر بكثرة الهالكين قال بعض السلف اذا وافقتَ الشريعة ولا خطت الحقيقة فلا تبال وان خالف رأيك جميع الخليفة قال الكرمانى مقتضى الامر بلزوم الجماعة انه يلزم المكلف متابعة ما اجمع عليه المجتهدون وهم المراد بقوله وهم اهل العلم (ص ۳۳۵) قال القسطلانى فى كتاب الفتن والجماعة التى امر الشارع بلزومها جماعة ائمة العلماء لان الله تعالى جعلهم حجة على خلقه۔۔۔ وقال آخرون هم جماعة الصحابة۔۔۔ وقال آخرون هم جماعة اهل الاسلام ما كانوا امجتمعين على امرٍ واجب على اهل الملة فاذا كان فيهم مخالف منهم فليسوا امجتمعين

(صانۃ ص ۳۳۵)

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ فرضیت جمعہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: "اس سے اسی قدر مفہوم ہوتا ہے کہ اکثر علماء فرضیت فی المدینہ کے قائل ہیں اور بعض فرضیت فی المکہ کو تسلیم کرتے ہیں مگر یہ قاعدہ کسی کے ہاں مسلّم نہیں کہ درصورتِ اختلاف جس جانب اکثر ہوں، اس کو ہمیشہ دُوسری جانب سے قوی اور راجح مانا جائے گا۔ آپ تھوڑا سا تامل کریں گے تو بہت سے نظائر ہر ایک مذہب میں آپ کو ملیں گے کہ علماء قولِ اکثر کو مرجوح اور دوسری

جانب کو راجح فرماتے ہیں...... تو کیا آپ بوجہ غربت اور مخالفت جمہور اس قسم کے مسائل کی تغلیط وتضعیف فرمائیں گے؟ یا بوجہ قوت دلیل اور صحت ماخذ ایک جانب کو دُوسری جانب پر ترجیح دینا حق فرمائیں گے، خواہ قولِ جمہور ہو یا قولِ غریب فماھو جوابکم فھو اجوابنا' (احسن القرای ص ۳۸)

''ناظرین سمجھ چکے ہوں گے کہ علماء حق کے ہاں جمہور کی کیا حیثیت ہے؟ جس کا نام لے لے کر عوام کو اہلِ حق کے خلاف ناجائز طریق سے اُکسایا جا رہا ہے، بھڑکایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ جمہور کی نہیں مانتے۔ اکابر کی نہیں مانتے یا سلف جمہور اور اکابر کے گستاخ ہیں۔ یہ حربہ بعینہٖ وہی ہے جسے بریلویہ اور شیعہ اہلِ حق کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔'' الی ان قال ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

''پھر کمال تعجب یہ ہے کہ ناقلین کی نقل، نقل در نقل، در نقل در نقل پر جمہور کا نام دھر دیتے ہیں۔ یوں تو ہر دُوسرے سال جمہور کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ صاحب تسکین اور ان کے ہم خیال ہم نوالہ ہم پیالہ پندرہویں صدی میں سلف۔ اکابر جم غفیر اور جمہور اور سوادِ اعظم کہلائیں گے۔'' الی قولہ: ''ہمارے اور آپ کے پیر ومُرشد حضرت مولانا حسین علی بھی کئی مسائل میں جمہور کے خلاف تھے۔ سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تحقیق کئی مسائل میں جمہور کے خلاف تھی حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی تحقیق بھی کئی مسائل میں مخالفِ جمہور تھی۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی تحقیق کو خود صاحب تسکین مان چکے ہیں کہ جمہور کے خلاف ہے متقدمین ومتاخرین علماء میں سے اکثر کے تفردات کتب میں درج ہیں۔ اگر جمہور بھی حجج شرعیہ میں سے کوئی حجت ہوتی تو یہ اکابر اپنا متفرد قول بیان نہ فرماتے اور اس کو اپنا مسلک نہ بناتے۔ اگر یہ جمہور کا قول شرعی حُجت ہوتا تو اس کے مخالفین سب مورِدِ طعن بنتے۔ جس طرح اجماع وقیاس کے مخالفین مورِدِ طعن ہیں۔''

پھر آگے لکھا ہے کہ: ''اور اکثر ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دوسرے عالم کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی تحقیق کو اپنی کتاب میں درج فرما دیتے تھے۔ اب اگر اتفاقاً پہلے عالم سے خطاء ہو چکی تھی تو وہی غلطی نقل در نقل ہوتی چلی آئی اور اسی حُسنِ ظن پر آنے والے علماء اپنی اپنی کتب میں درج کرتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ وہی غلط قول مشہور ہو گیا۔ جیسے غلط العوام۔ علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کثیرًا ما یقلد الساھون الساھین'' (فتح القدیر ص ۲۷۰) ابن نجیم فرماتے ہیں: ''وقد یقع کثیرًا اَنّ مؤلّفا یذکر شیئًا خطأً فی کتابہ فیاتی من بعد من المشائخ فینقلون تلک العبارۃ من غیر تغییر ولا تنبیہ فیکثر الناقلون لھا واصلھا ناقل مخطی'' (بحر الرائق ج ۶ ص ۱۸۵)

اب ناظرین سوچیں کہ جس جمہور پر اِترایا جا رہا ہے اس کی کیا حیثیت رہ گئی؟ بڑی محنت سے کھودا پہاڑ نکلا چوہا، پھر وہ بھی مرا ہوا۔ اب بھی جمہور کا نام لو گے؟'' (ندائے حق ملخصاً ص ۱۴۵ تا ۱۵۰)

الجواب: مؤلف ندائے حق نے مجذوبانہ انداز میں یہ جتنے حوالے پیش کیے ہیں، انہیں ایک بھی مفید نہیں بلکہ بعض ان کے سراسر خلاف ہیں اور ہمیں ایک بھی مضر نہیں ہے۔ یہ مؤلف مذکور کی کم فہمی اور قلت تدبر کا واضح نتیجہ ہے کہ خود دھوکے میں مبتلا ہوئے ہیں اور عوام الناس کو کمر باندھ کر دھوکا دینے کے درپے ہیں۔ ان کا ان عبارات سے اپنے مطلوب پر استدلال بالکل باطل ہے۔

اَوّلاً! اس لئے کہ ہم نے نہ تو یہ کہا ہے اور نہ ہمارا یہ مؤقف ہے کہ جمہور شرع کی پانچویں دلیل ہے۔ اَدّلۃ الشرع صرف چار ہیں لیکن ان ادّلہ اربعہ میں سے جس دلیل کو جمہور بیان کرتے اور اس پر عمل کرتے چلے آئے ہوں اس کو کوئی بھی دیانت دار اور منصف مزاج عالم کبھی بھی جمہور زنبور کہہ کر ٹرخا تا بھی نہیں رہا اور نہ حضرات جمہور کے خلاف ایسے گندے الفاظ کسی نے زبان وقلم سے نکالے ہیں۔ یہی ہوا ہے کہ جمہور کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھ کر علمی طور پر دوسرے پہلو کو ترجیح دی ہے۔

ثانیاً: اس لئے کہ اگر ایک طرف محض کثرت ہو اور دُوسری طرف قوی دلیل ہو تو سر اور آنکھوں پر ہم اس اُصولی مسئلہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ: ''العبرۃ للقوۃ لاللکثرۃ'' اور یہی مقام ہے سونار کی اور ایک لوہار کی۔ مگر یقین جانئے کہ مسئلۂ سماعِ موتی عند القبور اس مد میں ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ سماعِ موتی کا اثبات صحیح اور صریح روایات سے ثابت ہے جس پر جمہور (اَور بقول آپ کے زنبور۔ معاذ اللہ تعالیٰ) کا عمل ہے اور نفیٔ سماعِ موتی کی ایک بھی آیت کریمہ یا صحیح وصریح حدیث موجود نہیں ہے۔ جس کی مفصل بحث اپنے مقام میں مذکور ہے لہٰذا قوتِ دلیل کا فیصلہ بھی جمہور کے حق میں ہے اور جمہور کی اکثریت اور تعامل اس پر مستزاد ہے۔

وثالثاً: اس لئے کہ قرآنِ کریم کی جتنی آیات اس مقام پر مؤلف مذکور نے اپنے استدلال میں بیان اور ذکر کی ہیں وہ بالکل غیر متعلق ہیں کیونکہ پہلی آیت میں ہدایت کے مقابلہ میں جس فسق کا ذکر ہے وہ کُفر ہے۔ اسلام اور کُفر، توحید اور شرک وغیرہ بنیادی مسائل ہیں حق متعیّن منصوص اور محکم ہے لہٰذا حق کے مقابلہ میں باطل پرستوں کی کثرت کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور مسئلۂ سماعِ موتی کی ہرگز یہ پوزیشن نہیں ہے۔ اس میں قائلین اور مانعین دونوں طبقے مسلمان اور اہل السنت والجماعت سے وابستہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک طرف اکثریت اور جمہور ہیں اور دوسری طرف اقلیّت اور اُمت میں گنے چنے چند افراد ہیں اور دُوسری آیت اس لئے کہ خبیث وطیّب میں حرام وحلال کا تقابل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مسلم قوم کی بدقسمتی سے کہیں حرام کی کثرت ہو جائے تو وہ حلال کی قِلّت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ حرام حرام ہے اور حلال حلال ہے اور سماعِ موتی کا مسئلہ نفیاً واثباتاً اس طرز کا نہیں ہے، وہ ایک اختلافی مسئلہ ہے نہ کہ حرام وحلال کی کوئی حِسّی چیز۔ پھر مؤلف ہی ازرُوئے انصاف اور دیانت یہ فرمائیں (بشرطیکہ یہ دولت ان کے پاس ہو) کہ سماعِ موتی کے مسئلہ کا کون سا پہلو خبیث اور کون سا طیّب ہے؟ اَور ان میں سے کون سا گروہ خُبثاء کا اور کون سا طیّبین کا ہے؟ جراُت رندانہ اَور جسارتِ مجذوبانہ تو ان کو حاصل ہے ہی جس طرح جمہور کو زنبور کہنے سے وہ نہیں چوکے یہاں بھی تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر بے لاگ اور بے لوث طریقہ سے ضرور خُبثاء اور طیّبین کے گروہ کی تعیین کرتے جائیں؟ کیونکہ ؎

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے حور و خیام سے گزر بادہ و جام سے گزر

اور تیسری اور چوتھی اس لئے کہ اختلاف اس میں یہ ہے کہ جہاں کسی مسئلہ کے دو پہلو ہوں اور دونوں پر مسلمانوں کے بڑے بڑے علماء عامل ہوں تو اکثریت اور جمہور کے پہلو کو دُوسرے پر ترجیح ہو گی۔ مؤلف مذکور ہی بتائیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا لازم اور ایک گونہ عبادت ہے۔ کیا اس کی ناشکری کا پہلو بھی جائز اور مستحسن ہے تاکہ اس کا تقابل شکرگزاری سے کر کے ووٹوں کی گنتی کر کے اکثریت اور اقلیت کو متعین کیا جائے؟

اختلاف بڑی کثرت اور محض قلت میں نہیں ہے بلکہ اس مسئلہ میں ہے جہاں جانبین مسلمان علماء اور خدا پرست ہوں۔ ایک طرف اکثریت ہو اور دوسری طرف اقلیت تو کس کا ساتھ دینا زیادہ مناسب ہے؟ اور یَدُ اللّٰہِ علی الجماعة کا مفہوم کس پر زیادہ صادق آتا اور کس پر چسپاں ہے؟

سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جاست

ورابعاً: حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی عبارت میں حق و باطل کے الفاظ صراحت کے ساتھ موجود ہیں۔ معاذ اللہ تعالیٰ! اگر سماع موتی کا مسئلہ سرے سے باطل ہے تو آنحضرت ﷺ نے اس کا ثبوت کیوں فراہم فرمایا؟ اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر اِس وقت تک اُمت کی اکثریت اس باطل پر کیسے جمی رہی؟ لہٰذا یہ حوالہ بھی مؤلف کو مفید نہیں ہے۔

وخامساً: حضرت ابراہیم خواص رحمہ اللہ کا حوالہ بھی ان کے لئے مفید نہیں بلکہ مضر ہے اس لئے کہ یہاں افراد کی قلت اور کثرت کا تقابل نہیں بلکہ ایک ہی شخص میں کثرت روایت اور قلت علم کی صفت کا بیان ہے۔ یعنی اگر ایک شخص کے پاس کثرت سے روایتیں تو نہیں بلکہ وہ قلیل العلم ہے مگر اپنے علم کے بموجب عمل کرتا اور سُنن کی اقتداء اور پیروی کرتا ہے تو وہی صحیح معنی میں عالم ہے، نہ وہ کہ اُس نے کتابوں کے انبار تو جمع کر دیئے ہوں مگر عمل کا صفر ہو، جو کمثل الحمار یحمل اسفارًا کا مصداق ہے اور اس میں اقتدیٰ بالسنن کا جملہ صاف طور پر اس کا مقتضی ہے کہ مثلاً وہ سماع موتی کی حدیثوں کا قائل ہے اور اُن کی پیروی کرتا ہے اپنی ناقص رائے اور نارِسا عقل کی کسوٹی پر ان کو نہ پرکھے اور نہ ان کی غلط اُور دُور از کار تاویلات کرے جیسا کہ نیلوی صاحب کا یہ محبوب مشغلہ ہے۔

وسادساً: اس لئے کہ سوادِ اعظم کی تعریف میں علماء اور اہل السنت والجماعۃ کا تذکرہ ہے اور ان کا تقابل عوام سے ہے جو جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم سے الگ اور اہل سنّت کے راستہ کے خلاف ہو، ہمارا بھی اس پر صاد ہے لیکن مسئلۂ زیر بحث میں اہل السنت اور اہلِ بدعت کا اور علماء اور عوام کا تقابل نہیں ہے بلکہ علماء کا علماء سے اور اہل السنت کا آپس میں اختلاف ہے۔ اس لئے یہ حوالہ بھی اُن کو سُود مند نہیں ہے۔

وسابعاً: مجالس الابرار کا حوالہ بھی غیر متعلق ہے کیونکہ اس میں ان بدعات اور محدثات الامور کا ذکر ہے۔ جن پر حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد جہالت اور نفس پروری کی وجہ سے اکثریت کا تعامل ہو۔ ایسے مواقع پر سوادِ اعظم اور التزام حق کی پیروی کا سبق دیا گیا ہے اور یہ بات بالکل حق ہے۔ سماعِ موتی کا مسئلہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد کی پیداوار نہیں بلکہ اُسی دَور کا ہے اور صحیح صریح اور مرفوع احادیث سے ثابت ہے اور بجز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے (اگر معقول طریقہ سے اُن کا قول ثابت ہو جائے تب) جو فہم صحابی حجت نہیں، کے تحت داخل ہو کر قابلِ عمل نہیں اور خود مؤلف ''ندائے حق'' نے (ص ۱۴۴، ۱۴۵) میں فہم صحابی کا عنوان قائم کر کے اس پر بحث کی ہے اور لکھتے ہیں کہ: ''راوی صحابی کا فہم معتبر نہیں'' اور کسی نے اس کا انکار نہیں کیا اور نہ یہ مسئلہ محدثات الامور کی مد میں ہے۔

وسامناً: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت بھی مؤلف مذکور کو سود مند نہیں کیونکہ اس میں حق کا لفظ ہے جو باطل کے مقابل اطلاق ہوتا ہے اور مسئلۂ زیر بحث میں حق و باطل کا نزاع نہیں بلکہ صواب و خطاء کا اختلاف ہے کیونکہ مختلف فیہا اور اجتہادی اور فروعی مسائل کا اہلِ حق کے ہاں یہی مقام ہوتا ہے، قطعی حق اور قطعی باطل کا معاملہ

یہاں نہیں ہوتا۔ اسی طرح سواد اعظم کی تفسیر میں ما انا علیہ و اصحابی کا ارشاد بھی بجا ہے اور ہمارے حق میں ہے کیونکہ سماع موتی کا ثبوت آنحضرت ﷺ اور آپ کے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ بجز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کہ وہ اس میں متفرد ہیں اور فہم صحابی حجت نہیں ہے، اس لئے یہ حدیث بھی جمہور کی تائید میں ہے نہ کہ تردید میں۔ نعیم بن حماد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کہ جب جماعت ساری بگڑ جائے تو اکیلا جماعت ہے، کا یہ مطلب ہے کہ اگر بالفرض ساری جماعت بھی حق چھوڑ دے تو پھر تو اکیلا جماعت ہے۔ یہاں نہ کسی نے حق چھوڑا ہے نہ جماعت بگڑی ہے بلکہ حق پر قائم ہے، اسی طرح حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی ہمیں مضر نہیں۔ کیوں اس میں ہدایت اور ضلالت کا تقابل ہے اور بصورت گمراہی ہلاک ہونے والوں کا ذکر ہے اور اس کا بھی تذکرہ ہے کہ جب تیری رائے شریعت اور حقیقت کے موافق ہو تو پھر ساری مخلوق کی مخالفت کی بھی پرواہ نہ کر اور یہ مسئلہ اس رنگ کا نہیں ہے۔ یہ شریعت و حقیقت کے بھی موافق ہے اور اس میں اکثر مخلوق کی موافقت بھی ہے نہ کہ مخالفت اور علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد بھی درست ہے کہ لزوم جماعت کے امر کا مقتضیٰ یہ ہے کہ مکلف مجتہدین کے اجماعی مسائل کا پابند ہو اور وہی اہل علم ہیں۔ آگے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کہ سماع موتی کے مسئلہ میں اماموں میں سے کسی کا کوئی اختلاف نہیں جنھوں نے اس کے خلاف کہا ہے، ان کی بات غلط ہے۔ لہٰذا سماع موتی کا قائل مجتہدین حضرات کا پیرو ہے۔ اسی طرح علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد میں جماعت کے مفہوم سے ائمۃ العلماء، جماعت الصحابہ رضی اللہ عنہم اور جماعت اہل الاسلام مراد لی گئی ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ میں تمام اہل اسلام کا اجماع و اتفاق تو نہیں مسئلہ اختلافی ہے لیکن ائمۃ العلماء، جماعت الصحابہ رضی اللہ عنہم اور جماعت اہل الاسلام کی اکثریت کا یہی مسلک ہے۔

وتاسعاً (۹): حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد بھی صحیح ہے وہ جمہور اور اکثریت کے قول کو تسلیم کر کے راجح و مرجوح کا فرق اور لفظ ہمیشہ تحریر فرما کر اسے بیان فرماتے ہیں جو ایک خالص علمی اور تحقیقی بات ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مؤلف مذکور تو اس مسئلہ میں سرے سے اختلاف ہی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا تو یہ دعویٰ ہے کہ: ''اور عدم سماع موتی پر تمام صحابہ کرام کا اجماع ہو گیا۔''

''پس مطلب حل ہو گیا کہ سب صحابہ کا عدم سماع موتی پر اجماع ہے۔'' (ص ۱۵۱) لاحول ولا قوۃ الا باللہ!

اور پھر یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ جب اکثریت اور جمہور کا قول جو محض قیاسی اور اجتہادی ہی نہ ہو بلکہ اس کا مبنیٰ اور بنیاد صحیح صریح اور مرفوع احادیث پر قائم ہو تو اس کو کیسے مرجوح قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب کہ بعض حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ جب مسئلہ اور حادثہ میں حضرات ائمہ رحمہم اللہ سے کچھ منقول نہ ہو اور حضرات متاخرین رحمہم اللہ میں اختلاف ہو تو اکثر کے قول پر عمل ہو گا۔

چنانچہ حضرت مولانا عبدالحیٔ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ ''الحاوی'' للقاضی جمال الدین احمد بن نوح القابسی الغزنوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی فی حدود ۶۰۰ھ) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ: ''و ذکر فی الحاوی ایضاً اذا لم یوجد فی الحادثۃ عن واحد من ائمتنا جواب ظاهر وتکلم فیہ المشائخ المتأخرون قولاً واحداً یوخذ بہ فان اختلفوا یوخذ بقول الاکثرین ثم الاکثرین ممن اعتمد علیہ کابی حفص وابی جعفر وابی اللیث وغیرھم ممن یعتمد علیہ'' (مقدمہ عمدۃ الرعایۃ ص ۱۳)

ترجمہ: ''حاوی'' میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب کسی حادثہ میں ہمارے ائمہ کرام رحمہم اللہ سے کوئی جواب ظاہر نہ ہو اور اس میں مشائخ متاخرین رحمہم اللہ نے کلام کیا ہو اور ان کا صرف ایک ہی قول ہو تو اس کو لیا جائے گا اور اگر انہوں نے اختلاف کیا ہو تو پھر اکثر حضرات کا، جن پر اعتماد کیا گیا ہو قول لیا جائے گا۔ مثلاً امام ابوحفص رحمہ اللہ امام ابوجعفر رحمہ اللہ اور امام ابواللیث رحمہ اللہ وغیرہم جو قابلِ اعتماد حضرات ہیں۔

اور شارح مواقف ایک آیت کی دو تفسیریں نقل کرتے ہیں اور پھر آخر میں فرماتے ہیں: ''والمعتمد ھو قول الاکثرین'' (شرح مواقف ص ۱۶۷، طبع نولکشور لکھنؤ)

الغرض اختلافی مسائل میں اکثریت اور جمہور کے قول کو اگر معمول بہ ضروری بنایا جائے اور کسی معقول اور قوی وجہ سے اس کے مدِمقابل قول کو لیا جائے، تب بھی جمہور کو زنبور کہہ کر ان کو ہدف ملامت بنانا بھی تو کسی عالم کا کام نہیں ہے۔

دعاشراً (۱۰): مؤلف ندائے حق کا یہ کہنا کہ: ''ناظرین کرام سمجھ چکے ہوں گے کہ علماء حق کے ہاں جمہور کی کیا حیثیت ہے۔'' سو گزارش ہے کہ ناظرین کرام بحمد اللہ تعالیٰ بخوبی سمجھ چکے ہیں کہ جمہور کی حیثیت اختلافی مسائل میں بڑی مستحکم ہے اور ان کی خدمات اور حق پسندی قابل صد تحسین ہے۔ جمہور کو اہلِ حق کے مقابلہ میں لا کھڑا کرنا اور ان کو اہلِ حق سے نکال دینا اور پھر جمہور کے طریق کو ناجائز سے تعبیر کرنا اور سلف و جمہور اور اکابر کا مذاق اُڑانا اور پھر جمہور کو بریلویہ اَور شیعہ سے تشبیہ دے کر دِل ماؤف کی بھڑاس نکالنا اور اس پر موج میں آ کر ''نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن''...... چسپاں کر کے جمہور کے منصور مسلک کو ایک گونہ کفر سے تعبیر کرنا پرلے درجہ کی شقاوت قلبی اور خود رائی ہے۔ نعوذ باللہ تعالیٰ من سوء الفھم!

(۱۱) مؤلف مذکور کا یہ لکھنا کہ: ''ناقلین کی نقل نقل در نقل در نقل در نقل پر جمہور کا نام دھر دیتے ہیں۔ یوں تو ہر دوسرے سال جمہور کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا۔'' ان کے باطن اور ذہن کی غمازی کرتا ہے کہ جمہور کی کثرت اور تعداد میں اضافہ ہی سے مؤلف مذکور نالاں اور بے بس ہو کر جمہور کو جلی کٹی سنا رہے ہیں۔ مشہور کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ محترم! اگر گزشتہ چودہ صدیوں میں جمہور اور اکثریت کی معیت بحمد اللہ تعالیٰ صاحب تسکین کو حاصل ہے۔ پندرھویں صدی کے لوگوں کو بھی سلف، اکابر، جمِ غفیر، جمہور اور سواد اعظم پیروی نصیب ہو جائے تو یہ ان کی سعادت اور نیک بختی ہوگی اور جلنے والوں کی حرماں نصیبی ہوگی۔ مگر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ جب کہ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ!

بلاشبہ ہمارے پیر و مرشد قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اور شیخ الہند رحمہ اللہ اور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ وغیرہ حضرات نے اپنے علم اور تحقیق کی بناء پر اپنے تفردات کو بھی لیا ہے مگر یقین جانئے کہ نہ تو انہوں نے جمہور کو زنبور کہا ہے اور نہ اُن کا مذاق اُڑایا ہے اور نہ انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ علماء حق کے ہاں جمہور کی حیثیت کیا ہے؟ محترم! جس ڈگر پر آپ اور آپ کے بعض ضدی حواری چل رہے ہیں، یہی کتب اسلامیہ پر سے کلیۃً اعتماد اُٹھانے اور جمہور کو نامعتبر سمجھنے کا وہ راستہ ہے جسے اسلام کے کھلے مخالف بھی شاید سرانجام نہ دے سکیں جمہور حجّ شرعیہ تو نہیں مگر حجّ شرعیہ پر گامزن ضرور ہیں۔ کسی مسئلہ میں ان کے خلاف قول اختیار کرنے والے حضرات اگر علمی اور تحقیقی طور پر فروعی مسائل میں بزعم خود کیسی قوی دلیل کے پیشِ نظر اپنے قول اَور رائے پر عامل ہیں تو معذور ہو سکتے

ہیں لیکن اگر وہ مخلص ہوائے نفسانی اور تحزب وتعصب کا شکار ہو کر ایسا کرتے ہیں تو یقیناً وہ موردِ طعن ہیں۔

(۱۲) مؤلف مذکور کہتے ہیں کہ: ''اکثر ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ دوسرے عالم کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی تحقیق کو اپنی کتاب میں درج فرما دیتے تھے۔ اب اگر اتفاقاً پہلے عالم سے خطا ہو چکی تھی تو وہی غلطی نقل در نقل ہوتی چلی آئی۔'' سو عرض یہ ہے کہ سماع موتی عند القبور کا مسئلہ نہ کسی پہلے عالم کی خطا اور غلطی ہے اور نہ پچھلوں کی نقل در نقل میں غلطی اور خطاء واقع ہوئی ہے۔ یہ مسئلہ اس نبی معصوم ﷺ کی صحیح احادیث سے ثابت ہے جن کی بات میں سرے سے غلطی اور خطاء کا احتمال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (کیونکہ جہاں اجتہادی مسائل میں خطا اور ذلت صادر ہوتی رہی وہاں منجاب اللہ تنبیہ نازل ہوتی رہی اور آپ ﷺ کو خطاء پر باقی نہیں رکھا گیا مگر اس مسئلہ کی یہ حیثیت نہیں ہے) حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ اور علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کے حوالے درست اور صحیح ہیں مگر اس مسئلہ سے غیر متعلق ہیں جیسا کہ بالکل واضح ہے۔ مؤلف مذکور بزعم خود دشوار گزار مورچہ سر کر کے یوں گوہر افشانی کرتے ہیں کہ: ''اب ناظرین سوچیں کہ جس جمہور پر اِترایا جا رہا ہے، اُس کی کیا حیثیت رہ گئی۔ بڑی محنت سے کھودا پہاڑ نکلا چوہا، پھر وہ بھی مرا ہوا۔ اب بھی جمہور کا نام لوگے؟'' بلفظہٖ!

ناظرین کرام! خود انصاف فرمائیں کہ حضرات جمہور کے ساتھ اس سے بڑھ کر بھی کیا کوئی تمسخر ہو سکتا ہے؟ مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہئے کہ جمہور پر اعتماد کرنا اور ان کی بلند اور مضبوط حیثیت کو تسلیم کرنا اور ان کی علمی اور تحقیقی کارروائیوں پر دل سے یقین کرنا اور اُن کا ساتھ دینا سونے پر سہاگہ ہے اور آپ کی غیر متعلق باتوں کو نقل کرنے سے اُن کی حیثیت میں رَتی بھر فرق نہیں آیا اور کوئی بھی خدا ترس اور منصف مزاج عالم جمہور کا دامن نہیں چھوڑ سکتا اور بھلا جمہور کو چھوڑ کر جا بھی کہاں سکتا ہے؟ کیونکہ جمہور زندہ باد۔ جمہور زندہ باد۔

فائدہ: (مؤلف مذکور نے بزعم خویش ''الاعتصام'' سے مفید مطلب حوالہ تو نقل کر دیا ہے، اگر وہ ذیل کا حوالہ بھی نقل کر دیتے تو کیا ہی اچھا ہوتا اور خواص وعوام سب کو اس سے فائدہ ہوتا۔

چنانچہ اس میں لکھا ہے: ''اذا ثبت ان الحق هو المعتبر دون الرجال فاالحق ایضاً لا یعرف دون وسائطهم بل بهم یتوصل الیه وهم الادلاء علی طریقه''

(الاعتصام ج ۲ ص ۳۱۶، للامام ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی الغرناطی رحمہ اللہ المتوفی ۷۹۰ھ)

ترجمہ: ''جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اعتبار حق کا ہے رجال کا نہیں، تو یہ بات بھی ہے کہ حق ان رجال کے واسطہ کے بغیر پہچانا نہیں جا سکتا بلکہ انہی کی بدولت حق تک رسائی ہوتی ہے اور وہی حق کے راستہ کے راہ نما ہیں۔''

یعنی جو شخص رجال علم کے واسطہ کے بغیر حق تک پہنچنا چاہتا ہے تو اس غلطی پر ہے، کیونکہ ایسے ہی رجال علم حق تک رسائی کا ذریعہ اور واسطہ ہیں اور ان کے بغیر حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ مگر افسوس کہ ؎

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے ظاہر کئے فلک نے تھے جو خاک چھان کے

(۱۳) مؤلف مذکور بزعم خویش حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو منکرِ سماع موتی تصور کر کے بڑی موج میں آ کر لکھتے ہیں کہ: ''دراصل امام موصوف رحمہ اللہ کی فطرت سلیمہ اور تحقیق جانتی تھی کہ شرک میں داخل کرنے والا سب سے بڑا گیٹ مسئلہ سماع موتی کا ہے۔ اگر پکارنے والے اور نذر و نیاز دینے والے کو یقین ہو جائے کہ یہ میری پکار کو نہیں سُن سکتا تو پکارے کیوں؟'' (شفاء الصدور ص ۱۷)

اور کتاب ''شفاء الصدور'' کا تعارف کرانے والے بزرگ حقیقت بالکل مسخ کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں کہ: ''مثلاً عدمِ سماعِ موتی کی بحث میں اس جسم کے سماع کا قول عنا کر حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف اس قول کی نسبت کرنا یا اختلاف مابین الائمہ رحمہم اللہ اس جسم کے بارے کہنا دین پر کتنا ظلم ہے۔ حالانکہ اس جسم کے سماع کا کوئی امام بھی قائل نہیں اور نہ اختلاف کی یہ حقیقت ہے۔'' (بلفظہٖ شفاء الصدور ص ۱)

آپ اس کتاب میں اِن شاء اللہ تعالیٰ ملاحظہ کریں گے کہ سماعِ موتی کے سلسلہ میں جسمِ عنصری کا باقاعدہ تعلق ہے اور کوئی امام بھی سماعِ موتی کا منکر نہیں۔ خصوصاً حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اُمتِ مسلمہ کی اکثریت سماعِ موتی کی قائل ہے اور اس گیٹ سے بھی گزر رہے ہیں مگر یقین جانئے کہ ان میں کوئی بھی مُشرک نہ تھا۔ بفضلہٖ تعالیٰ سب کے سب مؤحد اور متبع سنت تھے اور یہ اس اَمر کی واضح دلیل ہے کہ محض سماعِ موتی کا مسئلہ شرک کا براہِ راست ذریعہ نہیں ہے۔ یہ اس شرط کے ساتھ شرک کا ذریعہ بنتا ہے کہ جب اس کے ساتھ شرک و جہالت کی آمیزش ہو جو ایک خارجی اَمر ہے اور ایک خارجی اَمر کو ساتھ ملا کر اس کو شرک بنانے کے بجائے یہ بہت زیادہ قرینِ انصاف ہے کہ حضرات سلف وخلف رحمہم اللہ کو شرک کی زد سے بچایا جائے اور ان کی خیر خواہی اور ان سے حُسنِ ظن بھی ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے۔

(۱۴) سماعِ موتی کے بارے میں چونکہ نصوص قطعیہ تو ہاتھ پلّے میں نہیں تھیں۔ کیونکہ قرآنِ مجید نے تو جہاں بھی تذکرہ کیا تو یوں فرمایا کہ مُردے نہیں سنتے۔ (نہ معلوم یہ کس قرآن مجید میں ہے کہ مُردے نہیں سنتے؟ معاف رکھنا قرآنِ کریم میں تو زندہ کافروں کے بارے میں آیا ہے کہ وہ صُمٌّ م بُکْمٌ ہیں اور نیز آیا ہے کہ فَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ مُردوں کے بارے میں تو کہیں نہیں آیا کہ وہ نہیں سنتے۔

مؤلف مذکور کی یہ کتنی کھلی جسارت ہے کہ وہ قرآنِ کریم میں بھی تحریف کرنے سے باز نہیں آئے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ فوا اسفا۔ صفدرؔ) تُو نہیں سنا سکتا۔ تمہاری پکاروں کو نہیں سنتے۔ پھر احادیث کی طرف دوڑے تو وہاں بھی کچھ نہ ملا۔ (آپ اسی کتاب میں ملاحظہ کر لینا کہ احادیث میں کچھ ملا ہے یا نہیں۔ صفدرؔ) بغیر معجزات اور خوارق عادات کے تو پھر ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا دروازہ کھٹکٹایا تو اندر سے جواب آیا (اس سے ثابت ہوا کہ مُردے سنتے بھی ہیں اور اندر سے جواب بھی دیتے ہیں۔ صفدرؔ) کہ لعنت ہو اُس پر جو یہ عقیدہ رکھے کہ مُردے سنتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے ''مُردے نہیں سنتے'' ''تُو نہیں سنا سکتا'' بلفظہٖ (شفاء الصدور ص ۱۰۶)

آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ مؤلف مذکور نے کس طرح حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر صریح بہتان باندھا ہے اور معاذ اللہ تعالیٰ ان کے ذمہ قرآنِ کریم کی تحریف لگا دی ہے کہ قرآن میں ہے کہ: ''مُردے نہیں سنتے'' اسی کتاب میں آپ دیکھیں گے کہ سماعِ موتی کے بارے میں صریح اور صحیح روایات اور احادیث موجود ہیں اور خود حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر حضراتِ ائمہ کرام رحمہم اللہ اور اسلامی دُنیا کی کیسی بڑی بڑی شخصیتیں سماعِ موتی کی قائل ہیں اور آپ دیکھیں گے کہ مؤلف مذکور کے اس شاہی فتویٰ کے رُو سے یہ لعنت کن کن ائمہ کرام اور اسلام کی کن کن عظیم شخصیتوں پر پڑتی ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

(۱۵) ''لیکن موٹی بات ۔۔۔ اگر کوئی شخص کہہ دے کہ مثلاً پاکستان کے مُردے شادی بیاہ کرتے ہیں اور گورستان میں رات کو نکل کر (اپنی قبروں سے) جو قریب ہوٹل ہوتے ہیں ان میں آکر چائے پیتے ہیں۔ حوضوں

اور تالابوں میں نہاتے ہیں یا کوئی کہہ دے کہ میں نے کئی مُردوں کو دیکھا ہے کہ موٹر سائیکل چلاتے ہیں۔ کیا ایک مولوی مدرّس دیو بندی عاقل بالغ باہوش وحواس یہ بات مان لے گا؟ جس طرح یہ چیزیں محال ہیں، مُردوں کا سماع بھی اسی طرح محال ہے۔ صحیح ثابت نہیں ہے پھر دوبارہ کہہ دیتا ہوں کہ معجزہ خرق عادت کرامت کو بحث میں نہ لانا۔''

(شفاء الصدور ص ۱۰۵)

مبتدی طالب علم بھی جانتے ہیں کہ محال کسی تقدیر اور کسی صورت میں ثابت نہیں ہوتا، لیکن حیرت ہے مؤلف مذکور پر کہ ایک طرف تو وہ بار بار لفظ محال بولتے ہیں اور دوسری طرف اہل حق کی گرفت کے ڈر سے بچنے کے لئے معجزہ، خرق عادت اور کرامت کو مستثنیٰ بھی کر جاتے ہیں۔ جب ایک چیز فی نفسہٖ محال ہے تو ان اُمور کو الگ کرنے کا کیا معنی؟ لیکن مؤلف مذکور بے چارے مجذوب بھی ہیں۔ جب وہ ایک چیز کی طرف اپنے ذہن کو مرتکز کرتے ہیں تو باقی چیزیں ان کے ذہن سے بالکل نکل جاتی ہیں۔ کہنے والوں نے کب یہ کہا ہے کہ عادۃً قبروں سے مُردے نکل کر یہ کارروائیاں کیا کرتے ہیں۔ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ کرامت اور خرقِ عادت کے طور پر کہیں ایسا ہوا اور اس کا واضح اور ٹھوس ثبوت ہو تو اس کا انکار نہیں کرنا چاہئے۔ علاوہ ازیں مؤلف مذکور کا عدم سماع موتی کو اس پر قیاس کرنا ایک تو نص کے مقابلہ میں قیاس ہے جو مردُود ہے۔ (آگے اِن شاء اللہ تعالیٰ صحیح حدیثیں آ رہی ہیں کہ مُردے سلام وغیرہ سنتے ہیں) اور دُوسرا یہ قیاس مع الفارق بھی ہے۔ اس لئے کہ قبور سے نکل کر ہوٹلوں میں چائے پینا یا حوضوں اور تالابوں میں چھلانگیں لگا کر نہانا اور بیاہ شادی وغیرہ کرنا خاصی نقل وحرکت کو چاہتا ہے اور عند القبر سماع میں ان کو ایک چھلانگ بھی قبر سے باہر نہیں لگانی پڑتی وہ لیٹے لیٹے ہی سُن سکتے اور سُن لیتے ہیں۔ لہٰذا ایسے عقلی ڈھکوسلوں سے ثابت شدہ مسائل کا انکار کرنا علم وانصاف سے کوسوں دُور ہے اور دہریوں اور نیز بد مذہبوں کے لئے دینی مسائل میں لب کشائی کے غلط مواقع پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ ہے۔

(۱۶) ''ان حوالہ جات میں دیو بندی حضرات کے حوالہ جات بھی درج کر دیئے ہیں محض اس لئے کہ بعض حضرات ایسے شریف الطبع ثابت ہوئے ہیں کہ محض عناداً کہہ دیتے ہیں کہ اہل دیو بند کا عقیدہ عدم سماع موتی کا نہیں ہے۔ بھلا حنفی مسلک بھی ہو اور سماعِ موتی کا قائل ہو ؎

ایں خیال است ومحال است وجنوں'' (ملخصاً ص ۱۷)

آپ اس کتاب میں ملاحظہ کریں گے کہ حضرات احناف رحمہم اللہ میں کتنے جلیل القدر بزرگ فقیہ اور علماء دیو بند میں کتنے اکابر مسئلہ سماعِ موتی کے واشگاف الفاظ میں قائل ہیں۔ حنفی دیو بندی بھی ہیں اور مسئلہ سماعِ موتی کے بھی قائل ہیں۔ خدا معلوم مؤلف ''شفاء الصدور'' علم وتحقیق کی کس دُنیا میں بستے ہیں؟ مؤلف مذکور نے اپنی کتاب میں غیر متعلق اور اُدھورے حوالے نقل کر کے اس اَمر پر سارا زور صرف کیا ہے کہ مُردے نہیں سنتے اور بعض حوالوں میں صراحۃً قطع وبرید بھی کی ہے اور اپنے مدعٰی کو ثابت کرنے کے لئے بزعم خویش پہلے سترہ (۱۷) قاعدے بیان کئے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں ان کی ہم نوائی کا کام آسان ہو۔ چونکہ براہِ راست کسی صریح دلیل سے مطابقی طور پر عدم سماعِ موتی کا مسئلہ ثابت کرنا بڑا مشکل تھا، اس لئے ان کو اس کے منوانے کے لئے پہلے سترہ (۱۷) قواعد وضع کرنے پڑے اور سترہ (۱۷) سیڑھیاں لگا کر مدعٰی ثابت کرنے کی ہمت کی۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:

فائدہ: ''ہم نے یہ قواعد اپنے اہلِ علم حضرات کی خدمت میں اس لئے پیش کئے ہیں کہ ان کو پڑھ کر مسئلہ عدمِ سماعِ موتی کو ان مذکورہ ضوابط وقواعد کے ماتحت سمجھنے کی کوشش فرمائیں۔ شتر بے مہار کی طرح نہ خود چلیں اور نہ کسی کو چلائیں۔ اکابرین کے نام پر دین فروشی شیوۂ اہلِ حق نہیں ہے۔'' (بلفظہٖ ص ۹)

اس سے معلوم ہوا کہ عدم سماعِ موتی کا شتر بے چارہ بغیرہ سترہ (۱۷) لگامیں دیئے چلنے ہی سے رہا۔ ہم مؤلف مذکور سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی اس مفید نصیحت پر ضرور غور اور عمل کریں کہ اکابرین کے نام پر دین فروشی شیوۂ اہلِ حق نہیں ہے۔ سچ ہے ؂

جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے

اس کے بعد مؤلف مذکور نے بابِ اوّل میں اپنے زعم کے موافق بارہ آیتیں پیش کی ہیں جن سے ان کا مقصد یہ ہے کہ مُردے نہیں سنتے۔ لیکن یقین جانئے کہ ان میں سے ایک بھی ان کے دعویٰ کی دلیل نہیں ہے۔ اصل بات جو قرآنِ کریم میں ہے اور جس کا مؤلف مذکور کے دعویٰ سے کچھ تعلق ہے۔ وہ یہ ہے: ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' یعنی بلا شبہ تو مُردوں کو نہیں سنا سکتا۔ سماع اور شے ہے جس کے درپے مؤلف مذکور ہے اور اسماع اور ہے، اس کی بقدرِ ضرورت بحث اسی کتاب میں اپنے مقام پر اِن شاء اللہ تعالیٰ آرہی ہے۔ پھر اس کے بعد مؤلف مذکور نے باب دوم میں عدم سماعِ موتی کے اثبات پر چودہ حدیثیں پیش کی ہیں اور یہ بہ جبر اور بزوران سے سیڑھیاں لگا لگا کر اپنا مطلب ثابت کیا ہے لیکن اس کشید سے نہ تو ان کا یہ مدّعیٰ ثابت ہوتا ہے اور نہ ان احادیث میں سے ایک حدیث بھی ان کی صراحت سے دلیل ہے اور خود مؤلف مذکور کو اس کا گہرا احساس ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''باقی رہا ایک خدشہ کہ ان میں کوئی صریح روایت نہیں جس میں لکھا ہو کہ مُردے نہیں سنتے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ایک اَمرِ بدیہی کے لئے اگر کوئی دلیل بیان نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔'' (شفاء الصدور ص ۳۵ طبع اوّل)

سوال یہ ہے کہ جب عدم سماعِ موتی اَمرِ بدیہی ہے تو مؤلف مذکور کو اس پر دلائل جمع اور پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر اکابر علماء کا اس میں اختلاف کیوں ہے؟ کیا ایک بدیہی بات میں بھی اتنا اور اس قدر اختلاف ہوتا ہے؟ اور پھر کیا وجہ ہے کہ تقریباً چودہ سو سال سے یہ بدیہی مسئلہ حل نہیں ہو سکا؟ اور پھر ایک بدیہی مسئلہ میں عامۃ المسلمین کے ذہن کو آپ نے کیوں پریشان کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مؤلف مذکور نرے مجذوب ہیں۔ ناتمام حوالے جمع کرنے اور بزوران سے مطلب کشید کرنے اور غلط بات پر اصرار کرنے کے سوا ان کا کوئی کمال ہی نہیں ہے۔

مؤلف مذکور اپنی دوسری کتاب (ندائے حق ص ۱۵۱) میں لکھتے ہیں: ''اور اگر حق سمجھا (دلیلِ عائشہ رضی اللہ عنہا کو) تو یہ صحابہ کا سکوت بطورِ ندامت کے تھا کہ کیسے صاف صاف قرآنِ پاک میں سماعِ موتی کی نفی وارد ہے (کسی ایک آیت کریمہ میں سماعِ موتی کی نفی وارد نہیں، چہ جائیکہ صاف صاف ہو۔ اسماع کی نفی الگ حقیقت ہے، بحث اِن شاء اللہ تعالیٰ آرہی ہے۔ صفدرؔ) مگر ہمارے ذہن میں ڈھول ہو گیا۔ مارے شرمندگی کے خاموش ہو گئے اور اس مسئلہ میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہو گئے'' ''اور عدم سماعِ موتی پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو گیا۔'' (بلفظہٖ)

مؤلف مذکور نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مسئلہ عدم سماعِ موتی پر اجماع کا جو دعویٰ کیا ہے، یہ سراسر جھوٹ اور خالص افتراء اور نرا بہتان ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر تا ہنوز اس مسئلہ میں اختلاف چلا

آرہا ہے۔ لیکن مؤلف مذکور کی دیدہ دلیری دیکھئے کہ وہ اپنے باطل دعویٰ کے لئے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت کو کس طرح ڈھول کا طعنہ دے کر اوران پر شرمندگی کا داغ لگا کر مطلب براری کر رہے ہیں۔ واضح دلائل کے ساتھ یہ ثابت ثابت ہے کہ جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سماع موتی کے قائل تھے، وہ آخر دم تک قائل رہے اور ان میں سے کسی ایک نے بھی رجوع نہیں کیا۔ اس کے برعکس فتح الباری کے حوالہ سے یہ روایت آگے بیان ہوگی۔ إن شاء اللہ تعالیٰ کہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سماع موتی کی قائل ہوگئی تھیں اور اس مسئلہ میں وہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت سے مل گئی تھیں۔

کیا سماعِ موتی معتزلہ کا مذہب ہے؟

مؤلف ندائے حق اپنی فہرست مضامین میں یہ عنوان قائم کرتے ہیں۔ ''سماعِ موتی دراصل معتزلہ میں سے ایک گروہ صالحیہ کا مذہب ہے'' اور اس عنوان پر وہ اپنی کتاب کے (ص ۱۲۷) میں یوں گوہر افشانی کرتے ہیں:
''معتزلہ میں سے صالحیہ فرقہ کا عقیدہ ہے کہ میت (مردہ) جانتا بھی ہے اسے قدرت بھی ہے۔ اس کا اِرادہ بھی ہوتا ہے۔ سُنتا دیکھتا بھی ہے۔ (شرح المواقف) تو اَب اس اعتبار سے سماع الموتی کی اضافت بھی درست ہوگئی اور مُردوں کا سننا بھی درست ہوگیا۔ بس تھوڑی سی کل مروڑنے کی کسر ہے۔ مذہب اہل السنت والجماعت سے ہٹ کر مذہب صالحیہ اختیار کر لیا۔ عقیدہ پختہ ہوگیا عقدہ حل ہوگیا۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔'' (بلفظہٖ)

الجواب: اس کو کہتے ہیں۔ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ مؤلف مذکور کو ما شاء اللہ تعالیٰ سمجھ سے تو کوئی سروکار ہی نہیں۔ بس مجذوبوں کی طرح کچھ کہنے کے عادی ہیں۔ دعویٰ و دلیل میں مطابقت اور بات کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ بفضلہٖ تعالیٰ ہم عرض کئے دیتے ہیں کہ معتزلہ کے فرقہ صالحیہ نے کیا کہا؟ اور ان کا ہم نوا کون ہے؟ آیا اہل السنت والجماعت یا مؤلف مذکور، اوران کے حقیقت نا آشنا گرضدی اور ہٹ دھرم حواری!

مواقف اور اس کی شرح میں ہے: ''الصالحیة اصحاب الصالحی و من مذھبم انھم جوّزوا قیام العلم والقدرة والارادة والسمع والبصر بالمیّت ویلزمھم جواز ان یکون الناس مع اتصافھم بھذہ الصفات اموا تاوان لا یکون الباری تعالٰی حیّاو جوّزوا خلو الجوھر عن الاعراض کلھا'' بلفظہ

(شرح المواقف ص ۷۵۰، طبع نولکشور لکھنؤ)

''صالحیہ فرقہ صالحی کے پیروکار ہیں اوران کا مذہب یہ ہے کہ انہوں نے علم وقدرت اور اِرادہ اور سمع اور بصر کا قیام میت سے جائز رکھا ہے اوران پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ یہ جائز سمجھیں کہ لوگ ان صفات کے ساتھ موصوف ہوکر بھی مُردے ہوں اور یہ کہ (معاذ اللہ تعالیٰ) باری تعالیٰ زندہ نہ ہو اور انہوں نے یہ بھی جائز قرار دیا ہے کہ جوہر تمام اعراض سے خالی ہو۔''

معتزلہ کے صالحیہ فرقہ کا یہ غیر معقول مسلک ہے کہ قبر میں اعادۂ روح اور زندہ کئے جانے کے بغیر ہی محض بے جان دھڑ اور جسد کو عذاب ہوتا ہے اور منکر ونکیر کے سوال کو وہ سنتا اور جواب دینے کا اِرادہ کرتا اور پھر جواب دینے پر قدرت رکھتا اور فرشتوں کو دیکھتا ہے۔ قاضی عضد الدین ایجی رحمہ اللہ اور علامہ سید سند رحمہ اللہ ان کے ساتھ علمی مناقشہ کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ اگر بغیر احیاء (زندہ کرنے) اور بغیر اعادۂ رُوح کے مُردے ان صفات سے متصف ہو

سکتے ہیں تو اس کا دُوسرا پہلو اور تصویر کا دُوسرا رُخ یہ نکلتا ہے کہ زندہ لوگ جو ان صفات سے متصف ہیں، مُردے کہلائیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ جو ان صفات کے ساتھ ہمیشہ سے متصف ہے، وہ بھی زندہ اور حی نہ ہو۔ (معاذ اللہ تعالیٰ)

چنانچہ خود مواقف اور اس کی شرح میں سوال وجواب و نعیم فی القبر کی بحث میں تصریح ہے کہ: ''واما ماذھب الیہ الصالحی من المعتزلۃ و ابن جریر الطبری و طائفہ من الکرامیۃ من تجویز ذٰلک التعذیب علی الموتٰی من غیر احیاء فخروج عن للعقول لان الجماد لا حِسّ لہ فکیف یتصور تعذیبہ'' (مواقف مع الشرح ص ۷۱۶)

ترجمہ: ''جس مسلک کو معتزلہ کے صالحی اور ابن جریر طبری اور کرّامیہ کے ایک گروہ نے اختیار کیا ہے کہ وہ مُردوں کو بغیر زندہ کرنے کے عذاب جائز قرار دیتے ہیں تو یہ غیر معقول ہے کیونکہ (بغیر رُوح کے) نرے دھڑ میں حِس نہیں۔ سو اس کو سزا اور عذاب دینے کا تصور کیسے؟

معتزلہ کا صالحیہ فرقہ یہ کہتا ہے کہ قبر میں مُردہ کو زندہ نہیں کیا جاتا اور نہ اس کی طرف اعادۂ رُوح ہوتا ہے (اور یہی مسلک مؤلف ندائے حق اور ان کے حواریوں کا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ صالحیہ فرقہ نرے بے رُوح جسم کے عذاب کا قائل ہے اور بغیر احیاء اَور اعادۂ رُوح کے وہ اس کے لئے علم۔ سمع اور قدرت وغیرہ ثابت کرتا ہے اور مؤلف مذکور رُوح اور جسد مثالی سے اس کارروائی کو وابستہ کہتے ہیں) مگر مؤلف مذکور اپنی کم فہمی کی وجہ سے عوام کو یہ غلط تأثر دے رہے ہیں کہ سماع موتی کا مسئلہ صالحیہ کا ہے اور پھر اہل السنّت والجماعت سے جن الفاظ سے وہ تمسخر کر رہے ہیں وہ بھی بالکل عیاں ہے۔ اس کو کہتے ہیں کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا اور وہ بھی مرا ہوا۔ سبحان من بیدہٖ ملکوت کل شیءٍ!

مسئلہ سماعِ موتی اختلافی ہے

حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک دَور اور خیر القرون کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک یہ مسئلہ اختلافی چلا آ رہا ہے کہ قبروں کے پاس اگر کوئی شخص اہل قبور کو سلام وغیرہ عرض کرے تو مُردے سُنتے ہیں یا نہیں؟ ایک گروہ سماع موتی کا قائل ہے جس میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ حضرات مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ رحمہم اللہ کا جمِ غفیر اور حضرات احناف رحمہم اللہ کا معتدبہ طبقہ اور اکابر علماء دیو بند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم کی اکثریت شامل ہے۔ (غیر مقلدین حضرات کا اس مسئلہ میں آپس میں خاصا اختلاف ہے۔ قاضی شوکانی، امیر یمانی، نواب صدیق حسن خان اور مولانا وحید الزمان خاں صاحب رحمہم اللہ وغیرہ حضرات شدّ و مد کے ساتھ سماعِ موتی کے قائل ہیں۔ جب کہ غیر مقلدین حضرات کے شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی رحمہ اللہ اور ان کے بیشتر تلامذہ اس کے منکر ہیں۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ نذیریہ و ثنائیہ) جن کے کچھ ضروری حوالے اسی کتاب میں اپنے مقام میں ذکر ہوں گے اور ان میں سے ہر فریق کے ضروری دلائل بھی اس کتاب میں بیان کر دیئے جائیں گے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ اس مسئلہ کے اختلافی ہونے کا انکار یا تو نِرے جاہل اور ضدی سے سرزد ہوگا اور یا کسی مجذوب سے، ورنہ کوئی بھی حقیقت شناس دیانت دار عالم اور خدا خوف مسلمان اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ ہم اس مقام پر مسئلہ کی وضاحت کے لئے فقیہ دوران قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) اور بعض دیگر اکابر کی چند عبارات اور حوالے عرض کرتے ہیں تاکہ اس مسئلہ کے اختلافی ہونے کا پہلو بالکل نمایاں اور روشن ہو جائے اور مؤلف ندائے حق کا یہ بالکل باطل نظریہ کہ: ''یہ وہم ہے، سلف میں یہ مسئلہ مختلف فیہ نہ تھا، قطعاً نہ تھا۔'' (ص ۱۵۳) کلیۃً مردُود ہو جائے۔

(۱) حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ مسئلہ سماع موتی کے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

الجواب: مسئلہ سماع موتی کا قرنِ اوّل میں مختلف ہوا ہے۔ اب اس کا فیصلہ تو ممکن ہی نہیں مگر بتقلید اپنے مجتہد مقلد کی کوئی ترجیح کی جانب اگر کوئی میلان کرے تو مضائقہ نہیں۔ سو مسلک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مثل طریقہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے یہ ہے کہ آیت قطعی کو اپنی حالت میں رکھ کر اور معنی حقیقی پر حمل کر کے کہ اصل موضوع لہٗ ہے۔ حدیث میں جو شرح قرآن ہے مناسب تاویل مناسب ہے جب تک قطع معنی حدیث پر حاصل نہ ہو جائے۔ چنانچہ اُصول میں مبرہن ہے۔ پس آیت: ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' قطعی خاص اور احادیث سماع ظنی اخبار احاد سے تخصیص کس طرح درست ہو سکتی ہے۔ پھر اس آیت میں استعارہ ہے کہ کفار کو اموات و صم سے تشبیہ دیا ہے اور مستعار منہ میں معنی وجہ شبہ کے حقیقۃً ہوتے ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ میّت اور اصم میں صلاح سماعت نہیں لہٰذا معنی عدم اجابت کے جو مجاز ہے مشبہ بہ میں لینا کیسے درست ہوگا؟ (دوسرے حضرات کے نزدیک اس تشبیہ کی مُراد حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت اور علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ کی عبارت میں اَور اسی طرح دیگر اکابر کی عبارات میں دوسرے طریق سے ہے، وہاں ملاحظہ کر لیں۔ صفدرؔ) البتہ مشبہ میں یہ ہی مُراد ہے لہٰذا حسب قاعدہ مرجح جانب عدم سماع ہے اَور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چونکہ فخرِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ مِنْهُمْ سنا تھا تو ان کے نزدیک یہ حدیث بھی قطعی تھی۔ سو جو کچھ معنی انہوں نے سمجھے اس فہم کی وجہ سے اگر (آیت مذکورہ کی۔ صفدرؔ) تخصیص کریں ہو سکتا ہے ورنہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے تو خود حدیث میں تاویل کی اور آیت کو بحال خود رکھا اور جمع کر دیا۔ الحاصل راجح مذہب عدمِ سماع کا ہے۔ حسب قواعد پس احادیث سماع میں تاویل مناسب ہے ورنہ دوسری جانب بھی مذہب قوی ہے اور زیادہ بسط کی گنجائش نہیں۔ اگر بغور مطالعہ فرماؤ گے، تو توقع ہے کہ اصل مُراد کو آپ تصدیق فرمادیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم! (لطائف رشیدیہ ص ۸،۹)

(۲) ترمذی شریف پڑھاتے وقت حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے جو کچھ اِرشاد فرمایا اس کو حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۳۴ھ) نے کتابی شکل میں جمع کر دیا ہے جس کا نام ''الکوکب الدری'' ہے، اس میں حدیث: ''السّلام عَلَیْکُمْ یا اھل القبور'' کی تفسیر میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''اس حدیث کے ظاہر سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے جو سماع موتی کے قائل ہیں۔ ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کا استدلال اور روایات سے بھی ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ میّت کے پاس جب دو فرشتے منکر و نکیر حاضر ہوتے ہیں تو اس وقت وہ قبر سے واپس آنے والوں کی جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ سنتی ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ میّت کے دفن ہونے کے بعد فرشتوں کے جلدی آنے سے کنایہ ہے، حقیقت مراد نہیں ہے اور جو حضرات سماع موتی کا انکار کرتے ہیں وہ اس خطاب کے صحیح قرار دینے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ یہ سلام فرشتوں کے واسطہ سے میّت کو پہنچتا ہے اور جو حضرات سماع موتی کا انکار کرتے ہیں۔ ان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں: ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' کیونکہ جب کفار کو عدم سماع میں مُردوں سے تشبیہ دی گئی ہے تو معلوم ہوا کہ مُردے نہیں سنتے وَرنہ یہ تشبیہ درست نہیں ہوتی اور جو یہ کہا گیا ہے کہ یہ ''وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی'' کے قبیل سے ہے تو یہ تام

نہیں۔ کیونکہ اس بناء پر بعد کا یہ ارشاد: ''اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا'' صحیح نہیں ہوتا کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت واقتدار پہلی جز و میں ہے، اسی طرح دوسری میں بھی ہے۔ پس کیسے صحیح ہوگا کہ ایک نوع آنحضرت ﷺ کے لئے ثابت کی جائے اور دوسری کی نفی ہو۔ باقی سماع موتی کے ثابت کرنے والے جو یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے بدر کے کنوئیں پر کھڑے ہو کر مقتولینِ بدر کو خطاب کیا تھا اور یہ صاف طور پر سماع موتی پر دال ہے تو اس کا جواب منکرین نے یہ دیا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان مقتولوں کی رُوحیں ان کے جسموں میں لوٹا دیں تا کہ وہ آنحضرت ﷺ کا خطاب سن لیں اور یہ ان کی زجر وتوبیخ اور ان کے عذاب کے اضافہ کے لئے تھا اور بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ آپ ﷺ نے اس لئے خطاب کیا تا کہ زندہ مشرکینِ قریش کا غصہ اس سے اور بڑھے اور آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو یہ فرمایا کہ تم ان سے زیادہ نہیں سنتے تو اس کا معنی یہ ہے کہ تم ان سے زیادہ نہیں جانتے۔ یہ تفسیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کی ہے سو یہ بھی سماع کی دلیل نہیں ہے۔ پس ظاہر یہ ہے کہ سماع کا انکار کیا جائے اور ہمارے نزدیک یہی بات زیادہ صحیح ہے اور بحث اس مسئلہ میں طویل ہے۔ یہ اس کا موقع نہیں ہے۔'' (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۱۹، مترجماً)

(۳) قبور سے اس طور پر دُعا کرنا کہ اے صاحب قبر اس طرح میرا کام کردے تو یہ حرام اور شرک بالاتفاق ہے۔ (یعنی اس کو پکارے اور اس سے مُراد مانگے۔ ہمارے پیر ومُرشد رئیس المؤحدین حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۶۳ھ) تفسیر بے نظیر (ص ۴۸) میں بحوالہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''وہ لوگ جو انبیاء اور صالحین کو بعد موت کے نزدیک سے پکارتے ہیں، وہ مشرک ہیں۔'' اس سے بھی یہی صورت مراد ہے) اور یہ بات کہ تم میرے واسطے دُعا کرو تو اس باب میں اختلاف ہے۔ منکرینِ سماع موتی اس کو لغو نا جائز کہتے ہیں اور مجوزین سماع جائز جانتے ہیں اور یہی بندہ نے پہلے بعض سائلین کے جواب میں لکھا ہے۔ بندہ مختلف فیہا مسائل میں فیصلہ نہیں کرتا لیکن احوط کو اختیار کرتا ہوں۔'' فقط واللہ تعالیٰ اعلم رشید احمد گنگوہی عفی عنہ!

(فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۲۳، طبع جید برقی پریس دہلی)

(۴) استعانت کے تین معنی ہیں۔ ایک یہ کہ حق تعالیٰ سے دُعا کرے کہ بحرمت فلاں میرا کام کردے یہ باتفاق جائز ہے۔ خواہ عند القبر ہو خواہ دُوسری جگہ۔ اس میں کسی کو کلام نہیں۔ دوسرے یہ کہ صاحب قبر سے کہے کہ تم میرا کام کردو۔ یہ شرک ہے خواہ قبر کے پاس کہے خواہ قبر سے دُور کہے۔ (حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۲۵ھ) فرماتے ہیں: ''دُعا از آنہا خواستن حرام است۔'' (مالا بدمنہ ص ۸۱) یعنی مُردوں سے مُراد مانگنا حرام ہے) اور بعض روایات میں جو آیا ہے ''اعینونی عباد اللہ'' تو وہ فی الواقع کسی میت سے استعانت نہیں بلکہ عباد اللہ جو صحرا میں موجود ہوتے ہیں، ان سے طلب اعانت ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو اس کام کے واسطے وہاں مقرر کیا ہے تو وہ اس باب سے نہیں ہے۔ اس سے حجت جواز لانا جہل ہے۔ معنی حدیث سے (یہ حدیث حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ بن غزوان، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے راوی ثقہ ہیں۔ (ورجالہ ثقات مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۳۲ اور ابن سنی ص ۱۶۲ اور حصن حصین ص ۱۶۳) میں بھی یہ روایت موجود ہے) تیسرے یہ کہ قبر کے پاس جا کر کہے کہ اے فلاں تم میرے واسطے دُعا کرو

کہ حق تعالیٰ میرا کام کر دیوے۔ اس میں اختلاف علماء کا ہے۔ مجوز سماع موتی اس کے جواز کے مقر ہیں اور مانعین سماع منع کرتے ہیں۔ سو اس کا فیصلہ اب کرنا محال ہے مگر انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں اسی وجہ سے ان کو مستثنیٰ کیا ہے اور دلیل جواز یہ ہے کہ فقہاء نے بعد سلام کے وقت زیارت قبر مبارک کے شفاعت و مغفرت کا عرض کرنا لکھا ہے۔ پس یہ جواز کے واسطے کافی ہے اور جس کو قاضی (ثناء اللہ) صاحب رحمہ اللہ نے منع لکھا ہے وہ دوسری نوع کی استعانت ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ مسئلہ مخلوط ہو رہا ہے (کہ میت سے مراد مانگنا اور اس سے دُعا کی التجاء کرنا ایک سمجھ لیا گیا ہے جیسا کہ مؤلف ندائے حق وغیرہ نے یہی سمجھ رکھا ہے) اور سماع موتی کا مسئلہ بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کے وقت سے مختلف فیہ ہے۔ سلام کرنے کو کوئی منع نہیں کرتا۔ بہر حال یہ مسئلہ مختلفہ ہے اس میں بحث مناسب نہیں فقط واللہ تعالیٰ اعلم! رشید احمد گنگوہی عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۹۹، ۱۰۰)

اس عبارت میں حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے عند القبر سماع کا اتفاقی اور اجماعی ہونا صراحت سے مذکور ہے اور عند القبر استشفاع کے جواز کی بھی بحوالۂ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تصریح موجود ہے۔ نیز مُردوں سے جائز و ناجائز استعانت کا فرق اور حکم بھی بیان کر دیا گیا ہے۔

(۵) اور تفصیل یہ ہے کہ استمداد تین قسم ہے۔ ایک یہ کہ اہل قبور سے مدد چاہئے۔ اس کو سب فقہاء نے ناجائز لکھا ہے۔ دوسرے یہ کہے، اے فلاں خدا سے دُعا کرو کہ فلاں کام میرا پورا ہو جائے۔ یہ مبنی اُوپر مسئلہ سماع کے ہے۔ جو سماع موتی کے قائل ہیں اُن کے نزدیک درست، دوسروں کے نزدیک ناجائز۔ اسی کو شیخ (عبدالحق محدّث دہلوی رحمہ اللہ شرح مشکوٰۃ بزبان عربی یعنی اللمعات) نے لکھا ہے: ''الاستمداد باھل القبور فی غیر النبی والانبیاء علیہم السلام فقد انکرہ کثیر من الفقھاء'' انبیاء کو اسی وجہ سے مستثنیٰ کیا کہ ان کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں۔ تیسرے یہ کہ دُعا مانگے الٰہی بحرمت فلاں میرا کام پورا کر دے۔ یہ بالاتفاق جائز ہے اور تمام مجروں میں موجود ہے۔ اسی وجہ سے اقوال علماء میں اختلاف ہے کہ استمداد لفظ مشترک ہے۔ کسی نے کسی کو لیا کسی نے کسی کو، قول ہر ایک کا اپنے معنیٰ و مُراد پر صحیح ہے۔ فقط محمد حسن عفی عنہ۔ مدرّس مدرسہ گلاوٹی مدرّس اوّل۔ الجواب بھذا التفصیل صحیح رشید احمد گنگوہی عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۲ ص ۸)

اِس عبارت میں بحرمت فلاں کے الفاظ سے توسّل اور دُعا کو بالاتفاق جائز بتایا ہے اور لفظ استمداد کے اشتراک کا تذکرہ اور اس کا الگ الگ شرعی اور فقہی حکم بھی صاف طور پر بیان کر دیا ہے۔

(۶) سوال: میّت قبر میں سنتی ہے یا نہیں؟

الجواب: اموات کے سننے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک سُنتی ہے، بعض کے نزدیک نہیں سنتی۔ فقط (فتاویٰ رشیدیہ ج ۳ ص ۱۱۳)

حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کے ان صریح ارشادات سے واضح طور پر یہ ثابت ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے عند القبور سماع کا مسئلہ اتفاقی اور عام اموات کے سماع کا مسئلہ اختلافی ہے اور یہ اختلاف حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وقت سے لے کر تا ہنوز بدستور چلا آ رہا ہے۔ اگر عدم سماع موتی پر حضرات صحابہ کرام کا اجماع ہو چکا تھا جیسا کہ مؤلف ''شفاء الصدور'' اور ''ندائے حق'' کا یہ بے بنیاد اور سراسر باطل دعویٰ ہے تو پھر علماءِ ملّت کا

اس مسئلہ میں اختلاف کیوں ہوا؟ اور کیوں ہے؟ کیا تمام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کے بعد بھی حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کو اختلاف کی کوئی گنجائش ہے؟ الغرض مسلکیؒ سماع موتی کے اختلافی ہونے کا انکار کرنا جیسا کہ مؤلف مذکور نے کیا ہے، علمی طور پر انتہائی بد دیانتی ہے۔

مفتی اوّل دار العلوم دیو بند

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیو بندی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۴۷ھ) نے سماع موتی کے بارے میں مختلف فتوے دیئے ہیں جن میں سے بعض فتوؤں کا تعلق عدم سماع موتی سے ہے اور ان کا یہ فتویٰ بھی ہے:

سوال نمبر ۳۱۸۹: بروئے مذہب احناف بزرگانِ دین کے مزارات پر جا کر یہ عرض کرنا کہ آپ مقبولِ خداوندی ہیں، آپ ہمارے لئے دُعا کر دیجئے کہ ہماری فلاں مُراد پوری ہو جائے۔ یہ جائز ہے یا نہ؟

سوال نمبر ۳۱۹۰: امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک بزرگانِ دین بعد وفات زائرین کی باتیں سنتے ہیں یا نہیں؟

سوال نمبر ۳۱۹۱: کیا یہ صحیح ہے کہ امام صاحب موصوف رحمہ اللہ نے کسی شخص کو کسی قبر پر اہل قبر سے کچھ عرض و معروض کرتے دیکھا اور فرمایا کہ تو ایسے سے التجاء کرتا ہے جو سُن بھی نہیں سکتا۔

سوال نمبر ۳۱۹۲: اگر کوئی آیت یا حدیث امام صاحب رحمہ اللہ کے قول کی تائید میں ہو تو وہ بھی تحریر فرمایئے۔

الجواب: (۱ تا ۴) سماع موتی میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے ہے۔ بہت سے ائمہ سماع موتی کے قائل ہیں اور حنفیہ کی کتب میں بعض مسائل ایسے موجود ہیں (یعنی مسئلہ یمین۔ صفدر) جن سے عدم سماع موتی معلوم ہوتا ہے مگر امام صاحب رحمہ اللہ سے کوئی تصریح اس بارہ میں نقل نہیں کرتے اور استدلال عدم سماع کا آیت: ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' وغیرہ سے کرتے ہیں اور مجوزین کا استدلال حدیث: ''ما انتم باسمع منھم'' اور حدیث سماع قرع نعال سے ہے اور آیت مذکورہ کا یہ جواب دیتے ہیں کہ نفی سماع قبول کی ہے۔ غرض یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور قول فیصل ہونا اس میں دُشوار ہے۔ پس عوام کو سکوت اس میں مناسب ہے۔ جب کہ علماء کو بھی اس میں تردّد ہے اور دلائل فریقین موجود ہیں اور جب کہ سماع موتی میں اختلاف ہوا تو اس میں بھی ہوا کہ بزرگانِ دین کے مزارات پر اس طرح دُعا کرنا کہ تم اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو کہ میری فلاں حاجت پوری فرما دے۔ یہ بھی مختلف فیہ ہوگا۔ البتہ احوط یہ ہے کہ اس طرح دُعا کرے...... کہ یا اللہ! اپنے اس نیک بندے کی برکت سے میری دُعا قبول فرما اور میری حاجت پوری فرما۔'' بلفظہ (فتاویٰ دار العلوم مدلل و مکمل ج پنجم ص ۴۶۱ طبع دیو بند)

اس فتویٰ سے یہ اُمور بصراحت معلوم ہوتے ہیں:

(۱) یہ مسئلہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تا ہنوز اختلافی چلا آ رہا ہے۔ (۲) اور فریقین کے پاس دلائل موجود ہیں۔ (۳) فقہ حنفی کی کتب میں بعض مسائل سے عدم سماع موتی معلوم ہوتا ہے۔ (۴) لیکن حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے اس بارہ میں کچھ منقول نہیں۔ (یعنی فتویٰ غرائب کا جو حوالہ منکرین سماع موتی حضرت امام صاحب رحمہ اللہ کی طرف نسبت کرتے ہیں وہ بے اصل ہے) (۵) بزرگوں کے طفیل اور وسیلہ سے دُعا مانگنا درست اور صحیح ہے۔ وغیرہ وغیرہ!

مؤلف اقامۃ البرہان لکھتے ہیں کہ (جواہر القرآن ص ۹۰۲ تا ۹۰۵ تفسیر سورۂ رُوم) وہاں ہم نے لکھا تھا کہ:

''سماعِ موتی کا مسئلہ زمانِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مختلف فیہ چلا آرہا ہے یہ مسئلہ اعتقاداتِ ضروریہ میں سے نہیں جن کی نفی یا اثبات پر کُفر واِسلام کا مدار ہے بلکہ یہ ایک علمی وتحقیقی بحث ہے جس میں بحث وتمحیص اور نظر وتحقیق کی گنجائش ہے۔ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے علماء کے درمیان اس مسئلہ میں ہمیشہ دو رائیں رہی ہیں۔ کچھ علماء کرام کی یہ رائے رہی ہے کہ مُردے سنتے ہیں۔ جب کہ دُوسرے علماء نے اپنی تحقیق کی بناء پر سماعِ موتی کی نفی کی ہے۔ علماء کرام کی ان دونوں جماعتوں کے پاس دلائل ہیں جن پر انہوں نے اپنی اپنی رائے اور تحقیق کی بنیادیں اُستوار کی ہیں جو سماعِ موتی کی نفی کرتے ہیں۔ ان کا استدلال ظواہر قرآن اور احادیث صحیحہ سے ہے۔ جب کہ قائلین سماعِ موتی بھی صحیح حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔'' (ص ۶۷)

نیز لکھتے ہیں کہ: ''جواہر القرآن'' میں ہم نے اپنا جو مؤقف تفصیل سے بیان کیا ہے اِس کا حاصل یہ ہے کہ سماعِ موتی کا تعلق احوالِ برزخ سے ہے اور احوالِ برزخ کا علم وحی سے سوا ممکن نہیں۔ اس لئے ضابطہ تو یہی ہے کہ مُردے نہیں سنتے لیکن جن احوال میں مُردوں کے سننے کی بعض احادیث میں صراحت ہے۔ وہ اپنے احوال وموارد کے ساتھ مخصوص ہوں گی اور اس سے عموم احوال میں سماعِ موتی پر استدلال صحیح نہیں ہوگا۔'' (جواہر القرآن ص ۹۰۴)

''ہمارے مؤقف کی اس توضیح سے یہ بات روشن ہے کہ ہم نے سماعِ موتی کی مطلقاً نفی نہیں کی۔''

(اقامۃ البرہان ص ۶۸)

یعنی جو چیز مؤلف ''شفاء الصدور'' اور ''ندائے حق'' کے نزدیک شرک کی جڑ ہے اور بقول ان کے سماعِ موتی کے قائلین پر جو لعنت ہوتی ہے اس میں مؤلف جواہر القرآن اور اقامۃ البرہان بھی سواتی برادران کے ہم نوا ہیں اور کیوں نہ ہوں ؎

تھیں میری اور رقیب کی راہیں جُدا جُدا آخر کو ہم دونوں دَرِ جاناں پہ جا ملے!

ہزار اَفسوس

اگر بات یہیں تک محدود رہتی کہ سماعِ موتی کا مسئلہ اختلافی ہے اور ہر فریق کو اپنی علمی اور تحقیقی صوابدید کے مطابق دلائل وبراہین کے رُو سے جو پہلو راجح اور صحیح نظر آتا ہے اسے قبول اور اختیار کر لینے کا حق ہے تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا اور ہمیں بھی اس مسئلہ میں کاوش کرنے کی قطعاً ضرورت پیش نہ آتی۔ مگر جب دُوسری طرف سے یہ غلو اختیار کیا گیا کہ یہ مسئلہ سلف میں اختلافی ہے ہی نہیں۔ جیسا کہ مؤلف ندائے حق لکھتے ہیں کہ سلف میں یہ مسئلہ مختلف فیہ نہ تھا، قطعاً نہ تھا۔'' (ص ۱۵۳) اور یہی غالی مجذوب حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر خالص بہتان تراشتے ہوئے ان کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ: ''لعنت ہو اس پر جو یہ عقیدہ رکھے کہ مُردے سنتے ہیں۔'' (شفاء الصدور ص ۱۰۶) تو ہمیں بھی اس سلسلہ میں کچھ لکھنا پڑا اور در حقیقت ''شفاء الصدور'' کے اسی لعنتی حوالے نے ہمیں کتاب لکھنے پر مجبور کیا ہے جس کا وعدہ ہم نے ''تسکین الصدور'' میں کیا تھا اور اب تو اس مسئلہ میں اس حد تک غلو اختیار کر لیا گیا ہے کہ الامان والحفیظ!

''انجمن اشاعت التوحید والسنۃ کے سرگرم اور نوجوان رُکن مولوی سعید احمد صاحب چتوڑ گڑھی (جن کی اس جماعت کے بقیہ حضرات صرف مصلحتاً تردید کرتے ہیں لیکن اس جماعت کے امیر جناب سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری دھڑلے کے ساتھ ان کی پوری پشت پناہی کر رہے ہیں) نے صاف اعلانیہ کہا اور ڈنکے کی چوٹ یہ فتویٰ دیا کہ جو شخص سماع صلوٰۃ وسلام عند القبر النبی الکریم کا قائل ہے وہ بلا شک قطعی کافر ہے۔ میرے پاس قرآن مجید کی ساٹھ (۶۰) آیتیں اور پانچ سو حدیث کا ثبوت ہے۔''

(بحوالہ دعوت الانصاف فی حیات جامع الاوصاف ص ۴، مولانا عبدالعزیز شجاع آباد)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ کس قدر ناجائز غلو ہے اور قرآن مجید اور احادیث پر کیسا صریح اور صاف بہتان ہے اور بلا استثناء ۱۳۴۷ھ سے قبل کی ساری اُمت کی تکفیر ہے۔ ہاں! اگر اس خانہ ساز کُفر سے کوئی بچ سکتا ہے تو سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری، جو چودھویں صدی میں اس بدعت ضلالہ کے موجد ہیں اور ان کے چند حواری۔ باقی ساری اُمت معاذ اللہ تعالیٰ کافر ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ ثم العیاذ باللہ تعالیٰ ولا حول ولا قوۃ اِلاّ باللہ) اور خود اِسی جماعت کے بعض منصف مزاج بزرگوں کو ان کا رَد لکھنا پڑا۔ (حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب مؤلف دعوت الانصاف شجاع آباد انجمن اشاعت التوحید والسنۃ کے امیر ہیں) اور مولوی احمد سعید صاحب نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ نبی ﷺ اپنی قبر مبارک کے نزدیک پڑھا ہوا صلوٰۃ وسلام نہیں سنتے، نہ تحت الاسباب نہ فوق الاسباب۔ جو شخص سماع صلوٰۃ وسلام عند القبر کا قائل ہے، وہ بلا تاویل کافر ہے اور جو اس کو کافر نہ سمجھے وہ بھی ویسا ہی کافر ہے۔ نیز جو شخص اس مسئلہ کو فروعی کہتا ہے وہ بھی کافر ہے۔ اگر سماع عند القبر کا قائل صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی ہوں تو وہ بھی کافر ہیں۔ بلفظہٖ (دعوت الانصاف ص ۲۳، ۲۴)

قارئین کرام! ان الفاظ کو بغور بار بار پڑھیں اور پھر اَز روئے انصاف یہ فرمائیں کہ اس شاہی فتویٰ کی زد سے اس اُمت مرحومہ کا کوئی بھی مسلمان کُفر کی زد سے بچ سکتا ہے؟ اگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کُفر کے اس ایٹم بم سے نہیں بچ سکتے تو اور کون بچ سکتا ہے؟ ہزار افسوس اور صد ہزار حیرت اور تأسف ہے، انجمن اشاعۃ التوحید والسنۃ کے ذمہ بزرگوں پر کہ وہ اندرونِ خانہ خُفیہ میٹنگیں کر کے مولوی احمد سعید صاحب کی وارفتہ زبان پر پابندی تو لگانے کی فکر کرتے ہیں اور انہیں نرمی کا سبق تو سکھاتے ہیں اور انہیں معتدل رویہ اختیار کرنے کی تلقین تو کرتے ہیں لیکن یہ سارا کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی ان کو اعلانیہ اپنی جماعت سے نہیں نکالتے اور بعض ان کو اپنے جلسوں میں بلاتے اور ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ معاف رکھنا کیا سمجھ دار عوام یہ سمجھنے میں حق بجانب نہیں کہ یہ کارروائی ہاتھی کے دانت ہیں، کھانے کے اور اور دِکھانے کے اور۔

سدًا للذریعہ سماعِ موتٰی کا اِنکار

یہاں یہ بات بھی بیان کرنا نہایت ضروری ہے کہ جو حضرات سماعِ موتیٰ کے منکر ہیں وہ علاوہ اُن دلائل کے جن کو وہ اپنے خیال کے مطابق اپنے دعویٰ پر پیش کرتے ہیں۔ (جن کا تذکرہ حسب ضرورت اِن شاء اللہ تعالیٰ اسی کتاب میں ہوگا) ان کے نزدیک یہ مصلحت (یا خطرہ) بھی پیش نظر ہے کہ اگر سماعِ موتیٰ کا مسئلہ ثابت اور رائج ہو گیا تو یہ جہالت اَور دِین سے دُوری کا دَور ہے، شرک و بدعت کے سیاہ اور گھنگھور بادل اطرافِ عالم پر چھائے

ہوئے ہیں اور مختلف علاقوں پر کم یا زیادہ برستے بھی ہیں۔ علماءِ سُوء اور پیرانِ بدکردار کی بددیانتی اور نفس پروری اظہر من الشمس ہے اور رقمیں بٹورنے کے لئے حضرات اولیاء کرام ﷭ کی قبور پر عُرسوں اور قوالیوں کی بھرمار ہے جن کی شب و روز خوب اشاعت ہوتی رہتی ہے اور جاہل قبر پرستوں کی بھی کوئی کمی نہیں اور خودغرض مجاور اور دین و شریعت سے بے نیاز فقیر و ملنگ ہمہ وقت قبور کے چمکانے کی لگن اور دُھن میں سرمست رہتے ہیں۔ اندریں حالات اگر سماعِ موتی محقق اور ثابت ہو جائے تو بدفطرت اور مشرک و مبتدع لوگ اس کو اور زیادہ ہوا دیں گے اور عوام الناس میں مزید گمراہی پھیلائیں گے۔ اس لئے سماعِ موتی کے مسئلے کا سرے ہی سے انکار کر دیا جائے کہ نہ یہ ثابت ہو اور نہ اس پر شرکت و بدعت کے غلط ثمرات اور اثرات مرتب ہوں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ چنانچہ مؤلف ''اقامۃ البرہان'' لکھتے ہیں کہ ''سماعِ موتی'' کا عقیدہ اگرچہ بذاتِ خود شرک نہیں لیکن شرک کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس لئے بھی عوام اہلِ اسلام کی خیرخواہی اور بہتری اسی میں ہے کہ ''سدًا للذریعہ وصونا للعقیدہ سماعِ موتی'' کا انکار کیا جائے۔'' (ص ۸۱)

یہ خدشہ صرف انہی حضرات کو لاحق نہیں جو سماعِ موتی کے منکر ہیں بلکہ اُن کے پیشِ نظر بھی ہے جو شدّ و مدّ کے ساتھ سماعِ موتی کے قائل ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی ﷫ (المتوفی ۱۲۹۷ھ) جن کی سماعِ موتی کے بارے میں عبارت آگے آ رہی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ، تحریر فرماتے ہیں: ''مگر چونکہ محتاج اور مستغنی محتاج الیہ کا پکارنا جُدا جُدا ہوتا ہے اور عوام اپنے خیالِ خام میں اولیاء کو قادر اور متصرف یعنی غنی محتاج الیہ سمجھتے ہیں تو اگر اس زمانہ میں اس امکانِ استماع کا بھی چرچا کیا جائے تو اس عُل سے نفع دینی میں تو کچھ متصور نہیں۔ البتہ قوتِ مضامین شرکیہ کا گمان غالب ہے۔ اس لئے یوں مناسب ہے کہ عوام کو فقط طریقۂ مسنونہ زیارت قبور تعلیم کیا جائے اور اس سے زیادہ کی اطلاع نہ ہونے دی جائے۔ ورنہ اس علم امکان سے ترقی مدارج تو معلوم کیونکہ ضروریاتِ دینی میں سے نہیں، البتہ مواخذۂ نقصان مذکورہ کا احتمال ہے۔'' (جمال قاسمی ص ۱۰، طبع قاسمی دیوبند)

اور حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی ﷫ (المتوفی ۱۳۶۲ھ) جن کا سماعِ موتی کے بارے میں حوالہ آگے آ رہا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ! ارشاد فرماتے ہیں: ''غرض اس طرح جانبین میں کلام طویل ہے اور دونوں شقوں میں وسعت ہے۔ البتہ عوام کا سا اعتقادِ اثبات کہ اس کو حاضر و ناظر متصرف مستقل فی الامور سمجھتے ہیں، یہ صریح ضلالت ہے۔ اگر اس کی اصلاح بدون انکارِ سماع کے نہ ہو سکے تو انکارِ سماع واجب ہے۔'' (التکشف ص ۴۲۷)

عبارت صاف ہے کہ اگر عوام کو غلط عقیدہ سے بچانے کا کوئی اور حل نہ ہو تو پھر انکارِ سماع واجب ہے۔ یہ وجوب ایک خارجی دلیل سے ہے اور مجبوری کی وجہ سے ہے جیسا کہ قرآنِ کریم کا جہراً وسراً پڑھنا موجب اُجر اور باعثِ ثواب ہے لیکن اگر اس سے نمازیوں کی نماز میں فرق آتا ہو تو بلند آواز سے پڑھنا جائز نہیں۔ (تفسیر مظہری ج ۳ ص ۵۱۲) اور اگر لوگوں کے دُنیوی اُمور میں خلل پڑتا ہو اور وہ قرآن کریم کی طرف توجہ نہ کر سکتے ہوں تو بلند آواز سے پڑھنا مکروہ ہے۔ (مجموعہ فتاویٰ عبدالحئی ﷫ ج ۱ ص ۷۳)

اگر اس بالا مصلحت (یا خطرہ) کا یہ پہلو دیکھا جائے جو اُوپر عرض ہوا تو منکرین سماعِ موتی کے خدشات اور خطرات بے جا نہیں ہیں۔ کیونکہ جہالت کی وجہ سے شرک و بدعت عام ہے اور علماءِ سوء اور پیران بداطوار گلے پھاڑ پھاڑ کر عوام الناس کو ورغلانے میں شب و روز کوشاں ہیں اور جہلاء کا طبقہ بزرگانِ دین اور شہداء کرام کے

مزاروں پر حاضر ہو کر ان سے مُرادیں مانگنا اور نذرانے پیش کر کے یوں سودا بازی کرتا ہے کہ لنگو لے اُور چُڑ دے اور یہ گمراہ ٹولہ توحید خالص کے انمول موتی اور قیمتی جواہر پارے ہر قبر بلکہ ہر تودۂ خاک پر نچھاور کرتا رہتا ہے۔ایسے ہی لوگوں کی اس مذموم اور مشرکانہ کارروائی کا رونا مولانا حالیؒ مرحوم نے یوں رویا ہے ؎

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مؤمنوں پر کشادہ ہیں راہیں پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں اِماموں کا رُتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پر جا جا کے نذریں چڑھائیں شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دُعائیں[1]
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

الغرض! اس خدشہ اور خطرہ کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے لیکن اس پہلو کے ساتھ ساتھ ذیل کے اُمور بھی کسی طرح نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہیں اور ان سے بھی پہلو تہی کرنا مناسب اور رَوا نہیں ہے۔

(الف) سماعِ موتی کا مسلک اختیار کرنا نہ شرک ہے اور نہ براہ راست شرک کا ذریعہ ہے۔شرک کا ذریعہ یہ تب بنتا ہے جب بدعقیدتی اور رُوحِ شریعت سے ناواقفی ساتھ شامل ہو۔سب سے پہلے عوام کے عقیدہ کی دُرستی کی فکر کرنی چاہئے اور ان کو قرآن کریم، حدیث شریف اور رُوحِ شریعت سے واقف کرنا چاہئے اور اسلامی تعلیم کو خوب واضح کرنا چاہئے اور اس کی احسن طریقہ سے نشر و اشاعت کرنی چاہئے۔مسئلہ سماعِ موتی سے انکار کر کے اس موہوم ذریعہ شرک پر بزعمِ خود کاری ضرب لگانا بالکل آخری مرحلہ کی بات ہے۔جب کہ اور کوئی صورت ممکن ہی نہ ہو۔

(ب) بزرگانِ دین اور شہدائے کرام ﷭ جب دُنیا میں زندہ تھے اور مصیبت زدہ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی تکالیف اور پریشانیوں کا تذکرہ بھی ان سے کیا کرتے تھے اور وہ بزرگ اور شہید اس دُنیا کی تکلیفی زندگی میں خود اپنے کانوں سے ان کی باتیں سُنتے بھی تھے۔آخر غور فرمایئے کہ انہوں نے ان پریشان حال لوگوں کی باتیں سننے کے بعد بھی کیا کر دیا؟ اور وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟ کیا نفع و ضرر اُن کے قبضے میں تھا؟ یا معاذ اللہ تعالیٰ ان کو خدائی اختیارات حاصل تھے؟ یا اولاد اور رِزق تقسیم کرنے کا محکمہ ان کے سپرد تھا؟ یا کسی بھی رنج و غم سے نجات دینا ان کے بس میں تھا؟ جب حاجت مندوں اور تکلیف زدہ لوگوں کی فریاد سُن چکنے کے بعد بھی وہ اپنی دُنیوی زندگی میں کچھ نہ کر سکے تو اَب قبر سے باہر کی آواز سُن کر آنا فاناً وہ کس کو بادشاہی مرحمت کر دیں گے؟ یا کم از کم قعرِ مذلت سے نکال کر بامِ عروج اور عزت کی گھاٹیوں پر پہنچا دیں گے؟ یا رِزق و اَولاد کے دروازے لوگوں پر کھول دیں گے؟ یا صحت و تندرستی کی دولت سے اُنہیں مالا مال کر دیں گے؟ یا آپس کی ناچاقی اور دُشمنی کو دوستی میں بدل دیں گے؟ یہ بات کسی بھی صاحب فہم سے مخفی نہیں کہ سُن لینے اور مُراد پوری کر دینے میں کوئی تلازم نہیں کہ جب بھی کوئی بات سُن لے تو سُنانے والے کی قلبی تمنا اور مُراد پوری ہو جایا کرے۔ان دونوں چیزوں میں نہ تو شرعی تلازم ہے اور نہ منطقی اور عُرفی۔

[1] یعنی ان سے مُرادیں مانگیں اور اس کا شرک اور ناجائز ہونا پہلے فتاویٰ رشیدیہ کے حوالہ سے بیان ہو چکا ہے۔

(ج) دوسروں کا تو قصہ ہی چھوڑیئے۔ جب خود ان بزرگوں پر دُنیا میں بے پناہ مصائب وآلام آئے اور وہ خود تکالیف اور پریشانیوں میں مبتلا ہوئے تو کیا انہوں نے خود اپنی مصیبتیں اور صعوبتیں دُور کر دیں؟ اور کیا وہ اپنے لئے خوشی اور راحت کے دروازے کھول گئے؟ جب وہ اپنے لئے کچھ نہ کر سکے تو بھلا وہ دوسروں کے لئے کیا کر سکتے تھے؟ یہاں تو افضل البشر سید ولد آدم خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو بھی اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ: ''قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا'' (سورۂ الجن: ۲)

ترجمہ: ''تو کہہ میرے اختیار میں نہیں تمہارا بُرا اور نہ راہ پر لانا۔''

اور نیز متصرف فی الامور اور خالقِ کائنات نے آپ سے یہ اعلان بھی کروایا کہ: ''قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ'' (سورۂ الاعراف: ۱۸۸)

ترجمہ: ''تو کہہ دے میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے کا اور نہ بُرے کا مگر جو اللہ چاہے۔''

جب فخرِ عالم سردارِ دو جہاں خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ حال ہے تو دُوسروں کا کیا پوچھنا؟ ؎

قیاس کُن زگلستانِ من بہارِ مرا

ان بزرگانِ دین کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ اہلِ مصائب کی تکالیف کو سُن کر اللہ تعالیٰ کے سامنے دامنِ سوال پھیلاتے اور دستِ عجز اُٹھاتے اور بڑھاتے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت ومصلحت کا تقاضا ہوتا تو ان کی دُعا قبول فرما لیتا اور حاجت مندوں کا کام پورا کر دیتا اور اُن کو اُن کی مُراد دے دیتا۔ اس کی مرضی نہ ہوتی تو حضرت نوح علیہ السلام جیسی بزرگ ترین ہستی سے بھی فرما دیتا: ''فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ'' (ہود: ۴۶)

ترجمہ: ''سو مت پوچھ مجھ سے جو تجھ کو معلوم نہیں۔''

پھر اس قادرِ مطلق حیی وقیوم اور فعال لما یرید ہستی کا کسی نے کیا بگاڑا؟ اور کیا کسی کو یہ پوچھنے کی ہمت بھی ہوئی کہ اے پروردگار یہ کام کیوں نہ ہوا؟

''لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ'' (انبیاء: ۲۳)

ترجمہ: ''یعنی اُس سے نہیں پوچھا جا سکتا جو کچھ وہ کرتا ہے اور مخلوق سے پوچھا جا سکتا ہے۔''

جب بزرگانِ دین اِس دُنیا کی زندگی میں زندہ رہ کر اور اپنے کانوں سے لوگوں کی تکالیف کو سُن کر کسی کی تکلیف دُور نہ کر سکے اور نہ کسی کو راحت اور شادمانی عطا کر سکے تو پھر کیا یہ دعویٰ درست اور یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ اِس دُنیا میں بھی کسی کی بات کو نہیں سُنا کرتے تھے؟ اور اگر سنا کرتے تو ضرور وہ مصائب وآلام سے لوگوں کو نجات دے دیتے؟ یقیناً یہ کہنا غلط ہوگا اصل بیماری کا یہ علاج اور مداوا ہرگز نہیں، جو سمجھ لیا گیا ہے بلکہ اصل بیماری عوام الناس کی قرآن وسُنّت سے جہالت اور رُوحِ شریعت سے بے خبری اور بے پرواہی ہے اور گندم نما جو فروش مولویوں اور زر پرست پیروں کی بد دیانتی اور خود غرضی ہے کہ وہ لوگوں کو شرک وبدعت کے جام بھر بھر کر پلاتے ہیں اور بدعقیدہ لوگ فرطِ محبت کے ساتھ ذوق وشوق سے پیتے ہیں۔ ورنہ درحقیقت شرک وبدعت کا مسئلہ سماعِ موتیٰ سے براہِ راست ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ یہ اس کی پیداوار اور اس کا ثمرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ جو سماعِ موتیٰ کے قائل تھے، پکے موحد اور صحیح معنی میں متبع سُنّت تھے۔ ان حضرات کے بارے میں اس

کا ادنیٰ ترین وہم بھی نہیں کیا جا سکتا کہ (معاذ اللہ تعالیٰ) وہ شرک و بدعت کے مرتکب یا اس کے مروج یا مداہن فی الدین تھے۔ اس لئے جہاں آج کل کے لوگوں کے ایمان اور عقیدہ کو بچانا ان کی خیر خواہی اور بہتری ہے وہاں سماع موتیٰ کے قائلین حضرات کو جہلاء کے اس وہم اور فتویٰ سے بچانا بھی نہایت ہی ضروری ہے کہ سماع موتیٰ کا مسلک اختیار کرنا شرک نہیں ہے تا کہ کوئی کوڑھ مغز یہ نہ سمجھنے لگے کہ وہ حضرات مشرک تھے یا کم از کم شرک کی ترویج کا وہ سبب بنے۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) وہ حضرات اسلام کا اصل سرمایہ ہیں جن پر اہل اسلام کو ہمیشہ کے لئے فخر ہے اور وہ آنے والی نسلوں کے لئے دینی اور مذہبی لحاظ سے بہترین نمونہ ہیں۔ وہ حضرات نہ صرف یہ کہ خود خالص توحید اور اصل سُنت پر کاربند تھے بلکہ داعیٔ توحید وسنت اور ماحیٔ شرک و بدعت بھی تھے۔ جن کی مبارک سعی سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اِنسانوں کو اسلام و ایمان جیسی عظیم دولت نصیب ہوئی اور وہ خود بھی ایمان کی عظیم تر دولت سے مالا مال تھے اور حقیقت میں ایمان کا تقاضا ہی یہی ہے کہ بندہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرے اور اُس کے قہر و غضب سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہے اور راحت و تکلیف دینے والا صرف اُسی کو سمجھے۔ کیونکہ نفع و ضرر سب پروردگار کے ہاتھ اور قبضہ میں ہے۔ اس کے بغیر کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ ہستی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ نفع و ضرر پہنچانے پر ہرگز قادر نہیں ہے ؎

ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہو

(د) لفظ استمداد، دُعا خواستن، دُعا مانگنا اور پکارنا وغیرہ الفاظ تفصیل طلب ہیں۔ اگر ان الفاظ سے قائل کی یہ مراد ہو کہ صاحب قبر اور مُردہ کام کرتا اور مُراد پوری کرتا ہے تو یہ خالص شرک ہے اور اگر مُراد یہ ہے کہ قائل اس کو سفارشی بناتا ہے اور یوں کہتا ہے کہ تُو اللہ تعالیٰ سے میرے لئے دُعا کر۔ یہ بات مسئلہ سماع موتیٰ پر متفرع ہے جیسا کہ فتاویٰ رشیدیہ کے حوالہ سے اس کے متعلق ضروری بحث گزر چکی ہے۔ ان دونوں کو گڈمڈ کر دینا اور ایک بنا دینا علم و تحقیق سے کوسوں دُور ہے اور اتنی واضح بات کو ملحوظ نہ رکھنا اور نظر انداز کر دینا علماء کو زیب نہیں دیتا۔ الغرض اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے مُراد مانگنا اور اس کو حاجت روا سمجھ کر پکارنا شرک ہے۔ اگر کوئی شخص زندہ بزرگ سے بھی اولاد مانگے یا صحت و تندرستی مانگے یا ایسی چیز طلب کرے جو عالم اسباب میں اس کے بس و اختیار میں نہیں ہے تو یہ بھی شرک ہے اور اِسی طرح دفن ہونے سے پہلے مُردہ کی چارپائی کے پاس حاضر ہو کر اُس سے مُراد مانگے تب بھی شرک ہے۔

چنانچہ علامہ محمد بن احمد بن عبد الہادی الحنبلی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۴۴ھ) لکھتے ہیں: "ولو جاء انسان الی سریر المیت یدعوہ من دون اللہ و یستغیث بہ کان ھذا اشر کا محرما باجماع المسلمین" (الصارم المنکی ص ۲۸۰)

"یعنی اگر کوئی شخص میت کی چارپائی کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ کے ورے اس کو پکارے اور اُس سے مدد مانگے تو مسلمانوں کے اجماع اور اتفاق سے یہ شرک اور حرام ہوگا۔"

غرض یہ کہ جو چیز شرک ہے وہ زندگی میں بھی شرک ہے اور مرنے کے بعد دفن سے پہلے بھی شرک ہے۔ جب کہ میت کی چارپائی سامنے ہے اور مُردہ نظر بھی آتا ہے اور دفن کے بعد بھی شرک ہے اور وہ اسی صورت میں ہے کہ اس سے اپنی حاجت اور مُراد طلب کرے اور مانگے۔ رہی استمداد کی وہ صورت جو توسّل اور شفاعت کی مد میں ہے وہ نہ تو زندگی میں شرک ہے نہ دفن سے قبل اور نہ دفن کے بعد۔ اس صورت میں مُراد اور حاجت صرف پروردگار سے طلب کی جاتی ہے۔ ہاں درمیان میں اللہ تعالیٰ کے کسی مقبول اور برگزیدہ بندے کا واسطہ اور سفارش ہوتی ہے

اور سفارش کرانے والا یہ سمجھتا ہے کہ مشکل کشا، حاجت رَوا اور قاضی الحاجات صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ بندہ کے بس میں یہ اُمور نہیں ہیں۔ وہ تو صرف دُعا کرتا اور سفارش کرتا ہے۔

چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) قبر کے پاس توسّل اور استمداد کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ونیست صورت استمداد مگر ہمیں کہ محتاج طلب کند حاجت خود را از جناب عزت الٰہی بتوسّل روحانیت بندہ کہ مقرب ومکرم درگاہ والا است وگوید خداوندا بہ برکت ایں بندہ کہ تو رحمت واکرام کردۂ او را برآوردہ گرداں حاجت مرا یا ندا کند آں بندہ مقرب ومکرم را کہ اے بندۂ خدا وولی وے شفاعت کن مرا وبخواہ از خدائے تعالیٰ مطلوب مرا تا قضا کند حاجت مرا پس نیست بندہ درمیان مگر وسیلہ وقادر ومعطی ومسئول پروردگار است تعالیٰ شانہٗ ودر وے ہیچ شائبہ شرک نیست چناں کہ منکر وہم کردہ وآں چناں است کہ توسّل وطلب دُعا از صالحان ودوستانِ خدا در حالتِ حیات کنند وآں جائز است باتفاق۔ پس آں چرا جائز نباشد وفرقے نیست در ارواح کاملان درحین حیات وبعد از ممات مگر در ترقی کمال۔'' (فتاویٰ عزیزی ج ۲ ص ۱۰۸)

(حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ نے یہ پوری عبارت مائۃ مسائل ص ۳۶، ۳۷ میں نقل کی ہے)

ترجمہ: ''اور اس استعانت کی صورت اس کے سواء اور کچھ نہیں کہ محتاج اپنی حاجت اللہ تعالیٰ کے مقرب اور مکرم بندہ کی روحانیت کے توسّل سے اللہ تعالیٰ سے طلب کرتا ہے کہ اسے پروردگار اس بندہ کی برکت سے کہ تو نے اس پر اپنی رحمت کر کے اس کو نوازا ہے۔ میری حاجت کو پورا کردے یا یوں صدا بلند کرتا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ کے مقرب اور برگزیدہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے ولی، میرے حق میں آپ سفارش کریں اور اللہ تعالیٰ سے میرے مطلوب کے پورا کرنے کی التجاء کریں تاکہ وہ میری حاجت کو پورا کردے۔ سو اس صورت میں بندہ درمیان میں صرف واسطہ ہے۔ قادر دینے والا اور جس سے سوال کیا گیا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی ہے اور اس صورت میں شرک کا شائبہ تک بھی نہیں پایا جاتا جس طرح منکر کا وہم ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے مقرب اور نیک بندوں سے ان کی زندگی میں کوئی توسّل کرے اور دُعا کی درخواست کرے اور یہ صورت بالاتفاق جائز ہے۔ پس ایسا توسّل بعد از وفات کیوں جائز نہ ہوگا؟ اور کامل لوگوں کی ارواح کا زندگی اور موت کے بعد کوئی فرق نہیں بجز اس کے کہ مرنے کے بعد کمال میں مزید ترقی ہو جاتی ہے۔

ایک طرف ان حضرات کی تحقیق ملاحظہ کریں اور دُوسری طرف مؤلف ندائے حق کی سنیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''آدم ہر سرِ مطلب توسّل بذات المیت یا بدعاء المیت یا بذات النبی ﷺ بعد الوفات کو یا حرام کہنا پڑے گا یا سکوت اختیار کرنا پڑے گا۔ بلا کھٹک کھلے طور پر کسی شرعی قاعدہ کی رُو سے جواز کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔'' (ص ۱۰۸)

مطلب بالکل واضح ہے کہ اکابر کی ایک نہیں سُنی، اپنی مرضی کرنی ہے۔

(ز) جو حضرات سماعِ موتیٰ کے قائل ہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ مُردے دُور دراز سے بھی سنتے ہیں۔ وہ صرف اس کے قائل ہیں کہ قبر کے پاس اگر سلام وکلام کیا جائے تو وہ سنتے ہیں۔ دور دراز سے عدم سماع پر سب کا اتفاق ہے کیونکہ دُور سے سننے کا مسئلہ غیر اللہ کے بارے میں عقیدہ علم غیب اور حاضر وناظر پر متفرع ہے اور ان کا کفر ہونا واضح دلائل سے اپنی جگہ پر ثابت ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ! ہم نے ''ازالۃ الریب'' اور ''تبرید النواظر'' وغیرہ میں ان پر

مبسوط بحث کردی ہے اور دُور دراز سے بزرگوں کی رُوحوں کو حاضر سمجھنا اور اُن کے لئے لوگوں کے حالات کا علم ثابت کرنا حضرات فقہاء کرام اور خصوصاً حضرات فقہاء احناف رحمہم اللہ کے ہاں صریح کفر ہے۔

چنانچہ علامہ زین العابدین الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۹۷۰ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ: ''قال علماءنا من قال ارواح المشائخ حاضرة تعلم یکفر'' (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۲۴، طبع مصر)

''ہمارے علماء نے تحریر فرمایا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ بزرگوں کے ارواح حاضر ہیں اور وہ جانتے ہیں تو ایسا شخص کافر ہے۔''

اور اسی کے قریب الفاظ ہیں: امام حافظ الدین محمد بن محمد الخوارزمی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۲۷ھ) کے (ملاحظہ ہو فتاویٰ بزازیہ علیٰ ہامش الہندیہ طبع مصر ج ۶ ص ۳۰۶) اور نیز حضرت مولانا محمد عبدالحیٔ اللکنوی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۰۴ھ) کے (ملاحظہ ہو مجموعۂ فتاویٰ عبدالحیٔ ج ۱ ص ۳۵ و ج ۳ ص ۵) اس سے معلوم ہوا کہ دُور دراز مقامات سے حضرات اولیاء کرام رحمہم اللہ اور مشائخ کو پکارنا اور عقیدہ یہ رکھنا کہ وہ ہمارے مصائب وحالات سے واقف ہیں اور ہمارے پاس حاضر وناظر ہیں، کفر ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قریب وبعید اور دُور ونزدیک کے اس بنیادی اور واضح فرق کو نظر انداز کر دینا (جیسا کہ مؤلف شفاء الصدور اور ندائے حق نے کیا ہے۔ مؤلف مذکور صفحہ ۱۰۶ کا بقیہ صفحہ میں لکھتے ہیں: ''پھر مُردے کا سماع ثابت کرنا یہ ندا للغیب نہیں تو کیا ہے؟'' بلفظہٖ) اور خلط مبحث کرنا اہلِ علم کی شان کے سراسر خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اختلافی مسائل میں محل نزاع سمجھنے کی توفیق بخشے۔

غائبانہ پکار

اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی بھی ہستی کے بارے یہ عقیدہ رکھ کر اس کو پکارنا کہ دُور دَراز سے وہ ہماری پکار سنتی اور ہماری حاجت روائی کرتی ہے، ممنوع اور شرک ہے اور اگر کوئی شخص یا رسول اللہ کے الفاظ مدد طلب کرنے کے لئے بولتا ہے تب بھی شرک ہے۔ ہاں! اگر یہ الفاظ محبت اور عقیدت کے طور پر اس طور پر پیش کرتا ہے کہ یہ بھی فی الجملہ دُرود شریف کے الفاظ ہیں اور فرشتے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کر دیں گے تو درست اور صحیح ہے۔

حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۶۲ھ) لکھتے ہیں کہ: ''سوال بست وچہارم اگر اہل مشرق بگویند یا رسول اللہ یا اولیاء اللہ واگر اہل مغرب بگویند یا رسول اللہ بر۔ بنہا شرع چہ حکم فرماید مشرک یا کافر، یا گناہ صغیرہ یا کبیرہ، یا مکروہ یا حرام؟''

جواب: ''در ندا کردن غائب میان نبی غیر نبی فرق است۔ اگر نبی را ندا خواہد نمود برائے ایصال صلوٰۃ یا سلام ظاہراً جواز است بدو جہت یکے آنکہ در حدیث شریف وارد است کہ ملائکہ از طرف حق تعالیٰ مقرر اند ہر کہ بر نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ یا سلام می فرستد ملائکہ نزد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم می رسانند۔ دوم آنکہ در التحیات خطاب برائے رسانیدن سلام وارد شدہ پس بنا بریں اگر کسے یا رسول اللہ بگوید برائے رسانیدن درود یا سلام جائز است ودر حق دیگر اشخاص سوائے نبی ایں قسم وارد نشدہ پس ندا در حق غیر نبی ممنوع است ومحظور خواہد بود بدلیل عموم آیات نصوص قرآنی کہ تلاوت نمودہ خواہد شد واگر غیر خدا را بایں اعتقاد میگوید کہ ہر وقت کہ من ندا می کنم اُو می شنود و یا قدرت در انجاح حاجات می وارد یا در عالم متصرف است یا شرکت تدبیر در کارخانجات الٰہی میدارد پس درایں صورت شریک گردانیدن است بخدا،

برائے دفع ایں اَمر پیغمبر خدا ﷺ مبعوث شدہ ہیچ کس را در علم غیب و قدرت مطلقہ و تصرف در اُمور عالم شریک با خدائے تعالیٰ نباید ساخت پس ایں قسم ندا کردن غیر خدا را موجب شرک و کفر است، چنانچہ آیاتِ قرآنی و احادیث رسول اللہ ﷺ و روایات فقیہہ برایںہا دال اند۔" (مأتہ مسائل ص ۳۸، ۳۹)

ترجمہ: "چوبیسواں سوال: اگر اہلِ مشرق کہیں یا رسول اللہ یا اولیاء اللہ اور اسی طرح اہلِ مغرب یا رسول اللہ کہیں۔ شریعت ان پر کیا حکم لگاتی ہے؟ وہ لوگ مشرک ہیں یا کافر ہیں یا یہ گناہ صغیرہ یا کبیرہ ہے؟ یا مکروہ یا حرام ہے؟

جواب: غائب کے ندا کرنے میں نبی اور غیر نبی کا فرق ہے۔ اگر کوئی نبی کو ندا کرتا ہے صلوٰۃ وسلام کے پہنچانے کے طور پر تو ظاہراً یہ جائز ہے دو وَجہ سے۔ اَوّل یہ کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے مقرر ہیں جو شخص آنحضرت ﷺ کی ذات کے لئے صلوٰۃ وسلام بھیجتا ہے فرشتے اس کو آپ تک پہنچا دیتے ہیں۔ (۲) دوسرے یہ کہ التحیات میں سلام پہنچانے کے لئے (اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ کے ساتھ) خطاب وارد ہوا ہے۔ پس اس بناء پر اگر کوئی شخص درود وسلام پہنچانے کی غرض سے یا رسول اللہ کہتا ہے تو یہ جائز ہے اور نبی کے علاوہ اور لوگوں کے بارے اس طرح وارد نہیں ہوا اس لئے ایسی ندا غیر نبی کے لئے ممنوع ہے اور اس سے روکنا چاہئے، اس لئے کہ قرآنِ کریم کی عمومی آیات اور نصوص جن کی تلاوت کی جائے گی وہ اس نہی کی دلیل ہیں اور اگر کوئی شخص غیر خدا کو اس اعتقاد سے پکارتا ہے کہ جب بھی مَیں ندا کروں گا وہ سنتے ہیں یا حاجات پورا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں یا جہان میں متصرف ہیں یا کارخانۂ خداوندی میں تدبر کی شرکت رکھتے ہیں سو ایسی صورت میں غیر خدا کو خدا تعالیٰ کا شریک بنانا ہے اور اسی چیز کے مٹانے کے لئے پیغمبر ﷺ مبعوث ہوئے تھے کہ کسی کو بھی علم غیب اور قدرت مطلقہ اور جہان کے کاموں کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ بنایا جائے سو غیر خدا کو اس طرح ندا کرنا موجب شرک وکُفر ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم کی آیات اور آنحضرت ﷺ کی احادیث اور فقہی روایات اس پر دلالت کرتی ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے اس مضمون کی آیات، احادیث اور فقہی عبارات نقل کی ہیں:

(۳) اختلافی مسائل میں ائمہ دین رحمہم اللہ اور علماء اسلام کا یہ طریق چلا آ رہا ہے کہ وہ اس پہلو کو جو اُن کے نزدیک راجح ہوتا ہے دلائل وبراہین سے مبرہن کر دیتے ہیں اور علمی اور تحقیقی طور پر دُوسرے فریق کو متانت سے جوابات دیتے ہیں لیکن نہ تو ان کی تکفیر کرتے ہیں اور نہ نفسِ مسئلہ کے نزاع واختلاف کا انکار کرتے ہیں لیکن مسلم قوم کی بدبختی اور قیامت کی نشانیوں میں ایک نشانی اعجاب کل ذی رأی برأیہ بھی ہے اُور اسی کے مطابق مؤلف "ندائے حق" وغیرہ کا انداز ہی سب سے نرالا ہے۔ پہلے تو انہوں نے مسئلہ سماعِ موتیٰ کے اختلافی ہونے کا سرے سے انکار کیا اور پھر جو حضرات ان کے ساتھ شریک نہیں باجبر اور سینہ زوری سے اُن کو اپنی کاغذی کشتی پر سوار کر کے اپنا ہمنوا کر دکھایا جو ہرگز ان کے ساتھ نہیں (جیسا کہ اِن شاء اللہ تعالیٰ آپ اسی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے) اور عدمِ سماعِ موتیٰ کا تو قصہ ہی چھوڑیئے اُنہوں نے آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے قریب سے طلبِ شفاعت کو بھی بیک جنبشِ قلم شرک قرار دے دیا۔ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ!

اختلافی مسائل میں یہ طریقہ علم وانصاف سے کوسوں دُور ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کی بعض عبارتیں بطور نمونہ عرض کر دیں تاکہ قارئین کرام اُن کی علمی تحقیق اور دیانت اور فقاہت فی الدّین کا بخوبی اندازہ لگا سکیں۔

(ا) الاستفتاء اب کیا فرماتے ہیں سواتی برادران (یعنی ابوالزاہد محمد سرفراز، وصوفی عبدالحمید۔ صفدرؔ) اس بارے میں کہ جو شخص انبیاء کو خصوصاً نبی اکرم ﷺ کو قبر کے پاس جا کر پکارے اور کہتا ہے: ''الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ ادع اللہ لی یارسول اللہ اسئلک الشفاعۃ واتوسل بک الی اللہ فی ان اموت مسلمًا علٰی ملتک وسنتک السلام علیک یارسول اللہ من فلاں بن فلاں''

(بین السطور لکھتے چلو علم غیب بھی ثابت ہوگیا۔ معلوم نہیں کہ کسی کے پیغام پہنچانے سے علم غیب کیسے ثابت ہوگیا؟ صفدرؔ) یشفع بک الی ربک وغیر ذٰلک! وہ آیا مشرک ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ نے تو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے وہ مشرک ہیں۔ (بلفظہٖ ندائے حق ص ۲۹۷، ۲۹۸)

الجواب: یہ جتنے الفاظ ہیں یہ سب حضرات فقہاء احناف رحمہم اللہ وغیرہم کے ہیں جو مختلف عبارات سے درج ذیل کتابوں میں ہیں:

فتح القدیر ج ۲ ص ۳۳۸، فتاویٰ عالمگیری طبع مصر ج ۱ ص ۲۸۲، نور الایضاح ص ۱۹۱، طحطاوی ص ۴۰۶، کتاب الاذکار ص ۱۸۴، شرح شفاء لعلی القاری رحمہ اللہ ج ۳ ص ۵۲۰، زُبدۃ المناسک ص ۶۰، مولانا گنگوہی رحمہ اللہ اور فتاویٰ رشیدیہ (جس کے حوالے پہلے گزر چکے ہیں) وغیرہ جن کے باقاعدہ حوالے ''تسکین الصدور'' میں درج ہیں۔ یہ سواتی برادران کی ایجاد نہیں بلکہ یہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے فرمودات ہیں اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ نے جس پکارنے کو شرک لکھا ہے وہ بالکل بجا اور درست ہے کہ صاحبِ قبر سے اپنی حاجت اور مُراد طلب کرے صاحبِ قبر سے مُراد مانگنے کا اور اس کی دُعا اور توسّل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مُراد مانگنے کا اُصولی طور پر فرق ہے، جیسا کہ فتاویٰ رشیدیہ کے حوالہ سے یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگردوں اور متوسّلین نے بالآخر اس مسئلہ میں شدت اور غلو سے بھی کام لیا ہے اور دوسرے حضرات ان کی رائے کے پابند نہیں ہیں۔

بے مثل جواب

مؤلف ندائے حق نے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کی واضح عبارات کا جو جواب دیا ہے وہ قابل دید ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''بس ہم اب آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ جتنی کتابوں میں یہ مسئلہ قبر پر حضور ﷺ سے دُعاء استغفار استشفاع کا جو معتبر کتب میں لکھا جا چکا ہے وہ باغیوں کا لکھا ہوا ہے اور بس۔'' (ندائے حق ص ۳۱۱)

حضرات علماءِ کرام اور طلبہٴ عظام نے روایتی اور درایتی، عقلی اور نقلی بے شمار جوابات ملاحظہ فرمائے ہوں گے لیکن مؤلف ندائے حق کا یہ انوکھا اور نرالا اور مجذوبانہ جواب ان کے معلومات میں اضافہ کرے گا۔ جو اس قابل ہے کہ اس کو سنہری حروف میں لکھ کر چڑیا گھر کے بڑے گیٹ پر آویزاں کیا جائے کہ انسانوں کے علاوہ بلبلیں اور طوطے وغیرہ جانور بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

قارئین کرام! اندازہ فرمائیں کہ جب ایسی معتبر کتابوں میں باغی گھس گئے (جو ممکن ہے کوریا یا ویت نام سے آئے ہوں یا ماؤ سے تعلق رکھتے ہوں) تو پھر ان درسی، مشہور اور متداول ومعتبر کتابوں کا خدا ہی حافظ ہے۔ نہ

معلوم ان میں باغیوں نے کیا کیا شگوفے کھلائے ہوں گے۔ ہاں! اگر یہ حوالے فتاویٰ غرائب (الغرائب فی تحقیق المذاہب) کے ہوتے تو پھر کیا مجال ہے کہ باغیوں کو اس میں گھسنے کا موقع مل سکتا؟ مگر شومئ قسمت کہ یہ تو فتح القدیر، عالمگیری، نور الایضاح وغیرہ معتبر کتابوں کے حوالے ہیں۔ پھر یہ کتابیں باغیوں کی دست برد سے کیسے اور کیونکر بچ سکتی ہیں۔ شائد مؤلف مذکور دل ہی دل میں سُرتال سے یہ پڑھتے ہوں ؎

تیرا جواب تو میں تھا میرا جواب نہ تھا

سبحان اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ

(۲) ''نیز جو شخص بہاول حق یا معین الدین اجمیری یا داتا گنج بخش یا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کو دُور ونزدیک سے پکارے وہ مشرک ہے یا نہیں؟ اگر مُشرک ہے تو اس میں کیا فرق ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو پکارے تو مؤحد، اگر ان تین کے علاوہ اوروں کو پکارے تو مشرک؟ یا نزدیک ودُور کا فرق کرتے ہو تو پھر فرمائیے کہ جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مزار پر کھڑے ہو کر پکارے یا لات بزرگ کی قبر پر کھڑے ہو کر پکارے اور دُعا مانگے کہ خدا پاک سے میرے حق میں سوال کرو کہ میرا فلاں کام ہو جائے، یہ شرک تھا یا نہ۔'' (ص ۲۹۸)

پہلے فتاویٰ رشیدیہ کے حوالہ سے یہ بات گزر چکی ہے کہ: ''حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے سماع عند القبر میں کسی کا اختلاف نہیں۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دیگر بزرگوں کے ساتھ اس سوال میں شریک کر کے اس کا فرق پوچھنا نری جہالت ہے۔ صرف پکارنے کا یہ معنی کرنا کہ دُعا مانگے کہ خدا پاک سے میرے حق میں سوال کرو۔'' سماعِ موتیٰ کے قائلین کے ہاں درست اور صحیح ہے اور منکرین کے ہاں لغو ہے۔ جیسا کہ فتاویٰ رشیدیہ کے حوالہ سے یہ بات گزر چکی ہے اور اس طرح سے دُعا کرانا شرک نہیں ہے جیسا کہ فتاویٰ عزیزی کے حوالہ سے یہ بات گزر چکی ہے۔ باقی دُور ونزدیک کا فرق اس مسئلہ میں ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کما مرّ! اس سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر دینا کسی بھی ذی عقل وشعور کو کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ ہاں! مجذوبوں کا معاملہ ہی جدا ہے۔

(۳) ''اب اگر قبر کے پاس جا کر صلحاء شہداء صدیقین اور انبیاء کو پکارنا اور ان کا شفعائنا عند اللہ ہونا محقق اور ثابت ہوتا ہے اور یہ اعتقاد شرک نہ ہوتا تو خدا تعالیٰ استثناء فرما دیتے لیکن اس اہم استثناء سے خدا کے سکوت کی کیا وجہ؟ پھر اس قسم کی احادیث متواتر یا مشہور کیوں نہیں؟ پھر صحاح ستہ والوں نے کیوں نہیں لیا۔'' (ص ۲۹۹)

اس استدلال میں مؤلف مذکور نے جس سطحی ذہن سے کام لیا ہے اس کا علم وتحقیق سے کوئی واسطہ ہی نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا بلا وجہ حجم بڑھانے اور وقت پاس کرنے کے لئے یہ دلیل پرویزؔ صاحب یا اُن کے کسی خوشہ چین سے مستعار لی ہے۔ مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کسی سے رائے لینے کا محتاج نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ بیان اور ارشاد فرمایا ہے وہ بالکل بجا ہے۔ معاملہ صرف سمجھنے کا ہے۔ غائبانہ طور پر کسی کو سفارشی بنانا تو اس شفعائنا عند اللہ کی مد میں آتا ہے لیکن زندگی میں کسی کو دُعا کے لئے سفارشی بنانا یا بعد از وفات قبر کے پاس سے کسی سے دُعا کی درخواست کرنا اور علی الخصوص حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے طلبِ شفاعت کرنا اس مد میں نہیں آتا۔ اگر یہ اس آیت کا مصداق ہوتا تو یہ آیت کریمہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے سامنے بھی تھی جنہوں نے ایمان وتقویٰ کی دولت

کے ساتھ دین کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کی ہے وہ ہرگز عند القبر شفاعت اور توسّل کی اجازت نہ دیتے اور بڑے بڑے ائمہ کرام رحمہم اللہ اور علماء ملت جو سماع موتی کے قائل ہیں، بزرگان دین کی قبور پر دُعا کی اجازت نہ دیتے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ نزدیک سے طلب سفارش اور دُعا کرانا اس آیت کے مفہوم میں ہرگز شامل نہیں ہے اور نہ شرک ہے۔ شرک اسی صورت میں ہے کہ دُور سے یہ کارروائی کی جائے جس سے علم غیب اور حاضر و ناظر کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے جو شرک کی جڑ اور بنیاد ہے۔ پھر مؤلف مذکور کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ بے شمار حلال و حرام اور عبادات و احکام وغیرہ کے مسائل ایسے ہیں جو قرآن کریم اور احادیث متواترۃ اور مشہورہ سے ثابت نہیں ہیں اور نہ صحاح ستہ والوں نے ایسی احادیث کی تخریج کی ہے لیکن حضرات فقہاء کرام اور محدثین عظام رحمہم اللہ ان پر بھی کاربند ہیں اور صحاح ستہ سے خارج اور صحیح حدیثوں کو بھی وہ لیتے ہیں جو اُصول اور قواعد کے مطابق صحیح ہیں اور ان کو وہ مسترد نہیں کر دیتے۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ یہ مسئلہ سواتی برادران کی ایجاد و اختراع نہیں ہے بلکہ سواتی برادران دیگر مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ اور اپنے اکابر کے دامن سے وابستہ اور ان کے خوشہ چین ہیں ؎

اولٰئک آبائی فَجِئنِیْ بمثلھم اذا جمعتنا یا جریر المجامع

حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے اِس فتویٰ کی اصل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر طلب دُعا اور استشفاع نہ فرض ہے اور نہ واجب اور نہ سُنّتِ مؤکدہ بلکہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے فتویٰ کی رُو سے صرف جائز ہے۔ اس میں بھی بعض فقہاء کرام رحمہم اللہ کا اختلاف ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور اس مسئلہ میں ان کے پیروکار اور بعض دیگر حضرات جواز کے بھی قائل نہیں ہیں۔ باقی حنفی، مالکی اور شافعی وغیرہ مسلک والے حضرات اکثر اس کے جواز کے قائل ہیں اور ظاہر بات ہے کہ ایسے فروعی مسئلہ کے لئے کسی قطعی دلیل کی ضرورت بھی نہیں ہوتی بلکہ فی الجملہ اس کا جواز مطلوب ہوتا ہے اور اس کا اصل جواز حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہے جس پر خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مہر تصدیق ثبت ہے۔ واقعہ یوں ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا اور اس کی وجہ سے بے حد تکلیف پیش آئی۔ گاؤں کا رہنے والا ایک شخص (اعرابی) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضر ہوا اور آپ سے درخواست کی کہ حضرت آپ کی اُمت نہایت تکلیف میں ہے اور اس کی ہلاکت و بربادی کا خطرہ ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ بارش برسائے۔

آپ کی قبر مبارک کے پاس دُعا کر کے یہ شخص چلا گیا۔ رات کو خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص سے ملے اور یہ فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور اُس سے میرا اسلام کہو اور یہ خبر دے دو کہ اِن شاء اللہ تعالیٰ بارش ہوگی اور عمر رضی اللہ عنہ سے کہہ دو کہ وہ عقلمندی کو لازم پکڑے۔

صبح ہوئی تو وہ شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور خواب کا یہ سارا ماجرا اُن کو سُنا دیا۔ یہ خبر سُن کر (مارے خوشی کے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا کہ: "میرے رب جو چیز میرے بس میں ہے اس کے بارے میں تو کبھی میں نے کوتاہی نہیں کی۔" (طبری ج ۴ ص ۹۸، البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۷۱، شفاء السقام ص ۱۳۰ اور وفاء الوفاج ۲ ص ۴۲۱)

اور یہ روایت ہمارے پیرومرشد حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ نے اپنی کتاب (تحریرات حدیث ص ۲۵۵) میں بھی نقل کی ہے۔ (طبری ج ۴ ص ۹۹) اور البدایہ والنہایہ وغیرہ کتابوں میں تصریح موجود ہے کہ خواب دیکھنے والے یہ اعرابی بزرگ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بن الحارث المزنی (المتوفی ۶۰ ھ) جلیل القدر اور مشہور صحابی تھے۔ انہوں نے جس وقت یہ خواب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں تمہاری طرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سفیر اور قاصد ہوں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ خواب تم نے کب دیکھا؟ فرمایا (البارحۃ) کہ گزشتہ رات، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع کے سامنے پیش کیا۔

فقالوا اصدق بلال رضی اللہ عنہ (طبریٰ والبدایہ والنہایۃ وغیرہ) تو اُنہوں نے کہا کہ بلال رضی اللہ عنہ سچ کہتے ہیں۔

یہ واقعہ ۱۷ھ کے آخر یا ۱۸ھ کی ابتداء کا ہے (طبری والبدایہ) اور مؤرخ عبدالرحمن بن خلدون رحمہ اللہ (المتوفی ۸۰۸ھ) اس کو حتمی طور پر ۱۸ھ کا بتاتے ہیں۔ (ابن خلدون ج ۲ ص ۹۶۹) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اور علامہ سمہودی رحمہ اللہ تینوں بزرگ فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۹۲، فتح الباری ج ۳ ص ۱۴۸، وفاء الوفاء ج ۲ ص ۴۲۱) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کی پوری سند بھی نقل کی ہے۔ اس صحیح روایت سے مؤلف ندائے حق کا یہ مطالبہ بھی پورا ہو گیا کہ آپ اپنے مطالعہ کے زور سے ذخیرۂ احادیث میں سے ایک حدیث ایسی دکھا دیں جس میں یہ ہو کہ صحابہ کرام بعد وفات النبی آپ سے استشفاع واستغفار کراتے تھے۔ (ندائے حق ص ۱۳۶)

الغرض یہ واقعہ صحیح سند کے ساتھ تاریخ اسلام کی معتبر کتابوں میں بالسند مذکور ہے جن میں احادیث کا خاصا ذخیرہ ہے۔

اس واقعہ اور صحیح روایت سے ذیل کے فوائد صراحت کے ساتھ حاصل ہوتے ہیں:

(۱) یہ واقعہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے تقریباً آٹھ سال بعد کا ہے جس میں بکثرت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے۔

(۲) خواب دیکھنے والا کوئی مجہول اور محض اعرابی اور جنگلی شخص نہ تھا جیسا کہ (شفاء الصدور ص ۱۰۲، اقامۃ البرہان ص ۲۹۵) میں ان کو صرف اعرابی کہہ کر گلو خاصی چاہی ہے اور (ندائے حق ص ۳۰۳) میں تو یہ لکھ کر حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کی پھبتی اُڑائی ہے کہ: ''یہ جمہور کشف خوابیں جنگلیوں کا مذہب آپ ہی کو نصیب ہو۔'' بلکہ یہ واقعہ جلیل القدر اور مشہور صحابی حضرت بلال بن الحارث المزنی رضی اللہ عنہ کا ہے جیسا کہ بیان ہوا۔

(۳) قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر اس طرح طلب دُعا اور استشفاع شرک اور بدعت نہیں ورنہ ایک جلیل القدر صحابی یہ کارروائی ہرگز نہ کرتے۔

(۴) یہ واقعہ نرے خواب ہی کا نہیں تا کہ یہ کہہ کر اس کو ٹال دیا جائے جیسا کہ ہمارے کرم فرماؤں نے یہ کیا ہے) کہ خواب پر مدارِ دین نہیں بلکہ اس خواب کو بیداری میں خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تائید اور تصویب حاصل ہے۔ اگر سُنّۃ الخلفاء الراشدین رضی اللہ عنہم کی مد میں ہو کر اس کارروائی کو سُنّت کا درجہ حاصل نہ ہو تو استحباب اور اقل درجہ جواز سے کیا کم ہو سکتا ہے؟ اور حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے بھی تو جواز ہی کا فتویٰ دیا ہے گو بعض حضرات نے منکرین کے رَدِّ عمل کے طور پر اس کی تاکید بھی کر دی ہے مگر فرض اور واجب تو نہیں کہا۔

(۵) اس واقعہ کی تائید وتصویب میں تنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی متفرد نہیں بلکہ دوسرے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی بلا نکیر اس کی تائید فرمائی ہے۔ فَقَالُوْا اَصَدَقَ بِلَالٌ رضی اللہ عنہ

(۶) یہ واقعہ کسی نص اور شرعی قاعدہ سے متصادم نہیں ہے۔ اگر اس سے کسی نص یا کسی شرعی اصل پر زد پڑتی تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور علی الخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو رَد کر دیتے اور یہ فرما دیتے کہ یہ واقعہ قرآن کریم کی فلاں اور فلاں آیت یا آیات کے خلاف ہے اس لئے یہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ کیونکہ جس طرح قرآنِ کریم کی سمجھ اُن حضرات کو حاصل تھی وہ بعد میں آنے والوں کو ہرگز حاصل نہیں ہے۔ جب حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس واقعہ کو قرآن کریم کی کسی نص کے خلاف نہیں سمجھا تو سمجھ لیجئے کہ اب اگر کوئی شخص اس واقعہ کو قرآن کریم کی کسی نص کے خلاف سمجھتا یا بتاتا ہے تو یقیناً وہ غلطی پر ہے اور اس کا نظریہ قابلِ قبول نہیں ہے۔

(۷) اور اس واقعہ کی صحت کے لئے اُمت کی اکثریت کا تعامل بھی ایک واضح قرینہ ہے جس پر ہر مَسلک اور ہر طبقہ سے متعلق کروڑوں حضرات اب تک اس پر عمل پیرا ہیں اور حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کا فتوائے جواز بھی ساتھ شامل ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ؎

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

اعتراض: مؤلف ''ندائے حق'' راقم کی تالیف ''راہِ سُنّت کی متعدد عبارات سے بزور اپنا مطلب کشید کرتے ہوئے اور اپنے حواریوں کو خوش کرتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ: ''حضرت شاہ محمد اسماعیل صاحب شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ متبادر از لفظ سیرت کہ مضاف بقوے باشد ہمیں است کہ آں سیرت در ایشاں مُروّج باشد نہ آں کہ کسے از ایشاں طریق ندرت بر آں سیرت باشد۔ (آگے چل کر فرماتے ہیں) نیز بفتوائے رأس العلماء (راقم کے پاس جو نسخہ ہے اس میں رئیس العلماء کے الفاظ درج ہیں۔ صفدرؔ) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرّہ کہ استمداد را بمعنی طلب دُعا از اموات از جنس بدعات شمردہ اند با وجود آنکہ صاحب استیعاب روایت کردہ کہ در زمانِ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اعرابی طلب دُعاء و استسقاء از مزار مبارک جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نمودہ پس با وجود تحقیق ایں اُمر مذکور در آں قرن بنا بر آنکہ مُروّج دراں قرن نہ گردیدہ از بدعات شمردہ اند۔''

(ایضاح الحق الصریح فی احوال المیت والضریح ص ۷، ۸ (مع ترجمہ اُردو ص ۱۳) ندائے حق ص ۱۱۹)

الجواب: اس واقعہ کو بدعت کہہ کر اس سے رُستگاری حاصل کرنا درست نہیں ہے۔

اوّلاً: اس لئے کہ یہ واقعہ نرے اعرابی کا نہیں ہے بلکہ اس کو بلا نکیر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تائید حاصل ہے۔ کیا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ واقعہ سُن کر اس کی تصدیق و تائید کرنا اور خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تصویب بدعت ہوگی؟

ثانیاً: جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رمضان مبارک میں مسجد نبوی کے اندر الگ الگ جماعتوں میں نماز تراویح پڑھنے والوں کو ایک ہی قاری اور امام پر جمع کر دیا تھا اور پھر یہ ارشاد فرمایا تھا: نعمت البدعۃ ہٰذہ۔ یعنی یہ بدعت اور ایجاد کیا ہی اچھی ہے۔ ظاہر اُمر ہے کہ اس مقام پر لفظ بدعت صرف لغوی طور پر بولا گیا ہے۔ اسی طرح عبارت میں بھی بدعت سے نو ایجاد مراد ہے نہ کہ وہ شرعی بدعت جس کی تردید احادیث صحیحہ اور شرعی دلائل سے ثابت ہے۔ کیونکہ اگر یہ شرعی بدعت ہوتی تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خلیفہ راشد رضی اللہ عنہ اس کی ہرگز تائید و تصویب نہ فرماتے۔ اُن کی تائید ہی اس اُمر کی دلیل ہے کہ یہ بدعت لغوی ہے نہ کہ شرعی۔

و ثالثاً: ایسا لگتا ہے کہ حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمہ اللہ نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کی اصل عبارت (یہ بات تحریر فرماتے وقت) ملاحظہ نہیں کی بلکہ اپنے حافظہ پر بھروسہ کر کے ان کا حوالہ دے دیا ہے۔ہم حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کی اصل عبارت مع ترجمہ عرض کرتے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں:

سوال: از انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام و شہداء عظام و صلحاء رحمہم اللہ عالی مقام بعد موت شان استمداد بایں طور کہ یا فلاں از حق تبارک و تعالیٰ حاجت مرا بخواہ و شفیع من شود دعا برائے من بخواہ درست است یا نے؟

سوال: حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام و شہداء عظام و صلحاء عالی مقام سے بعد وفات کے اس طور سے استمداد درست ہے یا نہیں کہ اے فلاں بزرگ اللہ تعالیٰ سے میری حاجت روائی کے لئے آپ عرض کریں اور میری سفارش کریں اور میرے لئے دعا کریں۔

جواب: استمداد از اموات خواہ نزدیک قبور باشد یا غائبانہ بے شبہ بدعت است۔ در زمان صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ نبود لیکن اختلاف است در آں کہ بدعت سیۂ است یا حسنہ؟ و نیز حکم مختلف می شود باختلاف طرق استمداد اگر استمداد بایں طریق است کہ در سوال مذکور است۔پس ظاہراً جواز است زیرا کہ دریں صورت شرک نمی آید مانند استمداد از صلحاء بدعا و التجاء در حال حیات و اگر بنوع دیگر است۔پس حکم آں موافق آن خواہد بود و در حدیث برائے روان شدن حاجت ایں قدر آمدہ است عن عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ قال ان رجلاً ضریر البصر اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ادع اللہ ان یعافینی فقال ان شئت صبرت فھو خیر لک قال فادعہ قال فامرہ ان یتوضأ فیحسن الوضوء ویدعو بھذا الدعاء اللّٰھم انی اسئلک و اتوجہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ انی اتوجہ بک الی ربی لیقضی لی حاجتی ھذہ اللھم فشفعہ فیَّ رواہ الترمذی و کذا فی المشکوٰۃ۔ (فتاویٰ عزیزی فارسی ج ۱ ص ۸۸، ۸۹)

جواب: استمداد اموات سے بلا شبہ بدعت ہے خواہ قبر کے پاس استمداد کی جاوے یا غائبانہ ہووے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے زمانے میں یہ امر نہ تھا لیکن اس میں اختلاف ہے کہ استمداد کرنا بدعت حسنہ ہے یا بدعت سیئہ ہے اور طریقۂ استمداد کے مختلف ہونے سے استمداد کے بارے میں حکم بھی مختلف ہوتا ہے تو اگر استمداد اس طریقے سے کیا جاوے جو سوال میں مذکور ہے تو ظاہراً جائز ہے۔اس واسطے کہ اس صورت میں شرک لازم نہیں آتا جیسا کہ بزرگوں سے بحالتِ حیات استمداد کرنا اس طور سے جائز ہے کہ ان سے عرض کیا جاوے کہ درگاہِ الٰہی میں میری حاجت روائی کے لئے آپ دعا و التجا کریں اور اگر اموات سے استمداد کسی دوسرے طریقے سے ہو تو اس طریقے کے موافق حکم ہوگا اور حدیث شریف میں حاجت روائی ہونے کے لئے اس قدر آیا ہے یعنی روایت ہے حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے کہ ایک شخص نابینا خدمت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ دعا کریں اللہ تعالیٰ سے اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو شفاء بخشے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تمہاری خواہش ہو تو دعا کروں اور اگر تم چاہو تو صبر کرو اور یہ تمہارے لئے بہتر ہے تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ دعا کریں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ وضو کرو اور احتیاط سے وضو کرو اور یہ دعا کرو: اَللّٰھُمَّ آخر حدیث تک یعنی اے پروردگار سوال کرتا ہوں تجھ سے اور متوجہ ہوتا ہوں تیری جانب بذریعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث رحمت کے لئے ہوئے ہیں میں متوجہ ہوا آپ کے ذریعے سے اپنے پروردگار کی طرف تا کہ پروردگار میری یہ حاجت پوری فرما دیوے۔اے

پروردگار آنحضرت ﷺ کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما۔ روایت کیا اس کو ترمذی نے اور ایسا ہی مشکوٰۃ شریف میں ہے۔ (ترجمہ: اُردو فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۱۸۷، ۱۸۸)

اس تفصیلی عبارت سے معلوم ہوا کہ استمداد کا جو طریقہ سوال میں مذکور ہے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ اس کو جائز کہتے ہیں۔ جب یہ صورت ان کے نزدیک جائز ہے تو پھر یہ بدعت سیئہ کیسے ہوگی؟ واضح بات ہے کہ ان کے نزدیک یہ صورت بدعت حسنہ کی ہے اور ہم نے راہِ سنت میں بقدر ضرورت اس پر بحث کی ہے کہ جو حضرات بدعت حسنہ کا اطلاق کسی جائز اَمر پر کرتے ہیں تو وہ چیز اصل میں جائز اور ثابت ہوتی ہے۔ صرف تعبیر کا فرق ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے پیشِ نظر نہیں ہے۔ ورنہ وہ بدعت کا لفظ بھی گو حسنہ ہی سہی، ہرگز نہ بولتے۔ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کی مذکور حدیث کا ماخذ اور اس کی دیگر روایتی اور درایتی بحث ہم نے تسکین الصدور میں کر دی ہے۔

مسئلہ استشفاع

آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر طلبِ مغفرت کی سفارش کرانے کا ثبوت بہت سے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ سے ثابت ہے۔ (جیسا کہ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے اجمالاً ان کے حوالہ سے اس کا جواز نقل فرمایا ہے) اور ذیل کی کتابوں میں (جن کی بقدر حاجت عبارتیں ہم نے تسکین الصدور میں عرض کر دی ہیں) ان کی عبارتیں ملاحظہ ہوں۔ فتح القدیر، فتاویٰ عالمگیری، رسائل الارکان لبحر العلوم، وفاء الوفاء، نور الایضاح طحطاوی، لباب المناسک المسلک المتقسط، کتاب الاذکار للنووی رحمہ اللہ، الایضاح فی مناسک الحج لہٗ اور شرح شفاء ملّا علی القاری رحمہ اللہ وغیرہ!

علّامہ داؤد بن سلیمان البغدادی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "و قد اطبق الائمة الحنفية على سُنية زيارة النبي ﷺ و زيارة صاحبيه رضی اللہ عنہما و السلام عليهم و طلب الشفاعة منهم" (المنحة الوهبية ص ۱۲، طبع استنبول)

بلاشبہ حضرات ائمہ حنفیہ رحمہم اللہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے دو ساتھیوں (حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما) کی زیارت کرنا اور ان کو سلام کہنا اور ان سے طلبِ شفاعت کرنا مسنون ہے۔

اس طلبِ شفاعت کا نہایت اخلاص و عقیدت کے ساتھ ذکر حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب (زبدۃ المناسک ص ۱۴۱) میں بھی کیا ہے۔ فقہی طور پر ایسے فروعی مسئلہ کے لئے اس سے زیادہ اور کیا ثبوت درکار ہے؟

گلوخلاصی

ہمارے کرم فرماؤں نے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کی ان صریح عبارات سے رُستگاری اور گلوخلاصی کے لئے ایک طریق تو یہ اختیار کیا ہے کہ ان کو قرآنِ کریم کی ان آیات سے جا ٹکرایا ہے۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) جن میں غیر اللہ کو پکارنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے مگر اہل علم جانتے ہیں کہ عند القبر طلبِ دُعا اور استشفاع کے وہ آیات ہرگز منافی نہیں ہیں۔ اگر استشفاع کی اس صورت میں کسی بھی قرآنی آیت سے تعارض پیدا ہوتا تو حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کا دینی طور پر نہایت ہی محتاط طبقہ ہرگز اس کی اجازت نہ دیتا۔ یہ طریق محض عوام کو کچھ دِکھانے یا اُلجھانے کے لئے ان حضرات نے اختیار کر رکھا ہے اور مسئلہ زیر بحث سے ان آیات کا قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔

دوسرا مختصر طریق جو انہوں نے اختیار کیا ہے، علم دوست احباب کے سامنے اس کو نہ پیش کرنا بھی ایک گونہ ظلم اور بخل ہوگا۔ مؤلف ندائے حق کا یہ حوالہ بمع جواب کے پہلے گزر چکا ہے۔ ''بس ہم اب آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ جتنی کتابوں میں یہ مسئلہ قبر پر حضور ﷺ سے دُعا استغفار استشفاع کا جو معتبر کتب میں لکھا جاچکا ہے وہ باغیوں کا لکھا ہوا ہے اور بس۔'' بلفظہٖ اور مؤلف ''اقامۃ البرہان'' کا جواب بھی اس سے کم درجہ کا نہیں ہے۔ وہ ''فتاویٰ رشیدیہ'' کی عبارت کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''فتاویٰ رشیدیہ کے مرتب سے یہاں سہو نہیں ہوا اور یہ الفاظ واقعی حضرت گنگوہی رحمہ اللہ ہی کے ہیں تو اس کے بارے میں بادب گزارش ہے کہ اُصولی طور پر اس دلیل سے اتفاق مشکل ہے۔'' (اقامۃ البرہان ص ۲۹۴) عرض ہے کہ یہ عبارت واقعی حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی ہے۔ اس لئے کہ حضرت نے ''زبدۃ المناسک'' میں بھی ایسا ہی لکھا ہے اور وہ حضرت کے اپنے ہاتھ مبارک کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اس میں کسی مرتب کا کوئی دخل نہیں ہے۔'' یہ جواب تو ''فتاویٰ رشیدیہ'' کی عبارت کا انہوں نے دیا۔ اب ان کا وہ جواب بھی ملاحظہ کریں جو بقیہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کو دیا ہے۔ ''باقی رہا فقہاء کا لکھ دینا تو یہ جواز کے لئے کافی نہیں کیونکہ یہ قول متاخرین کا ہے اور ان کو مذہب میں ایک نیا قول ایجاد کرنے کی اجازت نہیں۔ قبر مبارک تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور صاحبین کے زمانے میں بھی موجود تھی مگر انہوں نے قبر مبارک پر شفاعت مغفرت عرض کرنے کی اجازت نہیں دی اس لئے ان متاخرین کا قول حجت نہیں۔'' (اقامۃ البرہان ص ۲۹۵)

محترم! حضرت بلال بن الحارث المزنی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر وہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے صدق بلال رضی اللہ عنہ کہہ کر اس واقعہ کی تصدیق کی۔ یہ تو متاخرین میں سے نہیں ہیں اور کیا یہ ان حضرات کا قول بھی جواز کے لئے کافی نہیں ہے؟ اور پھر حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور حضرات صاحبین رحمہم اللہ کا مسلک آپ زیادہ جانتے ہیں یا حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ، حضرت ملا علی القاری رحمہ اللہ مرتبین فتاویٰ عالمگیری اور علامہ بحر العلوم وغیرہ حضرات؟ اور پھر یہ بھی بتایا جائے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور حضرات صاحبین رحمہم اللہ سے بصراحت کس کتاب کے حوالہ سے یہ ثابت ہے کہ اُنہوں نے قبر مبارک پر شفاعت مغفرت عرض کرنے کی اجازت نہیں دی؟ بات تو صرف اتنی ہے کہ ان حضرات نے ایک رائے قائم کر رکھی ہے اور یہ اس کو کسی قیمت پر چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں خواہ اس میں ان کی جمہور سے ٹکر ہو یا متاخرین سے متقدمین سے معرکہ ہو جائے یا دیگر طبقہ کے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ سے۔ خود حضرات فقہاء احناف رحمہم اللہ سے اختلاف ہو یا اپنے ہی دیوبندی اکابر سے۔ بہرکیف بقول ان حضرات کے ان کا ان سے اتفاق مشکل ہے۔ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک اعجاب کل ذی رأی برأیہ بھی ہے اور اس پُرفتن دَور میں ہم نے بہت سے لوگوں کا مشاہدہ کرلیا ہے۔ ان لوگوں کا علمی اور تحقیقی طور پر فرض ہے کہ وہ اپنے قائم کردہ اُصول کے مطابق متقدمین سے بصراحت یہ ثابت کردیں کہ عند القبر آنحضرت ﷺ اور حضرات صاحبین رضی اللہ عنہما سے استشفاع درست نہیں۔ باقی رہے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ، حافظ ابن القیم رحمہ اللہ، علامہ ابن الہادی رحمہ اللہ اور امام ابن رجب رحمہ اللہ وغیرہ حضرات، تو ایک تو یہ متاخرین میں شامل ہیں۔ ان کا قول بلا دلیل حجت نہیں۔ پھر اس مسئلہ میں یہ فریق ہیں۔ لہٰذا مجوزین کے نزدیک ان کی بات حجت نہیں ہے۔ جب کہ وہ جمہور ہیں اور قرآن وحدیث ان کا مستدل ہے۔

توسّل اور عند القبور طلب دُعا کا منظم طور پر انکار

خیر القرون سے دُور ہونے کے بعد عموماً مسلم قوم قرآن وسنت سے غفلت کی وجہ سے بہت کچھ برائیوں میں مبتلا ہو گئی تھی اور اس میں توحید وسنّت کی جگہ شرک و بدعت سرایت کر گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قبر پرستی کا عام رواج ہو گیا اور جہالت کی وجہ سے کچھ لوگ حضرات اولیاء کرام ﷭ کو حاجت رَوا اور مشکل کشا سمجھنے لگے اور ان کی قبروں پر حاضر ہو کر ان سے مُرادیں مانگنے لگے۔ اپنے دَور میں قوم کی اصلاح کی خاطر منظم طریقہ پر توسّل، استشفاع عند القبور اور زیارۃ القبور کا رَد اور انکار حافظ ابن تیمیہ ﷫ اور ان کے تلامذہ اور متوسّلین نے شروع کیا۔ ابتداء میں ان حضرات کے فتوے نہایت نرم اور لہجہ بڑا معقول وموزوں تھا اور وہ قبور کے پاس حاضر ہو کر مُردوں سے طلب دُعا کے بارے میں محض اتنا ہی کہتے رہے کہ یہ طریقہ قرآن وسنّت اور ائمہ اربعہ اور سلف صالحین ﷭ سے ثابت نہیں ہے اور یہ کارروائی ان میں سے کسی نے نہیں کی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس سے آگے بڑھے اور اس طریقہ کو صرف ذریعۂ شرک قرار دیا۔

چنانچہ خود امام ابن تیمیہ ﷫ ہی تحریر فرماتے ہیں: ’’فنهی الله سبحانه عن دعاء الملائكة والانبياء مع اخباره لنا ان الملائكة يدعون لنا و يستغفرون ومع هذا فليس لنا ان نطلب ذلك منهم وكذلك الانبياء والصالحون وان كانوا احياء في قبورهم وان قدر انهم يدعون للاحياء وان وردت به آثار فليس لاحد ان يطلب منهم ذلك و لم يفعل ذلك احد من السلف لان ذلك ذريعة الى الشرك بهم و عبادتهم من دون الله تعالى بخلاف الطلب من احدهم في حياته فانه لا يفضي الى الشرك‘‘

(القاعدۃ الجلیلۃ فی التوسل والوسیلۃ ص ۱۳۹، ۱۴۰)

ترجمہ: ’’پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرات ملائکہ اور حضرات انبیاء کرام ﷫ کو پکارنے سے منع فرمایا ہے۔ باوجود اس خبر دینے کے کہ حضرات ملائکہ ﷫ ہمارے لئے دُعا اور مغفرت چاہتے ہیں۔ تاہم ہمیں ان سے طلب کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح حضرات انبیاء کرام اور صالحین ﷫ اپنی قبروں میں زندہ ہونے کے باوجود اور یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ وہ زندوں کے لئے دُعا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس کے متعلق حدیثیں بھی آئی ہیں، کسی کو یہ جائز نہیں ہے کہ ان سے کچھ طلب کرے۔ حضرات سلف ﷭ میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا ہے کیونکہ ’’ایسا کرنے سے ان کے ساتھ شرک کا ذریعہ بن جاتا ہے‘‘ اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان سے پوجا ہونے لگتی ہے بخلاف زندگی میں کسی سے حاجت طلب کرنے میں کیونکہ یہ فعل شرک کی طرف نہیں لے جاتا۔‘‘

صرف نظر اس سے کہ جو حضرات عند القبور طلب دُعا کے قائل ہیں وہ بھی دُور دَراز مقامات پر غیر اللہ تعالیٰ کو پکارنے کو شرک کہتے ہیں اور اس پکارنے کی نہی کو وہ دُور سے مقید کرتے ہیں تاہم اس عبارت میں حافظ ابن تیمیہ ﷫ ایسی کارروائی کو اپنے خیال میں صرف شرک کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اس پر عین شرک کا فتویٰ صادر نہیں کرتے اور دلائل وبراہین پر نگاہ رکھتے ہوئے اس سے زیادہ فتویٰ اس پر لگ بھی نہیں سکتا۔ اِلّا یہ کہ کوئی جاہل توحید کے زرّیں اُصول کو چھوڑ کر دامِ شرک میں مبتلا ہو کر خالص شرکیہ کارروائی شروع کردے تو معاملہ جدا ہے لیکن جب ان حضرات کے اس مسلک کو بعض علاقوں میں کچھ پذیرائی ہوئی تو عام مسلمانوں کی طرف سے اس کا شدید ردعمل بھی

ہوا۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے شاگرد رشید اور ان کے خیالات ونظریات کے پُرجوش حامی (جو پہلے ان کے شدید مخالف تھے) شیخ شہاب احمد بن محمد مری الحنبلی رحمہ اللہ نے قاہرہ میں ۷۲۵ھ میں توسّل بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسئلہ زیارت کے متعلق اپنے اُستادِ محترم حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی حمایت کی تو فقہاء وقت نے اُن کی سخت مخالفت کی، ابن مری رحمہ اللہ کو پیٹا گیا اور قاضی القضاۃ تقی الدین احنائی المالکی رحمہ اللہ نے ان کو اس بدعقیدگی کے جرم میں قید کی سزا دی۔ کچھ دن قید رہے پھر جلاوطن کر دیئے گئے۔ (ذیل العبر للذھبی رحمہ اللہ حالات ۷۲۵ھ کو بحوالہ اصلاح الاخوان مؤلفہ سید شیخ داؤد آفندی رحمہ اللہ ص ۹۸ اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ص ۶۵۷،۵۵۲)

اسی طرح جب ۷۲۶ھ میں زیارت قبور اور توسّل، وسیلہ اور استغاثہ کے مسئلہ کی وجہ سے ہنگامہ ہوا تو حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنے اُستاد کے خیالات ہی کی پُرزور حمایت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق کی حکومت نے انہیں بھی گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا۔ استاد کی وفات کے بعد ۲۰/ذوالحجہ ۷۲۸ھ کو اُن کو قید سے رہائی ملی۔

(امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ص ۶۴۹، ۶۵۰، از افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری)

جب ان پر یہ تشدد ہوا تو حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی طبیعت میں شدت اور حدت تو تھی ہی ان کے فتوے میں بھی شدت آ گئی اور جس چیز کو پہلے وہ یوں تعبیر کرتے تھے کہ یہ حضرات سلف رحمہم اللہ سے ثابت نہیں یا یہ ذریعۂ شرک ہے۔ اس کارروائی کو وہ آخر میں صریح شرک سے تعبیر کرنے لگے۔ جس کا اثر قدرتی طور پر ان کے تلامذہ اور متوسّلین پر بھی ہوا اور یہ حضرات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر طلبِ دُعا اور طلبِ شفاعت کرنے کو صریح الفاظ میں شرک سے تعبیر کرنے لگے۔ چنانچہ حافظ ابن القیم، علامہ ابن الہادی، حافظ ابن رجب اور امام بدرالدین بعلی رحمہم اللہ وغیرہ اسی نظریہ کے قائل ہیں اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ کا بھی اس مسئلہ کے بارے میں وہی نظریہ ہے جو ان حضرات کا ہے۔ گویا اس مقام پر آ کر رائے وتحقیق کے سلسلہ میں دو راستے ہو جاتے ہیں۔ ایک وہ ہے جس پر جمہور حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ (عام اس سے کہ وہ مالکی ہوں یا حنفی، شافعی ہوں یا حنبلی) مگر حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بعد اکثر حنبلی امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نظریہ کے حامل ہیں) گامزن ہیں کہ ایسا کرنا جائز ہے اور سب ہی طبقوں کے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے مناسک اور فقہ کی کتابوں میں قبر مبارک کے پاس استشفاع کو جائز کہا ہے اور پھر اس کا طریقہ بتایا ہے کچھ تفصیل تسکین الصدور میں ملاحظہ فرمائیں اور اس مسئلہ میں صحیح رائے حضرات جمہور ہی کی ہے کیونکہ ید اللہ علی الجماعۃ۔ یہ الگ بات ہے کہ مؤلف ندائے حق وغیرہ انہیں جمہور زنبور کہہ کر ان سے اپنی خواہش کے مطابق چھٹکارا حاصل کر لیں۔

تفردات

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے کئی علمی اختیارات وتفردات ہیں، جو ان کے فتاویٰ کی چوتھی جلد کے ساتھ کتابی شکل میں منسلک ہیں اور فتاویٰ میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً یہ کہ سجدۂ تلاوت کے لئے وضو ضروری نہیں۔ (فتاویٰ ج ۳ ص ۹۵) اور یہ کہ ایک مجلس یا ایک کلمہ کے ساتھ دی گئی تین طلاقیں صرف ایک ہی ہوتی ہے اور یہ کہ حیض کی حالت میں طلاق نہیں ہوتی اور یہ کہ ہر بڑے چھوٹے سفر میں قصر اور دوگانہ ضروری ہے۔ (فتاویٰ ج ۳ ص ۹۵) اور یہ کہ اگر کوئی شخص عمداً نماز

چھوڑ دے تو اس کی قضاء نہیں اور یہ کہ توسّل درست نہیں اور اسی طرح استشفاع عند القبر جائز نہیں۔ وغیرہ وغیرہ! اور اسی قسم کے اختلافی مسائل کی وجہ سے ان کو حکومتِ وقت اور عوام اور علماء کی طرف سے خاصی دِقت پیش آئی اور کئی مرتبہ قید و بند سے دوچار ہوئے اور صعوبتیں اُٹھائیں مگر اپنے نظریات سے اُنہوں نے رجوع نہیں کیا اور تادمِ مرگ ان پر سختی سے کاربند اور مُصر رہے۔ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کئی فتوؤں میں متفرد ہیں جن کی وجہ سے اُن کی عزت خطرے میں پڑ گئی اور یہ فتوے ان کے علم کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے دَرگزر کرے اور ان سے راضی ہو۔ مَیں نے ان جیسی شخصیت نہیں دیکھی اور جب کہ (بجز جناب رسول اللہ ﷺ کے) ہر ایک کی بات کو لیا بھی جاسکتا ہے اور ترک بھی کیا جاسکتا ہے تو پھر ان کی لغزشوں سے کیا ہوا؟

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۷۹)

راقم الحروف ان کی بہت سی کتابوں سے مستفید ہوا ہے اور ان کا بڑا مداح اور ان کے بے شمار علمی اور مجاہدانہ کارناموں کا قائل ہے لیکن ان کے تفردات میں ان کا حامی نہیں ہے اور اس میں مسلکِ اعتدال راجح اور قوی نظریہ جمہور ہی کا ہے اور راقم بھی جمہور کے ساتھ ہے۔

طبیعت میں شدّت و حِدّت

اللہ تعالیٰ نے حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے دَور میں علم و اصلاح اور جہاد وغیرہ بہت سی نعمتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا اور وہ اپنے زمانہ میں اپنا نظیر اور اپنی مثال خود تھے مگر فطری طور پر ان کی طبیعت میں بے حد حدت اور شدّت تھی۔

چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''طبیعت میں حدت اور شدّت تھی اس کے باوجود ان کے اندر حلم اور بُردباری بھی تھی۔'' (الدرر الکامنہ ج ۱ ص ۱۵۱، وامام ابن تیمیہ ص ۵۸۱)

اور نیز لکھا ہے کہ: ''ان کی بحث و تکرار میں بہ تقاضائے بشریت غیظ و غضب میں حِدّت اور تیزی پیدا ہو جاتی تھی۔'' (الدرر الکامنہ ج ۱ ص ۱۵۱ والبدر الطالع ج ۱ ص ۶۵ وامام ابن تیمیہ ص ۶۰۳)

افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری لکھتے ہیں کہ: ''امام موصوف کی طبیعت میں تیزی اور حدت و شدّت زیادہ تھی۔ جب کوئی کام خلافِ شریعت ہوتا ہوا نظر آتا تو بگڑ جاتے تھے۔'' (امام ابن تیمیہ ص ۵۸۶)

حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام میں ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''اما الحافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فانه و ان نسب الزیادۃ و النقصان الی امامنا رحمۃ اللہ علیہ لکن فی طبعه سورۃ واحدۃ فاذا اعطف الی جانب عطف ولا یبالی و اذا تصدی الی احد تصدی ولا یحاشی ولا یؤمن مثله من الافراط و التفریط فالتردّد فی نقله لهذا'' (فیض الباری ج ۱ ص ۵۹)

ترجمہ: ''بہرحال حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ ایمان کی زیادت اور نقصان کی نسبت ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کی ہے لیکن اُن کی طبیعت میں تیزی اور حدت ہے۔ وہ جب کسی کی طرف جھکتے ہیں تو اسی طرف کے ہو رہتے ہیں اور پرواہ نہیں کرتے اور جب کسی کے درپے ہوتے ہیں تو درپے ہی رہتے ہیں اور پرہیز نہیں کرتے۔ سو ایسی شخصیت سے افراط و تفریط غیر متوقع نہیں ہوتی، اس لئے ان کی نقل میں تردّد ہے۔

اور دُوسرے مقام پر اُن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: ''واذا تاؤل ابن تیمیة ؒ فی مثل ھذہ الالفاظ فما ذا یصنع فی قولہ حُسِبت علیَّ بتطلیقة فانہ صریح فی عبرتھا الّا انہ من طریقتہ انہ اذا مرّ بلفظ لا یسوغ فیہ تأویلہ یغمض عنہ'' (فیض الباری ج ۴ ص ۳۱۰)

ترجمہ: ''مان لیا کہ حافظ ابن تیمیہ ؒ ان جیسے الفاظ کی تاویل کرتے اور کر سکتے ہیں لیکن یہ تو بتائیں کہ وہ حضرت ابن عمر ؓ کے اس قول سے کیا کریں گے کہ بحالتِ حیض میری دی ہوئی طلاق کا اعتبار کیا گیا۔ یہ قول تو صراحت سے دلالت کرتا ہے کہ بحالتِ حیض دی ہوئی طلاق کا اعتبار کیا گیا مگر حافظ ابن تیمیہ ؒ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ جب کسی ایسے لفظ پر آتے ہیں جس میں اُن کی تاویل نہیں چلتی تو وہ اس سے آنکھیں ہی بند کر لیتے ہیں۔

یہ روایت (بخاری ج ۲ ص ۷۹۰ اور مسلم ج ۱ ص ۴۷۶) میں ہے جس میں تصریح موجود ہے کہ بحالتِ حیض طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ صراحت حافظ ابن تیمیہ ؒ کی رائے اور مسلک کے خلاف ہے، اس لئے وہ اس میں تاویلات سے کام لیتے ہیں، مگر حُسِبَتْ علیَّ بتطلیقة کے صریح ارشاد سے گلو خلاصی نہیں کرا سکے۔ غالباً علامہ ذہبی ؒ (المتوفی ۷۴۸ھ) نے حافظ ابن تیمیہ ؒ کو ایسے ہی موقع پر ایک طویل خط میں تنبیہ فرمائی کہ اے کاش! صحیحین کی حدیثیں تم سے بچی رہتیں۔ تم تو ہر وقت تضعیف واہدار یا تاویل وانکار سے ان پر حملہ کرتے رہتے ہو۔ (زغل العلم ص ۱۷، ۱۸، امام ابن تیمیہ ؒ ص ۶۱۱) بلکہ علامہ ذہبی ؒ نے (زغل العلم ص ۳۲) اور اپنے رسالہ النصیحۃ الذھبیۃ لابن تیمیۃ ؒ میں ان کو خاصا کوسا ہے اور یہاں تک لکھا ہے کہ عقلمندوں کی جماعت ان کو محقق فاضل اور متبدع قرار دیتی ہے۔ (امام ابن تیمیہ ص ۶۰۸)

امام ابن حجر المکی ؒ (المتوفی ۹۷۴ھ) نے الجواہر المنظم میں اور علامہ تقی الدین الحصنی ؒ نے دفع الشبہ میں ان کو گمراہ تک کہا ہے۔ (معارف السنن ج ۳ ص ۳۳۱) حافظ ابن تیمیہ ؒ نے (منہاج السنۃ ج ۱ ص ۲۴۷) میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی تعبیر اختیار کی جس سے جسمیت کا شبہ ہوتا ہے۔ امام سبکی ؒ اس سے برہم ہو کر اپنے طویل قصیدہ نونیہ میں حافظ ابن تیمیہ ؒ کو صریح گالی دینے سے بھی باز نہیں آئے۔

ایک شعر یہ ہے ؎

کذب ابن فاعلة یقول بجھلہ اللہ جسم لیس کالجسمانی

(طبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۲۶۲)

یہ بڑوں کی آپس میں معاصرانہ یا ناقدانہ باتیں ہیں۔ ہمارے لئے سبھی حضرات قابل قدر ہیں اور معاذ اللہ تعالیٰ ہمارا مقصد ان حوالوں سے حافظ ابن تیمیہ ؒ کی توہین وتنقیص نہیں ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ کئی مسائل میں وہ منفرد ہیں اور ان مسائل میں ان کے شاگردوں اور مخصوص متوسلین کے بغیر اور کسی نے ان کی ہم نوائی نہیں کی اور طبیعت کی شدت اور حدّت کی وجہ سے وہ ان پر مصر بھی رہے۔ لہٰذا جمہور کا ساتھ چھوڑ کر ایسے نظریات میں ان کا ساتھ نہیں دیا جا سکتا حق جمہور کے ساتھ ہی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے روضۂ اقدس کی نیت سے سفر

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے جمہور کے ساتھ اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ بقول ان کے دور دراز سے آنحضرت ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضری کی نیت سے سفر نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں! مسجد نبوی کا قصد کیا جا سکتا ہے اور وہاں پہنچ کر پھر روضۂ اقدس کی زیارت بھی کی جا سکتی ہے۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لئے سفر درست نہیں ہے۔ ہاں! جو قبریں آبادی سے ملحق ہوں ان کی زیارت کرنا وہ مستحب سمجھتے ہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ نے "جنت البقیع" وغیرہ کی قبروں کے قریب ہونے کی بناء پر زیارت کی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مذہب کی نقل کرنے میں لوگوں نے خطاء کی ہے۔ (بایں طور کہ ان کا مذہب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ مطلقاً زیارت قبور ہی کے منکر ہیں دُور ہوں یا نزدیک، حالانکہ وہ قریب سے زیارت کے قائل ہیں)

علامہ ابن عابدین الشامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لئے دُور سے کوچ اور سفر کرنے اور رخت سفر باندھنے سے منع کرتے ہیں اور قریب سے زیارت قبور کو جائز قرار دیتے ہیں اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اس مسئلہ میں حضرات متقدمین رحمہم اللہ میں سے صرف چار بزرگ موافق ہیں۔ ان میں سے ایک الجوینی رحمہ اللہ (امام ابو محمد عبداللہ بن یوسف الشافعی رحمہ اللہ المتوفی ۴۳۸ھ) والد امام الحرمین رحمہ اللہ (ابو المعالی عبد الملک الشافعی رحمہ اللہ المتوفی ۴۷۸ھ) بھی ہیں اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جب یہ مسئلہ اختیار کیا تو وہ مصائب اور تکالیف میں مبتلاء ہو گئے اور امام تقی الدین السبکی رحمہ اللہ نے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے رَد میں ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام "شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام" ہے اور میں نے اس میں کوئی جدید اور تازہ کوئی شئے نہیں دیکھی۔ وہ ضعیف روایات کی تقویت کے درپے رہے ہیں۔ پھر امام ابن الہادی رحمہ اللہ نے علامہ سبکی رحمہ اللہ کے رد میں کتاب لکھی جس کا نام "الصارم المنکی علی نحر السبکی" رکھا اور اس نے اپنی تصنیف میں عمدگی کا ثبوت دیا ہے۔ پھر ان کے رَد میں علامہ ابن علان (احمد بن ابراہیم المکی الشافعی النقشبندی رحمہ اللہ المتوفی ۱۰۳۳ھ) نے کتاب لکھی جس کا نام انہوں نے "المبرد المبکی علی الصارم المنکی" رکھا۔ (نہایت افسوس ہے کہ سعودی حکومت نے، جس پر نجدی علماء کے خیالات کا غلبہ ہے، جو حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مسلک کے پیرو ہیں، اس کتاب کا داخلہ ہی حجاز میں ممنوع قرار دے دیا ہے جیسا کہ "شامی" جیسی مفید کتاب ممنوع الدخول ہے اور "الصارم المنکی" اور اسنی المطالب وغیرہ کتابوں کی بکثرت اشاعت کرتے ہیں اور یہ ہر کتب خانہ سے بآسانی مل سکتی ہیں۔ صفدرؔ) اور طرفین سے سلسلہ تالیف و تصنیف جاری رہا اور جمہور ائمہ کا مذہب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی قبر شریف کی زیارت جائز ہے اور اعلیٰ درجہ کی نیکیوں میں شمار ہے اور نہی شد رحال کی حدیث کے مختلف جوابات جمہور کی طرف سے دیئے گئے ہیں ان میں سے بہتر وہ جواب ہے جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے (فتح الباری ج ۳ ص ۵۳ میں) اور علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ نے (عمدۃ القاری ج ۳ صفحہ ۳۸۲ میں) دیا ہے اور دونوں کا مستدل وہ روایت ہے جو (مسند احمد ج ۳ ص ۶۴) میں ہے کہ تین مسجدوں کے علاوہ اور کسی مسجد کی طرف سفر نہ کیا جائے کہ اس میں نماز پڑھی جائے۔ (یعنی مستثنیٰ منہ عام نہیں بلکہ صرف مسجد ہے۔ صفدرؔ) رہی اس مسئلہ میں جمہور کی دلیل تو وہ یہ ہے کہ تواتر کے ساتھ حضرات السلف

الصالحین رحمہم اللہ سے آنحضرت ﷺ کے روضۂ اقدس کی طرف ان سے سفر ثابت ہے اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے پیروکار اس سے کوئی تسلی بخش اور شافی جواب نہیں دے سکے۔ باقی ان کا یہ جواب کہ حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ مسجد نبوی کی طرف سفر کیا کرتے تھے اور روضۂ مطہرہ کی طرف ان کا سفر نہ ہوتا تھا، ایک بناوٹی بات ہے۔ (فقول مصنوع) اس لئے کہ حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ کے سفر کی غرض صرف مسجد نبوی ہی ہوتی تو وہ حضرات مسجد نبوی کی طرح مسجد اقصیٰ کا سفر بھی اسی اہتمام سے کرتے۔ حالانکہ واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ان حضرات سے اس کا کوئی شافی جواب نہیں بن سکا۔

مسئلہ: حضرات اولیاء کرام رحمہم اللہ کی قبور کی زیارت کے لئے دُور دراز سے سفر کرنے کے لئے، جیسا کہ ہمارے اس زمانے میں معمول بن چکا ہے، صاحب شریعت (آنحضرت ﷺ) یا صاحب مذہب (یعنی مثلاً امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ) یا مشائخ سے نقل اور حوالہ کی ضرورت ہے اور دُور دراز قبروں کی زیارت کا گاؤں اور شہر کے قریب قبروں کی زیارت پر قیاس کرنا جائز اور درست نہیں ہے کیونکہ قریب کی قبور کے لئے کوئی سفر ہی نہیں ہوتا۔ (العرف الشذی ص ۱۶۳) میں ہے۔ (معارف السنن ج ۳ ص ۳۳۵) میں بھی ہے۔

دیوبندی مسلک کے حضرات، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اس عبارت کو بار بار پڑھیں اور غور کریں کہ حضرت نے کیا فرمایا ہے؟ اور خصوصیت سے مؤلف ندائے حق وغیرہ جنہوں نے الصارم المنکی کے بارے میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ''قد اجاد'' کا جملہ ہی پلّے باندھ لیا ہے اور آگے سب عبارت ہڑپ کر لی ہے اُن کو معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے صرف ان کی عالمانہ تحریر کی داد دی ہے نہ کہ ان کے دلائل کی۔ اسی لئے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ بار بار فرماتے ہیں کہ جمہور کی دلیل کا شافی اور تسلی بخش جواب نہ تو علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ دے سکے ہیں اور نہ اُن کے پیروکار۔

محقق العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا السید محمد یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اُستاد محترم نے فرمایا کہ جو مسلک حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اس کی طرف ان سے قبل چار عالم گئے ہیں۔ ایک ان میں ابو محمد الجوینی رحمہ اللہ والد امام الحرمین رحمہ اللہ ہیں اور دوسرے ان میں قاضی عیاض المالکی رحمہ اللہ ہیں اور تیسرے ان میں قاضی حسین الشافعی رحمہ اللہ ہیں جیسا کہ فتح الباری اور عمدۃ القاری میں ہے۔ راقم (یعنی حضرت مولانا بنوری صاحب) کہتا ہے کہ ان حضرات سے جو چیز منقول ہے وہ یہ ہے کہ نیک لوگوں کی زیارت کے لئے، زندہ ہوں یا مُردہ، اور اسی طرح متبرک مقامات کی طرف بقصد تبرک سفر کرنا اور وہاں نماز پڑھنا منع ہے۔ جیسا کہ فتح الباری وغیرہ میں ہے اور ان حضرات سے صراحت کے ساتھ یہ ثابت نہیں ہے کہ انہوں نے خصوصیت سے آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت سے منع کیا ہو۔ ہاں! ان کے نزدیک لفظ صالحین کے عموم میں یہ بھی داخل ہو تو الگ بات ہے۔ بلکہ قاضی عیاض رحمہ اللہ کے کلمات ان کی کتاب ''الشفاء'' میں جمہور کے موافق ہیں اور بحث و تمحیص کے بعد یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے پیروکار اس مسئلہ میں متفرد ہیں۔ اگرچہ ان کے بعض اقوال میں جمہور اُمت اور تمام ائمہ کے مقابلہ میں کچھ لوگ ان کے موافق بھی ہیں اور اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ ایک تھوڑا سا طائفہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مسلک کے موافق ہے تو ہو لیکن یہ ایک ایسا قول تھا جس کا نشان آفاق میں اوراق کے گوشوں کے اندر پوشیدہ تھا۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ہی وہ شخص ہیں جنہوں نے نئے سرے سے اس مُردہ مسئلہ کو قبر سے اُٹھا باہر لا کھڑا کیا ہے اور اس کی وجہ سے اُمت میں فتنے کا ایک نیا

دروازہ کھل گیا ہے اور اسی لئے یہ مسئلہ بھی ان کے دیگر شاذ مسئلوں کی طرح شاذ اور ان کا تفرد ہی سمجھا جاتا ہے اور اس کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ تقی الدین الحصنی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب دفع الشبہ میں ایسی ہی تحقیق کی ہے جس کی میں گمان کرتا تھا۔ (دفع الشبہ ص ۹۷) اور اس کے بعد) سو انہوں نے تحقیق کی کہ امام ابومحمد الجوینی رحمہ اللہ اور قاضی عیاض رحمہ اللہ وغیرہ آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی طرف سفر کو حرام نہیں کہتے۔ اس کا مطالعہ کرنا چاہئے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور ان کے علاوہ بے شمار محققین نے یہ ثابت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے مشروع ہونے پر بلا اختلاف اجماع ہے جیسا کہ فتح الباری میں ہے۔ اس تحقیق کے بعد حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اجماع کی مخالفت کی ہے اور اس اجماع کو قاضی عیاض المالکی رحمہ اللہ اور امام نووی الشافعی رحمہ اللہ اور حافظ ابن الہمام الحنفی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے اور اس مسئلہ میں اجماع کی مخالفت کی وجہ سے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ طرح طرح کے مصائب اور شدائد میں مبتلاء ہوئے، جیسا کہ الدرر الکامنہ میں ہے۔'' (معارف السنن ج ۳ ص ۳۳۰، ۳۳۱)

اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ حضرات کی اس تاویل کا کہ مدینہ طیبہ جانے والے مسجد نبوی کا قصد کرتے ہیں (یا کریں) اور اس کے بعد روضۂ اقدس کی حاضری کا رَد کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ المسجد الحرام جو جمہور کے نزدیک مسجد نبوی سے زیادہ افضل ہے، جس میں مسجد نبوی میں پڑھی ہوئی نماز سے کئی گنا زیادہ ثواب ہوتا ہے۔ (آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مسجد حرام میں نماز پڑھنا ایک لاکھ نماز کے مساوی ہے اور میری مسجد میں ایک ہزار نماز کے برابر ہے اور مسجد اقصیٰ میں پانچ سو نماز کے برابر ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۴ ص ۷، حدیث حسن)

پھر کیا وجہ ہے کہ سلف صالحین رحمہم اللہ محض نماز پڑھنے کے لئے المسجد الحرام کی اعلیٰ فضیلت چھوڑ کر مسجد نبوی کی ادنیٰ فضیلت حاصل کرنے کے لئے سفر کرتے اور تکلیفیں اُٹھاتے رہے؟ اور پھر مسجد اقصیٰ کے سفر کا بھی انہوں نے کوئی خاص اہتمام نہ کیا۔ حالانکہ بعض روایات میں ان دونوں کا درجہ برابر آیا ہے۔ الغرض اگر حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ کا مقصد آنحضرت ﷺ کے روضۂ اقدس کی برائے زیارت حاضری مقصود نہ ہوتی تو صرف مسجد نبوی کے اس اہتمام کا کیا معنی؟ اور کیا مقصد؟ (محصلہ معارف السنن ج ۳ ص ۳۳۴)

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اس غلو اور شدت کے مقابلہ میں حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے آنحضرت ﷺ کے روضۂ اقدس پر زیارت کی نیت سے حاضر ہونے کو افضل قربات بلکہ قریباً واجب قرار دیا ہے۔

چنانچہ محقق احناف ابن الہمام (المتوفی ۸۶۱ھ) لکھتے ہیں: ''المقصد الثالث فی زیارۃ قبر النبی ﷺ من افضل المندوبات وفی مناسک الفارسی وشرح المختار انہا قریبۃ من الوجوب لمن لہ سعۃ''

(فتح القدیر ج ۲ ص ۵۸۹، طبع ہند)

ترجمہ: ''تیسرا مقصد آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت۔ ہمارے مشائخ رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ تمام مستحبات میں سے افضل ہے اور مناسک فارسی اور شرح مختار میں ہے کہ صاحب استطاعت کے نزدیک واجب کے قریب ہے۔

ان سلجھے ہوئے فقہی الفاظ میں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور اس مسئلہ میں ان کے متوسّلین کا رَد ہے اور جمہور کے مسلک کی پُرزور تائید ہے اور امام ابن ہبیرہ رحمہ اللہ نے کتاب ''اتفاق الائمہ رحمہم اللہ'' میں تصریح فرمائی ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا اتفاق ہے کہ قبر نبوی کی زیارت سب سے بہتر کاموں میں سے ہے۔ (حاشیہ مکتوبات شیخ الاسلام مدنیؒ ج اوّل ص ۱۲۰)

باب اَوّل

سماعِ موتی کے بعض دلائل

اس مسئلہ کے اثبات پر قدیماً و حدیثاً متعدد عقلی اور نقلی دلائل پیش کئے گئے ہیں مگر ہمارا مقصد اس مقام پر تمام دلائل و براہین کا استیعاب و احاطہ نہیں اور نہ یہ ہمارے بس کی بات ہے بلکہ بعض دلائل پیش کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ قائلین سماعِ موتی بھی بحمد اللہ تعالیٰ قوی دلائل سے لیس ہیں اور ان کے دعویٰ، مسلک اور دلائل و براہین کا کلیۃً انکار کر دینا فہم و بصیرت اور علم و انصاف سے یکسر دُور ہے۔ ہاں! اختلافی مسائل میں اپنے پسندیدہ مسلک کو دلائل سے مبرہن کر کے ترجیح دینا اور انصاف و دیانت کے ساتھ علم و تحقیق کی روشنی میں فریق ثانی کو جواب دینا ایک خالص علمی خدمت ہے۔ جس کو اہلِ علم حضرات انجام دیتے رہتے ہیں۔ وَالْعِصْمَۃُ بِیَدِ اللّٰہِ تعالٰی وَحْدَہٗ!

پہلی دلیل: حضرت اَنس رضی اللہ عنہ (المتوفی ۹۳ھ) سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''العبد اذا وضع فی قبرہ وتولی و ذہب اصحابہ حتّٰی انہ لَیسمع قرع نعالھم اتاہ ملکان''

(الحدیث بخاری ج ۱ ص ۱۷۸، واللفظ لہٗ و مسلم ج ۲ ص ۳۸۶ و ابوداؤد ج ۲ ص ۲۹۹، ۱۰۴، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۴، سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۸۰، مصنف ابن ابی شیبۃ ج ۳ ص ۳۷۸، طبع حیدر آباد دکن، مسند احمد ج ۳ ص ۱۲۶، شرح السنۃ ج ۵ ص ۴۱۵)

بندہ جب قبر میں رکھا جاتا ہے اور اُس کے ساتھی اس سے چلے جاتے ہیں۔ ابھی وہ ان جانے والوں کی جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ ہی سُن رہا ہوتا ہے کہ اچانک اس کے پاس دو فرشتے آجاتے ہیں۔

اور (مستدرک ج ۱ ص ۳۸۰) کی روایت میں جس کے علیٰ شرط مسلم صحیح ہونے پر امام حاکم رحمہ اللہ اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ دونوں متفق ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''والذی نفسی بیدہٖ انہ لیسمع خفق نعالھم حین یولّون عنہ''

''اس ذات کی قسم کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ ان کی جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ سنتا ہے جس وقت لوگ اس سے واپس ہوتے ہیں۔''

اور یہ روایت (موارد الظمآن ص ۱۹۶) میں بھی ہے اور (شرح السنۃ ج ۵ ص ۴۱۳) میں ان المیّت یسمع حِسّ النعال اذا ولوا عنہ الناس مدبرین کے الفاظ ہیں۔

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ مُردہ دفن کے بعد قبر میں قبر سے واپس ہونے والے لوگوں کی جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ اور آواز سُنتا ہے اور جب یہ سُنتا ہے تو انسانوں کی آواز بطریق اولیٰ سنتا ہے۔ تسکین الصدور میں باحوالہ ٹھوس دلائل کے ساتھ یہ بات ہم نے بیان کردی ہے کہ جمہور اہل السنت والجماعت کے نزدیک قبر کی راحت اور عذاب رُوح اور جسم دونوں سے وابستہ ہے اور منکر و نکیر (نافرمانوں کے لئے اور مبشر و بشیر فرماں برداروں کے لئے) (کذا فی فتح الباری ج ۳ ص ۴۸۰) کے آنے سے قبل ہی اس میں اعادۂ رُوح ہو جاتا ہے اور اسی موقع پر مُردہ جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ سنتا ہے۔

اسی سلسلہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ: ''وقد ثبتت الاحادیث بما ذهب الیه الجمهور کقوله انه یسمع خفق نعالهم وقوله تختلف اضلاعه لضمة القبر وقوله یسمع صوته اذا ضربه بالمطراق وقوله یضرب بین اذنیه وقوله فیقعدانه وکل ذٰلک من صفات الاجسام''

(فتح الباری ج ۳ ص ۱۸۴، طبع مصر)

''جمہور کے مسلک کے مطابق احادیث ثابت ہیں مثلاً یہ کہ مُردہ دفن کرنے والوں کی واپسی پر ان کی جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ سنتا ہے اور یہ کہ قبر کی تنگی کی وجہ سے اس کی پسلیاں آر پار ہو جاتی ہیں اور یہ کہ اس کو جب ہتھوڑے سے پیٹا جاتا ہے تو اس کی آواز سُنی جاتی ہے اور یہ کہ جب اس کے دونوں کانوں کے درمیان گرز ماری جاتی ہے اور یہ کہ منکر ونکیر اُس کو بٹھاتے ہیں تو یہ جملہ اُمور اجسام کی صفات ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ مُردہ کے لئے سماع قرع نعال ثابت ہے اور یہ حقیقت پر محمول ہے، کوئی مجاز و کنایہ نہیں اور دیگر اُمور کی طرح اس میں بھی مُردہ کے جسم کا تعلق ہے یہ محض رُوح ہی سے وابستہ نہیں ہے اور حضرت امام محمد بن اسمٰعیل البخاری رحمہ اللہ (المتوفی ۲۵۶ھ) نے اس سلسلہ میں صحیح بخاری میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے باب المیّت یسمع خفق النعال (ج ۱ ص ۱۷۸)

اس کی شرح میں علامہ بدر الدین محمود العینی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۸۵۵ھ) فرماتے ہیں: ''ای هذه باب یذکر فیه المیّت یسمع خفق نعال الاحیاء وخفق النعال صوتها ودوسها علی الارض''

(عمدۃ القاری ج ۴ ص ۱۵۷، طبع مصر)

ترجمہ: ''یعنی یہ باب ہے جس میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ مُردہ زندوں کی جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ سنتا ہے اور خفق النعال کا معنی جوتیوں کی آواز اور ان سے زمین کو روندنا ہے۔''

یہ عبارت بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مُردہ زندوں کی جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ سنتا ہے اور حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کا بھی یہ مسلک ہے۔ حضرت ملّا علی القاری الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۱۴ھ) اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ: ''وقال ابن الملک ای صوت دقّها وفیه دلالة علی حیوٰة المیّت فی القبر لان الاحساس بدون الحیوٰة ممتنع عادةً واختلفوا فی ذٰلک فقال بعضهم یکون باعادة الروح وتوقّف ابو حنیفة رحمہ اللہ فی ذٰلک اھ ولعل توقف الامام فی ان الاعادة بجزء البدن او کله'' (مرقات ج ۱ ص ۱۹۸، طبع ملتان)

علامہ ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''قرع نعال سے جوتیوں کی زمین پر پڑنے کی آواز مراد ہے اور اس حدیث میں مُردہ کے قبر میں زندہ ہونے کی دلیل ہے کیونکہ زندگی کے بغیر عادۃً احساس ممتنع ہے اور اس میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ زندگی اعادۂ رُوح کے ساتھ ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اس میں توقف کیا ہے۔'' شاید کہ امام صاحب رحمہ اللہ کا توقف اس بات میں ہو کہ اعادۂ روح جزو بدن کی طرف ہے یا کُل کی طرف۔ (نفس اعادہ میں توقف نہیں)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ سمع قرع نعال سے حقیقت مراد ہے کہ مُردہ سچ مچ دفن کر کے واپس جانے والوں کی جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ سنتا ہے۔ اس حدیث کا یہی مطلب و مُراد صحیح ہے اور جمہور شراح حدیث نے بھی یہی مطلب بیان کیا ہے جیسا کہ آپ نے بعض حوالے دیکھ لئے ہیں۔ بعض حضرات نے اس حدیث سے سرعت اتیان

ملائکہ مراد لی ہے۔ کمامرّ عن الکوکب الدری! لیکن یہ تو خود حدیث میں مصرح اور منصوص ہے جیسا کہ (بخاری ج ۱ ص ۱۷۸ وغیرہ) کی روایت میں اس کی تصریح ہے: ”حتّٰی انه لیسمع قرع نعالھم اتاہ ملکانِ“ یعنی مُردہ ابھی قرع نعال کی آواز سن ہی رہا ہوتا ہے کہ اچانک اس کے پاس دو فرشتے آ پہنچتے ہیں۔ اس صراحت کے ہوتے ہوئے سمع قرع نعال کے جملہ سے سرعتِ اتیانِ ملائکہ بطور کنایہ مراد لینے کی کیا ضرورت ہے؟ لہٰذا مؤلف کا (ندائے حق ص ۱۵۲) میں یہ لکھنا باطل ہے کہ: ”اور قرع نعال والی حدیث بھی آپ نہیں پیش کر سکتے کیونکہ وہ حدیث ماؤل ہے۔“ تاویل کی وہاں ضرورت پیش آتی ہے حقیقت جہاں متعذر ہو لیکن یہاں حقیقت ہی متعین ہے جیسا کہ شراح حدیث کے جم غفیر نے اس کی تصریح فرمادی ہے۔

اعتراض: حضرت مولانا گنگوہی ﷫ نے اس حدیث کا یہ مطلب بیان فرمایا ہے کہ اس سے فرشتوں کی جلد آمد مراد ہے اور یہ سُرعتِ اتیانِ ملائکہ سے کنایہ ہے۔ (ملاحظہ ہو الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۱۹، تقریر الجھوہی ﷫ علی مسلم ص ۶۳)

جواب: علم حدیث پڑھنے اور پڑھانے والے جانتے ہیں کہ حدیث پڑھاتے وقت اساتذہ کرام اختلافی مسائل میں ہر مسئلہ اور ہر گروہ کی عقلی و نقلی دلیل کو تفصیلاً یا اجمالاً بیان کیا کرتے ہیں۔ حضرت مولانا گنگوہی ﷫ نے بھی مسلم اور ترمذی کے درس کے موقع پر حضرات منکرین سماع موتی کی طرف سے یہ معنی بیان کیا ہوگا کہ وہ اس حدیث کی تصریح یوں کرتے ہیں جس کو لکھنے والے حضرات نے اپنے بیاض میں جمع کر لیا ہے۔ لیکن اس سے قطعی طور پر یہ ثابت کرنا کہ حضرت مولانا گنگوہی ﷫ مُردہ کو دفن کرنے کے بعد اس کے سماع کے کلیۃً منکر ہیں، بالکل غلط ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۲ ص ۱۰، ۱۱) کا ایک سوال و جواب ملاحظہ ہو۔

سوال: جب سماع موتی کے حضرت امام صاحب ﷫ قائل نہیں ہیں، پھر فقہاء حنفیہ تلقین میت کو کیوں تحریر فرماتے ہیں؟

الجواب: مسئلہ سماع میں حنفیہ باہم مختلف ہیں اور روایات سے ہر دو مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ پس تلقین اسی مذہب پر مبنی ہے۔ کیونکہ اوّل زمانۂ قریب دفن کے بہت سی روایات (جن میں ایک حدیث قرع نعال والی بھی ہے۔ صفدرؔ) اثبات سماع کرتی اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ ﷫ سے اس باب میں کچھ منصوص نہیں اور روایات جو کچھ امام صاحب ﷫ سے (عدمِ سماع موتی پر آئی ہیں، مثلاً فتاویٰ غرائب وغیرہ کا حوالہ) صفدرؔ شاذ ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم!

حضرت مولانا گنگوہی ﷫ کی اس تصریح کے باوجود بھی اگر کوئی شخص اُن کے نقطۂ نظر سے حدیث سمع قرع نعال وغیرہ احادیث کی تاویل کرتا ہے تو اُس کی تاویل کا قطعاً کوئی اعتبار نہیں۔ عقلمندوں نے پہلے ہی یہ بات کہہ دی ہے کہ ؎

”خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدَرْ“

دوسری دلیل: حضرت ابو ہریرہ ﷜ (المتوفی ۵۷ھ) سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: ”ان رسول اللہ ﷺ اتی المقبرۃ فقال السلام علیکم دار قوم مؤمنین و انا ان شاء اللہ بکم لاحقون“

(مسلم ج ۱ ص ۱۲۶، ابوداؤد ج ۲ ص ۱۰۵، سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۷۸، مسند احمد ج ۲ ص ۳۰۰، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۱۰۵)

جناب رسول اللہ ﷺ قبرستان تشریف لے گئے اور آپ ﷺ نے (مُردوں کو خطاب کرتے ہوئے) فرمایا سلام ہو تم پر اے مؤمنوں کی بستی میں رہنے والو اور بلاشبہ ہم بھی اِن شاء اللہ تعالیٰ تم سے ملنے والے ہیں۔“

اور اسی مضمون کی روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مرفوعاً مروی ہے۔ (مسلم ج ۱ ص ۳۱۳، مسند احمد ج ۶ ص ۷۶، نسائی ج ۱ ص ۲۲۲، ابن ماجہ ج ۱ ص ۱۱۲، سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۷۹، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۵۴، شرح السنۃ للبغوی رحمہ اللہ ج ۵ ص ۴۷۱)

اور اسی مضمون کی روایت حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ: ''کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعلمھم اذا خرجوا الی المقابر'' (مسلم ج ۱ ص ۳۱۴، ابن ماجہ ج ۱ ص ۱۱۲، سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۷۹، مسند احمد ج ۵ ص ۳۵۳، ابن ابی شیبہ ج ۴ ص ۱۳۸، طبع ملتان و شرح السنۃ للبغوی رحمہ اللہ ج ۵ ص ۴۶۸)

ترجمہ: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ تعلیم دیا کرتے تھے کہ جب وہ قبرستان میں جائیں (تو ان الفاظ سے انہیں سلام کہا کریں)''

اور تعلیم کے الفاظ کے بغیر نفس سلام کہنے کی ان کی روایت (نسائی ج ۱ ص ۲۲۲، سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۷۹، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۵۴) میں موجود ہے اور اسی مضمون کی روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی ہے۔ (ترمذی ج ۱ ص ۱۲۵، وقال حسن غریب و مسند احمد، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۵۴) اور اسی مضمون کی روایت حضرت بشیر بن الخصاصیہ رضی اللہ عنہ (المتوفی) سے بھی مرفوعاً مروی ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۳ ص ۶۰، وقال رواتہ ثقات) اور اسی مضمون کی روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت مجمع بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۶ ص ۶۰) ان کی سندیں اگرچہ کمزور ہیں، مگر اُصولِ حدیث کے رُو سے پہلی صحیح روایات کی تائید ان سے ہوسکتی ہے۔ ان الفاظ اور اس انداز سے مُردوں کو سلام کہنے کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ خطاب کے اہل ہیں اور سلام کہنے والوں کا سلام سنتے ہیں۔ اسی لئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی مُردوں کو سلام کہا اور اُمت کو اس کی تعلیم بھی دی کہ وہ بھی جب قبرستان میں جائیں تو اس طرح ان کو سلام کہا کریں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''والسنۃ ان یقول الزائر السلام علیکم'' (تلخیص الحبیر ج ۲ ص ۱۳۷) سے اس طرح سلام کہنے کو سنت سے تعبیر کرتے ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''وثبت عنہ صلی اللہ تعالٰی لامتہ اذا سلموا علٰی اھل القبور ان یسلموا علیھم من یخاطبونہ فیقول المُسَلِّم السلام علیکم دار قوم مؤمنین وھذا خطاب لمن یسمع ویعقل ولولا ھذا الخطاب لکانوا بمنزلۃ خطاب المعدوم والجماد والسلف مجمعون علٰی ھذا وقد تواترت الاٰثار عنھم بان المیّت یعرف بزیارۃ الحی لہ ویستبشر بہ'' (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۴۳۸)

ترجمہ: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُمت کے لئے یہ حکم ثابت ہے کہ وہ جب اہل قبور کو سلام کرے تو اس طرح سلام کرے جس طرح مخاطب سے سلام کیا جاتا ہے۔ سو سلام کہنے والا کہے۔ اے مؤمنوں کی بستی میں رہنے والو! تم پر سلام ہو اور یہ خطاب اس کو ہے جو سنتا اور جانتا ہے۔ اگر اُن کو یہ خطاب نہ ہوتا تو اس میں وہ ایسے ہوتے جیسے معدوم و جماد اور سلف صالحین رحمہم اللہ کا اس پر اجماع ہے اور تواتر کے ساتھ اُن سے آثار مروی ہیں کہ جب کوئی زندہ مُردہ کی زیارت کے لئے آتا ہے (اور اسے سلام کہتا ہے تو اُس کی آواز سے) مُردہ اُس کو پہچان لیتا ہے اور اس کی آمد سے وہ خوشی محسوس کرتا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے اس دعویٰ کے اثبات کے لئے کئی روایات اور آثار نقل کئے اور پھر لکھتے ہیں کہ: ''وقد شرع السلام علی الموتٰی والسلام علٰی من لم یشعر ولا یعلم بالمُسَلِّم محال'' (ج ۳ ص ۴۳۹)

"بے شک مردوں پر سلام کہنا مشروع کیا گیا ہے اور ایسے شخص کو سلام کہنا، جو سلام کہنے والے کا نہ تو شعور رکھتا ہو اور نہ علم محال ہے۔"

اور اس بحث کے اختتام پر لکھتے ہیں کہ: "فهذا السلام والخطاب والنداء لموجود يسمع ويخاطب ويعقل ويرد وان لم يسمع المسلّم الرد والله تعالىٰ اعلم" (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۴۳۹)

"پس یہ سلام وخطاب اور ندا اس موجود کو ہے جو سنتا ہے اور اس سے خطاب کیا جا سکتا ہے اور جو سمجھتا ہے اور سلام کا جواب دے سکتا ہے۔ اگرچہ سلام کہنے والا میت کے جواب کو نہیں سنتا اور اللہ تعالیٰ ہی خوب اور بہتر جانتا ہے۔"

ان صحیح احادیث اور سلف صالحین رحمہم اللہ کے اجماع واتفاق کے پیش نظر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا یہ بیان اور تشریح خالص حق ہے، اور شرعی طور پر اس میں ذرہ بھر بھی افراط وتفریط نہیں ہے۔

ابنِ کثیر کی یہ عبارت الحاقی ہے؟

مؤلف نے (ندائے حق ص ۲۹۱، ۲۹۲) میں بلا وجہ اس پر خاصا زور صرف کیا ہے کہ: "ابن کثیر رحمہ اللہ کی یہ عبارت الحاقی ہے کیونکہ یہ عبارت ابن کثیر رحمہ اللہ جیسے محقق کی نہیں ہے جو مفضی الی الشرک ہے بلکہ یار لوگوں کا الحاق ہے۔" (تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ ص ۴۴۵ حاشیہ) پر کسی خدا کے بندے نے صاف لکھ دیا ہے کہ: "من هٰهنا الى الآيات التالية زيادة من النسخة المكية وهو غير موجود في النسخة الاميرية"

اللہ اس لکھنے والے کے درجے بلند کرے جس نے ابن کثیر رحمہ اللہ کے سر سے الزام اُتارا۔ صاحب تسکین الصدور پر تعجب ہے کہ وہ حاشیہ کی اس عبارت سے اغماض کرتے ہیں۔ اس محشی رحمہ اللہ کی عبارت سے ہمیں اپنے شیخ مولانا حسین علی رحمہ اللہ کے قول کی تصدیق ہو جاتی ہے جو آپ نے اپنی خود نوشت تفسیر بے نظیر میں تحریر فرمایا ہے ہر نبی کو خداوند کریم نے یہ حکم دیا کہ خاص اللہ کو پکارو اور کتابوں میں بھی یہی حکم بھیجا۔ باغیوں نے خلاف کیا اور لکھ دیا جن کو اُن کا لکھا مل گیا۔ ان کو شک پڑ گیا، لیکن علماء ثقات نے بیان فرما دیا کہ یہ باغیوں کا لکھا ہوا ہے۔ ان کے بیان کرنے کے بعد جھگڑا غیر مقبول ہے وہ عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ اب جو شخص خلاف قرآن کے لکھا ہوا دکھا دیوے اُس کو کہو یہ باغیوں کا لکھا ہوا ہے اگر جس کی طرف وہ نسبت کرتے ہیں، وہ مقبولِ الٰہی ہے کہہ دو اس کی طرف کسی باغی نے نسبت کی ہے۔ اگر آیت الٰہی کے مقابلے میں صحیح حدیث لائیں کہ مطلب اس حدیث کا آیت کے مخالف ہو تو کہہ دو ہم ظاہر معنی والی آیت کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کا معنی علماء کرام بیان کریں گے اگر تاویل صحیح معلوم ہو سکے تو بیان کرے، نہیں تو علماء کرام کے بیان پر حوالہ کرے۔ (تفسیر بے نظیر ص ۸۸، ۸۹ بحوالہ ندائے حق)

الجواب: ابن کثیر رحمہ اللہ یہ عبارت لکھنے میں متفرد نہیں۔ ابھی ان شاء اللہ العزیز حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کا حوالہ بھی آ رہا ہے۔ تفسیر ابن کثیر طبع کرنے والوں کے پیش نظر طباعت کے وقت غالباً دو نسخے تھے۔ ایک مکیہ اور دوسرا امیریہ، امیریہ کے نسخہ سے کاتب کی غفلت سے یہ عبارت چھوٹ گئی ہوگی اور ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے مکیہ کے نسخہ سے اس عبارت کو نقل کر دیا جو ابن کثیر رحمہ اللہ ہی کی ہے اور اس کے الحاقی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ راقم اثیم کے پیش نظر تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ کے دو نسخے ہیں ایک وہ جس کے حاشیہ پر معالم التنزیل ہے جو "مطبع المنار" مصر میں طبع ہوئی ہے اور دوسرا وہ نسخہ ہے جو معالم التنزیل کے بغیر ہے جو مطبع "دار الاحياء الكتب العربية عيسى البابى

الحلبی و شرکاء'' نے طبع کرایا ہے۔ ان دونوں نسخوں میں یہ عبارت موجود ہے اوران نسخوں میں مکیہ کے نسخہ پر ہی اعتماد کیا گیا ہے۔ مؤلف مذکور کا یہ جواب نری دفع الوقتی ہے اوراس پر ان کا ضمیر بھی ضرور ان کو ملامت کرتا ہوگا۔ (بشرطیکہ اجیر خاص بن کر ضمیر کہیں گروی ہی نہ رکھ چکے ہوں) یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ سلام علی القبور نہ تو شرک ہے اور نہ مفضی الی الشرک ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے خود بھی قبور پر سلام کہا اور اُمت کو اس کی تعلیم بھی دی، جیسا کہ صحیح روایات سے ثابت ہو چکا ہے اور تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ کی اس مفصل عبارت میں (جو مکتبۂ امیریہ میں چھوٹ گئی ہے) بھی احادیث اور آثار پر ہی بنیاد رکھی گئی ہے جہاں نہ قیاس کا دخل ہے اور نہ کسی بناوٹ و تصنع کا، اور نہ یہ قرآن کریم کے خلاف ہے، اگر ایسا ہوتا تو آنحضرت ﷺ ہرگز سلام علی القبور نہ کہتے اور نہ اس کی اُمت کو تعلیم دیتے۔ حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ بالکل بجا ہے مگر مؤلف مذکور بڑے مجذوب ہیں۔ انہوں نے اس غیر متعلق حوالہ کو یہاں جوڑ دیا ہے۔ قرآن کریم اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی کتابوں کے خلاف جو کچھ کسی نے لکھا ہوگا وہ ضرور باغیوں نے لکھا ہوگا۔ مگر نہ تو اہلِ قبور کو سلام کہنا، ان کو ممنوع طریقے سے پکارنا ہے اور نہ یہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم کے خلاف ہے بلکہ یہ اس کے عین مطابق اور اُس کی تعمیل ہے۔ اس کے الحاقی ہونے کا وہم بھی نہیں ہو سکتا۔ مؤلف مذکور نے جس کتاب کا حوالہ اپنے مزاج مبارک اور اپنی فہم کے خلاف دیکھا ہے۔ بے موقع اور بے محل اور بلا ضرورت حضرت مرحوم کے اس حوالہ کو اکسیر اور اُمرت دھارا سمجھ کر استعمال کیا ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ (المتوفی ۷۵۱ھ) لکھتے ہیں کہ: ''وقد شرع النبی ﷺ لامتہ اذا سلموا علی اهل القبور ان یسلموا علیہم من یخاطبونہ فیقول السلام علیکم دار قوم مؤمنین و ھذا خطاب لمن یسمع و یعقل ولولا ذٰلک لکان ھذا الخطاب بمنزلۃ خطاب المعدوم والجماد والسلف مجمعون علی ھذا وقد تواترت الاخبار عنھم بان المیت یعرف زیارۃ الحی لہٗ ویستبشر بہ'' (کتاب الروح ص ۴، طبع حیدرآباد دکن)

ترجمہ: ''تحقیق آنحضرت ﷺ نے اپنے اُمتیوں کے لئے یہ مشروع قرار دیا ہے کہ وہ جب اہلِ قبور کو سلام کریں تو اُن سے ایسے انداز سے سلام کریں جیسے مخاطب سے کیا جاتا ہے اور یہ خطاب ان سے ہے جو سنتے اور سمجھتے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ خطاب معدوم اور جماد سے ہوتا۔ حالانکہ سلف صالحین رحمہم اللہ کا اسی پر اجماع ہے اور تواتر کے ساتھ ان سے یہ خبریں منقول ہیں کہ مُردہ اس زندہ کو (آواز سے) پہچانتا ہے جو اُس کی زیارت کے لئے آتا ہے اور مُردہ کو اس سے خوشی بھی ہوتی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اپنے دَور میں مؤحدین کے سربراہ تھے اور جس چیز کے بارے میں ان بزرگوں کو ادنیٰ سا وہم بھی ہو جاتا تھا کہ یہ شرک یا ذریعۂ شرک ہے اس کا صاف اور صریح الفاظ میں، جاندار الفاظ میں بے باک قلم سے بلا خوف لومۃ لائم رَد کر دیتے تھے اور اس میں کسی مصلحت یا خطرہ کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان مؤحدین حضرات کا یہ اقرار ہی نہیں بلکہ واضح عقلی اور نقلی دلائل سے یہ ثابت کرنا کہ سماع موتی حق ہے۔ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک شرعی دلائل کے پیش نظر اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ امام ابو عمر بن عبدالبر رحمہ اللہ احادیث السلام علی القبور کو ثابتہ متواترۃ کہتے ہیں اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ بھی ان کے اس قول کی تائید کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو کتاب الروح ص ۱۲۴)

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''سماع المیۃ لِلاصوات من السلام والقرأۃ حق اقتضاء الصراط المستقیم'' (ص۱۸۱، طبع مصر)

ترجمہ: ''مُردے کا سلام وقرأت کی آوازوں کو سننا حق ہے۔''

حضرت ملّا علی القاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''فان سائر الاموات ایضاً یسمعون السلام والکلام''

''بے شک تمام مُردے بھی سلام وکلام سنتے ہیں۔'' (یعنی یہ سماع صرف حضرات انبیاء کرام علیہم السلام ہی کی خصوصیت نہیں ہے) (مرقات ج۲ ص۲۱۰)

علامہ محمد بن اسماعیل الامیر الیمانی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۱۸۲ھ) ''السلام علیکم یا اھل القبور'' کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ: ''وفیہ انھم یعلمون بالمَار بھم وسلامہ علیھم والالکان اضاعۃ'' (سبل السلام ج۲ ص۱۵۷، طبع مصر)

''اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ مُردوں کے پاس سے گزرنے والوں اور ان کو سلام کہنے والوں کو مُردے (ان کی آواز سے) پہچانتے ہیں۔ ورنہ انہیں سلام کہنا ایک بے ہودہ حرکت ہوتی۔''

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۶۹ھ) السلام علیکم کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

''اشارۃ الٰی انھم یعرفون الزائر ویدرکون کلامہ وسلامہ''

''اس میں اشارہ ہے کہ مُردے زیارت کرنے والے کو پہچانتے ہیں اور اس کے کلام وسلام کا ادراک وشعور رکھتے ہیں۔'' (فتح الملہم ج۱ ص۴۱۳)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۹۷ھ) بانیٔ دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں کہ:

''سماعِ اموات کے قصہ میں اوّل تو یہ معروض ہے کہ یہ اُمر قدیم سے مختلف فیہ ہے۔ دوسرے ضروریاتِ دینی اور عقائدِ ضروریہ میں سے نہیں۔ اس کی تنقیح قرار واقعی تو بعد مرگ ہی معلوم ہوگی۔ اگر بعد مرگ ہم نے اوروں کا سلام و پیام سُن لیا، سماع نہیں تو عدم سماع متحقق ہو جائے گا۔ علاوہ بریں طرفین میں بڑے بڑے اکابر ہیں۔ اگر ایک طرف میں بالکل ہو رہیے تو کسی نہ کسی طرف والوں کو بُرا سمجھنا پڑے گا۔ اس لئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہوں بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل نہ سمجھ لیں جب یہ بات گوش گزار خدام ہو چکی تو اب سنئے اپنے خیال نارسا کے موافق سمعِ اموات حدِ اسماع سے تو پَرے ہے پر استماعِ اموات ممکن ہے۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ خدا نے تو اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی فرمایا اور رسول اللہ ﷺ نے باوجود اس کے سلام اہلِ قبور مسنون کر دیا۔ اگر استماع ممکن نہیں تو پھر یہ بے ہودہ حرکت یعنی سلام اہلِ قبور ملحدوں کی زبان درازی کے لئے کافی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کبھی آواز میں ایسی قوت ہوتی ہے کہ بے تکلف ہر صاحب سمع اس کو سُن لیتا ہے اس صورت میں سمع سامعین حد اسماع میں ہوتا ہے اور کبھی بوجہ ضعف آواز متکلم سننے والوں کو سر جھکانے اور کان لگانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس صورت میں اصل میں تو سمع سامعین حد اسماع سے خارج ہوتا ہے پر بعد سر جھکانے اور کان لگانے کے حد اسماع میں آجاتا ہے اس لئے اس کو استماع کہئے اور نفی اسماع کیجئے تو بجا ہے کیونکہ بوجہ ضعف آواز عدم اسماع تو ظاہر ہے مگر جب سامعین کی طرف سے اہتمام ہو تو ان کی طرف سے اخذ اور فعل ظاہر ہے، اور ظاہر ہے کہ استماع میں بہ نسبت سماع ایک مضمون اخذ ہوتا ہے۔ چنانچہ خواص ابواب کے جاننے والے اور محاورات عرب کو پہچاننے والے ان فرقوں کو خوب جانتے ہیں۔'' (جمال قاسمی ص۸،۹)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''والحق ان الموتی یسمعون فی الجملة و هذا علی احد وجهین اولهما ان یخلق الله عز و جل فی بعض اجزاء المیّت قوة یسمع بها متی شاء الله تعالی السلام و نحوه مما یشاء الله سبحانه سماعه ایاه و لا یمنع من ذلک کونه تحت اطباق الثری و قد امحلت هاتیک البنیة و انفصمت العری و لا یکاد یتوقف فی قبول ذلک من یجوز ان یری اعمی الصین بقة اندلس و ثانیهما ان یکون ذلک السماع للروح بلا واسطة قوة فی البدن و لا یمتنع ان تسمع بل ان تحس و تدرک مطلقًا بعد مفارقتها البدن بدون وساطة قوی فیه و حیث کان لها علی الصحیح تعلق لا یعلم حقیقته و کیفیته الّا الله عز و جل بالبدن کله او بعضه بعد الموت و هو غیر التعلق بالبدن الذی کان لها قبله اجری الله تعالی سبحانه عادته بتمکینها من السمع و خلقه لها عند زیارة القبر و کذا عند حمل البدن الیه و عند الغسل مثلاً و لا یلزم من وجود ذلک التعلق و القول بوجود قوة السمع و نحوه فیها نفسها ان تسمع کل مسموع لما ان السماع مطلقًا و کذا سائرہ الاحساسات لیس الّا بالعًا للمشیة فما شاء الله تعالی کان و ما لم یشاء لم یکن فیقتصر علی القول بسماع ما ورد السمع بسماعه من السلام و نحوه و هذا الوجه هو الذی یترجح عندی و لا یلزم علیه التزام القول بان ارواح الموتی مطلقًا فی افنیة القبور لما ان مدار السماع علیه مشیة الله تعالی و التعلق الذی لا یعلم کیفیته و حقیقته اِلّا هو عزّ و جَلّ فلتکن الروح حیث شاءت او لا تکن فی مکان کما هو رأی من یقول بتجردها'' (تفسیر روح المعانی ج ۲۱ ص ۵۷، ۵۸)

''اور حق بات یہ ہے کہ مُردے فی الجملہ سنتے ہیں اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اللہ تعالیٰ میت کے بعض اجزاء میں ایسی قوت پیدا کر دے جس سے مُردہ جب اللہ تعالیٰ چاہے، سلام وغیرہ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کو منظور ہو سُن لے اور اس میں اس سے رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی کہ وہ مٹی کے پردوں کے نیچے پڑا ہوا ہے اور اس کا بدنی ڈھانچہ جُدا ہو چکا ہے اور اس کے جوڑ الگ ہو چکے ہیں وہ شخص اس کے قبول کرنے میں ذرّہ بھر بھی توقف نہیں کرے گا جو (اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت) اس کو جائز سمجھتا ہے کہ چین کا اندھا اُندلس کے مچھر کو دیکھ لے اور دوسری صورت یہ ہے کہ یہ سماع رُوح کو ہو اور اس میں بدنی قوت کا واسطہ نہ ہو اور اس میں بھی کوئی امتناع نہیں کہ رُوح سُنے بلکہ بدن سے جدا ہونے کے بعد بغیر بدنی قوتوں کے مطلقاً احساس و ادراک بھی کرے اور وہ روح جہاں کہیں بھی ہو صحیح قول کی بناء پر اس کا مرنے کے بعد کُل یا بعض بدن سے تعلق ہوتا ہے جس کی حقیقت اور کیفیت کو بجز پروردگار کے اور کوئی نہیں جانتا اور یہ تعلق اس تعلق کے علاوہ ہے جو اس سے قبل (اس دُنیا میں بطور تصرف اور تدبیر کے) بدن کے ساتھ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عادت یہ جاری فرمائی کہ اس کو سُننے کی قدرت دی اور جب قبر کی زیارت کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کو پیدا فرما دیتا ہے اور اسی طرح جب اس کے بدن کو قبر کی طرف اُٹھا کر لے جاتے ہیں اور اسی طرح غسل کے وقت بھی رُوح سنتی ہے اور اس تعلق اور اس قول سے کہ خود نفس رُوح میں قوتِ سماعت ہے اور یہ لازم نہیں آتا کہ ہر قابلِ سماعت چیز کو وہ سنے۔ کیونکہ مطلقاً سماع اور اسی طرح باقی تمام حواس اللہ تعالیٰ کی مشیّت کے تابع ہیں۔ سو جو چیز اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ ہوتی ہے اور جس کو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتی۔ پس میت کے سماع کو اس چیز کے سماع پر بند کرنا چاہئے جس کا ثبوت دلیل سمعی سے ہو۔ مثلاً سلام وغیرہ اور یہی وجہ راجح ہے اور اس توجیہ کی بناء پر

اس قول کے التزام کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ مُردوں کی رُوحیں قبروں کے کناروں پر ہوتی ہیں کیونکہ دار و مدار سماع کا اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس تعلق پر ہے جس کی کیفیت اور حقیقت اللہ تعالیٰ کے سواء اور کوئی نہیں جانتا۔ پس رُوح جہاں بھی چاہے ہو یا کسی مکان میں بھی نہ ہو جیسا کہ ان لوگوں کا خیال ہے جو اس کے تجرد کے قائل ہیں۔ (بہرحال تعلق مع البدن اور سماعت پھر بھی ثابت ہے)

اس واضح اور صریح عبارت سے علامہ آلوسی ﷫ کا سماع موتی کے بارے میں نظریہ بالکل عیاں ہوگیا ہے اور یہ پوری عبارت حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ﷫ نے (فتح الملہم ج ۲ ص ۴۷۹) میں نقل کی ہے اور اس سے کوئی اختلاف نہیں کیا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت مولانا عثمانی ﷫ بھی اس مسئلہ میں علامہ آلوسی ﷫ کے ہمنوا ہیں کہ مُردے عند القبور فی الجملہ سنتے ہیں جس میں سلام وغیرہ بصراحت مذکور ہے۔ اس مفصّل اور روشن و صاف عبارت کے بعد بھی اگر کوئی شخص (مؤلف ندائے حق کی طرح) یہ دعویٰ کرے کہ علامہ آلوسی ﷫ اور علامہ عثمانی ﷫ مطلقاً سماع موتی کے منکر ہیں تو اَیسا شخص دھوکے میں مبتلاء ہے اور خالص تعصب سے کام لے رہا ہے، بلکہ علامہ عثمانی ﷫ فتح الملہم کے اسی صفحہ میں اس مذکورہ بالا عبارت سے قبل تصریح فرماتے ہیں کہ: ''قال العبد الضعیف عفا اللہ تعالیٰ عنہ والذی تحصل لنا من مجموع النصوص واللہ تعالیٰ اعلم ان سماع الموتیٰ ثابت فی الجملة بالاحادیث الکثیرة الصحیحة واما اسماع العباد ایاھم فمنفی بسیاق القرأن العزیز وتحقیقہ علی ما حرّرہ شیخ شیخنا قاسم العلوم والخیرات قدس اللہ تعالیٰ روحہ فی بعض مکاتیبہ'' (فتح الملہم ج ۲ ص ۴۷۹)

ترجمہ: ''بندۂ ضعیف اللہ تعالیٰ اُسے معاف کرے کہتا ہے کہ جو چیز ہمیں مجموعۂ نصوص سے حاصل ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ تو سب سے بہتر جانتا ہے یہ ہے کہ مُردوں کا سماع فی الجملہ بہت سی صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ باقی رہا (زندہ) بندوں کا مُردوں کو سُنانا تو وہ قرآن کریم کے سیاق سے منفی ہے۔ (یعنی نفی اسماع کی ہے نہ کہ سماع کی) اور اس کی تحقیق جیسا کہ ہمارے استاد الاستاد قاسم العلوم والخیرات مولانا نانوتوی ﷫ نے اپنے ایک مکتوب میں کی ہے یہ ہے۔''

اور اس کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ﷫ کی اس عبارت کا عربی میں ترجمہ کیا ہے جو ہم نے پہلے جمال قاسمی کے حوالہ سے مفصل عرض کردی ہے۔ غرض یہ کہ سماعِ موتی کا مسئلہ احادیث کی روشنی میں اتنا واضح ہے کہ جو حضرات مسئلہ عدم سماعِ موتی میں متشدد ہیں یا جن کو سماعِ موتی کا منکر سمجھ لیا گیا ہے وہ بھی کُلّیۃً سماعِ موتی کا انکار نہیں کرتے۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ اَجسام نہیں سنتے، اَرواح سنتی ہیں۔ چنانچہ شاہ عبد القادر صاحب دہلوی ﷫ (المتوفی ۱۲۳۰ھ) اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں اور حدیث میں ہے کہ مُردوں سے سلام علیک کرو، وہ سنتے ہیں اور بہت جگہ مُردے کو خطاب کیا گیا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ مُردے کی رُوح سنتی ہے اور قبر میں پڑا ہے دھڑ، وہ نہیں سُن سکتا۔ (تفسیر موضح القرآن ص ۷۲۳)

ہمارے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سماع کا تعلق صرف جسم اور دَھڑ سے تسلیم کیا جائے تو دَھڑ نہیں سُن سکتا اور منسوب بہ اسلام فرقوں میں ایسا گروہ بھی ہے جو قبر کے سوال اور عذاب و راحت کا تعلق بلا اعادۂ رُوح صرف جسم سے تسلیم کرتا ہے۔ (تسکین الصدور ملاحظہ فرمائیں) اور اگر سماع کا تعلق رُوح سے ہو تو بلا شبہ رُوح سنتی ہے اور صحیح احادیث اور جمہور اُمت کے واضح ارشادات کے مطابق قبر میں رُوح کا جسم سے باقاعدہ تعلق ہے تو پھر سماع کیوں نہ ہو؟

ہمارے پیر و مرشد حضرت مولانا حسین علی صاحب ﷫ اس مسئلہ میں خاصا تشدد کرنے کے باوجود یہ فرماتے ہیں: ''اور تحقیق سماع موتی کے متعلق یہ ہے کہ بدن نہیں سنتے۔ جیسا کہ اس (فَاِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی) آیت سے معلوم ہوتا ہے اور باقی آیات بھی دال عدم سماع موتی پر ہیں اور رُوح زندہ ہے وہ سنتا ہے جب قریب ہو۔ ہاں! نزاع امام صاحب ﷫ اور امام شافعی ﷫ کا اس بات میں ہے آیا روح قبور کے نزدیک ہے یا علیین میں۔ باقی پوری تحقیق کا یہ مقام نہیں۔ (تفسیر بلغۃ الحیران ص ۲۷۵)

اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ قبر کے قریب اگر کوئی سلام وغیرہ کرے تو حضرت مرحوم کے نزدیک رُوح سنتی ہے۔ غور فرمایئے کہ فی الجملہ سماع موتی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ باقی رُوح اگر علیین میں بھی ہو تو جمہور اہل السنت کے نزدیک اس کا تعلق قبر میں اُس کے بدن کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ (تسکین الصدور ملاحظہ فرمائیں) خود امام الائمہ حضرت امام ابوحنیفہ (نعمان بن ثابت ﷫ (المتوفی ۱۵۰ھ) اپنی کتاب ''فقہ اکبر'' میں تصریح فرماتے ہیں کہ: ''و اعادۃ الروح الی العبد فی قبرہ حق'' (فقہ الاکبر مع الشرح لعلی القاری ﷫ ص ۱۲۰، طبع کانپور)

''قبر میں رُوح کا بندے کی طرف لوٹایا جانا حق ہے۔''

اور کیوں حق نہ ہو، جب کہ صحیح احادیث سے اعادہ رُوح الی البدن ثابت ہے۔ (تفصیل کے لئے ''تسکین الصدور'' دیکھئے) تو حضرت امام صاحب ﷫ بھلا ان صریح اور صحیح احادیث کی مخالفت کیسے کر سکتے تھے؟ ہم نے ''البیان الازہر'' کے مقدمہ میں محققین علماء اسلام کے حوالہ سے یہ بات عرض کر دی ہے کہ ''الفقہ الاکبر'' حضرت امام ابوحنیفہ ﷫ کی ہی تالیف ہے یہ دعویٰ کرنا کہ یہ اُن کی کتاب ہی نہیں، تحقیق اور انصاف سے کوسوں دُور ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی الحنفی ﷫ (المتوفی ۱۲۲۵ھ) اس سوال کا جواب کہ جب ارواح علیین اور سجین میں ہے اور ابدان قبور میں، تو پھر ان کا آپس میں جوڑ کیسے ہے؟ جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''قلنا وجه التطبيق ان مقرارواح المؤمنين في عليين او في السماء السابعة ونحو ذلک كما مرّ ومقرارواح الكفار في سجين ومع ذلک لكل روح منها اتصال بجسده في قبره لا يدرك كنهه إلّا الله تعالى وبذلک الاتصال يصح ان يعرض على الانسان المجموع المركب من الجسد والروح مقعده من الجنة او النار و يحسّس اللذة اوالالم ويسمع سلام الزائر ويجيب المنكر والنكير وذالک مما ثبت بالكتاب والسنة'' (تفسیر مظہری ج ۱۰ ص ۱۲۴، ۱۲۵)

''ہم کہتے ہیں کہ تطبیق اس طور پر ہے کہ مؤمنوں کے ارواح کا مستقر علیین یا ساتواں آسمان اور اس کی مانند کوئی اور جگہ ہے جیسا کہ گزر چکا ہے اور کفار کے ارواح کا ٹھکانہ سجین ہے۔ لیکن بایں ہمہ ہر روح کا قبر میں جسم کے ساتھ تعلق ہے جس کی حقیقت بجز پروردگار کے اور کوئی نہیں جانتا اور اس اتصال کی وجہ سے صحیح ہے کہ انسان پر جو جسم اور رُوح دونوں کے مجموعہ اور مرکب کا نام ہے اس کا ٹھکانہ جنت یا دوزخ کا پیش کیا جائے اور وہ لذت یا دُکھ محسوس کرے اور زیارت کرنے والے کا سلام سنے اور منکر و نکیر کا جواب دے اور اسی کی مانند اور اُمور جن کا کتاب وسنت سے ثبوت ہو چکا ہے۔

الغرض روح کا علیین وغیرہ میں رہنا اس کا متقاضی نہیں کہ قبر میں بدن کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ ہاں! اس اَمر کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سماع وغیرہ برزخی اُمور کا اصل تعلق رُوح سے ہے۔ کیونکہ بغیر رُوح کے بدن کے عذاب وراحت اور سماع کا کوئی معنی نہیں کیونکہ بدن بغیر رُوح کے نرا اجماد ہے۔ لہٰذا ان اُمور کا مدار رُوح پر ہے لیکن بدن کا تعلق بھی اُس کے ساتھ بدستور رہتا ہے۔

فقیہ کامل المحدث الجلیل نمونۂ سلف حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۵۲ھ) کی سماعِ موتٰی کے بارے میں چند ضروری عبارات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) باب قول الميّت و هو على الجنازة قدّموني و اعلم ان مسألة كلام الميّت و سماعه واحدة و انكرها حنيفة العصر و فى رسالته غير مطبوعه لعليّ القارى رحمہ اللہ ان احدًا من ائمتنا لم يذب الى انكارها و انما استنبطوها من مسألة فى باب الايمان و هى حلف رجل ان لا يكلم فلانا فكلمه بعدما دفن لا يحنث قال القارى رحمہ اللہ و لا دليل فيها على ما قالوا فان مبنى الايمان على العرف و هم لا يسمونه كلامًا و انكره الشيخ ابن الهمام رحمہ اللہ ايضاً فى الفتح ثم اورد على نفسه ان السماع اذا لم يثبت فما معنى السلام على القبر و اجاب عنه انهم يسمعون فى هذا الوقت فقط و لا دليل فيه على العموم ثم عاد قائلاً انه ثبت منهم سماع قرع النعال ايضاً فاجاب عنه بمثله اقول و الاحاديث فى سمع الاموات قد بلغت مبلغ التواتر و فى حديث صَحّحَهٗ ابو عمر ان احدًا اذا سلم على الميّت فانه يرد عليه و يعرفه ان كان يعرفه فى الدنيا (بالمعنى) و اخرجه ابن كثير رحمہ اللہ ايضاً و تردد فيه فالانكار فى غير محله سيّما اذا لم ينقل عن احد من ائمتنا رحمہم اللہ فلا بد بالتزام السماع فى الجملة و اما الشيخ ابن الهمام رحمہ اللہ فجعل الاصل هو النفى و كل موضع ثبت فيه السماع جعلهٗ مستثنى و مقتصرًا على المورد قلت اذن ما الفائدة فى عنوان النفى و ما الفرق بين نفى السماع ثم الاستثناء فى مواضع كثيرة و ادعاء التخصيص و بين اثبات السماع فى الجملة مع الاقرار بانا لاندرى ضوابط اسماعهم فان الاحياء اذا لم يسمعوا فى بعض الصور فمن ادعى الطرد فى الاموات و لذا قلت بالسماع فى الجملة بقى القرأن فامره صعب قال تعالٰى فانك لا تسمع الموتٰى و قال و ما انت بسمع من فى القبور و هو بظاهره يدل على النفى مطلقًا فقيل بالفرق بين السماع و الاسماع و النفى هو الثانى دون الاوّل و المطلوب هو الاوّل دون الثانى و اجاب[1]

عنه السيوطى رحمہ اللہ سماع موتٰى كلام الخلق قاطبة قد صح فيها لنا الآثار بالكتب و آية النفى معناها سماع هدى لا يسمعون و لا يصغون للادب قلت نزل الشيخ رحمہ اللہ فيها على الغرض و حاصل الآية على طوره ان هؤلآء الكفار كالموتٰى فلا تنفع هدايتك فيهم لان نفعها انما كان فى حياتهم و قد مضٰى وقتها كذٰلك هؤلاء و ان كانوا احياء الا ان هدايتك غير نافعة لهم لكونهم مثل الاموات فى عدم الانتفاع فليس الغرض منه نفى اسماع بل نفى الانتفاع قلت عدم السماع و السمع و الاستماع كلها بمعنى عدم العمل لان السمع يكون للعمل فاذا لم يعمل به فكانّه لم يسمعه تقول قلت له مرارًا ان لا يترك الصلٰوة و لٰكنه لا يسمع كلامى اى لا يعمل به يقال فى الفارسية نشنود يعنى عمل نمى كند فلو قال الشيخ رحمہ اللہ ان من فى

[1] اشعار اس سے زیادہ وسط کے ساتھ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مشکلات القرآن ص ۲۲۲ میں نقل فرمائے ہیں۔

القبور لا یعملون لدخل الکلام فی اللغۃ ولم یبق تاویلاً بل الاحسن ان یقال مانتے نہیں فان قلت ان الاموات اذا ثبت لھم السماع فھل لھم الانتفاع بہ ایضاً ومجرد سماع الصوت فقط قلت الصوت من مات علی الخیر فانہ ینتفع بہ ایضاً و اما من مات علی الشر والعیاذ باللہ فاین لہ ان ینتفع اذا لم ینتفع بہ فی الدنیا ولیس لہ الاسماع الصوت والوجہ الثانی فی التفصی عن الآیۃ ان ھذا السماع الذی نحن بصددہ الباتہ من عالم البرزخ اخبرنا بہ المخبر الصادق فامنا بہ اما فی عالمنا فھو معدوم ولا یلزم للقرآن ان یعبر بما یأتی علی العالمین فجاز ان یکون نفی السماع بحسب عالمنا فان التشبیھات تکون للتوضیح فقط ولما کان من فی القبور کالعدم فی عالمنا لیس لھم سماع ولا علم ولا شیٔ جاز لہ ان ینفی عنھم السماع ایضاً والقول بان الاموات اذا ثبت لھم السماع عند القرآن لم یستقم لہ التشبیہ بالاموات جھل وسفہ فان التشبیہ انما ورد بحسب علمنا وعالمنا و ان ثبت السماع عندہٗ واذا کانوا معدومین فی عالمنا لطف التشبیہ لا محالۃ اما قولہ ﷺ نم کنومۃ العروس فقدمر الکلام فلانعیدہ (فیض الباری ج ۲ ص ۴۶۷، ۴۶۸)

’’باب اس اَمر کے بیان میں کہ مُردہ چار پائی پر ہوتا ہے اور یہ کہتا ہے مجھے آگے لے چلو جاننا چاہئے کہ میت کے کلام کرنے کا اور اس کے سماع کا مسئلہ ایک ہی ہے اور ہمارے اس وقت کے حنفیوں نے اس کا انکار کیا ہے اور حضرت ملّا علی القاری رحمہ اللہ کے ایک غیر مطبوعہ رسالہ میں ہے کہ ہمارے ائمہ احناف رحمہم اللہ میں سے کوئی بھی انکار سماع کے مسئلہ کی طرف نہیں گیا۔ تحقیقی بات یہ ہے کہ (متاخرین) فقہاء نے باب الایمان کے ایک مسئلہ سے عدم سماع موتیٰ کا استنباط کیا ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص نے قسم اُٹھائی کہ فلاں سے کلام نہیں کرے گا۔ پس اُس نے اُس سے اُس کے دفن ہونے کے بعد کلام کیا تو حانث نہ ہوگا۔ مُلّا علی القاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ سے عدم سماعِ موتیٰ ثابت نہیں جیسا کہ ان حضرات نے ثابت کیا ہے۔ کیونکہ دارو مدار قسموں کا عُرف پر ہے اور اہلِ عُرف اس کو کلام نہیں کہتے اور ابن الہمام رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں سماعِ موتیٰ کا انکار کیا ہے اُور اپنے اُوپر یہ سوال وارد کیا ہے کہ جب سماع ثابت نہیں تو قبر پر سلام کہنے کا کیا مطلب؟ اور اس کا یہ جواب کہ مُردے صرف سلام کے وقت ہی سنتے ہیں اور اس میں عموم پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ پھر لوٹے اور یہ اشکال پیش کیا کہ جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ سننے کا ثبوت بھی مُردوں سے ہے تو اس کا بھی اُنہوں نے ایسا ہی جواب دیا ہیں (انور شاہ رحمہ اللہ) کہتا ہوں کہ مُردوں کے سننے کی احادیث درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اور ایک حدیث میں آتا ہے جس کی تصحیح امام ابو عمر ابن عبد البر رحمہ اللہ نے کی ہے کہ جب مُردہ پر سلام کیا جاتا ہے تو وہ اُس کا جواب بھی دیتا ہے اور اگر وہ اس کو دُنیا میں پہچانتا ہے تو (آواز سے) پہچان بھی لیتا ہے۔ (یہ روایت بالمعنیٰ نقل کی گئی ہے) اور اس روایت کو ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی بیان کیا ہے اور اس میں اُنہوں نے تردّد کیا ہے۔ پس سماعِ موتیٰ کا انکار بالکل بے موقع ہے خاص طور پر جب کہ ہمارے ائمہ احناف رحمہم اللہ میں سے کسی سے یہ منقول نہیں تو ضروری ہے کہ فی الجملہ سماع کا التزام کیا جائے۔ باقی رہے شیخ ابن الہمام رحمہ اللہ تو انہوں نے اصل نفی سماع کو قرار دیا ہے اور ہر وہ ایسی جگہ جہاں سماع ثابت ہے۔ (مثلاً حدیث قرع نعال اور سلام وغیرہ) تو اس کو انہوں نے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور اس کو اپنے مورد پر بند کیا ہے میں کہتا ہوں کہ پھر اس وقت عنوانِ نفی کا کیا فائدہ؟ اور کیا فرق نکلے گا نفی سماع کا، پھر بہت سی جگہوں میں استثناء اور ادعائے تخصیص کا اور فی الجملہ اثبات

سماع کا۔ باوجود اس اقرار کے کہ ہم مُردوں کو سنانے کے ضوابط نہیں جانتے؟ کیونکہ بسا اوقات زندہ لوگ بھی بعض صورتوں میں نہیں سنتے۔ پس مُردوں میں ہمہ وقت سننے کا کون دعویٰ کر سکتا ہے؟ اور اسی لئے میں فی الجملہ سماع موتی کا قائل ہوں۔ رہا قرآن کریم کا معاملہ تو وہ مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں بے شک تو مُردوں کو نہیں سنا سکتا اور نیز فرمایا اور تو اُن کو نہیں سنا سکتا جو قبروں میں ہیں اور یہ بظاہر مطلقاً نفی پر دلالت کرتا ہے۔ سو اس کے جواب میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ سماع اور اسماع کا فرق ہے۔ نفی اسماع کی ہے نہ کہ سماع کی اور ہمارا مطلوب سماع ہے نہ کہ اسماع اور امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مُردوں کا ساری مخلوق کے کلام کو سننا بلا شبہ صحیح ہے۔ اس سلسلہ میں کئی کتابوں میں حدیثیں اور آثار ہمارے ہاں صحیح ثابت ہو چکے ہیں اور نفی کی آیت کا معنٰی یہ ہے کہ وہ ایسا سماع نہیں کرتے جس سے ان کو ہدایت ہو کہ وہ نہ تو اَدب و احترام اور ہدایت پذیری کے لئے سنتے ہیں اور نہ کان لگاتے ہیں۔ مَیں کہتا ہوں کہ شیخ سیوطی رحمہ اللہ نے اس میں مطلب اور گُر کی بات بتا دی ہے اور ان کے طریقہ پر اس آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ بے شک یہ کفار مُردوں کی طرح ہیں اُن کو تیری رہنمائی نفع نہیں دے سکتی کیونکہ ان کے نفع اُٹھانے کا وقت ان کی زندگی تھی جو اَب ختم ہو چکی ہے۔ اسی طرح یہ زندہ لوگ بھی اگرچہ ہیں تو زندہ ہی مگر تیری ہدایت ان کو سُود مند نہیں ہے کیونکہ یہ ہدایت سے نفع نہ اُٹھانے میں مُردوں کی طرح ہیں۔ سو اس آیت سے غرض نفی سماع نہیں ہے بلکہ نفی انتفاع ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عدمِ اسماع اور سماع اور استماع سب کے سب ایک ہی معنی میں ہیں یعنی عمل نہ کرنا۔ کیونکہ سننا تو عمل کے لئے ہوتا ہے پس جب اس پر عمل نہ کیا گیا تو گویا سنا ہی نہیں تم بسا اوقات کسی بے نماز کے بارے میں کہتے ہو کہ میں نے کئی بار اس کو نماز نہ ترک کرنے کا کہا مگر وہ میری بات نہیں سنتا یعنی اس پر عمل نہیں کرتا اور فارسی میں کہا جاتا ہے کہ وہ سنتا نہیں یعنی عمل نہیں کرتا۔ سو اگر امام سیوطی رحمہ اللہ یہ فرماتے دیتے کہ اہلِ قبور عمل نہیں کرتے تو پھر یہ کلام لغت کی مد میں داخل ہو جاتا اور تاویل نہ ہوتا۔ بلکہ احسن بات یہ ہے کہ کہا جائے مانتے نہیں اگر تو کہے کہ جب مُردوں کے لئے سماع ثابت ہو گیا تو کیا وہ اس سے فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں یا اُن کو محض آواز ہی پہنچتی ہے؟ مَیں جواب میں کہوں گا کہ جو شخص خیر پر مَرا اُس کو آواز سے بھی فائدہ پہنچتا ہے اور جو شخص شر پر مَرا (اللہ تعالیٰ کی پناہ) تو اُس کے لئے کیا فائدہ۔ کیونکہ جب اس شخص نے زندگی میں فائدہ نہیں اُٹھایا تو اب کیا اُٹھائے گا۔ ایسے شخص کو صرف آواز ہی سنائی دے گی اور بس اور دُوسری وجہ اس آیت کریمہ کے اشکال سے جان چھڑانے کی یہ ہے کہ یہ سماع جس کے اثبات کے ہم درپے ہیں عالم برزخ سے ہے اور ہمیں مخبر صادق ﷺ نے اس کی خبر دی ہے۔ سو ہم اس پر ایمان لائے ہیں۔ رہا یہ سماع ہمارے اس جہان کے اعتبار سے تو وہ معدوم ہے اور قرآن کریم کے لئے یہ لازم نہیں کہ ایسی تعبیر کرے جو دونوں جہانوں (اس جہان اور برزخ) پر فِٹ اُترے۔ پس جائز ہے کہ نفی سماع ہمارے (تکلیفی) عالم کے لحاظ سے ہو کیونکہ تشبیہات صرف توضیح کے لئے ہوتی ہیں اور جب وہ لوگ جو قبروں میں ہیں، ہمارے عالم کے لحاظ سے معدوم ہیں تو اس اعتبار سے نہ تو ان کے لئے سماع ہے نہ علم اور نہ کوئی اور شئے تو جائز ہے کہ اُن سے (اپنے اس عالم کے لحاظ سے) سماع کی نفی بھی کی جائے اور یہ کہنا کہ قرآن کریم کی رُو سے جب مُردوں کے لئے سماع ثابت ہے تو مُردوں کے ساتھ ان کی تشبیہ درست نہیں ہے، ایک خالص جہالت اور حماقت ہے کیونکہ تشبیہ تو ہمارے علم اور عالم کے مطابق وارد ہوئی ہے۔

اگر اس کے ہاں سماع ثابت ہے اور مُردے جب ہمارے عالم کے لحاظ سے معدوم ہیں تو لامحالہ تشبیہ میں لطافت ظاہر ہوگئی۔ رہا آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد کہ مُردہ سے (دفن کے بعد) کہا جاتا ہے کہ تو اُیسا سوجا، جیسے دُلہن (مزے سے) سوتی ہے تو اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ سو ہم اس کا اعادہ نہیں کرتے۔''

اس عبارت میں بے شمار فوائد ہیں۔ چند ضروری یہ ہیں:

(۱) کلام میت اور سماع میت کا مسئلہ اور حکم ایک ہی ہے۔

(۲) اس زمانہ کے احناف نے سماع موتٰی کے مسئلہ کا انکار کیا ہے۔

(۳) حضرت مُلّا علی القاری رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر مستقل رسالہ لکھا ہے کہ ہمارے ائمہ (حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ وغیرہ) میں سے کوئی ایک بھی سماع موتٰی کا منکر نہیں تھا۔

(۴) یہ مسئلہ لوگوں نے خود ''باب الایمان'' کی ایک جزئی سے استنباط کیا ہے جس کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۵) حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ نے سماع موتٰی کا انکار کیا ہے لیکن قرع نعال اور سلام کا سننا انہوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔

(۶) سماع موتٰی کی احادیث متواتر ہیں۔

(۷) صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ مُردہ سلام کہنے والے کے سلام کو سُنتا اور اس کا جواب دیتا ہے۔

(۸) سماع موتٰی کے انکار کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ ہمارے ائمہ سے انکار ثابت نہیں ہے۔

(۹) حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ نے اصل ضابطہ عدم السماع قرار دیا ہے۔

(۱۰) لیکن پھر عنوانِ نفی کا کیا فائدہ ہے؟ اور نفیٔ سماع کا پھر بہت سی جگہوں میں استثناء اور تخصیص کے دعوے کا اور فی الجملہ اثبات سماع کا کیا فرق نکلے گا؟ کیونکہ نتیجہ تو بہر کیف سماع موتٰی ہی نکلتا ہے۔

(۱۱) اور پھر مُردوں کے سُنانے کا کیا ضابطہ ہے؟ کیونکہ بعض صورتوں میں زندہ بھی (جب کہ اس کی توجہ نہ ہو یا سُنانے والے کی آواز ضعیف و کمزور ہو۔ کما مرّ عن قاسم العلوم والخیرات) تو نہیں سُنتا پھر مُردوں کے بارے میں ضابطہ کا کیا معنٰی ہے؟

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے اس بیان اور تقریر کو پیش نظر رکھتے ہوئے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فتح الملہم کی اس عبارت میں اُن کا صحیح مفہوم نہیں ادا کیا جاسکا۔

''وھذا معنٰی ما قالہ الشیخ الانور رحمہ اللہ ان الضابطة انما ھو عدم السماع لٰکن المستثنیات فی ھذا الباب کثیرة'' (ج ۲ ص ۴۷۹)

''اور یہ معنٰی ہے جو کچھ کہ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ضابطہ تو عدم سماع ہے لیکن اس باب میں بہت سی اشیاء (مثلاً سلام وغیرہ) اس ضابطہ سے مستثنٰی ہیں۔''

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تقریر سے ظاہر ہے کہ وہ یہ ضابطہ تسلیم اور بیان نہیں فرمارہے بلکہ یہ ضابطہ انہوں نے حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے اور پھر اس پر گرفت کی ہے اور ان کے ساتھ رسّہ کشی کی ہے جیسا کہ ان کی اس تقریر سے بالکل ظاہر ہے اور یہ کسی بھی اہلِ علم پر مخفی نہیں۔ باقی مجذوبوں کو سمجھانا مشکل ہے۔

(۱۲) قرآن کریم میں انک لا تسمع الموتٰی اور ولا تسمع من فی القبور کے ظاہری الفاظ سے معاملہ مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے بظاہر سماع موتٰی کی نفی ثابت ہوتی ہے۔

(۱۳) لیکن اگر باریک بینی سے کام لیا جائے تو اس میں کوئی اشکال نہیں کیونکہ اس کے صحیح محامل اور معانی موجود ہیں۔ چنانچہ اس کے معنی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سماع اور اسماع میں فرق ہے۔ یہاں اسماع کی نفی ہے سماع کی نہیں اور ہمارا مقصود سماع ہے نہ کہ اسماع۔

(۱۴) امام سیوطی ﷫ فرماتے ہیں کہ سماع موتی ثابت ہے جس پر صحیح آثار دلالت کرتے ہیں۔ اس آیت میں نفی ایسے سماع کی ہے جس سے ہدایت اور فائدہ حاصل ہو۔ یعنی یہ زندہ کفار ہدایت سے فائدہ حاصل نہ کرنے میں ایسے ہی ہیں جیسے مُردے کیونکہ ان کے انتفاع کا وقت ہی اب جاتا رہا ہے۔ لہٰذا اس سے مطلوب نفی سماع نہیں ہے بلکہ مطلوب نفی انتفاع ہے۔

(۱۵) حضرت شاہ صاحب ﷫ اپنا فیصلہ یہ دیتے ہیں کہ عدم اسماع وسمع اور استماع، سب کا مفہوم ایک ہے اور وہ عمل نہ کرنا ہے۔ کیونکہ سننا عمل کے لئے ہوتا ہے اور جب عمل نہ کیا گیا تو گویا سنا ہی نہیں۔ جیسے تم کسی سے نماز کے بارے میں بار بار کہو اور وہ نماز نہ پڑھے تو تم کہو گے کہ میری تو وہ سنتا ہی نہیں۔ یعنی مانتا نہیں اور عمل نہیں کرتا اور ایسے ہی موقع پر فارسی میں کہا جاتا ہے نشنود۔ اگر شیخ جلال الدین سیوطی ﷫ اس کی یوں تعبیر کردیتے کہ اہلِ قبور عمل نہیں کرتے تو پھر گفتگو لغت میں ہوتی اور تاویل نہ رہتی۔

(۱۶) جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مُردے سنتے ہیں تو کیا اس سے ان کو فائدہ بھی ہوتا ہے یا آواز ہی سنتے ہیں؟ حضرت شاہ صاحب ﷫ فرماتے ہیں کہ جو آدمی نیکی کی حالت پر مَرا اُس کو اس سماع سے فائدہ بھی ہوتا ہے (کیونکہ مؤمن اور نیک آدمی کو قرآن پاک اور سلام وغیرہ کا ثواب سے فائدہ ہی فائدہ ہے) لیکن جس بدقسمت کی وفات ہی بدی پر ہوئی ہو (العیاذ باللہ تعالیٰ) تو اس کو اس سے کیا حاصل؟ کیونکہ جب اس نے اس سے زندگی میں فائدہ اور نفع حاصل نہیں کیا تو اب کیا کرے گا؟ ؎

اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

تو ایسے شخص کے حق میں صرف آواز ہی سننے کا حصہ ہے اور بس۔

(۱۷) اِس آیت کریمہ کے ظاہری اشکال سے گلوخلاصی کی دُوسری وجہ یہ ہے کہ جس سماع کے اثبات کے دَرپے ہم ہیں وہ عالمِ برزخ کا معاملہ ہے۔ ہمیں مخبر صادق ﷺ نے اس کی خبر دی ہے سو ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ رہا ہمارے عالم اور جہاں کا معاملہ، تو اس کے حق میں وہ معدوم ہے (بایں طور کہ ہم اس کا ادراک واحساس نہیں کرسکتے) اور قرآن کریم کے لئے یہ لازم نہیں کہ اس کی ایسی تعبیر کرے جو عالم برزخ اور ہمارے اِس عالم دونوں پر فِٹ بیٹھے۔ پس جائز ہے کہ ہمارے عالم کے اعتبار سے نفی سماع ہو۔ کیونکہ تشبیہات صرف وضاحت کرنے کے لئے ہوتی ہیں اور وہ لوگ جو قبور میں ہیں ہمارے عالم کے لحاظ سے کالعدم ہیں اور ہمارے عالم کے لحاظ سے نہ ان کے لئے سمع ہے نہ علم ہے اور نہ کوئی اور شئے، تو جائز ہے کہ اپنے عالم کے لحاظ سے ان سے سماع کی بھی نفی کی جائے۔

(۱۸) رہا یہ سوال کہ جب مُردوں کے لئے سماع ثابت ہے تو پھر اِن زندوں کو مُردوں کے ساتھ تشبیہ کیوں دی گئی ہے؟ تو یہ سوال بڑی جہالت اور خالص حماقت ہے کیونکہ تشبیہ ہمارے علم اور ہمارے عالم کے لحاظ سے ہے اگرچہ قرآنِ پاک کے رُو سے ان کے لئے سماع ثابت ہے

(۱۹) اور جب وہ ہمارے عالم کے لحاظ سے معدوم ہیں تو یہ تشبیہ لامحالہ درست اور صحیح ہے۔

(۲۰) رہی وہ حدیث جس میں آتا ہے کہ مُردے کو کہا جاتا ہے سو جا جیسے دُلہن سوتی ہے (جس سے اس کے عدم احساس کا شبہ ہوتا ہے) تو اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ (فیض الباری ج ۱ ص ۱۸۳) میں فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حیاتِ برزخیہ کو نیند سے تشبیہ دی گئی ہے تو جیسے اس عالم کی حیات الگ نوع کی ہے، اسی طرح وہاں کی نیند بھی الگ ہے جس کا مطلب اس جہان سے انقطاع ہے۔ (نہ یہ کہ ان کو وہاں ادراک وشعور ہی نہیں رہتا جیسا کہ نیند کی حالت میں ہوتا ہے)

(۲) قوله السلام (الآخر) ظاهر حديث الباب وغيره من كثير من الاحاديث يدل على سماع الموتٰى واشتهر على السنة الناس ان الموتى ليس لهم سماع عند ابى حنيفة رحمہ اللہ و صَنَّفَ مُلّا على القارى رحمہ اللہ رسالة و ذكر فيها انّ الشمهور ليس له اصل من الائمة اصلاً بل اخذ هذا من مسئلة فى باب الايمان انه اذا حلف انه لا يتكلم مع فلان فمات الرجل فتكلم معهٗ على قبره ميتا لا يحنث اقول ان وجه عدم الحنث ان مبنى الايمان علٰى العرف واهل العرف لا يعلمون ان الموتٰى تسمع والمحقق ان ابا حنيفة لا ينكر سمع الاموات وان خالف ابن الهمام وقال ان الموتٰى لا تسمع وان ذخيرة الحديث تدل على سمع الموتٰى وقال الشيخ ان الموتٰى لا تسمع ويستثنى منه سمع قرع النعال والسلام عليكم اقول لو قلنا يسمع الموتٰى لا اشكال فانه ثبت بقدر مشترك تواتر فى الحديث ولا نتعرض الٰى التخصيصات المتكلفة وسيما اذا لم يرد الانكار عن ائمتنا الثلاثة اما الآيات المشيرة الى عدم السمع فلها محامل حسنة قال التفتازانى فى شرح المقاصد ان علم الميّت مجمع عليه ولٰكنه لا حركة لا اقول ان نقل اجماع التفان ان فى حيّز الخفاء واما نفى الحركة ففى فتاوٰى ابن حجر العسقلانى ولم تنطبع ان حركة الروح وايابه وهذا به ثابت فى الشريعة وذكر بعض التفصيل السيوطى رحمہ اللہ فى رسالته (العرف الشذى ص ۳۵۳)

’’آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مُردوں کو السلام علیکم کہنا (الآخر) اس باب کی حدیث اور اس کے علاوہ بہت سی حدیثوں کا ظاہر اس کو چاہتا ہے کہ مُردے سنتے ہیں اور کچھ لوگوں کی زبانوں پر یہ مشہور ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مُردے نہیں سنتے لیکن ملا علی القاری رحمہ اللہ نے ایک رسالہ لکھا ہے اور اس میں انہوں نے ذکر کیا ہے کہ اس مشہور قول کی ائمہ رحمہم اللہ سے بالکل کوئی اصل نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ ’’باب الایمان‘‘ کے مسئلہ سے لیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص قسم اُٹھائے کہ فلاں سے بات نہیں کرے گا اور وہ مَر گیا تو قسم اُٹھانے والے نے مَرنے والے کی قبر پر اس سے گفتگو کی تو حانث نہ ہوگا۔ مَیں کہتا ہوں کہ حانث نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مدارِ قسم کا عُرف پر ہے اور اہلِ عُرف نہیں جانتے کہ مُردے سنتے ہیں اور تحقیقی بات یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سماعِ موتٰی کے منکر نہیں ہیں۔ اگرچہ اس میں ابن الہمام رحمہ اللہ نے مخالفت کی ہے اور یہ کہا ہے کہ مُردے نہیں سنتے۔ مگر احادیث کا ذخیرہ سماعِ موتٰی پر دلالت کرتا ہے اور شیخ ابن الہمام رحمہ اللہ نے یہ تو کہا ہے کہ مُردے نہیں سنتے مگر جوتیوں کی آواز کا سننا اور سلام کا سننا اس سے مستثنٰی قرار دیتے ہیں۔ مَیں کہتا ہوں کہ اگر ہم یہ کہیں کہ مُردے سنتے ہیں تو اس میں سرے سے کوئی اشکال ہی نہیں کیونکہ قدرِ مشترک کے طور پر اس میں متواتر حدیثیں ثابت ہیں اور ہم ان پر تخصیصات کے درپے نہیں ہوتے جو تکلفات پر مبنی ہیں۔ خصوصاً جب کہ سماعِ موتٰی کا انکار ہمارے تینوں اماموں (امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ) سے ثابت اور وارد نہیں ہوا۔ باقی رہیں وہ آیات جو عدمِ سماع کی طرف اشارہ کرتی ہیں تو ان کے اچھے محامل

اور معانی موجود ہیں۔ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ شرح مقاصد میں لکھتے ہیں کہ میت کے علم پر سب کا اتفاق ہے لیکن مُردہ حرکت نہیں کرتا۔ میں کہتا ہوں کہ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ کا اجماع نقل کرنا حیز خفاء میں ہے۔ رہی حرکت کی نفی تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں ہے جو ابھی تک طبع نہیں ہوا (اب طبع ہو چکا ہے۔ صفدرؔ) کہ روح کا حرکت کرنا اور اس کا آنا اور جانا شریعت سے ثابت ہے اور اس کی کچھ تفصیل امام سیوطی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ (شرح الصدور) میں ذکر کی ہے۔

اس عبارت میں بہت سے فوائد ہیں۔ بعض یہ ہیں:

(۱) باب کی یہ اور دیگر بے شمار حدیثیں سماع موتیٰ پر دلالت کرتی ہیں۔

(۲) عام لوگوں کی زبان پر یہ دعویٰ جاری ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سماع موتیٰ کے منکر ہیں لیکن حضرت ملّا علی القاری رحمہ اللہ نے تصریح فرمادی ہے کہ اس سلسلہ میں ائمہ رحمہم اللہ میں سے کسی سے بھی کچھ منقول نہیں ہے، صرف لوگوں کا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔

(۳) عدمِ سماع کا مسئلہ ''باب الایمان'' سے ماخوذ ہے جس کی حقیقت ہی جدا ہے جیسا کہ آگے آ رہی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

(۴) محقق بات یہ ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سماع موتیٰ کے منکر نہیں ہیں۔

(۵) حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ نے اگرچہ سماع موتیٰ کا انکار کیا ہے لیکن قرع نعال اور السلام علیکم سننے کے وہ بھی قائل ہیں (اور پھر اُنہوں نے روضۂ اقدس کے اندر تینوں بزرگ ہستیوں کی قبور پر استشفاع کا فتویٰ دیا ہے جو سماع کی فرع ہے)

(۶) سماع موتیٰ کے بارے میں حدیثیں قدرِ مشترک کے طور پر متواتر ہیں۔

(۷) لہٰذا تخصیصات و تکلفات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(۸) حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور حضرت امام محمد رحمہ اللہ ہمارے تینوں بزرگوں سے سماع موتیٰ کا انکار ثابت نہیں ہے۔

(۹) عدمِ سماع پر دال آیات کے اپنے مقام پر صحیح محامل موجود ہیں۔

(۱۰) علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے اس بات پر کہ مُردہ جانتا ہے اور اس بات پر کہ وہ حرکت نہیں کرتا، اجماع نقل کیا ہے۔ لیکن دُوسری جز و کہ وہ حرکت نہیں کرتا، مسلّم نہیں۔ کیونکہ حافظ ابن حجرِ عسقلانی رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں شرعی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ رُوح کا حرکت کرنا اور آنا جانا ثابت ہے اس کی کچھ مزید تفصیل آگے فیض الباری کے حوالہ سے آ رہی ہے۔ ان شاء اللہ العزیز!

(۳) ثم اطلعت علٰی روایة فیها غشی الارواح اربعین سنة ولعل اسناده ضعیف مع هذا یکون لجوابه نفاذ و من ههنا تبیّن وجه قوله تعالٰی مَنْ م بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا۔ هٰذَا۔ وَقد تکلمنا علیه سرة و فیه اشکال فانه یدل علی رقودهم فی القبور و الاحادیث وردت بعذابهم و دعائهم بالویل و الثبور و حاصل الجواب انه حکایة عن مدة غشیهم تلک ای لو بقینا کذلک مغشیا علینا و لم تحصل لنا الافاقة لکان احسن ثم ان الآیة ترد علی القائلین بنفی السماع لدلالته علی الرقاد و نفی العذاب (ایضاً) فما ذا یصنعون بها فلا بد علیهم ان یذکروا لها وجها فینبغی لهم ان یطلبوا وجهًا لأیة نفی السماع (ایضاً) فان العذاب کما انه متحقق کذالک السماع (ایضاً) متحقق فلا یغز بامثال هذه النصوص فان لها وجوهًا و معانی (فیض الباری ج ۳ ص ۳۱۹)

''پھر مجھے ایک ایسی روایت پر آگاہی ہوئی جس سے (حشر سے پہلے) چالیس (۴۰) سال اُرواح کی غشی معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی سند ضعیف ہو لیکن باوجود اس کے اس جواب کے لئے بھی گنجائش ہے اور یہیں سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی کہ قبروں سے اُٹھتے وقت مجرم کہیں گے۔ کس نے اُٹھایا ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے وجہ ظاہر ہوگئی ہے اور ہم نے اس پر ایک مرتبہ بحث کردی ہے اور اس میں اشکال ہے وہ یہ کہ یہ ارشادِ خداوندی قبروں میں ان کے سونے پر دلالت کرتا ہے اور احادیث سے ان کا عذاب اور ان کا (عذاب سے اُکتا کر اپنے لئے) ہلاکت اور تباہی مانگنا ثابت ہے اور جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اس مدت کی حکایت ہے جس میں ان پر غشی طاری تھی۔ اس قول سے اُن کی مُراد یہ ہے کہ اگر ہم اسی طرح بے ہوشی میں رہتے اور ہمیں افاقہ حاصل نہ ہوتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ پھر اس آیت کریمہ کے پیش نظر ان لوگوں پر اعتراض وارد ہوتا ہے جو سماع کی نفی کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اُن کے سونے پر بھی دلالت کرتی ہے اور نفی عذاب پر بھی، تو وہ اس نفی عذاب سے کیا کریں گے؟ سو ان کے لئے ضروری ہے کہ اس آیت کریمہ کی کوئی توجیہ بیان کریں اور ان کے لئے یہ بھی مناسب ہے کہ آیت نفی سماع کے لئے بھی کوئی حل تلاش کریں۔ کیونکہ جس طرح ان کے لئے عذاب ثابت ہے، اسی طرح ان کے لئے سماع بھی ثابت ہے۔ سو ایسی نصوص سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔ ان کے اپنی جگہ پر معانی اور توجیہات موجود ہیں۔''

اس عبارت میں بھی حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے سماع موتی کی تصریح فرمائی ہے اور منکرین سماع موتی سے آیت مذکورہ پر وارد اعتراض کا تخلص طلب فرمایا ہے اور پھر علمی طور پر دلِ سوزی اور ہمدردی کے ساتھ نصیحت فرمائی ہے کہ نصوص کے صحیح معانی اور تفاسیر کو چھوڑ کر ان کے ظاہر سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔ مشہور ہے لکل فن رجال۔

(۴) قوله ما انتم باسمع لما اقول منهم و قد مرت مسئلة سماع الاموات و اما قوله وما انت بمسمع من في القبور فلقائل ان يقول انه محمول على نفي سماع يترتب عليه الاجابة او على نفيه بحسب عالمنا فان السماع ان كان فهو في عالم آخر و اما في عالمنا فهو كالمعدوم او انه على حد قوله صم بكم عمى مع وجود السمع والنطق والبصر كما اجاب السيوطي في نظم و آية النفي معناها سماع هدى لا يقبلون ولا يضعون للادب و اعلم ان التفتازاني نقل الاجماع على علم الاموات و انما الخلاف في سماعهم و كذا نقل ان لا خلاف في نفي سائر الصفات غير السماع فالاياب والذهاب و نحوهما منفي عنهم رأسا و نقل ابن حجر رحمہ اللہ في فتاواه ان الاموات يتحركون من مكان الى مكان (ايضاً) و انكر الاتفاق فيه قلت كلام التفتازاني في حق الاجساد دون الارواح و اثبات ابن حجر نى حق الارواح فصح الامر ان قوله قال قتادة احياهم الله تعالى حتى اسمعهم ويؤيد هذا الزاوى ما عند ابن كثير اذا مر احدكم بقبر رجل يعرفه يرد الله تعالى عليه روحه (الآخر) فدل على رد الروح عليه فلا يسمع في كل وقت (فیض الباری ج ۴ ص ۹۰،۹۱)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ تم اُن سے زیادہ نہیں سُن رہے جو مَیں اُن سے کہہ رہا ہوں۔'' مسئلہ سماع موتی پہلے گزر چکا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ اور تو نہیں سنا سکتا اُن کو جو قبروں میں ہیں، تو کہنے والے کو یہ کہنے کا حق ہے کہ وہ کہے کہ یہ ایسے سماع کی نفی پر محمول ہے جس سماع پر قبولیت مترتب ہو (یعنی ان کو سماع قبول نہیں) اور یا اس نفی سے مُراد یہ لے کہ نفی ہمارے عالم کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ سماع ہے تو دُوسرے جہاں (برزخ) میں

ہے اور ہمارے عالم کے لحاظ سے وہ ایسا ہے جیسے معدوم اور یا اس کو اس طریقہ پر لے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ (کافر) بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔ حالانکہ اُن کا سننا، بولنا اور دیکھنا یقینی بات ہے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نظم میں جواب دیا ہے کہ: ''نفی سماع کی آیت کا معنٰی یہ ہے کہ ہدایت کا سماع اُن کو نہیں اور وہ نہ تو اس کی تعظیم کرتے ہوئے اس کو قبول کرتے ہیں اور نہ کان لگاتے ہیں اور جاننا چاہئے کہ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ مُردے جانتے ہیں اور لکھا ہے کہ اختلاف ان کے سماع میں ہے اور اسی طرح انہوں نے نقل کیا ہے کہ سماع کے بغیر تمام صفات ان سے منفی ہیں۔ پس آنا اور جانا وغیرہ ان سے کُلیۃً منفی ہے اور امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاویٰ میں نقل کیا ہے کہ مُردے ایک جگہ سے دُوسرے جگہ تک حرکت بھی کرتے ہیں اور ان کی عدمِ حرکت پر اتفاق کا انہوں نے انکار کیا ہے۔ مَیں کہتا ہوں کہ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ کی بات اجسام کے بارے میں ہے (کہ وہ حرکت نہیں کرتے) اور ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی بات اَرواح کے بارے میں ہے (کہ وہ حرکت کرتے ہیں) لہٰذا دونوں باتیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ ان کا ارشاد کہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا۔ حتیٰ کہ ان کو آپ کا کلام سنایا اور اس راوی کی تائید وہ روایت کرتی ہے جو ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص ایسے آدمی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جس کو وہ جانتا تھا تو اللہ تعالیٰ اُس پر اُس کی رُوح لوٹا دیتا ہے۔'' اس سے رَدِّ رُوح کا ثبوت ملا تو مُردہ ہر وقت نہیں سُنتا۔ (بلکہ اُس وقت سُنتا ہے جب اُس پر رُوح لوٹائی گئی ہو)''

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی اس پیش کردہ روایت سے معلوم ہوا کہ جب بھی کوئی قبر کے پاس سے گزرتا ہے اور میت کو سلام کہتا ہے تو اُس وقت اُس کی طرف رُوح لوٹائی جاتی ہے اور وہ سلام کہنے والے کو سابق تعارف کی وجہ سے پہچانتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے حوالے سے یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں تردّد کیا ہے۔ غالباً اُن کا تردّد اس اَمر میں ہے کہ میت کی طرف جب ایک بار رُوح لوٹائی جاتی ہے تو یہ اعادہ مستمرہ ہوتا ہے یا جب بھی کوئی سلام کہتا ہے تو اسی وقت رَدِّ رُوح ہوتا ہے۔ جمہور پہلی شق کے قائل ہیں۔ راقم کہتا ہے کہ اگر اس روایت میں رَدِّ رُوح سے توجہ مراد لی جائے جیسا کہ حدیث ردّ اللہ علی روحی میں یہ مراد لی گئی ہے تو زیادہ مناسب ہے۔ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ان تفصیلی عبارات کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سماعِ موتیٰ کے قائل نہ تھے جیسا کہ مؤلف ندائے حق نے کہا ہے تو وہ صرف خود فریبی کا شکار ہے اور لوگوں کو دھوکہ دینے پر کمر بستہ ہے۔

حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی دامت برکاتہم

حضرت مولانا دَورِ حاضر کے محقق عالم، بلند پایہ مناظر اور علماءِ دیوبند کے ترجمان ہیں۔ پہلے آپ بھی سماعِ موتیٰ کے منکر تھے، جیسا کہ ان کی کتاب (سنت ضرور یہ ص ۳۶) میں اس کا تذکرہ موجود ہے اور مؤلف ندائے حق وغیرہ نے بھی یہ حوالہ دیا ہے۔ (ندائے حق ص ۱۵۷، واقامۃ البرہان ص ۹۱) لیکن تینتیس (۳۳) سال تک سماعِ موتیٰ کا انکار کرنے کے بعد حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق پر بنیاد رکھ کر اس سے رجوع کر لیا ہے اور اَب سماعِ موتیٰ کے مُقر ہو گئے ہیں۔ (''الفرقان'' لکھنؤ، ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۶ھ حاشیہ ص ۳۲)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (سابق مفتی دارالعلوم دیوبند وحال مفتی اعظم پاکستان)

حضرت مفتی صاحب نے سماع موتی کے بارے میں متعدد فتوے صادر فرمائے ہیں اور اس مسئلہ میں خاصی تحقیق فرمائی ہے۔ چنانچہ وہ مسئلۂ توسّل کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس طرح اور عنوان سے توسّل بزرگوں کے ساتھ جائز ہے مگر اہلِ قبور کو خطاب اگر سماع موتی کے اعتقاد پر مبنی ہے (یعنی یہ سمجھتا ہے کہ دوسرے پہلو اور عدم سماع کا احتمال ہی نہیں۔ صفدرؔ) تو درست نہیں اور اگر محض احتمال کے درجہ میں ہے تو مضائقہ نہیں۔ مگر پھر بھی احتیاط اجتناب میں ہے۔ (کیونکہ عوام الناس جہالت کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ صفدرؔ)

(فتاویٰ امداد المفتین ص ۲۹۱، ۲۹۲، طبع کراچی)

نیز اِرشاد فرماتے ہیں کہ: ''اعدل الاقوال اور اصح و مختار یہ ہے کہ جن جن مواقع میں مَیّت کا کلام وغیرہ سننا منصوص ہے وہاں تو بلا تأمل یقین کیا جاوے۔ باقی عام کلام خطاب کے متعلق کوئی ضابطہ تو ہے نہیں کہ ضرور سنتے ہیں لیکن یہ نہ سننا بھی ضروری نہیں۔ اگر حق تعالیٰ شانہٗ چاہیں تو سنا دیں۔ غرض ایسی حالت نہیں جیسے زندگی میں بطور جریانِ عادت سننا ضروری ہوتا ہے۔ ہذا ھو التحقیق!'' (امداد المفتین ص ۲۹۱)

اور نیز اِرشاد فرماتے ہیں کہ: ''و ذھبت طوائف من اھل العلم بسماعھم فی الجملة وقال ابن عبدالبر رحمہ اللہ ان الاکثرین علٰی ذٰلک وھو اختیار ابن جریر الطبری رحمہ اللہ وکذا ذکرہ ابن قتیبہ رحمہ اللہ وغیرہ''

(احکام القرآن حزب خامس ص ۱۰۴)

''اہلِ علم کے بہت سے طائفے اس طرف گئے ہیں کہ مُردے فی الجملہ سنتے ہیں۔ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر اسی کے قائل ہیں اور اسی کو امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور ایسا ہی امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔''

اور تحریر فرماتے ہیں کہ: ''قال العبد الضعیف والذی ذکرہ فی الروح من طوائف اھل العلم وذکر ابن عبدالبر رحمہ اللہ ان الاکثرین علٰی ذٰلک یعنی سماعھم فی الجملة ھو الحق الحقیق بالقبول والیہ یرشد صیغة القراٰن وشان النزول وبہ تتوافق الروایات من الصحابة رضی اللہ عنہم والرسول صلی اللہ علیہ وسلم وھو مختار مشائخنا دامت برکاتھم'' (ص ۱۰۴)

''بندہ ضعیف کہتا ہے کہ ''کتاب الروح'' میں جو اہلِ علم کے کئی طائفوں سے ذکر کیا ہے اور امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے کہ اکثر حضرات فی الجملہ سماع موتی کے قائل ہیں۔ یہی حق ہے جو قبول کے لائق ہے اور قرآنِ کریم کا صیغہ اور شانِ نزول بھی اسی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور اسی سے ان روایات میں جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مَروی ہیں، توافق پیدا ہو جاتا ہے اور ہمارے مشائخ (دیوبند) دامت برکاتہم کا بھی یہی مختار ہے۔

اُور اس مسئلہ کی طویل بحث کرتے ہوئے اور نصوص و دلائل کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''فالقول باطلاق سماع الموتٰی فی کل فرد وفی کل حین قول بما لیس لک بہ علم والقول بنفیہ رأسا مزاحمة للنصوص المذکورة انفا ولذالک قلنا بثبوتہ فی الجملة اعنی فی حین دون حین لشخص دون شخص فی کلام دون کلام وبذٰلک تتوافق النصوص والآثار الواردة فی ھذا الباب'' (ص ۱۰۶)

''یہ کہنا کہ مُردے مطلقاً سنتے ہیں یعنی ان کا ہر فرد اور ہر وقت سنتا ہے تو یہ ایسی بات ہے جس کا تجھے علم نہیں ہے اور سماعِ موتیٰ کا کُلیۃً نفی کر دینا ان نصوص سے تصادم اور مزاحمت ہے جن کا ذکراً بھی ہوا اور اسی لئے ہم فی الجملہ سماعِ موتیٰ کے قائل ہیں یعنی کسی وقت نہ کہ ہر وقت (کیونکہ ''مؤمن نم کنومۃ العروس'' کا مزہ بھی تو لیتے ہیں اور کسی وقت ان کی توجہ صرف الی اللہ تعالیٰ ہی ہوتی ہے۔ صفدرؔ) اور بعض اشخاص کے لئے نہ کہ ہر ایک کے لئے اور بعض کلام نہ کہ ہر ایک اور اسی طریق سے اس باب میں وارد نصوص اور آثار میں موافقت پیدا ہوتی ہے۔

اور نیز یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ: ''فالاحادیث الصحیحۃ لما کانت ناطقۃ بثبوت السماع فی قتلٰی بدر و فی صیغۃ السلام لکل مسلم نطقنا بہ و ھی ساکتۃ عن سائر الکلام فسکتنا عنہ ولٰکن لا سکوت الجمود والانکار بل سکوت من لا یعلم امرًا ممکنَ الوقوع ھل وقع ام لا فان ثبت بدلیلٍ وقوعہ قلنا بہ و اِلّا دُمنا علی السکوت لقولہٖ تعالٰی و لا تقف مالیس لک بہٖ علم'' (ص ۱۰۶)

''صحیح احادیث جب اس مسئلہ میں ناطق ہیں کہ مقتولین بدر کا سماع ثابت ہے اور اسی طرح ہر مُردہ مسلمان سلام سنتا ہے تو ہم بھی اس کے قائل ہیں اور یہ احادیث باقی سب کلام سے ساکت ہیں سو ہم بھی ساکت ہیں لیکن یہ سکوت جمود و اِنکار کا نہیں بلکہ اس شخص کا سکوت ہے جو کسی ممکن الوقوع اَمر کے واقع ہونے کو نہیں جانتا کہ کیا واقع ہوا ہے یا نہیں؟ پس اگر کسی دلیل سے اس کا وقوع ثابت ہو جائے تو ہم اس کے قائل ہیں وَرنہ و لا تقف ما لیس لک بہ علم کے مطابق ہم سکوت پر دائم رہیں گے۔

حضرت مفتی صاحب کی ان تمام واضح اور ناطق عبارات سے یہ بات بالکل عیاں ہو چکی ہے کہ فی الجملہ سماعِ موتیٰ ثابت ہے۔ نصوص اور صحیح احادیث اسی پر دال ہیں اُور اس کا اِنکار نصوص اور احادیث صحیحہ کا انکار وجحود ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر مؤلف ندائے حق وغیرہ حضرت مفتی صاحب کو منکرین سماعِ موتیٰ میں شمار کرتے ہیں تو وہ جانیں اور ان کی ضد اور ہٹ دھرمی۔

مشہور غیر مقلد عالم مولانا وحید الزمان صاحب رحمہ اللہ

مولانا اپنی جماعت اور اپنے دَور کے متبحر عالم اور مصنف ومحقق بزرگ تھے۔ وہ سماعِ موتیٰ کے مسئلہ کی تحقیق میں لکھتے ہیں: ''السلام علیکم دار قوم مؤمنین۔ سلام تم پر اے مؤمن گھر والو۔ یہ آپ ﷺ نے قبرستان میں جا کر فرمایا۔ مُردوں کو سلام کیا۔ اُن سے مخاطبہ کیا۔ معلوم ہوا کہ مُردے اپنی قبروں میں ہمارا سلام وکلام سنتے ہیں لیکن وہ ہم کو اپنا جواب نہیں سنا سکتے۔ اہلِ حدیث کا قاطبۃً (یعنی سب کا کُلیۃً) یہی قول ہے۔ صرف امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ (اُن کی طرف عدمِ سماعِ موتیٰ کی نسبت بالکل غلط ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے اِن شاء اللہ تعالیٰ۔ صفدر) اور معتزلہ نے سماعِ موتیٰ کا انکار کیا ہے۔ ان کے انکار سے کیا ہوتا ہے؟ اور تعجب ہے ان اہل حدیث پر، جو لوگوں کو تو ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی تقلید سے تو منع کرتے ہیں اور خود جب چاہتے ہیں ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مقلد بن جاتے ہیں۔ سماعِ موتیٰ کی نفی میں اُن کے قول سے استدلال کرتے ہیں اور اَحادیث صحیحہ کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔''

(لغات الحدیث ج ۳ ص ۱۵۰، طبع نور محمد کارخانہ، آرام باغ کراچی)

نیز لکھتے ہیں کہ: ''اہل حدیث کے پیشواء حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے صراحۃً سماع موتی کو ثابت کیا ہے اور بے شمار حدیثوں سے جن کو امام سیوطی رحمہ اللہ نے ''شرح الصدور'' میں ذکر کیا ہے۔ مُردوں کا سماع ثابت ہوتا ہے اور سلف رحمہم اللہ کا اس پر اجماع ہے۔ صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اس سے انکار منقول ہے اُور ان کا قول شاذ ہے۔''

(ایضاً ج ۳ ص ۱۶۶، سم)

اور یہی بزرگ لکھتے ہیں: ''اِنَّکَ لا تسمع الموتٰی'' کو مُردوں کو (یعنی کافروں کو) اسلام نہیں قبول کرا سکتا۔ اس آیت سے سماع موتی کی نفی نہیں نکلتی جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خیال کیا کیونکہ اسماع سے یہاں سماع اجابت مراد ہے جیسے اسمع وغیرہ مسمع میں اور متعدد احادیث سے سماع موتی ثابت ہے، جیسے اُوپر گزر چکا ہے اُور اہل حدیث کے بڑے امام جیسے ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ ہیں، اسی کے قائل ہیں صرف حنیفہ (بالکل غلط ہے کمامرّ وسیاتی ان شاء اللہ تعالیٰ! صفدرؔ) اور معتزلہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ مجمع البحار میں ہے: ''اِنَّکَ لا تسمع الموتٰی'' کا معنٰی یہ ہے کہ تو ان جاہلوں کو نہیں سمجھا سکتا جن کو اللہ تعالیٰ نے جاہل بنایا ہے تو یہ آیت اُس حدیث کے خلاف نہ ہوگی۔ ''ما انتم باسمع من ھؤلاء'' (ایضاً ج ۳ ص ۱۶۳، سم)

تیسری دلیل: حافظ ابو عمر بن عبد البر المالکی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۶۳ھ) جن کو علامہ ذہبی رحمہ اللہ الامام، شیخ الاسلام اور حافظ المغرب کے پیارے الفاظ سے بیان کرتے ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۶) اور حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ ایک مقام میں فرماتے ہیں کہ: ''وھو من المتقنین فی باب النقل فلا مناص من تسلیم تک النسبۃ'' (فیض الباری ج ۱ ص ۶۰) یعنی جب امام ابن عبد البر رحمہ اللہ نقل کے سلسلہ میں ان حضرات میں شامل ہیں جو متقن اور متثبت ہیں تو لامحالہ ان کی بیان کردہ نقل اور نسبت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

روایت کرتے ہیں: ''من حدیث ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما من رجل یمر بقبر اخیہ المؤمن کان یعرفہ فیسلّم علیہ الّا عرفہ ورذ علیہ السلام'' (کتاب الروح ص ۱۳، والجامع الصغیر ج ۲ ص ۱۵۱)

''حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص بھی اپنے مؤمن بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جس کو وہ دنیا میں پہچانتا تھا۔ وہ جب بھی اسے سلام کہتا ہے تو وہ اس کو پہچان لیتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔''

یہ پہچاننا سلام کہنے والے کے سلام و کلام کے لب و لہجہ سے ہوتا ہے، جس طرح اکثر پسِ پردہ یا نابینا حضرات لوگوں کی آواز اور طرز کلام اور لب و لہجہ سے ان کو پہچان لیتے ہیں۔ حالانکہ آنکھوں سے وہ کچھ نہیں دیکھتے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ مُردہ قبر میں سلام سُنتا بھی ہے اور اس کا باقاعدہ جواب بھی دیتا ہے یہ روایت سماع موتی کی واضح اور روشن دلیل ہے جس میں ذرہ بھر شک نہیں کیا جا سکتا۔

حافظ ابن القیم الحنبلی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۵۱ھ) لکھتے ہیں کہ: ''قال ابن عبد البر رحمہ اللہ ثبت عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' (کتاب الروح ص ۲)

''امام ابن عبد البر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت ثابت ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ امام ابن عبد البر رحمہ اللہ کے نزدیک یہ روایت صحیح اور ثابت ہے اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ بھی ان کی تائید کرتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ الحنبلی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۲۸ھ) اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''وقد روی حدیث صححہ ابن عبدالبر انہ قال مامن رجل یمر بقبر اخیہ'' (اقتضاء الصراط المستقیم ص ۱۵۷، طبع مصر)

''بلاشبہ ایک حدیث روایت کی گئی ہے جس کی امام ابن البر رحمہ اللہ نے تصحیح کی ہے کہ جو شخص اپنے بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے۔''

علامہ علی بن عبدالکافی السبکی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۵۶ھ) لکھتے ہیں: ''ذکرہ جماعۃ وقال القرطبی فی التذکرۃ ان عبدالحق صححہ'' (شفاء السقام ص ۶۵)

''اس کو ایک جماعت نے بیان کیا ہے اور قرطبی رحمہ اللہ تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امام عبدالحق رحمہ اللہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔''

اور امام محمد بن احمد الانصاری القرطبی رحمہ اللہ (المتوفی ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں کہ: ''وفی حدیث صححہ عبدالحق مرفوعا'' (مختصر تذکرہ قرطبی رحمہ اللہ ص ۳۸، طبع مصر)

''ایک مرفوع حدیث میں ہے جس کی عبدالحق رحمہ اللہ نے تصحیح کی ہے۔''

اور حافظ عماد الدین ابوالفداء اسمٰعیل ابن کثیر رحمہ اللہ (المتوفی ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں کہ: ''من اشھر ذلک ماروا ہ ابن عبدالبر مصححا لہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ مرفوعا مامن احد یمر بقبر اخیہ المسلم''

(تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۴۳۸)

''سماع موتی کے مشہور دلائل میں سے ایک وہ روایت بھی ہے جس کو امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے مرفوعاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے تصحیح کے ساتھ نقل کیا ہے کہ جو شخص بھی اپنے مسلمان بھائی کی قبر کے پاس سے گزرے۔''

امام محمد بن احمد بن عبدالہادی الحنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وھو صحیح الاسناد''

(الصارم المنکی ص ۱۸۶، طبع مصر)

''کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔''

اور دُوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عند القبر سماع کا تو کہنا ہی کیا۔

''وھذا قد جاء عموما فی حق المومنین مامن رجل یمر بقبر الرجل کان یعرفہ فی الدنیا فیسلم علیہ الارد اللہ علیہ روحہ حتی یرد علیہ السلام'' (الصارم المنکی ص ۹۵)

''یہ تو عام مؤمنوں کے حق میں آیا ہے کہ جو شخص بھی کسی ایسے شخص کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جس کہ وہ دُنیا میں پہچانتا تھا تو وہ جب بھی اس کو سلام کہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف اس کی رُوح لوٹا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔''

علامہ محمد عبدالباقی بن یوسف الزرقانی المالکی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۱۲۲ھ) لکھتے ہیں کہ: ''رواہ ابن عبدالبر وصححہ ابو محمد عبدالحق'' (شرح مواہب ج ۵ ص ۳۳۴، طبع مصر)

''امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اس کو روایت کیا ہے اور علامہ ابو محمد عبدالحق رحمہ اللہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔''

اور اپنا فیصلہ یوں لکھتے ہیں: ''فقد صح مرفوعا مامن احد یمر'' (ج ۸ ص ۳۰۸)

علامہ سید محمود آلوسی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۷۰ھ) لکھتے ہیں کہ: "اخرج ابن عبدالبر وقال عبدالحق الاشبیلی رحمہ اللہ اسنادہ صحیح عن ابن عباس رضی اللہ عنہ مرفوعا" (روح المعانی ج۶ ص ۴۵۵)

"امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اس حدیث کی تخریج کی ہے اور امام عبدالحق اشبیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہیں۔

علامہ طحطاوی (سید احمد الطحطاوی الحنفی رحمہ اللہ) لکھتے ہیں کہ: "واخرج ابن عبدالبر فی الاستذکار والتمهید بسند صحيح عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مامن احدیمر بقبر اخیه المؤمن كان يعرفه فی الدنيا فيسلم عليه الاعرفه ورد عليه السلام" (طحطاوی ص ۳۴۱)

"امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "استذکار اور تمہید" میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی تخریج کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص بھی اپنے مؤمن بھائی کی قبر کے پاس سے جس کو وہ دُنیا میں پہچانتا تھا نہیں گزرتا جس کو وہ سلام کہے مگر وہ اس کو پہچان کر اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

اور مسئلہ سماع موتی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "واخرج ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ والبیهقی رحمہ اللہ فی الشعب عن محمد بن واسع قال بلغنی ان الموتی یعلمون بزوارهم یوم الجمعة ویوما قبله ویوما بعدهٔ وقال ابن القيم رحمہ اللہ الاحاديث والآثار تدل على ان الزائر متى جاء علم به المزور وسمع سلامه وانس به ورد عليه وهذا عام فی حق الشهداء وغيرهم وانه لاتوقيت فی ذٰلک وهو اصح من اثر الضحاک على التوقيت"

(طحطاوی ص ۳۴۰)

"اور امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے شعب الایمان میں محمد بن واسع رحمہ اللہ سے تخریج کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ بلاشبہ مُردے جمعہ کے دِن اور ایک دن اس سے قبل اور ایک دن اس کے بعد اپنے زیارت کرنے والوں کو پہچانتے ہیں اور امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ احادیث اور آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ زیارت کرنے والا جب بھی آتا ہے تو جس کی زیارت کی جاتی ہے۔ (یعنی مُردہ) وہ اس کو جانتا، اس کے سلام کو سنتا، اُس سے مانوس ہوتا اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے اور یہ بات شہداء اور غیر شہداء سب کے حق میں عام ہے اور اس میں کسی وقت کی تخصیص نہیں اور یہ حضرت ضحاک رحمہ اللہ کے اثر سے زیادہ صحیح ہے جس میں وقت کی تخصیص ہے۔

اُصولِ حدیث کے رُو سے تخریج اور اخراج کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حدیث کو اس کی پوری سند کے ساتھ نقل کیا جائے۔ یہ روایت امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے مؤطا امام مالک کی مطول اور مختصر شرح التمہید اور الاستذکار میں نقل کی ہے۔ جیسا کہ امام جلال الدین سیوطی الشافعی رحمہ اللہ (المتوفی ۹۱۱ھ) نے اس کی تصریح کی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ صححہ عبدالحق کہ اس کی تصحیح محدث عبدالحق رحمہ اللہ نے کی ہے۔ (شرح الصدور ص ۸۴) اور محدث عبدالحق رحمہ اللہ کے حوالہ سے اس کی تصحیح انہوں نے اپنی کتاب (بشریٰ الکیب ص ۱۰۳) میں بھی نقل کی ہے اور امام عبدالحق رحمہ اللہ نے یہ بات اپنی کتاب "العاقبہ" میں تحریر فرمائی ہے۔ (الصارم المنکی ص ۱۸۶) اور اس کے علاوہ "الاحکام الصغریٰ" میں بھی فرمائی ہے۔

جیسا کہ علامہ السید السمہودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''روی عبدالحق فی الاحکام الصغریٰ وقال اسنادہ صحیح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما الٰی ان قال وروی ابن عبدالبر رحمہ اللہ وصححہ کمانقلہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ''
(وفاء الوفی ج ۲ ص ۴۰۴)

''امام عبدالحق رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الاحکام الصغریٰ'' میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔ پھر آگے فرمایا اور امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے بھی یہ روایت کی ہے اور اس کو انہوں نے صحیح کہا ہے جیسا کہ ان سے ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ (التوفی ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں: ''صححہ ابو محمد عبدالحق رحمہ اللہ'' (دلیل الطالب علی ارجح المطالب ص ۸۴۱)

''اس حدیث کی امام ابو محمد عبدالحق رحمہ اللہ نے تصحیح کی ہے۔''

اور مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''وفی حدیث صححہ ابو عمران احدًا اذا سلّم علی المیّت فانہ یرد علیہ ویعرفہ'' (فیض الباری ج ۲ ص ۴۶۷)

''اور حدیث میں آتا ہے جس کو امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے کہ جب بھی کوئی شخص مُردہ کو سلام کرتا ہے، وہ اُس کا جواب دیتا اور اُس کو پہچانتا ہے۔''

اور علامہ عزیزی رحمہ اللہ اِلَّا عَرَفَهُ وَرَدَّ علیہ السلام کے جملہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ولا مانع من خلق ھذا الادراک برد الروح فی بعض بدنہ'' (السراج المنیر ج ۳ ص ۲۸۶)

''اس میں کوئی مانع نہیں کہ اس میں یہ ادراک اس کی رُوح کو اس کے بدن کے بعض حصہ کی طرف لوٹانے کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔''

قاضی محمد بن علی الشوکانی رحمہ اللہ (التوفی ۱۲۵۰ھ) کہتے ہیں: ''مع ان مطلق الادراک کالعلم والسماع ثابت لسائر الموتٰی وقد صح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعًا مامن احد یمر علٰی قبر اخیہ المؤمن وفی روایۃ بقبر الرجل کان یعرفہ فی الدنیا فیسلم علیہ اِلَّا عرفہ ورد علیہ السلام'' (نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۶۴، طبع مصر)

''حالانکہ مطلق ادراک مثلاً علم اور سماع تو یہ تمام مُردوں کے لئے حاصل اور ثابت ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مرفوع روایت آئی ہے کہ جو شخص بھی اپنے مؤمن بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے اور ایک روایت میں آتا ہے جس کو وہ دُنیا میں پہچانتا تھا تو جب وہ اُس پر سلام کہتا ہے وہ اُس کو پہچانتا ہے اور اُس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔''

اس صحیح اور صریح حدیث کی روشنی میں حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''فھذا نص فی انہ یعرفہ بعینہ ویرد علیہ السلام'' (کتاب الروح ص ۴)

''یہ حدیث اس بات میں نص ہے کہ مُردہ سلام کہنے والے کو بعینہٖ پہچانتا اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔''

اور یہی حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اپنے مشہور قصیدہ ''نونیہ'' میں لکھتے ہیں:

وھذا ورد نبینا التسلیم من یأتی بتسلیم مع الاحسان

اُور یہ اَمر کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر اس شخص کے سلام کا جواب عنایت فرماتے ہیں جو عمدہ طریقہ سے سلام کہتا ہے۔

ماذاک مختصا بہ ایضاً کما قد قالہ المبعوث بالقرآن

یہ صرف آپ کی ذات کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے جیسا کہ خود اس ذات نے فرمایا جس کو قرآن دے کر بھیجا گیا ہے۔

من زار قبر اخ لہ فاتی بتسلیم علیہ و ھو ذوایمان

کہ جس شخص نے اپنے مؤمن بھائی کی قبر کی زیارت کی اور اُسے سلام کہا۔

ردالالٰہ علیہ حقا روحہٗ حتّٰی یرد علیہ ردّ بیان

(النونیہ ص ۱۴۵)

تو پروردگار یقینی طور پر اُس پر اُس کی رُوح لَوٹا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اُس کے سلام کا واضح بیان سے جواب دیتا ہے۔

اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۶۹ھ) فرماتے ہیں کہ: ”علی ان الصواب ان المیّت اھل الخطاب مطلقًا لما سبق من الحدیث ما من احد یمر بقبر اخیہ المؤمن یعرفہ فی الدنیا فیسلم علیہ الّا عرفہ ورد علیہ السلام“ (فتح الملہم ج ۲ ص ۵۰۸)

”مزید برآں درست بات یہ ہے کہ مُردہ مطلقاً خطاب کا اہل ہے کیونکہ پہلے حدیث گزر چکی ہے کہ جو شخص بھی اپنے مؤمن بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جس کو دُنیا میں وہ پہچانتا تھا اور وہ اُسے سلام کہتا ہے تو مُردہ اس کو پہچان لیتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔“

اسی مضمون کی روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔ (کتاب الروح ص ۵، وشرح الصدور ص ۸۴) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مَروی ہے۔ (کتاب الروح ص ۱۳) اور ان کی یہ روایت امام ابن عساکر رحمہ اللہ اور خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے بھی نقل کی ہے۔ (الجامع الصغیر ج ۲ ص ۱۵۱) اور امام ابی الدنیا رحمہ اللہ اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے ”شعب الایمان“ میں بھی نقل کی ہے۔ (شرح الصدور ص ۸۴) ان دونوں روایتوں میں کمزوری بھی ہے لیکن اُصولِ حدیث کے رُو سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سابق حدیث کے لئے شاہد اور مؤید کا درجہ ان کو حاصل ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت صحیح ہے جس کو صحیح کہنے والے اور اُن کی تائید کرنے والے اور اس روایت سے استدلال کرنے والے یہ حضرات ہیں:

(۱) امام ابن عبدالبر، (۲) امام ابو محمد عبدالحق، (۳) حافظ ابن تیمیہ، (۴) حافظ ابن القیم، (۵) حافظ ابن کثیر، (۶) امام قرطبی، (۷) ابن عبدالہادی، (۸) علامہ زرقانی، (۹) علامہ آلوسی، (۱۰) نواب صدیق حسن خان، (۱۱) علامہ سمہودی، (۱۲) مولانا سید انور شاہ صاحب، (۱۳) علامہ سیوطی، (۱۴) علامہ عزیزی، (۱۵) قاضی شوکانی، (۱۶) مولانا عثمانی (رحمہم اللہ)

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ متقین واثبات میں سے ہیں اور نقل کے باب میں ثقہ اور ثبت ہیں اور امام عبدالحق الارذی الاشبیلی رحمہ اللہ (المتوفی ۵۸۱ھ) کو علامہ ذہبی رحمہ اللہ حافظ العلامۃ اور الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۳۹) اور حافظ ابو عبداللہ الابار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ”کان فقیھا حافظًا عالمًا بالحدیث وعللہ عارفًا بالرجال موصوفا بالخیر والصلاح والزھد والورع ولزوم السنۃ“ (تذکرہ ج ۴ ص ۱۴۰)

''وہ فقیہ، حافظ، حدیث اور اس کی علتوں کے عالم اور راویوں کو جاننے والے تھے۔ نیز وہ خیر وصلاح، زُہد وورع سے متصف اور پابند سنت تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ موصوف نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مذکورہ بالا حدیث کی تصحیح محض صوفیانہ رنگ اور سہل نگاری کے طور پر نہیں بلکہ علم حدیث اور اس کے رواۃ پر گہری نگاہ رکھ کر اُصولِ حدیث کے مطابق کی ہے اور محدثین اور محققین علماء کرام کے جم غفیر نے ان کی تائید کی ہے۔

اعتراض: اس حدیث کے سلسلہ میں جو اعتراض نظر سے گزرا ہے۔ وہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یوں نقل کیا ہے: ''وقیل فی حدیث ابن عبدالبر رحمہ اللہ ان عبدالحق وان قال اسنادہ صحیح الا ان الحافظ ابن رجب تعقبہ وقال انہ ضعیف بل منکر'' (روح المعانی ج۲۱ ص۵۷)

''اور ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی روایت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ امام عبدالحق رحمہ اللہ نے اگرچہ کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔ مگر حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے ان پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف بلکہ منکر ہے۔

الجواب: اوّلاً تو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے لفظ ''قیل'' سے اس جواب کو نقل کر کے اِس کا ضعف بتا دیا ہے اور اس کی اہمیت گھٹادی ہے اور یہ ظاہر کر دیا ہے کہ وہ خود اس سے مطمئن نہیں ہیں، وثانیاً حافظ عبدالرحمن بن شہاب الدین ابن احمد بن رجب الحنبلی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۹۵ھ) اپنے مقام پر بلا شبہ متبحر عالم ہیں، لیکن فن حدیث اور روایت حدیث کی پرکھ اور نقد وجرح میں ان کا وہ مقام نہیں جو حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ اور امام عبدالحق اشبیلی رحمہ اللہ کا ہے وہ دونوں اقدام ہونے کے علاوہ اس فن میں ان سے اعلم بھی ہیں اور پھر حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ ابن القیم رحمہ اللہ وغیرہ بے شمار محدثین ان کی تائید کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی تصحیح کے مقابلہ میں ان کی تضعیف کا کوئی مقام نہیں ہے۔ وثالثاً ابن رجب رحمہ اللہ کی جرح اور تضعیف مُبہم ہے اور اُصولِ حدیث کے رُو سے اس کا کوئی اعتبار نہیں جمہور کا ضابطہ یہ ہے۔

اگر کوئی کہے کہ: ''ھذا الحدیث غیر ثابت او منکر او فلان متروک الحدیث او ذاھب الحدیث او مجروح او لیس بعدل من غیر ان یذکر سبب الطعن وھو مذھب عامۃ الفقہاء والمحدثین''

(الرفع والتکمیل ص۸)

یہ حدیث ثابت نہیں یا منکر ہے یا فلاں راوی متروک الحدیث یا ذاہب الحدیث یا مجروح ہے یا عادل نہیں اور اس کی وجہ اور سبب نہ بیان کرے (تو اس صورت میں یہ جرح مقبول نہ ہوگی) اکثر فقہاء اور محدثین کا یہی مذہب ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جرح مبہم اور غیر مفسر کا جمہور فقہاء کرام اور محدثین عظام رحمہم اللہ کے نزدیک کوئی اعتبار نہیں۔ مؤلف ندائے حق امام نووی رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے غیر ثقہ راوی سے کیوں روایت کی ہے تو اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ امام مسلم رحمہ اللہ کے نزدیک اس راوی پر جرح مفسر ثابت نہیں اور جرح صرف مفسر ہی قبول کی جا سکتی ہے۔ (نووی ص ۱۳، ندائے حق ص ۱۸۲، ملخصہ) اور پھر آگے مقدمہ (بخاری ص۱۱) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ متابعت اور استشہاد میں بعض ضعیف راویوں کی روایت بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ (ندائے حق ص ۱۸۲)

ہاں! اگر جارح ائمہ جرح وتعدیل میں سے ہو۔ متشدد، متعنت اور متعصب نہ ہو اور جرح کے اسباب کو جانتا ہو تو پھر جرح تعدیل پر مقدم ہوگی۔ بشرطیکہ یہ کہ جمہور کے قول سے متصادم نہ ہو۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں

کہ: ”والجرح مقدم علی التعدیل و اطلق ذٰلک جماعۃ ولکن محلہ ان صدر مبینا من عارف باسبابہ لانہ ان کان غیر مفسر لم یقدح فی من ثبتت عدالتہ“ (شرح نخبۃ الفکر ص ۱۱۱)

”جرح تعدیل پر مقدم ہے اور ایک جماعت نے اس کو مطلق رکھا ہے لیکن اس تقدیم کا صحیح محل یہ ہے کہ جرح مفسر ہو اور ایسے شخص سے ہو جو جرح کے اسباب کو جانتا ہو۔ کیونکہ اگر جرح مفسر نہ ہوئی تو ایسے شخص کے بارے میں اس سے کوئی عیب پیدا نہیں ہوگا جس کی عدالت ثابت ہو چکی ہو۔

الحاصل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مذکور مرفوع حدیث بالکل صحیح ہے اور اس کے متعلق یہی فیصلہ جمہور محدثین رحمہم اللہ کا ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

چوتھی دلیل: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں کفار کو شکست دینے اور اُن میں سے ستر (۷۰) کو جہنم رسید کرنے کے بعد جب ان میں سے چوبیس بڑے بڑے کافروں کی لاشیں بدر کے کنوئیں میں ڈالیں تو تیسرے دن آپ وہاں اس کنوئیں کے پاس تشریف لے گئے اور اُس کے کنارے پر کھڑے ہو کر ان میں سے ایک ایک کافر اور اس کے باپ کا نام لے کر فرمایا کہ کیا تمہیں یہ بات خوش کرتی ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی؟ ہمارے ساتھ ہمارے پروردگار نے جو وعدہ کیا تھا وہ تو پورا ہو گیا کیا جو (عذاب وسزا کا) وعدہ تم سے ہوا تھا، وہ پورا ہو گیا یا نہیں؟ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت! کیا آپ ایسے اجسام سے گفتگو فرما رہے ہیں جن میں اَرواح نہیں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”والذی نفس محمد بیدہٖ ما انتم باسمع لما اقول منھم قال قتادۃ احیاھم اللہ حتی اسمعھم قولہ توبیخا و تصغیرا و نقمۃً و حسرۃً و ندمًا“

(بخاری ج ۲ ص ۵۶۶، واللفظ لہٗ و مسلم ج ۲ ص ۳۸۷، مسند احمد ج ۳ ص ۱۰۴، ج ۳ ص ۱۴۵)

اس پروردگار کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے تم اس گفتگو کو جو میں ان سے کر رہا ہوں، اُن سے زیادہ نہیں سنتے۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کلام اُن کو سنایا تا کہ ان کو ڈانٹ، ذِلت وخواری، حسرت اور ندامت حاصل ہو۔“

اس حدیث کی تفسیر وتوضیح میں شرّاح حدیث کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اس حدیث سے مُردوں کے سننے کا جو ثبوت ملتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔ اگر اس کا یہی مطلب متعین ہو تو پھر اس کا عام موتی کے سماع سے تعلق نہیں ہوگا اور اس قول کی بنیاد حضرت قتادہ رحمہ اللہ کی تشریح اور تفسیر پر ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ کی وفات ۱۱۸ھ میں ہوئی۔ وہ فن حدیث میں الحافظ اور العلاّمہ تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۵) لیکن اس کے ساتھ قدری یعنی منکر تقدیر بھی تھے۔ چنانچہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ ہی لکھتے ہیں کہ وہ برملا اپنی یہ رَدّی عقیدہ بیان کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہوتی ہے مگر گناہ اس کی تقدیر سے نہیں ہوتے۔ (ایضاً ج ۱ ص ۱۱۶، ۱۱۷) امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ ان کو چوٹی کا بدعتی (یعنی قدری) کہتے تھے۔ (تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۵۳)

اور محدّثین کرام رحمہم اللہ القدر کا معنی یہ کرتے ہیں کہ: ”وھو زعم ان الشر من خلق العبد“

”اور وہ یہ خیال کرتا ہے کہ شر بندے کی مخلوق ہے۔“ (تدریب الراوی ص ۲۱۹)

اور یہ بدعتی فرقہ معتزلہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ چنانچہ علم الکلام کی مشہور کتاب المواقف اور اس کی شرح میں اس کی تصریح موجود ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۷۴۷ طبع لکھنؤ) اور معتزلہ روافض اور خوارج وغیرہ کا حیوۃ فی القبر کے بارے میں اہل السنت والجماعت سے پہلے ہی اختلاف ہے۔ ہم نے تسکین الصدور میں اس کی کچھ بحث کر دی ہے۔ پھر قتادہ رحمہ اللہ کی یہ تفسیر اور توجیہ اہل السنت پر کیسے حجت ہو سکتی ہے؟ خود مؤلف (شفاء الصدور ص ۷۲) کے حاشیہ میں قتادہ کے قدری ہونے کی تصریح کرتے ہیں۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ حدیث اُن کی خصوصیت پر محمول نہیں ہے بلکہ جس طرح عام دیگر مردے سنتے ہیں۔ اسی طرح مقتولینِ بدر نے بھی سنا۔ چنانچہ اس کی تشریح میں لکھا ہے: ''قال النووی قال المازری قیل ان المیت یسمع عملاً بظاھر ھذا الحدیث و فیہ نظر لانہ خاص فی حق ھؤلاء ورد علیہ القاضی و قال یحمل سماعھم علی ما یحمل سماع الموتی فی احادیث عذاب القبر و فتنتہ التی لا مدفع لھا و ذٰلک باحیائھم او احیاء جزء منھم یعقلون بہ و یسمعون فی الوقت الذی یریدہ اللہ قال الشیخ ھذا ھو المختار ''

(۱۲ طیبی ہامش بخاری ج ۲ ص ۵۶۶، ہامش مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۴۵، عن المرقات والطیبی)

''امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ امام مازری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کہا گیا ہے کہ اس حدیث کے ظاہر کو ملاحظہ کرتے ہوئے میت سنتی ہے لیکن اس میں کلام ہے کیونکہ یہ تو اُنہی لوگوں کے ساتھ مختص ہے مگر قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اس کا رَد کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ ان مقتولین بدر کا سماع اسی پر حمل کیا جائے گا جس طرح احادیث عذاب قبر اور فتنۂ قبر میں عام موتی کے سماع پر محمول ہے۔ کیونکہ ان حدیثوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ ان کو یا ان کی کسی ایسی جزو کو زندہ کیا جاتا ہے جس سے وہ سمجھتے ہیں اور اس وقت سنتے بھی ہیں جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ شیخ صاحب فرماتے ہیں یہی بات مختار ہے۔

حضرت امام نووی رحمہ اللہ کے اصل الفاظ یہ ہیں کہ: ''قال المازری قال بعض الناس المیت یسمع عملاً بظاھر ھذا الحدیث ثم انکرہ المازری وادعی ان ھذا خاص فی ھؤلاء ورد علیہ القاضی عیاض وقال یحمل سماعھم علی ما یحمل علیہ سماع الموتی فی احادیث عذاب القبر و فتنتہ التی لا مدفع لھا و ذٰلک باحیائھم او احیاء جزء منھم یعقلون بہ و یسمعون فی الوقت الذی یرید اللہ ھذا کلام القاضی و ھو الظاھر المختار الذی تقتضیہ احادیث السلام علی القبور واللہ تعالٰی اعلم'' (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۳۸۷)

''علامہ مازری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میت سنتی ہے اور وہ لوگ بظاہر اس حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ پھر مازری رحمہ اللہ نے انکار کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ سماع مقتولینِ بدر سے مخصوص ہے لیکن قاضی عیاض رحمہ اللہ نے ان کا رَد کیا اور فرمایا کہ ان کے سماع کو اسی پر حمل کیا جائے گا جس پر سماعِ موتی کی احادیث دال ہیں جو عذابِ قبر اور فتنۂ قبر سے متعلق ہیں جن کو ٹالا نہیں جا سکتا اور یہ اس طرح کہ ان کو زندہ کیا جائے یا ان کی کسی جزو کو زندہ کیا جائے جس سے وہ سمجھ سکیں اور اس وقت سُن سکیں جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرمائے۔ یہ قاضی عیاض رحمہ اللہ کا کلام ہے اور یہی ظاہر اور مختار ہے جس کو قبور پر سلام کی احادیث چاہتی ہیں اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''و اما سوال السائل ھل یتکلم المیت فی قبرہ فجوابہ انہ

یتکلم و قد یسمع ایضاً من کلمۃ کما ثبت فی الصحیح عن النبی ﷺ انہ قال انھم یسمعون قرع نعالھم الی ان قال و ثبت عنہ فی الصحیح انہ نادٰی المشرکین یوم بدر لما القاھم فی القلیب قال ما انتم باسمع لما اقول منھم و الاٰثار فی ھذا کثیرۃ منتشرۃ و اللہ تعالٰی اعلم'' (فتاوی ابن تیمیہ رحمہ اللہ ج ۶ ص ۲۱۷، طبع مصر)

''بہر حال سائل کا یہ سوال کہ کیا مُردہ قبر میں بولتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بولتا ہے اور کبھی کلام کرنے والے کی بات کو سنتا بھی ہے جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بے شک وہ واپس آنے والوں کی جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ سنتا ہے۔ (پھر آگے فرمایا) اور آپ سے صحیح حدیث کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ نے بدر کے دن جبکہ مشرکین کی لاشیں کنوئیں میں ڈالیں آواز دی اور (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے) فرمایا کہ میں ان سے جو گفتگو کر رہا ہوں تم اس کو ان سے زیادہ نہیں سن رہے اور اس سلسلہ میں (کہ سماع موتی ہے) بکثرت حدیثیں موجود ہیں جو (کتب حدیث میں) پھیلی ہوئی ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔

علامہ علی بن عبد الکافی السبکی رحمہ اللہ نے بھی سماع موتی پر اس روایت: ''ما انتم بالسمع لما اقول منھم'' سے استدلال کیا ہے۔ (شفاء السقام ص ۱۴۷)

حضرت مولانا امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۱۷ھ) نے فرمایا کہ آیت: ''انک لا تسمع الموتی'' میں نفی حواس خمسہ ظاہرہ سے مراد ہے نہ کہ مطلقاً اسماع اور استماع موتی حواس باطنیہ سے پیغمبروں و اولیاء کرام کو ممکن ہے جیسے کہ حدیث قلیب میں مصرّح ہے۔ (شمائم امدادیہ ص ۷۲)

حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ نے گو حواس باطنیہ سے سماع تسلیم کیا ہے مگر قلیب بدر کی حدیث سے عموم سمجھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علامہ قاضی عیاض، امام نووی اور حافظ ابن تیمیہ وغیرہ (رحمہم اللہ) کے نزدیک اس حدیث میں سماع موتی کا مسئلہ مقتولینِ بدر ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ عام ہے اور دیگر بعض اکابر علماء نے بھی اس سے تعمیم ہی سمجھی ہے۔ چند حوالے ملاحظہ ہوں۔

الامام العلاّمہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی رحمہ اللہ (المتوفی ۶۷۱ھ) سماع موتی پر بحث کرتے ہوئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا آیت کریمہ: ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' سے نفی سماع موتی پر استدلال نقل کرنے کے بعد آخر میں اپنا فیصلہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''و قد عورضت ھذہ الاٰیۃ بقصۃ بدر و بالسلام علی القبور و بما روی فی ذٰلک من ان الارواح تکون علٰی شفیر القبور فی اوقات و بانّ المیّت یسمع قرع النعال اذا انصرفوا عنہ الٰی غیر ذٰلک فلو لم یسمع المیّت لم یسلّم علیہ و ھذا واضح و قد بیّناہ فی کتاب التذکرۃ''

(تفسیر قرطبی الموسوم بہ الجامع لاحکام القرآن ج ۱۳ ص ۲۳۲، طبع مصر)

''اس آیت کریمہ کے معارضہ میں بدر کا واقعہ اور قبر پر سلام کہنے کی روایات اور وہ جو روایت کیا گیا ہے کہ اَرواح بعض اوقات قبروں کے کنارے پر ہوتے ہیں اور یہ کہ میت واپس جانے والوں کی جوتیوں کی آواز سنتی ہے، وغیرہ دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ پس اگر مُردہ نہ سنتا ہو تو اُس کو سلام نہ کہا جاتا اور یہ بالکل واضح ہے اور ہم نے اپنی کتاب تذکرہ میں اس کو صراحت سے بیان کیا ہے۔''

اس عبارت سے ایک بات تو یہ ثابت ہوئی کہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی سماع موتی کا مسئلہ صرف

مقتولینِ بدر کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ یہ سماع عام ہے جیسا کہ ان کی عبارت سے ظاہر ہے اور دُوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ جن لوگوں نے علامہ قرطبی رحمہ اللہ کو سماع موتی کے منکرین میں شمار کیا ہے، وہ سخت غلطی پر ہیں اور یہ عبارت ان کی تردید کے لئے کافی ہے جیسا کہ کسی بھی صاحبِ فہم اور منصف مزاج سے مخفی نہیں ہے۔

علامہ عبدالعلی بحرالعلوم الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۳۵ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ: ''وما قیل ان التلقین لغو لان المیّت لا یسمع فهذا باطل لانه قد ورد فی الحدیث الصحیح ان المیّت اسمع لصوت النعال من الاحیاء و رسول اللہ ﷺ قد نادی الکفرة الملقین فی قلیب بدر وقال انهم یسمعون ولا یقدرون علی الجواب لما لحقهم من العذاب الشدید'' (رسائل الارکان ص ۱۵۰، طبع لکھنؤ)

''اور جو یہ کہا گیا ہے کہ تلقین لغو ہے کیونکہ مُردہ نہیں سُنتا تو یہ کہنا باطل ہے کیونکہ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ میّت جوتیوں کی آواز کو بہ نسبت زندوں کے بھی زیادہ سنتی ہے اور جناب رسول اللہ ﷺ نے اُن کفار کو جو بدر کے کنوئیں میں ڈالے گئے تھے۔ آواز دی تھی اور آپ نے فرمایا کہ بلاشبہ وہ سنتے ہیں لیکن چونکہ ان کو سخت عذاب ہو رہا ہے اس لئے جواب دینے پر قادر نہیں ہیں۔''

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ علامہ بحرالعلوم رحمہ اللہ سماع موتی کے قائل تھے نہ کہ منکر (جیسا کہ مؤلف ندائے حق نے ص ۱۵۳ میں منکرینِ سماعِ موتی میں اُن کا نام دیا ہے) اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اصحابِ بدر کے اس واقعہ کو صرف اُن ہی کے ساتھ مختص نہیں سمجھتے بلکہ وہ اس سے تعمیم مُراد لے رہے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) سے سوال ہوا جس کا جواب انہوں نے یہ دیا:

''سوال: انسان را بعد موت ادراک و شعور باقی میماند و زائران خود رامے شناسد و سلام و کلام ایشاں را شنو دیانے؟

جواب: انسان را بعد موت ادراک باقی میماند بر ایں معنی شرع شریف و قواعد فلسفی اجماع دارند اما در شرع شریف پس عذاب قبر و تنعیم بتواتر ثابت است و تفصیل ان دفتر طویل مے خواهد و کتاب شرح الصدور فی احوال الموتی والقبور که تصنیف شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ است و دیگر کتب حدیث باید دید و در کتب کلامیه اثبات عذاب القبر مینمایند حتّٰی که بعض اهل کلام مُنکر آں را کافر مے دانند و عذاب و تنعیم بغیر ادراک و شعور نمے تواند شد و نیز در احادیث صحیحه مشهوره در باب زیارت قبور و سلام بر موتی و همکلامی بآنها که انتم سلفنا و نحن بالاثر و انا ان شاء اللہ بکم لاحقون ثابت است و در بخاری و مسلم موجود است که آنحضرت ﷺ با مقتولین بدر (بعض نسخوں میں کتابت کی غلطی سے ''شہداء بدر'' لکھا گیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ صفدرؔ) خطاب فرمودند هل وجدتم ما وعد ربکم حقا مردم عرض کردند یا رسول اللہ اتتکلم من اجساد لیس فیها ارواح (بعض نسخوں میں کتابت کی غلطی سے رُوح کا لفظ لکھا گیا ہے) فرمودند ما انتم باسمع منهم ولکنهم لا یجیبون ''الی ان قال'' بالجملة انکارِ شعور و ادراک اموات اگر کفر نه باشد در الحاد بودن او را اشبه نیست''

(فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۸۸، فارسی و ج ۱ ص ۱۸۵، مترجم اُردو ص ۱۸۶)

''سوال: کیا موت کے بعد انسان کے لئے ادراک وشعور باقی رہتا ہے؟ اور وہ اپنی زیارت کرنے والوں کو پہچانتا ہے اور ان کا سلام وکلام سنتا ہے یا نہیں؟

جواب: موت کے بعد انسان کا ادراک باقی رہتا ہے۔ اس نظریہ پر شرح شریف اور قواعد فلسفی کا اجماع ہے۔ رہا شرح شریف کا معاملہ، تو قبر کا عذاب وراحت تواتر سے ثابت ہے اس کی تفصیل کے لئے طویل دفتر درکار ہیں اور امام سیوطی رحمہ اللہ کی کتاب ''شرح الصدور فی احوال الموتی والقبور'' اور دوسری کتابیں دیکھنی چاہئیں اور علم کلام کی کتابوں میں اثبات عذاب قبر ملاحظہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ بعض متکلمین نے اس کے منکر کو کافر شمار کیا ہے اور قبر کی سزا و راحت بغیر ادراک وشعور کے نہیں ہوسکتی اور نیز صحیح ومشہور حدیثیں قبور کی زیارت کے باب میں اور مُردوں سے سلام اور ہم کلام ہونے کے بارے میں مثلاً یہ کہ تم ہمارے پیش رو ہو اور ہم تمہارے تابع ہیں اور ہم إن شاء اللہ تعالیٰ تم سے ملنے والے ہیں، ثابت ہیں اور بخاری ومسلم میں موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مقتولینِ بدر سے خطاب فرمایا کہ کیا تم نے وہ کچھ پالیا جو تمہارے ساتھ رب نے وعدہ کیا تھا؟ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ ایسے اجسام سے کلام فرمارہے ہیں جن میں اَرواح نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ تم ان سے زیادہ نہیں سُن رہے اور لیکن وہ جواب نہیں دیتے۔ (پھر آگے فرمایا کہ) بالجملہ اموات کے شعور وادراک کا انکار اگر کفر نہیں تو اس کے الحاد ہونے میں تو شبہ ہی نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ وہ بھی مقتولینِ بدر کے ساتھ سماع کو مخصوص نہیں کرتے بلکہ اس سے تعمیم مُراد لیتے ہیں اور مُردوں کے ادراک وشعور پر کافی زور دے رہے ہیں۔

علامہ سمہودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''انما نعتقد ثبوت الادراکات کالعلم والسماع لسائر الموتی فضلاً عن الانبیاء ویقطع بعود الحیوۃ لکل میت فی قبرہ کما ثبت فی السنۃ'' الی ان قال ''لکن یکفی فیہ حیوۃ جزء یقع بہ الادراک فلا یتوقف علی البنیۃ کما زعم المعتزلہ'' (وفاء الوفی ج ۲ ص ۴۰۷)

''یقینی بات ہے۔ ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا تو پوچھنا ہی کیا، علم اور سننے وغیرہ کے ادراکات تو تمام مُردوں کے لئے ثابت ہیں اور یقینی بات ہے کہ ہر میّت کی طرف قبر میں زندگی لوٹ کر آتی ہے، جیسا کہ سُنّت سے ثابت ہے۔ (پھر آگے فرمایا) لیکن (عام اموات کے لئے) ایسی جزو کی حیات کافی ہے جس سے ادراک ہوسکے۔ سو یہ جسمانی ڈھانچے پر موقوف نہیں ہے جیسا کہ معتزلہ کا (باطل) خیال ہے۔

''مؤلف ''شفاء الصدور'' نے (ص ۱۱۱ سے ص ۱۱۹) تک مُردوں اور زندوں میں چوالیس فرق بیان کئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مُردوں کو کفن پہنایا جاتا ہے، زندوں کو نہیں پہنایا جاتا، مُردوں کا مرثیہ ہوتا ہے زندوں کا نہیں۔ زندے وارث ہوتے ہیں، مُردے نہیں ہوتے۔ وغیرہ وغیرہ! مگر ہم اس لایعنی اور غیر ضروری بحث میں اپنا وقت ضائع کرنا اور عام مسلمانوں کے ذہن کو مشوش کرنا پسند نہیں کرتے۔ ہم ارخاء عنان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چلو سب فرق صحیح ہیں لیکن ادراک وشعور فہم وسماع میں مُردے اَور زندے برابر ہیں۔ اصل گُر کی بات ہی یہی ہے جیسا کہ اس پر بے شمار حوالے عرض کردیئے گئے ہیں۔ قاضی شوکانی رحمہ اللہ اور علامہ عثمانی رحمہ اللہ کا حوالہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے۔

نواب صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''وجملہ اموات از مؤمنین وکفار در حصولِ علم وشعور وادراک وسماع وعرض اعمال ورد جواب بر زائر برابر اند تخصیص بہ انبیاء وصلحا نیست''

(دلیل الطالب علی ارجح المطالب ص ۸۴۰)

"تمام مُردے مؤمن ہوں یا کافر، حصولِ علم، شعور، ادراک، سماع، عرض اعمال اور زیارت کرنے والے کے سلام کے جواب لوٹانے میں برابر اور یکساں ہیں۔ ان اُمور کی تخصیص محض حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور صلحاء کے ساتھ ہی نہیں ہے۔"

ان اکابر کے علاوہ بھی بہت سے حضرات یہی فرماتے ہیں۔ چنانچہ علامہ آلوسی الحنفی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہ: "و ذهب طوائف من اهل العلم الى سماعهم فى الجملة وقال ابن عبدالبر ان الاكثرين على ذلك وهو اختيار ابن جرير الطبرى و كذا ذكره ابن قتيبه و غيره واحتجوا بما فى الصحيحين عن انس عن ابى طلحة رضی اللہ عنہ قال لما كان يوم بدر و ظهر عليهم يعنى مشركى قريش رسول الله ﷺ امر ببضعة و عشرين رجلاً وفى رواية اربع وعشرين رجلاً من صناديد قريش فالقوا فى طوى اى بئر من اطواء بدر وان رسول الله ﷺ ناداهم يا اباجهل بن هشام يا امية بن خلف يا عتبة بن ربيعة اليس قد وجدتم ما وعدكم ربكم حقا فانى قد وجدت ما وعد ربى حقا فقال عمر رضی اللہ عنہ يا رسول الله ما تكلم من اجساد لا ارواح لها فقال والذى نفس محمد بيده ما انتم باسمع لما اقول منهم و زاد۔ فى رواية لمسلم عن انس رضی اللہ عنہ، و لكنهم لا يقدرون ان يجيبوا"

(روح المعانی ج ۶ ص ۴۵۴)

"اہل علم کے کئی طائفے اس طرف گئے ہیں کہ مُردے فی الجملہ سنتے ہیں۔ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ علماء کی اکثریت اسی پر ہے اور اسی کو امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور اسی طرح امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے اور ان حضرات نے بخاری اور مسلم کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس کو حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا کہ جب بدر کا دن تھا اور آنحضرت ﷺ مشرکین قریش پر غالب آ گئے تو آپ نے بیس سے زائد سردارانِ قریش کے بارے میں ایک اور روایت میں آتا ہے کہ چوبیس کے بارے میں حکم دیا کہ ان کو بدر کے کنوؤں میں سے ایک کنوئیں کے اندر ڈال دو اور آنحضرت ﷺ نے ان کے نام لے لے کر ان کو پکارا اور فرمایا: اے ابوجہل بن ہشام، اے اُمیّہ بن خلف، اے عتبہ بن ربیعہ کیا تم نے وہ چیز پالی جو تمہارے ساتھ تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا، بے شک میں نے وہ سب کچھ پالیا جو میرے ساتھ میرے رب نے وعدہ کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! آپ ایسے جسموں سے گفتگو فرما رہے ہیں جن میں اَرواح ہی نہیں۔ آپ نے فرمایا: اِس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ میں جو کچھ ان سے کہہ رہا ہوں تم اس کو ان سے زیادہ نہیں سُن رہے اور مُسلم کی روایت میں حضرت اُنس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اور لیکن وہ اس پر قادر نہیں کہ جواب دے سکیں۔"

بقول امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ سماع موتیٰ کے قائل اکثر حضرات ہیں اور ان ہی میں امام ابن جریر الطبری رحمہ اللہ بھی ہیں اور ان سب حضرات نے اپنے دلائل میں قلیب بدر والی حدیث بھی پیش کی ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

علامہ داؤد بن سلیمان البغدادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اگرچہ ان کے سماع کا انکار کیا ہے مگر وہ اس میں معذور ہیں۔

"قال ابن تيمية رحمہ اللہ فى كتاب الانتصار للامام احمد رحمہ اللہ و انكار عائشة رضی اللہ عنہا سماع اهل القليب الكفار معذورة فيه لعدم بلوغها النص و غيرها لا يكون معذورًا مثلها لان هذه المسئلة صارت معلومة من الدين بالضرورة"

(المنحة الوهبية ص ۱۳)

''امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ کی نصرت میں جو کتاب لکھی ہے (جس کا نام الانتصار لِلا مام احمد رحمہ اللہ ہے) اس میں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے قلیب بدر کے کفار کے سماع کا جو اِنکار کیا ہے وہ اس میں معذور ہیں کیونکہ وہ اس موقع پر موجود نہ تھیں اور ان کو یہ ارشاد نہیں پہنچا اور دوسرے اُن کی طرح معذور نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ یہ مسئلہ ضروریاتِ دین کی طرح معلوم ہو گیا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ سماعِ موتٰی کے مسئلے کو ضروریاتِ دین کے مسائل میں شمار کرتے ہیں۔

پانچویں دلیل: امام سیوطی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''واخرج العقیلی عن ابن ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال ابو رزین رضی اللہ عنہ یا رسول اللہ ان طریقی علی الموتٰی فھل من کلام اتکلم بہ اذا مررت علیھم قال قل السلام علیکم یا اھل القبور من المسلمین والمؤمنین انتم لنا سلف ونحن لکم تبع وانا انشاء اللہ بکم لاحقون قال ابو رزین یا رسول اللہ یسمعون قال یسمعون ولٰکن لا یستطیعون ان یجیبوا قال یا ابا رزین الا ترضٰی ان یرد علیک بعددھم من الملائکۃ'' (شرح الصدور ص ۸۴، طبع مصر)

''امام عقیلی رحمہ اللہ نے حضرت ابوہُریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی تخریج کی ہے کہ حضرت ابورزین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یارسول اللہ میرا راستہ مُردوں کے پاس (یعنی قبرستان) سے گزرتا ہے۔ پس کیا میں ان کے پاس سے گزرتے ہوئے کوئی کلام کیا کروں؟ آپ نے فرمایا: تم یہ کہو۔ سلام ہو تم پر اے اہلِ قبور، جو مسلمان اور مؤمن ہو۔ تم ہمارے پیشرو ہو اور ہم تمہارے تابع ہیں اور ہم بھی اِن شاء اللہ تعالیٰ تم سے ملنے والے ہیں۔ حضرت ابورزین رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا وہ سنتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! سنتے ہیں مگر وہ جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ آپ نے فرمایا: اے ابورزین (رضی اللہ عنہ) کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ تم جتنے مُردوں کو سلام کہو اتنی ہی تعداد میں فرشتے تمہیں جواب دیں۔

اس حدیث سے بصراحت یہ معلوم ہوا کہ اہلِ قبور اپنی قبروں میں باہر سے سلام کہنے والے کا سلام سنتے ہیں۔ ہاں! اس حدیث کے آخری حصہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے مگر اسی حدیث کے بعد امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''قولہ لا یستطیعون ان یجیبوا ای جوابا یسمعہ الجن والانس فھم یردون حیث لا یسمع'' (شرح الصدور ص ۸۴)

''آپ کے اس ارشاد کا کہ وہ جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا جواب کہ جس کو جن اور اِنسان سُن سکیں۔ مُردے جواب تو دیتے ہیں مگر وہ (عادۃً) سنا نہیں جاتا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ مُردے سلام سننے کے بعد اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔ مگر مکلّف مخلوق جن و اِنس (جن کو ثقلین سے تعبیر کیا جاتا ہے) اس جواب کو نہیں سنتے۔ اگر یہ عادۃً سُن لیتے تو ایمان بالغیب نہ رہتا۔ حالانکہ یہی ان سے مطلوب و مقصود تھا کہ وہ دیکھتے اور سنتے تو کچھ نہیں مگر بلا چون و چرا وہ سب نصوص پر ایمان رکھتے ہیں۔ بعض حضرات نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کی سند میں محمد بن اشعث ہے جو مجہول ہے اور امام عقیلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی حدیث محفوظ نہیں ہے۔ (لسان ج ۵ ص ۸۴) بجا ہے مگر دیگر صحیح روایات اور اُمّت کا تعامل اس سے استدلال کا مؤید ہے اور یہ اس قدر کمزور نہیں کہ اس کو سرے سے نظر انداز کر دیا جائے اور جس مسئلہ کے اثبات کے لئے یہ حدیث پیش کی جاتی ہے وہ خود اختلافی مسئلہ ہے اور بنیادی عقائد اور حلال و حرام کے احکام سے نہیں ہے۔

علامہ آلوسی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وما اخرجه العقیلی من انهم یسمعون السلام ولا یستطیعون ردّه محمول علی نفی استطاعة الردّ علی الوجه المعهود الذی یسمعه الاحیاء'' (روح المعانی ج۲۱ ص۵۸)

''اور جس حدیث کی امام عقیلی رحمہ اللہ نے تخریج کی ہے کہ مُردے سلام تو سنتے ہیں لیکن جواب رَد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس پر محمول ہے کہ معہود طریقہ سے رَد کی طاقت نہیں رکھتے کہ اس جواب کو زندہ لوگ سن سکیں۔''

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سوال: نوزدهم سماعتِ موتی سلام زائر در شرح آمد یانه؟

جواب: سماعتِ موتی سلام زائر را در شرع مشکوۃ لاعلی القاری رحمہ اللہ از سیوطی رحمہ اللہ نقل نموده هکذا عبارته قال السیوطی رحمہ اللہ واخرج العقیلی عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ'' (مائۃ مسائل ص۳۴)

''اُنیسواں سوال: کیا قبور کی زیارت کرنے والے کے سلام کو مُردوں کے لئے سننے کا ثبوت شریعت سے ثابت ہے یا نہیں؟

جواب: مُردوں کا زیارت کرنے والے کے سلام کے سننے کا ثبوت مُلّا علی قاری رحمہ اللہ نے شرح مشکوۃ میں امام سیوطی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے اور امام سیوطی رحمہ اللہ کی عبارت اس طرح ہے کہ امام عقیلی رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث کی تخریج کی ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے وہ پوری حدیث نقل کی ہے جو اُوپر شرح الصدور کے حوالہ سے نقل کی جا چکی ہے۔ اس سے بصراحت معلوم ہوا کہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ بھی مُردوں کے لئے سماع سلام کے قائل ہیں اور اسی کو فی الجملہ سماع کہا جاتا ہے۔ مؤلف نے (ندائے حق ص ۱۵۳) میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ کو بھی مطلقاً منکرین سماعِ موتی میں شمار کیا ہے جو قطعاً غلط ہے۔

نوٹ: ان کے اس ارشاد کی تحقیق کہ: ''نزد اکثر حنفیہ سماعت موتی ثابت نیست۔'' اپنے مقام پر آ رہی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ!

چھٹی دلیل: امام ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ (جن کا نام عبداللہ تھا اور وہ الحافظ عدیم النظیر، الثبت اور النحریر تھے۔ ۲۳۵ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۸) فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہ بن موسیٰ رحمہ اللہ نے بیان کیا (یہ صحاح ستہ کے راوی اور ثقہ تھے۔ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۵۲) وہ ابن ابی ذئب رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ (ان کا نام محمد بن عبدالرحمن بن المغیرہ تھا۔ یہ بھی صحاح ستہ کے رواۃ میں تھے اور ثقہ تھے۔ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۰۳) وہ قرہ رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ (یہ قرہ بن خالد سدوسی رحمہ اللہ ہیں جن سے صحاح ستہ کے جملہ مصنفین نے روایت لی ہے اور وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۷۲) اور وہ عامر بن سعد رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ (علامہ ابن سعد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور محدث عجلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۶۴)

وہ اپنے والد ماجد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: ''انه کان یرجع من ضیعته فیمر بقبور الشهداء فیقول السلام علیکم وانا بکم للاحقون ثم یقول لاصحابه الا تسلمون علی الشهداء فیردون علیکم'' (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۴ ص ۱۳۸، طبع ملتان وشرح الصدور ص ۹۴، طبع مصر)

''وہ جب اپنی زمین اور کھیتی سے واپس آتے اور شہداء کی قبروں کے پاس سے گزرتے تو فرماتے السلام علیکم اور بے شک ہم بھی تم سے ملنے والے ہیں۔ پھر اپنے ساتھیوں سے فرماتے کہ کیا تم شہداء کو سلام نہیں کہتے تاکہ وہ تمہیں تمہارے سلام کا جواب لوٹائیں۔''

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو عشرۂ مبشرہ میں سے ایک جلیل القدر، صاحب منقبت اور مستجاب الدعوات صحابی تھے ان کا بھی یہ نظریہ تھا کہ شہداء زندوں کا سلام سنتے اور ان کو جواب دیتے ہیں کیونکہ ان کے سامنے وہ صریح اور صحیح حدیثیں تھیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مُردوں کو سلام کہنے اور اُن کی طرف سے جواب لوٹانے کا ذکر فرمایا ہے اور یہ تمام احادیث اپنی حقیقت پر محمول ہیں تو پھر جلیل القدر صحابی ان کی خلاف ورزی کیسے کر سکتے تھے؟

ساتویں دلیل: پہلے یہ بات بحوالہ فتاویٰ رشیدیہ عرض کی جا چکی ہے کہ تلقین میت میں حنفیہ باہم مختلف ہیں۔ جو گروہ سماعِ موتٰی کا قائل ہے وہ تلقین کا بھی قائل ہے اور چونکہ دفن کے بعد بہت سی روایات اثباتِ سماع کرتی ہیں۔لہٰذا تلقین میت اسی پر مبنی ہے۔(محصلہ) اور یہ تلقین اسی وجہ سے ہے کہ میّت قبر میں سنتی ہے، وَرنہ یہ کارروائی بیکار ہے۔

علّامہ ابراہیم حلبی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۹۵۶ھ) کہتے ہیں کہ:''وانما لا ینهی عن التلقین بعد الدفن لانه لا ضرر فیه بل فیه نفع فان المیّت یستأنس بالذکر علی ما ورد فی الاٰثار ففی صحیح مسلم عن عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص'' (غنیۃ المستملی ص ۵۳۳، طبع دیوبند)

''بلا شبہ دفن کے بعد تلقین سے نہ منع کیا جائے کیونکہ اس سے ضرر تو کچھ ہے نہیں بلکہ اس میں فائدہ اور نفع ہے۔ کیونکہ میّت ذکر سے مانوس ہوتی ہے جیسا کہ آثار میں آیا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔''

اِس کے بعد انہوں نے مسلم کی روایت بھی نقل کی ہے اور اس کے علاوہ کچھ اور آثار بھی نقل کئے ہیں۔ چنانچہ مسلم کی اس روایت کے آخر میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فاتح مصر (المتوفی ۴۳ھ) نے فرمایا کہ:''فاذا دفنتمونی فَسُنُّوا علی التراب سنّا ثم اقیموا حول قبری قدر ما تنحر جزور و یقسم لحمها حتی استأنس بکم و انظر ماذا اراجع به رُسل ربی'' (مسلم ج ۱ ص ۷۶، واللفظ لہ و ابوعوانہ ج ۱ ص ۷۱)

''جب تم مجھے دفن کر چکو تو مجھ پر مٹی ڈالو پھر میری قبر کے پاس اتنا وقت ٹھہرے رہو جس میں اُونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جا سکتا ہو، تاکہ میں تمہاری وجہ سے مانوس ہو کر سوچ سکوں کہ اپنے رب کے فرشتوں کو کیا جواب دوں۔''

اس کتاب کے (ص ۲۸ تا ۳۰) میں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ، شیخ بدرالدین العینی رحمہ اللہ اور کتاب ''الدرر السنیة فی الاجوبة النجدیة'' کے حوالوں سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ قبر کے پاس حاضر ہونے والے کو صاحب قبر جانتا اور اس سے مانوس ہوتا ہے، اور دفن کے بعد قبر پر ٹھہرنا اور اس کے ثابت قدم رہنے کی دُعا کرنا ثابت ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:''کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا فرغ من دفن المیّت وقف علیه فقال استغفروا لاخیکم ثم سلوا له التثبت فانه الاٰن یسئل'' (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۰۳، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۶)

''کہ آنحضرت ﷺ جب میت کے دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو اس کی قبر پر ٹھہرتے اور فرماتے اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو اور اس کے لئے ثابت قدم رہنے کی دُعا کرو کیونکہ اب اس سے سوال ہوگا۔''

یہ سب باتیں صاحب قبر کے احساس وشعور پر دال ہیں، ورنہ قبر کے پاس دُعا کرنے کی کوئی خصوصیت نہیں۔ دُعا دُور سے بھی پہنچتی ہے۔

امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (المتوفی ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں کہ: ''واخرج الطبرانی فی الکبیر و ابن مندۃ عن ابی امامۃ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ ﷺ قال اذا مات احد من اخوانکم فسویتم علیہ التراب فلیقم احدکم علٰی رأس القبر ثم لیقل یا فلان بن فلانۃ فانہ یسمعہ ولا یجیب'' (شرح الصدور ص ۴۴، ومختصر تذکرۂ قرطبی رحمہ اللہ ص ۳۱، وقال الحافظ فی التلخیص ج ۲ ص ۱۳۵، واسنادہ صالح وقد قواہ الضیاء فی احکامہ)

''امام طبرانی رحمہ اللہ نے ''معجم کبیر'' میں اور اِسی طرح حافظ ابن مندہ رحمہ اللہ نے حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت کی تخریج کی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب تمہارے بھائیوں میں سے کوئی فوت ہوجائے اور تم اس پر مٹی ڈال کر قبر درست کرچکو تو تم میں سے ایک اس کی قبر کے سرہانے کھڑا ہوکر یہ کہے۔ اے فُلاں بن فُلاں کے بیٹے! کیونکہ بلاشک وہ سنتا ہے لیکن وہ جواب نہیں دے سکتا (جس کو تم سُن سکو) اس کی اسناد صالح ہے اور محدّث ضیاء رحمہ اللہ نے ''احکام'' میں اس کو قوی بتایا ہے۔''

اگرچہ اس حدیث کی بعض محدثین کرام رحمہم اللہ نے تضعیف کی ہے لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کی سند کو صالح کہتے ہیں اور مشہور محدّث ضیاء الدین ابوعبداللہ محمد بن عبدالواحد المقدسی الحنبلی رحمہ اللہ (المتوفی ۶۴۳) جو الامام العالم الحافظ الحجۃ اور محدّث شام تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۹۰) علّامہ برزالی رحمہ اللہ ان کو ثقہ جبل حافظ دین اور امام ابن النجار رحمہ اللہ ان کو حافظ متقن حجۃ عالم بالرجال کہتے ہیں۔ (ایضاً ص ۱۹۱) بھی اس حدیث کو قوی کہتے ہیں اور اس کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ التلخیص میں کہتے ہیں کہ اس کے کئی شواہد موجود ہیں۔ (ملاحظہ ہو ج ۲ ص ۱۳۶) اور پھر جمہور اُمت کے اس پر عمل سے اس کو تقویب حاصل ہے۔

چنانچہ حافظ ابن القیم الحنبلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''ویدل علی ھذا (ایضاً) ماجری علیہ عمل الناس قدیمًا الی الآن من تلقین المیّت فی قبرہ ولولا انہ یسمع ذٰلک و ینتفع بہ لم یکن فیہ فائدۃ و کان عبثًا و قدسئل عنہ الامام احمد رحمہ اللہ فاستحسنہ واحتج علیہ بالعمل و یروٰی فیہ حدیث ضعیف ذکرہ الطبرانی فی مُعجمہ من حدیث ابی امامۃ رضی اللہ عنہ ''الٰی ان قال فھذاالحدیث و ان لم یثبت فاتصال العمل بہ فی سائر الامصار والاعصار من غیر انکار کاف فی العمل بہ وما اجری اللہ سبحانہ الحادۃ قط بان امۃ طبقت مشارق الارض و مغاربھا و ھی اکمل الامم عقولاً واوفرھا معارف تطبق علی مخاطبۃ من لا یسمع ولا یعقل و تستحسن ذٰلک ولا ینکرہ منھامنکر بل سنہ الاولٰی للآخر و یقتدی فیہ الآخر بالاوّل''

(کتاب الروح ص ۱۴، طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن)

''اور قبر میں میت کی تلقین کے جواز کی اس کارروائی پر یہ بات بھی دلالت کرتی ہے کہ قدیم سے اس وقت تک لوگوں کا عمل اس پر چلا آرہا ہے اور اگر مُردہ اس کو نہ سنتا ہو اور اس سے اس کو فائدہ حاصل نہ ہوتا ہو تو یہ ایک

بے فائدہ اور عبث کارروائی ہوگی اور امام احمد رحمہ اللہ سے اس بارے میں سوال ہوا تو انہوں نے اس کو مستحسن سمجھا اور اس پر انہوں نے دلیل یہ پیش کی کہ اس پر بدستور عمل چلا آرہا ہے اور اس سلسلہ میں ایک ضعیف حدیث بھی مروی ہے جس کا امام طبرانی رحمہ اللہ نے اپنے معجم میں حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے۔ (اس کے بعد انہوں نے یہی روایت نقل کی جو ہم نے ابھی شرح الصدور وغیرہ کے حوالہ سے عرض کی ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں) پس یہ حدیث اگرچہ ثابت[1] نہیں۔ (لیکن حدیث حَسن سے بھی جمہور کے نزدیک احتجاج درست ہے اور بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یہ روایت صالح ہے۔ کما مر!) لیکن تمام شہروں اور سب زمانوں میں بغیر اِنکار کے اس پر عمل کا اتصال اس پر عمل کے لئے کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کی یہ عادت کبھی جاری نہیں رہی کہ تمام اُمتوں سے عقل کے لحاظ سے بہتر اُمت اُور وافر معارف سے شناسا اُمت زمین کے مشرق سے مغرب تک اس پر متفق ہو جائے کہ وہ ایسی ذات کو مخاطب بنائے کہ نہ تو وہ سنتی ہے اُور نہ جانتی ہے اور پھر اس کو وہ اچھا بھی سمجھے اُور کوئی منکر اس کا انکار بھی نہ کرے بلکہ پہلا اس کو بعد میں آنے والے کے لئے مسنون قرار دے اور بعد کو آنے والا پہلے کی اقتداء کرے۔''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے (زاد المعاد ج ۱ ص ۱۴۵، طبع مصر) میں اس روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا رفع صحیح نہیں لیکن امام اثرم رحمہ اللہ نے جب امام احمد رحمہ اللہ سے اس کارروائی کا ثبوت طلب کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اہلِ شام (جو اس وقت سنت کا مرکز تھا) ایسا کرتے ہیں۔ (محصلہ) یعنی حدیث کے ضُعف کو تعامل سے پورا کیا۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی یہ عبارت بہت سے فوائد پر مشتمل ہے۔ چند یہ ہیں:

(۱) امام اہل السنت والجماعت حضرت احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی تلقین میت کے قائل تھے بلکہ وہ اس کو مستحسن سمجھتے تھے۔

(۲) حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کے دَور تک (جن کی وفات ۷۵۱ھ میں ہوئی) قدیم سے تمام شہروں اور سب زمانوں میں اس پر اُمت کا تعامل چلا آرہا ہے۔

(۳) بلکہ بقول ان کے مشرق سے مغرب تک اس پر اُمت کا اتفاق رہا ہے۔

(۴) اور کسی منکر نے اس کا انکار نہیں کیا۔

(۵) یہ حدیث اگرچہ ثابت نہیں مگر اُمت کے تعامل سے اس کا اعتبار ہے۔

اس روایت کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے عبید بن مرزوق کے مرسل سے ابوالشیخ کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ ایک عورت مسجدِ نبوی میں جھاڑو دیتی تھی۔ اس کی وفات ہوگئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی وفات کا علم نہ ہوسکا۔ وہ دفن ہو چکی اور آپ اس کی قبر کے پاس سے گزرے تو فرمایا کہ یہ قبر کس کی ہے؟

---

[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''نتائج الافکار'' میں لکھتے ہیں کہ: ''لایلزم من نفی الثبوت ثبوت الضعف لاحتمال ان یراد بالثبوت الصحة فلا ینتفیَ الحسن'' (ترجمہ: ''نفی ثبوتِ حدیث سے اس کا ضعف ثابت نہیں ہوتا کیونکہ احتمال ہے کہ ثبوت سے صحت مراد ہو (یعنی یہ حدیث صحت کو نہیں پہنچتی) تو اس سے حُسن ہونے کی نفی نہیں ہوتی)'' حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اس فنی نقطہ سے معلوم ہوا کہ نفی ثبوت سے ثبوتِ ضعف لازم نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ حدیث صحت کو تو نہ پہنچتی ہو لیکن حُسن کے درجہ کو پہنچ جائے اور اسی کو صالح سے تعبیر کرلیا گیا ہے اور حُسن حدیث بھی جمہور کے نزدیک قابل احتجاج ہے۔''

''فقالوا ام محجن قال علیہ السلام التی کانت تقم المسجد؟ قالوا نعم فصف الناس فصلّی علیها فقال علیہ السلام ای العمل وجدتِ افضل؟ قالوا یا رسول اللہ اتسمع؟ قال علیہ السلام ما انتم باسمع منها فذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انها اجابتهٔ قم المسجد'' (رُوح المعانی ج۲۱ ص۴۹)

''حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یہ اُم محجن رضی اللہ عنہا کی قبر ہے۔آپ نے فرمایا کہ وہ جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی؟ انہوں نے کہا ہاں حضرت وہی لوگوں نے صف باندھی اور آپ نے اُس کا جنازہ پڑھایا (جو آپ کی خصوصیت تھی یا اس کے لئے اجتماعی صورت میں دُعا کی) آپ نے اس بی بی سے دریافت کیا کہ تُو نے کون سا عمل افضل پایا؟ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: یارسول اللہ! کیا وہ سنتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ: تم اُس سے زیادہ نہیں سُن رہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ: اُس نے جواب یہ دیا ہے کہ میں نے مسجد کی صفائی افضل عمل پایا۔''

یہ روایت اگرچہ مرسل ہے لیکن مرسل کے بارے میں حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ کا فیصلہ یہ ہے۔ علامہ جزائری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مراسیل سے گزشتہ زمانے میں علماء احتجاج کیا کرتے تھے۔ مثلاً امام سفیان ثوری، امام مالک اور امام اوزاعی رحمہم اللہ۔ جب امام شافعی رحمہ اللہ آئے تو انہوں نے مرسل کی حُجیت میں کلام کیا۔ (توجیہ النظر ص ۲۴۵)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد اور اکثر فقہاء رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ مُرسل قابل احتجاج ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر مُرسل کے ساتھ کوئی تقویت کی چیز مل جائے تو وہ حُجت ہوگا۔ مثلاً کہ وہ مسنداً بھی مروی ہو یا دُوسرے طریق سے۔ وہ مرسل روایت کیا گیا ہو یا بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا اکثر علماء نے اس پر عمل کیا ہو۔ (مقدمہ نووی رحمہ اللہ بر شرح مسلم ص۱۷) اور یہاں تقویت کے تمام اسباب موجود ہیں۔ اسی مضمون کی مسند روایت (بلکہ کئی روایات) بھی موجود ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی (اور اسی طرح بعض دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی اس پر عمل تھا۔ کما مرّ) اور اُمت کی اکثریت کا بھی اس پر عمل ہے جیسا کہ اس کتاب سے واضح ہے اور یہ کسی نص قرآنی کے معارض بھی نہیں ہے اور چونکہ صحیح روایات سے عام مُردوں کے سماع کا ثبوت ہے۔ لہٰذا اس کو آپ کی خصوصیت پر حمل کرنا بھی درست نہ ہوگا جیسا کہ بعض کوتاہ فہم لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے میت کی تلقین کے بارے میں سوال کیا گیا تو وہ فرماتے ہیں: ''الجواب: هذا التلقین المذکور قد ثبت عن طائفة من الصحابة رضی اللہ عنہم انهم امروا به کابی امامة الباهلی وغیره وروی فیه حدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لٰکنه مما لا یحکم بصحته و لم یکن کثیر من الصحابة رضی اللہ عنہم یفعل ذلک فلهذا قال الامام احمد رحمہ اللہ وغیره من العلماء ان هذا التلقین لا بأس به فرخصوا فیه و لم یأمروا به واستحبهٔ طائفة من اصحاب الشافعی رحمہ اللہ واحمد رحمہ اللہ وکرهه طائفة من العلماء من اصحاب مالک رحمہ اللہ وغیرهم'' الٰی ان قال فلهذا قیل ان التلقین ینفعهٔ فان المیّت یسمع النداء کما ثبت فی الصحیح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه قال انه یسمع قرع نعالهم و انه قال ما انتم باسمع لما اقول منهم و انه امرنا بالسلام علی الموتی فقال ما من رجل یمر بقبر الرجل کان یعرفهٔ فی الدنیا فیسلم علیه اِلّا ردّ اللہ علیه روحه حتّٰی یرد علیه السلام واللہ تعالٰی اعلم''

(فتاوٰی ابن تیمیہ ج ا ص ۲۸۹)

"الجواب: یہ مذکور تلقین حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک طائفہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے اس کا حکم دیا ہے۔ جیسے حضرت ابواُمامہ الباہلی رحمہ اللہ وغیرہ اور اس میں آنحضرت ﷺ سے ایک روایت بھی مروی ہے لیکن اس کی صحت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت یہ کارروائی نہیں کرتی تھی۔ اس لئے حضرت امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ علماء نے فرمایا ہے کہ اس تلقین میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ سو ان حضرات نے اس کی اجازت دی ہے اور (تاکیدی) حکم نہیں دیا اور اس کو امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے ایک طائفہ نے مستحب قرار دیا ہے اور حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے علماء کے ایک طائفہ اور دوسرے حضرات نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔ (آگے فرمایا) سو اسی لئے کہا گیا ہے کہ تلقین مُردے کو نفع دیتی ہے کیونکہ وہ آواز کو سنتا ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے کہ مُردہ لوگوں کی جوتیوں کی آواز سنتا ہے اور نیز آپ نے فرمایا کہ مَیں جو کچھ ان سے کہتا ہوں اس کو تم ان سے زیادہ نہیں سنتے اور نیز آپ نے ہمیں مُردوں پر سلام کہنے کا حکم دیا۔ پس آپ نے فرمایا کہ تم میں جو شخص بھی کسی ایسے آدمی کی قبر سے گزرتا ہے جس کو وہ دنیا میں پہچانتا تھا اور وہ اس کو سلام کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی رُوح (یعنی توجہ) کو اس پر لوٹا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کے سلام کا جواب لوٹاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

تعامل کی وجہ سے ضعیف حدیث درجۂ قبولیت حاصل کر لیتی ہے

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ لا وصیۃ لوارث کی تحقیق کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"وھذا الحدیث ضعیف بالاتفاق مع ثبوت حکمہ بالاجماع"

"یہ حدیث بالاتفاق ضعیف ہے۔ حالانکہ اس کا حکم بالاجماع ثابت ہے۔"

پھر آگے لکھتے ہیں: "و بحث فیه ابن القطان ان الحدیث الضعیف اذا انعقد علیه الاجماع هل ینقلب صحیحًا او لا؟ والمشهور الآن عند المحدثین انه یبقٰی علٰی حاله والعمدة عندهم فی هذا الباب هو حال الاسناد فقط فلا یحکمون بالصحة علٰی حدیث فی اسناده راوٍ ضعیف و ذهب بعضهم الٰی ان الحدیث اذا تائد بالعمل ارتقٰی من حال الضعف الٰی مرتبة القبول قلت وهو الاوجه عندی وان کبر علٰی المشغوفین بالاسناد فانی قد بلوت حالهم فی تجازفهم و تسامحهم و تماکسهم فی هذا الباب واعتبار الواقع عندی اولٰی من المشی علٰی القواعد وانما القواعد للفصل فیما لم ینکشف امره من الخارج علٰی وجهه فاتباع الواقع اولٰی والتمسک به احزی" (فیض الباری ج ۳ ص ۴۰۹)

"امام ابن القطان رحمہ اللہ نے اس پر بحث کی ہے کہ کیا ضعیف حدیث جب اس پر اجماع منعقد ہو جائے، صحیح بن سکتی ہے یا نہیں؟ اور اس وقت محدثین میں مشہور یہی ہے کہ وہ اپنے حال پر باقی رہے گی اور ان کے نزدیک اس باب میں مدار صرف اسناد کے حال پر ہے تو وہ کسی ایسی حدیث کے صحیح ہونے کا فیصلہ نہیں کرتے جس میں کوئی ضعیف راوی ہو اور بعض محدثین اس طرف گئے ہیں کہ ضعیف حدیث جب عمل سے مؤید ہو جائے تو وہ ضُعف کی حالت سے نکل کر درجۂ قبولیت تک پہنچ جاتی ہے۔ مَیں کہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہی بات زیادہ درست ہے۔ اگرچہ یہ بات ان لوگوں پر شاق گزرے گی جو صرف اسناد پر فریفتہ ہیں، مَیں نے ان لوگوں کا حال اس باب میں ان کے تخمینہ اور ان کی چشم پوشی و سہل انگاری اور ان کی سخت گیری سے بخوبی آزمایا ہے اور میرے نزدیک واقع کا اعتبار

نرے قواعد پر چلنے سے زیادہ بہتر ہے قواعد تو صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ جس چیز کی حقیقت خارج سے پوری طرح منکشف نہیں ہوئی قواعد سے کھل جائے۔ سو واقع کی پیروی اور اس سے تمسک اولیٰ اور زیادہ مناسب ہے۔"

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی یہ مُراد ہرگز نہیں کہ اسناد کا سرے سے کوئی اعتبار نہیں کیونکہ حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے میں اسناد کا بڑا دخل ہے اگر اسناد نہ ہو تو جس کا جو جی چاہے گا کہہ ڈالے گا۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر کسی حدیث میں کوئی راوی ضعیف ہو (یہ یاد رہے کہ کذاب و وضاع وغیرہ راوی کی بات نہیں ہو رہی، صرف اُس راوی کی بات ہو رہی ہے جس کا ضعف محدثین کرام رحمہم اللہ کے نزدیک قابل برداشت ہے) لیکن اس ضعیف حدیث پر اُمت کا اجماع ہو یا اکثریت کا تعامل ہو تو محض روات پرستی کی وجہ سے تعاملِ اُمت سے نظر پھیر کر اس حدیث کو ضعیف کہہ کر دل کی تسکین حاصل کر لینا۔ (جیسا کہ مؤلف ندائے حق وشفاء الصدور اور اقامۃ البرہان وغیرہ نے یہ وتیرہ اختیار کر رکھا ہے) حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک بالکل غلط ہے اور صرف اسی فنی وجہ سے تعامل اور توارث اُمت سے اغماض کرنا صحیح نہیں ہے اور یہی کچھ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے۔

قاضی شوکانی رحمہ اللہ ایک حدیث کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ثم حکم ابن عبد البر رحمہ اللہ مع ذٰلک بصحتہ لتلقی العلماء لہ بالقبول فردہ من حیث الاسناد و قبلہ من حیث المعنیٰ" (نیل الاوطار ج۱ ص ۲۵)

"پھر امام ابن عبد البر رحمہ اللہ نے باوجود اس کے کہ اس حدیث کی سند کمزور ہے اس کو صحیح قرار دیا ہے کیونکہ علماء نے اس کو قبول کر کے اس پر عمل کیا ہے۔ الغرض امام ابن عبد البر رحمہ اللہ نے سند کے لحاظ سے اس کو رد کیا ہے اور معنٰی کے لحاظ سے اس کو قبول کیا ہے۔"

اس سے بھی معلوم ہوا کہ علماء اُمت کا تعامل بھی ایک بڑی شئے ہے اور اس سے بھی صرفِ نظر نہیں کی جاسکتی اور ایسے فروعی مسائل میں ادلۂ قطعیہ کی حاجت بھی نہیں ہوتی۔ فی الجملہ دلائل درکار ہوتے ہیں اور بحمد اللہ تعالیٰ اس مسئلہ میں وہ سب موجود ہیں۔

قاضی شوکانی رحمہ اللہ ہی ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ: "فالاحکام الفرعیۃ لا تشترط فیھا الادلۃ القطعیۃ" (نیل الاوطار ج۸ ص ۱۸۴)

"احکامِ فرعیہ کے لئے ادلّہ قطعیہ شرط نہیں ہے۔"

فقیہ کبیر امام الفقہاء حسن بن منصور رحمہ اللہ المعروف بقاضی خان (المتوفی ۵۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ: "وان قراء القراٰن عند القبور ان نوی بذٰلک ان یؤنسھم صوت القراٰن فانہ یقرأ فان لم یقصد ذٰلک فاللہ تعالٰی یسمع قرأۃ القراٰن حیث کانت" (فتاویٰ قاضی خان ج۴ ص ۷۹۱، طبع نولکشور لکھنؤ)

"اگر کسی شخص نے "قبور" کے پاس اس نیت سے قرآنِ کریم پڑھا کہ اس کے قرآنِ کریم پڑھنے کی آواز سے مُردے مانوس ہوتے ہیں تو بلاشک وہ پڑھے اور اگر یہ نیت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ قرآن کریم کی قرأت کو سنتا ہے۔ (تو پھر قبور کے پاس پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟)

اور یہ عبارت (فتاویٰ عالمگیری ج۴ ص ۳۷۷ طبع مصر) میں بھی ہے۔ علماء کرام جانتے ہیں کہ فتاویٰ عالمگیری کو حضرت سلطان اورنگ زیب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۱۱۸ھ) کے زمانہ میں پانچ سو جیّد علماء کرام نے مدوّن اور مرتب کیا

ہے۔ اگر مُردے فی الجملہ نہیں سنتے تو قبروں کے پاس قرآن کریم پڑھنے والوں کی آواز سے مُردوں کے مانوس ہونے کا کیا مطلب ہے؟ ان کا قرآن کریم کی آواز سے مانوس ہونا تو صرف اسی صورت میں متحقق ہوسکتا ہے کہ وہ قبور کے پاس قرآن پڑھنے والوں کی آواز کو سنتے ہوں اورسُن کر اس سے مانوس اور منتفع ہوں۔ صَوت القرآن کے الفاظ اس عبارت میں صراحۃً موجود ہیں۔ لہٰذا اس کی یہ تاویل کرنا جیسا کہ (شفاء الصدور ص ۹۵) میں کی گئی ہے کہ جیسے سرسبز درختوں اور پودوں سے مَیّت کو فائدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح بغیر سننے کے قرآن کریم سے بھی وہ فائدہ اُٹھاتا ہے، سراسر باطل اور قطعاً مَردُود ہے۔

حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ نے تلقین میّت کے بارے میں خاصی بحث کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''و اما التلقين بعد الموت و هو فى القبر فقيل يفعل لحقيقته مار وينا و نسب الى اهل السنة و الجماعة و خلافا الى المعتزلة و قيل لايؤمر به و لا ينهى عنه الى ان قال و قد يختار الشق الاوّل و الاحتياج اليه فى حق التذكير لتثبيت الجنان للسوال فنفى الفائدة مطلقا ممنوع نعم الفائدة الاصلية منتفية'' الى ان قال الا انه على هذا ينبغى التلقين بعد الموت لانه يكون حين ارجاع الروح فيكون لفظ موتاكم فى حقيقته و هو قول طائفة من المشائخ او هو مجاز باعتبار ما كان نظرا الى انه الآن حى اذ ليس معنى الحى الا من فى بدنه الروح''

(فتح القدیر ج ۱ ص ۴۴۶، ۴۴۷)

''بہرحال مرنے کے بعد جب کہ میّت قبر میں ہو اس کی تلقین کے بارے میں اختلاف ہے سو کہا گیا ہے کہ یہ کارروائی کی جائے اس حقیقت کی بناء پر جس پر ہم نے روایت نقل کی ہے اور یہ بات اہل السنت والجماعۃ کی طرف نسبت کی گئی ہے اور اس میں معتزلہ کا اختلاف ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نہ تو اس کا حکم دیا جائے اور نہ اس سے منع کیا جائے۔ (آگے فرمایا) اور بلا شک پہلی شق کو اختیار کیا گیا ہے اور مَیّت کو یاددہانی کرانے کے لئے اس کی حاجت بھی ہے تاکہ اس کا دل سوال کے وقت ثابت رہے اس لئے تلقین کے فائدہ کی مطلقاً نفی کرنا ممنوع ہے۔ ہاں! اصلی فائدہ (کہ تکلیفی زندگی کی طرح سُن کر قبول کرے) منتفی ہے۔ (آگے فرمایا) ہاں! اس لحاظ سے مناسب یہی ہے کہ مرنے کے بعد تلقین کی جائے، کیونکہ وہ رُوح کو لوٹائے جانے کے بعد ہوگی۔ لہٰذا اس صورت میں حدیث میں لفظ ''موتاکم'' حقیقت پر محمول ہوگا۔ (قریب المرگ کے معنیٰ میں نہ ہوگا) اُور مشائخ میں سے ایک گروہ کا یہی قول ہے یا یہ مجاز ہے۔ اس سے کہ اعادۂ رُوح سے پہلے مُردہ تھا کیونکہ اس وقت تو وہ زندہ ہے۔ اس لئے کہ زندہ کا معنیٰ اس کے بغیر اور کوئی نہیں کہ اس کے بدن میں رُوح ہو۔ (اور یہاں ایسا ہی ہے)

مشہور فقیہ علامہ سید محمد امین بن عمر الحنفی الشامی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں کہ: ''و انما لا ينهى عن التلقين بعد الدفن لانه لا ضرر فيه بل فيه نفع'' (ردالمحتار ج ۱ ص ۷۹۷)

''یقینی بات ہے کہ دفن کے بعد تلقین سے منع نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ اس میں نقصان تو کوئی ہے نہیں بلکہ اس میں (مَیّت کا) فائدہ اور نفع ہی ہے۔''

سابق مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمہ اللہ سے سوال ہوا کہ: ''بعد دفن کے تلقین کرنا جائز ہے یا نہ؟ اگر جائز ہے تو کس طرح؟'' اِس کا جواب وہ یوں اِرشاد فرماتے ہیں:

الجواب: تلقین بعد الدفن کو فقہاء نے جائز رکھا ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم ج ۵ ص ۳۹۲)

فائدہ: قبر پر قرآنِ کریم پڑھنے کے بارے میں حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کا اختلاف ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا مسلک یہ نقل کیا گیا ہے کہ وہ اس کو مکروہ فرماتے ہیں لیکن حضرت امام محمد رحمہ اللہ کے اس کے جواز کا حکم دیتے ہیں اور فتویٰ اسی پر ہے۔

چنانچہ امام السید احمد الطحطاوی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''قوله ثم لا يعود على المسلمين۔ لم يصح فيه حديث كما ذكره ملا علی رحمہ اللہ فی بعض كتبه واخذ من ذلك جواز القرأة على القبر والمسئالة ذات خلافٍ قال الامام تكره لان اهلها جيفة ولم يصح فيها شئ عنده عنه صلی اللہ علیہ وسلم وقال محمد تستحب لورد الآثار وهو المذهب المختار كما صر حوابه فی کتاب الاستحسان'' (طحطاوی ص ۳۴۱)

''ان کا قول ''ثم لا يعود على المسلمين'' اِس میں کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے جیسا کہ ملّا علی القاری رحمہ اللہ نے اپنی بعض کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس سے قبر پر قرأت کا جواز اخذ کیا گیا ہے اور مسئلہ اختلافی ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے۔ کیوں اہلِ قبور مُردے ہیں اور ان کے نزدیک اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز ثابت نہیں ہے اور امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مستحب ہے۔ کیونکہ اس میں آثار (واحادیث) وارد ہیں اور یہی مختار مذہب ہے۔ جیسا کہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے کتاب الاستحسان میں اس کی تصریح کی ہے۔

(عالمگیری ج ۱ ص ۱۷۷) میں ہے کہ ہمارے فقہاء احناف رحمہم اللہ نے امام محمد رحمہ اللہ کا قول لیا ہے کہ عند القبر قرآن کریم پڑھنا درست ہے اور (البحر الرائق ج ۱ ص ۲۸۴) میں ہے کہ: ''والفتوىٰ علىٰ قول محمد رحمہ اللہ'' امام نووی رحمہ اللہ (شرح مسلم ج ۱ ص ۱۴۱) میں اور علامہ عینی رحمہ اللہ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۸۷۷) میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (فتح الباری ج ۱ ص ۲۵۷) میں لکھتے ہیں کہ قبر پر کھجور کی ٹہنیاں (جریدتین) رکھنے سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ عند القبر قرأۃ قرآن اور تسبیح وغیرہ سے تخفیفِ عذاب ہوتی ہے۔

باب دوم

منکرین سماعِ موتیٰ کے دلائل

پہلے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ یہ مسئلہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے تاہنوز اختلافی چلا آرہا ہے۔ اس مسئلہ میں خود حضرات فقہاء احناف رحمہم اللہ اور نیز ہمارے اکابر علماء دیوبند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم کا آپس میں بھی اختلاف ہے جو حضرات سماعِ موتیٰ کا انکار کرتے ہیں۔ اُصولی طور پر اُن کی تین دلیلیں ہیں: (۱) ظاہر نصوصِ قرآنیہ۔ (۲) اقوال حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ اور (۳) قیاسی وعقلی دلیل۔ عقلی اور قیاسی دلیل کا، جواَب چودھویں صدی میں ایجاد کی گئی ہے، تانا بانا اور کائنات صرف اتنی ہی ہے کہ رُوح کے بدن سے کُلّی طور پر انقطاع کے بعد بے حساب مٹی کے ڈھیر کے نیچے قبر میں جب کہ نہ کوئی دَروازہ ہے اور نہ دریچہ، عقل کیسے باور کر سکتی ہے کہ بیرونی آواز مُردہ سُن سکتا ہے؟ جب کہ بسا اوقات بند کمرہ میں بیٹھا ہوا زندہ شخص بھی کمرہ سے باہر والوں کی آواز کو نہیں سُنتا۔ مگر اربابِ فہم وبصیرت پر مخفی نہیں کہ یہ ایک نِرا عقلی ڈھکوسلہ ہے۔

اَوّلاً: اس لئے کہ صحیح ،مشہور بلکہ متواتر حدیث سے ثابت ہے کہ قبر میں جسم کی طرف رُوح لوٹائی جاتی ہے اور جسم کا رُوح سے تعلق قائم کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اُس کو ادراک وشعور حاصل ہوتا ہے اور اسی تعلق اور ادراک وشعور کی وجہ سے مُردہ سلام وکلام وغیرہ سنتا ہے۔

ثانیاً: سماعِ موتی کی صحیح حدیثیں پہلے باحوالہ پیش کی جا چکی ہیں جو اپنی حقیقت پر محمول ہیں جیسا کہ جمہور شراحِ حدیث کی تشریح اور تفسیر سے یہ بات عرض کی جا چکی ہے اور یہ طے شدہ بات ہے کہ نص کے مقابلہ میں قیاس مرُدود ہوتا ہے۔ لہٰذا ان صحیح وصریح احادیث کے مقابلہ میں غیر معصوم اور غیر مجتہد کے اس بے وزن قیاس کی شرعاً کیا وقعت ہوسکتی ہے جس کے متعلق صرف اتنی ہی گزارش کافی ہے کہ ؎

خویش را تاویل کُن نے ذکر را

ظاہر نصوص سے عہد حاضر کے مجتہدین حضرات نے جو استدلال کیا ہے اُصولی طور پر دو طرح کا ہے۔ ایک یہ کہ وہ تمام آیات ان حضرات کے نزدیک مسئلہ عدمِ سماعِ موتی پر ان کا مستدل ہیں جن میں غیر اللہ کو سفارشی بنانا اور ان کی عبادت کرنا اور غیر اللہ کو پکارنا اور اس کے نتیجہ میں ان کا اس عبادت اور پکار سے غافل اور بےخبر ولاعلم رہنا ثابت ہوتا ہے۔

مثلاً یہ آیت کریمہ: ’’وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّھُمْ وَ لَا یَنْفَعُھُمْ وَ یَقُوْلُوْنَ ھٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ‘‘ (یونس:۱۸)

’’اور وہ عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ورے اس چیز کی جو نہ نقصان پہنچا سکے اُن کو اور نہ نفع اور کہتے ہیں یہ تو ہمارے سفارشی ہیں اللہ تعالیٰ کے پاس۔‘‘

کہتے ہیں کہ اس آیت کریمہ سے عند القبور استشفاع اور علی الخصوص آنحضرت ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوکر مغفرت کی سفارش کرنا ممنوع ثابت ہو رہا ہے کیونکہ یہی صورت اس منہی عنہ حکم میں داخل ہے۔

الجواب: اس آیت کریمہ کی تفسیر میں ایک تو یہ کہا گیا ہے کہ اس سے بُت (اصنام واوثان) مُراد ہیں۔ جیسا کہ (تفسیر خازن ج ۳ ص ۱۸۰، معالم التنزیل ج ۳ ص ۱۸۰، برحاشیہ خازن تفسیر مظہری ج ۵ ص ۱۶، رُوح المعانی ج ۱۱ ص ۸۸) وغیرہ تفسیروں میں مذکور ہے۔ اس تفسیر پر تو قطعاً کوئی اعتراض واشکال وارد نہیں ہوتا۔ دُوسری تفسیر یہ ہے کہ ’’مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ‘‘ سے اصنام واوثان کے علاوہ فرشتے اور حضرت مسیح علیہ السلام وغیرہ حضرات بھی مُراد ہوں۔ جیسا کہ (رُوح المعانی ج ۱۱ ص ۸۸) وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس تفسیر پر بظاہر اشکال ہوگا مگر حقیقت میں کوئی اشکال نہیں۔ کیونکہ اس سے ایسی سفارش مُراد ہے جو غائبانہ اور دُور سے ہو۔ کیونکہ اس میں غیر اللہ کو حاضر وناظر اور عالم الغیب ماننا لازم آتا ہے جو ناجائز اور شرک ہے اور اسی صورت کو حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے ’’مَنْ قَالَ ارواح المشائخ حاضرۃ تعلم یکفر‘‘ سے تعبیر کیا ہے، رہی قبر کے پاس قریب سے سفارش کی درخواست کرنا تو یہ اس مد میں ہرگز نہیں۔ کیونکہ قریب سے کسی کی درخواست والتجاء کو سُن کر غیر اللہ کی اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارش اگر اس میں داخل ہو اور شرک ہو تو زندہ سے بھی دُعا کی التجاء کرنا شرک ہوگا۔ کیونکہ کوئی بھی بزرگ ہو، بہرحال وہ من دون اللہ میں داخل ہے، تو چاہئے کہ زندہ بزرگ کو دُعا کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی بنانا بھی شرک ہو اور ھٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآءُ نَا عِنْدَ اللّٰہِ کا مصداق ہو۔ حالانکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے اور اُمّتِ مسلمہ کا تعامل اس پر مستزاد ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس

لوگ دُعا کی درخواست لے کر آتے تھے اور آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں اُن کے لئے دُعا فرمایا کرتے تھے۔ بخاری وغیرہ میں روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک لمبے قد اور کالے رنگ والی بی بی (حضرت اُمّ زُفر سعیرہ الاسدیہ رضی اللہ عنہا) آئیں اور انہوں نے آپ ﷺ سے مِرگی کے دورہ کا شکوہ کیا اور پھر کہا: ''فادْعُ اللہ'' حضرت آپ ﷺ میرے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو اس بیماری پر صبر کر اور اللہ تعالیٰ تجھے جنت مرحمت فرمائے گا۔ وَاِنْ شِئْتِ دعوت اللہ ان یعافیک فقالت اصبر الحدیث اور اگر تو چاہے تو میں تیرے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کروں کہ وہ تجھے عافیت بخشے۔ وہ بی بی عرض کرنے لگی تو میں صبر ہی کرتی ہوں (تا کہ جنت کا سودا برقرار رہے) (بخاری ج ۲ ص ۸۴۴)

اگر آنحضرت ﷺ کو دُعا کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی بنانا شرک ہوتا تو آپ ﷺ اس بی بی کو سختی سے منع فرما دیتے اور کبھی بھی اس کے لئے دُعا نہ فرماتے۔ حالانکہ اس صحیح حدیث میں ''وَ اِنْ شِئْتِ دعوت اللہ'' کے الفاظ صراحت سے موجود ہیں اور بحوالہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ زندہ کو اور عند القبر مُردہ کو بسلسلہ دُعا سفارشی بنانا دونوں صورتیں درست ہیں اور ان میں کوئی بھی شرک نہیں ہے۔ علاوہ ازیں حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ اور علی الخصوص فقہاء احناف رحمہم اللہ کا تو وہ محتاط، نکتہ رس اور ذمہ دار طبقہ ہے جس کی مثال دُنیا میں ناپید ہے اور حضرات مفسّرین کرام رحمہم اللہ کا طبقہ ساتھ مل کر اس کو نور علیٰ نور بنا دیتا ہے اور یہ تمام حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر طلبِ مغفرت کی درخواست کرنا جائز ہے اور اسی طرح حضرات شیخین (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ) سے یہ سفارش کروانا کہ آپ دونوں بزرگ آنحضرت ﷺ کے ہاں میرے لئے سفارش کریں۔ حالانکہ یہ دونوں بزرگ من دون اللہ میں داخل ہیں۔ اگر اس طرح کی سِفارش اس آیت کریمہ کی تفسیر میں داخل ہو کر هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ کا مصداق ہوتی تو حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ اور مفسرین عظام کا محتاط گروہ کبھی اس کی اجازت نہ دیتا۔ حالانکہ واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس آیت کی یہ تفسیر ہرگز نہیں ہے اور یہ بری اختراع اور خانہ زاد ہے۔

اور مثلاً یہ آیتِ کریمہ: ''وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ'' (الاحقاف:۵)

''اور اس سے بہکا کون ہے؟ جو پکارے اللہ کے سوا اَیسے کو کہ نہ پہنچے اس کی پکار کو دن قیامت تک اور ان کو خبر نہیں ان کے پکارنے کی۔''

اور مثلاً یہ ارشاد: ''وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ○ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ'' (یونس:۲۸،۲۹)

''اور جس دن جمع کریں گے ہم ان سب کو، پھر کہیں گے شرک کرنے والوں کو کھڑے ہو اپنی اپنی جگہ تم اور تمہارے شریک، پھر ہم ان کو الگ الگ کر دیں گے اور کہیں گے ان کے شریک تم ہماری بندگی تو نہ کرتے تھے سو اللہ کافی ہے گواہ ہمارے اور تمہارے درمیان ہم کو تمہاری بندگی کی خبر نہ تھی۔''

اور اسی مضمون کی بے شمار آیات جن سے ندائے حق کے مقدمہ باز بزرگ نے مقدمہ کے ص ۲ سے ص ۱۴ تک اپنے مضمون کا حجم بڑھایا ہے اور اس دور میں اس مسلک والوں کے امام مولانا سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری گجراتی ایسی ہی آیات کریمات کو بڑے لئے سے پڑھ کر مجمع میں اپنے استدلال کی قوت ظاہر کیا کرتے ہیں اور ان کی پیروی میں دیگر مقررین اور مبلغین حضرات بھی ان کی نقل اتارتے ہیں اور ان ہی آیات سے عدم سماع موتی پر حتیٰ کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے عندالقبور عدم سماع پر بھی استدلال کرتے ہیں۔ حالانکہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا عندالقبور سماع ایک اتفاقی اور اجماعی عقیدہ ہے اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اب اس اختلاف کے موجد صرف یہی حضرات ہیں اور اس جدید اختلاف کا یہ زنگ دار اور ملمع سازی کا سہرا انہیں کے سر پر زیب دیتا ہے۔

ہماری طرف سے ان تمام آیات کا پہلا اور اُصولی جواب وہی ہے جو خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ایک منکرِ تقدیر کو دیا تھا جس نے قرآنِ کریم کی بعض آیات سے انکارِ تقدیر کا مسئلہ سمجھ رکھا تھا اور اُن کا یہ جواب خاصی تفصیل کے ساتھ ''ابوداود'' میں موجود ہے۔ جو اس قابل ہے کہ سنہری حروف سے لکھا جائے جس میں اُن کا یہ ارشاد بھی ہے: ''لقد قرؤا منه ماقرأتم وعلموا من تاويله ماجهلتم'' (ابوداود ج ۲ ص ۲۷۸)

''کہ بلا شبہ ان سلف صالحین رحمہم اللہ نے قرآنِ کریم پڑھا جیسے تم پڑھتے ہو مگر وہ اس کی تفسیر کو جانتے تھے اور تم اس سے جاہل ہو۔''

مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی یہی آیات کریمات سلفِ صالحین رحمہم اللہ کے سامنے بھی تھیں جن سے تم نے انکارِ تقدیر پر استدلال کیا ہے مگر وہ حضرات تو ان آیات سے وہ مطلب ہرگز نہیں سمجھے جو تم سمجھے ہو اور نہ انہوں نے ان کی وہ تفسیر اور تعبیر کی ہے جو تم کرتے ہو اور مدار تو انہی کی سمجھ پر ہے۔ پھر کیسے تسلیم کیا جائے کہ تمہارا استدلال صحیح اور ان کی سمجھ معاذ اللہ تعالیٰ غلط تھی؟ سو ہم بھی یہی عرض کرتے ہیں کہ ان تمام آیات کا عندالقبور عدم سماع موتی سے ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر تعلق ہوتا تو یقیناً سلف صالحین رحمہم اللہ صراحت کے ساتھ ان سے استدلال کرتے اور اپنے مخالفین کے سامنے بطور احتجاج ان کو پیش کرتے۔ کیونکہ یہ مسئلہ تو عہدِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اختلافی چلا آ رہا ہے مگر یقین جانئے کہ سلفِ صالحین رحمہم اللہ میں جو حضرات عدم سماع موتی کے قائل تھے۔ اُنہوں نے بھی ان سے استدلال نہیں کیا جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ جملہ آیات مسئلہ سے بالکل غیر متعلق ہیں اور نری زبان آوری، لفاظی اور سینہ زوری سے کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں! عقیدت مند مرید اور کم علم ہم جماعتی لوگ وقتی طور پر ضرور وجد و سرور میں آسکتے ہیں کہ دیکھو فلاں صاحب نے قرآنِ کریم کی کتنی آیات اپنے دعویٰ پر پیش کر ڈالیں مگر نرے واہ واہ سے کیا بنتا ہے۔

دُوسرا جواب یہ ہے کہ عبادت کی کئی قسمیں ہیں مثلاً سجدہ کرنا، طواف کرنا اور نذر و نیاز دینا وغیرہ۔ بلکہ جاہل لوگوں بزرگوں کی قبروں پر چراغاں کرنا اور جھاڑ و دینا بھی کارِ ثواب ہی سمجھتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص کسی بزرگ کی قبر پر چپکے سے آ کر سجدہ کرتا ہے یا خاموش رہ کر طواف کرتا ہے یا قبر پر نذر و نیاز ہی آ کر رکھ دیتا ہے تو بزرگوں کو ان کی اس عبادت کی کیا خبر ہے؟ اور اسی طرح دُور دراز سے ان کو پکارنے کی کیا خبر ہے؟ یہ تمام اُمور اپنے مقام پر حق اور صحیح ہیں۔

اور تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر ان آیات کریمات سے عندالقبور سماع موتی کی نفی ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن پر یہ آیات نازل ہوئی تھیں اُمت کو کبھی عندالقبور سلام کہنے کی تلقین اور طریقہ ارشاد نہ فرماتے کیونکہ آپ (معاذ اللہ تعالیٰ)

قرآنِ کریم کی آیات کی خلاف ورزی کے لئے تشریف نہیں لائے تھے بلکہ اُن کی مراد اور تفسیر لوگوں پر واضح کرنے اور ان پر عمل کرنے اور کرانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور پھر جمہورِ اُمت نے بھی عند القبور سلام کہنے کا طریقہ اپنایا ہی ہے اس کا رد اور انکار نہیں کیا اور یہ تمام آیات کریمات ان حضرات کے سامنے تھیں اور بعد میں آنے والوں سے کہیں بڑھ کر وہ حضرات قرآنِ کریم پڑھتے بھی تھے اور اس کو صحیح معنی میں سمجھتے بھی تھے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔

اور چوتھا جواب یہ ہے کہ اگر واقعی اور سچ مچ ان آیات کریمات سے قطعی اور حتمی طور پر عند القبور سماع کی نفی ہوتی ہے تو جو حضرات سماعِ موتی کے قائل ہیں اُن کو کھل کر کافر کہنا چاہئے۔ کیونکہ قرآنِ کریم کی کسی ایک آیت کا انکار یا اس کی بے جا تاویل کُفر ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ کی ''خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً'' کی تاویل کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا اور ان کو کافر سمجھ کر ان سے جہاد کیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن کریم کی بے شمار آیات کے منکر یا مؤول کا فر قرار نہ پائیں؟ جو حضرات محض تحزب اور تعصب کے جوش میں آکر ایسا کرتے ہیں اُن کو ہوش میں آکر ان اُمور پر غور کرنا چاہئے۔

ندائے حق کے مقدمہ میں مقدمہ باز بزرگ نے بزعمِ خویش پینسٹھ (۶۵) آیات پیش کی ہیں اور آخر میں لکھتے ہیں۔ ''ان قطعیات و یقینیات کے ہوتے ہوئے کسی سلف یا خلف اکابر یا اصاغر جماہیر ہوں یا مشاہیر کا قول و فعل حجت نہیں بن سکتا۔'' (بلفظہٖ ص ۱۴) شاباش اِسی کا نام ہے علمی تحقیق۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ! قطعیات و یقینیات سے کیا مراد ہے؟ اگر یہ مُراد ہے کہ یہ قرآن کریم کی آیات ہیں جن کا ثبوت قطعی اور یقینی ہے تو یہ بتلایا جائے کہ سلف و خلف اور اکابر و اصاغر اور جماہیر و مشاہیر نے ان کا کب اور کہاں انکار کیا ہے؟ اور اگر مُراد یہ ہے کہ ان کی عدم سماعِ موتی پر دلالت قطعی اور یقینی ہے تو یہ مؤلف مذکور کا زُعمِ باطل ہے۔ لاریب فیہ!

بڑے دُکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ دُوسروں کے اکابر کو کوسنا اور اُن پر برسنا تو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے لیکن خود اپنے ہی اکابر کی مٹی جس طرح ان یار لوگوں نے پلید کی ہے، دُنیا کے کسی باہوش فرقہ سے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ الٰہی! ؎

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر شریکِ زُمرۂ لایحزنوں کر

لیکن بات اِسی پر ختم نہیں ہوسکتی کہ سلف و خلف اور جماہیر و مشاہیر اَور اکابر و اصاغر کا قول و فعل ان قطعیات اور یقینیات کے مقابلہ میں حجت نہیں۔ بلکہ قرآنِ کریم کی قطعی اور یقینی آیات اَور قطعی اور یقینی مطلب و مُراد (جو کہ مؤلف مذکور کا مدعیٰ ہے) کے مقابلہ میں رائے اور نظریہ رکھنے والوں کی کھلے طور پر تکفیر درکار ہے۔ دیدہ باید!

اور پانچواں جواب یہ ہے کہ امام القاضی ناصر الدین ابو سعید عبداللہ بن عمر البیضاوی رحمہ اللہ (المتوفی ۶۸۵ھ) ''وَ هُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:''لانها اما جمادات و اما عباد مُسَخَّرون مشتغلون باحوالهم'' (تفسیر بیضاوی ص ۴۴۳)

''اس لئے کہ وہ یا تو جمادات (بُت) ہیں اور یا تابع فرمان بندے ہیں جو اپنے اَحوال میں مصروف و مشغول ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ان کی غفلت اور عدمِ سماع اس لئے نہیں کہ وہ سنتے نہیں اور ان میں سننے کی اہلیت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے اس لئے پکارنے والوں کی پکار سے غافل اور بے خبر ہیں کہ وہ اپنے احوال میں مصروف ہیں اور پکارنے والوں کی پکار کی طرف ان کی توجہ و التفات ہی نہیں اور بغیر توجہ اور التفات کے سننا کیسا؟

اور علامہ السید محمود آلوسی الحنفی رحمہ اللہ غٰفِلُوْنَ کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "لا یسمعون ولا یدرون اما ان کان المدعوا جماداً فظاھز و اما ان کان من ذوی العقول فان کان من المقبولین المقربین عند اللہ تعالٰی فلا شتغالہ عن ذٰلک بما ھو فیہ من الخیر او کونہ فی محل لیس من شان الذی فیہ ان یسمع دعاء الداعی للبعد کعیسٰی علیہ السلام الیوم او لان اللہ تعالٰی یصون سمعہٗ عن سماع ذٰلک لانہ لکونہ مما لا یرضی اللہ تعالٰی ان یؤلمہٗ لو سمعہ و ان کان من اعداء اللہ تعالٰی کشیاطین الجن والانس الذین عبروا من دون اللہ فان کان میّتا فلا شتغالہ بما ھو فیہ من الشر وقیل لان المیّت لیس من شأنہ السماع ولا یتحقق منہ سماع الا معجزۃ کسماع اھل القلیب وفی ھذا کلام تقدم بعضہ و ان کان حیّا فان کان بعیداً مثلاً فالامر ظاھر و ان کان قریبًا سلیم الحاسۃ فقیل الکلام بالسنبۃ الیہ بعد تاویل الغفلۃ بعدم السماع علی التغلیب لندرۃ ھذا الصنف"

(تفسیر روح المعانی ج ۲۶ ص ۷)

"نہ وہ سنتے ہیں اور نہ وہ جانتے ہیں اس لئے کہ اگر مدعو جماد ہیں تو ظاہر ہے اور اگر وہ ذوی العقول ہیں تو اگر وہ اللہ تعالٰی کے مقبول اور مقرب ہیں تو وہ آرام وراحت میں معروف رہ کر اس کارروائی سے بے خبر ہیں اور یا وہ ایسی جگہ ہیں جس میں ہونے کی وجہ اس میں رہنے والے کی شان یہ ہے کہ پکارنے والے کی پکار کو دُوری کی وجہ سے وہ نہیں سنتے جیسے آج کے دن حضرت عیسٰی علیہ السلام اور یا اس لئے کہ اللہ تعالٰی اس کے کانوں کو اس سے محفوظ رکھتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالٰی اس کو پسند نہیں کرتا کہ اس ناپسندیدہ اَمر سے ان کو دُکھ پہنچائے اور اگر وہ اللہ تعالٰی کے دُشمنوں میں سے ہیں۔ مثلاً شیاطین الانس والجن، جن کو من دون اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے تو اگر وہ مُردہ ہیں تو وہ اپنی تکلیف میں مبتلاء ہیں۔ (لہٰذا غافل ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اس لئے غافل ہیں کہ میّت کی شان ہی سے سماع نہیں اور اُس سے سماع متحقق ہی نہیں ہو سکتا مگر معجزہ کے طور پر جیسا کہ قلیب بدر والوں کا سماع اور اس میں کلام ہے۔ اس کا بعض حصہ پہلے گزر چکا ہے اور اگر وہ زندہ ہیں۔ سو اگر وہ مثلاً دُور ہیں تو معاملہ بالکل واضح ہے اَور اگر وہ قریب ہوں اور ان کے حواس بھی صحیح سالم ہوں تو کہا گیا ہے کہ ان کی بہ نسبت یہ کلام بعد اس کے کہ غفلت سے مُراد عدم سماع ہو تغلیب پر ہے کیونکہ یہ قسم بالکل نادر ہے۔

اس عبارت کا بقیہ حصہ تو بالکل روشن اور واضح ہے۔ البتہ آخری حصہ قابلِ توجہ ہے، وہ یوں کہ اگر مدعو قریب ہو اور اس کے حواس بھی صحیح سالم ہوں اَور غفلون میں غفلت کا معنی بھی عدم سماع ہو تو چونکہ بقیہ اقسام کے مقابلہ میں یہ قسم کم اور نادر ہے تو بقیہ اقسام (مثلاً جماد۔ مقبولِ الٰہی ہو کر خوشی میں مشغول ہونے والے، اور دُور رہنے والے، اور بُرے ہو کر اپنی تکلیف میں مبتلا ہونے والے وغیرہ) کو ملحوظ رکھ کر تغلیباً یہ ارشاد ہوا ہے کہ سب غافل اور بے خبر ہیں اور نہیں سنتے، حالانکہ یہ قریب والے سنتے ہیں اور تغلیب کا باب بڑا وسیع ہے۔ مثلاً ابوین، عمرین وغیرہ وغیرہ۔

اور قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "اِنْ تَدْعُوْھُمْ لقضاء حاجتکم لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَ کُمْ لانھا جمادات وَلَوْ سَمِعُوْا علی سبیل الفرض او علی تقدیر کون بعضھم ذاشعور کابلیس مَا اسْتَجَابُوْ لَکُمْ لعدم قدرتھم علی الانفاع او لتبرئھم منکم و مما تدعون لھم من الالوھیۃ کعیسٰی و عزیر و الملائکۃ" (تفسیر مظہری ج ۸ ص ۵۰)

''اگر تم ان کو پکار وا پنی حاجت براری کے لئے تو نہ سنیں وہ تمہاری پکار کیونکہ وہ جمادات ہیں اور اگر وہ تمہاری پکار سُن لیں یعنی فرضی طور پر یا اس صورت میں کہ ان میں سے بعض ابلیس کی طرح شعور والے ہیں نہ پہنچ سکیں تمہارے کام پر کیونکہ ان کو نفع پہنچانے کی قدرت نہیں اور یا اس لئے کہ وہ تم سے اور تمہاری اس کارروائی سے کہ تم ان کے لئے اُلوہیت کا دعویٰ کرتے ہو بیزار ہیں جیسے حضرت عیسیٰ، حضرت عزیر اور فرشتے علیہم السلام۔

اس سے معلوم ہوا کہ بُت وغیرہ جمادات تو سننے سے ہی رہے اور اگر بالفرض یہ سُن بھی لیں یا ابلیس کی طرح کسی شعور والے کو پکارا جائے تو وہ کس کو نفع دینے پر قادر ہے؟ اور آخر اس کے بس میں ہے کیا؟ اور اگر کوئی حضرت عیسیٰ اور حضرت عزیر اور فرشتوں (علیہم السلام) کو حاجت کے لئے پکارتا ہے تو وہ سفارش اور دُعا کے لئے کب آمادہ ہو سکتے ہیں؟ وہ تو مشرکوں ہی سے بیزار ہیں اور اس پر وہ کب راضی ہیں کہ اُن کو اُلوہیت کا درجہ دیا جائے۔

اور یہی بزرگ ''وَ هُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ'' کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''لانها اما جمادات لایسمع و لا یعقل او اما عباد مسخرون متشغلون باحوالهم کعیسے و عزیر و الملائکة''

ترجمہ: ''جن کو حاجات کے لئے پکارا جاتا ہے یا تو وہ جمادات ہیں اس لئے نہ تو وہ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں اور یا وہ تابع فرمان بندے ہیں جو اپنے حالات میں مشغول و مصروف ہیں، جیسے حضرت عیسیٰ، حضرت عزیر اور فرشتے۔ (علیہم السلام)

حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ وغیرہ بزرگوں نے نہ پہنچ سکیں کا ترجمہ کر کے شاید دُور ہی کی طرف اشارہ کیا ہے اور دُور ہوں تو پکارنے والوں کی پکار سے غافل اور بے خبر رہنا ظاہر ہے اور اگر نزدیک ہوں تو بھی یہ ضروری تو نہیں کہ ہر قریب کی بات سُنی جائے بلکہ اس کے لئے التفات اور توجہ اور سننے کا قصد بھی ضروری ہے اور جو حضرات اپنے حالات میں مستغرق ہیں وہ کیا سُن سکتے ہیں؟ ہاں! قصد اور توجہ و التفات کے بعد سننا صحیح ہے اور اس کا مطلقاً اِنکار درست نہیں ہے۔

مؤلف ندائے حق لکھتے ہیں: پھر ''لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَکُمْ اور وَ هُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ'' کے عمومی قاعدہ میں سے کسی صحابی، تابعی، تبع تابعین، محدث، مفسر، متکلم کا چودہ صدیوں میں اِلاَّ الانبیاء کا استثناء نہ بیان کرنا عدم سماع انبیاء علی القبور وغیرہ پر چودہ صدیوں کے علماء کے اجماع پر دال ہے۔ اب ہم بھی آپ سے پوچھتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیتیں دال برعدم سماع انبیاء ہیں یا نہ؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اگر ہے تو تم کس دلیل سے انبیاء کو مستثنیٰ کرتے ہو؟ (ص ۱۴۷)

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ان آیات کا تعلق ہی عدم سماع انبیاء سے ہرگز نہیں ہے پھر استثناء کی کیا ضرورت ہے؟ اور آپ ان آیات کی مذکورہ تفسیریں ملاحظہ فرمالیں کہ یہ تعلق کیوں نہیں ہے؟

اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ ''وَ هُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: ''جمادات (یعنی اصنام وغیرہ۔ صفدر) تو بوجہ عدم قوت سامعہ کے اور ذوات الارواح میں بایں معنی کہ جیسی خبر کے کفار معتقد تھے (کہ دُور سے بھی سنتے ہیں۔ صفدر) سماع لازم و دائم اور مفید ہے، وہ منفی ہے۔'' (بیان القرآن ج ۱۱ ص ۳) اور ''اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِیْنَ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: ''اور ان کا غافل ہونا ان کی عبادت سے ظاہر ہے اِس واسطے کہ بُتوں کو ایسا شعور ظاہر ہے کہ یہاں نہیں ہے اور اگر معبودین، مثل ملائکہ وغیرہم کو بھی عام لیا جائے تو بھی غافل ہونا صحیح ہے کیونکہ علم ملائکہ وغیرہم کا محیط نہیں ہے اور سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔'' (ج ۳ ص ۱۱)

دونوں تفسیروں کی مُراد واضح ہے۔ اَوّل کی اس طرح کہ مشرکین ذوات الارواح مخلوق کے لئے سماع کو لازم ودائم اور مفید سمجھتے تھے۔ حالانکہ سماع فی الجملہ ہے اور وہ بھی بالکل نزدیک سے نہ کہ دُور سے اور سننے کے بعد بھی بھلا وہ کسی کو کیا خزانے بخش دیں گے؟ جیسا کہ مشرکین کا باطل خیال تھا اور دوسری اس طرح کہ فرشتے اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے علم محیط تو رکھتے نہیں تا کہ دُور دراز کے حالات کا بھی ان کو علم ہو یا مثلاً قبور کے پاس چپکے سے سجدہ اور طواف ونذر ونیاز کا ان کو علم ہو۔ الغرض ان آیات سے عند القبور سماع موتی کی نفی کرنا یا ان سے فقہی قاعدہ کے مطابق دُعا کرانے کا انکار کرنا بالکل اور یقیناً ایک غیر متعلق بات ہے اور بڑی سینہ زوری ہے۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔

اور دوسرا طریق ان حضرات کے استدلال کا یہ ہے کہ قرآن کریم کی وہ آیات جن میں ''لَا یَسْمَعُوْا'' اور ''لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ'' وارد ہوا ہے ان سے وہ عند القبور سماع موتی کی نفی کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں قدرے تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے تا کہ عُقدہ حل ہو جائے۔ پہلی آیت کریمہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ'' (الفاطر: ۱۴)

''اگر تم ان کو پکارو وہ تو وہ سنیں نہیں تمہاری پکار اور اگر سُن بھی لیں تو تمہارے کام پر نہ پہنچ سکیں۔ (اور نہ تمہارا کام کر سکیں)

منکرین سماع موتی کا کہنا ہے کہ اس سے ثابت ہوا کہ مُردے نہیں سنتے۔

الجواب: اس سے اسماع موتی کی نفی نہیں ہوتی جس کے جمہور قائل ہیں کہ نزدیک سے سماع ہے نہ کہ دُور سے۔ چنانچہ علامہ آلوسی الحنفی رحمہ اللہ وغیرہ کے حوالہ سے اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ مُردہ یا زندہ دُور ہو تو تمام اہل حق کا اس پر اتفاق ہے کہ عادۃً وہ دُور سے نہیں سُنتا۔ خرقِ عادت کا معاملہ ہی الگ ہے اس کو درمیان میں لا کر خلط مبحث کرنا علماء اور عقلاء کی شان کے سراسر خلاف ہے۔ آدمی قریب ہو اور اپنی کسی مصروفیت اور فکر میں منہمک ہو تب بھی بات نہیں سنتا۔ قریب سے بھی بات سننے کے لئے توجہ اور التفات کی ضرورت ہوتی ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ خلیفۂ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک فکر میں ڈوبے ہوئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے گزرے اور انہیں سلام کیا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہ سُن سکے۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے معذرت کی اور فرمایا کہ: ''واللہ ماشعرت انک مررت ولا سلّمت'' (مشکوۃ ج ا ص ۱۶)

''بخدا میں نہیں جانتا کہ تو میرے پاس سے گزرا اور نہ تُو نے سلام کیا۔''

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''دیکھئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سلام کی خبر نہ ہوئی جس کا جواب دینا واجب تھا۔ اکثر فرح یا غضب کے غلبہ سے ایسا ہو جاتا ہے۔'' (بوادر النوادر ص ۲۰۴ ج ۲)

کیا آج بھی ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جو گانے بجانے اور ریڈیو وغیرہ کی غیر مشروع آوازوں سے نامانوس ہیں اور قریب ہوتے ہوئے بھی ان آوازوں کی طرف وہ توجہ ہی نہیں کرتے اور نہ سنتے ہیں۔ اُن کی بلا سے کہ کون کیا کہہ رہا ہے؟ الغرض اس آیت کریمہ سے ''سماع عند القبور'' کی اُس قسم کی نفی کرنا، جس کے قائل ''سماع موتی'' کے قائل ہیں، ثابت نہیں ہے۔

(۲) ''وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَاۤءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَاۤءُ وَمَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ''

''اور برابر نہیں زندے اور مُردے بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سُنا تا ہے اور تو ان کو نہیں سُنا سکتا جو قبروں میں ہیں۔'' (الفاطر: ۲۳)

منکرین سماع موتی کا کہنا ہے کہ اس آیت کریمہ میں زندوں اور مُردوں کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور آخر میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تو اہل قبور کو نہیں سُنا سکتا۔ ہاں! اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سنا دے اور جب اِسماع کی نفی ہوگئی تو استماع اور سماع کی نفی بھی ہوگئی اور یہ ثابت ہوگیا کہ مُردے نہیں سنتے۔

الجواب: اس سے اُس سماع کی نفی نہیں ہوتی جس کے اثبات کے درپے سماع موتی کے قائلین ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''واما قوله وَمَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ فسياق الآية يدل على ان المراد منها ان الكافر الميت القلب لا تقدر على اسماعه اسماعًا ينتفع به كما ان من في القبور لا تقدر على اسماعهم اسماعًا ينتفعون به ولم يرد سبحانه ان اصحاب القبور لا يسمعون شيئًا البتة كيف وقد اخبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم انهم يسمعون خفق نعال المشيعين واخبر ان قتلى بدر سمعوا كلامه وخطابه وشرع السلام عليهم بصيغة الخطاب الذي يسمع واخبر ان من سلّم على اخيه المؤمن رد عليه السلام''

(کتاب الروح ص ۵۵)

بہر حال ''وَمَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ'' تو آیت کا سیاق دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد ایسا کافر ہے جو مُردہ دل ہو تو مطلب یہ ہے کہ تو ایسے شخص کو اس طرح نہیں سُنا سکتا کہ وہ اس سے منتفع ہو جیسا کہ تو اُن لوگوں کو جو قبور میں جا پہنچے ہیں۔ اس طرح نہیں سُنا سکتا جو اس سے نفع حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ کی یہ مُراد نہیں کہ اصحابِ قبور قطعاً کوئی چیز نہیں سنتے، کیسے یہ مُراد ہوسکتی ہے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی ہے کہ مُردے رخصت کرنے والوں کی جوتیوں کی آواز سنتے ہیں اور آپ نے یہ خبر بھی دی کہ مقتولینِ بدر نے آپ کے کلام اور خطاب کو سُنا اور نیز آپ نے مُردوں پر خطاب کو سُنا اور نیز آپ نے مُردوں پر خطاب کے ایسے صیغہ سے سلام مشروع قرار دیا ہے جو سُنا جاتا ہے اور آپ نے یہ خبر بھی دی ہے کہ جو اپنے مؤمن بھائی (کی قبر) کے پاس سے گزرتا ہے اور اُسے سلام کہتا ہے تو وہ اُس کے کلام کا جواب دیتا ہے۔''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کے اس مدلّل بیان سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ ''وَمَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ'' سے اللہ تعالیٰ کی ہرگز یہ مُراد نہیں کہ مُردے نہیں سنتے۔ اگر ایسا ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پیغام پہنچانے پر مامور ہیں، ہرگز سماع موتی کی خبر نہ دیتے۔

علّامہ قرطبی رحمہ اللہ ''وَمَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''ای هم بمنزلة اهل القبور في انهم لا ينتفعون بما يسمعونه ولا يقبلونه'' (تفسیر قرطبی ج ۱۴ ص ۳۴۰)

''یعنی وہ بمنزلۂ اہلِ قبور ہیں اس معنی میں کہ وہ سنی ہوئی چیز سے نفع نہیں اُٹھاتے اور نہ اُسے قبول کرتے ہیں۔''

اور علّامہ داؤد بن سلیمان الحنفی البغدادی رحمہ اللہ ''اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى'' اور ''وَمَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ'' کا مطلب معتمد اور مستند علماء کرام (اساطین العلماء) سے بیان اور نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''لان السماع النفي في الآيتين هو سماع القبول والاذعان للايمان وقد شبه الله الكفار الاحياء الذين لهم

اسماع و ابصار و عقوله بالاموات لا من حيث انعداد الادراكات و الحواس بل من حيث عدم قبولهم الهدٰى والايمان'' (المنحۃ الوھبیۃ فی رد الوھابیہ ص ۸، طبع استنبول)

''جس سماع کی ان دونوں آیتوں میں نفی کی گئی ہے وہ سماع قبول اور ایمان کی اذعان و یقین کے ساتھ سننے کی نفی ہے اَور بلا شک اللہ تعالیٰ نے ان کفار کو جو زندہ ہیں اور جن کے کان، آنکھیں اور عقول، سب کچھ موجود ہیں، مُردوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ ان کے ادراکات وحواس معدوم ہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ ہدایت اور ایمان قبول نہیں کرتے۔''

اِس عبارت میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ زندہ کافروں کو مُردوں کے ساتھ تشبیہ دینے کی یہی وجہ ہے کہ جیسے مُردوں میں ادراک، شعور اور احساس ہوتا ہے مگر وہ سماع سے فائدہ اور نفع نہیں اُٹھا سکتے۔ یہی حال ان زندہ کافروں کا ہے۔

علّامہ بدرالدین ابوعبداللہ محمد بن علی البعلی الحنبلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:''و سماع الميت لقرع نعالهم والسلام عليه ونحو ذٰلک مما ثبت ان جنس الاموات يسمعونه ليس ذٰلک مخصوصًا بقوم معينين بل هو مطلق وقوله تعالٰى فانک لا تسمع الموتٰى المراد السماع المعتاد الذى يتضمن القبول والانتفاع كما فى حق الكفار السماع النافع فى قوله تعالٰى وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَقَوْلُهٗ تَعالٰى لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ فاذا كان قد نفى عن الكافر السمع مطلقًا و علم انه انما نفى سمع القلب المتضمن للفهم والقبول له لا مجرد سماع الكلام فكذٰلک المشبه به و هو الميت'' (مختصر الفتاوٰی لمصریۃ ص ۱۸۹، طبع مصر)

''مُردے کا زندہ لوگوں کی جوتیوں کی آواز اور سلام وغیرہ سننا جو ثابت شدہ ہے کہ جنس اموات سنتے ہیں یہ کسی معین قوم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مطلق ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ تُو مُردوں کو نہیں سنا سکتا۔ اس سے مراد سماع معتاد ہے وہ جو قبول اَور انتفاع کو متضمن ہے جیسا کہ کفار کے حق میں نفی سماع نافع کی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور اگر اللہ ان میں خیر جانتا تو انہیں سنا دیتا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ (کافر قیامت کے دن دوزخ میں پہنچ کر کہیں گے) اگر ہم سنتے ہوتے یا ہم جانتے ہوتے (تو ہم دوزخ میں نہ آتے) اور جب کافر سے بظاہر مطلقاً سننے کی نفی کی گئی ہے۔ حالانکہ معلوم ہے کہ نفی دل کے اُس سننے کی ہے جو فہم وقبول کو متضمن ہو نفی محض سماع کلام کی نہیں ہے۔ سو اسی طرح مُشبّہ بہ یعنی میت میں مُراد لینی چاہئے۔ (تاکہ مُشبّہ بہ کا تعلق ظاہر ہو)

قارئین کرام کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ مختصر الفتاوی المصریہ، فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ملخص ہے۔ گویا یہ سب کچھ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ ان تمام واضح اَور رَوشن عبارات سے معلوم ہوا کہ مُردوں سے مطلقاً سماع کی نفی نہیں کی گئی، بلکہ اس سماع کی نفی کی گئی ہے جو سماع مفید اَور نافع ہوسکتا ہے۔ کیونکہ زندہ کفار سے (جو مُشبّہ ہیں) جس سماع کی نفی کی گئی ہے وہ سماع قبول اور نافع ہے۔ سو اسی طرح مُردوں سے بھی (جو مُشبّہ بہ کے درجہ میں ہیں) نفی مطلقاً سماع کی نہیں، بلکہ اُس سماع کی نفی ہے جو مفید اور نافع ہے اور نصوصِ قطعیہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ کُفّار اس دُنیا میں جب کہ وہ بقیدِ حیات ہیں، ویسے تو سنتے ہیں اور ان کے کان، آنکھیں اور دِل سبھی کچھ موجود ہیں۔ مگر سماعِ قبول سے محروم ہیں۔

ذیل کی قرآنی آیات سے اس مسئلہ پر بخوبی روشنی پڑتی ہے کہ کفار کے لئے کس سماع کا ثبوت ہے اور کون سا سماع ان سے منفی ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کفار کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ'' (البقرۃ:۱۸)

''وہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹیں گے۔''

''کون عقلمند یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ دُنیا میں سبھی کفار بہرے، گونگے اور اندھے ہوتے ہیں اور کوئی کافر دُنیا میں نہ تو کوئی بات سنتا ہے اور نہ کسی سے کلام کرسکتا ہے اور نہ کسی چیز کو دیکھ سکتا ہے؟ بات صرف اتنی ہے کہ ویسے تو بہرے نہیں مگر بتفسیر حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ یعنی بہرے ہیں جو سچی بات نہیں سنتے، گونگے ہیں جو سچی بات نہیں کہتے، اندھے ہیں جو اپنے نفع ونقصان کو نہیں دیکھتے۔'' حالانکہ بظاہر ان کے کان، آنکھیں اور زبانیں بالکل درست ہیں لیکن وہ ان سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے: ''وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْئِدَةً فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ كَانُوْا یَجْحَدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ'' (الاحقاف:۲۶)

''اور ہم نے ان کو دیئے تھے کان اور آنکھیں اور دل۔ پھر کام نہ آئے اُن کے کان اور نہ اُن کی آنکھیں اور نہ اُن کے دل کسی چیز میں اس لئے کہ وہ انکار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی باتوں سے اور ان کو اس چیز نے گھیر لیا جس سے وہ مسخرہ کرتے تھے۔''

یعنی ان کو نصیحت سننے کے لئے کان اور قدرت کی نشانیاں دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سمجھنے بوجھنے کے لئے دل دیئے گئے تھے، پر وہ کسی قوت کو کام میں نہ لائے۔ اندھے، بہرے اور پاگل بن کر پیغمبروں کے مقابل ہوگئے، آخر انجام یہ ہوا کہ یہ سب قوتیں موجود ہیں اور عذاب الٰہی نے آگھیرا۔ کوئی اندرونی اور بیرونی قوت اس کو دفع نہ کرسکی۔ اس آیت کریمہ سے صراحۃً معلوم ہوا (اور بھلا مشاہدہ کو جھٹلا بھی کون سکتا ہے؟) کہ کفار کے لئے دُنیا میں کان، آنکھیں اور دل تھے مگر وہ بدبخت اپنے سُوءِ اختیار سے ان سے فائدہ اور نفع نہ لے سکے اور انجام کار تباہ ہوگئے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ''

''اور ہم نے پیدا کئے دوزخ کے واسطے بہت سے جن اور اِنسان ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں اور کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں، وہ ایسے ہی جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ اور وہی لوگ ہیں غافل۔'' (الاعراف:۱۷۹)

یعنی دِل، کان، آنکھ سب کچھ موجود ہیں لیکن نہ دِل سے آیات اللہ میں غور کرتے ہیں نہ قدرت کے نشانات کا بنظر تعمق واعتبار مطالعہ کرتے ہیں اور نہ خدائی باتوں کو بسمع قبول سنتے ہیں جس طرح چوپائے جانوروں کے تمام ادراکات صرف کھانے پینے اور بہیمی جذبات کے دائرہ میں محدود ہوتے ہیں۔ یہی حال ان کا ہے کہ دِل ودماغ ہاتھ پاؤں، کان آنکھ غرض اللہ کی دی ہوئی سب قوتیں محض دُنیوی لذائذ اور مادّی خواہشات کی تحصیل وتکمیل کے لئے وقف ہیں۔ انسانی کمالات اور ملکوتی خِصال کے اکتساب سے کوئی سروکار نہیں۔ (از مولانا عثمانی رحمہ اللہ)

(۴) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''اَوَ لَمْ یَهْدِ لِلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ'' (الاعراف: ۱۰۰)

''کیا ظاہر نہیں ہوا ان لوگوں پر جو وارث ہوئے زمین کے، وہاں کے لوگوں کے ہلاک ہونے کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو پکڑ لیں ان کے گناہوں پر اور ہم نے مُہر کر دی ان کے دلوں پر، سو وہ نہیں سنتے۔''

اس آیت کریمہ کے آخری حصہ میں اس کی تصریح ہے کہ کافر نہیں سنتے۔ کیا اس کا یہی مطلب ہے کہ سچ مچ حقیقۃً کافر دُنیا میں نہیں سنتے؟ کون مسلمان اس ظاہری مفہوم سے دھوکا کھا سکتا ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ○ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ'' (حٰمٓ السجدۃ: ۳،۴)

''(یہ) ایک کتاب ہے جس کی آیتیں جُدا جُدا تفصیل سے بیان کی گئی ہیں قرآن (ہے) عربی زبان میں سمجھنے والوں کے لئے خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا پر ان میں اکثر لوگوں نے اس سے اعراض کیا۔ سو وہ نہیں سنتے۔

اس مضمون میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ کافر قرآن کریم کو نہیں سنتے۔ حالانکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کفار اپنے سر میں لگے ہوئے حسّی کانوں سے قرآنِ کریم سنتے تھے اور سنتے ہیں لیکن اُنہوں نے اس کو قبول نہ کیا اور گوش دل سے نہ سُنا اور اُنہیں اسے تسلیم کرنے اور اس پر ایمان لانے کی توفیق نہ ہوئی تو سُنا اَن سُنا برابر ہے۔ اب اگر قرآنِ کریم کے صحیح مطلب اور مُراد سے چشم پوشی کر کے کوئی شخص اس دعویٰ پر مُصر رہے کہ اس دُنیا میں زندہ رہ کر بھی کافر مطلقاً اور قطعاً قرآنِ کریم نہیں سنتے تھے اور ''فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ'' اس کی قطعی اور یقینی دلیل ہے تو ایسے ضدی انسان کو بھلا دُنیا میں کون سمجھا سکتا ہے؟ اور اس کا علاج بھی کیا ہے؟

(۶) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ'' (الانفال: ۲۱)

''اور تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا ہم نے سُن لیا اور وہ نہیں سنتے۔''

اس آیتِ کریمہ میں کافروں کے لئے سماع بھی ثابت ہے اور سماع کی نفی بھی ہے کہ جس کا مطلب اس کے سواء اور کیا ہو سکتا ہے کہ اگر چہ کافر زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم نے سُن لیا لیکن وہ سننا ہی کیا ہے جس کو آدمی قبول نہ کرے اور ماننے پر آمادہ نہ ہو۔ اب اگر کوئی شخص ''وَ هُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ'' کے ظاہری مفہوم پر ہی ڈٹ جائے اور لوگوں کو یہ باور کرانے کے درپے ہو کہ زندہ کافر بھی نہیں سنتے تو یہ اس کی کوئی دینی خدمت نہ ہو گی اور قرآن فہمی اور دین شناسی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ سوء فہم اور تعصب اور تحزب سے بچائے۔

(۷) اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے: ''وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِیْۤ اُذُنَیْهِ وَقْرًا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ'' (لقمان: ۷، الجاثیہ)

''اور جب اس پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ پیٹھ پھیرتا ہے تکبر سے گویا اُس نے ان کو سنا ہی نہیں گویا اس کے دونوں کان بہرے ہیں۔ سو خوش خبری سُنا اس کو دَردناک عذاب کی۔

یعنی کافر و مشرک پر جب اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ سنتا تو ہے لیکن حق سے ضد اور عناد رکھ کر پیٹھ پھیر دیتا ہے اور تکبر و غرور کے نشے میں مست رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا اُس نے سُنا ہی نہیں اور اَیسا محسوس ہوتا ہے جیسا ان کے دونوں کانوں میں بوجھ ہے اور کوئی بات اس کے کانوں تک پہنچتی ہی نہیں۔ کیونکہ جب سُننے کا فائدہ اور نفع

اس کو قبول کرنا ہے مگر جب قبول نہ کیا تو کیا سُنا؟ اور اس سُننے کا کیا ثمرہ نکلا؟ یوں کہہ دیجئے گویا اُس نے سُنا ہی نہیں۔

(۸) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا'' (الفرقان: ۴۴)

''کیا تو خیال کرتا ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں؟ اور کچھ نہیں وہ برابر ہیں چوپایوں کے بلکہ وہ زیادہ بہکے ہوئے ہیں راہ سے۔''

اس آیت کریمہ میں بھی یہ حقیقت آشکارا کی گئی ہے کہ کفار کی اکثریت نہ تو سنتی ہے اور نہ سمجھتی ہے لیکن سماع اور سمجھ کی اس نفی کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کانوں اور عقل سے بے بہرہ ہیں، بلکہ اس سے وہی سماع اور عقل مراد ہے جس سے نفع وضرر کی شناخت ہو سکے اور بُرے بھلے کی تمیز کی جا سکے اور اپنی سرکشی کی وجہ سے کفار اسی سے حرماں نصیب ہیں۔

(۹) فرمانِ خداوندی ہے: ''وَ مَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ'' (النحل، الروم)

''اور تو نہیں ہدایت دے سکتا اندھوں کو ان کی گمراہی سے، تو نہیں سُنا سکتا مگر صرف ان کو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں، سو وہ مسلمان ہوتے ہیں۔''

اس سے ظاہری اُور سطحی طور پر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ صرف اُنہی لوگوں کو سنا سکتے تھے (اُور صرف وہی لوگ سُنتے تھے) جو مؤمن اور مسلمان ہوتے تھے۔ نہ دُوسروں کو آپ سنا سکتے تھے اُور نہ وہ سنتے تھے۔ کون مسلمان اس ظاہری مفہوم سے دھوکا کھا سکتا ہے اُور یہ بے بنیاد دعویٰ کر سکتا ہے کہ واقعی نہ تو نبی کریم ﷺ کافروں کو سنا سکتے تھے اور نہ کافر سنتے تھے۔ بات تو صرف اس قدر ہے کہ نصیحت سنانا ان کے حق میں نافع ہو سکتا ہے جو سُن کر اس کا اثر قبول کریں اور اسے مان لیں لیکن کافروں نے اس کا اثر قبول نہیں کیا گویا انہوں نے سُنا ہی نہیں اگرچہ حقیقت میں اُنہوں نے سُن ہی لیا ہوتا ہے۔ الغرض ان تمام مضامین میں سماع سے جو مقصود ہے وہ مان لینا اور قبول کرنا ہے اور اسی قبولیت اور تسلیم سے کافر محروم ہیں۔ حضرت مولانا عثمانی رحمہ اللہ ''سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ'' کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں: ''سماعون کے معنیٰ ہیں بہت زیادہ سننے اور کان دَھرنے والے۔ پھر بہت زیادہ سننا کبھی تو جاسوسی پر اطلاق کیا جاتا ہے اور کبھی اس کے معنے ہوتے ہیں بہت زیادہ قبول کرنے والا جیسے ''سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' میں سننے کے معنیٰ قبول کرنے کے ہیں۔'' (حاشیہ ص ۱۴۷)

(۱۰) اللہ تعالیٰ نے کفار کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ''الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَ كَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا'' (الکہف: ۱۰۱)

''وہ جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا تھا میری یاد سے اُور وہ نہ سُن سکتے تھے۔''

یعنی حق کے ساتھ ضد اور عناد کی وجہ سے حق سُننے کی تاب بھی وہ اپنے اندر نہیں رکھتے تھے اور اتنا حوصلہ ہی نہ تھا کہ دِلجمعی اور عالی ہمتی کے ساتھ شرح صدر سے حق کو سُن لیتے۔ ان بدبختوں نے وہ قدرت ہی ضائع کر دی جو اُن کو اللہ تعالیٰ نے حق قبول کرنے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کے لئے مرحمت فرمائی تھی۔

علامہ عبدالعزیز فرہاروی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی حدود ۱۲۳۷ھ) فرماتے ہیں کہ: ''و لهذا ای لان تارک قصد الخير مضيع للقدرة عليه ذمّ الكافرون بانهم لا يستطيعون السمع ای لا يقصدون سمع الحق علی وجه

القبول فلا یخلق فیھم الا استطاعۃ علی سمعہ و لو قصدوہ لخلقھا فیھم فھم المضیعون لھا'' (نبراس ص ۲۸۱)

''اور اسی لئے کفار کی مذمت کی گئی ہے کہ وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے۔ کیوں خیر اور نیکی کے قصد کرنے کا تارک خود قدرت کو ضائع کرنے والا ہے۔ مُراد یہ ہے کہ وہ حق کو قبول کرنے کے ارادے سے سننے کا قصد ہی نہیں کرتے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ان میں اس کے سننے کی استطاعت ہی پیدا نہیں کرتا اور اگر وہ اس کا قصد کرتے تو اللہ تعالیٰ ان میں استطاعت پیدا کر دیتا۔ سو وہی اس قدرت کو ضائع کرنے والے ہیں۔''

قرآنِ کریم کے ان صریح مضامین اور ان کی تشریح و تفسیر سے جو بیشتر مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سے ماخوذ ہے۔ یہ بات بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ کفار و مشرکین کے لئے اس دُنیا کی زندگی میں بھی سماع کی نفی کی گئی ہے لیکن اس سے مُراد سماع نافع مفید اور سماع قبول ہے، مطلقاً سماع مراد نہیں ہے۔ اسی طرح اس سماع کی نفی سے بھی جو موتی سے ہے، سماع نافع و قبول مراد ہے نہ کہ مطلق سماع اور اسی صورت میں منشاء خداوندی بھی پورا ہوتا ہے اور مُشبّہ اور مُشبّہ بہ میں وجہِ تشبیہ بھی خوب واضح ہوتی ہے اور ہر چیز اپنے اپنے موقع پر بالکل فٹ بیٹھتی ہے اور کسی کا کسی سے تعارض و تضاد باقی نہیں رہتا اور اس ٹھوکر کا یہ مرحلہ اسی وقت پیش آتا ہے۔ جب بجائے حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ اور اکابر کی بات پر اعتماد کرنے کے اپنی اختراعی تاویلات سے کام لیا جائے۔ جیسا کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے ؎

ولے تاویل شاں در حیرت انداخت خدا و جبرائیل و مصطفیٰ را

دوسری آیت کریمہ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''فَاِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ'' (النمل، الروم: ۵۲)

''البتہ تو نہیں سنا سکتا مُردوں کو اور نہیں سُنا سکتا بہروں کو اپنی پکار جب لَوٹیں وہ پیٹھ پھیر کر۔''

حضرات منکرین سماع موتی اپنے دعویٰ کے لئے اس آیت کریمہ سے بزعمِ خویش سمجھی ہوئی مُراد کو حُجت قطعیہ سمجھتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مُردے نہیں سنتے کیونکہ جب اسماع کی نفی ہوئی تو سماع کی لازماً نفی ہوگئی۔

الجواب: اس آیت کریمہ کی دو تفسیریں مشہور ہیں۔ پہلی تفسیر یہ ہے کہ اس میں سماع نافع کی نفی ہے۔

چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''ای لا تسمعھم شیئاً ینفعھم'' (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۸۴)

یعنی تُو اُن کو کوئی ایسی شئے نہیں سنا سکتا جو اُن کو نفع دے۔ مطلب واضح ہے کہ مطلق سماع و اسماع کی نفی نہیں بلکہ سماع مفید و نافع کی نفی ہے اور سابق پیش کردہ مفصل بحث اور قرآنِ کریم کی صریح آیات اور ان کی ضروری تشریح کی موجودگی میں اس کے سمجھنے میں کسی بھی عقلمند کو قطعاً کوئی دُشواری پیش نہیں آسکتی۔ ہاں! دُشواری ہوگی تو صرف حق تسلیم کر لینے اور اس کو قبول کر لینے میں۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے اس مختصر مگر کافی و شافی تفسیر کی موجودگی میں مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ طلباءِ علم کو علمی و تحقیقی طور پر کوئی اُلجھن باقی نہ رہے۔ اس لئے مزید تشریح کرتے ہیں اور چند اہم حوالے ہم عرض کئے دیتے ہیں۔ ماننے والوں کے لئے ان میں اطمینانِ قلب کا خاصا مواد ہوگا اور نہ تسلیم کرنے والوں کا پارہ اس سے اور چڑھ جائے گا اور یہ ایک فطری بات ہے کسی کے بس کی نہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: ''و قد استدلت اُمّ المؤمنین عائشۃ صدیقۃ رضی اللہ عنہا بھذہ الآیۃ اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی علی توھیم عبداللہ بن عمر فی روایتہ مخاطبۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم القتلی الذی القوا فی قلیب بدر بعد

ثلاثة ايّام و معاتبته اياهم و تقريعه لهم حتّٰى قال له عمر يا رسول الله ماتخاطب من قوم قد جيفوا؟ فقال والذى نفسى بيده ما انتم باسمع لما اقول منهم و لكن لا يجيبون و تاوّلته عائشة رضى الله عنها على انه قال انهم الآن ليعلمون ان ما كُنت اقول لهم حق و قال قتادة احياهم الله له حتّٰى سمعوا مقالته تقريعًا و توبيخًا و نقمةً و الصحيح عند العلماء رواية عبدالله بن عمر لما لها من الشواهد على صحتها من وجوه كثيرة من اشهر ذٰلك ما رواه ابن عبدالبر مصححاله'' (تفسیر ج ۳ ص ۴۳۸)

''حضرت اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' کی آیت سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے وہم پر استدلال کیا جو (بقول اُن کے) ان کو اس روایت کے بیان کرنے میں ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولین بدر سے جب ان کو کنوئیں میں ڈالا گیا، تین دن کے بعد خطاب کیا اور اُن کو ڈانٹ پلائی اور اُن کو سرزنش کی یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یارسول اللہ! آپ ایک مُردہ قوم سے کیسے خطاب فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ اُس اللہ کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم اس بات کو جوئیں اُن سے کہہ رہا ہوں، اُن سے زیادہ نہیں سنتے۔ لیکن وہ جواب نہیں سکتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس کی یہ تاویل کی کہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ بلاشبہ یہ کفار اب جانتے ہیں کہ میں جو کچھ ان سے کہا کرتا تھا وہ حق ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو آپ کی خاطر زندہ کیا حتیٰ کہ انہوں نے آپ کی بات سنی اور یہ سب کچھ سرزنش، ڈانٹ اور اُن کی بُرائی اُن پر ظاہر کرنے کے لئے تھا لیکن جمہور علماء کے نزدیک حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہی کی روایت صحیح ہے۔ کیوں اس کی صحت کے متعدد اسانید سے بکثرت شواہد ہیں جن سے مشہور وہ روایت ہے جس کی امام ابن البر رحمہ اللہ نے تصحیح کی ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے وہی سابق روایت نقل کی جس کی مفصل بحث پہلے گزر چکی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے اس بیان کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت صحیح ہے۔ کیونکہ اس کی صحت پر متعدد وجوہ سے شواہد موجود ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ شواہد پیش کئے ہیں جن میں سے ایک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی وہ مرفوع روایت ہے جس کی تصحیح امام ابن البر رحمہ اللہ نے کی ہے اور ہم باحوالہ پہلے اس کو عرض کر چکے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت اور ان کا استدلال خود محتاج تاویل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علمی مقام اور شان اپنی جگہ پر مسلّم ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس کی روایت (مسلم ج ۲ ص ۳۸۷) میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ جن کی روایت (بخاری ج ۲ ص ۵۶۶، مسلم ج ۲ ص ۳۸۷) میں ہے۔ وغیرہ! جلیل القدر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحیح روایات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور جمہور کی تحقیق کو نظر انداز کر کے کِس کِس کے وہم کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جنگ جمل کے موقع پر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں یہ فرمایا تھا۔

''و تعلمون ان وهن النساء و ضعف رأيهنّ الى التلاشى'' (الامۃ والسیاسۃ لابن قتیبۃ رحمہ اللہ ج ۲ ص ۶۷ طبع مصر)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ پر یہ گرفت (بخاری ج ۲ ص ۵۶۷ و مسلم ج ۲ ص ۳۸۷) وغیرہ میں موجود ہے جس میں انهم الآن ليعلمون کے الفاظ موجود ہیں لیکن علم سماع کے منافی نہیں ہے۔

چنانچہ علّامہ داود بن سلیمان البغدادی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''و قال علماء الامة ان العلم يستلزم السماع و لا ينافيه كما حقيقه ابن تيمية و ابن القيم و ابن رجب و السيوطى و غيرهم'' (المنحۃ الوھبیۃ ص ۹)

''علماء اُمت نے یہ کہا ہے کہ علم سماع کو مستلزم ہے اس کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ، امام ابن القیم، علامہ ابن رجب اور امام سیوطی وغیرہ (رحمہم اللہ) نے اس کی تحقیق کی ہے۔''

(۲) حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''و ھذا مصیر من عائشۃ رضی اللہ عنہا الی رد روایۃ ابن عمر رضی اللہ عنہ المذکرۃ و قد خالفھا الجمھور فی ذٰلک و قبلوا حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ لموافقۃ من رواہ غیرہ علیہ و اما استدلالھا بقولہ تعالٰی اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی فقالوا معناھا لا تسمع سماعًا ینفعھم او لا تسمعھم الّا ان یشاء اللہ تعالٰی قال السھیلی عائشۃ رضی اللہ عنہا لم تحضر قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم فغیرھا ممن حضر (حفظ للفظ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و قد قالوا لہ یا رسول اللہ اتخاطب قومًا قد جیفوا فقال ما انتم باسمع لما اقول منھم قال و اذا اجاز ان یکونوا فی تلک الحال عالمین جاز ان یکونوا سامعین اما باذان رؤسھم کما ھو قول الجمھور او باٰذان الروح علٰی رای من یوجہ السوال الی الروح من غیر رجوعٍ اِلی الجسد قال و اما الاٰیۃ فانھا کقولہ تعالٰی اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَھْدِیْ الْعُمْیَ ای ان اللہ تعالٰی ھو الذی یُسمع و یھدی انتھٰی و قولہ انھا لم تحضر صحیح لٰکن لا یقدح ذٰلک فی روایتھا لانہ مرسل صحابی و ھو محمول علٰی انھا سمعت ذٰلک ممّن حضرہ او من النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد و لو کان ذٰلک قادحًا فی روایتھا لقدح فی روایۃ ابن عمر رضی اللہ عنہ فانہ لم یحضر ایضاً و لا مانع ان یکون النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اللفظین معًا فانہ لا تعارض بینھما و قال ابن التین لا معارضۃ بین حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ و الاٰیۃ لان الموتٰی لا یسمعون بلا شک لٰکن اذا اَراد اللہ تعالٰی اسماع ما لیس من شأنہ السماع لم یمتنع کقولہ تعالٰی اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ الاٰیۃ و قولہ فَقَالَ لَھَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا'' (فتح الباری ج ۳ ص ۲۷۷)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی اس تاویل میں اس طرف جارہی ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت مردُود ہے لیکن جمہور اہلِ اسلام نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کو قبول کیا ہے۔ کیونکہ دُوسرے حضرات کی روایتیں ان کے موافق ہیں۔ رہا ان کا ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' سے استدلال تو جمہور نے کہا ہے کہ اس کا معنٰی یہ ہے کہ تو ان کو اس طرح نہیں سنا سکتا، جس سے ان کو نفع ہو یا اُن کو اللہ تعالٰی کی مشیت کے بغیر نہیں سنا سکتا۔ امام سہیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بدر میں آپ کے اس ارشاد کے موقع پر حاضر ہی نہ تھیں۔ لہٰذا اُن حضرات کو جو اس موقع پر حاضر تھے آپ کا فرمان زیادہ یاد ہو سکتا ہے۔ حالانکہ انہوں نے آپ سے کہا یا رسول اللہ کیا آپ ایسی قوم سے خطاب فرماتے ہیں جو مُردہ ہے؟ سو آپ نے فرمایا کہ مَیں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کو تم ان سے زیادہ نہیں سنتے۔ انہوں نے فرمایا کہ جب کفار اس حالت میں جاننے والے ہیں تو جائز ہے کہ وہ سننے والے بھی ہوں یا تو اپنے سر کے حِسّی کانوں سے، جیسا کہ جمہور کا قول ہے اور یا رُوح کے کانوں سے، اُن حضرات کے نزدیک جو یہ کہتے ہیں کہ (نکیرین کا) سوال رُوح کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور رُوح بدن کی طرف نہیں لَوٹتی اور فرمایا کہ رہی آیت کریمہ، تو وہ اللہ تعالٰی کے اس ارشاد کی طرح ہے کہ کیا تو بہروں کو سُنا سکتا ہے یا اندھوں کو ہدایت دے سکتا ہے۔ یعنی (تیری قدرت نہیں) اللہ تعالٰی ہی سناتا اور ہدایت دیتا ہے۔ امام سُہیلی رحمہ اللہ کا بیان ختم ہوا۔ اُن کا یہ ارشاد کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس موقع پر حاضر نہ تھیں صحیح ہے لیکن اس کی وجہ سے ان کی روایت میں کوئی عیب پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ صحابی کا مرسل ہے جو اس بات پر محمول ہے کہ انہوں نے اُس موقع پر حاضرین سے سُنا یا براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بعد سُنا اور اگر اس وجہ سے ان کی روایت پر

قدح ہو سکتی ہے تو یہی اعتراض بعینہٖ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت پر بھی ہے جو اُس موقع پر حاضر نہ تھے اور کوئی مانع نہیں کہ آپ نے دونوں لفظ (سماع اور علم کا) اکٹھے ارشاد فرمائے ہوں۔ کیونکہ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ محدث ابن التین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث اور اس آیت میں کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ مُردے خود نہیں سنتے لیکن جب اللہ تعالیٰ چاہے کہ ایسی چیز سنا دے جس کی شان سننا نہیں تو یہ ممتنع نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی اور جیسا فرمایا کہ اس نے آسمانوں اور زمین سے فرمایا کہ تم خوشی سے بن جاؤ یا جبراً۔''

امام ابوالقاسم عبدالرحمن السہیلی رحمہ اللہ (المتوفی ۵۸۱ھ) کی جس عبارت کا حوالہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دیا ہے وہ ان کی کتاب (الروض الانف ج ۲ ص ۴۷، طبع مصر) میں ہے۔ اس عبارت میں بے شمار فوائد میں سے چند یہ ہیں جو صراحت سے درخشاں ہیں۔

(۱) جمہور نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے۔ (۲) جمہور نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو قبول کیا ہے کہ مُردے سنتے ہیں۔ (۳) اس روایت کے بیان کرنے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ متفرد نہیں بلکہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ (۴) ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' سے ایسے سماع کی نفی ہے جو نافع اور مفید ہو اور مرنے کے بعد جب تکلیفی زندگی ہی ختم ہوگئی تو اب ان کو اس سماع سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ (۵) اور یا یہ مطلب ہے کہ تو ان کو نہیں سنا سکتا یعنی تجھے اس پر قدرت نہیں۔ ہاں! اللہ تعالیٰ جب چاہے ان کو سنا دے۔ (۶) جمہور کے نزدیک یہ سماع رُوح اور بدن دونوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ (۷) ہاں! کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ یہ سماعت رُوحانی ہے اور وہ ''رَدّ الروح الی الجسد'' کے قائل نہیں ہیں لیکن جمہور کا یہ مسلک نہیں ہے۔ والحق مع الجمہور اور آگے کتاب المغازی میں فرماتے ہیں کہ: ''قال البیهقی رحمہ اللہ العلم لا یمنع من السماع والجواب عن الآیة انه لا یسمعهم وهم موتی ولکن الله تعالٰی احیاهم حتّٰی سمعوا کما قال قتادة ولم ینفرد عمر رضی اللہ عنہ ولا ابنه بحکایة ذٰلک بل وافقهما ابو طلحة رضی اللہ عنہ کما تقدم وللطبرانی من حدیث ابن مسعود مثله باسناد صحیح ومن حدیث عبدالله بن سیدان نحوه وفیه قالوا یا رسول الله وهل یسمعون؟ قال یسمعون کما تسمعون ولکن لا یجیبون وفی حدیث ابن مسعود ولٰکنهم الیوم لا یجیبون ومن الغریب ان فی المغازی لابن اسحاق روایة یونس بن بکیر اسناد جید عن عائشة رضی اللہ عنہا مثل حدیث ابی طلحة وفیه ما انتم باسمع لما اقول منهم واخرجه احمد باسناد حسن فان کان محفوظًا فکانّها رجعت عن الانکار لما ثبت عندها من روایات هؤلاء الصحابة رضی اللہ عنہم لکونها لم تشهد القصة'' (فتح الباری ج ۸ ص ۳۰۵، ۳۰۶)

''امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ علم سماع سے نہیں روکتا اور آیت کریمہ کا یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ اس حالت میں وہ نہیں سنتے جب وہ مُردے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے آپ کا کلام سنا جیسا کہ قتادہ رحمہ اللہ کی روایت میں ہے اور اس حدیث اور حکایت کو بیان کرنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی متفرد نہیں ہیں بلکہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بھی ان کے موافق ہیں جیسا کہ گزر چکا ہے اور طبرانی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ایسی ہی ہے جس کی سند صحیح ہے اور عبداللہ بن سیدان سے بھی اسی مضمون کی روایت ہے اور اس روایت میں ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا یا رسول اللہ کیا یہ سنتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! سنتے

ہیں، اسی طرح جیسے تم سنتے ہو لیکن وہ جواب (جس کو تم سنو) نہیں دے سکتے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ "لیکن وہ آج کے دن جواب نہیں دیتے" اور یہ بڑی نرالی بات ہے کہ ابن اسحاق رحمہ اللہ کے مغازی میں یونس بن بکیر رحمہ اللہ کے طریق سے جید اسناد کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح روایت ہے جیسے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے جس میں "ما انتم باسمع لما اقول منهم" کے الفاظ موجود ہیں اور امام احمد رحمہ اللہ نے بھی حسن اسناد کے ساتھ اس کی تخریج کی ہے۔ سو اگر یہ الفاظ محفوظ ہوں تو گویا یہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سماع موتی کے انکار سے رجوع کر لیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک ان جلیل القدر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایتیں ثابت ہو گئیں (جو موقع پر حاضر تھے اور) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حاضر نہ تھیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ: (۱) اثبات علم اور اثبات سماع کی حدیثوں میں حقیقۃً کوئی تعارض نہیں۔ دونوں جمع ہو سکتی ہیں۔ (۲) آیت کا یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپ ان کو مُردہ ہونے کی حالت میں نہیں سُنا سکتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا تھا جیسا کہ حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے کہا تو پھر انہوں نے سُن لیا۔ (اور اعادۂ روح سب کے لئے ثابت ہے۔ لہٰذا سب سُن سکتے ہیں۔ صفدرؔ) (۳) سماع موتی کی روایت بیان کرنے میں صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزند عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہی متفرد نہیں بلکہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن سیدان بھی اس قصہ کے بیان میں ان کے مؤید و مصدّق ہیں۔ (۴) اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ باسناد جید اور اسناد حسن سماع موتی کی روایت مروی اور ثابت ہے۔ (۵) اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت میں سماع کا لفظ محفوظ ہے (اور جب بقول ان کے سند جید اور حسن ہے تو قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ لفظ محفوظ ہی ہے۔ صفدرؔ) تو پھر یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انکار سماع موتی سے رجوع کر لیا تھا۔ کیونکہ جب ان کے نزدیک دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایات ثابت ہو گئیں جو اُصل موقع پر موجود تھے اور وہ خود وہاں موجود نہ تھیں تو انہوں نے اپنے سابق نظریہ سے رجوع کر لیا اور اس مسئلہ میں اُن کی ہم نوا ہو گئیں۔ کیونکہ اکثریت دوسری طرف تھی اور مشہور ہے کہ ؎

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو!

مولانا مبارک پوری صاحب رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ: "قال الحافظ فی فتح الباری قال القرطبی رحمہ اللہ انکار حضرت عائشة رضی اللہ عنہا ذلک وحکمها علی الراوی بالتخطیة او النسان او غلی انه سمع بعضًا و لم یسمع بعضا بعید لان الرواة لهذا المعنی من الصحابة رضی اللہ عنہم کثیرون و هم جازمون فلا وجه للنفی مع امکان حمله علی محمل صحیح" (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۱۳۶)

"حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سماع موتی کا انکار اور ان کا راوی پر خطا یا نسیان کا حکم لگانا یا یہ کہنا کہ راوی نے بعض حصہ سُنا اور بعض نہیں سُنا ایک بعید سی بات ہے۔ کیونکہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس مفہوم کو بیان کرنے والے بکثرت ہیں جو جزم سے بیان کرتے ہیں۔ لہٰذا نفی کی کوئی وجہ نہیں۔ جب کہ اس کو صحیح محمل پر (مثلاً یہ کہ سماع قبول کی نفی ہے) حمل کرنا ممکن ہے۔"

حضرت مولانا محمد عبدالحیٔ صاحب لکھنوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "و اما رد عائشة رضی اللہ عنہا بعض تلک الاحادیث فلم یعتد بِه جمهور الصحابة رضی اللہ عنہم و من بعدهم و اما قوله تعالٰی اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی ففیه نفی الاسماع

لا السماع علی ان الصحیح ان المراد بالموتی ھناک موتی القلوب و ھم الکفار لا الاموات العرفیۃ الی ان قال و بالجملۃ لم یدل دلیل قوی علی نفی سماع المیت و ادراکہ و فھمہ و تألمہ لا من الکتاب و لا من السنۃ بل السنن الصحیحۃ الصریحۃ دالۃ علی ثبوتھا لہ و الحق فی ھذا المقام ان ھذا کلہ من تقریرات المشائخ و توجیھاتھم و تکلفاتھم و لا عبرۃ بھا حین مخالفتھا الاحادیث الصحیحۃ و آثار الصحابۃ الصریحۃ و اما ایمتنا فھم بریئون عن انکار ھذہ الامور'' (عمدۃ الرعایۃ ج ۲ ص ۲۵۴)

''بہرحال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ان بعض احادیث کا رد کرنا تو جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کے حضرات نے اس رد کا کوئی اعتبار نہیں کیا۔ رہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' تو اس سے نفی اسماع مراد ہے نہ کہ نفی سماع علاوہ ازیں صحیح بات یہ ہے کہ الموتی سے مراد اس مقام پر وہ کافر ہیں جن کے دِل مُردہ ہیں عُرفی اموات مُراد نہیں ہیں۔ (پھر آگے فرمایا) خلاصہ کلام یہ ہے کہ میّت کے سماع ادراک فہم اور اس کے تکلیف اُٹھانے کی نفی پر کوئی قوی دلیل دال نہیں ہے نہ کتاب اللہ سے اور نہ سُنّت سے بلکہ صحیح اور صریح حدیثیں ان اُمور کے میت کے لئے اثبات پر دال ہیں اور حق اس مقام میں یہ ہے کہ نفی کی جملہ تاویلات مشائخ کی اپنی تقریریں اور توجیہات و تکلفات ہیں اور احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقابلہ اور مخالفت میں ان تکلفات کا کوئی اعتبار نہیں۔ رہے ہمارے ائمہ (حضرت امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد وغیرہ رحمہم اللہ) تو نفی سماع موتی وغیرہ اُمور سے وہ بالکل بری ہیں۔''

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''و النص الصحیح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مقدم علی تاویل من تاول من اصحابہ و غیرہ و لیس فی القرآن ما ینفی ذلک فان قولہ اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی انما ارادبہ السماع المعتاد الذی ینفع صاحبہ فان ھذا مثل ضرب الکفار و الکفار تسمع الصوت لکن لا تسمع سماع قبول بفقہ و اتباع'' (فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ج ۴ ص ۲۹۸)

''وہ نص صحیح جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وارد ہے وہ اس تاویل پر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہم نے کی ہے، مقدم ہے اور قرآنِ کریم میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی نفی کرتی ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ بے شک تو مُردوں کو نہیں سُنا سکتا۔ اس سے مراد وہ معتاد سماع ہے جو سامع کو نفع دے۔ بلاشبہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے کفار کے لئے بیان فرمائی ہے اور کفار آواز سنتے ہیں لیکن سمجھ اور پیروی کے جذبہ سے سماع قبول اُن کو حاصل نہیں ہے۔''

اور اس سے قبل انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نام لے کر اُن کی عدم سماع موتی کی تاویل کو مرجوح قرار دیا ہے اور پھر زوردار الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ: ''و اھل العلم بالحدیث و السنۃ انفقوا علی صحۃ ما رواہ انس رضی اللہ عنہ و ابن عمر رضی اللہ عنہ و ان کانا لم یشھدا بدرا فان انس رضی اللہ عنہ روی ذلک عن ابی طلحۃ رضی اللہ عنہ و ابو طلحۃ رضی اللہ عنہ، شھد بدر'' (فتاویٰ ج ۴ ص ۲۹۷)

''حدیث و سنّت کا علم رکھنے والے اس اُمر پر متفق ہیں کہ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے (سماع موتی کی) حدیثیں صحیح ہیں۔ وہ دونوں اگرچہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے لیکن حضرت اَنس رضی اللہ عنہ نے یہ روایت حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور وہ بدر میں شریک تھے۔''

لطیفہ: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ کی محدثانہ اور فقیہانہ تحقیق تو آپ نے ملاحظہ کرلی اور مؤلف ندائے حق کی یہ گپ بھی آپ کو یاد ہوگی جو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ: ''تو یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا سکوت بطور

ندامت کے تھا کہ کیسے صاف صاف قرآنِ پاک میں سماعِ موتی کی نفی وارد ہے مگر ہمارے ذہن سے ذہول ہوگیا مارے شرمندگی کے خاموش ہو گئے اور اس مسئلہ میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہو گئے اور عدم سماع موتی پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہوگیا۔'' (ص ۱۵۱)

سبحان اللہ تعالیٰ کیا ہی عجیب تحقیق ہے جس کو سننے کے بعد محققین کے سر بھی شرم کے مارے جھک جاتے ہیں۔ موصوف کو معلوم ہونا چاہئے کہ جمہور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سماعِ موتی کا جو مؤقف پہلے تھا وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت اور تاویل سُن کر بھی بدستور باقی رہا۔ نہ تو وہ حضرات شرمندہ ہوئے اور نہ خاموش رہے۔ وہ بدستور زور و شور کے ساتھ سماعِ موتی کی حدیثیں بیان کرتے رہے اور تمام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہم نوا تو کیا ہوتے بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا انکارِ سماعِ موتی سے رجوع کر کے جمہور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہم نوا ہو گئیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رجوع کی وہ صحیح روایت بھی تائید کرتی ہے جو حضرت ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ سے یوں مروی ہے کہ: ''قال توفِّي عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ بِالْحُبْشِيِّ قال فحمل الی مکة فدفن فیها فلما قدمت عائشة رضی اللہ عنہا اتت قبر عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ فقالت الی قوله ثم قالت واللہ لو حضرتک ما دُفِنتَ اِلَّا حیث مُتَّ ولو شهدتک ما زُرتُک''

(ترمذی ج ۱ ص ۱۲۵، رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجالہ رجال الصحیح، مجمع الزوائد ج ۳ ص ۶۰)

''عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ (مکہ مکرمہ کے قریب) حُبشی کے مقام پر وفات پا گئے اور ان کو اُٹھا کر مکہ مکرمہ لایا گیا اور وہاں ان کو دفن کیا گیا جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (حج کے موقع پر) آئیں تو عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی قبر پر بھی آئیں تو کہا (مرثیہ کے دو شعر پڑھے جو ان کتابوں میں مذکور ہیں) پھر فرمایا: بخدا اگر میں تیری وفات کے وقت حاضر ہوتی تو تُو وہاں ہی دفن کیا جاتا جہاں تیری وفات ہوئی تھی اور اگر میں اُس وقت موجود ہوتی تو اب تیری قبر کی زیارت کے لئے میں نہ آتی۔''

ظاہر بات ہے کہ اگر یہ محض تحسّر اور افسوس کے طور پر خیالی رنگ میں حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ سے خطاب ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اُن کی قبر پر حاضر ہو کر یہ کہنے کی حاجت نہ ہوتی، وہ مدینہ طیبہ میں یا دُور ہی سے ایسا کہہ دیتیں۔ یہ خطاب اُن کے رجوع کا واضح قرینہ ہے۔

اور القاضی البیضاوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''و انما شُبِّهوا بالموتی لعدم انتفاعهم باستماع ما یتلی علیهم کما شُبِّهوا بالصم فی قوله تعالٰی ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین فان اسماعهم فی هذه الاحالة ابعد'' (تفسیر بیضاوی علی القرآن العظیم ص ۳۲۱، طبع مصر)

''ان زندہ کافروں کو مُردوں کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ اس چیز کو جو اُن پر پڑھی جاتی ہے، سُن کر نفع نہیں حاصل کرتے۔ جیسا کہ ان کو ''وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ'' کے ارشاد میں بہروں سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ اس حالت میں اُن کا سننا بعید تر ہے۔

اس تفسیر سے بھی معلوم ہوا کہ زندہ کفار کو مُردوں کے ساتھ تشبیہ اس اَمر میں نہیں دی گئی کہ وہ بسرے سے سنتے ہی نہیں بلکہ تشبیہ اس سماع کی ہے جو موجبِ انتفاع ہو اور یہ بالکل واضح ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ (التوفی ۱۳۶۲ھ) ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''ف: اس آیت سے بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ مُردے نہیں سنا کرتے ہر چند کہ مُردوں سے مراد یہاں کفار ہیں مگر تشبیہ جب ہی درست ہو سکے گی۔ جب مُردے نہ سنتے ہوں لیکن چونکہ بعض احادیث میں مُردوں کا سننا قریب جگہ نہ کہ بعید سے وارد ہے اس لئے بعض علماء نے آیت (کے معنی) میں کہا ہے کہ مراد سماع منفی سے سماع نافع ہے اور قرینہ اس کا علاوہ دفع تعارض حدیث کے یہ بھی ہے کہ کفار سے مطلق سماع کا منفی ہونا مشاہدہ کے خلاف ہے۔ البتہ سماع نافع ضرور منفی تھا۔ پس مُردوں سے بھی یہی منفی ہے۔ (یعنی تشبیہ صرف اس پہلو میں ہے نہ کہ نفس سماع میں۔ صفدر) چنانچہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی مُردوں کو نصیحت کرے، بیکار ہے۔ کیوں وہ دار العمل نہیں اور ثواب سے نفع ہونا یا تلاوت قرآن سے اُنس ہونا یہ دوسری بات ہے، مقصود مواعظ کا نافع نہ ہونا ہے اور بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ مُردے میں مردۂ حقیقی جسد ہے وہ نہیں سن سکتا مگر اس سے رُوح کی نفی لازم نہیں آتی (یعنی سماع بہر کیف ثابت ہے بدن اور رُوح مل جل کر سنیں جیسا کہ جمہور کا مسلک ہے یا نفس رُوح سُنے جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔ صفدر) اور علماء مانعین نے حدیثوں میں کچھ مناسب تاویلیں کر کے تعارض کو دفع کیا ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔'' (تفسیر بیان القرآن ج ۸ ص ۹۸)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل کشف تو عموماً سماع موتیٰ کے قائل ہیں اور اس مسئلہ میں، میں انہیں کا معتقد ہوں۔ کیونکہ مجھے ظن غالب ہے کہ موتیٰ سنتے ہیں۔ دیکھئے حدیث میں صاف وارد ہے: ''وانہ یسمع قرع نعالھم'' یعنی مُردہ گورستان میں آنے والوں کے جوتوں کی آواز سنتا ہے۔

(ملفوظات اسعد الابرار ص ۲۹۱، جمع کردہ مولانا سید محمد ابرار الحق صاحب خلیفہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ)

حضرت مولانا عبد الحق صاحب حقانی رحمہ اللہ جن کو مؤلف ندائے حق مُفسّر و متکلم کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ص ۴۲) (التوفی ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء) اپنی مُستند اور محقق تفسیر میں آیت روم کی اسی مذکورہ آیت کریمہ: ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: ''ان آیات سے بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ مُردہ نہیں سُنتا اور اس کی سند میں کچھ احادیث و اقوال بھی پیش کرتے ہیں۔ آج کل یہ مسئلہ سماع موتیٰ باہمی قیل وقال کا بڑا میدان ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس کی پوری تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے مگر مختصراً کچھ بیان کرتا ہوں۔ ان آیات میں تو عدمِ سماع کا اشارہ تک بھی نہیں ہے۔ اِس لئے ان سے استدلال کرنا بے فائدہ بات ہے رہے احادیث و اقوال، ان سے بھی صاف معلوم نہیں ہوتا کہ مَیّت نہیں سُن سکتی بلکہ بہت سی صحیح احادیث اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ مُردے زندوں کی آواز سنتے ہیں۔ از اں جملہ وہ احادیث ہیں جو زیارتِ قبور کی بابت وارد ہیں۔'' (تفسیر حقانی ج ۶ ص ۴۱)

اس کے بعد اُنہوں نے چند صحیح احادیث کا تذکرہ فرمایا ہے جن کا ذکر ہم باحوالہ پہلے کر چکے ہیں۔

الغرض! جن آیات سے منکرین سماع موتیٰ انکار پر استدلال کرتے ہیں۔ ان آیات کی عدم سماع موتیٰ پر دلالت تو کیا ہوتی۔ بقول علامہ حقانی رحمہ اللہ ان میں عدمِ سماع کا اِشارہ تک بھی نہیں ہے مگر یہ ظلم ہے کہ اب جو حضرات سماع موتیٰ کے منکر ہیں۔ وہ اس آیت سے اپنے استدلال کو نصِ قطعی سمجھتے ہیں اور مجوزین سماع موتیٰ کی تکفیر کرتے ہیں، جیسا کہ اسی کتاب میں باحوالہ نیلوی صاحب کی عبارتیں عرض کر دی گئی ہیں۔

دُوسری تفسیر

اس مضمون کی آیات کی دُوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ مثلاً: "اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی" کا مطلب یہ ہے کہ تیرے بس، اختیار اور قدرت میں یہ بات نہیں کہ تو مُردوں کو سنائے یہ کام تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ یعنی نفی اسماع کی ہے نہ کہ سماع کی۔

چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "لان الاسماع هو ابلاغ الصوت من المسمع فی اذن السامع فالله تعالٰی هو الذی اسمعهم بان ابلغهم صوت نبیه ﷺ بذلک" (فتح الباری ج ۸ ص ۳۰۶)

"اسماع کا معنی یہ ہے کہ سنانے والے کی آواز کو سُننے والے کے کان تک پہنچایا جائے سو یہ کام اللہ تعالیٰ کا ہے کہ اس نے آنحضرت ﷺ کی آواز کفار کے کانوں تک پہنچا دی۔"

اُور یہ بات شرعاً بالکل ثابت ہے کہ جو کام عادۃً انسان کے بس میں نہ ہو باوجود اس کے وہ کام کرنے کے اس سے نفی درست ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى"

"سو تم نے ان کو نہیں مارا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو مارا اور تُو نے نہیں پھینکی تھی مٹھی خاک جس وقت کہ پھینکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکی۔" (الانفال: ۱۷)

ظاہر اَمر ہے کہ غزوۂ بدر میں کفار کو قتل کرنے والے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ وغیرہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے اور کنکریوں کی ایک مٹھی آنحضرت ﷺ نے تین مرتبہ "شَاهَتِ الْوُجُوْه (ای قَبُحَتْ)" فرما کر پھینکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ بظاہر دونوں کی نفی فرما رہے ہیں کہ نہ تو تم نے کافروں کو قتل کیا ہے اور نہ حضور علیہ السلام نے کنکریوں کی مٹھی پھینکی ہے بلکہ یہ کام اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ خدا تعالیٰ کی قدرت سے کنکریوں کے ریزے ہر کافر کی آنکھ میں پہنچے وہ سب آنکھیں مَلنے لگے۔ اِدھر سے مسلمانوں نے فوراً دھاوا بول دیا۔ آخر بہت سے کافر کھیت رہے۔ اُسی کو فرماتے ہیں کہ بظاہر کنکریاں تم نے اپنے ہاتھ سے پھینکی تھی لیکن کسی بشر کا یہ فعل عادۃً ایسا نہیں ہو سکتا کہ مٹھی بھر کنکریاں ہر سپاہی کی آنکھ میں پڑ کر ایک مسلح لشکر کی ہزیمت کا سبب بن جائیں۔ یہ صرف خدائی ہاتھ تھا جس نے مٹھی بھر سنگ ریزوں سے فوجوں کے منہ پھیر دیئے اور تم بے سروسامان قلیل التعداد مسلمانوں میں اتنی قدرت کہاں تھی کہ محض تمہارے زورِ بازو سے کافروں کے ایسے ایسے مُنڈ مارے جاتے۔ یہ تو اللہ ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے ایسے متکبر سرکشوں کو فناء کے گھاٹ اُتارا۔ (فوائد شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ)

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ: "اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ" (القصص: ۵۶)

"بے شک تو ہدایت نہیں دے سکتا جس سے تو محبت کرے لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت دیتا ہے اور وہی خوب جانتا ہے اُن کو جو ہدایت پانے والے ہیں۔"

اب اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ آنحضرت ﷺ کسی فرد کو ہدایت نہیں دے سکتے تو اس کو ہدایت حاصل بھی نہیں ہو سکتی۔ مُراد تو بالکل واضح ہے کہ ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے آپ کا نہیں۔ آپ صرف راہ بتاتے اور

راہنمائی کرتے ہیں اور اس معنی میں آپ ہادیٔ برحق ہیں لیکن ہدایت دینے کے معنی میں ہادی صرف حق تعالیٰ ہے اور بس۔ کسی اور کا اس میں رتی بھر دخل نہیں ہے۔

اسی مد میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: ''اِنَّ اللّٰہَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ ''

'' بے شک اللہ تعالیٰ سناتا ہے جس کو چاہے اُور تُو نہیں سنا سکتا قبروں میں پڑے ہوؤں کو۔'' (الفاطر: ۲۲)

'' لہٰذا سماع کی نفی سے سماع کی نفی نہیں ہوتی اور اسی کو حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ وغیرہ حضرات نے یوں تعبیر فرمایا کہ سمع اموات حد اسماع سے تو پرے ہے پر استماع اموات ممکن ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''یقول تعالٰی کما انک لیس فی قدرتک ان تسمع الاموات فی اجداثها و لا تبلغ کلامک الصم الذین لا یسمعون وهم مع ذٰلک مدبرون عنک کذلک لا تقدر علٰی هدایة العمیان عن الحق وردهم عن ضلالتهم بل ذٰلک الی اللہ تعالٰی فانه تعالٰی بقدرته یُسمعُ الاموات اصوات الحیاء اذا شاء و یهدی من یشاء و یضل من یشآءُ و لیس ذٰلک لاحد سواه'' (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۴۳۸)

'' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جیسے تیرے بس میں یہ نہیں کہ تُو مُردوں کو اُن کی قبروں میں سنائے اور نہ یہ کہ تیرا کلام ان بہروں تک پہنچ سکے جو سنتے نہیں۔ جب کہ انہوں نے تیری طرف اپنی پیٹھ بھی پھیر دی ہو۔ اسی طرح تو حق سے اندھوں کو ہدایت دینے پر اور ان کو گمراہی سے ہٹانے پر قادر نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے بس میں ہے کہ وہ مُردوں کو اپنی قدرت سے جب چاہتا ہے زندوں کی آوازیں سنا دیتا ہے اُور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اُور یہ کارروائی اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اُور کے بس اور اختیار میں نہیں ہے۔

اس تفسیر کے رُو سے نفی اس سماع کی ہے جو اِنسان کے بس اور قدرت میں نہیں اور ''اِنَّ اللّٰہَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ'' میں اس سماع کا اثبات ہے جو مُردوں کے لئے ثابت ہے جیسا کہ ابھی ''اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ '' کی تفسیر میں نفی اور اثبات کا معنی بیان ہوا ہے۔

امام محمد بن جریر رحمہ اللہ الطبری (المتوفی ۳۱۰ھ) ''اِنَّ اللّٰہَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: ''کما لا یقدر ان یسمع من فی القبور کتاب اللہ فیهدیهم به الٰی سبیل الرشاد فکذلک لا یقدر ان ینفع لمواعظ اللہ و بیان حججه من کان میت القلب من احیاء عباده عن معرفة اللہ و فهم کتابه و تنزیله و واضح حججه'' (تفسیر ابن جریر ج ۲۲ ص ۱۲۹)

'' جس طرح اہلِ قبور کو اللہ تعالیٰ کی کتاب سنا کر ان کو راہِ راست پر لانے کی قدرت کسی کو نہیں۔ اسی طرح یہ قدرت بھی کسی کو نہیں۔ اسی طرح یہ قدرت بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصیحتیں اور اس کی واضح دلیلیں بیان کر کے ان مُردہ دلوں کو نفع پہنچایا اور زندہ کیا جائے جو اس کے بندوں میں سے اس کی معرفت اس کی کتاب کی فہم اس کے اُترنے اور اس کی واضح دلیلوں کی معرفت سے بے خبر اور مُردہ دِل ہیں۔''

نیز وہ لکھتے ہیں: ''و قوله انک لا تسمع الموتٰی یقول یا محمد لا تقدر ان تُفهِمَ الحقَّ مَنْ طَبعَ اللہ علٰی قلبه فاماته لان اللہ قد ختم علیه اَلّا یفهمهٗ'' (تفسیر ابن جریر ج ۲۰ ص ۱۲)

ترجمہ: ''اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بے شک تو مُردوں کو نہیں سنا سکتا یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اس پر قادر

نہیں کہ اس شخص کو حق سمجھا دے جس کے دِل پر اللہ تعالیٰ نے مُہر لگا دی ہے اور اس کو مُردہ کر دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر مُہر لگا دی ہے کہ وہ حق کو نہ سمجھے۔''

اِس تفسیر میں بھی اس کی تصریح ہے کہ نفی سماع کی نہیں بلکہ نفی اس کی ہے کہ بجز پروردگار کے کسی کو سُنانے کی قدرت نہیں ہے اور تحریر فرماتے ہیں: ''ولاتسمع الصم الدعاء اذاولوامدبرین یقول لو ان اصمّ ولّی مدبرًا ثم نادیتہ لم یسمع کذالک الکافر لایسمع ولاینتفع بمایسمع'' (تفسیر ابن جریر ج۲۱ ص۵۶)

''اور تُو بہروں کو جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر لَوٹ جائیں نہیں سُنا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کا یہ مطلب ہے کہ اگر کوئی بہرہ شخص پیٹھ پھیر کر لَوٹ جائے پھر تو اُس کو پکارے تو وہ نہیں سُنتا۔ اسی طرح کافر نہ سُنتا ہے اور نہ سُنی ہوئی چیز سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔''

اس سے معلوم کہ کافر کے عدم سماع کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے انتفاع نہیں کرتا۔ شیخ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۸۸۹ھ) فرماتے ہیں: ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی ای الکفار فانھم کالموتٰی فی عدم الانتفاع بما یستمعون الٰی قولہ اِنْ تُسْمِعُ سماع انتفاع اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ'' (تفسیر جامع البیان ص ۳۳۴)

''بے شک تو مُردوں یعنی کافروں کو نہیں سُنا سکتا کیونکہ وہ سُنی ہوئی چیز سے عدم انتفاع میں مُردوں کی طرح ہیں۔ (پھر آگے فرمایا) تو نہیں سُنا سکتا سماعِ انتفاع مگر صرف ان کو جو ایمان لائیں۔''

اس تفسیر سے بھی معلوم ہوا کہ نفی مطلق سماع کی نہیں بلکہ سماعِ انتفاع کی نفی ہے۔

حافظ ابن حجر اور مولانا عثمانی، حافظ اسماعیلی (ابوبکر احمد بن ابراہیم المتوفی ۳۷۱ھ) جو الامام اور الحافظ تھے، (اکمال ص۶۲۸) اور جو الامام الحافظ الثبت اور شیخ الاسلام تھے، (تذکرہ ج ۳ ص۱۴۹) کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں: ''وقال الاسماعیلی کان عند عائشۃ من الفھم والذکاء وکثرۃ الروایۃ والخوص علٰی غوامض العلم مالا مزید علیہ لٰکن لاسمبیل الٰی ردّ روایۃ الثقۃ الابنصّ مثلہ یدلّ فسخہ او تخصیصہ او استحالتہ فکیف والجمع بین الذی انکرتہ واثبتہ غیرھا ممکن لان قولہ تعالٰی اِنَّکَ لاتسمع الموتٰی لاینافی قولہ ﷺ انھم الاٰن یسمعون لان الاسماع ھو ابلاغ الصّوت من المسمع فی اذن السامع فاللہ تعالٰی ھو الذی اسمعھم بان ابلغھم صوت نبیّہ ﷺ واما جوابھا بانہ انما قال انھم لیعلمون فان کانت سمعت ذٰلک فلا ینافی روایۃ یسمعون بل یؤیدھا'' (فتح الباری ج۸ ص۳۰۶، وفتح الملہم ج ۲ ص۴۷۸)

''امام اسماعیلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس فہم، ذکاء، کثرتِ روایت اور علم کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہونے کی وہ خوبی تھی جس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا مگر بایں ہمہ ثقہ راوی کی روایت کو رد کرنے کی بھی کوئی سبیل نہیں۔ مگر ہاں! یہ کہ اگر کوئی اس جیسی نص ہو جو اس کے منسوخ یا مخصوص یا محال ہونے پر دلالت کرے پھر بھلا کیونکر یہ روایت رَد کی جا سکتی ہے۔ جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت جس میں انہوں نے سماع کا انکار کیا ہے اور دوسرے حضرات کی روایت جس میں اس کا اثبات ہے۔ جمع اور تطبیق بھی ممکن ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد ''اِنَّھُمْ الاٰن یسمعون'' (یعنی کفار اب سن رہے ہیں) میں کوئی منافاۃ نہیں ہے۔ کیونکہ اسماع کا یہ معنی ہے کہ سُنانے والے کی آواز سننے والے کے کان میں پہنچائی جائے تو سُنانے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے کفار کو اپنے نبی کی آواز پہنچائی۔ رہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا

یہ جواب کہ آنحضرت ﷺ نے تو یہ فرمایا تھا کہ بے شک وہ اس وقت جانتے ہیں۔ اگر واقعی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ لفظ آپ سے سُنے تھے تو پھر بھی یہ یسمعون کے ہرگز منافی نہیں بلکہ اس کے مؤید ہیں۔"

امام شمس الدین محمد بن یوسف بن علی الکرمانی الشافعی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۸۶ھ) (بخاری شریف ج ۲ ص ۵۶۷) حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا "ما قال انهم یسمعون ما اقول وانما قال انهم الآن لیعلمون الحدیث" کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ: "فان قلت کیف جاز تکذیب ابن عمر رضی اللہ عنہ قلت ما کذب احد بل البحث فی انه حمل علی الحقیقة وعائشة رضی اللہ عنہا حملته علی المجاز فان قلت هل وجب تاویل کلامه بما اولته عائشة رضی اللہ عنہا قلت یحتمل ان یکون معنی الآیة انک لا تسمع بل الله هو المسمع مع ان المتاولین قالوا المراد من الموتی الکفار باعتبار موت قلوبهم وان کانوا احیاء صورة وکذا المراد من الآیة الاخری قال صاحب الکشاف فی قوله تعالی انک لا تسمع الموتی شبهوا بالموتی وهم احیاء لان حالهم حال الاموات وفی قوله تعالی ما انت بمسمع من فی القبور ای الذین هم کالمقبورین" (کواکب الدراری ج ۱۵ ص ۱۶۷، ۱۶۸)

"اگر تو یہ کہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی تکذیب کیسے جائز ہوگئی؟ تو مَیں کہوں گا کہ ان کی تکذیب کسی نے نہیں کی بلکہ بحث اس میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو حقیقت پر محمول کیا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجاز پر پھر اگر تو یہ کہے کہ کیا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے کلام کی تاویل واجب ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کی؟ تو میں کہوں گا کہ احتمال ہے کہ آیت کا معنی یہ ہو کہ بے شک تو نہیں سُنا سکتا، بلکہ اللہ تعالیٰ سُنانے والا ہے۔ علاوہ ازیں تاویل کرنے والوں نے یہ بھی کہا ہے کہ (یہاں مُردوں سے حقیقی مُردے مُراد نہیں ہیں بلکہ) موتیٰ سے کفار مُراد ہیں۔ اس اعتبار سے کہ ان کے دِل مر چکے ہیں۔ اگرچہ صورۃً وہ زندوں کی شکل میں ہیں۔ (لہٰذا اہلِ قبور کے عدم سماع کا مسئلہ ہی اس سے غیر متعلق ہے) اور اِسی طرح دُوسری آیت سے یہی مراد ہے۔ صاحب کشاف نے "اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ان زندہ کافروں کو مُردوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ ان کی حالت مُردوں کی سی ہے (کہ جیسے وہ سماع سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے اسی طرح یہ بھی ہیں) اور اسی طرح مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ کا مطلب بھی یہی ہے کہ باوجود زندہ ہونے اہلِ قبور کی طرح یہ نفع حاصل نہیں کر سکتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بقول علامہ کرمانی رحمہ اللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی تکذیب نہیں کی بلکہ یہاں معاملہ حقیقت ومجاز کا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے انهم یسمعون کی حدیث کو حقیقت پر حمل کر کے سماع موتیٰ کا قول کیا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو مجاز پر محمول کیا ہے کہ مُراد اس سے علم ہے یعنی مُردے اس وقت جانتے ہیں۔ پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ جب حقیقت شرعاً متعذر نہیں تو پھر مجاز کی کیا ضرورت ہے؟ کیونکہ مشہور تو یہ ہے کہ المجاز قنطرة الحقیقة کہ مجاز حقیقت کا پُل ہے۔ اور پھر یہ بات بھی پہلے بحوالہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ گزر چکی ہے کہ یسمعون اور یعلمون میں تطبیق بھی ممکن ہے ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

حافظ بدرالدین محمود العینی الحنفی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہ: "واجیب عن الایة بان الذی یسمعهم هو الله تعالی والمعنی انه ﷺ لا یسمعهم ولکن الله تعالی احیاهم حتی سمعوا کما قاله قتادة وقال السهیلی رحمہ اللہ وعائشة رضی اللہ عنہا لم تحضر وغیرها ممن حضر احفظ للفظه وقد قالوا له اتخاطب قوما قد جیفوا فقال ما انتم باسمع لما اقول منهم واذا جاز ان یکونوا سامعین اما باٰذان رؤسهم اذا قلنا ان الارواح تعاد الی

الاجساد عند المسألة وهو قول الاكثر من اهل السنة واما باذان القلب والروح على مذهب من يقول يتوجه السوال الى الروح من غير رجوع منه الى الجسد او الى بعضه'' (عمدة القاری ج ۱۷ ص ۹۳)

''اس آیت کریمہ کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کو سناتا ہے اور معنی یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اُن کو نہیں سنا سکتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے سن لیا۔ جیسا کہ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے اور امام سہیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حاضر نہ تھیں اور دُوسرے حضرات جو وہاں حاضر تھے وہ آنحضرت ﷺ کے الفاظ کو زیادہ یاد رکھنے والے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے آپ سے کہا کہ کیا آپ ایسی قوم سے خطاب فرما رہے ہیں جو سنتی نہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ تم میری بات کو ان سے زیادہ نہیں سن رہے اور جب (بقول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) اس حالت میں ان کا عالم ہونا جائز ہے تو ان کا سامع ہونا بھی جائز ہے یا تو سر کے حسّی کانوں سے اگر ہم یہ کہیں کہ سوال کے وقت ان کے ابدان میں اَرواح کو لوٹایا جاتا ہے جیسا کہ اکثر اہل السنّت والجماعت کا قول ہے اور یا دِل اور رُوح کے کانوں سے ان لوگوں کے مذہب پر جو یہ کہتے ہیں کہ سوال رُوح کی طرف متوجہ ہوتا ہے بغیر اس کے کہ سارے بدن یا اس کے بعض حصہ میں رُوح لوٹائی جائے۔''

اس عبارت سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ اہل السنت والجماعت کی اکثریت بدن اور رُوح دونوں کے ساتھ سماعِ اموات کی قائل ہے اور یہی اکثریت عودالرُوح الی الجسد کی بھی قائل ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''قلت اذا صح عن النبی ﷺ ان الموتٰی تسمع کلام الحی فمعنی قوله تعالٰی "اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی" باختیارک و قدرتک کما انت تسمع الحی علی ما جری به عادة الله تعالی لکن الله تعالٰی یسمع الموتٰی کلام الاحیاء اذا شاء او انک لاتسمع الموتی سماعا تترتب علیه الفائدة'' (منہ نوّر اللہ مرقدہ حاشیۂ تفسیر مظہری ج ۷ ص ۲۵۳)

''میں کہتا ہوں کہ جب آنحضرت ﷺ سے یہ صحیح ثابت ہو چکا ہے کہ مُردے زندہ کے کلام کو سنتے ہیں تو ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' کا مطلب یا تو یہ ہے کہ تُو اپنے اختیار اور قدرت سے مُردوں کو نہیں سُنا سکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی جاری کی ہوئی عادت کے مطابق تُو زندہ کو سُنا سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ہی زندوں کا کلام مُردوں کو جب چاہتا ہے سُنا دیتا ہے اور یا اس آیت کریمہ کا یہ مطلب ہے کہ تو مُردوں کو اس طریقہ پر نہیں سُنا سکتا جس پر (قبول کرنے کا) فائدہ مترتب ہو۔''

الغرض حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ کی کوئی بھی تفسیر لے لیں۔ قدرِ مشترک سب اس پر متفق ہیں کہ اس مضمون کی تمام آیات سے عدمِ سماعِ موتی ہرگز ثابت نہیں ہے جس کے دَرپے مؤلف شفاء الصدور وندائے حق اور ان کے حواری ہیں اور اس پر بضد ہیں۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ ''اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' کی آیت کی تشریح وتفسیر کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔ ''یعنی تم یہ نہیں کر سکتے کہ کچھ بولو اور اپنی آواز مُردے کو سُنا دو کیونکہ یہ چیز ظاہری اور عادی اسباب کے خلاف ہے البتہ حق تعالیٰ کی قدرت سے ظاہری اسباب کے خلاف تمہاری کوئی بات مُردہ سُن لے اس کا انکار کوئی مؤمن نہیں کر سکتا۔ اب نصوص سے جن باتوں کا اس غیر معمولی طریقہ سے سُننا ثابت ہو جائے گا اُسی حد تک ہم کو سماعِ موتی کا قائل ہونا چاہئے۔ محض قیاس کر کے دُوسری باتوں کو سماع کے تحت نہیں لا سکتے۔ بہرحال آیت میں اسماع کی نفی سے مطلقاً سماع کی نفی نہیں ہوتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔'' (حاشیہ ص ۵۳۱)

بہرحال اس آیت کریمہ کی پہلی تفسیر لیں یا دُوسری، بہر کیف دونوں سے یہ ثابت ہے کہ اس سے مطلقاً سماع کی نفی نہیں ہوتی بلکہ سماع نافع ومفید یا اِسماع کی نفی ہے اور نفسِ سماع موتی فی الجملہ ثابت ہے۔ صحیح احادیث اور جمہورِ اُمت کا بیان اس کی واضح دلیل ہے۔

مسئلۂ سماع موتی اور حضرت عزیر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ

قرآنِ کریم کے تیسرے پارہ میں ایک واقعہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے جس کا نہایت مختصر خلاصہ یہ ہے کہ ایک بزرگ ہستی کو اللہ تعالیٰ نے وفات دے دی۔ سو سال تک مُردہ رہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اُن کو زندہ کیا تو اُن سے فرمایا کہ تم اس حالت میں کتنا عرصہ رہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ صرف ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ نہیں بلکہ تم تو سو سال اس حالت میں رہے۔ (محصلہ)

جمہور مفسرین کرام کے نزدیک یہ بزرگ ہستی حضرت عزیر علیہ السلام کی تھی۔ بعض حضرات نے سماع موتی کے انکار پر اس واقعہ سے بھی استدلال کیا ہے۔ چنانچہ مؤلف ''جواہر القرآن'' لکھتے ہیں کہ اس واقعہ سے سماع موتی کی نفی ہوتی ہے۔ کیونکہ عزیر علیہ السلام دُنیا میں ہونے والے تمام انقلابات سے بے خبر تھے۔ سو سال کے عرصہ میں نہ تو رات دن کے اختلافات کا اُن کو پتہ چلا اور نہ ہی بیرونی آوازیں اُنہیں سنائی دیں۔ (جواہر القرآن ص ۱۲۷)

الجواب: اس واقعہ سے سماع موتی کی نفی پر استدلال صحیح نہیں ہے۔

اَوّلاً: اس لئے کہ یہ مسئلہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اختلافی چلا آرہا ہے مگر حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ میں سے کسی نے اس واقعہ سے عدم سماع موتی پر استدلال نہیں کیا جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ واقعہ اس مسئلہ سے بالکل غیر متعلق ہے۔ ہمارے پیر ومرشد حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ نے اس واقعہ سے استدلال کیا ہے۔ لیکن حضرت مرحوم کے کئی تفردات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔ الحمد للہ تعالیٰ حضرت مرحوم کا ادب واحترام سویدائے قلب میں موجود ہے اور ان کی بے لوث دینی خدمات اور اپنے مخصوص رنگ میں توحید وسنّت کی نشر واشاعت اور اپنے نرالے ذوق میں شرک وبدعت کا رَدّ نا قابلِ تردید حقیقت ہے لیکن شریعت کا حق سب سے مقدم ہے۔ امام تاج الدین ابو نصر عبدالوہاب السبکی (المتوفی ۷۷۱ھ) اپنے اُستادِ محترم ناقدِ فن رجال علامہ شمس الدین ابو عبداللہ الذہبی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۴۸ھ) کی بعض علم کوتاہیوں اور تفردات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''وانا قلت غیر مرۃ ان الذھبی استاذی وبہ تخرجت فی علم الحدیث الا ان الحق بالاتباع'' (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۲۴۹، طبع مصر)

''میں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ میرے استاد ہیں اور انہی کی بدولت مَیں نے علمِ حدیث میں مہارت حاصل کی ہے مگر حق کی پیروی کرنا زیادہ مناسب ہے۔''

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ سے یہ سوال ہوا کہ آپ کی فلاں مسئلہ میں یہ رائے ہے۔ حالانکہ آپ کے پیر ومُرشد اس کے خلاف کہتے ہیں تو آپ ان کی مخالفت کیوں فرماتے ہیں، (محصلہ) تو اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں: ''اور حجت قول وفعل مشائخ سے نہیں ہوتی بلکہ قول وفعل شارع علیہ السلام سے اور اقوال مجتہدین رحمہم اللہ سے ہوتی ہے۔ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں جب اُن کے پیر سلطان نظام الدین قدس سرہٗ کے فعل کی حجت کوئی لاتا کہ وہ ایسا کرتے ہیں، تم کیوں نہیں کرتے؟ کہ فعلِ مشائخ حجت نہ باشد اور اس جواب کو

حضرت سلطان الاولیاء رحمہ اللہ بھی پسند فرماتے۔ لہٰذا جناب حاجی (امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ) کا ذکر کرنا سوالات شرعیہ میں بے جا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔'' رشید احمد گنگوہی عفی عنہ! (فتاویٰ رشیدیہ ج۱ ص ۹۸ طبع دہلی)

مؤلف اقامۃ البرہان لکھتے ہیں: ''اسلام مشائخ اور اساتذہ کی تقلید بے جا کا نام نہیں بلکہ دلائل شریعت کے اتباع کا نام ہے۔'' (ص ۳۱۲)

ظاہر اَمر ہے کہ جب حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ میں سے کسی نے عدم سماع موتی پر یہ واقعہ پیش نہیں کیا حالانکہ قرآن کریم کا یہ واقعہ بھی ان کے پیش نظر تھا اور اس مسئلہ کا اختلاف بھی ان کے سامنے تھا تو یہ اس مسئلہ سے غیر متعلق ہے۔

ثانیاً: اس واقعہ سے نفی سماع موتی تب متحقق ہو سکتی ہے جب تحقیقی اور تاریخی طور پر یہ ثابت کیا جائے کہ حضرت عزیر علیہ السلام کے پاس کوئی پہنچا ہو اور اُس نے اُن سے علیک سلیک کی اور کلام کیا ہو مگر نہ تو وہ سُن سکے اور نہ اُن کو خبر ہوئی۔ بہت ممکن ہے کہ جہاں ان کی وفات ہوئی تھی وہاں کوئی بھی نہ گیا ہو اور نہ کسی کو ان کی خبر ہوئی ہو، محض عقلی طور پر یہ کہہ دینا کہ سو سال تک وہاں کوئی نہ گیا ہو اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی ہو، کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ کیونکہ تاریخی حقائق کے لئے محض عقلی موشگافیاں ناکافی ہیں۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۳۹ھ) اس واقعہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''حضرت عزیر (علیہ السلام) نے راہ میں ایک شہر دیکھا۔ ویران اس کی عمارت گری ہوئی دیکھ کر اپنے دل میں کہا کہ یہاں کے ساکن سب مر گئے کیونکہ حق تعالیٰ اُن کو جلا دے اور یہ شہر پھر آباد ہو۔ اُسی جگہ اُن کی رُوح قبض ہوئی اور اُن کی سواری کا گدھا بھی مر گیا۔ سو برس تک اُسی حالت میں رہے اور کسی نے نہ اُن کو وہاں آ کر دیکھا نہ اُن کو خبر ہوئی۔'' (حاشیہ قرآن کریم ص ۵۵)

اس سے معلوم ہوا کہ سو سال کے عرصہ تک اُن کے پاس سرے سے کوئی گیا ہی نہیں تھا اَور نہ کسی کو اُن کی خبر ہوئی تھی تو پھر سلام و کلام کرنے نہ کرنے اَور سننے نہ سننے کا کیا معنٰی؟ اور انکار سماع موتی کا کیا مطلب؟ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ اس واقعہ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ: ''رہی یہ بات کہ جب دُوسروں نے دیکھا نہیں۔'' تو لوگوں کے لئے نمونہ قدرت کس طرح ہوگا؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ قرائن خارجیہ قطعیہ سے ان کا صدق بیان لوگوں کو بطور علم ضروری کے معلوم ہو جاوے گا جیسا کہ خود ان کو ایسے ہی قرائن سے نیز اپنا مُردہ رہنا مدت طویل تک معلوم ہو گیا۔'' واللہ تعالیٰ اعلم! (تفسیر بیان القرآن ج۱ ص ۱۴۵)

اِس سے بھی معلوم ہوا کہ نہ کوئی ان کے پاس گیا اور نہ اُن کو دیکھا۔

ثالثاً: اس واقعہ سے جو کچھ ثابت ہے وہ صرف اِس قدر ہے کہ بَرزخ میں رہنے کی مدت کا احساس نہیں ہو سکتا اَور یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وقت کتنا گزرا اور اس کا عدم سماع موتی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس واقعہ کے فوائد میں لکھتے ہیں کہ: ''پانچویں بعد بعث کے بَرزخ میں رہنے کی مدت معلوم نہ ہونا ''الٰی ان قال'' اور پانچویں اَمر کی نظیر اُن کا جواب ''یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ'' کہنا جیسا کہ بعینہٖ یہی جواب بعض اہل محشر دیں گے۔'' (تفسیر بیان القرآن ج۱ ص ۱۴۵)

یہ بالکل صاف عبارت ہے کہ برزخ کی مدت معلوم نہیں ہو سکتی۔

لطیفہ: راقم الحروف نے ''تسکین الصدور'' میں نہایت اختصار کے ساتھ حضرت عزیر علیہ السلام کے اس واقعہ سے عدم سماع موتی پر استدلال کرنے والوں کا جواب عرض کیا تھا۔ اس جواب سے مؤلف ''تسکین القلوب''

خاصے پریشان اور برہم ہوئے ہیں اور راقم کی تردید میں جو کچھ اُنہوں نے لکھا ہے اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت عزیر علیہ السلام کو اپنے حالات کا علم نہ ہو سکا جو حضوری ہے تو غیروں کے حالات و اقوال کا علم کیسے ہو گیا جو علم حصولی ہے؟ اور نیز لکھتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام خوشی میں انہماک کے باعث اپنے ذاتی حالات سے تو بے خبر ہو گئے اور باقی سب کچھ دیکھ سُن رہے ہیں۔'' (تسکین القلوب ص ۵۵، ۵۶ ملخصہ)

الجواب: موصوف نے یہ جو کچھ ارشاد فرمایا ہے صرف مناظرانہ دفع الوقتی ہے اس کے سواء کچھ نہیں۔ ایک تو اس لئے کہ ہم نے یہ دعویٰ تو نہیں کیا کہ غیروں کے سب حالات کا ان کو علم ہے اور نہ یہ کہا گیا ہے کہ وہ سب کچھ دیکھ اور سُن سکتے ہیں۔ خویش اقارب[1] کے بعض اعمال کا علم اقارب پر عرضِ اعمال کی حدیث کے پیش نظر قابل انکار نہیں۔ باقی سب حالات اور اعمال کا علم بجز پروردگار کے اور کسی کے نہیں ہے اور سننے کا دعویٰ بھی عند القبر اور نزدیک سے ہے۔ دُور دراز سے سُننے کا دعویٰ بھی نہیں ہے۔ موصوف نے بلا وجہ موجبہ کُلیہ کا سور داخل کر کے تعمیم پیدا کر کے کو سنے کی ناکام کوشش فرمائی ہے اور باقی سب کچھ دیکھ سُن رہے ہیں۔'' اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کا سوال حضرت عزیر علیہ السلام سے ان کے ذاتی حالات وصفات کے متعلق نہیں تھا تا کہ علم حضوری اور علم حصولی کی منطقیانہ بحث یہاں چل نکلے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن سے کَمْ لَبِثْتَ اِرشاد فرما کر زمانہ کی تعیین و توقیت دریافت فرمائی ہے اور زمانہ و وقت نہ تو انسان کے ذاتی حالات میں داخل ہے نہ صفات میں بلکہ ظرف ہے اور الگ مقولہ ہے۔ اگر زمانہ انسان کے ذاتی اور صفاتی حالات میں داخل ہوتا تو حشر کے دن قبور سے نکلنے کے بعد ہر ایک کو دُنیا یا قبر اور برزخ میں اپنے ٹھہرنے کا صحیح اور ٹھیک وقت معلوم ہوتا اور وہ ایک دُوسرے کو یا فرشتوں کو جواب دیتے اور بتاتے ہوئے یہ مختلف تعبیریں نہ کرتے۔ اِنْ لَبِثْتُمْ اِلَّا یَوْمًا۔ (تم نہیں ٹھہرے مگر صرف ایک دن) اِنْ لَبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا۔ (تم نہیں ٹھہرے مگر دس دن)'' کَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَهَا لَمْ یَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰهَا'' (گویا کہ وہ جس دن قیامت کو دیکھ لیں گے یوں

---

[1] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے اعمال تمہارے اقارب پر ان کی قبروں میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر عمل اچھے ہوتے ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں اور اگر دُوسری مد کے ہوتے ہیں تو وہ اُن کے لئے دُعا کرتے ہیں۔ (ملخصہ مسند ابوداود طیالسی ص ۲۴۸) اور اسی مضمون کی روایت حضرت اُنس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ (مسند احمد ج ۳ ص ۱۶۵) اور حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زندوں کے اعمال اُن کے مُردہ خویش و اقارب پر پیش کئے جاتے ہیں اور وہ اُن کے لئے دُعا بھی کرتے ہیں۔ جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ کتاب (شرح الصدور ص ۱۱۰، فی احوال الموتی والقبور) میں لکھا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت اُنس رضی اللہ عنہ کے طریق سے سند کے ساتھ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ بے شک تمہارے اعمال تمہارے اقارب اور تمہارے خاندان کے لوگوں پر، جو مر چکے ہوتے ہیں، پیش کئے جاتے ہیں۔ سو اگر عمل اچھا ہو تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر عمل بُرا ہو تو کہتے ہیں اے پروردگار تو ان کو ہدایت دیئے بغیر نہ مار (مائۃ مسائل ص ۳۸) اور اسی مضمون کی ایک مرفوع روایت حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے اور ایک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور ایک عبدالغفور عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے مرفوعا مروی ہے۔ (شرح الصدور ص ۱۱۰) اور حضرت ابو اَیوب انصاری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۲ ص ۳۲۷) خویش و اقارب پر عرض اعمال کی ایک حدیث امام الطائفہ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ (المتوفی ۶۳۲ ھ) (عوارف المعارف علی الاحیاء ج ۴ ص ۱۵۳) میں اور ایک حدیث امام غزالی رحمہ اللہ '' (احیاء العلوم ج ۴ ص ۴۱۲) میں پیش کر کے ان سے عرض اعمال پر استدلال کرتے ہیں۔ اصل عبارت تسکین الصدور میں ملاحظہ کر لیں۔ الغرض یہ جملہ روایات مل جُل کر اس فروعی مسئلہ کے اثبات کے لئے کافی ہیں۔'' وفیها کفایة لمن له هدایة''

سمجھیں گے کہ وہ نہیں ٹھہرے مگر دن کا پچھلا یا پہلا حصہ" کَاَنَّھُمْ یَوْمَ یَرَوْنَ مَایُوْعَدُوْنَ لَمْ یَلْبَثُوْا اِلَّا سَاعَۃً مِّنْ نَّھَارٍ "
(گویا کہ وہ جس دن اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا وعدہ اُن سے کیا جا رہا ہے، ایسا خیال کریں گے کہ وہ دن کا صرف ایک گھنٹہ ٹھہرے ہیں) علاوہ ازیں اگر وقت اور زمانہ انسان کی ذات وصفات میں داخل ہوتا تو ہر آدمی کو اپنی تاریخ پیدائش، عمر اور زندگی کے دُوسرے واقعات تاریخ وار معلوم ہوتے اور ایسے حالات میں لوگ ظن اور تخمینہ سے ہرگز کام نہ لیتے۔ حالانکہ بجز اُن لوگوں کے جن کے حافظے بڑے قوی ہوتے ہیں یا وہ لوگ جن کے پاس تاریخ ولادت اور زندگی کے اہم واقعات لکھے ہوئے ہوتے ہیں اور کوئی شخص اپنی عمر یا زندگی کے واقعات زمانہ اور وقت کی تعیین وتحدید کے ساتھ نہیں بتا سکتا اور نہ لوگ اپنی صُلبی اُولاد اور قریب ترین رشتہ داروں عزیزوں کی عمریں صحیح صحیح بتا سکتے ہیں۔ حالانکہ وہ اُنہی کے ہاں اور اُن کے سامنے پیدا ہوئے ہوتے ہیں اگر وقت اور زمانہ علم حضوری میں داخل ہوتا تو پھر بلا تامّل ہر شخص متعین طور پر یہ اُمور بتا سکتا اور حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے تو کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ وقت اور زمانہ انسان کی ذات وصفات میں داخل ہو کر علم حضوری بن گیا؟

مشہور محقق مُلّا جلال الدین الدوانی رحمہ اللہ (المتوفی ۹۲۸ھ) لکھتے ہیں: "و علمھا بذاتھا و صفاتھا علم حضوری کما بَیَّنَ فی موضعہ" (ملّا جلال ص ۹۰)

"اُور نفس کا اپنی ذات وصفات کے بارے میں علم، علم حضوری ہے جیسا کہ اپنی جگہ پر یہ بات بیان کی گئی ہے۔"

اور اس کے شارح میر زاہد بن محمد المسلم (المتوفی ۱۱۰۱ھ) لکھتے ہیں کہ: "قد اشتھر فیما بین القوم ان علم النفس بذاتھا و صفاتھا علم حضوری" (میر زاہد ص ۸۸)

(منطقیوں کی) قوم میں یہ بات مشہور ہے کہ نفس کا اپنی ذات وصفات کے متعلق علم، علم حضوری ہوتا ہے۔

الحاصل نفس کا اپنی ذات وصفات کے بارے میں علم بلاشبہ علم حضوری ہوتا ہے مگر وقت اور زمانہ نہ انسان کی ذات ہے نہ اس کی صفت ہے۔ اس لئے غیر متعلق بحث کو درمیان میں لا کر گلو خلاصی نہیں کی جا سکتی۔

وثالثاً: اہل السنت والجماعت کا سماع موتی کے بارے میں اختلاف جس طرز کا بھی ہے، عام موتی کے بارے میں ہے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں نہیں ہے۔ اس میں سب متفق ہیں کہ وہ قریب سے سنتے ہیں۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی یہ عبارت پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ: "مگر انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں۔" (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۹۹)

جب حضرت عزیر علیہ السلام نبی ہیں تو پھر ان کے عدمِ سماع کا کیا معنٰی؟

اصحاب کہف کا واقعہ

اس وقت کے وہ حضرات جو عدمِ سماعِ موتی کے قائل ہیں وہ اصحاب کہف کے واقعہ سے بھی استدلال کیا کرتے ہیں بلکہ اس پر خاصا زور دیتے ہیں کیونکہ ان کے واقعہ میں بھی یہ آتا ہے کہ جب وہ تین سو نو (۳۰۹) سال گزار کر نیند سے بیدار ہوئے تو انہوں نے آپس میں ایک دُوسرے سے سوال کیا "کَمْ لَبِثْتُمْ" تم کتنا عرصہ یہاں ٹھہرے ہو؟ جواب دینے والوں نے کہا: "لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ" کہ ہم ایک دن یا دِن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ جب نیند میں جب کہ رُوح بھی کلی طور پر بدن میں ہوتی ہے ان کو وقت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا اور باہر کی دُنیا کا اُن کو

علم نہ ہو سکا تو بھلا مُردے کیونکر باہر کی بات کو سنتے ہیں؟ مگر یہ ان حضرات کا بڑا مغالطہ ہے۔ کیونکہ نیند کی حالت میں ادراک وشعور ایک گونہ معطل ہو جاتا ہے اور انسان بے بس اور بے اختیار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیند کی حالت میں طلاق وعتاق اور اسلام وردت وغیرہ کسی چیز کا اعتبار نہیں ہوتا اور قبر میں اعادۂ رُوح کے بعد میت کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میت میں ادراک وشعور اور علم باقاعدہ ہوتا ہے اور اسی بناء پر جب نکیرین سوال کرتے ہیں اور مُردہ اس کا جواب دیتا ہے تو اس کے جواب کا باقاعدہ اعتبار ہوتا ہے اور امتحان میں اس کی کامیابی یا ناکامی پر اُسے جزا وسزا ملتی ہے اَور اُسے اسی اِدراک وشعور کے ساتھ راحت وکُلفت محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے مُردے کا سونے والے پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ لہٰذا اصحابِ کہف کے واقعہ سے بھی عدم سماعِ موتی کا مسئلہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا اور نہ حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ میں سے کسی نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس واقعہ سے بھی صرف اس قدر ثابت ہے کہ ان کو اپنے رہنے کی مدت اور زمانہ معلوم نہ تھا اَور آج بھی سونے والوں کو سونے کا صحیح وقت اور کئی لوگوں کو اپنی عُمروں کا متعین وقت معلوم نہیں ہوتا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ نہیں سنتے۔

عدم سماعِ موتی اَور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ فتاویٰ غرائب (یا الغرائب فی تحقیق المذاہب) میں ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آدمی کو دیکھا جو نیک اور بزرگ لوگوں کی قبروں پر جاتا اور اُن کو سلام کہتا اور ان سے مخاطب ہو کر ان سے باتیں کرتا اور ان سے کہتا۔ اے اہلِ قبور کیا تمہیں کوئی خبر ہے یا کوئی علامت ہے۔ میں کئی مہینوں سے تمہارے پاس آ رہا ہوں اور تمہیں پکار پکار کر کہہ رہا ہوں اور یہ سوال کرتا ہوں کہ تم میرے لئے دُعا کرو۔ کیا تمہیں کچھ پتہ چلا یا تم بے خبر ہی رہے؟ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص سے فرمایا کہ کیا انہوں نے تجھے کوئی جواب دیا؟ اس شخص نے کہا۔ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تیرے لئے دُوری ہو اور تُو ذلیل وخوار ہو تو ایسے اجسام سے باتیں کرتا ہے جو نہ تو جواب دینے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ان کو کسی چیز کا اختیار ہے اور "نہ کوئی آواز ہی سُن سکتے ہیں" اور پھر آپ نے بطور استدلال یہ آیت کریمہ پڑھی: "وَمَآ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ" (محصلہ تفہیم المسائل لمولانا بشیر الدین قنوجی رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۷۲ اور یہ حوالہ تحریرات حدیث ص ۲۰۶ اور شفاء الصدور ص ۴۴ و اقامۃ البرہان ص ۹۷ وغیرہ کتابوں میں بھی ذکر کیا گیا ہے)

الجواب: یہاں چند اُمور قابلِ توجہ ہیں۔

(۱) اَوّل قاضی بشیر الدین قنوجی رحمۃ اللہ علیہ شاگرد حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب اور اُستاد نواب صدیق حسن خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ غیر مقلد تھے۔ سب سے پہلے اس حوالہ کا ماخذ ہماری معلومات کی بناء پر انہی کی کتاب ہے۔ انتہائی حیرت کی بات ہے کہ حضرات فقہاء احناف رحمہم اللہ میں سے مسئلہ سماعِ موتی کے مثبت اور منفی پہلو میں نہ تو متقدمین حضرات کو یہ حوالہ دستیاب ہوا ہے اور نہ متاخرین کو اور ہماری دانست میں کسی معتبر حنفی فقیہ نے ان سے پہلے اس کا تذکرہ نہیں کیا اور نہ فقہ حنفی کی کسی معتبر کتاب میں اس کا ذکر ہے۔ "مَنۡ ادعٰی خلافه فعلیه البیان بالبرهان"

دوم: یہ فتاویٰ غرائب کس کی تالیف ہے؟ اور اس کے مصنّف کون تھے؟ اور کس مسلک سے تعلق رکھتے تھے؟ اور یہ کس زمانہ کی تالیف ہے؟ اور فقہاء احناف اور دیگر فقہاء کے نزدیک اس کے مصنّف اور کتاب کا کیا پایہ ہے؟

سوم: ایسی غیر متعارف اور مجہول کتاب کے حوالہ کا صریح اور صحیح احادیث اور جمہور اُمت کے واضح اقوال کے مقابلہ میں کیا وقعت اور اعتبار ہوسکتا ہے؟

حضرت ملّا علی القاری الحنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ’’قلت و من القواعد الکلیة ان نقل الاحادیث النبویة و المسائل الفقهیة و التفاسیر القرانیة لا یجوز الا من الکتب المتداولة لعدم الاعتماد علی غیرها من وضع الزنادقة و الحاق الملاحدة بخلاف الکتب المحفوظة فان نسخها تکون صحیحة متعددة‘‘ (موضوعات کبیر ص ۱۰۴، ۱۰۵، وبوادر النوادر ص ۵۰۹)

’’میں کہتا ہوں کہ قواعد کلیہ میں سے یہ بات ہے کہ آنحضرت ﷺ کی احادیث اور فقہی مسائل اور قرآنِ کریم کی تفاسیر کا نقل کرنا جائز ہے مگر صرف ان کتابوں سے جو متداول ہیں کیونکہ دوسری کتابوں پر کوئی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں زندیقوں کی جعل سازی اور ملحدوں کا الحاق شامل ہو بخلاف محفوظ کتابوں کے، کیونکہ ان کے نسخے صحیح اور متعدد ہوتے ہیں۔ (اور ان میں قطع و برید کا موقع جعل سازوں کو نہیں مِل سکتا)

اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ فقہی مسائل کا غیر متداول اور مجہول کتابوں سے نقل کرنا سِرے سے جائز ہی نہیں ہے۔

مولانا عبدالحئی لکھنؤی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں کہ: ’’صرح فی فتح القدیر من باب القضاء انه لا یحل النقل من الکتب الغریبة‘‘ (الفوائد البهیة ص ۱۹۰، طبع مصری)

’’فتح القدیر کے باب القضاء میں تصریح موجود ہے کہ کتب غریبہ سے نقل کرنا حلال اَور جائز نہیں ہے۔‘‘

حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ کی عبارت یوں ہے: ’’و طریق نقله لذلک عن المجتهد احد امرین اما ان یکون له فیه سند الیه او یأخذه من کتاب معروف تداولته الایدی نحو کتب محمد بن الحسن رحمہ اللہ و نحوها من التصانیف المهشورة للمجتهدین لانه بمنزلة الخبر المتواتر عنهم او المشهور هکذا ذکر الرازی رحمہ اللہ فعلی هذا لو وجدنا بعض نسخ النوادر فی زماننا لا یحل عزو ما فیها الی محمد رحمہ اللہ و لا الی ابی یوسف رحمہ اللہ لانها لم تشتهر فی عصرنا فی دیارنا و لم تتداول نعم اذا وجد النقل عن النوادر مثلاً فی کتاب مشهور معروف کالهدایة و المبسوط کان ذلک تحویلاً علی ذلک الکتاب‘‘

(فتح القدیر ج ۳ ص ۲۴۶ طبع ہند، ج ۵ ص ۵۶۴ طبع مصر)

’’کہ قاضی کے مجتہد سے مسئلہ نقل کرنے کے سلسلہ میں دو طریقوں میں سے ایک ہونا چاہئے۔ یا تو مجتہد تک سند کے ساتھ یہ سلسلہ پہنچے اور یا کسی ایسی معروف کتاب سے نقل کرے جو ہاتھوں میں متداول رہی ہو۔ جیسے حضرت محمد بن الحسن رحمہ اللہ کی کتابیں اور ان کی مانند مجتہدین کی اور مشہور کتابیں کیونکہ یہ ان سے بمنزلہ خبر متواتر یا مشہور کے منقول ہیں۔ اسی طرح امام (ابو بکر الجصاص) رازی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ سو اس تحقیق کے پیشِ نظر اگر ہمارے زمانہ میں کوئی چیز نادر کتابوں کے بعض نسخوں میں پائی گئی تو نہ ان سے نقل کرنا جائز ہے اور نہ اس کی نسبت حضرت امام محمد رحمہ اللہ اور حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی طرف کرنی جائز ہے۔ کیونکہ ہمارے زمانہ میں ہمارے علاقہ کے اندر ان نادر کتابوں کی شہرت نہیں ہے اور نہ یہ متداول ہیں۔ ہاں! اگر نادر کتابوں سے نقل کسی مشہور اور معروف کتاب میں ہو۔ مثلاً ہدایہ اور مبسوط وغیرہ تو اس نقل کا اعتبار اس مشہور اور معروف کتاب کی وجہ سے ہوگا۔‘‘

اگر حافظ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں اور ان کے علاقہ میں جو علم و عرفان کا دور اور فقہ کا گہوارہ تھا، نادر کتابوں کی نقل کا اعتبار نہیں ہو سکتا تو آج اُن سے نقل کئے ہوئے مسئلہ کو کون تسلیم کرتا ہے؟

یہ پوری عبارت فتاویٰ عالمگیری ج ۳، صفحہ ۳۸۷ طبع مصر میں بھی موجود ہے اور اس کے آخر میں ہے کذا فی البحر الرائق یعنی اسی طرح البحر الرائق میں ہے۔ الغرض فتح القدیر، البحر الرائق اور عالمگیری وغیرہ تمام معتبر کتابوں میں یہ عبارت اس اَمر کو واضح سے واضح تر کرتی ہے کہ نادر کتابوں کے حوالہ سے کوئی مسئلہ حضرات ائمہ کرام رحمہم اللہ کی طرف نسبت نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا عبدالحیٔ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ: ''لا تجوز الفتوٰی من التصانیف الغیر المشھورۃ'' (مقدمۂ عمدۃ الرعایۃ ص ۱۱)

''غیر مشہور تصانیف سے فتویٰ جائز نہیں ہے۔''

اَور فتاویٰ غرائب کے اس حوالہ کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟

(۴) چہارم: پہلے یہ بات با حوالہ گزر چکی ہے کہ حضرت مُلّا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور (نیز آپ کے مایہ ناز شاگردوں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ) سے عدم سماع موتی کے بارے میں قطعاً کوئی ثبوت نہیں ہے اور حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

الجواب: مسئلہ سماع میں حنفیہ باہم مختلف ہیں اَور روایات سے ہر دو مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ پس تلقین اسی مذہب پر مبنی ہے کیونکہ اَوّل زمانۂ قریب دفن کے بہت سی روایات اثبات سماع کرتی ہیں اور حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے اس باب میں کچھ منصوص نہیں اور روایات جو کچھ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آئی ہیں، شاذ ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم! (فتاویٰ رشیدیہ ج ۲ ص ۹۳)

گویا حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی فتاویٰ غرائب کا یہ حوالہ شاذ ہے جو قابلِ اعتبار نہیں ہے اور سابق مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''سماعِ موتی'' میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے ہے۔ بہت سے ائمہ سماعِ موتی کے قائل ہیں اور حنفیہ کی کتب میں بعض مسائل (مسئلہ یمین جس کی بحث آ رہی ہے) ایسے مذکور ہیں جن سے عدم سماع معلوم ہوتا ہے مگر امام صاحب سے کوئی تصریح اس بارہ میں نہیں نقل کرتے۔'' (فتاویٰ دارالعلوم ج ۵ ص ۴۶۱ طبع دیوبند)

ان تمام جان دار اور شان دار حوالوں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہو گئی کہ فتاویٰ غرائب کے اس حوالہ کا حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قطعاً کوئی ثبوت نہیں ہے اور یہ حوالہ بالکل اس کا مصداق ہے کہ ؎

یہ ہوائی کسی دُشمن نے اُڑائی ہو گی

اَور خود مؤلف ''شفاء الصدور'' کو اس کا اقرار ہے کہ جو روایت اُصول کے خلاف ہو وہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''اور مناقضۃ الاصول کا مفہوم یہ ہے۔ اسلامی دفاتر اور مسند احادیث اور مشہور کتب سے خارج ہو۔'' (بلفظہٖ ص ۸۷)

مؤلف مذکور کا حضرت امام صاحب رحمہ اللہ پر خالص بہتان

مؤلف مذکور نے حضرت امام صاحب رحمہ اللہ کا یہ مسلک بتایا ہے کہ: ''مُردے بلا استثناء انبیاء کرام علیہم السلام نہیں سنتے۔'' (ندائے حق ص ۳۲۰) مؤلف مذکور اپنی پوری جماعت کے ساتھ مل کر بھی قیامت تک صراحت کے ساتھ کسی معتبر حوالہ سے یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ حضرت امام صاحب رحمہ اللہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے سماع کے منکر تھے۔ (دیدہ باید)

دیدہ دلیری اور قبل از وقت واویلا

''مؤلف ''ندائے حق'' بزعم خویش حضرت بہلول رحمہ اللہ اور شیخ چلی کی طرح ''خیر القرون'' کے حضرات سے عدم سماع موتی پر اتفاق ثابت کر چکنے کے بعد یہ عنوان قائم کرتے ہیں۔ ''خیر القرون کے بعد کا عہد'' اور پھر لکھتے ہیں کہ: ''اَوراق سابقہ میں سمجھ لیا ہوگا کہ دعویٰ صاحبِ تسکین کہ سماع موتی پر سلف کا اجماع ہے، صحیح نہیں اور سلف کا اطلاق صحابہ رضی اللہ عنہم پر آتا ہے اور بعض نے توسیع کر کے خیر القرون پر بھی سلف کا اطلاق کیا۔ جس کی خیریت کی شہادت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اب ہوسکتا ہے کہ کوئی کہے کہ ہوسکتا ہے کہ پہلے یہ مسئلہ مختلف فیہا رہا ہو، بعد کے علماء نے سماع پر اجماع کرلیا ہو۔ اَوّل تو یہ وہم ہے سلف میں یہ مسئلہ مختلف فیہ نہ تھا قطعاً نہ تھا۔ (شاباش نیلوی صاحب۔ صفدر)

(و من ادعٰی فعلیہ البیان بالادلۃ دون اقوال من بعدھم بلا برھان بلفظہ ص ۱۵۳)

اس کے بعد انہوں نے ستر بزرگوں کے نام ذکر کئے جن میں صاحب فتح القدیر، ابن قیم، ابن تیمیہ، صاحب تفسیر ابن کثیر، صاحب تفسیر مظہری، صاحب تفسیر رُوح المعانی، شاہ محمد اسحاق، قاضی خان، طحطاوی، صاحب رد المحتار، صاحب فتاویٰ عالمگیریہ رحمہم اللہ (مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہئے کہ فتاویٰ عالمگیریہ کو تقریباً پانچ صد جید علماء کرام کی کمیٹی نے مرتب کیا ہے۔ اس کے مرتب، صاحب نہیں اصحاب ہیں۔ صفدرؔ) تھانوی، مُلّا علی قاری، شاہ عبد القادر، بحر العلوم، عبد الحیٔ، محمد قاسم نانوتوی، حسین احمد مدنی وغیرہ (رحمہم اللہ) حضرات کے نام لئے۔ پھر ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ تمام قبروں میں پڑے ہوئے دھڑوں کے سننے کے قائل نہیں اَور جن علماء کے اقوال آپ کے ذہن میں ہیں یا آپ ان کو اپنی تحقیق انیق اور بڑی کاوش سے جمع کر کے منصۂ شہود پر لانے والے ہیں، وہ آپ کو کسی طرح سُود مند نہیں۔ اس کا جواب کتاب شائع ہونے سے پہلے ہی سُن لیں اور اپنی کتاب میں اس بات کا جواب ضرور دیں وَرنہ آپ کی کتاب ناقص تصور ہوگی۔ بات یہ ہے کہ سماع موتی میں تو کسی کا کوئی اختلاف نہیں اور نہ ہی ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جس کے حل کے لئے دلائل اور نظر و فکر کی ضرورت ہو۔ مسئلہ اپنے مقام پر بالکل بدیہی ہے۔ عرفاً، شرعاً، ظاہراً و باطناً اور دراصل جس بات میں حنفیہ و شوافع کا باہمی اختلاف ہے وہ سماع رُوحانی میں ہے نہ کہ قبروں میں پڑے ہوئے دَھڑوں کے سننے نہ سننے میں (بلفظہٖ ص ۱۵۳، ۱۵۴) اس کے بعد انہوں نے (ص ۱۵۴) میں حضرت تھانوی، علامہ آلوسی، شاہ عبد القادر، مولانا عثمانی، مولانا سید انور شاہ صاحب اور مولانا مدنی رحمہم اللہ کی بعض اُدھوری اور مجمل عبارتیں نقل کی ہیں جن میں رُوح کے سننے کا ذکر ہے۔ (محصلہ) اور ایسا ہی انہوں نے (شفاء الصدور ص ۷۰، ۷۱) میں لکھا ہے۔

''الجواب: قارئین کرام! آپ مؤلف مذکور کی اس عبارت کو سرسری طور پر پڑھ کر اندازہ لگائیں کہ آیا اس میں اُنہوں نے کوئی ٹھکانے کی بات کی ہے؟ پہلے تو وہ لکھتے ہیں کہ سلف میں یہ مسئلہ مختلف فیہ نہ تھا، قطعاً نہ تھا اور

پھر آگے لکھتے ہیں کہ سماع موتیٰ میں تو کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ معلوم نہیں کہ ان کی کون سی بات صحیح ہے پہلے آپ ٹھوس حوالوں سے پڑھ چکے ہیں کہ یہ مسئلہ عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تا ہنوز مختلف فیہا ہے۔ اور پھر آگے جن بزرگوں کے نام دیئے ہیں ان میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی عبارت میں رُوح کے سننے کا اور حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کی عبارت میں رُوح کے سننے اور دھڑ کے نہ سننے کا اور حضرت مدنی رحمہ اللہ کی عبارت میں سماع رُوحانی کا ذکر ہے۔ باقی کسی کی عبارت میں اس کی تصریح موجود نہیں کہ رُوح سنتی ہے اور دھڑ نہیں سُنتا۔ یہ تمام اکابر رُوح اور جسم دونوں کے تعلق سے سماع کے قائل ہیں۔ یہ مؤلف مذکور کی کیسی اور کتنی دیدہ دلیری ہے کہ وہ ان اکابر پر غلط الزام لگا رہے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی عبارتیں اپنے مقام پر آ رہی ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ اور پھر مؤلف مذکور نے ہماری کتاب کے طبع ہونے سے قبل ہی واویلا شروع کر دیا ہے کہ تمہارے ذہن میں یہ ہوگا اور وہ ہوگا۔ ہم اس کا جواب قبل از وقت ہی دے دیتے ہیں۔ نیلوی صاحب آپ اتنے پریشان اور خوف زدہ کیوں ہیں؟ ان شاء اللہ تعالیٰ ہم طبع دوم میں اس مسئلہ کی مزید تشریح کریں گے۔ سرِ دست نقد طور پر آپ اس کتاب میں ضروری مواد تو پڑھ لیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور علماء ملّت کیا فرماتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ قبر اور برزخ کی زندگی پر بحث کرتے ہوئے طویل بحث میں یہ بھی لکھتے ہیں:

(۱) ''پس یہ اَمر کہ اَرواح کا قبور کے ساتھ تعلق ہے اِس چشم سے لینا چاہئے جس کو کسی قدر کشفی آنکھ نے بھی بتلایا ہے کہ اس تودۂ خاک سے اَرواح کا ایک تعلق ہوتا ہے اَور ''السلام علیکم یا اھل القبور'' کہنے سے جواب ملتا ہے۔'' (المصالح العقلیہ حصہ سوم ص ۳۲۶، طبع دیوبند)

(۲) ''غرض رُوح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ انسان میّت سے کلام کر سکتا ہے۔ اَرواح کا تعلق آسمان سے بھی ہوتا ہے جہاں اس کے لئے ایک مقام ملتا ہے۔'' (ایضاً ص ۳۲۷)

(۳) ''اِسی طرح بلا شبہ مَرنے کے بعد اجزائے بدن سے بھی رُوح کا تعلق رہتا ہے گو نیکوں کی رُوح علیین میں ہوتی ہے اور بدوں کی سجّین میں۔ لیکن رُوحوں کا رُوحانی تعلق ابدان کے ذرّات کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ خواہ کسی کو قبر میں دفن کریں خواہ جلا دیں۔ خواہ وہ ڈوب جائے۔ ذرّے ذرّے کے ساتھ رُوح کا تعلق (بالاتر از فہم) رہتا ہے۔ اس کی نظیر ایک تار برقی کافی ہے تار برقی کا تعلق دیکھئے کہاں سے کہاں تک رہتا ہے۔ ایسا ہی رُوح کا تعلق باوجود علّیین و سجّین کے تعلق بدن کے ساتھ بھی ہے اور ضرور ہے مگر اس دُنیا کی آنکھیں محسوس نہیں کر سکتیں۔'' (ص ۳۲۷، ۳۲۸)

حضرات کی ان تمام عبارات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رُوح کے بدن عنصری (کیونکہ ذرّہ ذرّہ بھی بدن ہوتا ہے جسم مثالی تو ذرّہ ذرّہ نہیں ہوتا) کے تعلق کے ساتھ مُردہ قبر میں سلام سُنتا اور اس کا جواب دیتا ہے۔ ہاں! رُوح کا ایک تعلق بدن سے وہ تھا جو دُنیوی زندگی میں تدبیر اور نشوونما کا تھا، برزخ اور قبر میں یہ تعلق نہیں ہوتا۔ صرف رُوحانی تعلق ہوتا ہے جو ادراک و شعور اور سماع وغیرہ میں منحصر رہتا ہے۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۷۷ھ) آنحضرت ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضری کے سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں: ''حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مسلک حضوری مدینہ منورہ کے بارہ میں مرجوح بلکہ غلط مسلک ہے، مدینہ منورہ کی حاضری محض جناب سرور کائنات علیہ السلام کی زیارت اور آپ کے توسّل کی غرض سے ہونی چاہئے۔ آپ کی حیات نہ صرف رُوحانی ہے جو کہ عام مؤمنین وشہداء کو حاصل ہے بلکہ جسمانی بھی ہے اور از قبیل حیات دُنیوی بلکہ بہت سی وجوہ سے اس سے قوی تر ہے۔ آپ سے توسّل نہ صرف وجود ظاہری کے زمانہ میں کیا جاتا تھا بلکہ اس برزخی وجود میں بھی کیا جانا چاہئے۔ محبوب حقیقی تک وصال اور اس کی رضا صرف آپ ہی کے ذریعہ سے اور وسیلہ سے ہوسکتی ہے۔'' (مکتوبات شیخ الاسلام ج اوّل ص ۱۱۹، ۱۲۰)

اور (ج ا ص ۳۱۲) میں فرماتے ہیں: ''حاضری روضۂ مبارک کے وقت آنحضرت علیہ السلام کی رُوح پرفتوح کو وہاں جلوہ افروز سننے والی جاننے والی غایت جمال وجلال کے ساتھ تصور کرتے ہوئے شہنشاہِ عالم کے دربار کی حاضری خیال کی جاوے اور جملہ طرق ادب کا لحاظ رکھا جائے۔''

حضرت کی ان عبارات سے معلوم ہوا کہ سماع صرف رُوحانی نہیں بلکہ جسمانی بھی ہے۔ جن لوگوں نے حضرت کی عبارات میں سے صرف رُوحانی کا لفظ پلے باندھ لیا ہے (جیسے مؤلف ندائے حق وغیرہ) تو ان کا نظریہ درست نہیں ہے۔ ان پر اخلاقی طور پر یہ لازم ہے کہ حضرت کی تمام عبارات کو پیش نظر رکھ کر ان کا مطلب لیں۔

فقہی دلیل

حضرات منکرین سماع ایک دلیل یہ پیش کرتے ہیں جو کُتب فقہ وفتاویٰ میں موجود ہے کہ اگر کسی شخص نے یہ قسم اُٹھائی کہ میں فلاں سے کلام اور گفتگو نہیں کروں گا اور وہ شخص فوت ہو گیا اور قسم اُٹھانے والے نے اس کی قبر پر جا کر اس سے کلام کیا تو حانث نہ ہوگا۔

''لان الموتٰی لا یسمعون'' کیونکہ مُردے نہیں سنتے۔

اس جزئی کی فقہی عبارات کو نہایت اختصار کے ساتھ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: سوال بست و ششم سماعت موتی کلام احیاء سوائے سلام در شرع جائز است یا گناہ؟ کدام گناہ؟

''چھبیسواں سوال: سلام کے بغیر مُردوں کا زندوں کے کلام کا شرعاً سننا کیسا ہے؟ جائز ہے یا گناہ؟ اور گناہ کیسا ہے؟

جواب: عادت و تکیہ سائل است در ہر جامی پُرسد جائز است یا گناہ؟ کدام گناہ؟ بنا بر تکیہ کلام خود نیز این جامی پُرسد کہ جائز است یا گناہ؟ و اِلاّ این مقام پُرسیدن باین عبارت نمی سزد زیرا کہ جواز و گُناہ در اَفعال و اعمال می شود و این متعلق اخبار است کہ این اَمر ثابت است یا نہ پس جواب این است کہ نزد اکثر حنفیہ سماعت موتی ثابت نیست چنانچہ از کافی شرح وافی و فتح القدیر حاشیۂ

هدایه صراحةً و اشارةً که قریب بتصریح است و از مستخلص شرح کنز و عینی شرح کنز و کفایه شرح هدایه معلوم می شود چنانچه عبارات آنهاں مرقوم می شود و در دیگر کتب هم موجود بنا پر طول عبارت بر نقل عبارت ایں پنج کتب اکتفاء نموده شد'' (مائۃ مسائل ص ۴۶)

''الجواب: سائل کی عادت اور تکیہ کلام یہ ہے کہ وہ ہر جگہ یہ پوچھتا ہے کہ جائز ہے یا گناہ؟ اور گناہ ہے تو کیسا؟ اپنے اسی تکیۂ کلام کی وجہ سے یہاں بھی وہ پوچھتا ہے کہ جائز ہے یا گناہ؟ ورنہ اس مقام میں اس طرح پوچھنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ جواز اور گناہ افعال اور اعمال میں ہوتا ہے اور یہ سوال اخبار کے متعلق ہے کہ یہ معاملہ ثابت ہے یا نہ۔ پس اس کا جواب یہ ہے کہ اکثر احناف کے نزدیک سماع موتی ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ کافی شرح وافی اور فتح القدیر حاشیۂ ہدایہ میں صراحۃً اور اشارۃً جو تصریح کے قریب ہے اور مستخلص شرح کنز اور عینی شرح کنز اور کفایہ شرح ہدایہ سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کی عبارات لکھی جا رہی ہیں اور دوسری کتابوں میں بھی یہ موجود ہے مگر طوالت کے ڈر سے صرف ان پانچ کتابوں کی عبارت کے نقل پر ہم اکتفاء کرتے ہیں۔''

اس کے بعد انہوں نے ص ۴۶ سے ص ۵۳ تک ان کتابوں کی وہ تفصیلی عبارتیں نقل کی ہیں جو قسم اور یمین کے مسئلہ سے متعلق ہیں اور بظاہر عدم سماع موتی پر دال ہیں۔

الجواب: حضرات مجوزین سماع موتی اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں جیسا کہ حضرت ملّا علی القاری رحمہ اللہ اور حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کے حوالہ سے پہلے گزر چکا ہے کہ قسم کا مدار عُرف پر ہے اور عُرف عام میں لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ مُردے نہیں سنتے۔ (یعنی ان کے سننے کا کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ کیونکہ تکلیفی زندگی باقی نہیں رہتی) اس لئے قسم اُٹھانے والا باوجود کلام کرنے کے حانث نہیں ہوگا۔

حضرت مولانا محمد عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: ''و انما حکموا فی الحلف بالضرب و الکلام و الدخول علیه و نحوها بعدم الحنث عند وجود هذه الاشیاء بالمیت لکون الایمان مبنیة علی العرف و العرف قاض علی ان هذه الامور یراد بها ارتباطها ما دام الحیوة لا بعد الموت فالکلام بالمیت و ان کان کلامًا حقیقةً و یوجد فیه الاسماع و الافهاء لکن العرف یحکم بان المراد فی قوله لا ...... هو الکلام حالة حیات'' (عمدۃ الرعایہ ج ۲ ص ۲۵۴)

''مشائخ نے میّت کو مارنے اس سے کلام کرنے اور اس کے پاس جانے وغیرہ اُمور میں عدم حنث کا حکم کیا ہے کیونکہ قسموں کا مبنیٰ عُرف ہے اور عُرف یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ان اُمور کا ارتباط زندگی تک ہے بعد الموت نہیں۔ پس میّت سے کلام اگرچہ حقیقۃً کلام ہے اور اس میں اسماع اور افہام پایا جاتا ہے لیکن عُرف یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس عدم تکلم سے حالتِ حیات میں عدم تکلم مُراد ہے۔

اور حضرت شیخ الاسلام شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں: ''و اما مسألة الایمان التی ذکرها الشیخ ابن الهمام رحمہ اللہ فبنی الایمان علی العرف فاذا حلف احد انه لا یکلم فلانًا فلا یفهم منه اهل العرف الا التکلیم فی حالة الحیوة فلا یحنث بتکلیمه میتًا و الله تعالٰی اعلم'' (فتح الملہم ج ۲ ص ۴۷۹)

''بہرحال! قسم کا مسئلہ جس کو شیخ ابن الہمام رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے (تو اس کا جواب یہ ہے کہ) قسموں کا مبنیٰ عُرف پر ہوتا ہے۔ سو جب کوئی شخص یہ قسم اُٹھائے کہ میں فلاں سے کلام نہیں کروں گا تو اس سے اہلِ عُرف یہی سمجھتے ہیں

کہ زندگی کی حالت میں کلام کرنا مُراد ہے لہٰذا مُردہ کے ساتھ کلام کرنے کی وجہ سے وہ حانث نہ ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔"

اس سے معلوم ہوا کہ عُرفِ عام میں کلام کرنے نہ کرنے کا تعلق زندوں سے ہوتا ہے جس پر عادۃً کوئی اثر اور نتیجہ مرتّب ہو اور کلام کرنے والا مخاطب کی گفتگو سے بھی فائدہ اُٹھا سکے اور اس کے ہاں یا نہیں اور رضا اور عدمِ رضا سے آگاہ اور واقف ہو سکے اور مُردہ چونکہ مکلّف نہیں اُور عادۃً اس کی آواز بھی نہیں سُنی جاسکتی۔ اس لئے عُرفِ عام کے لحاظ سے مُردہ سے وہ کلام نہیں جو زندہ سے تھا۔ لہٰذا متکلم اور حالف اس سے حانث نہ ہوگا۔

علّامہ داود بن سلیمان البغدادی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: "فقال المحقق الشیخ علی القاری الحنفی فی شرح المشکوۃ فی شرح حدیث اھل القلیب اقول ھذا منھم مبنی علی ان مبنی الایمان علی العرف فلا یلزم منه نفی حقیقة السماع کما قالوا فیمن حلف لا یأکل اللحم و اکل السمک مع انه تعالٰی سماه لحمًا طریا" اقول و ھذا کذٰلک فان من حلف لا یکلم زیدًا و کان میّتًا فکلمه لا یحنث لان التکلم المراد منه المتعارف الذی یکون فیه محاورة باخذ الکلام ورده ولما کان المیت یسمع ولا یرد رد اًمتعارفا بل ردًا نؤمن به ولا نسمعه غالبًا لم یحصل حقیقة التکلم العرفی فلھٰذا قالوا الا یسمع لا لِاَن المیت لا یسمع"

(المنحۃ الوھبیۃ ص ۱۰)

"محقق الشیخ مُلّا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ نے مشکوٰۃ کی شرح میں حدیث اہلِ قلیب یعنی وہ کنواں جس میں مقتولینِ بدر کو پھینکا گیا تھا) کی شرح میں فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کا یہ ارشاد اس بات پر مبنی ہے کہ قسموں کا مدار عُرف پر ہے سو اس سے حقیقتِ سماع کی نفی لازم نہیں آتی۔ جیسا کہ اُنہوں نے کہا ہے کہ جس نے یہ قسم اُٹھائی کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا اور اُس نے مچھلی کھالی تو وہ حانث نہ ہوگا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اُس پر لَحمًا طَرِیًا (تازہ گوشت) کا لفظ اطلاق فرمایا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی اسی طرح ہے جس نے قسم اُٹھائی کہ وہ زید سے بات نہیں کرے گا اور زید مَر چکا ہے اُور اُس نے اُس سے کلام کیا تو حانث نہ ہوگا۔ کیوں تکلّم سے مُراد وہ متعارف کلام ہوتا ہے جس میں طرفین سے گفتگو کرنے اُور رَدّ کرنے کا سلسلہ ہو اور جب مُردہ سُنتا ہے اُور اس طریقہ سے جواب رَدّ نہیں کرسکتا جو متعارف ہے بلکہ وہ ایسے طریقہ سے رَدّ کرتا ہے جس پر ہم ایمان تولاتے ہیں مگر غالباً سنتے نہیں اور اس طریقہ سے تکلّم عُرفی کی حقیقت حاصل نہیں ہوتی تو اس وجہ سے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ وہ سُنتا نہیں، نہ اس وجہ سے کہ سچ مچ مُردہ نہیں سُنتا۔

حضرت مُلّا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بحث (مرقات ج ۸ ص ۱۱) میں کی ہے جس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ کلام سے جو مقصود ہوتا ہے وہ یہاں مفقود ہے۔ اِس لئے قسم اُٹھانے والا حانث نہ ہوگا کیونکہ کلام سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ دُوسرا سمجھ کر اور سُن کر اس کو جواب دے جس کو متکلّم سُن سکے۔ اُور میّت گو آواز سُنتی اور جواب بھی دیتی ہے مگر اس کی آواز عادۃً سُنی نہیں جاتی۔ اِس لئے یہ کلام عُرفی کلام کی مد میں شامل نہیں اُور اس پر حنث بھی نہیں۔ مُردہ تو آخر مُردہ ہے۔ فقہ سے اس کا بھی ثبوت ہے کہ بعض اوقات حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ زندہ آدمی کے کلام کو بھی کلام نہیں کہتے۔

چنانچہ علّامہ ابن عابدین الشامی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: "وفی التحریر و تبطل عباراته من الاسلام والردة والطلاق و لم توصف بخبرٍ ولا انشاءٍ و صدقٍ و کذبٍ کالحان الطیور و مثله فی التلویح فھٰذا صریح فی ان کلام النائم لا یسمّٰی کلامًا لا لغةً ولا شرعًا بمنزلة المھمل"

(شامی ج ۲ ص ۵۸۸، طبع مصر مطلب طلاق المدھوش)

''اور تحریر (الاصول) میں ہے کہ سونے والے کی عبارات اسلام۔ ردّت اور طلاق وغیرہ سب میں باطل ہیں اور اس کی عبارتیں نہ تو خبر اُور انشاء سے متصف ہیں اور نہ سچ اور جھوٹ سے جیسے پرندوں کی بولیاں اور اسی طرح تلویح میں ہے۔ پس اِس بیان میں اس کی تصریح ہے کہ سونے والے کا کلام نہ تو لُغت کے لحاظ سے کلام ہے اور نہ شرع کے اعتبار سے بلکہ یہ بمنزلۂ مہمل کے ہے۔''

ملاحظہ فرمایئے کہ سونے والا با قاعدہ بولتا ہے اور سننے والے سنتے ہیں مگر بایں ہمہ اس کے کلام کو حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نہ لُغۃً کلام کہنے کو تیار ہیں اور نہ شرعاً محض اس لئے کہ نیند کی حالت میں آدمی حدیث کے رُو سے (رفع القلم عن ثلاثة عن النائم حتّٰى يستيقظ الحدیث الجامع الصغیر ج ۲ ص ۲۴ حم۔ د۔ ن۔ ہ۔ ک۔ صحیح) مرفوع القلم اور غیر مکلّف ہوتا ہے اور چونکہ وہ بے بس و بے اختیار ہے۔ اس لئے اس کے کلام پر کلام کا اطلاق بھی نہیں ہوتا اُور نہ اسلام و ردّت اور طلاق وغیرہ کے شرعی اور فقہی احکام اس پر مترتب ہوتے ہیں اور اس کا کلام نہ خبر ہے نہ انشاء اور نہ سچ ہے اور نہ جھوٹ بلکہ اس کو ایسا سمجھنا چاہئے جیسے طوطا وغیرہ پرندے بولیاں بولتے ہیں اُور قسم کا تو مدار ہی عُرف پر ہے۔ کُتبِ فقہ۔ فتاویٰ اور تفاسیر میں اس کی بے شمار جزئیات موجود ہیں۔ صرف بات کو واضح اور مبرہن کرنے کے لئے ہم یہاں چند جزئیات با حوالہ عرض کرتے ہیں۔ اگر کسی شخص نے یہ قسم اُٹھائی کہ مَیں آٹا نہیں کھاؤں گا۔ اگر اُس نے آٹے سے تیار کی ہوئی روٹی وغیرہ کھالی تو حانث ہوگا اور اگر تکلیف اُٹھا کر آٹا ہی پھانک گیا تو حانث نہ ہوگا، (قدوری ص ۲۰۷) اور یہ اِس لئے کہ عُرفِ عام میں آٹا پھانکا نہیں جاتا بلکہ اس کی روٹی کھائی جاتی ہے۔

اگر کسی شخص نے قسم اُٹھائی کہ میں سَر نہیں کھاؤں گا تو یہ اُس سَر پر بولا جائے گا جو عادۃً بازار میں فروخت ہوتا ہے (حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک گائے، بھینس، بھیڑ اور بکری کا اور حضرات صاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک صرف بھیڑ اور بکری کا سر) اگر کسی نے چڑیا وغیرہ جانور کا سر کھالیا تو حانث نہ ہوگا۔ (قدوری ص ۲۰۸ والتوضیح والتلویح ص ۱۱۳) اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ چڑیا وغیرہ جانوروں کا سر، سر ہی نہیں ہوتا۔ سر تو بہر حال ہوتا ہے مگر عُرفِ عام میں وہ بازاروں میں فروخت نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کے استعمال سے حانث نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی نے یہ قسم اُٹھائی کہ وہ بیت (گھر) میں داخل نہ ہوگا۔ اگر وہ بیت اللہ شریف یا مسجد یا گرجا یا کلیسا وغیرہ عبادت خانوں میں داخل ہو گیا تو حانث نہ ہوگا۔ (قدوری ص ۲۰۶) اگرچہ حقیقۃً یہ بھی گھر ہی ہیں اور ان کی بھی عموماً دیواریں اور چھتیں ہوتی ہیں اور ان میں بھی بسا اوقات رات گزاری جاتی ہے اور ان میں بھی بیوتت (یعنی رات گزارنے) کا تحقق ہوتا ہے لیکن عُرفِ عام میں ان کو عام اور مطلق بیت نہیں کہتے اس لئے اس سے حِنث لازم نہیں آتا۔ اگر کسی شخص نے قسم اُٹھائی کہ میں کلام نہیں کروں گا۔ اُس نے اگر نماز شروع کی اور اس میں اس نے قرآنِ کریم پڑھا تو حانث نہ ہوگا۔ (قدوری ص ۲۰۶) حالانکہ قرآنِ کریم بھی کلام ہے مگر اللہ تعالیٰ کا اُور عرفِ عام میں اس پر کلام نہیں بولا جاتا۔

اگر کسی شخص نے یہ قسم اُٹھائی کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ اس نے اگر مچھلی کا گوشت کھالیا تو حانث نہ ہوگا۔ (قدوری ص ۲۰۷) اگرچہ قرآنِ کریم میں اس پر لحم کا لفظ بولا گیا ہے (لَحْمًا طَرِيًّا۔ یعنی تازہ گوشت) مگر عرفِ عام میں مطلق لحم اور گوشت کا لفظ اس پر نہیں بولا جاتا۔ اِس لئے مچھلی خور اس قسم کی وجہ سے حانث نہ ہوگا۔ کتب فقہ واُصول میں یہ مسئلہ بصراحت مذکور ہے کہ اگر کسی شخص نے قسم اُٹھائی کہ میں میوہ اور پھل نہیں کھاؤں گا اور اس نے انگور اور انار کھالئے تو حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک وہ حانث نہ ہوگا (شرح وقایہ ج ۲ ص ۲۲۲، نور الانوار ص ۱۱۶،

والتوضیح والتلویح ص ۱۱۵) اس لئے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تحقیق میں ان میں تفکّہ اور تلذّذ سے زائد معنی موجود ہیں۔ یعنی میوہ تلذّذ کے لئے کھایا جاتا ہے اور انگور وانار سے ان کے نزدیک بعض علاقوں میں خوراک اور غذا کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اس لئے ان کے کھانے والا حانث نہ ہوگا۔

اگر کسی شخص نے یہ قسم اُٹھائی کہ فلاں عورت سے مجامعت نہیں کرے گا اور اس کو بوسہ نہ دے گا۔ اگر اس عورت کی زندگی میں یہ کارروائی ہوئی تو حانث ہو جائے گا۔ اگر اس عورت کے مرنے کے بعد یہ کارروائی اس سے کی گئی تو حانث نہ ہوگا۔ (فتاویٰ سراجیہ ص ۵۸ طبع نولکشور، ونحوہ فی جامع الکبیر للامام محمد رحمہ اللہ ص ۷۳) اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس عورت کے رخسار اور شرم گاہ ہی مرنے کے بعد غائب ہوگئی ہے اور بوسہ ومجامعت کا تحقق ہی نہیں ہوا مگر چونکہ عُرف عام میں یہ کارروائی زندہ سے مُراد لی جاتی ہے۔ لہٰذا مُردہ کے ساتھ اس کارروائی سے حنث لازم نہ ہوگا۔

اگر کسی نے یہ قسم اُٹھائی کہ میتہ (بے ذبح کیا ہوا جانور) نہیں کھاؤں گا اور اس نے مچھلی اور مکڑی کھالی تو حانث نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر یہ قسم اُٹھائی کہ میں دَم (خون) نہیں کھاؤں گا اور اس نے جگر اور تِلّی کھالی تو حانث نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر یہ قسم اُٹھائی کہ میں دابہ (جانور) پر سوار نہیں ہوں گا اور وہ کافر پر سوار ہو گیا تو حانث نہ ہوگا۔ حالانکہ حدیث میں مچھلی ومکڑی پر میتہ اور جگر وتِلّی پر دَم کا اطلاق ہوا ہے۔

(أحِلّ لنا المیتتان و الدمان فاما المیتتان فالحوت و الجراد و اما الدمان فالکبد و الطحال ہ۔ک۔ ھق عن ابن عمر رضی اللہ عنہ صحیح الجامع الصغیر ج ۱ ص ۱۳ طبع مصر) اور کفار کے بارے میں قرآن کریم میں آتا ہے۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا (تفسیر کشاف ج ۱ ص ۲۱۵ طبع مصر) یعنی بدترین جانور اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافر ہیں)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''پھر الاشباہ والنظائر'' میں عُرف اور شرع میں باہم تعارض ہونے کے بارے میں لکھا ہے کہ جب عُرف اور شرع میں باہم تعارض ہووے تو استعمال کے بارے میں جو عرف ہوگا وہی مقدم سمجھا جاوے گا۔ خصوصاً قسم کے مسائل میں۔ مثلاً جب کسی شخص نے قسم کھا کر کہا کہ فرش پر نہ بیٹھوں گا یا یہ کہا کہ بساط پر نہ بیٹھوں گا یا یہ کہا کہ سراج (چراغ) کی رَوشنی سے فائدہ نہ اُٹھاؤں گا تو وہ شخص اس صورت میں حانث نہ ہوگا کہ زمین پر بیٹھے اور نہ اس صورت میں حانث ہوگا کہ آفتاب کی روشنی سے فائدہ اُٹھاوے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں زمین کو فرش اور بساط فرمایا ہے اور سراج کا لفظ شمس کے معنی میں ارشاد فرمایا ہے اور اگر کسی شخص نے قسم کھا کر کہا کہ گوشت نہ کھاؤں گا تو مچھلی کا گوشت کھانے سے حانث نہ ہوگا اگرچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں لحم کا لفظ مچھلی کے گوشت کے معنی میں ارشاد فرمایا ہے۔ اگر کسی شخص نے قسم کھا کر کہا کہ دابہ پر سوار نہ ہوگا تو اس صورت میں حانث نہ ہوگا کہ مثلاً پالکی پر سوار ہووے اور وہ پالکی کفار لے جاویں اگرچہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو دابہ ارشاد فرمایا ہے۔ اور اگر قسم کھا کر کہا کہ سقف (چھت) کے نیچے نہ بیٹھوں گا اور اس کے بعد آسمان کے نیچے بیٹھا تو حانث نہ ہوگا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے آسمان کو سقف ارشاد فرمایا ہے۔''

(فتاویٰ عزیزی ج ۲ ص ۹۷ ۲ مترجم اُردو واصل فارسی ۲۳۰ ص ۱۲۸، ۱۲۹، طبع مجتبائی دہلی)

اگر کسی نے قسم اُٹھائی کہ گوشت نہیں کھائے گا اور اس نے شوربا کھایا یا مچھلی کھائی تو حانث نہ ہوگا۔ ہاں! مگر جب نیت کرے تو الگ بات ہے اور اگر اُس نے قسم اُٹھائی کہ دابہ پر سوار نہیں ہوگا یا میخ اور کیل پر نہ بیٹھے گا اور

وہ پہاڑ پر جا بیٹھا تو حانث نہ ہوگا۔ حالانکہ قرآن کریم میں مچھلی پر گوشت کا، کافر پر دابہ کا اور پہاڑوں پر کیلوں (وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا) کا اطلاق ہوا ہے اور یہ نہ حانث ہونا عُرف کی وجہ سے ہے۔ (رسائل ابن عابدین ص ۳۰۰ طبع مصر)

الحاصل! کُتبِ فقہ وفتاویٰ واُصول وتفسیر وغیرہ میں قسم کے سلسلہ میں عُرفِ عام کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا گیا۔ لہٰذا فقہ کی اس جزئی سے مطلقاً سماع موتی کی نفی پر استدلال قطعاً صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ ماتہ مسائل میں ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ مُردے سلام کہنے والوں کا سلام سنتے ہیں اور یہ حوالہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے۔ اگر ماءتہ مسائل میں پیش اور نقل کردہ ان فقہی حوالوں سے ان کے نزدیک مطلقاً سماع موتی کی نفی مُراد ہوتی تو پھر مُردے کے کلام سننے کا کیا مطلب ہے؟ لہٰذا حضرت مُلّا علی القاری، علامہ داود بن سلیمان البغدادی، مولانا عبدالحیٔ صاحب، حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب اور حضرت مولانا عثمانی وغیرہ حضرات (رحمہم اللہ) کا یہ کہنا بے جا نہیں کہ فقہ کے اس جزئیہ سے سماع موتی کی نفی نہیں ہوتی اور یہ سب حضرات خود فی الجملہ سماع موتی کے قائل ہیں اور یہ سب حضرات محقق حنفی ہیں اور موخر الذکر دونوں بزرگ علماءِ دیوبند میں بلند پایہ شخصیتیں ہیں۔

ایک مغالطہ اور اُس کا جواب

مؤلف اقامۃ البرہان (ص ۷۵، ۷۶) وغیرہ نے ہدایہ، فتح القدیر، بنایہ، طحطاوی اور مبسوط (ج ۹ ص ۹۷۸) کی ایک عبارت سے عدم سماع موتی پر استدلال کیا ہے۔ واللفظ للآخر!

''فان المقصود من الکلام الافہام وذلک لا یحصل بعد الموت''

''کیونکہ کلام سے مقصود افہام ہے اور یہ موت کے بعد حاصل نہیں ہوتا۔''

الجواب: اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میّت سرے سے علم وفہم اور اِدراک وشعور ہی سے محروم ہوتی ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو منکرینِ سماع موتی میں پیش پیش سمجھی جاتی ہیں۔ مُردوں کے لئے علم وفہم تو وہ بھی ثابت کرتی ہیں۔ جیسا کہ بخاری وغیرہ کے حوالہ سے اس کی تصریح گزر چکی ہے اور اگر سچ مچ مُردوں میں فہم وشعور نہیں ہوتا تو پھر وہ نکیرین کے سوالات کو کیسے سمجھتے ہیں؟ اور پھر بلا فہم وشعور ان کو جواب کیسے دیتے ہیں؟ اور پھر ان غیر شعوری جوابات کا عنداللہ اعتبار کیوں کیا جاتا ہے؟ اور پھر ان جوابات پر راحت وعذاب کیسے کرتے ہیں؟ اور پھر زندوں کا سلام سُن کر اُن کو جواب کیسے دیتے ہیں؟ (جس کی صحیح احادیث سے پوری بحث پہلے گزر چکی ہے) اور جب زندوں کے بعض اعمال اُن پر پیش کئے جاتے ہیں تو اچھے کاموں سے وہ خوش ہوتے ہیں اور بُرے کاموں پر ان کے لئے وہ دُعائیں کرتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہی اُن سے صادر ہوتا ہے؟ اس نظریہ کے پیشِ نظر تو راحت وعذابِ قبر کی جملہ احادیث پر اور کُتبِ عقائد میں اہل السنت والجماعت کی طرف سے پیش کردہ تمام عقلی اور نقلی دلائل پر پانی پھر جاتا ہے۔ کون عقل مند اس نکمی بات کو تسلیم کرسکتا ہے؟ الغرض بقول حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ مُردوں کے ادراک وشعور کا انکار اگر کفر نہیں تو اس کے الحاد ہونے میں تو کوئی شُبہ ہی نہیں ہے (عبارت ان کی پہلے عرض کی جاچکی ہے) کُتبِ فقہ کی اس عبارت اور جزئیہ کا مطلب اس کے سواء اور کچھ نہیں کہ تکلیفی زندگی کی طرح جس پر عادۃً کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ مُردوں میں اس قسم کا افہام وتفہیم نہیں اور عُرفِ عام کے لحاظ سے کلام کا جو مقصود ہے وہ اس سے حاصل نہیں ہوتا۔ حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ (صاحب فتح القدیر) اور علامہ عینی رحمہ اللہ

(صاحب بنایہ) کی عبارتیں پہلے گزر چکی ہیں کہ وہ فی الجملہ سماع موتی کے قائل ہیں۔ پھر ان کی عبارات کی ان کی مرضی کے خلاف توجیہ کرنا توجیہ الکلام بما لا یرضی بہ قائلہ کا مصداق ہے اور حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ نے علم کلام کی کتاب المسایرہ میں میت کے فہم اور ادراک کا اثبات کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ج ۲۲ ص ۱۱۶، مع المسایرہ طبع مصر)

عدم سماع موتی کی ایک اور دلیل

مؤلف شفاء الصدور (ص ۵۷ میں) اور صاحب تسکین القلوب (ص ۷۹) میں لکھتے ہیں: ''واللفظ لہ لانزاع فی ان المیت'' (شرح مقاصد ص ۱۶۳، بحوالہ البصائر ص ۴۰) اس میں کوئی نزاع نہیں کہ میت نہیں سنتی۔ پھر حنفیہ کرام کے یہ اصحاب فتاویٰ، البحر الرائق، الظہیریہ، طحطاوی حاشیۂ مراقی الفلاح، الجوہرہ، جامع الرموز، سراج الوہاج، فتاویٰ قاضی خان، اور نہر الفائق سب اس پر متفق ہیں کہ: ''امام سلام پھیرتے وقت نمازِ جنازہ سے میت کو سلام دینے کا ارادہ نہ کرے اس لئے کہ وہ اس کا اہل نہیں یعنی سنتا نہیں۔'' (البصائر ص ۴۰)

الجواب: فقہ کے اس جزئیہ سے عدم سماع موتی پر استدلال صحیح نہیں ہے۔

اوّلاً: اس لئے کہ میت کو سلام میں مراد لینے اور نہ لینے کا مسئلہ خود حضرات فقہاء احناف میں اختلافی ہے۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم المصری الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''و لم یبین المنوی بالتسلیمتین للاختلاف ففی التبیین و فتح القدیر ینوی بھما المیت مع القوم و فی الظھیریۃ و لا ینوی الامام البیت فی تسلیمتی الجنازۃ بل ینوی من عن یمنیہ فی التسلیمۃ الاولی و من عن یسارہ فی التسلیمۃ الثانیۃ اھ۔ و ھو الظاھر لان المیت لا یخاطب بالسلام علیہ حتی ینوی بہ اذ المیت لیس اھلاً لہ'' (البحر الرائق ج ۲ ص ۱۸۳ طبع مصر)

''دونوں سلاموں میں جس کو مراد لیا گیا ہے اس کا ذکر انہوں نے نہیں کیا اس لئے کہ اس میں اختلاف ہے۔ تبیین اور فتح القدیر میں ہے کہ ان دونوں سلاموں میں قوم کے ساتھ میت کو بھی مراد لے اور ظہیریہ میں ہے کہ امام جنازہ کے دونوں سلاموں میں میّت کی نیت نہ کرے بلکہ دائیں اور بائیں طرف کے سلام میں انہیں لوگوں کی نیت کرے جو اس کے دائیں اور بائیں ہیں اور ظاہر بات بھی یہی ہے۔ کیونکہ (اس تکلیفی) سلام کا میت اہل ہی نہیں لہٰذا اس کو سلام اور خطاب کرنا کیسا؟

اور حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''وینوی بالتسلیمتین المیت مع القوم''

''کہ امام دونوں سلاموں میں قوم کے ساتھ میت کی نیت بھی کرے۔'' (فتح القدیر ج ۱ ص ۴۶۰، طبع مصر)

جب یہ مسئلہ خود حضرات فقہاء احناف میں اختلافی ہے تو اس سے بلا اختلاف بتائے استدلال کرنا کون سی علمی خدمت ہے۔ حیرت ہے ان بزرگوں پر جو فقہ کی بہت سی کتابوں کا نام لکھ کر عوام کو یہ باور کرا رہے ہیں بلکہ مغالطہ دے رہے ہیں کہ یہ جزئیہ متفق علیہا ہے۔ الغرض جہاں سلام میں میت کی نیت نہ کرنے والے حضرات موجود ہیں، وہاں حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ جیسے محقق میت کو نیت میں مراد لینے والے بھی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں اس جزئیہ کے اختلافی ہونے کے باوجود اس کو غیر مسلم کہنے والے بھی موجود ہیں۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین الشامی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ''و قولہ ھنا اذ المیت لیس اھلاً لہ غیر مسلّم و سیأتی ماورد فی اھل المقبرۃ السلام علیکم دار قوم مؤمنین و تعلیمہ علیہ السلام السلام علی الموتی'' (منحۃ الخالق ج ۲ ص ۱۸۳، طبع مصر)

''ابن نجیم رحمہ اللہ کا اس مقام پر یہ کہنا کہ میت سلام کی اہل نہیں، مسلّم نہیں ہے اور عنقریب اہلِ قبور کے بارے میں جو وارد ہوا ہے، آ رہا ہے کہ ان کو السلام علیکم دار قوم مؤمنین کے الفاظ سے سلام کہا جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (اُمت کو) مُردوں پر سلام کہنے کی تعلیم بھی ہے۔''

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس اَمر کا صاف انکار کیا ہے کہ میت سلام کی اہل نہیں اور دُوسری بات یہ معلوم ہوا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ بھی فی الجملہ سماعِ موتی کے قائل ہیں۔ لہٰذا مؤلف (شفاء الصدور ص ۱۷) میں اور (ندائے حق ص ۳۱) میں علامہ شامی رحمہ اللہ کو منکرین سماعِ موتی میں شامل کرنا قطعاً غلط ہے۔

وثانیاً: اس لئے کہ ان عبارات میں ''اہل نہیں'' کا یہ مطلب نہیں کہ میت سنتی نہیں بلکہ یہاں حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کا مطمحِ نظر ہی اور ہے قاضی خان کی عبارت یہ ہے: ''ولا ینوی الامام المیت فی تسلیمتی الجنازة بل ینوی من عن یمینه بالتسلیمة الاولی و من عن یساره بالتسلیمة الثانیه'' (فتاوی قاضی خاں ج ۱ ص ۹۲، طبع نولکشور)

''اَور جنازہ کے دونوں سلاموں میں اِمام میت کا اِرادہ نہ کرے بلکہ پہلے سلام میں ان لوگوں کا اِرادہ کرے جو اُس کے دائیں طرف ہیں اَور دوسرے سلام میں اُن کی نیت کرے جو اُس کی بائیں جانب ہیں۔''

اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ پہلے سلام کو بائیں طرف والے اَور دُوسرے سلام کو دائیں طرف والے نہیں سنتے بلکہ مقصد یہ ہے کہ پہلے سلام کے دائیں طرف والے اہل اور مستحق ہیں اَور دوسرے سلام کے بائیں جانب والے اور اسی طرح (جامع الرموز ج ۱ ص ۷۲) میں لکھا ہے کہ دائیں طرف سلام پھیرتے وقت امام ان انسانوں اور جنّوں کی نیت کرے جو اس کی دائیں جانب ہیں اور بائیں طرف سلام میں بائیں طرف کے انسانوں اَور جنّوں کی نیت کرے اور کافی کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ امام ہمارے زمانہ میں سلام میں عورتوں کی نیت ہی نہ کرے اور یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ سلام میں فاسقوں کی نیت نہ کرے اَور یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ پہلے سلام میں حاضرین کی نیت کرے اور دُوسرے سلام میں تمام انسانوں اور جنّوں کی نیت کرے اور (ج ۱ ص ۷۳) میں یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ بعض کے نزدیک منفرد تمام اِنسانوں کی نیت کرے۔ (ملخصہٗ) ان عبارات میں اس کا کہ امام سلام پھیرتے وقت عورتوں اور فاسقوں کی نیت نہ کرے، یہ مطلب تو یقیناً نہیں کہ عورتیں اَور فاسق سلام سنتے ہی نہیں اَور اس معنی میں وہ اہل نہیں کہ وہ سننے سے قاصر ہیں بلکہ مُراد یہ ہے کہ عورتیں جو عموماً مبداء فساد ہیں۔ (مشہور مقولہ ہے کہ مبداء فساد تین چیزیں ہیں۔ زن۔ زر۔ زمین) اور فاسق جو رب تعالیٰ کے نافرمان ہیں۔ اس سلام کے اہل اور مستحق نہیں ہیں۔ اِسی طرح جو شخص وفات پا چکا ہے اس کے لئے بعد از موت دُنیا کی تکالیف اور مصائب سے سلامتی کی دُعا کا کیا معنٰی؟ چونکہ زندہ انسان کو اس تکلیفی زندگی میں طرح طرح کے مصائب پیش آتے رہتے ہیں اس لئے اس کے حق میں سلام کرنا اور سلامتی کی دُعا کرنا درست ہے اَور وہ اس کا اہل و مستحق ہے بخلاف میت کے۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جامع الرموز میں ایک قول یہ بھی تو نقل کیا گیا ہے کہ منفرد بعض حضرات فقہاء کے نزدیک سلام پھیرتے وقت تمام انسانوں کو مُراد لے (ینوی جمیع الناس) کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تمام انسان اس کے سلام کو سنتے ہیں اور اس معنی میں وہ اس کے اہل ہیں۔ لہٰذا وہ ان بعض حضرات فقہاء کرام کے نزدیک سلام میں سب کی نیت کرے؟ کون عقلمند یہ معنٰی مُراد لے سکتا ہے؟

وثالثاً: اس لئے کہ کُتبِ فقہ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ بعض اوقات ایسے لوگوں کو بھی سلام کہنا مکروہ ہے جو باقاعدہ سنتے ہیں۔ امام صدر الدین الغزی الحنفی رحمہ اللہ کا عربی قصیدہ جو ''سلامک مکروہ علٰی من یستمع'' سے شروع ہوتا ہے۔ درمختار (ج۱ ص۵۷۷، طبع مصر) میں منقول ہے جس میں تقریباً بیس اشخاص ایسے بتائے ہیں جنہیں سرے سے سلام کہنا ہی مکروہ ہے، جن میں نمازی، مؤذن، محدّث، خطیب، اقامت کہنے والا، اجنبی عورتیں، شطرنج کھیلنے والا اور قضائے حاجت میں مصروف وغیرہ اشخاص مذکور ہیں اور (فتاویٰ سراجیہ ص۷۲) میں ہے کہ حمام میں سلام نہ کہے اُور (فتاویٰ قاضی خان ج۴ ص۷۹۲) میں ہے کہ جو لوگ خطبہ سُن رہے ہوں، ان کو بھی سلام نہ کہے۔ اگر کسی نے سلام کیا تو سامعین پر ردِّ سلام واجب نہیں، ان فقہی احکام کا یہ مقصد تو ہرگز نہیں کہ یہ تمام لوگ کانوں سے بہرے ہوتے ہیں اور سلام نہیں سنا کرتے، اس لئے ان کو سلام نہیں کہنا چاہئے، سلام نہ کہنے یا سلام کہہ کر کسی کی سلام میں نیت نہ کرنے سے یہ کیوں کر ثابت ہوا کہ وہ سُنتا نہیں؟

ورابعاً: اس لئے کہ حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک مجلس کے پاس سے گزرے، جس میں مسلمان، بُت پرست، اور یہودی وغیرہ تھے اور ان میں رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی بھی تھا۔ آپ نے اُنہیں سلام کہا۔ (محصلہ بخاری ج۲ ص۹۲۴)

اس حدیث کی شرح کے فوائد میں علامہ قسطلانی رحمہ اللہ (وغیرہ شراح حدیث) لکھتے ہیں کہ: ''ففیہ انہ یسلم بلفظ التعمیم ویقصد بہ المسلم'' (حاشیہ بخاری ج۲ ص۹۲۴)

''اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سلام تو عام لفظ سے کہے لیکن قصداً اُور نیت صرف مسلمان کی کرے۔''

کون یہ باطل اور بے بنیاد دعویٰ کر سکتا ہے کہ مُشرک، یہودی اور بُت پرست وغیرہ کفار اس لئے سلام کے اہل نہیں کہ وہ سنتے نہیں؟ بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ نافرمان امن اور سلامتی کی دُعا کے اہل و مستحق نہیں ہیں اُور یہی وجہ ہے کہ بلاضرورت و مجبوری ان کو ابتداءً سلام کہنا درست نہیں ہے اُور جب وہ سلام کہیں تو بفحوائے حدیث ان کو صرف ''علیکم'' کہہ دینا کافی ہے۔

وخامساً: اس لئے کہ حدیث کی رُو سے سلام یا تو تکلیفی زندگی کے لئے ثابت ہے جس میں انسان طرح طرح کی دینی اور دُنیوی پریشانیوں میں مبتلاء رہتا ہے اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے سلامتی سے رکھے اور یا قبر کی زندگی کے لئے ثابت ہے جس میں انسان طرح طرح کی آزمائشوں میں گھر جاتا ہے۔ مثلاً منکر نکیر کا سوال اور متعدد دیگر اُمور۔ اسی وجہ سے اس کے لئے تثبت کی دُعا کی تلقین آئی ہے اور اس کے بعد عذاب و راحت اور تخفیفِ عذاب اور رفعِ درجات کا سلسلہ تو حشر تک باقی رہتا ہے۔ لہٰذا اس وقت بھی اس کے لئے السلام علیکم کہہ کر سلامتی کی دعا کی جاسکتی اور ثابت ہے بخلاف موت کے بعد دفن سے پہلے درمیانی وقفہ میں شرعاً صراحت کے ساتھ اس کے لئے سلام ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو سلام نہیں کہنا چاہئے اور اس سلامتی کی دُعا کا اس لئے وہ اہل نہیں۔ کیونکہ دُنیوی مصائب سے تو وہ چھوٹ چکا ہے اور قبر کا سلسلہ ابھی تک شروع نہیں ہوا۔ ہاں! بطور حزن اس کو خطاب کرنا یا دُعا کرنا کہ اس کی مد میں شامل ہو جائے درست ہے۔

وسادساً: اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ دفن سے پہلے مُردہ سلام کا اہل نہیں ہوتا۔ یعنی بقول ان حضرات کے سُنتا نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے رُوح نکال لی جاتی ہے جس سے ظاہری طور پر فہم و ادراک، علم

وشعور اور سماع کی اہلیت وابستہ ہے اور جب اس کو قبر میں دفن کر لیا جاتا ہے تو صحیح حدیث کی رُو سے اُس کی طرف اُس کی رُوح لوٹائی جاتی ہے اور اس کو ایک گونہ حیات حاصل ہو جاتی ہے۔ (تسکین الصدور ملاحظہ کریں) لہٰذا اب وہ سنتا ہے جیسا کہ صحیح روایات اور فقہاء کرام اور محدثین عظام رحمہم اللہ کے حوالے سے اس پر پہلے عرض کر دیے گئے ہیں۔ لہٰذا قبل از دفن کی حالت پر بعد از دفن کی حالت کو قیاس کر کے مطلق سماع موتی کی نفی کرنا دلائل اور براہین کے لحاظ سے ہرگز درست اور صحیح نہیں ہے اور فقہ کا یہ جزئیہ بھی نہ عدم سماع موتی کا مثبت ہے اور نہ مؤید۔ جیسا کہ کسی بھی ذی فہم وعلم سے یہ مخفی نہیں ہے۔

شرح مقاصد کا حوالہ

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: "واما قوله تعالى وَمَآ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِي الۡقُبُوۡرِ فتمثيل لحال الكفرة بحال الموتى ولا نزاع في ان الميت لا يسمع" (شرح مقاصد ج ۲ ص ۲۲۱ طبع محرم آفندی ترک)

"کہ بہرحال اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ اور تو نہیں سنا سکتا ان کو جو قبروں میں ہیں تو اس میں کافروں کے حال کو مُردوں کے حال سے مثال دی گئی ہے اور کوئی نزاع نہیں کہ مُردے نہیں سنتے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ مُردہ نہیں سنتا اور یہ عدم سماع کا مسئلہ اتفاقی ہے اختلافی اور نزاعی نہیں ہے۔

الجواب: اس عبارت سے استدلال کرنے والوں نے دھوکہ کھایا ہے اور مغالطہ دیا ہے جس سے ان کا مقصد کسی طرح بھی پورا نہیں ہوتا اور سوءِ فہم سے انہوں نے شرح مقاصد کا مطلب نہیں سمجھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے متن (مقاصد الطالبین) میں یہ عنوان قائم کیا ہے کہ "المبحث السادس سوال القبر وعذابه حق" یعنی سمعیات کے سلسلہ کی چھٹی بحث یہ ہے کہ قبر میں (فرشتوں کا) سوال اور عذاب قبر حق ہے۔

پھر اس کی شرح (شرح المقاصد) میں یہ تحریر فرمایا ہے: "اتفق الاسلاميون على حقية سوال منكر ونكير وعذاب الكفار و بعض العصاة فيه و نسب خلافه الى بعض المعتزلة الى قوله لنا الآيات الى قوله والاحاديث المتواترة الى قوله تمسک المنكرون بالسمع والعقل اما السمع الى قوله ولا نزاع في ان الميت لا يسمع واما العقل الى قوله والجواب اجمالا الى قوله والجواب اجمالا الى قوله وتفصيلا"

"تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے۔ قبر میں منکر اور نکیر (علیہما السلام) کا سوال اور تمام کفار اور بعض گنہگاروں پر قبر میں عذاب حق ہے اور اس میں بعض معتزلہ کی طرف اختلاف نقل کیا گیا ہے۔ (پھر اس کی تشریح کی) آگے فرمایا ہمارے دلائل میں قرآن کریم کی آیات ہیں۔ (اور بعض آیات کا حوالہ دیا) پھر آگے فرمایا اور احادیث متواترہ بھی ہیں۔ (پھر ان میں سے بعض کا ذکر فرمایا) پھر آگے فرمایا اور منکروں نے دلیل سمعی اور دلیل عقلی سے استدلال کیا ہے۔ بہرحال دلیل سمعی یہ ہے (پھر اس کی خاصی تفصیل بیان کی جس کے آخر میں یہ بھی ہے (ولا نزاع في ان الميت لا يسمع) پھر ان کی عقلی دلیل نقل کی۔ پھر فرمایا کہ معتزلہ کی سمعی اور عقلی دلیل کا اجمالی جواب یہ ہے۔ پھر فرمایا کہ تفصیلی جواب یہ ہے۔ پھر آگے اجمالی اور تفصیلی جواب کی تشریح کی۔

مقاصد اور شرح مقاصد کی مفصل عبارت کا جو تقریباً دو صفحوں میں پھیلی ہوئی ہے، یہ نہایت ہی مختصر خلاصہ ہے۔ سماع موتی کے منکرین نے سوءِ فہم سے "ولا نزاع في ان الميت لا يسمع" کو اپنی دلیل سمجھ لیا ہے کہ عدم سماع

موتی اتفاقی مسئلہ ہے۔ حالانکہ یہ جملہ معتزلہ کی سمعی دلیل کا چربہ اور اس کا تتمہ ہے جس کو نقل کر کے آگے علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے ان کی سمعی اور عقلی دلیل کا اجمالاً اور تفصیلاً خوب خوب رد کیا ہے مگر منکرین سماع موتی نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، معتزلہ کے اس جملہ کو اُچک کر اپنی دلیل بنا ڈالا اور پھولے نہیں سماتے کہ ہم نے علم کلام کی معتبر کتاب سے مفید مطلب حوالہ ڈھونڈ نکالا ہے مگر ؎

تم جو دیتے ہو نوشتہ وہ نوشتہ کیا ہے جس میں ایک حرف وفا بھی کہیں مذکور نہیں

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ فلاسفہ کے اس باطل نظریہ کی کہ بدن سے جب رُوح جدا ہو جاتی ہے اُور بدن ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے تو جزئیات کا ادراک اُسے نہیں ہوتا، تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''بل الظاھر من قواعد الاسلام انہ یکون للنفس بعد المفارقۃ ادراکات متجددۃ جزیۃ و اطلاع علی بعض جزیات احوال الاحیاء سیما الذین کان بینھم و بین المیت تعارف (قلت الصحیح تعارف او تقارن کما لا یخفی، صفدر) فی الدنیا ولھذا ینتفع بزیارۃ القبور والاستعانۃ بنفوس الاخیار من الاموات فی استنزال الخیرات واستد فاع المسلمات فان للنفس بعد المفارقۃ تعلق ما بالبدن و بالتربۃ التی دفنت فیھا فاذا زار الحی تلک التربۃ و توجھت تلقاء نفس المیت حصل بین النفسین ملاقاۃ و افاضات'' (شرح مقاصد ج ۲ ص ۴۳)

''اسلام کے قواعد سے یہ ظاہر ہے کہ رُوح کے لئے بدن سے جدائی کے بعد بھی نئے نئے جزئی ادراکات ہوتے رہتے ہیں اور زندوں کے بعض جزئی احمال پر بھی انہیں اطلاع ہوتی ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے احوال سے کہ ان کے اور میت کے درمیان دُنیا میں تعارف اور لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قبور کی زیارت سے انتفاع ہوتا ہے اور نیک مُردوں کے نفوس سے (ان سے دُعا کرانے کی برکت سے) بھلائیاں طلب کرنے میں استعانت کی جاتی ہے اور اسی طرح پریشانیاں دُور کرنے میں بھی کیونکہ رُوح کا بدن سے جدا ہونے کے بعد بھی ایک گونہ تعلق بدن سے ہوتا ہے اور اس مٹی سے بھی ہوتا ہے جس میں مَیت دفن کی جاتی ہے۔ جب زندہ قبر کی زیارت کے لئے آتا ہے اُور اُس کی رُوح کی میت کی رُوح کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو دونوں رُوحوں میں ملاقات اور افاضات حاصل ہوتے ہیں۔''

یہ بات تو اُونچے طبقے کے حضرات صوفیاء ہی جان سکتے ہیں کہ قبور سے یہ فیض کیسے حاصل ہوتا ہے؟ ہم لوگ اس کے اہل نہیں ہیں لیکن اُصولاً ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے اور یہ ممکن ہے۔
(ملاحظہ ہو حاشیہ فیض الباری ج ۳ ص ۴۳۴ وغیرہ)

اس عبارت سے یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ رُوح کا جسم اور قبر سے ایک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے اور زیارت کنندہ کی زیارت سے مَیت کو بھی فائدہ ہوتا ہے اور اہل زیارت کنندہ بھی افاضات سے جھولی بھر کے جاتا ہے۔ یہ سب کچھ تسلیم کرتے ہوئے کُلیتہً سماع کا انکار کیسے درست ہے؟ ہاں! یہ بات گزر چکی ہے کہ سماع نافع اور سماع قبول نہیں ہوتا اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔

ایک مغالطہ

مؤلف ''ندائے حق'' اس مغالطہ کا شکار ہیں کہ قبور کے پاس قریب سے دُعا کی درخواست کرنا بھی شرک ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

نقل صحیح ہے؟

آپ کے نزدیک یہ قاعدہ کُلیہ ہے کہ کسی عالم کا کسی بات کو نقل کر دینا، یہ اس کی تصحیح ہے تو آپ خود بہت جگہ پھنس جائیں گے۔ دیکھئے حضرت شیخ رحمہ اللہ ''تفسیر بے نظیر'' (ص ۴۸) میں بحوالہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہ: ''وہ لوگ جو اَنبیاء اور صالحین کو بعد موت کے قریب سے پکارتے ہیں وہ بھی مُشرک ہیں۔''

الاستفتاء اب کیا فرماتے ہیں سواتی برادران اس بارے میں کہ جو شخص اَنبیاء کو خصوصاً نبی اکرم ﷺ کو قبر کے پاس جا کر پکارتا ہے اَور کہتا ہے: ''الصلوٰة والسلام علیک یا رسول اللہ ادع اللہ لی یا رسول اسئلک الشفاعة واتوسل بک الی اللہ فی ان اموات مسلمًا علی مِلّتک وسنتک السلام علیک یا رسول اللہ من فلان بن فلان'' (بین السطور لکھتے ہیں چلو علم غیب بھی ثابت ہو گیا۔ بلفظہٖ۔ نہ معلوم کسی کا سلام پہنچانے سے علم غیب کیسے ثابت ہو گیا۔ صفدرؔ) یستشفع بک الی ربک وغیرذٰلک۔ آیا وہ مشرک ہے یا نہ؟ حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ نے تو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ مشرک ہیں گویا ان (حضرت صاحب نے اپنی کتاب میں نقل فرما کر) اس کو صحیح سمجھا۔ پھر صاحب تسکین کے متعلق کیا فتویٰ ہے جو اس شرک کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور فرماتے ہیں، وہاں قبر پر جا کر مندرجہ بالا پکار ضرور کرو۔ حضور سے دُعا کراؤ۔ حضور سے سفارش کراؤ اَور دوسروں کا نام لے کر کہو کہ فلاں بندہ فلاں کا بیٹا آپ کو سلام کہتا ہے۔ پھر صرف حضور کو نہ پکارو بلکہ اُن کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کو بھی پکار پکار کر کہو اے ابابکر! اے عمر! حضور کو تم ہی ہماری بات کہو کہ ہماری سفارش کریں اور ہمارے حق میں اللہ سے دُعا مانگیں کہ اللہ ہماری سعی قبول فرمائے اور ہمیں اپنے دِین پر رکھے اَور دین پر مارے اور اسی زُمرے میں ہمیں اُٹھائے پھر کہے۔ الشفاعة۔ الشفاعة۔ الشفاعة یا رسول اللہ۔ وغیرہ وغیرہ! بتاؤ ان کو مشرک کہیں یا نہ؟ اگر مشرک نہ کہیں تو صاحب تسکین کا قاعدہ کُلیہ ٹوٹ جائے گا اگر مشرک کہیں تو صاحب تسکین اور اس کے اتباع فتویٰ سے مستثنٰی ہیں۔ اگر ہیں تو کس قاعدہ کے تحت مستثنٰی ہیں: ''بینوا توجروا'' نیز جو شخص بہاول حق یا معین الدین اجمیری یا داتا گنج بخش یا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کو دُور و نزدیک سے پکارے، وہ مشرک ہے یا نہ؟ اگر مشرک ہے تو اس میں کیا فرق ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو پکارے تو مؤحد، اگر ان تین کے علاوہ اَوروں کو پکارے تو مشرک؟ کیا نزدیک و دُور کا فرق کرتے ہو؟ اگر یہی ہے تو پھر فرمائیے کہ جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مزار پر کھڑے ہو کر پکارے یا لات بزرگ کی قبر پر کھڑے ہو کر پکارے اور دُعا مانگے کہ خدا پاک سے میرے حق میں سوال کرو کہ میرا فلاں کام ہو جائے، یہ شرک تھا یا نہ؟ اگر شرک نہیں تھا تو خدا نے ''والذین تدعون من دون اللہ'' کے ساتھ من بعید کی قید کیوں نہیں لگائی؟ (ندائے حق ص ۲۹۷، ۲۹۸)

الجواب: مؤلف مذکور نے یہ جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی سطحی فہم کی واضح دلیل ہے اَور محض ہوائی قلعہ ہے۔

اَوّلاً: اس لئے کہ کسی عالم کا کسی کے قول کو نقل کرنا اور اس کا کہیں بھی رَد نہ کرنا بلکہ اس سے استدلال واحتجاج کرنا حقیقۃً اس کی تصحیح ہے۔ تصحیح اَور کس چیز کا نام ہے؟

وثانیاً: آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر سفارش کی التجا اَور دُعا کرانا اور اسی طرح

حضرات شیخین رضی اللہ عنہما سے ایسا عرض کرنا اگر شرک ہوتا تو نور الایضاح سے لے کر فتاویٰ عالمگیری تک معتبر کتب حنفیہ میں اس کی اجازت ہرگز نہ ہوتی اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے قطب وقت اور فقیہ النفس بزرگ جو اپنے وقت میں مؤحدین کے مرجع تھے اس کی ہرگز اجازت نہ دیتے۔ اس کے کچھ ضروری حوالے اسی پیش نظر کتاب میں عرض کیے جا چکے ہیں اور مزید تفصیل "تسکین الصدور" طبع دوم میں ملاحظہ فرمائیں۔ سواتی برادران بھی اسی کے داعی ہیں جس کے یہ تمام ذمہ دار حضرات داعی ہیں۔ سواتی برادران بھی صرف اسی فتویٰ کے مستحق ہیں جو ان اکابر پر لگے گا۔

وثالثاً: قریب سے پکارنا صرف اس صورت میں شرک ہے جب مُردہ سے مُراد مانگی جائے جیسا کہ فتاویٰ رشیدیہ وغیرہ کے حوالہ سے یہ بات گزر چکی ہے، ان سے دُعا کرانا شرک نہیں ہے۔

حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں: "لا یجوز لاحد ان یسغیث باحد من المشائخ الغائبین ولا المیتین مثل ان یقول یا سیدی فلان اغثنی و انصرنی و ادفع عنی و انا فی حسبک ونحو ذٰلک بل کل ھذا من الشرک الذی حرّم اللہ و رسولہ وتحریمہ مما یعلم بالاضطرار من دین الاسلام" (القاعدۃ الجلیلۃ ص ۱۲۸، بلغۃ الحیران ص ۵۵)

"کسی کے لئے جائز نہیں کہ غائب اور مُردہ بزرگوں سے مدد طلب کرے۔ مثلاً یہ کہے کہ اے میرے فلاں سردار آپ میری مدد کریں اور آپ میری نصرت فرمائیں اور مجھ سے تکلیف دُور کریں یا کہے کہ مَیں آپ کی نگرانی میں ہوں اور اس کی مانند اور الفاظ کہے یہ شرک کی اس مد میں ہیں جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور اس کا حرام ہونا دین اسلام (کے قطعی دلائل اور یقینی براہین) سے بالاضطرار معلوم ہے۔

اور خود حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اور دُعا کا معنیٰ عبادت نہیں ہے بلکہ حاصل معنیٰ بیان کرتے ہیں اور لفظ عبادت کہہ دیتے ہیں یعنی دُعا سے مُراد پکارنا غائبانہ ہے اور "فادعو اللہ" کا معنیٰ عبادت والا حاصل معنیٰ ہے۔ کیونکہ مطلق پکار تو منع نہیں ہے۔ (بلغۃ الحیران ص ۶۱) نیز فرماتے ہیں یعنی سوائے حق تعالیٰ کے "غائبانہ حاجات میں نہ پکارو۔" اور اسی پر محدثین فقہاء کا اتفاق ہے اور اس پر اجماع اُمت ہے۔ (بلغۃ الحیران ص ۳۴۱)

الغرض حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے جس چیز کو شرک کہا ہے وہ میت سے مُراد مانگنا ہے اور اس کے شرک ہونے میں کوئی شک نہیں اور حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مطلق پکار سے منع نہیں کیا بلکہ "غائبانہ پکار" سے منع کیا ہے اور اسی پر انہوں نے محدثین فقہاء کا اتفاق اور اُمت کا اجماع نقل کیا ہے۔ لہٰذا قریب و بعید کا فرق نہ کرنا سراسر باطل ہے۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم "اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "یعنی یہ بت یا بعض اَنبیاء یا فرشتے جن کو تم خدا سمجھ کر پرستش کرتے ہو۔ اگر مصیبت کے وقت پکارو گے تو اَوّلاً یہ تمہاری بات سُن ہی نہ سکیں گے کیونکہ بتوں میں تو سننے کی صلاحیت ہی نہیں، اَنبیاء اور فرشتوں میں اگرچہ صلاحیت ہے مگر "وہ نہ ہر جگہ موجود ہیں" نہ ہر ایک کے کلام کو سنتے ہیں۔ آگے فرمایا اگر بالفرض وہ سُن بھی لیں جیسے فرشتے اور انبیاء تو پھر بھی وہ تمہاری درخواست پوری نہ کریں گے کیونکہ ان کو خود قدرت نہیں اور اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اُس سے کسی کی سفارش نہیں کر سکتے۔"

(تفسیر معارف القرآن ج ہفتم ص ۳۲۹)

غرض یہ کہ پکار میں قُرب وبُعد کا فرق ایک واضح حقیقت ہے اور حضرت مفتی صاحبؒ نے بھی اس کو نظر انداز نہیں کیا۔

خاتمہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم حضرت مفتی اعظمؒ کی ہی ایک عبارت پر سماع موتی کے اس رسالہ کو ختم کر دیں۔ چنانچہ وہ سورۂ نمل میں ''اِنَّکَ لَاتُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' کی تفسیر میں یہ لکھنے کے بعد کہ اس سماع سے سماع نافع مراد ہے۔ یعنی نفی سماع نافع کی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں: اس لئے اس آیت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مُردے کوئی کلام کسی کا سُن ہی نہیں سکتے۔ اس لئے سماع موتی کے مسئلہ سے درحقیقت یہ آیت ساکت ہے۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ قابلِ نظر ہے کہ مُردے کسی کا کلام سُن سکتے ہیں یا نہیں؟

مسئلہ سماعِ اموات

'' یہ مسئلہ کہ مُردے کوئی کلام سُن سکتے ہیں یا نہیں۔ ان مسائل میں سے ہے جن میں خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا باہم اختلاف رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سماع موتی کو ثابت قرار دیتے ہیں اور حضرت اُمّ المؤمنین صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس کی نفی کرتی ہیں۔ اِسی لئے دُوسرے صحابہ وتابعین میں بھی دو گروہ ہو گئے۔ بعض اثبات کے قائل ہیں بعض نفی کے اور قرآن کریم میں یہ مضمون ایک تو اسی موقع پر سورۂ نمل میں آیا ہے، دُوسرے سورۂ رُوم میں تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ دُوسری آیت آئی ہے اَور سورۂ فاطر میں یہ مضمون ان الفاظ سے آیا ہے: وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ۔ یعنی آپ اُن لوگوں کو نہیں سُنا سکتے جو کہ قبروں میں ہیں۔ ان تینوں آیتوں میں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ ان میں کسی میں یہ نہیں فرمایا کہ مُردے نہیں سُن سکتے بلکہ تینوں آیتوں میں نفی اس کی کی گئی ہے کہ آپ نہیں سُنا سکتے۔ تینوں میں اسی تعبیر وعنوان کو اختیار کرنے سے اس طرف واضح اشارہ نکلتا ہے کہ مُردوں میں سننے کی صلاحیت ہو سکتی ہے مگر ہم باختیار خود ان کو نہیں سُنا سکتے۔'' (تفسیر معارف القرآن ج ششم ص ۵۹۰)

اس کے بعد اُنہوں نے (ص ۵۹۱، ۵۹۲) میں اس مسئلہ پر خاصی تفصیلی بحث کی ہے۔ اہلِ ذوق حضرات اس کا مطالعہ فرمائیں۔

سردست ہم ان ہی دلائل اور حوالوں پر اکتفاء کرتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ان شاء اللہ العزیز طبع جدید میں مزید وضاحت کر دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تعصب وتحزب اَور غلو فی الدین سے محفوظ رکھے اَور اللہ تعالیٰ ہی اپنے خصوصی فضل وکرم سے ہمیں جمہور علماء اُمت اَور اکابر کے دامن سے وابستہ رکھے اور اپنی رائے کی پیروی اور خود پسندی سے بچائے اور ایمان واسلام پر قائم رکھے اَور اِسی پر خاتمہ فرمائے۔

''وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ وَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ''

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز

خطیب جامع مسجد گکھڑ منڈی وصدر مدرّس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

۲ رجب ۱۳۹۵ھ / ۱۲ جولائی ۱۹۷۵ء

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ
بَلْ أَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (القرآن)

اَلْاَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّونَ (الحديث)

اَلشِّهَابُ الْمُبِيْن

على من

انكر الحق الثابت بالادلة والبراهين

تالیف: شیخ الحدیث

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ

جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

إِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَاءُ وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ

ما من رجل یمر بقبر اخیہ المؤمن کان یعرفہ فیسلم علیہ
الّا عرفہ وردّ علیہ السلام (حدیث شریف)

بالجملہ انکارِ شعور و ادراکِ اموات اگر کفر نباشد در الحاد بودنِ اُو
شبہ نیست (فتاویٰ عزیزی ص ۸۸ ج ۱)

الشہاب المبین

علی من انکر

الحق الثابت بالادلۃ والبراہین

بحمد اللہ تعالیٰ وحسن توفیقہ اس کتاب میں رسالہ الشہاب الثاقب علی من حرّف الاقوال والمذاہب کا نہایت ہی احسن اور سلجھے ہوئے انداز میں علمی اور تحقیقی طور پر جائزہ لیا گیا ہے اور صریح حوالوں سے مصنف الشہاب الثاقب کی غلطیاں اور علمی مغالطے اجاگر کر کے ان کا رد کیا گیا ہے حضرات علماء اور طلباء کو بفضلہ تعالیٰ اس میں کئی ٹھوس اور جدید علمی اور تحقیقی بحثیں نظر آئیں گی جن سے علمی مغالطے اور جہل مرکب کافور ہوگا۔ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ۔

(ابوالزاہد محمد سرفراز)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفصیلی فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(حرفے چند)

شیخ الحدیث حضرت مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ نے ایک کتاب "سماع الموتیٰ" کے نام سے تحریر فرمائی۔ فریق ثانی کے بزرگ عالم دین، دارالعلوم دیوبند کے فاضل حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے شاگرد مولانا قاضی شمس الدین صاحب گوجرانوالہ نے اس کا جواب "الشہاب الثاقب علیٰ من حرّف الاقوال والمذاھب" کے نام سے تحریر فرمایا۔ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے اس کا جواب "الشہاب المبین علیٰ من انکر الحق الثابت بالادلۃ والبراھین" کے نام سے تحریر کیا۔ ۲۳/اپریل ۱۹۸۳ء کو یہ جواب الجواب تحریر ہوا۔ اس مجموعے میں ہم اس کو شامل اشاعت کر رہے ہیں۔ (ناشر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض حال

الحمدللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی امابعد!

فان اصدق الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدی ھدی محمد ﷺ وشر الامور محدثاتھا وقال النبی ﷺ علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین عضوا علیھا بالنواجذ وقال ایضاً خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم وقال ایضاً سیکون فی امتی اختلاف وفرقۃ قوم یحسنون القیل الی قولہ یدعون الی کتاب اللہ ولیسوا منہ فی شیء (الحدیث)

کچھ عرصہ سے پاکستان میں مسئلہ سماع الموتی محل نزاع بنا ہوا ہے۔ ایک طبقہ کلیۃً سماع کا انکار کرتا ہے۔ حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ کے عندالقبر سماع صلوٰۃ وسلام اور استشفاع عندالقبر کا بھی منکر ہے، بلکہ اس کارروائی کو شرک اور ایسا کرنے والے کو ابوجہل کا بڑ کہتا ہے۔ ان میں سرفہرست سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری گجراتی، سید محمد حسین شاہ صاحب نیلوی، مولانا سید احمد حسین شاہ صاحب سجاد بخاری اور مولوی احمد سعید صاحب ملتانی اور ان جیسے دیگر حضرات ہیں جب کہ اشاعت التوحید والسنۃ کے بعض حضرات عندالقبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کے قائل ہیں جن میں محترم جناب مولانا قاضی شمس الدین صاحب اور جناب مولانا قاضی محمد عصمت اللہ صاحب وغیرہ مدرس قسم کے بزرگ ہیں۔ بعض حضرات اس سماع کو دلیلاً اور بعض تقلیداً مانتے ہیں اور عام اموات کے سماع کا سختی سے انکار کرتے ہیں اور یہ حضرات سماع کے قائلین کی تکفیر وغیرہ نہیں کرتے اور یہ حضرات قدرے معتدل ہیں۔ اس کے برعکس پوری امت بشمولیت جملہ اکابر علماء دیوبند کثر اللہ تعالیٰ جماعتھم حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے عندالقبور سماع کو اتفاقی طور پر تسلیم کرتے ہیں اور بقول حضرت گنگوہی رحمہ اللہ اس مسئلہ میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور عام اموات کے سماع اور عدم سماع کو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر تا ہنوز اختلافی مسئلہ تسلیم کرتے ہیں۔ قائلین اور منکرین دونوں کو اہلسنت والجماعت ہی مانتے ہیں۔ لیکن صریح عبارات اور ٹھوس حوالوں کے پیش نظر سماع کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں بفضلہٖ تعالیٰ راقم اثیم کی کتاب ''سماع موتی'' ملک کے کونے کونے میں پہنچ چکی ہے اور جید علماء کرام سے داد تحسین حاصل کر چکی ہے اور پاک وہند میں علماء دیوبند کثر اللہ تعالیٰ جماعتھم کے اس وقت کے چوٹی کے دو بزرگوں (حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ اور حضرت مولانا سید احمد رضا شاہ صاحب بجنوری دامت برکاتھم داماد حضرت رئیس المحدثین مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ) کی تصدیقات بھی شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس کتاب کا بہت ہی زیادہ فائدہ ہوا ہے۔ جن حضرات کے پاس کتابیں نہیں یا ان کی طرف مراجعت کا وقت نہیں انہیں اثبات اور نفی کے یکجا صریح اور ٹھوس حوالے دستیاب ہو گئے اور مسئلہ کی حقیقت ان پر منکشف ہو گئی اور بعض غالی حضرات کی بھی آنکھیں کھل گئیں کہ ایسے اختلافی مسئلہ میں جس میں منکرین بھی دلائل سے لیس ہیں تکفیر وتفسیق نرا غلو اور تعصب ہے اور ان کو مشرک قرار دینا اکثر امت کو مشرک قرار دینے کے مترادف ہے اور یہ بات بھی ان سطحی

ذہنوں پر عیاں ہوگئی جو ادھوری توحید بیان کرتے ہیں کہ مردے نہیں سنتے، مردے کچھ نہیں کر سکتے، مردے کچھ نہیں دے سکتے، مردوں کے اختیار میں نفع اور ضرر نہیں، وغیرہ وغیرہ کہ زندے بھی باوجود سننے کے کچھ نہیں کر سکتے نہ کسی کو مافوق الاسباب فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ ضرر۔ رزق، اولاد، عزت وذلت اور نفع وضرر وغیرہ صرف خدا تعالیٰ کے پاس اور اس کے اختیار میں ہے، کسی مردے اور زندہ کو خدائی کاموں میں رتی بھر کا اختیار بھی نہیں ہے۔

اور اس کتاب کے پڑھنے سے کئی غالی لوگ تائب ہو گئے ہیں جو یہ سمجھتے تھے کہ قبروں پر بزرگوں کو پکارنے اور ان سے مرادیں مانگنے سے بچ کچھ مل جاتا ہے۔ وہ اس کتاب کے صریح اور ٹھوس حوالوں سے بخوبی یہ سمجھ گئے ہیں کہ سن لینے کے بعد بھی کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ جیسے دنیا میں سبھی بزرگ سنتے تھے مگر کسی کو بھی کچھ نہیں دے سکے اور نہ خود اپنی تکالیف دور کر سکے ہیں۔ ہاں! اپنے اور دوسروں کے متعلق دعائیں کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں قبول فرمائیں۔ بعض کے کام جو اس کی حکمت کے مطابق تھے کر دیئے بعض کے نہیں کئے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا بیٹے (کنعان) کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا باپ (آزر) کے بارے میں قبول نہیں فرمائی اور سردار دو جہاں فخر کائنات حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر تین دعائیں مانگیں، دو اللہ تعالیٰ نے منظور فرمالیں اور تیسری نامنظور فرمائی (ایک یہ تھی کہ میری ساری امت قحط سالی میں مبتلاء ہوکر تباہ نہ ہو جائے اور دوسری یہ تھی کہ ساری امت غرق نہ ہو جائے اور دشمن اس کا استیصال نہ کر دے۔ یہ دونوں دعائیں اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیں اور تیسری یہ تھی کہ میری امت آپس میں نہ لڑے۔ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمائی۔

(محصلہ مسلم ج ۲ ص ۳۹۰، ترمذی ج ۲ ص ۴۰ وقال حدیث حسن صحیح وموارد الظمآن ص ۴۵۳)

اور مردوں سے مرادیں مانگنے والے اس کتاب کے ٹھوس مضامین سے بخوبی یہ سمجھ گئے کہ بات سننے اور اس کے نتیجے میں کچھ کر سکنے یا کروا سکنے میں بزرگوں کا قطعاً کوئی دخل نہیں اور نہ سننے اور کام کر دینے یا کروا دینے میں کوئی شرعی، عقلی اور عرفی تلازم ہے۔ جہاں اس کتاب سے بعض غالیوں اور متردد اور متذبذب لوگوں کی توقع سے کہیں بڑھ کر اصلاح ہوئی، وہاں اس کتاب کے ٹھوس اور صریح حوالوں اور واضح ترین عبارات نے منکرین سماع موتی پر قیامت برپا کر دی۔ کبھی ملتان میں اجتماع ہونے لگا اور کبھی رحیم یار خان میں، کبھی سرگودھا میں اور کبھی گجرات اور گوجرانوالہ وغیرہ میں اور اپنے حواریوں کو مطمئن کرنے کے لئے مختلف قسم کے حربے اختیار کئے گئے اور محترم سجاد صاحب کے ذریعے سے ایک مختصر سا رسالہ ''ارشاد الاصاغر الی مسلک الاکابر فی سماع اہل المقابر'' طبع کروایا گیا۔ جس میں بعض اکابر علماء دیوبند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم کی مجمل عبارتوں کا سہارا لیا گیا اور بہت سے حضرات کے مبہم دستخطوں سے ایک فتویٰ شائع کرایا گیا کہ یہ حضرات سماع موتی کے منکر تھے۔ لیکن اہل علم اس سے بھی مطمئن نہ ہو سکے۔ اس لئے کہ جب تک اصل فتویٰ اور اس کی پوری عبارت کسی مطبوعہ کتاب اور مطبوع فتویٰ سے نہ دکھائی جائے، کب کسی کو اطمینان ہو سکتا ہے؟ باقی فوٹو سٹیٹ کاپیوں کے ذریعہ اطمینان کرانا جب کہ جعل سازی سے فوٹو سٹیٹ کاپیوں کے ذریعے زمین کو آسمان کرکے پیش کیا جا سکتا ہے۔ بالکل ایک لاحاصل اور بے فائدہ بحث ہے۔ یہ ان حضرات کا علمی اور اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اصل عبارت بحوالہ کتاب پیش کرتے کہ کس کتاب میں یہ فتویٰ درج

ہیں یا اصل مطبوع فتویٰ بمع مکمل عبارت کے نقل کرتے اور تسلی کرنے والوں کو بوقت حاجت اصل مطبوع فتویٰ دکھا سکتے۔ صرف فوٹو کاپیوں سے نہ تسلی ہوسکتی ہے اور نہ اس کو کوئی تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے۔

جب سمجھ دار طبقہ نے اس کارروائی کو بھی ''سماع الموتی'' کا جواب تصور نہ کیا اور ان کی تسلی نہ ہوئی تو سب حضرات نے مل جل کر یہ فارمولا تیار کیا کہ اس کے جواب کے لئے جماعت کی بزرگ ترین شخصیت کا انتخاب ہو۔ چنانچہ اس فرض کفایہ کی ادائیگی کے لئے علم اور عمر کے لحاظ سے صف اوّل کے بزرگ حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب کا انتخاب ہوا اور بعض حواریوں نے ان کی بڑی خوشامد، منت وساجت کی کہ حضرت یہ بھاری چٹان آپ کے بغیر کوئی نہیں اٹھا سکتا اور جب تک یہ بھاری بھرکم وزن کی چٹان سماع الموتی راستہ سے نہ ہٹے ہمارے لئے مشکلات ہیں۔

چنانچہ بادل نخواستہ حضرت نے ان کی آرزو کو پورا کیا اور ''الشہاب الثاقب علی من حرّف الاقوال والمذاہب'' کے نام سے چوراسی صفحہ کا رسالہ لکھا اور اس میں اپنی پرانی اور مالوفہ عادت کے مطابق تعلّی اور ہمہ دانی کے بھرپور زور سے مؤلف سماع موتی اور ان کی جماعت کو بہت نیچا دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر وہ سماع موتی کے جواب میں بہت ہی بری طرح ناکام ہوئے ہیں اور سماع موتی میں سینکڑوں حوالوں سے نظر بچا کر کمال بزرگی کے پیش نظر صرف چند حوالوں کا جواب زیب قرطاس فرما کر اور کچھ ادھر ادھر کی غیر متعلق باتیں کر کے اور آخر میں بزرگانہ نصیحت فرما کر جواب سے فارغ الذمہ ہو گئے ہیں اور اس چھوٹی سی کتاب کا دس روپے ہدیہ مقرر کر کے اس کے وزن اور قیمت میں اور اضافہ کیا ہے۔ خیر ہمیں ان سے کوئی شکوہ نہیں وہ ہمارے بزرگ ہیں اور درسی کتابوں کے بہترین مدرس رہے ہیں۔ لیکن اب وہ اس عمر کے قریب ہو چکے ہیں جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لکیلا یعلم من بعد علم شیئاً! ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو غلط قسم کے حواریوں اور مشیروں کے چنگل سے بچا کر اپنے علم وبصیرت پر چلنے اور قائم رہنے کی توفیق بخشے اور جو غلط باتیں ان کے قلم سے نکلی ہیں ان سے رجوع کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین!

کسی بھی اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں ہوسکتی کہ جب بھی کوئی شخص کسی کتاب یا کسی مضمون کی تردید کرتا ہے تو بزعم خویش اس میں قابل مواخذہ سب باتوں کو ضرور ملحوظ رکھتا ہے جو باتیں قابل تردید ہوتیں ہیں۔ ان کی خوب دل کھول کر تردید کرتا ہے اور جو باتیں صحیح یا لاجواب ہوتی ہیں ان پر خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔

محترم جناب قاضی صاحب نے کتاب سماع الموتی میں درج شدہ صدہا صریح حوالوں میں سے صرف چند کا انتخاب فرمایا ہے اور بقیہ پر چپ سادھ لی ہے جو اس بات کا واضح تر قرینہ ہے کہ بقیہ سب حوالے اور استدلالات بالکل صحیح اور لاجواب ہیں ورنہ ان پر بھی ضرور گرفت کرتے اور جن حوالوں اور دلائل پر انہوں نے تنقید کی ہے اس کا حشر بھی بفضلہٖ تعالیٰ قارئین کرام بخوبی اس کتاب میں دیکھ لیں گے کہ اس کا تانا بانا اور کائنات کیا ہے؟ الغرض اس کتاب میں محترم جناب قاضی صاحب کی تردید کا پس منظر، پیش منظر اور تہ منظر بالکل کھل کر عیاں ہو جائے گا۔ لہٰذا خود محترم جناب قاضی صاحب کے لئے بھی اور اس مسئلہ میں ان کے جملہ حواریوں کے لئے بھی یہی مناسب ہے کہ کتاب سماع الموتی کے تنقید اور گرفت سے بالاتر دلائل اور حوالوں کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیں۔ کیونکہ وہ السکوت فی معرض البیان، بیان کے قاعدہ کے لحاظ سے صحیح اور لاجواب ہیں اور جن پر انہوں نے تنقید کی ہے، ان کو اور ان

کے روشن جوابات کو اس کتاب میں ملاحظہ فرما کر رجوع الی الحق کا پورا اور فی الفور ثبوت دیں اور قارئین کرام بھی ٹھنڈے دل سے ان کی تنقید پر غور فرمائیں کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ اور شوق اعتراض اور جذبہ تردید میں آ کر محترم نے اسے کیا سے کیا بنا ڈالا ہے۔ دہائی اس پر مفت کی ہے اور زجر و توبیخ اور تعلّی اس پر مستزاد ہے جس سے ہر سطحی ذہن والا اور کم فہم آدمی ضرور مغالطے کا شکار ہو سکتا ہے کہ بات چونکہ ایک مدرس اور بڑے بزرگ کی ہے۔ لہٰذا کتاب سماع الموتی میں علمی اور تحقیقی طور پر ضرور خامی اور غلطی ہو گی۔

لیکن عقلی و نقلی دلائل کو پرکھنے والے حضرات اب بھی بفضلہٖ تعالیٰ موجود ہیں جو طرفین کی باتوں کا بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں اور صواب و خطاء، صحیح و غلط اور دودھ و پانی کا فرق کر سکتے ہیں۔ اس لئے فیصلہ ہم انہی کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو صحیح اور غلط میں تمیز کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین!

ابوالزاہد محمد سرفراز

یکم رجمادی الاخریٰ ۱۴۰۳ھ، ۱۷ مارچ ۱۹۸۳ء

کتاب سماع الموتی کے خلاف غصہ

جناب قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ: ''ایک مشورہ حضرت مولانا سرفراز صفدر کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ فکر تو آپ نہ کریں کہ آپ کی یہ کتاب (سمع موتیٰ) لوگوں میں متبول نہیں ہوگی۔ متبول تو ضرور ہو جائے گی اس لئے کہ موجودہ دور جہالت میں ہر طرف علمی زوال ہے وہاں ایسی کتاب کہ جس میں ہر شخص کے متعلق جس کی عبارت کا حوالہ دیا گیا ہے یہ لکھا ہوا ہے۔ المتوفی فی سنۃ فلان، المتوفی فی سنۃ فلاں (لفظ فیوضات حسینی میں عدم مطابقت کے اعتراض کو جناب قاضی صاحب نے تسکین القلوب میں بھی اور اس رسالہ میں بھی خوب دہرایا ہے لیکن خود جناب قاضی صاحب کو سنۃ فلاں کی غلطی کا کوئی احساس نہیں۔ صفدر) جو ایک محققانہ رنگ ہے کیسے قبول نہیں ہو گی جب کہ علماء بلکہ علماء مدرسین کی یہ حالت ہے کہ: ''یُستحَبُ الصلوٰۃ'' کی جگہ ''یُستحِب الصلوٰۃ'' اور ''یُکرہُ الصلوٰۃ'' کی جگہ ''یُکرَہ الصلوٰۃ'' پڑھاتے ہیں۔'' (ص۷۹)

پھر آگے (ص ۸۰، ۸۱) میں تلفظ کے اغلاط کی چند مثالیں دی ہیں اور (ص ۴۲) میں لکھتے ہیں کہ: ''آپ چاہتے ہیں کہ اندر بیٹھے ہر ایک کے نام کے ساتھ ''المتوفی فی سنۃ کذا المتوفی فی سنۃ کذا'' لکھ کر اس تصنع اور بناوٹ سے اپنی دھاک بٹھائیں۔''

اور (ص ۴۸) میں لکھتے ہیں کہ: ''موصوف سمع موتی پر ایک کتاب لکھ کر ہماری اس سب احتیاط، اجتناب کی تلقین اور تاکید کا ملیا میٹ کر دیں جس کتاب کو اہل بدعت لے کر بغلیں بجائیں اور خوشیاں منائیں اور کہیں کہ ہمیں جتنا اس کتاب سے فائدہ ہوا اپنوں سے بھی نہیں ہوا۔''

اور (ص ۳۱) میں لکھتے ہیں: ''بے شک اکابر دیوبند نے کسی کے پوچھنے پر اور استفتاء پر تو مختلف جواب دیئے لیکن نہ تو ان میں سے کسی نے سماع موتی پر کتاب لکھی اور نہ لکھنے کو اچھا سمجھا اور لکھتے بھی کیوں، اگر مردے سنیں تو ہم نے ان سے مانگنا کچھ نہیں اور نہ سنیں تو ہمارا بگڑ کچھ نہیں جاتا تو اس پر کتاب لکھنا: ''جی بہلانے کو یہ خیال اچھا ہے'' کے سواء اور کچھ بھی نہیں۔''

الجواب: جناب قاضی صاحب کا یہ ارشاد تصویر کا صرف ایک رخ اور ون وے ٹریفک کے مترادف ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ! کتاب سماع الموتی سے جہاں بعض بریلویوں کی اصلاح ہوئی ہے، وہاں دیوبندی مسلک کے بہت سے حضرات کی پیچ در پیچ غلطیاں دور ہوئیں ہیں جن کے سامنے اکابر کی اصل عبارتیں نہ تھیں اور دھوکا بازوں نے انہیں ان کی مختصر اور مجمل عبارتوں سے فریب دیا تھا اور اب ان کی آنکھیں روشن ہو گئیں اور دل منور ہو گئے ہیں کہ حقیقت کیا ہے اور ان کی مجمل عبارات کو غلط انداز میں پیش کرنے والوں نے کیا تاثر دیا ہے اور اس امر کو منصف مزاج حضرات جو علم اور اکابر سے تعلق رکھتے ہیں بخوبی جانتے اور مانتے ہیں اور اس کتاب میں صریح پیش کردہ حوالوں سے (مثلاً قبور سے اس طور دعا کرنا کہ اے صاحب قبر اس طرح میرا کام کردے تو یہ حرام اور شرک بالاتفاق ہے)'' (ص ۸۳)

اور'' مثلاً یہ کہ صاحب قبر سے کہے کہ تم میرا کام کردو، یہ شرک ہے۔'' (ایضاً) وغیرہ وغیرہ! بعض منصف مزاج بریلویوں پر حقیقت واضح ہو گئی کہ جیسا کوئی زندہ بزرگ بات سن کر کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مردے بھی سن کر کچھ نہیں کر سکتے، کام کرنے والا صرف پروردگار ہے۔

اسی سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

الغرض! اکابر کی تلقین اور احتیاط کو اس مدلل کتاب نے بفضلہ تعالیٰ خوب اجاگر کیا ہے اور ان کی کسی بات پر اس سے زد نہیں پڑی اور نہ پڑ سکتی ہے تو ان کی احتیاط و تلقین بھلا اس سے ملیا میٹ کیسے ہوئی؟ یا کیسے ہو سکتی ہے؟ جیسا کہ جناب قاضی صاحب کا بے بنیاد نظریہ ہے۔

جناب قاضی صاحب کا یہ ارشاد کہ: '' اکابر دیوبند نے سماع الموتی پر کتاب نہیں لکھی۔'' تفصیل طلب ہے۔ اوّلاً اس لئے انہوں نے کتاب نہیں لکھی کہ ان کے دور میں القول الجلی، مسالک العلماء، تسکین القلوب، شفاء الصدور، الاقوال المرضیہ، ندائے حق اور اقامۃ البرہان وغیرہ افراط و تفریط اور غلو و تعصب سے بھری ہوئی کتابیں بھی تو طبع نہیں ہوئی تھیں۔ ان سے استفتاء کرنے والے جب مسئلہ پوچھتے تھے تو وہ اپنی علمی تحقیق بیان کر دیتے اور دوسرے فریق کے ادب اور احترام اور علمی مقام کو باقاعدہ ملحوظ رکھتے جیسا کہ ان کے فتوؤں سے بالکل عیاں ہے۔ مثلاً: حضرت مفتی محمد کفایت اللہ رحمہ اللہ کا فتویٰ ملاحظہ ہو:

فصل ششم مسئلہ سماع موتی

سوال: سماع موتی محققین علماء کے نزدیک ثابت ہے یا نہیں؟

جواب: (۱۹۵) مسئلہ سماع موتی قرون اولیٰ سے مختلف فیہ چلا آتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی اس میں اختلاف تھا۔ قرن صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد بھی ہمیشہ علماء اس میں مختلف رہے۔ اکثر صوفیاء سماع موتی کے قائل ہیں۔ لیکن علمائے حنفیہ کے نزدیک ثابت نہیں۔ ہاں میت کو قبر میں رکھنے کے بعد اس قدر حیات اس میں ڈالی جاتی ہے کہ وہ آرام یا تکلیف کو محسوس کر سکے۔ (فی الشامی ج ۲ ص ۱۳۴) '' ولا یرد تعذیب المیت فی قبرہ لانہ توضع فیہ الحیوۃ عند العامۃ بقدر ما یحس بالالم والبنیۃ لیست بشرط عند اھل السنۃ بل تجعل الحیوۃ فی تلک الاجزاء

المتفرقة التی لا یدرکه البصر و قال بعد اربعة اسطر و لا یرد ما فی الصحیح من قوله ﷺ لاهل قلیب بدر هل وجدتم ما وعدکم ربکم حقاً فقال عمر اتکلم الیت یا رسول الله فقال ﷺ و الذی نفس بیده ما انتم باسمع من هو لاء او منهم فقد اجاب عنه المشائخ بانه غیر ثابت یعنی من جهة المعنی و ذالک لان عائشة روته بقوله تعالٰی و ما انت بمسمع من فی القبور انک لا تسمع الموتٰی و انه انما قاله علٰی وجه الموعظة للاحیاء و بانه مخصوص باؤلٰئک تضعیفا للحسرة علیهم خصوصیة له ﷺ معجزة لکن یشکل علیهم ما فی مسلم ان المیت یسمع قرع نعالهم اذا انصرفوا الا ان یخصوا ذالک باوّل الوضع فی القبر مقدمة للسوال جمعاً بینه و بین الآیتین فانه شبه فیهما الکفار بالموتی الافادة بعد سماعهم و هو فرع عدم سماع الموتٰی''

تاہم کسی فریق کو یہ حق نہیں کہ دوسرے فریق کو تضلیل یا تفسیق یا تجہیل کر سکے۔ کیونکہ اس صورت میں کہ مسئلہ قرونِ اولیٰ میں بھی مختلف فیہ تھا، اس تضلیل یا تفسیق یا تجہیل کا اثر صحابہ ﷢ تک پہنچے گا۔ ولا شک فی فسادہ۔

(کفایت المفتی ج ۱ ص ۱۹۶، ۱۹۷)

ثانیاً ان کے دور میں کسی احمق نے یہ کہا تھا کہ سماع موتی کے قائل لوگ مشرک ہیں اور یہ ابوجہل کا ٹبر (خاندان) ہے اور سماع موتی کے قائل علماء سوء اور ملحد و مبتدع اور ملعون ہیں۔ یقین جائیے کہ اگر ان کے دور میں ایسا تحزّب اور غلو ہوتا تو وہ صرف کتاب ہی نہ لکھتے بلکہ کتابیں لکھتے اور اس کا خوب رد کر کے اپنا علمی فریضہ ادا کرتے۔

ثالثاً: صراحت سے، بغیر ہیر پھیر کے یہ بتائیں کہ ان کے دور میں کس نے یہ کہا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کا جسم عنصری سے تعلق نہیں اور آپ عند القبر صلوٰۃ وسلام نہیں سنتے؟ کسی ایک شخص کا صراحت سے باحوالہ تذکرہ تو کریں تاکہ ہماری معلومات میں بھی علمی اضافہ ہو۔ بخلاف اس کے مولوی سعید احمد صاحب چتوڑ گڑھی (سنا ہے کہ وہ محترم جناب قاضی شمس الدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں اور) جو انجمن اشاعت التوحید والسنۃ کے سرگرم رکن ہیں جن کو آپ حضرات اپنے جلسوں میں بلاتے ہیں اور ان کی سرپرستی کرتے ہیں اور وہ آپ حضرات کی شہ پر ہی غلو اور تعصب کا خوب خوب مظاہرہ کرتے ہیں اور یہاں تک انہوں نے کہا کہ جو شخص سماع صلوٰۃ وسلام عند قبر النبی الکریم ﷺ کا قائل ہے وہ بلا شک قطعی کافر ہے۔'' (بحوالہ دعوت الانصاف ص ۴)

جناب قاضی صاحب ہی انصاف سے فرمائیں کہ ان کے اس کافرانہ فتویٰ سے حضرات سلف و خلف میں سے کوئی مسلمان بچ سکتا ہے؟ محترم جناب قاضی صاحب! آپ کی اور آپ کے حواریوں کی آنکھوں میں مدلل اور لاجواب ہونے کی وجہ سے صرف کتاب سماع الموتی ہی کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور صرف اسی کا آپ شکوہ کرتے ہیں۔ ذرا دوسری طرف بھی نگاہ اٹھائیں:

غیر کی آنکھوں کا تنکا تجھ کو آتا ہے نظر   دیکھ اپنی آنکھ کا غافل ذرا شہتیر بھی

ورابعاً: آپ ہی کی اپنے مؤکل نیلوی صاحب سے نقل کردہ عبارت میں یہ بات مذکور ہے کہ مولوی کرامت اللہ خان صاحب نے سماع موتی کے مسئلہ میں کچھ غلو سے کام لیا اور ان کے رسالہ کا رد حضرت گنگوہی ﷫ نے کیا اور جس پر متعدد حضرات کے دستخط ہیں۔ اس رسالہ کے مرکزی اور نزاعی الفاظ اور ان کی تردید کے الفاظ اور

قید تو آپ بتاتے ہی نہیں، صرف ان کی مجمل تصدیقات نقل کرنے کی خوشی میں آپ پھولے نہیں سماتے۔ آپ ہی کے نقل کردہ یہ الفاظ ہیں۔ ''فاضل مجیب نے جس قید کے ساتھ مولوی کرامت خاں صاحب کے رسالہ کا جواب دیا ہے نہایت صحیح ہے''۔ عبدالسلام دہلوی (الشہاب الثاقب ص ۱۶) افسوس کہ مولوی کرامت اللہ خان صاحب کے رسالہ کے اس مسئلہ کے متعلق اصل الفاظ اور جس قید کے ساتھ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اس کا جواب لکھا ہے اور اس قید کو ملحوظ رکھ کر مصدقین حضرات نے تصدیق کی ہے سامنے ہوتے تو پھر حقیقت کھلتی لیکن اتنی بات تو بالکل یقینی ہے کہ مولوی کرامت اللہ خان صاحب نے ضرور جناب نیلوی صاحب کی طرح اس مسئلہ میں غلو اور کوئی افراط وتفریط کی ہے جس کے جواب دینے پر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ اور ان کے مصدقین مجبور ہوئے ہیں۔ جناب قاضی صاحب کو ایک ذمہ دار بزرگ ہونے کی وجہ سے دوسرے غالی فریق کی بھی خوب گوشمالی کرنی چاہئے۔ لیکن وہ اپنے حواریوں کے اکسانے سے کمر باندھ کر اور لنگوٹ کس کے صرف سماع الموتی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

کیا کتاب سماع الموتی مسلک دیوبند کے خلاف ہے؟

ہم موصوف کی عبارات ان کے اپنے الفاظ میں لکھ کر اس پر اختصاراً کچھ عرض کرتے ہیں۔

۱...... ''ہمارے زمانے میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس نے حضرات دیوبند کے مسلک کو کچھ نیچے اتارا اور مبتدعہ نے اس سے استفادہ کیا۔ ہم ایک جگہ مبتدعہ کے ساتھ مناظرہ کے لئے گئے۔ مناظرہ تو نہ ہوا مگر فریق مخالف کی باتوں سے ایسا پتہ چلا کہ اس کے پیچھے (نہ معلوم اس کا اشارہ کس طرف ہے؟ فریق مخالف کی طرف یا باتوں کی طرف؟ مرتب) موصوف کی کتاب بول رہی ہے۔'' (بلفظہ ص ۳)

الجواب: ''اس عبارت میں موصوف نے اپنے حقیقت ناشناس حواریوں کو یہ بتانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ کتاب سماع الموتی نے حضرات دیوبند کے مسلک کو کچھ نیچے اتارا۔'' کاش کہ وہ یہ بتاتے کہ وہ کون سا مسئلہ ہے جو سماع الموتی میں مسلک دیوبند سے کچھ نیچے اترا ہوا ہے۔ تاکہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جا سکتا۔ مگر موصوف کو ایک شوشہ ہی چھوڑنا تھا اور بس۔ اگر اس کتاب میں درج شدہ مسائل اور دلائل مسلک دیوبند کے معیار پر پورے نہ اترتے تو حضرت مولانا بنوری رحمہ اللہ اور حضرت مولانا بجنوری دام مجدہم جیسی وسیع النظر شخصیتیں کبھی اس کتاب کی بھرپور تائید نہ کرتیں۔ کتاب دفع الشبہ کی ایک عبارت کے ترجمہ میں مرجع کی تعیین کی غلطی طبع اول میں ہوگئی تھی اور ان دونوں بزرگوں نے الگ الگ تحریریں اس کی اصلاح کی لکھیں اور معاف نہیں کیا اور اب اس غلطی کی اصلاح کرلی گئی ہے۔ اگر اس کتاب میں کہیں بھی مسلک دیوبند کی مخالفت ہوتی تو یقیناً یہ حضرات گرفت کرتے اور اصلاح کی تلقین کرتے۔ کیونکہ ضمیر کے مرجع کی تعیین کی غلطی سے مسلک کی غلطی تو کہیں زیادہ ہے۔

اپنی آنکھ کا شہتیر

ہمارے بارے میں موصوف تو یہ لکھتے ہیں کہ ہم نے مسلک دیوبند کو نیچے اتارا ہے جو بالکل خلاف واقع ہے لیکن خود خیر سے حضرات دیوبند کے ایک گونا اجماعی مسلک سے اتفاق کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے

ہیں کہ: ’’دیکھئے ہم آنحضرت ﷺ کے لئے بعد از وفات حیات دنیوی کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ حیات دنیوی نہیں بلکہ حیات برزخی اخروی ہے جو حیات دنیوی سے بدرجہا افضل، اکمل، اجمل، اولیٰ، اعلیٰ برتر بالاتر ہے تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ مہند کی عبارت سے اتفاق نہیں، اس پر آپ ہمیں دیوبندی مانیں یا کہہ دیں کہ یہ لوگ دیوبندی نہیں ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں نہ یہ کہ ہمیں دیوبندی مانتے ہیں یا نہیں۔‘‘ (ص ۱۱ و ۱۲)

المہند پر اکابر علماء دیوبند میں سے تیئیس حضرات کی تصدیقات اور دستخط موجود ہیں، جن میں خصوصیت سے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ، مولانا احمد حسن امروہی، مولانا مفتی عزیز الرحمن دیوبندی، مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ، مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری، مولانا حبیب الرحمن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ، مولانا غلام رسول صاحب رحمہ اللہ اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مگر قاضی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ ہمیں مہند کی عبارت سے اتفاق نہیں۔ ہمیں کوئی دیوبندی کہے یا نہ کہے ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں۔ ملاحظہ کیجئے کہ کس طرح اکابر علماء دیوبند کثّر اللہ تعالیٰ جماعتہم کے اجماعی مسلک کی دھجیاں اڑاتے ہیں اور (۲۸ و ۲۹) میں بڑے فخریہ انداز سے لکھتے ہیں کہ: ’’حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے ہمیں دیوبندی اور کٹر دیوبندی کہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت قاری صاحب کو دور رہنے کی وجہ سے تفصیلاً آپ کے نظریات معلوم نہیں ہیں۔ اس لئے انہوں نے اس حسن ظن کی وجہ سے آپ کو دیوبندی کہا کہ آپ علمائے دیوبند کے شاگرد ہیں اور چند ماہ دار العلوم میں درجہ وسطانی میں مدرس رہے ہیں۔‘‘

اور (ص ۲۹) میں لکھتے ہیں کہ: ’’قاری محمد طیب صاحب کے ساتھ صد سالہ اجلاس میں مہمان خانہ میں گفتگو ہوئی تھی تو انہوں نے فرمایا کہ یہ ان حضرات حیات دنیویہ والوں کا نظریہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا تفرد ہے۔ باقی اکابر دیوبند کا وہی نظریہ ہے جو تم کہتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ ہم نے اس پر بیس سال مار کھائی۔ فرمانے لگے طاقت والا آدمی ہی مار کھاتا ہے۔‘‘ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مہمان خانہ میں ہجوم اور بھیڑ کی وجہ سے یا تو حضرت قاضی صاحب موصوف اپنا پورا نظریہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے سامنے نہیں پیش کر سکے اور یا وہ معروفیت کی وجہ سے ان کی بات توجہ سے نہیں سن سکے۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا تفرد حیات دنیویہ کے بارے میں نہیں ہے۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا تفرد صرف موت کے معنی میں ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: ’’ارواح انبیاء کرام علیہم السلام کا اخراج نہیں ہوتا۔ فقط مثل چراغ اطراف وجوانب سے قبض کر لیتے ہیں اور سواء ان کے اوروں کی ارواح کو خارج کر دیتے ہیں۔‘‘ (جمال قاسمی ص ۱۵)

اور ایسا ہی وہ آب حیات (ص ۱۶۸) میں لکھتے ہیں اور تحریر فرماتے ہیں: ’’مگر اس عقیدہ کو عقائد ضروریہ میں سے نہیں سمجھتا نہ تعلیم ایسی باتوں کی کرتا ہوں نہ منکروں سے دست و گریبان ہوتا ہوں۔‘‘ (لطائف قاسمیہ ص ۵)

ہم نے اس کی پوری بحث تسکین الصدور میں کر دی ہے۔ الغرض حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا تفرد موت کی تفسیر اور معنی میں ہے اور قبر میں حیات دنیویہ اور برزخیہ کا مسلک اکابر علماء دیوبند کا اجماعی عقیدہ ہے۔

چنانچہ المہند میں ہے: ’’عندنا وعند مشائخنا حیاۃ حضرت الرسالۃ ﷺ دنیویۃ من غیر تکلیف

وھی مختصة بہ ﷺ وبجمیع الانبیاء علیہم السلام والشھداء لا برزخیة کما ھی لسائر المؤمنین بل ھی لسائر الناس الی قولہ فثبت بھذا ان حیوتہ دنیویة برزخیة لکونھا فی عالم البرزخ'' (المہند ص ۱۳، طبع قاسمی دیوبند)

ہمارے اور ہمارے مشائخ کے نزدیک حضرت ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور آپ کی حیات دنیا کی سی ہے بلا مکلف ہونے کے اور یہ حیات مخصوص ہے۔ آنحضرت ﷺ اور تمام انبیاء علیہم السلام اور شہداء کے ساتھ، برزخی نہیں جو حاصل ہے تمام مسلمانوں بلکہ سب آدمیوں کو (آگے فرمایا) پس اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ﷺ کی حیات دنیوی ہے اور اس معنی کو برزخی بھی کہ عالم برزخ میں حاصل ہے۔''

یہ ترجمہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۴۶ھ) کا ہے جو المہند کے مرتب اور اس کے مترجم ہیں۔ اس صاف اور صریح عبارت سے واضح ہوگیا کہ آنحضرت ﷺ کی قبر میں حیات دنیوی کے قائل صرف حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ہی نہیں بلکہ بقول حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ یہ ان کا اور مشائخ دیوبند کا مسلک ہے اور تیئس حضرات کی اس پر تصدیقات موجود ہیں جن میں سے بعض کے نام پہلے گزر چکے ہیں اور چوبیسویں خود حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ ہیں۔ اگر دو درجن حضرات کی رائے کا نام بھی تفرد ہے تو یہ عجیب ہی تفرد ہے۔ حضرت قاضی صاحب موصوف میں یہ دیرینہ خامی چلی آتی ہے کہ بڑی جلدی جذبات میں آجاتے ہیں اور اپنی ہی کہانی سناتے رہتے ہیں۔ دوسرے کی بات توجہ سے کم سنتے ہیں۔ یقیناً ایسا ہی قصہ ان کو یہاں بھی پیش آیا ہوگا و لابد۔

باقی آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی زندگی کو برزخی تو قاضی صاحب موصوف بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی تشریح کی چنداں ضرورت نہیں اور اکابر علماء دیوبند اس معنی میں برزخی مانتے ہیں کہ وہ برزخ میں حاصل ہے جیسا کہ المہند کی عبارت سے نقل کیا جا چکا ہے۔ البتہ حیات دنیوی کی قدرے تشریح ہم کرتے ہیں۔ باحوالہ پوری تشریح تو ہم نے تسکین الصدور میں کر دی ہے، وہاں ہی ملاحظہ کرلیں۔ حیات دنیوی کا یہ مطلب ہے کہ روح مبارک کا تعلق دنیوی بدن سے ہے، طیور اور بدن مثالی وغیرہ کسی اور جسم سے نہیں ہے اور دنیا کی سی کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی طرح ادراک وشعور، علم وسماع کی صفات اس کو حاصل ہیں نہ یہ کہ دنیوی کھانے پینے اور ایسے ہی دیگر حاجات کو مستلزم ہے اور نہ یہ کہ دوسرے لوگ اس کو محسوس کرتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں۔

جناب قاضی صاحب کا اپنا اقرار

حضرت قاضی صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام رحمہم اللہ کے نزدیک یہ عذاب وثواب قبر اور تألم وتلذذ صرف روح سے تعلق رکھتا ہے۔ (صوفیاء کرام رحمہم اللہ کا مسلک تسکین الصدور میں ملاحظہ کریں کہ کیا ہے؟ مرتب) اس جسم عنصری سے اس کا تعلق نہیں اور فقہا کرام رحمہم اللہ اور متکلمین رحمہم اللہ کے نزدیک یہ جسم خواہ ریزہ ریزہ ہو چکا ہو، پھر بھی قبر کے عذاب وثواب اور تألم وتلذذ میں روح کا شریک ہے اور فتویٰ بھی فقہاء کرام رحمہم اللہ کے قول پر دینا چاہئے۔'' (تسکین القلوب ص ۴۷)

اور اپنی کتاب ''التعلیق الفصیح علی المشکوٰۃ المصابیح'' میں لکھتے ہیں کہ: ''وقال الفقھاء ھو للروح مع الجسد ویشارک الجسد فیہ الروح'' (ج ۱ ص ۳۹) حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ عذاب وراحت روح اور جسم دونوں کو ہے اور جسم اس میں روح کے ساتھ شریک ہے۔

جب عام اموات کے بارے میں فتویٰ یہ ہے کہ قبر میں راحت وعذاب جسم عنصری اور روح دونوں کو ہے گو جسم عنصری ریزہ ریزہ ہی کیوں نہ ہو جائے تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجساد مبارکہ تو صحیح احادیث کے پیش نظر عند الکل محفوظ ہیں تو ان کے ساتھ ارواح کے تعلق کا کیا اشکال ہے؟

الغرض! جو حضرات حیات دنیوی کا جملہ بولتے ہیں تو اس معنیٰ میں کہ روح مبارک کا اس جسد اطہر کے ساتھ تعلق ہے جو دنیا میں تھا اور علم وادراک وشعور وسماع میں دنیا کی سی کیفیت حاصل ہے لیکن یہ تعلق برزخ میں ہے اس لئے برزخی بھی ہے۔ اگر کسی صاحب کو آپ ﷺ کی روح مبارک کے جسد اطہر سے تعلق اور عند القبر سماع صلوٰۃ وسلام کے بارے میں تردد یا شک ہے تو تسکین الصدور کا مطالعہ کرے اور اگر روح مبارک کے جسد اطہر سے تعلق اور سماع صلوٰۃ وسلام عند القبر کا منکر ہے تو ہم مباہلہ کے لئے تیار ہیں جہاں چاہے ان شاء اللہ العزیز کر سکتے ہیں۔

حیات دنیوی کا معنیٰ؟

حضرت قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ دراصل اور درحقیقت حیات النبی ﷺ کے دونوں فریق قائل ہیں۔ اختلاف یہ ہے کہ یہ (یعنی یہ مؤلف تسکین الصدور اور سماع الموتی اور ان کے ساتھی۔ صفدر) حیات دنیوی کے قائل ہیں اور ہم حیات برزخی اخروی کے قائل ہیں جو حیات دنیوی سے بدر جہا افضل، اکمل، اجمل، برتر، بالاتر ہے۔ (ص ۷۷)

اور اس مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں ارقام فرماتے ہیں کہ: ''اب سوچنا یہ ہے کہ اس مسئلہ کو حل کیسے کیا جائے؟

۱...... ایک صورت تو یہ ہے کہ چونکہ جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں صرف ضد، عناد، حسد، بغض کی بنا پر کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ جو کچھ کرتے پھریں ہم چپ رہیں۔ دلیل اس امر کی یہ ہے کہ ان لوگوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی امداد کر کے پاکستان سے اسلام، اقدار اسلامیہ اور اخلاق کی بیخ کنی کرائی اور اس پر نادم نہیں، کیا وہ بڑا جرم تھا یا یہ حیات کا مسئلہ جو ہمارے ذمے لگاتے ہیں۔

۲...... دوسری صورت یہ ہے کہ کسی ثالث منصف شخص یا جماعت کے سامنے دونوں فریق بیٹھ کر برادرانہ گفتگو (مناظرہ) کرلیں۔

۳...... تیسری صورت یہ ہے کہ انتقال کے بعد آنحضرت ﷺ کی حیات دنیویہ ہے یا اخرویہ برزخیہ اس پر مباہلہ کرلیں۔

۴...... چوتھی صورت یہ ہے کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ یہاں ان کے سامنے لکھ دیتے ہیں۔ پھر دونوں فریق کے چند آدمی اسے لے کر دیو بند چلے جائیں اور حضرات کے سامنے رکھ کر پوچھیں کہ اس عقیدہ والا آدمی دیو بندی ہے یا نہیں جو وہ کہہ دیں ان کے فیصلہ کو منظور کرلیں۔'' (ص ۷۸، ۷۹)

الجواب: ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان چاروں صورتوں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی صورت کے متعلق اوّلاً تو یہ عرض ہے کہ ضد، عناد، حسد اور بغض (جو دعویٰ ہے) کا ذوالفقار علی بھٹو کی امداد سے کیا ربط اور تعلق ہے کہ آپ اس کو بطور دلیل کے پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دلیل اس امر کی یہ ہے۔'' خدارا بتلایئے کہ اس دعویٰ اور دلیل کا کیا جوڑ ہے؟ اور بھٹو صاحب کی امداد یا عدم امداد کا مسئلہ حیات النبی ﷺ سے شرعی، منطقی یا عرفی کون سا جوڑ اور تلازم ہے؟

ثانیاً: اگر بقول آپ کے جمعیۃ العلماء اسلام نے سیاسی طور پر ایک حد تک بھٹو صاحب کا ساتھ دیا تو مفتی محمود صاحب مرحوم نے ڈیرہ اسماعیل خان میں مقابلہ کر کے شکست فاش بھی تو بھٹو صاحب کو دی تھی اور اسمبلی میں ڈٹ کر مقابلہ بھی تو کیا تھا کہ گھسیٹ کر باہر پھینک دیئے گئے تھے اور پھر بھرپور تحریک چلائی تھی اور اس کی قیادت کی تھی۔ حتیٰ کہ اس کے نتیجہ میں بھٹو صاحب کو اقتدار بلکہ جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ الغرض اجب تک اقدار اسلامیہ کی مخالفت اور اخلاق حسنہ کی بیخ کنی کا علم نہ تھا اور محض ان کی زبانوں پر اعتماد کر کے ان کو سچا تصور کر لیا گیا تھا تو چند قدم ان کے ساتھ چلے تھے۔ پھر جب ان کا فریب عیاں ہو گیا تو مقابلہ کی ٹھان لی، جس کا واضح نتیجہ ہر ایک کے سامنے آ گیا۔

ثالثاً: جمہور کے نزدیک جس معنی میں حیات ثابت ہے، اس کا انکار کون سا مرغوب اور پسندیدہ امر ہے جس میں آپ حضرات تعصب اور تحزب میں آ کر مبتلاء ہیں اور دوسرے حضرات آپ سے اس میں حسد اور بغض وعناد کرتے ہیں؟ دوسرے حضرات تو آپ کے اس غلط نظریہ کو درست ہی نہیں سمجھتے تو پھر وہ آپ کے ساتھ اس میں حسد کیوں کرتے ہیں اور کیوں کریں گے؟ جناب قاضی صاحب نے تعلّی کے جذبات میں آ کر ایسے الفاظ لکھ دیئے ہیں کہ نہ ان کا سر ہے اور نہ پاؤں جو بالکل بے موقع اور بے محل اور خالص بے مغز ہیں۔

رابعاً: المہند میں حیات دنیوی و برزخی کا جو جملہ ہے جس پر اکابر علماء دیوبند کی تصدیقات ہیں، کیا ان حضرات نے آپ لوگوں کے ساتھ اختلاف رونما ہونے سے قبل ہی محض ضد، حسد اور عناد و بغض کی وجہ سے حیات دنیوی کا جملہ لکھ دیا تھا اور مصدقین نے اس کی تصدیق کر دی تھی؟ اگر حیات دنیوی و برزخی کا جملہ ضد و عناد کی پیداوار ہے تو کیا وہ ضدی گروپ کی پیدائش یا اس سے اختلاف ظاہر ہونے سے قبل ہی حسد اور عناد پر اتر آئے؟ خدارا فرمایئے کہ بات کیا ہے؟ اور ضدی گروپ کون ہے؟

دوسری، تیسری اور چوتھی صورت کا اجمالی جواب یہ ہے کہ آپ حضرات خود ہی اکابر کے نزدیک حیات دنیوی کا جو مفہوم ہے وہ نہیں سمجھے یا پھر ضد اور عناد کی وجہ سے ماننے پر آمادہ نہیں۔ ہم پہلے المہند کے حوالہ سے ان حیوتہ دنیویۃ برزخیۃ کے الفاظ نقل کر چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک میں زندگی دنیوی بھی ہے اور برزخی بھی۔ دنیوی بایں معنی کہ آپ کی روح مبارک کا قبر شریک میں اسی جسد اطہر و عنصری سے تعلق ہے جو آپ کو دنیا میں حاصل تھا اور ہم نے بفضلہ تعالیٰ ''تسکین الصدور'' میں روشن دلائل اور واضح حوالوں سے یہ بات ثابت کی ہے کہ نیک لوگوں کی ارواح کا مستقر علیین اور جنت ہے اور برے لوگوں کی ارواح کا مستقر سجین اور نار ہے لیکن بایں ہمہ صحیح احادیث اور علماء ملت کے روشن اور صریح حوالوں کے پیش نظر ارواح کا قبور میں اجسام سے بھی تعلق رہتا ہے۔ اگر آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کا قبر شریف میں اس بدن عنصری سے تعلق ہو جو دنیا میں آپ کو حاصل تھا تو شرعاً اور عقلاً اس میں کیا استبعاد ہے؟ اکابر علماء دیوبند جب حیات دنیوی کا جملہ بولتے ہیں تو اس سے ان کی یہی مراد ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی روح مبارک کا اس جسد اطہر سے قبر شریف میں تعلق ہے جو آپ کو دنیا میں حاصل تھا۔ چنانچہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''انبیاء علیہم السلام کو ابدان دنیا کے حساب سے زندہ سمجھیں گے۔'' (لطائف قاسمیہ ص ۴) اور اس سے قبل لکھتے ہیں کہ: ''انبیاء کرام علیہم السلام کو ان اجسام دنیاوی کے تعلق کے اعتبار سے زندہ سمجھتا ہوں۔ یہ نہیں کہ مثل شہداء ان ابدان کو چھوڑ کر اور ابدان سے تعلق ہو جاتا ہے۔'' (لطائف قاسمی ص ۳)

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی اس واضح عبارت سے یہ ثابت ہوا کہ جیسے حضرات شہداء کو دوسرے عارضی طیور وغیرہا کے اجسام مرحمت ہوتے ہیں۔ (اور ان کا تعلق فی الجملہ اجسام عنصریہ سے بھی قائم رہتا ہے۔ تسکین الصدور) حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات کا یہ معنی نہیں کہ اپنے ابدان عنصریہ کو چھوڑ کر اور اجسام سے ان کا تعلق ہو جائے بلکہ ان کے ارواح کا تعلق ابدان دنیویہ سے ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے اس حیات کو حیات دنیوی حقیقی اور جسمانی کہتے ہیں۔ حیات دنیویہ کا یہ مطلب ان حضرات کے نزدیک ہرگز نہیں کہ دنیا کی زندگی کی طرح دنیوی خوراک کے محتاج ہوں یا بدن کا نشو ونما ہو یا دوسرا کوئی اس زندگی کا ادراک وشعور کر سکے اور اس کو محسوس طور پر زندگی نظر آتی ہو اور نقل وحرکت کرتے دکھائی دے۔

چنانچہ علامہ زرقانی رحمہ اللہ امام سبکی رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: ''وانہ احیی بعد الموت حیاۃ حقیقیۃ ولا یلزم منہ ان یکون معہا کما فی الدنیا من الحاجۃ الی طعام وشراب وغیر ذالک من صفات الاجسام الذی نشاھدھا ای لان ذالک عادی لاعقلی والملائکۃ احیاء ولا یحتاجون الی ذالک''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد حیات حقیقیہ سے زندہ کئے گئے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس حیات حقیقیہ کے ساتھ دنیوی کھانے پینے اور دیگر اجسام کی ان صفات کی حاجت پڑے جن کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یعنی اس لئے کہ یہ حاجت عادی ہے عقلی نہیں۔ مثلاً فرشتے زندہ ہیں۔ (بحیات حقیقیہ) لیکن وہ کھانے پینے وغیرہ اشیاء کے محتاج نہیں ہیں۔ (زرقانی علی المواہب ج ۸ ص ۳۱۰)

غور فرمائیں کہ ایک طرف تو یہ حضرات اس حیات پر حقیقیہ کا اطلاق کرتے ہیں دوسری طرف اس کی تصریح کرتے ہیں کہ اس حیات میں کھانے پینے کی اشیاء کی حاجت نہیں۔ (یعنی وہ خوراک اور پانی جو دنیوی ہے نہ کہ وہ خوراک وغیرہ جو قبر اور برزخ میں حسب حال جنت سے ملتی ہے۔ وہ تو اپنی جگہ ثابت ہے: ''عند ربھم یرزقون'' اس لئے خلط مبحث سے اجتناب کریں) اور اسی طرح اجسام کی دیگر صفات مثلاً نقل وحرکت وغیرہ جن کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ لازم نہیں آتی۔ ایسی تصریحات کی موجودگی میں بھی کوئی شخص ان حضرات کی اصطلاح میں حیات دنیوی، حیات حقیقی اور حیات جسمانی کا معنی نہ سمجھے تو پہلے ان کی اصطلاحات کو سیکھنے کی کوشش کرے پھر ان سے الجھے اور لٹھ لے کر ان کا تعاقب کرے تاکہ نزاع کا کوئی فائدہ بھی نکلے۔

مناظرہ اور مباہلہ کس سے اور کیوں؟

ہم نے صراحتاً جمہور کا مسلک عرض کر دیا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد عنصری اور دنیوی بدن مبارک سے روح اطہر کا قبر شریف میں تعلق مانتے ہیں اور اسی تعلق کی بنا پر حیات کے قائل ہیں اور عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کے بھی قائل ہیں اور یہی کچھ الفاظ کو قدرے پیچ دے کر جناب قاضی صاحب تسلیم کرتے ہیں اور حیات دنیوی کے قائلین کو اہل سنت والجماعت سے وابستہ مانتے ہیں تو پھر مناظرہ اور مباہلہ کس سے اور کیوں؟ چنانچہ محترم جناب سید عنایت اللہ شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''اور اس عالم دنیا سے انتقال کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم برزخ میں مثل شہدا بلکہ شہدا سے بھی اعلیٰ وافضل حیات برزخیہ عطا فرمائی گئی وہ حیات دنیویہ نہیں بلکہ اس سے بدرجہا اعلیٰ وارفع،

اجمل وافضل حیات برزخیہ ہے نہ کہ حیات دنیویہ لیکن اگر کوئی اس حیات کو دنیوی کے نام سے تعبیر کرے اور آپ کی حیات برزخیہ سے بھی انکار نہ کرے تو اس کو جماعت اہلسنت سے خارج نہیں کرنا چاہئے۔"

عنایت اللہ بخاری عفی عنہ مسجد جامع گجرات

(تعلیم القرآن ماہ جنوری ۱۹۶۰ء ص ۳۲)

اس فتویٰ پر پچاس علماء کرام کے دستخط ہیں جن میں حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحب رحمہ اللہ، مولانا قاضی شمس الدین صاحب اور مولانا قاضی محمد عصمت اللہ صاحب وغیرہ حضرات شامل ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ المہند میں آپ ﷺ کی قبر شریف کی زندگی کو دنیویہ برزخیہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور دنیویہ کا معنی بھی باحوالہ پہلے عرض کر دیا گیا ہے اور ہم اور ہمارے جملہ اکابر اور فقہاء اسی نظریہ کے حامل اور قائل ہیں اور خود جناب قاضی صاحب کے بھی حیات دنیویہ برزخیہ کے قائلین کے سنی ہونے پر دستخط ثبت ہیں تو پھر وہ ان سے مناظرہ ومباہلہ کرنے سے پہلے خود اپنے ساتھ ہی یہ معاملہ کر لیں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی سامنے نظر آجائے اور نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی۔

جناب قاضی صاحب بلاوجہ بات کو گول کر کے منصفوں اور ثالثوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

ضروری نہیں کہ یہ حیات دوسروں کو بھی محسوس ہو

کسی بھی منصف مزاج عقل مند کے لئے اس بات کا سمجھنا مشکل نہیں ہے اور ہم نے تسکین الصدور میں باحوالہ یہ بحث بھی کی ہے کہ جس طرح نیند میں مستغرق آدمی کے روح کا بدن سے بدستور تعلق ہوتا ہے اور وہ خواب میں نماز پڑھتا، اٹھتا، بیٹھتا، چلتا، پھرتا، کھاتا، پیتا اور اچھلتا کودتا ہے اور دشمن سے لڑتا جھگڑتا بھی ہے اور جماع کی لذت سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے لیکن بیدار شخص کو وہ بالکل ساکن نظر آتا ہے۔نہ تو وہ نماز پڑھتا دکھائی دیتا ہے اور نہ دوڑتا نظر آتا ہے لیکن خواب میں یہ ساری کارروائی روح اور بدن دونوں کی مشارکت سے ہوتی ہے۔الغرض! آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی زندگی بایں معنی دنیوی بھی ہے کہ روح مبارک کا دنیوی بدن سے تعلق ہے اور برزخی بھی ہے کہ یہ زندگی برزخ میں ہے۔مشہور عالم حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی دام مجدہم حیات دنیویہ کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:"اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ وہ حیات دنیا کی سی ہے۔یعنی مع الجسد صرف برزخی روحانی نہیں جو تمام مومنین کو بھی حاصل ہے جن کے اجسام مٹی ہو چکے ہیں۔" (حاشیہ ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی ماہ نومبر ودسمبر ۱۹۵۹ء ص ۳۹)

جب جناب قاضی صاحب عامۃ الناس کے لئے قبر میں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ارواح کا ابدان عنصریہ سے تعلق ہوتا ہے۔گو وہ ذرہ ذرہ ہی کیوں نہ ہو جائیں تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے اس کے تسلیم کرنے میں کیا مانع ہے۔جب کہ احادیث صحیحہ صریحہ سے یہ ثابت ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ابدان مبارکہ قبور میں بالکل صحیح وسالم رہتے ہیں اور تکوینی طور پر زمین پر حرام ہے کہ وہ ان کے اجسام مبارکہ کو کھائے اور ضائع کرے تو ان اجسام دنیویہ کے ساتھ ان کے ارواح طیبات کا تعلق کون سا دقیق نظری مسئلہ ہے جس کے لئے آپ کسی ثالث منصف کے پاس مقدمہ لے جانے کی دعوت دیتے ہیں اور کبھی مناظرہ اور مباہلہ کے لفظ سے رعب ڈالتے ہیں اور خود عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کے بھی قائل ہیں۔ (تسکین القلوب ص ۱۰۵)

لہٰذا ہم مؤدبانہ عرض کرتے ہیں کہ جناب قاضی صاحب پہلے تو محترم جناب قاضی شمس الدین صاحب مجاہد

پورہ گوجرانوالہ سے مناظرہ کرلیں کہ وہ آپ کی روح مبارک کا جسم عنصری سے تعلق مانتے ہیں یا نہیں؟ اور عندالقبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کے قائل ہیں یا نہیں؟ اگر قائل ہیں تو ہمارا دعویٰ ثابت ہے۔ اگر نہیں قائل تو پہلے ان سے مناظرہ پھر مباہلہ کرلیں۔ جو نتیجہ نکلے گا ہم ان شاء اللہ العزیز! اس سے اتفاق کریں گے۔ بات کو گڈمڈ کر دینا اور مابہ النزاع کو نہ سمجھنا یا نہ سمجھنے دینا علماء کی شان سے کوسوں دور ہے۔ آپ ہمارے بزرگ اور قابل احترام ہیں ٹھنڈے دل سے ان باتوں پر غور کریں۔ البتہ اگر کوئی شخص قبر شریف میں آپ کی روح مبارک کا اس بدن اطہر سے جو دنیا میں تھا تعلق نہیں مانتا اور عندالقبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کا قائل نہیں تو جب اور جہاں چاہے ہم مباہلہ کے لئے تیار ہیں۔

عجیب تماشا

جناب قاضی صاحب مصنف المہند اور اس کے جملہ مصدقین حضرات جو اکابر علماء دیوبند میں شامل ہیں اور تسکین الصدور کے پاک وہند کے مصدقین حضرات پر تو اعتماد کرنے پر آمادہ نہیں اور علماء دیوبند کی طرف مراجعت کی تلقین کرتے اور دعوت دیتے ہیں۔ نہ معلوم ان حضرات کے علاوہ علماء دیوبند اور کون ہیں اور وہ کہاں سے آئیں گے؟ کیا یہ جملہ حضرات اس کا مصداق نہیں ہیں:

اولئک آبائی فجئنی بمثلهم اذا جمعتنا یا جریر المجامع

فیصلہ تو ہو چکا ہے پھر آپ کیوں گریز کرتے ہیں؟

اہل علم اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ جب خیر المدارس ملتان کے سالانہ جلسہ میں جناب سید عنایت اللہ شاہ صاحب نے حیات النبی ﷺ کے انکار کا دھماکہ کیا تھا اور پھر یہ مسئلہ چلا اور اس پر اختلاف کھل کر سامنے آگیا تو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اس سلسلہ میں ایک مصالحانہ فیصلہ صادر فرمایا تھا جس کے الفاظ یہ ہیں: ''وفات کے بعد نبی کریم ﷺ کے جسد اطہر کو برزخ (قبر شریف) میں بہ تعلق روح حیات حاصل ہے اور اس حیات کی وجہ سے روضہ اقدس پر حاضر ہونے والوں کا آپ صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں۔'' (ملاحظہ تسکین الصدور ص ۳۹)

اور اس فیصلہ پر فریقین کے قابل اعتماد اور چوٹی کے حضرات کے دستخط ثبت ہیں۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری رحمہ اللہ، حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحب رحمہ اللہ قلعہ دیدار سنگھ، حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب رحمہ اللہ اور خود حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم کے دستخط۔ اب جناب قاضی صاحب ہی ازراہ انصاف فرمائیں کہ حضرات دیوبند کے اکابر کے یہ فیصلے آپ کے ہاں قابل اعتماد ہیں؟ اگر ہیں تو آمنا وصدقنا فیصلوں پر عمل کریں اور اگر یہ فیصلے قابل اعتماد نہیں تو عوام کو مغالطہ میں مبتلاء کرنے کے لئے علماء دیوبند کی طرف مراجعت کرنے اور ان کے فیصلوں کی طرف دعوت دینے کا عذر لنگ بالکل بے کار ہے اور ہاتھی کے دانتوں کے بغیر اس دعوت کی اور کوئی حیثیت نہیں ہے کہ کھانے کے اور دکھانے کے اور۔

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کے فتویٰ سے دھوکا دہی

بعض سطحی قسم کے لوگ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کے ایک مجمل جواب اور فتویٰ سے مغالطہ کھاتے اور دیتے ہیں۔ وہ یہ ہے:

سوال: انبیاء کرام اپنی قبور میں زندہ ہیں یا نہیں؟

جواب: انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں مگر ان کی زندگی دنیاوی زندگی نہیں ہے بلکہ برزخی اور تمام دوسرے لوگوں کی زندگی سے ممتاز ہے۔ اسی طرح شہداء کی زندگی بھی برزخی ہے اور انبیاء کی زندگی سے نچلے درجے کی ہے۔ دنیا کے اعتبار سے وہ سب اموات میں داخل ہیں۔ انک میت و انھم میتون اس کی صریح دلیل ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ (کفایت المفتی ج ۱ ص ۶۸)

اس عبارت میں ''مگر ان کی زندگی دنیاوی زندگی نہیں ہے بلکہ برزخی'' سے کیا مراد ہے؟ اگر یہ مراد ہے کہ دنیوی زندگی کی طرح تکلیفی زندگی نہیں اور دنیوی کھانے پینے اور دیگر لوازمات دنیویہ کی محتاج نہیں اور دوسروں کو وہ زندگی محسوس نہیں ہوتی تو بجا ہے۔ جمہور بھی اسی کے قائل ہیں اور اگر یہ مراد ہے کہ قبر شریف میں آپ کی روح مبارک کا جسد اطہر سے کوئی تعلق نہیں اور آپ عند القبر پیش کئے گئے صلوٰۃ وسلام کو نہیں سنتے اور نہ جواب دیتے ہیں تو یہ قطعاً باطل اور سراسر مردود ہے۔ خود حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا مفصل جواب ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک میں حیات روح اطہر کے جسم شریف کے ساتھ تعلق اور وابستگی سے مانتے ہیں اور اس کو وہ اہلسنت والجماعت کا مذہب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک سوال جواب ملاحظہ ہو۔

سوال: مولود میں لفظ یارسول اللہ، السلام علیک، یا حبیب سلام علیک پکار کر کہنا اس غرض سے کہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک محفل میلاد میں آتی ہے۔ لہٰذا برائے تعظیم کھڑے ہو کر لفظ مذکور کو پکار کر کہتے ہیں آیا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب: صلوٰۃ وسلام کے ساتھ یا رسول و یا حبیب نداء کے الفاظ سے پکارنا اس خیال سے کہ صلوٰۃ وسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرشتوں کے ذریعہ پہنچادیا جاتا ہے اور آپ تک ہماری ندا اور خطاب پہنچ جاتا ہے جائز اور درست ہے۔ کیونکہ بعض روایات معتبرہ سے ثابت ہے کہ باری تعالیٰ وتقدس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر ایک فرشتہ مقرر فرمادیا ہے کہ اس کو ایسی قوت سامعہ عطاء فرمائی ہے کہ وہ تمام مخلوق کے صلوٰۃ وسلام سن کر حضرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کر دیتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جواب دیتے ہیں: ''قال النواب صدیق حسن خان البوفالی فی نزل الابرار فی بیان فوائد الصلوٰۃ علیہ صلی اللہ علیہ وسلم ومنھا قیام ملک علٰی قبرہ صلی اللہ علیہ وسلم اعطاہ اسماع الخلائق یبلغہ ایھا کما فی حدیث واثق ابن حبان رواتہ وورد ت احادیث بمعناہ ثانیۃ (والصحیح ثابتۃ۔ صفدر) وللّٰہ الحمد ومنھا انھا سبب لرد النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی المصلی والمسلّم علیہ کماورد بسند حسن بل صححہ النووی فی الاذکار وغیرہ انتہی ملتقطاً''

نواب صدیق حسن خان بھوپالی رحمہ اللہ اپنی کتاب نزل الابرار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف بھیجنے کے فوائد کے بیان میں فرماتے ہیں کہ ان فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کی قبر مبارک پر ایک فرشتہ کھڑا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے کان عطاء فرمائے ہیں۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک صلوٰۃ وسلام پہنچاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے جس کی روات کی ابن حبان رحمہ اللہ نے توثیق کی ہے اور صحیح احادیث اور بھی اس مضمون کی ہیں۔ وللہ الحمد!

اور ایک فائدہ یہ ہے کہ جب کوئی آپ پر صلوٰۃ وسلام پڑھتا ہے تو آپ ﷺ اس کا جواب دیتے ہیں (اور صلوٰۃ وسلام پڑھنا آپ کے رد جواب کا سبب ہے) جیسا کہ حسن سند سے حدیث آئی ہے بلکہ امام نووی ﷫ (وغیرہ) نے کتاب الاذکار میں اس کی تصحیح کی ہے۔

ہاں! اس خیال اور اعتقاد سے نداء کرنا کہ آنحضرت ﷺ کی روح مبارک مجلس مولود میں آتی ہے۔ اس کا شریعت مقدسہ میں کوئی ثبوت نہیں اور کئی وجہ سے یہ خیال باطل ہے۔ اوّل یہ کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ قبر مبارک میں زندہ ہیں، جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے تو پھر آپ کی روح مبارک کا مجالس میلاد میں آنا بدن سے مفارقت کر کے ہوتا ہے یا کسی اور طریقے سے؟ اگر مفارقت کر کے مانا جائے تو آپ کا قبر مطہر میں زندہ ہونا باطل ہوتا ہے یا کم از کم زندگی میں فرق آنا ثابت ہوتا ہے تو یہ صورت علاوہ اس کے کہ بے ثبوت ہے، باعث توہین ہے، نہ کہ موجب تعظیم اور اگر مفارقت نہیں ہوتی تو پھر ہر مجلس مولود میں آپ ﷺ کی موجودگی بدن اور روح کے ساتھ ہوتی ہے یا محض بطور کشف وعلم کے؟ پہلی صورت بداہۃً باطل ہے اور دوسری صورت بے ثبوت اور بعض اعتبار سے موجب شرک ہے کہ آن واحد میں مجالس کثیرہ کا علم ہونا، اس طرح کہ گویا آپ ﷺ حاضر وناظر ہیں۔ یہ خاصۂ ذات احدیت ہے۔ آنحضرت ﷺ کو ہر جگہ حاضر وناظر سمجھنا شرک ہے۔

رہی مجلس میلاد تو اس کا حکم یہ ہے کہ نفس ذکر ولایت ومعجزات واقوال وافعال وواقعات آنحضرت ﷺ جائز بلکہ محبوب ومستحسن ہے لیکن قیود مروجہ اور ہیئات مخصوصہ جو آج کل اکثر مجالس مروجہ میں پائی جاتی ہیں۔ بدعت وبے اصل ہیں۔ ذکر ولادت کے وقت قیام کرنا بالکل بے اصل ہے، شریعت مقدسہ میں اس کی کوئی اصل نہیں۔ نہ قرون ثلاثہ میں اس کا وجود تھا نہ کوئی دلیل اس کے جواز پر دال ہے۔ انتہی بلفظہٖ محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

(کفایت المفتی ج ۱ ص ۱۵۹ تا ۱۶۱)

اس مفصل جواب اور فتویٰ سے چند امور واضح طور پر ثابت ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱...... آنحضرت ﷺ قبر مبارک پر پیش کئے گئے صلوۃ وسلام کو سنتے ہیں۔

۲...... اور ان کی نقل اور تحقیق سے (جب کہ دوسرے حضرات کی تحقیق سے دور دراز سے پیش کئے گئے سلام کو صحیح حدیث: ''ان للہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام'' (نسائی ج ۱ ص ۱۲۳ ومستدرک ج ۲ ص ۴۲۱) وغیرہ فرشتے پہنچاتے ہیں) اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کے روایت کی توثیق محدث ابن حبان ﷫ کرتے ہیں اور دیگر احادیث ثابتہ اس کی مؤید ہیں۔

۳...... آپ اس پیش کئے گئے صلوٰۃ وسلام کا قبر مبارک سے جواب بھی دیتے ہیں۔

۴...... اور اس کا حسن اور صحیح روایت سے ثبوت ہے (اس کی مفصل بحث تسکین الصدور میں ملاحظہ فرمائیں)

۵...... آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک میں زندگی اور حیات اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔

۶...... اور یہ حیات بدن اطہر کے ساتھ روح مبارک کی وابستگی کے ساتھ ہے۔

۷...... اگر روح مبارک کو اس بدن مبارک سے جو قبر شریف میں مدفون ہے جدا اور الگ تسلیم کیا جائے تو قبر مبارک میں زندہ ہونا باطل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قبر میں آپ کی زندگی اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔

۸...... اور قبر مبارک میں آپ کے جسد اطہر سے روح مقدس کا تعلق نہ ماننا بے ثبوت ہونے کے علاوہ باعث توہین بھی ہے۔ وغیرہ وغیرہ!

حضرت مفتی صاحب کے اس تفصیلی جواب اور فتویٰ کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ عندالقبر صلوٰۃ وسلام کے سماع اور جواب دینے کے قائل نہیں یا آپ کی قبر مبارک میں حیات صرف بایں طور برزخی مانتے ہیں کہ جسم اطہر سے روح مبارک کا کوئی تعلق نہیں یا حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی حیات فی القبر کے بارے میں اہلسنت والجماعت کی تحقیق کے علاوہ کوئی اور تحقیق ہے۔ جیسا کہ مؤلف شفاء الصدور وندائے حق اور مؤلف اقامۃ البرہان وغیرہ حضرات غلط تاثر دینے کے درپے ہیں قطعاً باطل ہے اور اس قابل ہے کہ: ''اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں۔''

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے عام اموات کے سماع کے مسئلہ کو اختلافی قرار دیا ہے۔ (اور نفس الامر میں ہے بھی ایسا ہی) چنانچہ ان سے یہ سوال ہوا کہ سماع موتی محققین علماء کے نزدیک ثابت ہے یا نہیں؟

مفتی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(۱۹۵) جواب: مسئلہ سماعت موتی قرون اولیٰ سے مختلف فیہ چلا آتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی اس میں اختلاف تھا۔ قرن صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد بھی ہمیشہ علماء اس میں مختلف رہے۔ اکثر صوفیہ سماع موتی کے قائل ہیں لیکن علماء حنفیہ کے نزدیک ثابت نہیں۔ ہاں! میت کو قبر میں رکھنے کے بعد اس قدر حیات اس میں ڈالی جاتی ہے کہ وہ آرام یا تکلیف محسوس کر سکے۔ قال الشامی (ج ۲ ص ۱۳۴) ''ولا یرد تعذیب المیت فی قبرہ لانہ توضع فیہ الحیوۃ عندالعامۃ بقدر ما یحس بالالم والبنیۃ لیست بشرط عند اھل السنۃ بل تجعل الحیاۃ فی تلک الاجزاء المتفرقۃ التی لایدرکہ البصر'' (کفایت المفتی ج ۱ ص ۱۹۶)

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عندالقبر صلوٰۃ وسلام کے سماع اور سلام کے جواب دینے میں کسی کا کوئی اختلاف ذکر نہیں کرتے نہ تو حضرات فقہاء کرام رحمہ اللہ کا اور نہ ہی حضرات صوفیاء عظام رحمہ اللہ وغیرہم کا، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ کسی کے نزدیک بھی اختلافی نہیں بلکہ سب کا اتفاقی ہے۔

محترم جناب سجاد صاحب کی زیادتی

قارئین کرام بحوالہ پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ پڑھ چکے ہیں کہ عام اموات کے سماع اور عدم سماع میں قرن اوّل سے تاہنوز اختلاف چلا آرہا ہے لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کے عندالقبر سماع میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عندالقبر صلوٰۃ وسلام کا سماع اور رد جواب ایک اتفاقی امر ہے جس کا ثبوت متعدد صحیح احادیث سے ہے جن میں سے ایک یہ ہے: ''من صلی عند قبری سمعتہ ومن صلی علیّ من بعید اعلمتہ'' (جلاء الافہام ص ۱۹) بروایت ابو الشیخ رحمہ اللہ نہ کہ بطریق محمد بن مروان سدی الصغیر الکذاب جس کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، علامہ سخاوی رحمہ اللہ، ملا علی القاری رحمہ اللہ اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ وغیرہم حضرات بسند جید فرما کر اس کی تصحیح کرتے ہیں۔ حوالے ہم نے تسکین الصدور میں دے دیئے ہیں اور خود (ماہنامہ تعلیم القرآن ص ۴۸ ماہ اکتوبر ۱۹۶۸ء)

میں ابوالشیخ کی سند کو بسند جید سے نقل کیا ہے اور پوری امت کا اس پر تعامل اور توارث ہے کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔لیکن محترم جناب مولانا احمد حسین شاہ صاحب سجاد بخاری مختصر فوائد از رئیس المفسرین حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ میں لکھتے ہیں کہ: ''باقی رہا روح اور بدن کا تعلق تو یہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں محض قیاسی بات ہے۔(تعاد الروح فی جسدہ کی حدیث جمہور امت کے نزدیک صحیح ہے۔حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ ابن القیم رحمہ اللہ وغیرہ تمام اس کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔بحث تسکین الصدور میں ملاحظہ کریں اور روح کا بدن سے تعلق حضرات فقہاء و متکلمین رحمہم اللہ حتیٰ کہ جناب مولانا قاضی شمس الدین صاحب تک کو مسلم ہے۔خود محترم جناب سجاد صاحب صحیح حدیث اور جمہور اہل اسلام کے مقابلہ میں قیاس فاسد اور الکل پچو بات سے کام لے رہے ہیں۔صفدر) یہی تحقیق جو لکھائی گئی ہے بعینہٖ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے کہ روح مبارک کا بدن اطہر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔نعوذ باللہ تعالیٰ من ھذا الھذیان! صفدر) اور جو حدیثوں میں آتا ہے کہ اگر کوئی قبر پر مجھے سلام دے تو میں خود سنتا ہوں اور اگر درود سے سلام بھیجے تو فرشتے پہنچاتے ہیں۔یہ احادیث ضعیفہ ہیں۔'' (ص ۵۳۲)

حافظ ابن حجر، علامہ سخاوی، ملا علی قاری اور مولانا عثمانی وغیرہم معتبر محدثین کرام (رحمہم اللہ) تو ابوالشیخ کی سند کو جید کہتے ہیں۔مگر جناب سجاد صاحب اس مضمون کی سب احادیث کو احادیث ضعیفہ کہتے ہیں جس کا جوب یہاں اتنا ہی کافی ہے۔لاحول ولا قوۃ الا باللہ! پوری بحث تسکین الصدور میں دیکھیں۔

واقعہ

یہ عنوان قائم کر کے قاضی صاحب موصوف لکھتے ہیں، صد سالہ اجلاس میں تقریباً تیس لاکھ آدمی کے سامنے سٹیج پر پگڑی احقر کو اور چند دوسرے حضرات کو (جن میں مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا منت اللہ صاحب، مولانا عبدالحق صاحب اکوڑہ خٹک اور مولانا اسعد صاحب مدنی وغیرہ شامل تھے) بندھائی۔ان سے کہا جا کر دارالاہتمام سے پگڑیاں لے لو۔اس کے بعد ان لوگوں نے مہم چلائی ہوئی ہے کہ یہ دیوبندی نہیں۔ضد اور ہٹ دھرمی کی انتہاء ہوگئی۔محترم موصوف سے مئودبانہ عرض ہے کہ آپ پوری سنجیدگی اور دیانت سے حالات کا مطالعہ کریں کہ آپ کی جماعت کی اکثریت ایک مدت سے اہل بدعت اور مشرکین کو کچھ نہیں کہتی اور ہمارے پیچھے کربستہ ہاتھ دھو کر لگے ہوئے ہیں اور تو اور شاید آپ کو معلوم نہ ہو آپ کے حواریین نصرۃ العلوم والے مسجد لانگریاں والی جس میں احقر ۳۵ برس سے درس دیتا ہے پندرہ سال سے ایک مہم چلا رہے ہیں کہ اس پر بھی قبضہ کر لیں۔'' (ص ۲۹)

الجواب: معلوم نہیں کہ موصوف کا ''ان سے جا کر دارالاہتمام سے پگڑیاں لے لو'' سے اشارہ کس کی طرف ہے؟ غالباً سواتی برادران ہی کی طرف اشارہ ہے۔کیونکہ آگے نصرۃ العلوم کا تذکرہ آرہا ہے۔اگر موصوف کی یہی مراد ہے تو یہ اس پیرانہ سالی میں غلط بیانی کی بدترین مثال ہے۔کیونکہ مجمع لاکھوں کا تھا اور پگڑیاں ہزاروں کو ملنا تھیں۔اس کارروائی کا افتتاح محترم قاری محمد طیب صاحب اور مولانا محمد منت اللہ صاحب کی دستار بندی سے ہوا اور پھر مولانا عبدالحق صاحب اور بعد میں آپ کا نمبر آیا۔چونکہ ہزاروں لوگوں کو دستار بندی کرانا بہت ہی مشکل تھا کچھ حضرات کو سٹیج پر اور باقی حضرات کو سٹیج سے نیچے پگڑیاں ہاتھوں میں دی گئیں اور بحمد اللہ تعالیٰ سواتی برادران سٹیج پر ہی

تھے اور براہ راست سٹیج پر پگڑیاں ملیں۔ ہم سے یہ نہیں کہا گیا کہ جاؤ دارالاہتمام سے پگڑیاں لے لو۔ لیکن گستاخی معاف صرف پگڑی اور سند ملنے سے ہی آدمی دیوبندی مسلک کا پیرو تو نہیں ہو جاتا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض غیر مقلدین حضرات دیوبند کی سند لئے پھرتے ہیں۔ مولوی محمد بشیر صاحب گوجرانوالوی قبرستانی اور مولوی منظور الحق صاحب وڈالہ سندھواں ضلع سیالکوٹ وغیرہ بھی دیوبند کے سند یافتہ تھے لیکن ساری زندگی بدعات کی ترویج میں انہوں نے گزار دی۔ آپ کے دیوبندی مسلک ترک کرنے کا اس لئے لوگوں کو شبہ ہے کہ آپ المہند میں درج شدہ دیوبندی مسلک کی ترجمان عبارت کو کھلے بندوں تسلیم نہیں کرتے اور صاف فرماتے ہیں کہ ہمیں کوئی دیوبندی کہے یا نہ کہے ہمیں کوئی پروا نہیں۔ انصاف سے فرمائیں آپ کی اس تصریح کے بعد صرف دستار بندی سے آپ کی دیوبندیت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ اور از راہ انصاف فرمائیں کہ دیوبندی مسلک سے ضد اور ہٹ دھرمی کس کو ہے؟ کیونکہ، ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

باقی آپ کا یہ ارشاد کہ ہماری جماعت کی اکثریت مدت سے اہل بدعت اور مشرکین کو کچھ نہیں کہتی اور ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے ہی پڑی ہوئی ہے تو اس عبارت میں آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ جماعت کی اقلیت ہی سہی۔ اہل بدعت ومشرکین کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ان میں بفضلہ تعالیٰ سواتی برادران بھی ہیں۔ لہٰذا ان سے یہ شکوہ تو بے سود ہے۔ لیکن گزارش ہے کہ آپ کی جماعت کے صدر محترم نے اختلاف رونما ہونے کے بعد ۱۳۷۴ھ سے آج تک کیا اپنی رٹ چھوڑی ہے اور کسی تقریر میں بھی عدم سماع کے مسئلہ کو نظر انداز کیا ہے؟ اور اسی طرح آپ کی جماعت کے دیگر افراد نے ملک کے بعض مقامات میں اس مسئلہ کے علاوہ کوئی اور مسئلہ بیان کرنے کی زحمت گوارا کی ہے؟

محترم! آپ بزرگ ہیں تصویر کے دونوں رخ سامنے رکھنے چاہئیں۔ تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے صرف ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ رہا آپ کا مسجد لنگریاں والی پر قبضہ کا شوشہ تو یہ بھی سوء ظن کی بدترین مثال ہے۔ کیونکہ ہم تو غیر اوقاف کی مساجد پر قبضہ جاری رکھنے سے بھی عاجز ہیں۔ چہ جائیکہ اوقاف کی مسجد پر قبضہ کریں۔ راقم اثیم کو گکھڑ کی مسجد اور نصرۃ العلوم کے اسباق اور گورنمنٹ کالج گکھڑ کے درس ہی سے فرصت نہیں ملتی اور صوفی عبدالحمید مسجد نور کی خطابت درس وتدریس اور دیگر اہتمام کے مشاغل سے فارغ نہیں ہو سکتا تو آپ کے درس پر قبضہ کرنے کا کیا معنی؟ پھر آپ عرصہ تک ہمارے ساتھ رہے۔ مزاج سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ ہم شرارت پسند نہیں ہیں اور بفضلہ تعالیٰ بزرگوں کے ادب واحترام کو بھی بخوبی جانتے ہیں اور آپ کی ہر غمی اور خوشی میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ جیسے آپ نے اپنے فرزند مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کی تجہیز وتکفین اور جنازہ میں ہماری شرکت کا خود ہی ذکر فرمایا ہے۔ اسی طرح آپ کو اپنے عزیز اور عزیزہ کی شادی میں شرکت کا بھی ذکر کرنا چاہئے تھا۔ آپ کے دعوت نامہ پر ہم حسب توفیق شامل ہوئے اور نیز آپ کے حکم سے اور محترم جناب مولانا قاضی محمد عصمت اللہ صاحب دام مجدہم کے ارشاد سے راقم اثیم ہی نے ان کی والدہ ماجدہ مرحومہ کا قلعہ دیدار سنگھ میں جنازہ پڑھایا تھا۔ حالاں کہ آپ دونوں بزرگ عالم بھی تھے اور ولی بھی تھے لیکن جنازہ پڑھانے کا اعزاز آپ نے راقم اثیم کو دیا اور آپ کو یاد ہوگا کہ جب میں آگے کھڑا ہوا تو پیچھے سے آوازیں بلند ہوئیں کہ شاہ صاحب گجراتی تشریف لے آئے ہیں لیکن آپ

دونوں بزرگوں نے فرمایا کہ جنازہ تم ہی پڑھاؤ گے تو جنازہ میں نے ہی پڑھایا تھا۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ ہم اور آپ میں گہرے روابط ہیں۔ صرف آپ سے مؤدبانہ التجاء ہے کہ آپ غلط کار مشیروں اور تنگ دل حواریوں کے کہے لگ کر ہمارے خلاف دل میں جذبات نہ رکھیں۔ ہم آپ کے خادم ہیں:

کون کہتا ہے کہ ہم تم میں جدائی ہوگی — یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی

اس لئے یہ خیال ہی دل سے نکال دیں کہ مسجد لانگریاں والی میں آپ کے جاری درس پر ہم قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر نوح عطا فرمائے۔ تاکہ آپ اپنا درس جاری رکھ سکیں اور ان حضرات کے مالی تعاون سے مدرسہ جامعہ صدیقیہ کو چار چاند لگا سکیں۔

فیوضات حسینی

ہمارے پیرومرشد حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کے مضمون پر ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے جس کا نام فیوضات حسینی ہے (الملقب بہ تحفہ ابراہیمیہ) اس کا اردو ترجمہ افادہ عوام کے لئے عزیزم صوفی عبدالحمید فاضل دیوبند مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نے کیا ہے۔ راقم اثیم نہ تو اس کتاب کا مصنف ہے اور نہ مترجم ہے لیکن جناب قاضی شمس الدین صاحب لکھتے ہیں کہ اس سے پہلے آپ نے ایک کتاب لکھی اور نام رکھا فیوضات حسینی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس ساری کمپنی کو کتاب کا نام لکھنا بھی نہیں آیا۔ (ہلفظہٖ ص ۴) اور دوسرے مقام پر لکھا کہ مولانا موصوف ابوالزاہد سرفراز صاحب مصنف فیوضات حسینی۔'' (ص ۱۳)

الجواب: ہم نے جناب قاضی صاحب کے اعتراض کا جواب (تسکین الصدور ص ۵۰) میں مفصل دے دیا ہے۔ اس جواب کو اسی میں ملاحظہ کریں۔ یہاں صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ فیوضات حسینی کے مصنف حضرت مولانا حسین علی صاحب ہیں اور یہ کتاب اسی نام سے ان کی زندگی میں طبع ہوئی تھی اور یہ نام انہی کا رکھا ہوا ہے اور ہماری کمپنی کے نیجر حضرت مرحوم ہیں اور اس کا مترجم راقم اثیم نہیں بلکہ عزیزم صوفی عبدالحمید ہے۔ راقم اثیم کو اس کا مصنف قرار دینا بالکل خلاف واقعہ ہے۔ فارسی اور اردو میں موصوف اور صفت کی مطابقت کا خاص اہتمام نہیں کیا جاتا اور اس کی متعدد مثالیں ہم نے عرض کر دی ہیں اور خود جناب قاضی صاحب نے حیات برزخی اور حیات دنیوی کے جملے اپنی تحریر میں استعمال کئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو تعلیم القرآن مئی ۱۹۵۹ء ص ۱۶)

لہٰذا اس کمپنی کے ایک فرد اور رکن آپ خود بھی ہیں اور اس جرم میں برابر کے شریک ہیں:

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

عجیب بات ہے کہ جناب قاضی صاحب کو موصوف اور صفت میں مطابقت ملحوظ نہ رکھنے کا اعتراض تو از بر ہے لیکن حضرت مرحوم کا رکھا ہوا نام بدل کر محض سینہ زوری سے اس کا نام افادات حسینیہ رکھ دینا اور اصل کتاب کے آخر سے مختلف سلاسل کے شجرے جو بحرمت فلاں الخ کے الفاظ سے درج تھے سب کا حذف کر دینا تاکہ منکر توسل جناب سید عنایت اللہ شاہ صاحب امیر اشاعت التوحید والسنۃ پر کوئی زد نہ پڑے یاد نہیں۔ محترم! کسی مصنف کی کتاب کا نام بدل ڈالنا اور اس کچھ حصہ حذف کر دینا یہ کون سی دیانت ہے؟ خدارا بتائیں کہ بات کیا ہے؟ لیکن: جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

لفظ ابی الزاہد پر اعتراض

اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ علم، کنیت اور لقب میں فرق ہے۔ علم وہ خاص نام ہے جس سے آدمی مشہور ہوتا ہے۔ (فرہنگ آصفیہ ج ۳ ص ۲۸۱)

اور یہ خاص نام والدین یا کوئی اور بزرگ سنت کے مطابق ولادت کے دن یا ساتویں دن رکھتے ہیں اور کنیت وہ نام اب یا ام یا ابن یا بنت کے نام سے بولا جائے۔ (ایضاً ج ۳ ص ۵۷۸) اور لقب وہ نام جس میں موسوم کی مدح یا ذم ہو یا وہ وصفی نام جو کسی خاص صفت یا عزت وغیرہ کے سبب پڑ گیا ہو۔ (ایضاً ج ۴ ص ۱۹۴) لیکن جناب قاضی صاحب نے اعتراض کے شوق میں کنیت کو علم بنا کر اعتراض جڑ دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: ''اب آپ نے اپنا نام (کنیت) ابوالزاہد لکھی۔ جناب زاہد علم (نام) ہے اور اعلام پر الف لام داخل کرنا غیر مستحسن اور قبیح ہوتا ہے اور بے فائدہ اس کا ذکر اور عدم ذکر برابر ہوتا ہے۔ پھر آگے نحوی قاعدہ کا حوالہ نقل کرتے ہیں کہ بعض اعلام میں الف لام داخل ہیں۔ الفضل والحارث والنعمان فذکرذا وحذفہ سیان یعنی ان کا حذف اور ذکر دونوں برابر ہیں۔ (ص ۴) اور (ص ۵۷) میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اصطلاح میں تفرد اس کو کہتے ہیں جو مسائل میں ہو جیسے آپ کا اسم گرامی ابوالزاہد نہ دلائل میں۔''

الجواب: جناب قاضی صاحب کی پرانی عادت ہے کہ دوسروں کو بلا وجہ مرعوب کرنے کے لئے کسی عبارت کا کوئی چٹکلہ چھوڑ دیتے ہیں اور پھر جذبات کے تیز رو گھوڑے پر سوار ہو کر خوب زیر کرتے اور لتاڑتے ہیں اور اصل حقیقت کی طرف خود توجہ نہیں فرماتے۔ یہاں بھی انہوں نے ایسا ہی کیا ہے جس کی کوئی وقعت نہیں۔

اوّلاً: اس لئے کہ جب نحوی طور پر اعلام پر الف لام کا لانا اور نہ لانا دونوں پہلو برابر ہیں تو اگر کسی نے ایک مساوی پہلو کو اختیار کر لیا تو اس پر واویلا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

ثانیاً: علم اور کنیت کو گڈمڈ کر دینا علمی طور پر کون سی مستحسن بات ہے؟ راقم اثیم کا نام محمد سرفراز ہے جو والد مرحوم یا بڑے بزرگوں نے رکھا ہے اور تقریباً ۳۵ سال کے بعد جب بڑا لڑکا محمد عبدالمتین خان زاہد پیدا ہوا تو اس کے لقب زاہد کی وجہ سے راقم نے ابوالزاہد کنیت رکھی اور القاب پر الف لام سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ الحذاء، الضریر، الاعمش، الاعرج، القصیر اور الطویل وغیرہ کے القاب جو کتب حدیث میں آتے رہتے ہیں۔ ہرگز آپ سے مخفی نہ ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگ بہ نسبت نام و علم کے کنیت اور تخلص وغیرہ سے زیادہ مشہور ہوتے ہیں جیسے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہ ان کا نام عبد عمرو یا عبدالرحمٰن بن صخر وغیرہ تھا اور ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کہ ان کا نام احمد تھا مگر شہرت کنیت اور تخلص سے زیادہ ہے۔

ثالثاً: کتب حدیث میں سینکڑوں علم ایسے موجود ہیں جن پر الف لام داخل ہے۔ (بخاری ج ۱ ص ۲) میں ان الحارث بن ہشام وعروۃ ابن الزبیر اور (ج ۱ ص ۴) میں ابوالیمان الحکم بن نافع کی سند سے، خدا معلوم جناب قاضی صاحب کتنی دفعہ بخاری شریف پڑھا چکے ہیں مگر نہ تو انہوں نے اس کے خلاف قلم اٹھایا اور نہ تلامذہ کو اس غیر مستحسن اور قبیح اور بے فائدہ کارروائی پر آگاہ کیا ہے۔ دیگر کتب صحاح کا تو ذکر ہی چھوڑیئے۔ بخاری اور مسلم میں سینکڑوں

اعلام پر الف لام آیا ہے مگر جناب قاضی صاحب نے ان مقامات کے بارے میں اپنی کسی کتاب میں کبھی بھی کچھ تحریر نہیں فرمایا اور نہ ان پر کبھی لب کشائی فرمائی ہے۔ صرف ابوالزبیر (محمد بن تدرس رحمۃ اللہ علیہ) (بخاری ج ۱ ص ۹۸، ۱۷۶، ۲۳۳، ۲۹۱، ۵۷۵، ۳ وج ۲ ص ۵۹۲ وج ۲ ص ۵۹۳ میں اور مسلم ج ۲ ص ۴، ۷، ۱۱، ۱۵، ۲۷، ۳۲، ۳۸، ۵۴، ۶۵، ۱۶۶، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۰۲ ومسلم ج ۱ ص ۲۲۴، ۲۴۰، ۲۶۲، ۲۶۵، ۴۶۵) وغیرہ میں الف لام کے ساتھ آیا ہے۔ لیکن جناب قاضی صاحب نے اس کے خلاف کسی کتاب میں کوئی تبصرہ نہیں فرمایا، آخر کیوں؟ کیا صرف ابوالزاہد ہی ایک مسئلہ بن گیا ہے اور پھبتی اس پر فٹ آتی ہے؟ جناب قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ: ''تفرد اس کو کہتے ہیں جو مسائل میں ہو جیسے آپ کا اسم گرامی ابوالزاہد۔'' نہ معلوم ابوالزاہد کون سا مسئلہ ہے؟ اور کنیت اسم اور علم کیسے بن گئی؟ اور اسم فقہی مسئلہ کیسے بن گیا؟ مگر یہ نہ پوچھئے۔

رابعاً: جناب قاضی صاحب سے یہ بات تو مخفی نہیں ہوگی کہ ان کے استاذ محترم حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کا نام اور علم محمد انور شاہ تھا اور فتح الملہم میں جابجا قال الشیخ الانور کا جملہ موجود ہے۔ مثلاً (ج ۲ ص ۹۷، ۴ وج ۳ ص ۱۵۹) اور ہم نے کتاب (سماع موتی ص ۱۷۹) میں قال الشیخ الانور کا جملہ فتح الملہم کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ لیکن اس سے جناب قاضی صاحب کی نظر مبارک چوک گئی ہے اور مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو اس غیر مستحسن قبیح اور بے فائدہ کارروائی پر کچھ نہیں فرمایا اور ابوالزاہد پر گرفت فرمائی ہے۔ شاید اس لئے یہ جلی حروف میں کتاب کے سرورق پر ہے۔

تناقض

جناب قاضی صاحب بزعم خویش سماع الموتی کی بعض عبارات میں تناقض ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ (باب التناقض ص ۲۶) میں لکھتے کہ: ''زائر قبر مبارک کے پاؤں کی طرف سے آئے اور سر کی طرف سے نہ آئے تاکہ دیکھنے والے کو دقت نہ ہو۔'' اور (ص ۱۸۹) میں فرماتے ہیں: ''سماع کے بغیر تمام صفات ان سے منفی ہیں۔'' اب گزارش یہ ہے کہ رؤیۃ بھی سماع کے بغیر ہے۔ یہ منفی ہے یا مثبت اگر منفی ہے تو (ص ۲۶) کی بات نہ ثابت ہوئی اور اگر مثبت ہے تو اجتماع نقیضین ہے کہ رؤیۃ سماع کے علاوہ ہونے کی وجہ سے منفی بھی ہے۔'' (بلفظہٖ ص ۴ و ۵)

الجواب: جناب قاضی صاحب نے اپنے ناخواندہ حواریوں کو جو مغالطہ دیا ہے وہ علماء اور صلحاء کی شان سے بالکل بعید ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ انہوں نے (ص ۲۶) کی پوری عبارت ہی نقل نہیں کی۔ عبارت یہ ہے کہ شفاء الصدور کے اسی صفحہ میں حضرت ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دے کر اور نام لے کر انہوں نے ایک فقہی مسئلہ بیان ہے کہ زائر قبر مبارک کے پاؤں کی طرف سے آئے اور سر کی طرف سے نہ آئے تاکہ دیکھنے والے کو دقت نہ ہو۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''تو یہ اقوال حجت نہیں ہیں۔'' قاضی صاحب موصوف نے اوّل اور آخر کو اڑا کر کمر سے عبارت پکڑ لی ہے اور حضرت ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ کا نام تک نہیں لیا اور ہم نے اس قسم کی عبارات کا مطلب (سماع الموتی ص ۱۳۱ و ۳۲۲) میں قدرے تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔ مگر جناب قاضی صاحب نے اس کا ذکر تک بھی نہیں کیا۔ کچھ عبارت ملاحظہ کرلیں۔

''اور حضرات فقہاء کرام کی ان عبارات میں رؤیت سے جاننا مراد ہے کہ جب کوئی زندہ شخص قبر کے پاس

آ کر سلام وکلام کرتا ہے تو مردے اس کو آواز اور لب ولہجہ سے پہچان لیتے ہیں جیسا کہ نابینا حضرات لوگوں کو آواز سے پہچانتے ہیں۔ مگر نابینا سے بھی اگر کلام کرنا ہوتا ہے تو عادۃً لوگ اس کے پیچھے نہیں کھڑے ہوتے بلکہ سامنے ہی کھڑے ہوتے ہیں، گو اس کو نظر کچھ بھی نہیں آتا۔ عادت یوں ہی ہے اور متکلم کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اگر یہ بینا ہوتا تو میں اس کے سامنے ہی سے آتا۔ اب بھی ایسا ہی کروں۔ یہی حال اموات کے ساتھ کرنا چاہئے کہ اگر وہ قبر کے مضبوط پردہ کے پیچھے سے اپنی حسی آنکھوں سے دیکھتے ہوتے تو ان کے پاس آنے والے سامنے سے ہی آتے۔ اس لئے اب قبر پر سامنے ہی کی طرف سے آئیں نہ کہ پیچھے کی طرف سے اور ان کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھ کر یوں خیال اور تصور کریں کہ گویا وہ دیکھتے ہیں۔"

قارئین کرام ہی انصاف سے فرمائیں کہ ہم نے تو حضرت ملا علی القاری ؒ اور علامہ شامی ؒ وغیرہ حضرات فقہاء کرام کی عبارات میں رویت کا مطلب علم بیان کیا ہے جس کا تعلق سماع سے ہے اور حقیقی اور حسی رؤیت کی نفی کی ہے۔ پھر اس عبارت کا (ص۱۸۹) کی عبارت سے تعارض کیسا اور اس پر باب التناقض کے قائم کرنے کا کیا معنیٰ؟

ثانیاً: (سماع الموتی ص۱۸۹) کی عبارت نقل کرنے میں بھی جناب قاضی صاحب نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ ہم نے (ص۱۸۸ تا ۱۰۹) میں (فیض الباری ج۴ ص۹۰ و ۹۱) کی طویل عبارت نقل کرکے اس کا ترجمہ کیا ہے جس میں یہ بھی ہے کہ: "اور جاننا چاہئے کہ علامہ تفتازانی ؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ مردے جانتے ہیں اور لکھا ہے کہ اختلاف ان کے سماع میں ہے اور اسی طرح انہوں نے نقل کیا ہے کہ سماع کے بغیر تمام صفات ان سے منفی ہیں۔" پہلی عبارت میں رؤیت کے قائل حضرت ملا علی القاری ؒ اور علامہ ابن عابدین شامی ؒ ہیں اور اس عبارت میں سماع کے بغیر باقی تمام صفات کی نفی کرنے والے علامہ تفتازانی ؒ ہیں۔ جب قائل ہی جدا جدا ہیں تو ان کی عبارات میں تعارض اور تناقض کا کیا مطلب؟ آپ ہمارے بزرگ ہیں آپ سے مئودبانہ گزارش ہے کہ ناخواندہ حواریوں کے ہاتھ میں کھلونا نہ بنیں۔ اپنے مقام کو ملحوظ رکھیں اور ایسی کمزور اور کچی باتیں لکھ کر اپنی علمی ساکھ کو ضائع نہ کریں۔

کیا مردے زندوں کے بعض حالات جانتے ہیں؟

موصوف لکھتے ہیں اور (ص۲۸) میں فرماتے ہیں: "مشہور اور مستفیض احادیث سے یہ ثابت ہے کہ مردہ اپنے اہل وعیال اور دوستوں کے احوال کو جانتا ہے جو ان کو دنیا میں پیش آتے ہیں اور یہ حالات ان پر پیش کئے جاتے ہیں۔"

محترم! (مشکوۃ شریف ص۲۵) میں تو لکھا ہے (ہم ان کے ترجمہ پر ہی اکتفاء کرتے ہیں۔ صفدر) "اسے فرشتے کہتے ہیں سو جا عروس کی طرح جسے احب اہلہ کے سوا کوئی نہیں جگاتا۔ یہاں تک اسے اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اس خواب گاہ سے اٹھائے گا۔" اور اسی (ص۲۵) میں (ہے) جب ایک تمہارا مر جاتا ہے تو (قبر میں) صبح وشام اس کی جگہ پیش کی جاتی ہے۔ جنتی ہے تو جنت سے اور دوزخی ہے تو دوزخ سے۔ حدیث فرماتی ہے کہ وہ اس حالت میں ہوتا ہے اور آپ فرماتے ہیں جو اوپر لکھا۔ بہتر تو ہے آپ اپنا نظریہ چھوڑ کر حدیث رسول اللہ ﷺ کو مان لیں۔ (ملخصہ ص۵)

الجواب: اس میں بھی جناب قاضی صاحب نے بالکل سطحی مغالطہ دیا ہے۔ اوّلاً یوں کہ (ص ۲۸) کی عبارت حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے (فتاویٰ ج ۴ ص ۳۴۶ و ۴ ، ۴۴۷) کا ترجمہ ہے۔ قاضی صاحب نے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے فتاویٰ کا نام تک نہیں لیا جو علمی خیانت ہے۔

ثانیاً: ہم نے (سماع الموتی ص ۳۱۷، ۳۱۸) میں باحوالہ متعدد احادیث عرض اعمال علی المیت کی عرض کی ہیں اور قاضی صاحب نے ان کا بھی ذکر تک نہیں کیا اور انہی احادیث کو حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ مشہور اور مستفیض احادیث کہتے ہیں۔ مگر قاضی صاحب ہمیں یہ وعظ فرمارہے ہیں کہ بہتر تو یہ ہے کہ آپ اپنا نظریہ چھوڑ کر حدیث رسول اللہ ﷺ کو مان لیں۔ کیا خوب، محترم! ہمارا نظریہ حدیث پر مبنی نہیں بلکہ مشہور اور مستفیض احادیث پر مبنی ہے۔ آپ ہمیں حدیث ماننے کا کیا سبق سنا رہے ہیں۔ خود مشہور احادیث کو ترک کرنے کے وبال سے ڈریں۔

ثالثاً: جناب قاضی صاحب مشکوٰۃ شریف کی جس حدیث رسول اللہ ﷺ کا سبق اور درس ہمیں سنا رہے ہیں، اس میں عرض اعمال اور مردوں کے اپنے زندہ اقارب کے بعض اعمال سے باخبر ہونے کی نفی کا اشارہ تک بھی موجود نہیں ہے جو کچھ اس حدیث میں ہے۔ علی الرأس والعین ہم اس کو یقیناً مانتے ہیں اور آپ کی تلقین کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا پردہ کرنا

جناب قاضی صاحب لکھتے ہیں: اور (۲۹) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دفن کئے جانے کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پردہ کر کے اندر جاتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ پہلے تو میرے والد اور خاوند تھے اور بہرحال حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو اجنبی ہیں۔ ان کی مراد یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو دیکھتے ہیں۔'' سبحان اللہ! وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جوان کو دو گز مٹی سے دیکھ سکتا تھا، اس چادر سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون! بریں عقل و ہمت بباید گریست۔ کیا شاگردوں کو یہی پڑھایا کرتے ہیں۔

گر ہمیں مکتب وہمیں ملا — کار طفلاں تمام خواہد شد

اللہ کے بندو! اس کا تو یہ مطلب ہے کہ مردے سے وہی معاملہ کرنا چاہئے جو زندہ سے کیا جاتا ہے۔ (ص ۶۰۵)

الجواب: اس اعتراض میں بھی جناب قاضی صاحب نے وہی کچھ کہا ہے جس ان سے توقع تھی اور ہو سکتی ہے۔ ہم نے (۲۹) میں علامہ بدرالعینی الحنفی رحمہ اللہ کے مختصر الفتاویٰ المصریۃ کی ایک عبارت نقل کی ہے جس کا ایک حصہ لے کر جناب قاضی صاحب نے حاشیہ آرائی کی اور مکتب وملا اور اطفال کو اجاڑنے کا ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ان کا علمی فریضہ تھا کہ وہ علامہ بعلی رحمہ اللہ اور ان کے فتاویٰ کا حوالہ دیتے تا کہ اس ملا کو بھی آپ کی شیرینی اور خوردہ کا کچھ لذیذ حصہ مل جاتا۔ مگر انہوں نے اپنے شاگردوں اور حواریوں کے سامنے صرف ابوالزاہد بیچارے ہی کو نیچا دکھانا ہے اور بس تو اور کسی کے نام لینے کی کیا ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں ہم نے (۳۲) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کا واضح مطلب بیان کیا ہے اور وہی شاگردوں کو بھی پڑھایا کرتے ہیں۔ مگر قاضی صاحب نے اس مطلب کا ذکر تک کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ہم نے لکھا ہے کہ اس کو ایسا ہی سمجھئے جیسا کہ کوئی متادب شاگرد اپنے استاد کے مصلی یا ان کی خاص نشست گاہ پر استاد کی غیر حاضری میں بھی کھڑا ہونے اور بیٹھنے کی ہمت اور جرأت نہیں

کرتا۔ اس خیال سے کہ یہ میرے استاد کا مقام ہے کہ اگر استاد محترم موجود ہوتے تو ان کی موجودگی میں یہ جرأت نہ کرتا۔ اب بھی ان کا ادب واحترام ملحوظ رکھتا ہوں۔ ٹھیک اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بوقت زیارت کیا کرتی تھیں۔ پہلے چونکہ صرف آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی وہاں مدفون تھے تو وہ ستر کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتی تھیں۔ جیسا کہ ان کی زندگی میں نہیں کرتی تھیں، بخلاف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہ چونکہ وہ شرعاً غیر محرم تھے۔ اس لئے جس طرح ان کی زندگی میں وہ ان کے سامنے پردے کا اہتمام کرتی تھیں۔ بعد از وفات بھی اس کو ملحوظ رکھا۔

قارئین ہی فرمائیں کہ کیا ہماری اس تفصیلی عبارت کی طرف جناب قاضی صاحب نے کوئی توجہ کی ہے اور کیا پھر اس تفصیل کے بعد ان کے اعتراض یا پھبتی اور وعظ کی کوئی ضرورت ہے۔ ہماری اس تصریح اور سابق ذکر کردہ تشریح کے بعد جناب قاضی صاحب کے اس ارشاد کا کہ جناب رؤیت سے مراد کوئی رؤیت بھی مراد ہو بصری یا علمی اگر دو گز مٹی اس سے حائل نہیں ہوتی تو یہ چادر ہرگز اس سے حائل نہیں ہوگی اور پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رؤیت علمی ہوگی تو دوسری اموات کی رؤیت بھی علمی ہوگی یا بصری ہوگی اور جب علمی ہوگی تو وہ پہلی عبارت جو آپ نے لکھی ہے کہ میت کے پاؤں کی طرف سے آوے اور سامنے کھڑا ہو کر میت کو دیکھنے میں تکلیف نہ ہو، اس کا کیا مطلب ہوگا؟ کیا رؤیت علمی میں بھی اس تکلیف کا احتمال ہے؟ احقر اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ آپ کے باب التناقض میں داخل ہے۔ (بلفظہٖ ص ۶)

جواب بالکل واضح ہو گیا ہے کہ رؤیت علمی مراد ہے اور یہ سب کے لئے ہے اور بقول علامہ تفتازانی رحمہ اللہ اس پر اجماع ہے کہ مردے جانتے ہیں اور گزر چکا ہے کہ تناقض تو ہرگز نہیں۔ ہاں! فہم کا قصور ضرور ہے۔

بریلویوں کو تحفہ

جناب قاضی صاحب لکھتے ہیں: (ص ۳۳ سے لے کر ۳۵) تک بہت سی عبارات نقل کی ہیں۔ ان کے متعلق عرض ہے کہ یہ تخییل پر محمول ہیں یا حقیقت علم پر؟ ظاہر تو یہ ہے کہ یہ تخییل پر محمول ہیں۔ جیسا کہ آپ نے خود (ص ۳۷) پس یستحضر کی تشریح میں اس کی وضاحت کی ہے اور اسے تسلیم کیا ہے اور جب تخییل پر محمول ہیں تو ان سے آپ کا مطلب ہرگز نہیں ثابت ہوتا اور اگر حقیقت پر محمول ہیں تو ان سے آپ کا مطلب ثابت ہوگا مگر ساتھ ہی یہ آپ کی طرف سے بریلویوں کو تحفہ ہوگا، وہ آپ کا شکر ادا کریں گے اور آپ کو ثواب دارین حاصل ہوگا۔ احقر کا مشورہ یہ ہے کہ آپ دوسری صورت اختیار کر لیں کہ آپ کا مطلب بھی ثابت ہو جائے اور ثواب دارین سے بھی محروم نہ ہوں ہم ثواب وہم خرما۔ (بلفظہٖ ص ۶)

الجواب: یہاں بھی جناب قاضی صاحب نے خلط مبحث سے کام لیا ہے اور بات کو گول کر گئے ہیں۔ ان عبارات میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر سلام کرنے والا یہ تصور اور خیال کرے کہ گویا آپ ﷺ سامنے حاضر ہیں اور گویا زائر کو دیکھ رہے ہیں۔ لہٰذا ادب واحترام کو ملحوظ رکھے اور یہ امر تخییل پر محمول ہے وکانہ حاضر جالس بازائک وغیرہ کے الفاظ بعض عبارات میں صراحت سے مذکور ہیں اور دوسری چیز ہے۔ عند القبر زائر کے صلوٰۃ وسلام کا سننا اور اس کا جواب دینا اور یہ حقیقت پر محمول ہے اور وسماعہ

کلامک ور دہ علیک سلامک کے الفاظ نمایاں طور پر موجود ہیں۔ جب دو چیزیں الگ الگ ہیں تو ان کو گڈ مڈ کر کے ایک کر دکھانا اور پھر ہم سے یہ سوال کرنا کہ یہ تخییل پر محمول ہے یا حقیقت علم پر؟ بالکل بے سود اور دور از کار بات ہے۔ کیونکہ جب دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ ایک تخییل پر محمول ہے اور دوسری حقیقت علم پر کہ زائر کا سلام سن کر آپ کو اس کے سلام و کلام کا حقیقۃً علم ہو جاتا ہے اور آپ اس کے سلام کا جواب دیتے ہیں اور اگر اس نظریہ سے بریلویوں کو تحفہ ملتا ہے تو المہند کے مؤلف اور اس پر دستخط کرنے والے اکابر علماء دیوبند بلکہ پوری امت کی طرف سے ملتا ہے۔ لہٰذا ثواب دارین اور خرما کا مستحق صرف ابوالزاہد ہی نہیں بلکہ پوری امت اور اکابر علماء دیوبند بھی ہیں اور اس تحفہ میں بریلویوں کی کوئی تخصیص نہیں اور ان میں سے بعض عبارات سے جو کچھ بریلویوں نے سمجھا ہے اس کا رد (سماع الموتی ص ۳۷) میں ہم نے کر دیا ہے۔ اس کو وہاں ہی ملاحظہ کر لیں اور خلط مبحث سے کام نہ لیں۔

لفظ اذ ظرف ہے جو ماضی کے لئے ہوتا ہے

(سماع الموتی ص ۳۶) میں علامہ قسطلانی رحمہ اللہ اور علامہ زرقانی رحمہ اللہ کی عبارت پر گرفت کرتے جناب قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں یہ فقرہ جو ہے کہ: ''کما کان یفعل بین یدیہ فی حیاتہ اذھو حیٌ'' میں لفظ اذ ظرف ہے جو ماضی کے لئے ہوتا ہے اور یہ ظرف متعلق ہے کما کان یفعل کے ساتھ اور معنی یہ ہے۔ جیسا کہ وہ کیا کرتا تھا جب آپ زندہ تھے۔ مگر مولانا اس کا معنی کرتے ہیں۔ کیونکہ آپ زندہ ہیں۔ ''ان کنت لا تدری'' یہ بھی آپ کے باب التحریف میں داخل ہے۔ پھر جب یہ احساس ہوا کہ تو میں نے بریلویوں کے لئے بڑا تحفہ مہیا کر دیا تو فرماتے ہیں کہ اس عبارت سے اہل بدعت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دلوں کے راز تک کا علم غیب ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ مگر وہ بے چارے یستحضر کا مفہوم نہیں سمجھے۔ استحضار کا یہ معنی ہوتا ہے کہ اپنے ذہن اور خیال میں ایک بات کو حاضر کرے اور ذہن میں پیش نظر رکھے۔

اس کے متعلق پہلی عرض تو یہ ہے کہ اس عبارت میں وسماعہ لسلامہ بھی استحضار کے تحت داخل ہے پھر آپ کا مطلب نہیں حاصل ہوگا۔ دوسری عرض یہ ہے کہ استحضار کے نیچے تو کما ہو فی حال حیاتہ تک داخل ہے اور بس آگے ''اذ لا فرق بینا موتہ و حیاتہ'' تو یستحضر کی دلیل ہے اس کے نیچے داخل نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ آپ فکر نہ کریں جب آپ جیسے بزرگوں کی حمایت بریلویوں کو حاصل ہے تو ناکام مشکل سے ہوں گے۔ آپ ان کی حمایت ضرور جاری رکھیں۔ ہم بندیال میں ایک بریلوی کے ساتھ مناظرہ کرنے کے لئے گئے۔ مناظرہ تو نہ ہوا مگر اس کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے نیچے آپ کی دیگ بول رہی ہے۔ (بلفظہٖ ص ۷و۸)

الجواب: اس عبارت میں بھی جناب قاضی صاحب نے سطحی قسم کی اور بے مغز باتیں لکھ کر وقت ضائع کیا ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ لفظ اذ صرف ماضی ہی کے لئے نہیں آتا بلکہ استقبال، مفاجات اور تعلیل کے لئے بھی آتا ہے۔ چنانچہ نحو کی مشہور اور درسی کتاب شرح جامی میں ہے کہ: ''وقد تجیٔ للمستقبل کقولہ تعالٰی فسوف یعلمون اذ الاغلال فی اعناقھم الٰی قولہ وقد تجیٔ للمفاجاۃ'' (شرح جامی ص ۲۴۱)

اذ کبھی مستقبل کے لئے بھی آتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فسوف یعلمون اذ الاغلال فی

اعناقھم (میں مستقبل کے لئے ہے) اور کبھی یہ مفاجات (اچانک کے معنی) کے لئے بھی آتا ہے اور علم نحو کی مشہور اور دقیق کتاب مغنی اللبیب (ج ۱ ص ۷۷۱) (جس کے مصنف جمال الدین عبداللہ بن یوسف رحمہ اللہ الخزرجی المتوفی ۷۶۱ھ ہیں اور (شرح الدمامینی علی متن المغنی ج ۱ ص ۱۷۵) میں اس کی تصریح موجود ہے کہ لفظ اذ تعلیل کے لئے بھی آتا ہے اور علامہ رضی (محمد بن الحسن الاسترآبادی المتوفی ۶۸۴ھ) لکھتے ہیں کہ: ''ویجئ اذ للتعلیل نحو جنتک اذ انت کریم'' (رضی شرح الکافیہ ج ۲ ص ۹۱ طبع دہلی)

اور لفظ اذ دلیل کے لئے بھی آتا ہے جیسا کہ جنتک اذ انت کریم میں تعلیل اور دلیل کے لئے ہے۔

لہٰذا لفظ اذ کو صرف ماضی ہی کے سمجھنا نحوی قاعدہ سے بے خبری پر مبنی ہے۔ وثانیاً: اس نحوی اور مشہور قاعدہ کے علاوہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم جناب قاضی صاحب کی علمی دیگ کا ایک چمچہ اور کڑ چھا بھی ہدیہ قارئین کرام کر دیں تاکہ ان کے لئے کسی طرف بھی راہ فرار باقی نہ رہے۔ چنانچہ اسی سابق عبارت میں جناب قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ آگے ''اذ لافرق بین موتہ وحیاتہ'' تو یستحضر کی دلیل ہے۔ اس کے پیچھے داخل ہی نہیں۔ (ملفظہ) اس عبارت میں جناب قاضی صاحب نے لفظ اذ کو تعلیل اور دلیل کے لئے تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح ہم بھی باادب عرض کرتے ہیں کہ: ''اذ ھو حی'' کا جملہ جو شارح زرقانی رحمہ اللہ کا ہے: ''ویلازم الادب والخشوع'' کی دلیل ہے جو علامہ قسطلانی رحمہ اللہ کی عبارت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضر ہونے والا جب بھی حاضر ہو ادب، خشوع اور تواضع کو لازم پکڑے اور اس عظمت اور ہیبت کے مقام پر اپنی نگاہ کو نیچے رکھے۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زندگی میں اس طریقہ کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور جیسا کہ آپ کی حسی زندگی میں ادب واحترام لازم تھا۔ اب آپ کی قبر مبارک پر بھی ایسا ہی لازم ہے۔ اگر یہ مطلب نہ لیا جائے (اور حقیقت اور نفس الامر میں ہے بھی یہی) اور جناب قاضی صاحب والا مطلب لیا جائے تو ''اذ ھو حی'' کا جملہ جو شارح علامہ زرقانی رحمہ اللہ کا ہے بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی زندگی میں ادب اور خشوع وغیرہ تو ماتن کی عبارت ''کما کان یفعل بین یدیہ فی حیاتہ'' سے ثابت ہے۔ پھر اس ثابت شدہ حیات کو اذ ھو حی سے ثابت کر کے تحصیل حاصل کا کیا فائدہ؟ اور علامہ زرقانی رحمہ اللہ ہی علامہ سبکی رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: ''وانہ احیی بعد الموت حیاۃ حقیقۃ'' کہ آپ کو وفات کے بعد حقیقی حیات کے ساتھ زندہ کیا گیا ہے۔ (زرقانی ج ۸ ص ۳۱۰)

اور علامہ سخاوی رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: ''اذا کان المصلی عند قبرہ سمعہ بلا واسطۃ'' جب صلوٰۃ وسلام پڑھنے والا آپ کی قبر کے پاس پڑھتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلاواسطہ سنتے ہیں۔ (زرقانی ج ۸ ص ۳۰۸)

اور نیز لکھتے ہیں کہ: ''واورد ان رد السلام علی المسلّم لا یختص بہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا بالانبیاء فقد صح مرفوعاً مامن احد یمر بقبر اخیہ المؤمن ومن کان یعرفہ فی الدنیا الّا عرفہ ورد علیہ السلام واجیب بان الرد من الانبیاء رد حقیقی بالروح والجسد بجملتہ ولا کذالک الرد من غیر الانبیاء والشہداء فلیس بحقیقی وانما ھو بواسطۃ اتصال الروح بالجسد لان بینہ وبینھا اتصالاً یحصل بواسطتہ التکمن من الرد مع کون ارواحھم لیست فی اجسادھم'' اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ سلام کہنے والے کے سلام کا جواب دینا

آنحضرت ﷺ اور دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام ہی سے مختص نہیں ہے۔ اس لئے کہ صحیح اور مرفوع حدیث سے ثابت ہے کہ جب بھی کوئی شخص اپنے مومن بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جس کو وہ دنیا میں پہچانتا ہے۔ جب وہ سلام کہتا ہے تو مردہ اسے پہچانتا ہے اور جواب دیتا ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے یہ ردسلام روح اور جسم کے کمال تعلق سے حقیقی رد ہے اور غیر انبیاء اور غیر شہداء علیہم السلام سے یہ رد حقیقی نہیں، بلکہ روح کے جسم کے ساتھ فی الجملہ اتصال سے ہے۔ کیونکہ جسم اور روح میں ایک گونہ اتصال ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ ردسلام پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کی ارواح ان کے اجسام میں (بکمالہ) داخل نہیں ہوتیں۔ (ج ۸ ص ۳۰۸)

ان عبارات سے صراحۃً ثابت اور معلوم ہوا کہ علامہ زرقانی رحمہ اللہ آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک میں آپ کی حیات حقیقیہ کے قائل ہیں کہ روح مبارک کا بکمالہ جسد اطہر سے کامل تعلق ہے نہ ایسا جیسا کہ عامۃ الناس کے ارواح کا ان کے اجساد سے فی الجملہ تعلق ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی ان صریح عبارات کی موجودگی میں یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ علامہ زرقانی رحمہ اللہ اذ ہو حی سے یہ مراد لے رہے ہیں کہ: ''جب آپ زندہ تھے'' اور اب آپ کو قبر میں زندہ نہیں مانتے؟ الغرض کوئی معمولی سمجھ والا بھی یہ غلطی نہیں کرے گا اور نہ یہ ٹھوکر کھائے گا۔ ہاں! لا نسلم کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔

ثالثاً: جناب قاضی صاحب کا یہ فرمانا کہ اس عبارت میں وسماعہ لسلامہ بھی استحضار کے تحت داخل ہے۔ پھر آپ کا مطلب نہیں حاصل ہوگا۔ نری دفع الوقتی اور خالص سینہ زوری ہے۔ کیونکہ علامہ قسطلانی رحمہ اللہ اور علامہ زرقانی رحمہ اللہ بانگ دہل بڑی شد و مد کے ساتھ عند القبر بلا واسطہ صلوٰۃ وسلام کا سماع اور حقیقی طور پر رد جواب بر ہر زائر ثابت کرتے ہیں۔ پھر ان کی عبارات کا یہ مطلب کیسے ہوگیا کہ وہ تخیل اور استحضار کے طور پر عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کے قائل ہیں۔

رابعاً: محترم جناب قاضی صاحب نے بندیال کے مناظرہ کا موضوع نہیں بیان کیا کہ کیا تھا؟ سماع الموتی کی دیگ میں لاتعداد اور بے شمار علماء ملت کی واضح عبارات کے علاوہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ کی یہ عبارت بھی درج ہے کہ میں کہتا ہوں کہ سننے کی احادیث درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ (فیض الباری ج ۲ ص ۴۶۷)

اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ کی یہ عبارت بھی درج ہے کہ بندۂ ضعیف اللہ تعالیٰ اسے معاف کرے کہتا ہے کہ جو چیز ہمیں مجموعہ نصوص سے حاصل ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ تو سب سے بہتر جانتا ہے۔ یہ ہے کہ مردوں کا سماع فی الجملہ بہت سی صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ (فتح الملہم ج ۲ ص ۴۷۹)

غالباً دیگ کے ان اور جیسے دیگر ٹھوس حوالوں نے قاضی صاحب کو حواس باختہ کیا ہوگا کہ اگر بریلوی یہ مسئلہ اٹھا دیں کہ جناب قاضی صاحب! آپ تو سماع موتی کا کلیۃً انکار کرتے ہیں اور آپ کے پیر و مرشد قریب سے سماع روح کے قائل ہیں۔ جیسا کہ ہم نے (سماع الموتی ص ۱۶۸) میں پڑھا ہے اور یہ مذکور دونوں بزرگ آپ کے استاد حدیث ہیں تو آپ کیوں ان سب کی مخالفت کرتے ہیں؟ اب اگر جناب قاضی صاحب ان کی بات تسلیم کرتے ہیں تو حواری نہیں جینے دیں گے اور اگر انکار کرتے ہیں تو مرشد اور اساتذہ کی رجعت پڑتی ہے۔ کریں تو کیا کریں؟
نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ بندیال میں بریلوی حضرات نے یہ موقف اختیار کیا ہو اور سماع الموتی میں درج

شدہ حوالوں سے استفادہ کیا ہو کہ علماء دیو بند تو آنحضرت ﷺ کی حیات دنیوی اور برزخی دونوں کے قائل ہیں اور سماع موتی میں جسم اور روح دونوں کو شریک گردانتے ہیں اور صرف روح کی زندگی میں اور صرف روح سے سننے کے قائل تو ہمارے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی ہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ میں آپ تو ہمارے بریلوی بھائی ہیں اور آپ کا قارورہ تو ہمارے ساتھ ملتا ہے۔ پھر آپ ہمارے ساتھ مناظرہ کرنے کے لئے اتنے دور سے چل کر کیوں تشریف لائے ہیں؟ غالباً سماع الموتی کی دیگ میں اپنی قوت اور حرارت کی وجہ سے یہی حوالہ ابلتا اور جوش مارتا ہوا نظر آیا ہوگا جس کی وجہ سے گھبرا کر جناب قاضی صاحب مناظرہ کئے بغیر ہی بندیال سے تشریف لے آئے اور مناظرہ کی نوبت ہی نہ آئی۔

قارئین کرام کے افادہ کے لئے عرض ہے کہ ہم نے سماع الموتی میں بریلوی فرقہ کے پیشوا اور اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کا حوالہ یوں نقل کیا ہے۔

چنانچہ احمد رضا خان صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

عرض: ام المومنین صدیقہ رضی اللہ عنہا کا انکار سماع موتی سے رجوع ثابت ہے یا نہیں؟

ارشاد: نہیں! وہ جو فرما رہی ہیں حق فرما رہی ہیں، وہ مردوں کے سننے کا انکار فرماتی ہیں، مردے کون ہیں؟ جسم، روح مردہ نہیں اور بے شک جسم نہیں سنتا روح سنتی ہے۔"

پھر آگے لکھتے ہیں: "سماع کے عرفی معنی ان آلات کے ذریعہ سے سننا اور یہ یقیناً بعد مرنے کے روح کے لئے نہیں۔ روح کو جسم مثالی دیا جاتا ہے۔ اس کے جسم کے کانوں سے سنتی ہے۔"

پھر آگے لکھتے ہیں: "موتی کون ہیں؟ اجسام قبور میں کون ہیں۔ وہی اجسام تو پھر اجسام ہی کے سننے سے انکار ہوا اور وہ یقیناً حق ہے۔" (ملفوظات حصہ سوم ص ۳۳)

غور کیجئے اور انصاف سے فرمایئے کہ اس مسئلہ میں خان صاحب بریلوی کا ہمنوا کون ہے؟ مگر دنیا میں ایسا ہوتا رہا ہے کہ چھاننی لوٹے کو دو سوراخ ہونے کا طعن دیتی ہے۔" (سماع الموتی ص ۴۶ و ۴۷)

اور یہ جو کچھ خان صاحب نے فرمایا وہی جناب قاضی صاحب فرماتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: لہٰذا جب کوئی قبر کے پاس جا کر کلام کرے گا تو یہ جسم مردہ تو سنتا نہیں اور روح کوسوں دور علیین میں ہے۔ پھر سنے گا کون؟ لہٰذا ثابت ہوا کہ موتی نہیں سنتے۔" (الشھاب ص ۴۶)

جناب خان صاحب اور جناب قاضی صاحب دونوں قبر میں جسم کو مردہ مانتے ہیں۔ دیکھئے کیسے قارورہ آپس میں ملا ہے بریلویوں کو اپنے ہمنواہ ہونے کا کیسا بہترین تحفہ جناب قاضی صاحب نے پیش کیا ہے کہ وہ پھولے نہ سمائیں۔

استعارہ کی بحث

(سماع الموتی ص ۷۹) میں ہم نے لطائف رشیدیہ (ص ۸ و ۹) کی مسئلہ سماع موتی سے متعلق ایک عبارت نقل کی ہے۔ (وہ اصل کتاب ہی دیکھ لیں) اس کو جناب قاضی صاحب نقل کرکے ہمارے ہی مارے ہوئے شکار کو چیر پھاڑ کر مفید مطلب حصہ حاصل کرنے کے در پے ہیں۔ چنانچہ جناب قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں: "چونکہ

حضرت مولانا ابوالزاہد سلمہ اللہ تعالیٰ نے ایک باب التحریف بھی کھول رکھا ہے اس لئے کہیں یہ عبارت بھی اس باب کے ذیل میں ہضم نہ کر جائیں۔ مناسب سمجھا کہ اس عبارت کا بلاتحریف صحیح مطلب پہلے لکھ دیا جائے۔ الیٰ قولہ: پھر آیت میں استعارہ ہے۔ مردے اور صمّ مشبہ بہ مستعار منہ ہیں اور کفار مستعار لہ مشبہ ہیں اور استعارہ میں وجہ شبہ جو معنی مشترک ہوتا ہے۔ وہ مستعار منہ مشبہ بہ میں حقیقی لیا جاتا ہے۔ مجازی لینا درست نہیں جیسے شیر مشبہ بہ ہو اور زید مشبہ اور وجہ شبہ شجاعت جو دونوں میں مشترک ہے۔ شیر میں علی وجہ الاتم اور حقیقی معنی پر ہوگی مجازی پر نہیں۔ اسی طرح موتی اور صمّ میں وجہ شبہ عدم سماع علیٰ وجہ الاتم ہوگی اور حقیقی معنی پر ہوگی کہ نہیں سنتے نہیں سنتے، نہیں سنتے۔ مجازی معنی پر محمول نہیں ہوگی کہ سنتے ہیں اور نفع نہیں اٹھاتے، سنتے ہیں اور نفع نہیں اٹھاتے، سنتے ہیں اور جواب نہیں دیتے۔ ہاں! مشبہ کفار میں یہی معنی مراد ہیں کہ نفع نہیں اٹھاتے۔ لہٰذا حسب قواعد مرجح جانب عدم سماع ہے۔'' (ص۹و۱۰)

الجواب: محترم قاضی صاحب بڑے ذہین طباع اور بہترین مدرس ہیں۔ مگر اس مقام پر انہوں نے غور وفکر سے بالکل کام نہیں لیا۔ ورنہ ان کے لئے بات سمجھنا بالکل آسان ہے۔ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ استعارہ کے چار ارکان ہیں۔ مشبہ، مشبہ بہ، وجہ شبہ اور اداۃ (حرف) التشبیہ (تلخیص المفتاح، مختصر المعانی اور مطول وغیرہ میں اس کی سیر حاصل بحث ہے) باقی تین چیزوں میں تو فریقین کا کوئی نزاع نہیں۔ نزاع ہے تو وجہ شبہ میں ہے کہ اس مقام میں مشبہ کفار اور مشبہ بہ الموتی وصمّ میں وجہ شبہ کیا ہے؟ پہلے وجہ الشبہ کا معنی ملاحظہ کرلیں۔ چنانچہ امام ابوالمعالی محمد بن عبدالرحمن القزوینی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۳۹ھ) لکھتے ہیں: ''ووجهه مايشترک کان فيه تحقيقاً او تخييلاً''

اور وجہ شبہ وہ ہے جس میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں حقیقتاً یا خیالی طور پر شریک ہوں۔ (تلخیص المفتاح ص۴۹)

اور اس کی تشریح میں علامہ مسعود رحمہ اللہ بن عمر سعد الدین تفتازانی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۹۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

''ای وجه التشبيه هو المعنى الذی قصد اشتراک الطرفين فيه تحقيقاً او تخييلاً الى قوله ولهذا قال الشيخ عبدالقاهر التشبيه الدلالة علىٰ اشتراک شيئين فی وصف هو من اوصاف الشئ فی نفسه خاصة کالشجاعة فی الاسد والنور فی الشمس'' (المطول ص۵۲۸ وراجع مختصر المعانی ص۲۰۰)

وجہ شبہ وہ معنی ہے جس میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کے اشتراک کا قصد کیا گیا ہو۔ حقیقتاً یا خیالی طور پر (پھر آگے فرمایا) اور اسی لئے شیخ عبدالقاہر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ تشبیہ کا مطلب کسی چیز کے ذاتی اور خاص اوصاف میں سے کسی وصف کا دو چیزوں میں اشتراک پر دلالت کرنا ہے جیسا کہ شیر میں وصف شجاعت ہے اور سورج میں نور ہے۔

یعنی اگرچہ شیر میں اور بھی اوصاف ہیں۔ مثلاً حیوان ہونا، جسم ہونا وغیرہ مگر اس کی خاص صفت شجاعت ہے۔ اس وصف خاص میں دو چیزوں کا شریک ہونا وجہ شبہ ہے اور اسی طرح سورج کا جسم اور حجم وغیرہ بھی ہے۔ مگر اس کی ذاتی صفت (جو اللہ تعالیٰ نے اسے دی ہے) نور اور روشنی ہے تو اس میں نور والی صفت وجہ شبہ ہے اور اس وصف میں دونوں کا اشتراک ایسا اور اس قدر گہرا ہو کہ گویا دونوں ایک ہیں۔

چنانچہ امام فن امام عبدالقاہر بن عبدالرحمن الجرجانی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ: ''وانه قد تناهى الى ان صار المشبه لايتميز عن المشبه به فی المعنى الذی من اجله شبه به'' یعنی وہ وجہ شبہ یہاں تک پہنچ جائے کہ مشبہ کو مشبہ بہ سے اس معنی سے ممتاز نہ کیا جاسکے جس کی وجہ سے اسے تشبیہ دی گئی ہے۔ (دلائل الاعجاز ص۲۴۰ مصر)

ان روشن عبارات سے یہ بات بالکل آشکارا ہوگئی ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں وجہ شبہ ایک ہونی چاہئے۔ مگر قاضی صاحب وکالت کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ مشبہ بہ یعنی الموتی اور صمّ میں وجہ شبہ عدم سماع ہے اور زور دے کر بار بار فرماتے ہیں کہ نہیں سنتے، نہیں سنتے، نہیں سنتے اور مشبہ یعنی کفار میں وجہ شبہ عدم انتفاع بتاتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ: ہاں! مشبہ کفار میں یہی معنی ہیں کہ نفع نہیں اٹھاتے۔ اب انصاف سے فرمائیں کہ کیا استعارہ کے قواعد کی یہ صریح خلاف ورزی نہیں ہے؟ آپ چونکہ بزرگ ہیں۔ اس لئے باب التحریف اور باب التناقض اور باب الجہالۃ والتعصب وغیرہ کے جملے آپ کے حق میں بولنے کی جرأت تو ہم نہیں کر سکتے لیکن متادبانہ گزارش ہے کہ طے شدہ اصول کو تو پامال نہ کریں۔

اگر مشبہ یعنی کفار میں وجہ شبہ عدم انتفاع ہے تو یقین جانئے کہ مشبہ بہ الموتی اور صمّ میں بھی یہی معنی متعین ہیں اور اگر مشبہ بہ (الموتی اور صمّ) میں حقیقتاً عدم سماع ہے تو استعارہ کے قاعدہ کے مطابق مشبہ (کفار) میں بھی حقیقتاً عدم سماع ہی ہوگا تو اعلان کر دیجئے کہ دنیا میں سچ مچ کوئی زندہ کافر حقیقتاً نہیں سنتا اور فھم لا یسمعون اپنی حقیقت پر محمول ہے۔ معاف رکھنا نہیں سنتے، نہیں سنتے، نہیں سنتے بار بار کہہ اور لکھ کر اور اس پر زور صرف کر کے تو یہ وجہ شبہ نہیں بن سکتی۔ وجہ شبہ قاعدہ کے مطابق بنائیں جو مشبہ اور مشبہ بہ دونوں میں ایک ہو اور وہ صرف وہی ہے جو ہم کہتے ہیں۔ عدم انتفاع کہ مشبہ بہ (الموتی اور صمّ) میں حقیقتاً عدم انتفاع ہے اور مشبہ (کفار) میں ادّعاء کہ وہ سن کر بھی نفع نہیں اٹھاتے اور سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ امام فن امام عبد القاہر الجرجانی رحمۃ اللہ علیہ استعارہ کی بحث میں فرماتے ہیں کہ: ''ان موضوعها علی انک تثبت بها معنیً لا یعرف السامع ذالک المعنی من اللفظ و لکنه یعرفه من معنی اللفظ بیان ذالک انا نعلم انک لا تقول رأیت اسداً الّا و غرضک ان تثبت للرجل انه مساوٍ للاسد فی شجاعته و شدة بطشه و اقدامه الی قوله فاعرف هذه الجملة و احسن تاملها'' استعارہ کی وضع اس لئے ہے کہ تو اس کے ساتھ وہ معنی ثابت کرے جس معنی کو سامع لفظ سے نہ سمجھے لیکن اس لفظ کے معنی سے سمجھے۔ بیان اس کا یہ ہے کہ بلا شبہ ہم یہ جانتے ہیں کہ تو جب (بہادر شخص کو دیکھ کر) کہے میں نے شیر دیکھا ہے تو تیری غرض یہی ہے کہ تو مرد کے لئے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ شیر کے ساتھ اس کی شجاعت، سخت گرفت اور جرأت میں مساوی ہے۔ (پھر آگے فرمایا کہ) تو اس قاعدہ کو اچھی طرح سمجھ لے اور اس پر خوب غور کر۔ (دلائل الاعجاز ص ۲۳۰)

ملاحظہ کیجئے کہ امام فن اس عبارت میں استعارہ کی وضع اور اس کا قاعدہ اور ضابطہ کیا بیان کرتے ہیں اور پھر کس طرح اس کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

اس قاعدہ سے صراحتاً یہ معلوم ہوا کہ وجہ شبہ کو سامع لفظوں سے نہیں سمجھ سکتا بلکہ الفاظ کے معانی سے سمجھتا ہے۔ اب اگر ہم لاتسمع الموتی میں وجہ شبہ عدم سماع تسلیم کریں تو اس کو تو سامع آپ حضرات کے پسندیدہ ترجمہ کہ مردے نہیں سنتے لاتسمع الموتی کے لفظوں سے سمجھتا ہے۔ پھر یہ استعارہ کیسے ہوا؟ اور عدم سماع وجہ شبہ کیسے قرار پائی؟ اور پھر استعارہ میں قاعدہ کے لحاظ سے یہ کیسے متصور ہو سکتا ہے کہ حکم خبری (یعنی لاتسمع الموتی) اور وجہ شبہ (جو بقول آپ کے عدم سماع ہے) ایک ہی ہو؟ آپ جذبات میں آنے کی بجائے ٹھنڈے دل سے علمی طور پر ائمہ فن کی روشن عبارات کی مدد سے استعارہ کو سمجھنے کی کوشش فرمائیں اور عدم انتفاع کو ہم ہی نے وجہ شبہ نہیں قرار دیا۔

حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ ایسا ہی فرماتے ہیں۔ہم نے سماع الموتی میں مشہور مفسر قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کی تفسیر ان الفاظ سے نقل کی تھی:''وانما شبھوا بالموتی لعدم انتفاعھم باستماع مایتلی علیھم کما شبھوا بالصم فی قولہ تعالٰی ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولو مدبرین فان اسماعھم فی ھذہ الحالۃ ابعد''ان زندہ کافروں کو مردوں کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ اس چیز کو جو ان پر پڑھی جاتی ہے سن کر نفع نہیں حاصل کرتے۔جیسا کہ ان کو ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین کے ارشاد میں بہروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔کیونکہ اس حالت میں ان کا سننا بعید تر ہے۔ (تفسیر بیضاوی علی القرآن العظیم ص ۳۲۱)

اس تفسیر سے بھی معلوم ہوا کہ زندہ کفار کو مردوں کے ساتھ تشبیہ اس امر میں نہیں دی گئی کہ وہ سرے سے سنتے ہی نہیں بلکہ تشبیہ اس سماع کی ہے جو موجب انتفاع ہو اور یہ بالکل واضح ہے۔ (سماع الموتی ص ۲۹۵)

جناب قاضی صاحب علامہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کے اس حوالہ اور اس کی روشنی میں ہماری تشریح کا جواب یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ:''جناب یہ وہی فرما رہے ہیں جس کا ذکر پہلے استعارہ کی تفصیل میں گزر چکا کہ مردے سنتے ہی نہیں اور یہ (یعنی کفار۔صفدر) سنتے ہیں نفع نہیں اٹھاتے۔مولانا!صمّ کی تشبیہ میں کیا معنی کریں گے۔یہ سنتے ہیں اور نفع نہیں اٹھاتے۔جیسے صمّ مدبر سنتا ہے اور نفع نہیں اٹھاتا؟جناب!صمّ مدبر سنتا ہے؟ کلا وحاشا:سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔''(ص ۵۵،۵۶)اور پھر(ص ۷۵)میں لکھتے ہیں کہ:''حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ انہوں نے سوتی اور من فی القبور میں ایک مدلل قانون ذکر کیا ہے۔استعارہ کا کہ اس میں مشبہ بہ مستعار منہ میں معنی حقیقی لینا ضروری ہے۔موصوف نے اس کی پروانہ کی اور اس قانون کی خلاف ورزی کی اور آخر تک قدب تشبیہ کرتا گیا۔''

اس طرز استدلال میں جناب قاضی صاحب نے غور وفکر کو قریب بھی نہیں آنے دیا۔اولاً:اس لئے کہ جو تفسیر استعارہ کی جناب قاضی صاحب نے نقل کی ہے کہ وجہ شبہ عدم سماع ہے وہ ائمہ فن شیخ عبد القاہر الجرجانی رحمہ اللہ اور علامہ تفتازانی رحمہ اللہ وغیرہ کی صریح عبارات کے خلاف ہے اور وجہ شبہ عدم سماع قطعاً نہیں بن سکتی۔کما مر!تو پھر علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کی صریح عبارت میں ہم وجہ شبہ عدم انتفاع کو چھوڑ کر اس مفروض تفصیل کی طرف کیوں جائیں جس کا حوالہ جناب قاضی صاحب یوں دیتے ہیں کہ:''یہ وہی فرما رہے جس کا ذکر پہلے استعارہ کی تفصیل میں گزر چکا کہ مردے سنتے ہی نہیں اور (کفار) سنتے ہیں نفع نہیں اٹھاتے۔''

عرض یہ ہے کہ علامہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ علوم عربی کے امام ہیں وہ استعارہ کی تفسیر کو بخوبی جانتے ہیں اور وہ تو صراحۃً بیان کرتے ہیں کہ وجہ شبہ عدم انتفاع ہے جو مشبہ اور مشبہ بہ دونوں میں ایک ہے۔ایک میں حقیقتاً اور دوسرے میں ادّعاء اور قاضی صاحب مشبہ بہ الموتی اور الصمّ میں وجہ شبہ مردے سنتے ہی نہیں۔بتلاتے ہیں مشبہ کفار میں سنتے ہیں،نفع نہیں اٹھاتے۔''کچھ تو غور فرمائیں کہ وہ کیا فرما رہے ہیں اور استعارہ کا قانون کیا ہے۔

ثانیاً:یہ بات صرف قاضی بیضاوی رحمہ اللہ ہی نہیں بیان کرتے دیگر مفسرین کرام رحمہم اللہ بھی یہی کچھ فرماتے ہیں۔چنانچہ تفسیر جلالین اور السراج المنیر میں''افانت تسمع الصم''کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ:''شبھھم بھم فی عدم الانتفاع بمایتلی علیھم'' (تفسیر جلالین ص ۳۷۴ اوالسراج المنیر ج ۲ ص ۲۱)

اللہ تعالٰی نے کفار کو بہروں کے ساتھ اس امر میں تشبیہ دی ہے کہ ان پر جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس سے وہ نفع نہیں اٹھاتے۔

یہ عبارت بھی بالکل صریح ہے کہ وجہ تشبیہ عدم انتفاع ہے نہ کہ عدم سماع اور تفسیر مظہری میں ''انک لا تسمع الموتی'' کی تفسیر میں ہے کہ: ''ای الکفار شبھھم بالموتی لعدم الانتفاع لھم بتسامع ما یتلی علیھم کما شبھوا بالاصم فی قولہ تعالٰی ولا تسمع الصم الدعا'' (تفسیر مظہری ج ۷ ص ۱۳۰)

اللہ تعالیٰ نے کفار کو مردوں سے تشبیہ دی ہے۔ اس امر میں کہ جو کچھ ان پر پڑھا جاتا ہے وہ اس کو سن کر اس سے انتفاع نہیں کرتے۔ جیسا کہ ان کو بہروں سے اسی وجہ سے تشبیہ دی ہے: ''ولا تسمع الصم الدعاء'' کے ارشاد میں۔ اس عبارت میں اس بات کی صراحت ہے کہ زندہ کفار کو مردوں اور بہروں سے تشبیہ عدم انتفاع میں دی گئی ہے۔

اور تفسیر خازن میں ہے کہ: ''یعنی ان اللہ سبحانہ وتعالٰی صرف قلوبھم من الانتفاع بما یسمعون ولم یوفقھم لذالک فھم بمنزلۃ الجھال اذا لم ینتفعوا بما لم یسمعوا'' (تفسیر الخازن ج ۳ ص ۱۹۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ان کی سنی ہوئی چیزوں کے انتفاع سے پھیر دیا ہے اور ان کو اس کی توفیق ہی نہیں دی۔ سو ان کی مثال ان جاہلوں کی سی ہے جنہوں نے نہ سنا اور نہ نفع اٹھایا۔

یہ عبارت بھی بالکل واشگاف ہے کہ تشبیہ عدم انتفاع میں ہے باوجود تلاش کے کسی معتبر تفسیر میں صراحۃً ہمیں ایک حوالہ بھی نہیں مل سکا کہ اس استعارہ میں وجہ تشبیہ عدم سماع ہے۔ اگر یہ وجہ تشبیہ بن سکتی تو کوئی نہ کوئی مفسر ضرور اس کا ذکر کرتا بخلاف عدم انتفاع کے کہ اس کا صراحۃً ذکر کرتے ہیں جس طرح ان حضرات نے وجہ شبہ عدم انتفاع بتائی ہے۔ اسی طرح حافظ ابن تیمیہ، علامہ قرطبی، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن حجر، امام ابن جریر، شیخ معین الدین، علامہ عبدالعزیز فرہاروی اور علامہ بعلی، مولانا تھانوی وغیرہ (رحمہم اللہ) جملہ حضرات بھی وجہ شبہ عدم انتفاع (اور عدم قبول) بیان کرتے ہیں، جن کی مفصل عبارتیں سماع الموتی کے مختلف صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں مگر جناب قاضی صاحب کو وہ نظر نہیں آئیں یا تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں اور کوسنے کے لئے صرف راقم اثیم ہی کو سامنے رکھا ہے۔ حالانکہ:

میں اس عارفانہ تجاہل کے صدقے ہر ایک دل کو چھیدا میرا دل سمجھ کر

اصل بات یہ ہے کہ جناب قاضی صاحب خود غلط فہمی کا شکار ہیں وہ یہ کہ وہ وجہ تشبیہ مرکب سمجھتے ہیں کہ بہرے اور مردے نہ سنتے ہیں اور نہ نفع اٹھاتے ہیں اور زندہ کفار سنتے ہیں اور نفع نہیں اٹھاتے ہیں۔ اسی لئے تو وہ ہم سے سوال کرتے ہیں کہ صمّ کی تشبیہ میں کیا معنی کریں گے؟ یہ سنتے ہیں اور نفع نہیں اٹھاتے جیسے صمّ (غالباً اصم ہوگا کیونکہ صم تو جمع ہے مدبر اس کی صفت کیونکر واقع ہو سکتی ہے؟ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موصوف اور صفت کی عدم مطابقت کے اعتراض کی شیرینی سواتی برادران ہی کے لئے وقف ہو) مدبر سنتا ہے اور نفع نہیں اٹھاتا؟ جناب! سنئے مدبر سنتا ہے۔ کلّا وحاشا!

سو مؤدبانہ گزارش ہے کہ وجہ تشبیہ مفرد ہے عدم انتفاع یہ مشبہ بہ الصم میں حقیقتاً ہے کہ چونکہ سنا نہیں، اس لئے فائدہ نہیں اٹھایا اور مردوں میں بھی حقیقتاً ہے کہ ان کے انتفاع کا عالم ہی نہیں ہے اور کفار میں جو مشبہ ہیں ادّعاء ہے کہ سن کر بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ بہر حال اور بہر کیف وجہ تشبیہ عدم انتفاع ہے۔ لا غیر ولا شک فیہ!

ثالثاً: بلاشک حضرت گنگوہی رحمہ اللہ ہمارے صد احترام بزرگ ہیں لیکن استعارہ کی تفسیر اور تشریح میں دلائل الاعجاز، تلخیص المفتاح، مختصر المعانی اور مطول وغیرہ کی صریح عبارتیں ہی قابل اعتماد ہیں۔ کیونکہ امام عبدالقاہر

الجرجانی رحمہ اللہ اور علامہ تفتازانی رحمہ اللہ وغیرہ اکابر اس فن کے امام ہیں اور بات انہی کی چلے گی کہ وجہ تشبیہ مشبہ اور مشبہ بہ میں ایک ہی ہوتی ہے اور وہ الفاظ سے نہیں سمجھی جاسکتی بلکہ عقلاء اسے معانی سے سمجھتے ہیں اور جناب قاضی صاحب اس پر مصر ہیں اور بلا دلیل یہ منوانا چاہتے ہیں کہ مشبہ بہ میں وجہ شبہ عدم سماع ہے اور مشبہ میں عدم انتفاع ہے اور استعارہ کے قانون کی خود صراحتاً خلاف ورزی کرتے ہیں اور الٹا ہمیں خلاف ورزی کا ملزم گردانتے ہیں:

ایں کار از تو آید ومرداں چنیں کنند

ہم نے (سماع الموتی ص ۱۷۷) میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کا یہ حوالہ بھی دیا ہے جس کو دیگر سینکڑوں حوالوں اور صریح عبارات کی طرح جناب قاضی صاحب پی گئے ہیں۔

''والقول بان الاموات اذا ثبت لهم السماع عندالقرآن لم يستقم له التشبيه بالاموات جهل وسفه فان التشبيه انما ورد بحسب علمنا وعالمنا وان ثبت السماع عنده'' (فیض الباری ج ۲ ص ۴۶۸)

اور یہ کہنا کہ قرآن کریم کی رو سے جب مردوں کے لئے سماع ثابت ہے تو مردوں کے ساتھ اس کی تشبیہ درست نہیں۔ایک خالص جہالت اور حماقت ہے۔کیونکہ تشبیہ تو ہمارے علم اور ہمارے عالم کے مطابق وارد ہوئی ہے۔اگرچہ قرآن کریم کی رو سے سماع ثابت ہے۔''

اور اس سے قبل امام سیوطی رحمہ اللہ کی عبارت کا حوالہ دے کر اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''ان هؤلآء الكفار كالموتى فلا تنفع هدايتك فيهم لان نفعها انما كان فى حياتهم وقد مضى وقتها كذالك هؤلآء وان كانوا احياء الا ان هدايتك غير نافعة لهم لكونهم مثل الاموات فى عدم الانتفاع فليس الغرض نفى السماع بل نفى الانتفاع'' (فیض الباری ج ۲ ص ۴۶۸)

بے شک یہ کافر مردوں کی طرح ہیں۔ تیری رہنمائی ان کو کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ کیونکہ اس ہدایت اور رہنمائی کا فائدہ ان کو زندگی میں ہوسکتا تھا اور اب اس کا وقت جاچکا ہے۔اسی طرح یہ کافر اگرچہ زندہ ہیں مگر تیری ہدایت ان کو فائدہ نہیں دیتی۔ کیونکہ یہ عدم انتفاع میں مردوں کی طرح ہیں تو اس میں غرض نفی سماع نہیں بلکہ نفی انتفاع ہے۔حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت بھی بالکل واضح ہے۔مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔

جذبات وجوش

پھر آگے جوش میں آکر محترم قاضی صاحب فرماتے ہیں: ''تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ موتی اور من فی القبور کا حقیقی معنی تو کفار نہیں بلکہ مردے ہیں۔اس میں استعارہ کیا گیا موتی اور من فی القبور کو کفار کے لئے۔مردے مستعار منہ اور مشبہ بہ بنے اور کفار مستعار لہ اور مشبہ بنے اور عدم سماع ان دونوں میں مشترک وجہ تشبیہ کی بنے گی جیسے اسد بول کر مراد زید لیں تو شیر مستعار منہ مشبہ بہ بنے گا اور زید مستعار لہ مشبہ ہوگا اور شجاعت دونوں میں مشترک وجہ تشبیہ کی ہوگی اور استعارے کا قانون یہ ہوتا ہے کہ وجہ تشبیہ کے معنی مشترک مشبہ بہ میں حقیقی پایا جائے علی وجہ الاتم نہ کہ مجازی تو یہ ضرور ہوا کہ عدم سماع علی وجہ الحقیقت مردوں میں اتم پایا جائے تو معنی یہ ہوا کہ مردے تو سرے سے سنتے ہی نہیں اور کفار سنتے ہیں اور نفع نہیں اٹھاتے اور یہ نہ کہہ سکیں گے کہ جیسے کفار سنتے تو ہیں مگر نفع نہیں اٹھاسکتے۔

ایسے ہی مردے سنتے تو ہیں مگر نفع نہیں اٹھا سکتے۔ اس لئے کہ اس صورت میں مستعار منہ مشبہ بہ میں معنی حقیقی نہ رہے گا بلکہ مجازی بن جائے گا جو قانون استعارہ کے خلاف ہے اور نیز اس میں قلب تشبیہ ہو جائے گا۔ اس لئے کہ معنی یہ ہو جائے گا کہ مردے سننے کے بعد نفع نہیں اٹھا سکے۔ جیسے کفار سننے کے بعد نفع نہیں اٹھا سکتے تو اس میں مردے مشبہ بن گئے اور تھے وہ مشبہ بہ اور کفار مشبہ بہ بن گئے اور تھے وہ مشبہ تو چوں کہ موصوف کے پاس اس کا جواب کوئی نہیں اس لئے اغماض کر گئے۔'' (ص ۲۱ و ۲۲)

الجواب: اس میں بھی جناب قاضی صاحب نے غور و فکر سے بالکل کام نہیں لیا۔ اوّلاً: اس لئے کہ وہ خود استعارہ کا قانون یہ بیان کرتے ہیں کہ مستعار منہ اور مستعار لہٗ میں جو معنی مشترک ہوگا وہ وجہ تشبیہ ہوگی اور معنی مشترک ان دونوں میں ایک ہی ہونا چاہئے اور وہ خود مستعار منہ میں تو یہ کہتے ہیں کہ مردے تو سرے سے سنتے ہی نہیں (اور یہ معنی مفرد ہے) اور مستعار لہٗ میں فرماتے ہیں کہ اور کفار سنتے ہیں مگر نفع نہیں اٹھاتے (اور یہ معنی مرکب ہے) تو اس لحاظ سے دونوں میں ایک ہی معنی تو نہ پایا گیا۔ ایک میں معنی مفرد ہے اور دوسرے میں مرکب ہے اور یہ استعارہ کے قانون کے سراسر خلاف ہے۔ استعارہ کے قاعدہ اور قانون کے مطابق ان کو یہ کہنا چاہئے کہ جیسے مردے سرے سے نہیں سنتے۔ ایسے ہی زندہ کفار بھی سرے سے نہیں سنتے اور کلمۂ حق کے سننے سے انہیں بالکل چھٹی دے دینی چاہئے۔

وثانیاً: اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو جیسے مردوں سے تشبیہ دی ہے، اسی طرح صم (بہروں) سے بھی تشبیہ دی ہے اور اس مقام پر محترم جناب قاضی صاحب بھی الموتیٰ اور صم کا ذکر کرتے ہوئے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ: ''ہاں! مشبہ کفار میں یہی معنی مراد ہیں کہ نفع نہیں اٹھاتے۔'' (ص ۱۰) اس جگہ جناب قاضی صاحب نے عدم انتفاع کو وجہ تشبیہ قرار دیا ہے اور یہی صحیح ہے کہ مفرد بھی ہے اور دونوں میں مشترک بھی ہے اور یہاں وجہ تشبیہ عدم سماع اور عدم انتفاع دو چیزیں بیان فرماتے ہیں۔ نہ معلوم یہ تفنن کیوں؟ اور کیسا؟ چوں کہ محترم جناب قاضی صاحب کے ذہن میں عدم سماع موتیٰ کا مسئلہ کالنقش فی الحجر ہے۔ اس لئے وہ وجہ شبہ میں اس کا پیوند ضرور ساتھ لگانے پر مجبور ہیں۔ حالانکہ وجہ شبہ صرف اور صرف عدم انتفاع ہے جو دونوں میں مشترک ہے اور مفرد ہے اور یہ معنی الموتیٰ اور صم میں حقیقتاً ہے اور کفار میں مبالغۃً اور اس وجہ شبہ میں عدم استماع کا کوئی پیوند نہیں اور اس حصہ سے آیات کریمات بالکل خاموش ہیں۔ چنانچہ علامہ حقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''ان آیات میں تو عدم سماع کا اشارہ تک نہیں ہے۔'' (تفسیر حقانی ج ۶ ص ۶۱)

اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ ''لاتسمع'' کے مضمون کی تین آیتوں کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں کہ: ''ان تینوں آیتوں میں یہ بات قابل نظر ہے کہ ان میں کسی میں یہ نہیں فرمایا کہ مردے نہیں سن سکتے بلکہ تینوں آیتوں میں نفی اس کی کی گئی ہے کہ آپ نہیں سنا سکتے۔'' (معارف القرآن ج ۶ ص ۵۹۰)

الغرض! وجہ تشبیہ میں عدم سماع قطعاً شامل نہیں۔ وجہ تشبیہ تمام صورتوں میں صرف عدم انتفاع ہے جو الموتیٰ اور صم میں حقیقتاً ہے اور کفار میں مبالغۃً ہے۔

مگر محترم جناب قاضی صاحب استعارہ کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عدم سماع کو بھی عدم انتفاع کے ساتھ ضم کر کے بجبر منوانا چاہتے ہیں۔

ثالثاً: محترم جناب قاضی صاحب کا یہ فرمانا کہ اور یہ نہ کہہ سکیں گے کہ جیسے کفار سنتے تو ہیں مگر نفع نہیں اٹھا سکتے۔ ایسے ہی مردے سنتے تو ہیں مگر نفع نہیں اٹھا سکتے۔ اس لئے کہ اس صورت میں مستعار منہ مشبہ بہ میں معنی حقیقی نہیں رہے گا بلکہ مجازی بن جائے گا جو قانون استعارہ کے خلاف ہے۔ بلفظہٖ! اسی سابق غلطی کا نتیجہ ہے جس کی طرف ان کی توجہ نہیں اور یہ قانون استعارہ کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی اسی سابق غلطی کی وجہ سے وجہ تشبیہ مرکب بنا ڈالی ہے۔ حالانکہ وجہ تشبیہ مفرد ہے اور وہ عدم انتفاع ہے جو مشبہ بہ میں حقیقی ہے اور مشبہ میں مبالغۃً ہے۔ تعجب ہے کہ خود قاضی صاحب وجہ تشبیہ عدم انتفاع تسلیم کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: ہاں! مشبہ کفار میں یہی معنی مراد ہیں کہ نفع نہیں اٹھاتے اور الٹا آپ ہمیں کوستے ہیں کہ ہم قانون استعارہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور قلب تشبیہ کرتے ہیں۔ فالی اللہ المشتکیٰ! اور پہلے خود یہ تحریر فرماتے ہیں نفع نہیں اٹھاتے۔ جو صحیح ہے اور یہاں یہ فرماتے ہیں کہ نفع نہیں اٹھا سکتے۔ صرف قائلین سماع موتی کی بات کو مستبعد قرار دینے کے لئے یہ تعبیر اختیار کرتے ہیں۔

رابعاً: قاضی صاحب فرماتے ہیں: ''اور نیز اس میں قلب تشبیہ ہو جائے گا۔ اس لئے کہ معنی یہ ہو جائے گا کہ مردے سننے کے بعد نفع نہیں اٹھا سکتے جیسے کفار سننے کے بعد نفع نہیں اٹھا سکتے تو اس میں تو مردے مشبہ بن گئے اور تھے وہ مشبہ بہ اور کفار مشبہ بن گئے اور تھے وہ مشبہ۔''

اس عبارت میں بھی محترم جناب قاضی صاحب نے اسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے اور بزور اپنی طرف سے وہ مشبہ بہ کو مشبہ بنا رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ: ''مردے سننے کے بعد نفع نہیں اٹھا سکتے جیسے کفار سننے کے بعد نفع نہیں اٹھا سکتے تو اس میں مردے مشبہ بن گئے اور تھے وہ مشبہ بہ۔''

محترم! بن نہیں گئے بلکہ آپ نے اپنے ہاتھ مبارک کے کرتب سے بزور بنا دیئے ہیں اور اس کے بارے میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ: ''جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔''

محترم! کہنے والے استعارہ کے قانون کے عین مطابق یہ کہتے ہیں کہ عدم انتفاع، الموتی اور صم میں حقیقۃً ہے اور زندہ کفار میں مبالغۃً ہے کہ وہ فائدہ نہیں اٹھاتے اور سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔

خامساً: آخر میں فرماتے ہیں: ''تو چونکہ موصوف کے پاس اس کا جواب کوئی نہیں۔ اس لئے اغماض کر گئے۔'' سو گزارش ہے کہ ہم نے سماع الموتی (ص ۸۰) میں بین القوسین یہ عبارت تحریر کی ہے کہ (دوسرے حضرات کے نزدیک اس تشبیہ کی مراد حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت (۱۷۴) اور بدر الدین بعلی رحمہ اللہ کی عبارت (۲۶۸) میں اور اسی طرح دیگر اکابر کی عبارات میں دوسرے طریق سے ہے وہاں ملاحظہ کر لیں۔ صفدر) مطلب واضح ہے کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی عبارت میں وجہ تشبیہ عدم سماع ہے تو دوسرے حضرات کی عبارات میں عدم انتفاع ہے اور باقاعدہ ان کی عبارات کا حوالہ دیا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ جواب نہ تھا۔ اغماض کر گئے، نری مضحکہ خیز بات ہے۔

حضرات علمائے دیوبند کا فتویٰ

محترم جناب قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ الغرض! علامہ سید امیر علی ملیح آبادی مصنف تفسیر مواہب الرحمن، نواب قطب الدین صاحب دہلوی مصنف مظاہر حق، حضرت مولانا محرم علی صاحب مؤلف غایت الاوطار ترجمہ

درمختار، مولانا سید احمد صاحب امروہی، حسین صابری چشتی، نقشبندی، مجددی نے حضرت شیخ المشائخ حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کے فتویٰ کی تصدیق ان الفاظ کے ساتھ فرمائی ہے۔

''فما حققه المحقق الكامل المحدث الفقيه والفاضل النبيه شيخ الوقت مولانا رشيد احمد امطر الله عليه شآبيب الرحمت هو الاحق بالقبول وهو الاوفق بالمذهب والاوفق بالافتاء'' اس فتویٰ پر بہت سے علمائے کرام کے دستخط اور مہریں ذیل میں ملاحظہ ہوں۔ مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کا عدم سماع اموات ہے اور باعتبار روایت و درایت کے بھی راجح ہے۔'' اس کے بعد تقریباً تین صفحوں میں متعدد حضرات کے نام ہیں۔ مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب، حضرت شیخ الہند، مولانا محمد انور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا خلیل احمد صاحب، مولانا ظفر احمد تھانوی، مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی وغیرہم۔ (رحمہم اللہ) (الشہاب الثاقب ص ۱۲ تا ۱۴)

(اور (ص ۱۴) میں نقل کیا ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے) اور آخر میں قاضی صاحب فرماتے ہیں: دیکھئے مولانا اس حقیقت حقہ مبینہ، ثابتہ پر کہ حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی، مفتی عزیز الرحمن اور حضرت مفتی کفایت اللہ (رحمہم اللہ) کے نزدیک عدم سماع قطعی یا راجح ہے کس طرح قلم پھیرتے ہیں۔ (بلفظہٖ ص ۱۶)

الجواب: یہ ساری کاوش بے سود ہے۔ اوّلاً: اس لئے کہ محترم جناب قاضی صاحب نے یہ مضمون اور بزرگوں کے نام محترم جناب نیلوی صاحب کے مضمون البیان (الاوفی فی رد سماع الموتی ص ۱۷ تا ۲۱) سے لئے ہیں۔ لیکن اس سارے مضمون میں انہوں نے بھولے سے بھی اشارۃً نیلوی صاحب کا نام تک نہیں لیا اور ان کے مارے ہوئے شکار پر ہی فرحاں و نازاں ہیں۔ حالانکہ علمی اور اخلاقی طور پر ماخوذ مضمون کا حوالہ دینا چاہئے تھا کہ شیر کس نے قابو کیا ہے؟ اور میں نے کہاں سے لیا ہے؟

ثانیاً: نیلوی صاحب کا بھی یہ علمی اور اخلاقی فریضہ تھا اور ہے کہ وہ اس رسالہ کے اصل مطبوعہ الفاظ بھی درج کرتے ہیں کہ مولوی محمد کرامت اللہ خان صاحب رحمہ اللہ نے کیا تحریر کیا تھا اور پھر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے کن الفاظ میں اس کا جواب دیا تھا جس کی تصدیق حضرات مصدقین نے کی ہے۔ خود جناب نیلوی صاحب نقل کرتے ہیں۔ فاضل مجیب نے جس قید کے ساتھ مولوی محمد کرامت خان صاحب کے رسالہ کا جواب دیا، نہایت صحیح ہے۔ (عبدالسلام دہلوی) (البیان الاوفی ص ۲۱) اور اس حوالہ کا ذکر جناب قاضی صاحب نے بھی (الشہاب ص ۱۶) میں کیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مولوی محمد کرامت اللہ خان صاحب کے رسالہ میں سماع موتی کے بارے بنیادی باتیں کیا ہیں؟ اور فاضل مجیب حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے جس قید کے ساتھ اس کا رد کیا ہے وہ قید کیا ہے؟ جناب نیلوی صاحب نے نہ تو اصل رسالہ کے الفاظ بتائے ہیں اور نہ جواب ہی پورا نقل کیا ہے جس میں کوئی خاص بنیادی قید بھی ہے اور اس قید کو ملحوظ رکھ کر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اس کا رد کیا ہے اور مصدقین حضرات نے اس کی تائید و تصدیق کی ہے۔ جب تک رسالہ کے اصل الفاظ اور دعویٰ اور اس کے رد کے اصل الفاظ اور وہ قید جس کو ملحوظ رکھ کر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے جواب دیا ہے سامنے نہ آئیں تو یہ دشوار گزار گھاٹی طے نہیں ہوسکتی۔ اصل بحث اور جواب کو پی جانا اور صرف پرزور الفاظ میں تصدیقات نقل کر دینا اور اس پر خوشی منانا خالص مجذوبانہ کارروائی ہے۔ جناب قاضی صاحب کا بھی یہ علمی اور اخلاقی فرض تھا کہ وہ اصل رسالہ اور اس کے رد کے الفاظ کا بقید حروف حوالہ دیتے۔ پھر تصدیقات نقل کرتے تاکہ پتہ چلتا کہ اصل حقیقت کیا ہے؟

شکوہ

جناب قاضی صاحب کا نیلوی صاحب پر علمی طور پر اعتماد نہ کرنا خالص اعجوبہ ہے۔ کیونکہ جو شخص حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر معروف الفقہ والعدالۃ اور جمہور کو زنبور اور حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کو ایرے غیرے نتھو خیرے اور ان کی کتابوں کی پوتھیاں اور استشفاع عند القبر کرنے والوں کو (جس پر تمام مسالک کے علماء متفق ہیں) علماء سوء اور سماع موتی کے قائلین کو ملحدین اور مبتدعین کہتے ہوں اور خود کاتب ہونے کی وجہ سے کاپیاں بھی تیار کر سکتے ہوں تو ان کی نقل پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ مگر حیرت ہے کہ لفظ مجذوب بولنے پر ہمارا تو یوں شکوہ کیا ہے کہ آپ مولوی محمد حسین صاحب کو جا بجا مجذوب کہتے ہیں۔ مولانا صدق دل سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مجذوب بنائے۔ (مگر نیلوی صاحب جیسا ہرگز نہیں۔ صفدر) علم تصوف میں یہ لکھا ہے کہ جب تک کوئی شخص مجذوب نہ ہو، ولی ہو ہی نہیں سکتا۔ فرق یہ ہے کہ ایک مجذوب سالک ہوتے ہیں اور ایک سالک مجذوب الخ (الشہاب الثاقب ص ۵۷) اور جناب قاضی صاحب کو یقین کر لینا چاہئے کہ نیلوی صاحب ان دونوں قسموں سے محروم ہیں اور نرے مجذوب ہیں۔

جناب قاضی صاحب بلا وجہ لغوی مجذوب کو اصطلاحی مجذوب بنا کر ولی بنانے کے درپے ہیں جو اسلام کی بنیادی باتوں میں بھی یمین و یسار کا فرق نہیں جانتے۔ مگر افسوس ہے کہ جناب قاضی صاحب نیلوی صاحب کے کسی لفظ پر جو سب باحوالہ سماع الموتی میں درج ہیں قطعاً کوئی تنقید نہیں کرتے۔ ان کا فریضہ تھا کہ جناب نیلوی صاحب کو بھی ذرا ڈانٹ پلاتے جن کے واہیات اور مکروہ الفاظ کی زد میں امت کی اکثریت آ جاتی ہے۔

کیا حضرت گنگوہی رحمہ اللہ مطلقاً سماع موتی کے منکر ہیں؟

ثالثاً: یہ بات بھی بالکل عیاں ہے کہ الموتی میں حضرت انبیاء کرام علیہم السلام بھی قطعاً شامل ہیں۔ اس لئے کہ اس دنیا کی ظاہری اور حسی اور تکلیفی زندگی تو ان کو بھی نہیں ہے۔ قبر میں ان کی دنیوی، حقیقی اور جسمانی حیات کا معنی باحوالہ پہلے گزر چکا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا حضرت گنگوہی رحمہ اللہ اور ان کے جملہ مصدقین حضرات کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی عند القبر سماع نہیں؟ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے عند القبور سماع پر اتفاق نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ طویل عبارت میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ: ''مگر انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں۔'' (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۰۰)

اور اس مسئلہ پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ بھی اتفاق نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں: ''کیونکہ روضہ مبارک پر جو درود شریف پڑھا جاتا ہے وہ بالاتفاق بلا واسطہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش ہوتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سنتے اور جواب دیتے ہیں۔'' (امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۱۱۰)

اور جن بزرگوں کے نام جناب نیلوی صاحب اور جناب قاضی صاحب نے مصدقین میں درج کئے ہیں ان میں سے ایک بزرگ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عند القبر سماع کے منکر نہیں بلکہ سبھی حضرات مقر ہیں اور حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ اگرچہ عام اموات کے سماع میں اختلاف کرتے ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عند القبر سماع کو پرزور الفاظ میں ثابت کرتے ہیں جن کا مفصل حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔

رابعاً: اگر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے اس فتویٰ میں جو مولوی محمد کرامت اللہ خان کے رد میں انہوں نے تحریر فرمایا ہے: الموتیٰ سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ دوسرے عام اموات مراد ہوں تو ان کے سماع اور عدم سماع میں واقعی اختلاف ہے۔ اکابر علماء دیوبند میں سماع کے قائل بھی ہیں جن میں حضرت نانوتوی، حضرت تھانوی، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی وغیرہم (رحمہم اللہ) حضرات سرفہرست ہیں اور وہ زوردار الفاظ میں سماع کا اثبات کرتے ہیں جن کی مفصل عبارات سماع الموتیٰ میں باحوالہ درج ہیں۔ ان کو منکرین میں شامل کرنا خالص سینہ زوری ہے اور ان میں منکر بھی ہیں جیسے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ وغیرہ حضرات۔

محترم جناب قاضی صاحب نے (سماع الموتیٰ ص ۳۲۷، ۳۲۸) میں (فتاویٰ رشیدیہ ج ۲ ص ۹۳) کے حوالہ سے درج شدہ ذیل کی عبارت کا بھی نام تک نہیں لیا اور اس کو بھی ہضم کر گئے ہیں جس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ ''پس تلقین اسی مذہب پر مبنی ہے۔ کیونکہ اوّل زمانہ قریب دفن کے بہت سی روایات اثبات سماع کرتی ہیں اور حضرت امام اعظم رحمہ اللہ سے اس باب میں کچھ منصوص نہیں۔'' حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی ایسی صریح عبارت کی موجودگی میں یہ دعویٰ کرنا کہ آپ کلیۃً سماع موتیٰ کا انکار کرتے ہیں نرا تعصب ہے۔

عزیز الفتاویٰ

محترم جناب سجاد بخاری اور نیلوی صاحب کے مارے ہوئے شکار سے استفادہ کرتے ہوئے جناب قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں اور چونکہ موصوف نے مفتی دارالعلوم حضرت مفتی عزیز الرحمن رحمہ اللہ کی عبارت نقل کرنے کے بعد لگائی ہے (کہ فتاویٰ غرائب کا جو حوالہ منکرین سماع موتیٰ حضرت امام صاحب رحمہ اللہ کی طرف نسبت کرتے ہیں وہ بے اصل ہے۔ صفدر) اس لئے ان کا فیصلہ بھی سن لیں۔

وہ (عزیز الفتاویٰ ص ۵۸۳) میں لکھتے ہیں کہ سماع موتیٰ ثابت نہیں بلکہ عدم سماع پر نص قطعی وارد ہے: ''قال اللہ تعالٰی و ما انت بمسمع من فی القبور و قال اللہ تعالٰی انک لا تسمع الموتی'' اب آپ اندازہ کریں کہ جب حضرت مفتی صاحب مرحوم ان کو عدم سماع پر نص قطعی قرار دیتے ہیں تو خود سماع کا قول کر کے نص قطعی کا خلاف کریں گے؟ آپ کو اختیار ہے کہ آپ مفتی صاحب مرحوم پر جرح کریں زور شور سے ان کا رد کریں اور یہ کہیں کہ مفتی صاحب کا اس آیت کو عدم سماع موتیٰ پر دال نص قطعی کہنا غلط ہے۔ اس کے دلائل دیں۔ دلائل سے ان کے قول کی تردید کریں۔ آپ کے لئے میدان وسیع ہے کون منع کرتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ ان کے اقوال کی تحریف کر کے جو مسلک ان کا نہیں ان کے ذمے لگانا، یہ صریح خیانت اور بددیانتی ہے آپ اس سے پرہیز کریں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ پختہ دیوبندی بھی رہنا چاہتے ہیں اور حضرات اکابر دیوبند کے مسلک کے خلاف بھی کرنا چاہتے ہیں جو یقیناً عدم سماع موتیٰ کی ترجیح یا سماع موتیٰ کا چرچا کرنا خلاف دیانت اور خلاف احتیاط ہے۔ اس لئے آپ نے یہ باب التحریف والخیانت قائم کر رکھا ہے جو علمائے حق کے شایان شان نہیں بلکہ ان کے طرز زندگی سے کوسوں دور ہے۔　　(الشھاب ص ۱۱)

اور پھر آگے (ص ۱۶) میں لکھتے ہیں: ”(ص ۹۷) میں فرماتے ہیں یعنی فتاویٰ غرائب کو جو حوالہ منکرین سماع موتی حضرت امام صاحب رحمہ اللہ کی طرف نسبت کرتے ہیں وہ بے اصل ہے۔ شاباش:

ایں کار از تو آید ومرداں چنین کنند

یہ تمام اکابر حضرات اصل کو چھوڑ کر بے اصل کو لے رہے ہیں۔ اصل صرف آپ کو ہی سوجھا۔ اگر آپ کی یہ تحقیق ہے کہ یہ بے اصل ہے تو آپ اپنے ذمہ لگائیں۔ ان حضرات کی عبارات کی اپنی طرف سے تردید کریں تو آپ کی مرضی، مگر تحریف تو نہ کریں۔“

الجواب: محترم جناب قاضی صاحب جذبات کی رو میں بہہ گئے ہیں اور اصل بات کو سمجھنے کی قطعاً کوشش ہی نہیں کی اور خیر سے رونا ہماری فہم کا رو رہے ہیں کہ ہم بات نہیں سمجھتے یا تحریف اور بددیانتی سے کام لیتے ہیں۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ من ذالک و من سوء الفهم) ہم نے فتاویٰ دار العلوم کا حوالہ اس لئے نہیں پیش کیا کہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمہ اللہ سماع موتی کے قائل ہیں۔ حاشا وکلا! جیسا کہ جناب قاضی صاحب نے یہ لکھا ہے کہ اب آپ اندازہ کریں کہ جب حضرت مفتی صاحب مرحوم ان کو عدم سماع پر نص قطعی قرار دیتے ہیں تو خود سماع کا قول کر کے نص قطعی کا خلاف کریں گے؟ آپ کو یہ اختیار ہے کہ آپ مفتی صاحب مرحوم پر جرح کریں۔“

ہم نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ حضرت مفتی صاحب سماع موتی کے قائل ہیں۔ وہ اس اختلافی مسئلہ میں عدم سماع کے پہلو کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے ذمہ یہ لگانا کہ ہم حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کو سماع موتی کے قائل کہتے ہیں نرا بہتان ہے۔ ہم نے حضرت مفتی صاحب کی یہ عبارت ایک تو اس لئے نقل کی ہے کہ نیلوی صاحب کا یہ بے بنیاد دعویٰ ہے کہ اور عدم سماع موتی پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو گیا۔ (ندائے حق ص ۱۵۱)

ہم نے نیلوی صاحب کے اس باطل دعویٰ کی تردید کے لئے جہاں اور واضح اور صریح عبارات نقل کی ہیں وہاں (سماع الموتی ص ۸۸) میں فتاویٰ دار العلوم کی یہ مفصل عبارت بھی نقل کی ہے۔

الجواب: (۱ تا ۴) سماع موتی میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے ہے۔ بہت سے ائمہ سماع موتی کے قائل ہیں اور حنفیہ کی کتب میں بعض مسائل ایسے موجود ہیں (یعنی مسئلہ یمین۔ صفدر) جن سے عدم سماع موتی معلوم ہوتا ہے۔ مگر امام صاحب رحمہ اللہ سے کوئی تصریح اس بارہ میں نقل نہیں کرتے اور استدلال عدم سماع کا آیت: ”انک لا تسمع الموتی“ وغیرہ سے کرتے ہیں اور مجوزین کا استدلال حدیث: ”ماانت بمسمع منهم“ اور حدیث سماع قرع نعال سے ہے اور آیت مذکورہ کا یہ جواب دیتے ہیں کہ نفی سماع قبول کی ہے۔ غرض یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور قول فیصل ہونا اس میں دشوار ہے۔ پس عوام کو سکوت اس میں مناسب ہے۔ جب کہ علماء کو بھی اس میں تردد ہے اور دلائل فریقین موجود ہیں۔ (فتاویٰ دار العلوم مدلل و مکمل ج ۵ ص ۴۶۱ طبع دیوبند)

اور دوسرے اس لئے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے عدم سماع موتی کے بارے میں کوئی تصریح موجود نہیں ہے۔ اس فتویٰ کو نقل کر کے ہم نے یہ لکھا ہے کہ اس فتویٰ سے یہ امور بصراحت معلوم ہوتے ہیں۔

۱...... یہ مسئلہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تا ہنوز اختلافی چلا آرہا ہے۔

۲...... اور فریقین کے پاس دلائل موجود ہیں۔

۳...... فقہ حنفی کی کتب میں بعض مسائل سے عدم سماع موتی معلوم ہوتا ہے۔

۴...... لیکن حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارہ میں کچھ منقول نہیں (یعنی فتاویٰ غرائب کا جو حوالہ منکرین سماع موتی حضرت امام صاحب کی طرف نسبت کرتے ہیں وہ بے اصل ہے۔'' (سماع الموتی ص ۸۸و۸۹)

اور (سماع الموتی ص ۳۲۸) میں ہم نے فتاویٰ رشیدیہ اور فتاویٰ دارالعلوم کا یہ حوالہ نقل کر کے آخر میں لکھا ہے کہ ان تمام جاندار اور شاندار حوالوں سے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہوگئی کہ فتاویٰ غرائب کے اس حوالہ کا حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قطعاً کوئی ثبوت نہیں۔''

اب قارئین کرام ہی انصاف سے فرمائیں کہ ہم نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں کون سی خیانت اور بددیانتی کی ہے؟ اور کون سا باب التحریف والخیانت قائم کیا ہے؟ اور ہم نے کون سی بات ان کے ذمہ لگائی ہے جو انہوں نے نہیں فرمائی؟ حضرت قاضی صاحب کو خود انصاف سے کام لینا چاہئے کہ وہ ہم پر بلاوجہ خائن اور محرّف ہونے کا الزام اور بہتان لگاتے ہیں اور ساتھ ساتھ وعظ بھی فرماتے ہیں کہ یہ علمائے حق کے شایان شان نہیں ہے اور ان کی طرز زندگی سے کوسوں دور ہے۔ حضرت قاضی صاحب ہمیں تو آخرت اور قیامت کی فکر کا سبق سناتے ہیں مگر خود اس آخر عمر میں بھی اپنے حواریوں کو خوش کرنے کے لئے ہم پر بہتان تراشی کرتے ہیں۔

ثبوت قطعی اور دلالت قطعی میں فرق نہ کرنا

جناب قاضی صاحب کا یہ ارشاد بھی قابل توجہ ہے کہ وہ حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کا کہ: ''سماع موتی ثابت نہیں بلکہ عدم سماع پر نص قطعی وارد ہے۔'' یہ مطلب لیتے ہیں کہ: ''اور یہ کہیں کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اس آیت کو عدم سماع موتی پر دال نص قطعی کہنا غلط ہے۔'' جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کریمات کی دلالت عدم سماع پر نص قطعی ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو یہ فرماتے ہیں عدم سماع اور لاتسمع الموتی پر نص قطعی وارد ہے۔ اس میں کیا شک ہے۔ نصوص قرآنیہ تو تمام ہی قطعیات میں نزاع نص قطعی کے وارد ہونے کا نہیں ہے۔ نزاع اس میں ہے کہ اس معنی میں دلالت بھی نص قطعی ہے؟ خود حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی عبارت اس نکتہ کو حل کرتی ہے۔ ذیل کے امور ملاحظہ کریں:

۱...... یہ مسئلہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے تاہنوز اختلافی چلا آرہا ہے۔

۲...... بہت سے ائمہ سماع کے قائل ہیں۔ یعنی سماع موتی کے قائلین حضرات عدم سماع موتی پر ان آیات کی دلالت کو قطعی نہیں مانتے ورنہ ان کے مفہوم سے اختلاف کا کیا مطلب؟

۳...... عدم سماع والے انک لاتسمع الموتی وغیرہ سے استدلال کرتے ہیں۔ علماء کرام تو کیا مبتدی طالب علم بھی یہ جانتے ہیں کہ نص قطعی سے استدلال کرنے کا مفہوم اور ہے اور مطلوب معنی اور مراد پر اس نص کے قطعی طور پر دلالت کرنے کا مطلب اور ہے۔

۴...... مجوزین سماع موتی ''ماانتم باسمع منھم'' اور حدیث ''سماع قرع نعال'' سے استدلال کرتے ہیں۔یعنی اگران آیات کریمات کی عدم سماع موتی کے معنی پر دلالت قطعی ہوتو پھرایک توصحیح احادیث کا قرآن کریم کے مفہوم سے تعارض ہوگا اور دوسرے اگر قائلین سماع موتی عدم سماع کے معنی پر دلالت قطعی تسلیم کرتے تو اس سے اختلاف کرتے ہوئے احادیث سے استدلال نہ کرتے۔اس سے صاف عیاں ہوا کہ یہ حضرات عدم سماع موتی کے معنی پر اس کی دلالت کو قطعی نہیں مانتے۔

۵...... خود حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ قائلین سماع موتی کی طرف سے وکالت کرتے ہوئے آیت کا معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اس سے سماع قبول (اور سماع انتفاع کی نفی مراد لیتے ہیں۔اس سے صاف ظاہر ہوا کہ اس معنی کی بھی گنجائش ہے اور قطعی الدلالت معنی میں دوسرے معنی کا احتمال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۶...... غرض یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور قول فیصل ہونا اس میں دشوار ہے۔اگر حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک آیت مذکورہ کی عدم سماع کے معنی پر دلالت قطعی ہوتی تو فیصلہ کرنا بالکل سہل ہوتا۔اس میں کوئی دشواری نہ ہوتی اور یوں فرمادیتے کہ نص قطعی کی عدم سماع موتی کے معنی پر دلالت قطعی ہے۔اس لئے کسی اور معنی کی اس میں سرے سے گنجائش ہی نہیں ہے۔

۷...... عوام کو اس میں سکوت کرنا چاہئے جب کہ علماء کو بھی اس میں تردد ہے۔اگر عدم سماع موتی کے معنی پر دلالت قطعی ہوتی تو سکوت کا کوئی معنی نہیں کیونکہ قطعی معنی کے خلاف سکوت کا کیا مطلب ہے؟

۸...... اور دلائل فریقین موجود ہیں۔اس سے واضح ہوا کہ آیت کا یہ معنی قطعی نہیں ورنہ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت کے مقابلہ میں کوئی دلیل، دلیل ہی نہیں وہ نرا شبہ ہے، جو مردود ہے۔

ان تمام اندرونی قرائن سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ لاتسمع الموتی کا ثبوت اور درود تو قطعی ہے۔لیکن عدم سماع موتی کے معنی پر اس کی دلالت قطعی نہیں ہے۔مگر حیرت ہے کہ جناب قاضی صاحب دال کا لفظ بول کر دلالت کو قطعی قرار دیتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا جناب قاضی صاحب کے نزدیک حضرت نانوتوی رحمہ اللہ (بلکہ خود حضرت گنگوہی رحمہ اللہ بھی جو دفن کے فوراً بعد بہت سی احادیث کی روشنی میں سماع موتی کے قائل ہیں) حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب، حضرت تھانوی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا عبدالحق حقانی، حضرت مولانا عبدالحئی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوری وغیرہم (رحمہم اللہ) حضرات مسلکاً پختہ دیوبندی نہیں تھے جو عام موتی کے سماع کے قائل ہیں اور ان کی واضح اور صریح عبارات سماع الموتی میں مذکورہ ہیں جن سے قاضی صاحب نے بالکل آنکھیں بند کرلیں ہیں اور نہ تو کسی عبارت کا جواب دیا ہے اور نہ ہی ان کا ذکر تک کیا ہے تاکہ حواری بدظن نہ ہوجائیں۔کیا یہ سارے حضرات سماع موتی کے پہلو کو ترجیح دیتے ہیں یا عدم سماع کے پہلو کو؟ نیز آپ ان سے پوچھئے کہ سماع موتی کا چرچا کرکے خلاف دیانت اور خلاف احتیاط کام ان حضرات نے کیوں کیا ہے اور سماع موتی کا قول اختیار کرکے انہوں نے باب التحریف والخیانت کیوں قائم کیا ہے؟ کیا ان حضرات کی یہ کارروائی علمائے حق کے شایان شان ہے یا ان کی طرز زندگی سے کوسوں دور ہے؟

کیا حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب سماع موتی کے منکر تھے؟

محترم جناب قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ اب حضرت استاذ مکرم مولانا محمد انور شاہ صاحب مرحوم کی ایک عبارت ملاحظہ ہو۔ وہ عبارت یہ ہے: ''مشکلات القرآن (سورۃ البقرہ ص۹) بلکہ تحقیق آنست کہ معنی حیات تعلق روح بہدن است و در قبر اصلاً تعلق روح بہدن نیست بلکہ بقاء شعور وادراک رابعد از مفارقت از بدن تعبیر بحیات فرمودہ اند۔''

اسی تحقیق اور حقیقت کی بنا پر آپ نے فرمایا: ''ان الضابطة انماھو عدم السماع لکن المستثنیات فی ھذا الباب کثیرۃ'' (فتح الملہم ج ۲ ص ۴۷۹)

جس ضابطے اور اس عبارت کی تحریف مولانا ابوالزاہد نے ایسے بودے اور گندے طریقے سے کی ہے جس کی حد نہیں۔ اللہ کے بندے جس بزرگ کا یہ عقیدہ ہو کہ در قبر اصلاً تعلق روح بہدن نیست اس کے نزدیک ضابطہ عدم سماع نہ ہو تو اور کیا ہو۔ مولانا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔ کچھ خیال کریں۔ محدث اور صدر مدرس اور تحریفات اور خیانات کا یہ انبار الامان الامان! (ص ۲۰ و ۲۱)

اور (ص ۱۳) میں لکھتے ہیں کہ: ''مولانا موصوف ابوالزاہد سرفراز صاحب مصنف فیوضات حسینی نے باب التحریف والخیانت سے کام لے خوب بگاڑا ہے۔''

الجواب: محترم جناب قاضی صاحب نے فکر آخرت اور خدا خوفی سے بالکل بے نیاز ہو کر یہ تحریر فرمایا ہے ورنہ وہ کبھی ایسی لایعنی کارروائی نہ کرتے۔ ذیل کے امور دیکھیں۔

اوّل ہم نے (سماع الموتی ص ۱۷۰ تا ۱۹۰) میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کی سماع الموتی کے بارے میں متعدد صریح عبارتیں نقل کی ہیں جن سے لاجواب ہو کر جناب قاضی صاحب بلاوجہ طیش میں آ گئے ہیں۔ صرف چند عبارتیں ہم یہاں عرض کرتے ہیں۔ باقی آپ سماع الموتی میں ملاحظہ فرما لیں۔

۱...... ''قولہ السلام علیکم الخ ظاھر حدیث الباب وغیرہ من کثیر من الاحادیث یدل علی سماع الموتی واشھر علی السنة الناس ان الموتی لیس لھم سماع عند ابی حنیفة الی ان قال والمحقق ان اباحنیفة لا ینکر سمع الاموات وان خالف ابن الھمام وقال ان الموتی لا تسمع وان ذخیرۃ الحدیث تدل علی سمع الموتی'' آنحضرت ﷺ کا مردوں کو السلام علیکم کہنا۔ اس باب کی یہ حدیث اور اس کے علاوہ اور بہت سی حدیثوں کا ظاہر اسی کو چاہتا ہے کہ مردے سنتے ہیں اور کچھ لوگوں کی زبانوں پر یہ مشہور ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مردے نہیں سنتے۔ (پھر آگے فرمایا) اور تحقیقی بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سماع موتی کے منکر نہیں ہیں۔ اگرچہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے مخالفت کی ہے اور یہ کہا ہے کہ مردے نہیں سنتے۔ حالانکہ احادیث کا ذخیرہ سماع موتی پر دلالت کرتا ہے۔ (العرف الشذی ص ۳۵۳)

قارئین کرام! اس صریح عبارت کے پیش نظر انصاف سے فرمائیں کہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ سماع موتی کے قائل ہیں یا منکر ہیں؟ اور آپ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک کیا بیان فرماتے ہیں؟

۲...... حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ ''من بعثنا من مرقدنا'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ثم ان الایة ترد علی القائلین بنفی السماع لدلالته علی الرقاد ونفی العذاب ایضاً فما ذا یصنعون بھا فلا بدعلیھم ان

یذکروا لها وجها فینبغی لهم ان یطلبوا وجهاً لایة نفی السماع ایضاً فان العذاب کما انه متحقق کذالک السماع ایضاً متحقق فلا یغتر بامثال هذه النصوص فان لها وجوهاً ومعانی''

پھر اس آیت کریمہ کے پیش نظر ان لوگوں پر اعتراض وارد ہوتا ہے جو سماع کی نفی کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کے سونے پر بھی دلالت کرتی ہے اور نفی عذاب پر بھی تو وہ اس نفی عذاب سے کیا کریں گے؟ سو ان کے لئے ضروری ہے کہ اس آیت کریمہ کی کوئی توجیہ بیان کریں اور ان کے لئے یہ بھی مناسب ہے کہ آیت نفی سماع کے لئے بھی کوئی حل تلاش کریں۔ کیونکہ جس طرح ان کے لئے عذاب ثابت ہے۔ اسی طرح ان کے لئے سماع بھی ثابت ہے۔ سو ایسی نصوص سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ ان کے اپنی جگہ پر معانی اور توجیہات موجود ہیں۔ (فیض الباری ج ۳ ص ۳۱۹)

اس عبارت میں بھی تصریح موجود ہے کہ مردوں کے لئے سماع محقق اور ثابت ہے۔

۳...... حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب فرماتے ہیں: ''وقال الشیخ ان الموتی لا تسمع ویستثنی منه سمع قرع النعال والسلام علیکم اقول لو قلنا یسمع الموتی لا اشکال فانه ثبت بقدر مشترک تواتراً فی الحدیث ولا نتعرض الی التخصیصات المتکلفة وسیما اذا لم یرو الانکار عن ائمتنا الثلاثة''

اور شیخ ابن الہمام رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مردے نہیں سنتے مگر جوتیوں کی آواز کا سننا اور سلام کا سننا اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ کہیں کہ مردے سنتے ہیں تو اس میں سرے سے کوئی اشکال ہی نہیں کیونکہ قدر مشترک کے طور پر سماع موتی پر متواتر حدیثیں موجود ہیں اور ہم ان تخصیصات کے درپے نہیں ہوتے جو تکلفات پر مبنی ہیں۔ خصوصاً جب کہ سماع موتی کا انکار ہمارے تینوں اماموں سے وارد نہیں ہوا۔ (العرف الشذی ص ۳۵۳)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی یہ عبارت بھی بالکل واضح ہے کہ وہ حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ سے علمی طور پر رسہ کشی کرتے ہیں کہ وہ ضابطہ عدم سماع قرار دیتے ہیں۔ لیکن سماع قرع النعال اور السلام علیکم کو اس سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قدر مشترک متواتر حدیثیں سماع موتی پر دال ہیں۔ پھر ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہم استثناء اور تخصیص کے اس تکلف میں پڑیں، جب کہ ہمارے تینوں ائمہ کرام یعنی حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد (رحمہم اللہ) (جن پر فقہ حنفی کی مدار ہے) سے سماع موتی کا انکار ثابت نہیں ہے۔

۴...... حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''واما الشیخ ابن الهمام فجعل الاصل هو النفی وکل موضع ثبت فیه السماع جعله مستثنی ومقتصراً علی المورد قلت اذاً ما الفائدة فی عنوان النفی وما الفرق بین نفی السماع ثم الاستثناء فی مواضع کثیرة وادعاء التخصیص وبین اثبات السماع فی الجملة مع الاقرار بانا لا ندری ضوابط اسماعهم فان الاحیاء اذا لم یسمعوا فی بعض الصور فمن ادعی الطرد فی الاموات ولذا قلت بالسماع فی الجملة'' (فیض الباری ج ۲ ص ۴۶۷)

بہرحال شیخ ابن الہمام رحمہ اللہ نے اصل اور ضابطہ نفی سماع قرار دیا ہے اور وہ ہر ایسی جگہ جہاں سماع ثابت ہے۔ (مثلاً سماع قرع النعال اور سلام وغیرہ) اس کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں اور اس کو اپنے مورد پر بند کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ پھر اس وقت نفی کے عنوان کا کیا فائدہ؟ اور کیا فرق نکلے گا نفی سماع کا اور پھر بہت سی جگہوں میں استثناء اور ادّعاء تخصیص کا اور فی الجملہ اثبات سماع کا؟ باوجود اس اقرار کے کہ ہم مردوں کو سنانے کے ضابطوں کو نہیں

جانتے۔ کیونکہ بسا اوقات زندہ لوگ بھی بعض صورتوں میں نہیں سنتے۔ پس مردوں میں ہمہ وقت سننے کا کون دعویٰ کرسکتا ہے؟ اور اسی لئے میں فی الجملہ سماع موتی کا قائل ہوں۔

یہ عبارت بھی بالکل روشن ہے کہ حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ ضابطہ اور اصل عدم سماع قرار دیتے اور سماع قرع النعال اور السلام علیکم وغیرہ کو اس سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ ان سے اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پھر نفی سماع موتی اور بہت سی جگہوں میں سماع کو اس سے مستثنیٰ کرنے اور تخصیص کرنے کا کیا فائدہ نکلے گا اور اس ضابطہ کا معیار و مقیاس کیا ہے؟ جب کہ زندہ آدمی بھی جب اس کی توجہ نہ ہو بات نہیں سنا کرتا تو مردوں میں ہمہ وقت سماع کا کوئی دعویٰ کرتا یا سکتا ہے؟ اور صاف فرماتے ہیں کہ میں سماع موتی کا قائل ہوں۔

اب ہم اہل علم کو علم کا واسطہ دے کر پوچھتے ہیں کہ کیا حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب فی الجملہ سماع موتی کے قائل ہیں یا منکر؟ اور کیا آپ ضابطہ عدم سماع بیان کرتے ہیں یا اس ضابطہ کو توڑتے ہیں؟ اور کیا ہم نے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارات میں تحریفات اور خیانات کا انبار لگایا ہے یا محترم جناب قاضی صاحب ہم پر محرف اور خائن ہونے کا صریح بہتان لگا رہے ہیں؟ یہ فیصلہ قارئین کرام پر ہے۔

اور یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ کسی مصنف کی کسی مجمل عبارت کو خود اس کی مفصل عبارات کی روشنی میں حل کرنا اگر بودا اور گندا طریقہ ہے تو مضبوط اور ستھرا طریقہ علمی طور پر دنیا میں کون سا ہے؟ خدارا انصاف سے فرمائیں کہ محترم جناب قاضی صاحب نے اس پیرانہ سالی میں یہ کیا فرما دیا؟ حضرت شاہ صاحب کی مزید عبارات سماع الموتی میں زیادہ مفصل طور پر ذکر کی گئی ہیں جن سے لاجواب ہو کر محترم قاضی صاحب انہیں تحریفات اور خیانات کے انبار سے تعبیر کر کے اور بودے اور گندے طریقے سے ذکر کر کے جان چھڑانا چاہتے ہیں جو علماء کی شان سے کوسوں دور ہے۔

۵...... ہم نے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے مفصل حوالے سماع الموتی میں بیان کر کے لکھا ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے بیان اور تقریر کو پیش نظر رکھتے ہوئے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فتح الملہم کی اس عبارت میں ان کا صحیح مفہوم ادا نہیں کیا جاسکا۔ وھذا معنی ما قالہ الشیخ الانور ان الضابطۃ انما ھو عدم السماع لکن المستثنیات فی ھذا الباب کثیرۃ! (فتح الملہم ج ۲ ص ۴۷۹)

اور یہ معنی ہے جو کچھ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ ضابطہ تو عدم سماع ہے لیکن اس باب میں بہت سی اشیاء (مثلاً سلام وغیرہ) اس ضابطہ سے مستثنیٰ ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تقریر سے ظاہر ہے کہ وہ یہ ضابطہ تسلیم اور بیان نہیں فرما رہے بلکہ یہ ضابطہ انہوں نے حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے اور پھر اس پر گرفت کی ہے اور ان سے رسہ کشی کرتے ہوئے ان پر مضبوط علمی تنقید کی ہے۔ جیسا کہ ان کی تقریر سے بالکل ظاہر ہے اور یہ کسی بھی اہل علم پر مخفی نہیں۔ باقی مجذوبوں کو سمجھانا مشکل ہے۔ (سماع الموتی ص ۱۷۹)

الغرض فتح الملہم کی اس عبارت میں سقم اور فروگزاشت ہے۔ اصل عبارت یوں ہونی چاہئے: ”وھذا معنی ما قالہ الشیخ الانور ناقلاً عن ابن الھمام ان الضابطۃ“

الحاصل یہ ضابطہ شیخ ابن الہمام رحمہ اللہ کا بیان کردہ ہے۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ اس سے قطعاً متفق نہیں ہیں۔ جیسا کہ بالکل عیاں ہے۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ان صریح عبارات

میں سماع موتی کا کھلے اور زوردار الفاظ میں سماع موتی کا اثبات اور اقرار بھی ملاحظہ کریں اور جناب قاضی صاحب کی یہ سینہ زوری بھی دیکھ لیں۔ وہ فرماتے ہیں: ''اور شاہ صاحب مرحوم کی عبارت میں یہ تصریح اظہر من الشمس ہے دیکھولو وانکر ھا حنفیۃ العصر اس کا کیا معنی؟ انکار کیا انکار کیا یہ (یعنی ابوالزاہد محمد سرفراز) کہہ رہے ہیں کہ اقرار کیا کہہ رہے ہیں۔'' (بلفظہ الشہاب ص ۶۸) معاف رکھنا حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انکار سماع موتی اظہر من الشمس تو کیا ثابت ہوتا، ان کی عبارات میں انکار سماع موتی کی طرف ذرہ بھر اشارہ تک بھی موجود نہیں ہے بلکہ ان کی صریح عبارات سماع موتی پر نص ہیں۔ ہاں! ان کے ہم عصر کچھ احناف غلط فہمی کا شکار ہو کر یہ کہتے تھے کہ سماع موتی نہیں اور غالباً ان کے انکار کی وجہ وہ قول ہے جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بلاوجہ منسوب ہے کہ مردے نہیں سنتے۔ حالانکہ حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایسی کوئی چیز منقول نہیں جیسا کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ رشیدیہ میں اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عزیز الفتاویٰ میں اجمالاً اس کا تذکرہ فرمایا ہے اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ رسالہ حضرت ملا علی القاری واضح الفاظ میں اس کا رد کیا ہے کہ حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ یا آپ کے تلامذہ میں کوئی سماع موتی کا منکر ہو۔

دوم: حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''ثم السوال عندی یکون بالجسد مع الروح کما اشار الیہ صاحب الھدایۃ فی الایمان'' پھر سوال (قبر میں) میرے نزدیک جسم مع الروح سے ہوتا ہے جیسا کہ صاحب ہدایہ نے کتاب الایمان میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (فیض الباری ج ۱ ص ۱۸۵)

اس عبارت سے واضح ہوا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قبر میں سوال جسم مع الروح دونوں سے ہوتا ہے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ روح کا جسم سے تعلق ہو۔

۴...... خود حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی فرماتے ہیں کہ: ''ثم لاھل السنۃ قولان قیل ان العذاب للروح فقط وقیل للروح والجسد والمشھور الثانی اختارہ اکثر شارحی الھدایۃ وھو المختار وان صار البدن ذرۃ ذرۃ فان الشعور لکل شیٔ عند جمھور الائمۃ'' (العرف الشذی ص ۳۵۵)

پھر اہل سنت کے دو قول ہیں: ''ایک یہ عذاب صرف روح کو ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ روح اور جسم دونوں کو ہوتا ہے۔ مشہور یہی قول ہے اور ہدایہ کے اکثر شارحین نے اسی کو اختیار کیا ہے اور (میرے نزدیک بھی) یہی مختار ہے۔ اگرچہ بدن ذرہ ذرہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ کیونکہ جمہور امت کے نزدیک شعور ہر چیز کو ہے۔ یہ حوالہ بھی بالکل واضح ہے کہ قبر میں عذاب وراحت جسم اور روح دونوں کو حاصل ہے اور یہی قول حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مختار ہے یہ اور اس سے مزید صریح حوالے ہم نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے (تسکین الصدور ص ۱۸۹ تا ۱۹۴) میں نقل کئے ہیں۔ ان صریح حوالوں کی موجودگی میں یہ دعویٰ کرنا کہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ قبر میں جسم کے ساتھ روح کا کوئی تعلق نہیں مانتے، قطعاً غلط ہے۔

سوم: حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مشکلات القرآن میں جو عبارت نقل کی ہے وہ حضرت کی اپنی نہیں بلکہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے بلکہ ''تحقیق آنست'' سے لے کر ''فرمودہ اند'' کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں ''پس حمل حیات قبر برمجازیت متعین است لاغیر''

(تفسیر عزیزی ص ۱۷۶ برحاشیہ قرآن کریم وتسکین القلوب ص ۳۹)

اب ہم حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کی خود اپنی بے شمار عبارات میں سے جو ہم نے تسکین الصدور میں نقل کی ہیں چند نہایت اختصار سے یہاں عرض کرتے ہیں۔

۱...... زیرا کہ ارواح را تعلق بہ بدن خود کہ در قبر مدفون است البتہ میباشد زیرا کہ مدت دراز دریں بدن بودہ اند۔ (تفسیر عزیزی ج ۱ ص ۴۳ طبع مجتبائی دہلی)

اس لئے کہ ارواح کا اپنے ابدان کے ساتھ جو قبر میں مدفون ہیں۔ یقیناً تعلق ہوتا ہے کیونکہ مدت دراز تک وہ ارواح ان ابدان میں رہ چکی ہیں۔ یہ عبارت یہ بات واضح کرتی ہے کہ قبر میں بدن کے ساتھ روح کا باقاعدہ تعلق ہوتا ہے۔

۲...... وبالجملہ بعد ازاں کہ ثابت شد کہ روح باقی است و اورا تعلقے خاص با جزائے بدن بعد مفارقت از وے وتغیر کیفیت وے نیز باقی است کہ بداں علم وشعور بزائران قبر واحوال ایشاں دارد''

اور بالجملہ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ روح باقی ہے اور اس کا ایک خاص تعلق اجزائے بدن کے ساتھ اس سے مفارقت اور تغیر کیفیت کے بعد بھی باقی ہے کہ اس تعلق کی وجہ سے اس میں علم اور شعور ہوتا ہے جس سے قبر کی زیارت کرنے والوں اور ان کے احوال سے آگاہی ہوتی ہے۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۲ ص ۱۰۸ طبع مجتبائی دہلی)

یہ حوالہ بھی بالکل واضح ہے کہ قبر میں روح کا ایسا تعلق جس سے ادراک وشعور اور علم حاصل ہو بدستور باقی رہتا ہے جس سے زیارت کرنے والوں کی شناخت ہوتی ہے۔ نیز حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ مردوں کے دفن کرنے کی تائید اور جلانے کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

۳...... ونیز درسوختن بآتش تفریق اجزائے بدن است کہ بسبب آں علاقۂ روح از بدن انقطاع کلی مے پذیرد الیٰ قولہ ودر دفن کردن چوں اجزائے بدن بتمامہ یک جا میباشد علاقۂ روح بابدن از راہ نظر وعنایت بحال می ماند وتوجہ روح بزائرین ومستانسین ومستفیدین بسہولت میشود'' (تفسیر عزیزی پارہ عم ص ۶۱ طبع حیدری بمبئی)

اور نیز آگ میں جلانے سے بدن کے اجزاء متفرق ہو جاتے ہیں اور اس وجہ سے روح کا تعلق بدن سے کلی طور پر منقطع ہو جاتا ہے۔ (پھر آگے فرمایا) اور دفن کرنے میں چونکہ بدن کے اجزاء بتمامہا یک جا ہوتے ہیں۔ اس لئے روح کا بدن کے ساتھ تعلق از راہ نظر وعنایت اپنے حال پر رہتا ہے اور روح کی توجہ زیارت کرنے والوں اور انس حاصل کرنے والوں اور استفادہ کرنے والوں کی طرف آسانی سے ہوتی ہے۔

چونکہ مسلمان مردوں کو دفن کرتے ہیں، جلاتے نہیں۔ اس لئے اس عبارت کے پیش نظر ان کی ارواح کا ان کے ابدان کے ساتھ قبر میں تعلق ثابت ہے جس سے سلام وغیرہ کا سماع متحقق ہے۔

۴...... ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ روح آں میت را بقدریکہ ادراک وتألم وتلذذ از وحاصل شود بہ بدنے از ابدان عنصریہ موجودہ یا مثالیہ مخترعہ متعلق میسازد۔'' (تحفہ اثنا عشریہ ص ۳۸۴ طبع لکھنؤ)

اللہ تعالیٰ اس میت کی روح کو اس انداز سے کہ ادراک اور تکلیف اور لذت اسے حاصل ہو اور ابدان عنصریہ میں سے موجود بدن کے ساتھ یا (بصورت بدن عنصری کے جل جانے کے) ابدان مثالیہ مخترعہ سے متعلق کر دیتا ہے۔

اس عبارت سے بھی عیاں ہوا کہ ابدان عنصریہ سے بھی ارواح کا تعلق بدستور قائم رہتا ہے۔

۵...... وتعلقے بہ قبر نیز ایں ارواح رامیباشد کہ بحضور زیادت کنندگاں واقارب ودیگر دوستاں بر قبر مطلع ومستانس میگردند“
اور ان کا ارواح کا قبر کے ساتھ بھی تعلق ہوتا ہے کہ جو لوگ ان کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور جو ان کے اقارب اور دوسرے دوست حاضر ہوتے ہیں ان کی آمد سے وہ مطلع اور ان سے مانوس ہوتے ہیں۔ (تفسیر عزیزی پارہ ۳۰ ص ۱۲۵)

یعنی ارواح علیین میں ہوں یا سجین میں ان کا ابدان کے ساتھ قبر میں بدستور تعلق رہتا ہے جس سے انہیں ادراک وشعور اور علم حاصل ہوتا ہے اور زیارت کرنے والوں کے حالات سے بصورت سلام وکلام یا عرض اعمال وہ مطلع ہوتے رہتے ہیں اور اموات کے لئے یہ ادراک وشعور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک اس قدر اور اتنا واضح اور ضروری ہے کہ وہ لکھتے ہیں: ”بالجملہ انکار شعور وادراک اموات اگر کفر نباشد در الحاد بودن او شبہ نیست۔“
(فتاویٰ عزیزی ج ا ص ۸۸)

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر اموات کے ادراک وشعور کا انکار کفر نہ ہو تو اس کے الحاد ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔

۶...... ”در قبر احیاء واماتت حقیقیہ نیست بسبب انعکاس اشعہ روح بر بدن تعلقے پیدا می شود کہ تغذیہ تنمیہ بدن ہمراہ آن نمی باشد تا معنی حیات متحقق باشد۔“ (تحفۂ اثناعشریہ ص ۳۸۲)

قبر میں زندہ کرنا اور مارنا حقیقی نہیں (بلکہ) بدن پر روح کی شعاعوں کے عکس اور پرتو پڑنے کے سبب سے روح کا بدن کے ساتھ ایک تعلق پیدا ہو جاتا ہے کہ حاجت خوراک اور بدن کی نشو ونما کی اس کے ساتھ نہیں ہوتی۔ تاکہ (حقیقی) حیات کا معنی متحقق ہو۔

دنیا کی ظاہری، حقیقی اور حسی حیات میں عادۃً کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے اور بدن نشو ونما پاتا ہے لیکن حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قبر میں روح کے تعلق اور عکس سے گو حیات حاصل ہوتی ہے جس سے ادراک وشعور اور علم ہوتا ہے۔ لیکن بدن کو حسی خوراک کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ بدن نشو ونما پاتا ہے۔

۷...... ”آرے روح را برائے تألم وتلذذ جسمانی واعمال حواس تعلقے بہ بدن خودش یا بہ بدن دیگر مثالی ورائے تعلق تدبیر وتصرف وتغذیہ وتنمیہ خواہند داد وحاصل آنکہ چوں روح از بدن جدا شد قوائے نباتی از وجدا میشود نہ قوائے انسانی وحیوانی۔“ (تحفۂ اثناعشریہ ص ۳۸۴)

ہاں! روح کا جسمانی دکھ اور لذت اٹھانے اور حواس کے اعمال کے لئے اپنے بدن (عنصری) کے ساتھ یا بدن مثالی کے ساتھ ایک تعلق ہوتا ہے لیکن یہ تعلق اس تعلق کے علاوہ ہے جس سے بدن کی تدبیر اور تصرف اور خوراک رسانی اور نشو ونما ہو اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب بدن سے روح الگ ہو جاتی ہے تو نباتی (بڑھنے اور نشو ونما والی قوتیں) اس سے جدا ہو جاتی ہیں نفسانی اور زندگی کی قوتیں اس سے جدا نہیں ہوتیں۔

یعنی روح کا بدن سے حیات اور ادراک وشعور والا تعلق تو ہوتا ہے لیکن اس تعلق سے بدن کی تدبیر خوراک کی ضرورت اور نشو ونما والا تعلق نہیں ہوتا، جہاں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ روح کے بدن سے تعلق کی اصلاً نفی کرتے ہیں۔ اس سے یہی بدن کی تدبیر تغذیہ اور تنمیہ والا تعلق ہے۔ باقی ادراک وشعور والے تعلق کی نفی کو وہ کم از کم الحاد کہتے ہیں جیسا کہ بیان ہوا۔ تحفۂ اثناعشریہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی اپنی تصنیف نہ بھی ہو تاہم یہ

کتاب ان کی مصدقہ ضرور ہے۔ لہٰذا جناب قاضی صاحب کا یہ فرمانا کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے تو خود لکھ دیا کہ تحفہ اثنا عشریہ میری تصنیف نہیں ایک افغانی عالم کی تصنیف ہے۔ میں نے صرف اس کو ترتیب دی ہے۔ (ملخصًا الشہاب ص ۸۴)

چہارم: ہم نے تفصیل سے عرض کر دیا ہے کہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بلکہ تحقیق آنست الخ کی عبارت بعینہا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ سے نقل کی ہے اور انہی کی پیروی میں یہ فرماتے ہیں اور ان کے ہاں بھی ''و در قبر اصلاً تعلق روح بہ بدن نیست'' کا وہی مطلب ہے جو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کا ہے جن کی واضح عبارتیں عرض کر دی گئی ہیں۔ اگر یہ مطلب نہ ہو بلکہ وہ مطلب ہو جو حضرت قاضی صاحب سمجھتے اور بیان کرتے ہیں تو یقیناً یہ مطلب حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اپنی صاف اور روشن عبارات کے خلاف ہے جیسا کہ کسی بھی اہل علم پر یہ مخفی نہیں۔ خوب ٹھنڈے دل سے علمائے کرام کو اور خود جناب قاضی صاحب کو اس پر غور کرنا چاہئے اور خود قاضی صاحب کی نقل کردہ عبارت میں یہ لفظ موجود ہیں۔

بلکہ بقاء شعور و ادراک روح را بعد از مفارقت از بدن تعبیر بہ حیات فرمودہ اند۔ الخ بلکہ بدن سے جدا ہونے کے بعد روح کے شعور اور ادراک کے باقی رہنے کو حیات سے تعبیر کر دیا ہے۔

ظاہر امر ہے کہ اگرچہ روح کا بدن سے تدبیر و تغذیہ و تنمیہ والا تعلق نہیں لیکن ادراک و شعور والا تعلق تو ہے اور اسی کا نام حیات اور جب ادراک و شعور ہے تو سماع کیوں نہیں۔

نری خوش فہمی یا مجذوبانہ بڑ

بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ یہ بات تسکین الصدور، سماع الموتی اور اسی پیش نظر کتاب میں عرض کر دی گئی ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے عند القبور سماع میں امت مسلمہ کا کوئی اختلاف نہیں رہا۔ اس اختلاف کے موجد دنیا میں سب سے پہلے شخص جناب سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری گجراتی ہیں۔ ہاں! عام اموات کے سماع اور عدم سماع کے بارے میں قرن اوّل سے تاہنوز اختلاف چلا آ رہا ہے۔ منکر بھی ہیں اور قائل بھی لیکن اکثر امت اور ہر مسلک اور ہر طبقہ کے علمائے کرام سماع کے قائل ہیں اور حضرات اکابر علماء دیوبند میں بھی اکثریت سماع کی قائل ہے۔ حوالے کچھ تو اس کتاب میں اور اکثر سماع الموتی میں عرض کر دیئے گئے ہیں۔ مگر مجذوب نیلوی صاحب نے شیخ چلّی کا پلاؤ کھا کر ایک اختراعی فہرست تیار کی ہے جس میں پہلی صدی سے لے کر اس وقت تک کے اکابر کے نام درج کئے ہیں کہ یہ سب حضرات سماع موتی کے منکر ہیں۔ بلاشبہ ان میں سے بعض حضرات سماع موتی کے منکر ہیں اور ہمیں سب کی عبارات اصل کتابوں میں دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور سماع موتی کی واضح اور صریح عبارات کی موجودگی میں اس جستجو کی ضرورت بھی نہیں سمجھی گئی۔ لیکن حیرت، تاسف اور تعجب تو اس امر پر ہے کہ جناب نیلوی صاحب نے سینہ زوری سے بہ جبر سماع موتی کے قائلین حضرات کو بھی منکرین سماع موتی کی گاڑی پر سوار کر دیا ہے اور عوام کو دھوکا دینے کی خاطر تکثیر سواد کا بالکل ہی ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور اٹھا رہے ہیں اور اس غلط بیانی پر سختی سے مصر ہیں۔

چنانچہ وہ (ندائے حق ص ۱۵۳) میں مطلقاً سماع موتی کے منکرین میں حافظ ابن الہمام، علامہ ابن القیم، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن کثیر، علامہ آلوسی، قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی، شاہ محمد اسحاق، قاضی خان، شامی، مصنفین

فتاویٰ عالمگیری، ملا علی القاری علامہ بحر العلوم، مولانا نانوتوی اور مولانا تھانوی وغیرہ (رحمہم اللہ) حضرات کے نام بھی پیش اور نقل کرتے ہیں جو بالکل واقع کے خلاف ہے اور ہم نے ان حضرات کی عبارتیں سماع الموتیٰ میں عرض کر دی ہیں اور مجذوب نیلوی صاحب نے (البیان الاوفی ص ۳۰ تا ۳۳) تک میں جو نام بھی انہیں کہیں سے دستیاب ہو سکے ہیں وہ انہوں نے منکرین سماع موتیٰ میں جڑ دیئے ہیں۔ مثلاً حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، علامہ عینی، علامہ علی القاری، حافظ ابن کثیر، علامہ آلوسی، قاضی ثناء اللہ صاحب، مولانا نانوتوی، مولانا گنگوہی، مولانا سید محمد انور شاہ صاحب، مولانا عثمانی (رحمہم اللہ) وغیرہ وغیرہ حضرات اور یہ نری کذب بیانی ہے اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ ان حضرات کے کچھ حوالے اسی کتاب میں اور کچھ سماع الموتیٰ میں بڑی وضاحت سے درج ہیں۔ وہیں ملاحظہ کرلیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اور خصوصاً علماء کو سچ بولنے کی توفیق بخشے اور جھوٹ وفریب کاری سے بچائے۔ آمین ثم آمین!

بلغۃ الحیران[1] کا حوالہ

ہم نے (سماع الموتیٰ ص ۱۶۸) میں پہلے حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمہ اللہ سے موضح القرآن کے حوالہ سے یہ عبارت نقل کی ہے اور حدیث میں ہے کہ: ''مردوں سے سلام علیک کرو۔ وہ سنتے ہیں اور بہت جگہ مردے کو خطاب کیا گیا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ مردے کی روح سنتی ہے اور قبر میں پڑا ہے دھڑ وہ نہیں سن سکتا۔'' اس کے بعد ہم نے (ص ۱۶۸) میں بلغۃ الحیران (ص ۲۵۷) کے حوالہ سے یہ عبارت نقل کی ہے: ''اور تحقیق سماع موتیٰ کے متعلق یہ ہے کہ بدن نہیں سنتے جیسا کہ اس آیت (فانک لا تسمع الموتی) کی سے معلوم ہوتا ہے اور باقی آیات بھی دال عدم سماع موتیٰ پر ہیں اور روح زندہ ہے وہ سنتا ہے جب قریب ہو۔ ہاں! نزاع امام صاحب رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا اس بات میں ہے کہ آیا روح قبور کے نزدیک ہے یا علیین میں۔ باقی پوری تحقیق کا یہ مقام نہیں۔'' اس کے بعد ہم نے لکھا ہے کہ اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ قبر کے قریب اگر کوئی سلام وغیرہ کرے تو حضرت مرحوم کے نزدیک روح سنتی ہے۔ غور فرمایئے کہ فی الجملہ سماع موتیٰ کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ باقی روح اگر علیین میں بھی ہو تو جمہور اہل السنۃ کے نزدیک اس کا تعلق قبر میں اس کے بدن کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ (تسکین الصدور ملاحظہ کریں)

---

[1] بلغۃ الحیران فی ربط آیات الفرقان حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ کی املائی تفسیر ہے جس کو ۱۳۴۹ھ میں مولانا سید نذر شاہ صاحب رحمہ اللہ (ملاحظہ ہو بلغہ ص ۱) اور مولانا غلام اللہ خان صاحب رحمہ اللہ (ملاحظہ ہو ص ۴) نے ضبط کیا ہے جس کی بعض عبارات پر مثلاً (ص ۱۵۷) کل فی کتاب مبین الخ کی عبارت پر عرصہ دراز سے اہل بدعت اعتراض کرتے ہیں جس کے جواب کی جناب قاضی صاحب کو توفیق نہیں ہوئی۔ وہ صرف اسی پر خوش ہیں کہ حضرت صاحب رحمہ اللہ سے قرآن کریم پڑھا، سراجی پڑھی، درالمعارف اور مسلم ومثنوی کا کچھ حصہ پڑھا اور چوبیس سال ان کی خدمت میں جاتے رہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ راقم اثیم بھی حضرت کا خوشہ چین اور خاتم المریدین ہے اور ہدایت المرتاب میں ہم نے حضرت مرحوم کی عبارات کی روشنی میں اس کا مسکت جواب دیا ہے۔ طلباء کرام حضرت مرحوم کا ایک اور حوالہ بھی دیکھ لیں۔

عالم بمعلومات غیر متناهیة قادر بمقدورات غیر متناهیة خلاف ما ادعت المعتزلة من ان کل ذالک متناهیة (تحریرات حدیث ص ۲۵۸) اللہ تعالیٰ غیر متناہی معلومات کا عالم اور غیر متناہی مقدورات پر قادر ہے۔ بخلاف اس کے معتزلہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ متناہی ہے۔

خود امام الائمہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ) المتوفی ۱۵۰ھ اپنی کتاب فقہ اکبر میں تصریح فرماتے ہیں کہ: ''اعادة الروح الی العبد فی قبرہ حق'' (الفقہ الاکبر مع الشرح لعلی القاری ص ۱۲۰ طبع کانپور)

قبر میں روح کا بندے کی طرف لوٹایا جانا حق ہے۔

اور کیوں حق نہ ہو جب صحیح احادیث سے اعادۂ روح الی البدن ثابت ہے۔ (تفصیل کے لئے تسکین الصدور دیکھئے) تو حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھلا ان صریح اور صحیح احادیث کی مخالفت کیسے کر سکتے تھے؟ ہم نے البیان الازہر کے مقدمہ میں محققین علمائے اسلام کے حوالہ سے یہ بات عرض کر دی ہے کہ الفقہ الاکبر حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہی تالیف[۱] ہے۔ یہ دعویٰ کرنا کہ ان کی کتاب ہی نہیں تحقیق اور انصاف سے کوسوں دور ہے۔ (سماع الموتی ص ۱۶۸)

ہماری اس مفصل عبارت کو بھی دیکھیں اور جناب قاضی صاحب کا بلاوجہ واویلا بھی ملاحظہ کریں۔ وہ لکھتے ہیں اور تو اور آپ نے تو حضرت مولانا و مرشدنا حسین علی نور اللہ مرقدہٗ کی عبارت کو بھی تحریف اور خیانت سے نہیں بخشا۔ وہ فرماتے ہیں جسم مردہ نہیں سنتا روح قریب ہو تو سنتا ہے بعید ہو تو نہیں سنتا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف اس میں ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک روح قبر کے پاس رہتی ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک علیین میں ہے۔ اب اس کا صاف مطلب ہے کہ جب کوئی قبر پر جا کر بات کرے گا تو روح سن لے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس لئے کہ روح قریب ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نہیں سنے گا اس لئے کہ وہ روح سے اور قبر کے پاس کھڑا ہو کر بات کرنے والے سے دور ہے، علیین میں ہے۔

اب جناب اس میں کیا تحریف کرتے ہیں کہ قریب اور بعید کو صفت قبر کی بناتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جب کوئی قبر کے پاس بات کرے گا تو مردہ سن لے گا۔ یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر اس لئے کہ قریب ہے۔ یہ خلاصہ ہے آپ کی تحریف اور خیانت کا۔

اب مولانا موصوف سے بہ ادب تمام التماس ہے کہ آپ نے حضرت مرحوم کی عبارت کا صحیح مطلب جو بالکل واضح ہے وہ سمجھا نہیں یا سمجھا ہے اور جان بوجھ کر اس میں تحریف کی ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو ہم جیسے درسی کتابوں کو دیکھنے والے محدود علم والے سمجھ گئے ہیں اور متبحر فی العلوم نہ سمجھے۔ اگر دوسری صورت ہے تو گزارش ہے کہ خدارا ان کی عبارت کو تو معاف کر دیتے۔ پھر ہم جو چوبیس برس حضرت مرحوم کی خدمت میں جاتے رہے،

---

[۱] مشہور محقق اور قدیم مؤرخ امام ابوالفرج محمد بن اسحاق بن ندیم رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۳۸۵ھ) لکھتے ہیں کہ: ''ولہ من الکتب الفقہ الاکبر و کتاب العالم والمتعلم'' یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات میں الفقہ الاکبر اور کتاب العالم والمتعلم بھی ہے۔ (الفہرست لابن ندیم ص ۲۹۹ طبع مصر) اور علامہ احمد بن مصطفیٰ المعروف بطاش کبریٰ زادہ الحنفی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۹۶۲ھ) لکھتے ہیں کہ الفقہ الاکبر اور العالم والمتعلم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہی تالیف ہے۔

وما قیل انہما یسالہ بل لابی حنیفة البخاری فمن اختراعات المعتزلة اور جو یہ کہا گیا ہے کہ یہ دونوں کتابیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی نہیں بلکہ ابوحنیفہ البخاری کی ہیں تو یہ معتزلہ کے اختراعات میں سے ہے۔ پھر آگے لکھتے ہیں کہ علامہ حافظ الدین البزازی، امام شمس الدین الکردری، فخر الاسلام البزدوی، شیخ عبدالعزیز البخاری (رحمہم اللہ) اور جماعت کثیرہ من المشائخ سب الفقہ الاکبر اور کتاب العالم والمتعلم کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف بتاتے ہیں۔ (مفتاح السعادة ج ۲ ص ۲۹)

حضرت سے قرآن کریم پڑھا، سراجی پڑھی، درالمعارف پڑھی، کچھ حصہ مسلم کا پڑھا، کچھ حصہ مثنوی مولانا روم کا پڑھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ان کا کیا نظریہ تھا اور وہ کیا فرماتے تھے اور آپ کو گھر بیٹھے معلوم ہو گیا:

ان کنت لا تدری فذاک مصیبة   وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

مولانا! اگر اتنی واضح عبارتیں بھی آپ نہیں سمجھتے تو مصیبت ہے اور اگر سمجھ کی تحریف اور خیانت کرتے ہیں تو اور بڑی مصیبت۔ جناب ہم بھی اساتذہ کرام کے اقوال کا کئی جگہ خلاف کرتے ہیں۔ لیکن ان کے اقوال کی تحریف نہیں کرتے۔'' (الشہاب ص۱۶ و۱۷) آگے (۱۷ تا ۲۰) تک چھ مثالیں اپنے اساتذہ کرام کے ساتھ اختلاف کی بیان کی ہیں۔ علمی طور پر ان پر خاصی اور قوی گرفت ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم غیر متعلق امور میں الجھنا اور قارئین کرام کو الجھانا پسند نہیں کرتے۔

الجواب:

نالۂ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر   اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی

قارئین کرام! ذیل کے امور کو ٹھنڈے دل سے ملاحظہ کریں تا کہ آپ بات کی تہہ کو پہنچ سکیں۔

۱...... حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ نے اپنی صوابدید کے مطابق قرآن کریم اور حدیث شریف میں تطبیق کی یہ صورت پیدا کی کہ قرآن کریم میں عدم سماع اس پر محمول ہے کہ جسم اور دھڑ نہیں سنتا اور حدیث سے جس سماع کا ثبوت ہے وہ روح کے سننے پر محمول ہے اور ان کی عبارت میں قبر کا لفظ بھی صراحۃً موجود ہے۔

۲...... حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ نے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ ہی کی پیروی میں یہ لکھا ہے کہ روح سنتی ہے اور دھڑ نہیں سنتا۔

۳...... حضرت مرحوم عبدالقبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کے قائل ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی خود نوشت تالیف میں حدیث سے استدلال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: ''عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال مامنکم احد یسلم علیّ الّا ردّ اللہ علیّ روحی حتی ارد علیہ السلام'' (تحریرات حدیث ص۲۱۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص بھی مجھ پر سلام نہیں کہتا مگر اللہ تعالیٰ مجھ پر تو جہ لوٹا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

اور نیز لکھتے ہیں: ''عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلّی عند قبری سمعتہ و من صلّی علیّ نائیاً ابلغتہ'' (رواہ البیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ ص ۱۵۲، تحریرات حدیث ص۲۱۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے میری قبر کے پاس درود شریف پڑھا تو میں خود سنتا ہوں اور جس نے دور سے درود شریف پڑھا تو وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے۔

حضرت مرحوم نے یہ حدیثیں پیش کی ہیں اور ان سے باقاعدہ استدلال کیا ہے جس سے صاف طور پر عیاں ہے کہ سماع قبر کے پاس سے ہوتا ہے نہ کہ علیین میں اور علیین تک جانے کی زندوں کے پاس رسائی ہی کہاں ہے۔

۴...... ہم نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی اپنی کتاب الفقہ الاکبر کا حوالہ دیا ہے کہ قبر میں جسم کے اندر روح لوٹائی جاتی ہے۔ محترم جناب قاضی صاحب اس حوالے کو لاجواب ہو کر بالکل پی گئے ہیں اور اس کا ذکر تک نہیں کیا

اور (۴۶) میں صرف یہ تحریر فرما کر گلو خلاصی چاہی ہے کہ اس قبر سے مراد یہ گڑھا ہرگز نہیں بلکہ عالم برزخ ہے۔ خلط ملط نہ کریں۔ بلفظہٖ! ہم نے (تسکین الصدور ص۸۱ تا ۸۳) میں قرآن کریم اور حدیث شریف کے واضح اور ٹھوس حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ قبر کا حقیقی معنی یہی گڑھا ہے۔ پھر (ص ۸۴) میں قبر کا مجازی معنی بیان کیا ہے۔ مگر اس کا کوئی جواب ابھی تک نہیں ملا۔

اگرچہ روح کا مستقر علیین یا سجین ہے لیکن روح کا جسم کے ساتھ باقاعدہ تعلق ہوتا ہے جس سے علم ادراک، شعور اور الم و راحت حاصل اور محسوس ہوتی ہے۔ ہم نے بفضلہٖ تعالیٰ اس کی مفصل اور سیر حاصل بحث تسکین الصدور میں کر دی ہے۔ اب اختصاراً صرف فتاویٰ دار العلوم کے دو حوالے عرض کرتے ہیں۔

سوال نمبر ۳۱۲۳: مرنے کے بعد عذاب روح کو ہوتا ہے یا جسم کو؟ یا دونوں کو؟

الجواب: (۱) قبر میں بھی روح کا تعلق رہتا ہے اور مستقر اصل اس کا علیین یا سجین ہے۔ (۲) عذاب روح پر مع جسم کے ہوتا ہے۔ جیسا کہ ظاہر احادیث سے ثابت ہے۔ فقط! (فتاویٰ دار العلوم مدلل و مکمل ج پنجم ص ۴۲۶، ۴۲۷، دیوبند)

سوال نمبر ۲۱۹۴: مرنے کے بعد جو سوال وغیرہ ہوتے ہیں تو روح مرنے کے بعد آسمان پر چلی جاتی ہے پھر قبر میں لائی جاتی ہے یا جسم میں بند کر دی جاتی ہے؟

الجواب: جسم سے روح کا تعلق رہتا ہے۔ فقط! (فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۵ ص ۳۶۲)

ان تمام صریح حوالوں سے ثابت ہوا کہ باوجود ارواح کے علیین یا سجین میں ہونے کے قبور میں اجسام کے ساتھ بھی ان کا باقاعدہ تعلق رہتا ہے اور حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''فیجوز ان یقع المسئلة والعذاب والنعیم ببعض جسد المومن والکافر دون بقیة اجزائه وقیل ان اللہ تعالٰی یجمع تلک الاجزاء المتفرقة للضغطة والمسئلة کمایفعل ذالک للحشر'' (تحریرات حدیث ص ۲۵۷)

سو جائز ہے کہ قبر میں سوال و عذاب اور راحت مومن اور کافر کے بعض جسم سے وابستہ اور متعلق ہو نہ کہ سب اجزاء سے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قبر کی تنگی اور سوال کے لئے ان متفرق اجزاء کو جمع کر دیتا ہے جیسا کہ وہ حشر کے دن ایسا کرے گا۔

حضرت مرحوم کی یہ عبارت اس بات پر صراحت سے دال ہے کہ مومن اور کافر کو قبر میں جو عذاب و راحت اور تنگی وغیرہ پیش آتی ہے اس میں جسم اور جسم کے متفرق اجزاء کا باقاعدہ تعلق ہوتا ہے۔ کیا جناب قاضی صاحب کے نزدیک یہ ساری کارروائی علیین اور سجین میں پیش آتی ہے؟ خدارا کچھ تو فرمایئے کہ بات کیا ہے؟

اور خود حضرت مرحوم لکھتے ہیں کہ: ''المنکر والنکیر یاتیان المیت فیرسل فی ذالک المیت الروح ثم یقعد فاذا سئل ارسلت روحه بالاالم ونؤمن بان المیت یعرف من یزوره اذا اتاه واکده یوم الجمعة بعد طلوع الفجر قبل طلوع الشمس'' جب منکر و نکیر میت کے پاس آتے ہیں تو اس میت میں روح ڈال دی جاتی ہے۔ پھر اس کو بٹھایا جاتا ہے جب اس سے سوال ہو چکتا ہے تو اس کی روح بلا تکلیف (ایک گونہ) نکال لی جاتی ہے اور ہم اس پر بھی ایمان رکھتے کہ جب میت کے پاس کوئی شخص زیارت کرنے کے لئے آتا ہے تو وہ اس کو پہچان لیتی ہے۔ خصوصاً جمعہ کے دن طلوع فجر کے بعد اور طلوع آفتاب سے پہلے۔ (تحریرات حدیث ص ۲۵۷)

یہ پہچاننا سلام اور کلام کے ذریعہ ہی سے ہوتا ہے نہ کہ رؤیت بصری سے۔اس عبارت سے معلوم ہوا کہ سوال نکرین کے بعد اگر چہ روح کا بدن سے وہ تعلق تو باقی نہیں رہتا جو سوال کے وقت ہوتا ہے اور اس قسم کا تعلق بدن سے منقطع ہو جاتا ہے لیکن فی الجملہ تعلق پھر بھی باقی رہتا ہے جس سے ادراک و شعور اسے حاصل ہوتا ہے اور زیارت کرنے والے کی شناخت اسے ہو جاتی ہے۔کیا محترم قاضی صاحب کے ہاں زیارت کرنے والا علیین یا سجین میں جا کر زیارت کیا کرتا ہے یا قبر پر۔ممکن ہے محترم قاضی صاحب یہ فرمادیں کہ جب آدمی چاند پر سے ہو آئے ہیں تو جمعہ کی چھٹی سے استفادہ کرتے ہوئے اگر کوئی زندہ علیین یا سجین میں جا کر ملاقات اور زیارت کر آئے اور سلام عرض کر آئے تو اس میں کیا اشکال ہے؟ معاف رکھنا اگر آپ نے حضرت صاحب رحمہ اللہ کے پاس چوبیس سال آتے جاتے یہی کچھ حاصل کیا ہے جو آپ نے پلے باندھ رکھا ہے تو آپ نے حضرت صاحب رحمہ اللہ سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا اور ہم نے بفضلہٖ تعالیٰ مختصر سے عرصہ میں بہت کچھ حاصل کر لیا ہے۔

اب قارئین کرام ہی انصاف سے فرمائیں کہ حضرت صاحب مرحوم کی عبارات کا مطلب ہم نہیں سمجھے یا جناب قاضی صاحب نہیں سمجھے؟ اور کیا ہم نے حضرت مرحوم کی عبارات میں تحریف و خیانت کی ہے؟ یا محترم قاضی صاحب یہ خدمت انجام دے رہے ہیں؟

آپ ہی خود اپنے جور و جفا کو دیکھیں ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

کیا دلائل میں بھی تفرّد ہوتا ہے؟

محترم جناب قاضی صاحب لکھتے ہیں اور (ص ۳۱۲) پر حضرت مولانا حسین علی نور اللہ مرقدہ کا عدم سماع موتی پر حضرت عزیر علیہ السلام (فاماتہ اللہ مائۃ عام) کے قصہ سے استدلال کرنے کا نام تفرد رکھا ہے۔اب تک تو ہم سنتے آئے ہیں کہ تفرد مسائل میں ہوتا ہے۔اب دلائل میں بھی تفرّد ہونے لگا۔چلو لغوی ہی سہی۔پھر ایک مسلم معتمد علیہ محقق قرآن کریم سے استدلال کرتا ہے۔آپ کہتے ہیں ان کا تفرّد ہے۔'' (الشہاب ص ۵۶ و ۵۷) اور حاشیہ میں لکھتے ہیں۔ہلذہ الحیر ان کی عبارت نقل کرنے کے بعد مولانا مرحوم کے قول میں تحریف کر کے حضرت مرحوم کے ذمہ یہ لگا آئے کہ حضرت سماع کے قائل ہیں اور یہاں حضرت مرحوم نے جو اپنا نظریہ عدم سماع کی دلیل دی، اسے تفرّد کہہ رہے ہیں۔یہ آپ کا باب التناقض ہے۔ (ص ۵۶)

الجواب: جناب قاضی صاحب کی عمر درسی کتابیں پڑھاتے گزر گئی ہے اور وہ اپنے آپ کو منطقی بھی تصور کرتے ہیں اور باب التناقض وغیرہ کی منطقی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں اور پھر دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ تفرد مسائل میں ہوتا ہے نہ کہ دلائل میں۔علمی طور پر یہ عجیب دعویٰ ہے۔ان کے اس غلط نظریہ کے رد کے لئے اختصاراً ہم یہاں صرف دو حوالے عرض کرتے ہیں۔

ا...... منطق و معقول کی مشہور درسی کتاب سلم العلوم میں وھھنا شک مشہور سے ایک اعتراض کیا ہے کہ علم اور معلوم متحد بالذات ہیں اور جب ہم نے تصدیق کا تصور کیا تو وہ دونوں ایک ہو جائیں گے۔حالاں کہ تصور اور تصدیق حقیقۃً متخالف ہیں۔اس اشکال کا جواب علامہ محب اللہ بہاری رحمہ اللہ (المتوفی ھ) یہ دیتے ہیں: ''وحلہ علی ماتفردت بہ ان العلم فی مسئلۃ الاتحاد بمعنی الصورۃ العلمیۃ'' (سلم العلوم ص ۸ و مع ملاحسن ص ۲۸۰)

اور اس کا حل جس میں متفرد ہوں یہ ہے کہ مسئلہ اتحاد میں علم صورت علمیہ کے معنی میں ہے۔

اب جناب قاضی صاحب ہی فرمائیں کہ یہ تفرد دلیل میں ہے یا مسئلہ میں؟ فیصلہ انہی پر ہے۔ اگرچہ اس اشکال کا جواب السید الہروی رحمہ اللہ اور علامہ قوشجی رحمہ اللہ نے بھی دیا ہے۔ لیکن حالت ادراکیہ کے صورت علمیہ کے ساتھ خلط اتحادی کے صرف صاحب سلّم ہی قائل ہیں اور اس دلیل اور جواب کے بیان کرنے میں وہ ہی متفرد ہیں۔ (فافہم)

۲ ...... علامہ عبدالعزیز فرہاروی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۳۷ھ) اس پر بحث کرتے ہوئے کہ قرآن کریم میں السمٰوات کا لفظ جمع بھی آیا ہے (اور مفرد بھی) اور الارض کا لفظ قرآن کریم میں جمع نہیں آیا۔ (آتا تو ارضون ہوتا۔ مختصین) (نبراس ص ۱۱۳) متعدد توجیہات اور دلائل بیان کرنے کے بعد آخر میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ: ''ومنها ان تعدد السموات معلوم للخاصة والعامة بالنظر الى الحركات المختلفة بخلاف الارض فانه انما علم من جهة الشرع وكذا كانت العرب تستعمل السموات جمعاً والارض مفرداً ثم نزل القرآن بلغتهم وهذا الوجه من خواص الكتاب '' ان دلائل اور توجیہات میں سے یہ بھی ہے کہ حرکات مختلفہ کو دیکھنے کی وجہ سے آسمانوں کا تعدد خواص اور عوام کو معلوم ہے۔ بخلاف زمین کے کیونکہ اس کا تعدد شرع ہی سے معلوم ہوا ہے اور اسی طرح عرب سمٰوات کو جمع اور ارض کو مفرد استعمال کرتے تھے۔ پھر قرآن کریم انہی کی لغت میں نازل ہوا اور یہ دلیل اور وجہ اسی کتاب کے خواص میں سے ہے۔ (نبراس ص ۱۱۳)

علامہ عبدالعزیز فرہاروی رحمہ اللہ نے سمٰوات کے تعدد کے دلائل پیش کئے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ دلیل صرف اسی کتاب (نبراس) کے خواص میں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ دلائل میں بھی تفرد ہوتا ہے۔ حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ بلاشک بڑے محقق، مواحد اور حق گو عالم تھے اور ہمارے پیر و مرشد ہیں لیکن معصوم تو نہیں۔ رفع سبابہ وغیرہ کے مسئلہ میں جناب قاضی صاحب خود ان سے اختلاف کرتے ہیں اور (الشہاب ص ۱۷ تا ۲۰) میں خود جناب قاضی صاحب نے اپنے اساتذہ کرام کے ساتھ (جن میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب رحمہ اللہ وغیرہ بزرگ ہیں) اختلاف کرنے کی مثالیں دی ہیں۔ کیا وہ ان کے محقق ہونے کے قائل نہیں ہیں؟ اور کیا چند مسائل یا دلائل میں کسی محقق سے علمی طور پر اختلاف کرنے سے وہ محقق ہونے سے نکل جاتے ہیں؟

تناقض

محترم قاضی صاحب ہماری عبارات میں تناقض ثابت ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ حضرت مرحوم کو سماع کا قائل بتاتے ہیں اور دوسری طرف عدم سماع موتی کی دلیل میں ان کے تفرد کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ آپ کا باب التناقض ہے۔ (محصلہ)

الجواب: گزارش ہے کہ بات صرف سمجھنے کی ہے حضرت مرحوم عندالقبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صلوٰۃ و سلام سننے اور جواب دینے کے تو قائل ہیں، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح وہ اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ میت زیارت کرنے والے کو (جو کہ ''السلام علیکم یا اہل القبور'' سے خطاب کرتا ہے۔ کیونکہ شرعاً قبور کی زیارت کا یہی معہود طریقہ ہے اور اس پر صحیح احادیث دلالت کرتی ہیں۔ صفدر) پہچانتی ہے۔ خاص طور پر جمعہ کے دن طلوع فجر کے بعد اور طلوع آفتاب سے قبل (کمامر) تو اس تحقیق کے پیش نظر مطلب یہ ہوگا کہ مردے سلام تو سنتے ہیں مگر لوگوں کی استمداد

واستعانت کے لئے آوازیں نہیں سنتے۔ جیسا کہ اچھے اور نیک لوگ اچھی باتیں تو سنتے ہیں لیکن ریڈیو وغیرہ کی غیر شرعی آوازوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی یا جیسا کہ حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ عام سماع موتی نہیں لیکن آنحضرت ﷺ کے عند القبر سماع کو وہ مانتے ہیں اور السلام علیکم الخ اور حدیث سماع قرع النعال کو وہ بھی عام ضابطۂ عدم سماع موتی سے استثناء کرتے ہیں یا جیسا کہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ قبور کے پاس سلام کے سماع کے قائل ہیں۔ (دیکھئے (مائۃ مسائل ص ۳۴) اور ان کی عبارت ہم نے (سماع الموتی ص ۲۲۷) میں نقل کردی ہے) اور دیگر باتوں کے سماع کے منکر ہیں۔ دیکھئے (مائۃ مسائل ص ۴۶) جن کی مفصل عبارت ہم نے (سماع الموتی ص ۳۳۵) میں نقل کردی ہے) یا جیسا حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا رجحان عدم سماع موتی کی طرف ہے لیکن آنحضرت ﷺ کے عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع پر اجماع نقل کرتے ہیں اور بعد از دفن تلقین کے وقت احادیث کی روشنی میں سماع کے قائل ہیں۔ اسی طرح اگر حضرت مرحوم بھی زیارت مسنونہ کے وقت السلام علیکم کے خاص سماع کے قائل ہوں اور عام سماع کے منکر ہوں تو اس میں کیا تناقض ہے؟ جب موضوع خاص و عام سے بدل گیا تو تناقض نہ رہا۔

جناب قاضی صاحب خود مختلف احادیث میں تعارض رفع کرنے کے لئے موضوع کے تھوڑے سے تغیر و تبدل سے کام لے کر گاڑی چلاتے رہتے ہیں تو یہ تطبیق ان میں سے بعض سے زیادہ واضح ہے۔ اس میں کوئی خفاء نہیں ہے۔ کمالا یخفی!

حدیث کے معنی میں تحریف کا الزام

جناب قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ: اور (۱۴۷) میں دوسری دلیل ذکر کرتے ہیں: ''سمع موتی والذی نفسی بیدہ انہ یسمع خفق نعالھم'' اور اس کا معنی کرتے ہیں اس ذات کی قسم کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ ان کی جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ سنتا ہے۔ یہاں موصوف نے حدیث کے معنی میں تحریف کی جو مقسم علیہ اس کو الحدیث کہہ کر چھوڑ دیا اور جو ظرف اور وقت مقسم علیہ اسے مقسم علیہ اور جواب قسم بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے اور حدیث کے معنی میں تو تحریف کرنے سے احتراز کرتے (یحرفون الکلم عن مواضعہ) کیا موصوف کے دماغ پر سمع موتی کا بھوت اتنا سوار ہو گیا کہ حدیث کے معنی میں تحریف کرنے پر اتر آئے۔ مرنا نہیں، جان نہیں دینی، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش نہیں ہونا۔'' (ص ۳۶)

الجواب: علم اور حقیقت سے بے خبر اور ناواقف آدمی جب جناب قاضی صاحب کی یہ عبارت پڑھے گا تو اس سے یہی سمجھے گا کہ واقعی مؤلف سماع الموتی نے حدیث کے معنی میں تحریف کر کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ کیونکہ جناب قاضی صاحب پرانے مدرس ہیں اور خیر سے شیخ الحدیث بھی ہیں اور اب قبر اور آخرت کے بھی بظاہر بالکل قریب ہیں۔ لہٰذا وہ علمی غلطی اور غلط بیانی کیسے کر سکتے ہیں؟ لیکن یقین جانیں کہ جناب قاضی صاحب خود نہ صرف یہ کہ غلط فہمی جہل مرکب کا شکار ہیں۔ ہم سماع الموتی کی پوری عبارت مع اس جملہ کے جو غیر مقصودی ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا تھا عرض کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ عبارت یہ ہے:

اور (مستدرک ج ۱ ص ۳۸۰) کی روایت میں جس کے علیٰ شرط مسلم صحیح ہونے پر امام حاکم رحمہ اللہ اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ دونوں متفق ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''والذی نفسی

بیدہ انہ یسمع خفق نعالھم حین یولون عنہ'' اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ ان کی جوتیوں کی کھنکھناہٹ سنتا ہے جس وقت لوگ اس سے واپس ہوتے ہیں۔

اور یہ روایت (موارد الظمآن ص ۱۹۶) میں بھی ہے اور (شرح السنۃ ج ۵ ص ۴۱۳) میں ''ان المیت یسمع حس لنعال اذا ولو عنہ الناس مدبرین'' کے الفاظ ہیں۔ (سماع الموتی ص ۱۴۷) ہم نے اختصار کے لئے حین یولون عنہ کا جملہ جو ظرف ہے ترک کر دیا تھا اور نعالھم کے بعد الحدیث کر دیا تھا۔ اس حدیث میں مقسم علیہ اور جواب قسم انہ یسمع خفق نعالھم کا جملہ ہی ہے اور حین یولون عنہ ظرف اور وقت مقسم علیہ ہے۔ لیکن جب قاضی صاحب مقسم علیہ اور جواب قسم کو ظرف اور وقت مقسم علیہ قرار دیتے ہیں اور حین یولون عنہ کے جملہ کو جس میں صراحۃً حین ظرف موجود ہے۔ اسے جواب قسم قرار دیتے ہیں اور پھر آگے حدیث کے کے معنی میں تحریف کا بہتان لگا کر وعظ پر اتر آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے۔ دماغ پر سمع موتی کا بھوت سوار ہو گیا ہے کہ حدیث کے معنی میں تحریف پر اتر آئے۔ مرنا نہیں جان نہیں دینی۔

محترم! آپ ہی کے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادلّہ صحیحہ وقویہ سے ثابت شدہ مسئلہ فی الجملہ سماع موتی کے بلا دلیل انکار کا بھوت آپ پر سوار ہو گیا ہے کہ جواب قسم اور مقسم علیہ اور ظرف اور وقت مقسم علیہ میں کوئی تمیز ہی نہیں رہی اور بدحواسی میں جواب قسم کو ظرف اور وقت مقسم علیہ بنا رہے ہیں اور ظرف اور وقت مقسم علیہ کو جواب قسم بنا رہے ہیں۔ کیا آپ نے مرنا نہیں، جان نہیں دینی۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش نہیں ہونا۔ یقین جانیں کہ علم صحیح اور رائے صحیح سے بے بہرہ چند حواریوں کے اکسانے پر سماع الموتی کے رد میں الشہاب الثاقب لکھ مارنے سے اللہ تعالیٰ کے دربار میں تو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ آخرت کی فکر کیجئے اللہ تعالیٰ توفیق بخشے۔

اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ لفظ حین اور اذا ظروف میں سے ہیں۔ مستدرک کی روایت میں حین کا لفظ ظرف ہے اور شرح السنۃ کی روایت میں اذا ولو اعنہ الناس مدبرین میں اذا کا لفظ ظرف ہے۔ بفضلہ تعالیٰ راقم اثیم کو جواب قسم اور ظرف میں تمیز کرنے کی اہلیت حاصل ہے۔ اگر جناب قاضی صاحب جگہ جگہ بلا وجہ ہمیں خائن اور محرف نہ کہتے اور سماع موتی کے قائلین کی بھی علمی طور پر قدر کرتے اور نیلوی صاحب اور سجاد صاحب اور چھوڑ گڑھی صاحب کو بھی کچھ تنبیہ فرما دیتے جو سماع موتی کے قائلین کو معلون اور ملحد اور مشرک تک کہتے ہیں اور مؤخر الذکر نے تو یہاں تک کہا کہ جو شخص سماع صلوٰۃ وسلام عند القبر النبی الکریم کا قائل ہے وہ بلا شک قطعی کافر ہے۔ (ملاحظہ ہو دعوت الانصاف ص ۴، اور سماع الموتی ص ۹۱) تو شاید کہ ہم قدرے سخت لہجہ جناب قاضی صاحب کے خلاف ہرگز نہ اختیار کرتے۔ وہ معمر اور بزرگ ہیں لیکن دین سب سے مقدم ہے۔ جناب قاضی صاحب نے غلو کرنے والے کسی صاحب کو کسی کتاب میں کوئی تنبیہ نہیں کی بلکہ ان کی تائید اور تصویب ہی کی ہے اور مفت میں ان کی وکالت کرتے ہیں جب کہ سماع الموتی کی کتاب کی جا بجا شکایت کرتے ہیں اور پھبتی اڑاتے ہیں۔

مسئلہ سماع اور حضرت عزیر علیہ السلام

منکرین سماع موتی حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ سے بھی عدم سماع پر استدلال کرتے ہیں۔ (دیکھئے جواہر القرآن ص ۱۲۷) ہم نے اس کا مفصل جواب (سماع الموتی ص ۳۱۴، ۳۱۵) میں دیا ہے جس میں حضرت شیخ

الہند رحمہ اللہ کی یہ عبارت بھی ہے ''سو برس تک اسی حالت میں رہے اور کسی نے نہ ان کو وہاں آخر دیکھا نہ ان کی خبر ہوئی۔'' (حاشیہ قرآن کریم ص ۵۵) اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا یہ حوالہ بھی ہے۔''رہی یہ بات کہ جب دوسروں نے دیکھا نہیں تو لوگوں کے لئے نمونہ قدرت کس طرح ہوگا۔'' (تفسیر بیان القرآن ج ۱ ص ۱۴۵) اس مقام پر ان واضح حوالوں کو جناب قاضی صاحب کوکا کولا کی بوتل سمجھ کر پی گئے ہیں اور کسی کا نام تک نہیں لیا اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا نام لئے بغیر یہ تحریر فرما کر ڑخا گئے ہیں کہ:''پھر سو سال میں کوئی کوا، کوئی کبوتر، کوئی چڑیا، کوئی جانور وہاں نہیں بولا ہوگا۔ کوئی بادل نہیں گرجا ہوگا۔ الیٰ قولہ'' جو من گھڑت مفروضہ ہے وہ فعلیت محض ہوگئی۔ اس لئے کہ مولانا نے اس مفروضہ کو لے کر جواب دینا ہے۔'' (الشہاب ص ۴۵)

حضرت قاضی صاحب کا علمی اور اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ دونوں کا نام لیتے اور ان کا باقاعدہ حوالہ دیتے اور پھر بن پڑتا تو معقول جواب دیتے لیکن ان کی بات کو من گھڑت مفروضہ تو نہ کہتے۔ مگر ان کو تو تحزب کے تحت نیلوی صاحب اور سجاد صاحب وغیرہ کی تائید کرنا ہے اور بس۔ پھر محترم جناب قاضی صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کوا، چڑیا، جانور اور بادل کا گرجنا کسی گھڑی کا نام نہیں ہے۔ جن کی آواز سے وقت کی تعیین ہو سکے اور وقت منضبط ہو سکے۔ گھڑی بھی پاس ہو تو بن دیکھے وقت کا پتہ نہیں چلتا اور حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ میں کم لبثت سے وقت کی تعیین کا سوال ہے اور (ص ۶۴) میں جناب قاضی صاحب نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے حوالہ کا تذکرہ کیا ہے لیکن جواب سے بالکل عاجز رہے ہیں۔ صرف شعر گوئی فرما کر اور یہ لکھ کر کہ کسی کے آنے نہ آنے سلام کلام کرنے کو رہنے دیں، یہ بعد کی چیز ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کم لبثت اور لبثت کا فاعل حضرت عزیر علیہ السلام ہیں اور فعل اپنے فاعل کی صفت ہوگا ہے اور اپنی صفات کا علم حضوری ہوتا ہے جس کو بیوقوف اور بچے بھی جانتے ہیں اور عزیر علیہ السلام کو اپنے رہنے کا علم تو نہیں اور اگر وہاں کوئی بات کرتا تو ضرور سنتے۔ کیونکہ اس طرح کہنے کے سواء کوئی پختہ دیوبندی نہیں بنتا۔ (محصلہ) اور (ص ۶۵، ۶۶) میں اصل نکتہ سے ہٹ کر پانی کی طرح بار بار اسے بلویا ہے۔

الجواب: قارئین کرام ملاحظہ کریں کہ جناب قاضی صاحب دوسروں پر پختہ دیوبندی ہونے کا طنز کرتے ہیں اور خود حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ دیوبندی کی معقول بات کو کس طرح ٹال گئے ہیں بلکہ من گھڑت مفروضہ سے تعبیر کر کے جان چھڑا گئے ہیں اور آگے بے سمجھے سوچے نحوی قاعدہ سے دفع الوقتی کرنے لگے ہیں۔ ہم نے (سماع الموتی ص ۳۱۸ تا ۳۲۰) میں اس کا مفصل جواب دیا ہے کہ سوال حرف کم سے وقت کی تعیین کا ہے اور زمانہ اور وقت نہ تو انسان کے ذاتی حالات میں داخل ہے نہ صفات میں بلکہ ظرف ہے اور الگ مقولہ سے ہے۔ اگر وقت وزمانہ انسان کی ذات وصفات میں داخل ہوگا اور زمانہ کا علم حضوری ہوتا تو ہر آدمی کو اپنی تاریخ پیدائش عمر اور زندگی کے دوسرے حالات تاریخ وار معلوم ہوتے۔ حالانکہ بجز ان لوگوں کے جن کے حافظے بڑے قوی ہوتے ہیں یا وہ لوگ جن کے پاس تاریخ ولادت اور زندگی کے اہم واقعات لکھے ہوئے ہوتے ہیں اور کوئی شخص اپنی زندگی کے واقعات زمانہ اور وقت کی تحدید وتعیین کے ساتھ نہیں بتا سکتا۔ تجربہ شرط ہے۔

بے جا مغز خوری

جناب قاضی صاحب لکھتے ہیں:''اور (۳۱۸) میں فرماتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کم لبثت ارشاد

فرما کر کہ زمانہ کی توقیت و تعیین دریافت فرمائی اور زمانہ و وقت نہ ان کے ذاتی حالات میں داخل ہے نہ صفات میں بلکہ ظرف ہے اور الگ مقولہ۔'' بے شک جناب اگر آپ لاہور جائیں واپس آئیں، لوگ پوچھیں جناب! آپ لاہور کتنے دن رہے؟ آپ کہیں زمانہ ایک امر منفصل علیحدہ مقولہ ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنا ٹھہرا ہوں۔ جناب آپ جب یہاں رہتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ کتنا ٹھہرا ہوں۔ بھائی سر نہ کھاؤ، چپ رہو۔ یہاں زمانہ میرے ساتھ امر متصل رہتا ہے لاہور جا کر امر منفصل اور الگ مقولہ بن جاتا ہے۔ جناب! اس کی کیا وجہ، بھائی سر نہ کھاؤ، یہ جگہ اور، اور وہ جگہ اور۔ جناب! پھر سننے کے لئے بھی یہ جہان اور، وہ جہان اور ہو سکتا ہے۔ یہاں سنے اور وہاں جا کر اس جہاں کی باتیں تو سنیں اور اس جہاں کی نہ سنے۔ بھائی چپ رہو ہم نے یہاں کی بھی سنانی ہے جناب! بات سمجھ نہیں آئی مگر چپ ہی کرتے ہیں۔ بلفظہٖ! (ص ۶۵، ۶۶)

اور نیز لکھتے ہیں: ''جناب کیا کریں آپ لاہور جائیں تو یہ جانا آپ کی صفت ہے۔ وہاں ٹھہریں تو یہ ٹھہرنا آپ کی صفت ہے۔ واپس ہوں تو واپس ہونا آپ کی صفت۔ کیا یہ لبثت یہ ٹھہرنا عزیر علیہ السلام کی صفت نہیں؟'' (ص ۶۷)

الجواب: جناب قاضی صاحب نے اس عبارت میں خالص طفل تسلی سے کام لیا ہے اور لوری دے کر سلانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ نہایت ہی ادب سے گزارش ہے کہ محترم جناب قاضی صاحب کو لاہور جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ گوجرانوالہ میں تشریف رکھتے ہوئے ہی بلا حساب اپنی پوری زندگی کے نہیں بلکہ گوجرانوالہ کے قیام ہی کے دن، گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ اور جتنے سانس انہوں نے لئے ہیں علم حضوری کے زور سے بتادیں اور جتنی دفعہ وہ اٹھے بیٹھے اور جتنے قدم انہوں نے آتے جاتے اٹھائے ہیں اور جتنے کلمات انہوں نے زبان سے نکالے ہیں بلکہ جتنے دن اور گھنٹے اور منٹ اور سیکنڈ پڑھایا ہے اور چھٹی کی ہے اور اس اثنا میں جتنے سانس انہوں نے لئے ہیں بتادیں۔ کیونکہ یہ تمام ان کی اپنی صفات ہیں۔ لاہور بالکل تشریف نہ لے جائیں یہیں گھر بیٹھے ہی بلا حساب کئے۔ بتائیں ہم مان لیں گے کہ گوجرانوالہ میں زمانہ امر متصل ہوتا ہے۔ کیونکہ بقول جناب قاضی صاحب کے علم حضوری اور بداہت کو تو بلہ اور صبیان بھی جانتے ہیں اور جناب قاضی صاحب تو ماشاء اللہ تعالیٰ جید مدرس ہیں۔ پھر علم حضوری اور بداہت ان کے گھر کی لونڈی کیوں نہ ہوگی؟ الغرض کھانا پینا، سونا جاگنا، وضوا ور غسل کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، تقریر کرنا، درس دینا وغیرہ وغیرہ بے شمار افعال ہیں جو جناب قاضی صاحب کی صفات ہیں۔ وہ اگر تحدید وقت کے ساتھ یہ بتادیں کہ یہ کام فلاں فلاں جگہ اور اتنے اتنے وقت میں ہوئے تو علم حضوری کا فائدہ بلا تامل حاصل ہو جائے گا ورنہ وقت اور زمانہ گوجرانوالہ میں رہ کر بھی الگ ہی مقولہ رہے گا اور منفصل ہی ہوگا نہ کہ متصل۔ جناب قاضی صاحب کو صفت اور ظرف کے مقولہ کو خلط ملط اور گڈمڈ نہیں کرنا چاہئے۔ لہٰذا لبثت میں ٹھہرنے کو تو حضرت عزیر علیہ السلام کی صفت سمجھیں اور کم میں وقت اور ظرف کو الگ قرار دیں کیونکہ صفت اُلگ مقولہ سے ہے اور ظرف الگ مقولہ سے ہے۔ ٹھہرنا بندے کی صفت ہے جو اس سے متصل ہے اور ٹھہرنے کا زمانہ ظرف ہے جو بندے سے الگ اور منفصل ہے۔

شرم آتی ہے

جناب قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ: اور (ص ۱۴۹) میں سماع موتی کی ایک دلیل یہ لکھی ہے کہ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک باب کا یہ ترجمہ (عنوان) لکھا ہے: ''باب المیت یسمع خفق النعال'' (ج ۱ ص ۱۷۸ صحیح

بخاری) حضرت آپ نے یہ ایسی کتاب لکھی ہے (معاف کرنا) کہ ہمیں جواب لکھتے بھی شرم آتی ہے۔ اگر کچھ نہ لکھیں تب کیا کریں اور اگر لکھیں تو دیکھنے والے یہ کہیں گے کہ موصوف اتنے بڑے محدث مدت سے ایک مدرسہ میں شیخ الحدیث صدر مدرس اتنی خبر بھی نہیں کہ محدثین ایک حدیث میں ایک لفظ دیکھ کر ایک عنوان قائم کر دیتے ہیں۔ خواہ ناظرین کو اس سے اتفاق ہو یا نہ ہو۔ کیا امام بخاری رحمہ اللہ باب القرأۃ خلف الامام لکھ دیں تو آپ کو اس سے اتفاق ہوگا۔ باب الجہر بالآمین آپ اس سے اتفاق کریں گے۔ باب رفع الیدین عند الرکوع کیا آپ اس سے اتفاق کریں گے۔ باب الجمعۃ فی القریٰ آپ اس سے اتفاق کریں گے۔ هلمّ جرّ الجیث لاتعدّو لاتحصیٰ! (ص ۸۳ و ۹۳)

الجواب: جناب قاضی صاحب کے بعض علمی چٹکلے تو تیر بہدف ہوتے ہیں لیکن ان پر تعلّی کا جن اور تکبر کا بھوت بری طرح سوار ہے کہ ان کے بغیر کوئی اور تدریس کے لائق ہی نہیں ہے۔ یہ بات ان کی گفتگو اور ان کی تحریرات سے بالکل واضح ہے۔ مشہور ہے عیاں راچہ بیان۔ اس عبارت میں بھی جناب قاضی صاحب نے علمی ٹھوکریں کھائی ہیں اور یہ لکھنے میں حق بجانب ہیں کہ سماع الموتیٰ کا جواب لکھنے میں شرم آتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس ٹھوس اور محقق کتاب کے بے شمار اور جاندار حوالوں سے نظر بچا کر صرف چند باتوں کا انتخاب فرمایا ہے اور ان کا حشر بھی قارئین کرام بخوبی ملاحظہ کر چکے ہیں اور جہل مرکب کے پلندے کا جب پوسٹ مارٹم ہو تو ضرور شرم آنی چاہئے۔ یہاں انہوں نے جو علمی ٹھوکریں کھائی ہیں وہ یہ ہیں:

اوّل: یہ کہ وہ لکھتے ہیں: ''محدثین ایک حدیث میں ایک لفظ دیکھ کر ایک عنوان قائم کر دیتے ہیں خواہ ناظرین کو اس سے اتفاق ہو یا نہ ہو۔'' بے شک حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ بشمولیت حضرت امام بخاری رحمہ اللہ بعض مقامات میں ترجمۃ الباب اور عنوان قائم کرتے ہیں اور جو حدیث اس باب میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں وہ بظاہر دلالت مطابقی اور تضمنی والتزامی وغیرہ سے باب کے مطابق نہیں ہوتی۔ وہاں تو ناظرین کو اختلاف کا حق ہوتا ہے کہ مانیں یا نہ مانیں۔ لیکن جہاں ترجمۃ الباب کے عین مطابق الفاظ حدیث سے ثابت ہو جائیں تو وہاں ناظرین کے نہ ماننے کا بہانہ بالکل بے سود اور بے کار ہے جیسا کہ یہاں جناب قاضی صاحب کا بہانہ بے کار ہے۔ کیونکہ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان یہ قائم کیا۔ باب المیت یسمع خفق النعال اور آگے حدیث وہ پیش کرتے ہیں جس میں یہ الفاظ ہیں: ''حتی انہ یسمع قرع نعالہم'' الحدیث اور علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان الفاظ سے ترجمۃ الباب کی مطابقت ہے۔ کیونکہ خفق اور قرع دونوں کا ایک معنی ہے۔ (ہامش بخاری ص ۱۷۸) تو اس باب میں جتنے الفاظ عنوان میں ہیں اتنے ہی حدیث میں ہیں۔ لہٰذا علمی طور پر ناظرین کا اس سے اتفاق نہ کرنا واضح طور پر علمی غلطی ہے اور یا پھر نرا تعصب ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ آمین!

دوم: ہم نے کتاب سماع الموتیٰ میں یہ باب اس لئے نہیں پیش کیا کہ آگے حدیث اس کے مطابق ہے۔ یہ بات تو اظہر من الشمس ہے۔ ہم نے امام بخاری رحمہ اللہ کی تبویب کا حوالہ دے کر آگے علامہ عینی رحمہ اللہ سے اس عنوان کی تشریح نقل کی ہے۔ یعنی یہ باب ہے جس میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ مردہ زندوں کی جوتیوں کی کھنکھناہٹ سنتا ہے اور خفق النعال کا معنی جوتیوں کی آواز اور ان سے زمین کو روندنا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۴ ص ۱۵۷)

اس کے بعد ہم نے لکھا ہے: ''یہ عبارت بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مردہ زندوں کی جوتیوں کی کھنکھناہٹ سنتا ہے اور حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔'' (ص ۱۴۹)

اب قارئین کرام ہی فرمائیں کہ جتنی بات ہم نے تحریر کی ہے اس میں علمی طور پر کیا کلام ہے؟ اور کیا اشکال ہے؟ ہم نے عنوان اور حدیث کی مطابق اور عدم مطابقت کا تو ذکر ہی نہیں چھیڑا اور نہ ہم نے ترجمۃ الباب کے اثبات اور مطابقت کے لئے آگے مذکور حدیث کا حوالہ دیا ہے۔ کیونکہ ایک واضح چیز کے اثبات کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور جناب قاضی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ: ''محدثین ایک حدیث میں ایک لفظ دے کر ایک عنوان قائم کر دیتے ہیں۔'' یعنی بالکل ایک غیر متعلق بات لکھ کر عوام کو مغالطہ دیتے ہیں۔ معاف رکھنا ایسا طریق اختیار کرنے سے اور ایسی غیر متعلق باتیں لکھنے سے شرم کیوں نہ آئے؟ ضرور آنی چاہئے۔ شرم آنا بھی ایک اچھی علامت ہے۔ جناب قاضی صاحب کا یہ فریضہ تھا کہ سماع الموتی میں درج شدہ اس دعویٰ کی کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ خفق النعال کے سماع کے قائل ہیں۔ اگر بن پڑتا تو باحوالہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں یوں تردید کرتے کہ سماع خفق النعال ثابت نہیں اور ناظرین کا غیر متعلق ذکر نہ کرتے۔

سوم: جناب قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''کیا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ باب القرأۃ خلف الامام لکھ دیں تو آپ کو اس سے اتفاق ہوگا۔ باب الجہر بالآمین آپ اس سے اتفاق کریں گے۔ باب رفع الیدین عند الرکوع، کیا آپ اس سے اتفاق کریں گے۔ باب الجمعۃ فی القریٰ، آپ اس سے اتفاق کریں گے۔''

الجواب: جناب قاضی صاحب نے یہ باتیں بھی اپنے حواریوں کو مطمئن کرنے کے لئے تحریر فرمائی ہیں۔ غور و فکر سے قطعاً کام نہیں لیا۔ اس لئے کہ اوّلاً تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب القرأۃ خلف الامام قائم ہی نہیں کیا۔ انہوں نے جو باب قائم کیا ہے وہ یہ ہے: ''باب وجوب القرأۃ للامام والمأموم فی الصلوٰت کلها فی الحضر والسفر ومایجهر فیها ومایخافت'' (ج ا ص ۱۰۴) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں خلف الامام کا لفظ ہی نہیں ہے۔

وثانیاً: اس دعویٰ کے اثبات کے لئے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آگے جو حدیثیں پیش کی ہیں ان میں کسی ایک کے اندر بھی خلف الامام اور ماموم کا لفظ مذکور نہیں ہے۔ یہاں ہم اس لئے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے اتفاق نہیں کرتے کہ باب اور پیش کردہ احادیث میں قطعاً مطابقت نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ قرأۃ خلف الامام کے قائل نہیں ہیں۔ اس کی مفصل اور سیر حاصل بحث ہم نے احسن الکلام میں کر دی ہے جس پر جناب قاضی صاحب کی تصدیق بھی موجود ہے۔ اسی طرح حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب الجہر بالآمین کا کوئی باب نہیں قائم کیا۔ (آمین پر الف لام لانے کا مسئلہ تو جناب قاضی صاحب ہی بہتر جانتے ہوں گے اور شاید یہاں ان کے نزدیک یہ مستحسن امر ہو) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک باب یہ قائم کیا ہے: ''باب جهر الامام بالتامین'' (ج ا ص ۱۰۷) اور دوسرا باب یہ قائم کیا ہے: ''باب جهر المأموم بالتامین'' (ج ا ص ۱۰۸) اور آگے جو مرفوع حدیثیں دلیل کے طور پر پیش کی ہیں ان میں جہر کا کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں احادیث مرفوعہ کے باب سے مطابق نہ ہونے میں ناظرین کو اختلاف کی گنجائش ہے۔ کیونکہ دعویٰ اور دلیل (یعنی ترجمۃ الباب اور احادیث) میں مطابقت نہیں ہے۔ اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب رفع الیدین عند الرکوع کا کوئی باب قائم نہیں کیا۔ انہوں نے جو باب قائم کیا ہے وہ یہ ہے: ''باب رفع الیدین اذا کبر واذا رکع واذا رفع'' (ج ا ص ۱۰۲)

اور پھر آگے انہوں نے اپنے اس دعویٰ کے اثبات پر مرفوع حدیث پیش کی ہے اور حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے اس لئے اختلاف کرتے ہیں کہ صحیح ابوعوانہ اور مسند حمیدی میں صحیح سند کے ساتھ یہ حدیث موجود ہے

کہ آنحضرت ﷺ رکوع کے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع یدین نہیں کیا کرتے تھے۔ نور الصباح وغیرہ میں اس کی مفصل بحث موجود ہے جو فاضل نصرۃ العلوم حضرت مولانا حافظ محمد حبیب اللہ صاحب نے تالیف کی ہے۔ اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے باب الجمعۃ فی القریٰ والمدن تو قائم کیا ہے۔ (ج ۱ ص ۱۲۲) لیکن اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ قریہ سے کیا مراد ہے۔ اگر مکہ مکرمہ، مصر، جواثی اور طائف وغیرہ کی طرح آبادی مراد ہے جن پر قرآن کریم اور حدیث میں لفظ قریۃ کا اطلاق کیا گیا ہے تو علی الرأس والعین ایسی آبادی میں جمعہ جائز ہے اور اگر بالکل معمولی آبادی مراد ہو جو چند گھروں پر مشتمل ہو تو امام بخاری رحمہ اللہ کے ساتھ ناظرین کو اس لئے اختلاف کی گنجائش ہے کہ آگے امام بخاری رحمہ اللہ نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ اس کی تائید نہیں کرتے تو ایسے مقامات پر اتفاق نہ کرنے سے پھر یہ کیسے اور کیونکر ثابت ہوگا کہ ہر ہر باب میں امام بخاری رحمہ اللہ کے ساتھ اختلاف کے لئے کمر باندھ لی جائے۔ جیسا کہ جناب قاضی صاحب کی عبارت سے مفہوم ہوتا ہے۔

اہل قبور کو سلام کہنے کا جواب

جناب قاضی صاحب لکھتے ہیں اور (ص ۱۵۲) میں دلیل پیش کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ ''اتی المقبرۃ فقال السلام علیکم دار قوم مؤمنین و انا ان شاء اللہ بکم لاحقون'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مردے سنتے ہیں۔ اس لئے کہ خطاب اس کو کیا جاتا ہے جو سنے۔ سبحان اللہ! ایک پورا باب ہی حذف کر گئے۔ جناب ایک باب ہے نصب العین کا۔ وہ یہ کہ نہ مخاطب سنتا ہے اور نہ متکلم کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ مخاطب سن رہا ہے بلکہ کمال محبت اور پیار یا درد فراق اور جدائی سے متکلم اس مخاطب کو یوں تصور اور خیال کر لیتا ہے کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ایک ماں کا بچہ مر جاتا ہے اس کو دفن کر آتے ہیں۔ واپس گھر آتے ہیں تو اس کی ماں کہہ رہی ہے اے میرے غمگسار بچے! اے میرے دکھ درد کے یار بچے! اے میری تکالیف میں میرا ساتھ دینے والے بچے! اگر نبی ﷺ کے انتقال کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کہے: ''یا ابتاہ اجاب ربا دعاہ یا ابتاہ من جنۃ الفردوس مأواہ یا ابتاہ الی جبرائیل ننعاہ'' موصوف یہاں بھی فرمائیں گے سنا سنا کر کہہ رہی ہیں۔

پھر آگے ایک صحابی کا قول: ''الا یا رسول اللہ کنت رجاءنا'' نقل کیا اور پھر آگے ''السلام علیک ایہا النبی'' کا تذکرہ کیا ہے اور لکھتے ہیں۔ اگر وظیفہ تعبدی بنائیں تو مقصد نہیں پورا ہوتا۔ انشاء الصلوٰۃ اگر یہاں سے کہیں کہ آپ سن رہے ہیں تو شرک بنتا ہے۔ موصوف فرمائیں گے فرشتے پہنچا دیتے ہیں۔ (ص ۴۰، ۴۱)

الجواب: محترم جناب قاضی صاحب نے یہ جتنی کاوش کی ہے بالکل بے سود ہے۔ اولاً اس لئے کہ کسی فن میں نصب العین کا مستقل باب تو ہے نہیں اور جو مسائل اس سلسلہ میں موجود ہیں جن میں غائبانہ خطاب ہوتا ہے اور تصور کے طور پر دل میں مخاطب کو حاضر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ہم ہرگز منکر نہیں ہیں۔ بفضلہ تعالیٰ ہم نے اپنی کتاب تبرید النواظر اور تفریح الخواطر میں السلام علیک ایہا النبی اور ایسے ہی غائبانہ تخاطب کے سلسلہ میں باحوالہ سیر حاصل بحث اس پر کی ہے۔ لہٰذا ہماری واضح تصریحات کی موجودگی میں ہمیں نصب العین کے باب کا منکر قرار دینا خالص تعبدی اور نری زیادتی ہے۔

ثانیاً: جناب قاضی صاحب نے نصب العین کے سمجھانے میں جتنی مثالیں بیان کی ہیں، یہ سب غائبانہ طور پر

ہیں جو نصب العین کا مصداق ہیں۔ ان غیر متعلق مثالوں سے سلام اہل قبور کا جواب کیسے بنا جس میں زائر قبر پر حاضر ہو کر سنت کے مطابق سلام کہتا ہے۔

ثالثاً: اس حدیث سے سماع الموتی پر استدلال ہم نے نہیں کیا بلکہ اکابر نے کیا ہے۔ جن کی صریح عبارات سماع الموتی میں جا بجا موجود ہیں جن کو قاضی صاحب سیون اپ کی بوتل سمجھ کر پی گئے ہیں۔ چند حوالوں کی طرف ہم یہاں صرف اشارہ ہی کرتے ہیں اور باقی حوالے اسی کتاب میں ملاحظہ کر لیں۔

۱...... حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''قوله السلام عليكم الخ ظاهر حديث الباب وغيره كثير من الاحاديث يدل على سماع الموتى'' (العرف الشذی ص ۳۵۳، سماع الموتی ص ۱۸۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا السلام علیکم کہنا اس باب کی یہ حدیث اور اس کے علاوہ بہت سی حدیثوں کا ظاہر اسی کو چاہتا ہے کہ مردے سنتے ہیں۔

۲...... حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود اس کے سلام اہل قبور مسنون کر دیا۔ اگر استماع ممکن نہیں تو پھر یہ بیہودہ حرکت یعنی سلام اہل قبور ملحدوں کی زبان درازی کے لئے کافی ہے۔''

(جمال قاسمی ص ۸، سماع الموتی ص ۱۶۲)

۳...... حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''فيقول السلام عليكم دار قوم مؤمنين وهذا خطاب لمن يسمع ويعقل'' (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۴۳۸ و کتاب الروح ص ۴، سماع الموتی ص ۱۵۴ و ۱۵۹)

زیارت کنندہ کہے سلام ہو تم پر اے مومنوں کی بستی میں رہنے والو اور یہ ان کو خطاب ہے جو سنتے اور جانتے ہیں۔

یہ اور اس قسم کی دیگر متعدد صریح عبارتیں جناب قاضی صاحب ہضم کر گئے ہیں اور جو بزرگ اس بڑھاپے میں ایک چھٹانک خالص گھی ہضم کر لے ان کے لئے یہ خشک حوالے ہضم کرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔

الفقہ الاکبر کی عبارت کا جواب

جناب قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''اور اسی صفحہ میں فقہ اکبر کی عبارت نقل کرتے ہیں: ''واعادة الروح الى العبد فى قبره حق'' موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ اس قبر سے مراد یہ گڑھا ہرگز نہیں بلکہ عالم برزخ ہے خلط ملط نہ کریں۔'' (ص ۴۶ و ۴۷)

اور (ص ۴۷ و ۴۸) میں لکھتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ کے بندے کچھ تو انصاف کر یہ عذاب قبر کا مسئلہ ہے جس کی بحث علم کلام (علم عقائد) میں ہوتی ہے اور آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ علم فقہ (کتب فقہ) کے باب الجنائز میں قبر سے مراد یہ گڑھا جو کھودا جاتا ہے۔ پھر دفن کر کے اوپر مٹی ڈالی جاتی ہے اور علم کلام میں قبر سے یہ گڑھا نہیں ہوتا جس کو دریا برد کیا جاتا ہے، مچھلیاں کھا جاتی ہیں، جن کی لاشیں جلا دی جاتی ہیں۔ ان کو بھی عذاب قبر ہوتا ہے، پسلیاں آر پار ہوتی ہیں، ہتھوڑوں سے مارا جاتا ہے۔ وغیرہ! وہاں اس گڑھے کا نشان بھی نہیں۔ بے شک اس گڑھے سے بھی گاہ بگاہ خرق عادت کے طور پر آواز آ جاتی ہے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خچر نے سنی تو کودی۔ لیکن علم کلام میں جہاں عذاب قبر کی بحث ہوتی ہے اور جس علم کا یہ مسئلہ ہے، وہاں قبر سے مراد یہ گڑھا نہیں لیتے۔ بلکہ عالم برزخ مراد لیتے ہیں۔ وہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ کیا آپ نے شرح عقائد خیالی حاشیہ شرح عقائد نہیں پڑھے، نہیں دیکھے۔ آج تک ان کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ وہاں کیا لکھا

ہے؟ اور اگر پڑھے، دیکھے اور سمجھے ہیں تو آپ کی دیانت یہ اجازت دیتی ہے کہ معاملے کو ایسا خلط ملط اور گڈ مڈ کر کے پیش کریں کہ ناظرین کتاب یہ سمجھیں کہ یہ سب کچھ اسی گڑھے میں ہو رہا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!''

الجواب: جناب قاضی صاحب نے اس مضمون میں ایسی نکمی اور کمزور باتیں تحریر کی ہیں جن پر تعجب ہوتا ہے۔ اولاً اس لئے کہ یہ تفریق کہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے نزدیک قبر اس گڑھے کا نام ہے جس میں مردے کو دفن کیا جاتا ہے اور حضرات متکلمین رحمہم اللہ کے نزدیک قبر اس گڑھے کا نام ہی نہیں بلکہ صرف برزخ کا نام ہے۔ خالص اختراعی تفریق ہے جو شیخ چلی کی کہانی سے بڑھ کر نہیں۔

ثانیاً: جناب قاضی صاحب کی عبارت کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے نزدیک مردے تو دفن کے بعد گڑھے میں کچھ عرصہ رہتے ہیں، لیکن حضرات متکلمین رحمہم اللہ کے نزدیک دفن کے فوراً بعد ان کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے یا ان کو سمندر یا کوئی اور دریا بہا کر لے جاتا ہے یا مچھلیاں فوراً ہڑپ کر جاتی ہیں اور اس گڑھے میں اس کا نام و نشان تک نہیں رہتا۔

ثالثاً: حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ اگر فتح القدیر میں جو فقہ کی کتاب ہے لفظ قبر بولیں تو اس سے مراد وہ گڑھا ہوگا جس میں مردے کو دفن کیا جاتا ہے اور کچھ عرصہ وہ رہتا ہے اور وہی جب المسایرہ میں جو علم کلام کی کتاب ہے یہ لفظ بولیں تو وہ گڑھا فوراً برزخ بن جائے گا اور مردہ سوختہ اور دریا برد ہو جائے گا یا اس کو مچھلیاں نگل جائیں گی۔ تعجب ہے کہ جناب قاضی صاحب کیا فرما رہے ہیں۔

رابعاً: بفضلہ تعالیٰ ہم نے (تسکین الصدور ص ۸۱ تا ۸۳) میں قرآن کریم اور صحیح احادیث سے قبر کا حقیقی معنی عرض کر دیا ہے کہ یہی گڑھا ہے اور پھر (ص ۸۴ تا ۸۵) میں قبر کا مجازی معنی برزخ باحوالہ بیان کیا ہے جس میں ہم علامہ قرطبی، حافظ ابن القیم اور امام سیوطی (رحمہم اللہ) کے حوالوں سے ان مردوں کے بارے جن کا جانور اور مچھلیاں کھا جائیں یا سوختہ یا دریا برد ہو جائیں یا مصلوب وغیرہ ہوں یا راحت قبر کا مطلب عرض کر دیا ہے وہاں ہی ملاحظہ کر لیا جائے۔

وخامساً: ہم نے (تسکین الصدور میں ص ۱۷۰ تا ۱۸۱) المسامرہ، المسایرہ، اصول الدین، التمہید، الاقتصاد فی الاعتقاد، شرح عقائد، نبراس، الخیالی علامہ ایوبی رحمہ اللہ، علی الخیالی رحمہ اللہ، تمہید، الدوانی علی العقائد العضدیۃ وغیرہ علم کلام کی مشہور اور مستند کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ جن سے راحت اور عذاب قبر کا ثبوت روح اور جسد عنصری دونوں کے لئے ثابت کیا گیا ہے اور یہ تمام حضرات بدن مادی اور عنصری کو ملحوظ رکھ کر باطل فرقوں کو جواب دیتے ہیں۔ جب بدن سے بدن مادی اور عنصری مراد ہو تو قبر سے یہی گڑھا مراد ہے جیسا کہ کسی بھی اہل علم پر یہ مخفی نہیں۔ راقم اثیم بفضلہ شرح عقائد مسامرہ اور خیالی وغیرہ پڑھا پڑھا کر بوڑھا ہو گیا ہے اور تسکین الصدور میں حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کی عبارات کے پہلو بہ پہلو حضرات متکلمین رحمہم اللہ کی ان ٹھوس اور صریح عبارتوں کے پیش نظر ہی محترم قاضی صاحب نے اپنا سابق نظریہ کہ تعلق روح بالجسم العنصری کا نام تک نہیں ملتا۔ بلکہ روایات میں صراحۃً اس تعلق کی نفی ملتی ہے۔ (مسالک العلماء ص ۳۷) اور (۳۰) میں لکھا کہ: ''تعلق روح بالجسد العنصری کا اشارہ تک بھی نہیں ملتا۔'' ترک کر کے یہ اقرار کیا کہ اور فقہاء کرام رحمہم اللہ اور متکلمین کے نزدیک یہ جسم خواہ ریزہ ریزہ ہو چکا ہو پھر بھی قبر کے عذاب و ثواب اور تألم وتلذذ میں وہ روح کا شریک ہے اور فتویٰ بھی فقہاء کرام رحمہم اللہ کے قول پر دینا چاہئے۔

(تسکین القلوب ص ۴۷، ونحوہ، التعلقیق الفصیح علی المشکوۃ المصابیح ج ۱ ص ۳۹)

اور یہ تسکین الصدور میں حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ اور حضرات متکلمین رحمہم اللہ کی واضح اور ٹھوس عبارات کا نتیجہ تھا کہ جناب قاضی صاحب نے اپنے سابق غلط نظریہ سے رجوع کر لیا جو علمی طور پر قابل قدر بات ہے۔ اگر ہم نے شرح عقائد اور خیالی وغیرہ نہ پڑھی نہ سمجھی اور نہ پڑھائی ہوتیں تو ان کی پیش کردہ صریح عبارات سے جناب قاضی صاحب کیونکر متاثر ہوتے اور اپنا باطل نظریہ کیوں چھوڑتے؟ اندریں حالات ان کا یہ طعنہ کہ یہ کتابیں ہم نے نہیں دیکھیں یا نہیں سمجھیں نرے جذبات کا بخار ہے اور بس۔

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ کے حوالہ کا جواب

جناب قاضی صاحب لکھتے ہیں: ''اور (۱۹۳) پر حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کا حوالہ دیا کہ وہ یہ کہ اکثر کا یہی نظریہ ہے کہ مردے سنتے ہیں۔ جناب کیوں نہ ہو جب کہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کا یہ نظریہ ہے کہ روح قبر کے پاس رہتی ہے۔ اب یہ آپ فیصلہ کریں کہ قبر کے پاس کہنا بہتر ہے یا علیین، سجین میں کلا ان کتاب الابرار لفی علیین'' (ص ۴۹)

الجواب: ہم نے سماع الموتی (ص ۱۹۲ تا ۱۹۵) میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی کتاب احکام القرآن حزب خامس (۱۰۴ تا ۱۰۶) کے حوالہ سے مفصل عبارات نقل کی ہیں جن میں یہ بات بھی تھی کہ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر حضرات فی الجملہ سماع موتی کے قائل ہیں اور نیز لکھتے ہیں کہ اور اسی سے ان روایات میں جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں توافق پیدا ہو جاتا ہے اور ہمارے مشائخ (علماء دیوبند دامت برکاتہم) کا بھی یہی مختار ہے (وهو مختار مشائخنا) مگر ان تمام صریح اور واضح عبارات اور حوالوں کو جناب قاضی صاحب پی گئے ہیں اور صرف امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ کا نام لے کر ہی بات کو ٹرخا گئے ہیں۔ عندالقبور سماع موتی کے صرف امام ابو عمر ابن عبدالبر رحمہ اللہ ہی قائل نہیں کہ اتنی بات کہہ کر پیچھا چھڑا لیا جائے کہ چونکہ وہ روح کو قبر کے پاس مانتے ہیں، اس لئے وہ سماع موتی کے قائل ہیں۔ کیونکہ متعدد مرفوع احادیث سے سماع عندالقبور ثابت ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عندالقبر صلوٰۃ وسلام کا سماع، مردوں کو السلام علیکم کہنا جو ظاہراً ان کے سماع پر دال ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی صحیح مرفوع حدیث کہ جب بھی کوئی شخص کسی مسلمان بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے اور وہ اسے سلام کہتا ہے تو وہ سلام سنتا اور جواب دیتا ہے۔ یہ تمام احادیث صراحۃً سماع موتی پر دال ہیں۔

ان تمام احادیث کی صحت پر سیر حاصل بحث سماع الموتی اور تسکین الصدور میں مذکور ہے جن کا بجز السلام علیکم کی حدیث کے جناب قاضی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس جواب کا حال بھی آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اگرچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سماع موتی کا انکار کرتی تھیں۔ لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''وقد خالفها الجمهور في ذالك وقبلوا احديث ابن عمر رضی اللہ عنہ لموافقته من رواه غيره عليه''

(فتح الباری ج ۳ ص ۲۷۷، سماع الموتی ص ۲۸۳)

جمہور نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کو (جو دال علی السماع ہے) لیا ہے۔ کیونکہ دوسرے حضرات کی روایتیں ان کے موافق ہیں۔

الحاصل امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ سماع کے مسئلہ میں متفرد نہیں ہیں۔ جمہور اہل اسلام ان کے موافق ہیں اور

بڑی تفصیل کے ساتھ ہم نے ان کے حوالے کتاب سماع الموتی میں عرض کر دیئے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ کیا امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ ارواح کو قبور ہی کے پاس مانتے ہیں اور ان کا تعلق جنت علیین اور ملاء اعلیٰ سے نہیں تسلیم کرتے۔ صحیح بات یہ ہے کہ جیسا کہ دیگر جمہور اہل اسلام ارواح کا مستقر جنت علیین اور ملاء اعلیٰ یا سجین تسلیم کرتے ہیں اور قبر کے ساتھ بھی ان کا تعلق مانتے ہیں۔ یہ نہیں کہ قبر کے پاس ہی ارواح کا مسکن اور گھر مانتے ہیں۔ اسی طرح امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ بھی مانتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''وقد وافق ابو عمر علی ان ارواح الشهداء فی الجنة ویسلّم علیهم عند قبورهم کما یسلّم علی غیرهم کما علّمنا النبی ﷺ ان نسلم علیهم و کما کانت الصحابة یسلّمون علی شهداء احد وقد ثبت ان ارواحهم فی الجنة تسوح حیث شاءت کما تقدم ولا یضیق عطنک عن کون الروح فی الملاء الاعلی تسوح فی الجنة حیث شاءت وتسمع سلام المسلّم علیها عنه قبرها وتدنو حتی ترد علیه السلام وللروح شان آخر غیر شان البدن''

امام ابوعمر بن عبدالبر رحمہ اللہ اس بات میں (جمہور سے) موافقت کرتے ہیں کہ شہداء کی ارواح جنت میں ہیں اور باوجود اس کے وہ فرماتے ہیں کہ شہداء کی قبور کے پاس انہیں سلام کہنا چاہئے جیسا کہ دوسرے لوگوں کو سلام کیا جاتا ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم اہل قبور کو سلام کہیں اور جیسا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہدائے احد کو سلام کہتے تھے۔ حالانکہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ ان کی ارواح جنت میں ہیں جہاں چاہتی ہیں جاتی ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور تیرا باڑہ (جس میں اونٹ یا بھیڑ بکریاں باندھی جاتی ہیں۔ مراد یہاں دل ہے جس میں طرح طرح کے خیالات اور علوم جمع رہتے ہیں) اس سے تنگ نہ ہو کہ روح ملاء اعلیٰ میں ہوتے ہوئے بھی جنت میں جہاں چاہے سیر کر سکے۔ ومع ہذا! قبر کے پاس سلام کہنے والے کے سلام کو سنے اور قریب ہو اور سلام کا جواب لوٹائے۔ کیونکہ روح کا معاملہ بدن کے معاملہ سے الگ اور جدا ہے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ امام ابوعمر ابن عبدالبر رحمہ اللہ ارواح کا جنت، ملاء اعلیٰ اور قبور سب سے باقاعدہ تعلق تسلیم کرتے ہیں اور عندالقبور سلام کے سماع اور رد جواب کے قائل ہیں نہ جیسا کہ جناب قاضی صاحب سمجھے ہیں کہ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ اس لئے سماع موتی کے قائل ہیں کہ وہ ارواح کو صرف قبور کے پاس ہی مانتے ہیں اور دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے جو جناب قاضی صاحب کو نظر نہیں آ رہا۔

قتلیٰ بدر اور سماع موتی

ہم نے کتاب (سماع الموتی ص ۲۱۱ تا ۲۲۴) میں مقتولین بدر کے بارے میں آنحضرت ﷺ کے ارشاد: ''ما انتم باسمع لما اقول منهم'' الحدیث کا کتب حدیث سے حوالہ دے کر آگے حضرت قتادہ رحمہ اللہ کے قول کا باحوالہ رد کیا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ سماع مقتولین بدر سے خاص تھا۔ پھر آگے ہم نے علامہ طیبی، ملا علی القاری، امام نووی، حافظ ابن تیمیہ امام علی بن عبدالکافی السبکی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، امام قرطبی، علامہ عبدالعلی بحر العلوم، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، علامہ آلوسی اور علامہ دوؤد بن سلیمان البغدادی (رحمہم اللہ) وغیرہ کے صریح حوالوں سے عبارات نقل کی ہیں کہ یہ سماع مقتولین بدر سے خاص نہ تھا بلکہ تمام موتی سے متعلق ہے لیکن جناب

قاضی صاحب نے نہ تو ان میں سے کسی ایک عبارت کا حوالہ دیا ہے اور نہ ان واضح تر عبارات اور حوالوں میں سے کسی ایک کا جواب دیا ہے۔ اس تمام مدلل اور باحوالہ بحث کو ہڑپ کر گئے ہیں اور صرف اپنی رام کہانی سنانے پر اکتفاء فرمائی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''اور (۲۱۱) میں قتلیٰ بدر کے متعلق جو حدیث ہے جن کو قلیب بدر میں ڈالا گیا تھا ذکر کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ما انتم باسمع لما اقول منھم'' نہیں تم بہتر سننے والے اس بات کو جو میں ان سے کہہ رہا ہوں یعنی یہ تم سے بھی زیادہ سن رہے ہیں۔ مولانا! دیانت سے کام لیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈریں۔ کیا ''انک لا تسمع الموتی'' اور ''ما انت بمسمع من فی القبور'' اس سے پہلے اتر نہیں چکی تھیں۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کا کیا معنی سمجھا ہوا تھا؟ کیا ذہن نشین کیا ہوا تھا۔ یہی جو آپ کرتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اگر یہی سمجھا ہوا تھا جو آپ محققانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں تو صحابہ کا وہ ذہن وہ نظریہ کہاں سے بنا تھا جس کی بناء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ حضرت آپ ان مردہ لاشوں کو کیا سناتے ہیں؟ پھر دوسرے بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پاس کھڑے ہیں کسی ایک نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہ ٹوکا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ سب کا نظریہ یہی تھا۔ سب اس سے متفق تھے کہ مردے نہیں سنتے۔ پھر آپ دیانت سے جواب دیں کہ نبی ﷺ نے اپنے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ کلیہ کو توڑا کہ مردے نہیں سنتے اور اس کی جگہ یہ کلیہ بیان کیا کہ مردے سنتے ہیں یا صرف قلیب بدر والوں کے متعلق فرمایا کہ: ''ما انتم باسمع منھم'' قانون کو نہیں توڑا۔ قانون بحال رکھا کہ مردے نہیں سنتے۔ صرف قلیب بدر والوں کے متعلق فرمایا کہ: ''ما انتم باسمع منھم'' اور صرف ان کو مستثنیٰ کیا۔ پھر جب کہ نبی ﷺ نے قانون اور کلیہ کو نہیں توڑا تو آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ جس کلیہ اور قانون کو نبی ﷺ نے نہیں توڑا اور بحال رکھا اس کو آپ توڑیں اور اس کی جگہ خود ساختہ من گھڑت کلیہ رکھیں کہ سب مردے سنتے ہیں۔ یہ حق آپ کو حاصل نہیں۔'' (ص ۴۹، ۵۰)

الجواب: محترم قاضی صاحب نے یہاں جس دفع الوقتی سے کام لیا ہے وہ ایک نرالا عجوبہ ہے اور ان کو کسی طرح سود مند نہیں ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ واقعی ''انک لا تسمع الموتی وغیرھا'' اس مضمون کی آیات پہلے نازل ہو چکی تھیں لیکن ان میں نہ تو عدم سماع موتی کا کوئی کلیہ بیان ہوا ہے اور نہ قانون۔ ان آیات کو عدم سماع موتی کے لئے کلیہ اور قانون بنانا جناب قاضی صاحب کی نری اختراع ہے۔ قانون اور کلیہ اہل لسان کے لئے بڑی واضح چیز ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جمہور ائمہ اس قانون اور کلیہ کی کبھی مخالفت نہ کرتے اور سماع موتی کے کبھی قائل نہ ہوتے۔

ثانیاً: اگرچہ منکرین سماع موتی نے ''انک لا تسمع الموتی'' وغیرہا آیات سے بزعم خویش عدم سماع موتی پر استدلال کیا ہے لیکن یہ استدلال قطعی نہیں ورنہ قائلین سماع موتی قطعی الدلالۃ معنی سے ہرگز ہرگز انکار نہ کرتے ورنہ کافر ہو جاتے اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے بلکہ مولانا حقانی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق ان آیات میں تو عدم سماع کا اشارہ تک بھی نہیں ہے۔ (تفسیر حقانی ج ۶ ص ۱۴۱) اور بقول حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ ان تینوں آیتوں میں یہ بات قابل نظر ہے کہ ان میں کسی میں یہ نہیں فرمایا کہ مردے نہیں سن سکتے بلکہ تینوں آیتوں میں نفی اس کی کی گئی ہے کہ آپ نہیں سنا سکتے۔ (معارف القرآن ج ۶ ص ۵۹۰) بڑی عجیب بات ہے کہ ان حضرات کے نزدیک تو ان آیات میں عدم سماع کا اشارہ تک بھی نہیں۔ لیکن محترم جناب قاضی صاحب عدم سماع کو قانون اور کلیہ قرار دیتے ہیں۔

ثالثاً: اگر عدم سماع موتی کا کوئی قانون اور کلیہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اور خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں ہوتا تو اس موقع پر ضرور وہ اس کا حوالہ دیتے کہ حضرت! قانون اور کلیہ تو عدم سماع ہے آپ اس کے خلاف کیوں کرتے ہیں؟ اور دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو بدری تھے اس موقع پر اس قانون اور کلیہ سے کبھی چپ نہ سادھ لیتے۔ اس سے یقیناً ثابت ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اذہان میں عدم سماع کا کوئی قانون اور کلیہ نہ تھا اور اس کو قانون اور کلیہ کہنا من گھڑت اور ایجاد بندہ ہے۔

رابعاً: حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے اس غلط فہمی میں مبتلاء تھے کہ چونکہ یہ بے جان جسم ہیں۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کیسے خطاب کرتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غلطی نکالی اور فرمایا کہ بخدا تم ان سے زیادہ نہیں سنتے۔ یعنی یہ تم سے بھی زیادہ سنتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ جناب قاضی صاحب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غلطی کو تو قانون اور کلیہ کا درجہ دیتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلفیہ اور صریح ارشاد کو جو قولی شکل میں اس کو قانون اور کلیہ بنانے پر آمادہ نہیں۔ حالانکہ اصول حدیث کی رو سے آپ کا قول امت کے لئے قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ حضرت آپ مجھے اپنے نفس کے علاوہ باقی سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بخدا جب تک کہ تو مجھے اپنے نفس سے بھی زیادہ محبوب نہ سمجھے بات نہیں بنتی۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بخدا آپ مجھے اپنے نفس سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''الآن یا عمر'' (بخاری ج ۲ ص ۹۸۱) یعنی عمر رضی اللہ عنہ اب بات بنی۔

جیسے اس مقام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غلط رائے کی اصلاح ہوئی یہاں بھی ہوئی۔ حیرت ہے کہ جناب قاضی صاحب حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن اور سابق غلط نظریہ کو کہتے ہیں کہ کیا بنا ہوا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نظریہ اور ذہن اور صریح ارشاد کو ملحوظ نہیں رکھتے کہ کیا تھا؟

الحاصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور باقی بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ ذہن اور نظریہ بن گیا کہ مردے سنتے ہیں اور اسی کو جمہور امت نے لیا ہے اور حدیث: ''ما انتم باسمع لما اقول منهم'' سے باقاعدہ استدلال کیا ہے۔

مسئلۂ توسل واستشفاع عند القبر

ہم نے (سماع الموتی ص ۱۱۶ تا ۱۲۰) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر طلب شفاعت اور توسل کا ٹھوس اور صریح حوالوں سے اثبات کیا ہے جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم اور دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق مروی ہے۔ اس سلسلہ میں جناب قاضی صاحب فرماتے ہیں: پھر (ص ۱۱۶) پر ایک اعرابی کا قصہ نقل کیا الیٰ قولہ اس پر موصوف نے بڑا زور لگایا کہ اسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تائید حاصل اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس سے اتفاق ہے۔ الیٰ آخر ما قال! سو گزارش ہے کہ اگر یہ ہے تو علی الرأس والعین۔ لیکن یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو معمول بنایا اور اکثریت نے استسقاء کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر جا کر بارش کے لئے دعا کی درخواست کریں۔ کلا وحاشا ہرگز ایسا نہیں۔ حضرت امیر عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل مستمر اور طریق کار یہ تھا کہ جو (مشکوٰۃ ص ۱۳۲) بحوالہ بخاری لکھا ہے: ''عن انس ان عمر بن الخطاب کان اذا قحطوا (الحدیث)'' (حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں) موصوف کو چاہئے کہ لفظ: ''کان اذا قحطوا استسقی'' کو غور سے دیکھ لے کہ یہ استمرار

بنتا ہے یا نہیں۔اب حیرانی ہے کہ موصوف اس قصہ اسے اغماض کیونکر گئے۔شاید اس لئے کہ اس سے موصوف کے ایک اور نظریہ مبارکہ پرزد پڑتی ہے۔اس لئے کہ اگر نبی ﷺ مدینہ منورہ روضۂ خضراء میں زندہ بحیات دنیویہ ہیں تو پھر عباس رضی اللہ عنہ کو لانے کی کیا ضرورت ہے۔روضۂ خضراء کے پاس کھڑے ہو کر کہہ دیں۔''اللّٰھم نتوسل بنبیک فاسقنا''

بے خودی بے سبب نہیں حافظ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

(بلفظہٖ ص ۲۶ و ۲۷)

الجواب: جناب قاضی صاحب کی یہ عبارت اس لحاظ سے قابل داد اور باعث صد تحسین ہے کہ انہوں نے حضرت بلال بن الحارث المزنی رحمہ اللہ کا بسند صحیح یہ واقعہ علی الرأس والعین تسلیم کر لیا ہے جس کو خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تائید اور تصدیق حاصل ہے اور اپنی جماعت کے بعض ضدی اور متعصب ساتھیوں کی کہ میں نہ مانوں کی رٹ سے گریز کیا ہے اور علماء کی یہی شان ہونی چاہئے کہ صحیح بات کو تسلیم کر لیں اور دوسرے لوگوں کی الدین النصیحۃ کے پیش نظر ان کی غلطیوں کی علمی اور تحقیقی لحاظ سے اصلاح کی کوشش کریں تاکہ دارین کی سعادت حاصل ہو لیکن تسلیم کے ساتھ ساتھ جو باتیں انہوں نے تحریر فرمائی ہیں وہ کافی حد تک قابل توجہ ہیں۔

اوّلاً: اس لئے کہ ہم نے یہ نہیں کہا کہ اس طریق کو ایسا معمول بنا لیا جائے کہ اس کے بغیر کسی اور طریق سے دعاء نہ کی جائے۔ہم نے تو مؤلف ندائے حق کے اس باطل دعویٰ کی تردید کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ بس اب ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ جتنی کتابوں میں (مثلاً نورالایضاح، فتح القدیر، فتاویٰ عالمگیری، رسائل الارکان لبحر العلوم، وفاء الوفاء، طحطاوی، لباب المناسک، المسلک المتقسط، کتاب الاذکار للنووی، الایضاح فی مناسک الحج ل، شرح شفا ملا علی القاری، فتاویٰ رشیدیہ اور زبدۃ المناسک وغیرہ وغیرہ کتابیں جن میں یہ مسئلہ درج ہے اور ان کی عبارتیں ہم نے تسکین الصدور میں باحوالہ درج کر دی ہیں۔صفدر)

یہ مسئلہ قبر پر حضور ﷺ سے دعاء استغفار، استشفاع کا جو معتبر کتب میں لکھا جا چکا ہے وہ باغیوں کا لکھا ہوا ہے اور بس۔'' (ندائے حق ص ۳۱۱)

اور نیز لکھتے ہیں کہ اب اگر قبر کے پاس جا کر صلحاء صدیقین اور انبیاء کو پکارنا اور ان کا شفعائنا عند اللہ ہونا محقق اور ثابت ہوتا اور یہ اعتقاد شرک نہ ہوتا تو خدا تعالیٰ استثناء فرما دیتے۔ (ندائے حق ص ۲۹۹)

گویا مؤلف ندائے حق کے باطل نظریہ سے یہ تمام مصنفین مشرک اور معلم شرک تھے اور ان تمام معتبر کتابوں میں باغیوں نے گھس کر ہیرا پھیری کر دی ہے۔معاذ اللہ تعالیٰ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ علم تحقیق اور دیانت شاید اسی کا نام ہے۔

قارئین کرام! خود انصاف اور غور سے ملاحظہ کریں کہ جناب قاضی صاحب نے مؤلف ندائے حق اور اس غلط نظریہ میں ان کے حامیوں کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا اور نہ ان کو روکا ٹوکا ہے اور نہ انہیں کوئی نصیحت ہی فرمائی ہے کہ غلو سے باز آجاؤ اور کوئی کتاب اور رسالہ ان کے خلاف نہیں لکھا۔لیکن تسکین الصدور اور سماع الموتی میں واضح ٹھوس اور مدلل حوالوں کو رد کرنے کا ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور ان کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔کیا یہ قول کہ بے خودی بے سبب نہیں غالب ان پر چسپاں نہیں ہوتا۔

ثانیاً: بفضلہ تعالیٰ ہم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث: ''انا نتوسل الیک'' کی مفصل باحوالہ بحث (تسکین الصدور ص ۴۱۲ تا ۴۱۷) میں کردی ہے جس کا کوئی جواب تا ہنوز ہمیں نہیں ملا۔ اس کتاب میں جناب قاضی صاحب اس بحث کو ملحوظ فرمالیں اور ہم نے اس سے قطعاً اغماض نہیں کیا۔ جیسا کہ قاضی صاحب کا ہم پر بے بنیاد الزام ہے اور ہم آنحضرت ﷺ کی جس حیات کے قائل ہیں جس کی بحث پہلے گزر چکی ہے، اس پر اس حدیث سے کوئی زد نہیں پڑتی اور نہ ہمارا کوئی نظریہ باطل ہے اور نہ باطل ہوتا ہے۔ یہ جناب قاضی صاحب کا صرف شیخ چلّی کا پلاؤ ہے۔

ثالثاً: جناب قاضی صاحب نے میزان الصرف وغیرہ میں یہ قاعدہ پڑھا ہے کہ حرف کان جب ماضی پر داخل ہو تو ماضی استمراری بن جاتی ہے۔ اس سے آپ یہ سمجھے کہ ہمیشہ لفظ کان استمرار ہی کا فائدہ دیتا ہے اور یہ قاعدہ کلیہ بن جاتا ہے۔ حالانکہ جناب قاضی صاحب کو بھی بخوبی معلوم ہے کہ جس قاعدہ کو کلیہ کہا جاتا ہے وہ بھی اکثر یہی ہوتا ہے۔ قاعدہ کلیہ صرف یہ ہے: ''ان لا کلیة''

امام نووی رحمہ اللہ ایک مقام پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ولا تغتر بقولها کان یصلّی فان المختار الذی علیه الاکثرون والمحققون من الاصولیین ان لفظة کان لایلزم منها الدوام ولا التکرار وانما هی فعل ماض یدلّ علی وقوعه مرة فان دلّ دلیل علی التکرار عمل به الاّ فلا تقتضیه بوضعهما'' کہ تم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کان یصلّی سے استمرار کا دھوکا نہ کھانا اس لئے کہ جو بات اکثر اور محقق اصولیوں کے نزدیک مختار ہے وہ یہ ہے کہ حرف کان سے دوام اور تکرار لازم نہیں آتا۔ یہ تو فعل ماضی ہے صرف ایک دفعہ کے وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ اگر کوئی (خارجی) دلیل تکرار پر دلالت کرے تو اس پر عمل کیا جائے گا ورنہ لفظ کان اپنی وضع کے لحاظ سے تکرار و دوام کو نہیں چاہتا۔ (نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۲۵۴)

محترم جناب قاضی صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اس قاعدہ پر بھی ٹھنڈے دل سے غور فرمالیں۔ اس لحاظ سے اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ قحط سالی میں ایک دفعہ بھی اس حدیث پر عمل ہوا ہو تو کافی ہے۔ استمرار لازم نہیں آتا اور اس کے ساتھ حضرت بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو بھی جو خلیفہ راشد اور دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مصدقہ ہے اور صحیح سند سے ثابت ہے، ملحوظ رکھیں۔ محض اعرابی کا قصہ کہہ کر نظرانداز نہ کردیں۔ کیونکہ جمہور امت کا حج کے موقع پر استشفاع عند القبر پر اتفاق اور تعامل رہا ہے اور اب بھی ہے اور دلائل واضحہ سے ثابت ہے کہ مجموعی لحاظ سے آنحضرت ﷺ کی امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کا محافظ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے تمام مسلمانوں کو قرآن و سنت اور سلف صالحین کے دامن سے وابستہ رکھے اور تشتت و افتراق اور تحزب و تعصب سے محفوظ رکھے اور اعجاب کل ذی رأی برأیہ اور ذاتی انا سے بالاتر رکھے اور بزرگوں کے ادب و احترام کا ذوق و شوق مزید بڑھائے اور انفرادیت سے بچائے۔ آمین ثم آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علیٰ رسوله خیر خلقه وعلیٰ اٰله واصحابه وازواجه وجمیع متبعیه الیٰ یوم الدین آمین یارب العالمین!

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز

خطیب جامع مسجد گکھڑ وصدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

۹ رجب ۱۴۰۳ھ / ۲۳ اپریل ۱۹۸۳ء

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ
بَلْ أَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (القرآن)

اَلْاَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّوْنَ (الحدیث)

المسلک المنصور

فی ردّ

الکتاب المسطور

تالیف: شیخ الحدیث

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ

جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ (القرآن)

"اَلْاَنْبِيَاءُ اَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ" (الحدیث)

دی اس نے جان عشق میں توحید کے لیے مُردوں کو تُو نے زندہ جاوید کر دیا

المسلک المنصور

فی رد

الکتاب المسطور

حصہ اوّل

لیکن الصدور میں اُمت مسلمہ کے اتفاقی و اجماعی عقیدہ کو صریح اور مضبوط دلائل سے اُجاگر کیا گیا ہے کہ اَلْاَنْبِيَاءُ اَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ اور یہ حیات گو اس دُنیا میں رہنے والوں کے ادراک و شعور اور حس سے بالاتر اور وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ میں داخل مگر ہے اُن اجساد مطہرہ کے بواسطہ ارواح طیبہ کے تعلق سے جو دُنیا میں حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل تھے اور اسی حیات کے آثار میں سے ہے کہ عند القبر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صلوٰۃ وسلام سُنتے اور اُس کا جواب دیتے ہیں لیکن جناب نیلوی صاحب یہ کہتے ہیں کہ قبور میں حیات الانبیاء کا عقیدہ معتزلہ، جہمیہ معطلہ، منافقوں، روافض، قادیانیوں، ہندوؤں اور بریلویوں کا ہے (معاذ اللہ تعالیٰ)

اس پیش نظر کتاب میں ان کے باطل نظریہ کو باحوالہ نقل کر کے اس کا علمی اور تحقیقی تجزیہ کیا گیا ہے قارئین کرام خود فیصلہ کر لیں۔ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ ○

ابو الزاہد محمد سرفراز خطیب جامع مسجد گکھڑ، و صدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تفصیلی فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(حرفے چند)

ہمارے بزرگ اور مخدوم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے مشہور زمانہ کتاب "تسکین الصدور" لکھی جس کا مولانا محمد حسین نیلوی نے "الکتاب المسطور فی جواب تسکین الصدور المعروف بہ ندائے حق" تحریر فرمائی۔ اس کا جواب حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے "سماع موتی" کے نام سے تحریر فرمایا۔ اس میں سے بعض مباحث کو مزید اجاگر کرنا تھا تو دوسرا جواب "المسلک المنصور فی رد کتاب المسطور" کے نام سے تحریر فرمایا اس مجموعہ میں یہ کتاب "المسلک المنصور فی رد الکتاب المسطور" شامل اشاعت ہے۔ یاد رہے کہ اس عنوان پر مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کی چار کتابیں ہیں۔ چاروں یکجا اس مجموعہ میں شامل اشاعت ہیں۔ الحمد للہ حمداً کثیراً! (ناشر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض حال

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد!

راقم اثیم نے ۱۳۸۷ھ میں اکابر علماء دیوبند کے حکم اور ان کے قیمتی علمی مشوروں سے کتاب "تسکین الصدور" تالیف کی تھی۔ بحمد اللہ تعالیٰ اس کو پاک و ہند کے جید اور مشہور علماء کرام نے بہت ہی پسند فرمایا اور سراہا اور اپنی علمی تصدیقات و تقریظات سے اسے مزین کیا جس سے اہل علم میں بہت سے شکوک و شبہات دور ہو گئے اور اہل السنت والجماعت کا حق اور صحیح مسلک مدلل و مبرہن ہو گیا۔ لیکن محترم جناب نیلوی صاحب نے تعصب، عناد اور ہٹ دھرمی کے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر مسلک حق کو بالکل ناحق طور پر روندنے اور کچلنے کے لئے پہلے تو ندائے حق میں اور اب الکتاب المسطور میں ناروا سعی کی ہے۔ اہل علم تو ان کی اس بے جا روش اور مغالطہ آفرینی سے کبھی بھی دھوکہ نہیں کھاتے اور نہ کھا سکتے ہیں۔ کیونکہ عقل و خرد کی دولت رب تعالیٰ نے اس لئے دی ہے کہ صحیح و سقیم کی پرکھ کی جائے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے عقلاء سے دنیا خالی نہیں ہے۔ لیکن دنیا میں کچھ لوگ ضدی، دھڑے بند اور متعصب بھی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو تو خدا تعالیٰ کے معصوم پیغمبر بھی نہیں منوا سکے۔ ہاں! مگر حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے دلائل و براہین کے لحاظ سے اتمام حجت کر دی گئی ہے۔ ہم نے بھی محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اتمام حجت کے طور پر الکتاب المسطور میں درج شدہ زیادتیوں، خامیوں اور چیرہ دستیوں پر سرسری اور طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے عوام الناس کو آگاہ کیا ہے اور حق و منصور مسلک کے دفاع کا فرض کفایہ ادا کرنے کی حتیٰ المقدور سعی کی ہے۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ جناب نیلوی صاحب اور راقم اثیم کی باتوں کا تقابل کر کے صحیح بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اگر علمی طور پر اس کتاب میں کوئی بات غلط نظر آئے تو بلا جھجک راقم اثیم کو اطلاع دیں۔ ان شاء اللہ العزیز! سمجھ آنے پر غلط بات کی تصحیح میں تأمل نہیں کیا جائے گا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی رسولہ خیر خلقہ محمد و علی آلہ واصحابہ وازواجہ واتباعہ الی یوم الدین۔ آمین!

ابو الزاہد محمد سرفراز

مؤرخہ ۱۰ رجب ۱۴۰۶ھ بمطابق ۲۲ مارچ ۱۹۸۶ء

باب اوّل

الحمد للہ الذی قال فی حق الشہداء بل احیاء عند ربہم یرزقون والصلوٰۃ والسلام علی من قال الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون۔ وعلی من تبعہ الی یوم الدین۔

جناب نیلوی صاحب لکھتے ہیں: "اما بعد بندہ ہیچمدان خادم علوم قرآن محمد حسین النیلوی غفر اللہ لہ والوالدیہ ولاساتذتہ عارض ہے کہ ۱۵ سال کا عرصہ ہو چکا ہے کہ بریلویہ عقیدہ کی تردید میں شفاء الصدور کتاب لکھی تھی۔ پھر امید کے بالکل برعکس بریلوی چپ سادھ ہو گئے، مگر دیوبند دارالعلوم کے فارغ جو قبل ازیں رد بریلویت میں تسلی بخش کام کرتے

رہے ہیں۔یعنی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب نے شفاء الصدور کی تردید میں تسکین الصدور لکھی۔ پھر ندائے حق میں حق واضح کیا گیا۔ چاہئے تھا کہ مشن ایک ہونے کی وجہ سے خاموش ہو جاتے مگر سماع الموتیٰ اور طبع جدید تسکین الصدور لکھ کر بریلویت کے خشک درخت کو پانی دے دیا جس سے وہ ہرا ہو کر خوب برگ و بار لانے لگ گیا ہے۔'' (الکتاب المسطور ج ۱ ص ۱۰) اس عبارت سے صاف عیاں ہو گیا کہ بقول جناب نیلوی صاحب انہوں نے شفاء الصدور اور ندائے حق میں بریلویت کی تردید کی ہے اور (ندائے حق طبع اول ص ۱۵۵) میں لکھتے ہیں کہ: ''ہم نے شفاء الصدور محض بریلویہ کے رد میں لکھی تھی۔ متقدین علماء حق کی عبارات درج کر کے خود بریلویہ کے علماء کی عبارات بھی درج کر دی تھیں۔ تا کہ ان پر حجت قائم ہو جائے اور سمجھیں کہ جب قبر عرفی میں ڈھیر پڑے نہیں سنتے تو ہم قبور پر آ کر پکار کر کیا کریں گے۔''

الجواب: جناب نیلوی صاحب کی یہ عبارات صرف ہاتھی کے دانت ہیں کھانے کے اور ہیں اور دکھانے کے اور۔ ان سے انہوں نے محض سادہ لوح اور حقیقت ناشناس عوام کو خالص اندھیرے میں رکھنے کی بالکل ناروا اور ناکام سعی کی ہے، جس کا اصل حقیقت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔

اوّلاً: تو اس لئے کہ جناب نیلوی صاحب نے بریلویوں کے کسی خاص مسئلہ کی تردید کا کوئی عنوان ہی قائم نہیں کیا اور نہ اس پر کوئی باب ہی باندھا ہے۔ کتاب کا نام ہی ''شفاء الصدور فی تحقیق علم سماع من فی القبور'' ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا سماع موتیٰ کے قائل صرف بریلوی ہی ہیں یا امت کی اکثریت بھی سماع موتیٰ کی قائل ہے؟ حضرات موالک، شوافع اور حنابلہ تقریباً سبھی ہی سماع موتیٰ کے قائل ہیں اور حضرت احناف کا بھی معتد بہ طبقہ سماع موتیٰ کا قائل ہے اور حضرات اکابر دیوبند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم میں بھی اکثریت سماع موتیٰ کی قائل ہے، جن کے حوالے سے سماع الموتیٰ میں مذکور ہیں۔ کیا جناب نیلوی صاحب کے نزدیک یہ سب بریلوی ہیں، جن کی تردید کا بیڑا انہوں نے اٹھایا ہے اور جن کے واضح اور منصور مسلک کے رد کا فرض منصبی وہ اپنے ذمے لئے ہوئے اور اس کے لئے پیچ و تاب کھاتے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ یہ کہہ دیں ؎

تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں ۔۔۔ رہی ہے ایک تصویر خیالی روبرو برسوں

وثانیاً: اس لئے کہ انہوں نے بزعم خویش الباب الاوّل میں قرآن کریم کی آیات کریمات سے اور ان کی تفاسیر میں حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ سے عدم سماع موتیٰ ثابت کیا ہے۔ مگر اس میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ کیونکہ ان میں جس سماع کی نفی ہے وہ سماع نافع ہے نہ کہ مطلق سماع۔ کیونکہ مشبّہ (زندہ کافر) اور مشبہ بہ (مردوں) میں وجہ تشبیہ ایک ہی ہوتی ہے اور وہ سماع نافع ہے نہ کہ مطلق سماع۔ ورنہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ زندہ کافر بھی نہیں سنتے۔ مزید تفصیل ''الشہاب المبین'' میں ملاحظہ فرمائیں: ''اور الباب الثانی میں احادیث و آثار نقل کر کے ان سے سماع موتیٰ کی نفی کی ہے۔ مگر یہاں بھی انہوں نے وہی غلطی کی ہے جو آیات و تفاسیر کے سمجھنے میں کی ہے اور الباب الثالث میں انہوں نے اپنی فہم ناقص سے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال اور ان کے اجماع سکوتی سے عدم سماع کا اثبات کر کے سابق کی طرح ٹھوکر کھائی ہے اور الباب الرابع میں انہوں نے قائلین سماع موتیٰ کے دلائل کے جوابات دینے کی لاحاصل سعی کی ہے اور الباب الخامس کا عنوان ہی یہ ہے۔ محدثین و متبدعین سماع موتیٰ۔'' (ص ۱۰۷ طبع اول)

الغرض! جناب نیلوی صاحب نے کتاب شفاء الصدور میں اوّل سے لے کر آخر تک اہل حق ہی کی تردید کی ہے نہ کہ بریلویوں کی۔ جناب نیلوی صاحب نے عام اموات کے سماع کی نفی سے آگے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

قبر مبارک کے پاس صلوٰۃ وسلام وغیرہ کے سماع کی بھی صاف نفی اور صریح انکار کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ”اور جو لوگ عند قبری، عند قبری کا وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں۔ وہ بھی سن لیں کہ تین بند دیواروں میں قبر شریف محفوظ ہے جہاں ہوا کا بھی گزر نہیں ہوسکتا۔ چہ جائیکہ آواز جاسکے وہ صورت بھی مقصود ہے۔“ (شفاء الصدور ص ۱۰۶ طبع اوّل)

جناب نیلوی صاحب نے سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں جس میں سات سمندر پار کی خبریں آج لوگ اپنے بند کمروں میں بخوبی سنتے ہیں۔ صحیح حدیث اور تعامل امت سے ثابت شدہ اجماعی واتفاقی مسئلہ (سماع صلوٰۃ وسلام وغیرہ عند القبر) کو اپنے فاسد قیاس سے رد کیا ہے۔ بھلا نص کے (جو یہاں صحیح حدیث ہے) ہوتے ہوئے قیاس اور عقلی ڈھکوسلوں کا کیا کام ہے اور انہیں کون مانتا ہے؟ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مگر انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں۔ (فتاویٰ رشیدیہ ج ا ص ۱۰۰ طبع جید برقی پریس دہلی)

اور حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کو بھی یہ بات مسلم ہے۔ کیونکہ روضۂ مبارک پر جو درود شریف پڑھا جاتا ہے وہ بالاتفاق بلاواسطہ حضور ﷺ پر پیش ہوتا ہے اور آپ اس کو سنتے اور جواب دیتے ہیں۔ (امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۱۱۰)

اور اس مسئلہ پر اس اتفاق واجماع کا اقرار جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ کے بزرگوں کو بھی ہے۔ چنانچہ ماہنامہ تعلیم القرآن میں تصریح موجود ہے کہ: ”باقی رہا آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس صلوٰۃ وسلام کے سماع کا مسئلہ تو اس میں فریقین کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہ تھا۔ جیسا کہ آج سے تقریباً تین سال پہلے ماہنامہ تعلیم القرآن شمارہ ماہ ستمبر ۱۹۵۹ء اور پھر اس کے بعد شمارہ ماہ دسمبر ۱۹۶۲ء میں دوسرے فریق (یعنی جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ) کے اس بارے مسلک کی صراحت موجود ہے۔ البتہ اس فریق کے بعض حضرات جن میں سے حضرت مولانا سید عنایت شاہ صاحب بخاری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ عند القبر سماع صلوٰۃ وسماع کے دوام اور ہمہ وقتی ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ الا خرق العادۃ“ (ماہنامہ تعلیم القرآن بابت ماہ اگست ۱۹۶۲ء ص ۱۸، ۱۹)

اس سے بالکل عیاں ہوگیا کہ آنحضرت ﷺ کے عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع میں بجز جناب سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری گجراتی کے اور کسی کا اختلاف نہیں اور امت مسلمہ میں یہی پہلے بزرگ ہیں جو اپنی رائے، سینہ زوری اور زور بیان سے سماع الصلوٰۃ والسلام عند القبر کے منکر ہیں۔ محترم جناب نیلوی صاحب کا یہ اخلاقی اور علمی فریضہ تھا کہ وہ عام سماع موتیٰ سے انکار کرتے وقت اس مسئلہ کو الگ کر دیتے۔ کیونکہ یہ امت کا اجماعی واتفاقی مسلک ہے۔ مگر انہوں نے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام وغیرہم سب کے عند القبور سماع کا قطعاً اور کلیۃً انکار کر دیا ہے۔ بلکہ یہاں تک لکھ دیا کہ: ”ان مسئلۃ سماع الموتی واجابتھم ومعرفتھم مختلق للملحدین“ (شفاء الصدور ص ۲۵ طبع اوّل)

بلاشبہ سماع موتیٰ اور ان کے جواب دینے اور ان کی معرفت کا مسئلہ ملحدین کا گھڑا ہوا ہے۔

اور باب پنجم کا عنوان ہی یہ ہے ملحدین ومتبدعین قائلین سماع موتیٰ۔ (ص ۱۰۷)

ابھی باحوالہ بیان ہو چکا ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا عند القبور سماع اتفاقی واجماعی مسئلہ ہے اور عام اموات کے سماع کا مسئلہ اختلافی ہے۔ حضرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تاہنوز اس میں اختلاف چلا آرہا ہے۔ مگر امت کی اکثریت سماع کی قائل ہے اور اس پر احادیث صحیحہ کثیرہ دال ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۶۹ھ) لکھتے ہیں کہ: ”ان سماع الموتی ثابت فی الجملۃ بالاحادیث الکثیرۃ

الصحیحۃ" بے شک فی الجملہ سماع موتیٰ احادیث کثیرہ صحیحہ سے ثابت ہے۔ (فتح الملہم ج ۲ ص ۴۷۹)

اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ: "اقول و الاحادیث فی سمع الاموات قد بلغت مبلغ التواتر وفی حدیث صححہ ابو عمر ان احداً اذا سلم علی المیت فانہ یرد علیہ ویعرفہ ان کان یعرفہ فی الدنیا (بالمعنیٰ)" (فیض الباری ج ۲ ص ۴۶۷)

میں کہتا ہوں کہ سماع الموتیٰ کے بارے میں احادیث بلاشبہ درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اور ایک حدیث میں ہے جس کی امام ابو عمر ابن عبدالبر (وغیرہ) تصحیح کرتے ہیں کہ جب کوئی آدمی کسی میت کو سلام کہتا ہے تو وہ اسے جواب دیتی اور (آواز سے) پہچانتی ہے اگر دنیا میں ان کا تعارف تھا۔

جناب نیلوی صاحب کا علمی و اخلاقی فرض تھا کہ وہ جس پہلو کو حق اور صحیح سمجھتے تھے، اسے دلائل سے اجاگر کرتے۔ لیکن جمہور امت کو ملحد اور مبتدع تو نہ قرار دیتے اور نہ احادیث صحیحہ متواترہ کا انکار کرتے۔ جب کہ عمومی طور پر احادیث صحیحہ کے انکار کی جرأت غلام احمد پرویز اور دیگر منکرین حدیث کو بھی نہیں ہوئی، وہ بھی بزعم خویش ان احادیث کو اپنے انکار و تاویل کا نشانہ بناتے ہیں جو ان کے نزدیک عقل اور تاریخ و مشاہدہ کے خلاف ہیں۔ باقی احادیث کو وہ بھی تاریخی سرمایہ اور ظنی درجہ میں تسلیم کرتے ہیں۔ جب کہ جناب نیلوی صاحب کا بے باک قلم اپنے غلط کار مشیر کے حکم کی تعمیل میں علم، تحقیق، دیانت اور خدا خوفی کی تمام حدود پھاند گیا ہے۔ مگر ؎

کون کرتا ہے بتوں کے آگے سجدہ زاہد   سر کو دے دے مار کر توڑیں گے بت خانے کو ہم

انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ صحیح اور متواتر احادیث کے خلاف احتیاط سے کام لیتے اور ان احادیث کے مطابق عمل کرنے والوں کو جو امت کی اکثریت ہے ملحد اور مبتدع کہنے سے گریز کرتے۔ کیونکہ تواتر کا انکار کفر تک نوبت پہنچا دیتا ہے۔ مستفیض اور متواتر کے بارے حضرت قطب الدین احمد بن عبدالرحیم المعروف بشاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۱۷۶ھ) فرماتے ہیں کہ: "اما المستفیض باللفظ فاعنی بہ الحدیث یرویہ عنہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ثلاثۃ من الصحابۃ رضی اللہ عنہم واکثر وحالھم فی الصدق و التقویٰ ما قد علم وقد شھد لھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھم خیر الفرق (القرون) وحث الناس علی تعظیھم ونھاھم عن سبھم فکانت الاحادیث المستفیضۃ من ھذا الوجہ متواترا او ملحقاً بالتواتر وھی کثیرۃ موجودۃ فی کل باب من ابواب الفقہ و السیرۃ اتفقت صیغ الاراء فیھا او اختلفت" (تفہیمات الٰہیہ ج ۱ ص ۲۱۰)

لفظی مشہور حدیث سے میری مراد وہ حدیث ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین یا زیادہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روایت کریں اور ان کی سچائی اور تقویٰ کا حال تو معلوم ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے یہ شہادت دی ہے کہ وہ بہترین جماعت میں ہیں اور لوگوں کو ان کی تعظیم پر آمادہ کیا ہے اور ان کو برا کہنے سے منع کیا ہے تو اس لحاظ سے مستفیض حدیثیں متواتر یا تواتر سے ملحق ہوں گی اور یہ فقہ اور سیرت کے ہر باب میں بکثرت موجود ہیں اور اداء کے الفاظ متفق ہوں یا مختلف۔

اور سماع موتیٰ عند القبور کی حدیثیں بھی اسی مد کی ہیں۔ اکابر علماء کا یہ طریقہ تھا اور ہے کہ وہ ان احادیث کو تسلیم کرتے ہوئے حسب فہم اس کی مناسب تاویل کرتے ہیں۔ لیکن فریق ثانی کو ملحد و زندیق اور مبتدع کسی نے نہیں کہا۔ تکفیر سازی کا یہ عہدہ جناب نیلوی صاحب اور ان کے سیدسند کو ہی حاصل ہے ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے   جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

اور علامہ طاہر بن صالح بن احمد الجزائری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''والمتواتر یکفر جاحدہ'' (توجیہ النظر الیٰ اصول الاثر ص ۳۶) متواتر کا منکر کافر ہو جاتا ہے۔ تواتر کی قسمیں اور اس کا حکم رئیس المحدثین حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے (فیصلہ مقدمہ بہاول پور ص ۲۴) میں اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ نے (مقدمہ فتح الملہم ص ۳، ۴) میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جناب نیلوی صاحب کو بہت ہی زیادہ مناسب اور بے حد ضروری تھا کہ وہ اس میدان میں انتہائی احتیاط سے قدم رکھتے اور قائلین سماع موتیٰ کو ملحد اور مبتدع نہ قرار دیتے۔ کیونکہ ان کے پاس متواتر احادیث ہیں اور امت مسلمہ کی اکثریت ان کے ساتھ ہے اور مشہور ہے کہ ؎

زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو

ثالثاً اس لئے کہ شفاء الصدور میں جن مسائل کو تختہ مشق بنایا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات قبر میں ان کے اجسام عنصریہ سے متعلق نہیں ہے اور وہ عند القبور صلوٰۃ وسلام وغیرہ نہیں سنتے اور استشفاع عند قبور الانبیاء علیہم السلام کو بھی شرک کہا[1] ہے اور زوردار الفاظ میں سماع موتیٰ کی نفی کی ہے اور جن اکابر علماء ملت نے حیات الانبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) اور عند القبور صلوٰۃ وسلام کے سماع اور استشفاع عند القبور اور سماع موتیٰ کے سلسلہ میں کتابیں مسائل لکھے ہیں۔ ان کو نام لے لے کر کوسا ہے اور ان کے اقوال کو غیر معتبر قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: ''یہ سننے اور کلام کرنے کی بابت اکثر سبکی، سیوطی، زرقانی، یافعی، محب الدین طبری، نوری، قاضی عیاض وغیرہ کی ہیں جن میں سے کوئی بھی حنفی مسلک کا نہیں۔''

باقی ملا علی قاری رحمہ اللہ اور ابن عابدین وغیرہ (جو دونوں کٹر حنفی ہیں۔ صفدر) کی عبارتیں ......تو یہ اقوال حجت نہیں ہیں۔ (ص ۹۶، ۱۰۰) میں لکھتے ہیں کہ: ''ملا علی قاری رحمہ اللہ اپنی کتابوں میں بہت غلطیاں کر جاتے ہیں۔'' اور (ص ۱۰۱) میں لکھتے ہیں کہ: ''پھر قاری صاحب رحمہ اللہ کی ہر بات پر اعتماد کرنا درست نہ ہوا۔ خصوصاً جب کہ وہ سبکی اور سیوطی کی تقلید میں کوئی بات لکھ جائیں۔'' اسی طرح ابن عابدین رحمہ اللہ نے محمد بن عبد الوہاب کے بارہ میں سنی سنائی بات لکھ دی ہے اور (ص ۶۸) میں لکھتے ہیں کہ: ''ابن الہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عند القبر سماع ثابت ہے۔'' (محصلہ) جناب نیلوی صاحب لکھتے ہیں کہ: ''یہ قول معتبر نہ سمجھا جائے گا۔'' اور (ص ۳۳) میں امام بیہقی رحمہ اللہ کا رد کیا ہے اور (ص ۶۶) کے حاشیہ میں علامہ بحر العلوم عبد العلی رحمہ اللہ کی کتاب رسائل الارکان الاربعہ کی تردید کی ہے اور (ص ۶۰) کے حاشیہ میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا نام لے کر ان کی تردید کی ہے اور (ص ۴۷) میں امام عبد الحق اشبیلی رحمہ اللہ کا رد کیا ہے اور (ص ۱۲) میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تردید کی ہے اور (ص ۹۳) میں لکھتے ہیں کہ جب میں نے حافظ ابن القیم رحمہ اللہ جیسے موحد جید عالم ماحی الشرک، ماحی البدع سے سماع الموتیٰ کا قول دیکھا تو حیران اور متعجب رہ گیا۔ (محصلہ) اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب اکابر علماء امت بریلوی تھے، جن کی تردید کا ٹھیکہ جناب نیلوی صاحب نے لیا ہے؟ جناب نیلوی صاحب آپ ہی انصاف سے کہیں اگر انصاف نامی کوئی چیز آپ کے

---

[1] چنانچہ لکھتے ہیں: ''اور علماء سو بھی ان کو تعلیم دیتے ہیں کہ اگر چہ دور سے نہیں تو قبر کے اوپر جا کر اگر پکارا جائے اور سفارشیں کروائی جائیں اور درخواستیں بھیجی جائیں تو مردے سنتے جاتے ہیں۔ معاذ اللہ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ تعالیٰ! ایسے غلط عقائد اور شرکیہ خیالات اور بدعیہ حرکات وسکنات سے بچائے۔ اگر اس قسم کے شرع میں جائز ہوتے تو سب سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی مزار مبارک پر جا کر کرتے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے محبوب سید الانبیاء علیہم السلام کی قبر مبارک کو ایسے کرتوتوں سے بچا رکھا ہے۔ (شفاء الصدور ص ۱۰۶)

پاس ہے کہ آپ تو ان اکابر کے نام لے لے کر ان کے حق اور صحیح نظریات کی تردید کریں اور راقم اثیم جانتے ہوئے خاموش رہے اور دفاع کا حق اور فرض کفایہ ادا نہ کرے؟ آخر کیوں؟ آپ کس سادگی سے عوام کو دھوکہ دے رہے ہیں کہ مشن ایک ہونے کی وجہ سے خاموش ہو جاتے۔ جناب نیلوی صاحب ایسا صریح دھوکہ تو نہ دیں آپ نہ تو حنفی ہیں نہ دیو بندی، صرف اپنی نارسا عقل کے پیروکار ہیں۔ آپ کو حنفیت اور دیو بندیت سے کیا واسطہ اور تعلق ہے؟

ہو چکا قطع تعلق تو جفائیں کیوں ہوں جن کو مطلب نہیں رہتا وہ ستاتے بھی نہیں

حیرت وافسوس

اہل علم جانتے ہیں کہ بعض مسائل میں اختلاف بھی ہوتا ہے مگر اختلافی مسائل میں کوئی دوسرے فریق کو مشرک، مبتدع ملحد، علماء سوء اور شریر نہیں کہتا۔ لیکن جناب نیلوی صاحب کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ وہ عام اموات کے سماع اور عدم سماع کے اختلافی مسئلہ سے آگے نکل کر آنحضرت ﷺ کے عند القبر سماع کے اجماعی اور اتفاقی مسئلہ کو اور استشفاع عند القبر کے بین الفقہاء مسلمہ مسئلہ کو تسلیم کرنے والوں کو بھی مشرک، مبتدع، ملحد، علماء سوء اور شریر کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔ سابق حوالوں کے علاوہ مزید ملاحظہ فرمائیں وہ لکھتے ہیں کہ: ''یہ امور جو مشہور ہیں یہ شریروں کے گھڑے ہوئے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صحاح کے مصنفین جو کامل محدث تھے۔ ان چیزوں کو نہیں پیش کرتے، جن کو بیہقی، سبکی اور سیوطی پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کی تصنیفات حدیث میں کم درجہ کی ہیں۔ جیسا کہ اصول حدیث کی کتب کے مطالعہ کرنے والے پر مخفی نہیں ہے۔'' (فیصلہ ص ۳۳)

جناب نیلوی صاحب! کیا آپ نے (بخاری ج ۱ ص ۱۷۸، مسلم ج ۲ ص ۳۸۶) کی صحیح حدیث: ''انہ یسمع قرع نعالھم'' تسلیم کر لی ہے جس پر حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے باب ''المیت یسمع خفق النعال'' (بخاری ج ۱ ص ۱۷۸) باندھا ہے اور کیا آپ نے صحیحین کی یہ روایت: ''ما انتم باسمع لما اقول منھم'' (بخاری ج ۲ ص ۵۶۶، مسلم ج ۲ ص ۳۸۷) مان لی ہے؟ اور کیا آپ نے (ابوداؤد ج ۱ ص ۲۷۹) کی یہ صحیح حدیث: ''مامن احد یسلم علیّ الا رد اللہ علیّ روحی حتی ارد علیہ السلام'' قبول کر لی ہے؟ اور کیا آپ نے (ابن ماجہ ص ۱۱۹) کی یہ جید حدیث: ''ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء فنبی اللہ حی یرزق'' کا اقرار کر لیا ہے؟ جب آپ نے صحاح ستہ کے کامل محدثین کی حدیثیں بھی تسلیم نہیں کیں تو امام بیہقی رحمہ اللہ حافظ سبکی اور علامہ سیوطی کو کوسنے کا ادھار کیوں کھائے بیٹھے ہیں؟ صاف کہہ دیں کہ میں اپنے گجراتی مشن کے خلاف کوئی حدیث ماننے کے لئے تیار نہیں اور آپ نے اپنی جملہ کتابوں میں قولاً وعملاً اس کا ثبوت بھی دیا ہے کہ معاذ اللہ تعالیٰ! تمام صحیح حدیثوں میں کیڑے نکالے ہیں اور جمہور شراح حدیث کے صریح حوالوں کے خلاف شاذ اور ادھورے اقوال پر مورچہ بندی کی ہے۔

ستم کا آشنا تھا کبھی کے دل دکھا گیا کہ شام غم تو کاٹ لی سحر ہوئی چلا گیا

رابعاً: اس لئے کہ جناب نیلوی صاحب کا اصل مقصد تو حضرت فقہاء کرام رحمہم اللہ اور اکابر علماء دیو بند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم کی پرزور تردید ہے۔ بریلویہ کا تو صرف نام استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ مسئلہ استشفاع کے بارے میں لکھتے ہیں: ''بس ہم اب آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ جتنی کتابوں میں یہ مسئلہ قبر پر حضور ﷺ سے دعاء استغفار کا جو معتبر کتب میں لکھا جا چکا ہے وہ سب باغیوں کو لکھا ہوا ہے اور بس۔'' (ندائے حق ص ۳۱۱ طبع اوّل)

قارئین کرام! یہ ہے جناب نیلوی صاحب کے نزدیک معتبر کتابوں کا حشر ہم نے تسکین الصدور میں استشفاع

عند القبر کے متعدد کتب فقہ ومناسک سے حوالے عرض کیے ہیں۔ مثلاً نور الایضاح، طحطاوی، مجمع الانہر، کتاب الاذکار للنووی، لباب المناسک، المسلک المتقسط، المنحۃ الوہبیۃ، شامی، فتح القدیر، وفاالوفاء، عالمگیری، رسائل الارکان، فتاویٰ عزیزی، زبدۃ المناسک وفتاویٰ رشیدیہ اور تحریرات حدیث وغیرہ لیکن بقول نیلوی صاحب ان سب کتابوں میں باغی گھس گئے ہیں اور اپنی باغیانہ کارروائی کرتے ہوئے ان میں مسئلہ گھسیڑ آئے ہیں۔ اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ ایسی بڑ تو نشہ کرنے والا کوئی مجذوب ملنگ بھی نہیں مارتا جو جناب نیلوی صاحب نے ماری ہے اور اب طبع جدید میں لکھتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ ایسی ایسی باتیں اکابر کی کتابوں میں درج کرنے کا غیر مذہب والوں نے منصوبہ بنا رکھا تھا کہ آنے والی نسلیں ان اکابر کی کتابوں کو دیکھ کر گمراہ ہوں۔" سبحان اللہ تعالیٰ! (الکتاب المسطور ج ۲ ص ۶)

یہ ہے الشیخ المحقق النیلوی صاحب کی تحقیق انیق جو عجائب گھر میں آویزاں کرنے کے قابل ہے۔ اس تحقیق اور تدقیق کے بعد کسی اسلامی کتاب کی کوئی حیثیت باقی رہ جاتی ہے کہ اس پر اعتبار کیا جا سکے؟ جب مشہور، معتبر، مستند، درسی اور متداول کتابوں کا یہ حال ہے تو پھر اسلامی کتب کے ذخیرہ کا کیا حال ہوگا۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

المهند على المفند

اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ "المہند" کے مرتب حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۴۶ھ) صاحب بذل المجہود شرح ابی داؤد ہیں اور اس میں دیگر مسائل کے علاوہ حیات الانبیاء علیہم السلام کا مسئلہ بھی ہے اور اس پر تقریباً چوبیس اکابر علماء دیوبند کے دستخط اور ان کی تصدیقات ہیں۔ چند مختصر سے مسئلے ہیں۔ کوئی لمبی کتاب نہیں ان اکابر میں حضرت شیخ الہند، حضرت تھانوی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن اور حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی رحمہم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔ جناب نیلوی صاحب المہند پر مفتی اعظم ہند رحمہ اللہ کی تقریظ کا جواب کے عنوان میں لکھتے ہیں۔

"المہند سے استاذ جی رحمہ اللہ کے دستخط کرنا فضول سی بات ہے۔ کیونکہ کسی معتمد علیہ کی تصنیف شدہ کتاب کو تقریظ کرنے والا تقریظ کرتے وقت من اولہ الی آخرہ ایک ایک حرف کر کے کوئی نہیں دیکھتا۔ خصوصاً وہ ہستیاں جن کے سر پر بیسیوں ذمہ داریاں ہوں۔ الی قولہ پھر خود المہند میں ایسی غلطیاں ہیں جن کی نسبت ان جید علماء کی طرف کرنا ان کی توہین ہے۔ پھر اس میں کئی کتابت کی غلطیاں ہیں۔" (الکتاب المسطور جلد اول ص ۴۶۰)

قارئین کرام غور فرمائیں کہ "المہند" کے صرف چند صفحات ہیں۔ کوئی لمبی چوڑی کتاب نہیں اور یہ نہایت ذمہ دار حضرات کی طرف سے علماء عرب کو جواب میں بھیجی گئی۔ کیا چند صفحات کے لئے بھی آپ کے استاذ جی حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ اور دیگر حضرات کے پاس وقت نہ تھا؟ اور رواداری میں گویا سوتے ہوئے اس پر دستخط جڑ دیے؟ ان ذمہ دار حضرات کی طرف جو علم وعرفان کے خزینے تھے، ایسی غیر ذمہ دارانہ نسبت کا کیا مطلب؟

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

الغرض! اصل مقصد تو جناب نیلوی صاحب کا صرف حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ اور اکابر علماء دیوبند کی تردید ہے۔ بریلویہ کا لفظ تو محض بطور ڈھال اور آڑ کے استعمال کرتے ہیں۔ جناب نیلوی صاحب ہی لکھتے ہیں کہ:

"روایت کی تصحیح وتحسین کی بابت سیوطی رحمہ اللہ کا تساہل مشہور ہے (مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور علامہ سخاوی رحمہ اللہ وغیرہ تو تساہل نہیں ہیں۔ صفدر) اور زرقانی رحمہ اللہ کا حال بھی کسی عالم سے مخفی نہیں اور سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے انہی کی کتابیں دیکھ کر سند جید فرما دیا۔ مولانا عثمانی رحمہ اللہ کا بھی یہی حال ہے۔" (ندائے حق طبع اول ص ۱۳۹)

اگر ان بزرگوں کا یہ حال ہے تو جناب نیلوی صاحب کس باغ کی مولی ہیں؟

تجھ سے کوئی گلہ نہیں ہے قسمت میں تیری صلہ نہیں ہے

اور نیز جناب نیلوی صاحب لکھتے ہیں: "یہ نام نہاد بناسپتی دیوبندی دراصل تقیہ کرنے والے بریلوی ہیں۔" (ایضاً ص ۱۵۶) مزید لکھتے ہیں: "اگر زمانہ حال کے بناسپتی دیوبندی علماء کہیں کہ صاحب شفاء الصدور نے عربی عبارتوں کا مطلب غلط بیان کیا ہے۔" (ایضاً ص ۱۵۶) نیز لکھتے ہیں: "بناسپتی نام نہاد دیوبندیوں سے پوچھو۔" (ایضاً ص ۱۵۷)

قارئین کرام! انصاف سے فرمائیں کہ کیا یہ بریلویوں کی تردید ہو رہی ہے یا دیوبندیوں کی؟ اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ دیوبندی تھے یا بریلوی؟ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ

وہ عرصۂ حمیت دینی کے شہسوار اہل نظر کے واسطے ہیں درّ تابدار

خامساً: اس لئے کہ جناب نیلوی صاحب نے (شفاء الصدور ص ۹۱ طبع اول) میں عندالقبر آنحضرت ﷺ کے عدم سماع کے ضمن میں مسئلہ علم غیب اور حاضر و ناظر بیان کیا ہے اور (ص ۹۲) کے حاشیہ میں ضمنی طور پر آنحضرت ﷺ کے علم غیب اور حاظر و ناظر سے متصف نہ ہونے اور دور سے سماع کی نفی کی ہے۔ بس ان کی کتاب میں یہی رد بریلویت ہے جو صرف ضمنی ہے۔ باقی تمام کتاب حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ اور اکابر علماء دیوبند کے نام لے لے کر تردید کے لئے وقف ہے۔ لیکن عوام کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ کتاب شفاء الصدور تو رد بریلویت کے لئے وقف تھی۔ مگر راستہ میں صفدر سے محاذ آرائی ہو گئی اور مشن ایک ہونے کی وجہ سے اسے خاموش رہنا چاہئے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ صفدر تو یہی کہے گا کہا ؎

اگر حق ہو تو جھکتا ہے سر ادنیٰ سے اشارے پر جو باطل ہو تو خنجر کے بھی آگے خم نہیں ہوتا

جناب نیلوی صاحب ہی لکھتے ہیں کہ: "ایک میرے پرانے دوست محقق اور مصنف مدرس اور مبلغ ہیں۔ (مراد اس سے راقم اثیم ہے۔ صفدر) سنا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے مردوں کے نہ سننے پر کوئی دلیل نظر نہیں آئی۔" (شفاء الصدور طبع اول ص ح)

اور راقم کو سچ مچ آج تک عدم سماع کی کوئی قطعی صریح اور صحیح دلیل نہیں ملی اور اہل علم کیا موافق اور کیا مخالف سبھی بخوبی جانتے ہیں کہ راقم اثیم فاضل دیوبند ہے۔ بریلوی نہیں اور بحمد اللہ تعالیٰ اس دور میں جس طرح بریلویوں کے باطل عقائد اور بدعات کی معقول تردید راقم اثیم نے کی ہے۔ وہ عیاں راچہ بیاں کا مصداق ہے۔

بخلاف جناب نیلوی صاحب کے کہ انہوں نے اپنی کتابوں میں فہم و بصیرت کو جواب دے کر اور تعصب و عناد کے تیز رو گھوڑے پر سوار ہو کر بے جوڑ اور بے ربط حوالے جوڑ جوڑ کر اپنی ناقص فہم سے نتائج اخذ کئے ہیں جو نفس الامر میں اس کا مصداق ہیں کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

انتہائی تعصب

جناب نیلوی صاحب جمہور امت اور حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کو سمعی دلائل سے عاری تصور کرتے ہوئے موج میں آ کر لکھتے ہیں: "سو اگر تو کہے کہ ہم اس مسئلہ کی سمعی دلیل تو نہیں جانتے لیکن ہم بڑے بڑے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے قول پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے اور وہ صرف وہی بات کہتے ہیں جس کو انہوں نے ادلہ سے حاصل کیا ہوتا ہے۔ میں (نیلوی رحمہ اللہ) کہتا ہوں کہ اگرچہ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ لیکن خطاء اور صدور نسیان ان سے ممکن ہے۔" (شفاء الصدور ص ۹۷ طبع اول)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بڑے بڑے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تو خطا و نسیان کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ہاں اگر

معصوم ہیں تو صرف جناب نیلوی صاحب ہی ہیں جو علمی اور تحقیقی میدان میں خالص مجذوب اپنی ناقص و باطل رائے پر بے حد گھمنڈ کرنے والے دعویٰ و دلیل کی مطابقت سمجھنے سے خالص کورے اور عبارات کا صحیح مطلب سمجھنے سے بالکل تہی دست ہیں مشہور ہے کہ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نظر آتا رہتا ہے۔ یہی حال جناب نیلوی صاحب کا ہے کہ انہیں اپنی مردود رائے کے خلاف صحیح رائے رکھنے والے سبھی بریلوی، خطا کار اور اصحاب نسیان نظر آتے ہیں۔

تذییل یہ عنوان قائم کر کے جناب نیلوی صاحب لکھتے ہیں: ''آج کل کے اہل بدعت بھی باوجود ادعائے حنفیت چونکہ سماع موتیٰ کے قائل ہیں، اس لئے انہوں نے بھی ایک شاخسانہ نکالا ہے کہ حضرت امام حنیفہ رحمہ اللہ اور مشائخ حنیفہ بھی سماع کے قائل ہیں۔ یہ ان کی صریح جہالت ہے یا منہ زوری، ورنہ کتب حنفیہ اس کی تصریحات سے پر ہیں۔'' (شفاء الصدور ص ۵۰ طبع اوّل)

اردو دان حضرات لفظ ''بھی'' کا مطلب جانتے ہی ہیں کہ اصل مقصد تو فقہاء کرام رحمہم اللہ اور اکابر علماء دیوبند کی تردید ہے۔ ہاں! آج کل کے اہل بدعت بھی ان کے ساتھ شامل ہیں۔ لہٰذا ضمناً ان کی تردید بھی ہو جاتی ہے۔ (سماع الموتیٰ ص ۱۸۳) میں ہم نے (العرف الشذی ص ۱۵۳) کے حوالہ سماع موتیٰ کے بارے حضرت امام ابو حنیفہ اور مشائخ حنیفہ کا محقق مذہب عرض کر دیا ہے۔ وہاں ہی ملاحظہ فرمالیں کہ ان کا مسلک کیا ہے؟

لطیفہ: نیلوی صاحب تو لکھتے ہیں کہ شفاء الصدور ہم نے محض بریلویہ کے رد میں لکھی ہے۔ حالانکہ فریق مخالف کے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب وغیرہ کا حوالہ وہ اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''اسی طرح بریلویوں کے مولوی احمد رضا خان نے اپنے ملفوظات حصہ سوم میں لکھا ہے۔ جواب سوال ماتصہ عرض ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا انکار سماع موتیٰ سے رجوع ثابت ہے یا نہیں؟ ارشاد نہیں! وہ جو فرما رہی ہیں حق فرما رہی ہیں وہ مردوں کے سننے کا انکار فرماتی ہیں۔ مردے کون ہیں؟ جسم! روح مردہ نہیں اور بے شک جسم نہیں سنتا۔ سنتی روح ہے۔ ملفوظات حصہ سوم از مولوی احمد رضا خان بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ وقال صاحب کتاب تحقیق لاریب ص ۱۹۳ جو احادیث یا عبارات کتب نفی سماع کی ہیں وہ جسد پر محمول ہیں۔'' (شفاء الصدور ص ۶۲)

قارئین کرام! نفی سماع موتیٰ کے بارے جو عقیدہ نیلوی صاحب کا ہے کہ سماع میں جسم عنصری کا کوئی تعلق نہیں۔ وہی مولوی احمد رضا خان صاحب کا ہے اب آپ انصاف سے فرمائیں کہ یہ بریلویوں کی تردید ہے یا ان کی تائید؟ جناب نیلوی صاحب کے حواریوں سے گزارش ہے کہ وہ انہیں اپنی سمت درست کرنے کی تلقین کریں اور یہ کہیں ؎

سفینہ لے چلا ہے کس مخالف سمت کو ظالم ذرا ملاح کو سمجھایئے برسات کے دن ہیں

حیرت: قارئین کرام! ضرور اس مغالطہ میں مبتلاء ہوں گے کہ جناب نیلوی صاحب نے قائلین سماع موتیٰ کو جو ملحد اور مبتدع قرار دیا ہے تو ضرور وہ بھی قطعی دلائل سے لیس ہوں گے۔ ورنہ اتنی بڑی جرأت اور جسارت کا ارتکاب کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا تفصیلی جواب تو آپ حضرات کو تسکین الصدور، سماع الموتیٰ اور الشہاب المبین میں ملے گا اختصاراً ہم یہاں ان کے بعض دلائل کا تذکرہ کرتے ہیں جن سے ان کے مشیر سید و سند جناب سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری گجراتی نے بھی اور خود جناب نیلوی صاحب نے بھی عدم سماع موتیٰ کا مسئلہ سمجھا اور بعض سے محض کشید کیا ہے۔ اصولی طور پر ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ ...... قرآن کریم کی وہ آیات کریمات جن میں ''من دون اللہ'' کے عدم سماع اور غفلت و بے خبری کا ذکر موجود

ہے۔ مثلاً: ''والذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطمیر ان تدعوھم لا یسمعوا دعاکم ولو سمعوا ما استجابو لکم (الآیۃ)'' اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوائے وہ مالک نہیں کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے۔ اگر تم ان کو پکارو سنیں نہیں تمہاری پکار اور اگر سنیں پہنچیں نہیں تمہارے کام پر (ترجمہ از شیخ الہند رحمہ اللہ) اور مثلاً: ''ومن اضل ممن یدعوا من دون اللہ من لا یستجیب لہ الی یوم القیمۃ وھم عن دعآئھم غفلون (الآیۃ)'' اور اس سے زیادہ گمراہ کون جو پکارے اللہ کے سوائے ایسے کو کہ نہ پہنچے اس کی پکار کو دن قیامت تک اور ان کو خبر نہیں ان کے پکارنے کی۔ (ترجمہ از شیخ الہند رحمہ اللہ) وغیرہا من الآیات! علم سے معمولی رابطہ رکھنے والا طالب علم بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اس مضمون کی آیات سے عدم سماع موتی پر استدلال بالکل غلط ہے اور عدم سماع موتی پر ان سے استدلال بالکل سینہ زوری اور محض کشید ہے۔ کیونکہ ''من دونہ'' اور ''من دون اللہ'' کے جملے عام ہیں زندوں اور مردوں سب کو شامل ہیں۔ اگر بقول منکرین سماع موتی ان آیات کریمات سے قبور کے پاس سے سماع موتی کی نفی ثابت ہے تو بولنے والے کے آس پاس کے قریب زندوں کے سماع کی بھی نفی کریں کہ آخر وہ بھی تو ''من دون اللہ'' اور ''من دونہ'' میں داخل ہیں۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ زندے تو ''من دون اللہ'' اور ''من دونہ'' کے افراد اور مصداق ہو کر بھی سماع قریب سے متصف ہوں اور مردوں کے حصہ میں صرف عدم سماع ہی آئے؟ غرضیکہ جس طرح ''من دون اللہ'' اور ''من دونہ'' کا مصداق مردے ہیں۔ اسی طرح زندے بھی ہیں۔ اگر قریب سے زندے سنتے ہیں تو عند القبور موتی کا سماع بھی ممکن بلکہ واقع ہے، نگاہ ایک ہی پہلو پر نہ ہو۔ دوسرا پہلو بھی پیش نظر رہے۔ مگر ؎

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوئے آسماں نہیں

غرضیکہ اس مضمون کی جملہ آیات عدم سماع موتی سے قطعاً غیر متعلق ہیں اور ان سے یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔

۲...... وہ آیات کریمات جن میں مثلاً: ''انک لا تسمع الموتی (النحل، الروم)'' البتہ تو نہیں سنا سکتا مردوں کو (ترجمہ از شیخ الہند رحمہ اللہ) اور مثلاً: ''ان اللہ یسمع من یشآء وما انت بمسمع من فی القبور (الفاطر)'' اللہ سناتا ہے جس کو چاہے اور تو نہیں سنانے والا قبر میں پڑے ہوؤں کو (ترجمہ از شیخ الہند رحمہ اللہ) وغیرہا من الآیات ہیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی ان سے عدم سماع موتی ہی سمجھا ہے۔ لیکن جمہور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا کہ ان آیات سے عدم سماع موتی ثابت ہے۔ بلکہ وہ سماع موتی کے قائل ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک ان آیات سے سماع موتی کی نفی ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وقد خالفھا الجمھور فی ذلک وقبلوا حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ الموافقۃ من رواہ غیرہ علیہ'' (فتح ج ۳ ص ۲۷۷) کہ جمہور نے اس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مخالفت کی ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث کو قبول کیا ہے۔ کیونکہ دوسروں کی روایات بھی ان کے موافق ہیں۔

اور حضرت مولانا محمد عبدالحئی لکھنوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں: ''واما رد عائشۃ رضی اللہ عنہا بعض تلک الاحادیث فلم یعتد بہ جمھور الصحابۃ رضی اللہ عنہم ومن بعدھم واما قولہ تعالٰی فانک لا تسمع الموتی ففیہ نفی الاسماع لا السماع الی قولہ وبالجملۃ لم یدل دلیل قوی علی نفی سماع المیت وادراکہ وفھمہ وتالمہ لا من الکتاب ولا من السنۃ بل السنن الصحیحۃ الصریحۃ دالۃ علی ثبوتھا لہ'' (عمدۃ الرعایۃ ج ۲ ص ۲۵۴)

رہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سماع موتی کی بعض احادیث کو رد کرنا تو جمہور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد کے

حضرات نے ان کی اس رائے کا اعتبار نہیں کیا۔ باقی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ البتہ تو نہیں سنا سکتا مردوں کو تو اس سے اسماع کی نفی ہے۔ سماع کی نہیں۔ (پھر فرمایا) اور خلاصہ کلام یہ ہے کہ کوئی دلیل کتاب وسنت سے مردے کے سماع اور ادراک فہم اور اس کے تکلیف اٹھانے کی نفی پر دال نہیں بلکہ صحیح اور صریح حدیثیں ان امور کے اس کے لئے ثبوت پر دال ہیں۔

حضرت مولانا عبدالحق حقانی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۳۲ھ) فرماتے ہیں کہ: ''ان آیات میں تو عدم سماع (موتی) کا اشارہ تک بھی نہیں ہے۔ اس لئے ان سے استدلال کرنا بے فائدہ بات ہے۔'' (تفسیر حقانی ج ۶ ص ۴۱)

حضرت مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۹۶ھ) فرماتے ہیں کہ ان تینوں آیتوں میں یہ بات قابل نظر ہے کہ ان میں کسی میں یہ نہیں فرمایا کہ: ''مردے نہیں سن سکتے بلکہ تینوں آیتوں میں نفی اس کی کی گئی ہے کہ آپ نہیں سنا سکتے۔ تینوں میں اس تعبیر وعنوان کو اختیار کرنے سے اس طرف واضح اشارہ نکلتا ہے کہ مردوں میں سننے کی صلاحیت ہو سکتی ہے۔ مگر ہم باختیار خود ان کو نہیں سنا سکتے۔'' (تفسیر معارف القرآن ج ۶ ص ۵۶۰)

امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ (جناب نیلوی صاحب) لکھتے ہیں: ''امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ نے جس کے بارے حضرت علامہ سید محمود آلوسی رحمہ اللہ نے (روح المعانی ج ۱۰ ص ۶۷) میں فرمایا: ''والاعتماد علی کلام الراغب في مثل ذلک ارغب عند المحققين'' محققین کے نزدیک ایسے مواقع پر راغب رحمہ اللہ کے کلام پر اعتماد کرنا بہت مرغوب ہے۔'' (الکتاب المسطور ج ۱ ص ۳)

اس مقام پر موتی سے مردے اور بے جان مراد نہیں لیتے بلکہ زندہ جاہل مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ موت کے معانی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''الثالث زوال القوة العاقلة وهي الجهالة نحوا ومن كان ميتاً فاحييناه واياه قصد بقوله انک لاتسمع الموتى'' (المفردات فی غریب القرآن ص ۴۹۴)

تیسرا معنی قوت عاقلہ کا زوال ہے اور یہ جہالت ہے جیسا کہ کہا اور وہ شخص جو مردہ (یعنی جاہل) تھا۔ سو ہم نے اسے زندہ کیا (یعنی علم سے نوازا) اور اللہ تعالیٰ نے اپنے قول ''انک لاتسمع الموتى'' میں یہی جہالت مراد لی ہے۔

یعنی اس مقام پر الموتی سے مراد زندہ جاہل ہیں جو بات کو نہیں مانتے اور سنی ان سنی ایک کر دیتے ہیں اور باوجود زندہ ہونے کے سمجھنے کی قوت ان میں نہیں ہے۔

الحاصل! بظاہر جن آیات کریمات سے منکرین سماع موتی کا استدلال ہو سکتا تھا، درحقیقت وہ بھی ان کے دعویٰ سے بالکل غیر متعلق ہیں اور ان میں عدم سماع کا اشارہ تک بھی موجود نہیں ہے بلکہ اگر دقیق نظر سے دیکھا جائے تو انہی آیات کریمات سے مردوں میں سننے کی صلاحیت ثابت ہوتی ہے اور بقول حضرت مفتی ان سے واضح اشارہ نکلتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے کیا ہی عجیب بات فرمادی ہے؟

وہ جب کرتا ہے باتیں مجھ سے میں حیران رہتا ہوں — کہ گویا خوبصورت منہ سے اک تصویر بولے ہے

۳...... قرآن کریم کے بعد احادیث کی باری آتی ہے مگر یقین جانئے کہ صراحۃً سماع موتی کی نفی میں کوئی حدیث موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس سماع موتی کے ثبوت میں احادیث متواترہ موجود ہیں اور حضرت سلف رحمہ اللہ کا اجماع اس پر مستزاد ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (المتوفی ۷۷۴ھ) اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ (المتوفی ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں کہ: ''والسلف مجمعون على هذا وقد تواترت الاثار عنهم بان الميت يعرف بزيارة الحي له ويستبشر به'' (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۴۳۸، کتاب الروح ص ۴)

حضرات سلف رحمہم اللہ کا اس پر اجماع ہے اور تواتر کے ساتھ ان سے منقول ہے کہ زندہ جب مردہ کی زیارت کرتا ہے۔ (اور اسے سلام کہتا ہے تو وہ اس کی آواز سے) اسے پہچانتا ہے اور اس کی آمد سے خوش ہوتا ہے۔

اس سے ثابت اور معلوم ہوا کہ حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ میں سماع موتی کا مسئلہ اجماعی تھا۔ عدم سماع موتی کے بارے حدیث کے موجود نہ ہونے کا اقرار جناب نیلوی صاحب کو بھی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: ''باقی رہا ایک خدشہ کہ ان میں کوئی صریح روایت نہیں جس میں لکھا ہو کہ مردے نہیں سنتے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ایک امر بدیہی کے لئے اگر کوئی دلیل بیان نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔'' (شفاء الصدور طبع اوّل ص ۳۵)

اس سے بالکل عیاں ہو گیا کہ جناب نیلوی صاحب کو کھلا اقرار ہے کہ مردوں کے نہ سننے کے بارے کوئی صریح حدیث موجود نہیں ہے۔ گویا ؎

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

عرض ہے کہ اگر عدم سماع موتی ایک بدیہی امر ہے تو آپ کو شفاء الصدور، ندائے حق اور کتاب المسطور میں امر بدیہی کے اثبات کے لئے ادھر ادھر سے رطب و یابس نامکمل اور غیر متعلق حوالے پیش کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اور آپ نے کسی اور امر بدیہی پر رطب و یابس حوالے کیوں جمع نہیں کئے؟ آپ قدم قدم پر عوام کو اندھیرے میں رکھنے اور ان کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور ان کو گمراہ کرنے کے لئے کمربستہ ہیں اور امت مسلمہ کے اکابر پر سے اعتماد اٹھانا اور ان سے تمسخر کرنا اور اپنے سید اور سند کو خوش کرنا اور ان سے تھپکی لینا اور محقق و مدقق کہلا کر دل بہلانا آپ کا لذیذ مشغلہ ہے۔ مگر ؎

بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت که با که باختہ عشق درشب دیجور

۴...... بعض حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے ان اقوال سے استدلال جن میں انہوں نے مسئلہ یمین میں فرمایا ہے کہ مردے نہیں سنتے۔ ان کے اقوال اپنے مقام پر برحق ہیں۔ وہ اس سماع کی نفی کرتے ہیں جس پر عرف عام میں کوئی نتیجہ مرتب ہو۔ چونکہ مردوں کے سننے پر کوئی دنیوی نتیجہ اور فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ اس لئے انہوں نے فرمایا کہ مردے نہیں سنتے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا کفار اور مشرکین کے بارے ارشاد ہے: ''فاعرض اکثرھم فھم لا یسمعون (حم السجدۃ)'' پر دھیان میں نہ لائے وہ بہت لوگ سو وہ نہیں سنتے۔ (شیخ الہند)

اس سے معلوم ہوا کہ زندہ کافروں کی اکثریت نہیں سنتی اور یہ نص قطعی سے ثابت ہے اور نیز ارشاد ہے: ''و نطبع علی قلوبھم فھم لا یسمعون (الاعراف)'' اور ہم نے مہر کردی ان کے دلوں پر سو وہ نہیں سنتے۔ (شیخ الہند)

اس آیت کریمہ سے بھی واضح طور پر معلوم ہوا کہ زندہ کافر نہیں سنتے۔ کیا سچ مچ اس کا یہی مطلب سمجھ لیا جائے کہ زندہ کافر نہیں سنتے؟ اور کیا اس کے لئے کوئی جمعیۃ بنالی جائے اور پاکستان کے کونے کونے میں ہر تقریر میں صرف یہی بیان کیا جائے کہ لوگو! زندہ کافر نہیں سنتے اور بیان کرنے والا یہ کہے کہ میں خادم قرآن کریم اور مبلغ اسلام ہوں۔ میں نص قطعی پیش کرتا ہوں کہ زندہ کافر نہیں سنتے اور اس کا منکر کافر، مشرک، یہودی، ملحد اور مبتدع ہے؟ کیا یہ قرآن کریم اور دین کی خدمت ہوگی۔ مطلب تو بالکل واضح ہے کہ کافر سن کر قبول نہیں کرتے اور مانتے نہیں اور اس سے انتفاع نہیں کرتے اور سنی ان سنی ایک کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''انما یستجیب الذین یسمعون والموتی یبعثھم اللہ ثم الیہ یرجعون (الانعام)'' مانتے وہی ہیں جو سنتے ہیں اور مردوں کو زندہ کرے گا اللہ پھر اس کی طرف لائے جاویں گے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''یعنی سب سے توقع نہ رکھو کہ مانیں گے۔ جن کے دل کے کان بہرے ہو گئے وہ سنتے ہی نہیں۔ پھر مانیں کس طرح؟ ہاں! یہ کافر جو قلبی وروحانی حیثیت سے مردوں کی طرح ہیں قیامت میں دیکھ کر یقین کریں گے اور ان چیزوں کو مانیں گے جن کا انکار کرتے تھے۔'' (فوائد عثمانیہ ص ۱۷۰)

اس سے معلوم ہوا کہ کافر ظاہری اور حسی کانوں سے بہرے نہیں اور دوسرے مقام پر ان ہی زندہ کافروں کو ''صم بکم عمی'' (بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہاں! دل کے کانوں سے بہرے ہیں۔ اگر وہ دل کے کانوں سے سنتے تو حق کو قبول کرتے اور مانتے الغرض زندہ کافروں اور مردوں میں وجہ تشبیہ عدم انتفاع اور عدم قبول ہے نہ کہ عدم سماع۔ جیسا کہ بعض سطحی اذہان مغالطہ کھاتے اور دیتے ہیں۔

قرآن کریم کی مختصر تفسیر جلالین شریف میں اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں ہے: ''انما یستجیب دعاءک الی الایمان الذین یسمعون سماع تفھم واعتبار والموتی ای الکفار شبھھم بھم فی عدم السماع یبعثھم اللہ فی الآخرۃ'' (تفسیر جلالین ص ۱۱۴)

وہی لوگ تیری دعوت الی الایمان کو قبول کرتے ہیں جو خوب سمجھ اور اعتبار کے ساتھ سنتے ہیں اور مردوں کو اللہ آخرت میں اٹھائے گا کفار کو اللہ تعالٰی نے مردوں سے تشبیہ اسی سماع کے نہ ہونے میں دی ہے۔

یہاں کفار سے مطلق سماع کی نفی نہیں بلکہ سماع تفہم واعتبار کی نفی ہے اور سماع تفہم واعتبار وہی ہو سکتا ہے جس پر ماننے اور قبول کرنے کا اثر مرتب ہو۔ طلباء علم اس نکتہ کو ملحوظ رکھیں کہ جلالین میں وجہ تشبیہ فی عدم سماع (نکرہ) نہیں بلکہ فی عدم السماع معرف باللام ہے اور اس سے وہی سماع مراد ہے جس کو وہ خود پہلے سماع تفہم واعتبار کے الفاظ سے بیان کر چکے ہیں۔ چنانچہ شیخ سلام اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ فی عدم السماع کی تشریح یوں کرتے ہیں: ''فی عدم السماع ای عدم السماع الذی یترتب علیہ الاثر من الاجابۃ و کفرھا'' (کمالین حاشیہ جلالین ص ۱۱۴)

یعنی ان کو ایسا سماع نہیں جس پر ماننے اور نہ ماننے کا اثر مرتب ہو۔

غرضیکہ اس آیت کریمہ اور اس کی تفسیر سے جن لوگوں نے جن میں جناب نیلوی صاحب نے بھی دیکھئے (شفاء الصدور ص ۱۱ طبع اول) مطلق سماع کی نفی سمجھی ہے، غلطی کی ہے۔ اولاً تو اس لئے کہ علم عربیت کے لحاظ سے مشبہ اور مشبہ میں وجہ تشبیہ ایک ہی ہوتی ہے تو ان لوگوں کے قاعدہ کے مطابق اگر مردے مطلق سماع سے محروم ہیں تو زندہ کافروں کو بھی مطلق سماع سے محروم تصور کریں۔ ''ولا قائل بہ'' وثانیاً اس لئے کہ صاحب جلالین اس مقام پر سماع کا معنی سماع تفہم واعتبار کرتے ہیں اور اسی لئے آگے السماع میں الف ولام عہد کا استعمال کرتے ہیں تو اس سے وہی مقید سماع مراد ہے جس کا وہ خود تذکرہ کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کو مطلق سماع پر حمل کرنا توجیہ القول بمالا یرضی بہ قائلہ کا مصداق ہے اور وہ خود دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''افانت تسمع الصم شبھھم بھم فی عدم الانتفاع بما یتلی علیھم'' (جلالین ص ۱۷۴)

کیا پس تو بہروں کو سنا سکتا ہے۔ اللہ تعالٰی نے زندہ کافروں کو بہروں کے ساتھ اس بات میں تشبیہ دی ہے کہ جو کچھ ان پر پڑھا جاتا ہے اس سے وہ انتفاع نہیں کرتے۔

یعنی وجہ تشبیہ ان میں عدم الانتفاع ہے جو وجہ تشبیہ زندہ کافروں اور مردوں میں ہے وہی زندہ کافروں اور بہروں میں ہے۔ کما لا یخفی علی عاقل!

قارئین کرام! آپ حضرات تسکین الصدور، سماع الموتی اور الشہاب المبین اور اس پیش نظر کتاب سے بخوبی یہ معلوم کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے عند القبور سماع میں تو کسی کا کوئی اختلاف نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عند القبر صلوٰۃ وسلام وغیرہ کے سماع کے بارے میں تو اکابر علماء جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ کا بھی اتفاق ہے۔ ہاں! عام اموات کے سماع اور عدم سماع کا مسئلہ قرن اوّل سے تا ہنوز اختلافی چلا آرہا ہے جو حضرات قرآن کریم کی آیات مثلاً: ''انک لا تسمع الموتی'' وغیرہا سے عدم سماع پر استدلال کرتے ہیں۔ بخیال آنہا یہ استدلالی رنگ تو ضرور ہے مگر اس استدلال کو قطعیت کا درجہ وہ بھی نہیں دیتے۔ اوّلاً تو اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو نص قطعی ''انک میت'' کے رو سے وفات پا چکے ہیں اور ''الموتی'' میں شامل ہیں۔ حالانکہ عام سماع موتی کے منکرین حضرات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کے قائل ہیں۔ اگر وہ حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عند القبر سماع کو ''لا تسمع الموتی'' کے خلاف پاتے تو کبھی بھی قرآن کریم کے خلاف نظریہ نہ رکھتے۔

ثانیاً: اس لئے کہ جمہور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور امت مسلمہ کی اکثریت جن میں بڑے بڑے امام فقیہ، محدث، متکلم اور صوفی شامل ہیں اور وہ سماع موتی کے قائل ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ان کو اس مضمون کی آیات سے قطعیت کے ساتھ عدم سماع کا مسئلہ نہ سمجھ آسکا اور وہ ان آیات کے ہوتے ہوئے بھی سماع کے قائل ہو گئے۔

ثالثاً: جو حضرات سماع موتی کے منکر ہیں وہ ان آیات سے استدلال تو کرتے ہیں مگر مجوزین سماع موتی کی تکفیر تجہیل اور تحمیق ہرگز نہیں کرتے۔ جیسا کہ ہم نے الشہاب المبین میں کفایت المفتی کے حوالے سے یہ عرض کیا ہے۔ اگر ان آیات کریمات سے عدم سماع موتی پر استدلال قطعی ہوتا تو سماع موتی کے قائلین یقیناً کافر ہوتے۔ ہم تو یہی عرض کریں گے کہ اپنی عقل نارسا اور فہم قاصر کی خاطر جمہور کا ساتھ ہرگز نہ چھوڑیں۔ اس لئے کہ ''ید اللہ علی الجماعۃ''۔

جس کوچے سے گزر صبا کا نہ ہو سکے ‏ ‏ ‏ ‏ اے عندلیب اس کے لئے گلستان نہ چھوڑ

رابعاً: جو حضرات سماع موتی کے منکر ہیں (جن میں اس دور میں ہمارے استاد ومرشد رئیس الموحدین حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ پیش پیش ہیں کے کلام کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ حضرت مرحوم اپنی املائی (تفسیر بلغۃ الحیران ص ۲۷۹) میں فرماتے ہیں: ''وما انت بمسمع من فی القبور'' یعنی بسبب مہر جباریت کے مردے ہو گئے ہیں۔ قبول کرنے ایمان کے سے ان کو سنانا فائدہ نہیں دیتا۔'' اس سے صراحۃً ثابت ہوا کہ ان کے ہاں بھی مطلق سماع کی نفی نہیں بلکہ نفی سماع قبول اور سماع نافع کی ہے اور اسی کو دوسرے حضرات سماع قبول، سماع تدبر، سماع تفہم، سماع اعتبار اور سماع انتفاع وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی وجہ تشبیہ زندوں اور مردوں میں عدم انتفاع اور عدم قبول ہے نہ کہ عدم سماع۔

باب دوم

کیا حیات الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا عقیدہ باطل فرقوں کا ہے؟

جناب نیلوی صاحب نے عوام الناس کو دھوکہ دینے کی خاطر (الکتاب المسطور ج۱ ص ۴۱۳، ۴۱۴) میں حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عقیدہ منافقوں کا (کہ (مدارج النبوۃ ج۲ ص ۵۱۳) میں ہے کہ بعض منافقوں نے کہا اگر

محمد ﷺ پیغمبر و نبی ہوتے تو ان کو موت ہی کیوں آتی) اور (ص ۴۱۶ تا ۴۱۷) میں روافض کا (کہ اصول کافی (کتاب الحجہ ص ۲۸۶، حیات القلوب ج ۲ ص ۸۷۲) میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کی قبر شریف کو جھانک کر نہ دیکھے کہ کہیں دیکھنے والا آپ ﷺ کو قبر شریف میں کھڑا نماز پڑھتے تو بعض ازواج مطہرات کے ساتھ صحبت میں مشغول نہ پائے۔'' اور (ص ۴۱۸) میں (غنیۃ الطالبین ج ۱ ص ۶۱) اور الملل والنحل کے متعدد حوالوں سے یہ لکھا ہے کہ حضرات ائمہ کی وفات نہیں ہوئی اور امام جعفر تا حال فوت نہیں ہوئے۔ وہ زندہ ہیں اور قیامت سے پہلے اٹھ کھڑے ہوں گے اور امام محمد بن حنیفہ رحمہ اللہ زندہ موجود ہیں اور عبداللہ خراسانی زندہ ہیں اور محمد بن عبداللہ قبر میں بحیات دنیوی زندہ ہیں اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے بارے شیعہ کا ایک گروہ کہتا ہے کہ وہ سرے سے فوت ہی نہیں ہوئے اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ مرنے کے بعد زندہ ہو گئے ہیں اور مغیریہ فرقہ کہتا ہے کہ محمد بن علی فوت نہیں ہوئے۔ ہم ان کے منتظر ہیں اور وہ واپس آئیں گے اور بزیغیہ فرقہ کہتا ہے کہ جب انسان کمال کو پہنچ کر مر جاتا ہے تو مرتا نہیں بلکہ عالم ملکوت کو پہنچ جاتا ہے اور اسماعیلیہ فرقہ کہتا ہے کہ اسماعیل بن جعفر تا حال وفات نہیں پائے اور رافضیوں کا ایک فرقہ کہتا ہے کہ موسیٰ بن جعفر زندہ ہیں، نہ مرے ہیں اور نہ مریں گے اور اصول کافی ص ۱۵۸ میں ہے کہ ائمہ اپنے اختیار سے مرتے ہیں۔ (محصلہ)

اور (ص ۴۱۹) میں حیات الانبیاء کا عقیدہ معتزلہ، جہمیہ اور معطلہ کا بتایا ہے اور پھر حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کے قصیدہ نونیہ سے ان کا رد نقل کیا ہے۔

''لو کان حیا فی الصریح حیاتہ قبل الممات بغیر ما فرقان۔ ما کان تحت الارض بل من فوقھا''

یعنی آنحضرت ﷺ قبر میں بغیر کسی فرق کے اسی طرح زندہ ہوتے جس طرح دنیا میں زندہ تھے تو زمین کے نیچے نہ ہوتے بلکہ اوپر ہوتے ...... اور (ص ۴۲۱) میں احمد رضا خان صاحب کے (فتاویٰ رضویہ ج ۱ ص ۶۱۱ اور ملفوظات ج ۳ ص ۲۶) سے یہ عقیدہ نقل کیا ہے کہ: ''انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبور میں حیات حقیقی حسی دنیاوی ہے اور وہ ازواج مطہرات سے شب باشی بھی کرتے ہیں۔'' اور (ص ۴۲۳) میں قادیانیوں کا اور (ص ۴۲۴) میں ہندوؤں کا یہ عقیدہ بتایا ہے کہ: ''وہ حیات الانبیاء کے قائل ہیں۔'' مگر یہ سب کچھ جناب نیلوی صاحب کا دجل اور تلبیس ہے اور اپنے جذباتی اور حقیقت ناشناس حواریوں کا یہ ذہن بنانا چاہتے ہیں کہ حیات الانبیاء کا نظریہ باطل فرقوں کا ہے۔ حالانکہ ان باطل فرقوں میں بعض تو وفات کے قائل ہی نہیں۔ جیسا کہ ان کے حوالوں سے عیاں ہے اور ان کی بعض عبارات کے تراجم میں قبر کا لفظ جناب نیلوی صاحب نے اپنی طرف سے داخل کر کے صریح دھوکہ دیا ہے اور ان میں بعض فرقے قبر کی حیات کو ان تمام لوازم کے ساتھ مانتے ہیں جو دنیا میں تھے۔ یہاں تک کہ ازواج مطہرات سے ہمبستری کے بھی قائل ہیں۔ جیسا کہ روافض اور خان صاحب کے حوالے سے انہوں نے نقل کیا ہے۔ جب کہ اہل حق آنحضرت ﷺ کی وفات کو ''انک میت'' کے مطابق قطعی مانتے ہیں اور قبر کی زندگی کو جو اعادۂ روح کی وجہ سے جیسا کہ صحیح حدیث ''فتعاد روحہ فی جسدہ'' اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ارشاد ''واعادۃ الروح الی العبد'' فی قبرہ حق سے ثابت ہے، تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی مبسوط بحث تسکین الصدور میں ملاحظہ فرمائیں اور یہ زندگی برزخی ہے۔ کیونکہ قبر اور برزخ میں ہے اور دنیوی بھی ہے۔ بایں معنی ہے کہ روح کا تعلق اس بدن سے ہے جو کہ دنیا میں تھا نہ کہ بدن مثالی سے۔ جیسا کہ بعض کہتے ہیں اور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے حوالہ سے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ دنیوی جسم کے تعلق سے حیات ہے اور اس زندگی کے لئے دنیوی زندگی کے تمام لوازم ثابت نہیں اور اگر بعض باطل فرقے بھی قبر شریف میں اعادۂ

روح الی الجسد کی وجہ سے اہل حق کی طرح حیات تسلیم کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حیات کے دلائل اتنے قوی مضبوط اور صحیح ہیں کہ باطل فرقے بھی اس کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں پاتے اور اہل حق کی ہمنوائی پر مجبور ہیں نہ یہ کہ اہل حق نے باطل فرقوں کا نظریہ اپنایا ہے۔ جیسا کہ جناب نیلوی صاحب عوام کو باور کرا رہے ہیں اور ان کے نادان حواری یہ سمجھ رہے ہیں کہ حیات الانبیاء کا نظریہ باطل فرقوں کا ہے۔ شاید جناب نیلوی صاحب یہ کہہ دیں ؎

ہر ایک بات مدلل نہیں ہوا کرتی کبھی تو دل کی بھی سن لو دماغ کے بدلے

قطع نظر ان سب باتوں کے (کفایت المفتی ج ا ص ۱۶۰) میں آنحضرت ﷺ کی قبر کی زندگی اہل السنت والجماعت کا مذہب ہے تو کیا معاذ اللہ تعالیٰ یہ سب اہل السنت والجماعت، منافق، رافضی، معتزلی، جہمی، قادیانی، ہندو اور بریلوی تھے؟ اور (المہند ص ۱۴) میں آنحضرت ﷺ کی قبر شریف کی زندگی کو نہ صرف یہ کہ تسلیم ہی کیا گیا ہے بلکہ اسے دنیویہ برزخیہ سے تعبیر کیا گیا ہے تو کیا حضرت مولانا سہارنپوری رحمہ اللہ اور ان کے جملہ مصدقین جو اکابر علماء دیوبند میں تھے۔ منافق، رافضی، معتزلی، جہمی، قادیانی، ہندو اور بریلوی تھے؟ اور پھر کیا اکبر علماء اشاعۃ التوحید والسنۃ جو حیات دنیویہ کے قائلین کو اہل السنت سے خارج نہیں قرار دیتے وہ بھی سبھی منافق، رافضی، معتزلی، جہمی، قادیانی، ہندو اور بریلوی ہیں۔ جناب نیلوی صاحب! آپ جس نہج پر چل رہے ہیں اور عوام کالانعام اور جذباتی نوجوانوں کو چلا رہے ہیں وہ کسی محقق، دیانت دار اور خدا ترس عالم کا راستہ نہیں ہے۔ کیونکہ حضرات سلف وخلف اور اکابر پر اعتماد ہی عالم اسباب میں کامیابی اور نجات کا سبب اور ذریعہ ہے نہ کہ ان سے بغاوت۔

چمن ان سے عبارت ہے بہاریں ان سے زندہ ہیں انہی کے سامنے پھولوں سے مرجھایا نہیں جاتا

نزاع صرف لفظی ہے

جو حضرات قبر کی زندگی پر لفظ برزخی اطلاق کرتے ہیں ان میں اور ان حضرات میں جو حیات برزخی تسلیم کرتے ہوئے اس پر حیات دنیوی کا اطلاق کرتے ہیں۔ نزاع صرف لفظی ہے اور یہ محقق ومدرس عالم اور جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ کے سابق نائب صدر حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب (المتوفی ۱۴۰۵ھ) کو بھی مسلم ہے۔ چنانچہ ہم قارئین کرام کے سامنے حضرت قاضی صاحب مرحوم کا چیلنج اور راقم اثیم کی طرف سے اس کا جواب اور پھر حضرت قاضی صاحب کا جواب الجواب بعینہٖ عرض کرتے ہیں۔ جناب قاضی صاحب رحمہ اللہ کا مزاج جذباتی اور طبیعت میں تعلّی تھی، ان کے بعض غلط کار اور انتہاء پسند حواریوں نے انہیں اکسایا تو وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور ذیل کا چیلنج راقم اثیم کے نام ارسال فرمادیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولوی سرفراز صاحب! بذات خود میرے ساتھ مناظرہ کرلیں یا مباہلہ کرلیں یا مباہلہ اور مناظرہ دونوں کرلیں۔ اس لئے کہ اس دنیا سے انتقال کے بعد قبر مبارک میں وہ کہتے ہیں حیاۃ دنیویہ ہے۔ میں کہتا ہوں دنیویہ نہیں بلکہ اخرویہ برزخیہ ہے جو نہ کرے وہ جھوٹا ہوگا۔ شمس الدین مؤرخہ ۱۰ رمئی ۱۹۸۵ء

راقم اثیم نے اس کا یہ جواب عرض کیا: ''قال اللہ تعالٰی یا ایہا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین وقال اللہ تعالٰی ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار وقال النبی ﷺ لا تکونوا امعۃ (الحدیث)''

الی محترم المقام جناب مولانا قاضی شمس الدین صاحب موصوف بالقابہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آپ کا چیلنج ذیل کے عنوان سے راقم اثیم کو ملا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولوی سرفراز صاحب! بذات خود میرے ساتھ مناظرہ کرلیں یا مباہلہ، یا مباہلہ اور مناظرہ دونوں کر لیں۔ اس لئے کہ اس دنیا سے انتقال کے بعد قبر میں وہ کہتے ہیں۔ حیات دنیویہ ہے میں کہتا ہوں دنیویہ نہیں بلکہ اخرویہ برزخیہ ہے جو نہ کرے وہ جھوٹا ہوگا۔ شمس الدین مؤرخہ ۱۰رمئی ۱۹۸۵ء

الجواب: آپ کے چیلنج کے الفاظ پڑھ کر سخت حیرت ہوئی اور اس کی آپ کے حواریوں نے فوٹوسٹیٹ کاپیاں تیار کر کے ملک کے کونے کونے میں پہنچانے کی کوشش کی اور رات کو جلسہ میں جناب شاہ صاحب گجراتی اور جناب ملتانی صاحب نے اس کی خوب خوب تشہیر کی ہے اور انتہائی بدکلامی کی اور ایسی ایسی ڈھینگیں ماریں اور تعلّی کی ہے کہ تعجب اور حیرت ہوتی ہے اور اغلب ہے کہ آپ کو متعصب اور جذباتی حواری کی سب باتوں سے خالص اندھیرے میں رکھیں گے۔ جیسا کہ ان کی فطرت اور آپ کے مزاج سے بالکل عیاں ہے کہ وہ ہمیشہ آپ کی شرافت، سادگی، نرمی اور رواداری سے غلط فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور اب بھی کمر باندھ کر اس کے درپے ہیں۔ خدا کرے کہ آپ زندگی کے آخری دور میں ہی اس سے آگاہ ہو جائیں۔

محترم! آپ نے اس مسئلہ میں مناظرہ اور مباہلہ کا چیلنج کیا ہے جس میں میرا (اور میرے اکابر کا) اور آپ کا صرف لفظی نزاع ہے۔ میں نے تسکین الصدور، سماع الموتی اور الشہاب المبین میں باحوالہ اس کی بحث اور وضاحت کردی ہے کہ ہماری مراد حیات دنیویہ سے صرف یہ ہے کہ آپ ﷺ کی روح مبارک کا اس جسد اطہر سے تعلق ہے جو دنیا میں آپ ﷺ کا جسم مبارک تھا۔ یہ حیات نہ تو صرف روحانی ہے اور نہ جسم مثالی کے تعلق سے ہے۔ جیسا کہ بعض کا دعویٰ اور وہم ہے۔ لیکن یہ حیات اہل دنیا کے ادراک وشعور سے بالاتر ہے اور ''لاتشعرون'' کا مصداق ہے اور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا یہ حوالہ (تسکین الصدور ص ۲۶۸ طبع دوم) میں موجود ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کو انہیں اجسام دنیاوی کے تعلق کے اعتبار سے زندہ سمجھتا ہوں۔ یہ نہیں کہ مثل شہداء ان ابدان کو چھوڑ کر اور ابدان سے تعلق ہو جاتا ہے۔ (لطائف قاسمی ص ۳) اور (تسکین الصدور ص ۲۷۲) کے حاشیہ میں حاشیہ تعلیم القرآن نومبر ۱۹۵۹ء ص ۳۹ کے حوالہ سے لکھا ہے۔

اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ وہ حیات دنیا کی سی ہے۔ یعنی مع الجسد ہے صرف برزخی روحانی نہیں جو تمام مومنین کو بھی حاصل ہے جن کے اجسام مٹی ہو چکے ہوں اور (تسکین الصدور ص ۲۷۷) میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کی عبارت میں لفظی حسی کی تشریح کرتے ہوئے راقم نے لکھا ہے۔ الغرض! جس طرح حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو دنیا میں اپنے تمام اعضاء مبارکہ میں حیات کے آثار محسوس ہوتے تھے۔ (اور اسی صفحہ میں اس سے قبل یہ عبارت موجود ہے جس طرح دنیا میں ایک تندرست انسان روح کا اثر تمام اعضاء میں محسوس کرتا ہے۔ بخلاف مفلوج اور مشلول کے کہ فالج کی وجہ سے اس کے جو اعضاء ماؤف اور شل ہو جاتے ہیں ان میں وہ حس نہیں پاتا) اسی طرح قبر میں جو حیات ان کو حاصل ہے، وہ ان کے حق میں حسی ہے اور اس کے آثار وہ خود محسوس کرتے ہیں۔ گو اہل دنیا کو اس کا احساس وشعور نہ ہو سکے اور حسی کے اس معنی میں نقلاً وعقلاً کوئی خرابی معلوم نہیں ہوتی۔

اور ہم نے (الشہاب المبین ص ۷۳) میں لکھا ہے کہ: حیات دنیویہ کا یہ مطلب ان حضرات کے نزدیک ہرگز نہیں کہ دنیا کی زندگی کی طرح دنیوی خوراک کے محتاج ہوں یا بدن کا نشو ونما ہو یا کوئی دوسرا اس زندگی کا ادراک وشعور کر سکے اور اس کو محسوس طور پر زندگی نظر آتی ہو اور نقل وحرکت کرتے دکھائی دے۔ ہماری مراد حیات دنیویہ سے صرف یہ ہے کہ روح مبارک کا تعلق جسد مثالی سے نہیں۔ جیسا کہ بعض کا ادّعاء ہے بلکہ یہ حیات دنیوی عنصری جسم سے متعلق ہے۔ صرف روح یا جسد مثالی کے تعلق سے حیات سے ممتاز کرنے کے لئے یہ تعبیر اختیار کی جاتی ہے تاکہ دونوں میں فرق نمایاں ہو جائے۔ گستاخی معاف آپ خود بھی روح کے جسد عنصری کے ساتھ تعلق سے حیات کے قائل ہیں۔ ہم نے (تسکین الصدور ص ۴۵) میں آپ کی عبارتوں کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً ایک یہ کہ (التعلیق الفصیح علی المشکوٰۃ المصابیح ص ۳۹) میں ہے: ''وقال الفقهاء رحمہم اللہ هو للروح مع الجسد ويشارك الجسد فيه الروح'' اور (ص ۴۵) میں ہم نے آپ کی کتاب (تسکین القلوب ص ۴۷) کا یہ حوالہ بھی درج کیا ہے۔ ہم اپنی پہلی بعض کتابوں میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ ''الانبياء احياء فی قبورهم يصلون لاشک فيه'' اور یہ بھی عرض کر چکے ہیں کہ صوفیاء کرام کے نزدیک یہ عذاب وثواب قبر اور ''تالم وتلذذ'' صرف روح سے تعلق رکھتا ہے۔ (صوفیاء کرام رحمہم اللہ میں ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ قبر میں ثواب وعقاب کا تعلق روح کے ساتھ بمشارکت بدن مثالی ہے اور یہ حضرات روح کا تعلق جسم عنصری اور جسم مثالی دونوں سے تسلیم کرتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ کے حوالے سے یہ بات اپنے مقام پر آرہی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ صفدر) اس جسم عنصری سے اس کا تعلق نہیں اور فقہاء کرام اور متکلمین رحمہم اللہ کے نزدیک یہ جسم خواہ ریزہ ریزہ ہو۔ پھر بھی قبر کے عذاب وثواب اور تالم وتلذذ میں روح کا شریک ہے اور فتویٰ بھی فقہاء کرام رحمہم اللہ کے قول پر دینا چاہئے۔ اگر آپ کو ہماری اس گزارش پر اعتماد نہ ہو اور بدگمانی بدستور رکھیں تو اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔

محترم! آپ خود انصاف سے فرمائیں (اگر آپ کے نزدیک انصاف کسی چیز کا نام ہے) کہ آپ بھی روح کے جسم عنصری کے ساتھ تعلق کی وجہ سے حیات کے قائل ہیں اور اسی پر فتویٰ بھی دیتے ہیں اور میں بھی اسی دنیوی بدن اور عنصری جسم کے ساتھ حیات کا قائل ہوں اور تصریح کی ہے کہ یہ حیات اہل دنیا کے ادراک اور شعور سے بالاتر ہے اور یہ حیات اس مذکور معنی میں دنیوی بھی ہے کہ روح کا تعلق بدن دنیوی سے ہے اور برزخی بھی ہے کہ برزخ میں ہے۔ (المہند ص ۳۸) میں ہے کہ ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک حضرت ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور آپ کی حیات دنیا کی سی ہے۔ بلا مکلف ہونے کے الی قولہ: ''حضرت ﷺ کی حیات دنیوی ہے اور اس معنی میں برزخی بھی ہے کہ عالم برزخ میں حاصل ہے۔'' اور اس پر علماء دیوبند کے چوبیس اکابر کی تصدیقات ثبت ہیں جن میں حضرت مولانا محمود حسن، حضرت مولانا عزیز الرحمن، حضرت مولانا تھانوی اور حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ رحمہم اللہ وغیرہ بھی ہیں۔ آپ کہنہ مشق مدرس عالم ہیں۔ فرمائیں کہ یہ نزاع لفظی ہے یا نزاع حقیقی؟ انصاف آپ پر چھوڑا جاتا ہے۔ ہم نے (تسکین الصدور ص ۲۷۵ میں ماہنامہ تعلیم القرآن ماہ جنوری ۱۹۶۰ء ص ۳۲) کے حوالہ سے ایک فتویٰ کے جواب میں یہ عبارت بھی نقل کی ہے: ''اور اس عالم دنیا سے انتقال کے بعد آنحضرت ﷺ کو عالم برزخ میں مثل شہداء بلکہ شہداء سے بھی اعلیٰ وارفع حیات برزخیہ عطاء فرمائی گئی ہے۔ وہ حیات دنیویہ نہیں بلکہ اس سے بدرجہا اعلیٰ وارفع واجمل وافضل حیات برزخیہ ہے نہ کہ حیات دنیویہ۔ لیکن اگر کوئی اس حیات دنیوی کے نام سے تعبیر کرے اور آپ ﷺ کی حیات برزخیہ سے بھی انکار نہ کرے تو اس کو جماعت اہل السنت سے خارج نہیں کرنا چاہئے۔''

اس پر پچاس حضرات کے دستخط ہیں اور تصدیق کا عنوان یہ ہے: ''جواب صحیح ہے'' ان حضرات میں سے بعض کے نام یہ ہیں: (۱) سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری، (۲) مولانا نصیر الدین صاحب غورغشتوی، (۳) مولانا عبدالرحمن صاحب بہودی، (۴) مولانا ولی اللہ صاحب (انہی) ضلع گجرات، (۵) مولانا غلام اللہ خان صاحب، (۶) مولانا محمد طاہر صاحب پنج پیر، (۷) مولانا فیض علی شاہ صاحب، (۸) مولانا قاضی شمس الدین صاحب، (۹) مولانا قاضی غلام مرتضیٰ صاحب مرجانوی (۱۰) مولانا قاضی نور محمد صاحب، (۱۱) مولانا محمد امیر صاحب سرگودھا، (۱۲) مولانا احمد حسین صاحب سجاد بخاری، (۱۳) مولانا قاضی عصمت اللہ صاحب (رحمہم اللہ)

ان حضرات میں باقی تو مرحوم ہو چکے ہیں، چھ زندہ ہیں۔ (۱) سید عنایت اللہ شاہ بخاری، (۲) خود جناب قاضی شمس الدین صاحب، (۳) مولانا محمد طاہر پنج پیر، (۴) مولانا فیض علی شاہ صاحب، (۵) مولانا احمد حسین سجاد بخاری، (۶) مولانا قاضی عصمت اللہ صاحب، ان جملہ حضرات نے حیات دنیویہ کی تعبیر کو بھی اہل السنت کا مسلک قرار دیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ محترم! آپ نے ان سب حضرات کو یا ان میں سے بعض کو مناظرہ اور مباہلہ کا چیلنج کیوں نہیں دیا؟ کیا اس کارروائی کے لئے کھلونا اور تختہ مشق آپ کو صرف مولوی سرفراز ہی نظر آیا ہے؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ پھر ان حضرات میں آپ کا اپنا اسم گرامی بھی ہے۔ آپ کو اس حیات کو دنیوی حیات سے تعبیر کرنے والے جناب قاضی شمس الدین صاحب ساکن مجاہد پورہ کیوں دکھائی نہیں دیئے؟ اگر ویسے نظر نہیں آتے تو شیشے میں دیکھ لیں ضرور نظر آجائیں گے۔ الغرض! اس مذکورہ مسئلہ میں محترم کے مناظرہ اور مباہلہ کا چیلنج بالکل بے سود، بے کار مہمل اور سستی شہرت حاصل کرنے اور اپنے متعصب اور حقیقت ناشناس حواریوں کو خوش کرنے کا ایک ناکام بہانہ ہے۔''

نزاع حقیقی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عند القبر صلوٰۃ وسلام وغیرہ کے سماع کا نظریہ اتفاقی اور اجماعی ہے اور اس پر امت کا تعامل رہا ہے اور اب بھی ہے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ مگر انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں۔ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۰۰ طبع دہلی)

اور حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کیونکہ روضہ مبارک پر جو درود شریف پڑھا جاتا ہے وہ بالاتفاق بلا واسطہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش ہوتا ہے اور آپ اس کو سنتے اور جواب دیتے ہیں۔'' (امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۱۱۰)

اور ۱۹۶۲ء میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی سرپرستی میں راولپنڈی میں یہ تحریر لکھی گئی تھی۔ ''وفات کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو برزخ (قبر شریف) میں بہ تعلق روح حیات حاصل ہے اور اس حیات کی وجہ سے روضۂ اقدس پر حاضر ہونے والوں کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں۔''

احقر: محمد طیب وارد حال راولپنڈی مؤرخہ ۲۲ رجون ۱۹۶۲ء

لاشئ غلام اللہ خان، نور محمد خطیب جامع مسجد قلعہ دیدار سنگھ

محمد علی جالندھری عفی اللہ عنہ

اور آپ نے خود (تسکین القلوب ص ۱۰۵) میں واضح الفاظ میں عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کو تسلیم کیا ہے۔

اور دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی صاحب کا بتائید دیگر حضرات علماء کرام فتویٰ یہ ہے۔ استفتاء نمبر ۱۹۹۸، یہ عقیدہ رکھنا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک علیین میں ہے۔ آپ کا اپنی قبر اور جسد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

لہٰذا آپ کی قبر پر درود وسلام پڑھا جائے تو پڑھنے والے کو ثواب ملتا ہے۔ لیکن آپ سنتے نہیں کیا ایسا عقیدہ صحیح ہے کہ نہیں؟ اور غلط ہونے کی صورت میں بدعت سیہٗ ہے یا نہیں؟ اور ایسے عقیدہ والے کی امامت کا کیا حکم ہے؟ بینوا تو جروا!

الجواب: آنحضرت ﷺ اپنے مزار مبارک میں بجسدہٖ موجود اور حیات ہیں آپ کے مزار کے پاس کھڑے ہو کر جو سلام کرتا ہے اور درود پڑھتا ہے۔ آپ ﷺ خود سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں ہمارے کان نہیں کہ ہم سنیں آپ اپنے مزار میں حیات ہیں، مزار مبارک کے ساتھ آپ کا خصوصی تعلق بجسدہٖ وروحہٖ ہے جو اس کے خلاف کہتا ہے وہ غلط کہتا ہے۔ وہ بدعتی ہے۔ خراب عقیدہ والا ہے اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔ یہ عقیدہ صحیح نہیں ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ''ان الله حرّم علی الارض ان تاکل اجساد الانبياء الحديث وعن ابی هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ من صلى علی عند قبری سمعته ومن صلى علی من بعيد اعلمته رواه ابو الشيخ رحمہ اللہ وسنده جيد (القول البديع ص ۱۱۶) وعن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ الانبياء (صلوٰة الله تعالٰی علیهم) احياء فی قبورهم يصلون رواه ابن عدی رحمہ اللہ والبيهقی رحمہ اللہ وغيرهما (شفاء السقام ص ۱۳۴)'' دو حدیثیں نقل کر دی ہیں۔ اس باب میں بکثرت احادیث وارد ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور جو انکار کرتا ہے بدعتی اور خارج اہل السنۃ والجماعۃ ہے۔ غرض پڑھنے والے کو ثواب بھی پہنچتا ہے اور مزار مبارک کے قریب پڑھنے سے آپ ﷺ سنتے بھی ہیں اور اپنے مزار مبارک میں بجسدہٖ موجود ہیں اور حیات ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب! کتبہ السید مہدی حسن مفتی دار العلوم دیوبند

مؤرخہ ۱۳ر جمادی الاوّل ۷۶ ۱۳ھ

الجواب صحیح جمیل احمد تھانوی جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور ۲۱ر شوال ۷۶ ۱۳ھ

اجاب المجيب واجاد محمد ضياء الحق كان الله له مدرسه جامعه اشرفيه لاهور

الجواب صواب محمد رسول خان عفا اللہ تعالیٰ عنہ

جناب سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری گجراتی سے قبل از شرق تا غرب از شمال تا جنوب پوری امت میں کوئی شخص ایسا نہیں گزرا جو آنحضرت ﷺ کے عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کا منکر ہو۔ (عام اموات کے سماع اور عدم سماع کا مسئلہ قدیماً وحدیثاً اختلافی چلا آتا ہے) اور اس عقیدہ والا بدعتی بھی ہے اور اہل السنت والجماعۃ سے بھی خارج ہے اور اس کے پیچھے نماز بھی مکروہ ہے۔

محترم! آپ کی سرپرستی میں تقریریں ہوتی ہیں اور جناب شاہ صاحب بڑی بے باکی کے ساتھ قائلین سماع موتی کو ابوجہل کا ٹبر، لوئر مشرک اور یہود تک کہہ جاتے ہیں۔ مگر آپ چپ سادھ لیتے ہیں اور آپ کو ان کی اصلاح اور ان سے بائیکاٹ کی توفیق نہیں ہوتی۔ پھر آپ کے شاگرد خاص مولوی احمد سعید صاحب ملتانی آتے ہیں اور عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کے...... قائلین کو کھلے لفظوں میں کافر کہتے ہیں جس سے پوری امت اور آپ کے اکابر حتیٰ کہ خود آپ کی تکفیر ہوتی ہے اور یہ سب کچھ آپ کی سرپرستی کے عنوان سے ہوتا ہے اور آپ کے حواری کرتے ہیں۔ مگر آپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور اگر کوئی دوسرا آپ کے فریق کے مسلمات سے جوابی کارروائی کرتا ہے تو آپ کو غصہ اور طیش آجاتا ہے۔ کیونکہ نزلہ برعضو ضعیف ریزد اور آپ اس سے معافی اور معذرت کے طالب ہوتے ہیں اور اپنی اور اپنے اکابر بلکہ پوری امت مرحومہ کی تکفیر بڑے ذوق وشوق سے گوارا کرتے ہیں۔ کیا ہمیں یہ کہنے کا حق نہیں کہ۔

اپنی نگاہ شوخ کی کچھ بھی خبر نہیں میری نگاہ شوق پہ اتنی ہیں سختیاں

محترم! العبد کی التجاء و گزارش ہے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ آپ کھلے لفظوں میں تحریری طور پر جناب گجراتی صاحب اور جناب ملتانی صاحب وغیرہ غالیوں سے برأت کا اعلان کریں۔ ورنہ تاریخ کسی کو معاف نہیں کرتی۔ آپ کو سرپرست مکفرین امت کے عنوان سے یاد کرے گی۔

چلئے آپ اپنے اندر اگر اس حقیقی نزاعی مسئلہ میں ان کو مناظرہ اور مباہلہ کے چیلنج کی توفیق نہیں پاتے اور جرأت نہیں کر پاتے تو بیزاری کے اعلان کی مراد نہ جرأت کا مظاہرہ تو کریں اور غلط کارحواریوں کی باتوں میں نہ آئیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ مرحمت فرمائے اور بزرگوں کا سایہ خوردوں کے سر پر دائم رکھے۔ آمین ثم آمین!

اگر آپ نے ان سے برأت نہ کی تو آپ ہی فرمائیں کہ ہم آپ کے بارے میں کیا رائے رکھیں؟

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد خاتم الانبیاء والمرسلین

وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہ وذریاتہ واتباعہ الیٰ یوم الدین

احقر: ابوالزاہد محمد سرفراز خطیب جامع مسجد گکھڑ
وصدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ
۲۶ رشعبان ۱۴۰۵ھ بمطابق ۱۷ رمئی ۱۹۸۵ء

مولانا قاضی شمس الدین کا چیلنج واپسی کا اعلان

اس کے جواب میں محترم جناب قاضی صاحب مرحوم نے اپنے مدرسہ کے مطبوعہ پیڈ پر (جس پر بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ مدرسہ جامعہ صدیقیہ مہتمم قاضی شمس الدین عفی اللہ عنہ، محلہ مجاہد پورہ گوجرانوالہ پاکستان درج ہے) یہ تحریر فرمایا کہ مولانا سرفراز صاحب مدظلہ کا اس چیلنج کے بعد یہ جواب آیا کہ چونکہ یہ نزاع لفظی ہے۔ اس لئے مناظرہ اور مباہلہ کی ضرورت نہیں۔ شمس الدین ۱۸ رمئی ۱۹۸۵ء

قارئین کرام! چونکہ حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب رحمہ اللہ کہنہ مشق مدرس نکتہ رس عالم اور مناظرانہ ذہن کے مالک تھے۔ اگر ان کے نزدیک فریقین کا اس مسئلہ میں نزاع لفظی نہ ہوتا بلکہ حقیقی ہوتا تو وہ کبھی بھی چیلنج واپس نہ لیتے بلکہ اپنے مزاج کے موافق خوب خوب تعاقب کرتے۔ مگر ایسا ہرگز نہیں کیا۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ اکابر اور خود اپنے صریح حوالوں کے سامنے وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس پاتے ہیں اور جناب نیلوی صاحب کی طرح صرف عقلی گھوڑے ہی نہیں دوڑاتے ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

حیات کے معنے؟

یہ عنوان قائم کر کے جناب نیلوی صاحب لکھتے ہیں کہ: "بعد از موت حیات ثانیہ برزخیہ میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ قرآن مجید اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ اس حیات ثانیہ برزخیہ کا انکار قطعیات ومحکمات کا انکار ہے۔ لیکن حیات کے ساتھ اپنی ناصواب دانش وفہم سے عنصریہ کی قید بڑھانا اور اس قید کو جس کا ذکر نہ قرآن مجید میں ہے نہ کسی حدیث میں ہے۔ نہ کسی صحابی سے مروی ہے نہ کسی تابعی سے نہ تبع تابعین سے نہ کسی مجتہد اور امام سے نہ کسی مفسر اور شارح سے نہ کسی متکلم اور صوفی سے ثابت غرض جس قید کو سلف وخلف میں سے کسی محقق نے ذکر نہ کیا ہو، پرزور دعووں سے بلا دلیل ثابت کرنا اور اس دعویٰ بلا دلیل کی۔ دلیل کا مطالبہ کرنے والے کو بجائے دلیل بتانے

کے اور براہین قاطعہ سے سائل کی تسلی کرنے کی سائل کو منکر حیات انبیاء وشہداء کہہ کر لوگوں میں بدظنی پھیلانا انہی لوگوں کا کام ہے، جنہیں خوف خدا نہیں مرنا یاد نہیں۔''

پھر آگے لکھتے ہیں کہ:''جیسے آدمی لباس ومکان بدلنے سے نہیں مرتا۔ ایسے ہی جسد عنصری کا لباس اتار کر جسد مثالی کا لباس پہن لینے اور دار دنیا سے دار برزخ کی طرف منتقل ہونے سے بھی آدمی نہیں مرتا۔ مگر نہ دنیا والوں کو جانتا ہے اور نہ ان کی آوازیں سنتا ہے۔ مگر خرق عادت کے طور پر۔''

پھر آگے حیات کے تعلق الروح بالبدن العنصری کے علاوہ نمبر لگا کر گیارہ اور معنے بیان کئے ہیں۔ تا کہ گیارھویں شریف کا مفہوم پورا ہو جائے اور مولوی احمد رضا خان صاحب کی روح ناراض نہ ہو جن کے ساتھ جناب نیلوی صاحب کا سماع روحانی میں قارورہ ملتا ہے۔ پھر آگے امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ کی (مفردات ج ۱ ص ۱۳۸) کا حوالہ نقل کیا ہے کہ احادیث کثیرہ سے ثابت ہے کہ شہداء کی ارواح لذتیں اٹھاتی ہیں۔ پھر آگے قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ کا حوالہ (مظہری ج ۴ ص ۱۷۰) سے نقل کیا ہے۔ یعنی انہیں مزوں اور نعمتوں کا شعور نہیں تو معلوم ہوا کہ حیات کے معنی ہیں۔ مزے اور نعمتوں کا شعور رکھنا۔ (محصلہ کتاب المسطور ص ۱ تا ۴)

الجواب: جناب نیلوی صاحب نے جس سطحی ذہن سے کام لیا ہے اس پر حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی ہم نہایت ہی اختصار سے عرض کرتے ہیں۔ غور فرمانا قارئین کرام کا کام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیآء ولکن لا تشعرون (البقرۃ)''اور نہ کہو ان کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مردے ہیں بلکہ وہ زندے ہیں لیکن تم کو خبر نہیں۔ (ترجمہ شیخ الہند)

اور نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیآء عند ربھم یرزقون (آل عمران)''اور تو نہ سمجھ ان لوگوں کو جو مارے گئے اللہ کی راہ میں مردے بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس کھاتے پیتے۔ (ترجمہ شیخ الہند)

اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات سے ثابت ہوا کہ جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتل ہوتے ہیں وہ مردے نہیں زندہ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ قتل کیا چیز ہوتی ہے؟ اگر شہید کا جسد عنصری قتل کیا جاتا ہے تو زندگی بھی اسی سے متعلق ہوگی اور اگر جسد مثالی یا روح قتل کی جاتی ہے تو زندگی بھی انہیں سے وابستہ ہوگی۔ کیا جناب نیلوی صاحب کے نزدیک شہید کا جسم مثالی یا اس کی روح قتل کی جاتی ہے یا جسد عنصری؟ کوئی عقلمند اس میں شک وتردد نہیں کرسکتا کہ شہید کا جسم عنصری ہی قتل کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق''بل احیاء''زندہ بھی وہی اجسام عنصریہ ہی ہوں گے نہ کہ اجسام مثالیہ کس سادگی سے جناب نیلوی صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جسد عنصری کا ثبوت قرآن مجید سے نہیں؟ اور صحیح حدیث میں (جس کی مفصل بحث (تسکین الصدور ص ۱۰۱ تا ۱۰۷) میں موجود ہے) فتعاد روحہ فی جسدہ میں اس جسم سے بغیر جسد عنصری کے اور کیا مراد ہے۔ کیونکہ لفظ اعادہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ جس جسم عنصری میں پہلے روح تھی اسی جسم کی طرف پھر لوٹائی جاتی ہے۔

ہم نے حضرات محدثین کرام، فقہاء عظام اور متکلمین ذوالافہام رحمہم اللہ کے ٹھوس اور صریح حوالے تسکین الصدور میں جسد عنصری کے ثبوت پر دیئے ہیں جن کو جناب نیلوی صاحب شیر مادر سمجھ کر ہضم کر گئے ہیں۔ ہم تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ قارئین کرام وہ حوالے خود وہاں ہی ملاحظہ کرلیں۔ اختصاراً ہم ایک حوالہ عرض کرتے ہیں۔

حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب رحمہ اللہ (المتوفی رمضان ۱۴۰۵ھ) فرماتے ہیں: ''ہم اپنی پہلی بعض کتابوں میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ ''الانبیآء احیاء فی قبورھم لا شک فیہ'' اور یہ بھی عرض کر چکے ہیں کہ صوفیاء کرام رحمہم اللہ کے نزدیک یہ عذاب وثواب قبراور تألم وتلذذ صرف روح سے تعلق رکھتا ہے۔ (صوفیاء کرام رحمہم اللہ میں ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ قبر میں ثواب وعقاب کا تعلق روح کے ساتھ بمشارکت بدن مثالی ہے اور یہ حضرات روح کا تعلق جسم عنصری اور جسم مثالی دونوں سے تسلیم کرتے ہیں۔ (جیسا کہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ کے حوالہ سے یہ بات تسکین الصدور ص ۱۳۶ میں موجود ہے۔ صفدر) اس جسم عنصری سے اس کا تعلق نہیں اور فقہاء کرام اور متکلمین رحمہم اللہ کے نزدیک یہ جسم خواہ ریزہ ریزہ ہو چکا ہو، پھر بھی قبر کے عذاب وثواب اور تألم وتلذذ میں وہ روح کا شریک ہے اور فتویٰ بھی فقہاء کرام رحمہم اللہ کے قول پر دینا چاہئے۔'' (تسکین القلوب ص ۴۷)

اور نیز وہ عربی شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں کہ: ''وقال الفقھاء رحمھم اللہ تعالٰی ھو للروح مع الجسد ویشارک الجسد فیہ الروح'' (التعلیق الفصیح ج ۱ ص ۳۹)

حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ عذاب وراحت روح اور جسم دونوں کو ہوتا ہے اور جسم اس میں روح کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔

قارئین کرام! جناب نیلوی صاحب سے تو حق بات کے سمجھنے اور اس کے اقرار کرنے کی سرے سے توقع ہی نہ رکھیں بلکہ خود سمجھنے کی کوشش کریں کہ حضرت قاضی صاحب مرحوم تو فرماتے ہیں کہ حضرات فقہاء کرام اور متکلمین عظام رحمہم اللہ قبر میں راحت وتکلیف کا تعلق روح اور جسم عنصری کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ فتویٰ بھی اسی پر ہونا چاہئے۔ کیا یہ حضرات فقہاء کرام، متکلمین اور سلف وخلف محققین رحمہم اللہ کے علاوہ کوئی اور مخلوق ہے؟ اگر یہ محقق نہ تھے تو دنیا میں محقق کون ہے؟ غرضیکہ جسد عنصری کا ثبوت قرآن کریم حدیث شریف اور حضرات فقہاء کرام اور متکلمین عظام رحمہم اللہ سے ہو گیا۔ اس کا انکار کرنا اور یہ سمجھنا اور عوام الناس کو یہ باور کرانا کہ جسد عنصری کا ثبوت قرآن وحدیث اور علماء امت سے نہیں۔ جناب نیلوی صاحب کی صرف جہالت ہی نہیں بلکہ دجل بھی ہے۔ جناب نیلوی صاحب سے ہمارا مطالبہ ہے کہ قرآن کریم، صحیح صریح حدیث، حضرات محدثین کرام، فقہاء عظام، متکلمین نیک فرجام رحمہم اللہ سے جن کے اجساد عنصریہ موجود ہیں کے بارے میں ثواب وعذاب کے سلسلہ میں جسد کے ساتھ مثالی کی قید بتائیں۔ ویسے اجسام مثالیہ کا ہمیں کوئی انکار نہیں ہے۔ الغرض قبر میں جسم عنصری کی روح کے ساتھ مشارکت سے حیات قرآن کریم صحیح حدیث اور حضرات فقہاء کرام اور متکلمین عظام رحمہم اللہ کی صریح عبارات سے ثابت ہے اور جسد کا لفظ جب بھی مطلق آئے گا تو اس سے جسد عنصری ہی مراد ہو گی۔ کیونکہ یہی اس کا فرد کامل ہے جسم مثالی۔ چونکہ بسلسلہ ثواب وعذاب قبر غیر ظاہر ہے۔ اس لئے وہ دلیل کا محتاج ہے جس پر کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے اور یہ عدل وانصاف کے اصول کے بھی بالکل خلاف ہے کہ گناہ تو کرے جسم عنصری اور سزا بھگتے جسد مثالی۔ دنیا میں بحالت ایمان تکلیفیں تو برداشت کرے جسد عنصری اور مزے لوٹے جسد مثالی یہ تو ایسا ہی ہوا۔ جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

دعائیں ہم نے مانگی تھیں بہاریں غیر نے لوٹیں ہمیں تو شاق گزرا ہے تمہارا یوں جواں ہونا

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۹۷ھ) فرماتے ہیں کہ: ''انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو انہیں اجسام دنیاوی کے تعلق کے اعتبار سے زندہ سمجھتا ہوں۔'' (لطائف قاسمی ص ۳)

کیا نیلوی صاحب حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کو عالم، صوفی، متکلم، محقق اور خلف کا کوئی فرد مانتے ہیں یا نہیں؟ اور کیا دنیا میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو اجسام عنصریہ حاصل تھے یا مثالیہ؟ قرآن کریم میں ہے: ''وما جعلناھم جسداً لا یاکلون الطعام (الانبیاء) '' اور نہیں بنائے تھے ہم نے ان کے ایسے بدن کہ وہ کھانا نہ کھائیں۔

اس میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے کون سے اجسام اور ابدان مراد ہیں؟ اور ''ان اللہ تعالیٰ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء (الحدیث) '' سے کون سے اجساد مراد ہیں؟ خود جناب نیلوی صاحب لکھتے ہیں کہ: ''اور آپ کے جسم مبارک اجساد عنصریہ اپنے اپنے عرفی مقبروں میں بالکل صحیح سلامت بلا تغیر وتبدل اسی حالت میں اب تک موجود ہیں۔'' (کتاب المسطور ج ۱ ص ۹)

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ جو حضرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زندگی کو جسمانی اور دنیوی سے تعبیر کرتے ہیں، ان کی مراد بھی صرف یہ ہے کہ روح اطہر کا تعلق اس جسم مبارک سے ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں حاصل تھا نہ یہ کہ بہمہ وجوہ دنیوی زندگی ہے جس پر احکام دنیا مرتب ہوں اور وہ اہل دنیا کے شعور میں آسکے۔ جیسا کہ نیلوی صاحب مغالطہ کا شکار ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر میں زندہ ہیں تو فصل خصومات کیوں نہیں کرتے۔ وغیر ذلک!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زندگی دنیوی جسم اطہر سے روح مقدس کے تعلق سے ایسی واضح اور نمایاں ہے کہ غیر مقلدین حضرات کے رئیس الطائفہ جناب قاضی محمد بن علی الشوکانی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۲۵۰ھ) بھی اسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں پاتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: ''وقد ذھب جماعة من المحققین الی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیّ بعد وفاته وانه یسرّ بطاعات امته وان الانبیآء لا یبلون مع ان مطلق الادراک کالعلم والسماع ثابت لسائر الموتی وقد صح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً مامن احدیم علی قبر اخیه المؤمن وفی روایة بقبر الرجل کان یعرفه فی الدنیا فیسلّم علیه الاعرفه ورد علیه ولابن ابی الدنیا اذا مر الرجل بقبر یعرفه فیسلم علیه رد علیه السلام وعرفه واذا مر بقبر لا یعرفه رد علیہ السلام وصح انه کان صلی اللہ علیہ وسلم یخرج الی البقیع لزیارة الموتی ویسلم علیهم وورد النص فی کتاب اللہ فی حق الشھداء انهم احیآء یرزقون والحیٰوة فیهم متعلقة بالجسد فکیف بالانبیآء والمرسلین وقد ثبت فی الحدیث ان الانبیآء احیاء فی قبورھم رواہ المنذری وصححه البیھقی وفی صحیح مسلم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال مررت بموسٰی لیلة اسری بی عند الکثیب الاحمر وھو قائم یصلی فی قبرہ'' (نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۶۴)

اور تحقیق سے محققین کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے بعد زندہ ہیں اور بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی طاعات سے خوش ہوتے ہیں اور بلاشبہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام بوسیدہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ مطلق ادراک مثلاً علم اور سننا تو یہ تو تمام مردوں کے لئے ثابت ہے اور تحقیق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت ثابت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی بھی اپنے مومن بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ ایسے مرد کی قبر کے پاس سے جسے وہ دنیا میں جانتا تھا اور وہ اسے سلام کہے تو وہ اسے پہچانتا ہے اور سلام کا جواب دیتا ہے اور امام ابن ابی الدنیا کی روایت میں ہے کہ جب کوئی آدمی کسی ایسے مرد کی قبر کے پاس سے گزرے جس کو وہ جانتا تھا اور اسے سلام کہے تو وہ اس کو جان کر جواب دیتا ہے اور اگر وہ اسے نہیں جانتا تو بلا جانے وہ اسے جواب دیتا ہے اور (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۱۲) کی روایت سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

مردوں کی زیارت کے لئے جنت البقیع (کے قبرستان میں) جاتے تھے اور سلام کہتے تھے اور قرآن کریم میں شہداء کے بارے صراحۃ آیا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور انہیں رزق دیا جاتا ہے اور ان کی یہ حیات جسم (عنصری) کے ساتھ متعلق ہے تو حضرت انبیاء کرام اور مرسلین علیہم السلام کی زندگی اجسام سے کیوں متعلق نہ ہوگی؟ اور حدیث سے ثابت ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ امام منذری رحمہ اللہ نے اس کو روایت کیا اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۶۸) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں معراج کی رات سرخ ٹیلے کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا اور وہ اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔

اور (تفسیر فتح القدیر ج ۱ ص ۳۶۵) میں لکھتے ہیں کہ: "ترد الیهم ارواحهم فی قبورهم فیتنعمون" ان کی طرف ان کی ارواح قبور میں لوٹائی جاتی ہیں۔ سو وہ مزے کرتے ہیں اور اسی کو وہ جمہور کا اور صحیح قول قرار دیتے ہیں۔ حیات کے اور بھی متعدد معانی ہیں۔ اپنے اپنے موقع اور محل کے لحاظ سے وہ سب درست ہیں نہ تو ہمیں ان کا انکار ہے اور نہ وہ سب معانی یہاں مراد ہیں۔ خواہ مخواہ کی تطویل سے کیا فائدہ؟ اور عوام کو غیر متعلق اور لایعنی حوالوں اور ابحاث میں الجھانے سے کیا حاصل؟ مقصود کے پیش نظر "خیر الکلام ماقل و دل" کو ملحوظ رکھنا چاہئے ۔

عشق کے مکتب کا ہے یہ قاعدہ چپ رہو مطلب ادا ہو جائے گا

امام الحسین بن محمد الراغب رحمہ اللہ (المتوفی ۵۰۲ھ) کی عبارت نقل کرنے میں جناب نیلوی صاحب نے کوتاہی کی ہے۔ سیاق و سباق کی پوری عبارت نقل کر دیتے تو ان کے بے بنیاد دعویٰ کی جڑیں کٹ جاتیں۔ امام راغب رحمہ اللہ "حیی" کے لفظ کی تشریح کرتے ہوئے حیات کے متعدد معانی بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"والرابعة عبارة عن ارتفاع الغم وبهذا النظر قال الشاعر... لیس من مات فاستراح بمیت انما المیت میت الاحیاء وعلی هذا قوله عزوجل ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل الله امواتاً بل احیآء عند ربهم ای هم متلذذون لما روی فی الاخبار الکثیرة فی ارواح الشهداء والخامسة الحیاة الاخرویة الابدیة وذلک یتوصل الیه بالحیاة التی هی العقل والعلم قال الله تعالی استجیبوا لله وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم وقوله یالیتنی قدمت لحیاتی یعنی بها الحیاة الاخرویة الدائمة" (المفردات فی غریب القرآن ص ۱۳۸)

اور چوتھا معنی حیات کا غم کا دور ہونا ہے اور اسی معنی میں شاعر کہتا ہے کہ جو شخص مر گیا اور اسے راحت حاصل ہوگئی تو وہ مردہ نہیں ہے۔ مردہ تو وہ ہے جو زندوں میں رہ کر بھی مردہ ہو۔ (یعنی اسے سکھ اور چین نصیب نہ ہو) اور اس معنی کے رو سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ تم ہرگز ان لوگوں کو مردے نہ کہو جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مارے گئے بلکہ وہ اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں۔ یعنی وہ مزے لوٹ رہے ہیں۔ جیسا کہ احادیث کثیرہ میں شہداء کی ارواح کے بارے آیا ہے اور پانچواں معنی حیات اخرویہ ابدیہ ہے اور اس تک اس حیات کے ذریعہ سے رسائی ہوتی ہے جو عقل و علم سے حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تم اللہ تعالیٰ اور رسول کا حکم مانو جس وقت بلائے تم کو اس کام کی طرف جس میں تمہاری زندگی ہے اور اللہ تعالیٰ کا (کافر کے قول کی حکایت کرتے ہوئے) ارشاد ہے۔ کاش کہ میں اپنی حیات کے لئے کچھ آگے بھیجتا۔ اس حیات سے بھی حیات اخرویہ دائمہ مراد ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا حضرات شہداء کو صرف چوتھے معنی کی حیات ہی حاصل ہے اور وہ حیات کے پانچویں معنی سے محروم ہیں؟ اور کیا شہداء کے ابدان عنصریہ کو شہید کیا جاتا ہے یا ارواح کو؟ اور کیا مزے صرف ارواح

اڑاتی ہیں یا ابدان بھی؟ اگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد حضرات شہداء کو حیات اخرویہ دائمہ حاصل نہیں تو اور کس کو حاصل ہوگی؟ اور ہم تسکین الصدور، سماع الموتی، الشہاب المبین کے علاوہ اس پیش نظر کتاب میں بھی باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ بعد از وفات حیات اعادۃ الارواح الی الابدان العنصریۃ کے طریق سے حاصل ہے۔ گو وہ اہل دنیا کے شعور وادراک سے بالاتر ہے۔ یہی صحیح احادیث کا مفاد ہے اور یہی حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ارشاد ہے اور اسی پر اہل السنت والجماعت کا اتفاق ہے۔ حضرات شہداء کے ابدان عنصریہ سے ان کی ارواح کا تعلق قائم ہوتے ہوئے بھی ان کی ارواح سبز رنگ کے طیاروں میں سوار ہو کر جنت میں جہاں چاہیں سیر کرتی پھریں۔ اس میں شرعاً کیا اشکال ہے؟ اور ان طیور (طیاروں) کے ساتھ ان کی ارواح کا ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ موتی اور ہیرے صندوق میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ (یا آج کل جیسا کہ لوگ ہوائی جہاز یا ریل یا کار وغیرہ میں سفر کرتے ہیں۔ صفدر) نہ ایسا تعلق جیسا کہ ارواح کا ابدان دنیویہ کے ساتھ تدبیر کا تعلق تھا۔ (ملاحظہ ہو لمعات حاشیہ ترمذی ج ۱ ص ۱۹۷)

اگر جناب نیلوی صاحب حضرت امام راغب کا پیش کردہ شعر بھی نقل کر دیتے اور آگے حیات کا پانچواں معنی بھی ساتھ ہی نقل کر دیتے اور شہید کا معنی بھی سمجھتے تو حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی۔ مگر انہوں نے اسی میں خیر سمجھی کہ شعر نہ نقل کیا جائے جس سے حیات کے چوتھے معنی کی اصلیت واضح ہوتی ہے اور نہ پانچواں معنی نقل کیا اور نہ شہید کا مفہوم ہی بیان کیا کہ قتل اور شہید کس کو کیا جاتا ہے؟ مگر وہ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے تو اپنے مطلب کے لئے ''لا تقربوا الصلوٰۃ'' کا جملہ ہی درکار ہے۔ سیاق وسباق سے مجھے کیا غرض؟

زمانے کے لب پہ زمانے کی باتیں مری دکھ بھری داستاں میرے دل میں

تفسیر مظہری کا حوالہ: جناب نیلوی صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ نے اموات کے معنی لکھے ہیں: ''امواتا غیر مستشعرین بالذات والنعماء'' یعنی انہیں مزوں اور نعمتوں کا شعور نہیں۔ (تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۷۰)

الجواب: جناب نیلوی کی سمجھ اور فہم بھی عجائبات زمانہ میں سے ایک اعجوبہ ہے۔ اس انداز استدلال سے ان کا مقصد یہ ہے کہ شہداء کے اجساد عنصریہ مردے ہیں اور مزوں اور نعمتوں کے شعور سے بالکل محروم ہیں اور ان کا تلذذ و تنعم صرف ان کی ارواح سے متعلق ہے۔ مگر ان کا یہ استدلال قطعاً باطل ہے۔ اولاً تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یوں ہے: ''ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیآء عند ربھم یرزقون'' اور تم ہرگز نہ خیال کرو ان لوگوں کے بارے جو مارے گئے اللہ کی راہ میں مردے بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے ہاں رزق دیئے جاتے ہیں۔

بالکل ظاہر امر ہے کہ شہید کی نہ روح قتل کی جاتی ہے اور نہ جسد مثالی بلکہ اس کا جسد عنصری قتل کیا جاتا ہے اور رب تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں وہ مردے نہیں بلکہ زندہ ہیں اور اپنے رب تعالیٰ کے ہاں وہ کھاتے پیتے ہیں۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ شہداء کے اجساد عنصریہ کو ''بل احیاء'' سے زندہ کہتے ہیں اور جناب نیلوی صاحب ان کو مردہ کہتے ہیں۔ اب فیصلہ قارئین کرام پر ہے کہ رب تعالیٰ کا ارشاد حق ہے یا جناب نیلوی صاحب کا خود ساختہ نظریہ؟

ثانیاً: اس لئے کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون'' اور نہ کہو ان کے بارے جو خدا کی راہ میں مارے گئے کہ مردے ہیں بلکہ وہ زندے ہیں لیکن تمہیں شعور نہیں۔

اس آیت کریمہ میں عدم شعور دنیا میں زندوں کی صفت بیان فرمائی ہے نہ کہ شہداء کی اور مطلب یہ ہے۔ اے زندو! اگرچہ شہداء قبر اور برزخ میں زندہ ہیں مگر تمہیں شعور نہیں۔ مگر جناب نیلوی صاحب پر تحقیق و تدقیق کا زور ہے۔ وہ عدم شعور شہداء کی صفت بناتے اور بتاتے ہیں۔

ثالثاً: اس لئے کہ ''امواتاً لاتحسبن'' کا مفعول اور غیر مستشعرین۔ امواتا کی صفت ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے دنیا میں زندہ لوگو! تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہونے والوں کو ایسے مردے نہ سمجھو کہ وہ مزوں اور نعمتوں کا شعور نہ رکھتے ہوں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں رزق دیا جاتا ہے اور بالکل عیاں ہے کہ زندہ بھی وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتل کئے گئے اور رزق بھی انہی کو ملتا ہے۔ جناب نیلوی صاحب کی یہ قرآن دانی ہے اور بقول خود وہ خادم قرآن اور درحقیقت وہ ہادم قرآن ہیں۔ العیاذ باللہ تعالیٰ کہ ''لاتحسبن'' کے فعل کو بمع حرف نفی کے بالکل نظرانداز کرتے ہیں اور امواتا کے جملہ کو جو مفعول ہے۔ مبتداء بنا کر غیر مستشعرین کو اس کی خبر بنا کر معنی یہ کرتے ہیں۔ یعنی انہیں مزوں اور نعمتوں کا شعور نہیں۔ اس قرآن فہمی پر افسوس بھی ہوتا ہے اور رنج بھی مگر وہ اپنی تحقیق پر خوب نازاں ہیں اور ان کے سطحی حواریوں نے انہیں خلاء تک پہنچادیا ہے۔

جنوں کہتا ہے پندار جنوں کی انتہاء کر دوں مہ و انجم کو اس کے پائے ناک پر فدا کر دوں

رابعاً: اس لئے کہ جناب نیلوی صاحب کا بیان کردہ مطلب حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ کی مراد کے خلاف ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''ومن اجل ذلک الحیواۃ لا تاکل الارض اجسادھم ولا اکفانھم'' (تفسیر مظہری ج ۱ ص ۱۵۲)

اور اسی حیات کی وجہ سے زمین شہداء کے اجسام اور ان کے اکفان کو نہیں کھاتی۔

غور فرمائیں کہ حضرت قاضی صاحب تو شہداء کے اجساد عنصریہ کی حیات کے قائل ہیں کہ زمین نہ تو ان کے اجسام کو کھاتی ہے اور نہ ان کے اکفان کو۔ کیونکہ جو جسم کھانے کے لائق ہے وہ جسد عنصری ہے نہ کہ جسد مثالی جیسا کہ کسی بھی عاقل پر مخفی نہیں۔ جائیکہ عالم پر۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ: ''والشھید لایبلی فی القبر ولایاکلہ الارض وھذا ایضاً اثر من آثار حیاتہ'' (تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۷۰)

اور قبر میں شہید بوسیدہ نہیں ہوتا اور نہ اس کو زمین کھاتی ہے اور یہ بھی اس کی حیات کے آثار میں سے ہے۔

اور یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ شہید کا جسم عنصری ہی قتل کیا جاتا ہے اور اسی کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے اور اسی کو زمین نہیں کھاتی اور نہ وہ بوسیدہ ہوتا ہے اور یہ اس کی حیات کے آثار ہیں۔ جناب نیلوی صاحب کا مسئلہ حیات میں غلو جنون کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ وہ جسد عنصری کے تعلق سے حیات کا تصور تک بھی نہیں کر سکتے۔ جہاں بھی لفظ حیات آتا ہے اس کی وہ یہی تاویل بلکہ تحریف کرتے ہیں کہ اس حیات سے جسد مثالی اور روح کی برزخی حیات مراد ہے۔ لیکن قرآن کریم، احادیث صحیحہ اور اہل السنت والجماعت کا واضح نظریہ اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فقہ اکبر میں روشن فتویٰ ان پر ضرب کاری ہے۔ البتہ ''لانسلم'' کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔

خامساً: حضرات انبیاء کرام اور شہداء عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا تو مقام ہی بہت بلند ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب عامۃ المؤمنین اور کفار کے بارے تحریر فرماتے ہیں کہ: ''ان مقر ارواح المومنین فی علیین او فی السماء

السابعة ونحو ذلک کمامر ومقر ارواح الکفار فی سجین ومع ذلک لکل روح منها اتصال بجسده فی قبره لایدرک کهنه الا الله تعالٰی وبذالک الاتصال یصح ان یعرض علی الانسان المجموع المرکب من الجسد والروح مقعده من الجنة او النار ویحسس اللذة او الالم ویسمع سلام الزائر ویجیب المنکر والنکیر ونحو ذلک مما ثبت بالکتاب والسنة'' (تفسیر مظہری ج ۱۰ ص ۱۲۴)

بے شک مومنوں کی ارواح کا ٹھکانا علیین یا ساتواں آسمان اور اس کی مانند کوئی جگہ ہے۔ جیسا کہ گزر چکا ہے اور کفار کی ارواح کا ٹھکانا سجین ہے لیکن بایں ہمہ ہر ایک روح کا اس جسم سے جو قبر میں ہے، تعلق ہے جس کی حقیقت بجز پروردگار کے کوئی اور نہیں جانتا اور اسی اتصال کی وجہ سے درست ہے کہ انسان پر جو جسم اور روح دونوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا ٹھکانا جنت یا دوزخ پیش کیا جائے اور وہ لذت یا دکھ محسوس کرے اور زیارت کرنے والے کو سلام سنے اور منکر ونکیر کو جواب دے اور اسی طرح کے اور امور جن کا ثبوت کتاب وسنت سے ہو چکا ہے۔

قارئین کرام! غور فرمائیں کہ حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ تو عام مومنوں اور کفار کی ارواح کا تعلق بھی قبور میں ان کے اجساد عنصریہ کے ساتھ تسلیم کرتے اور ان کے دکھ اور سکھ کو محسوس کرنے اور زیارت کنندہ کے سلام کا ادراک کرنے اور منکر ونکیر کے سوالات کو سمجھ کر جوابات دینے کا اثبات کتاب وسنت کے حوالے سے کرتے ہیں اور جناب نیلوی صاحب ہیں جو حضرت قاضی صاحب کی عبارت سے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں کہ حضرات شہداء کے اجسام عنصریہ مزوں اور نعمتوں کے شعور سے محروم ہیں اور یہی کچھ بعض دیگر باطل فرقے کہتے ہیں مگر کیا کیا جائے؟

دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں دیکھنا ہے کھینچتا ہے مجھ پر پہلا تیر کون؟

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''یرزقون من الجنة تاکید لکونهم احیاء'' شہداء کو جنت سے رزق دیا جاتا ہے اور یہ امر ان کے زندہ ہونے کی تاکید کرتا ہے۔ (تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۷۱)

غرضیکہ خود حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ کی واضح عبارتیں حضرات شہداء کی حیات جسمانی وعنصری کو عیاں کرتی ہیں اور ان کے لئے جنت سے رزق اور ان کے شعور کو اجاگر کرتی ہیں جن میں کوئی خفاء نہیں۔

وجہ اشتباہ ومغالطہ

معتزلہ وغیرہ باطل فرقوں نے تو صدیوں سے یہ مغالطہ پلے باندھ رکھا ہے کہ چونکہ قبر میں شہید وغیرہ کسی بھی صحیح جسد والے مردہ کی حیات ہمیں محسوس نہیں ہوتی اور نہ اس کا شعور مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس لئے حیات جسم عنصری سے متعلق نہیں بلکہ روح یا جسد مثالی سے وابستہ ہے اور یہی نظریہ جناب نیلوی صاحب نے ان سے چرایا یا محتاط الفاظ میں مستعار لیا ہے اور اسی غلط نظریہ کا رد حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ یوں کرتے ہیں: ''ولکن لاتشعرون فیه تنبیه علی ان حیاتهم لیست من جنس ما یحسه کل احد وانما هی امر لا یدرک بالعقل ولا بالحس بل بالوحی او الفراسة الصحیحة المقتبسة من الوحی'' (تفسیر مظہری ج ۱ ص ۱۵۳)

اور لیکن تمہیں شعور نہیں۔ اس میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ شہداء کی حیات اس قسم کی نہیں جس کا ہر کوئی احساس کر سکے۔ یہ حیات ایسی ہے کہ نہ تو عقل سے اس کا ادراک ہوتا ہے اور نہ حس سے بلکہ اس کا ادراک صرف وحی سے ہوتا ہے یا فراست صحیحہ سے جو وحی سے حاصل ہے۔

اس عبارت میں حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ نے ان لوگوں کے اس باطل نظریہ کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے

جو یہ کہتے ہیں کہ اگر حیات کا یہ معنی ہے کہ روح کا جسد عنصری سے تعلق ہے تو پھر اس کا مشاہدہ اور احساس ہونا چاہئے اور ان کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ وحی جلی و متلو میں ''بل احیاء'' اور وحی خفی وغیر متلو میں فتعاد روحہ فی جسدہ آیا ہے جس سے ان کی حیات ثابت ہے اور لغۃً لفظ عود اور اعادہ بھی اسی کو چاہتا ہے کہ روح اسی جسم کی طرف لوٹائی جائے جس میں پہلے دنیا میں وہ تھی اور وہ جسد عنصری ہی ہے نہ کہ مثالی اور اس وحی کے بعد اس حیات کا شعور و احساس اس فہم کامل اور فراست صحیحہ سے ہوتا ہے جو وحی سے حاصل ہے اور بحمد اللہ تعالیٰ اہل السنت والجماعت کو وہ فراست صحیحہ حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ حیات کے قائل ہیں اور اس میں ان کا کوئی اختلاف نہیں۔ جیسا کہ تسکین الصدور میں اس پر روشن حوالے مذکور ہیں اور اس کی مثال یوں دیتے ہیں جیسے سکتہ کا بیمار کو دیکھنے والے کو اس میں حیات نہیں نظر آتی۔ مگر ہوتا وہ زندہ ہے اور اس کی روح کا جسم عنصری سے باقاعدہ تعلق ہوتا ہے۔

جناب نیلوی صاحب کا بلا تفصیل کہ یہ کہنا کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا اور کفن دیا گیا۔ اس لئے ان پر زندوں کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور شہداء کو غسل اور کفن کے بغیر دفن کیا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ زندہ ہیں'' مسلم نہیں۔

اوّلاً: تو اس لئے کہ اس کا کیا معقول ثبوت ہے کہ سب حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا ہے؟

ثانیاً: اس لئے کہ بعض حضرات انبیاء کرام علیہم السلام شہید بھی تو ہوئے۔ قرآن کریم میں ''ویقتلون النبیین'' اور ''وقتلهم الانبیاء'' اس کا واضح ثبوت ہے تو ان کو تو زندہ تسلیم کریں۔

ثالثاً: اس لئے کہ صرف اس شہید کو غسل اور کفن نہیں دیا جاتا جو میدان جنگ میں شہید ہو جائے اور وہاں سے اٹھا کر نہ لے جایا گیا ہو اور اس نے کھانے پینے اور دوا وغیرہ استعمال کرنے کا کوئی فائدہ نہ اٹھایا ہو جس کو حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ ارتثاث سے تعبیر کرتے ہیں۔ (ہدایہ ج۱ ص ۱۶۴، شرح وقایہ ج۱ ص ۲۶۴)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ (المتوفی ۱۷۹ھ) فرماتے ہیں: ''وتلک السنة فی من قتل فی المعترک فلم یدرک حتی مات واما من حمل منهم فعاش ماشاء الله بعد ذلک فانه یغسل ویصلّٰی علیه کما فعل بعمر رضی اللہ عنہ'' (موطا امام مالک ص ۱۷۴ طبع مجتبائی دہلی)

اور یہ کارروائی ان شہداء سے ہوگی جو میدان جنگ میں شہید ہوئے اور کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور مر گئے۔ باقی رہا وہ شہید جو وہاں سے اٹھایا گیا اور وہ اس کے بعد زندہ رہا تو اس کا غسل بھی ہے اور جنازہ بھی جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا گیا۔

اور اسی صفحہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''ان عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب غسل وکفن وصلی علیه وکان شهیدا برحمة الله'' بے شک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غسل اور کفن دیا گیا اور ان کی نماز جنازہ بھی ادا کی گئی اور وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے شہید تھے۔ (موطا امام مالک رحمہ اللہ ص ۱۷۴)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ احد پہاڑ پر تھے کہ وہ لرز گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر پاؤں مبارک مارا اور فرمایا کہ ٹھہر جا تجھ پر نبی اور صدیق اور دو شہید ہیں۔'' (بخاری ج۱ ص ۵۲۳)

اس صحیح حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دونوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہید فرمایا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیٹ (ہیضہ وغیرہ) کی بیماری اور طاعون میں مرنے والے پانی میں ڈوب کر اور مکان و دیوار وغیرہ کے نیچے دب کر مرجانے والے کو شہید قرار دیا ہے۔ (بخاری ج ۱ ص ۹۰، ۷ ۳، ج ۳ ص ۲ ۱۴، ۱۴۳، مؤطا امام مالک ص ۴۶)

اور حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے مستقبل باب قائم کیا ہے (باب الشہادۃ سبع سوی القتل ج ۱ ص ۳۹۷) کہ قتل فی سبیل اللہ کے علاوہ شہید سات قسم کے ہیں۔ ان میں ان مذکورین کے علاوہ ذات الجنب، نمونیا اور سل اور دق مرنے والا اور والمراۃ تموت بجمع یعنی وہ عورت جو بچے کی پیدائش کے وقت دردزہ میں فوت ہوجائے بھی شامل ہیں۔

(الجامع الصغیر ج ۲ ص ۴۲ مالک حم دن ہ حب ک، صحیح)

اور کوئی مومن سمندری سفر طے کرتے وقت سر چکرانے سے مرجائے تو وہ بھی شہید ہے اور ڈوب کر مرجانے والا تو ڈبل شہید ہے۔ (ابوداؤد ج ۱ ص ۳۳۷، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۳۳)

اسی طرح وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں نکلا اور مرگیا یا قتل کردیا گیا یا گھوڑے یا اونٹ سے گر کر گردن ٹوٹ گئی یا سانپ وغیرہ کوئی کیڑا ڈس گیا اور وہ مرگیا یا اپنی چارپائی پر جس طرح بھی مرگیا تو وہ شہید ہے۔

(ابوداؤد ج ۱ ص ۳۳۸، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۳۳)

اور اسی طرح مومن اپنا مال، دین اہل وعیال جان اور اپنے جائز حق کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا شہید ہے۔ (نسائی ج ۲ ص ۱۵۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ سے سچے دل سے شہادت طلب کی تو اللہ تعالیٰ اس کو شہداء کے درجات پر پہنچادے گا۔ اگرچہ وہ اپنی چارپائی پر مرا ہے۔ (مسلم ج ۲ ص ۱۴۱)

اور اس کے علاوہ بھی بے شمار شہداء ہیں اور ان سب کو غسل اور کفن دیا جاتا ہے۔ غرضیکہ جناب نیلوی صاحب کا مطلقاً یہ کہنا کہ شہداء کو غسل اور کفن نہیں دیا جاتا۔ کتب حدیث اور فقہ سے بے خبری پر مبنی ہے۔

رابعاً: اس لئے کہ جناب نیلوی صاحب (الکتاب المسطور ج ۱ ص ۹) میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے لکھتے ہیں کہ: ''ان کے اجساد عنصریہ میں روحیں نہیں ہیں۔ ان کا صحیح سلامت رہنا بھی تو کمال قدرت الٰہیہ کا ظہور ہے۔ ورنہ بے روح چیز تو زمین کا لقمہ بن جاتی ہے۔''

گویا ان کے نزدیک حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اس لئے زندہ نہیں کہ قبور میں ان کے اجساد عنصریہ سے ارواح طیبہ کا تعلق نہیں۔ وہ ان کے نزدیک صرف اس معنی میں زندہ ہیں کہ ان کی ارواح زندہ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ شہداء کو جو وہ زندہ کہتے ہیں تو کس معنی میں زندہ کہتے ہیں۔ اگر اس معنی میں زندہ کہتے ہیں (جس کا وہ اس نہج پر پہنچ کر تصور بھی نہیں کرسکتے) کہ ان کی ارواح کا ان کے اجساد عنصریہ سے تعلق ہے تو یہ تو اہل حق کا مسلک ہے اور جناب نیلوی صاحب تو اس حق مسلک کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں اور اگر اس معنی میں زندہ کہتے ہیں کہ ان کے ارواح زندہ ہیں تو پھر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور حضرات شہداء میں تفریق کا کیا مطلب؟ ارواح تو سبھی کی زندہ ہیں؟ پھر شہداء پر زندوں کا اطلاق کرنا اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام پر زندوں کا اطلاق نہ کرنا۔ کیونکر درست اور صحیح ہے؟

جناب نیلوی صاحب کی اس نرالی منطق اور افسانہ کو کون سمجھے گا؟ مگر وہ کہہ دیں گے کہ

حال دل احوال غم شرح تمنا عرض شوق بے خودی میں کہہ گئے افسانہ در افسانہ ہم

جناب نیلوی صاحب کی یہ منطق بھی بڑی ہی نرالی ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجساد عنصریہ کو ارواح کے تعلق کے بغیر محفوظ تسلیم کرنے میں تو قدرت الٰہیہ کا ظہور ہے۔ مگر کیا ان کے اجساد عنصریہ سے ارواح مبارکہ کے تعلق سے ان کے محفوظ و سلامت رہنے میں رب تعالیٰ کی قدرت معاذ اللہ تعالیٰ مفقود ہو جاتی ہے؟ کیا اس کی قدرت کاملہ کا ظہور اس طرح نہیں ہو سکتا کہ ارواح طیبہ کا تعلق ابدان مبارکہ سے بھی ہو اور علیین اور جنت سے بھی تعلق برقرار رہے کہ عقل انسانی تو اس مقام میں دنگ و حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔ مگر قدرت الٰہیہ کا ظہور علیٰ وجہ الاتم ہوتا ہے۔ جیسا کہ تمام اہل حق اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ نہ تو قدرت الٰہیہ اور احادیث صحیحہ کا انکار ہو اور نہ اہل حق کا دامن چھوٹے اور نہ وہ خفا ہوں کہ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری ۔

دل جائے جان جائے قیامت ہی کیوں نہ آئے   سب کچھ مجھے قبول ہے مگر تو خفا نہ ہو

نرالی منطق

جناب نیلوی صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''احادیث میں عذاب وثواب کے واقعات اکثر جو آئے ہیں اسی ارواح کے عذاب وثواب کو بتایا گیا ہے۔ اگر بدن کے ذرات جہاں بھی منتشر ہو کر اڑ جائیں۔ برزخی عذاب ہر ہر ذرہ کا ہوتا رہے گا جو محسوس نہیں۔ بسیط عذاب غیر محسوس غیر شعوری حقیقی عذاب ہوگا۔ کیونکہ حیات بھی غیر شعوری غیر ترکیبی ہے۔ اس پر عذاب بھی ثواب بھی غیر محسوس، غیر شعوری ہوگا۔ کما لا یخفی علی المؤمن اللبیب'' (شفاء الصدور طبع اول ص ۳۶، ۱۰۵)

اس عبارت میں جناب نیلوی صاحب عذاب وثواب کا تعلق ارواح سے مانتے ہیں اور یہ نظریہ جمہور اہل السنت والجماعت کے حق و منصور مسلک کے خلاف ہے۔ تسکین الصدور ملاحظہ فرمائیں اور پھر متصل خود ہی اپنے اس غلط نظریہ کا رد کرتے ہیں کہ بدن کے ذرہ ذرہ کو برزخی عذاب ہوتا ہے۔ یہاں بدن سے ان کی کیا مراد ہے؟ اگر بدن مثالی ہے تو وہ ذرہ ذرہ نہیں ہوتا اور اگر بدن عنصری مراد ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ عذاب روح کے تعلق کے بغیر ہوتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہم نے (تسکین الصدور ص ۸۶) میں علامہ خیالی رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ قول نری حماقت ہے اور اگر روح کے تعلق سے ہے تو اہل حق کا قول تسلیم کر لیا جس کے لئے جناب نیلوی صاحب کا ذہن کسی قیمت پر آمادہ نہیں ہے۔ ہاں! مجبور ہو جائیں تو معاملہ الگ ہے ۔

مجبوریوں پہ اشک بہانا کبھی کبھی   جز اس کے اور کیا ہے میرے اختیار میں

عجیب شوشہ

جناب نیلوی صاحب لکھتے ہیں کہ: ''شہداء پر زندوں کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مگر انبیاء کرام علیہم السلام پر زندوں کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کی وفات کے بعد کپڑوں سمیت غسل دیا گیا اور کفن دیا گیا اور ان کے ساتھ شہیدوں کا سا برتاؤ نہیں کیا گیا کہ بغیر غسل دیئے ان کے معصوم مطہر معطر و مقدس اجساد طیبہ کو زیب تن کپڑوں کے ساتھ دفن کیا گیا ہو اور یہ بات سب امت کے نزدیک متفق علیہ و مجمع علیہ ہے۔ کسی ایک فرد کا اس میں اختلاف نہیں۔ سو اس معنی کی رو سے سب کے نزدیک ان پر میت کا اطلاق درست ہوا اور ''حیّ'' کا اطلاق اس معنی کی رو سے درست نہیں۔'' (الکتاب المسطور ج ۱ ص ۱۰)

اور (ص ۹) میں لکھتے ہیں کہ: ''ان اجساد عنصریہ میں روحیں نہیں ہیں۔ ان کا صحیح سلامت رہنا بھی کمال

قدرت الٰہیہ کا ظہور ہے۔ ورنہ بے روح کی چیز تو زمین کا لقمہ بن جاتی ہے۔"

الجواب: جناب نیلوی صاحب کہتے ہیں کہ شہداء زندہ ہیں۔ مگر انبیاء کرام علیہم السلام پر زندوں کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ شاید مولانا حالی رحمہ اللہ نے ایسے ہی غالی لوگوں کے بارے یہ فرمایا ہے کہ ؎

شہیدوں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں

ہم نے (تسکین الصدور ص ۲۷۵، ۲۷۶ طبع دوم) میں جناب سید عنایت اللہ شاہ صاحب گجراتی کا یہ فتویٰ بحوالہ ماہنامہ تعلیم القرآن نقل کیا ہے جس پر جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ کے پچاس علماء کرام کی تصدیقات اور دستخط موجود ہیں۔ جن میں: (۱) مولانا نصیر الدین صاحب غور غشتوی، (۲) مولانا ولی اللہ صاحب انہی ضلع گجرات، (۳) مولانا غلام اللہ خاں صاحب، (۴) مولانا محمد طاہر صاحب پنج پیر، (۵) مولانا قاضی شمس الدین صاحب، (۶) مولانا قاضی نور محمد صاحب، (۷) مولانا احمد حسین سجاد بخاری، (۸) حضرت مولانا قاضی غلام مصطفیٰ صاحب مرجانوی، (۹) اور حضرت مولانا قاضی محمد عصمۃ اللہ صاحب وغیرہم رحمہم اللہ ہیں۔

اس کے الفاظ یہ ہیں: اور اس عالم دنیا سے انتقال کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم برزخ میں (یعنی قبر میں جیسا کہ حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب رحمہ اللہ کے حوالہ سے عرض کیا جاچکا ہے۔ الانبیاء احیاء فی قبورھم (لاشک۔ صفدر) مثل شہداء سے بھی اعلیٰ وارفع حیات برزخیہ عطاء فرمائی گئی۔ وہ حیات دنیوی نہیں بلکہ اس سے بدرجہا اعلیٰ ارفع اجمل وافضل حیات برزخیہ ہے نہ کہ حیات دنیویہ۔ لیکن اگر کوئی اس حیات کو دنیوی کے نام سے تعبیر کرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات برزخیہ سے بھی انکار نہ کرے تو اس کو جماعت اہل السنت سے خارج نہیں کرنا چاہئے۔" (ماہنامہ تعلیم القرآن ماہ جنوری ۱۹۶۰ء ص ۳۲)

جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ کے یہ تمام اکابر علماء تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دنیوی حیات سے بھی بدرجہا اعلیٰ حیات کا اثبات اور اس کا اطلاق کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارفع حیات برزخیہ حاصل ہے اور جناب نیلوی صاحب کہتے ہیں کہ شہداء پر تو زندوں کا اطلاق ہوسکتا ہے مگر انبیاء کرام علیہم السلام پر زندوں کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

قرآن کریم میں "وقتلھم الانبیاء" اور "ویقتلون النبیین" کا ارشاد بھی موجود ہے کہ بعض حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو کافروں اور ظالموں نے شہید بھی کیا ہے۔ مگر جناب نیلوی صاحب پر ممات انبیاء (علیہم السلام) کے مسئلہ کا نظریہ۔ بھوت اور نشہ اس قدر سوار اور غالب ہے کہ وہ ان حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی جو شہید ہوئے بعنوان انبیاء زندہ نہیں مانتے اور نہ انہیں مستثنیٰ کرتے ہیں۔ بعنوان شہداء ان کو زندہ تسلیم کرنے میں ان کے نبوت اور رسالت کے اعلیٰ درجہ سے اغماض ہے۔ کما لا یخفی! مگر کیا کیا جائے جناب نیلوی صاحب بقول خود وزعم خویش خادم قرآن ہیں۔ کاش! وہ کسی حقیقی خادم قرآن سے استفادہ کرتے تو قدم قدم پر ٹھوکریں نہ کھاتے۔ اس لئے کہ ؎

تھا یہ بے رونق بیاباں پر گلستان ہو گیا
خار کو پھر گل کی صحبت سے ملا حسن جمیل

رہا جناب نیلوی صاحب کا یہ نظریہ کہ چونکہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا اور کفن بھی دیا گیا۔ لہٰذا وہ زندہ نہیں عجیب منطق ہے۔ کیا کپڑوں سمیت غسل دینا اور کفن دینا موت کی علت ہے؟ کپڑوں سمیت غسل کرنے والے اور لباس آخرت یعنی احرام کی سفید چادروں میں چلنے پھرنے والے کیا کبھی مردے ہوتے ہیں؟

اور جناب نیلوی صاحب یہ علمی بات بھی بالکل نظر انداز کر گئے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی بعض

خصوصیات بھی ہیں۔ اگر بالفرض سب کے لئے کسی صحیح مرفوع اور صریح حدیث سے کپڑوں سمیت غسل دینا ثابت ہو جائے تو یہ ان کی خصوصیات میں سے ہوگا نہ یہ کہ موت کی علت ہوگی۔ جیسا کہ انہوں نے بلاوجہ یہ سمجھ رکھا ہے اور ہم نے تسکین الصدور وغیرہ میں صراحت کے ساتھ یہ بات عرض کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات ''انک میت'' وغیرہ نصوص قطعیہ اور احادیث صحیحہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ آپ ﷺ کی وفات کا کوئی منکر نہیں۔ بعض حضرات نے لفظ وفات کی تشریح اپنے ذوق اور انداز سے کی ہے۔ مگر وفات کا انکار نہیں کیا۔ جیسا کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ وغیرہ اور جمہور اہل اسلام وفات کا معنی انقطاع الروح عن الجسد کرتے ہیں اور غسل دیتے اور کفن پہناتے وقت یہی کیفیت ہوتی ہے۔ ہاں! قبر میں دفن کر چکنے کے بعد صحیح بلکہ متواتر حدیث ''فتعاد روحہ فی جسدہ'' کے مطابق اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ارشاد کے موافق ''واعادۃ الروح الی العبد فی قبرہ حق'' (فقہ اکبر) قبر میں حیات تسلیم کرتے ہیں اور اسی پر واضح دلائل موجود ہیں۔ جیسا کہ اس کتاب میں بھی اختصاراً بعض حوالے مذکور ہیں۔ جناب نیلوی صاحب خود (الکتاب المسطور ج۱ ص۳۵۱) میں (فتاویٰ دارالعلوم ج۵ ص۴۷۶) کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی حیات قوی تر ہے۔ اس کے بعد شہداء کی پھر جملہ مومنین و مومنات کی درجہ بدرجہ اور نصوص صرف انبیاء علیہم السلام اور شہداء کی حیات میں وارد ہیں۔''

اور (ص۳۵۰) میں (کفایت المفتی ج۱ ص۶۸) کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی قبور میں زندہ ہیں۔ مگر ان کی زندگی دنیاوی زندگی نہیں ہے بلکہ برزخی اور تمام دوسرے لوگوں کی زندگی سے ممتاز ہے۔ اسی طرح شہداء کی زندگی بھی برزخی ہے اور انبیاء کی زندگی سے نیچے درجے کی ہے۔ دنیا کے اعتبار سے تو وہ سب اموات میں داخل ہیں۔ ''انک میت وانھم میتون'' اس کی صریح دلیل ہے۔''

ان عبارات سے واضح ہوا کہ قبور میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی حیات حاصل ہے اور شہداء سے اعلیٰ درجہ کی ہے۔ گو یہ حیات برزخی ہے کہ دنیا کی زندگی کے لوازم اس میں نہیں پائے جاتے۔ مگر ہے حیات اور دنیا کے اعتبار سے وہ اموات بھی ہیں۔ کیونکہ وہ حیات اہل دنیا کے شعور سے بالاتر ہے۔ ''ولکن لاتشعرون''

جناب نیلوی صاحب نے جو یہ لکھا کہ شہداء پر زندوں کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ مگر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پر زندوں کا اطلاق نہیں ہوسکتا تو گویا خود ہی اپنے سابق باطل نظریہ کی فتاویٰ دارالعلوم اور کفایت المفتی کے صریح اور جاندار حوالوں سے تردید کردی ہے۔ مگر مجذوب ہونے کی وجہ سے قاصر رہے ہیں اور بفضلہ تعالیٰ ہم ان کے محرم اسرار ہیں ؎

اے قطرۂ ساحل نہ الجھ میرے جنوں سے   ناداں نہ سکوں پائے گا ٹکرا کے بھنور سے

خود اپنی تردید

جناب نیلوی صاحب نے تسکین الصدور میں پیش کردہ ٹھوس حوالوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ وہ یوں کہ ہمارے ہی بعض نقل کردہ حوالوں کو بنیاد بنا کر حضرات فقہاء کرام اور متکلمین اہل سنت کا حوالہ دے کر تحریر کرتے ہیں کہ: ''قبر کا عذاب یا ثواب محسوس کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے صرف اسی قدر حس اور ادراک میت میں پیدا کرتا ہے کہ جس قدر سے وہ عذاب کے الم اور ثواب کی لذت کو جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسے پہنچتی ہے، محسوس اور دریافت کر سکتا ہے۔ زیادہ کا ادراک نہیں ہے۔ اس دعویٰ پر دلیل کے لئے عامہ کتب فقہ حنفیہ کی ایسی عبارتیں موجود ہیں جو عامہ علمائے حنفیہ اور جمہور فقہاء رحمہم اللہ اور تمام اہل السنت کا یہی عقیدہ ثابت کرتی ہیں۔'' (الکتاب المسطور ج۱ ص۱۸)

ظاہر بات ہے کہ لفظ میت سے جسد عنصری ہی مراد ہے کیونکہ نہ تو روح میت ہے اور نہ جسد مثالی۔ اب سوال یہ ہے میت میں یہ حس وادراک کیسے پیدا ہوتی ہے؟ (تسکین الصدور ص ۱۰۱) میں ہم نے صحیح حدیث کے حوالہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔

فتعاد روحه فی جسده اور (تسکین الصدور ص ۱۵۳) میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی الفقہ الاکبر کا حوالہ نقل کیا ہے: "واعادة الروح الی العبد فی قبره حق" اور (ص ۱۳۰، ۱۳۲) میں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا حوالہ نقل کیا ہے کہ: "الاحادیث متواترة علیٰ عود الروح الیٰ البدن وقت السوال"

اور (ص ۱۲۹) میں حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے: "ومعلوم ان هذا کله للجسد بواسطة الروح" اور (ص ۱۵۵) میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: "والایمان بملک الموت بقبض الارواح ثم ترد فی الاجساد فی القبور" اور (ص ۱۵۵) میں حضرت امام نووی رحمہ اللہ سے اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ نقل کیا ہے: "بعد اعادة الروح الیه اولی جزء منه" اور (ص ۱۵۸) میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا حوالہ نقل کیا ہے کہ جمہور فرماتے ہیں: "تعاد الروح الیٰ الجسد او بعضه" اور (ص ۱۶۱) میں علامہ عینی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اکثر اہل السنۃ یہ فرماتے ہیں: "ان الارواح تعاد الی اجساد" اور (ص ۱۶۵) میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ کا حوالہ نقل کیا ہے: "والجمهور علی عود الروح الی الجسد او بعضه" اور (ص ۱۶۷) میں علامہ سبکی کا حوالہ نقل کیا ہے: "ان حیات جمیع الموتی بارواحهم واجسامهم فی قبورهم لا شک فیها" اور (ص ۱۶۶) میں امام الحرمین رحمہ اللہ کے حوالہ سے سلف امت کا اتفاق اس پر نقل کیا ہے: "واحیاء الموتی فی قبورهم ورد الارواح فی اجسادهم" اور (ص ۱۶۷) میں مواقف کے حوالہ سے لکھا ہے: "واحیاء الموتی فی قبورهم" اور (ص ۱۶۹) میں شرح مواقف کے حوالہ سے لکھا ہے: "واذا ثبت التعذیب ثبت الاحیاء" اور (ص ۱۷۰) میں فتح القدیر کے حوالہ سے لکھا ہے: "الحق ان المیت المعذب فی قبره توضع فیه الحیوٰة بقدر ما یحسس بالالم" اور (ص ۱۸۲) میں امام غزالی رحمہ اللہ کا حوالہ نقل کیا ہے: "ولا یبعد ان تعاد الروح الی الجسد فی القبر" اور (ص ۱۸۹) "العرف الشذی" کا حوالہ نقل کیا ہے کہ عذاب قبر روح اور جسم دونوں کو ہوتا ہے اور یہی قول مشہور ہے۔

اور (ص ۱۹۱) فتاویٰ دارالعلوم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ عذاب روح پر مع جسم کے ہوتا ہے۔ جیسا کہ ظاہر احادیث سے ثابت ہے۔ وغیرہ وغیرہ! دیگر متعدد حوالے اسی میں دیکھ لیں۔ الحاصل! حضرات فقہاء کرام اور متکلمین رحمہم اللہ قبر میں حس ادراک شعور اور حیات اعادۂ روح الی الجسد کی بناء پر تسلیم کرتے ہیں۔ مگر جناب نیلوی صاحب ان اکابر میں سے کسی ایک کی بات سننے پر آمادہ نہیں۔ انہوں نے (الکتاب المسطور ج ۱ ص ۲۲ تا ص ۲۷) میں غیر متعلق اور غیر واضح حوالے جوڑ کر سارا روز ہی اس پر صرف کیا ہے کہ روح کا بدن عنصری سے تعلق نہیں بلکہ ان اجزائے اصلیہ سے ہے جن سے انسان بنایا گیا اور جو بوسیدہ نہیں ہوتے۔ مثلاً عجب الذنب (یعنی دم گزہ) مگر یہ ساری کاوش بے سود ہے۔ اس لئے کہ جن مردوں کے اجزاء خاک ہو جاتے ہیں یا جن کو درندے پرندے اور مچھلیاں وغیرہ جانور کھا جاتے ہیں۔ اگر ان کے بارے یہ بات کہی جائے تو حضرات متکلمین اور فقہاء عظام رحمہم اللہ نے باطل فرقوں کے جواب میں بطور تخلص کے یہ جواب ذکر کیا ہے لیکن روح کا یہ تعلق پھر بھی تو بالآخر بدن عنصری ہی کے اجزاء سے رہا نہ کہ بدن مثالی کے اجزاء سے "کما لا یخفی" قطع نظر اس کے بے شمار مردے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اجساد عنصریہ صحیح وسالم ہوتے ہیں تو ان کی طرف ارواح کے اعادہ میں

کیا اشکال ہے؟ اور ان کے لئے عجب الذنب (دم گزہ) اور ذرات کے ساتھ حیات کے تعلق کا کیا داعیہ اور مجبوری ہے؟ جناب نیلوی صاحب نے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے قبور میں اجساد عنصریہ کے بالکل صحیح سلامت بلا تغیر وتبدل کو (کتاب المسطور ج۱ ص۹) میں اجمالاً تسلیم کیا ہے اور (ج۲ ص۲۰۱) میں یہ عنوان قائم کیا ہے۔ سلامت اجساد انبیاء علیہم السلام امت مسلمہ میں مسلم ہے اور پھر (ج۲ ص۲۰۱ تا ۲۰۶) اس پر متعدد حوالے اور حدیثیں نقل کی ہے اور پھر (ص۲۰۶) میں تفسیر مظہری کے حوالہ سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ حافظ قرآن کا جسم بھی قبر میں محفوظ رہتا ہے اور پھر قتادہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ جس نے کوئی گناہ نہ کیا۔ اس کا جسم بھی محفوظ رہتا ہے اور زمین اس کو نہیں کھاتی تو گزارش ہے کہ جن کے اجسام قبور میں محفوظ ہیں۔ ان کی طرف تو اعادۂ ارواح کو تسلیم کرلیں۔ جیسا کہ احادیث متواترہ، حضرت امام ابو حنیفہ، حضرت امام احمد بن حنبل اور جمہور امت کا عقیدہ اور مسلک ہے اور ان کے صحیح اور صریح اقوال سے یہ ثابت ہے۔

جناب نیلوی صاحب آخرت کی فکر کیجئے اور مرنے سے قبل ہی صحیح اور متواتر احادیث حضرات فقہاء کرام، حضرات متکلمین اور جمہور امت پر اعتماد بحال کر لیجئے۔ ان شاء العزیز پشیمان تو آپ ضرور ہوں گے۔ مگر بہت سے سادہ لوح، ضدی اور متعصب لوگوں کو گمراہ کر کے بقول غالب رحمہ اللہ ۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ظلم عظیم

قارئین کرام! صد افسوس اور ہزار بار حیرت ہوتی ہے۔ جناب نیلوی صاحب کی تحقیق اور ہٹ دھرمی پر کہ وہ مومن تو رہے در کنار کفار کے اجسام کے ذرات تک میں حس وادراک تسلیم کر کے انہیں سزا یافتہ مانتے ہیں۔ مگر جب باری آتی ہے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تو ان کے اجساد مبارکہ کو صحیح سلامت مانتے ہوئے بھی ان کے ابدان سے ارواح طیبات کا تعلق نہیں مانتے اور واضح الفاظ میں تحریر کرتے ہیں کہ: ''ان کے اجساد عنصریہ میں روحیں نہیں ہیں۔'' (الکتاب المسطور ج۱ ص۹)

یہ ہے نیلوی صاحب کا حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے عشق ومحبت لاحول ولاقوۃ الا باللہ! اگر وہ کہہ سکتے ہیں ۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟

فتویٰ مفتی اعظم ہند رحمہ اللہ

یہ عنوان قائم کر کے جناب نیلوی صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت استاذی وشیخی مفتی اعظم ہند رحمہ اللہ (کفایت المفتی ج۱ ص۶۸) میں تحریر فرماتے ہیں: ''انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں مگر ان کی زندگی دنیاوی زندگی نہیں ہے بلکہ برزخی اور تمام دوسرے لوگوں کی زندگی سے ممتاز ہے۔ اسی طرح شہداء کی زندگی بھی برزخی ہے اور انبیاء کی زندگی سے نیچے درجے کی ہے۔ دنیا کے اعتبار سے وہ سب اموات میں داخل ہیں۔ ''انک میت وانھم میتون'' اس کی صریح دلیل ہے۔'' (الکتاب المسطور ج۱ ص۳۵۰)

اس کے بعد کفایت المفتی کے حوالہ سے دو تین فتوے اور نقل کئے ہیں۔

الجواب: جناب نیلوی صاحب کی حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت میں لفظ برزخی زندگی سے کیا مراد ہے؟ اور وہ اس سے کیا سمجھے ہیں؟ اگر ان کی مراد یہ ہے کہ آپ کی زندگی قبر اور برزخ

میں ہے اور دنیوی زندگی کے تمام آثار اور لوازمات اس میں نہیں پائے جاتے کہ دیکھنے والوں کو محسوس ہوں تو بجا ہے اس کا کون منکر ہے؟ اور اگر یہ مراد ہو کہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی عبارت میں برزخی زندگی سے یہ مراد ہے کہ روح مبارک کا قبر شریف میں جسد اطہر سے تعلق نہیں اور آپ ﷺ عند القبر صلوٰۃ والسلام نہیں سنتے تو قطعاً باطل ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم کسی اور کی عبارت سے اس کی تشریح کریں۔ خود حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ ہی کی کفایت المفتی کی عبارت کو ہم حکم تسلیم کرتے ہیں۔

سوال: مولود میں لفظ یا رسول اللہ السلام علیک۔ یا حبیب سلام علیک پکار کر کہنا اس غرض سے کہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی روح مبارک محفل میلاد میں آتی ہے۔ لہٰذا برائے تعظیم کھڑے ہو کر لفظ مذکور کو پکار کر کہتے ہیں آیا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب: صلوٰۃ وسلام کے ساتھ یا رسول و یا حبیب نداء کے الفاظ سے پکارنا اس خیال سے کہ صلوٰۃ وسلام آنحضرت ﷺ کو فرشتوں کے ذریعہ پہنچا دیا جاتا ہے اور آپ ﷺ تک ہماری نداء اور خطاب پہنچ جاتا ہے۔ جائز اور درست ہے۔ کیونکہ بعض روایات معتبرہ سے۔ ثابت ہے کہ باری تعالیٰ وتقدس نے آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک پر ایک فرشتہ مقرر فرما دیا ہے کہ اس کو ایسی قوت سامعہ عطاء فرمائی ہے کہ وہ تمام مخلوق کے صلوٰۃ وسلام سن کر حضرت نبوی میں عرض کر دیتا ہے اور آنحضرت جواب دیتے ہیں (اور پھر آگے نزل الابرار کے حوالہ سے صحیح حدیث نقل کر کے اس کا ترجمہ نقل کر کے آخر میں لکھتے ہیں) ہاں! اس خیال اور اعتقاد سے نداء کرنا کہ آنحضرت ﷺ کی روح مبارک مجلس مولود میں آتی ہے۔ اس کا شریعت مقدسہ میں کوئی ثبوت نہیں اور کئی وجہ سے یہ خیال باطل ہے۔

اوّل: یہ کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ قبر مبارک میں زندہ ہیں۔ جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے تو پھر آپ کی روح مبارک کا مجالس میلاد میں آنا بدن سے مفارقت کر کے ہوتا ہے یا کسی اور طریقے سے؟ اگر مفارقت کر کے مانا جائے تو آپ کا قبر مطہر میں زندہ ہونا باطل ہو جاتا ہے یا کم از کم زندگی میں فرق آنا ثابت ہوتا ہے تو یہ صورت علاوہ اس کے کہ بے ثبوت ہے۔ باعث توہین ہے نہ کہ موجب تعظیم اور اگر مفارقت نہیں ہوتی تو پھر ہر مجلس مولود میں آپ ﷺ کی موجودگی بدن اور روح کے ساتھ ہوتی ہے یا محض بطور کشف وعلم کے؟ پہلی صورت بداہۃً باطل ہے اور دوسری صورت بے ثبوت اور بعض اعتبار سے موجب شرک ہے کہ آن واحد میں مجالس کثیرہ کا علم ہونا اس طرح کہ گویا آپ ﷺ حاضر وناظر ہیں۔ یہ خاصہ ذات احدیت ہے۔ آنحضرت ﷺ کو حاضر وناظر سمجھنا شرک ہے۔" (کفایت المفتی ج ۱ ص ۱۵۹ تا ۱۶۱)

قارئین کرام! جناب نیلوی صاحب کے استاذ محترم مفتی اعظم ہند حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کی اس عبارت سے یہ امور صراحت ووضاحت سے ثابت ہیں۔

۱...... آنحضرت ﷺ عند القبر صلوٰۃ وسلام سنتے اور اس کا جواب دیتے ہیں۔

۲...... آپ ﷺ قبر مبارک میں زندہ ہیں اور یہ اہل السنت والجماعت کا مذہب ہے۔

۳...... آپ ﷺ کی زندگی روح مبارک کے اس جسد اطہر کے ساتھ تعلق سے ہے جو قبر شریف میں ہے۔

۴...... اگر اس جسد اطہر سے روح مبارک کی مفارقت اور جدائی مانی جائے تو آپ ﷺ کا قبر میں زندہ ہونا باطل ہو جاتا ہے یا کم از کم زندگی میں فرق آنا ثابت ہوتا ہے۔

۵...... اور آپ ﷺ کو قبر مبارک میں زندہ نہ تسلیم کرنا یا کم از کم زندگی میں فرق ماننا باعث توہین ہے نہ کہ موجب تعظیم۔
یہ سب باتیں حضرت مفتی اعظم ہند رحمہ اللہ کی اپنی عبارت میں موجود و مذکور ہیں۔
جناب نیلوی صاحب! خدارا بتائیں کہ آپ کے استاد محترم کیا فرماتے ہیں اور آپ کیا کہتے ہیں؟ اور آپ اہل سنت والجماعت اور اپنے استاذ محترم کے مسلک کو چھوڑ کر آنحضرت ﷺ کی (معاذ اللہ تعالیٰ) توہین کے مرتکب بھی ہیں اور آپ ﷺ کی توہین کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہو سکتا۔ جناب نیلوی صاحب! آپ تعصب عناد اور انا کو چھوڑ دیں۔ اپنے اور اپنے بعض جذباتی اور سطحی اذہان والے حواریوں کے ایمان کی فکر کریں۔ ہمیں آپ کی اور آپ کے حواریوں کی خیر خواہی مطلوب ہے نہ کہ بدخواہی ؎

کہو یارو تمہیں کیسا لگے ہے؟ وہ ظالم جو مجھے اچھا لگے ہے

مطالبہ: بحمد اللہ تعالیٰ ہم نے تسکین الصدور وغیرہ میں جو چیلنج کیا تھا اس سے جناب نیلوی صاحب خوب سر پٹائے، بوکھلائے اور سیخ پا ہوئے ہیں مگر اس کا جواب تا ہنوز نہیں دے سکے اور نہ ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک دے سکتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ بلاشبہ بے شمار علماء ملت اور اکابر فقہاء نے آنحضرت ﷺ کی بعد از وفات زندگی پر برزخی حیات کا اطلاق کیا ہے اور کسی کو اس سے انکار نہیں اور نہ انکار کی گنجائش ہے۔ بلاوجہ جناب نیلوی صاحب نے برزخی حیات کے اثبات کے لئے الکتاب المسطور اور ندائے حق وغیرہ میں صفحات کے صفحات سیاہ کر ڈالے ہیں۔ لیکن ان تمام بزرگوں میں ایک فرد بھی ایسا نہیں جو یہ کہتا ہو کہ آنحضرت ﷺ عند القبر صلوٰۃ وسلام نہیں سنتے اور قبر مبارک میں آپ ﷺ کے جسد اطہر کا روح مطہر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ہے جناب نیلوی صاحب میں دم خم تو بغیر ہیرا پھیری کے کم از کم ایک ہی حوالہ آنحضرت ﷺ کی حیات برزخیہ تسلیم کرنے والوں سے صریح الفاظ میں یہ بتا دیں کہ آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کا جسد اطہر سے قبر شریف میں کوئی تعلق نہیں ہے اور آپ عند القبر صلوٰۃ والسلام نہیں سنتے۔ جان چھڑانے کے لئے یہ لکھ دینا کہ دلیل مثبت پر ہوتی ہے نافی پر نہیں ہوتی محض طفل تسلی ہے جس سے کوئی بھی سمجھدار مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بات لگی لپٹی بغیر کہیں ؎

لو ہم بتائیں غنچہ و گل میں ہے فرق کیا؟ اک بات ہے کہی ہوئی اک بے کہی ہوئی

ہم پہلے باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ جو حضرات حیات دنیویہ کا جملہ بولتے ہیں تو ان کی مراد ہرگز ہرگز یہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی وفات نہیں ہوئی یا قبر مبارک میں بھی اسی طرح کی حیات ہے جو بعینہٖ دنیا میں تھی کہ ہر ایک کو وہ محسوس و مدرک تھی اور دنیوی زندگی کے تمام لوازم اس سے وابستہ ہیں۔ جیسا کہ شیعہ، شنیعہ اور بریلوی حضرات ازواج مطہرات سے شب باشی تک کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اہل حق برزخی کے ساتھ دنیوی کا اطلاق محض اس لئے کرتے ہیں کہ یہ واضح ہو جائے کہ قبر شریف میں آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کا اس جسد اطہر سے تعلق ہے جو آپ ﷺ کو دنیا میں حاصل تھا نہ تو صرف روح کی حیات ہے اور نہ روح مبارک کا جسد مثالی سے تعلق ہے۔ کیونکہ جب امت مسلمہ کے اتفاق سے آپ ﷺ کا جسد مبارک قبر شریف میں موجود و محفوظ ہے تو اس کے ہوتے ہوئے جسد مثالی ماننے کا کیا داعیہ ہے؟ قارئین کرام! اس بات کو بخوبی سمجھنے کی کوشش کریں۔ جناب نیلوی صاحب آپ حضرات کو اہل السنت والجماعت کی سیدھی لائن اور صراط مستقیم کی بہاروں سے ہٹا کر سنسان جنگل میں پھینکنے کا ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے ہیں

اجساد مثالیہ

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ اجساد مثالیہ کا ہمیں انکار نہیں۔ جہاں ابدان عنصریہ نہ جاسکیں وہاں وہ ارواح کا مرکب اور سواری بن سکتے ہیں۔ جیسا کہ حضرات شہداء کی ارواح کے لئے طیور کا لفظ وارد ہوا ہے۔ لیکن ارواح ان میں تدبیر نہیں کرتیں۔ جیسا کہ دنیا میں اجساد عنصریہ میں تدبیر کرتی تھیں۔ جناب نیلوی صاحب نے بلاضرورت اور بلاوجہ (الکتاب المسطور ج ۱ ص ۱۰ تا ص ۱۳) میں عمدۃ القاری (اور لطف کی بات یہ ہے کہ جمہور کی طرف سے تسکین الصدور میں حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ سے صحیح کے ساتھ اعمش رحمہ اللہ کی روایت پیش کی گئی تو نیلوی صاحب نے اس میں بلاوجہ کیڑے نکالے اور خود (ج ۱ ص ۱۱) میں اعمش رحمہ اللہ کی روایت استدلال میں پیش کرتے ہیں اور ایسی چپ سادھ لی ہے۔ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ صفدر) شرح الصدور، حاشیہ ترمذی اور روح المعانی سے کچھ روایات نقل کرتے ہیں جن سے اجساد مثالیہ کا ثبوت مطلوب ہے اور پھر (ج ۱ ص ۱۵) میں سوال و جواب کی صورت میں روح کے جسد مثالی میں داخل ہونے کا اثبات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم مجتہد نہیں ہیں۔ پایہ اجتہاد کا نہیں رکھتے۔ ہم تو سلف صالحین رحمہم اللہ کی بات کو لے کر اس پر کاربند ہو جاتے ہیں۔ جب حضرت عبداللہ بن المبارک کے طریق سے ہمیں آنحضرت ﷺ کا فرمان معلوم ہو گیا۔ پھر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سلف و خلف کے نزدیک بھی یہی مسلک صحیح ہے کہ ان ابدان محسوسہ سے نکل کر روح دوسرے مثالی جسم میں داخل ہو جاتی ہے تو پھر انکار کی ہمیں کوئی گنجائش نہیں۔ ہاں! اگر کوئی پرویزی ذہن کا نہ مانے تو ہم اس کو منوانے کے مکلف نہیں۔'' (ج ۱ ص ۱۵)

الجواب: سبحان اللہ تعالیٰ جناب نیلوی صاحب کا معصومانہ انداز تو ملاحظہ کیجئے کہ اہل السنت والجماعت کا حق و منصور مسلک جو قرآن کریم، احادیث متواترہ حضرات فقہاء کرام اور متکلمین عظام رحمہم اللہ کی تصریحات سے مؤید ہے کہ ارواح کا تعلق قبور میں اجساد عنصریہ سے ہے اور ارواح قبور میں انہی کی طرف لوٹائی جاتی ہیں۔ چھوڑ کر بلاوجہ سلف و خلف کا نام لے کر ان کا دامن پکڑنے کی قسم کھائے بیٹھے ہیں اور صحیح و متواتر احادیث کا انکار اور غلط تاویل بلکہ تحریف کر کے دوسروں کو پرویزی ذہن کا طعنہ دیتے ہیں۔ سچ ہے ؎

ایں کار از تو آید مرداں چنیں کنند

اور مزے کی بات یہ ہے کہ نہ تو شرح الصدور کی روایت کی سند اور اس کی صحت و اتصال بیان کرنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں اور نہ ہی حضرت عبداللہ بن مبارک کی بیان کردہ روایت کی ؎

اللہ ری تیری جنبش مژگان ستم کیش اک پل میں کئے تو نے دو عالم تہ و بالا

جناب نیلوی صاحب! گزارش ہے کہ جن روایات سے آپ نے سبز رنگ کے پرندوں اور اجساد مثالیہ کا اثبات کیا ہے۔ ان سے آپ کو کیا فائدہ؟ آپ کا فائدہ تو جب ہے کہ ارواح کا اجساد عنصریہ سے کوئی تعلق نہ ہو جس کی وجہ سے قبر میں حیات ثابت ہوتی ہے اور یہی حیات جناب نیلوی صاحب کی موت ہے اور قبر میں ثواب و عذاب اجساد مثالیہ سے متعلق ہو۔ جب کہ احادیث صحیحہ متواترہ اور اہل السنت والجماعت کے نزدیک ارواح کا تعلق ابدان عنصریہ سے قائم ہے تو سبز رنگ کے پرندے اور اجساد مثالیہ ارواح کے لئے صرف مرکب اور سواری ہی ہو سکتے ہیں جو قبر سے باہر کا معاملہ ہے۔ جیسا کہ ہوائی جہاز یا ریل اور موٹر وغیرہ کے اندر سیٹوں پر بیٹھ کر لوگ سفر کرتے ہیں یا گھوڑے وغیرہ کے اوپر سوار ہو کر چلتے پھرتے ہیں۔ خود آپ نے (ص ۱۱) میں نقل کیا ہے۔

"لفظ فی فی جوف طیر خضر بمعنی علی فیکون الارواح علی اجواف طیر خضر" کہ فی بمعنی علیٰ ہے یعنی ارواح سبز رنگ کے طیاروں کے پیٹوں (یعنی گدوں اور سیٹوں) پر (سوار ہو کر سیر کرتی ہیں)

لیکن یہ تعلق تدبیر بدن کا نہیں کہ ارواح ابدان مثالیہ میں تدبیر کرتی ہوں۔ بلکہ محض سواری و مرکب کا ہے۔ غرضیکہ ابدان عنصریہ کے ساتھ ارواح کا تعلق ماننے سے کوئی مخلص اور چھٹکارا نہیں ؎

پا بہ گل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون؟ دست بستہ شہر میں کھولے میری زنجیر کون؟

جناب نیلوی صاحب کی بوکھلاہٹ

جناب نیلوی صاحب نے تسکین الصدور اور سماع الموتی وغیرہ کے مضبوط، قوی، صریح اور واضح دلائل اور براہین سے بالکل کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے اور لاجواب و قاصر ہو کر اپنی خفت مٹانے کے لئے اب حربہ یہ اختیار کیا ہے کہ کہیں راقم اثیم کی کتابوں میں تعارض و تضاد ثابت کرنے کی بے جا کاوش کی ہے اور کہیں یہ الزام عائد کیا ہے کہ فلاں راوی کے بارے یہ جرحی کلمہ چھوڑ دیا ہے اور کہیں یہ کہ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ پر احسن الکلام میں سخت جرح کی ہے اور پھر تسکین الصدور میں اس سے استدلال کیا ہے اور کہیں یہ کہ حضرت قتادہ رحمہ اللہ کی احسن الکلام میں توثیق و تعریف کی ہے۔ مگر سماع الموتی میں اس کو قدری اور بدعتی کہا ہے اور کہیں یہ کہ اپنی بعض کتابوں میں کتب حدیث کے طبقہ ثالثہ کو مسترد کیا ہے اور دوسرے کتابوں میں خود ہی اس طبقہ کی روایات سے استدلال ہے۔ وغیرہ وغیرہ!

غرضیکہ بجائے تسکین الصدور اور سماع الموتی وغیرہ کتابوں میں نقل کردہ ٹھوس دلائل کے صحیح اور معقول جوابات دینے کے راقم اثیم اور راقم کی کتابوں پر بے اعتمادی پیدا کرنے کے لئے سطحی اور جذباتی قسم کے حواریوں کے جذبات کو یوں ابھارا ہے کہ اس کی کتابوں میں تعارض و تضاد ہے۔ کہیں کچھ لکھتا ہے اور کہیں کچھ۔ لہٰذا وہ اور اس کی کتابیں قابل اعتبار نہیں۔ لیکن بحمد اللہ تعالیٰ دنیا میں فہم و بصیرت والے بھی موجود ہیں۔ وہ خود ہی فریقین کی کتابوں کا موازنہ کر کے کھری اور کھوٹی بات کی تمیز کر سکتے ہیں۔ ہمیں کچھ کہنے کی حاجت ہی نہیں ؎

عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

اور اب تو راقم اثیم اور اس کی کتابوں کی مفروض اغلاط کو اشتہارات کے ذریعہ ان کے حواریوں نے ملک کے کونے کونے میں پہنچانے کی سعی کی ہے اور اس خدمت دین میں وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے ہمہ وقت خواہاں ہیں۔ اچھا کرتے ہیں ؎

حسینوں کی وفا کیسی جفا کیا جو دل آیا تو پھر اچھا برا کیا

ان شاء اللہ العزیز! زندگی رہی تو آئندہ حصص میں جناب نیلوی صاحب کے قائم کردہ تضادات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔ فی الحال ایک تضاد ملاحظہ کیجئے۔

جناب نیلوی صاحب کا مفروض تعارض

جناب نیلوی صاحب نے اپنے جذباتی حواریوں کو تسکین الصدور وغیرہ راقم اثیم کی کتابوں سے بزعم خویش تعارض اور تضاد بھی کشید کر کے بتائے ہیں۔ تاکہ بداعتمادی پیدا کی جاسکے۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:

مگر محترم کا دورخہ کلام ملاحظہ ہو۔

تعارض: محترم جناب مولانا صاحب نے (تسکین الصدور طبع اوّل ص ۸۱) میں خود تحریر فرمایا ہے کہ زندہ سے مراد اس مقام پر وہ زندہ نہیں جس میں روح داخل ہو اور اس سے اختیاری طور پر افعال سرزد ہوں۔ مگر (ص ۶۴) میں اس کے خلاف لکھ دیا کہ فرشتوں کو جواب دینا ایک اختیاری فعل ہے اور بدون روح کے اس کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اب معلوم نہیں پہلی بات صحیح ہے یا پچھلی۔" (الکتاب المسطور ج ۱ ص ۵۰۴)

الجواب: جناب نیلوی صاحب کا یہ بیان بھی دیگر مضامین کی طرح خالص مجذوبانہ ہے۔ اس لئے کہ (ص ۸۱) کی پوری عبارت یہ ہے۔ (پہلے عبدالحکیم علی الخیالی کا حوالہ ہے۔ پھر لکھا ہے کہ) مولانا سیالکوٹی نے بھی وہی کچھ ارشاد فرمایا جو دیگر علماء عقائد اور متکلمین رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ عذاب اور آرام کا تعلق تو بدن مادی اور عنصری کے ساتھ ہے اور وہ بھی حیات کے بعد نہ بایں طور کہ وہ جماد کا جماد رہے اور اس میں سرے سے حیات ہی نہ ہو۔ ہاں! یہ بات جدا ہے کہ زندہ سے اس مقام پر وہ زندہ مراد نہیں۔ جس میں سو فیصدی روح داخل ہو اور اس سے اختیاری طور پر افعال صادر ہوں کہ دوسرے لوگ بھی اس کا احساس کر سکیں۔ جیسا کہ دنیا میں تھا یا قیامت کو ہوگا بلکہ زندہ سے اس مقام پر وہ زندہ مراد ہے جس میں ایسا ادراک و شعور پیدا کر دیا جائے جس سے اس کو عذاب و آرام اور الم و لذت کا ادراک اور احساس ہو سکے۔ جب یہ کیفیت اس میں متحقق ہو جائے تو وہ زندہ کہلائے گا نہ کہ جماد۔"

قارئین کرام! اس عبارت کو بھی بغور پڑھیں اور پھر (ص ۶۴) میں (شرح فقہ اکبر ص ۱۲۱) کی عبارت کا ترجمہ اور اس کی تشریح بھی ملاحظہ فرمائیں۔ (حضرت ملا علی القاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں) تو جان لے کہ اہل حق اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ قبر میں میت کے اندر ایک گونہ زندگی پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ تکلیف اور لذت محسوس کرتا ہے۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ کیا روح اس کی طرف لوٹائی جاتی ہے؟ امام صاحب سے اس سلسلہ میں توقف نقل کیا گیا۔ لیکن ان کا کلام اس جگہ اعادۂ روح پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ فرشتوں کو جواب دینا ایک اختیاری فعل ہے اور بدون روح کے اس کا تصور نہیں ہو سکتا۔ (شرح فقہ اکبر)

اعادۂ روح کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ روح کا تعلق بکمالہ جسم سے ہو۔ جیسا کہ دنیا میں تھا یا آخرت میں ہوگا۔ اس میں اختلاف ہے۔ اگر حضرت امام صاحب رحمہ اللہ سے توقف کا قول کسی معتبر طریقہ سے ثابت ہے تو اس سے یہی پہلی صورت مراد ہوگی اور پہلے امام نووی رحمہ اللہ کے حوالہ سے عرض کیا جا چکا ہے کہ حق یہ ہے کہ قبر میں اعادۂ روح کی یہ صورت نہیں ہوتی اور دوسری صورت یہ ہے کہ اعادۂ روح سے فی الجملہ تعلق مراد ہو۔ جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی صریح عبارات کے حوالہ سے یہ بات نقل کی جا چکی ہے اور یہ اعادہ صحیح اور صریح احادیث سے ثابت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔

انصاف سے فرمائیں کہ ان مفصل عبارات میں کیا تعارض ہے؟ کیونکہ فرشتوں کو جواب دینا ایک اختیاری فعل ہے اور بدون روح اس کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اس میں اس اختیاری فعل کا اثبات ہے جس کے ذریعہ مقبور فرشتوں کو جواب دے سکے اور (ص ۸۱) کی عبارت میں ہے: اس مقام پر وہ زندہ مراد نہیں جس میں سو فیصدی روح داخل ہو اور اس سے اختیاری طور پر افعال صادر ہوں کہ دوسرے لوگ بھی اس کا احساس کر سکیں۔ جیسا کہ دنیا میں تھا یا قیامت کو ہوگا۔ اس مفصل عبارت میں ایسے افعال اختیاریہ کی نفی ہے، جنہیں لوگ دیکھ سکیں اور ان کا احساس کر سکیں۔ صد افسوس ہے کہ جناب نیلوی صاحب کو لفظ تعارض و تضاد تو آتا ہے مگر اس کی حقیقت اور معنی سے بالکل

بے خبر ہیں اور حیرت ہے کہ اس محقق اور خادم قرآن کو اردو عبارات سمجھنے کی اہلیت اور سلیقہ بھی حاصل نہیں۔ لیکن بے سوچے سمجھے الزام عائد کرنے کا شوق ضرور ہے ۔

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرم سخن سے پہلے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم المقام حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد از گزارش ہے کہ آنجناب کی علمی خدمات اور فرق باطلہ کے خلاف محققانہ وعالمانہ تصنیفات امت مسلمہ پر عموماً اور مسلک علماء دیوبند سے تعلق رکھنے والوں پر خصوصاً احسان عظیم ہے۔ مگر بعض حضرات نے آنجناب کی تصنیفات میں تعارض وتضاد ثابت کیا ہے۔ اس لئے آنجناب سے وضاحت مطلوب ہے کہ اگر واقعتاً تضاد ہے تو اس کی اصلاح کی درخواست ہے اور اگر تضاد نہیں بلکہ محض تعصب کی بناء پر تضاد ثابت کیا گیا ہے تو علمی انداز میں اس کا جواب عنایت فرمادیں۔ تاکہ فرق باطلہ کا منہ بند کیا جاسکے۔ تضادات واعتراضات حسب ذیل ہیں۔

۱...... (احسن الکلام ج ۱ ص ۹۱ تا ۹۳) پر تفصیلاً لکھا ہے کہ مستور کی روایت حجت نہیں اور (تسکین الصدور ص ۳۱۸) میں مستور کی روایت سے حجت پکڑی ہے۔

۲...... (احسن الکلام ج ۲ ص ۷۰ تا ۷۳) میں ہے کہ محمد بن اسحاق کذاب اور دجال ہے۔ مگر (تسکین الصدور ص ۳۲۹) میں مستدرک حاکم والی روایت سے حجت پکڑی ہے جس میں محمد بن اسحاق ہے۔

۳...... تسکین الصدور میں ایک راوی کی ثقاہت نقل کرکے جرح والا کلمہ چھوڑ دیا ہے اور فتح الباری سے اپنے مقصد کی عبارت نقل کردی۔

۴...... احسن الکلام میں ایک راوی کا نام عثمان بن عمر کے بجائے عمر بن عثمان بنادیا ہے۔

۵...... قتادہ کو احسن الکلام میں احد التابعین واعلام الاسلام بتایا ہے اور (سماع موتی ص ۲۱۲) میں بدعتی ثابت کیا ہے۔

۶...... (راہ سنت ص ۱۷۳) میں لکھا ہے کہ طبقہ ثالثہ کی روایات کو محدثین قبول نہیں کرتے اور خود من صلی علی عند قبری طبقہ ثالثہ کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ العارض: محمد نعیم اللہ خادم مدرسہ اشرف العلوم باغبانپورہ گوجرانوالہ

۸/ مارچ ۱۹۸۶ء بمطابق ۲۶/ جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ

باسمہ سبحانہ! من ابی الزاہد

الی محترم المقام جناب مولانا مفتی محمد نعیم اللہ صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج سامی!

آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا۔ یادآوری، کرم فرمائی، حسن ظنی اور ذرہ نوازی کا صمیم قلب سے ہزار شکریہ ورنہ من آنم کہ من دانم! محترم راقم اثیم کی تصنیفات کے بارے آپ نے اور پاک وہند کے دیگر اکابر علماء کرام نے جو رائے ظاہر فرمائی ہے۔ خدا تعالیٰ کرے کہ ایسا ہی ہو۔ لیکن اس میں راقم اثیم کا کوئی کمال نہیں۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور آپ جیسے مخلص بزرگوں اور ساتھیوں کے نیک دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ محترم! لایعنی اعتراضات سے اسلام کا کون سا ذخیرہ

محفوظ رہا ہے؟ کیا دیانند سرسوتی کی کتاب ستیارتھ پرکاش کا چودھواں باب قرآن کریم پر اعتراضات کے لئے وقف نہیں ہے[1] اور کیا منکرین حدیث نے صحاح ستہ کی احادیث پر کند چھری نہیں چلائی؟ اور کیا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر رافضیوں نے مطاعن و مثالب کی معنوی بارش نہیں برسائی؟ اور کیا حضرات ائمہ فقہ، منکرین فقہ کے تیروں سے محفوظ ہیں؟ محترم! نرے اعتراضات سے اپنے ماؤف دل کی بھڑاس نکالنے اور عوام الناس کو مغالطہ دینے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے عقل کی کسوٹی اسی لئے عطاء فرمائی ہے کہ صحیح وغلط اور حق و باطل کی پرکھ ہو سکے۔ محترم! نقل کردہ اعتراضات خالص مغالطے اور محض بے جان ہیں۔ اختصاراً اہم بحول اللہ تعالیٰ وقوتہ جوابات عرض کرتے ہیں۔

۱...... احسن الکلام میں مستور کی روایت کے حجت نہ ہونے کی بحث اپنے مقام اور موقع پر بالکل درست ہے اور (تسکین الصدور ص ۳۱۸) میں جس راوی سے ہم نے استدلال کیا ہے وہ ہماری تحقیق میں مستور و مجہول نہیں بلکہ ہم نے اصول حدیث کے ضابطہ سے اسے معروف ثابت کیا ہے اور باحوالہ لکھا ہے کہ وہ معروف ہے۔ ملاحظہ ہو (تسکین الصدور ص ۳۱۸) اور پھر ہم نے (ص ۳۲۰) میں لکھا ہے کہ: اس حدیث کے جملہ راوی ثقہ اور معروف ہیں اور محدثین کی خاصی جماعت اس حدیث کو صحیح مانتی اور کہتی ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ابوالشیخ کی مذکور سند کے بارے فرماتے ہیں۔ بسند جید! (فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۲)

علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ وسندہ جید (القول البدیع ص ۱۱۶) حضرت ملا علی القاری بھی اس کو بسند جید فرماتے ہیں۔ (مرقات ج ۱ ص ۱۰) نواب صدیق حسن خان بھی فرماتے ہیں۔ اسنادہ جید (دلیل الطالب ص ۸۴۴) مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ بھی اس کو بسند جید فرماتے ہیں۔ (فتح الملہم ج ۱ ص ۳۳۰) ان اکابر محدثین رحمہم اللہ نے (جن میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جن کی تقریب اور تہذیب التہذیب پر آج رواۃ کی توثیق وتضعیف پر مدار ہے) بیان سے واضح سے ہو گیا کہ یہ روایت جید اور صحیح ہے۔

محترم! راقم اثیم کی اس اصولی اور باحوالہ بحث کے بعد راقم پر یہ الزام کہ مستور کی روایت سے استدلال کر رہا ہے۔ انصاف و دیانت کا چوراہے میں خون بہانا ہے۔ اگر کسی مجذوب کی اپنی ذاتی اور اختراعی تحقیق یہ ہو کہ وہ ان محدثین کرام پر اعتماد نہیں کرتا اور راوی کو مجہول سمجھتا اور کہتا ہے تو اس سے راقم اثیم کی عبارات میں تضاد کیسے ثابت ہوا؟ راقم تو باحوالہ اور اصرار سے اسے معروف کہتا ہے۔ معہذا اگر کسی کو شبہ پڑتا ہے تو ہم ان شاء اللہ! اس کی دل جوئی کے لئے اس کو حذف کر دیں گے۔

۲...... محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کے بارے معترض نے صرف لاتقربوا الصلوٰۃ کا جملہ ہی پیش نظر رکھ کر اعتراض جڑ دیا ہے۔ سیاق وسباق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ ذیل کے امور کو ملحوظ رکھیں۔ (۱) ہم نے احسن الکلام کے سبب تالیف میں یہ حوالے نقل کئے ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ اس

[1] شاید جناب نیلوی صاحب وغیرہ حضرات نے شیعہ کے ایک بڑے عالم، محدث، مؤرخ اور مجتہد علامہ نوری طبرسی کی کتاب ''فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب'' دیکھی ہو گی جس میں انہوں نے بزعم خویش دو ہزار سے زیادہ (خود ساختہ تراشیدہ اور موضوع) روایات سے جن کو انہوں نے متواتر اور مستفیض کا درجہ دیا ہے۔ معاذ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں کمی بیشی، تغیر و تبدل اور تحریف ثابت کی ہے اور اس پر بغیر اپنے چار علماء کے تمام متقدمین اور متاخرین شیعہ علماء کا اتفاق و اجماع نقل کیا ہے مصنف جمادی الاخریٰ ۱۲۹۲ھ اس کی تالیف سے فارغ ہوا ہے۔

زمانے میں بعض مدعیان عمل بالحدیث نے یہ غوغا مچایا کہ حنفیہ مفسدین صلوٰۃ اور بے نماز ہیں۔ (ہدایۃ المہدی ص ۲) حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ بالخصوص قسم کھا کر کہے کہ حنفیوں کی نماز نہیں ہوتی۔ ان کی بیبیوں سے غیر مقلدین کو بلا طلاق نکاح جائز ہے۔ (تنقیح العقید ص ۳۵)

ایک غیر مقلد مگر منصف مزاج عالم ایسے ہی ایک غالی اور بے باک مفتی کا حوالہ دیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ اوّل تحریر ایک ہمارے ہی علماء اہل حدیث کی پرچہ تنظیم میں طبع ہوئی تھی۔ جس میں مولانا موصوف نے مدرک رکوع کے اعتقاد والوں کو مخلد فی النار تک کا حکم صادر فرما دیا تھا۔ نتیجہ اس طرح نکالا تھا کہ مدرک رکوع سے فاتحہ مفقود ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی نماز نہیں جس کی نماز نہیں وہ بے نماز ہے۔ بے نماز کافر ہے اور وہ مخلد فی النار ہے۔ (ملاحظہ اتمام الرکوع فی ادراک الرکوع ص ا طبع کردہ نمبر رسالہ صحیفہ اہل حدیث دہلی، احسن الکلام طبع سوم ج ۱ ص ۵۵) اور اب (فصل الخطاب ص ا جدید ایڈیشن) میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، بے کار ہے اور باطل ہے۔ ملاحظہ! (احسن الکلام ج ۱ ص ۵۷ طبع سوم)

محترم! ان غالیوں کے پاس مقتدی کے لئے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے لئے صریح روایت صرف اور صرف محمد بن اسحاق کی ہے۔ گویا یہ روایت ان کے نزدیک اوّل درجہ میں ان کی دلیل ہے اور اسی پر ان کے استدلال کا مدار ہے۔ اس لئے راقم الحروف نے بھی کتب اسماء الرجال سے ابن اسحاق پر کڑی جرح نقل کی ہے جو (احسن الکلام ج ۲ ص ۸۷ تا ۸۲) میں پھیلی ہوئی ہے۔ چونکہ غیر مقلدین حضرات کا دعویٰ انتہائی سنگین ہے۔ اس لئے یہ جرح نقل کی گئی ہے۔ غیر مقلدین حضرات کے بالکل ناروا غلو آمیز اور نہایت ہی باطل دعویٰ کے پیش نظر محمد بن اسحاق پر یہ سخت جرح باحوالہ کتب اسماء الرجال نقل کی گئی ہے۔ مگر بایں ہمہ (احسن الکلام ج ۲ ص ۸۳) میں یہ بھی ہے کہ مؤلف خیر الکلام نے جن بعض ائمہ کی بسلسلہ ابن اسحاق توثیق نقل کی ہے تو وہ مسلم ہے مگر وہ صرف تاریخ مغازی وغیرہ کے بارے میں نہ کہ صفات اللہ، حلال وحرام، احکام وسنن کے بارے میں اور مغازی میں وہ ثقہ بھی ہیں اور امام بھی۔ اس میں نزاع نہیں ہے۔

پھر آگے غیر مقلدین حضرات کے اس سوال کا کہ: ''علماء احناف نے بھی محمد بن اسحاق کی روایات کو معتبر سمجھا ہے۔ یہ جواب دیا ہے کہ کیا احناف نے محمد بن اسحاق کی روایت کو نص قرآنی اور صحیح احادیث کے خلاف حجت سمجھا ہے۔ اگر احناف نے اس کی روایت کو کسی موقع پر طور حجت بھی پیش کیا ہو تو یقین جانئے کہ تمام روئے زمین کے غیر مقلدین کو للکارا اور کھلا چیلنج بھی ہرگز نہ کیا ہوگا اور نہ حلفیہ طور پر ان کو بے عمل کہا ہوگا؟ انصاف شرط ہے۔'' (احسن الکلام ج ۲ ص ٦٦)

اہل علم ان عبارات کا مفہوم بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ (۳) ہم نے (تسکین الصدور ص ۳۲۹) میں محمد بن اسحاق کی جو روایت پیش کی ہے وہ ساتویں دلیل ہے۔ جب کہ چھ دلیلیں اس کے علاوہ ہیں جن میں محمد بن اسحاق نہیں۔ اگر یہ روایت نہ بھی ہو تو ہمارا دعویٰ باقی چھ دلیلوں سے ثابت ہے۔ ان کی روایت پر ہمارا دعویٰ موقوف نہیں۔ جب کہ غیر مقلدین کا دعویٰ خلف الامام اور سورۃ فاتحہ کی قید کے ساتھ ابن اسحاق ہی کی روایت پر موقوف ہے اور ان کی یہ حدیث ان کی نمبر ایک دلیل ہے۔ علاوہ ازیں ساتویں دلیل میں باحوالہ دو روایتیں نقل کی ہیں۔ ایک وہ ہے جس میں ابن اسحاق ہے اور دوسری (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۱۱) کے حوالہ سے یہ روایت ہے۔ ''ثم لئن قام علی قبری فقال یا محمد لا جیبنہ، رواہ ابو یعلیٰ ورجالہ رجال الصحیح (آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ پھر البتہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام میری قبر پر کھڑے ہو کر مجھے پکار کر کہیں۔ اے محمد ﷺ! تو میں ضرور ان کا جواب دوں گا اور اس

روایت کے راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں جن میں محمد بن اسحاق نہیں تو معترض کا دیانۃً یہ اخلاقی اور علمی فریضہ تھا کہ وہ اس صحیح روایت کا بھی حوالہ دیتے ہیں جس سے اہل علم یہ سمجھتے کہ استدلال کا مدار محمد بن اسحاق کی روایت پر نہیں بلکہ وہ صرف شاہد وتائید ہے۔ دونوں حدیثیں مل کر سا تویں دلیل بنتی ہے۔ ہاں! البتہ یہ غلطی ضرور ہوئی ہے کہ اگر دوسری روایت کو پہلے نقل کر دیا جاتا اور ابن اسحاق کی روایت کو بعد نقل کر دیا جاتا تو شاید کسی مجذوب کو اعتراض کو جرأت نہ ہوتی۔ اب ان شاء اللہ العزیز! طبع جدید میں اس کی بھی اصلاح کر دی جائے گی اور نیز (الدر المنثور ج ۲ ص ۲۴۵) کے بجائے (مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۰) غلط چھپ گیا ہے اور اب ان شاء اللہ العزیز! اس کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔
غرضیکہ معترض نے ان تمام حقائق سے آنکھیں بند کر کے ابن اسحاق کی روایت کے بارے اعتراض کیا ہے۔

۳...... جب جمہور محدثین کرام اور ائمہ جرح وتعدیل کسی راوی کو ثقہ کہیں اور ان میں کوئی اکیلے دوکیلے اس راوی پر جرح کا کلمہ بولیں تو اس سے وہ راوی مجروح نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ الحق مع الجمہور تو ایسے جرحی کلمہ کے چھوڑنے سے راوی پر یا اس کی روایت پر کیا زد پڑتی ہے۔ اگر فتح الباری سے اپنے مطلب کی عبارت نقل کی ہے تو کیا جرم کیا ہے۔ تمام مصنفین دوسری کی کتابوں سے صرف اپنے مطلب کے حوالے ہی نقل کیا کرتے ہیں۔ سب عبارتیں اور ساری کتابیں کون نقل کیا کرتا ہے اور کس نے نقل کی ہیں؟ ہاں! مصنف کی مراد کے خلاف عبارت اور حوالہ نقل کر دینا! اور مغالطہ دینا اصول تصنیف کے خلاف ہے۔ مگر اس کا واضح ثبوت درکار ہے کہ ایسا ہوا ہے محض کسی کی فہم حجت نہیں۔

۴...... ذہن میں نہیں آیا کہ احسن الکلام میں عثمان بن عمر راوی کا ذکر کہاں ہے؟ اگر وہ مقلوب ہو گیا ہے تو نہ تو راقم اثیم معصوم ہے اور نہ کاتب۔ غلطی ہوئی تو ان شاء اللہ العزیز! ضرور اصلاح کر لی جائے گی اور کتب حدیث کی اسانید میں مقلوب کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ والعصمۃ بید اللہ تعالٰی!

۵...... قتادہ رحمہ اللہ کو احسن الکلام میں ثقہ اور احد علماء التابعین والائمۃ العالمین وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ بجا ہے کہ روایت میں ثقہ ہے اور (ساع الموتٰی ص ۲۱۲) میں لکھا ہے۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ وہ برملا اپنا ردی عقیدہ بیان کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہر چیز اللہ تعالٰی کی تقدیر سے ہوتی ہے۔ مگر گناہ اس کی تقدیر سے نہیں ہوتے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۶، ۱۱۷)

امام الجرح والتعدیل یحیٰی بن سعیدان کو چوٹی کا (بدعتی) قدری کہتے تھے۔ (تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۵۳)

محترم! جس راوی کو امام الجرح والتعدیل یحیٰی بن سعید القطان، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر ردی عقیدہ والا اور چوٹی کا قدری (بدعتی) بتائیں تو ہم انہیں کیسے سنی سمجھ سکتے ہیں؟ فیصلہ آپ خود کر لیں۔ البتہ معترض اصول حدیث کا ایک واضح ضابطہ نہیں سمجھے۔ وہ یہ ہے کہ بدعت غیر مکفرہ کے مرتکب راوی اگر ثقہ ہوں تو ان کی روایت حجت ہے۔ جب کہ وہ بدعت کا داعیہ نہ ہو اور وہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس بدعت کے عقیدہ کا اہل السنت میں سے کوئی قائل نہ ہو اور امام سیوطی رحمہ اللہ نے اصول حدیث کی کتاب (تدریب الراوی ص ۲۱۹، ۲۲۰) میں متعدد بدعتیوں کے نام ذکر کئے ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں کہ: ''فھؤلاء المبتدعۃ ممن اخرج لھم الشیخان او احدھما'' یہ وہ بدعتی راوی ہیں جن کی روایتیں بخاری اور مسلم دونوں یا ان میں سے ایک میں موجود ہیں۔

۶...... راہ سنت اور دیگر بعض کتابوں میں ہم نے طبقہ ثالثہ کی کتابوں کے بارے جو لکھا ہے، افسوس ہے کہ معترض نے اس میں بھی قطع وبرید کی ہے۔ مثلاً ہم نے (گلدستہ توحید ص ۱۵۶) میں لکھا ہے کہ امام بیہقی رحمہ اللہ کی کتابیں

طبقہ ثالثہ میں ہیں۔ (عجالہ ص ۷) اور اس طبقہ کا حکم یہ ہے اور اکثر آں احادیث معمول بہ نزد فقہاء نہ شدہ اند بلکہ اجماع برخلاف آں منعقد گشتہ۔ (عجالہ ص ۷) لہٰذا قرآن کریم کی سابقہ آیات اور عقیدہ میں اس کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ یہ حدیث صحیح بھی ہو اور ظن غالب بھی یہی ہے کہ یہ سنداً صحیح ہے۔ مگر بحث باب عقائد کی ہے۔''

محترم! غور فرمائیں کہ طبقہ ثالثہ کی روایات کے رد کے متعلق چار وجوہ یہاں بیان کی گئی ہیں۔ (۱) قرآن کریم کے مقابلہ میں وہ حجت نہیں۔ (۲) باب عقیدہ میں خبر واحد صحیح معتبر نہیں۔ (۳) حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کے ہاں اس طبقہ کی اکثر (نہ کہ کل) احادیث معمول بہا نہیں۔ (۴) بلکہ ان کے خلاف اجماع منعقد ہے اور ہم نے اس طبقہ کی جس روایت سے استدلال کیا ہے اس سے مذکورہ خرابیوں میں سے کوئی بھی لازم نہیں آتی۔ اوّلاً تو اس لئے تمام حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ عند القبر صلوٰۃ والسلام کے قائل ہیں۔ ان میں کوئی منکر نہیں۔ ثانیاً: اس پر اجماع واتفاق واقع ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ مگر انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں۔ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۰۰، طبع جید برقی پریس دہلی)

اور حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: ''کیونکہ روضۂ مبارک پر جو درود شریف پڑھا جاتا ہے وہ بالاتفاق بلا واسطہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش ہوتا ہے اور آپ اس کو سنتے اور جواب دیتے ہیں۔'' (امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۱۱۰)

بلکہ اس مسئلہ پر اتفاق واجماع کا اقرار جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ کے بزرگوں کو بھی ہے۔ چنانچہ (ماہنامہ تعلیم القرآن بابت ماہ اگست ۱۹۶۲ء ص ۱۸، ۱۹) میں ہے۔ باقی رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس صلوٰۃ وسلام کے سماع کا مسئلہ تو اس میں فریقین کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہ تھا۔ جیسا کہ آج سے تقریباً تین سال پہلے ماہنامہ تعلیم القرآن شمارہ ماہ ستمبر ۱۹۵۹ء اور پھر اس کے بعد شمارہ ماہ دسمبر ۱۹۶۲ء میں دوسرے فریق (جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ) کے اس بارے مسلک کی صراحت موجود ہے۔ البتہ اس فریق کے بعض حضرات جن میں سے حضرت مولانا سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، عند القبر سماع صلوٰۃ وسلام کے دوام اور ہمہ وقتی ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ الا خرق العادۃ!

محترم! پوری امت میں از شرق یا غرب از شمال تا جنوب پہلے شخص جناب سید عنایت اللہ شاہ صاحب ہیں جو عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کے منکر ہیں۔ غرضیکہ ہم نے طبقہ ثالثہ کی روایت جو حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ کے نزدیک جید اور صحیح ہے۔ اس مسئلہ میں پیش کی ہے جس پر امت کا اجماع واتفاق ہے اور ظاہر امر ہے کہ امت مرحومہ کا اتفاق واجماع قرآن کریم اور صحیح حدیث کے خلاف کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے اور طبقہ ثالثہ کی روایت سے ہم نے استدلال کا وہاں انکار کیا ہے۔ جہاں نصوص قرآنیہ اور عقائد سے تصادم ہو اور اجماع فقہاء اس کے خلاف ہو اور ان دونوں باتوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اگر کوئی جاہل یا متعصب اس واضح فرق کو نظر انداز کرتا ہے تو بتلائے کہ ہمارے پاس اس کا کیا علاج ہے؟ ہم نے اختصاراً جوابات عرض کر دیئے ہیں۔ وفیہا کفایۃ!

حاضرین مجلس سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور نیک دعاؤں میں نہ بھولیں۔ بفضلہ تعالیٰ دعاء جو بھی دعا گو ہے۔ والسلام!

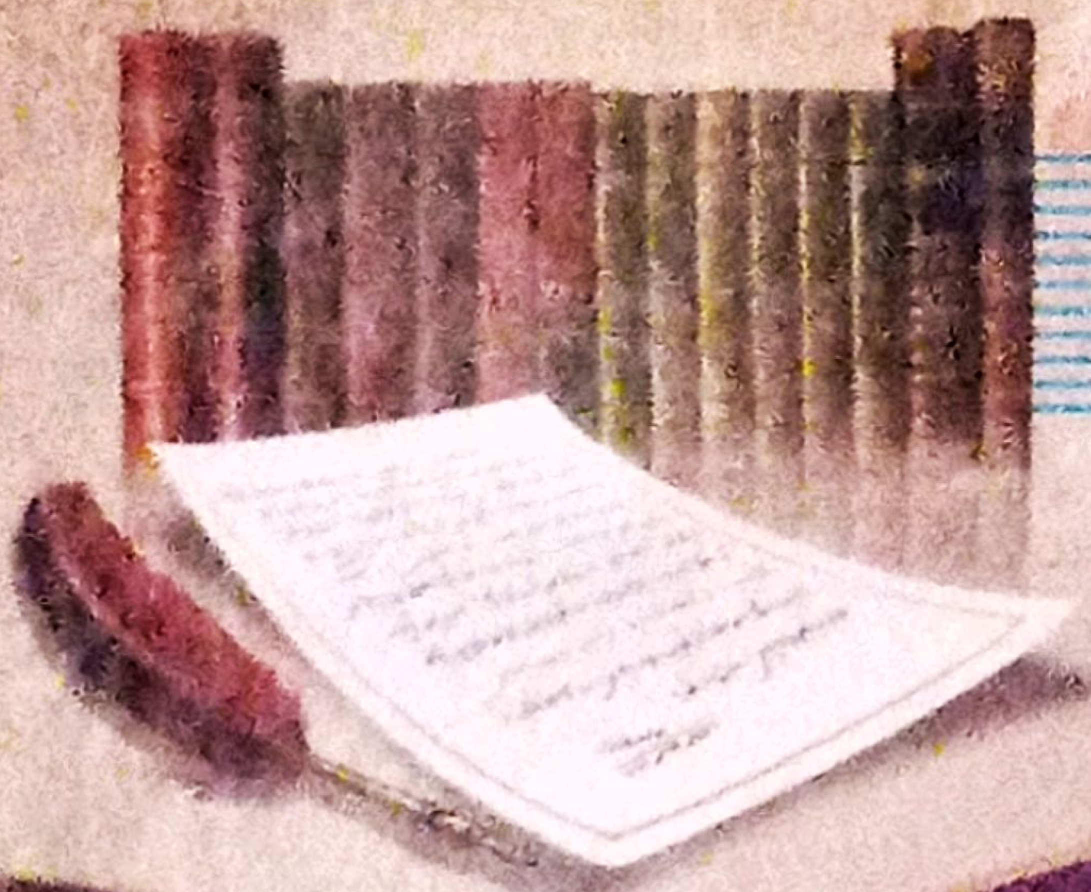
احقر: ابو الزاہد محمد سرفراز خان صفدر

خطیب جامع مسجد گکھڑ وصدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

۳۰ رجمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ بمطابق ۱۲ رمارچ ۱۹۸۶ء

تحریکِ ختمِ نبوت

1934ء تا 2019ء



مکمل سیٹ دس جلدیں

ترتیب وتحقیق

شاہینِ ختمِ نبوت حضرت مولانا اللہ وسایا مدظلہ

عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت